جلد اوّل

دار العلم ممبئی

العواصم من القواصم اور المنتقی سے اہم ترین حواشی کے ساتھ

مِنهَاجُ السُّنَّة

مکمل تخریج حدیث اور معتبر اہل کتب سے مفید حواشی کے ساتھ

تالیف

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

اختصار و ترجمہ

پیرزادہ شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی حفظہ اللہ

ناشر

دار العلم ممبئی

سلسلہ مطبوعات دارالعلم نمبر 209

نام کتاب	:	مِنْهَاجُ السُّنَّة (جلد اوّل)
تالیف	:	شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	:	دارالعلم، ممبئی
طابع	:	محمد اکرم مختار
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	:	۲۰۱۴ء
مطبع	:	بھاوے پرائیویٹ لمیٹڈ

دارالعلم ممبئی
DARUL ILM
PUBLISHERS & DISTRIBUTORS
242, J.B.B. Marg, (Belasis Road),
Nagpada, Mumbai-8 (INDIA)
Tel. (+91-22) 2308 8989, 2308 2231
Fax : (+91-22) 2302 0482
E-mail : ilmpublication@yahoo.co.in

فہرست موضوعات

انتساب

اولاً: میں اپنی اس ادنی سی کاوش کا انتساب ان علمائے کرام رحمہم اللہ کے نام کرتا ہوں جنہوں نے مختلف ادوار میں دفاع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور بیان سنت کی خاطر اپنی قیمتی جانیں جان آفریں کے سپرد کردیں۔اللہ ان کی انمول قربانیاں قبول فرمائے اور انہیں اس پر بہترین بدلہ عطاء فرمائے۔

ثانیاً: ان مجاہدین علماء کرام جو آج بھی اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر سنت اور اہل سنت کا دفاع کررہے ہیں۔

ثالثاً: اس کاوش کا انتساب اپنے ان تمام اساتذہ کرام کے نام کرتا ہوں جنہوں نے میری تربیت کی اور جن سے میں نے کسی طرح بھی اور کسی قدر بھی کسب فیض کیا۔ ان میں سرکاری پرائمری سکول سے لیکر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تک کے تمام اساتذہ شامل ہیں۔

رابعاً: اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے نام اور اپنی بیگم کے نام؛ جنہوں نے مجھے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے بھرپور موقعہ فراہم کیا' اور اس دوران میرے بچوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کی خدمات انجام دیں۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری اس کاوش کو میرے اور میرے اساتذہ کرام کے نام اعمال میں شامل کردے۔

اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبت میں اس طرح کی کوششیں کی جارہی ہیں' اللہ تعالیٰ ان کی محبت پر ہی موت دے' اور اور قیامت والے دن ان کے ساتھ ہمیں بھی کھڑا کردے۔ آمین۔

❁❁❁❁

هدیہ تشکر

﴿وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِراً عَلِيْماً﴾

''اور اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کا قدر دان اور جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾

''جو کچھ میں نے آپ کو دیا ہے، اسے لیجیے اور شکر گزار لوگوں میں سے ہو جائیے۔''

سب سے پہلے اور سب سے آخر میں حمد و تعریف اور شکر اللہ تعالیٰ کے لیے ہی سزاوار ہے، جو نیک اعمال کی توفیق بخشنے، انہیں پورا کرنے اور قبول کرنے والا ہے۔

میں اپنے والدین، اپنے تمام تر اساتذہ کا، خواہ ان کا تعلق مدرسہ اور سکول کی زندگی سے یا کالج اور یونیورسٹی کی زندگی سے ہے، تمام کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری تربیت میں کسی طرح بھی حصہ لیا۔

میں اپنے کفیل کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے دعوت الی اللہ کے لیے فراغت کا موقع دیا۔

بہت ہی ضروری سمجھتا ہوں کہ مراجعہ کرنے والے فاضل علماء محترمین کا بھی شکریہ اس دعا کے ساتھ ادا کیا جائے کہ اللہ اس محنت پر دارین میں نیک بدلہ دے۔

میں ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً مشورہ دیکر یا حوصلہ افزائی کر کے یا خیر کے کلمات کہہ کر کسی طرح بھی میری ڈھارس بندھائی اور اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی ترغیب دی؛ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کو اپنے انعامات رحمتوں اور مغفرتوں سے نواز دے۔

تقریظ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِيْنُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ . أَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ إِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [آل عمران ۱۶۴]

''بیشک مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ انہیں میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے یقیناً یہ سب اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ کریم کا احسان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا جو اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتے اور تزکیہ نفس کرتے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے سب کا پیغام پیغام توحید تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں رب کریم نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل ۳۶]

''ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔''

انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار اور طاغوت [غیر اللہ] کا انکار ہوا کرتا تھا۔ ایسے ہی فرمان الٰہی ہے: ﴿وَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء ۲۵] ''آپ سے قبل بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف وحی نازل کی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں سو تم میری ہی عبادت کرو۔'' یہ دعوت لے کر رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی وادی میں دعوت توحید کا آغاز کیا تو ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے مرد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے؛ جنہوں نے توحید کا پیغام سنتے ہی اس دعوت حق کو قبول کر لیا۔ اور پھر نبی کریم ﷺ پر اپنی جان نچھاور کرنا شروع کر دی؛ اپنا مال قربان کیا؛ اور لوگ مسلمان ہونے لگ گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلمہ پڑھنے سے اسلام کو عزت نصیب ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب سے اسلام لائے ہم معزز ہی رہے۔'' رسول اللہ ﷺ کے پہلے شاگرد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محترم جماعت تھی۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اعلان کرتے ہیں: ﴿أُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کی جماعت ہیں'' ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ''یقیناً ایمان والے کامیاب ہو گئے۔'' ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ ''وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ ان سے راضی ہو گیا۔'' ﴿اَلسّٰبِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾ ''مہاجرین و انصار میں سے ایمان میں سبقت اولین لے جانے اور جن لوگوں نے احسان کے ساتھ ان کی اتباع کی۔'' ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے دین سیکھا اور اسے

پھیلایا۔اور دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی کرنیں پہنچائیں۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ: ''اگر اسلام کو ایک اور عمر رضی اللہ عنہ مل جاتا تو دنیا سے کفر کا خاتمہ ہو جاتا۔'' مگر دشمنان دین اس چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ یہود و نصاری پہلے ہی دن سے اسلام' نبی اسلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دشمن تھے۔اور ہر دم اور ہر لحہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کیسے اس دین کو نقصان پہنچایا جائے۔

جب امت فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہوئی اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر روافض میدان میں اترے تو عبداللہ بن سباء جو کہ دین کا دشمن تھا اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کا نام نہاد علم اٹھایا اور اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو جمع کیا' اور کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر کفر کا فتوی لگایا۔اصل میں عبداللہ بن سباء کی تحریک اسلام دشمن تحریک تھی۔روافض جو کہ اہل اسلام کی دشمن اور کذاب جماعت ہے' یہ اسلام کی روح کے مخالف ہیں۔روافض کا حضرت ابوبکر صدیق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما [اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین] کو کافر قرار دینا تو اصل میں اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنا ہے۔کیونکہ خلفاء راشدین مہدیین اصل میں اسلام کے وہ سپہ سالار ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا۔ان اصحاب کو من گھڑت اور ضعیف روایات کے بل بوتے پر کافر قرار دینا یہ رافضی مذہب ہے۔ یہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کافر ثابت ہو گئے تو اسلام تو ختم ہو گیا۔کیونکہ صحابہ ہی مدرسۂ نبوت کے وہ پہلے طالب علم جنہوں نے دین کو لوگوں تک پہنچایا۔اگر وہی عادل [اور مسلمان] نہ ہوں تو دین کی نعمت اور کمال تم ختم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ امت میں ایسے محدثین پیدا ہوتے رہے جنہوں نے روافض کے مکروہ چہرہ سے پردہ اٹھایا اور اہل سنت کو یہ بتایا کہ اس دور میں ان کی سب سے بڑی دشمن جماعت روافض کی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''منہاج السنۃ النبویہ'' وہ عظیم الشان کتاب ہے جس میں آپ نے روافض کے من گھڑت اور بودے اور ضعیف دلائل کی خوب خوب خبر لی ہے۔یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں۔اور اگر کوئی رافضی تعصب کی عینک اتار کر پڑھے تو ان شاء اللہ سچا مسلمان ہو جائے۔منہاج السنہ کا ترجمہ بردار عزیز پیرزادہ سید شفیق الرحمٰن شاہ کشمیری مکی مدنی نے کیا ہے۔عام حضرات کے لیے یہ سید شفیق الرحمان شاہ کی طرف سے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔اللہ تعالیٰ مترجم کو مزید بخشے کہ شیخ الاسلام کی دیگر کتابوں کا ترجمہ کرکے عام حضرات تک شیخ الاسلام کے علوم پہنچائیں۔مترجم نے جب مجھے یہ مسودہ دیا تو اتنی ضخیم کتاب کو دیکھ کر میں گھبرا گیا کہ مجھ جیسا طالب علم اس کا کیا مراجعہ کرے گا۔اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جب منہاج السنہ کی جلد دوم شروع کی تو جوں جوں پڑھتا گیا' شوق بڑھتا گیا۔خاص طور پر جو حواشی مترجم نے لکھے' انتہائی خوبصورت اور مدلل ہیں۔اور بالخصوص احادیث کی تخریج اور ان کے صحیح یا ضعیف ہونے کے بیان کا اہتمام کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ مترجم کی کوشش کو قبول فرمائے۔ بیت اللہ میں بیٹھ کر اور دن رات ایک کرکے منہاج السنہ کو دیکھا۔بلکہ جب دن اور وقت کی کمی محسوس ہوئی تو جمعرات کی رات اور جمعہ کے دن کو بھی بیت اللہ میں بیٹھا اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ادھر جمعہ کی اذان میں نعرہ توحید بلند ہو رہا تھا ادھر منہاج کے آخری صفحات تھے۔دل سے دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ عقیدہ اور صحابہ کے دفاع میں مترجم کی یہ محنت قبول فرمائے' اور اس محبت کو ان کی آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دے؛ آمین۔

کتبہ

سید طیب الرحمٰن زیدی [حال وارد بیت اللہ' مکہ مکرمہ]

عرض مترجم

إنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِيْنُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ. أَمَّا بَعْدُ:

قارئین کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وبعد!

حق و باطل کی کشمکش کا سلسلہ روز ازل سے جاری ہے۔ اور جب تک اللہ چاہے گا جاری رہے گا۔ اور لوگ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہیں گے۔ مگر اس اختلاف کے بھی کچھ اصول و آداب ہوتے ہیں جن کی روشنی میں آپس میں بحث و مباحثہ اور گفت و شنید مناظرہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے بھی ہمیں یہی تعلیم دی ہے کہ کسی قوم کی مخالفت ہمیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ ہم عدل و انصاف کے دامن کو بھی چھوڑ دیں۔ عدل و انصاف سب سے اہم ترین چیز ہے۔ اسی پر زمین و آسمان قائم ہیں۔

یہ وہ راہ ہدایت ہے جس کو محمد عربی ﷺ اور آپ کے جانثاروں نے ایسے قائم کیا کہ آج تک دنیا کے کافر اور مسلمان اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے اپنے نبی کریم ﷺ کو مبعوث کیا تھا وہ پورا ہو چکا؛ اور دین اسلام کی نعمت مکمل ہو چکی اور دین اسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیل گیا۔

دین اسلام تیرہ سالہ مظلومیت کی زندگی گزارنے کے بعد جب ہجرت کے بعد ایک دوسرے مرحلہ میں داخل ہوا تو اسلام کی تیز رفتار اشاعت سے متاثر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن یہود و نصاریٰ اور مجوس نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے ہر طرح کی کوششیں بروئے کار لائیں۔ ایک طرف پیغمبر ﷺ پر قاتلانہ حملوں کے لیے منصوبہ بندیاں کی گئیں تو اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں۔ جب کام نہ بنا تو رسول اللہ ﷺ کو خیبر کے موقع پر زہر دیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی اپنے پیغمبر کو محفوظ رکھا تو ایک اور چال چلی گئی کہ: رسول اللہ ﷺ پر انتہائی سخت جادو کروائے گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس چال کو بھی ناکام کر دیا تو اب یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ دین اسلام کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے اور سازشیں کرنے کے درپے ہو گئے۔

چنانچہ ان سازشوں کے نتیجہ میں خلیفہ برحق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا؛ مگر یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ یہودیوں نے ایک بار پھر کمر کس لی اور ایک منظم سازش کے تحت اپنے کچھ چالاک اور مکار لوگوں کو تیار کر کے بھیجا جنہوں نے اسلام کا اظہار کرتے ہوئے لوگوں کو اسلام اور اہل اسلام کے متعلق شکوک و شبہات اور بدگمانیوں کا شکار کرنا شروع کیا۔ تاکہ مسلمان آپس میں اختلاف میں پڑ جائیں۔ چنانچہ اس سازش کے نتیجہ میں امام راشد اور خلیفہ برحق حضرت

عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو انتہائی مظلومیت کی حالت میں قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کردیا گیا۔ اور دشمنوں کو اس کے بعد کھل کر مسلمانوں میں نفرتیں پیدا کرنے کا موقع مل گیا؛ نئے نئے عقائد سامنے آئے ۔ اختلاف پیدا ہوئے۔ اور وہ تلوار جو کفار کے سروں پر آویزاں تھیں وہی مسلمانوں کی گردنوں پر لٹکنے لگی۔

اس ساری صورتحال میں جن فرقوں کے ظہور ہوا؛ ان میں نواصب؛ خوارج 'اور روافض سر فہرست ہیں ۔ اہل سنت والجماعت اللہ کی توفیق سے ہر دور میں کتاب وسنت کی راہ پر قائم رہے۔

بہر حال؛ اہل قبلہ میں جتنے بھی فرقے ظاہر ہوئے ان میں سب سے بُرا اور خطرناک فرقہ روافض کا تھا۔ یہ لوگ لوگوں کو دین اسلام اور اہل اسلام سے متنفر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ علمی وعقلی لحاظ سے یہ لوگ تمام فرقوں میں سب سے بڑھ کر جاہل؛ دین وعلم سے کورے؛ سب سے بڑے جھوٹے اور بہتان تراش نکلے۔

ان لوگوں نے محبت اہل بیت کے پردہ کے پیچھے رہ کر مجوسی تہذیب و مذہب کا پرچار کرنا شروع کیا۔ ان کی وجہ سے اسلام میں جو افتراق پیدا ہوا وہ سب سے بُرا افتراق تھا۔ ان لوگوں نے اسلام کے صف اولین کے لوگوں پر زبان طعن دراز کرنا شروع کی ۔ اور لوگوں کو صحابہ کرام سے متنفر کرنا چاہا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ان سے جو کچھ ہوسکتا تھا کر گزرے۔

مشہور شیعہ عالم حسن بن یوسف بن علی بن المطهر الحلی (۶۴۸۔۷۲۶ھ) نے جو نصیر الدین طوسی (۵۹۷۔۶۷۲ھ) کا خصوصی شاگرد تھا؛ ''منهاج الكرامة في معرفة الامامة" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ یہ کتاب اہل سنت و شیعہ کے مابین متنازع مسائل؛ مباحث سے لبریز اور من گھڑت وموضوع روایات کا پلندہ تھی۔ اور اس میں سابقین اولین صحابہ کو جی بھر کر گالیاں دی گئی تھیں۔

امت مسلمہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) کے عظیم احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی کہ انہوں نے کتاب مذکور کے جواب میں" منهاج الاعتدال في نقض كلام اهل الرفض والاعتزال " کے نام سے ایک كبير الحجم کتاب لکھی جو لوگوں میں ''منہاج السنۃ'' کے نام سے مشہور ہوئی، یہ کتاب ۱۳۲۱ھ میں مطبع بولاق سے "منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة والقدرية" کے نام سے چار جلدوں میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کا موضوع اہل سنت وشیعہ کے باہمی متنازع مسائل ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، شیعہ مصنف ابن المطہر کی کتاب سے عبارت نقل کر کے اس کا رد کرتے ہیں۔ فریقین کے دلائل کی موجودگی میں ایک با انصاف اور سلیم العقل انسان کے لیے فیصلہ صادر کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ شیعہ مصنف کی پیش کردہ احادیث جھوٹ کا پلندہ ہیں، اور وہ اکثر جھوٹی روایات سے احتجاج کرنے کا خوگر ہے۔

اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ احادیث صحیحہ وضعیفہ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں اور یا یہ کہ روافض کا مایہ استناد اسی قسم کی احادیث ہیں۔

موجودہ دور میں جب ایرانی انقلاب کے بعد رافضیت نے ہر طرف پر و پرزے نکالنے شروع کر دیے؛ اور لوگوں کو دین اسلام کے متعلق بدگمانی میں مبتلا کرنا شروع کر دیا؛ اور خود کو مسلمان ظاہر کر کے اہل اسلام کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈالنے لگے تو ان حالات میں ضروری ہوگیا تھا کہ کوئی ایسی مستند کتاب ترجمہ کر کے لوگوں تک پہنچائی جائے جس سے لوگوں پر رافضیت کی

حقیقت کا پردہ چاک ہو جائے' اور لوگ ان کی مکاریوں اور ریشہ دوانیوں سے آگاہ ہوسکیں۔ اس مقصد کے لیے میری نظر انتخاب میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''منہاج السنہ'' سے بہتر کوئی دوسری کتاب نہیں تھی۔ یہ کتاب سات سو سال سے رافضیت کے لیے گلے کی ہڈی بنی ہوئی ہے۔ اس کا معقول اور علمی جواب آج تک نہیں دیا جاسکا۔

میں نے بڑے بڑے علمائے کرام حفظہم اللہ سے سنا ہے وہ اس کتاب کے متعلق فرمایا کرتے ہیں:

''نیلے آسمان کے نیچے اور فرشِ زمین کے اوپر ردِ رافضیت پر اس سے بہترین کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔''

اور یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ:

''اگر انسان یورپ سے چین کا سفر کرے اور چین میں اسے منہاج السنہ مل جائے تو اس کا سفر ٹھیک اور کامیاب ہو گیا۔''

پس اسی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کا انتخاب کیا گیا۔

علمی کام:

❀ جہاں تک ترجمانی کا تعلق ہے میری یہ مخلصانہ کوشش رہی کہ مصنف کا مطلب آسان سے آسان الفاظ میں واضح کردوں ۔ اس بات کا افسوس ہے کہ کتاب کا ابتدائی حصہ علم کلام کے انتہائی دقیق اور گہرے علمی مباحث پر مشتمل ہے اور میں انتہائی جہد وسعی کے باوجود بھی اسے عام قارئین کے لیے قابل فہم نہ بنا سکا کتاب کے کسی حصہ کو حذف کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے عام قارئین سے صرف معذرت ہی کرسکتا ہوں۔ میں کسی درجہ میں بھی اپنی ترجمانی کو حرف آخر تصور نہیں کرتا، مجھے اپنی علمی بے بضاعتی اور کم سوادی کا پورا پورا احساس ہے، میں بارگاہ ربانی میں دعا گو ہوں، کہ جس اجر وثواب کی امید پر میں نے یہ خدمت انجام دی ہے اسے میرے لیے مقدر فرمائے۔

❀ ترجمہ کرتے ہوئے میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ جہاں کہیں کوئی مشکل عبارت یا توضیح طلب جملہ آجائے تو میں نے بین القوسین [ ] اس کی وضاحت وشرح کردی ہے۔ چنانچہ اس پوری کتاب میں آپ کو عبارت میں یا سرخی میں ان دو قوسین [ ] کے مابین عبارت ملے؛ اس کا تعلق شیخ الاسلام سے نہیں مترجم سے ہے۔

❀ اس کتاب میں ایسے تھا کہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ ابن مطہر رافضی پر رد کرتے ہوئے پہلے اس کی عبارت نقل کرتے پھر اس پر رد کرتے۔ میں نے دونوں عبارتوں کو جدا کرنے کے لیے رافضی کی عبارت سے قبل [اشکال]؛ [الزام]؛ [اعتراض] اور [کج فہمی] کی عبارت ہے۔ اور پھر شیخ الاسلام کی عبارت سے قبل [جواب] لکھا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اس کا خط اور سائز باقی عبارت سے بھی جدا رکھا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

❀ کتاب کے حاشیہ پر جابجا اہم ترین اور ضروری نوٹ لگادیے ہیں جن سے کتاب کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔

❀ میں نے عصر حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے رموز اوقاف کا خوب استعمال کیا ہے۔

❀ تخریج حدیث کے ساتھ ساتھ دیگر حوالہ جات بھی دیے گئے ہیں۔

❀ کتاب کا حجم کم رکھنے کے لیے کبھی کبھار حوالہ حواشی کے بجائے کتابی سطور میں ہی دیدیا ہے۔

میں بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہوں کے اس ناچیز کی خدمت کو میرے لیے، میرے والدین؛ اساتذہ، مصنف، طابع و ناشر

کاتب اور قاری سب کے لیے اخروی فلاح ونجات کا سبب بنائے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ان لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا دے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھتے ہیں اور سنت اور اہل سنت والجماعت سے نفرت وعداوت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص کے ساتھ اپنے دین کی دعوت کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے؛ آمین یا رب العالمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار مترجم

آغا سید دلدار حشر حسرت آل امام

فاضل اسلامی یونیورسٹی مدینہ طیبہ

حال وارد

حرم مکی شریف؛ مکہ مکرمہ دسمبر (۲۰۱۲)

❁❁❁❁

مقدمہ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾

''مسلمانو! اللہ واسطے انصاف کیساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور لوگوں کی دشمنی تم سے بے انصافی نہ کرائے انصاف کرو انصاف ہی پرہیزگاری کے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔''

یہ حقیقت ہے کہ انسانی تاریخ کے طویل وقفہ کے بعد دین اسلام کا ظہور و انتشار تاریخ کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ دین اسلام کا مقصد وحید اقامت حق وصواب ہے، خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے؛ اتفاق ہو یا اختلاف معاملات ہوں یا احکام، علمی مباحث ہوں یا تنظیمی امور؛ یا انسانی بہبود کے سلسلہ میں تعاون و اشتراک ان جملہ امور میں حق و انصاف کی جو شعاع نظر آئے گی وہ شمع اسلام ہی کی ضیاء پاشیوں کا نتیجہ ہوگی۔ تاریخ ادیان میں دین اسلام کی عظمت وشرافت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے دین حق کے لقب سے نوازا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ﴾ [التوبہ:۳۳]

''وہ ہستی جس نے اپنے رسولوں کو ہدایت اور دین حق دیکر مبعوث فرمایا۔''

دین اسلام مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ جادہ عدل و انصاف پر قائم رہیں، اپنے علم کی حد تک انصاف کیساتھ شہادت دیں اور نہ صرف دارالاسلام بلکہ جملہ اطراف ارضی میں عدل و انصاف کا بول بالا کریں اور اس کے لیے مصروف جہد وسعی رہیں اور اس میں کدو کاوش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ اگر چہ قیام عدل و انصاف سے بذات خود انہیں یا ان کے آباء و ابناء کو نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ حق وعدل کا قیام و بقاء اور شہادت حق اسلام کی اساس اولیں اور اس کا امتیازی شعار ہے۔ بنا بریں اہل اسلام پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ خوش دلی سے طہارت فکر ونظر؛ رضائے الٰہی اور مخلوقات الٰہی کے سکون و اطمینان کے پیش نظر عدل و انصاف میں ممتاز ہوں۔ نظام اسلام میں عدل کا شمار تقویٰ کے امور میں ہوتا ہے۔ اور تقویٰ وہ بہترین وصف ہے جو مسلمانوں کے مابین معیار عزت وشرف ہے۔ ذات باری تعالیٰ بخوبی آگاہ ہے کہ کون تقویٰ سے بہرہ ور ہے اور کون اس سے تہی دامن ہے؛ اس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں۔

دین اسلام کی یہی وہ حسین و جمیل صورت تھی جس کیلئے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تیار کیا اور انہیں اس قابل بنایا کہ بنی نوع انسان کو دعوت دینے میں آپ کے جانشین قرار پائیں۔ چنانچہ آقائے دو جہاں ﷺ نے مسجد نبوی سے متصل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دار فانی کو خیر باد کہہ کر جب ''الرفیق الاعلیٰ'' سے ملاقات کی تو آپ بے حد مسرور و مطمئن تھے۔ آپ کے برگزیدہ و منتخب صحابہ تحفظ دین کے لیے سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ یہ اصحاب کرام خلیفہ رسول

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں اپنے نفوس و قلوب کو اللہ کی طاعت و عبادت میں جھکائے رکھتے۔ یاد رہے یہ وہی ابوبکر ہیں جن کی شان میں، نیز ان کے محب مخلص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق، ان کے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے:

((أَلَا خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ .)) [1]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے بہترین فرد ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے فوراً بعد صحابہ کرام نے جزیرہ عرب میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی اور جہاد کے لیے اسی طرح صف آرا ہوئے جیسے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں نماز کے لیے صفیں باندھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوجیں رسالت محمدی کی امانت اٹھائے عازم عراق و شام ہوئیں اور قریبی اقوام تک پہنچ کر دم لیا۔ ان کے مخلصانہ جہاد کا نتیجہ یہ تھا کہ تائید ربانی نے ان کا ساتھ دیا اور جن علاقوں میں خلیفہ اول کے سپہ سالاروں کے جھنڈے لہرا رہے تھے، وہاں '' حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ '' کی صدائیں گونجنے لگیں۔ عہد صدیقی کے نامور سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ، خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم اجمعین تھے۔ جن قوموں سے بھی ان کا واسطہ پڑا، یہ ان کے حق میں اسلام کے معلم و داعی اور اللہ و رسول کے پیام رساں ثابت ہوئے۔ ان کی مخلصانہ دعوت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دیار و امصار میں ان کی خوب پذیرائی ہوئی، شہروں کے دروازے ان کے لیے کھل گئے اور وہاں کے رہنے والوں نے ان کی تعلیمات و ارشادات پر لبیک کہا۔ وادیٔ دجلہ و فرات اور دیار شام میں جب اللہ کی نصرت و تائید سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہر طرح مسرور و مطمئن ہو گئے تو رب ذوالجلال نے انہیں عالم آخرت میں صحبت نبوی کے لیے پسند فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی معیت بخشی جیسا کہ دنیا میں وہ اس سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کے بعد کشتیٔ اسلام کے ناخدا قرار پائے اور جیسا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد امت محمدی کے افضل ترین فرد تھے۔ [2]

کاروانِ اسلام اللہ کی نصرت و حفاظت میں رواں دواں رہا۔ چنانچہ دعوت محمدی کی علم بردار فوجیں ایک طرف سے وادیٔ نیل اور وہاں سے شمالی افریقہ تک جا پہنچیں اور دوسری جانب ایران کی آخری سرحد تک پہنچ کر دم لیا۔ جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے یہود و مجوس کی دسیسہ کاریوں سے جام شہادت نوش فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دو قدیم رفقا کی رفاقت آسان کر دی تو مسلمانوں نے خلافت کیلئے ایک پاکیزہ خصال، رحم دل، حافظِ قرآن، سخی اور حوادث روزگار پر صبر کرنے والی شخصیت کو پسند کیا...... وہ تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں سے (یکے بعد دیگرے) عقد نکاح باندھا اور اگر آپ کی تیسری بیٹی ہوتی تو بھی آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دوسروں پر ترجیح دیتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چیدہ و برگزیدہ اصحاب کے مخلص بھائی اور ان کے بیٹوں کے شفیق باپ تھے۔ تابعین کبار میں سے حسن بصری اور ان کے معاصر ابن سیرین کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں امت ہر طرح خوشحال تھی اور ہر طرف امارت و

---

[1] سنن ابن ماجه ـ المقدمة ـ باب فضل عمر بن الخطاب رضی الله عنه (حدیث:۱۰۶)

[2] مسند احمد (۱/ ۱۰۶) من عدة طرق۔

ثروت کا دور دورہ تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بہادر مجاہدین نے اسلامی جھنڈوں کو سرزمین قفقاز میں جا لہرایا جب کہ کسریٰ کے سپہ سالار وہاں پہنچنے کی امید بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بہر کیف مشرقی اور مغربی اقوام نے صحابہ کی سیرت و کردار ان کے عدل و انصاف رفق و تدبّر اور راہ حق پر استقامت و استقلال سے اسلام کا سبق سیکھا اور اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک کی تصدیق ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے:

((خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ))

''سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر وہ لوگ جو انکے قریب ہیں (تابعین) پھر وہ جو ان کے قریب ہیں (تبع تابعین)۔''

امام ربّانی احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں یہ حدیث بروایت عبیدہ سلمانی قاضی کوفہ انھوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔[1] امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کی کتاب نمبر ۶۲ باب اول میں یہ روایت حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے۔[2] عمران فتح مکہ کے دن عسکر نبوی میں قبیلہ خزاعہ کے علمبردار تھے۔[3]

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی ہے۔[4]

مذکورہ بالا حدیث نبوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ایک ہے۔ اسلام کو جو عزت و عظمت اور استقامت دور صحابہ ،تابعین و تبع تابعین میں حاصل ہوئی آئندہ ادوار میں نصیب نہ ہو سکی۔ اموی خلافت پر اس مبارک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ بنو عباس کے وہ اوّلین خلفاء جنھوں نے اموی ماحول میں تربیت پائی تھی اسی عہد میں شامل ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ائمہ اسلام کا اتفاق ہے کہ تبع تابعین میں سے آخری شخص جس کا قول مقبول ہے وہ ہے جو ۲۲۰ھ تک بقید حیات رہا۔ اس کے بعد بدعات کا دور دورہ ہوا اور حالات بڑی حد تک بدل گئے''[5]

اس مبارک زمانہ کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ''خیر القرون'' سے تعبیر فرمایا تھا۔ جو آپ کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ یہ اسلام کا زرّیں دور تھا۔ دین اسلام نے اس سے بڑھ کر نہ کبھی خیر و برکت کا مشاہدہ کیا نہ اہل اسلام نے اس سے بڑھ کر کبھی عزّ و شرف حاصل کیا نہ اس دور سے بہتر کبھی جہاد خالص دیکھا گیا نہ کرۂ ارضی کے دور افتادہ گوشوں تک کبھی دعوت اسلام اس وسعت کے ساتھ پہنچی ،اسی عصر و عہد میں حفاظ قرآن نے اکناف ارضی تک پہنچ کر لوگوں کو قرآن سے روشناس کرایا۔ نوجوان تابعین مختلف دیار و امصار میں پہنچ کر وہاں کے رہنے والے صحابہ سے حدیث نبوی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مبادا کہ صحابی کی موت سے وہ احادیث بھی ناپید ہو جائیں جو ان کے سینہ میں محفوظ ہیں۔ پھر تبع تابعین کا زمانہ آیا۔ وہ ہر ایسے خطۂ ارضی میں پہنچے جہاں کبار تابعین اقامت گزین تھے۔ اور ان سے وہ امانت حاصل کی جو انھوں نے صحابہ کرام سے سن کر یاد کر رکھی تھی۔ علیٰ ھذا القیاس سنت نبوی کی یہ امانت ان لوگوں تک پہنچی جنھوں نے اس کی جمع و تدوین کا بیڑا اٹھایا۔ مثلاً امام مالک رحمہ اللہ،

---

[1] مسند احمد (۱/ ۳۷۸، ح:۳۵۸۳) ، صحیح بخاری۔ کتاب الشھادات۔ باب لا یشھد علی شھادۃ جور اذا اشھد (ح:۲۶۵۲)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم ،(ح:۲۵۳۳)۔

[2] صحیح بخاری۔ (ح:۲۶۵۱، ۲۶۵۰)، صحیح مسلم (ح: ۲۵۳۵)

[3] الاصابۃ (۵/ ۲۷)۔

[4] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم، (حدیث: ۲۵۳۶)

[5] فتح الباری ج۷ ص ٤۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شیوخ وتلامذہ اور معاصرین، رجال تدوین کے یہاں پہنچتے وقت حدیث نبوی بالکل تروتازہ اورعطر نبوت سے بھر پور تھی ،حدیث نبوی کے امانت دار محافظین نے جوں کی توں یہ امانت دوسرے امانت دار محافظین تک پہنچا دی۔آگے چل کر یہ امانت کتاب اللہ کے بعد مسلمانوں کے لیے نہایت گراں قدر ورثہ قرار پائی ۔

خلاصۂ کلام! صحابہ کے طفیل اللہ تعالیٰ نے حدیث نبوی کا لازوال خزینہ ہمارے لیے محفوظ کرلیا ۔ان کی تلواروں سے ہی دیارو امصار اور بلاد فتح کیے اور ان کی مساعی جمیلہ سے ہی اسلامی دعوت پھلی پھولی ۔اور آج ہمارے لیے یہ عالمِ اسلام منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا جس میں کثرت سے اوطان واقوام موجود ہیں اور ان علوم وعلماء کی بھی کمی نہیں جو اسلام کے اولیں ادوار میں کرۂ ارضی کی زینت اور بے حد ناگزیر سمجھے جاتے تھے ۔زمانہ حال واستقبال میں علماء کی صلاحیت اور رجوع الی اللہ کے باعث اسلام کی شوکت رفتہ پھر لوٹ کر آئے گی ۔اور انہی کی جدوجہد کے بل بوتے پر اسلامی نظام کو حیات نو حاصل ہوگی ۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٌ .

جس طرح امرا اور اہل ثروت کے بیٹے اپنے آباء سے املاک واموال ورثہ میں پاکر دنیا میں عزت ومنصب حاصل کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ برے ساتھی ان کو اس وہم میں مبتلا کردیں کہ ان کی خوشحالی وفارغ البالی کا راز اس مال کو برباد کرنے میں مضمر ہے،اسی طرح ہم نے یہ اسلامی عز ومجد صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم اجمعین سے ورثہ میں پائی ۔

ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسا گراں بہا ورثہ نہیں پایا ۔اسلامی ورثہ میں تقدس وبرکت کے اعتبار سے گراں تر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی وہ خدمت ہے جو آپ نے قرآن کی جمع وتدوین اور اس کو مصاحف میں محفوظ کرنے کے سلسلہ میں انجام دی ۔اگر کرۂ ارضی پر رہنے والے تمام مسلمان اس عظیم احسان وعنایت پر شب وروز ان کے لیے اجر وثواب کی دعائیں مانگیں تو بھی وہ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے ۔اللہ تعالیٰ ہماری جانب سے ان کو اجر عظیم عطا فرمائے ۔(آمین)

اس عظیم میراث میں سے گراں قدر خزانہ ہر صحابی کی وہ توجہ ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اقوال وارشادات، سیرت وکردار اور اوامر ونواہی کے تحفظ کے سلسلہ میں انجام دی ۔صحابہ نے یہ امانت جوں کی توں اپنے بھائیوں، بیٹوں اور تابعین کو سپرد کردی کسی نبی کے اصحاب نے امانت کی سپردگی میں ایسی احتیاط سے کام نہ لیا ہوگا۔اس سے عیاں ہوتا ہے کہ اخلاق وتشریع، اقوام وامم کی تکوین وتخلیق اور مختلف انسانی طبقات واجناس واوطان میں یگانگت پیدا کرنے کے لیے یہ عظیم ترین انسانی وراثت تھی ۔ بنی نوع انسان کی ان خدمات جلیلہ کے پیش نظر صرف وہی شخص صحابہ کی تنقیصِ شان کا مرتکب ہوسکتا ہے جو غیر مسلم ہو اور دوسروں کو دھوکہ دینا چاہتا ہو یا زندیق ہو اور اس کے ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہو۔

صحابہ کرام سے تیسرا ورثہ ہم نے یہ پایا کہ انہوں نے اپنے اسلامی اخلاق واعمال کو اسلام کا نمائندہ بنا کر اقوام عالم کے سامنے پیش کیا، یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کو الفت ومحبت کی نگاہ سے دیکھنے لگے،صحابہ اسلام کا بہترین عملی نمونہ قرار پائے،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کے زمانہ میں روئے ارضی کی بسنے والی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوگئیں ۔

خلفائے راشدین کے زریں عہد کے بعد جن خوش نصیب صحابہ وتابعین رحمہم اللہ نے صحیحین کی جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کردہ روایت [1] کے مصداق خلفاء قریش کے جھنڈے تلے جہاد کیا، وہ بھی اس فضیلت میں برابر کے شریک ہیں ۔

---

[1] البخاری ، کتاب الاحکام(ح:۷۲۲۳)مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب الناس تبع لقریش ، (ح:۱۸۲۱ ، ۱۸۲۲)۔

نبی ﷺ نے قباء میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے جہاد سے متعلق جو خواب دیکھا تھا[1] وہ بھی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے آپ کا دوسرا خواب یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے سے متعلق تھا[2] صحیحین کی حضرت جابرہ بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث میں قریش کے جن عظیم اشخاص کا ذکر پایا جاتا ہے، وہ وہی لوگ تھے جنھوں نے جہاد میں شرکت کی اور اسلامی دعوت کو بلاعظم ایشیا وافریقہ اور یورپ کے دور افتادہ گوشوں تک پہنچا دیا، ہمارے قلوب ان کی سپاس گزاری میں کتنے ہی مشغول رہیں ہماری زبانیں ان کی مجاہدانہ مساعی کی مدح وثنا میں کتنی ہی رطب اللسان ہوں، یہ حقیقت ہے کہ ہم ان کے واجب شکر کا عشر عشیر بھی ادا نہیں کر سکتے۔

اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی عظمت وزرگی اور ان کی جرأت و بسالت کے اثبات میں ہم نے صحیح معلومات پر مبنی جو علمی مقالات لکھے ہیں ان سے صحابہ کی مدح وثنا کا حق کیوں کر ادا کیا جا سکتا ہے، اسی طرح دور حاضر کی تصنیفات سے صحابہ کی مدح گوئی کیوں کر ممکن ہے اگرچہ یہ تصانیف صحابہ کے مناقب وفضائل سے پر ہیں اور ان کتب کا اقصائے ارضی کے نوجوانوں تک پہنچنا ناگزیر ہے۔ان کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے، کہ قاری ان غزوات میں بذات خود شریک ہے، وہ اسلامی فوج کا ایک فرد ہے اور اسلامی جھنڈے تلے کفار کے خلاف نبرد آزما ہے، قاری اس تصور میں کھو جاتا ہے کہ صحابہ وتابعین کے ہاتھوں جو فتوحات حاصل ہوئیں اور اہل اسلام نے ان دنوں جو معرکے سر کئے وہ اپنے جذبات و احساسات اور دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ان میں شامل ہے اور جہاد میں بھرپور حصہ لے رہا ہے۔

منہاج الکرامہ کی علمی حیثیت:

یہی وہ صحابہ وتابعین رحمہم اللہ تھے جن کے بارے میں ''ابن المطہر'' [الحلی] نامی [شیعہ مصنف] ...... نے ''منہاج الکرامۃ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، یہ کتاب گالیوں کا پلندہ ہے، جس میں صحابہ کی مجاہدانہ مساعی کی مذمت کر کے ان کے محاسن کو عیوب ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی ہجو وقدح کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا گیا، اس کی حد یہ ہے کہ اگر اعداء دین مثلاً مجوس، رومی، ترک اور دیالمہ میدان حرب وقتال میں جب وہ صحابہ کے خلاف برسرپیکار تھے اگر ان کے اخلاق واعمال کی تصویرکشی کرنا چاہتے تو اس شرمناک طریق کار سے اجتناب کرتے۔

جب مسلمان ہسپانیہ میں برسراقتدار تھے تو وہاں کے پادری [بوقت مناظرہ] امام ابن حزم رحمہ اللہ کے خلاف شیعہ کے اس قول سے احتجاج کیا کرتے تھے کہ قرآن محرف ہو چکا ہے ان کی تردید میں امام موصوف رحمہ اللہ مجبوراً فرماتے:

((وَاَمَّا قَوْلُهُمْ فِیْ دَعْوَی الرَّوَافِضِ بِتَبْدِیْلِ الْقُرْآنِ فَاِنَّ الرَّوَافِضَ لَیْسُوْا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) (كتاب الفصل :٢/ ٧٨)

''عیسائیوں کا رافضی دعوی کا متعلق یہ کہنا کہ قرآن تبدیل ہو گیا ہے' تو بیشک رافضی مسلمان نہیں ہیں۔''

غالباً پادری کافی کلینی سے بیان کردہ جھوٹی روایات سے احتجاج کیا کرتے تھے، مثلاً کافی کلینی کی مذکورہ ذیل روایات:

کلینی کی کتاب ''الکافی'' کی موضوع روایات:

[1] صحيح بخاري- كتاب الجهاد- باب ما قيل فى قتال روم (حديث: ٢٩٢٤-٢٧٨٩ ، ٦٢٨٣)

[2] صحيح بخاري ، حديث:٢٩٢٤ ، ٢٧٨٩ ، ٦٢٨٣-

۱۔ جابر جعفی سے روایت ہے؛اس نے کہا میں نے ابو جعفر ﷺ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ جھوٹے آدمی کے سوا کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ قرآن کریم اسی طرح جمع کیا گیا ہے جیسے کہ نازل ہوا تھا،حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بعد میں آنے والے ائمہ کے سوا کسی نے قرآن کو نہ یاد کیا اور نہ جمع کیا۔'' (''الکافی'' از کلینی طبع:۸،۱۲۷۸،ص:۵۴)

۲۔ ابوبصیر روایت کرتے ہیں کہ میں ابوعبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا، ہمارے یہاں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا قرآن موجود ہے۔ میں نے عرض کیا مصحف فاطمہ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: وہ تمہارے قرآن سے تین گنا زائد ہے، بخدا اس میں تمہارے قرآن کا ایک لفظ بھی موجود نہیں۔'' (''الکافی'' از کلینی،ص:۵۷)

کلینی کی کتاب ''الکافی'' شیعہ کے یہاں اسی طرح مستند سمجھی جاتی ہے،جس طرح مسلمانوں کے نزدیک کتب حدیث میں صحیح بخاری، حالانکہ وہ ایسی کفریات سے لبریز ہے۔''**ابن المطھر** ''جس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ کتاب تحریر فرمائی ؛شیعہ کی کتاب روضات الجنات میں اسے طرح طرح کے القاب سے نوازا گیا ہے، مثلاً اسے فخر علماء، مرکز دائرہ اسلام، آیۃ اللہ فی العالمین، استاذ الخلائق ، جمال الملۃ والدین وغیرہ القاب سے ملقب کیا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ابن المطہر کی''**منھاج الکرامه** ''اور اس کے معاصر امام ابن تیمیہ ﷺ کی گراں قدر تصنیف'' **منهاج الاعتدال** ''یا''**منهاج السنة** '' کی تسوید وتحریر کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ مسلمانوں کو شیعہ بنایا جائے ،یا شیعہ کو اسلام کی جانب لوٹایا جائے اور اس لیے کہ یہ امر......

این خیال است ومحال ست وجنون

کا مصداق ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مذاہب کے اصول اساسی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں، اور دونوں میں گہرا فرق واختلاف پایا جاتا ہے، چند اصول آنے والے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے:

اہل اسلام وشیعہ میں بنیادی فرق:

اہل اسلام کے نزدیک شارع اور معصوم صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، آپ کے بعد نہ کوئی شارع ہے، نہ معصوم بخلاف ازیں شیعہ بارہ اماموں کو معصوم اور مصدر شریعت قرار دیتے ہیں۔

امام غائب کی خود ساختہ حکایت:

اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ شیعہ کے ائمہ معصومین میں سے گیارہواں امام لا ولد فوت ہوا اور ان کے بھائی جعفر نے اسی اساس پر ان کا ورثہ تقسیم کیا کہ آپ لاولد ہیں۔مزید براں ان کی بیویوں اور لونڈیوں کو عدت وفات اور مدت استبراء گزارنے کے لیے روک رکھا یہاں تک کہ جعفر اور بنی طالب کے نقباء پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ امام حسن عسکری بے اولاد تھے۔

ان تاریخی حقائق کے باوجود شیعہ یہ رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ امام حسن عسکری کا ایک لڑکا تھا اور آج سے گیارہ صدیاں پہلے وہ اپنے والد کے گھر کے تہ خانہ میں چھپ گیا تھا، بقول شیعہ وہ تا حال بقید حیات اور مسلمانوں کا شرعی حاکم ہے، شیعہ کی رائے میں ان کے سوا کرۂ ارضی پر جو مسلمان حاکم ہے وہ ظالم وغاصب ہے اور ناحق مسلمانوں پر حکومت وسلطنت کا دعویٰ کرتا ہے، شیعہ اس سے تجاوز کر کے یہاں تک کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جتنے مسلم حاکم یا امام یا خلیفہ قرار

پائے وہ ظالم و غاصب اور غیر شرعی حاکم تھے، شیعہ کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ان کا بارھواں بن باپ و بن اولاد امام کسی نہ کسی وقت ظہور پذیر ہوگا، اس کے زمانہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر مسلم خلفاء و حکام دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، امام مذکور ان پر حکمرانی کرے گا، اور جس ظلم و غصب کا ارتکاب وہ کر چکے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذلک) اس کی سزا دے گا۔

قرآن کی جمع و تدوین اور صحابہ کرام:

دین اسلام اور شیعہ مذہب کے مابین ایک اساسی فرق اور ہے، اہل اسلام کے ہاتھوں میں جو قرآن صدیوں سے چلا آرہا ہے اس کی جمع و تدوین کا بیڑا ابوبکر، عمر، عثمان اور دیگر اہل علم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے اٹھایا، مزید برآں جن احادیث نبویہ پر تشریع اسلامی کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ بھی صحابہ کی روایت کردہ ہیں، اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان خدمات جلیلہ کے ادا کرنے میں حضرات صحابہ کے رفیق کار تھے، حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ کمال صدق اور استقامت علی الحق کے اعتبار سے وہ ایک مثالی گروہ تھا جس کی نظیر دنیائے انسانیت میں تلاش نہیں کی جا سکتی، چنانچہ آپ کتاب ھذا کی آخری فصل میں اس کی تفصیلات ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہم قبل ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث صحیح بیان کر چکے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

''تمام زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہیں، پھر وہ جو ان کے قریب ہیں۔''[1]

یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن صحابہ سے سیکھا وہ صحابہ ہی تھے جنھوں نے رسول اللہ کی احادیث صحیحہ روایت کیں جن پر بیان شریعت کے ضمن میں ہمارا اعتماد ہے۔ جب مذکورہ حدیث کی روشنی میں صحابہ افضل الامت ہیں۔[2] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے منبر پر فرمایا: ''حضرت ابوبکر و عمر افضل الصحابہ ہیں۔'' اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ کے بارے میں اہل اسلام کا عقیدہ مذکورہ بالا حدیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے عین مطابق ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی حقائق بھی اسکی تائید و تصدیق کرتے ہیں ۔ چونکہ ہم نے علوم کتاب و سنت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ لہٰذا صحابہ کی مدح و تعدیل سے گویا ہمارے اعتماد کتاب و سنت کی تائید ہوتی ہے، البتہ ابن المطہر اور دیگر شیعہ امامیہ...... جن کو امام زید بن علی بن حسین رافضی کہہ کر پکارتے ہیں...... کا زاویہ نگاہ اس ضمن میں ہم سے مختلف ہے چنانچہ اس کی تفصیل [آگے] مناسب موقع پر آئے گی۔

حدیث نبوی اور شیعہ:

جو اصول و قواعد ہمارے اور شیعہ کے مابین وجہ فرق و امتیاز ہیں، ان میں سے ایک بنیادی امر یہ ہے کہ احادیث نبویہ کتاب الٰہی کے بعد تشریع اسلامی کی اساس و معیار ہیں۔ یہ احادیث ان صحابہ کے ذریعہ ہم تک پہنچیں جو حد درجہ عادل و امین اور حافظ و ضابط تھے۔ فن حدیث کے نقادان کی سیرت و کردار اور فنی مہارت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ محدثین نے روایت حدیث میں بے حد احتیاط سے کام لیا۔ جو شخص حد درجہ عبادت گزار اور صلاح و تقویٰ میں یگانہ روزگار ہو، اگر روایت حدیث میں سہل انگاری سے کام لیتا ہو، تو اس کی روایت محدثین کے نزدیک قابل حجت نہیں ہے۔ جو شخص آغاز زندگی میں حافظ و ضابط اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشهادات، باب لا یشهد علی شهادة جور۔ (ح: ۲٦٥١۔ ۲٦٥۲) صحیح مسلم ۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم، (ح:۲٥۳۳، ۲٥۳٥)

[2] مسند احمد(١/ ١٠٦) سنن ابن ماجه۔ المقدمة۔ باب فضل عمر بن الخطاب رضی الله عنه (حدیث:١٠٦)

امانت و عدالت کی صفات سے بہرہ ور ہو پھر بڑا ہو کر نسیان کے عارضہ کا شکار ہو جائے تو اندریں صورت محدثین کے نزدیک اس کی وہ روایات مقبول ہیں جو اس نے حالت صحت میں اس مرض میں مبتلا ہونے سے قبل روایت کیں، مرض میں مبتلا ہونے کے بعد کی روایات پایہ استناد سے ساقط ہیں۔ بخلاف ازیں شیعہ روایت حدیث میں امانت و عدالت اور حفظ و اتقان کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ شیعہ کی معتبر کتب مثلاً ''الکافی'' اور دیگر کتب میں حد درجہ دروغ گو لوگوں کی روایات درج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کے یہاں ثقاہت و صداقت کا معیار یہی ہے کہ راوی کس حد تک شیعہ مذہب کا حامی اہل بیت کا محب اور ان کے اعداء سے کہاں تک بغض و عناد رکھتا ہے۔ ہم قبل ازیں ان کی معتبر کتاب الکافی سے چند روایات نقل کر چکے ہیں جن میں انہوں نے قرآن کی صحت کو مشتبہ قرار دیا ہے۔ بنا بریں اس میں مزید جھگڑے و نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہسپانیہ کے پادریوں نے امام ابن حزم کے خلاف شیعہ کے قول سے احتجاج کرتے ہوئے ثابت کیا کہ قرآن کریم کی موجودہ صورت اصلی نہیں ہے، وہ محرف ہو چکا ہے تو انہوں نے برملا فرمایا: ''اِنَّ الرَّوَافِضَ لَيْسُوْا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ''

''بیشک روافض (شیعہ) مسلمانوں میں سے نہیں ہیں۔''

احمد بن سلیمان تستری رحمہ اللہ مشہور محدث ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

''جب کسی شخص کو اصحاب رسول رضی اللہ عنہم اجمعین کی توہین کرتے دیکھو تو جان لو کہ وہ زندیق ہے، اس لیے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں۔ قرآن حق ہے۔ قرآن اور احادیث نبویہ ہم تک صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے ذریعہ پہنچیں۔ صحابہ کی تنقیص شان سے شیعہ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے گواہوں کو مجروح کر کے کتاب و سنت کو ناکارہ کر دیں۔ حالانکہ زندیق ہونے کی حیثیت سے وہ اس امر کے زیادہ اہل ہیں کہ ان کو مجروح قرار دیا جائے۔''

شیعہ کے نزدیک دین اسلام نجات کے لیے کافی نہیں:

اہل اسلام اور شیعہ کے مابین ایک اور فرق یہ ہے کہ شیعہ کے نزدیک دین اسلام سعادت دنیوی و اخروی کے حصول کے لیے کافی نہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ امت اسلامیہ ائمہ معصومین کی اطاعت کے بغیر قاصر رہے گی اور اس کا استحکام و استقلال اس کے بغیر ممکن نہیں، اہل اسلام کے نزدیک حق کا مقام کہیں اس سے زیادہ بلند ہے کہ اسے اطاعت ائمہ کا محتاج قرار دیا جائے، مزید برآں یہ احترام مومن کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل فرمائی، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے تمہارے لیے پسند کر لیا۔'' (المائدۃ: ۳)

خلاصہ کلام! دین اسلام قرآن کریم اور صحیح احادیث نبویہ کی موجودگی میں وہ مرشد وحید اور ہادی کامل ہے جس کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت مسلمہ کو کسی امام معصوم کی ضرورت نہیں۔ اس امت راشدہ میں اسی کا نام سنت ہے۔ اسی بنا پر تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کو اہل السنۃ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ اس کے عین برعکس امت مسلمہ کو ناقص قرار دینے والے جن کا دعویٰ ہے کہ ائمہ معصومین کی اطاعت کے بغیر اسلام انسانی فلاح و نجات کے لیے کافی نہیں۔

تاریخ میں امامیہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ائمہ شیعہ میں سے امامت نافذہ صرف ایک ہی امام (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے حصہ میں آئی۔ وہ بھی اپنے خطبات و رسائل میں شیعہ کے گلہ گزار رہے اور ہمیشہ ان سے اظہار بیزاری کرتے رہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قائم مقام (امام حسن رضی اللہ عنہ) نے جو دوسرے امام معصوم تھے۔ '' **عام الجماعۃ** '' والے سال امام المسلمین (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کی بیعت کر لی۔ مگر شیعہ برابر مخالفت کرتے رہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شیعہ ان کے امام معصوم ہونے کے عقیدہ سے منحرف ہو گئے تھے، دوسری وجہ یہ ہے، کہ دانستہ ان کی اطاعت و اتباع سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ جب یہ بے کار قسم کی امامت گیارہویں امام کے لاولد فوت ہونے سے ختم ہوگئی، تو اب کوئی امام باقی نہ رہا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ امامیہ کا اس لقب سے ملقب رہنا محال تھا۔ اب انہوں نے بن باپ اور بے اولاد امام کا عقیدہ گھڑ لیا۔ یہ واقعہ کتاب ہذا میں آئے گا۔ شیعہ عہد ماضی کے فرضی معبودوں کی طرح اسے زندہ تصور کرتے ہیں، اسلام کو امت مسلمہ کے لیے ناکافی قرار دینا اس امر کا واضح اعتراف ہے کہ اسلام ناقص مذہب ہے اور اہل اسلام نجات سے قاصر ہیں۔ ابن المطہر کی کتاب کا موضوع صرف ان اعتراضات کا ازالہ ہے جو اس بیہودہ عقیدہ پر وارد ہوتے ہیں۔ اس کے عین برخلاف شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی تصنیف لطیف میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام دین کامل ہے۔ اہل اسلام مستحق رشد و فلاح ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ائمہ معصومین کی اطاعت سے بے نیاز ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو کامل اور نوع انسانی کی نجات کے لیے کفایت کنندہ قرار دیا ہے، مزید برآں مسلمانوں کے امام دوسرے مسلمانوں کے برابر ہیں، اور انہی کی طرح شرعی احکام و اوامر کے مکلف و مامور ہیں، اہل اسلام پر ائمہ کی اطاعت صرف نیک اعمال کی حد تک ضروری ہے اس لیے کہ خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔

انکار اجماع اور شیعہ:

اہل اسلام اور شیعہ میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ شیعہ دین اسلام کو ایک اجتماعی دین تسلیم نہیں کرتے علاوہ ازیں شیعہ کے یہاں غیر منصوص شرعی احکام میں مسلمانوں کا اجماع حجت نہیں، بخلاف ازیں اہل السنۃ والجماعۃ کے تشریعی نظام میں یہ امر مسلم ہے کہ فقہ و تشریع میں مہارت رکھنے والے علماء کا اجماع اللہ و رسول کے دین میں ایک شرعی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، امام حاکم اور دیگر محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ أُمَّتِيْ عَلَى الضَّلَالَةِ)) ❶

''اللہ تعالیٰ میری امت کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا۔''

حجیت اجماع کے دلائل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ))۔ ''اللہ کی تائید جماعت کے شامل حال ہوتی ہے۔''

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا یہاں تک کہ اس کی طرف لوٹ آئے۔'' ❷

---

❶ سنن ترمذی۔ کتاب الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ (حدیث: ۲۱۶۷)۔

❷ مسند احمد (۴/ ۱۳۰) سنن ترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام، (ح: ۲۸۶۳) بھذا اللفظ، سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ۔ باب فی الخوارج (ح ۴۸۵۸) مختصراً عن ابی ذر رضی اللہ۔

سرور کائنات ﷺ کا فرمان ہے: ((عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ))[1]

''سواد اعظم سے وابستہ رہیے جو الگ ہوا تو اسے تنہا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔''

احادیث نبویہ کے علاوہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ''سبیل المؤمنین'' کو اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ مقرون و متصل قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۱۵]

''جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرتا اور مومنوں کے علاوہ دوسری راہ پر چل دیتا ہے تو جدھر کا رخ کرتا ہے، ہم اسے اسی جانب پھیر دیتے ہیں اور ہم اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔''

صرف نبی ﷺ کی اطاعت سے روگردانی ہی جہنم لے جانے کیلئے کافی تھی تاہم مذکورہ بالا آیت میں مومنوں کی اختیار کردہ راہ کے سوا دوسرے راستوں کی جانب میلان و رجحان کو بھی دخول جہنم کا باعث قرار دیا۔ جس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ ''اللہ اور رسول کی اطاعت اور سبیل المؤمنین'' باہم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (آل عمران ۱۱۰)

''تم بہترین جماعت ہو جسے لوگوں کے فائدہ کیلئے ظاہر کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔''

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان بہ حیثیت مجموعی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ضلالت پر جمع نہ ہوں گے اور صرف ایسی چیز کو واجب یا حرام قرار دیں گے جس کے وجوب و حرمت کا فتویٰ اللہ و رسول نے صادر کیا ہو، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بحیثیت مجموعی حق گوئی سے سکوت اختیار کریں جب کہ وہ شرعاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مکلّف و مامور ہیں، یہ صریح نص قرآنی کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا دلائل اور دیگر لاتعداد براہین و دلائل کی بنا پر مسلمان دین اسلام کو ایک اجتماعی دین قرار دیتے چلے آئے ہیں اور اسی بنا پر ان کو ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے بایں ہمہ شیعہ اجماع امت کو تسلیم نہیں کرتے، امت مسلمہ ان کی نگاہ میں ایک منتشر جماعت ہے جس میں کوئی شیرازہ بندی نہیں، اور اس کے قیام و بگاڑ کے لیے نبی کے سوا کسی غیر معصوم امام کا وجود از بس ناگزیر ہے۔

شیعہ کا قبلہ و کعبہ:

ہمارے اور شیعہ کے مابین آخری نقطہ فرق و اختلاف یہ ہے کہ مسلمان جب عبادت بجالانے کے لیے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتے یا دعا کرتے وقت اس کے حضور عجز و نیاز کرتے ہیں تو صرف ایک ہی کعبہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، مگر شیعہ خانہ کعبہ کے ساتھ دوسرے کعبہ جات کو بھی شریک کرتے ہیں۔ شیعہ کا ایک کعبہ مغیرہ بن شعبہ کی قبر ہے جو نجف کے مقام میں واقع ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ میں شہادت پائی اور وہیں مسجد کوفہ اور قصر کے مابین مدفون ہوئے۔

[1] سنن ابن ماجة۔ کتاب الفتن، باب السواد الاعظم (حدیث: ۳۹۵۰) مختصراً و سنده ضعیف جداً اس کی سند میں معان بن رفاعۃ، لین الحدیث اور ابوخلف الاعمٰی متروک راوی ہے۔ مستدرك حاکم (۱/ ۱۱۵) من طریق آخر و سنده ضعیف ایضاً۔

عرصہ دراز کے بعد شیعہ نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بمقام نجف مغیرہ کی قبر میں مدفون ہیں۔ شیعہ نے اس قبر کو کعبہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اسکا اصلی اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو وہاں جا کر بچشم خود شیعہ کی حرکات کا ملاحظہ کرے، شیعہ کا دوسرا کعبہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی من گھڑت قبر ہے، جو بقول شیعہ کربلا میں واقع ہے۔ ملاحظہ کریں ایک شیعہ شاعر وہ کہتا ہے:

هي الطفوف فطف سبعا بمغناها فمالمكة معنى مثل معانيها

ارض ولكنما السبع الشداد لها دانت وطاطا اعلاها لادناها

''یہ ارض کربلا ہے یہاں سات مرتبہ طواف کیجئے

جو مقام اسے حاصل ہے وہ مکہ کو کہاں نصیب!

اگرچہ یہ زمین ہے مگر ساتوں آسمان اس کے تابع ہیں،

اور عرش عظیم بھی اس کے سامنے جھکتا ہے۔''

اب بتایئے اس کفر صریح کو سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک سے کیا نسبت جو آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدًا)) ❶

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''

نیز فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدًا)) ❷

''اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے، اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہوا جنہوں نے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو ہیاج حیان بن حصین اسدی کو فرمایا: کیا میں آپ کو اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا، اور وہ یہ ہے کہ کسی تصویر کو مٹائے بغیر نہ چھوڑیئے اور جو بلند قبر دیکھو، اسے زمین کے برابر کردو۔

اگر شیعہ امت محمدیہ میں شامل ہیں تو خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صحیح ترین حدیث ان کے لیے کافی ہے اور اگر وہ ائمہ معصومین کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں تو یہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل جو وہ رسول اللہ کی اطاعت میں بجالاتے اور اس کام کے لیے دوسرے اشخاص و رجال کو بھیجا کرتے تھے! اور اگر قبور انبیاء کے ساتھ ان کا رویہ یہود و نصاریٰ ہونے کی حیثیت سے ہے تو ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔

---

❶ صحیح بخاری کتاب الصلاۃ باب (٥٥)، حدیث: ٤٣٥، ٤٣٦، ١٣٣٠)، صحیح مسلم۔ کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المسجد علی القبور، (حدیث: ٥٢٩۔ ٥٣١)۔

❷ موطا امام مالك (١/ ١٧٢) کتاب قصر الصلاۃ فی السفر، ح: ٨٥، تعليقاً مسند احمد (٢/ ٢٤٦) عن ابی هريرة رضی الله عنه موصولاً وانظر مسند البزار (٤٤٠)۔

اس کتاب کی طباعت کے لیے میں نے اس کے بعض مقامات پر حواشی لکھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ حواشی اہم مطالب کے فہم وادراک میں قاری کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ اور وہ آسانی سے کتاب کا مطلب سمجھ سکے گا، حاشیہ نویسی کا محرک یہ امر تھا کہ دور حاضر میں شیعہ نے کتب و رسائل کی اشاعت کے ذریعہ اہل السنۃ کے برخلاف اس قدر بھرپور حملے کیے کہ ان پر خاموش رہنا حق وصداقت کی رسوائی ہے، چنانچہ میں بتوفیق ایزدمتعال صداقت اسلامی کے تحفظ ودفاع کے لیے گوشہ عافیت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور یہ مباحث قلمبند کیے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهُ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاَصْحٰبِ مُحَمَّدٍ وَّاَزْوَاجِ مُحَمَّدٍ وَذُرِّيَّةِ مُحَمَّدٍ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا وَسُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

آپ کا دینی بھائی
آغا مستنصر باللہ
مکہ مکرمہ/ ملاوی

❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَبِهٖ نَسْتَعِيْنُ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الْمُنْقِذِ مِنَ الضَّلَالِ الْمُرْشِدِ اِلَى الْحَقِّ ، اَلْهَادِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

علامہ زماں، فاضل دوراں' امام' عالم شیخ الاجل؛ حافظ فقیہ' امام ربانی شیخ الاسلام ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن ابی القاسم بن تیمیہ الحرانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''تمام تر تعریفیں اللہ عزوجل کے لیے ہیں جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کو خوشخبریاں دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر مبعوث فرمایا' اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں تا کہ وہ لوگوں کے مابین ان کے اختلافی مسائل میں کتب الٰہیہ کی روشنی میں فیصلے کرسکیں ۔ اور لوگوں کے درمیان اختلاف تو اسی وقت واقع ہوا جب ان کے پاس کھلی ہوئی کتابیں اور روشن دلائل آچکے تھے ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان میں سے جس کو چاہا حق کی طرف ہدایت دی' اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت نصیب کرتے ہیں ۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک اکیلا معبود برحق ہے' اس کا کوئی شریک نہیں ہے ۔ جیسا کہ اس کا فرمان ہے:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

''اللہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے بھی (گواہ ہیں) وہی قائم رکھنے والا ہے عدل و انصاف کو؛ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں وہ زبردست ہے حکمت والا۔''

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے وہ سچے رسول ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا؛ اور آپ کے ذریعہ سے اپنے اولیاء کو ہدایت نصیب فرمائی ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن کو تمہارے نقصان کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہارے فائدے کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں؛ ایمانداروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں ۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ بڑے عرش کا مالک ہے ۔'' اس کے بعد:

''میرے سامنے ایک معاصر شیعہ ''ابن المطہر'' [1] کی کتاب پیش کی گئی ۔ یہ کتاب اس نے شیعہ امامیہ کے مذہب کی

[1] ابن المطہر کا پورا نام حسن بن یوسف بن علی ابن المطہر المتوفی (۶۴۸ ـ ۷۲۶) ہے، یہ نصیر الدین طوسی المتوفی (۵۹۷ ـ ۶۷۲) [جاری ہے ....]

ترویج و اشاعت کے لیے تحریر کی تھی۔ جس میں اس نے ان لوگوں کو رافضی مذہب کی دعوت پیش کی ہے جن حکمرانوں اور اہل جاہلیت وغیرہ تک اس کی پہنچ ہو سکی ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں علم اور دین کی بہت ہی کم معرفت ہوتی ہے ۔ اور انہیں مسلمانوں کے اصل دین کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور اس پر مستزاد کہ وہ لوگ بھی اس کے مددگار بنے جن کی عادت رافضیوں کی مدد کرنا ہے۔ میری مراد وہ باطنیہ اور ملحد ہیں جو بظاہر اسلام کا اظہار تو کرتے ہیں مگر اپنے دلوں صابئیت' مجوسیت اور الحاد کو چھپائے ہوئے ہیں ۔ یا پھر وہ فلسفی ہیں جو کہ حقیقتِ اسلام اور مرسلین کی اتباع سے کوسوں دور ہیں ۔ جن لوگوں کے نزدیک اسلام کی اتباع واجب نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی اتباع کو حرام سمجھتے ہیں ۔ بلکہ ان کے نزدیک تمام ملتیں اور مذاہب ایک سیاست ہیں جس میں کسی کی بھی اتباع کرنا جائز ہے ۔ اور نبوت بھی ایک قسم کی عادلانہ سیاست ہے جو دنیا میں لوگوں کی مصلحت کے لیے ہے۔ ان لوگوں کی تعداد اس وقت بڑھ جاتی ہے' اور غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جب جہالت اور اہل جاہلیت کی تعداد میں اضافہ ہو جائے ۔ اور اس وقت کوئی ایسا عالم باقی نہ ہو جو علوم نبوت و سنت کا شناسا ہو' اور اس نور نبوت سے کفر اور گمراہی کے اندھیروں کو ختم کر سکے ۔ اور اس میں موجود کفر' شرک اور گمراہی کو طشت از بام کر سکے ۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو مطلق طور پر نبوت کی تکذیب نہیں کرتے ۔ بلکہ اس کے بعض احوال پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں ۔ ان لوگوں کے اس ایمان اور کفر میں مختلف درجات ہیں ۔ اسی وجہ سے نبوت کی تعظیم کا معاملہ بہت سے جاہل لوگوں پر ملتبس [خلط ملط] ہو جاتا ہے ۔ رافضی اور جہمی ان تمام گمراہیوں کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے ایک مین گیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان ہی کے راستہ سے وہ تمام گمراہ لوگ اسلام میں داخل ہوئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی کتاب کی آیات کا انکار کیا۔ جیسا کہ گمراہی کے سرغنوں باطنی قرامطی ملحد اور دوسرے منافقین کے ہاں طے شدہ ہے۔

جو آدمی یہ کتاب میرے پاس لیکر آیا اس کا کہنا تھا کہ جو بادشاہ اور دوسرے لوگ رافضی مذہب کی طرف مائل ہوئے ہیں' اس کا اہم ترین سبب یہ کتاب ہے۔ ابن المطہر نے یہ کتاب ایک مشہور بادشاہ کیلئے تحریر کی جس کا نام اس نے خدا بندہ ذکر کیا ہے۔ [1]

(گزشتہ سے پیوستہ ......) کا شاگرد خاص اور شیعہ کے کبار علماء میں سے ایک ہے، اس کی تربیت ہی صحابہ و تابعین کرام کے بغض و عناد پر ہوئی تھی، جو صحابہ نے کار ہائے نمایاں انجام دیے اور دنیائے انسانیت جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، ابن المطہر اُن کو غضب آلود نگاہ سے دیکھتا ہے، ابن المطہر نے اپنی کتاب کے جو اوراق سیاہ کیے ہیں، ان میں جگہ جگہ اس کی عداوتِ صحابہ کے مظاہر نظر آتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کتاب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے، اور اسے اولین و آخرین کے لیے سامان عبرت بنا دیا ہے۔ ابن المطہر کا پورا نام حسن بن یوسف بن علی ابن المطہر المتوفی (۶۴۸ ۔ ۷۲۶) ہے۔ یہ نصیر الدین طوسی المتوفی (۵۹۷ ۔ ۶۷۲) کا شاگرد خاص اور شیعہ کے کبار علماء میں سے ایک ہے، اس کی تربیت ہی صحابہ و تابعین کرام کے بغض و عناد پر ہوئی تھی، جو صحابہ نے کار ہائے نمایاں انجام دیے اور دنیائے انسانیت جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، ابن المطہر اُن کو غضب آلود نگاہ سے دیکھتا ہے، ابن المطہر نے اپنی کتاب کے جو اوراق سیاہ کیے ہیں، ان میں جگہ جگہ اس کی عداوتِ صحابہ کے مظاہر نظر آتے ہیں، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کتاب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے، اور اسے اولین و آخرین کے لیے سامان عبرت بنا دیا ہے۔

[1] خدا بندہ فارسی لفظ ہے عربی میں اس کے معنی ہیں، عبداللہ (اللہ کا بندہ)۔ خدا بندہ ایلخانی بادشاہوں میں سے آٹھواں بادشاہ اور چنگیز کی چھٹی پشت میں سے تھا، اس کا اصلی نام الجایتو (المتوفی ۶۸۰ ۔ ۷۱۶) ہے۔ اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

۱۔ الجایتو بن (۶۸۰ ۔ ۷۱۶)　　۲۔ ارغون ۹۶۰ھ　　۳۔ ابغا غون ۶۸۱ھ

۴۔ ہلاکو غون ۶۶۳ھ　　۵۔ تولی غون ۶۲۸ھ　　۶۔ چنگیز غون (۵۴۹ ۔ ۶۲۴)

چنگیز کا لقب ایلخان تھا، یہ سلطنت اسی کی جانب منسوب ہے، خدا بندہ کا والد ارغون صنم پرست تھا، ارغون کا چچا تکودار بن ہلاکو سیاسی (جاری ہے......)

ان لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اللہ کے بندوں کی نصرت کی خاطر اس کتاب میں موجود گمراہیوں اور باطل دعووں کو طشت از بام کروں ۔ اوران افتراء پردازوں کے جھوٹے اقوال کی قلعی کھول کر رکھ دوں ۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس کتاب کے بارے میں خواہ ان کے دعوے کیسے بھی کیوں نہ ہوں ؛ مگر خود یہ لوگ سب سے بڑھ کر گمراہ اور بھٹکے ہوئے ہیں ۔[امامیہ خود جاہل اورعلم دین سے بہت ہی کم واقفیت رکھنے والے ہوتے ہیں] ❶

دلائل کی اقسام: دلائل کی دو ہی قسمیں ہیں:

۱۔ دلائل نقلیہ ۲۔ دلائل عقلیہ

شیعہ لوگ اپنا مذہب بیان کرنے کے لیے عقلی اور نقلی دلائل پیش کرنے میں سب لوگوں سے بڑھ کر گمراہ ہیں ۔ یہ ان لوگوں کے مشابہ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾(الملك ۱۰)

(گزشتہ سے پیوستہ ......) مصلحت کے پیش نظر مسلمان ہو گیا تھا اور اپنا نام احمد نکو دار رکھ لیا تھا۔ ارغون نے خراسان میں اسکے خلاف بغاوت کر کے ۶۸۳ ء میں اسے قتل کر دیا اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ ارغون نے اپنے والد کے وزیر شمس الدین محمدی کے خلاف ۔ بہتان باندھا کہ اس نے زہر دے کر اس کے والد کو ہلاک کر دیا ہے اس جرم میں وزیر اور اس کے چار بیٹوں کو ہلاک کر کے عنان سلطنت اپنے یہودی طبیب سعد اللہ کے سپرد کر دی، اور خود عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگا، جب یہودی طبیب ملک کا نظم ونسق سنبھالنے سے قاصر رہا اور ملک میں بدامنی کا دور دورہ ہوا تو اعمال سلطنت نے اسے تہ تیغ کر دیا چنانچہ ارغون ۶۹۰ ھ میں بڑی بے کسی کی موت مرا، ارغون کے دو بیٹے تھے:

۱۔ الجایتو جسے خدابندہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ۲۔ غازان المتوفی (۶۷۰۔۷۰۳)، چونکہ رعایا مسلمان تھی، لہٰذا یہ دونوں سیاسی مصلحت کے پیش نظر مسلمان ہو گئے ۔ غازان نے اہل سنت کا مذہب اختیار کیا۔ جب ۷۰۳ ھ میں اس کا بھائی خدابندہ اس کا قائم مقام قرار پایا۔ تو اس نے شیعہ مذہب اختیار کیا، اس کے امراء وخواص اکثر شیعہ تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے کہ خدابندہ نے ایک روز اپنی بیوی سے ناراض ہو کر اسے طلاق دے دی پھر جلدی ہی نادم ہو گیا اور اسے گھر میں آباد کرنا چاہا، اہل سنت علماء نے متفقہ فتویٰ دیا کہ دوسرے خاوند سے نکاح کیے بغیر خانہ آبادی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ خدا بندہ کو بڑی مشکل پیش آئی، اس کے شیعہ خواص وامراء نے مشورہ دیا کہ شہر حلّہ کے مشہور شیعہ عالم ابن المطہر کو بلا کر مشورہ کیجئے، وہ اس کا کوئی حل پیش کرے گا۔ ابن المطہر حاضر ہوا تو سلطان نے صورت مسئلہ پیش کر دی۔ ابن المطہر نے پوچھا: کیا آپ نے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق دی تھی؟ سلطان نے کہا: نہیں! ابن المطہر نے کہا: چونکہ طلاق کے شرائط موجود نہیں لہٰذا طلاق واقع نہیں ہوئی ۔ اور سلطان حسب سابق اپنی بیوی کو آباد کر سکتا ہے۔ بادشاہ اس فتویٰ سے بہت خوش ہوا اور ابن المطہر کو اپنا خصوصی مصاحب بنالیا۔ ابن المطہر کے بہکانے سے خدابندہ نے دیار وامصار میں حکم ارسال کیا کہ منبر پر خطبہ دیتے وقت بارہ ائمہ کا نام لیا جائے ۔ ائمہ کے نام سکول اور مساجد کی دیواروں پر کندہ کیے جائیں، ابن المطہر کی حیلہ جوئی نے سلطان کو اس زحمت سے بچالیا کہ اس کی بیوی عقد ثانی کے بعد اس کے یہاں لوٹ کر آتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں شیعہ مذہب نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے، یہ خراسان وایران میں سرکاری طور پر تشیع کی جانب پہلا قدم تھا، کہا جاتا ہے، کہ یہ واقعہ ۷۰۷ ھ میں پیش آیا۔

اس واقعہ کے تین سو سال بعد شیعہ مذہب کی جانب دوسرا قدم اٹھا جس نے سلطنت صفویہ کے قیام سے پورے ایران کو تشیع کے آتشی کنویں میں دھکیل دیا۔ متقدمین شیعہ جن افکار وآراء کو غلو سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور ان کے معتقد کی روایت کو تسلیم نہیں کیا کرتے تھے، سلطنت صفویہ ان کی پشت پناہی کرنے لگی، اور سب شیعہ غالی بن گئے، جو افکار ومعتقدات متقدمین شیعہ کے یہاں غلو تصور کیے جاتے تھے، صفوی دور میں ان کو ضروریات مذہب میں سے سمجھا جانے لگا، چنانچہ شیعہ کے دوسرے بڑے علامہ المامقانی المتوفی (۱۲۹۰، ۱۳۵۱) نے اپنی کتاب تنقیح المقال میں جو جرح وتعدیل میں بے حد اہم کتاب ہے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔

❶ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے سالار انبیاء ﷺ سے جو سنت اخذ کی پھر ان کے ہاتھوں یہ مقدس امانت تابعین کرام تک پہنچی ۔ جو بات بھی اس کے خلاف ہو وہ جاہلیت میں شمار ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی نظامات واحکام کسی زمان میں ہو یا کسی مکان میں ان کی دو ہی قسمیں ہیں:

۱۔ اسلام ۲۔ جاہلیت۔ صحابہ سے جو سنن واحکام ہم نے اخذ کیے وہ اسلام ہیں اور اس کے ماسوا جو کچھ بھی ہے وہ جاہلیت ہے قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کب ایجاد ہوئی یا اس کا گھڑنے والا کون تھا۔

''اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے ہوتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔''

شیعہ نقلی دلائل پیش کرنے میں اکذب الناس ہیں ❶ اور عقلی دلائل کے ذکر و بیان میں اجہل الناس۔ ❷

منقول میں سے ایسی چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں جن کے متعلق علماء اضطراری طور پر جانتے ہیں یہ اباطیل (من گھڑت باتوں) میں سے ہیں۔ اور ایسی روایات کی تکذیب کرتے چلے آئے ہیں جن کے متعلق علماء کرام حتمی طور پر جانتے ہیں کہ یہ روایات امت میں نسل در نسل تواتر کے ساتھ چلی آرہی ہیں۔ شیعہ صاحبان اہل علم کی نقل کردہ روایات اور جھوٹ و باطل؛ غلط اور جہالت پر مبنی خبروں میں معروف؛ من گھڑت خبریں پھیلانے والوں کی مرویات اور عادل حافظ' ضابط اور علم حدیث میں معروف محدثین کی روایات کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ اس بارے میں اصل میں یہ لوگ اپنے اسلاف کے مقلد ہیں۔ خواہ یہ اپنی ان من گھڑت باتوں کو براہین [دلائل] کا نام ہی کیوں نہ دیتے ہیں۔

کبھی تو شیعہ حضرات معتزلہ اور قدریہ کی اتباع کرنے لگ جاتے ہیں' اور کبھی مجسمہ اور جبریہ کے پیروکار بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ نظری علوم میں سب فرقوں سے بڑھ کر گمراہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام اہل علم اور دین دار طبقہ کے لوگ انہیں اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں میں سب سے جاہل گروہ کہتے چلے آئے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن کی وجہ سے دین اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا بخوبی اندازہ صرف رب العالمین ہی کو ہے۔ ملحدین اسماعیلیہ ❸ باطنیہ اور نصیریہ جیسے گمراہ فرقے اسلام میں شیعہ ہی کے دروازے سے داخل ہوئے۔ کفار و مرتدین بھی شیعہ کی راہ پر گامزن ہو کر اسلامی دیار و بلاد پر چھا گئے، وہاں مسلم خواتین کی آبروریزی کی؛ ان کا مال لوٹا اور ناحق خون بہایا۔ اوران کی [کفار و مشرکین کی] مدد کی بدولت امت پر دین و دنیا کے وہ مصائب ٹوٹے جن کو صحیح معنوں میں اللہ رب العالمین ہی جانتا ہے۔

اس لیے کہ اس مذہب کی بنیاد رکھنے والے زندیق ملحد اور منافقین تھے۔ جنہیں امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی میں سزائیں دیں' ان میں سے ایک گروہ کو آگ سے جلا ڈالا' اور بعض کو قتل کرنا چاہا' مگر وہ آپ کی شمشیر بے نیام کے خوف سے بھاگ گئے۔ اور بعض لوگوں کے متعلق جب عجیب و غریب قسم کی خبریں ملیں تو انہیں کوڑوں کی سزا سنائی۔ اور کئی ایک اسناد سے آپ سے تواتر کے ساتھ روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے کوفہ کے منبر پر حاضرین کو سنا کر ارشاد فرمایا:

((خَیْرُ ھٰذِہِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّھَا اَبُوْبَکْرٍ ثُمَّ عُمَرُ)) ❹

---

❶ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرویات و منقولات میں شیعہ کے یہاں ثقاہت و عدالت کا معیار حب اہل بیت اور بغض صحابہ ہے۔ جو شخص اپنے دل میں صحابہ کے لیے جس قدر زیادہ بغض و عداوت رکھتا ہو، وہ اسی قدر زیادہ مقبول الروایت ہے، جو اس ضمن میں نرمی برتتا ہے، اور سیدہ عائشہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین پر لعنت نہیں بھیجتا وہ اس مقبولیت سے محروم ہے۔

❷ اجہل الناس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی اساس اباطیل و اوہام پر رکھی گئی ہے، چنانچہ آگے چل کر آپ اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے، جہالت کی حد یہ ہے کہ شیعہ امامیہ کو دور حاضر میں اپنا بلا امام ہونا بھی تسلیم نہیں، بخلاف ازیں وہ اپنے کو شیعہ امامیہ کہے جاتے ہیں اور اس امر کے مدعی ہیں کہ وہ امامیہ ہیں، ان کا امام بارہ سو سال کی مدت مدید گزرنے کے باوصف ہنوز بقید حیات ہے، جو کہ سامرہ کے تہ خانہ میں پوشیدہ ہے، امامیہ شیعہ امام غائب کے خروج کے منتظر ہیں، اور ان کے جلدی ظہور و خروج کے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔

❸ اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ عصر حاضر تک بقید حیات رہتے تو انہیں یہ ارشاد فرمانے میں کوئی باک نہ ہوتا کہ شیخیت کشفیت اور بہائیت شیعہ مذہب کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے، اور یہ شیعہ کی رکیک روایات ہی سے استدلال کر کے صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔

❹ البخاری ٥/ ٧۔ سنن ابن ماجہ۔ المقدمۃ۔ باب فضل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث: ١٠٦)۔

''نبی ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے بہترین انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

آپ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ نے بھی ایسا ہی جواب دیا تھا؛ جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کے اندر اور دوسرے علماء ملت نے اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔اس لیے پہلے زمانے کے شیعہ' یا وہ لوگ جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہمراہی کا شرف حاصل رہا وہ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ان کا جھگڑا حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے مابین فضیلت کے مسئلہ پر تھا۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا اعتراف اگلے اور پچھلے بڑے بڑے شیعہ علماء کو رہا ہے۔

ابو القاسم بلخی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ: کسی سائل نے شریک بن عبد اللہ رحمہ اللہ سے سوال کیا اور پوچھا: ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ ابوبکر یا علی [رضی اللہ عنہما] ؟۔آپ نے جواب دیا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔

سائل نے کہا: کیا تم شیعہ ہوکر بھی ایسے کہتے ہو؟ آپ نے جواب دیا: ''ہاں ؛ اور جو کوئی یہ عقیدہ نہ رکھے وہ ہرگز شیعہ نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا' وہ ان سیڑھیوں [منبر] پر چڑھے' اور ارشاد فرمایا:

''آگاہ ہو جاؤ! نبی ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے بہترین فرد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور انکے بعد عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

پھر ہم آپ کی بات کو کیسے رد کریں' اور آپ کو کیسے جھٹلائیں؟۔ اللہ کی قسم! آپ ہرگز جھوٹے نہ تھے۔ یہ کلام عبد الجبار ہمدانی [1] نے اپنی کتاب ''تثبیت النبوۃ'' میں نقل کیا ہے؛ اور کہا ہے: یہ کلام ابو القاسم بلخی نے جاحظ پر راوندی کے اعتراض پر رد کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔

کتاب کی اہمیت:

لوگوں نے مجھ سے گمراہی پر مبنی اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے اصرار کیا؛ ان کا کہنا تھا کہ اس کا جواب اگر نہ لکھا گیا تو اس میں اہل ایمان کے لیے بہت بڑی سبکی ہوگی۔ اور اہل طغیان [سرکش اور دین سے باغی] لوگ یہ خیال کرنے لگیں گے کہ کوئی بھی اس کتاب میں موجود بہتان تراشیوں کا جواب دینے پر قادر نہیں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے اس کا جواب لکھا جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے گئے اس وعدے کے ساتھ وفاداری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل علم و ایمان سے لیا تھا کہ وہ عدل کے ساتھ اللہ کے لیے گواہی دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا﴾

''اے ایمان والو! عدل و انصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور خوشنودی مولا کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، گو وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں عزیزوں کے وہ شخص اگر امیر ہو تو اور فقیر ہو تو دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے اس لئے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا اور اگر تم نے کج بیانی کی یا پہلو تہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔''

[1] قاضی عماد الدین ابو الحسن عبد الجبار بن احمد ہمدانی؛ اپنے وقت میں معتزلہ کے بڑے عالم تھے۔ آپ کی کتاب ''تثبیت النبوۃ'' اس باب میں ایک لاجواب کتاب ہے۔ یہ جملہ دیکھنے کے لیے دیکھیں: ۲/ ۵۴۹۔

پہلو تہی : سے مراد گواہی کو بدلنا ہے۔اور اس سے منہ موڑنے سے مراد: گواہی کو چھپانا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں میں سچ بولنے اور حق بیان کرنے کا حکم دیا ہے؛ اور جھوٹ بولنے اور حق چھپانے سے منع کیا ہے؛ جن کی معرفت اور اظہار کی ضرورت ہوتی ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((البیعان بالخیار ما لم یتفرقا فإن صدقا وبینا بورك لهما في بیعهما وإن كذبا وكتما محقت بركة بیعهما)) ❶

''بیع کرنے والوں کو جدا ہونے تک اختیار ہے۔ پس اگر وہ دونوں سچ بولیں اور بیان کر دیں عیوب وغیرہ تو ان کی بیع میں برکت دی جاتی ہے اور اگر انہوں نے جھوٹ بولا اور عیوب کو چھپایا تو ان کی بیع کی برکت مٹادی جاتی ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (المائدۃ ۸)

''اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ؛ کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کردے عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے۔''

یہی وہ سب سے بڑی گواہی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے امت محمد ﷺ کو گواہ بنایا ہے' جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ﴾

''اور ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو جائیں۔'' (البقرہ ۱۴۳)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج ۷۸)

''اور اللہ کی راہ میں ویسا ہی جہاد کرو جیسے جہاد کا حق ہے اسی نے تمہیں برگزیدہ بنایا ہے اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی؛ دین اپنے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا قائم رکھو؛ اس اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ اس قرآن سے پہلے بھی اور اس میں بھی؛ تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو جائے اور تم تمام لوگوں کے گواہ بن جاؤ۔''

جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کے نزدیک اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے نازل ہونے سے پہلے ان کا نام مسلمان رکھا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ﴾(البقرۃ ۱۴۰)

''اللہ کی طرف سے شہادت چھپانے والے سے زیادہ ظالم اور کون ہے؟''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾(آل عمران ۱۸۷)

''اور اللہ نے جب اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اسے لوگوں سے ضرور بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں تو۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

❶ البخاری کتاب البیوع ۳/ ۵۸۔ مسلم کتاب البیوع ۳/ ۱۱۶٤۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ❀ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ (البقرة ۱۵۹ — ۱۶۰)

''جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کیلئے بیان کر چکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور حق بیان کردیں تو میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔''

اور خصوصاً اس وقت جب اس امت کے آخری لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنا شروع کردیں۔جیسا کہ اثر میں ہے:

''جب اس امت کے بعد میں آنے والے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت کرنا شروع کردیں' تو جس کے پاس علم ہو' اسے چاہیے کہ اس کا اظہار کرے۔اس لیے کہ اس دن علم کو چھپانے والا بالکل اس آدمی کی مانند ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو چھپاتا ہے۔'' (رواہ ابن ماجہ '۱/ ۹۶؛ وھو ضعیف)

اس لیے کہ اس امت کے پہلے لوگ جنھوں نے تصدیق' علم اور عمل اور تبلیغ کی بنیاد پر اس دین کو قائم کیا' ان پر طعنہ زنی کرنا دین پر طعنہ زنی کرنا اور اس دین سے اعراض کا موجب ہے جو دین دیکر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو مبعوث کیا تھا۔

شیعیت کی مصیبت کے پھیلنے کا پہلا ہدف ہی یہی تھا۔اس لیے کہ ان کا مقصد لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے روکنا اور انبیاء و مرسلین کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائی ہوئی تعلیمات کو باطل قرار دینا تھا۔اسی لیے یہ لوگ ملت [اسلامیہ] میں [علمی وعملی] کمزوری کے حساب سے اپنے عقائد و خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔

حقیقت میں ملحدین میں ان ہی گمراہ کن بدعات کا ظہور ہوا۔لیکن ان میں سے بہت ساری بدعات نے ان لوگوں میں رواج پکڑا جو کہ خود ملحد اور منافق نہ تھے۔[ان بدعات کے پھیلنے کی] وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں شبہ اور جہالت پائی جاتی تھی جس کے ساتھ ہوائے نفس ملی ہوئی تھی؛ جس نے ان گمراہیوں کو قبول کرلیا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ❀ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ❀ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ❀ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰى .... سے لیکر آگے تک.... اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ❀ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ❀ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ❀ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰى ❀ اِنْ هِیَ اِلَّا اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ (النجم ۱۔۲۳)

''قسم ہے تارے کی جب وہ نیچے کو چلے۔تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر) نہ تو بہکا ہے نہ بھٹکا۔ اور نہ (اپنے دل کی) خواہش سے وہ (کوئی) بات کرتا ہے۔اس کی جو بات ہے وہ وحی ہے جو (اس پر) بھیجی جاتی ہے۔ ....[آگے تک] (مشرکو!) بھلا بتلاؤ تو سہی! لات اور عزیٰ۔اور تیسرا ایک اور بت منات (یہ کس کام کے ہیں۔تم کو تو مرد (بیٹے) ملے اور پروردگار کو عورتیں (بیٹیاں)۔یہ تو اگر ایسا ہو تو یہ ایک بھونڈی تقسیم ہے۔یہ بت تو نرے نام ہی نام ہے (جن کی حقیقت کچھ نہیں) جو تم اور تمہارے باپ دادا نے (اپنے دل سے) تراش لئے ہیں اللہ نے تو انکے (معبود ہونے کی) کوئی سند نہیں اتاری۔ یہ کافر صرف گمان پر چلتے ہیں اور جو ان کے دل میں آتا ہے وہ کرتے ہیں حالانکہ ان کے مالک کی

طرف سے ان کو (ٹھیک) راستہ بھی بتلایا جا چکا تھا۔''

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے کج روی اور گمراہی؛ جہالت اور اتباع ہویٰ (خواہشات کی پیروی) سے اپنے رسول کی تنزیہ و پاکیزگی بیان کی ہے۔ جیسا کہ [عام انسانوں کے بارے میں] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ (الأحزاب ۷۲)

''اور اسے انسان نے اٹھا لیا بیشک وہ بڑا ظالم بڑا نادان تھا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (الأحزاب ۷۳)

''تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کی توبہ قبول فرمائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۞ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾ (الفاتحة ۶۔۷)

''ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا نہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''

گمراہ وہ ہے جو حق بات کو نہ جان سکے' جیسا کہ عیسائی ہیں۔ اور مغضوب (جس پر غضب نازل ہوا ہو) سے مراد وہ بھٹکا ہوا سرکش ہے جو حق بات کو جان لے' مگر پھر بھی اس کے خلاف عمل کرے۔ صراط مستقیم ان دونوں چیزوں کو متضمن ہے کہ حق بات کی معرفت حاصل کی جائے۔ اور پھر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اسی لیے ماثور دعاؤں میں سے ایک یہ بھی ہے:

((اللهم أرني الحق حقاً و وفقني اتباعه' و أرني الباطل باطلاً و وفقني اجتنابه' و لا تجعله مشتبهاً عليَّ فأتبع الهوى))

''اے اللہ مجھے حق کو حق کر دکھا اور پھر مجھے اس کی اتباع کرنے کی توفیق دے' اور مجھے باطل کو باطل کر دکھا' اور پھر اس سے بچ کر رہنے کی توفیق دے' اور مجھ پر اس کو مشتبہ نہ کر دینا کہ میں خواہشات نفس کی پیروی کرنے لگ جاؤں۔''

صحیح مسلم میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ رات کو تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہوتے تو ان الفاظ میں دعا فرمایا کرتے:

((اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَآئِيْلَ وَمِيْكَآئِيْلَ وَاِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ)) (مسلم ۱/ ۵۳۴)

''اے اللہ! اے پروردگار جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل کے پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین کے! جاننے والے چھپی اور ظاہر باتوں کے تو ہی فیصلہ کرے گا اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا جس میں اختلاف کرتے رہے تھے، ہدایت دے مجھے، حق کی ان باتوں میں جن میں اختلاف ہو گیا ہے اپنے حکم کے ساتھ یقیناً تو ہی ہدایت دیتا ہے جسے چاہے صراط مستقیم کی طرف۔''

جو کوئی راہِ حق سے نکل جاتا ہے' وہ اپنے خیالات کی پیروی کرتا ہے؛ اور اسی چیز کے پیچھے چلتا ہے جو اس کے جی میں آتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر گمراہ اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔ کتاب و سنت کے مخالفین اہل بدعت کا یہی حال ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ اپنے خیالات کی پیروی کرتے ہیں؛ اور اسی چیز کے پیچھے چلتے ہیں جو کچھ ان کے جی میں آتا ہے۔ ان میں جہالت اور ظلم کی انتہاء ہے۔ خاص کر رافضیوں میں۔ بیشک یہ لوگ جہالت اور ظلم کی وجہ سے سب سے بڑھ کر گمراہیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام کے بعد اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بہترین لوگوں سابقین اولین اولیاء اللہ [صحابہ کرام]؛ اور ان کے بعد آنے والے تابعین عظام سے دشمنی رکھتے ہیں؛ اور کفار و مشرکین' یہود و نصاری اور اہل شرک اور ملحدین جیسے نصیریہ' اسماعیلیہ اور دیگر گمراہ فرقوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ آپ انہیں یا ان کے اکثر لوگوں کو دیکھیں گے کہ جب دو فریقوں کفار اور مؤمنین کا اپنے رب کے بارے میں جھگڑا ہو' اور لوگ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیمات کے بارے میں اختلاف کرنے لگیں' اور ان میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں اور کچھ کفر کی راہ پر چل پڑیں' خواہ یہ اختلاف زبانی ہو [جیسے مناظرہ وغیرہ] یا عملی [جیسے اہل اسلام اور اہل کفر کی جنگ]؛ تو یہ رافضی [اپنے دل میں چھپے بغض کی وجہ سے] کتاب و سنت کے متوالوں اہل اسلام کے خلاف کفار و مشرکین کا ساتھ دیتے ہیں۔ لوگوں کو بار ہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خراسان' عراق' جزیرہ اور شام وغیرہ کے ممالک میں اہل اسلام کے خلاف تُرک مشرکین کی مدد کی۔ اور چوتھی اور ساتویں صدی ہجری کے عظیم ترین حوادث میں بار ہا مصر اور شام میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کا ساتھ دیا۔ جب کفار نے بلادِ اسلامیہ پر دھاوا بولا اور اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کا قتل عام کیا جن کی صحیح تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' اس کڑے وقت میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن اور کفار کے سب سے بڑے مددگار یہی لوگ تھے۔ ایسے ہی مسلمانوں کے خلاف ان کا یہودیوں کا ساتھ دینا بھی مشہور و معروف ہے۔ یہاں تک کہ لوگ [ان کی یہودیوں کی خدمت کی وجہ سے] انہیں یہودیوں کے گدھے کہہ کر پکارنے لگے۔

یہودی رافضی مشابہت:

ابن المطہر نے اپنی کتاب کا نام ''منهاج الکرامة فی معرفة الامامة'' رکھا ہے۔ یہ کتاب اس بات کی زیادہ حق دار تھی کہ اس کا نام ''منہاج الندامۃ'' رکھا جائے۔ جیسا کہ اس کا مصنف جو کہ [اپنے بارے میں] طاہر ہونے کا دعوی کرتا ہے ' مگر حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ پاک نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ یہ سرکش طاغوت اور اہل نفاق میں سے ہے۔ اس کو مطہر کہنے کے بجائے پلید اور نجس کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اور دل کی پلیدگیوں میں سب سے بڑی پلیدی یہ ہے کہ جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور بہترین اہل ایمان ہیں' ان کے خلاف حسد و بغض ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد مالِ فے میں صرف ان لوگوں کا حصہ رکھا ہے جو یہ کہتے ہیں:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر ۱۰)

''اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کے

لیے ہمارے دل میں بغض اور دشمنی نہ ڈال؛ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔''

شیعہ خبث باطن اور ہوائے نفس اور دیگر کئی ایک یہودی اخلاقیات میں یہود سے ملتے جلتے ہیں' اور غلو و جہالت اور دیگر کئی ایک عیسائی اخلاقیات میں نصاریٰ کے ہم نوا ہیں۔ بعض اسباب کی وجہ سے یہودیوں سے مشابہت رکھتے ہیں تو بعض اسباب کی وجہ سے عیسائیوں کے مشابہ ہیں۔ لوگ شروع سے لیکر آج تک ان کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے متعلق سب سے زیادہ معلومات رکھنے والے امام شعبی رحمہ اللہ اور ان جیسے دوسرے علماء کوفہ تھے۔

امام شعبی رحمہ اللہ سے ثابت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''میں نے رافضیوں سے بڑھ کر بیوقوف کسی کو نہیں پایا۔ اگر یہ جانوروں میں سے ہوتے تو گدھے ہوتے، اور اگر پرندوں میں سے ہوتے تو کوے ہوتے۔ اور اللہ کی قسم! اگر میں چاہوں کہ وہ میرے گھر کو سونے سے بھر دیں، اور میں ان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ایک جھوٹ بولوں تو وہ ایسا کر گزریں گے۔ لیکن اللہ کی قسم! میں کبھی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

آپ سے یہ کلام بہت تفصیل کے ساتھ منقول ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ زیادہ تفصیل کسی دوسرے عالم سے نقل کی گئی ہے۔

ابن شاہین رحمہ اللہ [1] اپنی کتاب'' اللطف في السنة ''میں فرماتے ہیں: ''ہم سے محمد بن القاسم بن ہارون نے بیان کیا' وہ کہتے ہیں: ہم سے احمد بن ولید واسطی نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے جعفر بن نصیر الطوسی نے بیان کیا' وہ عبدالرحمن بن مالک بن مغول سے روایت کرتے ہیں' وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: مجھ سے شعبی نے کہا:

''میں تمہیں گمراہ کرنے والی ہوا پرستی سے خبردار کرتا ہوں۔ اور ان میں سب سے بڑھ کر برے رافضی ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور ثواب کی امید پر اسلام میں داخل نہیں ہوئے لیکن اہل اسلام سے بیزاری اور ان پر سرکشی کرتے ہوئے اسلام میں داخل ہوئے؛ بلکہ اہل اسلام سے انتقام لینے کے لیے اسلام کا اظہار کرنے لگے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے انہیں آگ میں جلایا تھا اور انہیں شہروں سے نکال دیا تھا۔ انہی میں سے ایک عبداللہ بن سباء یہودی تھا؛ جو کہ صنعاء کے یہود میں سے تھا؛ جسے ساباط کی طرف ملک بدر کیا تھا۔ اور عبداللہ بن یسار کو حاذر کی طرف ملک بدر کیا۔

رافضیوں کا فتنہ بھی یہودیوں کی طرح ہے۔ [اس کی وجہ ان کے عقائد میں یگانگت ہے۔ مثال کے طور پر:]

۱۔ یہودی کہتے ہیں کہ: ''بادشاہت صرف آل داؤد میں ہی ہوسکتی ہے۔ جب کہ رافضی کہتے ہیں: ''امامت صرف آل علی بن ابی طالب میں ہی ہوسکتی ہے۔''

۲۔ یہودی کہتے ہیں: ''جہاد اس وقت تک نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ مسیح منتظر نہ نکلے، اور آسمان سے تلوار اترے۔''
رافضی کہتے ہیں: ''جہاد فی سبیل اللہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ مہدی منتظر کا خروج ہو؛ اور آسمان سے ایک آواز لگانے والا آواز لگائے۔''

۳۔ یہودی نماز مغرب میں تاخیر کرتے ہیں یہاں تک کہ ستارے آپس میں مل جائیں؛ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں ثابت ہے آپ نے فرمایا: ''میری امت اس وقت تک خیر پر قائم رہے گی جب تک یہ نماز مغرب میں ستاروں کے مل جانے تک دیر نہ کرنے لگ جائیں'' [2] ۔[یہ حاشیہ آنے والے صفحہ پر]

[1] ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان البغدادی ' ۳۸۵ھمیں انتقال ہوا؛ دیکھیں: تذکرۃ الحفاظ ۳/ ۱۸۳۔

۴۔ یہود قبلہ سے کچھ ہٹ کر نماز پڑھتے ہیں' ایسے ہی رافضی بھی کرتے ہیں۔
۵۔ یہود نماز میں سستی کرتے ہیں' ایسے ہی رافضی بھی سستی برتتے ہیں۔
۶۔ یہودی نماز میں اپنے کپڑے لٹکا کر رکھتے ہیں؛ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔
۷۔ یہود کے ہاں عورتوں کی عدت نہیں ہے۔ایسے ہی رافضہ کے ہاں بھی ہے۔
۸۔ یہودیوں نے تورات میں تحریف کی؛ رافضیوں نے قرآن میں تحریف کی۔
۹۔ یہودی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر پچاس نمازیں فرض کی ہیں' رافضی بھی ایسے ہی کہتے ہیں۔
۱۰۔ یہودی اہل ایمان کو اخلاص کے ساتھ سلام نہیں کرتے بلکہ [السلام علیکم کے بجائے] السام علیکم [تم پر موت ہو] کہتے ہیں۔اور رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔
۱۱۔ یہودی جری اور مرماہی [مچھلی کی اقسام] نہیں کھاتے؛ ایسے ہی رافضی بھی کرتے ہیں۔
۱۲۔ یہودیوں نے خرگوش کو اور "تلی" کو حرام قرار دیا؛ رافضہ نے بھی ایسے ہی کیا۔
۱۳۔ یہودی موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں سمجھتے۔رافضہ بھی ایسے ہی نظریہ رکھتے ہیں۔
۱۴۔ یہودی ہر مسلمان کے خون کو حلال سمجھتے ہیں، [یہودیوں کے بارے میں] اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں خبر دی ہے:

﴿قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ﴾ (آل عمران ۷۵)

"وہ کہتے ہیں کہ جاہلوں کا (عرب کے لوگوں کا جو اہل کتاب نہ تھے) مال مار لیں تو ہم پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔"

رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔[وہ کہتے عامہ کے اموال کھانا ہمارے لیے جائز ہیں]۔

۱۵۔ یہودی نماز میں اپنی مینڈھیوں پر سجدہ کرتے ہیں۔رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں [تربت کربلا کی ٹکیہ پر سجدہ کرتے ہیں]۔
۱۶۔ یہودی نامکمل رکوع سے سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔اور یہی حال روافض کا بھی ہے۔
۱۷۔ یہود جبرئیل سے بغض رکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ: یہ ملائکہ میں سے ہمارا دشمن ہے۔ایسے ہی رافضہ بھی کہتے ہیں کہ: "جبرئیل نے غلط کیا وحی لے کر محمد ﷺ کے پاس چلا گیا، اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔"
۱۸۔ اس ایک خصلت میں رافضی عیسائیوں سے مشابہت رکھتے ہیں کہ عیسائی کہتے ہیں ہم پر عورتوں کا کوئی مہر نہیں' بس صرف ان سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں کہ وہ اپنی عورتوں سے متعہ کرتے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی رافضیوں پر دو وجہ سے فضیلت ہے۔یہودیوں سے پوچھا گیا کہ: تمہاری ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ تو کہنے لگے: "موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی ہیں۔" اور نصاریٰ سے پوچھا کہ: تمہاری ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ تو کہنے لگے: "عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی ہیں۔" رافضیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے برے لوگ کون ہیں؟ تو کہنے لگے: "محمد کے ساتھی ہیں۔"

انہیں ان (اصحاب محمد ﷺ) کے لیے استغفار کرنے کا حکم دیا گیا، تو انہوں نے (استغفار کے بجائے) سب وشتم کیا۔ سو یہ برہنہ تلوار قیامت تک ان کے سروں پر لٹکتی رہے گی۔ان کے قدم قیامت تک جم نہیں پائیں گے۔اور نہ ہی ان کا جھنڈا

❶ سابقه حاشية] رواه أبو داؤد في السنن ۱/ ۱۶۹؛ وابن ماجة ۱/ ۲۲۵۔ وأحمد في المسند ٤/ ١٤٧۔

بلند ہوگا اور نہ ہی ان کا ایک بات پر اجتماع ہوسکتا ہے۔ ان کی دعوت راندی ہوئی ہے۔ ان کا کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ ان کے اجتماعمیں بھی تفریق ہے۔ جب بھی یہ جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ اس آگ کو بجھا دیتے ہیں۔''

(میں کہتا ہوں): امام شعبی رحمہ اللہ سے ثابت ہے آپ فرماتے ہیں: ''اگر شیعہ جانوروں میں سے ہوتے تو گدھے ہوتے، اور اگر پرندوں میں سے ہوتے تو کوے ہوتے۔'' یہ آپ سے ثابت ہے۔

ابن شاہین کہتے ہیں: ہم سے محمد بن عباس نحوی نے بیان کیا' وہ کہتے ہیں: ہم سے ابراہیم الحربی نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے ابو ربیع زہرانی نے بیان کیا' وہ کہتے ہیں: ہم سے وکیع بن جراح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں: ہم سے مالک بن مغول نے بیان کیا۔ اور پھر یہی کلام نقل کیا۔ یہ سیاق عبدالرحمن بن مالک بن مغول کی سند سے امام شعبی سے منقول ہے۔

ابو عاصم خشیش بن اصرم ❶ نے اپنی کتاب میں روایت کیا؛ انہوں نے ابو عمرو الطلمنکی کی سند سے روایت کیا ہے 'ان کی کتاب ''الاصول'' میں ہے؛ آپ فرماتے ہیں: ''ہم سے ابن جعفر الراقی نے بیان کیا؛ وہ عبدالرحمن بن مالک بن مغول سے روایت کرتے ہیں' وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں' وہ فرماتے ہیں میں نے عامر الشعبی سے کہا: ''آپ کو ان لوگوں سے کس چیز نے موڑا، جب کہ آپ انہی میں سے تھے، اور ان کے بڑے سردار تھے؟۔''

تو انہوں نے فرمایا: ''میں نے دیکھا کہ وہ نصوص کو ایسے کاٹ کر لیتے ہیں جن کا کوئی منہ سرا ہی نہیں ہوتا؛ پھر مجھ سے کہا: ''اے مالک! اگر میں چاہوں کہ وہ اپنی گردنیں غلام بنا کر میرے سامنے پیش کر دیں، اور میرے گھر کو سونے سے بھر دیں، یا وہ میرے اس گھر کا حج کریں، اور میں جناب سیدنا علی رضی اللہ عنہ پر ایک ہی جھوٹ بولوں، تو وہ ایسا کر گزریں گے۔'' مگر اللہ کی قسم! میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ ہرگز نہیں بولوں گا۔'' اے مالک! میں نے تمام بدعتی فرقوں کا مطالعہ کیا ہے، رافضہ سے بڑھ کر بیوقوف کسی کو نہیں پایا۔ اگر یہ لوگ چوپائے ہوتے تو گدھے ہوتے؛ اور اگر پرندوں میں سے ہوتے تو کوے ہوتے۔''

اے مالک! یہ لوگ دین اسلام میں رغبت اور اللہ کی رضا مندی کے حصول اور اس کے خوف کی وجہ سے مسلمان نہیں بنے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب ہے۔ اور ان کی اسلام پر سرکشی اور بغاوت۔ یہ چاہتے ہیں کہ دین اسلام کو ایسے بگاڑ دیں جیسے پولس بن یوشع (یہودی بادشاہ) نے عیسائیت کو بگاڑا تھا۔

ان کی نماز ان کے کانوں سے اوپر تجاوز نہیں کرتیں۔ انہیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلایا تھا۔ اور ان میں سے کچھ کو مختلف علاقوں میں جلاوطن کیا۔ انہی میں سے عبداللہ بن سبا؛ صنعاء کا یہودی بھی تھا جسے ساباط کی طرف جلاوطن کیا۔ اور ایسے ہی ابو بکر الکروس کو جابیہ کی طرف جلاوطن کیا۔ اور ان میں سے ایک قوم کو آگ سے جلا دیا؛ (یہ وہ لوگ تھے) جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو کہنے لگے: ''آپ وہی ہیں۔'' حضرت علی نے کہا: میں کون ہوں؟ تو کہنے لگے: ''آپ ہی ہمارے رب ہیں۔'' (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے آگ جلانے کا حکم دیا۔ جب شعلے بھڑکنے لگے تو حکم دیا کہ انہیں آگ میں ڈال دیا۔

ان ہی کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب برائی کو حد سے بڑھا ہوا دیکھا تو میں نے آگ جلائی، اور (انہیں جلانے کے لیے اپنے غلام) قنبر کو آواز دی؛ (اس نے انہیں آگ میں جلا دیا)۔''

۱۹۔ یہود نماز میں اپنا کپڑا لٹکائے رکھتے ہیں۔ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث پہنچی کہ رسول

❶ خشیش بن اصرم بن اسود؛ ابو عاصم النسائی؛ آپ کا انتقال ۲۵۳ھ میں ہوا۔ تہذیب التہذیب ۳/ ۱۴۳۔

اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جس نے اپنا کپڑا لٹکایا ہوا تھا تو آپ نے اسے نرمی سے کپڑا اوپر کرنے کو کہا۔"

۲۰۔ یہودیوں نے تورات میں تحریف کی تو رافضی قرآن میں تحریف کرتے ہیں۔

۲۱۔ یہودی تمام مسلمانوں کے خون کو حلال تصور کرتے ہیں' ایسے ہی رافضی بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔

۲۲۔ یہودی لوگوں کو دھوکا دینا حلال سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی رافضی بھی کرتے ہیں۔

۲۳۔ یہودی تین طلاق کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے ؛ بس ہر حیض پر ایک طلاق شمار کرتے ہیں۔ ایسے ہی رافضی بھی کرتے ہیں۔

۲۴۔ یہودی باندیوں سے عزل کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ رافضہ بھی ایسے ہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

۲۵۔ یہود قبر میں لحد نہیں بناتے۔ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے لحد بنائی گئی تھی۔

۲۶۔ یہودی اپنے مردوں کو (قبر میں) تازہ گیلی مٹی میں رکھتے ہیں، ایسے ہی رافضہ بھی کرتے ہیں۔ ❶

---

❶ (مزید مشابہات یہ ہیں:) ۲۷۔ یہودی اپنے آپ کو اللہ کی پسندیدہ قوم تصور کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہودیوں کے علاوہ تمام انسان "گوئم" (Goium) یعنی حیوان ہیں جو یہودیوں کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اور ان کے مال و دولت کی لوٹ مار جائز ہے۔

اہل تشیع بھی بالکل یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا تعلق اہل بیت سے ہے اس لئے ہم سب سے افضل اور اللہ کے محبوب بندے ہے، وہ بھی اپنے علاوہ تمام انسانوں کو "ناصبی" کہتے ہیں یعنی ان کے عقیدے کے دشمن! جن کے مال و دولت کو لوٹنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ثواب کا رہے۔

(۲۸) یہود نسلی برتری و تعصب کے علم بردار ہیں وہ عربوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کو ذلت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

شیعوں کا بھی عربوں کے بارے میں یہی نظریہ اور خیال ہے۔ جدید ایران کے ایک مصنف "مہدی بازرگان" اسی رافضی نظریہ کی یوں وضاحت کرتا ہے:

"عربوں کی طبیعت میں سختی اور خشونت ہے۔ ان کا مزاج جارحانہ اور سوچ بڑی پست ہے۔" (الحد الفاصل بین الدین والسیاسہ، مہدی بازرگان ص:۶۸)

(۲۹): یہودیوں نے اپنے اقتدار و تسلط کے لئے تاریک کے ہر دور میں جنس (Sex) کا سہارا لیا انہوں نے علم و ادب کے نام پر دنیا میں ایسی فحاشی اور بے حیائی پھیلائی کہ مشرق و مغرب کے معاشروں کی اخلاقی قدریں تار تار ہوگئیں۔ اور اباحیت کے اسی یہودی فلسفے نے یورپ کی حالیہ جنسی بے راہ روی اور اجتماعی زنا کاری کی راہ ہموار کی جس نے انسان و حیوان کے فرق کو مٹا دیا۔ شیعوں نے بھی انسانی معاشرے کو کھوکھلا کرنے کے لیے زنا و بدکاری پر "متعہ" کا نقاب ڈال کر اس کو اعلیٰ ترین عبادت کا درجہ دے دیا اور کلینی سے خمینی تک تمام رافضی اہل قلم اس بات پر متفق ہیں کہ جو متعہ سے محروم رہا وہ جنت سے بھی محروم رہے گا اور قیامت کے دن نک کٹا اٹھے گا اور اس کا شمار اللہ کے دشمنوں میں ہوگا۔ شیعہ علماء و مجتہدین میں عاملی تو اجتماعی بدکاری پر زور دے ہی چکے تھے، لیکن عصر حاضر کے کلینی یعنی "آیت اللہ خمینی" نے بدکار اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ زنا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ (تحریر الوسیلۃ، ج۲ ص ۲۹۰)

۳۰۔ اور یہ کہ یہ لوگ یہودیوں کا مقابلہ کرتے ہیں، جنہوں پاک دامن بی بی حضرت مریم علیہا السلام پر بہتان دھرا تھا۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی پاک دامن بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان دھرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان سے ایمان سلب کرلیا گیا۔

۳۱۔ اور یہودیوں کے ساتھ اس قول میں بھی مشابہت رکھتے ہیں کہ وہ (یہود) کہتے ہیں: "بے شک دینا بنت یعقوب علیہ السلام (گھر سے) نکلی تو وہ کنواری تھی۔ ایک مشرک نے اس کی بکارت کو زائل کردیا۔" یہ (شیعہ) کہتے ہیں: "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو غصب کرلیا۔"

۳۲۔ تاج پہننا جو کہ یہودیوں کا لباس ہے؛ [اس کا مشابہ ایک کٹورہ نما سا رافضیوں کے سر پر ہوتا ہے]

۳۳۔ اور داڑھی کاٹنا یا منڈوانا اور مونچھیں بڑی بڑی رکھنا یہ یہودیوں اور ان کے بھائیوں کا دین ہے جو کافر ہیں؛ [اور رافضی بھی داڑھیاں کٹواتے، منڈواتے اور مونچھیں بڑھاتے ہیں]

۳۴۔ ان مشابہات میں سے نماز با جماعت اور جمعہ کا ترک کرنا ہے۔ یہ لوگ بھی اکیلے ہی نماز پڑھتے ہیں (با جماعت نماز شاذ و نادر ہی کہیں ہوتی ہے)

۳۵۔ ان مشابہات میں سے ایک آپس میں سلام کا ترک کرنا ہے۔ اگر وہ سلام کریں گے بھی تو سنت کے خلاف کریں گے۔

۳۶۔ انہی میں سے ایک کوئی کام کرکے نماز کو ختم کردینا ہے، جس میں وہ نماز کے فرض سلام کو پورا نہیں کرتے۔ بغیر سلام کے نماز توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے ہاتھ اٹھا کر رانوں پر مارتے ہیں؛ جیسے کہ شریر ٹٹو کرتے ہیں۔

۳۷۔ ایک مشابہت اہل اسلام سے عداوت اور دشمنی رکھنا ہے؛ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے متعلق فرمایا: ﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾ (مائدہ: ۸۲) "آپ دیکھیں گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے [......حاشیہ جاری ہے]

ابوالقاسم الطبری (المعروف لالکائی) نے اپنی کتاب ''شرح اصول السنہ'' میں وھب بن بقیہ الواسطی کی سند سے یہ کلام محمد بن حجر الباہلی سے نقل کیا ہے ۔'' یہ اثر عبدالرحمن بن مالک بن مغول سے بھی روایت کیا گیا ہے اور اس کی اور بھی اسناد ہیں جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور دوسری بعض روایات میں کچھ زیادہ بھی ہے۔ لیکن عبدالرحمن بن مالک بن مغول ضعیف ہے۔ اور امام شعبی رحمہ اللہ کا ان لوگوں کی مذمت کرنا دوسری اسناد سے ثابت ہے۔ یہ امام شعبی رحمہ اللہ سے مروی وہ امور ہیں جن میں روافض کی یہودیوں سے مشابہت ذکر کی گئی ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے ان کے علاوہ بھی وجوہات ذکر کی ہیں۔ لیکن ان (شیعہ) کا نام رافضی اس وقت سے پڑا ہے جب انہوں خلیفہ ہشام کی خلافت کے زمانہ میں زید بن علی بن حسین رحمہ اللہ کا ساتھ چھوڑ دیا؛ یہ تقریباً ۱۲۱ھ کا واقعہ ہے۔

ابو حاتم البستی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زید بن علی حسین بن علی رحمہ اللہ کو ۱۲۲ھ میں کوفہ میں قتل کرکے ایک لکڑی پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ آپ اہل بیت کے اہل علم وفضل لوگوں میں سے تھے۔ شیعہ اپنے آپ کو ان ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

رافضیوں پر اس اسم کا اطلاق کب ہوا؟:

(میں کہتا ہوں): زید بن علی کے خروج کے زمانے میں شیعہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ رافضیہ اور زیدیہ۔

جب آپ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے ان کے لیے رحم کی دعاء کی۔ مگر کچھ لوگوں نے اس بات کو رد کر دیا۔ آپ نے ان سے پوچھا: " رفضتمونی "...... ''تم نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔''

یہیں سے ان کا نام رافضی پڑ گیا' اس لیے کہ انہوں نے زید بن علی کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور جن لوگوں نے آپ کا ساتھ

[گزشتہ حاشیہ......]: یہودی اور مشرک ہیں۔''

ایسے ہی رافضی بھی اہل سنت والجماعت سے بہت ہی سخت دشمنی رکھتے ہیں؛ یہاں تک کہ انہیں نجس شمار کرتے ہیں۔ اس میں بھی وہ یہودیوں سے مشابہ ہیں، اور جو کوئی اس نہج پر چلے وہ بھی ان میں سے ہی ہے۔ اور جس انسان کا ان سے میل جول ہو، وہ اس چیز کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ جہاں اور جس ملک میں رہتے ہیں، اس ملک اور اس کے عوام کے لیے دردِ سر بن جاتے ہیں کیونکہ تخریبی سرگرمیاں ان کے دین کا ایک حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں ابوجعفر کلینی کی ایک شرانگیز عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں، کلینی نے لکھا ہے: ''ابوبکر سے لے کر آج تک تمام سنی حکمران غاصب وظالم ہیں، کیونکہ حکمرانی کا حق صرف شیعہ اماموں یا ان کی امامت کو ماننے والے شیعوں کو ہے اور شیعوں کا فرض ہے کہ تمام سنی حکومتوں کو تباہ کرنے میں لگے رہیں، کیونکہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور سنی حکومت میں اطمینان سے رہے تو چاہے یہ شیعہ کتنے ہی عبادت گذار کیوں نہ ہوں عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے'' (اصول کافی ص: ۲۰۶)۔

۳۸۔ ان مشابہات میں سے ایک: ان کا یہ کہنا ہے کہ جو کوئی ان سے دشمنی رکھے گا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ ایسی ہی بات یہود اور نصاریٰ نے کہی تھی کہ: ﴿وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى﴾ (البقرۃ: ۱۱۱)

''اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی جنت میں نہیں جائے گا۔''

۳۹۔ ان میں سے ایک: ائمہ [مسلمان حکمران] کی نصرت سے پیچھے رہنا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت زید (بن حسین) کے ساتھ کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے؛ اہل بیت سے محبت کے کتنے بڑے دعوے کرتے ہیں، اور ان کی نصرت کے وقت کتنے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ یہود نے بھی تو اپنے نبی موسیٰ سے یہی کہا تھا: ﴿فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ﴾ (مائدۃ: ۲۴)

''تم اور تمہارا رب جاؤ اور لڑو ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔''

۴۰۔ ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ یہود پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی گئی ہے؛ بھلے وہ جہاں کہیں بھی ہوں، ان پر بھی ذلت مسلط ہے۔ یہاں تک کہ اس ذلت اور خوف کے مارے انہوں تقیہ کا عقیدہ ایجاد کیا۔

۴۱۔ ان مشابہات میں سے ایک یہ ہے کہ یہود تورات کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ ایسے یہ لوگ بھی اپنے ہاتھوں سے جھوٹ لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے؛ اور اس طرح رسول اللہ ﷺ پر اور اہل بیت پر جھوٹ بولتے ہیں۔

دیا تھا' انہیں زیدیہ کہا جانے لگا۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو زید بن علی کی طرف منسوب کرتے تھے۔
جب آپ کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو رات کو [کچھ شیعہ] عابد آتے اور اس لکڑ کے پاس عبادت کرنے لگتے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات خلیفہ ہشام کی خلافت کے شروع اور اس کے بھائی خلیفہ یزید بن عبدالملک کی خلافت کے آخری ایام میں ہوئی ہے ۔ یہ تقریباً ۱۰۵ھ کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک لفظ ''رافضہ'' معروف نہیں تھا۔ اس سے ان احادیث کے من گھڑت ہونے کا بھی پتہ چل جاتا ہے جن میں ''رافضہ'' کا لفظ آیا ہے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ انہیں اس کے علاوہ دوسرے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ جیسا کہ انہیں خشبیہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس لیے کہ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ: ہم تلوار کے ساتھ جہاد صرف امام معصوم کی موجودگی میں ہی کریں گے۔ پس یہ لوگ لکڑی سے لڑا کرتے تھے۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول بعض روایات میں آیا ہے' آپ نے فرمایا: ''میں نے خشبیہ [شیعہ] سے بڑھ کر بیوقوف کسی کو نہیں دیکھا۔'' تو ان روایات میں رافضہ کو بالمعنی تعبیر کیا گیا ہوگا۔ عبدالرحمٰن کے ضعیف ہونے کے باوجود اس کے سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ: یہ کلام عبدالرحمٰن بن مالک بن مغول کی تالیف ہے۔ اور اس کا کچھ حصہ انہوں نے ضرور امام شعبی سے سنا ہوگا۔ بھلے پھر اسے انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے زمانہ کے شیعہ میں ایسے برے امور کا مشاہدہ کر لیا تھا۔ یا ان کے بارے میں جو کچھ سنا ہو' اس کی بنیاد پر ایسے کہا ہوگا۔ یا دیگر اہل علم کے اقوال ان کے بارے میں سنے ہوں گے۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں دونوں باتیں موجود ہوں۔ یا کچھ کلام امام شعبی کا ہو اور کچھ دیگر علماء کرام کا۔ خواہ جو بھی حال ہو' یہ کلام اتنی اسناد سے منقول ہے کہ اب دیگر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رافضی ایسے کرتے ہیں۔ اس سے مراد بعض رافضی ہیں' سارے نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبہ ۳۰)

''اور یہودی کہتے ہیں کہ عزیر (پیغمبر) اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ قَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ﴾ [المائدہ ۶۴]

''اور یہودی کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ تنگ ہے؛ انھی کے ہاتھ تنگ [کر دیے گئے] ہیں۔''

یہ بات تمام یہودیوں نے نہیں کہی؛ بلکہ ایسا کہنے والے ان میں سے کچھ لوگ تھے۔ یہ جو باتیں بیان کی گئی ہیں؛ یہ رافضیوں میں بھی موجود ہیں۔ صرف یہی نہیں' بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سے بعض خرگوش اور اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے۔ یہ بھی یہودیوں کی مشابہت ہے۔ اور ہمیشہ دو نمازیں اکٹھی کر کے پڑھتے ہیں؛ وہ دن میں صرف تین بار ہی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ بھی یہودیوں کی مشابہت ہے۔ اور ان میں سے بعض کا یہ کہنا کہ گواہوں کی موجودگی کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ یہ بھی یہودیوں کی مشابہت ہے۔ اور ان کا اپنے علاوہ دوسرے اہل کتاب اور مسلمانوں کے بدنوں کو نجس سمجھنا' اور ان کے ذبیحہ کو حرام قرار دینا۔ اور پانی اور مائع چیزیں جن میں ان میں سے کسی ایک کا ہاتھ لگ جائے اسے نجس سمجھنا۔ اور ان برتنوں کو دھونا جن میں ان کے علاوہ دوسرے لوگ کھالیں۔ یہ بھی سامری یہودیوں کی مشابہت ہے؛ بلکہ یہ لوگ ان سے بھی بدتر ہیں۔ اور ایسے ہی ان لوگوں کا تقیہ کرنا' اور اپنے باطن میں موجود دشمنی کے خلاف ظاہر کرنا بھی یہودیوں کی مشابہت ہے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

روافض کی بعض حماقتوں کا تذکرہ

ان کی جملہ حماقتیں تو بہت زیادہ ہیں ۔ مثال کے طور پر زید کی کھودی ہوئی نہر سے ان کا پانی نہ پینا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ ان نہروں اور کنوؤں سے بھی پانی پی لیتے تھے جنہیں کفار نے کھودا ہوتا تھا۔ اور ایسے ہی بعض شیعہ شامی توت نہیں کھاتے ۔ اور یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی کفار کے ممالک سے لائی جانے والی چیزیں جیسے : پنیر' لباس [اور پھل وغیرہ] استعمال کرتے تھے ۔ بلکہ غالب طور پر ان کے استعمال میں آنے والا لباس کفار کے ہاتھوں سے تیار کروہ ہوتا تھا۔ اور ایسے ہی یہ لوگ لفظ ''عشرہ'' یعنی ''دس'' کو زبان پر لانا گوارا نہیں کرتے ۔ اور نہ ہی کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس کی تعداد دس تک پہنچتی ہو۔ یہاں تک کہ عمارت تعمیر کرنے میں بھی اسے دس ستونوں پر تعمیر کرنا گوارا نہیں کرتے ۔ اس لیے کہ یہ لوگ صحابہ کرام کی بہترین جماعت ''عشرہ مبشرہ'' دس جنتی صحابیوں سے بغض رکھتے ہیں ۔ وہ دس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین یہ ہیں : جناب ابو بکر صدیق' جناب عمر فاروق جناب عثمان غنی ؛ جناب علی بن ابی طالب ؛ جناب طلحہ' جناب زبیر ؛ جناب سعد بن ابی وقاص ؛ جناب سعید بن زید بن عمرو بن نفیل جناب عبد الرحمن بن عوف جناب ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ [اللهم اجعلنا من محبيهم واحشرنا في زمرتهم؛ آمين]

سوائے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ان تمام صحابہ کرام سے بغض رکھتے ہیں ۔ اور سابقین اولین میں سے مہاجر و انصار اور وہ صحابہ کرام جنہوں حدیبیہ میں درخت کے نیچے نبی کریم ﷺ کی بیعت کی ؛ ان سے بغض رکھتے ہیں۔ بیعت کرنے والے ان صحابہ کرام کی تعداد چودہ سو تھی ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی ہے۔

صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا:

''یا رسول اللہ ﷺ ! اللہ کی قسم ! حاطب ضرور جہنم میں جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم جھوٹ کہتے ہو۔ بیشک حاطب بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا تھا۔'' [مسلم برقم (١٩٤٢)]

جب کہ شیعہ ان جمہور صحابہ کرام پر تبرأ کرتے ہیں ؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کرام کیساتھ ان کا یہی سلوک ہوتا ہے سوائے چند ایک صحابہ کے ؛ جن کی تعداد دس سے کچھ زیادہ بنتی ہے ۔ فرض کر لیجیے کہ دنیا میں دس بڑے کافر لوگ ہیں ۔ تب بھی ان کے کفر کی وجہ سے اس لفظ [دس] کا ترک کرنا واجب نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں ؛

﴿وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴾ [النمل ٤٨]

''اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔''

[ان کی وجہ سے] مطلق طور پر نو کے عدد کو ترک کرنا واجب نہیں ہوتا۔ بلکہ بہت سارے مواقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ'' دس '' کے مسمیٰ کی تعریف کی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ حج تمتع کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرة ١٩٦]

''تو جس شخص کو قربانی میسر نہ آئے تو تین روزے تو ایام حج میں رکھے اور سات گھر واپس پہنچ کر، یہ کل دس روزے ہو جائیں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ﴾ [الأعراف ۱۴۲]

''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کے لیے (کوہ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا، اِس طرح اس کے رب کی مقرر کردہ مدت چالیس راتیں پوری ہوگئیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالْفَجْرِ ۞ وَلَیَالٍ عَشْرٍ﴾ [الفجر ۱۔۲]

اور قسم ہے فجر کے وقت کی' اور دس راتوں کی۔''

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کی آخری دس راتیں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی۔'' [البخاری (۳/ ٤٧)مسلم (۲/ ۸۳۰)]

لیلۃ القدر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسے رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو۔''❶

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں کے بارے میں]ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بھی عمل ان دنوں کے عمل سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں۔''❷

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ لفظ''نو'' سے تو دوستی رکھتے ہیں؛ اور دس [عشرہ مبشرہ] میں سے''نو'' سے بغض رکھتے ہیں۔یعنی یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا باقی لوگوں سے بغض رکھتے ہیں۔ایسے ہی شیعہ ابوبکر و عمر اور عثمان نام رکھنا گوارہ نہیں کرتے؛اور ان لوگوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں جن کے نام ابوبکر وعمر اور عثمان [رضی اللہ عنہم اجمعین] ہوں ۔اور ان کے ساتھ لین دین کرنے کو مکروہ سمجھتے ہیں ۔اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ اگر فرض محال یہ سب سے بڑے کافر بھی ہوتے تو پھر بھی یہ مشروع نہ ہوتا کہ کوئی انسان ان کے نام پر نام نہ رکھے۔صحابہ کرام میں کتنے ہی لوگ ایسے تھے جن کے بچوں کا نام''ولید'' تھا۔اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قنوت میں یوں دعا فرمایا کرتے تھے:

((اللهم أنج وليد بن وليد بن المغيرة .)) [البخاری ٦/ ٤٨]

''اے اللہ!ولید بن ولید بن مغیرہ کو نجات عطا فرما۔''

حالانکہ اس کا والد [ولید بن مغیرہ] لوگوں میں سب سے بڑا کافر تھا۔قرآن میں وارد لفظ''وحید'' سے یہی مراد ہے:

﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴾ [المدثر ۱۱]

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا نام عمرو تھا؛اور مشرکین میں بھی اس نام کے لوگ تھے جیسے: عمرو بن عبد ود ؛ ابوجہل کا نام عمرو بن ہشام تھا۔صحابہ کرام میں خالد بن سعید بن العاص کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے' جب کہ یہی نام مشرکین میں خالد بن سفیان ہذلی کا بھی تھا۔صحابہ کرام میں ہشام نام کے لوگ تھے ؛ جیسے: ہشام بن حکیم ۔اور کفار میں سے ابو

❶ البخاري كتاب الصوم' باب(۷۲)؛ مسلم (۲/ ۸۲۳)۔ ❷ البخاري ۲/ ۲۰۔ الترمذي ۲/ ۱۲۹۔

جہل کے باپ کا نام ہشام تھا۔صحابہ کرام میں عقبہ نام کے لوگ تھے ؛ جیسے ابو مسعود عقبہ بن عمرو البدری ؛ عقبہ بن عامر الجہنی ۔ اور مشرکین میں بھی اس نام کے لوگ تھے جیسے :عقبہ بن ابی معیط ۔ ایسے ہی صحابہ کرام میں عثمان وعلی نام کے لوگ تھے ۔ اور مشرکین میں بھی اس نام کے لوگ تھے ؛ جیسے علی بن امیہ بن خلف ؛ جسے حالت کفر میں میدان بدر میں قتل کیا گیا۔ایسے ہی عثمان بن طلحہ کو اسلام قبول کرنے سے قبل قتل کر دیا گیا۔اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں ۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسماء میں سے کسی بھی نام کو محض اس وجہ سے ناپسند نہیں کرتے تھے کہ کسی کافر کا یہ نام ہے۔اگر یہ بات مان لی جائے کہ یہ نام رکھنے والے کافر تھے ؛ تو اس بنا پر بھی ان ناموں سے ناپسندیدگی واجب نہیں ہوتی ۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کو ان اسماء مبارکہ سے ہی پکارتے تھے۔اور لوگوں کے بھی اس نام سے پکارنے کو باقی رکھتے تھے۔شیعہ میں سے بہت سارے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ لوگ منافق تھے۔اور نبی کریم ﷺ کو ان کے منافق ہونے کا علم بھی تھا۔مگر پھر بھی آپ ان کو ان ناموں سے ہی پکارتے تھے۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھے۔ جس سے ان ناموں کیساتھ پکارنے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔خواہ یہ نام رکھنے والا مسلمان ہو یا کافر ؛ یہ معاملہ اسلام میں کسی پر مخفی نہیں ہے۔اور جو کوئی کسی ایک کو ان ناموں سے پکارنا ناپسند کرتا ہو' وہ لوگوں میں سب سے زیادہ دین اسلام کی مخالفت کرنے والا ہے۔ پھر اس کے باوجود جب ان کے ہاں کسی آدمی کا نام علی' یا جعفر؛ یا حسن یا حسین یا اس طرح کا دیگر کوئی نام ہو تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں' اور اس کی عزت وتکریم کرتے ہیں ؛ حالانکہ ان کے پاس اس چیز کی کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ وہ ان ہی میں سے ہے۔

ان اسماء کا خاص اہتمام کرنا ان لوگوں میں ہوسکتا ہے۔مگر ایسا کرنا اہل سنت ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔لیکن کیا کیا جائے کہ شیعہ لوگ انتہائی جہالت اور گمراہی کا شکار ہیں ۔ اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہر وہ چیز جس کا لوگ ان پر انکار کر رہے ہیں' وہ باطل نہیں ہوتی ۔ بلکہ ان کے اقوال میں سے کچھ اقوال ایسے ہیں جن میں اہل سنت ان کی مخالفت کرتے ہیں اور بعض مسائل میں موافقت کرتے ہیں ۔حق وصواب اس چیز میں ہے جو سنت کے موافق ہو۔

لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کے جہری بسم اللہ پڑھنے کو' موزوں پر مسح ترک کرنے کو' خواہ سفر میں ہو یا حضر میں ؛ نماز فجر میں قنوت کو ؛ اور حج تمتع ؛ طلاق بدعی کے لزوم' اور قبریں برابر کرنے کو اور نماز میں ہاتھ کھلا چھوڑنے کو بدعت قرار دیتے ہیں ۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن میں علماء اہل سنت والجماعت کا اختلاف ہے۔کبھی اس میں حق بات وہی ہوسکتی ہے جو ان کے قول کے موافق بھی ہو؛ اور کبھی وہ بات حق ہوتی ہے جو ان کے مخالف ہو۔لیکن یہ سارا معاملہ اجتہادی مسائل میں ہوتا ہے۔ان پر اس وقت تک انکار نہیں کیا جاسکتا جب تک انہیں خاص شعار نہ بنالیا جائے جس وقت یہ کسی خاص فرقہ کی نشانی بن جاتا ہے' اس لیے اس کا انکار کرنا لازمی ہوجاتا ہے ۔اگرچہ بذات خود مسئلہ اس نوعیت کا ہو کہ اس میں اجتہاد جائز ہو۔اس کی ایک مثال قبر پر ٹہنی گاڑنے کی ہے۔ایسا کرنا بعض صحابہ کرام سے منقول ہے ۔اور اس طرح کے دیگر مسائل بھی ہیں۔

ان کی حماقات میں سے یہ بھی ہے کہ یہ لوگ [اپنے مزعوم] مہدی منتظر کے لیے کئی ایک مقامات سجائے بیٹھے ہیں' جہاں پر وہ امام کا انتظار کررہے ہیں ۔ایک تو سامراء کا سرداب ہے' جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ امام یہاں پر غائب ہوگیا ہے ۔ اور کئی ایک دوسرے مقامات بھی ہیں جہاں پر گھوڑا یا خچر یا کوئی دوسری سواری لیے کھڑے رہتے ہیں تا کہ جب امام کا خروج ہو

تو اس پر سواری کرے۔ان مقامات پر ان کے کھڑے ہونے کا وقت صبح اور شام کا ہوتا ہے۔اور کبھی کبھار کسی دوسرے اوقات میں بھی وہاں چلے جاتے ہیں۔اور پھر ان میں سے کوئی ایک آواز لگاتا ہے' اور کہتا ہے: ''اے ہمارے آقا! اب باہر تشریف لائیے۔'' اس موقع پر اسلحہ کی نمائش بھی کرتے ہیں؛ حالانکہ وہاں پر ان سے لڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں جو برابر وہاں پر کھڑے رہتے ہیں اور نماز بھی نہیں پڑھتے۔اس لیے کہ اسے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ نماز میں ہو اور امام نکل آئے؛ اور اسے امام کی خدمت کا موقع نہ مل سکے۔

اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو وہاں سے دور ہونے کی بنا پر؛ جیسے کہ مدینہ طیبہ سے؛ رمضان کے آخری عشرہ میں سامراء کی طرف منہ کر کے چلاتے ہیں' اور بلند آواز میں امام کو نکلنے کے لیے دہائیاں دیتے ہیں۔

فرض کریں اگر یہ مان لیا جائے کہ امام کسی غار میں موجود ہے۔اور اسے اللہ تعالیٰ نے نکلنے کا حکم دیدیا تو وہ نکل کر ہی رہے گا' خواہ یہ لوگ اسے آوازیں دیں یا نہ دیں۔اور اگر اسے اجازت نہ ملے تو وہ ان کی بات ہرگز نہیں مانے گا۔اور جب امام نکلے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائیں گے' اور اس کے لیے سواری کا بھی بندوبست فرمائیں گے۔اور اس کے معاون و مددگار پیدا فرمائیں گے۔مگر پھر بھی وہاں پر کھڑے ہوئے والے صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی دنیاوی زندگی کی تمام کوششیں اکارت ہوگئی ہیں' اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان لوگوں کو معیوب گردانا ہے جو ایسے لوگوں کو پکارتے ہیں' جو ان کی پکار کو قبول نہیں کرتے۔فرمان الٰہی ہے:

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ☆اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ وَ لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ☆﴾ [فاطر ۱۳۔۱۴]

''وہ اللہ تمھارا پروردگار ہے، اسی کی بادشاہی ہے اور جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں۔اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن بھی لیں تو تمھاری درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھے ایک پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔''

یہ تو اس وقت فرمایا جا رہا ہے جب بت موجود بھی تھے؛ اور ان بتوں کے پاس شیاطین ہوا کرتے تھے جو کہ کبھی کبھار انہیں نظر بھی آتے؛ اور ان سے کلام بھی کرتے۔سو پھر جو کوئی معدوم کو مخاطب کرتا ہے وہ اس انسان سے زیادہ برے حال میں جو موجود کو مخاطب کر کے پکارتا ہے؛ اگر چہ وہ موجود جمادات ہی ہو۔پس جو کوئی اس امام غائب کو پکارتا ہو جس کو ابھی تک اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہیں کیا؛ تو اس کی گمراہی ان مشرکین کی گمراہی سے بھی بڑھ کر ہے۔اگر وہ یہ کہیں کہ ہم اس امام کے موجود ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔تو یہ دعوی بھی مشرکین کے اس قول کی طرح ہوگا کہ وہ کہا کرتے تھے: ''ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بت اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔'' پس اس عقیدہ کی بنا پر وہ ایسے لوگوں کی بندگی کرتے تھے جو ان کو کوئی نفع دے سکتے اور نہ ہی نقصان۔حالانکہ ان کا دعوی یہی تھا کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے ایسوں کو پکارتے ہیں جو نہ انہیں نفع دے سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان۔اگر چہ ان لوگوں نے اپنے ان [جھوٹے] معبودوں کو اللہ کے ہاں اپنا سفارشی بنا رکھا ہو۔شیعہ بھی تو یہی کہتے ہیں: ''[جسے ہم پکارتے ہیں' وہ]

امام معصوم ہے۔ وہ اسی بنیاد پر اس سے دوستی رکھتے ہیں' اور اسی بنیاد پر دشمنی رکھتے ہیں۔ جیسا کہ مشرکین اپنے معبودوں کی وجہ سے دوستی اور دشمنی رکھتے ہیں۔ اور پھر اس دوستی اور دشمنی کو ایمان کا اصول قرار دیتے ہیں جس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ بعض مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران ۷۹۔۸۰]

''کسی بشر کا کبھی حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ لیکن رب والے بنو، اس لیے کہ تم کتاب سکھایا کرتے تھے اور اس لیے کہ تم پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ یہ (حق ہے) کہ تمھیں حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بنالو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا، اس کے بعد کہ تم مسلم ہو۔''

جب ملائکہ اور انبیاء کو معبود بنانے والوں کا یہ حال ہے تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو ایک ایسے معدوم امام کو اپنا معبود بنارہے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة ۳۱]

''انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔''

سنن ترمذی میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے؛ انہوں نے اس آیت کو سن کر کہا تھا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! انہوں نے اپنے درویشوں کی بندگی تو نہیں کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیشک انہوں نے ان پر حلال چیز کو حرام کیا' اور حرام کو حلال کیا اور لوگوں نے ان کی اطاعت کی؛ تو یہی چیز عوام کی طرف سے ان کی عبادت کرنا تھی۔'' [سنن الترمذي ٤/ ٣١٤۔ وقال: غريب۔]

ان لوگوں نے تو زندہ اور موجود لوگوں کو اپنا رب بنالیا تھا' جب کہ یہ لوگ حلال و حرام کو ایسے معدوم امام کے ساتھ معلق کیے ہوئے ہیں جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اور پھر یہ لوگ جو بھی کام کرتے ہیں اس کو ثابت کرنے کیلئے کہتے ہیں کہ:

''امام نے ان کے لیے اسے حلال کیا ہے' یا پھر امام نے ہی ان پر یہ چیز حرام کی ہے۔''

خواہ یہ کام کتاب و سنت اور اجماع امت اور سلف صالحین کے عمل کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ جب ان کے دو گروہوں میں اختلاف ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ قول قابل حجت ہوتا ہے جس کا کہنے والا معلوم نہ ہو۔ اس لیے کہ یہی امام معصوم کا قول ہوسکتا ہے۔ پس اس کی روشنی میں وہ اس چیز کو حلال سمجھتے ہیں جو امام حلال قرار دے' اور اس چیز کو حرام سمجھتے ہیں جس کو امام حرام قرار دے۔ یہ بات کسی بھی دوسرے فرقہ کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ اور یہی ان لوگوں کا مذہب بھی ہے جو کہتے ہیں: امام کو کوئی بھی نہیں جانتا' اور نہ ہی اس سے ایک کلمہ بھی روایت کرنا ممکن ہے۔

ان کی حماقتوں کی ایک مثال یہ ہے کہ جس سے یہ لوگ بغض رکھتے ہیں' تو اس کا ایک پتلا بنالیتے ہیں۔ اور کبھی مینڈھے کو

اس کی شکل قرار دیتے ہیں۔اور کبھی کبھار یہ مینڈھا سرخ رنگ کا ہوتا ہے' اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو پیار سے حمیراء [گوری] کہا جاتا تھا۔[نبی کریم ﷺ آپ کو پیار سے ان الفاظ میں پکارتے تھے]۔ پھر اس مینڈھے کو عائشہ رضی اللہ عنہا قرار دیکر اسے تکلیف دیتے ہیں' اور اس کے بال نوچتے ہیں۔اس عمل سے ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح عائشہ رضی اللہ عنہا کو تکلیف ہوتی ہوگی۔

اور ایسے ہی ایک گھی بھری ہوئی مشک کو چھریاں مار کر پھاڑ ڈالتے ہیں' اور پھر اس سے گھی پیتے ہیں' اور یہ کہتے ہیں کہ یہ عمر کا پیٹ چاک کیا گیا ہے' اور ہم اس کا خون پیتے ہیں۔

ایسے ہی کولہو کے چرخ پر گھومنے والے گدھوں میں سے ایک کا نام ابو بکر رکھتے ہیں' اور دوسرے کا عمر؛ اور پھر ان دونوں گدھوں کو انتہائی سخت مارتے ہیں' اور یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ابو بکر وعمر کو سزا دی جارہی ہے ۔ اور کبھی کبھار ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام گدھے کے پاؤں کے نیچے لکھ دیتے ہیں ۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ ایسے گدھوں کے پاؤں پر بہت سخت مارتے ہیں جن پر ان صحابہ کرام کے نام لکھے گئے ہوں' اور کہتے ہیں: میں تو ابو بکر وعمر کو سزا دیتا ہوں؛ اور اس وقت تک ایسا کرتا رہوں گا جب تک یہ پاؤں توڑ نہ دوں۔''

ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے کتوں کے نام ابو بکر وعمر کے نام پر رکھتے ہیں اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ان صحابہ کرام کے اسماء مبارکہ پر اپنے کتوں کے نام رکھتے ہیں' اور پھر اگر اسے ابو بکر کے بجائے بکیر کہا جائے تو اس پر لڑنا شروع کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:''تم جہنمیوں کے نام پر ہمارے کتے کا نام رکھتے ہو۔''

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے مجوسی غلام ابولؤلؤ فیروز کی تعظیم صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔اور کہتے ہیں:'' حضرت ابولؤلؤ کے تبرکات۔''

باتفاق مسلمین ایک کافر کی یہ تعظیم صرف اس وجہ سے ہے کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔

ان کی حماقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ایک درگاہ بنالیتے ہیں' اور کہتے ہیں: یہ ہے:'' مزارِ اہل بیت۔''

حالانکہ ان کے اس جھوٹ پر کتنی بار لوگ انہیں جھوٹا قرار دے چکے ہیں۔اور کبھی کبھار اس صاحب مزار کو شہید قرار دیتے ہیں۔اور اس پر درگاہ تعمیر کر لیتے ہیں ۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہاں پر عوام الناس میں سے کسی کی قبر ہو' یا پھر کسی کافر کی قبر ہو' یا [پھر کسی جانور کو دفنا دیا گیا ہو؛ یا پھر فرضی قبر تیار کر لی گئی ہو۔دراوی]۔ بہت ساری نشانیوں سے یہ جھوٹ واضح ہو جاتا ہے۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ان ناموں والے جانوروں کو تکلیف دینا اور مار پیٹ کرنا صرف اس انسان کا کام ہوسکتا ہے کہ جو لوگوں میں سب سے بڑھ کر بیوقوف اور جاہل ہو۔اس لیے کہ وہ لوگ جو باتفاق مسلمین سب سے بڑے کافر تھے' جیسے : فرعون ؛ ابولہب' ابو جہل وغیرہ ؛ اگر ہم ان کو بھی سزا دینا چاہیں' اور پھر یہ طریقہ اختیار کریں تو یہ سب سے بڑی حماقت و جہالت ہوگی۔اس لیے کہ اب ایسا کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔اسی لیے جب کسی ایسے کافر کو قتل کر دیا جاتا ہے جسے جان سے ختم کرنا جائز بھی ہو' یا پھر وہ خود اپنی موت مر جائے' تو پھر بھی اس کے مر جانے یا قتل کیے جانے کے بعد اس کا مثلہ بنانا جائز نہیں۔ پس نہ ہی اس کی ناک کاٹی جائے گی' اور نہ ہی پیٹ چاک کیا جائے گا؛ نہ ہی کان کاٹے جائیں گے' اور نہ ہی اس کے ہاتھ توڑے جائیں گے۔بس اس کی صرف یہ ایک صورت ہوسکتی ہے کہ بطور بدلہ کے اس کے ساتھ ایسے کیا جائے۔

صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو اسے

تقویٰ کی نصیحت فرماتے ۔ اور جو مسلمان ان کے ساتھ ہیں' ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی وصیت کرتے ۔ اور پھر فرماتے : اللہ کے نام سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، کافروں سے قتال کرو، دھوکہ نہ دو، خیانت نہ کرو؛ کسی کا مثلہ نہ کرو اور کسی بچے کو قتل نہ کرو'' ۔[مسلم ٣/ ١٣٥٦۔]

سنن میں ہے: رسول اللہ ﷺ اپنے خطبہ میں صدقہ کرنے کا حکم فرماتے' اور مثلہ کرنے سے منع کیا کرتے تھے ۔''
[سنن أبي داؤد ٣/ ٧٢۔ والدارمي ١/ ١٩٠۔]

حالانکہ کفار کا مثلہ بنانے میں دشمن کے لیے زیادہ سزا ہے ۔ مگر آپ نے ایسا کرنے سے اس لیے منع فرمایا کہ یہ زیادہ تکلیف بلا ضرورت ہے ۔ اس لیے کہ مقصود اس کے شر سے بچنا تھا جو کہ اس کے قتل سے پورا ہوگیا ۔ یہ لوگ جو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض و نفرت رکھتے ہیں' اگر یہ کفار ہوتے' اور انہیں قتل کر دیا جاتا تو تب بھی ان کا مثلہ کرنا شریعت میں جائز نہ ہوتا ۔ اور نہ ہی انہیں مرنے کے بعد مارا پیٹا جاتا ۔ نہ ہی ان کے پیٹ چاک کیے جاتے اور نہ ہی ان کے بال نوچے جاتے ۔ حالانکہ اس میں ان کے لیے مزید تکلیف و ایذا رسانی ہوتی ہے ۔

جب یہ لوگ اپنے تئیں اس خیال میں کہ اس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے؛ ایسی حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں تو یہ ان کی جہالت کی انتہاء ہے ۔ تو پھر اس وقت کیا کیفیت ہوگی جب وہ کسی ایسے جاندار کو ایذاء دے رہے ہوں جن کو ناحق ایذا رسانی شریعت میں حرام ہے ۔ پس وہ ایسی حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے حقیقت میں انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس میں ان کا دنیا و آخرت کا نقصان ہے ۔ اور اس کے ساتھ ان کی انتہائی حماقت اور جہالت کی نشانی بھی ہے ۔

ان کی حماقتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صدیوں سے مقتولین پر ماتم کرتے چلے آرہے ہیں ۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ کوئی خواہ مقتول ہو یا دیگر مرنے والا ؛ موت کے بعد ایسی حرکات کا ارتکاب کرنا شریعت میں حرام ہے ۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسے حرام ٹھہرایا ہے ۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جس نے اپنے چہرے کو پیٹا اور گریبان چاک کیا اور جاہلیت کی سی پکار پکاری ۔''[1]

نیز یہ بھی صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصیبت کے وقت میں سر منڈوانے' چلا چلا کر رونے اور اپنے کپڑے پھاڑنے والوں سے برأت کا اظہار فرمایا ہے ۔''[2]

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس پر ماتم کیا جائے' اسے اس ماتم کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے ۔''[3]

اور مسلم شریف کی صحیح روایت میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گی کہ اس پر گندھک کا کرتا اور زنگ کی چادر ہوگی ۔''[4]

اس معنی میں بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں ۔ اور یہ لوگ تو ایسا ہی کرتے ہیں' اپنے گال پیٹتے ہیں' گریبان پھاڑتے ہیں' اور جاہلیت کا رونا روتے ہیں' اور ان کے علاوہ دیگر کئی برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں جو کہ کئی صدیوں سے جاری

---

[1] البخاري ٢/ ٨٢؛ مسلم ١/ ٩٩۔
[2] البخاري ٢/ ٨١؛ مسلم ١/ ١٠٠۔
[3] البخاري ٢/ ٨٠؛ مسلم ٢/ ٦٤٤۔
[4] مسلم ٢/ ٦٤٤۔

ہے ۔ اگر یہ کام اسی وقت بھی ہوتا [جب یہ غم تازہ تھا] تب بھی ایسا کرنا بہت بڑی برائی ہوتی ؛ کیونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ایسا کرنے کو حرام ٹھہرایا ہے۔تو پھر اتنی مدت گزر جانے کے بعد اس کا کیا جواز ہوسکتا ہے۔ ❀

یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ جو لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے افضل تھے ؛جن میں انبیاء بھی شامل ہیں اور غیر انبیاء بھی ؛ انہیں ظلم و عداوت سے قتل کیا گیا ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ آپ کے والد اور آپ سے افضل ہیں 'انہیں قتل کیا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ [جو کہ آپ کے خالو' جامع القرآن اور ذوالنورین ہیں] کو قتل کیا گیا۔آپ کا قتل کیا جانا نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلا فتنہ تھا جو اس امت میں پیدا ہوا۔اور آپ کے قتل کی وجہ سے جو فتنہ وفساد پیدا ہوا وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کی وجہ سے پیدا ہونے والے فتنہ سے کئی گناہ بڑھ کر ہے ۔ان کے علاوہ بھی کئی ایک لوگ قتل ہوئے' اور کئی لوگ طبعی موت مر گئے ۔مگر مسلمانوں یا غیر مسلموں میں سے کسی ایک نے بھی میت پر ایسے ماتم نہیں کیا اور نہ ہی کسی مقتول پر اتنی نوحہ گری کی گئی۔سوائے ان بیوقوفوں کے ۔اگر یہ لوگ پرندوں میں ہوتے تو کوے ہوتے اور اگر چوپائے ہوتے تو گدھے ہوتے۔''

ان میں سے بعض ایسے بھی بیوقوف ہیں جو جھاؤ کی لکڑ نہیں جلاتے ؛ اس لیے کہ انہیں پتہ چلا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خون جھاؤ پر گرا تھا۔حالانکہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ محض جھاؤ کی لکڑ جلانا شریعت میں مکروہ نہیں ہے؛ خواہ اس پر کوئی بھی خون گرا ہو۔تو پھر سارے جہاں میں پائے جانے والے اس جنس کے درخت جلانے میں کیا حرج ہے جن پر خون گرا ہی نہیں؟ ۔

ان کی حماقتیں اتنی زیادہ ہیں کہ یہاں پر ان کا تذکرہ کرنا طوالت اختیار کر جائے گا؛ ان کے نقل کرنے کے لیے کسی سند کی ضرورت بھی نہیں ۔لیکن اس سے مقصود یہ ہے کہ زمانہ قدیم یعنی تابعین اور تبع تابعین کے دور سے ان لوگوں کی حماقتوں کی روایتیں معروف ہیں؛ جیسا کہ امام شعبی اور امام عبدالرحمٰن سے ۔[امام شعبی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد اور تابعین میں سے ہیں' جب کہ حضرت عبدالرحمٰن تبع تابعین میں سے ہیں۔اور آپ کو کئی ایک علوم پر دسترس حاصل تھی]۔

آپ کی روایات دوسری روایات کے ساتھ مل کر قابل اعتماد ہوتی ہیں۔ان کے علاوہ مقاتل بن سلیمان' محمد بن عمر الواقدی اور ان جیسے دیگر لوگ بھی شامل ہیں ۔ان شہادات اور روایات کی کثرت کے ساتھ اگر ان کے راوی ثقہ نہ بھی ہوں تو بھی یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوجاتی ہے۔تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب ثقہ لوگ ان روایات کو نقل کر رہے ہوں ۔

یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ خود جنس شیعہ میں جو مذموم اقوال وافعال پائے جاتے ہیں' وہ اس سے کہیں بہت زیادہ ہیں جو ہم نے ذکر کیے ہیں ۔لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ سب اقوال امامیہ یا زیدیہ کے ہوں' یہ اقوال غالیہ اور کئی دوسرے شیعہ فرقوں کے بھی ہوسکتے ہیں ۔ مثال کے طور پر : اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دینا' اور یہ کہنا کہ طلاق میں عورت کی مرضی شرط ہے ؛ اور ان کے علاوہ دیگر ایسے اقوال جو ان کے عام لوگوں میں مشہور ہیں اگر چہ ان کے علماء اس کا اقرار نہ بھی کرتے ہوں ۔ اس لیے کہ جب ان کے مذہب کی بنیاد ہی جہالت پر ہے تو ان کے اکثر لوگ جہالت وحماقت کا شکار ہیں ۔

❀ یہ بات تاریخ میں تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا باقی ماندہ قافلہ کوفہ کی طرف نکلا تو وہاں لوگ رو رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے ۔حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے پوچھا یہ لوگ کیوں رو رہے ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت پر رو رہے ہیں۔تو آپ نے فرمایا: ''ارے ظالمو! تم نے ہی تو انہیں قتل کیا ہے ؛ اور اب رو رہے ہو؛ جاؤ تم قیامت تک ایسے روتے ہی رہو۔'' یہ انہی مظلوموں کی بددعاؤں کا اثر ہے کہ اصل قاتلین کی اولاد آج بھی رو رہے ہیں اور اپنے آپ کو پیٹ رہے ہیں ۔ورنہ قتل کرنے والے مردود بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے اور مقتولین بھی اپنے انعام کو پہنچ گئے ؛ وارثین اور لاحقین بھی صبر واستقامت کے ساتھ اپنے رب کی طرف سے عزت و اکرام کو پہنچ گئے ؛ اور جو اہل جرم ہیں ان پر آج بھی رسوائی و ذلالت چھائی ہوئی ہے۔اور ان پر بددعاؤں کے اثرات ہر خاص و عام ملاحظہ کر سکتا ہے ۔[دلدار جی]۔

فصل

رافضیوں کا جھوٹ اور علم سے تہی دامنی

ہم ان شاء اللہ تعالیٰ - اللہ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے - اس کتاب '' **منهاج الندامة** '' کے تعارف میں راہ استقامت پر گامزن رہیں گے ۔[اس کتاب کا مصنف]ابن المطہر بھی اپنے پیش رووں مثلاً ابن نعمان [1] المفید، کراجکی [2] و ابو القاسم [3] موسوی، اور نصیر الدین طوسی [4] کی راہ پر گامزن رہا۔ شیعہ دراصل طریق بحث و مناظرہ معرفت دلائل اور اصطلاحات مناظرہ مثلاً: منع و معارضہ سے بالکل ناآشنا ہیں، اسی طرح منقولات سے بھی وہ قطعی طور پر تہی دامن ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی منقولات؛ احادیث اور آثار کی معرفت میں لوگوں میں سب سے بڑے جاہل ہیں ۔ صحیح اور ضعیف کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت سے بے بہرہ ہیں۔

شیعہ سے متعلق ائمہ دین کی رائے:

تاریخ کے بارے میں شیعہ کا اعتماد ان منقولات پر ہے جن کی اسناد منقطع ہیں۔ [5] جن میں سے اکثر مشہور جھوٹے اور ملحد

---

[1] اس کا نام ونسب محمد بن محمد بن نعمان بن عبدالسلام بغدادی (المتوفی ۳۳۶۔۴۱۳ھ) ہے، یہ حلہ نامی شہر کا شیخ المشائخ تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ چھوٹی بڑی دوصد سے زائد کتب کا مصنف ہے۔

[2] محمد بن علی بن عثمان الکراجکی (المتوفی ۴۴۹ھ)۔ یہ شیخ ابن نعمان المفید کے تلامذہ میں سے تھا، کراجک ایک گاؤں کا نام ہے۔

[3] اس کا پورا نام ابو القاسم علی بن حسین بن موسیٰ المعروف بالمرتضیٰ ہے، تاریخ وفات (۳۵۵۔۴۳۶) ہے، یہ محمد بن حسین الرضی کا بھائی تھا، جو مشہور شاعر تھا، اس کی تاریخ وفات (۳۵۹۔۴۰۶) ہے ان دونوں بھائیوں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خطبات میں اضافہ کر کے ان میں طرح طرح کے عجائبات و غرائبات جمع کر دیئے، حالانکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دامن ایسی افترا پردازی سے پاک ہے۔

[4] محمد بن محمد بن حسن خواجہ نصیر الدین طوسی المتوفی (۵۹۷۔۶۷۲) ہے، مشہور ظالم و سفاک ہلاکو نے ۶۵۵ھ میں بغداد میں قتل عام کا جو بازار گرم کیا تھا اس کی براہ راست ذمہ داری نصیر الدین طوسی ابن علقمی اور اس کے مشیر ابن ابی الحدید پر عائد ہوتی ہے۔ طوسی ایک ملحد فلسفی تھا اور زوال بغداد کا اولیں محرک تھا۔ زوال بغداد سے قبل یہ بلاد الجبل اور قلعہ الموت میں سکونت پذیر تھا اور فرقہ اسماعیلیہ کا طرف دار تھا۔ طوسی نے اپنی مشہور تصنیف اخلاق ناصری اسماعیلی سلطان علاؤ الدین محمد بن جلال حسن کے وزیر ناصر الدین کے لیے تحریر کی تھی۔ ناصر الدین بلاد الجبل (کوہستان) کا حاکم تھا اور بڑا بد باطن شخص تھا طوسی کے نفاق اور خبث باطن کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس نے بنی عباس کے آخری خلیفہ المستعصم المتوفی (۵۸۸۔۶۵۶ھ) کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھا تھا۔ حالانکہ زوال بغداد کا محرک یہی طوسی تھا۔ شیعہ طوسی کی اس رسوا کن خیانت اور خبث باطن کو اس کے انتہائی کمالات میں سے شمار کرتے ہیں۔ (دیکھئے شیعہ کی کتاب روضات الجنات طبع ثانی: ۵۷۸)۔

طوسی ملحد کی یہ خیانت اتنی بڑی تھی کہ اس سے بڑی خباثت و خیانت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ طوسی اس قدر خیانت کار تھا کہ یہ ہلاکو کے خلاف سازش کرنے سے بھی باز نہ رہا۔ ہلاکو کو اس سازش کا پتہ چل گیا تھا وہ اس کی پاداش میں طوسی کو جہنم رسید کرنا چاہتا تھا۔ مگر قتل کرنے سے یہ امر مانع ہوا کہ طوسی سیاروں کی حرکات معلوم کرنے کے لیے ایک زائچہ تیار کر رہا تھا، اس نے چاہا کہ وہ تکمیل پذیر ہو جائے، ہلاکو نے جب طوسی کو بلا کر برا بھلا کہا اور اس کی خیانت کی قلعی کھول کر اسے قتل کی دھمکی دی تو طوسی کا شاگرد قطب الدین شیرازی موقع کو غنیمت جان کر اس زائچہ کی تکمیل کے لیے تیار ہو گیا اور ہلاکو سے کہا: ''اگر آپ کی رائے مبارک اس شخص (طوسی) کو قتل کرنے کے حق میں ہے تو زائچہ کی تکمیل کے لیے میری خدمات حاضر ہیں۔''

مقام افسوس ہے کہ علم و فضل کے یہ مدعی شرم و حیا کے کسی احساس کے بغیر اخلاقی گراوٹ کی اس حد تک پہنچ جاتے تھے۔

[5] سند میں انقطاع کے معنی یہ ہیں کہ اس کا تسلسل ٹوٹ جائے اور ایک یا دو راوی محذوف ہوں، مثلاً ایک شخص ایسے شخص سے روایت کرے جو اس سے پہلے ہوا ہے اور اس نے اس کا زمانہ نہیں پایا، تاہم وہ جھوٹ موٹ اس سے روایت کرنے کا مدعی ہے، یا اس نے کسی اور شخص کے واسطہ سے روایت کی اور چونکہ وہ شخص معروف بالکذب تھا اس لئے اس کا نام دانستہ سلسلہ سند سے حذف کر دیا تا کہ اس روایت کا جھوٹا ہونا عوام میں مشہور نہ ہو۔

لوگوں کی وضع کردہ ہوتی ہیں۔ مثلاً شیعہ علماء کے یہاں ابو مخنف [1] لُوط بن یحییٰ اور ہشام بن محمد بن سائب کلبی [2] اوران جیسے دیگر لوگوں کی روایات بھی قابل اعتماد ہیں حالانکہ اہل علم کے ہاں یہ لوگ جھوٹ میں مشہور و معروف ہیں۔ اور اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی روایات پر اعتماد کیا جا سکے۔ اس لیے کہ یہ لوگ انتہائی درجہ کی جہالت اور گمراہی کا شکار ہیں۔ اہل علم اپنی کتابوں میں ان لوگوں سے روایات نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سب سے بڑھ کر جھوٹا فرقہ رافضیوں کا ہے۔ ابو حاتم یونس بن عبدالاعلی [3] روایت کرتے ہیں، کہ اشہب [4] بن عبدالعزیز کہتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ سے جب روافض کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"لَا تُكَلِّمْهُمْ وَلَا تَرْوِ عَنْهُمْ فَإِنَّهُمْ يَكْذِبُوْنَ ۔"

''شیعہ سے بات کیجئے نہ ہی ان سے روایت کیجئے، اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

ابو حاتم فرماتے ہیں: ہم سے حرملہ [5] نے بیان کیا کہ میں نے امام شافعی رحمہ اللہ کو یہ فرماتے سنا:

"لَمْ اَرَ اَحَدًا اَشْهَدَ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّافِضَةِ ۔"

''میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی گواہی دینے والا کوئی نہیں دیکھا۔''

مؤمل بن اہاب [6] کہتے ہیں، میں نے یزید بن ہارون [7] کو سنا آپ فرماتے تھے: ''ہر بدعتی کی روایت قبول کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ بدعت کا داعی نہ ہو البتہ شیعہ کی روایت مقبول نہیں کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

محمد بن سعید [8] اصفہانی فرماتے ہیں: میں نے شریک [9] کو یہ کہتے سنا: ''جس آدمی سے بھی ملو اس سے علم حاصل کر لو البتہ شیعہ سے علم حاصل نہ کرو اس لیے کہ وہ حدیثیں گھڑ لیتے ہیں اور پھر انہیں دین بنا لیتے ہیں۔''

---

[1] ابو مخنف شیعہ رواۃ میں سے مقابلتاً کم درجہ کا ضعیف راوی ہے، اور اس میں ضعف کم پایا جاتا ہے۔ محدث ابن عدی اسکے بارے میں فرماتے ہیں: ''یہ کٹر شیعہ اور اخباری راوی ہے۔'' حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں: ''یہ ایک قصہ گو شخص ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ابو حاتم نے اس کی روایت قبول نہیں کی۔'' فیروز آبادی نے بھی اپنی کتاب ''القاموس المحیط'' میں یونہی لکھا ہے: کہا جاتا ہے، کہ لوط بن یحییٰ ابو مخنف ۱۵۷ھ میں فوت ہوا۔

[2] ہشام کا نام و نسب ابو المنذر ہشام بن محمد بن سائب المتوفی ۲۰۴ھ ہے، یہ قصہ گو اور ماہر انساب تھا اس کے بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کا قول سب سے زیادہ سچا ہے، فرماتے ہیں: ''یہ قصہ گو اور ماہر انساب ہے، میں یہ نہیں خیال کرتا کہ کوئی اس سے حدیث روایت کرتا ہو، یہ ان اخبار و انساب کا مرجع ہے، جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، جہاں تک حدیث رسول کا تعلق ہے، مسلمان اس سے زیادہ دانش مند ہیں، کہ وہ اس کے دھوکہ میں آئیں۔''
کلبی کے بارے میں محدث ابن عساکر نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے: ''کلبی شیعہ ہے اور اعتماد کے قابل نہیں۔''

[3] یہ اپنے زمانہ میں امام مصر اور وہاں کے جید فاضل تھے ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

[4] اشہب بن عبدالعزیز قیسی المتوفی (۱۴۰۔۲۰۴) یہ ائمہ مصر میں سے تھے اور امام مالک اور لیث بن سعد کے شاگرد تھے۔

[5] حرملہ بن یحییٰ تجیبی المتوفی ۲۴۳ یہ امام شافعی کے تلمیذ خاص اور مصر کے یکتائے روزگار فاضل تھے، انہوں نے امام مالک کے تلمیذ خاص ابن وہب سے تقریباً ایک لاکھ روایات اخذ کیں۔

[6] مؤمل بن اہاب ربعی المتوفی ۲۵۴ھ ان سے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

[7] یزید بن ہارون واسطی مشہور حافظ حدیث اور امام احمد کے استاد تھے، ان کی مجلس درس میں ستر ہزار طلبہ ہوا کرتے تھے، ۲۰۶ھ میں فوت ہوئے۔

[8] محمد بن سعید اصفہانی مشہور محدث شریک کے تلامذہ میں سے تھے، امام بخاری نے ان سے روایت کی ہے، یہ ۲۲۰ھ میں فوت ہوئے۔

[9] شریک بن عبداللہ نخعی المتوفی (۹۵۔۱۷۷) کوفہ کے قاضی اور عبداللہ بن مبارک کے شیوخ میں سے ہیں، یہ محدث ثوری اور امام ابوحنیفہ کے معاصر اور رفیق تھے۔ آپ شیعہ میں سے تھے اور خود اپنی زبان سے کہا کرتے تھے: میں شیعہ ہوں۔ اور یہ ان گواہی اپنے لوگوں کے متعلق ہے۔

ابو معاویہ [1] کا قول ہے کہ میں نے سنا اعمش [2] فرماتے تھے:

''لوگ اصحاب مغیرہ [3] بن سعید کو کذاب کا نام دیتے ہیں اور کذاب کی شہادت بالاتفاق مردود ہے۔''

حضرت اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ تم ان چیزوں کو یاد رکھو۔ اس لیے کہ میں خود کو اس بات سے مامون نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ کہیں کہ: ''ہم نے اعمش کو ایک عورت کے ساتھ پایا۔''

یہ روایات تاریخ میں ثابت ہیں۔ انہیں امام ابوعبداللہ بن بطہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''**الابانہ الکبری**'' میں؛ اور دوسرے لوگوں نے اپنی تصنیفات میں نقل کیا ہے۔ ابوالقاسم الطبری نے روایت کیا ہے: 'امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''میں نے گمراہ فرقوں میں سے رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹی گواہی دینے والا کوئی نہیں دیکھا۔''

یہ روایت حرملہ نے بھی نقل کی ہے؛ اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ: ''میں نے رافضیوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹی گواہی دینے والا کوئی نہیں دیکھا۔''

یہاں پر اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ اہل علم [علماء کرام] کا اتفاق ہے کہ اہل قبلہ کے فرقوں میں رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹا فرقہ کوئی بھی نہیں ہے۔' جو شخص کتب جرح و تعدیل؛ اور راویوں کے حالات زندگی کو بغور پڑھنے کا عادی ہے؛ جیسا کہ یحییٰ بن سعید القطان' علی المدینی؛ یحی بن معین' امام بخاری' ابوزرعہ؛ ابوحاتم الرازی' امام نسائی' ابوحاتم بن حبان' ابواحمد بن عدی' دار قطنی؛ ابراہیم بن یعقوب جوزجانی؛ یعقوب بن سفیان الفسوی؛ احمد بن عبداللہ بن صالح العجلی؛ العقیلی؛ محمد بن عبداللہ بن عمار الموصلی؛ حاکم نیشاپوری؛ حافظ عبدالغنی بن سعید المصری اور ان جیسے معروف اہل علم 'مصنفین اور ماہرین تنقید نگار؛ اور اسناد کے احوال کے جانکار سبھی لوگ یہ کہتے ہیں کہ: ''اہل علم کے نزدیک لوگوں کے ہر طبقہ میں شیعہ زیادہ تر جھوٹ میں معروف ہوتے ہیں۔''

یہاں تک کہ امام بخاری جیسے لوگوں نے پرانے شیعہ' جیسا کہ عاصم بن ضمرہ' حارث الاعور؛ عبداللہ بن سلمہ اور ان جیسے دیگر لوگوں سے ایک روایت بھی نقل نہیں کی؛ حالانکہ یہ شیعہ فرقہ میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ بلکہ یہ لوگ اہل بیت سے روایت کرتے ہیں جیسے کہ: حضرات حسن' حسین' رضی اللہ عنہما محمد بن حنفیہ؛ ان کے آزاد کردہ غلام عبیداللہ بن ابی رافع۔ اور ابن مسعود کے ساتھیوں سے بھی روایت کرتے ہیں؛ جیسے کہ: عبیدہ السلمانی؛ حارث بن قیس اور ان جیسے دوسرے لوگ۔ یہ لوگ نقل روایات کے امام اور نقاد ہیں' اور لوگوں میں سب سے بڑھ کر خواہشات سے دور رہنے والے؛ اور لوگوں کے احوال سے خوب باخبر اور حق بات کہنے والے ہیں جنہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

---

❶ ابو معاویہ محمد بن حازم المتوفی ۱۹۵ یہ نابینا ہونے کے باوصف بہت بڑے فاضل تھے، یہ اعمش کے تلامذہ میں سے تھے۔

❷ اعمش کا اصلی نام سلیمان بن مہران ہے، ان کی تاریخ وفات (۶۴۔۱۴۸) ہے، یہ بہت بڑے حافظ اور قاری تھے سفیان بن عیینہ اعمش کے بارے میں فرماتے ہیں: ''یہ بہت بڑے حافظ قاری اور عالم تھے، صداقت بیانی کی وجہ سے ان کو المصحف کہا جاتا تھا''۔

❸ مغیرہ بن سعید کوفی مشہور رافضی اور کذاب تھا، اسے ۱۱۹ھ میں خالد بن عبداللہ قسری کے عہد امارت میں سولی دیا گیا تھا، یہ آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ کی تحریف کر کے اسے غلط معانی پہنایا کرتا تھا۔ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء کے سوا ابوبکر و عمر اور جملہ صحابہ کی تکفیر کرتا تھا۔ یہ ایک یہودی عورت سے کچھ پڑھا کرتا تھا، جب دریافت کیا گیا کہ تم کیا پڑھتے ہو؟ تو کہنے لگا'' میں جادو سیکھتا ہوں۔'' ائمہ اہل بیت اس کی دروغ بیانی اور دین اسلام میں کفر و الحاد کے ارتکاب کی بنا پر اس سے اظہار براءت کیا کرتے تھے۔

بدعات مختلف اقسام کی ہوتی ہیں ۔ خوارج دینی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں' وہ دین اسلام سے ایسے نکل جاتے ہیں' جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے جنگ کرنے کا حکم بھی دیا ہے ۔ اور صحابہ کرام اور اہل اسلام علماء کرام رحمہم اللہ کا ان کے ساتھ جنگ کرنے پر اتفاق ہے ۔ نبی کریم ﷺ سے دس اسناد کے ساتھ صحیح احادیث ثابت ہیں ۔ جنہیں امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے ۔ ان میں سے تین روایات امام بخاری نے نقل کی ہیں ۔ یہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوں' بلکہ یہ اپنی سچائی میں سب سے بڑھ کر معروف ہیں ۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان کی نقل کردہ روایت کو اصح الحدیث کہا جاتا ہے ۔ [1] مگر یہ لوگ اپنی بدعت کی وجہ سے گمراہی اور جہالت کا شکار ہو گئے ۔ ان کی بدعت زندیقیت یا الحاد کی وجہ سے نہیں تھی ؛ بلکہ کتاب اللہ کے معانی و مفاہیم سے جہالت اور گمراہی کی وجہ سے تھی ۔

جب کہ رافضیوں کے دین کی بنیاد ہی زندیقیت اور الحاد پر مبنی ہے ۔ شیعہ میں جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کی بیماری بہت زیادہ ہے ۔ شیعہ یہ کہہ کر خود اپنی دروغ گوئی کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''ہمارا دین تقیہ ہے ۔'' [2] تقیہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایک اپنی زبان سے وہ بات کہے جو اس کے دل میں نہ ہو ۔ اسی کا نام جھوٹ اور نفاق ہے ۔ اس کے باوصف وہ باقی اہل ملت کو چھوڑ کر صرف خود مومن ہونے کے دعویدار ہیں ؛ اور سابقین اولین صحابہ کو ارتداد و نفاق [3] سے متہم کرتے ہیں ۔ گویا وہ اس مثل کے مصداق ہیں : '' رَمَتْنِیْ بِدَائِهَا وَانْسَلَّتْ '' ۔ '' وہ اپنی بیماری مجھ پر پھینک کر کھسک گئی ۔ ''

---

[1] خوارج کے نزدیک جھوٹ بولنے والا گناہ کبیرہ کا مرتکب اور ابدی جہنمی ہے ، یہی وجہ ہے کہ خوارج ظالم ہونے کے باوجود جھوٹ نہ بولتے تھے ۔

[2] حافظ ابن عساکر تاریخ دمشق میں رقم طراز ہیں ، کہ حسن بن مثنیٰ بن حسن سبط بن علی بن ابی طالب نے ایک رافضی سے کہا :
'' اگر ہمارا بس چلا تو ہم تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے اور تمہاری توبہ قبول نہیں کریں گے ، یہ سن کر ایک شخص بولا ۔ آپ ان کی توبہ کیوں کر قبول نہ کریں گے ۔'' حسن مثنیٰ نے فرمایا : '' ہم ان سے تمہاری نسبت زیادہ واقف ہیں ، اگر چاہیں تمہاری تصدیق کر دیں اور اگر چاہیں تکذیب کر دیں ، ان (شیعہ) کا خیال ہے کہ تقیہ میں ان سب باتوں کی گنجائش ہے ۔ مقام افسوس ہے کہ تقیہ کی رخصت مسلمان کو اضطراری صورت میں حاصل ہوتی ہے ، مثلاً وہ سلطان سے ڈرتا ہو تو اپنے ضمیر کے خلاف بات کہہ کر اپنی جان بچائے ۔ تقیہ میں عظمت و فضیلت کا کوئی پہلو موجود نہیں ، فضیلت کا موجب یہ امر ہے کہ ہر قیمت پر آدمی حق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور سچی بات کہہ دے ۔ اللہ کی قسم ! تقیہ کی بنا پر اللہ کے کسی بندے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اللہ کے بندوں کو گمراہ کرتا پھرے ۔'' (تاریخ دمشق از ابن عساکر : ۴/ ۱۶۵) ۔

[3] اہل سنت کے ایک عالم سید ابراہیم نے ایک شیعہ مجتہد محمد مہدی سبزواری کو بتاریخ ۱۴ صفر ۱۳۴۷ھ ایک خط لکھا ! سید ابراہیم نے اپنے خط میں ایک شیعہ عالم بہاؤ الدین عاملی کا شکوہ کیا تھا کہ اس نے تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں آیت : '' يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ '' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ، سید ابراہیم نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا : اگر سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ جن کی تعداد رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت ایک لاکھ سے بھی زائد تھی ، پانچ چھ یا سات کے سوا سب کافر منافق اور مرتد ہوئے ، تو وہ دین جاہلیت کا اعلان کرتے اور وہ مرتدین کے خلاف نبرد آزمانہ ہوتے ۔ مقام حیرت ہے کہ ۲۳ سال تک کافر آپ کے مصاحب رہے اسی طرح طویل مدت تک ایک کافرہ بیوی آپ کی زوجیت میں رہی ، اور آپ کو پتہ نہ چل سکا ، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین و آخرین کا علم عطا کر رکھا تھا ۔'' مہدی سبزواری نے ۴ ربیع الآخر کو اس کا حسب ذیل جواب دیا : '' آپ نے شیعہ کا قول نقل فرمایا ہے ، جواباً عرض ہے کہ سیدنا ابو بکر کا کفر (معاذ اللہ) بت پرستوں کی طرح حقیقی و واقعی نہیں ، بلکہ حکمی کفر ہے ، مزید برآں شیعہ اس بات کے قائل نہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کافر ہو گئے تھے ، بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ آپ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے ۔ (العیاذ باللہ) ۔
مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ بہاؤ الدین آملی کا یہ قول دروغ گوئی پر مبنی ہے ، کہ مذکورۃ الصدر آیت سیدنا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی ، تاہم عاملی اور سبزواری اس امر میں باقی شیعہ کے ہمنوا ہیں کہ صحابہ اگر آپ کی وفات سے قبل نہیں تو بعد میں ضرور مرتد ہو گئے تھے ، ہم کہتے ہیں کہ اگر شیعہ کے افکار و معتقدات کا انکار کفر ہے ، تو بلا شبہ اس اعتبار سے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر کہنا درست ہے ، سید ابراہیم اور مجتہد سبزواری کی مراسلت کے لئے دیکھئے ، مجلہ الفتح '' جمادی الآخرہ ۱۳۶۶ھ ۔

اسلام کا اظہار کرنے والوں میں رافضیوں سے بڑھ کرکوئی بھی فرقہ نفاق اور الحاد سے قریب ترنہیں۔اور کسی فرقہ میں اس فرقہ سے بڑھ کر مرتد اور منافق نہیں پائے جاتے۔اس بارے میں غالی اورنصیری بہت ہی مشہور ہیں۔ملاحدہ کی قربت میں اسماعیلیہ شیعہ اور ان کے ہم مثل لوگ ہیں۔شرعی امور میں ان کے لیے اصل یہ ہے کہ اہل بیت سے بعض روایات نقل کردی جائیں۔ان روایات میں سے کچھ سچی بھی ہوتی ہیں'اور اکثر روایات جھوٹی ہوتی ہیں؛ بلکہ جان بوجھ کر یہ جھوٹ گھڑا جاتا ہے۔چونکہ ان لوگوں میں صحیح اور کمزور و غریب روایات کی معرفت کا علم نام کی کوئی چیز نہیں' جیسا کہ محدثین کے پاس علم ہوتا ہے'اس لیے خطائے عمد کے مرتکب ہوتے ہیں۔

پھر اگر اہل بیت سے روایت صحیح ثابت بھی ہوجائے؛تو پھر بھی ان کے ہاں خبر کی قبولیت کا وجوب تین میں سے ایک اصول پر مبنی ہوتا ہے:

۱۔ ان میں سے کوئی ایک ایسے معصوم ہوگا جیسے رسول اللہ ﷺ معصوم تھے۔

۲۔ ان میں سے کوئی ایک جب کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کررہا ہوتا ہے۔اور اس منقول کے بارے میں عصمت کے دعویدار ہوتے ہیں۔

۳۔ کہتے ہیں: اہل بیت کا اجماع حجت ہے۔پھر کہتے ہیں کہ:''ان اہل بیت کی تعداد ان کے ہاں بارہ ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں: ان بارہ میں سے کسی ایک سے جو بات نقل کی جائے' ان سب کا اس بات پر اتفاق ہوتا ہے۔

یہ ان کے ہاں شرعی امور کے اصول ہیں۔جوکہ سب فاسد اصول ہیں۔ہم ان شاء اللہ اس مسئلہ کو اپنے موقع پر بیان کریں گے۔
ان لوگوں کا قرآن و حدیث اور اجماع پر کوئی اعتماد نہیں ہوتا۔سوائے ان معصوموں پر اعتماد کے۔اور نہ ہی قیاس کو مانتے خواہ وہ کتنا ہی صاف اور واضح کیوں نہ ہو۔

جب منقولات اور عقلیات میں شیعہ کا اعتماد آج کل (یعنی شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے دور میں) معتزلہ کی تصانیف پر ہے۔معتزلہ ان سے بڑھ کر عقلمند اور سچے ہوتے ہیں۔انکار تقدیر اور سلب صفات میں شیعہ معتزلہ کے ہم نوا ہیں۔بخلاف ازیں کوئی معتزلی حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی خلافت سے منکر نہیں۔بلکہ جمہور معتزلہ ان کی عزت وعظمت کے قائل ہیں۔جب کہ تفضیل کے مسئلہ میں ان کے جمہور ائمہ متقدمین حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے قائل تھے۔جب کہ متاخرین میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو فضیلت کے بارے میں توقف کرتے تھے۔اور بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے قائل تھے۔اس بنا پر ان کے اور زیدیہ کے درمیان ایک گونا تعلق قائم ہوگیا؛ اور یہ لوگ توحید' عدل' امامت اور تفضیل میں مشترک ہوگئے۔

قدیم معتزلی ائمہ جیسے: عمرو بن عبید؛ واصل بن عطاء؛ اور دوسرے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عدالت کے بارے میں توقف کیا کرتے تھے۔ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ کہا کرتے تھے:

''حضرت علی اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کے دو گروہوں میں سے کوئی ایک فاسق ہے۔مگر اس فاسق کو متعین نہیں کرتے تھے۔اگر ان دو میں سے کوئی ایک گواہی دے' تو اس کے فسق و فجور کی وجہ سے ان دو میں کسی ایک کے فاسق ہونے کی وجہ سے اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔مگر اس فاسق کی تعیین نہیں۔اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی دوسرے عادل انسان کے ساتھ مل کر گواہی دیں تو پھر ان کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی قبول کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

شیعہ متکلمین مثلاً ہشام [1] بن حکم، ہشام جوالیقی [2] اور یونس بن عبدالرحمٰن قمی [3] اور ان جیسے دیگر لوگ صفات الٰہی کا اثبات میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ رکھتے تھے ۔ اور وہی بات کہتے تھے جو اہل سنت والجماعت کہتے ہیں۔عقیدہ خلق قرآن کا انکار کرتے تھے۔اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔اور ان کے علاوہ بھی اہل سنت والجماعت کے عقائد ان کے ہاں پائے جاتے تھے۔یہاں تک کہ بعض لوگ اپنے غلو کی وجہ سے بدعت کا شکار ہوگئے تھے اور تجسیم اور تبعیض اور تمثیل کا عقیدہ رکھتے تھے۔جیسا کہ مقالات نگاروں نے ان کے عقائد بیان کیے ہیں۔

تیسری صدی ہجری کے آخر میں کچھ شیعہ لوگوں نے معتزلہ کے اقوال اختیار کیے۔جیسا کہ کتاب '' الآراء و الدیانات '' کا مصنف ابن نوبختی ؛اور اس جیسے دیگر لوگ ۔ ان کے بعد مفید ابن نعمان اور اس کے پیروکاران آئے۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فرق و مذاہب پر کتابیں لکھنے والے مصنفین جیسا کہ ابوالحسن اشعری اور دوسرے لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ شیعہ لوگ توحید یا عدل کے عقیدہ میں معتزلہ سے موافقت رکھتے ہیں۔بس یہ عقیدہ بعد میں آنے والے کچھ لوگوں سے منقول ہے۔ بلکہ ان کے پرانے لوگوں سے تجسیم اور اثبات قدر کا عقیدہ نقل کیا جاتا رہا ہے۔اسلام میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جسم کا عقیدہ رکھنے والا ہشام بن حکم ہے ۔اس کے لیے ابن راوندی جیسے مشہور و معروف زندیقوں اور ملحدوں نے کتاب لکھی تھی ؛اس کتاب کی اساس ان کے اصولوں پر رکھی گئی تھی۔

---

[1] ہشام بن حکم مشہور زندیق ابوشاکر دیصانی کا غلام اور اس کا تربیت یافتہ تھا، ابوشاکر ہی سے اس نے الحاد و زندقہ اور تجسیم کی تعلیم پائی۔ جب ابوشاکر مرگیا تو یہ کسی اور ملحد استاد کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا، اتفاقاً اس کی ملاقات ایک جہمی العقیدہ شخص سے ہوگئی۔ ہشام تجسیم کا عقیدہ رکھتا تھا اس کے عین برخلاف جہمی شخص نفی صفات کا قائل تھا۔ تاہم الحاد و زندقہ اور غلو فی البدعت میں دونوں ایک دوسرے کے ہم نوا تھے۔ برامکہ مجوس کے آتشکدہ کے متولی چلے آتے تھے۔ جب انہیں ہشام کا پتہ چلا تو وہ اسے بے حد چاہنے لگے۔روپیہ پیسہ سے اس کی مدد کی اور اس کی ذہانت کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے لگے۔شاید برامکہ کی وجہ ہی سے ہشام شیعہ سے وابستہ ہوگیا۔جس سے برامکہ کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح غالی شیعہ کو اس کا تعاون حاصل رہے گا۔ اور وہ نوعمر لوگوں کو تشیع کے جال میں پھنسا سکیں گے۔ علاوہ ازیں وہ اکابر شیعہ سے مل کر برامکہ کے بڑے بڑے کام نکالے گا، شیعہ مذہب میں مختلف عنصر کے لوگ پائے جاتے تھے۔ ہشام کے عہد اقتدار ہی میں خلیفہ ہارون رشید اپنی خواب غفلت سے چونکا اور برامکہ شعوبیہ اور زنادقہ کو سزا دینے کے درپے ہوا۔نتیجہ کے طور پر برامکہ زوال پذیر ہوگئے ۔ ان واقعات کے دوران ہشام کہیں چھپ گیا اور لوگوں سے مکمل علیحدگی اختیار کرلی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی موت ۱۹۹ھ میں واقع ہوئی۔ ہشام کے عقاید کے لیے دیکھئے۔(مختصر تحفہ اثنا عشریہ،ص:۶۳)

[2] ہشام بن سالم جوالیقی اس کا لقب علاف ہے، یہ کہا کرتا تھا کہ اللہ کی ایک صورت ہے، اور اس نے جناب آدم علیہ السلام کو اپنی صورت کے مطابق پیدا کیا تھا، اس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سر سے لے کر ناف تک کھوکھلا ہے اور ناف سے قدم تک ٹھوس ہے، جرح و تعدیل کے شیعہ علماء اسے ثقہ قرار دیتے ہیں، یہ سابق الذکر ہشام بن حکم کا معاصر تھا۔

[3] یونس بن عبدالرحمٰن القمی علی بن یقطین کا موالی تھا، یہ ہشام بن عبدالملک کے عہد خلافت میں پیدا ہوا، امام موسیٰ رضا اور خلیفہ ماموں کا معاصر تھا، اور فاسد عقائد رکھتا تھا، شیعہ روایت کرتے ہیں کہ محمد بن داود یہ نے موسیٰ رضا کو بلا کر یونس کے بارے میں دریافت کیا تھا، امام موسیٰ نے جواباً تحریر فرمایا:'' اللہ اس پر اور اس کے اصحاب پر لعنت کرے اللہ تعالیٰ اس سے اور اس کے اصحاب سے بیزار ہے۔'' ایک مرتبہ امام موسیٰ رضا نے یونس کی تالیف کردہ کتاب زمین پر دے ماری اور فرمایا: ''یہ زانی اور زانیہ کے بیٹے کی تصنیف ہے، یہ زندیق کی کتاب ہے۔'' جب امام موسیٰ رضا خلیفہ مامون کی دعوت پر خراسان تشریف لے گئے تو یونس نے ان کے بارے میں کہا: ''اگر وہ اس معاملہ میں بخوشی یا ناخوشی داخل ہوگئے تو وہ باغی ہیں۔''
بایں ہمہ وہ شیعہ کے نزدیک ثقہ اور ان کے لیے سرمایہ افتخار ہے اور وہ اس کی بریت ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔

شیعہ کی نگاہ میں مسئلہ امامت کی اہمیت اور اس کی تردید

شیعہ مصنف ابن المطہر آغاز کتاب میں رقمطراز ہے:

''یہ ایک مفید رسالہ اور لطیف مقالہ ہے، جو دین کے اشرف واہم مسائل پر مشتمل ہے اور وہ مسئلہ امامت ہے۔اس لیے کہ اس کے فہم و ادراک سے عز و شرف کے دروازے کھلتے ہیں۔ یہ ارکان ایمان میں سے ایک ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں دائمی زندگی نصیب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات حاصل ہوگی۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو شخص امام زمانہ کو پہچانے بغیر مر جائے، وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' میں نے سلطان اعظم، شاہ عرب و عجم، مولی النعم صاحب خیر و کرم؛ شہنشاہ مکرم غیاث الملۃ والدین والحق ''الوجائیو'' خدا بندہ کی لائبریری کے لئے یہ کتاب تحریر کی ہے، جس میں میں نے دلائل کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اہم ترین مسائل کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔میں نے اس کا نام ''**منہاج الکرامۃ فی معرفۃ الإمامۃ**'' رکھا ہے۔اور اسے چند فصلوں میں ترتیب دیا ہے:

۱۔ فصل اول میں امامت کے مسئلہ میں جو مذاہب پائے جاتے تھے بیان کیے۔

۲۔ فصل ثانی میں یہ بیان کیا کہ امامیہ کا مسئلہ واجب الاتباع ہے۔

۳۔ فصل ثالث میں رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کے دلائل بیان کیے۔

۴۔ فصل رابع میں بارہ اماموں پر روشنی ڈالی۔

۵۔ فصل خامس میں خلافت ابوبکر و عمر کا بطلان ثابت کیا۔ (العیاذ باللہ) [انتہی کلام الرافضی]

جوابات:

مذکورہ بالا بیان پر کئی طریق سے گفتگو کی جاسکتی ہے:

سب سے پہلے: ان سے یہ کہا جائے گا کہ ابن المطہر کا یہ قول کہ مسئلہ امامت اہم المطالب اور مسلمانوں کے اشرف ترین مسائل میں سے ہے؛ شیعہ وسنی علماء کرام کے اجماع کی روشنی میں بالاتفاق کذب ہے۔بلکہ ایسا کہنا کفر ہے۔اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان سے بڑھ کر کوئی اور مسئلہ اہم نہیں۔ یہ بات دین اسلام میں لازمی طور پر سب کو معلوم ہے۔اس لیے کہ کوئی کافر اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک وہ ''**لا إلـه إلا الله محمد رسول الله**'' کی گواہی نہ دیدے۔یہی وہ کلمہ ہے جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے کفار سے قتال کیا تھا۔جیسا کہ صحاح اور دوسری کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله أني رسول الله، ويقيموا الصلاة ويؤتوا الزكاة فإذا فعلوا ذلك عصموا منى دمائهم وأموالهم إلا بحقها.))[1]

''مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ

[1] البخاري ۱/ ۱۱۰ مسلم ۱/ ۵۲۔

دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کرلیں تو وہ مجھ سے اپنی جان اور مال محفوظ کرلیں گے مگر اسلام کے حق کیساتھ۔''

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ [التوبہ ۵]

''پس جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

حضرت رضی اللہ عنہ کو جب خیبر کی طرف بھیجا تو آپ سے یہی ارشاد فرمایا تھا۔ کفار کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی سیرت تھی۔ جب بھی وہ اپنے کفر سے توبہ کرلیتے تو ان کے اموال ونفوس کو امن حاصل ہوجاتا۔ کبھی بھی ان کے سامنے امامت کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبہ ۱۱]

''پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو دین میں تمھارے بھائی ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت میں صرف توبہ کرلینے کی وجہ سے انہیں دینی بھائی قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کفار جب عہد نبوی میں مشرف بہ اسلام ہوا کرتے تھے تو ان پر اسلامی احکام جاری کردیے جاتے تھے اور مسئلہ امامت کا ان کے سامنے ذکر تک نہ کیا جاتا۔ اور نہ ہی کسی اہل علم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات نقل کی ہے۔ نہ ہی کوئی خاص منقول ہے اور نہ ہی عام منقول۔ بلکہ ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب کوئی کافر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسلام قبول کرنا چاہتا تو آپ اس کے سامنے مسئلہ امامت کا اظہار تک نہیں فرمایا کرتے تھے۔ نہ مطلق طور پر اور نہ ہی مقید طور پر۔

پھر یہ مسئلہ اہم المطالب کیوں کر ہوا؟ اگر ہم بالفرض تسلیم بھی کرلیں کہ امامت کی معرفت ضروری ہے' تو پھر بھی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں انتقال کرگئے' انہیں اس مسئلہ کی معرفت کی ضرورت نہیں تھی۔ تو پھر یہ مسئلہ تمام مسائل دین سے اہم ترین اور اشرف ترین مسائل میں سے کیونکر ہوسکتا ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیا وہ لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہری و باطنی طور پر ایمان لائے' اور پھر دین اسلام پر قائم رہے' اس میں نہ ہی کوئی تبدیلی کی' اور نہ ہی ارتداد کے مرتکب ہوئے؛ کیا وہ باتفاق مسلمین [شیعہ وسنہ] تمام مخلوق سے بہترین لوگ نہیں تھے؟۔ ورنہ وہ مسلمانوں سے کیسے افضل ہوسکتے ہیں جو دین کے اہم ترین اور افضل ترین مسائل سے لابلد ہوں؟

اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارک میں خود امام تھے۔ اور امام کی ضرورت آپ کی وفات کے بعد پیش آئی۔ یہ مسئلہ کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں اہم ترین مسائل میں سے نہیں رہا۔ بلکہ آپ کی موت کے بعد دین کے اہم ترین مسائل میں سے ہوگیا۔

تو اس کے جواب کہا جائے گا کہ:

اول: اگر اس بات کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ مسئلہ مطلق طور پر دین کے اہم ترین مسائل میں سے

ہے ۔ بلکہ کبھی کبھار بعض اوقات میں ایسا ہوتا ہے ۔ باقی اوقات میں یہ نہ ہی دین کے اہم مطالب میں سے ہوتا ہے اور نہ ہی اشرف ترین مسائل میں سے ۔

دوم: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہر زمانے میں اور ہر جگہ پر امامت کی نسبت اہم ترین مسائل میں سے رہا ہے ۔پس امامت کا مسئلہ کسی طرح بھی اہم ترین مطلب اور اشرف ترین مسئلہ نہیں ہوسکتا۔

سوم: یہ کہا جائے گا کہ اگر واقعی یہ اتنا اہم ترین مسئلہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ پر واجب تھا کہ وہ باقی امت کے لیے اس مسئلہ کو بیان فرماتے ؛ جیسا کہ نماز' روزہ ؛ زکاۃ اور حج کے امور کو بیان فرمایا ہے ۔اور خاص کر اللہ تعالیٰ پر ایمان' اس کی توحید اور آخرت پر ایمان کو بیان کیا ہے ۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ان [رافضی] اصولوں کے مطابق امامت کا مسئلہ نہ ہی قرآن میں بیان ہوا ہے اور نہ ہی سنت میں ۔

اگر یہ کہا جائے کہ : امامت ہر زمانے میں اہم ترین مسئلہ رہی ہے ۔ نبی کریم ﷺ نبی بھی تھے اور امام بھی ۔اور یہ بات ہر اس آدمی کو معلوم ہے جو آپ پر ایمان لایا ہے کہ آپ اس وقت کے امام تھے ۔

ہم کہتے ہیں یہ عذر پیش کرنا کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے :

پہلی وجہ: کہنے والے کا یہ کہنا کہ : امامت احکام دین کے اہم ترین مطالب میں سے ہے ؛ یا تو اس سے مراد بارہ امام ہوں گے' یا پھر ہر زمانے میں متعین امام ہوگا۔ اس طرح سے کہ ہمارے اس زمانے میں امام غائب مہدی منتظر پر ایمان رکھنا ضروری ہوگا۔ جب کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امام ہونے پر ایمان رکھنا ضروری رہا ہوگا۔ اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بھی اہم آپ کی امامت پر ایمان رکھنا ہوگا۔ یا پھر اس سے مطلق امامت پر ایمان ہوگا' اس سے کوئی متعین شخص مراد نہیں ہوگا ۔ یا پھر اس سے کوئی چوتھا معنی مراد ہوگا۔

پہلا معنی: یہ بات اضطراری طور پر سب کو معلوم ہے کہ یہ مسئلہ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے درمیان مشہور و معروف تھا اور نہ ہی تابعین کرام کے درمیان ۔ بلکہ شیعہ خود کہتے ہیں : '' ان [ائمہ] میں سے ہر ایک اپنے سے پہلے امام کے متعین کرنے سے امام بنتا ہے ۔ پس یہ بات باطل ہوگئی کہ یہ مسئلہ دین کے اہم ترین امور میں سے ہے۔

دوسرا معنی: اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ ہر زمانے میں اس زمانے کے امام پر ایمان رکھا جائے ۔ تو اس لحاظ سے سن ۲۶۰ ہجری سے لیکر آج تک امام مہدی منتظر محمد بن حسن عسکری ہوگا۔ اور امامت پر ایمان رکھنا '' لا إله إلا الله محمد رسول الله '' کے اقرار ؛ اللہ تعالیٰ' فرشتوں' کتابوں اور رسولوں پر آخرت کے دن پر ایمان سے ؛ اور نماز' زکوٰۃ' روزہ' حج اور دیگر ارکان اسلام پر ایمان اور دیگر تمام واجبات سے بڑھ کر اہم ہوگا۔

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ دین میں اس طرح کی باتیں کرنا بالکل فاسد ہیں ۔ یہ امامیہ کا قول بھی نہیں ۔اس لیے کہ ان کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی امامت کا اہتمام مہدی منتظر کی امامت سے بہت بڑھ کر ہے ۔ جیسا کہ اس کتاب کے مصنف نے اور اس جیسے دیگر مشائخ نے نقل کیا ہے ۔امامیہ فرقہ کے پاس دین سے صرف یہ متاع باقی رہ گئی ہے کہ انہوں نے امام معدوم کو امام معصوم قرار دیا ہے ؛ جو کہ نہ انہیں دین میں کوئی فائدہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دنیا میں ۔ پس انہیں اس امام کی امامت پر ایمان رکھنے سے نہ ہی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کوئی دینی [یا اخروی] فائدہ ۔

اگر یہ کہیں کہ: ''اس سے مراد یہ ہے کہ مطلق طور پر امامت دین کے اہم ترین مطالب میں سے ہے۔ تو یہ کہنا بھی باطل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات بھی لازمی طور پر جانتے ہیں کہ دین کے دوسرے امور اس سے بڑھ کر اہم ہیں۔ اور اگر اس سے مقصود کوئی چوتھا معنی ہے تو شیعہ مصنف کو چاہیے کہ اس کی وضاحت کرے؛ تاکہ ہم اس پر بحث کر سکیں۔

دوسری وجہ: یہ کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کے امام ہونے کی وجہ سے آپ کی اطاعت لوگوں پر فرض نہ تھی؛ بلکہ لوگوں کی طرف آپ کے رسول ہونے کی وجہ سے اطاعت فرض تھی۔ یہ بات آپ کے لیے زندگی میں اور وفات کے بعد ہر حال میں ثابت ہے۔ آپ ﷺ کے بعد میں آنے والے لوگوں پر بھی آپ کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح آپ کے زمانے کے لوگوں پر فرض تھی۔ آپ کے اہل زمانہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو آپ کے پاس موجود ہوا کرتے تھے' اور آپ کے امر و نہی کو سماعت کیا کرتے تھے۔ اور کچھ دوسرے لوگ تھے' جو آپ کی مجلس سے غائب ہوتے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں شرکت کرنے والے لوگ ان تک شرعی احکام پہنچاتے۔ تو ان پر بھی اطاعت کرنا واجب ہوتی۔ ایسے ہی بعد میں آنے والے لوگوں کا معاملہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کا حکم عام ہے؛ اور ان تمام لوگوں کو شامل ہے چاہیے وہ آپ کی مجلس میں حاضر ہوں یا اس سے غائب ہوں۔ آپ کی زندگی میں اور اس کے بعد [جس تک بھی فرمان نبوت پہنچے' اس پر اس کا ماننا واجب ہو جاتا ہے]۔ یہ خصوصیت امامت کو حاصل نہیں۔ یہاں تک نبی کریم ﷺ نے کچھ خاص متعین لوگوں کو کچھ احکام دیے؛ اور کچھ متعین لوگوں کے لیے چند امور بیان کیے؛ مگر اس کے باوجود یہ احکام صرف ان لوگوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہوں گے؛ بلکہ ان جیسے دوسرے لوگوں کے لیے بھی یہ احکام ہوں گے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا اپنے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو یہ حکم دینا کہ:

''رکوع اور سجدہ میں مجھ پر سبقت نہ لے جاؤ۔''[1]

یہ حکم ہر مقتدی کے لیے ہے جو بھی امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو کہ رکوع اور سجدہ میں امام سے آگے نہ بڑھے۔

ایسے ہی [حج میں] رمی سے پہلے سر منڈوانے والے کیلئے آپ نے فرمایا تھا: ''اب رمی کر لو' اس میں کوئی حرج نہیں۔''

جس انسان نے حلق [سر منڈوانے] سے پہلے قربانی کر دی تھی' اس سے فرمایا: ''اب سر منڈوالو' کوئی حرج نہیں۔''[2]

جن لوگوں کے ساتھ اس کے بعد بھی اس طرح کا معاملہ پیش آ جائے ان کے لیے یہی حکم ہے۔

ایسے ہی جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ماہواری شروع ہو گئی تو آپ نے حکم دیا تھا:

''ایسے ہی کرتی جاؤ جیسے باقی حاجی کر رہے ہیں' صرف بیت اللہ کا طواف نہ کرنا۔''[3] اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

بخلاف امام کے جب اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اس کے بعد اس کے خلفاء کا معاملہ بھی امر و نہی کی تنفیذ میں کچھ ایسے ہی ہوتا ہے جیسے اس امام کی زندگی میں ہوتا ہے۔ پس ہر حکم دینے والا جب کسی ایسی بات کا حکم دیتا ہے جس میں اس کی اطاعت کرنی واجب ہو' تو حقیقت میں وہ رسول اللہ ﷺ کا حکم نافذ کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا اور ان پر آپ کی اطاعت فرض کر دی۔ اس وجہ سے نہیں کہ آپ حکمران ہیں اور آپ کے انصار و

---

[1] مسلم ۱/ ۳۲۰۔ ابن ماجة ۱/ ۳۰۸۔
[2] البخاری ۲/ ۱۷۳۔ مسلم ۲/ ۹۴۷۔
[3] البخاري ۲/ ۱۵۹۔

مدد گار ہیں۔ اور نہ ہی یہ وجہ ہے کہ کسی دوسرے نے آپ کی امامت کا عہد لیا ہے؛ اس طرح کی دیگر کوئی بات بھی نہیں۔ اور آپ کی اطاعت ان امور پر بھی موقوف نہیں جن پر خلیفہ معہود کی اطاعت موقوف ہوتی ہے۔ بلکہ اگر آپ کے ساتھ ایک آدمی بھی نہ ہو؛ اور تمام لوگ آپ کو جھٹلاتے رہیں' تب بھی آپ کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے[اس لیے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں]۔ مکہ میں ہجرت سے قبل جب آپ کے اعوان و انصار نہیں تھے' تب بھی آپ کی اطاعت واجب تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران]

''اور نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول، بیشک آپ سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر آپ فوت ہو جائیں، یا قتل کر دیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں پر پھر جاؤ گے اور جو اپنی ایڑیوں پر پھر جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو جلد جزا دے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا ہے کہ [اگر بالفرض] آپ کو قتل کر دیا جائے' یا طبعی وفات ہو جائے؛ تب بھی اس سے رسالت کے حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ جس طرح ائمہ کی موت سے یا قتل کر دیے جانے سے امامت کی اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ اور نبی ہونے کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ نبی ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے اور اس پر کبھی موت نہ آئے۔ اس لیے کہ آپ رب نہیں ہیں' بلکہ بیشک آپ رسول ہیں' اور آپ سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔

آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کیا' اللہ تعالیٰ کی امانت لوگوں تک پہنچا دی؛ اور امت کے لیے خیر خواہی کی؛ اور اللہ کی راہ میں ایسے جہاد کیا جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور پھر اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتے رہے یہاں تک کہ موت آ گئی۔ پس آپ کی اطاعت جیسے آپ کی زندگی میں واجب تھی' ایسے ہی موت کے بعد بھی واجب ہے' بلکہ زیادہ تاکیدی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ دین مکمل ہو گیا' اور آپ ﷺ کی موت سے احکام شریعت میں استقرار و ٹھہراؤ آ گیا۔ اب اس میں کسی چیز کے منسوخ [یا تبدیل] ہونے کا امکان باقی نہیں رہا۔ اسی لیے آپ ﷺ کی موت کے بعد قرآن مجید جمع کیا گیا۔

جب کوئی اعتراض کرنے والا یہ بات کہے کہ: ''بیشک آپ اپنی حیات مبارکہ میں خود امام تھے' اور آپ کے بعد دوسرے لوگ امام بن گئے۔ اگر ایسا کہنے سے مقصود یہ ہو کہ یہ امام بھی ایسے ہی واجب الاطاعت ہے جیسے رسول کی اطاعت کی جاتی ہے؛ تو ایسا کہنا سراسر باطل ہے۔ اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ امام آپ کے بعد خلیفہ بنا تھا تا کہ آپ ﷺ کے امر و نہی کو نافذ کرے؛ تو ایسا تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی ہوتا رہا ہے۔ اس لیے کہ جب بھی آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اپنے پیچھے کسی کو نگران چھوڑ کر جاتے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے اپنی زندگی کے برعکس موت کے بعد حکم دے کر کسی کو متعین نہیں کیا تھا۔

تو اس سے کہا جائے گا کہ: ''امیر کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے اس کا نام لے کر متعین کیا جانا ضروری نہیں۔ بلکہ جس تک کہ اس کے اوامر و نواہی پہنچیں ان پر اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ جیسا کہ جو انسان خود کلام سماعت کر رہا ہو' اس پر اطاعت واجب ہوتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

'' حاضرین کو چاہیے کہ وہ غائب لوگوں تک بات پہنچا دیں۔ بیشتر اوقات جس تک بات پہنچائی جاتی ہے' وہ بات

پہنچانے والے سے بڑھ کر یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔''❶

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ ﷺ اپنی حیات مبارک میں متعین معاملات میں فیصلے کیا کرتے تھے' جیسا کہ کسی شخص کو کچھ عطاء کرنا' کسی خاص شخص پر حد لگانا؛ خاص لشکر کو روانہ کرنا۔

تو اس سے کہا جائے گا کہ: یہ بالکل درست ہے۔اور اس طرح کے میں مسائل آپ کی اطاعت قیامت تک کے لیے واجب ہے؛ برخلاف ائمہ کے۔لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایسے مسائل پر استدلال مخفی رہتا ہے۔جیسا کہ آپ کی مجلس سے غائبین پر علم مخفی رہتا ہے۔ پس جو انسان آپ کی مجلس میں موجود ہو' وہ غائب کی بہ نسبت آپ کے قول کو زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اگر چہ غائبین میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو براہ راست سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔لوگوں میں ایسا فرق آپ کے امر و نہی کو سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس ان پر اطاعت کے واجب ہونے میں کوئی فرق نہیں۔

آپ کے بعد بھی ولی امر کی اطاعت ایسے ہی واجب ہے جیسے آپ کی حیات مبارک میں آپ کے متعین کردہ اولیاء الامر کی اطاعت واجب تھی۔آپ کی اطاعت تمام لوگوں کو یکساں طور پر شامل ہے۔اگر چہ ان کے سننے' سمجھنے اور فہم کے مراتب میں فرق ہے۔بعض لوگوں تک وہ احکام پہنچتے ہیں جو دوسروں تک نہیں پہنچے ہوتے۔اور کچھ لوگ آپ کی مجلس میں شرف سماعت سے باریاب ہوتے ہیں جو کہ کسی دوسرے انسان کو نہیں مل پاتا۔اور کچھ لوگ اس حدیث کو ایسے سمجھ لیتے ہیں جیسے دوسرے نہیں سمجھ سکتے۔

پس جو کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حکم جاری کرے تو اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔حقیقت میں یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے'اس انسان کی نہیں۔جب لوگوں پر کوئی ایسا حکمران ہو' جو صاحب شان وشوکت ہو'اور احکام نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو'اور وہ [احکام شریعت کے مطابق] حکم یا آرڈر جاری کرے؛ تو اس کے ساتھ مل جانا چاہیے؛ تو پھر جائز نہیں کہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو حاکم بنایا جائے۔پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کوئی انسان اس جیسا اور نہ ہو۔بلکہ کوئی ایسا انسان ہوسکتا ہے جو دوسرے کی بہ نسبت آپ کے زیادہ قریب ہو۔

خلافت نبوت کا سب سے زیادہ حق دار وہ انسان ہے جو آپ کے اوامر ونواہی کو جاری کرنے کے زیادہ قریب تر ہو۔ اور لوگ حکام کی اطاعت غالب طور پر اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کوئی قوت والا حکمران ان پر بات ماننے کو واجب نہ کردے۔جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں بہت سارے لوگوں نے ظاہری طور پر آپ کی اطاعت اس وقت تک نہیں کی جب تک کہ آپ کو انصار و مددگار میسر نہیں آگئے؛ جو آپ کی بات منوانے کے لیے جنگ وقتال تک کرتے تھے۔دین سارے کا سارا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی دین ہے۔پس جو کوئی رسول کی اطاعت کرتا ہے گویا کہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

آپ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں کا دین اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔اور حاکم وقت کی ایسے امور میں اطاعت کرنا جن کا حکم شریعت میں موجود ہو' حقیقت میں یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔[ایسے میں] حاکم وقت کا حکم دراصل اللہ کا حکم ہوتا ہے؛ جس کا اسے حکم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں یہ حکم جاری کرے۔حکمران کا حکم ماننا

---

❶ رواہ البخاری ۲/ ۱۷۶۔

[جب وہ احکام شریعت کے مطابق ہوتو] حقیقت میں اللہ کا حکم ماننا ہے۔ائمہ اور امت کے وہ اعمال جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور جن کے کرنے پر وہ راضی ہوتا ہے' حقیقت میں وہ تمام اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے کام ہیں۔اسی لیے دین کی اصل بنیاد ''**لا إله إلا الله محمد رسول الله** '' کی گواہی کا اقرار ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ ﷺ امام تھے' اور آپ کی امامت رسالت سے خارج چیز تھی۔یا آپ کی امامت میں کچھ ایسی شرائط تھیں جو رسالت میں نہیں تھیں؛ یا آپ کی امامت ایسی تھی جس میں رسالت سے ہٹ کر اطاعت واجب تھی۔ یہ تمام باتیں باطل [اور دروغ گوئی] ہیں۔اس لیے کہ آپ ﷺ کی ہر قابل اطاعت بات آپ کی رسالت میں شامل ہے۔ ہر وہ بات جس میں آپ کی اطاعت کی جاتی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ واجب الاطاعت رسول ہیں۔اور اگر یہ بات مان لی جائے کہ بالفرض آپ صرف امام ہیں ؛ تو آپ کی اطاعت اس وقت تک نہ کی جاسکتی جب تک آپ کی اطاعت کسی دوسرے رسول کی اطاعت کے زمرے میں نہ آتی۔اس لیے کہ اطاعت حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول کی ہے' اور پھر ان لوگوں کی جن کی اطاعت کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کی امامت کی وجہ سے آپ کی اطاعت کی گئی ؛ اور یہ اطاعت مسئلہ رسالت میں شامل تھی۔تو پھر اس بات کی کوئی تاثیر باقی نہیں رہتی۔اس لیے کہ صرف رسالت کا ہونا آپ کی اطاعت کے واجب ہونے کے لیے کافی ہے برعکس امام کے۔ بیشک امام اس وقت امام بنتا ہے جب اس کے اعوان و انصار و مددگار ہوں جو اس کے حکم کو نافذ کریں۔اگر ایسا نہ ہو تو وہ بھی کسی عام اہل علم اور اہل دین انسان کی طرح ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو مدینہ طیبہ میں انصار و مددگار میسر آ گئے تو آپ رسالت کے ساتھ ساتھ عادل امام بھی بن گئے۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: بلکہ آپ ایسے رسول ہو گئے جنہیں مددگار و انصار میسر آئے جو آپ کے احکام کو نافذ کرتے' اور آپ کے مخالفین سے جہاد کرتے۔اور [یہ عہد کیا کہ] جب تک ایک بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والا انسان روئے زمین پر موجود ہے' وہ ایسا کرتے رہیں گے' آپ کے احکام کو نافذ کرتے رہیں گے' اور اس کی مخالفت کرنے والوں سے جہاد کرتے رہیں گے۔اس میں کوئی حاکمیت یا امامت والی ایسی بات نہیں تھی جس کے ہونے سے رسالت کے باب میں کوئی خاص فائدہ ہو۔ اس لیے کہ یہ تمام امور خود رسالت میں شامل ہیں ۔لیکن ان انصار کی وجہ سے آپ کو کمال قدرت حاصل ہوگئی۔اور آپ پر اوامر نازل ہوئے' جہاد واجب ہوا جو کہ اس قدرت سے پہلے واجب نہیں تھا۔پس یہ احکام علم اور عدم علم ؛ قدرت اور عاجزی میں اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں؛ جیسا کہ محتاج اور مالدار' مریض اور صحت مند ہونے کی بنا پر مختلف ہوتے ہیں۔مؤمن ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار ہوتا ہے؛ اور تمام امور میں رسول اللہ ﷺ کا اطاعت گزار ہوتا ہے۔محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' آپ جس بات کا حکم دیتے ہیں' اور جس بات سے منع کرتے ہیں' ان تمام باتوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے ہوتے ہیں۔

[شبہ]: اگر امامیہ فرقہ کے لوگ کہیں کہ: رسالت کے برعکس امامت از روئے عقل واجب ہوتی ہے۔اس لیے یہ اہم ترین مسائل میں سے ہے۔

[جواب]: وجوب عقلی میں نزاع ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ اگر عقلی وجوب کو مان لیا جائے؛ تو اس نے امامت کا وجوب باقی عقلی واجبات کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ جب کہ دوسرے عقلی واجبات امامت سے بڑھ کر اوجب الواجابت ہیں جیسے: توحید؛ صداقت؛ اور عدل اور دوسرے عقلی واجبات ۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اس واجب سے انسان کو ملنے والا پیغام رسالت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ رسولوں پر ایمان لانے سے امامت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے؛ آپ کی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی؛ بخلاف امامت کے۔ پس جس انسان کے ہاں یہ ثابت ہو گیا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؛ اور آپ کی اطاعت اس پر واجب ہے؛ اور اس نے حسب استطاعت اتباع و اطاعت کی کوشش بھی کی ۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کی وجہ سے وہ انسان جنت میں چلا گیا؛ تو پھر یہ انسان امامت سے بے نیاز ہو گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت گزاری کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا تو اس نے ایک ایسی بات کہی جو کہ قرآن و سنت کی صریح نصوص کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر ان لوگوں کے لیے جنت کو واجب کیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں ۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ اور رفیق ہونے کے لحاظ سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ [النساء ۱۳]

''یہ اللہ کی حدود ہیں۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

بنا بریں صاحب الزمان جس کی طرف یہ لوگ بلاتے ہیں؛ لوگوں کے پاس اس کی معرفت حاصل کرنے کی کوئی راہ نہیں۔ اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں کس بات کا حکم دیتا ہے اور کس چیز سے منع کرتا ہے؛ اور انہیں کس بات کی خبر دے رہا ہے۔ اگر کوئی انسان امام کی اطاعت کے بغیر خوش بخت نہیں ہو سکتا؛ تو پھر اس سے لازم آتا ہے کہ کوئی بھی انسان جہاں میں نیک و خوش بخت نہ ہو؛ اور نہ ہی کوئی ایک نجات پا سکے؛ اور نہ ہی کسی ایک کے لیے؛ اطاعت الٰہی کی کوئی راہ ہوتی۔ اور یہ انسان کی طاقت سے بڑھ کر مکلف ٹھہرائے جانے کی سب سے بڑی مثال ہوتی۔ حالانکہ لوگ اس کے سب سے زیادہ محتاج تھے۔

[شبہ]: اگر یہ کہا جائے کہ: ''امام غائب اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس پر امامیہ فرقہ کے لوگ چل رہے ہیں۔''

[جواب]: تو ان سے کہا جائے گا کہ تو پھر اس امام کے وجود یا شہود کی کوئی حاجت ہی نہیں۔ اس لیے کہ اگر اس امام منتظر کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لیے آنے والے احکام معلوم ہو رہے ہیں تو پھر اس امام کی چنداں ضرورت نہیں خواہ یہ امام زندہ ہو یا مردہ؛ حاضر ہو یا غائب ۔ نہ ہی اس کی کوئی حاجت باقی رہتی ہے؛ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نجات کا

دارو مدار یا کسی ایک کی سعادت و شقاوت اس امام کی اطاعت پر منحصر ہے۔اس صورت حال میں ایسے امام کی امامت کا کہنا ممتنع ہوجاتا ہے۔ چہ جائے کہ اس امام کی اطاعت کو واجب قرار دیا جائے۔ یہ بات ہر اس انسان کے لیے واضح ہے جو معمولی سا بھی غور وفکر کرلے۔

لیکن رافضی لوگوں میں سب سے بڑھ کر جاہل ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلی اور شرعی واجبات کو بجالانا؛اور عقلی و شرعی قبیحات کو ترک کرنا یا تو اس معرفت پر منحصر ہوگا کہ کوئی انہیں اس امام کی طرف سے یہ احکام پہنچائے؛ یا اس پر موقوف نہیں ہوگا۔اگر یہ کہا جائے کہ اس معرفت پر موقوف ہے' تو اس سے انسان کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف لازم آتی ہے۔اس لیے کہ واجبات کا بجالانا اور محرمات سے اجتناب کرنا ایسی شرط پر موقوف کردیا ہے جس پر عام لوگ قدرت نہیں رکھتے۔بلکہ کوئی انسان اس پر قادر ہی نہیں۔اس لیے کہ جہاں میں کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جو صداقت کے ساتھ یہ دعوی کرسکے کہ اس نے امام منتظر کو دیکھا ہے یا اس کا کوئی کلام سنا ہے۔

اگر ایسا نہ ہو کہ عقلی و شرعی واجبات کا بجالانا اور عقلی و شرعی منکرات کا ترک کرنا[اس امام کی معرفت پر موقوف نہ ہو] امام منتظر کے بغیر بھی ممکن ہو؛ تو پھر اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ ہی اس امام کے وجوب یا شہود کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان رافضہ نے مخلوق کی نجات'ان کی سعادت اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو ایسی ممتنع شرط کے ساتھ معلق کردیا ہے جس پر لوگ قدرت نہیں رکھتے؛اور نہ ہی رافضیوں میں سے کوئی ایک اس پر قدرت رکھتا ہے۔

اور لوگوں سے کہتے ہیں:اس کے بغیر کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات نہیں حاصل کرسکتا۔اور نہ ہی کوئی اس کے بغیر خوش بخت ہوسکتا ہے۔اور نہ ہی کوئی اس کے بغیر ایماندار ہوسکتا ہے۔پس ان پر دو باتوں میں سے ایک لازم آتی ہے:

۱۔ یا تو ان کا یہ قول ہی سرے سے باطل ہوگا۔

۲۔ یا پھر یہ کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوچکے ہوں' اور اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے لیے عذاب واجب کردیا ہو' جس میں مسلمان اور دوسرے لوگ سب شامل ہیں۔پس اس تقدیر کی بنا پر یہ سب سے پہلے عذاب پانے والے بد بخت ہوں گے۔اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی اس امام کے احکام اوامر ونواہی اور اخبار کی معرفت حاصل کرنے کی کوئی راہ ہی نہیں جس کے بارے میں ان[شیعہ حضرات] کا عقیدہ ہے کہ امام غائب ہے مگر موجود ہے۔

بلکہ رافضی مشائخ کے ہاں کچھ ایسے اقوال منقول ہیں جن کے بارے میں ان کے ائمہ متقدمین کہتے ہیں کہ یہ اقوال امام منتظر سے منقول ہیں۔حالانکہ امام غائب سے کچھ بھی منقول نہیں ہے۔اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم نے امام غائب سے کچھ اقوال نقل کیے ہیں' تو وہ اپنے اس دعوی میں جھوٹا ہے۔

روافض سے کہا جائے گا کہ جو شریعت تمہارے پاس موجود ہے اگر دینی ضرورت کے لیے کافی ہے تو امام منتظر کی ضرورت نہیں،اور اگر ناکافی ہے تو تم نے خود ہی اپنے معذب اور بد بخت ہونے کا اقرار کرلیا اور اپنے دین کے ناقص ہونے کا اعتراف کرلیا اور یہ تسلیم کرلیا کہ تمہاری سعادت آنے والے امام کے حکم کے تابع ہے اور یہ معلوم نہیں کہ وہ کیا حکم صادر کرے گا۔میں نے رافضہ کے مشائخ کی ایک جماعت کو دیکھا ہے' جیسا کہ ابن العود الحلی؛ اس کا قول ہے:

''جب امامیہ کے کسی مسئلہ میں دو قول میں اختلاف ہو؛ ایک قول کا قائل معلوم ہو اور دوسرے کا نامعلوم۔تو جس قول کا

قائل معلوم نہیں وہی حق ہے، جس کی اتباع کرنا واجب ہے؛ اس لیے کہ اما معصوم جس کا انتظار کیا جا رہا ہے اسی گروہ میں شامل ہے۔ یہ ان لوگوں کی جہالت اور گمراہی کی انتہاء ہے۔اس لیے کہ اگر امام منتظر کے وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ اس نے یہ بات کہی ہے یا نہیں۔اس لیے کہ کسی ایک نے امام سے یہ قول نقل نہیں کیا۔ اور نہ ہی امام سے نقل کرنے والوں سے کسی نے روایت کیا ہے۔تو پھر یقینی طور پر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس امام کا ہی قول ہے۔پھر دوسرے قول کے لیے کیسے یہ جائز نہیں ہوسکتا کہ وہ اس امام غائب کا قول ہو؟۔اس لیے کہ امام کے لیے اس کی غیبت اور ظالموں کے خوف کی وجہ سے اپنے قول کا اظہار کرنا تو ناممکن ہے؟ جیسا کہ ان لوگوں کا دعوی ہے۔

خلاصہ کلام ! شیعہ کا دین مجہول و معدوم پر مبنی ہے۔معلوم اور موجود پر مبنی نہیں۔ان کا گمان ہے کہ ان کا امام موجود اور معصوم ہے۔حالانکہ امام مفقود اور معدوم ہے۔اور[بالفرض]اگر وہ موجود اور معصوم بھی ہو؛ تو پھر بھی یہ لوگ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ امام کے اوامر ونواہی جاننے پر ایسے قادر نہیں ہیں جیسے اس امام کے باپ دادا کے اوامر ونواہی جاننے پر قادر تھے۔ امام سے مقصود یہ ہے کہ اسکے اوامر و احکام کی اطاعت کی جائے ۔ جب اس کے احکام معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں؛ تو اس امام کی اطاعت واجب نہیں ہوتی[بلکہ ممنوع ٹھہرتی ہے]۔جب امامت کا مقصود ہی ممتنع ہے؛ تو عقل ونقل کے اعتبار سے اس کی امامت بے کار ہے۔اور اس وسیلہ کے اثبات میں درحقیقت کوئی بھی فائدہ نہیں۔ بلکہ ایسے وسیلہ کو ثابت کرنا جس سے مقصود حاصل نہ ہوتا ہو؛ بے کار' بے فائدہ' جہالت اور حماقت و عذاب پر مبنی ہے؛ اس پر نہ صرف تمام اہل شریعت کا بلکہ اس پر تمام عقلاء کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ جب اہل عقل کسی قبیح چیز کی تفسیر کسی نقصان دہ امر سے کرتے ہیں تو ان کا اس بات پر اتفاق ہوتا ہے کہ اس نقصان وضرر کو عقل سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اس امام غائب پر ایمان رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں ۔ بلکہ مال و بدن' نفس اور عقل ہر لحاظ سے مضر اور عقلاً وشرعاً قبیح ہے۔ اسی لیے اس امام کے پیروکار دین و دنیا کی مصلحتوں سے لوگوں میں سب سے زیادہ دور رہنے والے ہوتے ہیں ۔ان کو دین و دنیا کی کوئی بھی مصلحت نہیں مل پاتی۔ جب تک کہ وہ کسی دوسرے کی اطاعت میں داخل نہ ہو جائیں[یا پھر اپنے اس امام کی اطاعت کو کلی یا جزی طور پر ترک نہ کردیں]۔جیسا کہ یہودیوں کا حال ہے وہ اس وقت تک کوئی مصلحت حاصل نہیں کر سکتے جب تک وہ ان دوسرے لوگوں کا سہارا نہ لے لیں جو ان کے دین سے باہر کے افراد ہیں۔

شیعہ امام منتظر کے وجود کو ازبس ضروری قرار دیتے ہیں،اور اس کی عصمت کے قائل ہیں، وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ دین و دنیا کی مصلحتیں وجود امام سے وابستہ ہیں۔شیعہ کا یہ خیال اس لئے درست نہیں کہ امام منتظر کے عقیدہ سے انہیں کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ حاصل نہیں ہوا، اور جو لوگ اس کے قائل نہیں، ان کو کوئی دینی و دنیوی نقصان نہیں پہنچا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

بلکہ دوسرے لوگ اس امام کے متبعین سے بڑھ کر دین و دنیا کی مصلحتوں کے پانے والے ہیں۔اس سے معلوم ہوگیا کہ امامت کے عقیدہ سے سوائے رسوائی اور ندامت کے کوئی چیز نہیں مل سکی۔اور اس عقیدہ میں کوئی عزت اور کرامت والی بات ہرگز نہیں پائی جاتی۔اگر امام کی اطاعت کا واجب ہونا دین کے اہم ترین مطالب میں سے ہے تو رافضہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر دین کے بڑے اہم ترین مطالب سے دور رہنے والے ہیں۔اور اگر ایسا نہیں تو ان لوگوں کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے' اور ان کے دعوی کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ ہر دو لحاظ سے شیعہ کا قول باطل ہے۔

امام منتظر پر ایمان لانا ضروری نہیں:

[اشکال]: اگر شیعہ کہیں کہ ہم امام منتظر پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے بہت سے عابد و زاہد حضرت الیاس، حضرت خضر اور غوث و قطب بزرگوں اور دوسرے غائبین پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ نہ ان کے وجود کا کچھ پتہ ہے اور نہ ان کے اوامر نواہی کا۔ پھر جو لوگ ان [صوفیاء] کی موافقت کرتے ہیں؛ ان کیلئے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارے دعوی پر رد کرے؟

[جواب]: اس سے کہا جائے گا کہ: اس بات کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات : ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ: ''مسلمانوں کے کسی معروف عالم یا کسی معروف جماعت کے نزدیک ان پر ایمان لانا ضروری نہیں؛ اور کوئی ایسا بھی نہیں جو ان پر ایمان لانے کو واجب قرار دیتا ہو۔ اگر چہ بعض غالی فرقے اپنے اصحاب کے لیے اس چیز پر ایمان رکھنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: کوئی مؤمن اس وقت تک اللہ کا ولی نہیں ہوسکتا جب تک ان لوگوں کے اس زمانے میں موجود ہونے پر ایمان نہ لائے۔ [مگر جمہور مسلمین کے ہاں اس کلام کی کوئی قدر و قیمت نہیں] ان کا قول اسی طرح مردود ہے جیسے شیعہ کا قول۔

دوسری بات : یہ کہا جائے گا کہ: لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کا خیال ہے کہ ان لوگوں کے وجود پر ایمان رکھنے سے انسان کا ایمان؛ خیر و بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتے ہیں۔ زہاد زیادہ سے زیادہ یہ بات کہتے ہیں کہ: ''ان کی تصدیق کرنے والا ان کے منکر سے زیادہ افضل و اشرف اور کامل ہے۔ یہ قول ہر لحاظ سے رافضیوں کے قول کے مشابہ نہیں ہے۔ بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ اقوال آپس میں مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے کمال دین کو اس تصدیق پر موقوف کردیا ہے۔ پس اس وقت کہا جائے گا کہ مسلمان علماء اور ان کے ائمہ کا اس قول کے باطل ہونے پر اتفاق ہے۔ اس لیے کہ واجبات اور مستحبات کا علم' اور واجبات و مستحبات کا بجالانا ان کی تصدیق پر موقوف نہیں ہے۔ بعض اہل زہد و عابدین اور عوام الناس کا یہ خیال کرنا کہ دین کی کوئی بھی چیز واجب یا مستحب ان لوگوں کی تصدیق پر موقوف ہے؛ تو یہ ان لوگوں کی جہالت اور گمراہی پر مبنی قول ہے' اس پر کتاب و سنت کے جاننے والے اہل علم کا اتفاق ہے۔ اور دین میں یہ بات اضطراری طور پر معلوم اور ایک بدیہی امر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصدیق کو مشروع قرار نہیں دیا، اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور علماء اسلام میں سے کوئی ایک اس تصدیق کو امور دین میں سے سمجھتا تھا۔ اور ایسے ہی یہ تمام الفاظ: غوث؛ قطب؛ اوتاد؛ نجباء وغیرہ کے الفاظ کسی ایک نے بھی نبی کریم ﷺ سے کسی معروف سند کے ساتھ نقل نہیں کیے؛ اور نہ ہی یہ الفاظ نبی کریم ﷺ نے یہ الفاظ اپنی زبان مبارک پر لائے ہیں؛ اور نہ ہی صحابہ کرام نے۔ لیکن لفظ ابدال بعض سلف سے منقول ہے۔ اور اس بارے میں نبی کریم ﷺ سے ایک ضعیف روایت نقل کی گئی ہے؛ جس پر ہم کئی ایک جگہ پر تفصیلی کلام کرچکے ہیں۔ ❶

❶ یہ حدیث مسند احمد میں وارد ہوئی ہے: ۲/ ۱۷۱؛ تحقیق احمد شاکر۔ سلطان العلماء العز بن عبدالسلام السلمی المتوفی (۵۷۷۔۶۶۰) لکھتے ہیں کہ ابدال، غوث، قطب اور نجباء کے ناموں کی دین میں کوئی اصل نہیں اور یہ کسی حدیث صحیح و ضعیف میں نبی ﷺ سے منقول نہیں۔

بعض صوفیاء کا شرک فی ربوبیت:

تیسری بات: یہ بات کہنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں' جن کا کسی بشر کی طرف منسوب کرنا ہرگز جائز نہیں ۔ مثلاً: بعض لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ قطب وغوث ہدایت ونصرت اور رزق میں اہل زمین کی امداد کرتے ہیں اور یہ چیزیں انکے توسط کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ دعوی باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اور ایسا کہنے والا شخص گمراہ ہے اور اس کا قول اس باب میں نصاریٰ کے قول سے ملتا جلتا ہے۔ جیسے کہ ان میں سے بعض لوگ یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان اولیاء میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے ہر ولی کو جانتا ہے' جو موجود ہے یا جو ولی ہونے والا ہے؛ اس ولی کے نام' اس کے باپ کے نام اور اللہ کے ہاں اس کے مقام ومرتبہ سے بھی واقف کار ہے۔ اور اس طرح کی دیگر کئی باطل باتیں ایسے لوگوں کے عقیدہ میں شامل ہیں۔ جو اس امر کو متضمن ہیں کہ بعض بشر بعض خصائص میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں۔ مثال کے طور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کا جاننے والا ہے۔ اور ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ اس طرح کا دعوی بعض لوگ نبی کریم ﷺ اور اپنے شیوخ کے بارے میں کرتے ہیں کہ ان کا علم اللہ کے علم وقدرت پر حاوی ہے اور وہ اسی قسم کے علم و قدرت سے بہرہ ور ہیں جیسے ذات الٰہی۔ پس وہ ہر اس چیز کو جانتے ہیں جسے اللہ جانتا ہے' اور ہر اس چیز پر قدرت رکھتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا ہے۔ اس طرح کے عقائد واقوال بالکل نصاری اور غالی شیعہ کے اقوال کی جنس سے ہیں۔ اور ان عقائد واقوال کے باطل ہونے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ایسی کرامات' مکاشفات اور اجابت دعاء کے قصے اور ان کی طرف ایسی چیزیں منسوب کرتے ہیں جن کا کسی نبی یا نیک مسلمان کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ یہ لوگ ایسی باتیں کسی معدوم کی طرف منسوب کرنے میں اگرچہ خطاء کار ہیں؛ لیکن ان کی خطاء اس شخص کی غلطی کی طرح ہے جو یہ گمان رکھتا ہو کہ فلاں شہر میں اولیاء اللہ ہیں' حالانکہ وہاں کوئی بھی نہ ہو۔ یا پھر وہ انسان جو کہ بعض لوگوں کے متعلق گمان رکھتا ہو کہ وہ اولیاء اللہ ہیں' مگر وہ اولیاء اللہ نہ ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کے اعتقادات وخیالات گمراہی؛ جہالت اور خطا ہیں جن میں بہت سارے لوگ مبتلا ہیں۔ لیکن امامیہ کی خطاء اور گمراہی ان سب سے بڑھ کر اور قبیح ہے۔

الیاس اور خضر کی وفات:

چوتھی بات: یہ کہا جائے گا کہ: محققین علماء کرام کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ حضرت خضر والیاس فوت ہو چکے ہیں۔[1] نیز یہ کہ اللہ عزوجل اور مخلوق کے پیدا کرنے' ان کو روزی اور ہدایت دینے اور ان کی نصرت کرنے میں کسی مخلوق کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مرسلین کا واسطہ فقط تبلیغ رسالت کا ہے۔ اور کسی انسان کو مرسلین کی اطاعت کے بغیر کبھی کوئی سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب کہ مخلوق کے لیے رزق رسانی؛ ہدایت' نصرت اور پیدائش پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو کوئی قدرت حاصل نہیں۔ یہ امور انبیاء کرام کی حیات وموت پر منحصر نہیں۔ بلکہ مخلوق کی پیدائش اور ان کے لیے رزق رسانی حقیقت میں رسولوں کے وجود پر بھی منحصر نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کبھی ملائکہ کے واسطہ سے کچھ پیدا کرتے ہیں' اور کبھی اس میں کوئی انسان سبب بنتا

[1] سنت اللہ یہی چلی آتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام یا غیر انبیاء سب وقت مقرر پر فوت ہو جاتے ہیں، جو شخص دین اسلام کی طرف ایسی نص منسوب کرے جو اس کے خلاف ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے منظر عام پر لائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح حدیث میں ایسی کوئی نص موجود نہیں ہے۔

ہے ۔جیسا کہ مخلوق میں یہ اسباب عوام الناس میں معروف ہیں ۔

اب یہ کہنا کہ یہ امور بشری واسطہ کے بغیر نہیں ہو سکتے ۔ یا بشر میں سے کوئی ایک ان تمام امور پر قادر ہے؛ یا اس طرح کی دیگر باتیں ۔ یہ سب چیزیں باطل ہیں ۔تو پھر رافضیوں سے کہا جائے گا کہ: جب گمراہی پر کسی گمراہی و ضلالت سے استدلال کرتے ہیں تو پھر [اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد رکھنے کے قابل ہے کہ]:

﴿وَلَنْ يَّنفَعَكُمُ الْيَوْمَ إِذْ ظَلَمْتُمْ أَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ﴾ [الزخرف ۳۹]

''اور آج یہ بات تمہیں ہرگز نفع نہ دے گی ، جب کہ تم نے ظلم کیا کہ بے شک تم (سب) عذاب میں شریک ہو۔''

مزید برآں یہ بات بھی معلوم ہے کہ مسلمانوں کے اشرف ترین مسائل اور اہم ترین مطالب کے لیے ضروری ہے کہ دوسرے مسائل کی بہ نسبت ان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہو۔ اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی دوسرے مسائل کی بہ نسبت ان مسائل کا بیان کرنا زیادہ ضروری تھا۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی توحید' اس کے اسماء و صفات ؛ ملائکہ' کتب اور مرسلین ؛ یوم آخرت' قصص' اَمر و نہی ؛ حدود و فرائض کے احکام سے بھرا ہوا ہے؛ بخلاف امامت کے ۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن میں اہم اور اشرف ترین مسائل کا بیان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سعادت کو ایسے مسئلہ کے ساتھ معلق کر دیا ہے جس میں امامت کا ذکر تک نہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہے تو ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین، شہیدوں اور صالحین کے ساتھ اور رفیق ہونے کے لحاظ سے یہ لوگ کتنے اچھے ہیں ۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ☆ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾

[النساء ۱۳۔۱۴]

''پس جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا (تو) اللہ اس کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اللہ کی حدود سے آگے نکل جائے اللہ اسے دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اسے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے کہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا' وہ آخرت میں خوش بخت ٹھہرے گا۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے' اور ان کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے' تو اسے عذاب دیا جائے گا۔ سعادت مندوں اور اہل شقاوت کے درمیان یہ فرق ہے۔ مگر امامت کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے۔

اگر کوئی انسان یہ بات کہے کہ: ''امامت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہے۔''

تو اس سے کہا جائے گا کہ: اس کی انتہاء یہ ہوسکتی ہے دوسرے بعض واجبات کی طرح ہو' جیسے: نماز' روزہ' زکاۃ' حج اور دوسرے واجبات ؛ جو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں داخل ہیں۔تو پھر صرف امامت کیوں کر دین کے اشرف ترین مسائل اور اہم ترین مطالب میں سے ہوسکتی ہے؟۔

[اشکال]: اگر کوئی یہ کہے کہ: رسول اللہ ﷺ کی اطاعت امام کی اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ؛ اس لیے کہ امام ہی وہ ہستی ہے جو شریعت کی معرفت رکھتی ہے۔''

[جواب]: تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''تمہارے مذہب کا یہی دعوی ہے ؛ جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ امامت کے مسئلہ پر قرآن میں کہیں بھی کوئی دلیل ایسے نہیں پائی جاتی جیسے باقی تمام اصول دین کے متعلق دلائل موجود ہیں ۔اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ جس امام کے دعویدار یہ لوگ ہیں' اس امام سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔اور مزید بیان آگے آئے گا کہ جو پیغام رسول لے کر آئے ہیں' اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے کسی امام کی کوئی ضرورت نہیں۔

امامیہ کے ہاں اصول دین:

امامیہ کے ہاں چار اصول ہیں: ۱۔توحید ۲۔عدل ۳۔نبوت ۴۔امامت۔

امامت آخری مرتبہ ہے' جب کہ توحید' عدل اور نبوت کا درجہ اس سے پہلے کا ہے۔ یہ لوگ توحید میں صفات الٰہیہ کی نفی کو داخل کرتے ہیں۔اور یہ کہ قرآن مخلوق ہے ۔اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوگا۔اور عدل میں قدر کی تکذیب کو شمار کرتے ہیں۔اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت سے نواز دے۔اور نہ ہی کسی کو گمراہ کرنے پر قادر ہے۔اور کبھی اللہ تعالیٰ ایسی چیز کو چاہتے ہیں جو نہیں ہوسکتی۔اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر بھی نہیں ہے۔اور نہ ہی ایسے ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہو جائے۔اور جو نہ چاہے وہ نہ ہو۔لیکن اس کے باوجود توحید' عدل اور نبوت امامت پر مقدم ہیں۔ تو پھر امامت کیسے اشرف ترین اور اہم ترین مسائل میں سے ہوسکتی ہے؟

مزید برآں کہ امامت کو اس وجہ سے واجب قرار دیتے ہیں کہ اس سے واجبات کی ادائیگی میں مہربانی اور لطف ہوتا ہے۔ پس امامت ایسے ہی واجب ہوگی جیسے باقی وسائل واجب ہوتے ہیں۔تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وسیلہ مقصود سے بڑھ کر اہم ترین اور اشرف ترین ہو؟

مسئلہ امامت میں رافضی تناقض:

ان سے کہا جائے گا کہ: اگر امامت اہم ترین مطالب دین اور اشرف ترین مسائل مسلمین میں سے ہے تو پھر ان اہم مطالب اور اشرف مسائل سے لوگوں میں سب سے زیادہ دور خود رافضی ہیں ۔اس لیے کہ انہوں نے امامت کے مسئلہ میں ایسے حقیر اور گھٹیا قول گھڑ لیے ہیں جو کہ عقل اور دین ہر لحاظ سے فاسد ہیں۔اس کا بیان ان شاء اللہ آگے آئے گا جب ہم ان کے دلائل پر رد کریں گے۔

بس یہاں پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ امامت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ ان کا بڑا معصوم ہو۔اور ان کے دین و دنیا کے

مسائل میں لطف و مہربانی[نرمی] ہو۔ اس لیے یہ ایک ایسے مجہول و معدوم کے لیے حیلے گھڑتے ہیں نہ جس کی ذات کا کوئی اتا پتا ہے' اور نہ ہی جس کا کوئی نام و نشان دیکھنے میں آیا ہے؛ نہ ہی اس کی کوئی خبر سنی گئی ہے' اور نہ ہی کوئی حس محسوس ہوئی ہے۔ تو اس بنا پر انہیں مقصود امامت میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اور جو کوئی ایسا نفع بخش امام بنالیا جائے جس سے بعض دنیاوی اور دینی مصلحتیں حاصل ہو جائیں؛ وہ اس امام سے بہت بہتر اور بڑھ کر ہے جس سے امامت کی کوئی مصلحت حاصل نہ ہو۔

اسی لیے آپ امامیہ فرقہ کے لوگوں کو دیکھیں گے کہ وہ امامت کی مصلحتیں فوت ہو جانے کے سبب اپنے مقاصد کی بار آوری کے لیے کبھی کسی کافر کی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور کبھی کسی ظالم کی۔ حالانکہ دوسری طرف وہ لوگوں کو امام معصوم کی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں؛ اور خود کفار اور ظالمین کی اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ پس کیا ان لوگوں سے بڑھ کر کوئی مقصود امامت اور خیر و کرامت سے دور ہو سکتا ہے جو اس مسلک ندامت پر چلنے والے ہوں؟۔

اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ نے بعض دینی اور دنیاوی مسائل کو حکمرانوں کے ساتھ معلق کر دیا ہے؛ خواہ امامت اہم ترین امور میں سے ہو یا نہ ہو۔ جب کہ رافضی ان مصلحتوں کے حصول سے بہت دور ہیں۔ ان سے ان کے قول کے مطابق بہت سے اہم ترین مطالب اور مسلمانوں کے اشرف ترین مسائل فوت ہوئے ہیں۔

[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ایک شیعہ کا مناظرہ]:

بعض اکابر فضلاء شیعہ نے مجھ سے تنہائی میں ملاقات کی اور دینی مسائل پر گفتگو کا تقاضا کیا۔ میں نے شیعہ کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیا اور منہیات سے روکا، لہٰذا ضروری تھا کہ وہ بندوں پر مہربان ہوتا؛ جس کی وجہ سے لوگ فعل واجب اور ترک قبیح کے قریب تر ہوتے۔ اس لیے کہ جو کوئی کسی شخص کو کھانے کی دعوت دے' اگر اس کی مراد کھانا کھلانا ہو تو وہ اسباب بروئے کار لائے گا جو کھانے کے لیے ضروری ہیں۔ جیسے خندہ جبین سے استقبال کرنا' مناسب جگہ پر بٹھانا؛ اور اس طرح کے دیگر امور۔ اگر اس کا مقصود کھانا کھلانا نہ ہو تو اس کے چہرہ پر سلوٹیں پڑ جائیں گی' اور وہ دروازہ بند کر دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے یہ باتیں معتزلہ سے لی ہیں۔ ان کے پرانے شیوخ کے اصولوں میں یہ باتیں شامل نہیں ہیں۔

پھر کہا: ''امام بھی لوگوں پر عنایت الٰہی کی ایک علامت ہے۔ اس لیے کہ امام واجبات کا حکم دے گا اور برے اعمال سے روکے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ شرعی اوامر و اعمال کی اطاعت کریں گے۔ لہٰذا امام کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ امام معصوم ہو تا کہ مقصد حاصل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معصوم صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے [کسی اور کے لیے یہ دعوی نہیں کیا گیا]۔ لہٰذا آپ کا امام ہونا متعین ہوا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی معصوم نہیں۔ [اور اس باب میں بڑی تفصیلی گفتگو کی]۔ پھر کہتے ہیں: حضرت علی نے حسن رضی اللہ عنہ کو معصوم قرار دیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہاں تک کہ نوبت امام منتظر محمد بن حسن صاحب غار تک پہنچی۔ شیعہ نے تقریر سن کر اعتراف کیا کہ ان کے مذہب کے بیان کے مطابق یہ بڑی اچھی تقریر ہے۔

[شیخ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں]: جب میں نے شیعہ ❶ کے طرز استدلال کو بیان کیا اور شیعہ نے اسے سراہا تو میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: میں اور آپ علم و حق اور ہدایت کے طالب ہیں۔ شیعہ کا قول ہے کہ جو امام منتظر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔ بتایئے ! کیا آپ نے کبھی اسے دیکھا یا ایسے شخص کو دیکھا جس نے امام کو دیکھا ہو؟ یا اس کی کوئی خبر سنی یا اس کی گفتگو کا کچھ علم ہوا؟ یا جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے' اور جس چیز سے منع کیا ہے وہ اس سے ایسے ہی ماخوذ ہے جیسے دوسرے ائمہ کا کلام ان سے ماخوذ ہے؟۔شیعہ نے کہا: ''نہیں ۔''

میں نے کہا: ''پھر ایسے ایمان کا کیا فائدہ اور اس کے ذریعہ ہم پر اللہ کی کون سی مہربانی ہوئی؟ مزید برآں اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے شخص کی اطاعت کا مکلف کیوں کر کرتا ہے جس کے امر و نہی سے ہم ناواقف ہیں، اور اس کی پہچان کا کوئی طریقہ ممکن نہیں۔حالانکہ شیعہ تکلیف مالا یطاق کا شدید انکار کرتے ہیں، کیا اس سے زیادہ تکلیف مالا یطاق بھی کوئی ہو سکتی ہے؟

شیعہ: اس امر کا اثبات تو انہی مقدمات پر مبنی ہے جو آپ نے ذکر کیے ہیں۔

شیخ الاسلام: مگر مقصود چیز تو وہی ہے جو ہم سے متعلق ہو؛ اگر امر و نہی ہم سے وابستہ نہ ہو تو ہمیں اس سے کیا سروکار ہے؟ جب ان مقدمات کا تذکرہ کسی فائدہ سے خالی ہے؛ اس سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا' اور نہ ہی کوئی مہربانی حاصل ہوئی سوائے تکلیف مالا یطاق کے۔تو معلوم ہوا کہ امام منتظر پر ایمان لانا جہالت کی کرشمہ سازی ہے، اور اس کا لطف وعنایت ایزدی اور مصلحت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ بات درست اور موجب سعادت ہے جو امامیہ اپنے اکابر سے نقل کرتے چلے آئے ہیں، تو امام منتظر کی کوئی ضرورت نہیں۔اور اگر یہ نقل باطل ہے تو شیعہ بھی اپنے اس امام منتظر سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکے۔ نہ ہی انہیں حق کے اثبات میں اس امام منتظر سے کوئی فائدہ ہوا اور نہ ہی باطل کی نفی کرنے میں؛ نہ ہی امر بالمعروف اور نہ ہی نہی عن المنکر میں۔اور نہ ہی امامیہ میں سے کسی ایک کے لیے امامت سے مطلوب و مقصود مصلحت : لطف اور منفعت حاصل ہو سکے۔

وہ جاہل لوگ جو اپنے معاملات کو مجہولات سے معلق کر رکھتے ہیں' جیسا کہ غائب لوگ : جیسے قطب' ابدال' غوث اور خضر وغیرہ اس طرح کے دیگر لوگ۔ یہ لوگ بھی اپنی جہالت و گمراہی کے باوجود ایسی باتیں ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں جن سے نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی' نہ کوئی مہربانی؛ اور نہ ہی کوئی دین یا دنیا کا فائدہ۔لیکن اس کے باوجود یہ لوگ جہالت و گمراہی میں رافضیوں سے کم تر ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر زمانے میں ایک خضر ہوتا ہے۔اور بعض لوگ ہر ولی کو خضر کہتے ہیں ۔ یہود و نصاری نے بعض جگہیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ یہاں پر خضر کو دیکھتے ہیں۔

خضر کو مختلف صورتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔کبھی اس کی صورت خوفناک بھی ہوسکتی ہے۔اس لیے کہ یہ جو دعوی کرتا ہے

---

❶ شیخ الاسلام نے شیعہ کے طرز استدلال کو اس لیے واضح کیا تا کہ اسے مناظرہ کی اساس قرار دیا جا سکے، یہ غلط ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امام حسن رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کی صراحت کر دی تھی۔ امام احمد اپنی مسند میں عبداللہ بن سبع سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا وہ اپنی شہادت کا ذکر کر رہے تھے لوگوں نے کہا: ''ہم پر خلیفہ مقرر کر دیجیے'' فرمایا نہیں، میں تمہیں اسی طرح چھوڑ جاؤں گا جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں چھوڑا تھا، لوگوں نے کہا آپ اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اسے کیا جواب دیں گے؟ فرمایا میں عرض کروں گا کہ بار خدایا تو نے جب تک چاہا مجھے زندہ رکھا پھر فوت کر لیا اور تو ان میں موجود تھا اگر تو چاہتا تو ان کی اصلاح کرتا اور اگر چاہتا بگاڑ دیتا۔'' مسند احمد (۱/۱۳۰) طبقات ابن سعد (۳/۲۴) مجمع الزوائد (۹/۱۳۷) امام احمد نے اسی قسم کی روایت بطریق اسود بن عامر نقل کی ہے، دونوں روایات کی سند صحیح ہے، (العواصم من القواصم: ۱۹۹)

کہ وہ خضر ہے' حقیقت میں وہ [جنات میں سے کوئی] جن ہوتا ہے۔یا پھر وہ شیطان ہوتا ہے۔وہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے' اس کے سامنے آجاتا ہے۔اس بارے میں قصے بہت زیادہ ہیں جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بہر حال یہ لوگ شیعہ کی جملہ اقسام سے درجہا بہتر ہیں' اس لیے کہ شیعہ ایسے امام کا انتظار کررہے ہیں جس کے بارے میں ان کے پاس کوئی مستند نقل ہی موجودنہیں۔

[ان کی روایات کے مطابق] جب یہ امام غار میں داخل ہوا تو اس وقت وہ ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا تھا۔پس رافضی ان لوگوں سے کئی گنا بڑھ کر جھوٹی روایات کو قبول کرتے ہیں مگر کتاب وسنت سے منہ موڑتے ہیں[ان پر عمل نہیں کرتے]۔ رافضی بہترین مسلمانوں پر قدح کرتے ہیں' اوران سے دشمنی رکھتے ہیں۔رافضی امامت کی مصلحت کے متعلق لوگوں میں سب سے بڑھ کر گمراہ ہیں ۔ان کے اس عقیدہ کی وجہ سے ان سے بہت سارے دین کے اہم ترین اور اشرف ترین مقاصد فوت ہو چکے ہیں ۔

عمل صالح اور معرفت امام......؟:

ان سے کہا جائے گا کہ: تمہارا یہ کہنا کہ''اس[عقیدہ امامت کی]وجہ سے کرامت کے مراتب کا حصول ممکن ہے۔یہ محض باطل کلام ہے ۔صرف امام وقت کو پہچاننے یا دیکھنے سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی جب تک اس کے اوامر ونواہی کی اطاعت نہ کی جائے ۔ورنہ رسول اللہ ﷺ کی معرفت سے امام کی معرفت بڑھ کرنہیں ہے۔پس جو کوئی جانتا ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' مگر وہ آپ پر ایمان نہ لائے' اورآپ کے احکام کی پیروی نہ کرے' اسے کوئی کرامت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور جو کوئی نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے' مگر آپ کی نافرمانی کرے ؛ فرائض کو ضائع کرتا،ظلم وتعدی کا ارتکاب کرتا اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرتا ہو؛ توایسا انسان سزا کا مستحق ہوتا ہے ۔اس پر امامیہ اور دیگر تمام مسلمان گروہوں کا اتفاق ہے۔تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے جو کوئی امام کی معرفت حاصل کرے' اور اللہ تعالیٰ کے فرائض کا ضائع کرنے والا' اور حدود الٰہی کا پامال کرنے والا ہو[تو اسے کوئی کرامت یا بزرگی کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟]۔

[شیخ الاسلام نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا]: بہت سارے شیعہ کا قول ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ایک ایسی نیکی ہے [1] جس کی موجودگی میں بدی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اگر حب علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے گناہوں سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا تو امام معصوم کی قطعاً ضرورت نہیں۔اس لیے کہ تکلیف میں یہ مہربانی ہے۔ اگر علی کی محبت ہی تمام گناہوں کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے تو پھر کسی اور چیز کی کوئی ضرورت نہیں' خواہ امام موجود ہو یا نہ ہو۔

امامت ارکان ایمان میں شامل نہیں:

شیعہ کا یہ قول کہ امامت ارکان ایمان میں سے ہے؛ جس کی بنیاد پر جنت میں رہنے کا استحقاق حاصل ہوسکتا ہے۔تو ان سے کہا جائے گا کہ: امامت کو ارکان ایمان میں شمار کرنا اہل جہالت و بہتان تراشوں کا کام ہے۔ہم اس بارے میں ان شاء اللہ آگے اپنے موقع پر تفصیل سے بیان کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین اور ان کے احوال بیان فرمائے ہیں ۔ نبی کریم ﷺ نے ایمان کی تفسیر کی؛ اور اس کی شاخیں

[1] دیکھئے: اختصار تحفہ اثنا عشریہ ۔ ۲۰٤۔

بیان کیں، مگر امامت کا ذکر تک نہ فرمایا۔ صحیح روایات میں حضرت جبریل علیہ السلام والی حدیث بھی ہے؛ جب آپ ایک اعرابی کی صورت میں آئے اور اسلام؛ ایمان اور احسان کے بارے میں سوال کیا' تو آپ نے فرمایا:

''اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ اور بیشک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔'' اور فرمایا: ''اور ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر پورا ایمان رکھو؛ اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھو اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا یقین رکھو؛ قیامت اور حشر کو پورے طور پر مانو اور اچھی اور بری تقدیر کے اللہ کی جانب سے ہونے پر ایمان رکھو''۔

اس میں امامت کا ذکر تک نہیں فرمایا:

[اس کے بعد پھر پوچھا کہ احسان کسے کہتے ہیں؟] تو آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو اتنا ہی یقین رکھے کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔''[1]

اس حدیث کے صحیح ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ اسے قبولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اہل علم کا اس کی صحتِ نقل پر اجماع ہے۔ امام بخاری و مسلم نے کئی اسناد کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پر ان کا اتفاق ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت صرف صحیح مسلم میں ہے۔ اگرچہ شیعہ ان احادیث کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے' [تو یہ ان کی پرانی روش ہے۔ منہاج الندامہ کے] مصنف نے اپنی کتاب میں ایسی احادیث بطور دلیل پیش کی ہیں جن کے موضوع [من گھڑت] ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ [اور صحیح احادیث کو چھوڑ دیا ہے]۔

پھر یا تو دونوں فرقوں [اہل سنت اور شیعہ] کو چاہیے کہ ایسی دلیل کو بطور حجت پیش کیا جائے جس کی صحت ثابت ہو۔ یا پھر ایسی روایات کو بالکل ہی نہ پیش کیا جائے۔ اگر وہ [شیعہ] کسی روایت کو بالکل سرے سے ہی ترک کر رہے ہیں تو پھر ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ اور اگر وہ ایسی روایات نقل کریں گے' تو پھر روایت کے مقابلہ میں روایت لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ [لیکن فرق یہ ہے شیعہ بے سرو پا روایت سے استدلال کرتے ہیں اور ہم] ایسی روایت سے استدلال کرتے ہیں جن کی صحت ثابت ہو' اور روایت قابل حجت ہو۔

ہم ان باطل روایات پر جن کے ذریعہ شیعہ اہل سنت پر رد کرتے ہیں' تفصیلی اور مدلل کلام اپنے مناسب موقع پر کریں گے' اور ان روایات کا بھی ذکر کریں گے جنہیں اہل علم محدثین نے صحیح کہا ہے۔ اگر بالفرض [بطور مناظرہ] تسلیم کیا جائے کہ ہم [صحیح] احادیث سے استدلال نہیں کرتے تو تب بھی قرآن کی آیات اس بارے میں کافی ہیں۔ قرآن کریم میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ارشاد باری ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ☆ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ☆ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ (الانفال: ۲۔۴)

''(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی

[1] رواہ مسلم ۱/ ۳٦؛ البخاری ۱/ ۱۵۔

جائیں تو انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس رزق میں سے جو ہم نے انھیں دیا ہے، خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں، انھی کے لیے ان کے رب کے پاس بہت سے درجے اور بڑی بخشش اور باعزت رزق ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے امامت کا ذکر کیے بغیر ان لوگوں کے لیے ایمان کی گواہی دی ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ ﴾ (الحجرات: ۱۵)

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ و رسول پر ایمان لائے پھر شک نہ کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔''

ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے امامت کا ذکر کیے بغیر ان لوگوں کو سچا قرار دیا ہے۔ نیز ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (البقرہ ۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرلو۔ بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اللہ سے محبت کی خاطر اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں کو اور غلامی سے نجات دلانے کے لیے دے۔ نماز قائم کرے اور زکواۃ ادا کرے۔ نیز (نیک لوگ وہ ہیں کہ) جب عہد کریں تو اسے پورا کریں اور بدحالی، مصیبت اور جنگ کے دوران صبر کریں۔ ایسے ہی لوگ راست باز ہیں اور یہی لوگ سچے متقی ہیں۔''

یہاں پر بھی کہیں امامت کا کوئی ذکر تک نہیں کیا گیا۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الٓمّٓ ❀ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ❀ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ❀ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ❀ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [البقرۃ]

''الٓمٓ۔ اس کتاب کے سچ ہونے میں کوئی شک نہیں پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔ جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں؛ اور ہمارے دیے ہوئے مال سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت یافتہ اور کامیاب قرار دیا ہے؛ مگر امامت کا ذکر تک نہیں کیا۔ [مذکورہ بالا آیات کے علاوہ متعدد آیات اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں مگر کسی میں بھی امامت کے رکن ایمان ہونے کا ذکر نہیں کیا گیا۔]

اور ہم یہ بھی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ دین محمد ﷺ میں جب لوگ مسلمان ہوجاتے تو ان کے ایمان کو امامت کی معرفت پر موقوف نہیں رکھا جاتا۔ اور نہ ہی امامت کے بارے میں کچھ ذکر تک فرمایا۔ اور جو چیز ارکان ایمان میں سے تھی اس کا بیان کرنا رسول اللہ ﷺ کے لیے لازمی تھا تا کہ اہل ایمان کا ایمان درست ہو۔ جب یہ بات یقینی طور پر معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ ایمان کے لیے کوئی ایسی شرط نہیں رکھتے تھے' تو یہ بات بھی پتہ چل گئی کہ ایمان کے لیے امامت کی شرط رکھنا اہل بہتان [جھوٹے لوگوں] کا قول ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: مسئلہ امامت اس نص کے عموم میں داخل ہے' یا اس کا تعلق ایسے مسائل سے ہے جن کے بغیر یہ واجب پورا نہیں ہوتا۔ یا پھر کسی دوسری نص سے یہ ثابت ہے۔ تو اس سے کہا جائے گا: ''اگر ان تمام مسائل کی صحت ثابت بھی ہوجائے تو اس کی زیادہ سے زیادہ اہمیت یہ ہوگی کہ ان کا شمار دین کے فروعی مسائل میں ہوگا۔ ان کا شمار ارکان ایمان میں نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ایمان کا رکن تو وہ ہوگا جس کے بغیر ایمان مکمل نہ ہوتا ہو' جیسے کہ شہادتین کا اقرار۔ کوئی انسان اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تو وہ اس بات کی گواہی نہ دیدے کہ: ''**لا إله إلا الله محمد رسول الله** ''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں' اور بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

فرض کر لیجیے کہ امامت ایمان کے ارکان میں سے ایک رکن تھی؛ جس کے بغیر کسی انسان کا ایمان پورا نہیں ہوسکتا؛ تو اس سے واجب ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ امت سے عذر کو ختم کرنے کے لیے اس کو کھول کر بیان کرتے؛ جیسا کہ شہادتین کو' اور ایمان بالملائکہ' کتابوں پر ایمان' رسولوں پر ایمان اور آخرت کے دن پر ایمان کو بیان کیا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں ہزاروں لوگ فوج درفوج اسلام میں داخل ہوئے؛ مگر رسول اللہ ﷺ نے کسی ایک کیساتھ بھی ایمان کے لیے امامت کی شرط نہیں لگائی' نہ ہی مطلق طور پر اور نہ ہی مقید طور پر۔

چھٹی وجہ : شیعہ یہ من گھڑت روایت پیش کرتے ہیں: ''مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ إمام زمانه مات ميتة الجاهلية'' ...... ''جس کی موت اس حالت میں آئی کہ وہ امام زمانہ کو نہ پہچانتا ہو' تو جاہلیت کی موت مرے گا۔''

جواب : ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ یہ روایت کس نے بیان کی؟ اس کی اسناد کہاں ہے؟ اور پھر یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے روایت کردہ ایسی حدیث سے استدلال کیا جائے جس کی سند ہی ثابت نہ ہو۔ یہ تو اس وقت ہوتا ہے جب حدیث کی روایت میں کوئی مجہول الحال راوی نہ ہو۔ تو پھر اس وقت کیا کہہ سکتے ہیں جب وہ حدیث ان الفاظ سے کسی طرح بھی معروف ہی نہ ہو۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ یوں نہیں فرمائے۔ البتہ صحیح مسلم کی حدیث میں حضرت نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ واقعہ حرہ کے زمانہ میں یزید بن معاویہ کے دور میں عبداللہ [1] بن

---

[1] عبداللہ بن مطیع مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا داعی اور یزید کے برخلاف بغاوت کا اولیں محرک تھا، یہ پہلا شخص تھا، جس نے حاکم وقت یزید بن معاویہ کے خلاف جھوٹ کا طوفان کھڑا کیا، عوام بھی ان اکاذیب کی تصدیق کرنے لگے اور اس طرح مدینہ میں فتنہ پروری کا آغاز ہوا، محمد بن علی بن ابی طالب نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا تھا:
''میں یزید کی صحبت میں رہا ہوں، میں نے اسے نماز کا پابند نیکی کا پابند اور متبع سنت پایا لوگ اس سے فقہی مسائل دریافت کرتے تھے۔''
(البدایہ والنہایہ: ۸/ ۲۳۳، نیز العواصم من القواصم: ۲۲۳)

مطیع کے یہاں آئے تو انہوں نے خدام سے تکیہ لانے کے لیے کہا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں آپ کے یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں بلکہ ایک حدیث سنانے کے لیے آیا ہوں جو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

''جس نے اطاعتِ امام سے ہاتھ کھینچ لیا وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی، اور جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی گردن میں کسی کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' [1]

ترک بیعت:

مذکورہ بالا حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت عبداللہ بن مطیع سے بیان کی جب لوگوں نے امیر وقت یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی تھی؛ حالانکہ وہ ظالم تھا، اور پھر ان کی آپس میں جنگ بھی ہوئی۔ اور یزید نے اہل حرہ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ حدیث ہذا سے وہی مسئلہ مستفاد ہوتا ہے جو اس طرح کی دیگر تمام احادیث سے مستفاد ہوتا ہے۔ کہ جو شخص حکام وقت کا مطیع نہ ہو یا شمشیر بکف ان کے خلاف نبرد آزما ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ شیعہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے، وہ جبر و اکراہ کے بغیر ہمیشہ امراء کی اطاعت سے منحرف رہتے ہیں؛ [2] اور حکمرانوں کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم ان لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں اس حدیث کی اگر ایک آدمی سے بھی نقل منقول ہو تو اس کی صحت ثابت کرو۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایمان کا رکن اس جیسی حدیث سے ثابت کیا جائے جس کے نقل کرنے والے کو کوئی نہ جانتا ہو۔ اور اگر اس کا ناقل معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی اس سے غلطی اور جھوٹ کا امکان رہتا ہے۔ کیا کسی معقول علمی طریقہ کے بغیر بھی ایمان کا کوئی رکن ثابت ہو سکتا ہے۔

ساتویں وجہ: ان سے کہا جائے گا: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر مبنی ہے۔ تو پھر بھی ان لوگوں کے لیے اس حدیث میں کوئی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الامارة- باب وجوب ملازمة جماعة المسلمين (ح: ١٨٥١)

[2] شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سلاطین اسلام میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی سلطان اچھا نہیں گزرا، جب آپ کے عہد خلافت کا تقابل بعد میں آنے والے سلاطین کے ادوار سے کیا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ رعایا کو جو امن و عافیت آپ کے زمانہ میں نصیب ہوئی وہ کسی بادشاہ کے دور میں حاصل نہ ہو سکی، اور جب خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو خلافت راشدہ کی فضیلت نمایاں ہوتی ہے، عباسی خلافت کے زمانہ میں لوگ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد خلافت کو مثالی عدل کا دور کہا کرتے تھے، مشہور محدث سلیمان بن مہران اعمش ان سے کہا کرتے تھے اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت پا لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ یعنی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے بہتر تھا، لوگوں نے کہا کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے حلیم و بردبار تھے؟ فرمایا: ''نہیں اللہ کی قسم! وہ عدل میں بھی بے نظیر تھے'' یزید کا عہد خلافت بھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے چنداں مختلف نہ تھا، اراکین سلطنت وہی تھے، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تھے، البتہ ہر حکومت کی ضروریات کا اندازہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، عبداللہ بن مطیع نے محمد بن حنفیہ کے عین برعکس افتراء پردازی سے کام لیکر یزید کے خلاف جو اتہامات باندھے تھے ان کا نتیجہ اس فتنہ سامانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا جس سے ڈرانے کیلئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن مطیع کے پاس آئے تھے، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ عبداللہ بن مطیع نقض بیعت کا جو اقدام کر رہا ہے وہ ظلم ہے جس کا مرتکب جاہلیت کی موت مرتا ہے، ابن مطیع کے ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید بھی اسی قسم کے ظلم پر اتر آیا، اہل عرب کے نزدیک ظلم کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز کو اسکی اصلی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے۔ سیدھی راہ سے بھٹک جانے کو بھی ظلم کہتے ہیں۔ ابن مطیع اور اس کے رفقاء کار کا ظلم وہ فتنہ سامانی ہے جس کا بیڑا انہوں نے واقعہ حرہ سے قبل اٹھایا اور یزید کا ظلم وہ افسوسناک نتائج ہیں جو اس سے رونما ہوئے۔ (منهاج السنة: ١٨٥/٣)۔

'' مات میتة الجاهلیة '' ''تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔'' یہ کلام تعصب کی بنا پر لڑنے والوں کو بھی شامل ہے۔اور شیعہ بنا بر تعصب لڑنے والوں میں سرفہرست ہیں۔البتہ طرف داری کے نقطہ خیال سے لڑنے والے مسلمانوں کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ کتاب وسنت اس پر دلالت کرتے ہیں ۔تو پھر جس انسان کا جرم اس سے کم تر ہو' اسے کیسے کافر قرار دیا جا سکتا ہے ؟۔اگر وہ اطاعت امام سے نکل جائے اور جاہلیت کی موت مرے تو وہ کافر نہیں ہوگا۔[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:''جو شخص اطاعت امام سے خروج اختیار کرے اور جماعت کو ترک کر کے مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''[2]

شیعہ عرصہ دراز سے اطاعت امام سے نکل چکے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی جماعت کو ترک کر دیا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہو تو اس پر صبر کرے، کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوتا ہے، اور اسی حالت میں مر جاتا ہے، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔''[3]

ان نصوص سے جہاں رافضیوں اور ان جیسے لوگوں کی حالت واضح ہوتی ہے' وہیں پر یہ روایات اہل علم کے ہاں معروف بھی ہیں۔[جب کہ وہ روایت جو روافض نے پیش کی ہے' اس کی کوئی اصل نسل یا معروف قابل اعتماد سند نہیں۔]

آٹھویں وجہ : ان کی پیش کردہ روایت خود روافض کے خلاف حجت ہیں۔اس لیے کہ یہ لوگ اپنے امام زمانہ کو نہیں پہچانتے ۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ غائب منتظر محمد بن حسن عسکری ہے ۔ جو کہ ۲۶۰ ہجری میں سامراء کے غار میں چھپ گیا 'اور ابھی تک واپس نہیں نکلا۔غائب ہونے کے وقت وہ امام دو یا تین یا پانچ سال کا بچہ تھا۔جو چار سو ساٹھ [اب بارہ سو] سال کی طویل مدت سے ایک تہ خانہ میں چھپا بیٹھا ہے؛ کسی شخص کو اس کا نشان و پتہ تک معلوم نہیں اور نہ اس کے متعلق کوئی خبر سنی گئی ہے۔ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس امام کی ذات یا صفات کو جانتا ہو۔لیکن پھر بھی کہتے ہیں : وہ انسان جس کو نہ کوئی دیکھ سکا 'اور نہ ہی کسی نے اس کی کوئی خبر سنی' وہ ان کا امام زمانہ ہے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اس طرح امام کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی انسان کا قریبی چچازاد بھائی ہو مگر وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو۔پس یہ انسان اپنے چچازاد تک کو نہیں جانتا۔اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ جیسے کسی انسان کو کوئی گرا پڑا مال مل جائے' اس کو پتہ ہے کہ کوئی انسان اس کا مالک ہے؛ مگر جب تک اس کو خاص متعین انسان کے مالک ہونے کا علم نہ ہو' تو وہ اس وقت تک اس کے مالک کو پہچاننے والا نہیں ہو سکتا۔بلکہ یہی انسان اس کا عارف ہے' کیونکہ اس پر احکام نسب و ملکیت مرتب ہوتے ہیں۔

جب کہ امام منتظر کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔اس کے کسی ایسے حال کی معرفت نہیں ہو سکی جس سے امامت میں فائدہ ہوتا۔ بیشک امام کی معرفت جس سے انسان جہالت سے معرفت کی طرف نکلتا ہے' اور اس کے نتیجہ میں جماعت کی شیرازہ بندی اور

---

[1] حضرت جندب بجلی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:''جو شخص عصبیت کی دعوت دیتا یا اس کا معاون ہو کر اندھا دھند لڑ رہا ہو اور وہ مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔''مسلم کتاب الامارة۔ باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین (ح: ۱۸۵۰)۔

[2] صحیح مسلم۔ کتاب الامارة، باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین (حدیث:۱۸٤۸)۔

[3] صحیح بخاری کتاب الفتن ۔ باب قول النبی ﷺ " سترون بعدی اموراً تنکرونها" (ح:۷۰۵٤) صحیح مسلم ۔ کتاب الامارة۔ باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین(ح:۱۸٤۹)۔

اطاعت ممکن ہوتی ہے۔ بخلاف اس چیز کے جس پر اہل جاہلیت تھے۔ اس لیے کہ ان کا کوئی امام نہیں تھا جس کے جھنڈے کے نیچے یہ لوگ جمع ہوتے۔ اور نہ ہی ان کی شیرازہ بندی کے لیے کوئی جماعت تھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا' اور آپ کے ذریعہ سے ان لوگوں کو اطاعت گزاری اور جماعت بندی کی طرف ہدایت دی۔ جب کہ اس منتظر کی معرفت سے نہ ہی اطاعت گزاری حاصل ہوئی اور نہ ہی جماعت بندی۔ اور ایسی کوئی معرفت حاصل نہ ہو سکی جس سے لوگ جاہلیت سے معرفت کی طرف نکلتے۔ بلکہ اس امام کی طرف منسوب لوگ باقی تمام لوگوں میں سب سے بڑھ کر جاہل اور اہل جاہلیت سے زیادہ مشابہت رکھنے والے ہیں۔

نویں وجہ : نبی کریم ﷺ نے ہمیں صرف ان ائمہ وسلاطین کی اطاعت کا حکم دیا ہے جو موجود ہوں، حکومت و سلطنت سے بہرہ ور ہوں اور لوگ انہیں عام طور سے جانتے ہوں۔ مزید برآں ان کی اطاعت صرف معروف میں ضروری ہے منکر میں نہیں۔ ہمیں کسی مجہول اور معدوم کی اطاعت کا حکم ہرگز نہیں دیا اور نہ ہی کسی ایسے کی اطاعت کا حکم دیا جس کا نہ کوئی بس چلتا ہو اور نہ ہی اسے اصل میں کوئی حکومت یا قدرت حاصل ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں آپس میں محبت کرنے اور اجتماعیت قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور تفرقہ بازی اور اختلاف سے منع کیا ہے۔ ائمہ کی اطاعت کا حکم مطلق طور پر نہیں دیا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے نافرمانی میں نہیں۔

ائمہ معصوم نہیں:

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ کی اطاعت میں جن ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' وہ معصوم نہیں ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں دعا کرتے ہوں۔ تمہارے بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے بغض رکھتے ہوں، جن پر تم لعنت بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہوں۔'' ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم ان کی بیعت توڑ نہ ڈالیں؟ فرمایا: ''جب تک وہ نماز کی پابندی کریں تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' آپ نے دو مرتبہ یہ الفاظ دہرائے: ''جس پر کسی شخص کو حاکم بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے کوئی برا کام کرتے دیکھے تو اسے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھے مگر اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔''[1]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب ایسے حکمران ہوں گے جن کے خلاف شریعت اعمال کو تم پہچان لو گے اور بعض اعمال نہ پہچان سکو گے۔ پس جس نے اس کے اعمال بد کو پہچان لیا وہ بری ہو گیا جو نہ پہچان سکا وہ محفوظ رہا لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور تابعداری کی وہ ہلاک ہو گیا۔ صحابہ نے عرض کیا: ''ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نہیں جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔''[2]

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ باب خیار الائمۃ و شرارھم (حدیث: ۱۸۵۵)

[2] شیعہ کے گیارہ امام خود غیر معصوم ہونے کے معترف تھے، لوگوں نے ائمہ سے کن کروہ دعائیں ذکر کی ہیں جن میں بارگاہ ایزدی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کیا کرتے تھے اگر وہ معصوم اور گناہوں سے پاک ہوتے تو مغفرت طلب کرنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی، بارھواں امام بقول شیعہ نو عمری ہی میں تہ خانہ میں داخل ہو گیا نہ انہیں کسی نے دیکھا اور نہ ان سے کوئی دعا سن کر یاد رکھی، عصر حاضر تک کسی شخص نے ان کی آواز تک نہیں سنی۔

یہ بات واضح ہے کہ ائمہ سے مراد امراء اور حکمران ہیں۔ان میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی کئی ایک بری اور مکروہ باتیں بھی ہوتی ہیں۔لیکن کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ان کی اطاعت سے دست کش ہو جائے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان کی اطاعت کرے۔ اور یہ کہ ان حکمرانوں میں اچھے بھی لوگ ہوتے ہیں اور برے بھی۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے لوگ محبت رکھتے ہیں' اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں؛ اور وہ لوگوں سے محبت رکھتے اور ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ان میں سے کچھ حاکم ایسے بھی ہوتے ہیں' جو لوگوں سے بغض رکھتے ہیں' اور ان کے لیے بد دعا کرتے ہیں' اور لوگ بھی ان سے بغض رکھتے ہیں' اور ان پر بد دعا کرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء علیہم السلام کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پا جاتا تو اس کا خلیفہ و نائب نبی ہوتا تھا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ اور عنقریب میرے بعد خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔صحابہ نے عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کر لو اسے پورا کرو اور حکام کا حق ان کو ادا کرو۔ بے شک اللہ ان سے ان کی رعایا کے بارے میں سوال کرنے والا ہے)) [1]

ایک دوسری روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((عنقریب میرے بعد حقوق تلف کئے جائیں گے اور ایسے امور پیش آئیں گے جنھیں تم ناپسند کرتے ہو۔صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''تم پر کسی کا جو حق ہو وہ ادا کر دو اور اپنے حقوق تم اللہ سے مانگتے رہنا۔)) [2]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے۔)) [3]

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان مرد پر حاکم کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو سوائے اس کے کہ اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے؛ پس اگر اسے معصیت و نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ اس کی بات سننا لازم ہے اور نہ اطاعت۔'' [4]

[اس ضمن میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ائمہ معصوم نہیں]۔

---

[1] صحیح مسلم امارت اور خلافت کا بیان: (271)؛ پہلے خلیفہ کی بیعت کو پورا کرنے کے وجوب کے بیان میں۔

[2] نفس الكتاب والباب في صحيح مسلم۔

[3] صحيح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح:271 غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

[4] صحيح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح:271 غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

اگر وہ یہ کہے کہ: ''دین کے اہم ترین مطالب اور اشرف ترین مسائل'' کہنے سے میری مراد وہ مسائل تھے جن میں نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اس امت کا اختلاف واقع ہوا ہے۔ان میں سے ایک ایسا مسئلہ مسئلہ امامت ہے۔

تو اس سے کہا جائے گا یہ نہ ہی الفاظ فصیح ہیں' اور نہ ہی معنی صحیح ہے۔اس لیے کہ جو کچھ تم نے ذکر کیا ہے' وہ اس معنی پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ الفاظ کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ یہ مسئلہ مطلق طور پر دین کے اہم ترین مطالب اور مسلمانوں کے اشرف ترین مسائل میں سے ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ فرض کریں :تمہاری کی مراد یہی تھی ; تو اس لحاظ سے اس کا معنی باطل ہوا۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اس سے اشرف اور اہم ترین مسائل میں مسلمانوں کا اختلاف واقع ہوا ہے۔اگر مان لیا جائے کہ یہی مطلب اشرف مطالب میں سے ہے؛ تو پھر جو کچھ تم نے پہلے بیان کیا ہے' وہ باطل ترین مذاہب اور فاسد تر مطالب میں سے ہے۔اس لیے کہ مسئلہ امامت میں اختلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور سے پہلے پیش نہیں آیا۔

خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں یہ اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔سوائے جو کچھ سقیفہ کے دن سامنے آیا۔اس دن لوگ اس وقت تک وہاں سے اٹھے نہیں جب تک ان کا اس مسئلہ پر آپس میں اتفاق نہیں ہوگیا۔ایسی باتوں کو نزاع شمار نہیں کیا جاتا۔ اور اگر مان لیا جائے کہ اس مسئلہ میں نزاع و اختلاف نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد پیدا ہوگیا تھا؛ تو ہر وہ مسئلہ جس میں نبی کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اختلاف پیدا ہوگیا ہو' وہ ان دیگر مسائل سے افضل و اہم تر نہیں ہوسکتا جن میں اختلاف نبی کریم ﷺ کی وفات کے لمبے زمانے کے بعد پیدا ہوا ہو۔

اگر ایسا ہوتا تو یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ توحید و صفات کے مسائل' اثبات و تنزیہ' قدر و تعدیل' اسماء و تجویز؛ تحسین' تقبیح کے مسائل امامت کے مسائل سے بڑھ اہم تر اور اشرف تر ہیں ۔ایسے ہی مسائل احکام و اسماء؛ وعد و وعید؛ شفاعت اور خلود فی النار کے مسائل امامت کے مسائل سے زیادہ اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقائد کے بارے میں جتنے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں انہوں نے مسئلہ امامت کو آخر میں ذکر کیا ہے۔ یہاں تک کہ خود امامیہ فرقہ کے لوگ مسئلہ امامت سے پہلے توحید' عدل اور نبوت کے مسائل ذکر کرتے ہیں۔ایسے ہی معتزلہ کے ہاں پانچ اصول ہیں: توحید؛ عدل ؛منزلہ بین منزلتین ؛وعید کا انفاذ اور پانچواں مسئلہ ہے: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا؛ امامت کے مسائل اسی مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جمہور امت نے مسئلہ امامت کے بغیر بھی اس مقصود امامت کی بہت بڑی خیر حاصل کی تھی جس کا پرچار رافضی کررہے ہیں۔اس لیے کہ امامیہ ایسے صاحب زمان امام کا عقیدہ رکھتے ہیں جو کہ مفقود ہے؛ اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ تقریباً دو سو ساٹھ ہجری میں سرداب سامراء میں داخل ہوگیا تھا۔اور اب تک چار سو پچاس [ہمارے دور میں بارہ سو] سال سے غائب ہے۔اس اتنی لمبی مدت کے دوران اس امام کی امامت سے شیعہ کو دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکا۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ:'' ہمارے پاس اس امام کے علاوہ دوسرے لوگوں سے منقول علم ہے۔''

اگر یہ مسئلہ دین کے اہم ترین مسائل میں سے تھا اور وہ لوگ اس سے کچھ بھی فائدہ حاصل نہ کرسکے؛ تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ان سے دین کا اہم ترین اور اشرف ترین حصہ چھوٹ گیا۔تو اس صورت میں باقی مسائل عقیدہ توحید اور عدل بھی ان کے کچھ کام نہ آسکے۔اس لیے کہ بہ نسبت مقصود امامت کے ان میں نقص پایا جاتا ہے۔لہٰذا اس وجہ سے وہ عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

شیعہ امامیہ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ امامت کی ضرورت صرف شریعت کی فروعات میں ہوتی ہے اصول میں نہیں۔ جب کہ اصول عقلیہ میں امام کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔اس لیے کہ دینی اصول وقواعد اہم واشرف ہوتے ہیں۔اس تمام کلام کے بعد امامت کے متعلق تمہارا عقیدہ راہ حق سے سب سے زیادہ دور ہے۔اگر اس میں سوائے اس کے اور کچھ بھی نہ ہوتا کہ تم نے امامت کو دین ودنیا میں مخلوق کی مصلحت کے لیے واجب قرار دیا ہے۔اور تمہارے کے اس امام زمانہ کے ذریعہ ابھی تک کوئی مصلحت حاصل نہیں ہوئی؛ نہ ہی دین میں اور نہ ہی دنیا میں۔اب بتائیے اس شخص کی جد وجہد سے زیادہ بیکار کوشش کس کی ہوگی جو اطاعت ائمہ میں بڑی زحمت اٹھاتا، اکثر قیل وقال سے کام لیتا، مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوتا، سابقین اولین [صحابہ وتابعین] پر لعنت بھیجتا اور کفار ومنافقین کا دست راست بنا رہتا ہے۔بایں ہمہ وہ حیلہ گری سے بھی نہیں چوکتا، دشوار گزار راستوں پر گامزن ہوتا، جھوٹی شہادت سے تقویت حاصل کرتا اور اپنے پیروکاروں کو فریب دہی سے پھانستا رہتا ہے۔اور ایسی ایسی حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جن کا یہاں پر ذکر کرنا طول اختیار کر جائے گا۔ [1]

اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک امام کا وجود از بس ضروری ہے جو احکام الٰہی سے آگاہ کرتا رہے۔اور وہ چیزیں بیان کرے جن سے اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہوتی ہو۔پھر جب اس امام کے نام ونسب کا علم ہوگیا تو اس سے کوئی بھی مطلب کی بات حاصل نہ ہوسکی۔اور نہ ہی اس کی تعلیمات اور رہنمائی کی باتوں میں سے کوئی بات اس کے ماننے والوں تک پہنچ سکی۔اور نہ ہی اس کے اوامر ونواہی کا پتہ چل سکا۔اور نہ ہی امام سے کوئی مصلحت ومنفعت حاصل ہوئی؛ بجز جان و مال کے نقصان کے۔اور اس کے کہ وہ انسان حسرت وندامت کا شکار ہو، خطا کا مرتکب ہو، دور دراز سفر میں مبتلا رہ کر دن رات امام غائب کا منتظر رہے۔اور تہ خانہ میں داخل ہونے والے ایک امام کی وجہ سے امت محمدی سے بغض وعداوت کا سلوک روا رکھے۔حالانکہ اس امام نے نہ کوئی کام کیا اور نہ اسکی زبان سے ایک لفظ صادر ہوا۔مزید برآں اگر امام مذکور کا وجود یقینی ہوتا تو بھی شیعہ کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔امت کے دانش مند لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ شیعہ کے یہاں افلاس کے سوا اور کچھ نہیں۔مزید برآں حسن بن علی عسکری کے یہاں سرے سے کوئی اولاد ہی نہ تھی اور نہ اس نے اپنے پیچھے کوئی وارث چھوڑا ہے۔جیسا کہ مورخ ابن جریر طبری اور عبدالباقی بن قانع وغیرہ اہل علم نسب دانوں نے ذکر کیا ہے۔

شیعہ کہتے ہیں: امام زمان اپنے والد کی وفات کے بعد اس سرداب میں داخل ہوگیا تھا' اس وقت اس کی عمر دو سال یا پھر تین سال یا پھر پانچ سال تھی۔

❁❁❁❁

[1] شیعہ پر الزامات کا طویل سلسلہ ہنوز جاری ہے، یہ الزامات بلا دلیل نہیں بلکہ ان کے تاریخی دلائل وہ شواہد موجود ہیں، علاوہ ازیں خود شیعہ کی تصنیفات میں ایسے حقائق کی کمی نہیں اگر عمر و وقت میں گنجائش ہوتو شیعی تصنیفات میں سے مواد لے کر ضخیم مجلدات تحریر کی جا سکتی ہیں۔

امام غائب کے عقیدہ کا ابطال

[شیعہ کا قول ہے کہ امام منتظر دویا تین یا پانچ سال کی عمر میں تہ خانہ میں داخل ہوا] نظر بریں [اس وقت وہ امام بنص قرآنی] یتیم ہوگا؛ جس کی تربیت اور مال کی حفاظت نص قرآنی کی بنا پر ضروری ہے یہاں تک کہ اس پر عقل مندی کے آثار نظر آنے لگیں۔ اور اس کا کوئی مستحق قرابت دار اسے گود پالے گا [اور تربیت و پرورش کا اہتمام کریگا]۔ جب اس کی عمر سات سال کی ہوجائے تو اسے طہارت اور نماز کی ادائیگی کا حکم دیا جائے گا۔

غور فرمایئے! جس نے ہنوز نہ وضوء کیا نہ نماز ادا کی؛ اور اگر وہ شاہد اور موجود بھی ہوتا تو از روئے نص قرآنی وہ خود اور اس کا مال واسباب اس کے کسی ولی کی نگہداشت میں ہوتے۔ (اور ولی کی اجازت کے بغیر اسے تصرفات کی اجازت نہ ہوتی) تو پھر ایسے شخص کا اہل ایمان کا امام ہونا کیوں کر جائز ہو سکے گا؟

[یہ تو اس صورت میں ہوتا جب امام موجود ہوتا] اور پھر اس وقت کیا عالم ہوگیا جب امام اتنی لمبی مدت سے مفقود یا معدوم ہو۔ جب کسی عورت کا ولی زیادہ مدت کے لیے غائب ہوجائے تو قاضی یا موجود ولی اس کی شادی کراسکتا ہے تاکہ اس عورت کے معلوم اور موجود ولی کے لمبا عرصہ تک غائب رہنے کی وجہ سے مصلحت فوت نہ ہو۔ تو پھر امامت کی مصلحت کیسے حاصل ہوسکتی ہے جب کہ امام اتنے لمبے عرصہ سے غائب اور مفقود ہو؟۔

[اتنی طویل مدت میں کوئی امام کیوں نہ مقرر کیا گیا اور امامت کی مصلحت کو کیوں کر پیش نظر نہ رکھا گیا؟] ❶

❶ مورخ ابن جریر طبری ۳۰۲ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حسب ونسب کا ایک جھوٹا دعویٰ دار حیلہ جوئی کر کے خلیفہ المقتدر عباسی کے دربار میں حاضر ہوا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ محمد بن حسن بن علی بن موسیٰ بن جعفر ہے، خلیفہ نے بنی ہاشم کے مشائخ کو بلایا؛ ان کا سردار ان دنوں احمد بن عبدالصمد تھا جو ابن طومار کے نام سے مشہور تھا۔ ابن طومار نے کہا کہ حسن کی کوئی اولاد نہ تھی، پھر تم محمد بن حسن کیسے ہوگئے؟ بنی ہاشم چلا چلا کر کہنے لگے کہ اسے سخت سزا دے کر لوگوں میں اس کی تشہیر کی جائے۔ چنانچہ اسے ایک اونٹ پر سوار کر کے ذوالحجہ کی آٹھویں اور نویں تاریخ کو شہر کی دونوں جانب میں پھرا کر مغربی جانب ایک قید خانہ میں قید کر دیا گیا۔ طبری کے ذکر کردہ واقعہ میں قابل غور بات ابن طومار کا یہ قول ہے کہ حسن عسکری نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ یہ قول ان لوگوں کے قول سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ حسن عسکری کی لونڈی نرگس کے یہاں آپ کی زندگی یا بعد از موت ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ حسن عسکری کا بھائی جعفر بن علی بن موسیٰ باقی لوگوں کی نسبت آپ کا نہایت قریبی تعلق دار تھا۔ حسن عسکری کی وفات کے بعد اس نے سب ترکہ خود لے لیا تھا۔ اس لیے کہ دوسرا کوئی شخص ان کا وارث نہ تھا، جعفر بن علی نے ان کی لونڈی کو بھی روکے رکھا تھا اور اس وقت اجازت دی جب پتہ چل گیا کہ ان میں سے کوئی بھی حاملہ نہیں۔ تاریخ کے اوراق ایسی شخصیت سے آشنا نہیں جسے حسن عسکری کی اولاد کہا جا سکے۔ گروہی تعصب کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا الگ بات ہے کہ وہ تاحال بقید حیات ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس (افسانے) کے آغاز کا حقیقت سے اتنا ہی تعلق ہو جتنا اس کے انجام کا۔ "سبحان واهب العقول"

فصل اول

مسئلہ امامت میں مختلف مذاہب

شیعہ مصنف ابن المطہر مسئلہ امامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: پہلی فصل: **مسئلہ امامت میں لوگوں کے مذاہب**:

''امامیہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عادل و حکیم ہیں [ظالم نہیں]۔ وہ افعال قبیحہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور نہ ہی واجب میں خلل ڈالتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے افعال بنا بر حکمت صحیح غرض کے لیے واقع ہوتے ہیں۔ اور وہ ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ ہی کوئی بیکار کام کرتا ہے۔ وہ بندوں پر بڑا مہربان ہے اور وہی کام کرتا ہے جو ان کے لیے سود مند اور بہتر ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو بغیر سختی کے اختیار دیا ہے۔ اور اپنے انبیاء کرام و معصوم رسولوں کی زبانی انہیں ثواب دینے کا وعدہ کیا ہے اور عذاب سے انہیں ڈرایا ہے۔ ان انبیاء کرام علیہم السلام سے خطاء یا بھول یا گناہ کا سرزد ہونا جائز نہیں۔ ورنہ ان کے اقوال و افعال کا اعتبار نہ رہتا؛ اور ان کی بعثت کا فائدہ حاصل نہ ہوتا۔''

سلسلہ تحریر کو جاری رکھتے ہوئے لکھتا ہے: ''سرور کائنات ﷺ کی وفات کے بعد امامت کا سلسلہ جاری کیا اور معصوم اولیاء مقرر کیے تاکہ لوگ غلطی؛ سہو و خطا سے مامون رہیں۔ اور ان اماموں کی اطاعت کرتے رہیں تاکہ یہ عالم ارضی لطف و عنایت ربانی سے خالی نہ رہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو آپ رسالت کی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔ اور اس امر کی تصریح کر دی کہ آپ کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں گے۔ پھر حسب ذیل خلفاء علی الترتیب ظہور پذیر ہوں گے:

۱۔ حسن بن علی ۲۔ حسین بن علی ۳۔ علی بن حسین
۴۔ محمد (باقر) ۵۔ جعفر (صادق) ۶۔ موسیٰ بن جعفر
۷۔ علی بن موسیٰ ۸۔ محمد بن علی جواد ۹۔ علی بن محمد ھادی
۱۰۔ حسن بن علی عسکری ۱۱۔ محمد بن حسن۔

سالار انبیاء ﷺ امامت کی وصیت کرنے کے بعد فوت ہوئے۔

بخلاف ازیں اہل سنت ان جملہ امور کے قائل نہیں۔ وہ اللہ کے لیے عدل و حکمت کا اثبات نہیں کرتے۔ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ اور اخلال بالواجب کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے افعال معلل بالاغراض نہیں، بلکہ حکمت و مصلحت سے یکسر خالی ہیں۔ بقول ان کے اللہ تعالیٰ ظلم و عبث کا مرتکب ہوتا ہے، اور وہ کام نہیں کرتا جو بندوں کے لیے زیادہ مناسب ہوں؛ بلکہ ایسے کام کرتا ہے جو حقیقت میں فساد ہیں؛ اس لیے کہ وہ گناہ کے کام ہیں۔ اور کفر و ظلم کی انواع و اقسام اور معاصی و کفریات بھی انجام دیتا ہے۔ کرۂ ارضی پر جس قدر فسادات رونما ہوتے ہیں وہ سب اس کی طرف منسوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے بہت بلند ہے۔

بقول اہل سنت اطاعت کنندہ ثواب کا مستحق نہیں اور عاصی عذاب کا استحقاق نہیں رکھتا۔ بلکہ بعض اوقات ساری عمر اس

کی اطاعت کرنے والوں اور اس کے احکام بجالانے والوں کو بھی عذاب میں مبتلا کرتا ہے؛ جیسا کہ نبی کریم ﷺ۔ اور ساری زندگی ہر قسم کی نافرمانی کرنے والوں کو ثواب و جزاء دیتا ہے؛ جیسے ابلیس وفرعون کو۔ انبیاء معصوم نہیں بلکہ ان سے خطا اور فسق و کذب کا صدور ممکن ہے۔ آپ نے کسی کے لیے امامت کی وصیت نہیں کی بلکہ بلا وصیت فوت ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد بقول اہل سنت ابو بکر رضی اللہ عنہ خلیفہ اول ہوئے۔ کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ اور چار دیگر صحابہ یعنی ابو عبیدہ، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، اسید بن حضیر اور بشیر بن سعد نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ ثانی مقرر کیا۔ بعد ازاں عمر رضی اللہ عنہ نے چھ اشخاص کو خلافت کیلئے منتخب کیا ان میں سے بعض نے عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے چن لیا۔ پھر لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور آپ خلیفہ قرار پائے۔ [1] اس کے بعد اہل سنت کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی امامت کے قائل ہیں اور بعض معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کرتے ہیں، اہل سنت کے نزدیک خلیفہ سفاح عباسی کے ظہور تک خلافت بنو امیہ میں ہی رہی۔ پھر اس کے بعد خلافت اس کے بھائی منصور کے پاس چلی گئی۔ اور پھر اس کے بعد مستعصم تک خلافت کو بنی عباس میں تسلیم کرتے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

شیعہ مصنف کے اشکالات کا جواب:

شیعہ مصنف نے اہل سنت اور شیعہ کے جو افکار و معتقدات بیان کیے ہیں وہ تحریف و کذب سے خالی نہیں، چنانچہ ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

پہلی بات: یہ ہے کہ اہل سنت اور شیعہ کے عقاید بیان کرتے ہوئے انکار تقدیر اور عدل کا ذکر بے سود ہے۔ اس لیے کہ فریقین [شیعہ اور اہل سنت] کے بعض گروہ ان دونوں کے قائل ہیں۔ مثلاً شیعہ کے بعض فرقے قدر کو تسلیم کرتے اور عدل و جور کا انکار کرتے ہیں۔ حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت کے قائلین میں سے بعض لوگ مثلاً معتزلہ عدل و جور کے قائل ہیں۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اس عقیدہ کی اصل بنیاد معتزلہ کے مذہب سے چلی ہے۔ چنانچہ اکابر شیعہ مثلاً شیخ مفید، موسوی، طوسی اور کراجکی نے یہ عقیدہ معتزلہ سے اخذ کیا ہے۔ قدیم شیعہ اس کے قائل نہ تھے۔ اس سے واضح ہوا کہ مسائل امامت بیان کرتے ہوئے تقدیر کا ذکر و بیان قطعی طور سے غیر متعلق ہے۔ بلکہ بسا اوقات مسئلہ امامت میں ایسے لوگ بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں؛ جو مسائل قدر میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات مسائل قدر میں ہم آہنگ لوگ مسائل امامت میں اختلاف کرتے ہیں۔ ان مسائل کا مسئلہ امامت میں ذکر کرنا دیگر ان تمام مسائل کی طرح ہے جس میں کچھ مسلمان گروہوں نے ان کی مخالفت کی ہے [اور کچھ نے موافقت]۔ جیسا کہ فتنہ قبر؛ منکر نکیر؛ حوض؛ میزان؛ شفاعت؛ اور اہل

[1] اس سے معلوم ہوا کہ کسی نے آپ کو خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چھٹے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منبر پر جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''لوگو! میں تمہاری اجازت سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہ (امامت و خلافت) تمہارا ذاتی معاملہ ہے اس میں کسی کو مداخلت کا حق حاصل نہیں بجز اس کے کہ تم کسی کو امیر مقرر کر دو، قبل ازیں اس ضمن میں ہمارے مابین اختلاف رونما ہو چکا ہے، اگر تمہیں (میرا خلیفہ ہونا) پسند ہے تو میں (مسند خلافت پر) بیٹھ جاؤں گا، ورنہ میں کسی پر اظہار ناراضگی نہیں کرتا، اس واقعہ کی تفصیلات تاریخ طبری (۵/ ۱۵۶، ۱۵۷) پر ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد: ''کہ کسی کو مداخلت کا حق نہیں۔'' اس پوری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے، جو شیعہ نے ۱۳ صدیوں سے آج تک تعمیر کر رکھی ہے، دیکھئے (العواصم من القواصم: ۱۴۲، ۱۴۳)۔

کبائر کا جہنم سے نکالا جانا؛ اور اس طرح کے دیگر وہ مسائل جن کا امامت سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ یہ بذات خود مستقل علیحدہ ایسے مسائل ہیں جس طرح کے کئی ایک دیگر علمی مسائل ہوتے ہیں۔ جیسے وہ اختلاف جن کے بارے میں موسوی اور دیگر مشائخ امامیہ نے کتابیں لکھی ہیں۔ اس سے واضح ہوا کا مسئلہ امامت میں ان مسائل کو داخل کرنا یا تو جہالت کا کرشمہ ہے' یا پھر جان بوجھ کر اس جہالت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

دوسری بات: ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ اس نے امامیہ سے نقل کیا ہے' وہ درست طور پر نقل نہیں کیا[بلکہ اس میں ڈنڈی ماری ہے]اس لیے کہ امامیہ کے وہ اقوال جو اس نے نقل کیے ہیں' یہ تو حقیقت میں معتزلہ کے اقوال وعقائد ہیں جن میں متاخرین شیعہ نے ان کی موافقت کی ہے۔

شیعہ کے عقائد:

نیز امامیہ سے جو بیان نقل کیا ہے، وہ بھی تشنہ تکمیل ہے ان کے افکار وعقائد کا خلاصہ حسب ذیل ہے: شیعہ کہتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ٔملائکہ اور حیوانات اور دیگر اشیاء کے افعال کو پیدا نہیں کیا بلکہ حوادث اس کی خلق وقدرت کے بغیر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی گمراہ کو راہ راست پر نہیں لاسکتا اور نہ ہی ہدایت یافتہ کو گمراہ کرنے پر قادر ہے۔

۳۔ کوئی انسان ہدایت ربانی کا محتاج نہیں،[اللہ تعالیٰ نے ہر چیز واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے، اس سے ہدایت یاب ہونا بندے کا اپنا کام ہے، اللہ کی مدد سے ہدایت نصیب نہیں ہوتی]۔

۴۔ ہدایت ربانی مومن وکافر سب کیلئے یکساں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مومنین کو دین کی نعمت سے بہرہ ور کیا ہے اسی طرح کفار کو بھی اس نعمت سے محروم نہیں کیا۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہدایت یافتہ بنایا اسی طرح ابو جہل کو بھی ہدایت سے نوازا۔ یوں سمجھئے کہ ایک والد دو بیٹوں کو یکساں رقم دیتا ہے، ایک اسے اطاعت الٰہی میں صرف کرتا ہے اور دوسرا معصیت میں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی باپ کی طرف سے انعام کے ہونے میں کوئی فرق نہیں۔

۵۔ مشیت ایزدی ایسے امور میں متعلق ہوتی ہے، جو ظہور پذیر نہیں ہوتے اور بعض امور اس کی مشیت کے بغیر وجود میں آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض ایسے لوگوں کو خاص کر دیتا ہے جن کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ اگر انہیں اپنی مہربانی کے لیے خاص کیا تو وہ اس وجہ سے مزید ہدایت پائیں گے۔ ورنہ نہیں۔

جواب: ان سے کہا جائے گا کہ:''حقیقت میں یہ اہل سنت والجماعت کا قول ہے جو تقدیر کو ثابت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں:'' ہر وہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے لیے خاص کر دیا ہو' وہ ہدایت پا کر رہے گا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کیساتھ خاص نہیں کیا' وہ ہدایت نہیں پاسکتے۔ تخصیص اور ہدایت اہل سنت والجماعت کے نزدیک آپس میں متلازم ہیں۔'' اگر یہ کہا جائے: بلکہ کبھی اللہ تعالیٰ ایسے امور کے لیے خاص کرتا ہے جس سے ہدایت یافتہ ہونا واجب ہوتا ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ [الانفال ۲۳]

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انھیں ضرور سنوا دیتا اور اگر وہ انھیں سنوا دیتا تو بھی وہ منہ پھیر جاتے، اس حال میں کہ وہ بے رخی کرنے والے ہوتے۔''

ان سے کہا جائے گا: ''یہ تخصیص حق ہے۔ مگر یہ دعوی کرنا کہ اس کے علاوہ کوئی اور تخصیص نہیں ہے' غلط ہے؛ بلکہ ہر وہ چیز جو ہدایت پانے کے لیے لازمی ہے؛ وہ ہدایت ہے۔

اجمالی طور پر وہ [شیعہ] ذات الٰہی کے لیے مشیت عامہ و قدرت تامہ کا اثبات نہیں کرتے، شیعہ کی رائے میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق جملہ حوادث کو شامل نہیں، بعینہ معتزلہ بھی یہی کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس میں شیعہ کے دو قول ہیں۔

تیسری بات : باقی رہا شیعہ کا یہ قول کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ائمہ معصومین کو اس لیے پیدا کیا ہے تا کہ یہ عالم ارضی اس کی عنایات سے خالی نہ رہے۔''

جواب : اگر اس قول سے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ائمہ معصومین کو اس لیے پیدا کیا ہے'' مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قوت اور قدرت دی ہے کہ وہ لوگوں کے سیاسی امور نبھائیں تا کہ ان کی سیاست سے لوگوں کو فائدہ حاصل ہو۔ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ شیعہ اس بات کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ بلکہ بقول شیعہ ائمہ معصومین مجبور و مظلوم اور حد درجہ بے بس ہیں۔ انہیں کوئی قدرت و اختیار حاصل نہیں۔ شیعہ اس بات کے معترف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ معصومین کو (تصرفات و اختیارات) کا مالک نہیں بنایا، اور نہ ہی انہیں حکومت سے نوازا۔ ان ائمہ کو کوئی ایسی حکومت و ولایت بھی حاصل نہیں تھی جیسے ان کے دوسرے مؤمن بھائیوں کو حاصل ہوئی تھی۔ اور نہ ہی کفار و فجار جیسی حکومت و سلطنت ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے کئی ایک کو حکومت سے نوازا تھا۔ جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ﴾ [البقرة ۲۵۱]

''اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا' اور اللہ تعالیٰ نے اسے ملک اور حکمت سے نوازا' اور جس چیز کے متعلق چاہا تعلیم دی۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا﴾ (النساء: ۵۴)

''یا وہ لوگوں سے اس پر حسد کرتے ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دیا ہے، تو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور ہم نے انھیں بہت بڑی سلطنت عطا فرمائی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الكهف ۷۹)

''اور ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی چھین کر لے لیتا تھا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ [البقرة ۲۵۸]

''کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، اس لیے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی۔''

ان ائمہ میں سے کسی ایک کو اللہ تعالیٰ نے ایسے حکومت نہ عطا کی تھی جیسے انبیاء کرام علیہم السلام اور نیک لوگوں کو دی تھی۔اور نہ ہی ایسے عطا فرمائی جیسے دوسرے بادشاہوں کو عطا کی تھی۔تو پھر یہ قول باطل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان ائمہ کو اس لیے مقرر فرمایا تھا کہ یہ لوگوں کے سیاسی امور کو نبھائیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ:''تقرر ائمہ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر ان کی اطاعت ضروری قرار دی جائے۔جو ان کا اطاعت شعار ہوتا ہے وہ اسے ہدایت سے بہرہ اندوز کرتے ہیں' مگر لوگ ان کی نافرمانی کرتے تھے۔''

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ:''لوگ صرف اسی بنا پر اللہ کی طرف سے لطف وعنایت سے محروم نہیں رہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی تکذیب کرتے اور اس کے احکام سے سرتابی کے مرتکب ہوتے تھے۔

باقی رہا امام منتظر کا مسئلہ! تو اس امام پر ایمان رکھنے والے بھی اس عقیدہ سے کوئی نفع اندوز نہیں ہوئے اور نہ ہی انہیں کوئی لطف ومہربانی حاصل ہوئی۔حالانکہ وہ اس سے محبت ودوستی رکھتے ہیں۔تو معلوم ہوا کہ اس عقیدہ سے نہ ہی کوئی لطف ومہربانی حاصل ہوئی اور نہ ہی کوئی فائدہ؛ نہ اس امام کے ماننے والے کے لیے اور نہ انکار کرنے والے کے لیے۔''

اس سے ان کے قول کا بطلان ثابت ہو گیا کہ کائنات میں لطف ومہربانی اور رحمت امام معصوم کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔اور یہ بات ضرورت کے تحت معلوم ہے کہ اس امام کی وجہ سے کائنات میں کوئی لطف ومہربانی حاصل نہ ہوسکی؛ نہ ہی اس امام پر ایمان رکھنے والوں کو کچھ ملا اور نہ ہی اس کا انکار کرنے والوں کا کوئی نقصان ہوا۔بخلاف اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول کے؛ کہ جب کوئی قوم کسی رسول کو جھٹلاتی ہے [تو انہیں نقصان ہوتا ہے]۔بیشک رسولوں سے ان لوگوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے جو ان پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔تو اس لحاظ سے نبی کا وجود اس پر ایمان لانے والوں اور اطاعت گزاروں کے حق میں رحمت ہوا کرتا تھا۔جب کہ نافرمان حد سے گزرا ہوا سرکش ہوتا ہے [اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا]۔

جب کہ اس امام سے نہ ہی کسی مؤمن کو کوئی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کسی کافر کو۔

جہاں تک [بارہ ائمہ] ائمہ اثناعشر کا تعلق ہے ان سے لوگ اسی طرح مستفید ہوتے رہے جیسے ان جیسے دیگر علماء وفضلاء کی تعلیم وعلم' بیان حدیث؛ اور افتاء سے۔البتہ اولی الامر ذوسلطان سے جو منفعت مطلوب ہوتی ہے وہ ان ائمہ میں سے کسی ایک سے بھی حاصل نہ ہوسکی۔اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ابن المطہر نے جس عنایت ربانی کا ذکر کیا ہے، وہ دجل و فریب کی کرشمہ سازی ہے اور بس۔

[الزام]: ابن المطہر کا یہ قول کہ:''اہل سنت ذات باری تعالیٰ کے لیے عدل وحکمت کا اثبات نہیں کرتے۔ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ اور اخلال بالواجب کا مرتکب ہوسکتا ہے۔''

[جواب]: (یہ بات) دو لحاظ سے باطل ہے۔اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ بہت سے اہل سنت والجماعت جو خلافت کے بارے میں منکر نصوص ہیں؛ اور بارہ اماموں کو بھی نہیں مانتے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لیے عدل وانصاف کا اثبات ایسے ہی کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ مصنف کی تحریر میں بیان ہو چکا ہے۔مصنف اور اس کے شیوخ اور دیگر لوگوں نے یہ عقیدہ معتزلہ سے لیا ہے۔متاخرین روافضہ بھی اس عقیدہ میں ان کے ہم نوا بن گئے ہیں۔پس اس قول کو تمام اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب کرنا سوائے شیعہ کے' یہ اس مصنف کی طرف سے ایک جھوٹی بات ہے۔

دوسری وجہ: وہ تمام اہل سنت والجماعت جو تقدیر کا اقرار کرتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ عادل نہیں' یا پھر حکیم نہیں۔ اوران میں سے کوئی ایک ترک واجب کے جواز کا بھی نہیں کہتا۔ اور کوئی بھی اسے قبائح کا مرتکب نہیں ٹھہراتا۔ اہل اسلام میں جو شخص علی الاطلاق ایسا عقیدہ رکھتا ہو اور وہ بالاتفاق مباح الدم ہے۔ لیکن مسئلہ قدر اوراس طرح کے دیگر مسائل میں مسلمانوں کے مابین اختلاف بڑا مشہور ومعروف ہے۔

مسئلہ تقدیر:

[تقدیر کا مسئلہ متنازع فیہا ہے]۔ جب کہ قدر کی نفی کرنے والے جیسے معتزلہ اوران کے ہم نوا؛ ان کا وہی عقیدہ ہے جو متاخرین امامیہ کا ہے۔ جب کہ قدر کو ثابت کرنے والے جمہور ائمہ اہل اسلام صحابہ وتابعین اور اہل بیت اور دوسرے لوگوں کے مابین یہ امر اختلافی ہے کہ خداوندی عدل وحکمت اوراس ظلم سے کیا مراد ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا منزہ ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے افعال واحکام کے معلل ہونے میں بھی اختلاف ہے:

۱۔ ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ سے ظلم کا صدور ممکن نہیں اور وہ جمع بین الضدین کی طرح ذات باری کے لیے محال لذاتہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو چیز ممکن ہو اور قدرت الٰہی کے دائرہ میں داخل ہو اسے ظلم سے تعبیر نہیں کر سکتے۔
ان لوگوں کا کہنا ہے: مثلاً اللہ تعالیٰ اگر اطاعت شعار کو عذاب میں مبتلا کر دے اور عاصی پر انعامات کی بارش کرے تو بقول ان کے یہ ظلم نہیں۔ وہ کہتے ہیں: ظلم اس تصرف کا نام ہے جس کا حق حاصل نہ ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ جملہ اختیارات سے بہرہ ور ہے۔ یا پھر ظلم وہ ہے جس میں کسی کے حکم کی مخالفت ہو۔ اللہ تعالیٰ تو خود حکم دینے والا ہے۔ تو اس کا یہ فعل ظلم کیوں کر ہوا؟ عقیدہ قدر پر ایمان رکھنے والے بہت سے متکلمین اور فقہاء اور اصحاب ائمہ اربعہ یہی رائے رکھتے ہیں۔

۲۔ دوسرے گروہ کی رائے ہے کہ ظلم قدرت الٰہی کے احاطہ میں داخل ہے۔ اور وہ ممکنات میں سے بھی ہے؛ چونکہ اللہ تعالیٰ عادل ہے اس لیے وہ ظلم کا ارتکاب نہیں کرتا، اس نے خود اپنی ذات کی مدح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا ﴾ (یونس ۴۴)

''بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ بھر ظلم نہیں کرتا۔''

ظاہر ہے کہ مدح اسی کام کے چھوڑنے پر کی جا سکتی ہے جس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہو؛ نہ کہ وہ کام ترک کرنے پر جس پر کوئی قدرت ہی نہ ہو۔ ان لوگوں کا کہنا ہے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴾ (طہ: ۱۱۲)

''جو حالت ایمان میں نیک کام کرے وہ ظلم اور کمی سے نہیں ڈرے گا''

ان کا کہنا ہے کہ: ظلم یہ ہوگا کہ کسی پر دوسرے کی برائیوں کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ اور ہضم یہ ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا اجر نہ دیا جائے۔ جب کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ۞ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾

[ھود ۱۰۰۔۱۰۱]

''یہ ان بستیوں کی چند خبریں ہیں جو ہم آپ کیلئے بیان کرتے ہیں، ان میں سے کچھ کھڑی ہیں اور کچھ کٹ چکی

ہیں۔اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اس نے جب ان لوگوں کو ہلاک کیا تو ان پر کوئی ظلم نہیں کیا؛ بلکہ انہیں ہلاک کرنا ان کے گناہوں کی وجہ سے تھا۔جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَجِيْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ [الزمر ۶۹]

''اور نبی اور گواہ لائے گئے اور ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ لوگوں کے درمیان بغیر حق کے فیصلہ کرنا ظلم ہے۔اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے منزہ ہے۔

جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـــًٔا ﴾ [انبیاء ۴۷]

''اور ہم بروز قیامت انصاف کے ترازو رکھیں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔''

مراد یہ ہے کہ ان کی نیکیوں میں سے کچھ بھی کم نہ کیا جائے گا۔اور نہ ہی کسی کو بغیر گناہوں کے سزا دی جائے گی۔اللہ تعالیٰ ایسے افعال سے منزہ ومبرا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ۞مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾

''میرے پاس جھگڑا مت کرو، حالانکہ میں نے تو تمھاری طرف ڈرانے کا پیغام پہلے بھیج دیا تھا۔میرے ہاں بات بدلی بھی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ہرگز کوئی ظلم ڈھانے والا نہیں۔'' (ق:۲۹)

مذکورہ [بالا] آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو اس امر سے منزہ قرار دیا ہے، جس پر وہ قدرت رکھتا ہے نہ کہ ایک محال بات سے جس پر وہ سرے سے قادر ہی نہیں۔اس طرح کے قرآن مجید میں کئی ایک مواقع ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان انصاف کریگا۔اور ان کے مابین عدل کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور عدل سے فیصلہ نہ کرنا ظلم ہوگا 'جب کہ اللہ تعالیٰ ظلم سے بری ہے۔اور کسی ایک پر دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾[الانعام ۱۶۴]

''اور کسی جی پر کسی دوسرے کا بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نامناسب چیزوں سے اپنے آپ کو منزہ و بری قرار دیتے ہیں۔بلکہ ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہوگا جو اس نے خود کیا ہو۔اور اسی گناہ کا بوجھ اس پر لادا جائے گا جو اس نے خود کمایا ہو۔

صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے؛ اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام کرتا ہوں' پس تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔''[1]

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر رکھا ہے جس طرح اس نے رحمت کو اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا ہے، قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (الانعام:۱۲)

[1] صحیح مسلم۔کتاب البر والصلة۔باب تحریم الظلم (حدیث:۲۵۷۷)۔

''اس نے رحمت کو اپنی ذات پر لکھ رکھا ہے۔'' [واجب کردیا ہے]

صحیح حدیث میں وارد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے جب مخلوقات کو پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک کتاب میں جو عرش پر رکھی ہے یہ الفاظ تحریر کیے: ''میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔''❶

کیا افعال الٰہی معلل ہیں؟:

مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف بالحکمت ہے۔ مگر اس کی تفسیر میں ان کے مابین اختلاف ہوا ہے۔ ایک گروہ کے نزدیک حکمت کے معنی یہ ہے کہ اسے افعال العباد کا علم ہے اور وہ حسب ارادہ ان کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف علم' ارادہ اور قدرت کی صفات کو ثابت مانتے ہیں۔

جمہور اہل سنت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خلق و امر میں حکیم ہے، حکمت سے مشیت علی الطلاق مراد نہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہر صاحب ارادہ حکیم بھی ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ محمود ۲۔ مذموم۔

اللہ تعالیٰ کے خلق و امر میں جو اچھے انجام کار اور بہترین نتائج پائے جاتے ہیں اسی کو حکمت کہتے ہیں۔ ان الفاظ میں

---

❶ صحیح بخاری۔ کتاب بدء الخلق۔ باب ما جاء فی قول اللّٰہ تعالیٰ ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَءُ الْخَلْقَ...... ﴾ (ح:۳۱۹٤)
صحیح مسلم، کتاب التوبة۔ باب فی سعة رحمة اللّٰه تعالیٰ (ح:۲۷۵۱)۔ [اس کی مزید تفصیل منہاج میں یوں ہے]:
ظاہر ہے کہ جس چیز کو ذات باری نے اپنے لیے واجب یا حرام کر رکھا ہے، وہ اس پر قادر ہے اس لیے کہ جو چیز ممکنات میں سے نہیں وہ اللہ کی ذات پر حرام یا واجب کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اکثر اہل سنت محدثین و مفسرین نیز فقہاء صوفیا اور متکلمین اور ائمہ اربعہ کے ماننے والے؛ جو تقدیر کے قائل ہیں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ مومن کو ہدایت یاب کر کے اس پر احسان دھرنا اور کافر کو اس سے محروم رکھنا ظلم ہے، اس کا یہ عقیدہ دو اعتبار سے جہالت پر مبنی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ: چونکہ مومن کافر پر فضیلت رکھتا ہے بنا بریں وہ اس اعزاز کا مستحق ہوا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدَاکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾ (الحجرات: ٤۹/ ۱۷)
''بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی جانب راہ دکھائی اگر تم سچے ہو۔'' دوسری جگہ انبیاء کرام علیہم السلام کی زبانی ارشاد ہوا:
﴿ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ ﴾ (ابراھیم: ١٤/ ١١)
''ہم تو صرف تمہاری طرح کے انسان ہیں مگر اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اپنا احسان فرماتا ہے۔''
آیت سے آشکار ہوا کہ اللہ تعالیٰ صرف اسی کو سزا دیتا ہے جو اس کا مستحق ہو؛ نیز نیکوکار کو کبھی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔ اسی لیے یہ مثل مشہور ہے:
''کُلُّ نِعْمَةٍ مِّنْهُ فَضْلٌ وَکُلُّ نِقْمَةٍ مِّنْهُ عَدْلٌ۔'' ''ہر احسان اس کا فضل ہے اور ہر سزا اس کا عدل ہے۔''
اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ وہ گناہوں کے باعث لوگوں کو سزا دیتا ہے اور اس کے انعامات محض اس کے فضل و احسان کی کرشمہ سازی ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے: ''جو اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان پائے تو اس کا شکر ادا کرے اور جو اس کے سوا (حوادث و آلام وغیرہ) پائے تو اپنے آپ کو ملامت کرے۔''
صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، (ح:۲۵۷۷) مطولاً۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:
﴿ مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ﴾ (النساء:۷۹) ''آپ کو جو کچھ بھلا پہنچتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''
آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو پسندیدہ نعمتیں مثلاً نصرت خداوندی اور وسعت رزق وغیرہ تجھے حاصل ہوتی ہے، یہ عین عنایت ربانی ہے اور جو تکلیف آتی ہے، وہ تمہارے گناہوں کا ثمرہ ہے۔ اس آیت میں الحسنات سے نعمتیں اور السیئات سے مصائب و آلام مراد ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا:
﴿ وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ ﴾ (الاعراف: ۷/ ۱٦۸) ''ہم نے ان کو بھلائی و عافیت اور تکلیفات سے آزمایا۔''
نیز فرمایا: ﴿ اِنْ تُصِبْکَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ﴾ (التوبہ:۹/ ۵۰)۔ ''اگر تجھے آرام پہنچتا ہے تو انہیں برا محسوس ہوتا ہے۔''
مزید ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ تَمْسَسْکَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْکُمْ سَیِّئَةٌ یَّفْرَحُوْا بِهَا ﴾ (آل عمران: ۱۲۰)
''اگر تمہیں خوش حالی نصیب ہوتی ہے تو انہیں برا محسوس ہوتا ہے اور اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں۔''

حکمت کا اثبات معتزلہ اور ان کی موافقت رکھنے والے شیعہ کا قول نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان گروہوں میں سے جمہور کا یہی قول ہے ۔مفسرین' محدثین ؛صوفیاء؛ اہل کلام' اور دوسرے لوگ یہی عقیدہ رکھتے ہیں ۔ ائمہ فقہاء احکام شریعت میں اللہ تعالیٰ کے لیے حکمت' اور مصلحت کے اثبات پر یک زبان اور متفق ہیں۔اس میں تنازعہ کرنے والے فقط تقدیر کے منکر اور کچھ دوسرے لوگ ہیں۔اور ایسے ہی اس کی تخلیق میں بندوں کے لیے جو مصلحتیں اور حکمتیں ہیں وہ معلوم شدہ ہیں۔

پہلے نظریہ کے قائلین جہم بن صفوان اور اس کی موافقت رکھنے والے مثلاً ابو الحسن اشعری اور ان کے ہم خیال فقہاء' امام مالک' امام شافعی' اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے اصحاب کا قول ہے ۔ان کا کہنا ہے کہ: قرآن کریم میں جن افعال الٰہیہ کا ذکر آیا ہے ان میں لام تعلیل نہیں بلکہ لام عاقبت ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے افعال معلل نہیں ہیں)۔

بخلاف ازیں جمہور کے نزدیک لام تعلیل اللہ تعالیٰ کے افعال و احکام میں داخل ہے۔ قاضی ابو یعلی ؛ ابو الحسن بن الزعفرانی اور ان کے ہم نوا و ہم خیال امام احمد کے ساتھی اگر چہ وہ پہلے قول کے قائل ہیں' لیکن کئی ایک مقامات پر ان سب سے یہ دوسرا قول بھی منقول ہے۔اور امام شافعی' امام مالک اور ان کے ساتھیوں اور دیگر فقہاء سے بھی اس طرح کا قول منقول ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو لوگ بہت بڑی گمراہی کا شکار تھے۔جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا سنو:

''میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو وہ باتیں سکھا دوں کہ جن باتوں سے تم لاعلم ہو۔میرے رب نے آج کے دن مجھے وہ باتیں سکھا دی ہیں۔ میں نے اپنے بندے کو جو مال دے دیا ہے وہ اس کیلئے حلال ہے اور میں نے اپنے سب بندوں کو حق کی طرف رجوع کرنے والا پیدا کیا ہے؛لیکن شیطان میرے بندوں کے پاس آ کر انہیں ان کے دین سے بہکاتے ہیں۔اور میں نے اپنے بندوں کے لئے جن چیزوں کو حلال کیا ہے وہ ان کے لئے حرام قرار دیتے ہیں اور وہ ان کو ایسی چیزوں کو میرے ساتھ شریک کرنے کا حکم دیتے ہیں کہ جس کی کوئی دلیل میں نے نازل نہیں کی۔[1]

---

[1] [اس حدیث کا باقی حصہ یوں ہے:]اور بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف نظر فرمائی اور عرب عجم سے نفرت فرمائی سوائے اہل کتاب میں سے کچھ باقی لوگوں کے۔اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے تاکہ میں تم کو آزماؤں اور ان کو بھی آزماؤں کہ جن کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے۔اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جسے پانی نہیں دھو سکے گا اور تم اس کتاب کو سونے اور بیداری کی حالت میں بھی پڑھو گے اور بلاشبہ اللہ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں قریش کو جلا ڈالوں۔تو میں نے عرض کیا:اے پروردگار!وہ لوگ تو میرا سر پھاڑ ڈالیں گے۔اللہ نے فرمایا: تم ان کو نکال دینا جس طرح کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی خرچہ کیا جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر روانہ فرمائیں میں اس کے پانچ گنا لشکر بھیجوں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تابعداروں کو لے کر ان سے لڑیں کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نافرمان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جنتی لوگ تین قسم کے ہیں حکومت کے ساتھ انصاف کرنے والے؛ صدقہ و خیرات کرنے والے توفیق عطا کئے ہوئے ؛وہ آدمی کہ جو اپنے تمام رشتہ داروں اور مسلمانوں کے لئے نرم دل ہو وہ آدمی کہ جو پاکدامن پاکیزہ خلق والا ہو اور عیالدار بھی ہو لیکن کسی کے سامنے اپنا ہاتھ نہ پھیلاتا ہو۔''

آپ نے فرمایا:''دوزخی پانچ طرح کے ہیں وہ کمزور آدمی کہ جس کے پاس مال نہ ہو اور دوسروں کا تابع ہو اہل و مال کا طلبگار نہ ہو خیانت کرنے والا آدمی کہ جس کی حرص چھپی نہیں رہ سکتی ؛اگرچہ اسے تھوڑی سی چیز ملے اور اس میں بھی خیانت کرے؛ وہ آدمی جو صبح شام تم کو تمہارے گھر اور مال کے بارے میں دھوکہ دیتا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل یا جھوٹے اور بدخو اور بیہودہ گالیاں بکنے والے آدمی کا بھی ذکر فرمایا اور ابوغسان نے اپنی روایت میں یہ ذکر نہیں کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ کریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی خرچ کیا جائے گا۔اور فرمایا:''میں نے اپنے بندوں کو یکسو موحد پیدا کیا تھا۔پس شیطان نے لوگوں کو گمراہ کیا؛ اور ان پر کچھ چیزیں حلال کیں' اور کچھ حرام کیں' اور میں نے انہیں حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں؛ جس کی میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔''[صحیح مسلم:جلد سوم:ح 2708۔]یہ حدیث کافی لمبی ہے۔

مسلمان اس چیز پر قائم تھے جو پیغام اور دین حق دیکر اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ جو کہ صحیح منقول اور صریح معقول کے موافق تھا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا' تو مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں کے مابین صفین کے موقع پر جنگ و قتال بپا ہوئے۔ اور وہ لوگ ظہور پذیر ہوئے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔'' [مسلم ۲/ ۷٤٥؛ سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]

ان لوگوں کا ظہور اس وقت ہوا جب یہ دونوں مسلمان گروہ دو جرگہ داروں پر راضی ہو گئے۔ اور بغیر کسی فیصلہ کے ان کا افتراق ہو گیا۔ اور اسی وقت سے شیعیت کی ابتداء ہوئی۔ اور ان لوگوں کا ظہور ہوا جو غالی شیعہ بنے ؛ جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خدا ہونے کا دعوی کیا۔ اور وہ لوگ سامنے آئے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منصوص ہونے کا دعوی کیا؛ جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دینے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں قسم کے لوگوں کو سزا دی۔ خوارج سے قتال کیا۔ اور جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الٰہ ہونے کا دعوی کیا تھا' انہیں آگ میں جلا دیا۔ ایک روز حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے باہر نکلے؛ تو جو لوگ آپ کو خدا سمجھتے تھے' انہوں نے آپ کو سجدہ کیا۔ آپ نے ان سے پوچھا یہ کیا ہے؟ کہنے لگے: تم وہی ہو۔ آپ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ کہنے لگے: ''آپ وہ معبود ہیں جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔'' آپ نے فرمایا: ''تمہارے لیے ہلاکت ہو' ایسے کہنا کفر ہے۔ اپنی بات سے رجوع کرو' ورنہ تمہاری گردنیں مار دوں گا۔

دوسرے دن بھی ان لوگوں نے ایسے ہی کیا۔ تیسرے دن بھی ایسے ہی کیا۔ آپ نے تین دن تک انہیں مہلت دی۔ اس لیے کہ مرتد کو توبہ کرنے کے لیے تین دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ جب انہوں نے اپنے قول سے رجوع نہیں کیا تو آپ نے آگ جلانے کا حکم دیا۔ یہ خندقیں باب کندہ کے پاس کھودی گئیں۔ اور ان لوگوں کو اس آگ میں ڈال دیا گیا۔

ان لوگوں کو قتل کرنا بالاتفاق واجب تھا۔ لیکن ان کو آگ سے جلانے میں علماء کرام کا اختلاف تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں آگ میں جلا دیا جائے۔ جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے فقہاء کا خیال اس کے خلاف تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''اگر میں اس جگہ پر ہوتا [یا میرا بس چلتا] تو میں انہیں آگ میں نہ جلاتا' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ: ''کوئی بھی اللہ کے عذاب سے مخلوق کو عذاب نہ دے۔'' میں ان کی گردنیں مار دیتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو کوئی اپنے دین کو بدل ڈالے اسے قتل کر دو۔'' یہ حدیث بخاری میں ۱۵/۹ پر ہے۔

رہ گئے سبّ و شتم کرنے والے' جو کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں دیتے ہیں؛ ان کے بارے میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خبر پہنچی تو آپ نے ابن سوداء [عبداللہ ابن سباء شیعیت کے موجد اعلی] کو بلا بھیجا؛ جس کے بارے میں آپ کو یہ شکایت ملی تھی۔ آپ اس کو قتل کرنا چاہتے تھے' مگر وہ قرقیسیا کی طرف بھاگ نکلا۔ رہ گئے مفضلہ ؛ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جناب حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر فضیلت دیتے ہیں' ان کے متعلق آپ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب بھی کوئی ایسا انسان میرے پاس لایا جائے گا جو مجھے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر ترجیح دیتا ہو؛ تو میں اسے بہتان گھڑنے والی کی حد لگاؤں گا؛ [یعنی اسی کوڑے مارے جائیں گے]۔

آپ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ آپ نے کوفہ کے منبر پر ارشاد فرمایا:

''آگاہ ہو جاؤ! نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت کے سب سے بہترین فرد حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔'' ❶

یہ بات آپ سے تقریباً اسی اسناد کیساتھ روایت کی گئی ہے۔ اسے امام بخاری اور دوسرے لوگوں نے بھی روایت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے شیعہ بالاتفاق حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے۔ جیسا کہ کئی لوگوں نے روایت کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اہل سنت میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ سے اخلال واجب کا ارتکاب ہوتا ہے؛ یا وہ کوئی قبیح فعل سرانجام دیتا ہے۔ لیکن یہ بدعتی [جھوٹ گھڑنے میں] اپنے اسلاف کے مسلک پر چلا ہے۔ یہ اہل سنت سے نقل کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اخلال بالواجب اور فعل قبیح کے ارتکاب کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور یہ اس نے دو گروہوں میں سے ایک سے' جو یہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی واجب نہیں ہوتا؛ اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ تمام چیزیں ترک کر دے؛ بطور الزام نقل کیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ: اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ: ''اس سے کوئی قبیح چیز نہیں ہوتی؛ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے فعل قبیح کو جائز سمجھتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے افعال کا ارتکاب کرتا ہے جو ان کے نزدیک قبیح ہوتے ہیں' یا وہ فعل جو بندوں کے افعال میں سے قبیح ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بطریق الزام نقل کیا ہے' جس کا عقیدہ وہ خود رکھتا ہے۔

اہل سنت والجماعت تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے' اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ اور ہدایت اس کے فضل سے ملتی ہے۔ جب کہ قدریہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ ہر وہ کام کرے جس کے متعلق وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے' اور اس کے خلاف کرنا اللہ تعالیٰ پر حرام ہے۔ پس اس طرح وہ اللہ تعالیٰ پر کچھ چیزیں واجب کرتے ہیں' اور کچھ چیزیں حرام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر واجب نہیں کیا۔ اور نہ ہی از روئے شریعت یا عقل ان کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پھر یہ اپنی طرف سے ان لوگوں پر حکم لگانے لگ جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کو واجب نہیں ٹھہراتے؛ اور کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اخلال بالواجب کا ارتکاب کرتا ہے؛ حالانکہ یہ مذہب کے نقل کرنے میں تلبیس و تحریف والا کام ہے۔ ان لوگوں کے عقیدہ کی بنیاد قدریہ کا عقیدہ ہے جس میں وہ خلق افعال میں اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ پس پھر اس میں جو چیز اچھی لگے' اسے بندے کا حسن قرار دیتے ہیں' اور جو چیز بندے سے قبیح تصور ہو وہ اللہ کے لیے بھی قبیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی مثال بیان کرنا باطل ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کے افعال معلّل بالحِکَم ہیں؟:

[اعتراض]: شیعہ کہتے ہیں: ''اہل سنت کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کسی غرض کی وجہ سے کوئی کام نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے یہاں تمام افعال باری تعالیٰ کسی غرض و حکمت پر مبنی نہیں ہوتے؛ اور نہ ہی ان میں سرے سے کوئی حکمت پائی جاتی ہے۔'' [آہ رافضی]

[جواب]: اللہ تعالیٰ کے افعال و احکام کے معلّل بالحکمت ہونے میں اہل سنت کے دو قول ہیں۔ اور مذاہب اربعہ میں سے ہر مذہب میں اس مسئلہ میں نزاع پایا جاتا ہے۔ اکثر علماء فقہیات پر تبصرہ کرتے وقت تعلیل احکام کو تسلیم کرتے ہیں۔ علماء اصول میں سے بھی بعض بصراحت تعلیل کے معترف ہیں۔ اور بعض اس کا انکار کرتے ہیں۔

---

❶ البخاري ٥/ ٧۔

شیعہ کا یہ کہنا کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ ظلم وعبث کا مرتکب ہوسکتا ہے۔اگر اس سے مراد بذات خود[اس فعل کا] ظلم وعبث ہونا ہے' تو پھر بھلے رافضی نے یہ جملہ بطور الزام کہا ہو؛ یہ فقط بہتان اور من گھڑت ہے ۔اہل سنت کبھی اس کو ظلم نہیں کہتے ۔[ایسی بات کسی مسلمان کے منہ سے نہیں نکل سکتی ۔ تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا]

ظلم کی تفسیر میں اہل سنت والجماعت کے ہاں اختلاف ہے' جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ فعل جو بندے کی جانب سے ظلم وعبث ہے' تو پھر اس کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں کوئی ایسی ممنوع بات بھی نہیں ۔[[اہل سنت اللہ تعالیٰ کو افعالِ عباد کا خالق قرار دیتے ہیں۔قرآن کریم میں فرمان الٰہی ہے:﴿هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ۱۲۰) ''وہ ہر چیز کا خالق ہے۔'']]

جمہور اہل سنت والجماعت یہ نہیں کہتے کہ: یہ ظلم وعبث اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں: یہ بندے کا فعل ہے' مگر تخلیق اللہ تعالیٰ کی ہے۔جیسا کہ انسانی قدرت' اس کی سمع و بصارت اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے' اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی سمع و بصارت اور قدرت ہرگز نہیں ہے۔ ❶

اللہ تعالیٰ بندوں کی حرکات وعبادات کا خالق:

[اعتـــراض] : شیعہ کہتے ہیں:''اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ وہ کام نہیں کرتا جو بندوں کے لیے اصلح ہو، بلکہ وہ ایسے کام کرتا ہے جو فساد کے موجب ہوں، مثلاً کفر وعصیان وغیرہ۔پورے عالم میں ہونے والا ہر قسم کا فساد اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب ہیں۔(تَعَالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ)۔

[جواب] :ہم جواباً کہتے ہیں کہ بے شک بعض اہل سنت اور بعض شیعہ کا نقطۂ نظر یہی ہے۔مگر جمہور اہل سنت اس کے خلاف ہیں۔بلکہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ جملہ اشیاء کا خالق و مالک ہے۔اور کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی خلقت' اس کے ملک اور قدرت سے باہر نہیں ہوسکتی ۔ اس میں تمام حیوانات کے افعال بھی داخل ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور مؤمنین [کو بھی پیدا کیا]اور ان کی حرکات، عبادات اور ارادات کو بھی پیدا کیا۔منکرین تقدیر اس چیز کو اللہ تعالیٰ کی اختیار ملکیت سے خارج قرار دیتے ہیں جو خود اس کی ملکیت ہے۔جیسے :انبیاء، اولیاء؛ ملائکہ اور مؤمنین کی اطاعت وعبادت ۔منکرین تقدیر کا عقیدہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے عبادت کو پیدا نہیں کیا، وہ بندے کو عبادت پر لگا سکتا ہے نہ اس کے ذہن میں عبادت کا خیال القاء کرسکتا ہے وہ کسی کو ہدایت عطا کرنے پر بھی قادر نہیں۔اور نہ ہی ان امور کے تارک کو ان کے بجالانے پر قادر کرسکتا ہے۔جب کہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی منقول ہے:

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ (البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنے اطاعت شعار بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلم جماعت تیار

---

❶ [[(منہاج السنہ میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ: ظلم کا صدور اس شخص سے ہوتا ہے جو اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ظلم کا پیدا کرنے والا (ذاتِ اللہ تعالیٰ) ظالم نہیں ہو جاتا۔غور کیجیے کہ عبادات، روزہ اور حج وغیرہ کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے، مگر ان کو پیدا کرنے سے وہ عابد، روزہ دار اور حاجی نہیں بن گیا۔اسی طرح بھوک کو بھی اسی نے پیدا کیا، مگر وہ بھوکا نہیں بن گیا۔تو پھر ظلم کی تخلیق سے وہ ظالم کیوں کر ٹھہرا؟ قاعدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی جگہ کسی صفت یا فعل کو پیدا کرتا ہے تو وہ اس فعل یا صفت سے متصف نہیں ہوتا۔اگر ایسا ہوتا تو اسے تمام پیدا کردہ اعراض (جمع عرض وہ چیز جو بذاتِ خود قائم نہ ہو بلکہ اس کا وجود کسی چیز کے باعث ہو) کے ساتھ موصوف کردیا جاتا۔[دلدار جی]]۔

کردے۔"

آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا فرمائی کہ وہ مہربان ذات انہیں مسلمان بنا دے؛ اور ان کی اولاد میں سے بھی ایک مسلمان امت پیدا فرمائے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو فاعل بنانے پر قادر ہے۔ نیز فرمایا:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ (ابراھیم: ۴۰)

"اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنا دے؛ اور میری اولاد کو بھی۔"

اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے ہیں کہ وہ مہربان ذات آپ کو نماز کا پابند بنا دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نمازی کو نمازی بناتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چمڑے اور اعضاء کے بارے میں خبر دی ہے؛ [کہ روز قیامت یہ بول پڑیں گے] اور پھر اس خبر کی تصدیق نقل کی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ﴾ [فصلت ۲۱]

"وہ کہیں گے: ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو تمام بولنے والوں کو بلواتا ہے۔

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے وہ کام نہیں کرتا جو ان کے لیے اصلح ہو۔ یا بندوں کی مصلحت کا خیال نہیں کرتا۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ قائلین تقدیر میں سے ایک جماعت یہی عقیدہ رکھتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خلق وامر اس کی مشیت کے تابع ہے کسی مصلحت پر موقوف نہیں۔ یہ جہمیہ کا عقیدہ ہے۔

اس کے عین برعکس جمہور علماء یہ رائے رکھتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ بندوں کو اسی بات کا حکم دیتا ہے جس میں ان کی فلاح و بہبود مضمر ہوتی ہے، اور اسی چیز سے روکتا ہے جو باعث فساد ہوتی ہے۔ اگر مامور بہ بھی فعل کو انجام دیا گیا تو اس سے تمام لوگوں کے لیے مصلحت حاصل ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت بھی مصلحت عامہ کے تحت عمل میں آئی ہے۔ اگر بعض لوگوں کو ان کی معصیت کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہو تو بھی یہ مبنی بر حکمت ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس عرش کے اوپر ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے: "میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔"

اور ایک روایت میں آتا ہے: "میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔" [اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے]۔

ان کا عقیدہ ہے کہ مامور بہ کا بجالانا اور محذورات کا ترک کرنا اس فاعل اور تارک کے لیے مصلحت ہے۔ جب کہ خود نفس امر اور رسولوں کی بعثت میں تمام لوگوں کے لیے عام مصلحت ہے؛ اگر چہ یہ بعض لوگوں کے لیے شر کو بھی متضمن ہو۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے تمام افعال پر مصلحت' رحمت اور منفعت غالب ہوتی ہے۔ اکثر محدثین، فقہاء، صوفیاء اور کرامیہ یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء میں بعض ضرر رساں بھی ہیں مثلاً گناہ۔ تاہم یہ کہنا پڑے گا کہ ان میں کوئی دوسری حکمت و مصلحت ضرور ہے جس کی بناء پر ان کی تخلیق عمل میں آئی۔

اہل سنت پر بہتان عظیم:

[شبہہ ۱]: "تم اہل سنت کا یہ قول نقل کرتے ہو کہ: اطاعت گزار ثواب کا استحقاق نہیں رکھتا اور عاصی [گنہگار] سزا کا حقدار نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات تمام عمر فرمانبرداری کرنے والے کو جو کہ اس کے احکام بجالانے میں حد درجہ کو پہنچا ہوتا

ہے' جیسے نبی کو بھی سزا دیتا ہے۔ اور تمام عمر کے گنہگار اور نافرمان پر؛ جو کہ اس کی نافرمانیوں میں حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے' جیسے ابلیس اور فرعون پر بھی رحم فرماتا ہے۔''

[جواب]: یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے۔ اہل سنت کا کوئی فرد یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نبی اور اطاعت گزار کو سزا دیتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ ابلیس اور فرعون پر رحم کرتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ یہ کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے لیے گنہگار کو اس کے گناہ پر سزا دینا واجب نہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: اہل ایمان گنہگار کو معاف کرنا اور اہل کبائر کو دوزخ سے نکالنا جائز ہے۔ وہ کسی اہل توحید کو دائمی طور پر جہنم رسید نہیں کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جہنم سے ایسے لوگوں کو بھی نکالے گا جن کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔ امامیہ اس عقیدہ میں اہل سنت والجماعت کے ہم نوا ہیں۔

[شبہ ۲]: شیعہ کہتے ہیں: ''اہل سنت کے نزدیک انبیاء غیر معصوم ہیں۔''

[جواب]: علی الاطلاق اہل سنت سے یہ قول نقل کرنا باطل ہے۔ اہل سنت اس ضمن میں متحد الخیال ہیں کہ شرعی احکام کے پہنچانے میں انبیاء معصوم ہیں۔ رسالت کا اصلی مقصد بھی یہی ہے۔ بیشک رسول ہی وہ ہستی ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی لوگوں تک پہنچاتے اور اس کے متعلق خبر دیتے ہیں۔ تبلیغ رسالت میں ان کے معصوم ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ [بعض اوقات ان سے گناہ کا صدور ہوتا ہے مگر] وہ گناہ اور فسق وخطاء پر قائم نہیں رہتے۔ لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی زبان پر ایسے کلمات کا جاری ہونا جائز ہے جن پر پھر اللہ تعالیٰ انہیں آگاہ فرمائے۔ مگر وہ اس خطا پر قائم نہ رہیں؟۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری ہو گئے تھے:

"تلك الغرانيق العلى 'و إن شفاعتهن لترتجى۔"

''وہ بلند شان بگلے [بت] ہیں' اور بیشک ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے شیطان کے القاء کردہ کلمات کو ختم کر دیا' اور اپنی آیات کو ثابت و برقرار رکھا۔ علماء رحمہم اللہ میں سے بعض ایسے ہیں جو اس کو بالکل جائز نہیں مانتے۔ اور بعض اس طرح کے امور کو شرکیہ یا حرام کلمات نہ ہونے کی بنا پر جائز کہتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ شیطانی اثرات کو ختم کر کے اپنی آیات کو برقرار رکھتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ علیم و حکیم کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ إِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ﴾ [الحج ۵۳]

''تاکہ وہ اس (خلل) کو جو شیطان ڈالتا ہے، ان لوگوں کے لیے آزمائش بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں اور بے شک ظالم لوگ یقیناً دور کی مخالفت میں ہیں۔''

''شیعہ کا یہ الزام کہ: ''اہل سنت انبیاء کرام علیہم السلام سے خطاء کا صادر ہونا جائز سمجھتے ہیں۔''

جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خطاء پر مستمر نہیں رہتے۔ بعض اوقات ان سے خطاء کا صدور ہوتا ہے مگر وہ غلطی اور خطاء پر قائم نہیں رہتے۔ گویا وہ ہر ایسی بات سے منزہ ہیں جو نبوت میں قادح ہو۔ جمہور میں سے جن علماء کے نزدیک انبیاء سے صغائر کا صدور ممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ انبیاء صغائر پر مصر نہیں

رہتے۔حضرت داؤد علیہ السلام کو توبہ کرنے کے بعد جو مرتبہ عالی ملا وہ توبہ سے پہلے حاصل نہ تھا۔ بندہ بعض اوقات ایک برائی کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

رہا سہو ونسیان کا مسئلہ' جیسا کہ نماز میں سہو؛ تو انبیاء کرام سے اس طرح کے واقعات پیش آئے ہیں۔ ایسے امور کے واقع ہونے میں حکمت یہ ہے تاکہ مسلمان ان کی سنت کی پیروی کرسکیں۔ جیسا کہ موطا امام مالک رحمہ اللہ میں روایت کیا گیا ہے:

"إنما أنسی ' أو أنسی لأسنَّ۔" [الموطا۱/ ۱۰۰]

''بیشک میں بھول جاتا ہوں' یا بھلا دیا جاتا ہوں' تاکہ میں سنت قائم کروں۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

"إنما أنا بشر أنسی كما تنسون ' فإذا نسيت فذكروني۔" [البخاری۱/ ۸۵؛مسلم ۱/ ۳۶۸]

''بیشک میں بشر ہوں' میں بھی ایسے بھول جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو' جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد دلا دو۔''

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا؛ تو صحابہ کرام نے آپ سے گزارش کی: یارسول اللہ! کیا نماز زیادہ کردی گئی ہے۔آپ نے پوچھا: کیوں کیا ہوا؟ تو عرض کرنے لگے: آپ نے پانچ رکعت پڑھائی ہیں۔'' [البخاری۱/ ۶۸]

مگر شیعہ کا معاملہ مختلف ہے وہ بڑی حد تک نصاریٰ سے ملتے جلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اَوامر واَخبار میں انبیاء کی اطاعت وتصدیق کا حکم دیا اور لوگوں کو غلو وشرک سے روکا۔ مگر نصاریٰ نے اللہ کا دین بدل دیا۔ اور مسیح علیہ السلام کی شان میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ اسے اللہ تعالیٰ کیساتھ شریک ٹھہرانے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو بدل ڈالا اور اس طرح ان کی نافرمانی کے مرتکب ہو کر عاصی ٹھہرے؛ دین میں غلو کرکے اس کی اصل حدود سے تجاوز کر گئے۔ اصل حدود اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی وحدانیت کا اقرار؛ اور اس کے رسولوں کے لیے رسالت کی گواہی تھا۔

اس غلو نے انہیں دین سے نکالا اور وہ تثلیث اور اتحاد کے قائل ہو گئے۔ اور رسول اللہ کی اطاعت وتصدیق سے نکالا: کہ رسول نے انہیں حکم دیا تھا کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں جو اس کا اور ان سب کا رب ہے؛ مگر انہوں نے اس کے قول کو جھٹلایا کہ اللہ ان کا رب ہے؛ اور انہیں جو حکم دیے تھے ان کی نافرمانی کی۔

روافض کا غلو:

روافض نے انبیاء کرام علیہم السلام اور ائمہ کی شان میں اس حد تک مبالغہ آمیزی کا مظاہرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہیں رب بنا لیا۔ اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کو ترک کردیا جس کا حکم انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ انبیاء علیہم السلام کی توبہ و استغفار کے ضمن میں جو نصوص وارد ہوئی تھیں ان کی تکذیب کرنے لگے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مساجد میں جمعہ و جماعت کا نام نہیں حالانکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ انہیں بلند کیا جائے' اور اللہ کے ذکر سے آباد کیا جائے۔ ان کے ہاں ان مساجد کی کوئی توقیر و حرمت نہیں۔ اگر مسجدوں میں نماز پڑھتے بھی ہیں تو اکیلے اکیلے پڑھتے ہیں۔ مگر قبروں پر [قبے ومزارات] بنا کر مقابر کی تعظیم وتکریم میں وہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ مشرکین کی مشابہت میں ان پر اعتکاف بیٹھتے اور ان کا حج کرنے کے لیے ایسے ہی جاتے ہیں جیسا کہ بیت اللہ کا حج کرنے کے لیے سفر کیا جاتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ بعض شیعہ ان زیارتوں کو حج بیت اللہ کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو بیت اللہ کے حج کیساتھ ان مقابر کے حج سے

مستغنی ہوتا ہے؛ اسے گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ہیں۔ اور ایسے ہی نماز باجماعت اور جمعہ کے ساتھ ان کا معاملہ ہے۔ یہ لوگ بالکل عیسائیوں کی طرح ہیں جو اللہ کی بندگی پر بتوں کی پوجا کو ترجیح دیتے ہیں۔ [جب کہ]رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی صحیح احادیث میں ثابت ہے؛ آپ نے فرمایا:

''اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔'' آپ انکے فعل سے ڈراتے تھے۔ ❶

نیز آپ ﷺ نے وفات سے پانچ روز قبل ارشاد فرمایا:

'' آگاہ ہوجاؤ! جولوگ تم سے پہلے ہوا کرتے تھے' وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا کرتے تھے؛ تم ہر گز قبروں کو مسجدیں نہ بنانا' میں تمہیں اس چیز سے منع کرتا ہوں۔''

اور آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

''وہ بدترین لوگ ہوں گے جن کی زندگی میں قیامت آئے گی اور جولوگ قبروں کو مسجدیں بناتے ہونگے۔''❷

یہ روایات امام احمد اور محدث ابن حبان نے اپنی صحیح میں یہ روایت ذکر کی ہے۔ آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا یُّعْبَدُ؛ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰی قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ.)) ❸

''اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے اس قوم پر اللہ کا شدید غضب نازل ہوا جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''

شیعہ کے مشہور عالم شیخ المفید نے ''حج المشاھد'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں مخلوقات کی قبروں کی زیارت کو اس حج بیت اللہ سے تعبیر کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جائے قیام قرار دیا ہے۔ ❹

❶ صحیح بخاری کتاب الصلاۃ، باب (٥٥) (ح:٤٣٥۔٤٣٦) صحیح مسلم۔ کتاب المساجد۔ باب النهی عن المسجد علی القبور(ح:٥٢٩، ٥٣١)۔ ❷ صحیح ابن حبان(٢٣١٩)، مسند احمد(١/ ٤٠٥)

❸ موطا امام مالك(١/ ١٧٢) کتاب قصر الصلاة فی السفر ح:٨٥، بدون السند، مسند احمد(٢/ ٢٤٦)

❹ اکابر شیعہ نے شیخ المفید کی کتاب کے علاوہ بھی متعدد کتب مقامات مقدسہ کی زیارت پر لکھی ہیں اور عوام کے یہاں اسی طرح مقبول و متداول ہیں جیسے قرآن کریم۔ شیعہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ مقامات مقدسہ کو مکہ مکرمہ۔ خانہ کعبہ اور سات آسمانوں کے مقابلہ میں افضل قرار دیا جائے۔ میں نے ایک مرتبہ فارسی زبان کے ایرانی رسالہ ''پرچم اسلام'' مجریہ ١٠/محرم ١٣٦٦ھ بروز جمعرات میں حسب ذیل عربی اشعار اور ان کا فارسی ترجمہ دیکھا تھا۔ اس رسالہ کا ایڈیٹر عبدالکریم فقیہی شیرازی ہے؛ شعر یہ ہیں:

هِيَ الطُّفُوْفُ فَطُفْ سَبْعًا بِمَعْنَاهَا ۔۔۔ فَمَا لِمَكَّةَ مَعْنًى مِثْلَ مَعْنَاهَا

أَرْضٌ وَلٰكِنَّمَا السَّبْعُ الشِّدَادُ لَهَا ۔۔۔ دَانَتْ وَطَأْطَأَ أَعْلَاهَا لِأَدْنَاهَا

(یہ اشعار اور ان کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔) الطفوف طف کی جمع ہے یہ ارض کربلا کا نام ہے۔ اس میں ایک فرضی قبر ہے جس کی تزئین و آرائش پر شیعہ نے کروڑوں روپیہ صرف کیا اور یہ کہہ کر اپنے لیے تسکین و اطمینان کا سامان بہم پہنچایا ہے کہ یہ نبیرۂ رسول ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قبر ہے یہ شاعر ان کفریات کے سامع و قاری کو اس فرضی قبر پر سات مرتبہ طواف کرنے کا حکم دیتا ہے اور تاکید کہتا ہے کہ جو فضیلت ان کی تعمیر کردہ فرضی قبر کی بناء پر اس کربلا کو حاصل ہے وہ سرزمین مکہ کو خانہ کعبہ کی وجہ سے کہاں نصیب! پھر یہاں تک کہتا ہے کہ اس کی نشیب ترین زمین کے سامنے سات آسمانوں کی بلند ترین جگہ سجدہ ریز ہے۔ غالباً اس کا اشارہ عرش اعظم کی جانب ہے۔ رسالہ کے ایڈیٹر عبدالکریم شیرازی کو یہ خطرہ دامن گیر تھا کہ شائد اس کے عام قارئین ان کفریہ اشعار کو سمجھنے پر قادر نہ ہوں اس لیے اس نے بکمال امانت و دیانت فارسی زبان میں اشعار کا ترجمہ کر دیا۔

بیت اللہ ہی وہ سب سے پہلا گھر ہے جسے اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا۔ پس اس کے علاوہ کسی اور گھر کا طواف نہیں کیا جاسکتا؛ اور صرف اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے گی؛ اور صرف بیت اللہ کے حج کا حکم دیا جائے گا۔ اور یہ بات یقینی طور پر ہر کوئی جانتا ہے کہ ان درگاہوں اور درباروں کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے کوئی بھی ایسا حکم نہیں دیا جیسا کہ ان لوگوں نے اپنی طرف سے خود ساختہ کہانیاں گھڑلی ہیں۔ اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے انبیاء اور صالحین کی قبروں کے پاس عبادت کرنے کے طریقے مقرر کیے ہیں۔ بلکہ یہ تو مشرکین کا دین ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا﴾ [نوح ۲۳]

''اور کہا انہوں نے کہ ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑنا۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے بزرگ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوگیا تو لوگ ان کی قبروں پر بیٹھ گئے۔ جب ایک لمبا زمانہ گزر گیا تو انہوں نے ان کی مورتیاں بنالیں؛ اور پھر ان کی بندگی کرنے لگے۔''

رسول اللہ ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تم قبروں پر نہ بیٹھنا اور نہ ہی ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا۔''❶

حضرت ابو ہیاج اسدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''کیا میں تجھے اس کام کے لئے نہ بھیجوں جس کام کے لئے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھیجا تھا کہ تو کسی صورت کو مٹائے بغیر نہ چھوڑنا اور نہ کسی بلند قبر کو برابر کئے بغیر چھوڑنا۔''❷

یہاں پر مورتیوں کو مٹانے اور قبروں کو برابر کرنے کا ایک ہی حکم بیان ہوا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں شرک پھیلانے کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ام سلمہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ انہوں نے ایک گرجا ارض حبشہ میں دیکھا تھا، اس میں خوبصورت تصویریں تھیں۔ جب انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان لوگوں میں جب کوئی نیک مرد مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنالیتے اور اس میں یہ تصویریں بنادیتے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک قیامت کے دن بدترین مخلوق ہوں گے۔''❸

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں مسجدوں کو آباد کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں پر درگاہوں کا کہیں ذکر تک نہیں۔ رافضہ نے اللہ کے دین کو ہی بدل ڈالا۔ انہوں نے مسلمانوں کی مخالفت میں مشرکین کے دو بدو چلتے ہوئے درگاہیں آباد کیں؛ اور مساجد کو ویران کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ [الأعراف ۲۹]

''فرما دیجیے کہ ''میرے پروردگار نے تو انصاف کا حکم دیا ہے اور اس بات کا کہ ہر مسجد کے پاس اپنی توجہ ٹھیک اسی

---

❶ مسلم ۳/ ٦٦٨۔ ❷ صحیح مسلم: کتاب جنازوں کا بیان؛ باب قبر کو برابر کرنے کے حکم کے بیان میں؛ ح ۲۲۳٦۔

❸ رواہ البخاري ۱/ ۱۸۹؛ مسلم ۱/ ۳۷۵۔

کی طرف رکھو۔''

یہاں پر ہر درگاہ نہیں فرمایا' بلکہ مسجد کا نام لیا ہے۔

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَ فِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ☆اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾ [التوبة ۱۷۔۱۸]

''لائق نہیں تھا کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ درآں حالیکہ وہ خود اپنے کفر کے آپ ہی گواہ ہیں؛ ان کے اعمال غارت و اکارت ہیں اور وہ دائمی طور پر جہنمی ہیں۔اللہ کی مسجدوں کی آبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں، اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، بیشک یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے درگاہوں کا ذکر نہیں کیا' بلکہ یہ حقیقت ہے کہ درگاہوں کو آباد کرنے والے غیر اللہ سے ڈرتے ہیں' اوران سے اپنی امیدیں وابستہ کیے رہتے ہیں۔ جب کہ اللہ کا حکم ہے:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن ۱۸]

''اور بیشک مسجدیں صرف اللہ کے لیے ہیں پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔''

یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ درگاہیں بھی اللہ کے لیے ہوتی ہیں۔ بلکہ مساجد کا فرمایا۔ نیز مساجد کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا﴾ [الحج ۴۰]

''وہ مسجدیں ہیں جہاں اللہ کا نام باکثرت لیا جاتا ہے۔''

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے درگاہوں کا نام تک نہیں لیا۔ نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ [النور ۳۶]

''ان گھروں میں جن کے بلند کرنے اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔''

دین اسلام میں یہ بات اضطراری طور پر تواتر کے ساتھ سب کو معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے نمازوں' باجماعت نمازوں' جمعہ اور جماعت اور عیدین قائم کرکے اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنے کو مشروع ٹھہرایا تھا۔ آپ نے اپنی امت کو ہرگز یہ اجازت نہیں دی کہ وہ کسی نیک انسان یا نبی کی قبر پر مسجد بنائیں' یا وہاں پر درگاہیں قائم کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں کسی نبی یا کسی نیک انسان کی قبر پر ہرگز نہ ہی کوئی مقبرہ ہوتا تھا اور نہ ہی کچھ؛ ابراہیم علیہ السلام کی قبر پر؛ نہ ہی کسی دوسرے نبی کی قبر پر۔

بلکہ مسلمانوں نے کتنی ہی بار بلادِ شام کا سفر کیا۔ حضرت عمر؛ حضرت عثمان' حضرت علی اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کئی بار شام گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فتح بیت المقدس کے موقع پر شام گئے' تاکہ آپ اہل ذمہ کے ساتھ معاہدہ کرکے بیت اللہ کی چابیاں وصول کرلیں۔ پھر آپ وہاں سے سرغ کے علاقہ میں بھی گئے۔ ان تمام چکروں میں کبھی کسی ایک نے بھی حضرت

ابراہیم خلیل اللہ کی قبر کی زیارت کے لیے کوئی سفر نہیں کیا۔ اور نہ ہی وہاں پر کوئی مقبرہ یا درگاہ موجود تھے۔ بلکہ وہاں پر ایک عمارت ہوا کرتی تھی جو ایسے گول اور بغیر دروازہ کے تھی جیسے نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر پر حجرہ شریف۔ بنوامیہ اور بنوعباس کے دور میں یہ سلسلہ ایسے ہی رہا۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی ہجری کے آخر میں جب ان علاقوں پر عیسائی غالب آگئے تو انہوں نے وہاں پر ایک گرجا بنالیا۔ اور اس پرانی عمارت میں سوراخ کرکے ایک دروازہ بنالیا۔ اس لیے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ دروازہ بنایا نہیں گیا' بلکہ وہاں پر نقب لگائی گئی ہے۔

پھر جب مسلمانوں نے یہ علاقے عیسائیوں سے واپس حاصل کر لیے تو بعض لوگوں نے وہاں پر مساجد بنالیں۔ [ایسا صحابہ کے دور میں نہیں تھا' بلکہ بعد میں ہوا ہے] اس لیے کہ صحابہ کرام جب کسی کو دیکھتے کہ وہ قبر پر مسجد بنا رہا ہے تو اسے منع فرمایا کرتے تھے۔

جب شہر تستر میں حضرت دانیال علیہ السلام کی قبر ظاہر ہوئی تو حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھا؛ تو آپ نے جواب دیا کہ: دن کے وقت تیرہ قبریں کھودی جائیں؛ اور رات کے وقت ان تیرہ میں سے کسی ایک میں دفن کر دیا جائے' تاکہ لوگ فتنہ میں مبتلا نہ ہوں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب دیکھتے کہ لوگ کسی ایسی جگہ کو متبرک سمجھ کر نماز پڑھ رہے ہیں جہاں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی ہو' تو آپ اس سے منع فرمایا کرتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

''تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ اپنے انبیاء کے نشانات و مقامات کو سجدہ گاہ بنالیا کرتے تھے۔ جو انسان وہاں پر نماز کا وقت پالے؛ اسے چاہیے کہ نماز پڑھ لے' ورنہ وہاں سے گزر جائے۔''

یہ مسئلہ اور اس جیسے دوسرے مسائل جن سے توحید ثابت ہوتی ہو' جو کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے مرسلین کا پیغام ہے۔ ان میں سنن مصطفیٰ ﷺ کے پیروکار ہیں۔

اسلام دو بنیادوں پر قائم ہے:

۱۔ یہ کہ ہم اللہ معبود برحق کے علاوہ کسی کی بندگی نہ کریں۔

۲۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طریقہ کے مطابق کریں جو اس نے مشروع ٹھہرایا ہو؛ بدعات کیساتھ اللہ کی بندگی نہ کریں۔

نصاریٰ ان دونوں اصولوں سے نکل چکے ہیں۔ یہی حال اس امت کے اہل بدعت اور روافض کا ہے۔ نیز عیسائی یہ گمان کرتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی اتباع کرنے والے حواری ابراہیم علیہ السلام اور موسی علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام و مرسلین سے افضل ہیں۔ ان لوگوں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حواریین سے بالمشافہ خطاب کیا تھا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں: بیشک اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں: حضرت مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہی حال رافضیوں کا ہے۔ وہ اپنے بارہ ائمہ کو سابقین اولین مہاجرین و انصار سے افضل قرار دیتے ہیں۔ ان کے غالی فرقہ کے لوگ کہتے ہیں: ائمہ انبیاء کرام سے بھی افضل ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ ائمہ کے متعلق ویسے ہی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں جیسے عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں۔

عیسائی کہتے ہیں: امور دین پادریوں کے سپرد ہیں؛ وہ جس چیز کو حلال کر دیں وہ حلال ہے' اور جس چیز کو حرام قرار دیدیں وہ حرام ہے۔ اور دین وہی چیز ہے جس کو وہ شریعت مقرر کر دیں۔

رافضی بھی یہی کہتے ہیں: دین کے تمام امور ائمہ کے سپرد ہیں' حلال وہی ہے جسے وہ حلال قرار دیں' اور حرام وہی ہے

جسے وہ حرام قرار دیں۔ اور دین وہی چیز ہے جس کو وہ شریعت مقرر کردیں۔

رہے وہ لوگ جو شیعہ غلو کا شکار ہوئے؛ جیسے اسماعیلیہ؛ جو کہتے ہیں کہ حاکم ہی الہ ہوتا ہے؛ اوراس کے ساتھ ہی اپنے ائمہ کی الوہیت کے بھی قائل ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: محمد بن اسماعیل محمد بن عبداللہ [ﷺ] کی شریعت کا رہبر و شیخ ہے۔ان کے علاوہ بھی ان کے کچھ ایسے عقائد ہیں جو غالیہ اور رافضہ سے لیے گئے ہیں۔ان میں سے اکثر لوگ یہود و نصاری اور مشرکین کے علاوہ دوسرے کفار سے بھی بدتر ہیں'اور اپنے آپ کو شیعیت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

فصل

[وصیت رسول اللہ ﷺ کا مسئلہ]

[اعتراض]: شیعہ کہتے ہیں: ''اہل سنت کہتے ہیں کہ:'' رسول اللہ ﷺ نے کسی کو امام مقرر نہیں کیا تھا اور آپ بلا وصیت فوت ہوگئے''۔

[جواب]: واضح ہو کہ یہ جمہور اہل سنت کا قول نہیں۔ اہل سنت میں سے ایک جماعت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت نص سے ثابت ہے۔[اہل سنت والجماعت میں]امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ کے مذہب میں یہ تنازع بڑا معروف ہے۔قاضی ابو یعلی نے اس ضمن میں امام احمد رحمہ اللہ سے دو روایتیں ذکر کی ہیں:

۱۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انتخاب کی بناء پر خلیفہ قرار پائے۔یہی اہل حدیث کی ایک جماعت؛ معتزلہ اور اشاعرہ کا مذہب ہے؛ اور قاضی ابو یعلی نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔

۲۔ امام احمد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ آپ کی امامت نص خفی اور اشارہ سے ثابت ہے۔ حضرت حسن بصری؛ محدثین کی ایک جماعت؛ بکر بن اخت عبد الواحد رحمہ اللہ اور خوارج میں سے بھیسیہ اسی کے قائل ہیں۔ان کے شیخ ابو عبداللہ ابن حامد کہتے ہیں:''باقی صحابہ اور اہل بیت کے برعکس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کتاب وسنت میں دلیل موجود ہے۔لیکن ہمارے اصحاب میں یہ اختلاف ہے کہ آپ کی خلافت نص سے ماخوذ ہے یا استدلال سے۔ ہمارے اصحاب میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں نص ذکر کی ہے۔اور آپ کے متعلق حتمی طور پر دوٹوک الفاظ میں کہا ہے[کہ آپ ہی خلیفہ ہوں گے]۔

اور ہمارے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ:'' آپ کی خلافت استدلال جلی سے ثابت ہے۔''

ابن حامد نے کہا ہے:'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کی نص وہ حدیث ہے جسے امام بخاری اپنی سند کیسا تھ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔''

احادیث نبویہ سے خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ کا اثبات:

ایک عورت بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئی۔آپ نے اسے دوبارہ حاضر ہونے کیلئے مامور فرمایا۔تو وہ بولی:'' اگر میں آؤں اور آپ کو موجود نہ پاؤں[تو]۔''(یعنی اگر آپ وفات پا جائیں تو) آپ نے فرمایا:'' اگر تو مجھے نہ پائے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ

کی خدمت میں حاضری دیجیے۔'' ❶

یہ حدیث ایک دوسرے سیاق سے بھی نقل کی گئی ہے۔ ابن حامد نے متعدد احادیث ذکر کر کے لکھا کہ ''یہ احادیث امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نص ہیں۔'' [مزید] انہوں نے کہا ہے کہ: سفیان عبدالملک بن عمیر سے؛ وہ ربعی سے؛ وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان دونوں کی پیروی کیجیے جو میرے بعد (خلیفہ) ہوں گے۔'' آپ نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ ❷

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''میں سو رہا تھا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کنویں پر دیکھا جس پر ایک ڈول پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس ڈول سے جس قدر اللہ نے چاہا پانی کے ڈول نکالے۔ پھر ابن ابی قحافہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ڈول لے لیا۔ انہوں نے ایک دو ڈول پانی کے نکالے اللہ تعالیٰ ان کی کمزوری کو معاف کرے۔ اس کے بعد وہ ڈول مغرب کی طرف کو ہٹ گیا اور عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا۔ تو میں نے لوگوں میں کسی قوی و مضبوط شخص کو ایسا نہ پایا جو عمر رضی اللہ عنہ کی طرح رہٹ کھینچتا۔ اس نے بڑی قوت سے اس قدر ڈول نکالے کہ سب لوگوں کو سیراب کر دیا۔'' ❸

ان کا کہنا ہے: یہ حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص ہے۔ اور اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جو ابوبکر بن مالک نے روایت کی ہے۔ مسند امام احمد میں حماد بن سلمہ سے روایت ہے' وہ علی بن زید بن جدعان سے' وہ عبدالرحمن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

''کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکایا گیا ہے پھر آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا اور آپ بھاری نکلے۔ پھر حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما کو تولا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وزنی ثابت ہوئے۔ پھر ترازو اٹھا لیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ خلافت نبوت کی جانب اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جسے چاہے حکومت و سلطنت سے نوازے۔'' ❹

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آج ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھ دیا گیا ہے، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔'' جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم بارگاہ رسالت سے اٹھے تو ہم نے کہا نیک آدمی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس مراد ہے۔ اور ایک دوسرے

---

❶ صحیح بخاری کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ۔ باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلاً (ح ٣٦٥٩)۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٨٦)

❷ الترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب(١٦ ح:٣٦٦٢) سنن ابن ماجة۔ باب فضل أبي بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٩٧)

❸ صحیح بخاری: کتاب مناقب انبیاء علیہم السلام کا بیان ::ح 881۔

❹ مسند احمد(٥/ ٤٤، ٥٠) سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء (حدیث: ٤٦٣٤۔٤٦٣٥) تاہم اس میں خواب دیکھنے والے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے صحابی تھے۔ واللہ اعلم)

کے ساتھ وابستہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کے خلفاء ہیں۔"[1]

صالح بن کیسان، زہری سے روایت کرتے ہیں وہ عروہ رضی اللہ عنہ سے کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"جس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درد شروع ہوئی تو میں خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تا کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک عہد نامہ لکھ دوں۔" پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے۔"[2]

اور ایک روایت میں ہے: "کوئی طمع کرنے والا اس معاملہ کی طمع بالکل نہ کرے۔"

یہ حدیث صحیحین میں ہے، اور ابوداؤد الطیالسی کی سند سے بھی روایت کی گئی ہے۔

ابن ابی ملیکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا جب سرور کائنات کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو آپ نے فرمایا: "عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو بلاؤ تا کہ میں ابوبکر کے لیے (ایک عہد نامہ) لکھ دوں۔ جس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہے۔ پھر فرمایا: "اللہ کی پناہ کہ مسلمان ابوبکر رضی اللہ عنہ (کی خلافت و امارت) میں مختلف الخیال ہوں۔"[3]

ابن حامد پھر وہ احادیث ذکر کرتے ہیں جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے امام نماز ہونے کا ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ کچھ اور احادیث بھی قلمبند کی ہیں جو محدثین کے نزدیک صحت کے درجہ سے فروتر ہونے کی وجہ سے یہاں پر ذکر نہیں کی جا رہی۔

خلافت صدیقی سے متعلق ابن حزم رحمہ اللہ کا زاویہ نگاہ:

امام ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب "الملل و النحل" میں فرماتے ہیں:[4] "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امامت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے:

(۱) ایک گروہ کا خیال ہے کہ آپ نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا۔

(۲) دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ جب آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام نماز بنایا تھا تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ امامت و خلافت کے اوّلین مستحق تھے۔

(۳) تیسرے گروہ کے نزدیک افضلیت کی بناء پر آپ کو امام نماز بنایا گیا تھا۔ اس سے ان کی خلافت کی جانب اشارہ کرنا مقصود نہیں۔

(۴) چوتھے گروہ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً اپنے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لوگوں پر خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔

ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ درج ذیل براہین و دلائل کی روشنی میں ہم نے آخری نظریہ اختیار کیا ہے۔

پہلی دلیل:

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء (حدیث:٤٦٣٦)

[2] صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (حدیث:٢٣٨٧) واللفظ له۔ صحیح بخاری۔ کتاب المرضی باب ما رخص للمریض ان یقول (حدیث:٥٦٦٦) مطولاً من طریق آخر عنها

[3] طبقات ابن سعد (٣/ ١٨٠) السنة لابن ابی عاصم (٢/ ٥٥٥) مسند احمد (٦/ ٤٧، ١٠٦)

[4] ابن حزم کا یہ بیان ان کے رسالہ "الامامة والمفاضلة" میں درج ہے۔ یہ رسالہ کوئی مستقل کتاب نہیں بلکہ ان کی شہرہ آفاق کتاب "الفِصَل فی الملل والنحل" جلد چہارم میں شامل ہے۔ دیکھیے کتاب مذکورہ، ص:۱۰۷، طبع مصر ۱۳۲۱ھ۔ خلافت کے مسئلہ پر یہ اہم ترین کتاب ہے۔

خلافت ابی بکر رضی اللہ عنہ کی پہلی دلیل [لوگوں کے طبقات کے لحاظ سے] یہ ہے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (الحشر: ۸)

''(فیئے کا مال) ان مہاجر مسکینوں کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں۔''

اس آیت میں جن صحابہ کی صدق بیانی اور راست گوئی کی شہادت دی گئی ہے وہ آپ کو ''خلیفۃ الرسول'' کہنے میں یک زبان تھے۔ خلیفہ [1] عربی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جس کو کسی نے اپنا قائم مقام بنایا ہو۔ جو خود کسی کا نائب بن جائے اسے خلیفہ نہیں کہتے۔ خود بخود نائب بننے والے کو ''خالف'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور معنی لغت کے اعتبار سے ہرگز جائز نہیں۔ خلیفہء رسول سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ آپ نماز پڑھانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے۔ وجہ یہ ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں خلیفہ کے لقب سے مشہور نہیں ہوئے۔ حالانکہ آپ اس وقت بھی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ تھے۔ تو اس سے یقینی طور پر معلوم ہوگیا کہ یہ نیابت و خلافت امامت نماز کے علاوہ جداگانہ نوعیت کی تھی۔

دوسری دلیل:

جن لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر اپنی نیابت کا شرف عطاء فرمایا تھا؛ مثلاً غزوۂ تبوک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو [2] غزوۂ خندق میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو [3] اور غزوۂ ذات الرقاع میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو۔ [4] علاوہ ازیں دیگر صحابہ جن کو یمن و بحرین اور طائف وغیرہ میں عامل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس میں امت کا کبھی بھی کوئی اختلاف نہیں رہا کہ ان میں سے کوئی شخص بھی علی الاطلاق خلیفہ کے لقب سے مشہور نہیں ہوا [اور نہ ہی کوئی اس لقب کا مستحق تھا]۔ اس سے یہ حقیقت ضروری طور پر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ خلافت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس امت میں آپ کی قائم مقامی و نیابت مراد ہے؛ اس حقیقت کا کسی کو انکار نہیں۔ اب یہ بات محالات میں سے ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یوں ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع کر لیا ہو؛ جبکہ آپ نے صراحتاً کسی کو بھی یہ منصب تفویض نہ فرمایا ہو۔

---

[1] خلیفہ بروز فعیل بمعنی مفعول ہے بنابریں خلیفہ وہ شخص ہے جسے کسی نے اپنا نائب مقرر کیا ہو۔ جن لوگوں کی شان میں وارد ہے ﴿أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (الحجرات: ۴۹/۱۵) انہی لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ الرسول یعنی نائب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لقب سے ملقب کیا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ اللہ کریم نے ان کو صادق بھی قرار دیا ہے۔

[2] صحیح بخاري۔ کتاب المغازي۔ باب غزوة تبوك۔(حدیث:٤٤١٦) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل علي بن ابي طالب رضي الله عنه (حدیث: ٢٤٠٤)

[3] جوامع السیرة لابن حزم(ص:١٨٥) سیرة ابن هشام(ص:٤٥٦)۔

[4] سیرة ابن هشام(ص:٤٥٤) جوامع السیرة لابن حزم(ص:١٨٢، ١٨٣) اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ ساتھ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بھی آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر آپ کو صرف نماز میں اپنا خلیفہ بنائے جانے کے علاوہ کوئی دلیل نہ ہوتی تو آپ اس لقب کے مستحق نہ ٹھہرتے ۔ جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے ۔ مزید برآں صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اگر میں لوٹ کر آؤں اور آپ موجود نہ ہوں تو پھر کیا کروں؟...... اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ فوت ہو جائیں تو پھر کیا کروں...... فرمایا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو جایئے ۔''❶

ابن حزم رحمہ اللہ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص جلی ہے ۔'' (کتاب الامامۃ والمفاضلۃ، ص: ۱۰۸)

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے بیماری کی حالت میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا:

''میں نے ارادہ کیا تھا کہ تمہارے والد اور بھائی کو بلا کر ایک عہد نامہ لکھ دوں مبادا کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حقدار ہوں یا کوئی آرزو کرنے والا (خلافت کی) تمنا کرے ۔ مگر اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے ۔''❷

''ایک روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام ابوبکر کے علاوہ کسی کو خلیفہ نہیں مانتے ۔''

ابو حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس امت پر خلیفہ مقرر کئے جانے میں نص جلی ہے'' ۔

[[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمادیا تھا۔ البتہ اس حدیث کے پیش نظر آپ جانتے تھے کہ امت آپ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرے گی اور آپ نے اس پر اظہار پسندیدگی فرمایا۔ رسول اکرم ﷺ نے نص جلی سے سکوت اختیار کر کے صرف امت کے اجماع پر اکتفاء فرمایا تھا'']]

قائلین عدم استخلاف کے دلائل:

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جن لوگوں کی رائے میں رسول اللہ نے کسی کو بھی خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درج ذیل قول پیش کرتے ہیں ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کر دوں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو مجھ سے افضل تھے ایسا ہی کیا تھا اور اگر مقرر نہ کروں تو جو مجھ سے بہتر ہستی تھے انہوں نے بھی کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا ۔'' [یعنی رسول اللہ ﷺ کا نمونہ میرے پیش نظر ہے] ۔''❸

---

❶ صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ "لو کنت متخذا خلیلاً" (حدیث:۳٦۵۹)، صحیح مسلم (حدیث: ۲۳۸٦)

❷ صحیح بخاری ۔ کتاب المرضی ۔ باب ما رخص للمریض ان یقول انی وجع (حدیث: ۵٦٦٦)۔

❸ صحیح بخاری ۔ کتاب الاحکام ۔ باب الاستخلاف (حدیث: ۷۲۱۸) صحیح مسلم ۔ کتاب الامارۃ، باب الاستخلاف و ترکہ (حدیث:۱۸۲۳)۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ: ''اگر سرور کائنات ﷺ کسی کو خلیفہ بنانے والے ہوتے تو کسے یہ منصب تفویض فرماتے؟'' تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواباً فرمایا: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو۔''[1]

محدث ابن حزم رحمہ اللہ کا قول ہے:

''یہ محال ہے کہ حضرت عمر و عائشہ رضی اللہ عنہما کا قول اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین دونوں مرفوع احادیث کے خلاف ہوں ۔اور اس کے مقابلہ میں حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے ایسی موقوف روایات پیش کی جائیں جن سے کوئی واضح اور ظاہری حجت نہ حاصل ہوتی ہو ۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس روایت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر کیے جانے کا حکم مخفی رہا۔جیسے دیگر کئی ایک احکام شرعی آپ مخفی رہے؛ جیسے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کرنے کا حکم؛ وغیرہ ۔ان کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں کوئی تحریری دستاویز تحریر نہیں کی تھی ۔'' ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کے خلیفہ بنائے جانے کے لیے کوئی تحریری دستاویز موجود نہ تھی؛ مگر اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت موجود تھی۔

کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ: حجت تو ان دونوں صحابہ کی روایت میں ہے' ان کے قول میں نہیں؟

[[امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس ضمن میں فرماتے ہیں:]]

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر کیے جانے پر اثبات میں کلام دیگر کئی مواقع پر بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں پر مقصود آپ کی خلافت کے بارے میں لوگوں کی آراء کا بیان کرنا ہے ۔کیا اس بارے میں کوئی نص خفی یا جلی وارد ہوئی ہے؟ اور اس سے خلافت ثابت ہوتی ہے؟۔ یا پھر اہل حل وعقد کے اختیار وانتخاب سے خلیفہ مقرر کیے گئے؟

یہ بات بہت واضح کی جا چکی ہے کہ بہت سارے سلف و خلف نے نص جلی یا خفی کا کہا ہے ۔تو پھر اس طرح رافضی کی اہل سنت والجماعت پر قدح باطل ہوگئی۔رافضی کا کہنا کہ [اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ]: ''رسول اللہ ﷺ نے کسی کو امام مقرر نہیں کیا تھا اور آپ بلا وصیت فوت ہو گئے'' ۔[مطلق طور پر یہ بات کہنا غلط ہے]

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہ قول تمام لوگوں کا نہیں۔اگر یہ حق ہے تو بعض لوگوں نے کہا ہے ۔اور اگر حق اس کے خلاف ہے تو بعض نے اس طرح بھی کہا ہے۔ پس دونوں طرح سے حق اہل سنت والجماعت کے عقیدہ سے باہر نہیں ہے۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر بھی ''بصراحت کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے بارے میں شیعہ کے یہاں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔راوندیہ کہتے ہیں کہ: ''آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا۔'' اور امامیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہی دعویٰ کرتے ہیں۔''

قاضی ابو یعلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی الله عنه(حدیث:۲۳۸۵)۔
حضرت ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا اور ان سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ اگر اپنی حیات طیبہ میں کسی کو خلیفہ بناتے تو کس کو بناتے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ پھر اس کے بعد کس کو؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد کس کو بناتے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو، پھر اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش ہو گئیں۔

''راوندیہ کی ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ آپ نے بعینہٖ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرکے اس کا اعلان کیا تھا۔اور آپ نے کھل کر صراحت کے ساتھ اسے واضح کیا تھا۔مگر امت نے اس نص کا انکار کرکے کفر وعناد کا مظاہرہ کیا؛اور سر کشی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی ؛[اور مرتد ہوگئی]۔ان میں سے بعض یہاں تک کہتے ہیں کہ:''آپ نے تا قیام قیامت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔''

یعنی ایسا نص خفی سے ثابت ہے ۔ پس اس مسئلہ میں راوندیہ کے دو قول ہوئے ؛ جیسا کہ شیعہ کے دو قول ہیں ۔ امامیہ کہتے ہیں :رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کیساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیکر آپ کو خلیفہ مقرر کیا تھا کہ آپ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام ہوں گے ۔اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو ۔ جب کہ زیدیہ اس قول میں ان کی مخالفت کرتے ہیں ۔

پھر زیدیہ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں:''من کنت مولاہ فعلي مولاہ ۔''''جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کا مولا ہے''اس قول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ مقرر کئے جانے پر نص موجود ہے۔ نیز یہ حدیث کہ:''کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛[سوائے اس کے کہ آپ نبی نہیں ہیں]''؛ ان کے علاوہ دوسری روایات جن میں نص خفی موجود ہے؛ اور ان کے معنی پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے ۔

زیدیہ میں سے جارودیہ فرقہ سے حکایت نقل کی گئی ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایسی صفات بیان کر کے نص کے ساتھ خلیفہ مقرر کیا تھا کہ وہ صفات صرف آپ میں ہی پائی جاتی تھیں[کسی اور میں نہیں]؛ آپ نے نام نہیں لیا۔ پس راوندیہ کا نص کے بارے میں دعویٰ کرنا ویسے ہی ہے جیسے رافضہ کا دعویٰ۔ اس کے علاوہ بھی امامیہ سے کئی اقوال منقول ہیں ۔

یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ رافضیوں کے اقوال آپس میں انتہائی تعارض رکھتے ہیں۔ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے' بالکل ایسے ہی ہے جیسے راوندیہ کا دعویٰ کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے ۔ اور ان دونوں اقوال کا باطل ہونا لامحالہ طور پر معلوم ہے۔اہل علم نے ان دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں کہی۔ یہ تو اہل بدعت کے اپنی طرف سے گھڑے ہوئے اقوال ہیں' جیسا کہ اس کے تفصیلی بیان میں آئے گا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے دیندار اور اہل علم لوگ کبھی بھی اس چیز کے دعویدار نہیں رہے۔اور اس مسئلہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی نصوص میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا کہنے والے اہل علم کی ایک جماعت ہیں۔جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان بھی آگے آئے گا۔

یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ: مقام نزاع پر یہ بھی ویسے ہی استدلال کرتے ہیں جس طرح دوسرے لوگ استدلال کرتے ہیں ۔آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ سب سے کمزور دلیل وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نام لیکر خلیفہ مقرر کیے جانے کا ذکر ہے۔یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے قائلین میں سے بعض لوگ نص جلی سے خلافت ثابت کرتے ہیں' اور بعض لوگ نص خفی سے ۔ ابن بطہ رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: مجھ سے ابو الحسن اسلم الکاتب نے بیان کیا؛ ان سے زعفرانی نے حدیث بیان کی؛ ان سے یزید بن ہارون نے' وہ محدث مبارک بن فضالہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ: بیشک حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے محمد بن زبیر حنظلی کو حسن بصری کی خدمت میں بھیجا۔اور ان سے پوچھا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا؟ ۔تو انہوں نے جواب دیا: کیا تمہارا ساتھی

شک میں ہے؟ نیز آپ نے فرمایا: ہاں! اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں! رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ آپ اس بات سے بہت زیادہ بچ کر رہنے والے تھے کہ ظلم سے خلافت پر قبضہ کر لیتے۔''

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ کو لوگوں کی امامت کرنے کا حکم دیا جانا ہی آپ کو خلیفہ مقرر کرنا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے نزدیک یہی آپ کو خلیفہ مقرر کیا جانا تھا۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم پر ابوبکر کو خلیفہ بنایا گیا۔ آپ بہترین خلیفہ تھے۔ آپ ہم پر بہت زیادہ مہربانی و شفقت کرنے والے تھے۔ میں نے معاویہ بن قرہ رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرما رہے تھے: نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔''

پھر جن لوگوں کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ سالار انبیاء ﷺ نے صراحتاً حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو خلافت سے نوازا تھا۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بالاتفاق ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول کہہ کر پکارتے تھے۔ اور خلیفہ وہی ہوتا ہے جس کو کوئی اپنا قائم مقام مقرر کردے۔ اس لیے کہ خلیفہ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ تو یہ دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو ہی خلیفہ مقرر کیا تھا۔ جو لوگ اس دلیل میں جھگڑا کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: لفظ خلیفہ کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے:

(۱) وہ شخص بھی خلیفہ ہے جس کو کوئی اپنا نائب بنائے۔

(۲) جو دوسرے کا از خود نائب بن جائے وہ بھی خلیفہ ہے۔

تو اس صورت میں ''فعیل بمعنی فاعل'' کے ہوگا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: فلاں انسان فلاں کا خلیفہ بنا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول ﷺ فرماتے ہیں:

''جس نے کسی کو جہاد کے لیے تیار کرکے بھیجا گویا اس نے خود جہاد میں شرکت کی اور جو اس کی عدم موجودگی میں اس کا خلیفہ (قائم مقام) بنا وہ بھی غازی ٹھہرا۔''❶

مذکورہ بالا حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث بھی صحیح ہے۔ آپ دعا فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! تو میرا رفیق سفر ہے اور اہل و عیال میں میرا خلیفہ ہے'' (یعنی قائم مقام)۔ اے اللہ! سفر میں ہمارا ساتھی رہنا، اور ہمارے گھر والوں میں ہمارا خلیفہ رہنا۔''❷

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ﴾ (الانعام ۱۶۵)

''وہ اللہ ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس: ۱۴)

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الجهاد۔ باب فضل من جهز غازیاً (حدیث: ۲۸۴۳)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب فضل اعانة الغازی فی سبیل الله، (حدیث: ۱۸۹۵)

❷ صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب استحباب الذکر اذا رکب دابته، (حدیث: ۱۳۴۲)

''پھر ان کے بعد ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ بنا دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔''

نیز فرمایا:

﴿وَ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً﴾ (البقرۃ:۳۰)

''جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِیۡفَةً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡكُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ﴾ (ص:۲۶)

''اے داؤد! بیشک ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے پس آپ لوگوں کے درمیان حق کیساتھ فیصلہ کریں۔''

مذکورہ بالا آیات کا مطلب یہ ہے کہ تجھے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا ہے جو تجھ سے پہلے تھے۔ یہ مقصود نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے نائب تھے۔ جیسا کہ قائلین وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔ [1]

وحدت الوجود کے قائل یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کو ذات باری سے وہی تعلق ہے جو آنکھ کی پتلی کو آنکھ سے (یعنی دونوں ایک ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں)۔ اور یہ اتحاد اور حلول کا نظریہ رکھنے والے ملحدین کا عقیدہ ہے: وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنٰی کا جامع ہے، اس کی دلیل میں وہ درج ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرۃ:۳۰)

''اور حضرت آدم علیہ السلام کو سب نام سکھلا دیے۔''

اہل وحدۃ الوجود کا نقطہ خیال ہے کہ انسان اللہ کی مثل ہے جس کی تشبیہ کی نفی کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَیۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ ﴾۔ ''اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔'' اس کے علاوہ بھی ان لوگوں کے ایسے فاسد عقائد ہیں جن میں ہی کوئی صحیح عقلی دلیل پائی جاتی ہے' اور نہ ہی نقلی دلیل۔ جس کے تفصیلی بیان کا یہ موقع نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کا نائب نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ نیابت اس شخص کی ہوتی ہے، جو خود موجود نہ ہو۔ اور ذات باری ہمیشہ سے موجود اور مخلوقات کا ناظم و مدبر ہے۔ البتہ بندہ جب اپنے اہل و عیال میں موجود نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا نائب ہوتا ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اہل و عیال کی حفاظت فرماتا ہے۔ مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ''یا خلفیۃ اللہ'' کہہ کر پکارا گیا؛ تو آپ نے فرمایا: ''میں تو صرف خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں میرے لیے یہی کافی ہے۔'' [2]

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ بہت سارے اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ اس بارے میں وہ صحیح معروف اور مستند احادیث سے دلیل لیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کی رائے ان

---

[1] الحادیہ ان ملحدین کو کہتے ہیں جو نظریہ وحدۃ الوجود کے داعی ہیں اور واجب الوجود و ممکن الوجود کے مابین کسی فرق و امتیاز کے قائل نہیں۔ یہ خالق و مخلوق میں اتحاد و یگانگت کا نظریہ رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ عالم ارضی عین ذاتِ باری ہے۔ دونوں میں کوئی تغایر نہیں پایا جاتا۔ دراصل جو ملاحدہ ذات باری سے اعلانیہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ وہ وحدت الوجود کے داعی بن بیٹھتے ہیں۔ وحدۃ الوجود درحقیقت برہمنوں کا عقیدہ ہے۔ دور حاضر کے ایک برہمن ٹیگور نامی نے اس کے اثبات میں متعدد کتب تالیف کی ہیں۔ شرق و غرب کے سب منافق ملحدین عقیدہ وحدۃ الوجود کے قائل و داعی ہیں۔ دور حاضر کے وہ خالص ملحدین جو اعلانیہ اپنے ملحدانہ عقائد کا اعتراف کرتے ہیں وحدۃ الوجود کا نقاب اوڑھنے والے منکرین کی نسبت کم ضرر رساں ہیں۔

[2] طبقات ابن سعد(۳/ ۱۸۳)۔

لوگوں کی رائے کی بہ نسبت زیادہ درست ہے جو کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی خلافت نص سے ثابت ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے سوائے جھوٹ اور بہتان تراشی کے؛ جس کے باطل ہونے کو ہر وہ انسان جانتا ہے جس کا اسلام سے بہت ہی معمولی سا تعلق بھی ہو۔ یا پھر ایسے الفاظ سے استدلال کرتے ہیں جن میں اس مسئلہ پر سرے سے کوئی دلیل موجود ہی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ غزوہ تبوک میں آپ کو نائب مقرر کرنے کی حدیث۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر خلیفہ کے لیے منصوص ہونا واجب ہے تو پھر ان دلائل کی روشنی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا منصوص ہونا زیادہ اولی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پہلے آپ کے دلائل باطل ٹھہرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی طرف رہنمائی کی تھی۔ اور اپنے متعدد اقوال و افعال سے اس جانب اشارے دیے تھے۔ اور آپ کو خلافت اپنی رضامندی سے اور آپ کی تعریف کرتے ہوئے دی۔ اور آپ نے یہ ارادہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کوئی تحریری عہد نامہ چھوڑ دیا جائے۔ پھر آپ کو آثار وقرائن سے معلوم ہو چلا کہ مسلمان بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنالیں گے؛ اس لیے اس پر اکتفاء کرتے ہوئے آپ نے تحریر لکھوانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پھر اپنی بیماری کی حالت میں بروز جمعرات نے آپ نے دوبارہ ارادہ کیا کہ کوئی عہد لکھوایا جائے؛ پھر جب آپ کے ارادہ میں جب بعض لوگوں کو بیماری کی وجہ سے شک گزرا کہ کیا آپ بیماری کی وجہ سے ایسے کہہ رہے ہیں یا پھر آپ کا واجب الاتباع حکم ہے؟ تو آپ نے پھر اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس لیے کہ آپ کو یہ علم ہو گیا تھا کہ اللہ کی مشیت بھی یہی ہے' اور مؤمنین بھی آپ کو ہی خلیفہ بنائیں گے۔ اگر آپ کا متعین کیا جانا امت کے لیے ایک مشتبہ امر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری تھا کہ آپ دوٹوک الفاظ میں کھل کر بیان فرما دیتے تاکہ کسی کو کوئی عذر نہ رہے۔ لیکن جب اتنی دلیلیں موجود تھیں جن کی روشنی میں سمجھا جا سکتا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی آپ کے خلیفہ ہوں گے تو اس سے مقصود حاصل ہو گیا۔ اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا:

''اللہ کی قسم! تم میں ایک بھی ایسا نہیں جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مانند ہو' جس کے لیے گردنیں ماری جائیں۔''[1]

نیز صحیحین میں یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے بنی سقیفہ کے موقع پر مہاجرین وانصار کے سامنے ابوبکر سے یہ ارشاد فرمایا تھا:

''آپ ہمارے سردار ہیں' اور ہم سب سے بہتر ہیں۔ اور ہم سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہیں۔''[2]

اس وقت کسی بھی انسان نے اس بات کا انکار نہیں کیا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے یہ کہا کہ: ابوبکر کے علاوہ مہاجرین وانصار میں سے کوئی ایک ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر خلافت کا حق دار ہے۔ اور نہ ہی آپ کی خلافت میں کسی نے جھگڑا کیا۔ ہاں! بعض انصار کی خواہش تھی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک امیر مہاجرین میں سے۔ اس نظریہ کا باطل ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونے والی متواتر نصوص سے ثابت ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ تمام انصار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی سوائے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے؛ اس لیے کہ آپ خلافت کے طلبگار تھے۔ اور کسی ایک نے بھی ہرگز یہ بات نہیں کہی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کے خلیفہ ہونے کے بارے میں صراحت آئی ہے۔ نہ ہی حضرت علی کے بارے میں اور نہ ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود اس کا دعویٰ کیا' اور نہ ہی حضرت

---

[1] البخاري ٨/ ١٦٩؛ مسلم ٣/ ١٣١٧۔
[2] البخاري ٥/ ٧۔

عباس رضی اللہ عنہ نے اور نہ ہی کسی دوسرے صحابی نے ؛ رضی اللہ عنہم ۔ اور نہ ہی حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے محبین میں سے کسی ایک نے یہ کہا کہ ان دو حضرات میں سے کوئی ایک خلافت کا زیادہ مستحق ہے ؛ اور نہ ہی کسی نے ان کے بارے میں نصوص وارد ہونے کا دعوی کیا۔ بلکہ کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ بھی کوئی انسان قریش میں ایسا ہے جو خلافت کا زیادہ حق دار ہو۔ نہ ہی بنی ہاشم میں سے اور نہ ہی غیر بنی ہاشم میں سے ۔ یہ ایسا معاملہ ہے جسے علم حدیث رکھنے والے علماء بہت اچھی طرح جانتے ہیں ' اور ان کے ہاں یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے ۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر صحیح اور صریح نصوص دلالت کرتی ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آپ کے لیے اس امر پر راضی تھے ۔ مسلمانوں کی بیعت واختیار سے آپ کی خلافت منعقد ہوئی ۔ اس اختیار میں لوگوں کے پاس اللہ اور اس کے رسول کے ہاں آپ کی فضیلت کے دلائل موجود تھے ۔ اور یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آپ ہی خلافت کے حقدار تھے ۔ پس آپ کی خلافت نص اور اجماع سے ثابت ہوتی ہے ۔ نصوص میں دلیل موجود ہے کہ اللہ اور اس کا رسول آپ پر راضی تھے ۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ آپ کے لیے مقدر کر دیا تھا کہ مؤمنین آپ کو خلیفہ منتخب کریں گے ۔ یہ بات تحریر نویسی سے زیادہ مضبوط و بلیغ تھی ۔ اس لیے کہ اگر عہد نامہ لکھا جاتا تو آپ کی خلافت کا ثبوت صرف عہد نامہ ہوتا ۔

جب مسلمانوں نے بغیر کسی عہد نامہ کے آپ کو چن لیا ؛ نصوص ان کے اختیار و چناؤ کے درست و حق ہونے پر دلالت کرتی ہیں ۔ اور یہ کہ اللہ اور اس کا رسول آپ سے راضی ہیں ۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں وہ فضائل و مناقب موجود تھے جن کی وجہ سے آپ دوسرے عام مسلمانوں سے ممتاز اور جداگانہ حیثیت رکھتے تھے ؛ اور آپ خلافت کے سب سے زیادہ حق دار تھے ۔ پس اس بنا پر آپ کے لیے کسی عہد کے لکھے جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی ۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے وثیقہ لکھنے کا ارادہ کیا تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

> ''میرے پاس اپنے والد اور بھائی کو بلا کر لاؤ تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک عہد نامہ لکھ دوں ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مبادا کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حقدار ہوں یا کوئی آرزو کرنے والا (خلافت کی) تمنا کرے ۔ مگر اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے ۔'' [1]

صحیح بخاری کی روایت میں ہے : ''میں نے ارادہ کیا تھا کہ تمہارے والد اور بھائی کو بلا کر ایک عہد نامہ لکھ دوں مبادا کوئی کہنے والا یہ کہے کہ میں (خلافت کا) زیادہ حقدار ہوں یا کوئی آرزو کرنے والا (خلافت کی) تمنا کرے ۔ اللہ تعالیٰ اور مومنین ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے ۔'' [2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر دیا تھا کہ آپ اس اندیشہ کے تحت عہد نامہ لکھنا چاہتے تھے ؛ پھر آپ کو اندازہ ہوا کہ معاملہ صاف ظاہر اور واضح ہے ؛ اس میں کسی قسم کا کوئی نزاع نہیں ہو سکتا ۔ اور امت میں ابھی تک خود نبی موجود ہیں ؛ اور اللہ تعالیٰ نے اس امت کو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے ؛ اور یہ زمانہ بھی بہترین لوگوں کا زمانہ ہے ۔ پس ایسے واضح اور کھلے ہوئے معاملہ میں ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہوگا ۔ اس لیے کہ نزاع تو اس وقت ہوتا ہے جب علم پوشیدہ ہو ۔ یا پھر کسی کا برائی کا ارادہ ہو ۔ ان دونوں باتوں کا ہونا ناممکن تھا ۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا علم بڑا واضح تھا ۔ جبکہ برا ارادہ اس خیر القرون

---

[1] اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے ۔

[2] اس کی تخریج گزر چکی ہے ۔

کے جمہور امت سے واقع ہونا محال تھا۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اور مومنین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو (خلیفہ) تسلیم نہیں کر سکتے۔''

اس بنا پر آپ نے عہد نامہ تحریر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا؛ اس لیے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے چرچے نے عہد نامہ تحریر کرنے سے بے نیاز کر دیا تھا۔اب اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔اس لیے عہد نامہ تحریر نہ کیا گیا۔[1]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ امت محمدی کا اتفاق اور اس پر رسول اللہ ﷺ کا اظہار خوشنودی کرنا عہد نامہ لکھنے سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

[اعتراض]:

شیعہ مصنف کا قول ہے کہ:''اہل سنت کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس لیے خلیفہ منتخب ہو گئے تھے کہ چار صحابہ کے ایماء سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔''

[جواب]: [ہم جواباً کہتے ہیں کہ: یہ بالکل غلط بات ہے۔] یہ ائمہ اہل سنت والجماعت کا قول نہیں ہے۔اگرچہ بعض اہل کلام ایسا کہتے ہیں کہ: چار اشخاص کے بیعت کرنے سے امامت منعقد ہو جاتی ہے۔اور بعض کہتے ہیں: دو افراد کے بیعت کرنے سے؛ اور بعض کے نزدیک ایک انسان کے بیعت کرنے سے امامت منعقد ہو جاتی ہے۔

مگر یہ تمام حقیقت میں اہل سنت والجماعت کے اقوال نہیں ہیں۔اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ امامت وخلافت کا اصلی مقصود قوت واقتدار کا حصول ہے لہٰذا جب اصحاب قوت وشوکت کسی شخص کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو اس کی خلافت منعقد ہو جائے گی۔اس لیے اہل سنت والجماعت کہتے ہیں:

''جو شخص قوت وشوکت حاصل کر لے جس کی بنا پر وہ مقاصد خلافت کی تکمیل کر سکتا ہو، تو وہ ان اولی الامر حکام میں شمار ہوگا جو واجب الاطاعت ہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کا حکم صادر نہ کرے۔نظر بریں خلافت ملوکیت وسلطنت کا نام ہے نیک ہو یا بد کوئی شخص صرف تین یا چار آدمیوں کی موافقت کے بل بوتے پر بادشاہ نہیں بن سکتا۔سوائے اس صورت کے کہ ان چار پانچ افراد کی بیعت اور موافقت کا تقاضا یہ ہو کہ باقی لوگ بھی اس بیعت پر راضی ہوں، تو امامت منعقد ہو جائے گی۔ایسے ہی ہر وہ معاملہ جس میں کسی کی مدد کی ضرورت ہو، وہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک وہ لوگ تعاون نہ کر لیں جن کے ذریعہ سے اس کام کا سرانجام دیا جانا ممکن ہو۔یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی گئی اور قوت واقتدار سے بہرہ ور ہو گئے تو امامت وخلافت کے منصب پر فائز ہوئے۔''

[1] استخلاف ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مزید دلائل: ۱۔سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:''ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہیے کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' بخاری۔ باب اھل العلم والفضل احق بالامامة (ح ٦٧٩) مسلم۔ کتاب الصلاة۔ باب استخلاف الامام (ح ٤٢٠)۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کی بیماری کے دنوں میں وفات تک نماز پڑھاتے رہے۔

۲۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو دوست بنانے والا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دوست بناتا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا مسجد کی جانب کسی کی کھڑکی باقی نہ رہنے دی جائے۔'' صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ (ح:٣٦٥٤) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:٢٣٨٢)۔

۳۔عبدالرحمٰن بن ابی بکرہ سے روایت ہے کہ:''[تیس سال تک] خلافت نبوت ہوگی پھر اس کے بعد اللہ جسے چاہے سلطنت عطا کرے۔'' سنن ابی داؤد (ح:٤٦٣٥)

اگر لوگوں کی ایک جماعت سفر میں ہو' تو سنت کے مطابق انہیں چاہیے کہ وہ اپنے میں سے ایک آدمی کو امیر بنالیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''تین لوگوں کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ سفر میں ہوں' مگر اپنے میں سے ایک آدمی کو اپنا امیر بنالیں۔'' ❶

پس جب ارباب اختیار اسے منتخب کرلیں تو وہ امام/ امیر بن جائے گا۔ کسی انسان کا امیر و قاضی و والی ہونا؛ یعنی جن امور کی بنیاد اختیار اور سلطان [قوت] پر ہو؛ تو جب بھی قدرت وشوکت حاصل ہو جائے؛ تو امامت منعقد ہو جائے گی؛ ورنہ نہیں۔ اس لیے کہ امامت سے مقصود ان امور کو انجام دینا ہوتا ہے جن کو نبھانا قوت وسلطنت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایک چرواہے کی ہے؛ جب بھی اس کے انتظام ولوازمات پورے ہو جائیں گے؛ تو اسے چرواہا تسلیم کیا جائے گا؛ ورنہ نہیں۔ ایسے ہی کسی عامل کو عامل اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ اس کام کو نبھانے کی قدرت رکھتا ہو' ورنہ نہیں۔

لوگوں کی سیاست پر قدرت ان کے اس امام کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوتی ہے؛ یا اس امام کے ان لوگوں پر غالب آجانے سے۔ جب بھی انسان لوگوں کے سیاسی امور نبھانے پر قادر ہو جائے؛ بھلے وہ لوگوں کے اس کی اطاعت کر لینے کی وجہ سے ہو' یا پھر اس انسان کے غالب آجانے کی وجہ سے؛ تو اب یہ انسان صاحب اطاعت وشوکت حکمران ہوگا۔ پس جب یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجالانے کا حکم دے تو اس کی بات ماننا پڑے گی۔ اسی لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے عبدوس بن مالک العطار کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا:

''اہل سنت والجماعت کے ہاں عقیدہ کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس چیز پر صحابہ کرام تھے' اسے مضبوطی سے قائم رہیں۔..... یہاں تک کہ آپ نے فرمایا..... جو شخص مسند خلافت پر قابض ہو اور لوگ اس کی خلافت پر اجماع کرلیں؛ اور اس کے خلیفہ ہونے پر راضی ہو جائیں۔ اور اسی طرح جو شخص بزور شمشیر خلیفہ بن بیٹھے؛ اور لوگ اسے مسلمانوں کا حکمران تسلیم کرلیں تو اس کو صدقات دینا جائز ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔''

---

❶ رواہ أبو داؤد ۳/ ۵۰؛ و أحمد ۱۰/ ۱۷٤۔ ان دلائل کی روشنی میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ چونکہ خلافت صدیقی پر سب مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا تھا اور اللہ ورسول ﷺ نے بھی اس پر اظہار خوشنودی فرمایا تھا اس لئے آپ امامت کے مستحق تھے۔ پھر اہل قوت واقتدار کے بیعت کرنے کی بنا پر آپ خلیفہ منتخب ہوگئے۔ اسی طرح بیعت عامہ اور مسلمانوں کے اطاعت اختیار کرنے کی بنا پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے۔ اگر اس مفروضہ کو تسلیم کرلیا جائے کہ صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد نامہ کو درست تسلیم نہیں کیا تھا، تو آپ امامت کے منصب پر فائز نہ ہوتے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ کی خلافت جائز تھی، یا ناجائز؟ حلت وحرمت کا تعلق افعال سے ہے۔ جہاں تک خلافت و امارت کا تعلق ہے، وہ صرف حاصل شدہ اقتدار کا نام ہے۔ بعض اوقات یہ اقتدار جائز طریقہ سے حاصل ہوتا ہے، جیسے خلفائے راشدین کی خلافت اور بعض اوقات ناروا طریق سے بھی قوت وشوکت حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً کسی ظالم کی سلطنت وحکومت۔ اگر اس مفروضہ کو صحیح تصور کیا جائے کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چند صحابہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی، اور باقی صحابہ اس کے لیے تیار نہ تھے تو آپ کی امامت وخلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں آپ جمہور مسلمانوں کی بیعت کی بنا پر خلیفہ منتخب ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بیعت نہ کرنے سے آپ کی خلافت میں قدح وارد نہ ہوئی، کیونکہ خلافت کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیعت کرنے میں جو سبقت فرمائی تھی، تو اس میں کوئی حرج نہیں اس لیے کہ بیعت کرتے وقت کوئی شخص تو ایسا ہوگا جو باقی لوگوں سے سبقت کرے گا۔ اگر چند افراد آپ کی بیعت پر خوش نہ بھی ہوتے تو اس سے بھی آپ کی خلافت میں کوئی قدح وارد نہیں ہوتی، کیونکہ شرعی دلائل سے آپ کی بیعت کا استحقاق ثابت ہو چکا تھا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں جو وصیت کی تھی، اس کی تکمیل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مسلمانوں کی بیعت عام سے ہوئی اور آپ بالاتفاق خلیفہ قرار پائے۔

خلافت عثمان رضی اللہ عنہ پر شیعہ اعتراض:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ:''بعض صحابہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے خلیفہ منتخب کیا۔آپ شوریٰ کے چھ ارکان میں سے ایک تھے۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بعض لوگوں کی بیعت سے خلیفہ نہیں بنے تھے؛ بلکہ آپ کی بیعت پر اجماع عام ہوا تھا، اور ایک شخص بھی بیعت سے الگ نہ رہا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بروایت حمدان بن علی فرماتے ہیں:''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت باقی خلفاء راشدین کی نسبت زیادہ مستحکم تھی، کیونکہ آپ کی خلافت اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی بنا پر عالم وجود میں آئی تھی۔''[امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بیان حق وصداقت کا آئینہ دار ہے]۔

بالفرض اگر عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ آپ کی بیعت کرتے اور حضرت علی وطلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر اصحاب اثر و رسوخ بیعت میں شریک نہ ہوتے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز نہ ہوتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چھ اشخاص پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ قائم کر دی تھی: حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت طلحہ' حضرت زبیر؛ حضرت سعد' حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین۔[حکم دیا کہ]یہ باہمی مشورہ سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر دیں۔ حضرت طلحہ و زبیر اور سعد رضی اللہ عنہم اجمعین حسب مرضی شوریٰ میں سے نکل گئے۔حضرت عثمان،علی،اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین باقی رہے۔ان تینوں کا آپس میں اتفاق ہوا کہ: عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں بنیں گے' اور ان دو میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کریں گے۔حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مسلسل تین شب و روز نہ سوئے۔انصار و مہاجرین اور صوبوں کے عمال سے مشورہ کرنے میں مصروف رہے۔ان لوگوں نے اس سال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تھا؛ اور ابھی مدینہ میں موجود تھے۔ان سب نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا مشورہ دیا اور پھر کسی کی ترغیب و ترہیب کے بغیر عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔یہی وجہ ہے کہ بہت سارے سلف جیسے: ایوب سختیانی' احمد بن حنبل اور امام دارقطنی رحمہم اللہ فرماتے ہیں:

''جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دی؛ اس نے مہاجرین و انصار صحابہ کرام سے بے وفائی کی۔''

یہ دلیل ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں' اسی لیے صحابہ نے آپ کو مقدم جانا اور آپ کی بیعت کی۔

خلافت علی رضی اللہ عنہ اور شیعیت:

[شبہ]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''حضرت علی رضی اللہ عنہ کثیر مخلوقات کی بیعت کی بنا پر خلیفہ قرار پائے۔''

[جواب]: مخلوق کی بیعت کے لیے جناب ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تخصیص بلا مخصص ہے۔جس کا باطل ہونا ظاہر ہے۔اس لئے جس انسان کو سیرت سے معمولی سا بھی شغف ہوگا وہ جانتا ہے کہ قبل ازیں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی بیعت بھی اسی طرح بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور لوگوں کے اتفاق سے ہوئی تھی۔ ہر انسان جانتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہونے والا اتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا۔اور جن لوگوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی وہ ان لوگوں سے افضل تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والوں میں جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال شامل

ہیں ۔آپ کی بیعت انتہائی اطمینان وسکون سے تین دن کی مشاورت کے بعد عمل میں آئی ۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد عمل میں آئی تھی جب کہ دل سکون و اطمینان سے یکسر محروم تھے ۔ اکابر صحابہ متفرق تھے ۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہاں تک کہا جاتا ہے کہ انہیں بحالت جبر واکراہ بیعت کے لیے لایا گیا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے : میں نے بیعت لی اور تلوار میری گردن پر تھی ۔ مدینہ میں شرپسندوں کا بڑا زور تھا۔ جب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل ہوئے مدینہ میں فتنہ پسندوں کا سیلاب موجیں مار رہا تھا۔ بکثرت صحابہ بیعت میں شریک نہ ہو سکے، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ان جیسے دوسرے لوگ ۔

اس موقع پر لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے : ایک گروہ جو آپ کے ساتھ تھا؛ دوسرا گروہ جو آپ سے برسر پیکار تھا؛ اور تیسرا گروہ جو نہ آپ سے برسر پیکار تھے اور نہ ہی آپ کے ساتھ تھے؛ [بلکہ عزلت نشین ہوگئے تھے]۔باایں ہمہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ کثیر مخلوقات نے ان کی بیعت کی ۔اور خلفاء سابقین کے بارے میں سکوت اختیار کرنا کہاں تک قرین عدل و انصاف ہے؟ ۔حالانکہ جب ان خلفاء کی بیعت ہوگئی تو کسی ایک نے بھی ان کے بارے میں اختلاف نہیں کیا؛ خاص کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے ۔اس لیے کہ انصار انہیں امیر مقرر کرنا چاہتے تھے ۔تو آپ کے دل میں بھی ایسے ہی ملال سا باقی رہا جیسے بشر کے دل میں باقی رہتا ہے ۔مگر اس کے باوجود آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور نہ ہی حق بات کو رد کیا ۔اور نہ ہی باطل پر کسی کی مدد کی ۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ مسند صدیق میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں :......عبد الرحمن الحمیر ی سے حکایت سقیفہ مذکور ہے ۔اس میں ذکر کیا گیا ہے :'' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:'' اے سعد! آپ جانتے ہیں کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

'' قریش اس امر کے والی ہیں ۔لوگوں کے نیک ان کے نیکوکاروں کے تابع اور بد اوران کے بدکاروں کا تابع ۔''[1]

یہ حدیث مرسل حسن درجہ کی ہے۔ اس حدیث میں فائدہ کی بات یہ ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دعوی امارت سے تنازل اختیار کر گئے ؛ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں داخل ہوگئے ۔اللہ تعالیٰ ان سب پر راضی ہو جائے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق علماء کے مختلف افکار و آراء:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والوں نے ان کے خلاف شورش بپا کر دی تھی ۔ایک گروہ آپ کی بیعت تک سے منحرف ہوگیا، اہل شام اس وقت تک آپ کی بیعت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، جب تک قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لے لیا جائے]۔یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں لوگ گروہ بندی کا شکار ہوگئے تھے ۔

پہلا گروہ: اس امر کا قائل تھا کہ حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں خلیفہ برحق ہیں ۔اور جب ایک خلیفہ پر اتفاق نہ ہو سکے تو ایک وقت میں دو خلیفہ بنانے جائز ہیں ۔کرامیہ سے یہ قول نقل کیا گیا ہے ۔

دوسرا گروہ: ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ وہ انارکی کا دور تھا، اور اس وقت کوئی بھی جائز خلیفہ نہ تھا بصرہ کے محدثین میں سے

[1] المسند ١/ ١٦٤ ۔ تحقیق أحمد شاکر۔

ایک گروہ کی یہی رائے ہے۔اسی لیے جب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ شمار کرنا شروع کیا تو تو آپ کی عدم خلافت کے قائلین نے آپ کو گدھے سے بڑھ کر گمراہ و بدتر کہا۔اور ایک گروہ نے چوتھے خلیفہ کی خلافت کا انکار کیا۔اور کہنے لگے اس سے پہلے ان لوگوں نے آپ کی خلافت کا انکار کیا ہے' جو کہ ایسے نہیں تھے؛ اس سے مراد بیعت سے پیچھے رہ جانے والے صحابہ کو لیتے تھے۔امام احمد بن حنبل اور دوسرے علماء رحمہم اللہ جو خلافت علی رضی اللہ عنہ کے قائل تھے نے آپ کی خلافت پر حدیث سفینہ سے استدلال کیا؛ جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''میرے بعد تیس سال خلافت ہوگی، پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔''[1]

تیسرا گروہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا قائل تھا۔اور جن لوگوں سے آپ نے قتال کیا' اس قتال میں آپ حق پر تھے۔اور ان کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جن صحابہ کرام نے قتال کیا جیسے طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین؛ وہ غلط کار نہیں تھے، کیونکہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برخلاف نبرد آزما تھے،اور یہ مشہور مقولہ ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ:'' كُلُّ مُجْتَهِدٍ مُصِيبٌ ''

یہ اہل بصرہ میں سے ابو ہذیل علاف جبائی،ابوعلی؛ ابو ہاشم بن جبائی اور ان کے موافقین اشاعرہ جیسے قاضی ابو بکر ابن الباقلانی؛ امام ابی حامد[2] رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے۔امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہی ہے۔ان کی رائے میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس قتال میں ایسے ہی مجتہد تھے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ۔یہ فقہاء کرام کی ایک جماعت اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کا قول ہے۔ابوعبداللہ ابن حامد نے اصحاب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے جنگ جمل اور جنگ صفین کے بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں:

پہلا قول: ان میں سے ہر ایک راہ حق پر تھا۔

دوسرا قول: ان دو میں سے ایک گروہ حق پر تھا' مگر اس کا پتہ نہیں کہ وہ کون سا گروہ ہے۔

تیسرا قول: حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے' اور ان کے مخالفین خطا کار تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ اہل سنت والجماعت سے صراحت کے ساتھ منقول ہے کہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کی بھی مذمت بھی نہیں کی جائیگی۔جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں گروہوں میں سے حق کے زیادہ قریب تھے۔جب کہ قتال کو درست کہنا اہل سنت والجماعت کا عقیدہ نہیں ہے۔بلکہ ان کا کہنا ہے کہ قتال کو ترک کرنا دونوں گروہوں کے لیے بہتر تھا۔

چوتھا گروہ: ان کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ امام برحق تھے اور ان کے خلاف لڑنے والے اگرچہ بنا بر اجتہاد ان کے خلاف برسر پیکار تھے، مگر ان کا اجتہاد مبنی بر خطا تھا، بہت سے حنفیہ، شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ اسی نقطہ نظر کے حامل ہیں۔

پانچواں گروہ: ان کا خیال ہے کہ اس دور میں خلیفہ برحق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، آپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حق و صداقت سے قریب تر تھے۔تاہم ان دونوں کے لیے آپس میں نبرد آزما ہونا مناسب نہ تھا۔بلکہ اس سے احتراز و اجتناب اختیار کرنا افضل تھا۔وہ اس کی دلیل میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں:

---

[1] سنن ابی داؤد ـ كتاب السنة ، باب في الخلفاء(ح:٤٦٤٦) سنن ترمذی ، باب في الخلافة (ح:٢٢٢٦) ـ

[2] ابو بکر محمد بن طیب باقلانی المتوفی ۴۰۳ھ آپ ابوالحسن اشعری کے تلمیذ رشید تھے، استاد کی وفات کے بعد معتزلہ کے خلاف صف آرا رہے، یہ بڑے وسیع العلم حاضر جواب اور کامیاب مناظر تھے، کثیر التصانیف تھے، ان کی اعجاز القرآن اور التمہید زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

''ایک فتنہ برپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے کی نسبت افضل ہوگا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''[2]

اس حدیث میں آپ نے صلح کرانے کی بنا پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش فرمائی۔[3]

اگر نبرد آزمائی واجب یا مستحب ہوتی تو آپ اس کے تارک کی مدح نہ فرماتے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے باغیوں کے خلاف ابتداء جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی ہر باغی کے خلاف قتل وقتال کو ضروری ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (الحجرات ۹)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسرِ پیکار ہوں تو ان میں صلح کرا دیجئے اور اگر ایک گروہ دوسرے پر ظلم کر رہا ہو تو اس سے لڑو جو دوسرے پر ظلم کر رہا ہو؛ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئے۔''

متحارب فریقین میں صلح کی ضرورت واہمیت:

مذکورہ بالا آیت میں پہلے صلح کا حکم دیا گیا ہے، اگر کوئی فریق ظلم وزیادتی کا مرتکب ہو تو اس سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی تعمیل کے لیے سر تسلیم خم کردے، بنابریں فریقین کے لڑنے میں کوئی مصلحت نہیں پائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ جس بات کا اللہ نے حکم دیا ہو اس کی مصلحت فساد کی نسبت راجح ہوگی۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ (مشہور تابعی) فرماتے ہیں:

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے:''جو شخص بھی فتنہ کی لپیٹ میں آجائے مجھے اس کے جادہ مستقیم سے بھٹک جانے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے، مگر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے سرور کائنات ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:'' فتنہ وفساد سے محمد بن مسلمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''[4]

ثعلبہ بن ضبیعہ رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ:'' میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا:'' مجھے وہ شخص معلوم ہے جسے فتنہ پردازی سے کوئی نقصان اور ضرر لاحق نہیں ہوتا، چنانچہ ہم باہر نکلے تو ایک خیمہ نصب کیا ہوا دیکھا جس میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے۔ ہم نے اس ضمن میں ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں نہیں چاہتا کہ بلاد و امصار جس فتنہ سے دوچار ہیں میں بھی اس کی لپیٹ میں آجاؤں یہاں تک کہ فتنہ کی آگ فرو ہو جائے۔''[5]

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے واضح فرمادیا ہے کہ محمد بن مسلمہ کو کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اس دور میں بالکل عزلت نشین تھے۔ آپ نے نہ ہی معاویہ کا ساتھ دیا اور نہ ہی علی کا؛ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب المناقب۔ باب علامات النبوۃ فی الاسلام (حدیث:۳۶۰۱) صحیح مسلم: کتاب الفتن۔ باب نزول الفتن کمواقع القطر، (حدیث:۲۸۸۶)

[2] صحیح بخاری، حوالہ سابق (ح:۳۶۲۹)

[3] حدیث مذکور کے لیے (دیکھیے العواصم من القواصم:۱۹۹)۔

[4] الاصابۃ (۳/ ۳۸۴) سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ۔ باب ما یدل علی ترک الکلام فی الفتنۃ (حدیث:۴۶۶۳)

[5] مستدرک حاکم (۳/ ۴۳۳)، طبقات ابن سعد (۳/ ۴۴۴)

اسی طرح سعد بن ابی وقاص، اسامہ بن زید، عبداللہ بن عمر، ابوبکرہ، عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین اور اکثر سابقین الاولین صحابہ کسی فریق کے ساتھ مل کر شریک جنگ نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ طرز عمل اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ لڑائی نہ واجب تھی اور نہ مستحب۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لڑائی ترک کرنے والوں کی مدح سرائی کی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ بلکہ جو انسان واجب یا مستحب بجا لاتا ہے وہ ترک فعل کرنے والوں کی نسبت زیادہ افضل ہوتا ہے۔ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ یہ جنگ وقتال ایک فتنہ ہی تھا۔ جیسا کہ دوسری حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ایک فتنہ برپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے کی نسبت افضل ہوگا۔ اور کھڑا انسان چلنے والے کی نسبت افضل ہوگا؛ اور چلنے والا دوڑنے والی کی نسبت سے افضل ہوگا؛ اور دوڑنے والا جنگ میں واقع ہونے والے کی نسبت افضل ہوگا۔''❶

اس طرح کی دیگر بھی کئی ایک صحیح روایات ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قتال ترک کرنا ان کے لیے بہتر تھا۔ جمہور اہل سنت محدثین امام مالک، سفیان ثوری، امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ دین رحمہم اللہ اس ضمن میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو حضرات علی، زبیر، طلحہ اور معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں اچھی رائے اور حسن ظن رکھتے ہیں۔

سابقہ ذکر کردہ افکار و معتقدات کے علاوہ درج ذیل نظریات کے حامل بھی موجود تھے:

[۱۔ خوارج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اتباع کی تکفیر کرتے تھے۔

۲۔ روافض سابقین اولین صحابہ کو کافر یا فاسق قرار دیتے، اور علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہر لڑنے والے کی تکفیر کرتے تھے۔

۳۔ نواصب اور امویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اتباع کو فاسق اور ظالم و معتدی کے القاب سے نوازتے تھے۔

۴۔ معتزلہ کی ایک جماعت جنگ جمل میں شرکت کرنے والے ایک فریق کو فاسق قرار دیتی تھی، مگر معتزلہ اس فریق کی تعیین نہیں کرتے تھے۔]

مقصود یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اختلاف اور جنگوں کے واقعات سلف و خلف میں بڑے مشہور ہیں۔ ان افکار و معتقدات کی موجودگی میں یہ کہنا کیوں کر درست ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں خلفائے سابقین کی نسبت زیادہ لوگوں نے شرکت کی تھی؟۔

اگر یہ کہا جائے کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ: آپ کی خلافت لوگوں کے بیعت کرنے سے منعقد ہوئی نص سے نہیں؛ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت خلافت راشدہ ہونے کی نص اس حدیث میں موجود ہے: ''میری بعد خلافت تیس سال تک ہوگی۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

اہل سنت والجماعت تو دوسرے خلفاء کی خلافت کے برحق ہونے کے بارے میں بھی بہت سی نصوص روایت کرتے ہیں۔ محدثین کرام کے ہاں یہ معاملہ معلوم شدہ ہے۔ وہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے برحق ہونے پر بہت ساری نصوص روایت کرتے ہیں، بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے۔ اس لیے کہ آپ کی خلافت کی نصوص بہت کم ہیں۔ پہلے تین خلفاء پر امت کا اتفاق تھا؛ جس سے مقصود امامت حاصل ہوگیا تھا۔ ان ادوار میں کفار کو قتل کیا گیا؛ شہروں کے شہر فتح ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں نہ ہی کسی کافر کو قتل کیا گیا اور نہ ہی کوئی شہر فتح ہوا۔ بلکہ اہل قبلہ آپس میں لڑتے رہے۔ جب کہ جن نصوص کا دعوی

رافضی کرتے ہیں' وہ بالکل راوندیہ کی نصوص جیسی ہے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کے دعویدار ہیں۔اہل علم کے ہاں ان دونوں باتوں کا فساد اور باطل ہونا معلوم شدہ ہے۔اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے اثبات میں اس کے علاوہ کوئی اور دلیل نہ ہوتی تو اس سے ہرگز آپ کی خلافت و امامت ثابت نہ ہوتی۔ جیسا کہ اس جیسی دوسری دلیل سے حضرت عباس کی خلافت ثابت نہیں ہوسکتی۔

[شبہ] : (شیعہ کہتے ہیں:) اہل سنت کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے؛ بعض حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے لخت جگر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ قرار دیتے ہیں اور بعض امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ:''اہل سنت کے یہاں سرے سے اس ضمن میں کوئی اختلاف پایا ہی نہیں جاتا۔ بلکہ اہل سنت اس امر میں یک زبان ہیں کہ اہل عراق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی تھی۔اور اہل شام پہلے سے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ تھے۔[پھر انہوں نے ایک معاہدہ کے تحت بخوشی منصب امارت و خلافت امیر معاویہ [1] رضی اللہ عنہ کو تفویض کر دیا]۔

[شبہ] : شیعہ مصنف کا یہ قول کہ''اہل سنت کے یہاں بنوامیہ میں پھر بنوعباس میں خلافت جاری رہی۔''

[جواب]: اہل سنت یہ نہیں کہتے کہ صرف ان حکمرانوں کو اختیار حاصل تھا کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر خود ہی کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کریں۔ نیز اہل سنت کا ایک فرد بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ خلفاء تمام اوامر و احکام میں واجب الاطاعت تھے اور کسی بات میں ان کے حکم سے سرتابی کرنا روا نہ تھا۔ بخلاف ازیں وہ واقعات کی خبر دیتے ہیں' اور جو چیز واجب ہے اس کا حکم دیتے ہیں۔وہ اس چیز کی گواہی دیتے ہیں جو وقوع پذیر ہوئی تھی۔وہ صرف اس چیز کا حکم دیتے ہیں جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔اس لیے وہ کہتے ہیں: بنوامیہ مسند خلافت پر متمکن ہوگئے تھے وہ قوت و اقتدار سے بھی بہرہ ور تھے جس سے وہ مقاصد ولایت کو پورا کر سکتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو نافذ کرنا' حدود شریعت قائم کرنا؛ لوگوں میں

---

[1] ہم (العواصم من القواصم : ۱۹۷، ۱۹۸) کے حاشیہ پر مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

''حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کے والد، ان کے بھائی اور ان کے بھائی کی اولاد میں سے ۹ افراد کی طہارت و عصمت کا عقیدہ شیعہ کے ایمان کا اولین عنصر ہے۔عصمت ائمہ کے عقیدہ کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے خطا کا صدور نہیں ہوتا، اور ان کا ہر قول عمل حق و صواب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ حق و صواب تناقض سے پاک ہوتا ہے۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اہم ترین کارنامہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت ہے۔ جبکہ بقول شیعہ آپ کا یہ طرز عمل ایک امام معصوم کا فعل ہے۔تو شیعہ کو اس بیعت میں شرکت کرنا اور اس کی صداقت و حقانیت پر ایمان لانا چاہیے تھا، مگر مشاہدہ سے معلوم ہوتا ہیکہ وہ اس بیعت کے منکر ہیں اور اس ضمن میں اپنے امام معصوم کی مخالفت کا ارتکاب کرتے ہیں اسکے صرف دو اسباب ہیں:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ شیعہ ائمہ اثنا عشرہ کی عصمت کے دعویٰ میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں، اس سے شیعہ مذہب کی امارت دھڑام سے گر پڑے گی اس لیے کہ عصمت ائمہ کا عقیدہ شیعہ مذہب کا سنگ بنیاد ہے اس کے علاوہ ان کے مذہب کی کوئی اساس نہیں۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شیعہ کی نگاہ میں بلاشبہ امام حسن معصوم تھے اور حضرت حسن کا حضرت معاویہ کی بیعت سے مشرف ہونا ایک معصوم کا فعل ہے مگر شیعہ دین سے بغاوت کا ارتکاب کر رہے ہیں اور امام معصوم کی مخالفت سے باز نہیں آتے، اور اس پر طرہ یہ کہ آئندہ نسلوں کو بھی یہی وصیت کیے جاتے ہیں۔اس کا معنی یہ ہے کہ وہ امام معصوم کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں اور دانستہ کفر و عناد اور مکابرہ کی بنا پر امام کے احکام کی خلاف ورزی پر مصر ہیں۔ہم نہیں جانتے کہ مذکورہ ہر دو وجوہ میں سے کون سی وجہ شیعہ کو قعر ہلاکت میں گرانے کے لیے دوسری وجہ کی نسبت قوی تر ہے ظاہر ہے کہ ان ہر دو اسباب کے علاوہ تیسرا سبب اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

اموال تقسیم کرنا ؛اور شہروں میں والی مقرر کرنا وغیرہ۔[اور بنو امیہ امور سلطنت کے انتظام و انصرام سے بھی نابلد نہ تھے۔وہ مقاصد امامت کی تکمیل میں بھی کامیاب تھے]۔مثلاً وہ دشمن کے ساتھ جہاد میں حصہ لیتے تھے، حج کرنے جاتے، جمعہ جماعت اور عیدین کی پابندی کرتے اور راستوں کی حفاظت کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ تاہم [یہ اہلسنت والجماعت کی امتیازی شان اور عدل و انصاف ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ]:ان خلفاء یا ان کے نوابین میں سے کسی کی بھی اطاعت اللہ کی نافرمانی کر کے نہیں کی جاسکتی تھی۔ بلکہ جو کام اللہ کی اطاعت کا کریں گے'اس میں ان کے ساتھ شریک بنیں گے؛ ان کے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کیا جائے گا' ان کے ساتھ جمعہ اور عیدین کی نماز پڑھی جائے گی؛ حج کیا جائے گا؛ حدود شریعت کے قائم کرنے میں ان کی مدد کی جائے گی۔ نیکی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے میں ان کا ساتھ دیا جائے گا۔پس ان کی اطاعت صرف نیکی وتقویٰ کی حد تک تھی نہ کہ گناہ اور سرکشی میں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ بلاد مغرب میں بنو امیہ اور بنو علی رضی اللہ عنہ میں سے کئی لوگ عامل بنے تھے۔

ائمہ اثنا عشرہ مقاصد امامت کی تکمیل سے قاصر تھے:

یہ حقیقت ''عیاں راچہ بیاں'' کی مصداق ہے کہ امراء و حکام کے بغیر انسانی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ان ظالم حکمرانوں سے بڑھ کر بھی اگر کوئی ظالم حاکم ہو'تو اس کا ہونا حاکم نہ ہونے سے بہتر ہے۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''امارت ناگزیر ہے خواہ نیک ہو یا بد۔''لوگوں نے دریافت کیا، نیک امارت تو ہمیں معلوم ہے، امارت فاجرہ سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تو آپ نے جواباً فرمایا:''جس سے راستے محفوظ رہیں،شرعی حدود کا قیام عمل میں آئے۔دشمنان دین سے جہاد کیا جائے،اور مال غنیمت کو تقسیم کیا جائے۔''

شیعہ عالم علی بن معبد [1] نے اپنی تصنیف کتاب الطاعۃ و المعصیۃ میں یہ روایت ذکر کی ہے۔

جبکہ امام منتظر سے حقیقت میں کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت حاصل نہیں ہوسکی۔ اور نہ ہی اس کی امامت کا کوئی فائدہ ہے سوائے فاسد اعتقادات اور جھوٹی تمناؤں کے۔[اس امامت کے درپردہ]مسلمانوں میں جو فتنہ وفساد بپا کیا جارہا ہے؛ اور ایسے شخص کا انتظار ہورہا ہے جس نے کبھی بھی نہیں آنا؛ عمریں ختم ہوگئیں مگر اس امام سے کسی [بھی اپنے یا غیر]کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ لوگوں کے لیے چند دن بھی حاکم کے بغیر رہنا ممکن نہیں۔کیونکہ افراتفری اور طائف الملوکی کے دور میں تمام امور فساد کا شکار ہوجاتے ہیں ۔تو پھر لوگوں کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے جب وہ کسی امام کو جانتے ہی نہ ہوں سوائے غیر معروف امام کے۔جس کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں کہ وہ [کہاں ہے] کیا کہتا ہے؛[کیا کرتا ہے]۔اور اسے لوگوں کے معاملات میں کسی چیز کا کوئی اختیار بھی حاصل نہیں۔ بلکہ وہ امام ہی معدوم ہے۔

[[خلاصہ کلام (تاریخ کے مختلف ادوار میں) جو خلفاء مسند خلافت وامارت پر جاگزین ہوئے وہ بہر کیف شیعہ کے امام منتظر سے بہتر ہی تھے،جس کے انتظار میں شیعہ صدیوں سے جھوٹی آس لگائے بیٹھے ہیں۔اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ قرار دیا جائے تو]] امام منتظر کے جملہ آباء واجداد قوت وشوکت سے محروم، امامت سے قاصر اور امور مملکت سے بے بہرہ تھے۔[نظر بریں ان سے کسی طرح امامت کا مقصد پورا نہیں ہوتا]۔ بلکہ ان جیسے دوسرے لوگوں کو حدیث اور فتوی میں امامت کا درجہ حاصل تھا۔

---

[1] علی بن معبد ایک شیعہ عالم تھا اور بغداد میں سکونت پذیر تھا، المامقانی نے اپنی کتاب ''تنقیح المقال : ۲/ ۳۰۹ پر لکھا ہے کہ یہ امام حسن عسکری کے والد محمد کے بیٹے ہادی علی کے اتباع میں سے تھا،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بن معبد خلیفہ مامون و معتصم کا معاصر تھا۔''

مگر ان کے لیے کوئی شوکت و سلطنت حاصل نہ تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی امامت میں عاجز تھے؛ بھلے وہ اس امامت کے حقدار تھے یا نہیں تھے۔ ہر صورت میں انہیں نہ ہی اختیار حاصل ہوا اور نہ ہی انہیں حاکم بنایا گیا۔ اور اختیار و قدرت کے نہ ہونے کی وجہ سے ان سے وہ فوائد بھی حاصل نہ ہو سکے جو کہ مقصود ولایت و امارت ہوتے ہیں۔ اگر کوئی مؤمن ان کی اطاعت کر بھی لے تو ان کی اطاعت سے اسے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا جو حاکم وقت کی اطاعت سے حاصل ہوگا' جیسے دشمنان سے جہاد؛ مستحق افراد کو ان کے حقوق کی ادائیگی۔ حدود کا قیام وغیرہ۔

اگر کوئی کہنے والا یہ بات کہے کہ: ان میں سے کوئی ایک یا پھر کوئی دوسرا امام ہے' جسے قدرت و شوکت اور اختیار حاصل ہے؛ جس سے امامت کے مقاصد حاصل ہو سکتے ہیں؛ تو یہ ایک کھلی ہوئی باطل اور بلا حجت بات ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی دوسرا حاکم ایسا نہ ہوتا جو ان سے ٹکرا سکتا۔ اور نہ ہی ان کے برعکس وہ اپنا حکم چلاتا۔ ایسا تو کوئی ایک بھی نہیں کہہ سکتا۔

[اشکال] : اگر یہ کہا جائے: ''ان کے ائمہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ انہیں حاکم بنانا واجب تھا۔ اور لوگوں نے ان کو امام نہ بنا کر اور ان کی اطاعت ترک کر کے گناہ اور نافرمانی کی۔''

[ازالہ] : یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی کے متعلق کہا جائے کہ فلاں انسان اس کا مستحق تھا کہ اسے قاضی بنایا جائے مگر ظلم و زیادتی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا جا سکا۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اس بات میں کوئی جھگڑا نہیں کرتے کہ خلفاء اربعہ کے بعد کے حکمران بعض ایسے لوگوں کو والی بنا دیتے تھے جن کی نسبت دوسرے افراد اس کے زیادہ حقدار ہوا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ چاہتے تھے کہ اپنے بعد قاسم بن محمد کو خلیفہ بنائیں؛ مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس لیے کہ اہل شوکت و قوت اس بات پر آپ کے ساتھ موافقت نہ کرتے تھے۔ پس اس صورت میں جب اہل شوکت کسی مرجوح کو مقدم کیا' اور راجح کو چھوڑ دیا۔ اور ایسے ہی جو شخص اپنی اور اپنے ماننے والوں کی قوت کے بل بوتے پر ظلم و زیادتی سے اقتدار حاصل کر لے؛ تو اس کا گناہ اس پر ہوگا جس نے واجب ترک کیا ہے؛ حالانکہ وہ اس واجب کو پورا کرنے پر قادر تھا۔ یا پھر اس نے ظلم پر مدد کی [اس وجہ سے بھی گنہگار رہوا]۔

اس کے برعکس جو انسان نہ ہی خود ظلم کرے' اور نہ ہی ظلم پر کسی دوسرے کی مدد کرے: بلکہ وہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کرے؛ تو اس پر کچھ بھی گناہ نہ ہوگا۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ نیکوکار مؤمنین صرف نیکی اور بھلائی کے کاموں پر حکمرانوں کی مدد کرتے ہیں۔ ظلم و سرکشی کے کاموں میں ان کی مدد نہیں کرتے۔ پس یہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ امام جسے شرعی طور پر مقدم کرنا واجب ہوتا ہے؛ اسے قرآن کا بڑا قاری؛ سنت کا بڑا عالم؛ ہجرت میں مقدم؛ عمر میں بڑا ہونا چاہیے۔ مگر ایسا صاحب شوکت و قوت آگے بڑھ جائے جو باقی امور میں اس ماقبل الذکر انسان سے بہت کم ہو' اور نمازیوں کے لیے اس کے پیچھے نماز پڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو؛ تو اس میں نمازیوں کا کیا گناہ ہے؟۔

ایسے ہی ظالم اور جاہل یا مفضول حاکم کی بھی مثال ہے۔ جب اس سے مظلوم مطالبہ کرے کہ وہ اس کیساتھ انصاف کرے' یا ظالم سے اس کو اسکا حق دلوائے۔ پس اسے چاہیے کہ اسکے قرضہ دار کو بند کر دے؛ یا اسکی میراث کو تقسیم کر دے؛ یا اس کی شادی ایسی بیوہ سے کرا دے جس کا سلطان کے علاوہ کوئی ولی نہ ہو؛ تو اس پر کونسا یا کس چیز کا گناہ ہوگا یا اسے والی مقرر کرنے والے پر کس بات کا گناہ ہوگا جب کہ وہ حق کے علاوہ کسی چیز پر مدد نہ کرتا ہو اور باطل سے اجتناب کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن ۱۶]

''تم سے جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو تم سے جتنا ہو سکے اس کی بجا آوری کرو۔''❶

یہ بات بھی جانتے ہیں کہ آمدِ شریعت حسب امکان تحصیل مقاصد اوران کی تکمیل کے لیے؛ مفاسد کے خاتمہ اوران کی تقلیل کے لیے تھی۔ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں:''مناسب تو یہ ہے کہ اس آدمی کو والی مقرر کیا جائے جو اس کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ جب ایسا کرنا ممکن ہوتو اکثر کے ہاں پھر اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ جب کہ بعض کے ہاں ایسا کرنا مستحب ہے۔ہاں جو کوئی قدرت ہونے کے باوجود زیادہ مناسب کو صرف اپنی خواہشات کی وجہ سے چھوڑ دے[اوراس سے کم درجہ کے انسان کو والی مقرر کرے] تو وہ ظالم ہے۔اور جو کوئی زیادہ مناسب کو والی مقرر کرنے سے عاجز ہو؛ حالانکہ وہ ایسا کرنا بھی چاہتا ہو؛ تو ایسے کو معذور سمجھا جائے گا۔

اور اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: جس کو والی مقرر کردیا جائے؛ اس سے حسب امکان اللہ کی اطاعت پر مدد لی جائے۔اور اطاعت الٰہی کے امور کے علاوہ کسی چیز میں اس کی مدد نہ کی جائے۔اللہ کی نافرمانی پر نہ ہی اس سے مدد لی جائے' اور نہ ہی اس کی مدد کی جائے۔

[اب غور کیجیے] کیا اہل سنت والجماعت کا قول امام کی اطاعت کے متعلق ان لوگوں سے بہتر نہیں ہے جو ایسے معدوم یا عاجز کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں جس سے امامت سے مقصود امور حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔یہی وجہ ہے کہ رافضی جب مسلمان حکمرانوں کی مدد کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کے برخلاف چلے تو انہیں کفار کی مدد کرنا پڑی ؛ اور خود ان سے مدد حاصل کرنا پڑی ۔ یہ لوگ تو امام معصوم کی اطاعت کی طرف دعوت دیتے ہیں ؛ مگر ان کا کوئی امام موجود نہیں ہے جس کی اطاعت کریں سوائے کافروں اور ظالموں کے۔ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو لوگوں کو اولیاء اللہ کی غیبی مدد کے حیلے دیتا ہے۔مگر اسکے پاس سوائے جھوٹ و مکر کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کے پاس کوئی غیبی انسان ہوتا ہے۔یہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ۔ یا پھر اس کے ساتھ کوئی شیطان یا جنات ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے اسے بعض شیطانی احوال حاصل ہوتے ہیں۔[جن سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں]

اگر بالفرض تسلیم کرلیا جائے کہ جس نص کا دعوی رافضی کرتے ہیں' وہ حق اور موجود ہے؛ اور لوگوں نے منصوص علیہ امام کو مقرر نہیں کیا؛ تو اس وجہ سے وہ ترک واجب کے مرتکب ہوئے ؛ اور کسی دوسرے کو والی تسلیم کرلیا۔تب بھی جس امام سے مقصود امامت حاصل ہو سکتے ہیں وہ وہی امام ہے جسے والی مقرر کیا جا چکا ہے۔نہ کہ وہ مغلوب و مقہور امام جو کہ عاجز ہے۔مان لیا کہ وہ حاکم و والی متعین کیے جانے کا مستحق تھا ؛ مگر اسے والی نہیں بنایا گیا۔تو گناہ اس پر ہوگا جس نے اس کا حق مارا ہے؛ اور راہ حق کو ترک کیا ہے۔ان پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جنہوں نے نہ ہی کسی کا کوئی حق مارا اور نہ ہی کسی پر کوئی ظلم کیا۔

شیعہ کہتے ہیں:''امام[حاکم] مقرر کیا جانا واجب ہے؛ اس لیے کہ یہی مہربانی ہے اوراس میں بندوں کے لیے مصلحت ہے۔''

جواب: جب اللہ اوراس کا رسول ﷺ جانتے تھے کہ جس متعین شخص کی ولایت کا حکم دیا جائے گا ؛ لوگ اسے متعین نہیں کریں گے۔تو پھر اس کو والی مقرر کرنے کا حکم دینا جسے لوگ اپنا والی و حاکم مقرر کریں گے' اوراس سے فائدہ اٹھائیں گے' زیادہ بہتر تھا کہ اس کا حکم دیا جاتا؛ نہ کہ اس آدمی کا حکم صادر ہوتا جسے انہوں نے اپنا حاکم تسلیم ہی نہ کرنا تھا اور نہ ہی اس کی ولایت سے کوئی فائدہ حاصل ہونا تھا۔جیسا کہ نماز کی امامت اور[لوگوں کے درمیان فیصلہ کے لیے] جرگہ دار کا کہا جاتا ہے ۔تو پھر اس نص کا کیا عالم ہوگا جس کے بارے میں

❶ رواه البخاري ۹/ ۹٤؛ مسلم ۲/ ۹۷۵۔

رافضی دعوی کرتے ہیں ; کیا یہ سب سے بڑا جھوٹ اور افتراء نہیں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو مستقبل میں پیش آنے والے امور کے متعلق خبر دی تھی۔ اور اپنے بعد واقع ہونے والے تفرقہ سے آگاہ کیا تھا۔ تو پھر اگر آپ صراحت کے ساتھ ایسے شخص کو امام بنانے کا حکم بھی دیتے جس کے بارے میں آپ کو علم ہوتا کہ لوگ اسے اپنا امام نہیں بنائیں گے؛ بلکہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو اپنا امام بنائیں گے۔ جس سے مقصودِ امامت و ولایت حاصل ہوسکے۔ اور یہ کہ جب معاملہ اس منصوص علیہ امام تک پہنچے گا تو قتل و غارت گری ہوگی; اور لوگوں کا خونِ ناحق بہایا جائے گا؛ اور اس منصوص علیہ امام سے امت کو کوئی خیر حاصل نہیں ہوگی; اور نہ ہی اس سے وہ مقصودِ امامت و ولایت امور حاصل ہوں گے جو اس کے علاوہ دوسرے ائمہ سے حاصل ہوجائیں گے ; تو پھر اس وقت منصوص علیہ امام کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو امام بنانا واجب ہوجاتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ولی امر [حاکم] کے پاس دو افراد تھے ; اور وہ جانتا تھا کہ اگر ان میں سے ایک کو عامل بنادیا جائے تو لوگ اس کی بات مانیں گے اور اطاعت کریں گے ; اور اس کے ہاتھوں پر علاقے فتح ہوں گے؛ وہ جہاد کو قائم کرے گا اور دشمن کو زیر کریگا۔ اور اگر دوسرے کو عامل بنائے گا تو لوگ اس کی اطاعت نہیں کریں گے ; اور نہ ہی وہ کوئی علاقہ فتح کرسکے گا؛ بلکہ اس کے دور میں رعیت میں فتنہ و فساد برپا ہوگا۔ تو پھر ہر عاقل جانتا ہے کہ اس صورت میں لازم ہوگا کہ اس آدمی کو ولایت عطا کی جائے جس کے ہاتھوں خیر و بھلائی حاصل ہو۔ نہ کہ اس آدمی کو اختیار دیے جائیں جس سے کوئی بھلائی و خیر حاصل نہ ہو۔ بلکہ اس کی وجہ سے رعیت ہی فساد کا شکار ہوجائے۔ تو پھر جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ تینوں خلفاء کے بارے میں جانتے تھے کہ ان کے ذریعہ سے امت کے لیے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ اور ان سے کیا کچھ امت کو مصلحتیں دین و دنیا میں حاصل ہوں گی; پھر ان کی امامت کے بارے میں کوئی نص و صراحت موجود نہ ہو; اور ایسے امام کی امامت پر نص موجود ہو جس کی نہ ہی اطاعت کی جائے اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ بلکہ اس کے دور میں قتل و غارت گری ہو; نہ ہی وہ دشمن پر قابو پاسکتا ہو اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کی اصلاح کرنے پر قادر ہو۔ تو کیا خواہ کوئی کتنا بڑا ظالم اور فسادی ہی کیوں نہ ہو; کسی جاہل کے علاوہ کوئی بھی ایسے انسان کو عامل بنا سکتا ہے؟

اللہ اور اس کا رسول ﷺ جہالت اور ظلم سے بری ہیں۔ جب کہ شیعہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوگوں کی مصلحت اور راہِ حق سے کجی اختیار کرنے کو منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے وہ راہ اختیار کی جس میں فساد کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اگر شیعہ کہیں کہ: ''یہ فساد لوگوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے پیدا ہوا نہ کہ امام کی کوتاہی کی وجہ سے''۔

تو ان سے کہا جائے گا کہ: کیا ایسے انسان کی ولایت میں مصلحت نہیں ہے لوگ جس کی اطاعت کرتے ہوں اور یہ اس کی نسبت بہتر نہیں ہے لوگ جس کی نافرمانی کریں اور مصلحت حاصل نہ ہو؟ بلکہ فساد ہی پیدا ہو۔ اگر کسی انسان کا بیٹا ہو; اور اس کے لیے ادب سکھانے والے دو اتالیق ہوں; جب اس بچے کو ان دو میں سے ایک اتالیق کے سپرد کیا جائے تو وہ علم و ادب سیکھے۔ اور جب دوسرے کے پاس بھیجا جائے تو بچہ بھاگ جائے [اور اس سے کچھ بھی نہ سیکھے] تو کیا پھر اس بچے کو پہلے اتالیق کے سپرد کرنا زیادہ بہتر اور مناسب نہیں؟

اگر یہ کہیں کہ: دوسرا اتالیق افضل ہے۔ تو ہم پوچھتے ہیں جب بچے کے اس سے بھاگ جانے کی وجہ سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوسکتا ہو تو پھر اس کے افضل ہونے کا کیا فائدہ [اور کونسی وجہ فضیلت ہے]؟

اگر کسی عورت کو دو آدمی نکاح کا پیغام بھیجیں; ان میں سے ایک آدمی دوسرے سے افضل ہو۔ لیکن وہ عورت اس کو ناپسند کرتی ہو; اگر وہ اس آدمی سے شادی کر بھی لے تو اس کی بات نہ مانے۔ بلکہ اس سے جھگڑا کرتی رہے اور تکلیف دیتی رہے۔ نہ ہی یہ عورت اس مرد سے

کوئی فائدہ حاصل کر سکے اور نہ ہی وہ مرد اس عورت سے کوئی فائدہ حاصل کر سکے۔ جب کہ دوسرے آدمی سے یہ عورت محبت کرتی ہے' وہ اس سے محبت کرتا ہے؛ اور اگر ان کی آپس میں شادی ہو جائے تو اس سے مقاصد نکاح پورے ہو سکیں۔ تو پھر کیا باتفاق اہل عقل و دانش اس مفضول آدمی سے شادی کرنا زیادہ بہتر نہیں ہے؟ جو آدمی اس دوسرے سے شادی کا کہے' وہ اس سے زیادہ بہتر ہے جو پہلے آدمی سے شادی کا کہہ رہا ہے۔ تو پھر اللہ اور اس کے رسول کی طرف ایسی بات کیوں منسوب کی جاتی ہے جس پر کسی ظالم و جاہل کے علاوہ کوئی بھی انسان راضی نہیں رہ سکتا؟

یہ ایسے امور ہیں جن کا باطل ہونا معلوم ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ [خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے] افضل تھے؛ اور آپ امارت کے زیادہ حق دار تھے۔ مگر آپ کی ولایت سے وہی کچھ حاصل ہو سکتا تھا؛ جو کہ حاصل ہوا۔ آپ کے علاوہ دوسرے لوگ ظالم تھے؛ مگر ان سے مصلحتیں اور فوائد حاصل ہوئے۔ اگر ایسے نہ ہوتا تو معاملہ بالکل الٹ ہوتا۔ نہ ہی مصلحت حاصل ہوتی؛ نہ ہی لوگ اطاعت کرتے۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا مذہب سچی خبر اور دانشمندانہ قول ہے۔ جب کہ رافضیوں کا مذہب جھوٹی خبر اور احمقوں کا قول ہے۔ اہل سنت والجماعت اس امیر یا حاکم یا خلیفہ کو مانتے ہیں جو شان و شوکت اور قوت والا ہو؛ اور وہ مقصود ولایت مصلحتیں پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ جیسا کہ نماز کا امام وہی ہو سکتا ہے جو لوگوں کو نماز پڑھائے؛ اور لوگ اس کی اقتداء کریں۔ وہ انسان ہرگز امام کا مستحق نہیں ہو سکتا جو امام بنا پھرے اور لوگوں کو کبھی ایک نماز بھی نہ پڑھائے۔ لیکن اسے امام ہونا چاہیے تھا۔ حقیقی امام میں اور جسے امام ہونا چاہیے ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے؛ وہ کسی بھی اہل خرد و دانش پر مخفی نہیں ہے۔

[شیعہ] کہتے ہیں: ''بیشک یہ امام نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون کرتا ہے برائی اور گناہ کے کاموں پر نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں میں اس کی اطاعت کی جائے گی' نافرمانی اور گناہوں کے کاموں میں نہیں۔ اور اس کے خلاف شمشیر بکف ہو کر خروج نہیں کیا جائے گا۔ احادیث نبویہ اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے امیر سے کوئی بری حرکت صادر ہوتی دیکھے تو صبر سے کام لے اس لیے کہ جو شخص اطاعت سلطان سے ایک بالشت بھر باہر نکلا اور پھر اسی پر اس کی موت واقع ہو گئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''[1]

پس صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاکم کے خلاف خروج اور مسلمان کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اور حاکم میں برائیاں دیکھ کر ان پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ حکم کسی متعین حاکم؛ متعین امیر یا جماعت کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفتن ۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ " سترون بعدی امور تنکرونها(حدیث:۷۰۵٤)۔
صحیح مسلم، کتاب الإمارة۔ باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین (حدیث:۱۸٤۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''جو اطاعت سے نکلا اور پھر جماعت کو چھوڑ کر مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے، اور جو طرف داری اور تعصب کی خاطر لڑتا ہوا مارا جائے تو وہ میری امت میں سے نہیں۔'' صحیح مسلم۔ باب وجوب ملازمة جماعة المسلمین (ح:۱۸٤۸)۔
ایک روایت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچا تو وہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کو ملے گا اور اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہو گی اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں کسی (خلیفہ و امام) کی بیعت کا جوا نہیں تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' صحیح مسلم (ح: ۱۸۵۱)
نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت روا نہیں، اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے۔'' بخاری (ح: ۷۲۵۷)
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''امیر و خلیفہ کی بات سننا اور اس پر عمل پیرا ہونا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، خواہ وہ بات اسے پسند ہو یا ناپسند، البتہ اگر اسے اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر سننا ضروری ہے، نہ اطاعت کرنا۔'' بخاری (حدیث:۲۹۵۵)

دوسري فصل

واجب الاتباع مذہب کے بیان میں

کون سا مذہب واجب الاتباع ہے؟:

شیعہ مصنف ابن المطہر نے جو مضمون ذکر کیا ہے اس میں کہا ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد لوگوں کا آپس میں اختلاف ہوا؛ تو حق پر غور کرنا اور عدل وانصاف سے کام لینا واجب ہوگیا تھا۔ امامیہ کا مذہب چار وجوہات کی بنا پر واجب الاتباع ہے۔اس لیے کہ یہی مذہب حق پر ہے۔اور سب سے سچا مذہب ہے۔ کیونکہ اصول عقائد میں ان کا مسلک تمام اسلامی فرقوں سے جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔اس لیے بھی کہ وہ اپنی نجات اخروی کا کامل یقین رکھتے ہیں۔ان کا دین ائمہ معصومین سے ماخوذ ہے۔[شیعہ مصنف کے یہی الفاظ ہیں]۔

رافضی کہتا ہے: جب نبی کریم ﷺ کی موت کے بعد مصیبت عام ہوگئی اور لوگ اختلاف کا شکار ہوگئے ؛ان کی خواہشات نفس کے مطابق ان کے فرقے بھی متعدد ہوگئے ۔[[امامیہ کے علاوہ دیگر فرقے مختلف الخیال ہیں اور ان کے طرز فکر ونظر میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ درج ذیل افکار و آراء سے اہل سنت کے تغایر وتخالف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے]]:

ا۔اہل سنت میں سے بعض لوگ بلا استحقاق امارت وخلافت کے طلب گار تھے۔اور اکثر لوگ محض دنیا طلبی کے نقطہ خیال سے ان کے پیرو بن گئے تھے۔مثلاً عمر بن سعد بن مالک[جو کہ کچھ عرصہ کے لیے بلاد رے کا حاکم رہ چکا تھا][1]؛کو جب یہ اختیار دیا گیا کہ اگر چاہے تو امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہو اور اگر چاہے تو جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لے؛ تو اس نے لڑنا پسند کیا۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل جہنمی ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے:

(۱) فَوَ اللّٰهِ مَا اَدْرِیْ وَاِنِّیْ لَصَادِقٌ ، أُفَكِّرُ فِیْ اَمْرِیْ عَلٰی خَطَرَیْنِ

''اللہ کی قسم! میں سچ کہتا ہوں کہ میں دوخطرات کے بارے میں سوچ بچار کررہا ہوں اور مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

(۱) اَاَتْرُكُ مُلْكَ الرَّيِّ وَالرَّيُّ مُنْيَتِیْ ، اَوْ اُصْبِحُ مَاثُوْمًا بِقَتْلِ حُسَیْنٖ

''آیا میں رے کی سلطنت چھوڑ دوں حالانکہ یہ میری دلی تمنا ہے یا قتل حسین کے گناہ کا مرتکب ٹھہروں۔''

(۳) وَفِیْ قَتْلِهِ النَّارُ الَّتِیْ لَیْسَ دُوْنَهَا ، حِجَابٌ وَّلِیْ فِی الرَّيِّ قُرَّةُ عَیْنِیْ

''سیدنا حسین کے قتل کی سزا وہ آگ ہے جس میں کوئی پردہ حائل نہیں اور رے کی حکومت میرے لیے فرحت وسرور کی موجب ہے۔''

---

[1] مالک کی کنیت ابو وقاص تھی، یہ مشہور صحابی فاتح عراق حضرت سعد کے ازعشرہ مبشرہ کے والد تھے۔

۲۔ بعض اہل سنت شبہات کا شکار ہو کر دنیا دار لوگوں کے پیچھے چلنے لگے تھے۔کوتاہ بینی کی بنا پر انہیں حق تک رسائی حاصل نہ ہو سکی، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت کے مستوجب ٹھہرے۔اس لیے کہ انہوں نے غور وفکر نہ کر کے یہ حق غیر مستحق کے سپرد کر دیا تھا۔

۳۔ بعض لوگ کوتاہ فہمی کی بنا پر مقلد محض ہو کر رہ گئے اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید کثرت افراد حق وصداقت کی علامت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کی بیعت کر بیٹھے اور اس آیت کو یکسر نظر انداز کر دیا:﴿ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ﴾

''وہ (حق پرست) کم ہی ہوتے ہیں۔'' (ص ۲۴)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سباء ۱۳]

'''اور میرے بندوں میں سے بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہیں۔''

۴۔ بعض لوگ حق کی بنا پر امارت وخلافت کے طالب تھے، چنانچہ قلیل التعداد با اخلاص مسلمانوں کی ایک جماعت نے جنہیں دنیوی زیب وزینت سے کچھ سرور کار نہ تھا؛ اور جنہیں اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی ہرگز کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اخلاص کیساتھ ان کی اطاعت کا اقرار کر لیا جو تقدیم کے مستحق تھے ؛اور ان کے اوامر واحکام کی اطاعت کرنے لگے۔ جب مسلمان اس آزمائش کا شکار ہوئے ؛تو ہر ایک پر واجب ہوتا تھا کہ وہ حق میں غور وفکر کریں۔اور انصاف کا سہارا لیں۔اور حق کو اس کی جگہ پر رکھا جائے اور مستحق پر ظلم نہ کیا جائے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:﴿ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (ھود:۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔''

ان وجوہات کی بنا پر امامیہ کا مذہب واجب الاتباع ٹھہرا۔'' [شیعہ مصنف کا بیان ختم ہوا]۔

[شیعہ مصنف کے نظریات پر رد:]

شیعہ مصنف نے رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کو چار فرقوں میں تقسیم کیا ہے، حالانکہ یہ صریح قسم کی دروغ بیانی ہے۔ اس لیے کہ معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے ایک فرد واحد بھی ان اقسام چہارگانہ سے وابستہ نہ تھا۔ چہ جائے کہ صحابہ میں ان چہار اقسام کے علاوہ کوئی اور قسم بھی نہ ہو۔

بلا استحقاق طالب خلافت سے شیعہ مصنف کے زعم میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حق کی بنا پر طالب خلافت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ یہ دونوں کے حق میں صاف جھوٹ ہے۔اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل سے قبل کبھی اپنے لیے خلافت وامارت کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کبھی خلافت وامارت کا مطالبہ کیا؛ چہ جائے کہ وہ ناحق اس پر قبضہ کر لیتے۔

باقی ماندہ دو قسموں میں سے پہلی قسم کے وہ لوگ شمار کیے ہیں جو طلب دنیا کے لیے دوسروں کی تقلید کا دم بھرتے تھے۔اور دوسرے وہ جو کوتاہ بینی کے پیش نظر دوسروں کے پیرو تھے۔

حق کی معرفت حاصل کر کے اس کی پیروی کرنا انسان کا فرض ہے۔ یہی وہ صراط مستقیم ہے' جو کہ ان لوگوں کا راستہ ہے

جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام کیا۔ان میں انبیاء کرام علیہم السلام ؛ صدیقین ؛ شہداء اور صالحین شمار ہوتے ہیں ۔ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور نہ ہی ان لوگوں کا راستہ جو راہِ حق سے گمراہ ہوئے اور اس راہ سے بھٹک گئے جس راہ کی طرف ہدایت ملنے کی دعا ہم ہر نماز کی ہر رکعت میں کرتے ہیں ۔صحیح سند کیساتھ ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''یہود وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا۔اور عیسائی گمراہ ہیں ۔ یہود نے حق کو پہچانا مگر اس کی اتباع نہ کی ۔''

ترک اتباع کا سبب حسد و کبر؛ غلو اور خواہشات نفس کی پیروی تھی؛ اس لئے وہ مورد غضب الٰہی ہوئے ۔ نصاریٰ حق کی معرفت حاصل نہ کر سکے ۔ وہ جو کچھ اخلاقیات' عبادات اور زہد کرتے ہیں' اس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں ۔ بلکہ ان میں جہالت ؛ غلوٗ بدعات ؛ اور شرک پایا جاتا ہے ۔ اس لیے وہ جادہ مستقیم سے بھٹک گئے ۔اگرچہ ان دونوں امتوں میں سرکشی اور بغاوت کا عنصر پایا جاتا ہے ؛ تاہم یہود میں یہ عنصر زیادہ غالب ہے ۔ اور گمراہی نصاری پر غالب ہے ۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی صفات میں سے حسد و تکبر ؛ اتباع ہوی ؛ سرکشی ؛ فساد اور زمین پر غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں کو شمار کیا ہے ۔فرمایا:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

''لیکن جب کبھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمہاری طبیعتوں کے خلاف تھی ، تم نے جھٹ سے تکبر کیا ، پس بعض کو تو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل بھی کر ڈالا ۔'' [بقرہ ۸۷]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [النساء ۵۴]

''یا یہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے ۔''

مزید اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَّ اِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا﴾ [الأعراف ۱۴۶]

''میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں ، جس کا ان کو کوئی حق نہیں اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی وہ ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا راستے دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنا لیں ۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ قَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾

''ہم نے بنو اسرائیل کے لئے ان کی کتاب میں صاف فیصلہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو بار فساد برپا کرو گے اور تم بڑی زبردست زیادتیاں کرو گے ۔'' [الإسراء ۴]

جب کہ اللہ تعالیٰ نے نصاری کو گمراہی ؛ شرک ؛ غلو اور بدعات سے موصوف کیا ہے ۔ارشاد فرمایا:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [التوبة ۳۱]

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا اور مریم کے بیٹے مسیح کو؛ حالانکہ انہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [المائدۃ ۷]

''تم پر اللہ کی جو نعمتیں نازل ہوئی ہیں انہیں یاد رکھو اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا تم سے معاہدہ ہوا ہے جبکہ تم نے کہا: ہم نے سنا اور مانا اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالی دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَّرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ [الحدید]

''ہاں رہبانیت (ترک دنیا) تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر اسے واجب نہ کیا تھا مگر اللہ کی رضا جوئی کے۔سو انہوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی۔''

یہ موضوع کئی ایک مقامات پر تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔جب کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو گمراہی و سرکشی سے مبرا و منزہ قرار دیا ہے۔ارشاد فرمایا:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ❀مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ❀وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ [النجم ۱۔۳]

''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! کہ تمھارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔''

گمراہ وہ ہوتا ہے جو حق کو نہ پہچانتا ہو۔اور غاوی وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ﴾ [ص ۴۵]

''ہمارے بندوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا بھی لوگوں سے ذکر کرو جو ہاتھوں اور آنکھوں والے تھے۔''

یہاں پر ہاتھوں سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قوت ہے اور ابصار سے مراد دین میں بصیرت ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ ❀اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ❀اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر]

''زمانے کی قسم! کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔''

پس اتباع صراط مستقیم کے لیے حق بات کا علم ہونا اور اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔یہ دونوں چیزیں واجب ہیں۔کوئی بھی

انسان ان دو امور کے بجالائے کے بغیر کامیاب اور نجات پانے والے نہیں ہوسکتا۔

مگر اس کے عین برخلاف امت محمدی خیر الامم ہے۔ اور اس کے بہترین لوگ پہلی صدی کے لوگ ہیں۔ پہلی صدی کے لوگ علم نافع اور عمل صالح کے اعتبار سے اکمل ترین لوگ تھے۔ جب کہ یہ [رافضی] جھوٹے انہیں اس کے برعکس صفات سے موصوف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نہ ہی حق بات جانتے تھے اور نہ ہی اس کی پیروی کرتے تھے۔ بلکہ ان کے نزدیک اکثر صحابہ حق بات جانتے ہوئے بھی اس کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم؛ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم؛ اور باقی امت میں سے بہت سارے لوگ، حق بات نہیں جانتے تھے۔ بلکہ وہ اپنی جہالت اور غور وفکر نہ کرنے کی بنا پر ظالمین کی پیروی کرتے تھے۔ جو انسان غور وفکر نہیں کرتا اس کا سبب کبھی خواہشات نفس کی پیروی اور دنیا طلبی ہوتی ہے۔ اور کبھی کوتاہ فہمی اور نقص ادراک کی وجہ سے۔

شیعہ کا دعوی ہے کہ: ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو حق کی بنیاد پر خلافت کے طلبگار تھے۔ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ بات ہمیں اضطراری طور پر معلوم ہے کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کے اس قول کی روشنی میں لازم آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساری کی ساری امت گمراہ ہوچکی ہو؛ اور ان میں سے کوئی ایک بھی ہدایت یافتہ نہ ہو۔ تو پھر یہود و نصاری نسخ وتبدیل کے بعد بھی ان سے بہتر ٹھہرے۔ اس لیے کہ ان میں ایسے لوگ تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ﴾ [الأعراف ۱۵۹]

''اور قوم موسی میں ایک جماعت ایسی ہے جو حق کے مطابق ہدایت کرتی اور اسی کے مطابق انصاف بھی کرتی ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ یہودی اور عیسائی ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ [اور یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی]؛ ان میں سے ایک فرقہ جنتی ہوگا۔ شیعہ کے قول کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس امت کا کوئی بھی گروہ عدل و انصاف اور حق پر قائم نہیں رہا۔ جب خیر القرون میں ایسے لوگ موجود نہیں تھے' تو بعد کے ادوار میں بالاولی نہیں ہوں گے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ یہود و نصاری نسخ اور تبدیلی واقع ہونے کے بعد بھی اس بہترین امت سے بہتر ہوں جنہیں لوگوں کی بھلائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ یہ ان کے اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ ہے جو کچھ شیعہ کہتے ہیں۔ اگر یہ حکایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد کی ہے کہ امت میں اتنا اختلاف واقع ہوگیا تھا؛ تو پھر ان باقی سارے احوال کا کیا عالم ہوگا جن سے استدلال کیا جارہا ہے۔ اس حکایت میں جتنے بھی جھوٹ ہیں' ہم ان کا پول کھول کر رکھ دیں گے۔ ہم کہتے ہیں:

[صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام بلند اور شیعہ اعتراض]:

[اشکال]: رافضی نے جو کہا ہے: ''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد مصیبت عام ہوگئی اور لوگ اختلاف کا شکار ہوگئے؛ ان کی خواہشات نفس کے مطابق ان کے فرقے بھی متعدد ہوگئے۔ اہل سنت میں سے بعض لوگ بلا استحقاق امارت و خلافت کے طلب گار تھے۔ اور اکثر لوگ محض دنیا طلبی کے نقطہ خیال سے ان کے پیرو بن گئے تھے، مثلاً عمر بن سعد بن مالک [جو کہ کچھ عرصہ کے لیے بلاد رے کا حاکم رہ چکا تھا]؛ کو جب یہ اختیار دیا گیا کہ اگر چاہے تو امام حسین رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہو اور اگر چاہے تو جنگ سے کنارہ کشی اختیار کرلے؛ تو اس نے لڑنا پسند کیا۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل جہنمی ہیں۔'' پھر اس کے لیے اس نے شعر ذکر کیے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس پیرائے میں اتنے جھوٹ اور باطل باتیں اور امت کے بہترین لوگوں کی مذمت ہے جو کسی بھی عقلمند پر پوشیدہ نہیں ۔اس [کلام کے جھوٹ ہونے] کی کئی وجوہات ہیں:

شیعہ کا کہنا کہ''ان کی خواہشات نفس کے مطابق ان کے فرقے بھی متعدد ہوگئے۔'' توان میں سے ہر ایک اپنی خواہشات کا پیروکار ہوگیا۔ان میں کوئی ایک بھی حق کا طلبگار نہ تھا۔اور نہ ہی کوئی ایک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت میں کامیابی چاہتا تھا۔اور نہ ہی کسی کی بات اجتہاد و استدلال پر مبنی تھی۔ان الفاظ کا عموم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام کو شامل ہے۔یہ گل افشانی انہی صحابہ کے بارے میں کی جارہی ہے جن کی تعریف وتوصیف اللہ اور اس کے رسول نے کی ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے جنت کی خوشخبری دی تھی۔جن کی شان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (توبة ۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں؛ اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

نیز فرمان الٰہی ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (الفتح: ۲۹)

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت آپس میں رحمدل ہیں، آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں؛ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں۔ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نشان پڑ گئے ہیں۔ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے مثل اس کھیتی کے جس نے انکھوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہوگیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ..... اِلی قولہ تعالیٰ..... وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ☆ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں ...... آگے یہاں تک کہ فرمایا......: یہی لوگ سچے مومن

ہیں، ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی ۔ اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ پس یہ لوگ بھی تم میں سے ہی ہیں......۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحدید ۱۰]

''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [الحشر ۸۔۱۰]

''(فئے کا مال) ان مہاجر مسکینوں کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی راست باز لوگ ہیں ۔ اور (ان کیلئے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کتنی ہی سخت حاجت ہو (بات یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب اور بامراد ہے اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کہیں اور دشمنی نہ ڈال ۔ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔''

یہ آیات کریمہ مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے بعد آنے والے مؤمنین کی توصیف و مدح سرائی کو متضمن ہیں جو اپنے سے پہلے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ ان کے دل عداوت صحابہ سے پاک رہیں ۔ اور یہ ان اصناف صحابہ کو متضمن ہے جو مال فئے کے مستحق ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضہ ان تینوں اصناف سے خارج ہیں ۔ اس لیے کہ یہ لوگ سابقین یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے دعا نہیں کرتے، بلکہ ان کے دل صحابہ کے خلاف بغض و عداوت سے لبریز ہیں ۔ ان آیات میں صحابہ کرام کی ثنا خوانی کی گئی ہے اور اہل سنت والجماعت کی ثنا خوانی ہے جو ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں ۔ رافضی اس سے باہر ہیں ۔ کیونکہ رافضیوں کا مذہب

اس کا الٹ ہے۔ ابن بطہ اور دوسرے علماء کرام رحمہم اللہ نے ابو بدر سے حدیث روایت کی ہے؛ فرمایا:

''......حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ تین منزلوں پر ہیں۔ دو منزلیں گزر چکی ہیں۔ اور ایک منزل باقی رہ گئی ہے۔ پس اس کو اچھا سمجھنا جس پر تم ہونے والے ہو؛ تاکہ تم اس منزل پر ہو جاؤ جو کہ باقی رہ گئی ہے؛ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا﴾

''(فئے کا مال) ان مہاجر مسکینوں کے لئے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طلب گار ہیں۔''

یہ مہاجرین [صحابہ کرام] تھے؛ اور یہ منزلت گزر چکی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر ۸۔۱۰]

''اور (ان کے لئے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کتنی ہی سخت حاجت ہو۔''

پھر فرمایا: یہ انصار [صحابہ کرام رضی اللہ عنہم] تھے؛ اور یہ منزلت بھی گزر چکی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾

''اور جو ان کے بعد آئے اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کہیں اور دشمنی نہ ڈال۔ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔''

پھر فرمایا: وہ دو منزلیں گزر چکی ہیں؛ اور یہ منزل باقی رہ گئی ہے؛ اس کے لیے اچھے اعمال کرو تاکہ تم اس منزل کے مستحق بن جاؤ جو باقی رہ گئی ہے؛ پس اپنے سے پہلے لوگوں کے لیے استغفار کرو۔''[1]

نیز حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں:

''جو کوئی سلف کو گالی دے؛ مال فئے میں اس کا کوئی حصہ نہیں؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا﴾

''اور جو ان کے بعد آئے اور کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو......۔''

یہ اثر حضرت مالک رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ دوسرے اہل علم سے بھی معروف ہے۔ جیسا کہ ابو عبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ؛ امام احمد رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں سے ابو حکیم نہروانی نے بھی یہ اثر دوسرے فقہاء کرام سے نقل کیا ہے۔

[1] شائد یہ اثر الإبانۃ الکبری میں ہو؛ اس لیے کہ الإبانۃ الصغری میں نہیں ملا۔

اور حسن بن عمارہ سے بھی روایت کیا گیا ہے؛ وہ حکیم سے اور وہ مقسم سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے لیے یہ جانتے ہوئے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ باہم لڑا کرتے تھے۔'' ❶

حضرت عروہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ آپ فرمایا کرتی تھیں:

''اصحاب محمد ﷺ کے لیے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر لوگوں نے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔'' ❷

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو گالی نہ دو؛ اللہ کی قسم! اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' ❸

صحیح مسلم میں یہی روایت بعینہٖ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے!، اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے تو ان کے پاسنگ کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔'' ❹

نیز صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا: ''کچھ لوگ اصحاب محمد ﷺ یہاں تک کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں سوء ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں۔'' تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواباً فرمایا:

''اس میں حیرت و تعجب کی کون سی بات ہے۔ دارفانی سے کوچ کرنے کے باعث ان کے نیک اعمال کا سلسلہ بند ہو گیا تھا اللہ تعالیٰ کریم نے چاہا کہ ان کے اجر و ثواب کا سلسلہ بند نہ ہو۔'' ❺

ابن بطہ رحمہ اللہ نے صحیح اسناد سے عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: مجھ سے میری والد نے حدیث بیان کی؛ وہ کہتے ہیں: مجھ سے معاویہ نے حدیث بیان کی؛ ان سے رجاء نے؛ وہ مجاہد سے روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اصحاب محمد ﷺ کو برا بھلا نہ کہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے لیے استغفار کرنے کا حکم دیا ہے' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ آپس میں لڑیں گے۔'' ❻

[صحابہ کے فضائل و مناقب]:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''اصحاب محمد ﷺ کی شان میں گستاخی سے احتراز کیجئے؛ اللہ کی قسم! نبی ﷺ سے ان کی ایک گھڑی کی رفاقت و صحبت تمہارے چالیس سالہ اعمال سے افضل ہے۔'' ❼

❶ الشریعۃ للآجری (۱۹۷۹۔۱۹۸۰) السنۃ لابن ابی عاصم (۱۰۰۳)

❷ صحیح مسلم۔ کتاب التفسیر۔ باب فی تفسیر آیات متفرقۃ (حدیث: ۳۰۲۲)۔

❸ بخاری ۔باب قول النبی ﷺ "لو کنت متخذا خلیلا" (ح: ۳۶۷۳) صحیح مسلم۔ باب تحریم سب الصحابۃ رضی اللہ عنہم (ح: ۲۵٤۱)۔ ❹ صحیح مسلم۔حوالہ سابق۔ حدیث: ۲۵٤۰)

❺ الشریعۃ للآجری (۱۹۹۹) من طریق ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا

❻ شاید یہ صحیح مسلم کے بعض نسخوں میں ہے۔

❼ مصنف ابن ابی شیبۃ (۱۲/ ۱۷۸)، سنن ابن ماجۃ۔ المقدمۃ۔ باب فضل اھل بدر، (حدیث: ۱٦۲)۔

اور حضرت وکیع کی روایت میں ہے:'' تمہاری ساری زندگی کی عبادت سے بہتر ہے۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۞ وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۞ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۞ وَأُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴾ (الفتح:۱۸۔۲۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہوگیا، جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے، جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اس نے معلوم کرلیا ان پر اطمینان وسکون نازل کیا اور انہیں قریبی فتح سے نوازا۔اور بہت سی **غنائم** جنہیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت ساری **غنیمتوں** کا وعدہ کیا ہے جنہیں تم حاصل کروگے۔پس یہ تمہیں جلدی ہی عطا فرمادی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے تاکہ مومنوں کے لئے یہ ایک نشانی ہو جائے، تاکہ وہ تمہیں سیدھی راہ چلائے۔اور تمہیں اور (**غنیمتیں**) بھی دے جن پر اب تک تم نے قابو نہیں پایا اللہ تعالیٰ نے انہیں قابو کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''[1]

جن لوگوں نے جبل تنعیم کے پاس حدیبیہ کے مقام پر [ببول کے] درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ؛ ان کی تعداد چودہ سو سے زیادہ تھی۔یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ کو عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔پھر مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے صلح کرلی ؛ جسے صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔یہ ذوالقعدہ سن چھ ہجری کا واقعہ ہے۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے سن سات ہجری کی شروع میں غزوہ خیبر کیا ؛ جس میں اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت سے نوازا۔آپ نے یہ مال غنیمت اپنے صحابہ میں تقسیم کیا ؛ اور حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والے اعرابیوں میں سے کسی کو اس میں سے کچھ بھی حصہ نہیں دیا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلٰى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلَامَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [الفتح ۱۵]

''جب تم غنیمتیں لینے جانے لگو گے تو جھٹ سے یہ پیچھے رہ جانے والے لوگ کہنے لگیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو بدل دیں آپ فرما دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ ہی فرما چکا ہے کہ تم

[1] مذکورہ بالا آیت اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول ﷺ کے قلبی اسرار کو معلوم کر کے ان سے رضا مندی کا اظہار فرمایا ہے۔درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہ کی تعداد ۱۴۰۰ تھی۔پھر انہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں حصہ لیا۔بیعت رضوان سے اس وقت تک مسلمان ہنوز بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے صحابہ کے بارے میں: '' لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ '' کی شہادت الٰہی پر قانع چلے آرہے ہیں۔صحیح مسلم میں سرور کائنات ﷺ کا یہ ارشاد کہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔''(صحیح مسلم ۔ باب فضائل اصحاب الشجرۃ، (ح۲٤۹٦)۔

ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلو گے وہ اس کا جواب دیں گے (نہیں نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو (اصل بات یہ ہے) کہ وہ لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہیں۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر خبر دی ہے کہ اللہ ان صحابہ پر راضی ہوگیا۔ اور ان کے دلوں کا حال جان لیا؛ اور عنقریب انہیں فتح و نصرت سے نوازے گا۔ یہی وہ بڑے بڑے سرکردہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تھے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی دوسرا ایسا نہیں تھا جسے آپ پر مقدم کیا جاتا۔ بلکہ تمام کے تمام مسلمان آپ کی فضیلت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی فضیلت کو قرآن میں بیان کیا ہے' ارشاد فرمایا:

﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ﴾ [الحدید۱۰]

''تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے فی سبیل اللہ دیا ہے اور قتال کیا ہے وہ (دوسروں کے) برابر نہیں بلکہ ان کے بہت بڑے درجے ہیں ان لوگوں کی نسبت جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیے، ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں فتح سے پہلے جہاد کرنے والوں اور اس کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی فضیلت کا اعلان کیا ہے۔ یہاں پر فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیبیہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ: کیا یہ فتح ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں۔''[1]

اہل علم جانتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے بارے میں ہی اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی تھیں:

﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا ۞ لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۞ وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا﴾ [الفتح ۱۔۳]

''بیشک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے۔ تاکہ آپ کی سابقہ اور آئندہ لغزشیں؛ سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور آپ پر اپنا احسان پورا کر دے اور آپ کو سیدھی راہ چلائے۔ اور آپ کو ایک زبردست مدد دے۔''

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو اہل ایمان عرض گزار ہوئے: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو آپ کے لیے ہوا! ہمارے لیے کیا ہے؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ﴾ [الفتح ۴]

''وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور اطمینان ڈال دیا تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں۔''

یہ آیت فتح سے پہلے خرچ کرنے والوں کی فتح کے بعد خرچ کرنے والوں پر فضیلت کے باب میں ایک نص کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں:

[1] سنن أبي داؤد ۳/ ۱۰۱۔

﴿ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ﴾ (التوبة ۱۰۰)

''اور جومہاجرین اور انصار میں سے سابق اور مقدم ہیں......'' سابقین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حدیبیہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیا۔ بیعت رضوان والے تمام چودہ سولوگ اس میں شامل ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ: سابقین اولین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ۔ یہ قول ضعیف ہے۔اس لیے کہ فقط منسوخ قبلہ کی طرف نماز میں کوئی فضیلت نہیں ۔ اس لیے کہ قبلہ کا منسوخ ہونا ان لوگوں کا اپنا فعل نہیں ہے جس کی وجہ سے انہیں فضیلت دی جائے ۔ نیز یہ کہ دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی فضیلت پر کوئی حدیث [یا آیت] دلالت نہیں کرتی ؛ جیسا کہ انفاق فی سبیل اللہ میں سبقت ؛ جہاد اور بیعت رضوان کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ لیکن اس میں ان لوگوں کی بعد میں آنے والوں پر فضیلت ہے جو ایمان لانے میں سبقت لے گئے اور اس موقع کو پالیا۔ جیسے پانچ نمازیں فرض ہونے سے پہلے مسلمان ہونے والوں کو بعد میں مسلمان ہونے والوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ایسے ہی جو لوگ حضر میں نماز کی چار رکعت ہونے سے قبل اسلام لائے ؛ انہیں بعد میں اسلام لانے والوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ایسے ہی جو لوگ جہاد کی اجازت ملنے سے پہلے ؛ یا فرض ہونے سے پہلے اسلام لائے ؛ انہیں فرضیت جہاد کے بعد اسلام لانے والوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ایسے ہی جو لوگ رمضان المبارک کے روزے فرض ہونے سے پہلے اسلام لائے ؛ انہیں بعد میں اسلام لانے والوں پر سبقت حاصل ہے۔ ایسے ہی حج کی فرضیت سے پہلے مسلمان ہونے والوں کو بعد میں مسلمان ہونے والوں پر سبقت حاصل ہے ۔شراب حرام ہونے سے پہلے اسلام لانے والوں کو بعد میں اسلام لانے والوں پر سبقت حاصل ہے۔ یہی حال سود کی حرمت کا ہے۔

اسلام کے احکام آہستہ آہستہ نازل ہوتے رہے۔ ہر وہ انسان جو کسی حکم کے نازل ہونے سے پہلے اسلام لے آیا؛ اسے اس حکم کے نزول کے بعد مسلمان ہونے والوں پر سبقت حاصل ہے۔ اس میں اس کی ایک گونہ فضیلت ہے۔ پس جو لوگ قبلہ منسوخ ہونے سے پہلے اسلام لے آئے ؛ انہیں بعد میں مسلمان ہونے والوں پر فضیلت اسی باب میں حاصل ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے سابقین اولین بعد میں آنے والوں سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ ان بعض احکام میں کوئی ایسا سبب نہیں ہے جس کی وجہ سے انہیں دوسروں سے بہتر قرار دیا جائے۔ اس لیے کہ قرآن و سنت اہل حدیبیہ کی تقدیم پر دلالت کرتے ہیں۔ پس واجب ہوتا ہے کہ اس آیت کی ایسی تفسیر کی جائے جو باقی تمام نصوص کے موافق ہو۔

یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ ان سابقین اولین میں [حضرات صحابہ کرام] ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین شامل تھے ۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ کو عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیکر اس پر بیعت کی ۔ آپ کو رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا؛ اس لیے آپ اس موقع پر موجود نہیں تھے۔ آپ ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے بیعت لی۔ اس لیے کہ آپ کو خبر ملی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا ہے ۔ صحیح حدیث میں ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور انبیاء ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ اَحَدٌ مِّمَّنْ بَایَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ النَّارَ)) [1]

---

[1] مسلم۔ باب من فضائل اصحاب الشجرة (ح: ۲۴۹٦)، سنن ابی داؤد۔ باب فی الخلفاء (ح:٤٦٥٣)۔

’’درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی شخص آگ میں داخل نہیں ہوگا۔‘‘

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (التوبة: ۱۱۷)

’’اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا اس کے بعد ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے۔‘‘

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین جمع کیا ہے' ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ....اِلیٰ قولہ تعالیٰ.... وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ☆ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ﴾

’’جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں......آگے یہاں تک کہ فرمایا......: وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی؛ یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔ اور جو لوگ اس کے بعد ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ پس یہ لوگ بھی تم میں سے ہی ہیں......۔‘‘[الأنفال ۷۲۔۷۵]

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے مابین موالات و دوستی کو ثابت کیا ہے۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ☆....إلی أن قال....: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ☆وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ☆﴾ (المائدہ: ۵۱۔۵۶)

’’اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ؛ یہ تو آپس میں ہی ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بیشک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ تعالیٰ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا...... یہاں تک کہ فرمایا......(مسلمانو!) تمہارا دوست خود اللہ ہے اور اسکا رسول ہے اور ایمان والے ہیں جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور رکوع (خشوع و خضوع) کرنے والے ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور مسلمانوں سے دوستی کرے، وہ یقین مانے کہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔‘‘

دوسری جگہ ارشاد ہوا: ﴿ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبہ: ۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔‘‘

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین دوستی کو ثابت کیا ہے' اور ان سے دوستی لگانے کا حکم دیا گیا

ہے، مگر روافض اس کے برعکس ان سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں؛ ان سے دوستی نہیں کرتے۔ دوستی کی اصل تو محبت پر قائم ہوتی ہے۔ اور دشمنی کی اصل بغض و نفرت پر ہوتی ہے۔ رافضی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھتے ہیں محبت نہیں کرتے۔

ایک جاہل نے اپنی طرف سے یہ قول گھڑ لیا ہے کہ درج ذیل آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ نے نماز میں اپنی انگوٹھی بطور صدقہ ادا کردی۔ [[تب یہ آیت اتری، قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ﴾ (المائدہ: ۵۵)

''جو نمازوں کی پابندی کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔'']]

محدثین کے ہاں باتفاق اہل علم یہ روایت سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ کئی ایک وجوہات کی بنا پر اس کا جھوٹ کھل کر ظاہر ہوتا ہے:

❀ [پہلی وجہ: یہ طرز استدلال سراسر غلط ہے، جسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ] آیت میں ''الذین'' جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک تھے۔ مزید برآں '' وَهُمْ رَاكِعُوْنَ '' میں واؤ حالیہ نہیں۔ اگر واؤ کو حالیہ قرار دیا جائے تو زکوٰۃ کا حالت رکوع میں ادا کرنا ایک ضروری امر ہوگا۔ تو پھر صرف اس سے محبت و دوستی رکھی جائے جو حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کرے۔ اس کے علاوہ باقی تمام صحابہ اور اہل بیت سے دوستی نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں کسی کی مدح امر واجب یا مستحب کی بنا پر کی جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حالت نماز میں زکوٰۃ ادا کرنا بالاتفاق واجب ہے نہ مستحب۔ اس پر تمام اہل ملت کا اتفاق ہے۔

❀ [دوسری وجہ]: نیز یہ کہ نماز میں ایک طرح کی مشغولیت ہوتی ہے، [اور زکوٰۃ کی ادائیگی اس کی منافی ہے]۔ مزید برآں کہ اگر نماز میں ہی زکوٰۃ ادا کرنا کوئی مستحسن فعل ہوتا تو پھر رکوع اور قیام یا سجدہ کے درمیان کوئی فرق نہ ہوتا۔ بلکہ حالت قعود یا قیام میں زکوٰۃ ادا کرنا زیادہ آسان ہوتا۔

❀ [تیسری وجہ]: اس پر طرہ یہ کہ عہد نبوی میں سرے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر زکوٰۃ ہی فرض نہ تھی۔

❀ [چوتھی وجہ]: [اس کی حد یہ ہے کہ آپ کے پاس انگوٹھی بھی نہ تھی]۔ نیز یہ کہ اگر آپ انگوٹھی کے علاوہ کسی چیز سے زکوٰۃ ادا کرتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ [بفرض محال اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آپ کے پاس انگوٹھی موجود تھی؛ تو آخر یہ انگوٹھی دے کر کس مال کی زکوٰۃ ادا کی گئی؟] اس لئے کہ اکثر فقہاء زکوٰۃ میں انگوٹھی دینے کو کافی خیال نہیں کرتے۔

❀ [پانچویں وجہ]: شیعہ کی کتب حدیث میں تحریر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ انگوٹھی ایک سائل کو دی تھی۔ زکوٰۃ میں مدح کا پہلو صرف یہ ہے کہ فوری طور پر بلاتاخیر ادا کی جائے۔ کسی سائل کے سوال کا انتظار نہ کیا جائے۔

❀ [چھٹی وجہ]: یہ آیت کفار کے ساتھ دوستی کے سیاق میں چل رہی ہے۔ جس میں [کفار کی دوستی ترک کر کے] مؤمنین کے ساتھ دوستی لگانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس پر سیاق کلام دلالت کررہا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

رافضیوں کا المیہ یہ ہے کہ جب بھی وہ کسی دلیل سے استدلال کرتے ہیں' وہ الٹا ان کے گلے میں پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے انہوں نے ولایت پر استدلال کیا ہے؛ جس سے مراد وہ امارت لیتے ہیں۔ یہاں پر ولایت سے مقصود امارت [حکومت] نہیں' بلکہ اس سے دوستی مراد ہے جو کہ دشمنی کی ضد ہے۔ رافضی بالکل اس کے برعکس چلتے ہیں۔ اسماعیلیہ' نصیریہ اور اس طرح کے دیگر فرقے یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین کفار کے ساتھ محبت اور دوستی رکھتے ہیں۔ اور مہاجرین و انصار اور

تابعین اوران کے بعد آنے والے مسلمانوں سے دشمنی اور بغض رکھتے ہیں۔

قرآنی آیات سے مدح صحابہ:

[ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ آیت قرآنی میں کفار کی دوستی سے منع کر کے مومنین سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کا حکم دیا گیا ہے]۔ بخلاف ازیں روافض اہل ایمان سے بغض وعداوت رکھتے اور مشرکین تا تار سے دوستی لگاتے ہیں، جیسا کہ ہمارا مشاہدہ ہے، اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴾ (الانفال: ٦٤)

''اے نبی! آپ کے لیے اللہ کافی ہے اوران مومنوں کو جو آپ کی پیروی کررہے ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بھی کافی ہے اور آپ کے پیروکار مؤمنین کے لیے بھی۔ اوران پیروکاروں میں صف اول کے اور سب سے افضل لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ❀وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ❀فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴾ [نصر]

''جب اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہو رہے ہیں۔ تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اوراس سے بخشش مانگئے، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

جن لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ وہ فوج درفوج اسلام میں داخل ہورہے ہیں' وہ آپ کے زمانہ کے لوگ تھے۔ [جن کے بارے میں] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ هُوَالَّذِیْۤ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ☆وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ﴾

''وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی۔ اوران کے دلوں میں الفت ڈال دی۔''

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ذریعہ سے رسول اللہ ﷺ کی تائید ونصرت فرمائی تھی۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ❀لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ ❀ لِیُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَیَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ [الزمر ٣٣۔٣٥]

''اور جو شخص سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی۔ یہی لوگ پرہیز گار ہیں۔ وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے ان کے پروردگار کے ہاں موجود ہے۔ نیکی کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کردے جو انہوں نے کی تھیں اور جو اچھے کام وہ کرتے رہے انہی کے لحاظ سے انہیں ان کا اجر عطا کرے۔''

یہی وہ لوگ ہیں جو سچی بات کہتے ہیں' اور سچائی کی تصدیق کرتے ہیں۔ بخلاف رافضی مصنف کے؛ جو کہ جھوٹ بولتا ہے' اور جب اس کے پاس حق بات آتی ہے؛ تو اسے جھٹلاتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

اہل قبلہ میں سے شیعہ سے بڑھ کر کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اس قدر جھوٹ بولنے والا اور حق بات کو

جھٹلانے والا ہو۔ اس لیے اس فرقہ سے بڑھ کر کسی بھی فرقہ میں غلونہیں پایا جاتا۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بشر کے الٰہ ہونے کے دعویدار ہیں ۔ اور بعض نبی کریم ﷺ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی نبی تسلیم کرتے ہیں ۔ بعض اپنے ائمہ کے معصوم ہونے کے دعویدار ہیں ۔ یہ باقی تمام فرقوں سے بڑھ کر جھوٹ کی آخری حد ہے۔ اہل علم کا اتفاق ہے کہ اہل قبلہ کی طرف منسوب فرقوں میں سب سے زیادہ جھوٹ اسی فرقہ میں پایا جاتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ﴾ [النمل ۵۹]

''فرما دیجیے: سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے چن لیا۔''

سلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس سے مراد اصحاب محمد ﷺ ہیں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس امت میں سے اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے لوگوں میں سب سے افضل ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ☆ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ ☆ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ☆ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ﴾

''پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنایا جنھیں ہم نے (اس وراثت کیلئے) اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ پھر ان میں سے کوئی تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔ کوئی میانہ رو ہے اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والا ہے۔ یہی بہت بڑا فضل ہے۔ وہ ہمیشہ رہنے والے باغات میں داخل ہوں گے۔ وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔ اور وہ کہیں گے اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔ یقیناً ہمارا پروردگار بخشنے والا، قدردان ہے۔ جس نے اپنے فضل سے ہمیں ابدی قیام گاہ میں اتارا جہاں ہمیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ تھکان لاحق ہوتی ہے۔'' [فاطر ۳۲۔۳۵]

امت محمد ﷺ وہی لوگ ہیں جو یہود و نصاریٰ کے بعد کتاب اللہ کے وارث بنے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میں مبعوث کیا گیا ہوں ۔ پھر اس کے بعد آنے والے' پھر ان کے بعد آنے والے۔''❶

محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہی وہ چنے ہوئے لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے منتخب کرلیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ آخر آیت تک۔

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ

❶ متفق علیه ؛ البخاری ۳/ ۱۷۱؛ مسلم ٤/ ۱۹٦۲۔

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِي لَا يُشْرِكُوْنَ بِي شَيْئًا وَّمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ﴾ [النور ۵۵]

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کرکے جما دے گا اور ان کے خوف کو وہ امن امان سے بدل دے گا وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں گے اس کے بعد بھی جو لوگ ناشکری اور کفر کریں وہ یقیناً فاسق ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے نیکوکار اہل ایمان سے زمین میں خلافت عطا کیے جانے کا وعدہ فرمایا ہے۔اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ایسے ہی خلافت عطا فرمائی جیسے ان سے پہلے لوگوں کو عطا فرمائی تھی۔ اور ان کے لیے دین اسلام کو مضبوط و محکم کر دیا؛ یہی وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے چن لیا تھا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدہ ۳]

''اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا ہے۔''

[مذکورہ بالا آیت میں دیگر جن امور پر روشنی ڈالی گئی ہے' وہ یہ ہیں]:

۱۔ان کے لیے خوف کو امن سے بدل دیا۔ ۲۔ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔

اس میں دیگر دو استدلال بھی ہیں: ۱۔جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خلافت عطا کی؛ وہ اہل ایمان اور نیک عمل کرنے والے تھے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان ہی لوگوں سے ہے کسی دوسرے سے نہیں۔

۲۔ نیز یہ کہ ان تمام لوگوں کے گناہوں کی مغفرت کردی گئی ہے۔اور ان کے لیے بہت بڑا اجر عظیم تیار کر رکھا ہے' اس لیے کہ یہ لوگ صحیح معنوں میں ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کیے ہیں۔ یہ دونوں آیات صحابہ کرام کو شامل ہیں۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ یہ صفات حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے ادوار کے صحابہ پر منطبق ہوتی ہیں۔جنہوں نے آپ کی بیعت کی؛ وہ ان صفات سے بہرہ ور تھے۔ وہ امارت و خلافت سے بہرہ ور ہوئے، قوت و شوکت نے ان کے قدم چومے؛ خطرات کا ازالہ کرکے ملک میں امن و امان قائم کیا۔ فارس و روم کو زیرنگیں کیا، ان کی فتوحات کا سلسلہ شام و عراق مصر و مغرب و خراسان و آذربائیجان اور افریقہ تک پہنچ گیا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو اس کے بعد فتنہ پردازی کا آغاز ہوا۔بلاد کفار میں فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور رومی اور دوسرے لوگ اسلامی بلاد و امصار کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔حالانکہ اس سے قبل یہ لوگ ڈر کر رہتے تھے۔

پس قرآن کریم حضرات صحابہ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان اور ان کے پرامن دور خلافت و تمکنت میں جو لوگ ان کے ساتھ تھے؛ ان کے ایمان پر دلالت کرتا ہے۔اور وہ لوگ جو اس خلافت و تمکین کے پرامن دور میں موجود تھے' اور پھر انہوں نے فتنہ کے زمانہ کو پایا؛ جیسے: حضرت علی رضی اللہ عنہ طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی اس آیت میں داخل ہیں۔اس لیے کہ انہوں نے زمانہ خلافت پایا' قدرت و شوکت سے بہرہ ور ہوئے' اور امن و امان قائم کیا۔

دوسری جانب اس تفریق اور فتنہ کے دور میں بدعات کا آغاز ہوا اور مختلف فرقے سر اٹھانے لگے؛ مثلاً: روافض جنہوں نے اسلام میں نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔ نیز خوارج جو کہ اسلام سے نکل گئے۔ انہیں یہ نص شامل نہیں ہے۔ پس ان کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جنہیں اس آیت میں ایمان اور عمل صالح سے موصوف کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اولاً: ان لوگوں کا شمار ان صحابہ میں نہیں ہوتا جو اس آیت میں مخاطب ہیں۔ نیز ان کے لیے استخلاف و تمکین اور امن حاصل نہیں ہو سکا جیسا کہ صحابہ کرام کے مبارک دور میں ہوا تھا۔ بلکہ یہ ہمیشہ خوف و دہشت کا شکار اور افراتفری اور بے چینی میں رہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ﴾ [الفتح ۲۹]

''اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک اعمال کیے......''

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمام اہل ایمان سے اس نے وعدہ کیا ہے' جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [النور ۵۵]

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے۔''

[گزشتہ آیت میں] ایسے نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم سب سے وعدہ کرتا ہے؛ جو لفظ بیان جنس کے لیے ہوتا ہے' اس کا تقاضا یہ نہیں ہوتا کہ اسی لفظ کے ساتھ مجرور ہونے والا کلمہ اس سے باہر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ [الحج ۳۰]

''پس بچو گندگی سے جو کہ بتوں کی ہے۔''

تو اس کا تقاضا ہرگز یہ نہیں ہے کہ بتوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو گندے اور پلید نہیں ہیں۔ جب آپ کہیں: ''ثوب من حریر'' ''ریشم میں سے لباس۔'' تو یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کہہ رہے ہوں: ''ثوب حریر'' ''ریشم کا لباس'' اس سے مقصود یہ نہیں کوئی ریشم ایسا بھی ہے جو مضاف الیہ نہ ہو۔

جب لفظ ''مِنْ'' بیان جنس کے لیے آتا ہے؛ تو پھر جملہ مقدر یوں ہوگا کہ: ''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے؛ جو اس جنس میں سے ہیں۔'' یہ جنس تمام نیکوکار مؤمنین کی ہے۔

اور ایسے ہی جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے۔'' یعنی اس جنس اور صنف کے جتنے بھی لوگ ہیں ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ ہے۔

جب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے یہ فرمایا گیا:

﴿وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا﴾ [الأحزاب ۳۱]

''اور تم میں سے جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک عمل کرے گی اسے ہم اس کا اجر دوبار دیں گے اور ہم نے اس کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔''

تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرتی ہو اور نیک اعمال بجا لاتی ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [الأنعام ۵۴]

''اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو فرمادیجیے سلام ہے تم پر، تمھارے رب نے رحم کرنا اپنے آپ پر لازم کرلیا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص جہالت سے کوئی برائی کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو یقیناً وہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس صفت سے موصوف ہو۔ اور یہ کہنا جائز نہیں کہ اگر یہ جہالت سے کوئی برائی کا کام کردیں' اور پھر اس کے بعد توبہ کریں اور نیک اعمال بجالائیں' تو ان میں سے صرف چند ایک کی مغفرت ہوگی سب کی نہیں۔ اسی لیے یہ لفظ ''من'' جب نفی پر آتا ہے تو اس سے مراد جنس کی نفی ہوتیہے۔ جیسا کہ اس فرمان الٰہی ہے:

﴿وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ [الطور ۲۱]

''اور ان سے ان کے عمل میں کچھ کمی نہ کریں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [آل عمران ۶۲]

''اور کوئی بھی معبود برحق نہیں سوائے ایک اللہ کے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ﴾ [الحاقة ۴۷]

''پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔''

اسی لیے جب یہ لفظ کسی جملہ پر تحقیقی یا تقدیری نفی کے لیے داخل ہوتا ہے' تو اس سے پوری جنس کی نفی مراد ہوتی ہے۔ تحقیق کی مثالیں تو وہ ہیں جو گزر چکی ہیں۔ اور تقدیر کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [الصافات ۳۵]

''اور کوئی بھی معبود برحق نہیں سوائے اللہ کے۔''

اور سورت بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾

''اس کتاب کے سچا ہونے میں کوئی شک نہیں۔'' ان کے علاوہ بھی دیگر کئی مثالیں ہیں۔

بخلاف لفظ ''ما'' کے کہ جب لفظ ''من'' موجود نہ ہو۔ جیسا کہ یہ قول ہے: ''ما رأیت رجلاً۔'' ''میں نے کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ ظاہری طور پر یہاں بھی لفظ ''ما'' نفی جنس کے لیے آرہا ہے؛ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مقصود نفی جنس نہ ہو بلکہ نفی عدد کی ہو۔ یعنی میں نے ایک آدمی نہیں دیکھا۔ جیسا کہ سیبویہ کا قول ہے کہ یوں کہنا جائز ہے: ''ما رأیت رجلاً بل رجلین۔'' ''میں نے ایک آدمی کو نہیں دیکھا؛ بلکہ دو آدمی دیکھے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہوا کہ اس سے ایک مراد لینا بھی جائز ہے اگر چہ یہ ظاہر میں جنس کی نفی کے لیے آتا ہے۔

اسی لیے کہتے ہیں: اگر کسی انسان نے اپنے غلاموں سے کہا: ''من أعطاني منكم ألفاً فهو حر'' ''تم میں سے جو کوئی مجھے ایک ہزار دیدے، تو وہ آزاد ہے۔ تو ہر ایک غلام اسے ایک ایک ہزار دیدے؛ تو وہ سب آزاد ہوجائیں گے۔

اور ایسے ہی اگر انسان اپنی بیویوں سے کہے: ''من أبرأتني منكن من صداقها فهي طالق'' تم میں سے جو

کوئی مجھے اپنے مہر سے بری کردے ؛ اسے طلاق ہے۔ پھر اس کی سب بیویاں اسے مہر سے بری کردیں تو ان سب کو طلاق ہو جائے گی۔ اس لیے کہ لفظ ''من'' لگا کر حکم بیان کرنے کا مقصد جنس کا بیان ہے۔ نہ کہ یہ حکم بعض کے لیے ثابت کیا جائے اور بعض کے لیے اس کا انکار کیا جائے۔

اگر کوئی انسان یہ کہے کہ: جیسے یہ بات ممتنع نہیں ہے کہ تمام لوگ اس صفت سے موصوف ہوں' ایسے ہی یہ بھی واجب نہیں ہے کہ تمام لوگ ان صفات کے حامل ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [النور ۵۵]

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے۔''

اس آیت کا تقاضا یہ بھی نہیں ہے کہ تمام لوگ مذکورہ بالا صفات سے متصف ہوں۔

[جواب] ان سے کہا جائے گا: ہاں ؛ ایسے ہی ہے۔ فقط ان الفاظ کی وجہ سے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تمام لوگ ایمان اور عمل صالح سے متصف ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ: لفظ ''من'' اس کے منافی نہیں ہے کہ یہ وصف ان لوگوں کو بھی شامل ہو۔ کوئی یہ بات نہیں کہتا کہ: ﴿محمد رسول الله والذين معه ....﴾ میں خطاب تعریف ان تمام لوگوں کے لیے عام اور شامل ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام کی یہ مدح ان صفات پر ہے جن کا تذکرہ کیا جا چکا۔ یعنی کفار پر سختی ؛ آپس میں رحمت و شفقت ؛ رکوع اور سجدہ کرنا ؛ اللہ تعالیٰ کے فضل و رضامندی کی تلاش ؛ خصوصاً ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات ؛ اور یہ کہ انہوں نے کمزوری سے ابتداء کی اور بتدریج قوت و کمال حاصل کرتے گئے۔ جیسے کہ کاشتکاری میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ صرف ان صفات کی بنا پر نہیں ہے' بلکہ ان کے ایمان اور عمل صالح کی وجہ سے ہے۔ پر اس وجہ سے ان کا تذکرہ ان وعدوں کے مستحق ہونے کی روشنی میں کیا گیا۔ اس لیے کہ یہ تمام لوگ ان صفات سے موصوف تھے۔ اگر ان چیزوں کا ذکر نہ کیا جاتا تو خیال کیا جاسکتا تھا کہ فقط اس ذکر کی وجہ سے یہ لوگ مغفرت اور اجر عظیم کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اور اس میں اس جزاء کا کوئی سبب بیان نہ ہوتا۔ بخلاف اس کے کہ جب ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا جائے۔ اس لیے کہ جب حکم کو کسی مناسب اسم مشتق کے ساتھ معلق بیان کیا جائے تو اس حکم میں اشتقاق کا سبب بھی پایا جاتا ہے۔

☆[اشکال]: باقی رہا یہ سوال کہ منافق بھی اس دور میں بظاہر مسلم ہونے کے دعوی دار تھے؟

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ منافقین میں کوئی اچھا وصف نہ تھا، انہیں رسول اللہ ﷺ اور مومنین صحابہ میں کسی کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل نہ تھا، اور نہ ہی ان میں سے تھے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں:

﴿فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ☆ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ﴾ [المائدۃ ۵۲۔۵۳]

''بہت ممکن ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ فتح دیدے یا اپنے پاس سے کوئی اور چیز لائے پھر تو یہ اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی باتوں پر (بے طرح) نادم ہونے لگیں گے۔ اور ایماندار کہیں گے، کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے مبالغہ سے اللہ کی قسمیں

کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ان کے اعمال غارت ہوئے اور یہ ناکام ہوگئے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ☆وَ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ وَ مَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [العنکبوت ۱۰]

''اور اللہ تعالیٰ ضرور یہ دیکھ کر رہے گا کہ ایمان والے کون ہیں اور منافق کون؟۔اور کافر ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو تو ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھا لیں گے حالانکہ وہ دوسرے کے گناہوں کا کچھ بھی بار نہیں اٹھائیں گے۔یہ سراسر جھوٹے لوگ ہیں۔''

ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ منافقین مؤمن نہیں ہیں' اور نہ ہی ان کا شمار اہل کتاب میں ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی ان لوگوں کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں' ان میں سے اکثر کا تعلق رافضی فرقہ سے ہے۔

پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ منافقین اہل ایمان میں سے نہیں تھے۔منافقین میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جنہوں نے نفاق سے سچی توبہ کرلی تھی۔اس آیت میں ان ہی لوگوں کا بیان کیا گیا ہے:

﴿لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا☆مَّلْعُوْنِیْنَ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا﴾ [الأحزاب۶۰۔۶۱]

''اگر (اب بھی) یہ منافق اور وہ جنہوں کے دلوں میں بیماری ہے اور لوگ جو مدینہ میں غلط افواہیں اڑانے والے ہیں باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان کی (تباہی) پر مسلط کر دیں گے پر تو وہ چند دن ہی آپ کے ساتھ اس (شہر) میں رہ سکیں گے۔ان پر پھٹکار برسائی گئی، جہاں بھی مل جائیں پکڑے جائیں اور خوب ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔''

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو منافقین سے جنگ آزمائی کے لیے آمادہ نہ کیا اور نہ ہی آپ نے عام منافقین کو تہ تیغ کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق اپنے رویہ سے باز آ گئے تھے۔بیعت رضوان میں جد بن قیس کے سوا کوئی منافق موجود نہ تھا اور وہ بھی اونٹ کے پیچھے چھپ گیا تھا[اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کے شرف سے دور رکھا]۔اسی لیے صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

''تمام بیعت کرنے والے جنت میں داخل ہوں گے سوائے سرخ اونٹ والے کے۔''[1]

خلاصہ کلام! منافق صحابہ کے آگے مجبور و بے بس ہوا کرتے تھے، جنگ تبوک کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِیْنَةِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ (المنافقون: ۸)

''اگر ہم مدینہ کو لوٹ کر گئے تو ہم میں سے معزز آدمی ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔اور عزت اللہ،اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے مگر منافقوں کو معلوم نہیں۔''

---

[1] صحیح مسلم ۔ کتاب الامارۃ۔ باب استحباب مبایعۃ الامام الجیش (ح:۱۸۵۶) طبقات ابن سعد(۲/ ۱۰۰)۔

یہ آیت اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہے کہ عزت اہل ایمان کے لیے ہے منافقین کے لیے نہیں ۔اور اصحاب محمد عزت و قوت سے بہرہ ور تھے، اور منافق ان کے درمیان ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔پس یہ بات ممتنع ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جو کہ تمام مسلمانوں میں سب سے بڑھ کر عزت والے تھے؛ ان کا شمار بھی منافقین میں سے ہو۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا ہے کہ جو جتنی زیادہ عزت اور غلبہ والا ہو' وہ اتنا ہی بڑا ایمان دار بھی ہو۔

[[مذکورۃ الصدر آیات میں ذکر کردہ صفات ایک ذلیل اور مقہور و مجبور قوم کی صفات ہی ہو سکتی ہیں، اس کے عین برخلاف سابقین اولین مہاجرین و انصار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور بعد از وفات ہمیشہ باعزت زندگی بسر کرتے رہے، یہ آیات اس امر کی شاہد عدل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باعزت صحابہ رضی اللہ عنہم کسی طرح بھی منافق اور ذلیل و رسوا نہ تھے]]۔

اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ سابقین اولین' مہاجرین و انصار خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والے تھے ۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ منافقین اہل ایمان کے درمیان ذلیل و رسوا تھے ۔پس یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہوسکتا کہ عزت و غلبہ رکھنے والے صحابہ کرام کا شمار منافقین میں ہو۔ اگر یہ وصف کسی پر صادق آتا ہے تو وہ رافضی اور ان کے ہمنوا دوسرے لوگ ہیں جو صحابہ کرام پر معترض رہتے ہیں ۔

منافق کون ہے؟:

سابق الذکر امور و اوصاف کا اصلی مورد و مصدر شیعہ ہیں ۔ذلت و رسوائی میں ان کا شمار ہے، نفاق و تقیہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور کذب بیانی اور جھوٹی قسمیں اٹھانا ان کا سرمایہ افتخار! نفاق اور زندیقیت ہر فرقہ سے بڑھ کر رافضیوں میں موجود ہے۔

نفاق کی بنیاد جھوٹ پر ہے؛ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی زبانوں سے وہ باتیں صادر ہوتی ہیں، جو دل میں نہیں ہوتیں ۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتی ۔ رافضی اسی چیز کو اپنے دین کے بنیادی اصولوں میں شمار کرتے ہیں اور اسے تقیہ کا نام دیتے ہیں ۔ اور اس کے متعلق ائمہ اہل بیت کی طرف من گھڑت حکایات منسوب کرتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس جھوٹ اور دغا بازی سے اہل بیت کو مبرا رکھا ہے ۔

یہاں تک کہ شیعہ امام جعفر صادق رحمہ اللہ پر بہتان طرازی کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:" اَلتَّقِیَّةُ دِیْنِیْ وَدِیْنُ اٰبَائِیْ۔"

''تقیہ میرا اور میرے آباء کا دین ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بیت کو اس سے منزہ اور بے نیاز رکھا تھا اور ان کا دامن اس گند سے پاک تھا۔ وہ لوگوں میں سب سے سچے اور ایمان میں عظیم تر تھے ۔ بنابریں ان کا دین تقویٰ تھا نہ کہ تقیہ ۔فرمان الٰہی ہے:

﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ (آل عمران:۲۸)

''اہل ایمان مومنوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست نہ بنائیں جو ایسا کرے گا تو اللہ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں، البتہ یہ کہ کفار سے بچاؤ حاصل کرو تو الگ بات ہے۔''

یہاں پر اس آیت مبارکہ میں کافروں سے بچنے کا حکم ہے نہ کہ جھوٹ بولنے اور نفاق برتنے کا حکم ۔جس انسان کو مجبور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مباح ٹھہرایا ہے کہ وہ بوقت مجبوری اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دے۔ بشرطیکہ اس

کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔

اہل بیت مقہور و مجبور نہ تھے:

مگر اہل بیت کا معاملہ مختلف نوعیت کا ہے ان کو کسی شخص نے کسی بات پر مجبور نہیں کیا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اہل بیت کو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کیا تھا، اور نہ ہی کسی دوسرے کو اپنی بیعت کے لیے مجبور کیا۔ بلکہ انہوں نے اپنی مرضی سے بخوشی بیعت کی تھی۔ اور نہ ہی حضرت نے کسی کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان کی مدح سرائی کریں اور تعریف و توصیف کے پل باندھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کسی جبر و اکراہ کے ماتحت صحابہ کے فضائل و مناقب نہیں بیان کرتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی کسی بات پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا؛ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ بنوامیہ و بنوعباس کے عہد خلافت میں بہت سے لوگ ایمان و تقویٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فروتر تھے۔ وہ خلفاء میں گوناگوں عیوب و نقائص ملاحظہ کرتے، مگر ان کی مدح و ثناء میں رطب اللسان ہوتے نہ ان کی تعریفوں کے پل باندھتے اور نہ ہی خلفاء جبراً ان سے یہ کام لیتے۔ خلفائے راشدین تو باقی سلاطین کی نسبت جبر و اکراہ سے مبرا اور بالاتر تھے۔

ان [بنوامیہ اور بنوعباس] کے دور میں جب لوگوں کو کسی ایسی بات پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی زبانوں سے ایسی بات کہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ تو پھر خلفاء راشدین کے دور کے متعلق یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے؟ بلکہ [پھر یہ کہا جائے کہ] انہیں جھوٹ بولنے، جھوٹی گواہی دینے اور کفر کا اظہار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا؛ جیسا کہ رافضی کہتے ہیں، حالانکہ انہیں کسی نے ایسا کہنے پر مجبور نہیں کیا۔ تو معلوم ہوا کہ رافضی جس چیز کا اظہار کرتے ہیں وہ جھوٹ اور منافقت کے باب سے ہے۔ وہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ یہ اس باب سے نہیں کہ مؤمن کو کوئی کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ کلمہ کفر کہہ دے۔ بلاد کفار میں جتنے بھی مسلمان قیدی ہیں؛ ان میں سے اکثر اپنے دین کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے ہی خوارج باوجودیکہ جمہور مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں، اور حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما اور ان کے چاہنے والوں کی تکفیر کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود وہ اپنے دین کا اظہار کرتے ہیں۔ جب وہ کسی دوسری جماعت کے ساتھ سکونت پذیر ہوتے ہیں تو وہ [اپنے مسلک کے مطابق] موافقت و مخالفت پر رہائش پذیر ہوتے ہیں۔

[جب کہ اہل سنت میں سے] جو کوئی رافضیوں کے شہروں میں سکونت پذیر ہوتا ہے؛ وہ کبھی بھی رافضیت کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کی حد درجہ انتہاء یہ ہوسکتی ہے کہ جب وہ اپنے مذہب کے اظہار سے عاجز آ جائے تو خاموش رہے۔ اسے صحابہ کرام پر سب و شتم کے اظہار کی نوبت سے پالا نہیں پڑتا۔ ہاں اگر کبھی کہیں پر بہت کم ہی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو۔ [تو یہ دیگر بات ہے]۔

تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے عیال و اطفال کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جاسکتا ہے کہ بھلا اپنے مذہب کے اظہار میں بلاد کفر میں موجود ان قیدیوں سے بڑھ کر؛ یا عام عوام اہل سنت یا نواصب سے بھی ضعیف تر ہو سکتے ہیں۔ اخبار متواترہ کی بنا پر ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کو کسی نے بھی خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی مدح و ستائش پر مجبور نہیں کیا تھا، مگر بایں ہمہ وہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تعریف کرتے، ان کے لیے دعائے رحم فرماتے اور اس پر طرۃ یہ کہ اپنے احباب و خواص کے روبرو یہ سب کچھ بیان کرتے تھے۔ نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے۔''
کہ یہ ان جملہ کا وصف ہے جو کہ ان کی اجتماعیت کی صورت کو متضمن ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح ۲۹]

''ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے مثل اس کھیتی کے جس نے انکھوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ انکی وجہ سے کافروں کو چڑائے۔''

[تو ان سے کہا جائے گا] مغفرت اور اجر عظیم ان میں سے ہر ایک کے لیے حاصل ہوگی۔اس سے لازم آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ان صفات سے موصوف ہو جو اس کا سبب ہیں اور وہ ایمان اور نیک عمل۔اس لیے کہ جملہ لوگوں میں تو کوئی منافق بھی ہوسکتا ہے۔

جملہ طور پر قرآن میں جو کچھ بھی ہے وہ مؤمنین ؛متقین اور محسنین سے خطاب ہے۔نیز ان لوگوں کی تعریف اور مدح سرائی ہے۔وہ [صحابہ] لوگوں میں سب سے پہلی صف کے افراد ہیں جو ان آیات کے خطاب میں شامل ہیں۔اور اس امت میں سے جو لوگ بھی ان آیات کے خطاب میں شامل ہیں' ان میں سے افضل ترین لوگ ہیں۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے کئی اسناد کے ساتھ منقول ہے' آپ نے فرمایا:''بہترین زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔پھر اس کے بعد آنے والے پھر اس کے بعد آنے والے۔''[اس کی تخریج گزر چکی ہے]

دوسری وجہ: شیعہ مصنف کا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے احوال بیان کرنے میں جھوٹ اور تحریف سے کام لینا ہے۔[جیسا کہ وہ کہتا ہے]:

[**اعتراض:**] شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ ''بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بلا استحقاق خلافت کے طالب تھے،اور اکثر لوگوں نے دنیا طلبی کے نقطۂ خیال سے ان کی بیعت کر لی تھی۔''

[**جواب**]: شیعہ مصنف کا یہ اشارہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب ہے۔اس لیے کہ اکثر لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ حق کے ساتھ یا ناحق کسی طرح بھی امارت و خلافت کے طلب گار نہ تھے، آپ نے برملا فرمایا تھا:''میں تمہارے لیے عمر فاروق رضی اللہ عنہ یا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان دو میں سے کسی ایک کو پسند کرتا ہوں۔''

اس کے جواب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''اللہ کی قسم!اگر میں آگے بڑھوں اور آپ میری گردن کاٹ ڈالیں اس سے بہتر ہے کہ میں اس قوم کا سردار بنوں جس میں ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔''[1]

اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:''اے لوگو! مجھے معاف رکھو؛ مجھے معاف رکھو۔'' جب کہ مسلمانوں نے آپ کو ہی اختیار کیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جانتے تھے کہ آپ ان سب میں سے افضل و بہتر ہیں۔جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے موقع پر مہاجرین و انصار کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

''آپ ہمارے سردار ہیں' اور ہم سب سے بہتر ہیں' اور ہم سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو محبوب ہیں''۔

---

[1] یہ الفاظ متفق علیہ ہیں۔صحیح بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب رجم الحبلی فی الزنا، (حدیث:۶۸۳۰) مطولاً۔

صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی اس تقریر کا انکار نہیں کیا۔ یہ روایت بھی صحیحین میں موجود ہے۔
مسلمانوں نے آپ کو خلافت کے لیے بالکل ایسے چن لیا تھا جیسے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ صحیح حدیث میں ہے آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ایک عہد نامہ لکھ دوں تاکہ میرے بعد لوگ اس کے بارے میں اختلاف نہ کریں۔'' پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کریں گے۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر کونی اور تقدیر شرعی ہر لحاظ سے آپ کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور مؤمنین کو آپ کی ولایت اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ آپ کے طلب کیے بغیر انہوں نے آپ کو خلیفہ چن لیا۔

تیسری وجہ : بفرض محال اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ امارت کے طالب تھے اور لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی تھی۔ تو شیعہ کا یہ قول صریح قسم کی دروغ بیانی ہے کہ لوگوں نے طلب دنیا کی بنا پر آپ کی بیعت کی تھی۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں مال دنیا میں سے کچھ بھی نہیں دیا۔ آپ نے آنحضرت ﷺ کے حین حیات اپنا سب مال خرچ کر دیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مال خرچ کرنے کی ترغیب دی تو آپ نے اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا؛ رسول اللہ ﷺ نے آپ سے پوچھا: گھر کیلئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ تو آپ نے گزارش کی: ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو چھوڑ آیا ہوں۔'' [تخریج گزر چکی ہے]۔ [اور خلافت کے دوران آپ خالی ہاتھ تھے۔]

مزید برآں آپ کی بیعت کرنے والے دنیا طلبی سے بے نیاز تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے۔ یہ حقیقت دور و نزدیک سب کو معلوم ہے کہ حضرت عمر، ابوعبیدہ اور ان کے نظائر و امثال رضی اللہ عنہم اجمعین زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھے۔ انصار کے انفاق فی سبیل سے بھی کوئی بے خبر نہیں؛ جیسے حضرت اسید بن حضیر؛ ابوطلحہ؛ ابوایوب اور ان کے امثال؛ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ مزید برآں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت کوئی بیت المال نہ تھا، جس سے آپ ان کو کچھ سامان بہم پہنچاتے۔ اور نہ ہی اس وقت کوئی دیوان تھا جہاں سے لوگوں کے لیے وظیفہ مقرر کیا جاتا۔ انصار اپنی املاک میں موجود تھے۔ ایسے ہی مہاجرین میں سے جس کسی کے لیے مال غنیمت وغیرہ میں سے کچھ موجود تھا' وہ اسی کے لیے تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مال غنیمت کی تقسیم میں مساوات کے قائل تھے۔ اگر صحابہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرتے تو وہ بھی انہیں اسی قدر مال دیتے جتنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عطا کیا تھا حالانکہ آپ کا قبیلہ بنی تمیم سے افضل تھا۔ [مزید برآں آپ کا کنبہ قبیلہ اور چچا زاد بھائی حسب و نسب کے اعتبار سے افضل الصحابہ رضی اللہ عنہم تھے]۔ بنوعبد مناف قریش کے اشرف ترین لوگوں میں سے تھے جو کہ دوسرے لوگوں کی نسبت بنوامیہ کے قریب تر تھے۔ جیسے ابوسفیان بن حرب؛ اور بنی ہاشم جیسے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ تھے۔ ابو سفیان رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ جاہلیت کے دستور کے مطابق امارت بنی عبد مناف میں رہے۔ آپ نے اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بات بھی کی تھی؛ مگر نہ ہی اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مانا نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اور نہ ہی کسی دوسرے نے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اپنے علم و فضل اور دین و مذہب کی بنا پر ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔

غور کیجئے! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے عام لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا؟ خصوصاً جب کہ تنخواہ کے معاملہ میں آپ

سابقین اولین اور ایک عامی میں کچھ فرق نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''لوگ اللہ سے اجر وثواب پانے کی امید میں مشرف باسلام ہوئے ہیں اور وہ انہیں اجر عطا کرے گا، جہاں تنخواہ کا تعلق ہے وہ صرف بقائے حیات کا ذریعہ ہے اور بس''!

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو عطیات میں درجہ بندی کا مشورہ دیا تو آپ نے فرمایا: کیا میں ان سے ان کا ایمان خرید لوں؟۔ مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین وہی لوگ ہیں جنہوں نے پہلے آپ کی اتباع کی۔ جیسے حضرت عمر؛ ابوعبیدہ؛ اسید بن حضیر وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔ آپ نے ان صحابہ کرام اور ان طلقاء کے مابین بھی مساوات قائم کی جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام لائے۔تو کیا پھر ان لوگوں کو آپ کی ولایت وخلافت سے کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا؟ [جس کی بنا پر شیعہ الزام لگا رہا ہے کہ انہوں نے دنیا کی لالچ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی]۔

[چوتھی وجہ:] اہل سنت و شیعہ کا باہمی رابطہ:

ان سے کہا جائے گا کہ: اہل سنت کا شیعہ سے ربط و تعلق بعینہ اسی طرح ہے جیسے مسلمانوں کا نصاریٰ کے ساتھ۔ اہل اسلام ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔مگر نہ ان کی شان میں نصاریٰ کی طرح غلو کرتے ہیں اور نہ یہود کی طرح ان کی تنقیص شان کرتے ہیں۔ نصاریٰ غلو سے کام لیتے ہیں اور حضرت مسیح کو معبود سمجھتے، اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے ہیں۔ مبالغہ آمیزی کی حد یہ ہے کہ نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو رسولوں سے بھی افضل تصور کرتے ہیں۔

شیعہ کا بھی یہی حال ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تائید و نصرت کے لیے لڑنے والوں مثلاً اشترنخعی اور محمد بن ابی بکر کو حضرت ابوبکر و عمر اور سابقین اولین اور جمہور مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مقابلہ میں افضل سمجھتے ہیں۔

نظر بریں ایک مسلم جب نصرانی سے مناظرہ کرے گا تو وہ صرف حق بات ہی کہے گا۔[مگر نصرانی کو اس کی ہرگز پروا نہیں] اگر آپ عیسائی کی جہالت جاننا چاہتے ہوں؛ اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ ان کے پاس کوئی دلیل اور حجت نہیں ہے؛ تو اس کا بہترین مداوا یہ ہے کہ مسلم کی بجائے ایک یہودی نصرانی کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر میدان مناظرہ میں آئے۔ نصرانی یقیناً یہودی کو وہی جواب دے گا جو جواب مسلم دے رہا تھا۔ اگر وہ دین اسلام میں داخل نہ ہوا تو یقیناً یہودی کے ساتھ ہوگا۔ جب عیسائی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے کہا جائے گا اور وہ آپ پر نکتہ چینی کرے گا تو یہودی اس سے کہیں بڑھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کا مرتکب ہوگا۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات کرنے والے دلائل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے دلائل و براہین سے کہیں بڑھ کر ہیں، علاوہ ازیں وہ عیسوی دلائل کی نسبت شکوک و شبہات سے بعید تر ہیں۔

اگر اس پر قدح کرنا جائز ہے جس کی دلیلیں بہت زیادہ [اور صحت میں پختہ] ہیں؛ اور اس کے متعلق شبہات بھی بہت کم ہیں' تو پھر جو اس سے کم درجہ کا ہو وہ اس قدح کا زیادہ حق دار ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں قدح کرنا ناجائز ہے تو پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قدح کرنا بالکل باطل اور ناجائز ہے۔ اس لیے کہ جب مضبوط شبہ زائل ہو جائے تو کمزور شبہ بہت جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ جب کسی کمزور دلیل سے حجت ثابت ہو جائے تو پھر قوی دلیل سے بطور اولیٰ حجت ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے بہت سارے مناظرے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوئے ہیں۔

جس طرح معروف حکایت ہے کہ: جب ابوبکر بن باقلانی رحمہ اللہ سفیر بن کر شاہ روم کے دربار میں قسطنطنیہ پہنچے تو آپ کی عظمت و شان کے پیش نظر رومیوں نے محسوس کیا کہ آپ بادشاہ کو سجدہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ آپ کو ایک چھوٹے سے دروازے سے داخل کیا تاکہ جھک کر داخل ہوں۔ علامہ باقلانی رحمہ اللہ تاڑ گئے اور دربار میں الٹے پاؤں سرین کے بل داخل ہوئے؛ جو کچھ نصاری چاہتے تھے اسکا الٹ کر دیا۔ جب آپ تشریف فرما ہوئے اور عیسائیوں نے آپ سے بات چیت شروع کی۔ ایک رومی مسلمانوں پر تنقید کرتے ہوئے کہنے لگا، تمہارے پیغمبر کی بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔''

یہ واقعہ افک کی جانب اشارہ تھا؛ جیسا کہ رافضی بھی ایسی ہی باتیں کہتے ہیں۔ باقلانی رحمہ اللہ یہ سن کر بولے:

''بیشک دو پاکدامن عورتوں پر بہتان گھڑا گیا' اور ان پر زنا کا جھوٹا الزام لگایا گیا تھا...... اور وہ ہیں حضرت مریم و عائشہ رضی اللہ عنہا۔ حضرت مریم رضی اللہ عنہا دوشیزہ ہی تھیں کہ ان کے یہاں بچہ تولد ہوا۔ مگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا خاوند کے باوجود بے اولاد ہیں۔ نصرانی ہکا بکا رہ گیا، کچھ جواب بن نہ آیا۔ اور اس پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عفت و براءت حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے مقابلے میں نمایاں تر ہے۔ اور یہ شبہ حضرت عائشہ کی نسبت حضرت مریم پر قریب تر ہے۔''

اس کے ساتھ ہی جب حضرت مریم پر بہتان لگانے والوں کا جھوٹ ثابت ہوگیا؛ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام لگانے والوں کا جھوٹا ہونا بدرجہ اولی ثابت ہوتا ہے۔

ایسے ہی اگر فضیلت کے بارے میں دو گروہوں کے مابین مناظرہ ہو۔ ان میں سے ایک گروہ کی بھلائیاں او رخوبیاں زیادہ تھیں' اور برائیاں کم اور چھوٹی تھیں۔ جب ان بھلائیوں میں سے کسی کا تذکرہ کیا جائے تو اس پر مقابلہ میں دوسرے کی بڑی برائیاں گنی جاتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ﴾

''وہ آپ سے حرمت والے مہینے کے متعلق اس میں لڑنے کے بارے میں پوچھتے ہیں، فرما دیجیے اس میں لڑنا بہت بڑا ہے''

پھر فرمایا: ﴿وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ﴾[البقرۃ ۲۱۷]

''اور اللہ کے راستے سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔''

کفار نے مسلمانوں کے ایک سریہ کو عار دلائی تھی اس لیے کہ انہوں نے حرمت والے مہینے میں ابن الحضرمی کو قتل کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: یہ قتل واقعی بڑا [گناہ] ہے۔ اس کے مقابلہ میں مشرکین جس کفر پر ہیں' اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں؛ اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں؛ مسجد حرام سے (روکنا) اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ بڑا ہے اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔'' اس لیے کہ یہ ایسی چیز سے روکنا ہے جس کے بعد نجات اور سعادت حاصل نہیں ہوسکتی۔ نیز مسجد الحرام کی حرمت پامال کرنا حرمت والے مہینہ کی پامالی سے بڑھ کر ہے۔ لیکن اس قسم میں دونوں فریقوں کی مذمت کا عنصر شامل ہے۔

جب کہ پہلی قسم: جس میں دونوں فریقین کی مذمت نہیں۔ بلکہ اس میں دو جگہوں پر شبہ ہے؛ اور دونوں کے پاس دلائل

ہیں ۔ ان میں سے ایک گروہ کے دلائل زیادہ مضبوط اور ظاہر ہیں ۔ اور ان کا شبہ بڑا کمزور اور مخفی ہے۔ تو ان لوگوں کا مسئلہ ثابت ہونے میں ان لوگوں کی نسبت زیادہ حقدار ہے جن کی دلیلیں کمزور ہیں' اور شبہات قوی ہیں ۔ مسلمانوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کا یہی حال ہے۔ اور اہل سنت والجماعت کیساتھ اہل بدعت خصوصاً رافضی بھی اسی ڈگر پر چلتے ہیں ۔

حضرت ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما کی نسبت ایک سنی و شیعہ کا معاملہ بعینہ اسی نوعیت کا ہے ۔ ایک شیعہ اس وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان و عدالت اور دخول جنت کو ثابت نہیں کر سکتا جب تک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے ان کا اثبات نہ کیا جائے ، اگر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ان جملہ امور کا اثبات کرے گا ، اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اس سے مستثنیٰ قرار دے گا تو دلائل و براہین اس کا ساتھ نہیں دیں گے ۔ اسی طرح ایک عیسائی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا اثبات کرے گا تو دلائل اس کی موافقت نہیں کریں گے ۔

خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے اور نواصب آپ کو فاسق قرار دیتے ہیں ؛ اگر جب خوارج و نواصب شیعہ سے کہیں گے کہ : حضرت علی رضی اللہ عنہ ظالم اور خلافت کے خواہاں تھے ، اسی بنا پر وہ شمشیر بکف اپنے اعداء سے لڑتے تھے ۔ آپ نے ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بے بس ہو گئے ۔ رفقاء کار آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے ، انہوں نے آپ کے خلاف خروج کیا' [اور آپ کو کافر قرار دے کر یوم النہروان میں آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے] ۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے آپ کو قتل کر دیا ۔ اگر یہ گفتگو خلاف تہذیب اور مبنی بر فساد ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں روافض کی گستاخی اس سے کہیں بڑھ کر ہے ۔ شیعہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں جو گل افشانی کرتے ہیں اگر وہ درست اور مبنی برحق و صواب ہے تو اس کلام کے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ۔

شیخین کے اوصاف خصوصی :

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت بلا جبر و اکراہ لوگوں کی مرضی سے عمل میں آئی اور استحکام پذیر ہوئی تھی ۔ نہ آپ نے کسی کو [بیعت کی خاطر] مارا ؛ اور نہ ہی کسی پر تلوار چلائی ؛ نہ ہی کسی نے آپ کی نافرمانی کی ؛ اور نہ ہی کو کوئی مال دیا ۔ سب لوگ نے باتفاق آپ کو خلیفہ تسلیم کیا ۔ آپ نے اپنے عزیز و اقارب میں سے کسی کو کوئی عہدہ تفویض نہیں کیا ۔ نہ ہی مسلمانوں کے بیت المال سے اپنے وارثوں کے لیے کوئی مال باقی چھوڑا ۔ بخلاف ازیں اپنا سب اثاثہ اللہ کی راہ میں لٹا دیا ؛ اور اس کا کوئی بدلہ آپ نے نہیں لیا ۔ اور فوت ہوتے وقت یہ وصیت کر دی کہ گھر میں جو کچھ ہے ، سب بیت المال کی نذر کر دیا جائے ۔ گھر میں ایک بوسیدہ چادر ، ایک لونڈی اور ایک اونٹ کے سوا کچھ نہ تھا ۔ [1] یہاں تک حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے کہا : کیا تم یہ بھی آل ابوبکر سے لے لو گے ؟ اللہ کی قسم ! ایسا ہرگز نہیں ہو گا ؛ میں ابوبکر کی قسم پوری کروں گا' اور اس کی قیمت میں ادا کروں گا [اور مال آل ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس کیا جائے] ۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے بارے میں یہاں تک کہا کہ :

''ابوبکر رضی اللہ عنہ ! اللہ آپ پر رحم فرمائے ؛ آپ نے بعد میں آنے والے امراء کو بڑی مشکل میں مبتلا کر دیا ۔'' [2]

---

[1] طبقات ابن سعد (۳/ ۱۳۶)

[2] طبقات ابن سعد (۳/ ۱۳۶)

آپ کے عہد خلافت میں کوئی مسلمان قتل نہیں کیا گیا تھا۔اور نہ ہی کسی مسلمان نے کسی مسلمان سے جنگ کی۔ بلکہ آپ نے مسلمانوں کی معیت میں مرتدین و کفار کے خلاف جنگ لڑی تھی۔آپ کے دور میں بیرونی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب آخری وقت آیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ [1] جیسے نادرۂ روزگار تندرست وتوانا اور صاحب امانت و دیانت کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔[[جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تقرر میں کنبہ پروری، اقربا نوازی اور دنیا طلبی کا کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کی نفع رسانی کی خاطر آپ نے یہ اہم کام سرانجام دیا۔ چنانچہ آپ کی بصیرت وفراست کو سراہا گیا اور آپ کے اس بے پایاں احسان کا شکریہ ادا کیا گیا]]۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف شہر اور ملک فتح کیے، دفتر بنائے، بیت المال کو زر و مال سے بھر دیا اور لوگوں میں عدل و انصاف کو فروغ دیا۔[[بایں ہمہ آپ اسی شاہراہ پر گامزن رہے جس پر قبل ازیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چلا کرتے تھے، عیش پرستی اور نعمت کوشی کی زندگی سے کنارہ کش رہے، اقرباء نوازی سے احتراز کیا تا آنکہ شہادت پا کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے]]۔

ان مسلمہ حقائق کے باوجود اگر ایک شیعہ کہے کہ یہ سب کچھ طلب دنیا اور جاہ طلبی کے جذبہ کے پیش نظر تھا اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما طالب دنیا تھے۔تو ایک ناصبی بڑی آسانی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ [2] کے بارے میں کہہ سکتا ہے کہ آپ ریاست و امارت کے خواہاں تھے اور یہی جذبہ جدال وقتال کا محرک ہوا، یہاں تک کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ آپ کبھی کفار کے خلاف صف آراء نہ ہوئے، اور کبھی ایک شہر بھی فتح نہ کیا۔اور آپ کے عہد میں مسلمانوں کے مابین شر و فتنہ کے علاوہ کسی قسم کا کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

اگر شیعہ یہ کہے کہ حضرت علی طالب رضی اللہ عنہ رضائے الٰہی کے طلب گار تھے [اور دین کے معاملہ میں مداہنت کرنے والے نہ تھے] مگر دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کوتاہی پر تھے۔یا یہ کہا جائے کہ:''آپ مجتہد اور حق پر تھے ؛ اور دوسرے لوگ اس حالت میں خطا کار تھے۔تو بیشک اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ:''حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی رضائے الٰہی کے طلبگار ؛ مجتہد اور حق پر تھے ؛ رافضی بدرجہ اولی ان کے حق معرفت میں کوتاہ اندیش ؛ ان کی مذمت میں خطا کار ہیں۔اس لیے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما

---

[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عمر فاروق، کو''القوی الامین'' کے لقب سے یاد کیا۔حضرت فاروق زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ مصروف تھے، حضرت علی وعثمان رضی اللہ عنہما آپ کی مدد کر رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ آیت سنائی: ﴿ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ ﴾ ۔ سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کا لقب''عبقری''(نادرۂ روزگار) رسول اللہ ﷺ کے خواب سے ماخوذ ہے۔جس کی تفصیلات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہیں، تاریخ کی یہ دو عظیم ترین شہادتیں اسلامی بلکہ اس سے بڑھ کر انسانی عدل و انصاف کی زندہ جاوید مثالیں ہیں، اسلامی تاریخ گویا بزبان حال یوں کہہ رہی ہے:''غیظ وغضب میں گھل گھل کے مرجاؤ، دراصل تم ابوبکر وعمر کے دشمن نہیں ہو بلکہ اس دین اسلام سے عداوت رکھتے ہو جس کے وہ دونوں نمائندہ ہیں، بلکہ یوں کہیے کہ تم اس انسانیت کے دشمن ہو جس کی جانب منسوب ہونے کے تم مدعی ہو۔''

[2] جس طرح اس جاہل نصرانی نے قسطنطنیہ میں امام باقلانی کے روبرو سیدہ عائشہ صدیقہ کی شان میں گستاخی کر کے اپنے اہل مذہب کا منہ چڑایا تھا، اسی طرح شیعہ کا یہ فعل مسلم کامل خلیفہ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے باعث ننگ ہے۔نوع انسانی میں سے چیدہ و برگزیدہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے متعلق شیعہ کا مسلک مقابلہ وموازنہ پر مبنی ہے، حضرت علی اور ان کی اولاد کا مقام اہل سنت کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ ان کو میدان مقابلہ میں کھینچ لائیں، جس طرح انبیاء ورسل کے متعلق ہمارا موقف حسب ارشاد ربانی:''لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ'' عدم تفریق پر مبنی ہے، اسی طرح صحابہ کرام کے متعلق ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے استاد محترم (سرور کائنات ﷺ) نے فرمایا تھا:''أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ'' ''میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم جس کی پیروی کرو گے راہ راست کو پالو گے۔'' (جامع بيان العلم لابن عبد البر(۲/۹۱) الاحكام لابن حزم(۶/۸۲) یہ ضعیف روایت ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ،سلسلة الضعيفة للشيخ الالبانی،ص:۵۸)۔

سے مال و دنیا کی طلب کا شبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت بہت دور کا شبہ ہے۔ خوارج جو کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو کافر کہتے ہیں؛ ان کا شبہ رافضیوں کے شبہ کے قریب تر ہے جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مذمت کرتے ہیں اور انہیں کافر کہتے ہیں۔ تو پھر ان صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق ان کا کیا نظریہ و خیال ہوگا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہے' اور ان سے برسر پیکار رہے۔ خوارج کا شبہ ان لوگوں کے شبہ سے زیادہ قوی ہے جو حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین پر قدح وطعن وتشنیع کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ کہیں: ہم صرف اس کی بیعت کر سکتے ہیں' جو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرے' ظلم سے ہمارا دفاع کرے؛ اور ظالم سے ہمارا حق ہمیں دلائے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پھر یا تو وہ عاجز ہوگا یا ظالم؛ اور ہم پر واجب نہیں ہے کہ ہم ظالم یا عاجز کی بیعت کریں۔

یہ کلام اگر باطل ہے؛ تو جو کوئی حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ظالم اور مال و دنیا کے طلبگار کہتا ہے؛ اس کا کلام سب سے بڑھ کر باطل ہے۔ اس میں کوئی بھی ایسا انسان ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کر سکتا جس کو ادنی معرفت و بصیرت حاصل ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان کا اثبات:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیش رو بھی طلب امارت و ریاست سے پاک تھے]۔ واقعہ تحکیم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ ہر دو کو معزول کرنے اور شوریٰ سے خلیفہ منتخب کرنے میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہم نوا تھے۔ [1]

بتایئے: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے شبہات کو عبداللہ بن سبا اور اس کے نظائر و امثال کے شکوک سے کیا نسبت جن کا دعویٰ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ الٰہ تھے یا معصوم تھے یا نبی تھے۔

بلکہ اس شبہ کا اس شبہ سے کیا تعلق ہے جو لوگ کہتے تھے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیا جائے؛ اور ان لوگوں کا شبہ جو کہتے تھے کہ آپ اِلٰہ یا نبی تھے۔ یقیناً ایسا کہنے والے باتفاق مسلمین کافر ہیں۔

یہ دلائل و شواہد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ ایک رافضی اپنے مذہب کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عدل و ایمان ثابت نہیں کر سکتا، سوائے اس صورت کے کہ وہ اہل سنت والجماعت پر چلتے ہوئے ثابت کرے۔ خوارج جو کہ آپ کو کافر یا فاسق کہتے ہیں؛ اگر وہ رافضی سے کہیں: ''ہم یہ نہیں مانتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مؤمن تھے۔ بلکہ آپ کافر یا ظالم تھے [معاذ اللہ]؛ جیسا کہ رافضی حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کہتے ہیں؛ تو رافضیوں کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان و عدل پر دلیل نہیں ہوگی۔ اگر کوئی دلیل پیش کرے گا تو وہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان پر زیادہ وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہوگی۔

اگر رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسلام اور ہجرت و جہاد کے اثبات میں احادیث متواترہ سے استناد کرے گا تو ایسی متواتر روایات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی موجود ہیں۔ بلکہ معاویہ رضی اللہ عنہ؛ یزید؛ خلفاء بنی امیہ و بنو عباس کا اسلام؛ ان کے روزے؛ نمازیں؛ کفار کے ساتھ جہاد بھی ایسے ہی تواتر کیساتھ ثابت ہے۔

---

[1] قضیہ تحکیم سے متعلق صحیح بات یہی ہے، حضرت ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص اس امر میں متحد الخیال تھے کہ کبار صحابہ کے مشورہ سے خلیفہ منتخب کیا جائے، (العواصم من القواصم: ۱۷۲۔۱۸۱) کے حواشی میں اس کے دلائل پیش کیے ہیں، کتاب ہذا میں اپنے موقع پر ان عظیم حقائق کی نشاندہی کی جائے گی۔

اگر شیعہ کہے کہ صحابہ اندرونی طور پر منافق اور دین اسلام کے معاند و مخالف تھے تو ایک خارجی بڑی آسانی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نفاق کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

اور جب کبھی کسی شبہ کا ذکر کیا جائے تو اس کے جواب میں اس سے زیادہ طاقت ور شبہ پیش کیا جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ان جھوٹے رافضیوں نے جو باتیں گھڑلی ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ وہ کہتے ہیں:

''بیشک ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اندرونی طور پر منافق تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھتے تھے؛ ان سے جتنا ہو سکتا تھا انہوں نے دین کو خراب کیا۔'' تو اس کے جواب میں ایک خارجی بڑے آرام سے کہہ سکتا ہے کہ: آپ اپنے چچا زاد بھائی پر حسد کرتے تھے؛ [اور اس طرح اپنے کنبہ و قبیلہ میں عداوت کے مرتکب ہوتے تھے] علاوہ ازیں آپ دین میں فساد بپا کرنے کے خواہاں تھے۔ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے دور میں آپ ایسا نہ کر سکے؛ یہاں تک کہ آپ نے کوشش کر کے تیسرے خلیفہ کو شہید کروا دیا۔ اور جب مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو خون ریزی کا بازار گرم کیا؛ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور آپ کی امت کو بغض و عداوت کی وجہ سے قتل کرنے میں حد سے تجاوز کر گئے۔ آپ باطن میں منافقین کی محبت رکھتے تھے جو آپ کے نبی یا الٰہ ہونے کے دعویدار تھے۔ آپ اپنے باطن کے خلاف چیز کا اظہار کیا کرتے تھے۔ تقیہ و نفاق کی راہ پر گامزن ہوئے۔ جب ان لوگوں کو آگ میں جلایا تو اس پر انکار بھی کیا۔ اس لیے کہ آپ باطن میں ان کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اسی لیے باطنیہ آپ کے پیرو کاروں میں سے تھے۔ اور آپ کے اسرار انہی کے پاس ہیں؛ اور وہ آپ سے وہ اسرار نقل کرتے چلے آرہے ہیں جسے وہ دین سمجھتے ہیں۔

[[باطنیہ فرقہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی کرنے والے آپ کی جانب وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح پاک ہے]]۔

اس کے جواب میں ایک خارجی بھی ایسا کلام پیش کر سکتا ہے جو لوگوں کے درمیان مشہور کر دیا گیا ہو؛ بلکہ وہ اس کلام سے بڑھ کر ہوگا جو روافض نے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق مشہور کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ خارجی شبہ کی بہ نسبت رافضی شبہ کا فاسد و بیکار ہونا زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔ جب کہ خود خوارج روافض کی بہ نسبت زیادہ صحیح [سچے] اور با مقصد لوگ ہیں؛ اور رافضی سب سے جھوٹے اور دینی لحاظ سے فاسد لوگ ہیں۔

اگر رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایمان و عدل قرآنی نصوص سے ثابت کرنا چاہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ قرآنی نصوص عام ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ان کا شمول کسی دوسرے صحابی کے شمول سے بڑھ کر نہیں ہے۔

علیٰ ہذا القیاس شیعہ جس آیت کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مختص تصور کرتے ہوں بڑی آسانی سے اس آیت کو ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف بغیر دلیل کے دعویٰ کرنا کچھ بھی مشکل نہیں، فریقین کے لیے اس کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ [دلیل کی روشنی میں] حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کا دعویٰ دوسرے کسی بھی دعویٰ کی بہ نسبت زیادہ ممکن ہے۔

اگر شیعہ اقوال و آثار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب ثابت کریں تو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں وارد شدہ آثار اکثر و اصح ہیں۔ اور اگر شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل پر تواتر کا دعویٰ کریں؛ تو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں وارد تواتر زیادہ صحیح تر ہے۔ اگر شیعہ نقل صحابہ کا دعویٰ کریں تو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی شان میں منقول آثار بہت زیادہ ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ شیعہ دعویٰ کرتے ہیں سوائے چند افراد کے باقی تمام صحابہ مرتد ہو چکے تھے۔ تو پھر ان کے اس قول کے

مطابق ان میں سے کسی ایک کی روایت کسی صحابی کے فضائل ومناقب میں کیونکر قابل اعتماد ہوسکتی ہے۔ اور رافضیوں میں کوئی زیادہ صحابی نہیں تھے جن سے تواتر کیساتھ نقل کریں[بلکہ رافضیوں میں کوئی صحابی نہیں تھا جس سے یہ روایت نقل کریں]۔

ان کے ہاں نقل روایت کے تمام طرق منقطع ہیں۔ اگر یہ لوگ اہل سنت کی راہ پر نہ چلیں تو کوئی روایت پیش ہی نہ کرسکیں۔ جیسے نصاری اگر مسلمانوں کی روش اختیار نہ کریں تو ان کے لیے حضرت عیسی علیہ السلام کی نبوت کو ثابت کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فقیہ تھے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ فقیہ نہ تھے۔ یا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فقہیات کے عالم تھے اور عمر رضی اللہ عنہ فقہ سے نابلد تھے۔ یا حضرت علقمہ و اسود رضی اللہ عنہما تو فقیہ تھے؛ مگر عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فقہ نہیں جانتے تھے۔ یا اس طرح کسی چیز کے لیے وہ حکم ثابت کرنا جو اگر کم تر درجہ چیز میں ثابت کیا جائے تو اس سے بڑے درجہ میں خود بخود ثابت ہوجائے۔ یہ تناقض کا مسلک اہل علم وعدل کے ہاں ممتنع ہے۔[یہ ظلم وجہل کی راہ ہے اور شیعہ اسی راہ کے سالک ہیں]۔ رافضی لوگوں میں سب سے بڑے گمراہ اور جاہل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عیسائی لوگوں میں سب سے بڑے جاہل ہیں۔ اور رافضی لوگوں میں سب سے زیادہ خبیث النفس لوگ ہیں جیسے یہودی لوگوں میں سب سے بڑھ کر خبیث النفس ہوتے ہیں۔ ان میں عیسائیوں کی گمراہی اور یہودیوں کی خباثت پائی جاتی ہے۔

پانچویں وجہ: جہاں تک عمر بن سعد کی پیش کردہ مثال کا تعلق ہے جو کہ حرام مال ومرتبہ کا طلبگار تھا؛[عبیداللہ بن زیاد نے اسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے لڑنے یا اپنے منصب سے الگ ہوجانے کا اختیار دیا تھا] یہ قیاس کی بدترین قسم ہے۔[اس لیے کہ عمر بن سعد جاہ طلبی اور محرمات کا مرتکب ہونے میں مشہور ومعروف تھا] یہ مثال پیش کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ (نعوذ باللہ من ذالک) سابقین الاولین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اسی کی مانند تھے۔

عمر بن سعد کے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بہت بڑے فاتح تھے تاہم امارت وریاست سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ تھی، جب مسلمانوں میں فتنہ پردازی کا آغاز ہوا تو آپ اپنے محل میں گوشہ نشین ہوگئے جو عقیق نامی جگہ میں واقع تھا۔

آپ کا بیٹا عمر بن سعد خدمت میں حاضر ہو؛ آپ کو ملامت کرنے لگا' اور کہنے لگا: ''لوگ سلطنت وحکومت کے بارے میں لڑ جھگڑ رہے ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ہیں۔'' آپ بولے: ''اپنی راہ لیجئے! میں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِیَّ الْخَفِیَّ الْغَنِیَّ)) [1]

''اللہ تعالیٰ متقی گمنام اور بے نیاز آدمی کو پسند کرتے ہیں۔''

اہل شوری میں سے صرف حضرت علی اور سعد رضی اللہ عنہما باقی رہ گئے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے سرزمین عراق کو زیرنگیں کرکے کسریٰ کے لشکر کو نیچا دکھایا تھا۔ آپ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے ایک تھے، اور سب سے آخر میں فوت ہوئے۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے بیٹے عمر بن سعد کا مشابہ قرار نہیں دے سکتے تو حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اس کی مثل کیوں کر ہوئے؟

مقام حیرت ہے کہ شیعہ کے نزدیک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے محمد بن ابی بکر رحمہ اللہ کے ہم پلہ نہ تھے۔ بلکہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ان سے بلند تر تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایذا پہنچائی تھی اور

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الزھد۔ باب الدنیا سجن للمؤمن۔ (حدیث:۲۹۶۵)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تربیت یافتہ ہونے کی بنا پر وہ آپ کے خاص اعوان و انصار میں شمار ہوتا تھا۔ [1] مگر شیعہ محمد کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے اور لعنت تک بھیجنے سے نہیں شرماتے۔ [2]

اگر نواصب عمر بن سعد کے ساتھ یہی سلوک کریں یعنی قتل حسین رضی اللہ عنہ کی بنا پر اس کی مدح و ستائش کریں اس لیے کہ وہ حامیانِ عثمان رضی اللہ عنہ میں سے تھا اور ان کا قصاص لینا چاہتا تھا۔ اس کی دوش بدوش وہ عمر بن سعد کے والد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس لیے برا بھلا کہیں کہ وہ عملی طور پر قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والوں یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کے ساتھ شریک جنگ نہ ہو سکے، تو ان کے اس فعل اور شیعہ کے فعل میں کچھ فرق نہ ہوگا، بلکہ شیعہ کا فعل نواصب کے فعل سے شنیع تر ہوگا۔ اور رافضی ان سب سے بڑھ کر برے ہوں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مرتبہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بلند تر تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بھی قتل کیے جانے کا کم استحقاق رکھتے تھے۔ تاہم دونوں کے مظلوم اور شہید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی بنا پر امت اسلامیہ جس فتنہ سے دوچار ہوئی وہ قتل حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت عظیم تر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سابقین اولین صحابہ میں سے تھے، آپ خلیفہ مظلوم تھے، بلا وجہ آپ سے معزول ہونے کے لیے کہا گیا تھا، جس کے لئے آپ تیار نہ تھے، آپ نے مدافعت کے لیے جنگ بھی نہ کی اور شہادت سے مشرف ہوئے۔ [3]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ امیر و خلیفہ نہ تھے، البتہ خلافت کے طلب گار تھے۔ جب یہ بات مشکل نظر آئی اور آپ سے کہا گیا کہ آپ ایک قیدی کی حیثیت میں یزید کے روبرو پیش ہوں گے تو آپ نے یہ گوارا نہ کیا اور دشمن کے خلاف صف آرا ہوئے، یہاں تک کہ بحالت مظلومی شہادت سے بہرہ ور ہوئے۔ [4]

یہ واقعات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت مظلوم تر تھے اور آپ کا صبر و حلم بھی مقابلۃً اتم و اکمل تھا۔ تاہم دونوں کا مظلوم اور شہید ہونا کسی شبہ سے بالاتر ہے، اگر کوئی شخص یوں کہے کہ حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما حکومت و امارت کے اسی طرح ناحق کے طلب گار تھے جیسے اسماعیلیہ میں سے الحاکم وغیرہ اور دیگر سلاطین بنی عبید۔ [5] تو ایسا شخص بلا شک و شبہ دروغ گو اور مفتری ہوگا، اس لئے کہ حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما ہمارے نزدیک اعلیٰ

---

[1] سیدنا علی نے صدیق اعظم کی وفات کے بعد ان کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا، محمد بن ابی بکر اسی بیوی کے بطن سے آپ کا لے پالک تھا۔

[2] ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتب کے حوالہ سے تحریر کر چکے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو "الجبت" (جادوگر، شیطان) اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو "الطاغوت" (باغی، سرکش) کے القاب سے نوازتے ہیں، جب تاریخ انسانیت میں عدل و انصاف کے ایک مثالی کردار فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو..... جن کی بدولت اسلام کا نام روشن ہوا تھا..... طاغوت کہا جاتا ہے تو باقی لوگوں کی کیا حالت ہوگی، دراصل یہ لوگ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی توہین کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ اس اسلام کی مذمت بیان کرتے ہیں، جو ان دونوں حضرات کے طفیل اکناف ارضی میں پھیلا، یہی وجہ ہے کہ شیعہ نے ایک ایسا دین گھڑ لیا ہے جس سے ابوبکر و عمر عثمان و علی، حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے خلاف آشنا ہی نہ تھے۔ دیکھئے کتاب "مختصر التحفة الاثنا عشرية۔"

[3] شہادت عثمان کے لیے دیکھئے، (کتاب العواصم من القواصم مع التعليقات: ٥٢ تا ١٤٧)

[4] شہادت حسین کے لیے دیکھئے مقالہ محب الدین الخطیب جس کا عنوان ہے: "مَنْ هُمْ قَتَلَةُ الْحُسَيْنِ" (سیدنا حسین کے قاتل کون تھے؟) مجلہ الفتح شمارہ: ۸۵۱، محرم ۱۳۶۷ھ

[5] بنی عبید کے مذہب اور ان کی تاریخ نشو و ارتقاء کے لیے دیکھئے ہمارا مقالہ مجلہ الازہر (م ٢٥ / ٥ جمادی الاول ١٣٧٣ھ: ٦١٢، ٦٣١) مقالہ کا عنوان ہے: "مَنْ هُمُ الْعُبَيْدِيُّوْنَ"

درجہ کے مومن تھے۔ان کی دینداری اور فضیلت مسلمہ ہے۔جب کہ اسماعیلیہ ان کے مقابلہ میں منافق اور ملحد تھے۔اسماعیلیہ وغیرہ کافر اور ملحد ہیں۔

علی ہذا القیاس جو لوگ حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما کو ان جھوٹے طلب گاران خلافت کی مثل قرار دیتے ہیں جو بنی طالب میں پیدا ہوئے یا وقتاً فوقتاً سرزمین حجاز اور دیگر بلاد و امصار میں سر اٹھا کر ناحق لوگوں کی جانیں تلف کرتے اور مال چھینتے رہے، تو کیا ایسے لوگ ظالم و کاذب نہ ہوں گے؟ یقیناً وہ جھوٹے ہوں گے۔نظر بریں جو شخص حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو عمر بن سعد کا مماثل قرار دیتا ہے، اس کا ظلم و کذب سابق الذکر سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

پھر عمر بن سعد اگرچہ نیکی کے تصور سے کوسوں دور تھا، تاہم اس کے جرم کی انتہاء یہ تھی کہ وہ گناہ کے ساتھ دنیا کا طلب گار تھا؛ اور اسے اپنے اس عظیم گناہ کا اعتراف تھا۔اس طرح کے بہت سے گناہ مسلمانوں میں واقعہ ہوتے رہتے ہیں۔

ملحدین کی ریشہ دوانیوں کا سبب رافضی حماقتیں:

بہت سارے شیعہ اپنی گندی کاروائیوں کے متعلق اعتراف کرتے ہیں کہ اس سے ان کا مقصد ملک حاصل کرنا' دین میں خرابی پیدا کرنا اور محمد ﷺ سے بغاوت [و دشمنی] اور سرکشی کرنا تھا۔ جیسا کہ بہت سارے باطنیہ اور دیگر شیعہ گروہوں کی تحریروں اور خطابات سے ظاہر ہوتا ہے۔ان کا یہ اعتراف رہا ہے کہ وہ حقیقت میں اسلام پر یقین نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو شیعہ اس لیے ظاہر کرتے ہیں کہ شیعہ کی عقل بہت کم اور ان جہالت بہت زیادہ ہوتی ہے؛ لہٰذا ان کو استعمال کرتے ہوئے اپنے مقصود تک پہنچنا بہت آسان ہوتا ہے۔ان کا سب سے پہلا فرد' بلکہ ان کا سب سے بہترین مختار بن عبید ثقفی تھا۔ جو کہ شیعہ کا امیر تھا۔اس نے عبید اللہ بن زیاد کو قتل کیا۔اس نے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے انتقام کا نعرہ لگایا۔اس ذریعہ سے اس نے محمد بن الحنفیہ اور دیگر اہل بیت کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کی۔پھر اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔اس کا دعویٰ تھا کہ جبریل میرے پاس وحی لے کر آتا ہے۔صحیح مسلم میں سرور کائنات ﷺ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''قبیلہ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک سفاک (ناحق خون بہانے والا) ہوگا۔'' [1]

آپ کے ارشاد گرامی کے مطابق ثقیف کا کذاب مختار بن ابی عبید تھا اور سفاک حجاج بن یوسف ثقفی۔

روافض نواصب کی نسبت بدتر ہیں:

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ عمر بن سعد جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والی فوج کا سپہ سالار تھا۔ظالم اور طالب دنیا ہونے کے باوصف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حامی اور ان کے قاتلوں کے قاتل مختار بن ابی عبید سے زیادہ گناہ گار نہ تھا جس کا کہنا تھا کہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قصاص کا طالب ہے۔اور اس نے قاتلین حسین کو قتل کیا۔ بلکہ عمر بن سعد کے مقابلہ میں مختار گناہ گار اور کاذب تر تھا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیعہ مختار، عمر بن سعد ناصبی سے بدتر تھا۔اسی طرح حجاج بن یوسف بھی مقابلۃً مختار سے بہتر تھا۔حجاج کا جرم یہ تھا کہ وہ ناحق خونریزی کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں خبر دی تھی کہ وہ ناحق خون بہانے والا ہوگا۔اس کے مقابلہ میں مختار وحی کا دعویدار تھا اور کہا کرتا تھا کہ مجھ پر جبریل امین نازل ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ نزول وحی کا دعویٰ قتل نفوس سے عظیم تر ہے۔ یہ کفر ہے اور اگر مختار اس سے تائب نہیں ہوا تھا،

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرھا (حدیث: ۲۵٤۵)۔

تو وہ یقیناً مرتد تھا۔ فتنہ پردازی یوں بھی قتل سے عظیم تر جرم ہے۔ یہ سلسلہ یہاں ہی ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک وسیع باب ہے جائز یا ناجائز شیعہ جس کی بھی خدمت کرتے ہیں ان میں اس سے بھی بدتر آدمی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح شیعہ جس کی مدح وثنا کرتے ہیں ان کے حریف خوارج میں اس سے بہتر آدمی پائے جاتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ روافض اپنے حریف نواصب سے بدتر ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ شیعہ جن کو کافر و فاسق قرار دیتے ہیں، وہ ان لوگوں کی نسبت افضل ہیں جو نواصب کے نزدیک کافر و فاسق ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق اہل سنت کے عقائد کا خلاصہ:

اہل سنت کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ جملہ اہل ایمان سے الفت و محبت کا سلوک کرتے ہیں اور گفتگو میں علم عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہ جہالت زدہ اور اہل اہواء میں سے نہیں۔ وہ روافض و نواصب دونوں سے بیزار ہیں۔ ان کے افکار و معتقدات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ اہل سنت سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت رکھتے ہیں۔

۲۔ اہل سنت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مناقب و فضائل کے قدردان ہیں۔

۳۔ اہل سنت اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کے ان جائز حقوق کی نگہداشت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان کیے ہیں۔

۴۔ اہل سنت مختار ثقفی جیسے کذاب اور حجاج جیسے ظالم و سفاک کے رویہ کو پسند نہیں کرتے۔

۵۔ اس کے ساتھ ہی سابقین اولین کے مراتب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما افضل الصحابہ ہیں۔ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما یا کوئی اور صحابی اس فضیلت میں ان کا حصہ دار و شریک نہیں ہوسکتا۔

قرن اول میں یہ عقائد و افکار متفق علیہ تھے۔ شاذ و نادر کسی کو اختلاف ہو تو اور بات ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ قرن اول کے شیعہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء و احباب حضرت صدیق اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی عظمت و فضیلت میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بتواتر یہ روایت ثابت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے:

((خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ))[1]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر و عمر اس امت میں سب سے افضل ہیں۔''

تاہم شیعان علی میں سے ایک جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیتی تھی۔ مگر یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہل سنت حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی افضلیت میں یک زبان تھے۔ امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد رحمہم اللہ اور دیگر متقدمین و متاخرین محدثین، مفسرین، اہل فقہ و اہل زہد سب یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ البتہ حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی افضلیت میں اہل مدینہ کی ایک جماعت توقف کرتی تھی۔ امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ اہل کوفہ کی ایک جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل تھے۔ بعد ازاں حضرت ایوب سختیانی رحمہ اللہ سے ملنے کے بعد اس مسلک سے رجوع کرلیا تھا حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ بعد ازاں فرمایا کرتے تھے:

---

[1] سنن ابن ماجه۔ المقدمة۔ باب فضل عمر بن الخطاب رضی الله عنه (ح: ۱۰٦) ، مسند احمد (۱/ ۱۰٦)۔

''جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے افضل قرار دیا اس نے مہاجرین وانصار پر عیب لگایا۔''

اہل سنت کے سب ائمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دیتے ہیں۔ جمہور محدثین کا نظریہ یہی ہے۔نص اجماع اور قیاس بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔بعض متقدمین سے جو منقول ہے کہ وہ حضرت جعفر اور طلحہ رضی اللہ عنہما کو افضل قرار دیتے ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہر لحاظ سے افضل تھے؛ بلکہ بعض خصوصیات کے اعتبار سے ان کو جزوی فضیلت حاصل تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کو افضل قرار دینے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ بعض خصوصیات کی بنا پر جزوی فضیلت کے حامل تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں جاہل اور ظالم کی رافضی تقسیم:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا کہنا ہے کہ:''بعض صحابہ پر حق مشتبہ رہا اور طلب دنیا کے نقطہ خیال سے بیعت کر لی تھی۔''

۲۔ بعض اہل سنت شبہات کا شکار ہو کر دنیا دار لوگوں کے پیچھے چلنے لگے تھے۔کوتاہ بینی کی بنا پر انہیں حق تک رسائی حاصل نہ ہو سکی، اور گرفت الٰہی کے مستوجب ٹھہرے۔اس لیے کہ انہوں نے غور وفکر نہ کر کے یہ حق غیر مستحق کے سپرد کر دیا تھا۔

۳۔ بعض لوگ کوتاہ فہمی کی بنا پر مقلد محض ہو کر رہ گئے اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید کثرت افراد حق وصداقت کی علامت ہے،اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کی بیعت کر بیٹھے اور اس آیت کو یکسر نظر انداز کر دیا:﴿ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ﴾ (ص ۲٤)

''وہ (حق پرست) کم ہی ہوتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سبا ۱۳]

'''اور میرے بندوں میں سے بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہیں۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب]: ان سے کہا جائے گا: اس مفتری وکذاب نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو تین گروہوں میں منقسم کیا ہے:

۱۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا کے طلب گار تھے۔

۲۔ ایک گروہ کے لوگ کوتاہ بین تھے اور دور اندیشی سے محروم تھے۔

۳۔ صحابہ کی تیسری قسم عاجز اور بے بس تھی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین گروہوں میں تقسیم ہونے کی وجہ و محرکات واسباب بقول شیعہ مصنف مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ قصد ونیت کی خرابی۔

۲۔ جہالت۔پھر جہالت کے دو اسباب ہیں:

۱۔کوتاہ بینی، ۲۔عجز وقصور۔

❀ پھر شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ:''بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیعت کرتے وقت کوتاہ بینی سے کام لیا تھا۔اگر وہ غور وفکر سے کام لیتے تو حق وصداقت کو پہچان لیتے۔اس غور فکر کے ترک کرنے پر ان سے مؤاخذہ ہو گا۔بعض لوگ کوتاہ فہمی کی بنا پر مقلد محض ہو کر رہ گئے اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر یہ سمجھے کہ شاید کثرت افراد حق وصداقت کی علامت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انہی کی بیعت کر بیٹھے۔''

اس سے شیعہ مصنف کا مقصد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے اسباب کی جانب اشارہ کرنا ہے۔

[**جواب**]: اس شیعہ سے کہا جائے گا کہ: ''یہ صریح قسم کی دروغ گوئی ہے جس میں کوئی اشکال نہیں۔اور ہر شخص بڑی آسانی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ روافض کی قوم حیرانی و سرگردانی کا شکار رہتی ہے۔ چنانچہ اس افتراء پرداز سے اگر اس کی دلیل طلب کی جائے تو وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بلا دلیل کوئی بات کہنے کو حرام قرار دیا ہے خصوصاً جب کہ حق بیان کردہ بات کے خلاف ہو۔ اگر ہم صحابہ کے حالات سے نابلد ہوتے تو بھی بلا ثبوت ان کو بدارادہ اور جاہل قرار دینا روا نہ تھا، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾

''جس بات کی آپ خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑیے کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔'' (الاسراء ٣٦)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ﴾ (آل عمران ٦٦)

''تم وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسی باتوں میں تکرار کی جن کا تمہیں علم تھا، تو پھر ایسی باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں علم ہی نہیں۔''

جب ہمیں معلوم ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم علم و عقل اور دین و مذہب کے اعتبار سے امت محمدی کے کامل ترین افراد تھے تو پھر اس کے برعکس خیالات کا اظہار کرنا کیوں کر روا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جو کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہو تو وہ اس شخص کے نقش قدم پر چلے جو فوت ہو چکا ہو۔ اس لیے کہ زندہ شخص کے مبتلائے فتنہ ہونے کا خطرہ دامن گیر رہتا ہے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اس امت میں سب سے افضل، نیک دل، عمیق العلم اور تکلف و تصنع سے پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت و رفاقت اور دین اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے منتخب کیا تھا۔ لہٰذا ان کی فضیلت کا اعتراف کیجئے، ان کے نقش قدم پر چلئے، دین و مذہب اور اخلاق و عادات میں ان کی پیروی کیجئے، کیونکہ وہ صراط مستقیم پر گامزن تھے۔''[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں:

''اللہ کریم نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو سب سے افضل پایا؛ چنانچہ اسے اپنے لیے مخصوص کرلیا۔ پھر بندوں کے دلوں کو دیکھا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے دلوں کو سب سے افضل پایا اور انہیں اپنے نبی کے وزیر بنا دیا؛ جو اس کے دین کی خاطر لڑتے ہیں۔ جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جسے وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔''[2]

---

[1] مشکاۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ(ح:١٩٣)جامع بیان العلم لابن عبد البر(٢/ ٩٧) الهروی (ق:٨٦/ ١)۔

[2] مستدرک حاکم(٣/ ٧٨۔٧٩) ، مسند احمد(١/ ٣٧٩)وقال الهيثمي : رواه أحمد و البزار ' و الطبراني في الكبير مجمع الزوائد ١/ ١٧٧۔

یہ روایت ابن بطہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کی ہے اور دیگر محدثین کے یہاں یہ روایت زر بن حبیش سے مروی ہے۔
ایک روایت میں ہے کہ اس اثر کے راوی ابو بکر بن عیاش فرماتے ہیں: ''عاصم بن ابی النجود نے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی صواب دید سے خلیفہ بنایا تھا۔''
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں سب سے افضل ، نیک دل، عمیق العلم اور تکلف وتصنع سے پاک تھے۔''ایک جامع کلام ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے حسن قصد ، نیت اور دلوں کی نیکی کا بیان ہے۔ نیز یہ بھی بیان ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کمال معرفت و دقت اور گہرے علم کی نعمت سے سرفراز تھے۔ اور آپ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے: صحابہ کرام بلا علم بات کہنے اور تکلف کرنے سے بہت ہی دور اور پاک تھے۔
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذکورہ بالا ارشاد اس جاہل مصنف کے ان دعاوی کے عین برخلاف ہے کہ حضرات صحابہ طالب دنیا، جاہل اور حق کی تلاش سے قاصر تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کامل العلم اور نیک دل تھے، اور ان کا زمانہ سب زمانوں سے بہتر تھا۔ یہ بات تواتر کے ساتھ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''بہترین زمانہ وہ ہے جس میں میں مبعوث کیا گیا ہوں۔ پھر اس کے بعد آنے والے' پھر ان کے بعد آنے والے۔''
[اس کی تخریج گزر چکی ہے۔]
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس امت وسط کے بہترین لوگوں میں سے ہیں جو کہ سابقہ امتوں پر گواہی دیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اختلاف میں راہِ حق کی طرف ہدایت دی۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ پس یہ جماعت نہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں اور جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا؛ اور نہ ہی گمراہ اور جاہلین میں سے تھے۔ جس طرح کہ جاہل شیعہ نے انہیں گمراہوں اور سرکش باغیوں میں تقسیم کیا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ لوگ کمال علم اور جمال قصد کی نعمت سے مالا مال تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اس سے یہ لازم آتا کہ نہ ہی یہ امت دوسری امتوں سے بہتر ہے' اور نہ ہی خود بہترین امت ہے۔ یہ دونوں باتیں کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔
مزید برآں عقلی قیاس بھی اس چیز پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی اگر امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال پر غور وفکر کرے اور اس کے ساتھ ہی یہود و نصاری ؛ مجوس ومشرکین اور صابئین کے احوال پر بھی نظر فکر و عبرت ڈالے تو اس کے لیے باقی امتوں پر اس امت کی فضیلت علم نافع کے اعتبار سے ؛عمل صالح کے لحاظ سے دیگر ہر اعتبار سے واضح ہو جائے گی۔ یہ ایک لمبا موضوع ہے جس کی تفصیل بیان کرنے کا موقع یہ نہیں۔
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس امت کے کامل ترین لوگ ہیں۔ اس پر کتاب وسنت' اجماع امت اور قیاس سے دلائل موجود ہیں۔ اسی لیے آپ کو اکابرین امت میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جو اپنے آپ اور اپنے امثال پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی عظمتوں اور فضیلتوں اور برتری کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ اور آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اس بارے میں جھگڑا کرتے ہیں۔ جیسے رافضی۔ وہ لوگوں میں سب سے بڑے جاہل ہیں۔ اسی لیے آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ فقہ وحدیث' زہد وعبادت میں کوئی امام ایسا نہیں ہے جس کی طرف رافضی رجوع کرتے ہوں۔ اور نہ ہی کوئی کامیاب مسلمان جرنیل یا حکمران

رافضی ہوا ہے۔کوئی مسلمان بادشاہ ایسا نہیں گزرا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو دین اسلام کی نصرت کی ہو اور دین اسلام کو اللہ کی زمین پر نافذ کیا ہو اور اس کا تعلق رافضیوں سے ہو۔اور نہ ہی وزراء میں کوئی اچھی سیرت و کردار کا حامل انسان ایسا گزرا ہے جو کہ رافضی ہو۔

آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ رافضہ میں اکثر لوگ یا تو زندیق' منافق اور ملحد ہوتے ہیں' یا پھر پرلے درجے کے جاہل جنہیں نہ ہی منقولات کا کوئی علم ہوتا ہے اور نہ ہی معقولات کا۔یہ لوگ وادیوں اور پہاڑی علاقوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں ۔مسلمانوں پر جبر و ستم کرتے ہیں۔اہل علم و دین سے مجلس نہیں کرتے؛ سوائے اس صورت کے کہ کوئی انہی جیسا خواہش پرست ہو جس سے انہیں کچھ امیدیں وابستہ ہوں۔یا پھر کسی کیساتھ اس لیے بیٹھتے ہیں کہ وہ ان کے نسب کا ہو؛ اور اس کے ساتھ نسبی تعصب کے لیے بیٹھتے ہیں؛ جو کہ اہل جاہلیت کا طریقہ ہے۔

جو کوئی اہل علم و دین سے مجلس رکھنے والا مسلمان ہو' وہ رافضی نہیں ہوسکتا۔شیعہ مصنف کا یہ بیان اس کی جہالت و تشیع کی غمازی کرتا ہے۔ہم اس سے محفوظ و مصئون رہنے کے لیے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں، اس لیے کہ تشیع بدترین فرقوں مثلاً: نصیریہ، اسماعیلیہ، ملاحدہ، اہل الجبل اور قرامطہ کا ملجا و ماویٰ ہے۔ظاہر ہے کہ یہ فرقے علم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ان [کی رگ رگ] میں کذب' خیانت؛ وعدہ خلافی اور نفاق کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''منافق کی تین علامتیں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت کرے۔'' [صحیح مسلم: کتاب الایمان' باب منافق کی نشانیوں کا بیان؛ ح:213]

اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی زیادہ ہیں: ''اور اگرچہ وہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔'' اہل قبلہ میں سے یہ تین نشانیاں جس گروہ میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں' وہ رافضہ کا گروہ ہے۔

مزید برآں اس جھوٹے کذاب مصنف سے کہا جائے گا: ''تصور کیجیے کہ جن لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بیعت کی؛ تو وہ تمہارے قول کے مطابق یا تو دنیا کے طلب گار تھے؛ یا پھر جاہل۔اور ان کے بعد کی صدیوں میں ایسے لوگ بھی آئے جو ان میں سے ہر ایک کی طہارت و ذکاوت کو جانتے تھے۔جیسے حضرت: سعید بن المسیب؛ حسن البصری؛ عطاء ابن ابی رباح؛ ابراہیم النخعی؛ علقمہ؛ اسود؛ عبیدہ سلیمانی؛ طاؤس؛ مجاہد؛ سعید بن جبیر؛ ابوالشعثاء؛ جابر بن زید؛ علی بن زید؛ علی بن الحسین؛ عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ؛ عروۃ ابن زبیر؛ قاسم بن محمد بن ابوبکر؛ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث؛ مطرف بن شخیر؛ محمد بن واسع؛ حبیب العجمی؛ مالک بن دینار؛ مکحول؛ حکم بن عتبہ؛ یزید بن ابی حبیب رحمہم اللہ؛ اور ان کے علاوہ اتنی بڑی تعداد میں ہیں جن کی صحیح گنتی کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

پھر ان کے بعد ایوب السختیانی؛ عبداللہ بن عون؛ یونس بن عبید؛ جعفر بن محمد؛ الزہری؛ عمرو بن دینار؛ یحیی بن سعید الأنصاری؛ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن؛ ابوالزناد؛ یحیی بن ابی کثیر؛ قتادہ؛ منصور ابن المعتمر؛ اعمش؛ حماد بن ابی سلیمان؛ ہشام الدستوائی؛ سعید بن ابی عروبہ رحمہم اللہ۔

پھر ان کے بعد: مالک بن انس؛ حماد بن زید؛ حماد بن سلمہ؛ لیث بن سعد؛ اوزاعی؛ ابوحنیفہ؛ ابن ابی لیلی؛ شریک؛ ابن ابی ذئب؛ ابن الماجشون رحمہم اللہ؛ اور ان کے بعد جیسے: یحیٰ بن سعید القطان؛ عبدالرحمٰن بن مہدی؛ وکیع ابن الجراح؛ عبدالرحمٰن

بن القاسم؛ اشہب بن عبدالعزیز؛ ابو یوسف؛ محمد بن الحسن؛ شافعی؛ احمد بن حنبل؛ اسحق بن راہویہ؛ ابی عبید؛ ابوثور رحمہم اللہ؛ ان کے علاوہ اتنی بڑی تعداد جن کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جن کو غیر فاضل کو مقدم کرنے سے کوئی غرض نہیں۔ نہ ہی جاہ و مال کی غرض سے اور نہ ہی کسی لالچ کی بنا پر۔ یہ وہ لوگ تھے جو سب سے بڑے علماء اور حقائق کی چھان بین کرنے والے تھے۔ یہ تمام حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم پر متفق ہیں۔

بلکہ پہلے کے شیعہ جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں تھے؛ وہ بھی جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم پر متفق ہیں۔ علامہ ابن القاسم رحمہ اللہ [1] فرماتے ہیں: ''امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''جن اکابر سے میں نے ہدایت پائی ہے، ان میں سے کوئی بھی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی - حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما - پر تقدیم میں شک نہیں رکھتا تھا۔''

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تقدیم پر اہل مدینہ سے اجماع نقل کیا گیا ہے۔ [یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ] اہل مدینہ کا بنو امیہ کی طرف کوئی میلان نہیں تھا؛ جیسا کہ اہل شام کرتے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس انہوں نے یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ واقعہ حرہ والے سال یزید سے جنگ کی؛ اس کی وجہ سے مدینہ میں جو خونریزی ہوئی؛ وہ سب کو معلوم ہے؛ نیز اہل مدینہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کسی ایک کو بھی ایسے قتل نہیں کیا جیسے اہل بصرہ و کوفہ اور اہل شام کو قتل کیا۔ بلکہ آپ کا شمار مدینہ کے علماء میں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ مدینہ سے باہر نکل گئے اور لوگ آپ پر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مقدم سمجھتے تھے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے؛ آپ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو [باقی صحابہ پر] مقدم سمجھنے میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

شریک بن ابی نمر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایک سائل نے آپ سے پوچھا کہ ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما میں سے کون افضل ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ سائل نے آپ سے کہا: ''آپ شیعہ ہو کر بھی یہ بات کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں شیعہ وہی ہو سکتا ہے جو اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہو۔ اللہ کی قسم! حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سیڑھیوں پر چڑھے؛ اور خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا أَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ)) [2]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اس امت میں سب سے افضل ہیں۔''

کیا ہم آپ کی بات کو رد کریں' یا پھر آپ کو جھٹلائیں؟ اللہ کی قسم آپ ہرگز جھوٹے نہ تھے۔

قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب ''اثبات نبوت'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے' اور اسے ابوالقاسم بلخی کی کتاب کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلخی نے یہ کتاب راوندی کے رد پر لکھی ہے جو کہ اس نے جاحظ پر اعتراضات میں لکھی تھی۔ اس میں لکھا ہے:

''یہ کیسے کہا جا سکتا ہے: جن لوگوں نے [حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی] بیعت کی وہ دنیا کے طلبگار یا جاہل تھے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان صحابہ کرام کی شان میں طعن کرنے والا ان اوصاف سے متصف ہے۔ اس لیے کہ آپ اہل قبلہ کے طوائف

---

[1] امام عبدالرحمن بن قاسم المتوفی (۱۳۲۔۱۹۱) مقام الفسطاط کے مشہور علماء میں سے تھے، یہ امام مالک بن انس المتوفی (۱۸۱) کے شاگرد تھے اور ان کے علم و فضل کے مبلغ و ناشر تھے، اسد بن الفرات المتوفی (۱۴۲۔۲۱۳) نے ابن القاسم سے المدونہ کی تعلیم حاصل کی اور ۱۸۱ھ میں یہ کتاب لے کر قیروان پہنچے، ابن القاسم سے متعلق دیکھیے: مقالہ ''مع الرعیل الاول'' مجلہ الازہر، م: ۲۵ ج ۹ ص ۹۹۶، ۹۹۷، رمضان: ۱۳۷۳ھ)۔

[2] سنن ابن ماجه۔ المقدمة۔ باب فضل عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح: ۱۰۶)، مسند احمد (۱/ ۱۰۶)۔

میں سے کسی کو رافضیوں سے بڑھ کر جاہل نہیں پاؤ گے۔ اور نہ ہی ان سے بڑھ کر کوئی دنیا کا حریص ہے۔ غور و فکر کرنے والا جان سکتا ہے رافضی جو عیب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرف منسوب کرتے ہیں: وہ خود سب لوگوں سے بڑھ کر اس عیب کا شکار ہوتے ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس عیب سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اس بنا پر رافضی بغیر شک و شبہ کے لوگوں میں سب سے بڑھ کر جھوٹے ہیں۔ جیسے مسیلمہ کذاب اپنے اس دعوی میں جھوٹا تھا کہ: میں سچا نبی ہوں۔'' اسی لیے یہ لوگ اپنے آپ کو اہل ایمان سے موصوف کرتے ہیں [خود کو مؤمن کہتے ہیں]؛ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو منافق کہتے ہیں۔ جب کہ خود رافضی لوگوں میں سب سے بڑے منافق ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو سب سے بڑے مومن تھے۔''

خلافت علی رضی اللہ عنہ اور بیعت:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول ہے کہ: ''بعض لوگ حق کی بنا پر امارت و خلافت کے طالب تھے، چنانچہ قلیل التعداد با اخلاص مسلمانوں کی ایک جماعت نے آپ کی بیعت کی؛ جنھیں دنیوی زیب و زینت سے کچھ سرو کار نہ تھا؛ اور جنہیں اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی ہرگز کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بلکہ انہوں نے اخلاص کیساتھ ان کی اطاعت کا اقرار کر لیا جو تقدیم کے مستحق تھے؛ اور ان کے اوامر و احکام کی اطاعت کرنے لگے۔ جب مسلمان اس آزمائش کا شکار ہوئے؛ تو ہر ایک پر واجب ہوتا تھا کہ وہ حق میں غور و فکر کریں۔ اور انصاف کا سہارا لیں۔ اور حق کو اس کی جگہ پر رکھا جائے اور مستحق پر ظلم نہ کیا جائے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ﴾ (هود: ۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: پہلی بات: یہ ضروری تھا کہ یوں کہا جاتا: ''جب ایک گروہ اس طرف چلا گیا؛ اور ایک گروہ اس طرف چلا گیا تو اس وقت واجب ہوتا تھا کہ وہ غور و فکر کریں کہ کون سا قول زیادہ صحیح ہے۔ ہاں اگر ایک جماعت حق کی اتباع پر راضی ہو جائے اور دوسری جماعت باطل کی اتباع شروع کر دے؛ تو پھر اس صورت میں معاملہ بالکل واضح تھا؛ اس وقت غور و فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ معاملہ واضح نہ ہو تو پھر اس کا ذکر کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک معاملہ کھل کر واضح نہ ہو جائے۔

دوسری بات: شیعہ مصنف کا [حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں] یہ کہنا کہ: ''آپ حق کی بنا پر امارت و خلافت کے طالب تھے، چنانچہ قلیل التعداد مسلمانوں نے آپ کی بیعت کی۔''

بلا شک و شبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق شیعہ کا یہ قول باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں ہرگز خلافت کے طلب گار نہیں ہوئے۔ آپ نے اس وقت خلافت طلب کی جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا؛ اور آپ کی بیعت کر لی گئی۔ اس وقت قلیل تعداد میں نہیں بلکہ اکثر لوگ آپ کے ساتھ تھے۔ اہل سنت اور شیعہ اس امر میں متحد الخیال ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے ادوار میں اپنی بیعت کی دعوت نہیں دی۔ اور نہ ہی کسی ایک نے آپ کی بیعت کی۔ لیکن رافضی پھر بھی یہی دعوی کرتے ہیں کہ آپ ایسا کرنا چاہتے تھے۔ اور آپ کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر صرف آپ ہی امامت کے مستحق تھے۔ لیکن آپ ایسا کرنے سے عاجز تھے۔ اگر مان لیا جائے کہ یہ

بات حق ہے؛ تب بھی انہیں کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اس لیے کہ آپ نے اپنی بیعت کی طرف لوگوں کو دعوت نہیں دی۔ اور نہ ہی کسی ایک نے آپ کی اتباع کی۔ تو پھر جب یہ سارا قصہ ہی من گھڑت اور جھوٹ ہو تو اس کی قباحت و شناعت کا کیا کہنا۔

[اعتراض]: [رافضی کا قول ہے]: ''چنانچہ قلیل التعداد با اخلاص مسلمانوں کی ایک جماعت نے آپ کی بیعت کی۔''

[جواب]: یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر جھوٹا الزام ہے۔ اس لیے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے دور میں کسی ایک صحابی نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ اور کسی ایک کے لیے ایسا دعوی کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ: صحابہ کرام میں کچھ لوگ ایسے تھے جو آپ کی بیعت کرنا چاہتے تھے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو بہت سارے لوگوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ بعض لوگ ان دونوں سے دور رہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تو بعض لوگوں کے دلوں میں کسی دوسرے کی طرف میلان تھا۔ اس قسم کی باتیں کلیۃً تو ختم نہیں ہوسکتیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ طیبہ میں موجود تھے؛ تو اس وقت مدینہ میں اوراس کی اردگرد کی بستیوں میں منافقین بھی رہتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبۃ ۱۰۱]

''اور کچھ تمہارے گرد وپیش والوں میں اور کچھ مدینے والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے ان کو ہم جانتے ہیں۔''

نیز مشرکین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف ۳۱]

''اور کہنے لگے: یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔''

ان لوگوں کی چاہت تھی کہ اہل مکہ و طائف میں سے جس انسان کو یہ لوگ بڑا سمجھتے اور تعظیم کرتے ہیں' اس پر قرآن نازل کیوں نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾ [الزخرف ۳۲]

''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ہی ان کی زندگانی دنیا کی روزی ان میں تقسیم کی ہے اور ایک کو دوسرے سے بلند کیا ہے۔''

[شیعہ کے جھوٹے اوصاف]

رہا ان شیعہ کے یہ اوصاف بیان کرنا کہ یہ لوگ دنیاوی زیب وزینت سے منہ موڑ چکے تھے؛ اور انہیں اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ زہد و قتال میں شیعہ سے پیچھے کوئی فرقہ نہیں دیکھا گیا۔ خوارج جو کہ دین اسلام سے خارج ہیں' وہ زہد و جہاد میں شیعہ سے کئی گناہ آگے بڑھے ہوئے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ عراق؛ الجزیرہ؛ خراسان اور مغرب میں بنوامیہ اور بنوعباس کیساتھ جنگوں میں خارجی حملوں کے لیے ضرب

المثل بیان کی جاتی رہی ہے۔ ان لوگوں کے اپنے شہر پناہ ہوا کرتے تھے جہاں پر کسی دوسرے کو داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

جب کہ ان مقابلہ میں شیعہ ہمیشہ مغلوب و مقہور اور شکست خوردہ رہے ہیں۔ ان پر دنیاوی محبت و حرص کی نشانیاں ظاہر رہی ہیں ۔ اسی بنا پر انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کیساتھ خط و کتابت کی۔ آپ نے پہلے اپنے چچا زاد بھائی کو [حالات معلوم کرنے کے لیے] بھیجا ؛ اور پھر خود بھی تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے [خاندان اہل بیت کے ساتھ] غدر کیا ؛ دنیا کے بدلے آخرت کو بیچ ڈالا اور آپ کو دشمن کے حوالے کر دیا۔ اور دشمنوں کے ساتھ مل کر آپ کے خلاف جنگ لڑی۔ [تو پھر خود ہی فیصلہ کریں] ان میں کون سا زہد تھا؟۔ اور کونسا جہاد کر رہے تھے؟۔ ان لوگوں کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنی تکالیف برداشت کرنی پڑیں جن کی حقیقت کو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے شیعہ پر بددعا کی:

''اے اللہ ! میں ان سے ملول ہو گیا ہوں' تو انہیں مجھ سے ملول کر دے ۔ اے اللہ ! مجھے ان کے بدلے میں بہتر ساتھی عطا فرما ؛ اور میرے بدلے ان کو برا حکمران عطا فرما۔''

شیعہ حضرت کے ساتھ خیانت و غدر کے مرتکب رہتے تھے۔ آپ کو دھوکہ دیتے ؛ اور ان لوگوں سے خط و کتابت کرتے جن سے حضرت برسر پیکار ہوتے ۔ آپ کے ساتھ ولایت اور اموال میں خیانت کے مرتکب ہوتے ۔ اسی لیے تو یہ لوگ رافضی کہلاتے ہیں ۔ جب کہ حقیقی شیعان علی وہ تھے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا ؛ تو اس وقت ایک گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حمایتی بن گیا جو شیعان عثمان کہلائے ۔ اور دوسرا گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حمایتی بن گیا ؛ جو شیعان علی کہلائے۔ پہلے گروہ کے لوگ سب سے بہترین شیعہ تھے۔ جب کہ دوسرا گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں ؛ جو کہ اس دنیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خوشبودار پھول تھے ؛ کے ساتھ سلوک و معاملات میں سب سے برے لوگ ثابت ہوئے۔ حقیقت میں اس گروہ کے لوگ [ساری کائنات میں] سب سے بڑھ کر ملامت کے مستحق ہیں۔ [یہ لوگ] فتنہ پھیلانے میں سب سے جلد باز' [مقابلہ کی صلاحیت میں] سب سے عاجز' اور اہل بیت سے محبت کا اظہار کرنے والوں کو سب سے بڑھ کر دھوکہ دینے والے ہیں ۔ یہاں تک کہ جب ان پر قدرت حاصل ہو گئی ؛ اور ملامت کرنے والوں نے انہیں ملامت کیا تو انہوں نے دنیا کے تھوڑے سے مال کو ترجیح دیتے ہوئے [حضرت مسلم بن عقیل کو] دشمن کے سپرد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ اہل خرد و دانش بڑے بڑے مسلمانوں ؛ جیسے حضرت عبد اللہ بن عباس ؛ حضرت عبد اللہ بن عمر ؛ ابو بکر بن عبد الرحمن بن الحارث ؛ رضی اللہ عنہم اجمعین نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوچ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس لیے یہ اکابرین امت [اپنے تجربات کی روشنی میں] جانتے تھے کہ شیعہ آپ کو ذلیل کریں گے' اور آپ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے' اور آپ کے ساتھ کئے گئے وعدے پورے نہیں کریں گے۔

پھر ویسے ہی ہوا جیسے ان اکابرین کا خیال تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما کی دعا قبول فرمائی ؛ اور ان پر حجاج بن یوسف کو مسلط کیا۔ جو نہ ہی کسی نیک وکار کی نیکی کا خیال کرتا تھا اور نہ ہی کسی بدکار کی بدی کو معاف کرتا تھا۔ پھر اس شر کی لپیٹ میں وہ لوگ بھی آ گئے جو حقیقت میں ان شیعہ میں سے نہیں تھے۔ یہاں تک کہ شر و فتنہ عام ہو گیا۔

مسلمانوں کی وہ بڑی بڑی کتابیں عام ہیں؛ جن میں زھاد [وعباد] کا تذکرہ ہے۔ ان میں ایک بھی رافضی نہیں ہے۔ اور یہ مصنفین پوری امت میں حق بات کہنے میں مشہور و معروف ہیں۔ اور انہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان میں ایک بھی رافضی نہیں۔ رافضی ان میں کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ حقیقت میں منافقین کی جنس میں سے ہیں۔ ان کا مذہب تقیہ ہے۔ کیا جن لوگوں کو کسی ملامت گر کی پرواہ نہیں ہوتی ان کا یہ حال ہوتا ہے؟ یہ حال تو ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ [المائدۃ ۵۴]

''اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہوگی اور وہ اللہ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہونگے مسلمانوں پر؛ سخت اور تیز ہونگے کفار پر؛ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ بھی نہ کریں گے یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دے، اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور زبردست علم والا ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور جہاد فی سبیل اللہ:

یہ ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے مرتدین سے قتال کیا۔ ان میں سب سے پہلے فرد جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور پھر وہ لوگ ہیں جو قیامت تک آپ کی اس راہ پر گامزن رہیں گے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے مرتدین سے جہاد کیا؛ جیسے مسیلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں سے؛ اور زکوٰۃ روکنے والوں سے برسر پیکار ہوئے۔ فارس و روم پر غلبہ حاصل کیا۔ یہ لوگوں میں سب سے بڑے زاہد تھے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''تم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر نماز و روزہ والے نہیں ہو۔ وہ لوگ تم سے بہتر تھے۔ پوچھا گیا: اے ابوعبدالرحمٰن! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اس لیے کہ وہ دنیا سے سب سے زیادہ بے رغبت تھے؛ اور آخرت کی طرف سب سے زیادہ رغبت رکھتے تھے۔ انہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔''

اس کے برعکس اگر ہم دیکھیں تو رافضی اپنے دشمن کی طرف سے ملامت گری سے سب سے زیادہ خوف کھانے والے ہوتے ہیں۔ ان کا حال تو بالکل اس آیت قرآنی کے مطابق ہے:

﴿یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ﴾ [المنافقون ۴]

''ہر سخت آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں یہی اصلی دشمن ہیں ان سے بچو اللہ انہیں غارت کرے کہاں بھٹک رہے ہیں۔''

اہل قبلہ کے ساتھ ان کی بود و باش بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہودی باقی اہل ملت کے ساتھ رہتے ہیں۔

پھر ان سے یہ پوچھا جائے گا: دنیا سے بے رغبتی رکھنے والے کون لوگ تھے؟ جنہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی؟۔ کیا ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی بیعت نہ کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی؟۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور

میں کوئی ایک بھی ایسا انسان نہیں تھا جس نے ان کی بیعت سے سرکش ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی ہو۔ بلکہ تمام لوگوں نے ان تینوں خلفاء کی بیعت کر لی تھی۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ: ''[کچھ لوگ ایسے تھے] جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقدیم کا نظریہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ [اگر واقعی ایسا ہی تھا؛ حالانکہ یہ سوچ باطل ہے] تو پھر ان لوگوں کا یہ حال نہیں ہوتا جنہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔''

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت و خلافت کے دنوں میں لوگ آپ کے اصحاب کو جہاد کے رک جانے [یا کم ہو جانے] پر؛ اور قتال سے پیچھے رہ جانے پر بہت زیادہ ملامت کرتے تھے۔ تو پھر شیعہ میں وہ لوگ کہاں تھے جنہیں اللہ کے دین کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی؟۔''

اگر یہ لوگ حضرات صحابہ ابو ذر' سلمان اور عمار رضی اللہ عنہم پر کوئی جھوٹ گھڑیں تو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ یہ تینوں حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سب سے زیادہ تعظیم کرنے والے ان کے سچے تابع فرماں تھے۔ ہاں ان میں سے بعض سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف کچھ بے اعتنائی منقول ہوئی ہے؛ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف نہیں۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو مسلمان متفرق ہو گئے۔ ایک جماعت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف رغبت رکھتی تھی؛ اور دوسری جماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف۔ ان دونوں گروہوں کا باہم تصادم بھی ہوا۔ اس وقت دونوں جماعتوں کے لوگ قتل ہوئے۔

صحیح مسلم میں ہے: حضرت سعد بن ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کا ارادہ کیا تو وہ مدینہ منورہ آ گئے اور اپنی زمین وغیرہ بیچنے کا ارادہ کیا تا کہ اس کے ذریعہ سے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خرید سکیں اور مرتے دم تک روم والوں سے جہاد کریں۔ تو جب وہ مدینہ منورہ میں آ گئے اور مدینہ والوں میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ اور ان کو بتایا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں چھ آدمیوں نے بھی اسی طرح کا ارادہ کیا تھا؛ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمہارے لئے میری زندگی میں نمونہ نہیں ہے؟''

جب مدینہ والوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بیان کی تو انہوں نے اپنی اس بیوی سے رجوع کیا جس کو وہ طلاق دے چکے تھے اور اپنے اس رجوع کرنے پر لوگوں کو گواہ بنا لیا۔ پھر وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف آئے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وتر کے بارے میں پوچھا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

'' کیا میں تجھے وہ آدمی نہ بتاؤں جو زمین والوں میں سے سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وتر کے بارے میں جانتا ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کون ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو ان کی طرف جاؤ؛ اور ان سے پوچھو۔ پھر اس کے بعد میرے پاس آنا؛ اور وہ جو جواب دیں مجھے بھی اس سے باخبر کرنا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف چلا۔ حکیم بن افلح کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف لے کر چلو، وہ کہنے لگے کہ میں تجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف لے کر نہیں جا سکتا؛ کیونکہ میں نے انہیں اس بات سے روکا تھا کہ وہ ان دو گروہوں (علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما) کے درمیان کچھ نہ کہیں۔ تو انہوں نے نہ مانا اور چلی گئیں۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے ان پر قسم ڈالی تو وہ ہمارے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف آنے کے لئے چل پڑے......الخ۔ ❶

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: ''آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملت پر ہوں اور نہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ملت پر۔ بلکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت پر ہوں۔

[شیعہ کی تقسیم]:

پہلے دور کے شیعہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے۔اختلاف صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تقدیم کا تھا۔اس وقت نہ ہی کوئی امامیہ تھا اور نہ ہی رافضی۔ ان کا نام رافضی اس وقت سے پڑا؛ اور اس وقت سے یہ لوگ رافضی ہوئے جب حضرت زید بن علی بن الحسین رضی اللہ عنہ نے ہشام کے دور میں کوفہ میں خروج کیا۔اس وقت کچھ شیعہ نے آپ سے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ان کے لیے رحم و مغفرت کی دعا کی۔اس پر یہ شیعہ بگڑ گئے۔ آپ نے ان سے پوچھا: کیا تم مجھے چھوڑ رہے ہو؟ میری بات نہیں مان رہے؟ اس وقت سے ان کا نام رافضی [چھوڑنے والے] پڑ گیا۔اور ان میں سے شیعہ کا ایک گروہ زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہی رہا۔اس نسبت کے لحاظ سے انہیں زیدیہ کہا جانے لگا۔اس وقت سے شیعہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے: رافضہ امامیہ اور زیدیہ۔

جب کبھی یہ لوگ کوئی نئی بدعت ایجاد کرتے ان کے شر میں اضافہ ہی ہوتا جاتا۔زیدیہ رافضہ سے بہتر ہیں۔ان سے بڑے عالم؛ زاہد؛ سچے اور بہادر ہیں۔ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما باتفاق مسلمین لوگوں میں سب سے بڑے زاہد تھے۔انہیں اللہ کے دین میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوا کرتی تھی۔جیسا کہ کسی نے کہا ہے: ''اللہ تعالیٰ عمر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے؛ انہوں نے حق کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کا کوئی سچا دوست نہیں۔''

ہم اہل سنت والجماعت کے تمام گروہوں کے لیے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے۔بس ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا اتفاق گمراہی و ضلالت پر نہیں ہو سکتا۔اور ہر وہ مسئلہ جس میں اہل سنت والجماعت اور رافضہ کا اختلاف ہے' اس میں حق اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہے۔

جہاں کہیں رافضی اصابت رائے پر ہیں؛ تو وہاں لازمی ہوگا کہ اس موقع پر انہوں نے اہل سنت والجماعت کی موافقت اختیار کی ہوگی۔جب کہ رافضیوں کی غلطیوں پر اہل سنت میں سے کوئی ایک بھی ان کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔رافضیوں کا کوئی ایک بھی انفرادی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اہل سنت والجماعت سے علیحدہ ہوئے ہوں اور پھر وہ غلطی پر نہ ہوں۔ بلکہ ضرور اس مسئلہ میں غلطی کا شکار ہوتے ہیں؛ جیسا کہ بارہ اماموں کی عصمت کا عقیدہ ہی لیجیے۔

❶ صحیح مسلم:ح ۱۷۳۳۔ مسافروں کی نماز اور قصر کے احکام کا بیان: رات کی نماز اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رات کی نماز کی رکعتوں کی تعداد اور وتر پڑھنے کے بیان میں۔

فصل:

شیعہ کے افکار ومعتقدات

[شبہات]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''ہمارا مذہب اس لیے واجب الاتباع ہے کہ یہ جملہ مذاہب کی نسبت احق و اصدق اور باطل کی آمیزش سے خالص تر ہے۔ یہ مذہب اللہ ورسول اور اولیاء کی تنزیہ وتقدیس میں جملہ مذاہب سے آگے ہے۔ ہمارا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخصوص بالقدامت ہے۔ وہ جسم نہیں وہ مکان کے دائرہ میں محدود نہیں کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔ (آگے چل کر لکھتا ہے): اللہ تعالیٰ حواس سے دیکھا نہیں جا سکتا، وہ کسی جہت میں محدود نہیں اس کے اوامر ونواہی حادث ہیں اس لیے کہ معدوم سے امر و نہی کا صدور ممکن نہیں، ائمہ دین انبیاء کی طرح صغائر و کبائر سے پاک ہیں، انہوں نے اپنے جد امجد سرور کائنات ﷺ سے براہ راست احکام اخذ کیے اور قیاس و استحسان اور رائے کی جانب مطلقاً توجہ نہ کی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: [شیعہ کے]: ذکر کردہ مسائل کا مسئلہ امامت سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ بعض امامیہ ان کو تسلیم بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ طریقہ سراسر عقلی ہے، اور امام کا تقرر سمعی دلائل کا محتاج ہے۔ مزید برآں ان میں جو مسائل حق ہیں اہل سنت ان کو تسلیم کرتے ہیں اور جو باطل ہیں وہ بہر کیف مردود ہیں۔ یہ قواعد وعقائد دراصل جہمیہ ومعتزلہ سے ماخوذ ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ ذات باری صفت علم قدرت اور حیات سے عاری ہے، وہ بولتا ہے نہ راضی ہوتا ہے؛ ناراض ہوتا ہے نہ محبت کرتا اور نہ ہی عداوت رکھتا ہے۔

جہاں تک اہل سنت کے افکار و آراء کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان صفات کا اثبات کرتے ہیں جو اس نے خود اپنے لیے ثابت کی ہیں، اور ان صفات کی نفی کرتے ہیں جو صفات مخلوق سے مشابہ ومماثل ہیں، اہل سنت اثبات بلا تشبیہ اور تنزیہ بلا تعطیل کا عقیدہ رکھتے ہیں، خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''

یہ آیت مشبہہ یعنی ان لوگوں کے نظریات کی تردید کرتی ہے جو صفات باری کو مخلوق کی صفات کی مانند قرار دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا: '' هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ. '' آیت کا یہ جزء مُعَطِّلہ یعنی اس فرقہ کی تردید کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو صفات سے عاری قرار دیتے ہیں۔

صفات خالق ومخلوق میں فرق وامتیاز:

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ذات باری تعالیٰ اپنی خصوصیات میں بندے کی مشارکت سے پاک ہے۔ اگرچہ وجود، علم اور قدرت کی صفات عبد اور معبود دونوں میں پائی جاتی ہیں اور وہ دونوں اس کے ساتھ موصوف ہیں۔ مگر یہ مشترک صفات ذہن انسانی میں ایک کلی کی حیثیت رکھتی ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں اور ان میں سے جو صفات موجودات عالم میں پائی جاتی

ہیں وہ جدا گانہ نوعیت کی ہیں۔اور ان میں سرے سے کوئی اشتراک موجود نہیں اس مقام پر بہت سے لوگوں نے ٹھوکر کھائی اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ان صفات کے متحد فی الاسم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ صفت ''وجود'' جو باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہے، وہی بندے میں ہے ان کی رائے میں وجود کا لفظ مشترک لفظی ہے۔

دراصل یہ صفات قابل تقسیم ہیں اور سب ایک ہی قسم کی نہیں، مثلاً کہا جاتا ہے، کہ وجود کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ واجب الوجود ۲۔ ممکن الوجود

۳۔ قدیم ۴۔ حادث

بعض الفاظ مشترک المعنی ہوتے ہیں، مثلاً ''مشتری'' ایک ستارہ کا نام بھی ہے، اور خریدار کو بھی مشتری کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اگر مشترک المعنی لفظ کو کلی مشکک قرار دیا جائے۔ جس کے افراد یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ تو اس سے جملہ شبہات کافور ہوجاتے ہیں اس لیے کہ واجب الوجود میں جو وجود پایا جاتا ہے وہ ممکن الوجود کی نسبت اعلیٰ واولیٰ ہے۔

مگر یہ ہرگز درست نہیں اس لئے کہ مشترک کلی کے ایک فرد میں اگر معنی کی زیادتی ہوگی تو اس سے اس کے مشترک ہونے کی نفی نہیں ہوتی، وہ لفظ پھر بھی مشترک ہی رہے گا، اس لئے کہ وہ دونوں پر یکساں طور سے بولا جاتا ہے۔

ایک گروہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جن کے نزدیک کلی متواطی ہے۔ جس کے جملہ افراد یکساں ہوتے ہیں۔ اس رائے میں خالق کا وجود اس کی حقیقت سے زائد ہے، جو شخص یہ کہتا ہے کہ اس کی حقیقت اور وجود میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا وہ وجود کو مشترک لفظی قرار دیتا ہے۔

خلاصہ کلام! اس ضمن میں غلطی کی اصل وجہ لوگوں کا یہ وہم ہے کہ ان اسماء عامہ (مثلاً وجود، علم اور قدرت وغیرہ) کا مسمّٰی ایک کلی ہے اور یہ ایک چیز میں بھی وہی ہے جو دوسری میں۔ حالانکہ یہ درست نہیں اس لئے کہ جو چیز خارج میں موجود نہ ہو وہ ایک عام کلی کی حیثیت سے پائی نہیں جاتی، بلکہ وہ ہمیشہ معین و مخصوص ہوگی۔ ان اسماء سے جب اللہ تعالیٰ کو موسوم کیا جائے گا تو ان کا مسمّی مختص ہوگا اور جب بندے کو ان سے موسوم کیا جائے گا تو بندہ ان سے مخصوص ہوگا۔ جب یہ کہا جائے کہ عبد و معبود صفت وجود میں مشترک ہیں تو ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے ان کا ایک دوسرے سے متمیز ہونا ضروری ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک یہ اشتراک صرف وجود ذہنی میں پایا جاتا ہے، ماہیت و حقیقت اور ذات و نفس کے مسمّی میں سرے سے کوئی اشتراک موجود ہی نہیں۔ اس غلطی کا منشا و مصدر یہ ہے کہ وجود کو علی الاطلاق اخذ کیا گیا ہے اور حقیقت کو مخصوص قرار دیا گیا حالانکہ وجود اور حقیقت دونوں کو مطلقاً بھی اخذ کیا جا سکتا ہے، اور ان کو مخصوص بھی کر سکتے ہیں، اندریں صورت وجود مطلق حقیقت مطلقہ کے مساوی ہوگا اور وجود مخصوص حقیقت مختصہ کے برابر۔ گویا وجود مطلق حقیقت مطلقہ سے ہم آہنگ ہوگا اور وجود مخصوص حقیقت مختصہ کے مطابق و موافق؛ دونوں کا مسمّی ایک ہوگا، مگر تسمیہ کی جہت متعدد ہوگی۔ مثلاً کہا جاتا ہے:

"هٰذَا هُوَ ذَاكَ " اس میں مشار الیہ ایک ہے مگر جہتیں مختلف ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء و صفات ثابت کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مخلوقات کے مشابہ و مماثل ہے، اس میں شبہ نہیں کہ باری تعالیٰ ایسی صفات سے متصف ہے جو اس کی ذات کے ساتھ لازم ہیں، یہ صفات اسی طرح قدیم،

ازلی اور واجب ہیں جس طرح اس کی ذات قدیم و واجب ہے، اس میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ کہنا کہ اسماء الٰہی ثابت ہیں مگر صفات نہیں، ایک قسم کا عقلی مغالطہ ہے۔ مزید برآں یہ نظریہ قرامطہ کی پیروی کا غماز ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ تقسیم ایک شنیع قسم کی خطا اور بدعت ہے۔ سنت کی پیروی کرنے والے اہل حق کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانیت سے ہرگز موصوف نہیں ہوسکتا۔ (تعالی اللہ عن ذلک) بلکہ دور جاہلیت و اسلام کے عرب بھی اللہ تعالیٰ کو جسم سے منزہ تصور کرتے تھے۔

مسئلہ تجسیم:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول ہے: ''لَيْسَ بِجِسْمٍ'' (اللہ تعالیٰ مجسم نہیں)۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ جسم کا لفظ محتاج تشریح ہے، یہ لفظ ان معانی کے لیے مستعمل ہے:

۱۔ وہ مرکب جس کے اجزاء الگ الگ ہوں اور ان کو یکجا کر دیا جائے۔

۲۔ جو تفریق و انفصال کو قبول کرتا ہو۔

۳۔ جو مادہ و صورت سے مرکب ہو۔

ذات باری تعالیٰ مذکورۃ الصدر جملہ امور و اوصاف سے منزہ ہے۔

بعض اوقات جسم سے وہ چیز مراد ہوتی ہے جس کی جانب اشارہ کیا جا سکے جسے دیکھا جا سکے یا جس کے ساتھ صفات وابستہ ہوں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان صفات سے موصوف ہے، چنانچہ دعا کرتے وقت اس کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے، آنکھ اور دل سے بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، مومن بروز قیامت اسے کھلم کھلا دیکھیں گے۔ علاوہ ازیں یہ صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں۔ اگر شیعہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کے جسم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ان امور سے بھی بہرہ ور نہیں تو ہم کہیں گے کہ یہ امور و اوصاف نقل صحیح اور عقل صریح سے ثابت ہیں، اور تم ان کی نفی پر کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ جسم کا لفظ نفی و اثبات دونوں اعتبار سے بدعت ہے، اس لیے کہ نصوص شرعیہ اور اقوال سلف میں لفظ جسم کے اطلاق کی نفی کی گئی ہے۔[1] نہ کہ اثبات کی، اسی طرح ''جوہر'' اور ''متغیّز'' کے الفاظ کا بھی نصوص میں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔

---

[1] جو بات غیبی امور سے تعلق رکھتی ہو اس کا ذکر نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی درست نہیں، اس کا ذکر صرف انہی الفاظ میں مناسب ہے جو منصوص اور شارع سے منقول ہوں، اس میں سلف صالحین کی پیروی کا التزام ازبس ناگزیر ہے۔ نائب السلطنت افرم کی مجلس میں بمقام دمشق ۷۰۵ھ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے معاصر علماء کے مابین جو مناظرہ ہوا تھا اس میں شیخ کے حریف علماء نے جب تشبیہ و تجسیم کی نفی کا ذکر چھیڑا تو شیخ الاسلام نے اپنے رسالہ ''العقیدۃ الواسطیہ'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

میرا قول ''مِنْ غَيْرِ تَكْيِيْفٍ وَلَا تَمْثِيْلٍ'' ہر باطل کی تردید کے لیے کافی ہے، میں نے تشبیہ و تمثیل کی بجائے تکییف و تمثیل کے الفاظ اس لیے انتخاب کیے کہ ''تکییف'' کی نفی سلف سے منقول ہے، چنانچہ امام مالک اور ابن عیینہ کا یہ مقولہ علماء کے یہاں زبان زد خاص و عام ہے: ''اَلْإِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُوْلٌ وَالْإِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ'' (اللہ تعالیٰ کا مستوی علی العرش ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں اس پر ایمان لانا واجب اور اس سے متعلق سوال کرنا بدعت ہے)

خلاصہ کلام! شیخ الاسلام اپنی تصانیف میں نہ صرف لفظ جسم کا اطلاق کرنے سے احتراز کرتے بلکہ تجسیم کا لفظ تک تحریر نہیں کرتے۔ ذات باری کی تنزیہ کرتے ہوئے وہ ''من غیر تکییف ولا تمثیل'' کے الفاظ ذکر کرتے ہیں جس سے ان کا مقصد شرعی اصطلاحات کا تتبع اور طریق سلف کی پیروی کرنا ہے، جو الفاظ غیبی امور سے متعلق ہوں ورود نص کے بغیر ان کا استعمال نفیاً و اثباتاً کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''لَا فِي مَكان'' (اللہ تعالیٰ مکان میں محدود نہیں)۔

[جواب]: لفظ مکان دو معانی کے لیے مستعمل ہے:

۱۔ مکان وہ چیز ہے جو کسی پر حاوی و محیط ہو اور وہ چیز اس کی محتاج ہو۔

۲۔ لفظ مکان کا اطلاق بعض اوقات مافوق العالم پر بھی کیا جاتا ہے، خواہ وہ موجود بھی نہ ہو۔

لفظ مکان سے اگر پہلا مفہوم مراد لیا جائے تو ذات باری تعالیٰ اس سے منزہ ہے البتہ دوسرے معنی کے اعتبار سے اللہ پر لفظ مکان کا اطلاق کر سکتے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فوق الخلق ہے، جب اس کائنات ارضی میں خالق و مخلوق کے سوا کوئی موجود ہی نہیں تو خالق کا مخلوق سے الگ ہونا ضروری ہے۔ اللہ کی ذات ظاہر ہے اور اس پر کوئی چیز نہیں، وہ آسمان و زمین کے اوپر ہے، اور مخلوقات سے جدا ہے، جیسا کہ کتاب و سنت سے مستفاد ہوتا ہے۔

[اعتراض]: شیعہ کا یہ قول کہ: '' وَاِلَّا لَكَانَ مُحْدَثًا '' (ورنہ اس کا حادث ہونا لازم آئے گا) مطلب یہ ہے کہ اللہ کو جسم یا مکان میں محدود تسلیم کرنے سے اس کا حادث ہونا لازم آتا ہے۔

[جواب]: ہم اس کے قائل سے دریافت کرتے ہیں کہ اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے......؟ گویا تم نے اپنے اسلاف معتزلہ کی اس دلیل پر اکتفا کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جسم ہوگا، تو وہ حرکت و سکون سے خالی نہ ہوگا (ظاہر ہے کہ حرکت و سکون حادث ہیں) اور جو حوادث سے خالی نہ ہو وہ خود حادث ہوتا ہے، کیونکہ ایسا کوئی حادث نہیں جس کے پہلے کوئی دوسرا حادث نہ ہو۔

معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر صفات علم و قدرت اور حیات و کلام کا قیام ذات باری کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو اس سے اس کا حادث ہونا لازم آئے گا۔ ہم جواباً کہیں گے کہ: تم اللہ تعالیٰ کو حي اور علیم و قدیر قرار دیتے ہو اور اس کے باوصف تمہارے نزدیک اس کا مجسم ہونا لازم نہیں آتا، حالانکہ جو حیّ اور عالم و قادر ہو وہ تمہارے نزدیک جسم ہوتا ہے، اگر تمہاری بات کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ ممکن ہوگا کہ اللہ تعالیٰ صفت علم قدرت اور حیات سے موصوف ہو وہ اس خاکدان ارضی سے مبائن اور اس کے اوپر ہو اور اس کے باوصف جسمانیت سے پاک ہو۔

اگر شیعہ یہ کہے کہ جو مخلوقات سے جدا اور عالم ارضی کے اوپر ہو اس کا مجسم ہونا ضروری ہے تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ علیم و قدیر اور حی کا تعقل بھی جسمانیت کے بغیر ممکن نہیں، مزید برآں اگر یہ حادث دائمی نہ ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حوادث کے انواع و اقسام بھی دائم نہ ہوں، اس سے بڑھ کر یہ کہ اس سے حوادث کا صدور بلا سبب لازم آتا ہے جو صریح عقل کے منافی ہے، تاہم اصل سعادت ایمان باللہ ایمان بالرسل اور ان کی تصدیق و اطاعت ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ قرآن کریم میں فرمان الٰہی ہے:

﴿كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ﴾

''ہم نے اس کتاب قرآن کریم کو آپ کی طرف نازل کیا، تاکہ آپ بحکم اللہ تعالیٰ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی اور اللہ تعالیٰ کے راستہ کی جانب لائیں۔'' (ابراھیم: ۱)

اللہ تعالیٰ اور بندے کی صفات کے مابین فرق و امتیاز:

اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کر کے ان کے ذریعے اپنے اسماء و صفات مقدسہ کو تفصیلاً بیان کر دیا، اسی طرح نقص

وتمثیل کی نفی بطریق اجمال ذکر کی۔

خلاصہ کلام! ذات باری ان صفات کمال سے موصوف ہے جو لامحدود ہیں اور جن کی کوئی غائیت نہیں وہ جمیع نقائص و عیوب سے منزہ ہے، صفات کمال میں کوئی اس کا نظیر و مثیل نہیں۔

سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں وہ نعمتیں موجود ہیں، جو انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں۔''❶

جب مخلوقات کا یہ حال ہے تو خالق کا نظیر و مثیل کیوں کر ممکن ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جنت میں جو نعمتیں موجود ہیں دنیا میں صرف ان کے نام پائے جاتے ہیں۔''❷

جب دنیا و آخرت کی نعمتوں کے نام مشترک ہیں اور ان کی حقیقت مختلف ہے جس کا اندازہ دنیا میں نہیں کیا جا سکتا تو اس سے عیاں ہے کہ باری تعالیٰ جن صفات کمال سے موصوف ہے وہ بندے کی صفات سے کس قدر جداگانہ نوعیت کی ہوں گی۔

[شیخ الاسلام رحمہ اللہ آگے چل کر فرماتے ہیں]:

جو بات سالار رسل ﷺ سے ثابت ہو اس پر ایمان لانا واجب ہے اور جو ثابت نہ ہو اس کے بارے میں نفی کا حکم صادر کیا جا سکتا ہے، نہ اثبات کا، جب تک متکلم کا منشا و مقصود معلوم نہ کر لیا جائے اور اس کی نفی کی صحت و اثبات کی تہ تک نہ پہنچا جائے۔ بنابریں نفی و اثبات کے بارے میں بلا تفصیل مجمل الفاظ قیل و قال جہل و ضلال کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ یہ مقولہ مشہور ہے کہ عقلاء میں زیادہ تر اختلاف ناموں کے اشتراک کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کی نفی اور اثبات کرنے والے اہل سنت اور شیعہ دونوں فرقوں میں پائے جاتے ہیں، سب سے پہلے شیعہ متکلمین میں سے ہشام بن حکم نے لفظ ''جسم'' کا اطلاق کیا، محدث ابن حزم اور دیگر علماء نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری اپنی تصنیف ''مقالات الاسلامیین'' میں رقم طراز ہیں:

مسئلہ تجسیم میں شیعہ کے چھ فرقے

تجسیم کے عقیدہ میں روافض کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے، اس ضمن میں وہ چھ فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

پہلا فرقہ: پہلا فرقہ ہشامیہ ہے، یہ ہشام بن حکم کے پیرو ہیں، ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان کا معبود مجسم ہے، اور اس کی نہایت وحدت ہے، اس کا طول، عرض و عمق مساوی ہے، اس کا نور پگھلے ہوئے سونے کی طرح بلند ہوتا ہے، وہ گول موتی کی طرح چمک دار ہے، وہ رنگ دار، بامزہ اور ہوادار ہے اسے ٹٹولا جا سکتا ہے۔

دوسرا فرقہ: دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں۔ وہ باقی اجسام کی طرح بھی نہیں اللہ تعالیٰ کو جسم قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ موجود ہے وہ اجزا سے پاک ہے وہ عرش پر ہے مگر اسے چھوا جا سکتا ہے نہ اس کی کیفیت بیان کی جا سکتی ہے۔

تیسرا فرقہ: تیسرے فرقے کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت انسان جیسی ہے، مگر وہ جسم سے پاک ہے۔

❶ صحیح بخاری ۔ کتاب بدء الخلق۔ باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ (ح:۳۲۴٤) صحیح مسلم۔ کتاب الجنۃ۔ باب صفۃ الجنۃ(ح:۲۸۲٤۔۲۸۲۵)۔ ❷ تفسیر ابن جریر طبری(۱/ ۳۹۲)۔

چوتھا فرقہ: یہ ہشام بن سالم جوالیقی کے پیرو ہیں، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ انسانوں جیسی صورت رکھتا ہے، تاہم گوشت اور خون سے پاک ہے، وہ ایک درخشندہ نور ہے، وہ حواس خمسہ رکھتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں ناک منہ اور آنکھیں ہیں، اس کے حواس بدلتے رہتے ہیں۔ ابوعیسیٰ الورّاق کا بیان ہے کہ: ہشام بن سالم کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے سیاہ بال ہیں، یہ سیاہ نور ہے۔

پانچواں فرقہ: اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ چراغ کی طرح روشن ہے، اس کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی، اس کی صورت نہیں، مزید برآں اس کے اجزاء اختلاف سے پاک ہیں۔

چھٹا فرقہ: شیعہ کا چھٹا فرقہ یہ نظریہ رکھتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ مجسم اور باصورت نہیں، وہ متحرک ہے نہ ساکن، اسے چھوا ہی نہیں جا سکتا۔ توحید باری تعالیٰ سے متعلق وہ معتزلہ کے ہم نوا ہیں۔

امام اشعری رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: یہ متاخرین شیعہ کے افکار و معتقدات ہیں، متقدمین شیعہ تشبیہ (صفات باری کو صفات مخلوق کے مماثل قرار دینے) کا عقیدہ رکھتے تھے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام میں شیعہ کا اختلاف:

[امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس ضمن میں بڑی طویل بحث کی اور تقدیر رویت باری تعالیٰ اور کلام ربانی کے مسائل سے احتجاج کیا ہے، آگے چل کر فرماتے ہیں:]

[اعتراض]: شیعہ کا قول ہے کہ: ''انبیاء عظام خطا و سہو اور صغائر سے از آغاز عمر تا اختتام حیات معصوم و منزہ ہوتے ہیں۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: عصمت انبیاء کرام علیہم السلام کا مسئلہ شیعہ کے یہاں مختلف فیہا ہے۔ امام اشعری رحمہ اللہ ''مقالات الاسلامیین'' میں فرماتے ہیں:

شیعہ اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا رسول سے معصیت کا صدور جائز ہے یا نہیں؟۔ ایک فرقہ کا نقطۂ نظر یہ جائز ہونے کا ہے؛ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے دن قیدیوں کا فدیہ لے کر غلطی کی تھی۔ البتہ ائمہ سے معصیت صادر نہیں ہو سکتی، کیونکہ رسول جب معصیت کا مرتکب ہوگا تو وحی کے آنے پر اس سے رجوع کر لے گا، مگر ائمہ پر وحی نہیں آتی لہٰذا ان سے سہو اور غلطی کا صدور جائز نہیں [1] یہ ہشام بن حکم کا قول ہے: (دیکھئے: مقالات الاسلامیین : ۱/ ۱۱۵)

ہم کہتے ہیں کہ جمہور اہل اسلام کی رائے میں انبیاء علیہم السلام شرعی احکام کے پہنچانے میں معصوم ہوتے ہیں اور وہ غلطی پر

[1] اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ شیعہ کے یہاں ائمہ کی عصمت انبیاء کرام کی نسبت اتم و اکمل ہے، باقی رہا یہ عذر کہ انبیاء مورد وحی ہیں، یہ صرف ظاہری ملمع سازی ہے، اکابر شیعہ سے بکثرت ایسے اقوال محفوظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ائمہ کی جانب وحی آنے کے دعوے دار ہیں، شیعہ کی مشہور کتاب کافی کلینی ہے، جو ان کے ہاں صحیح بخاری کا درجہ رکھتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ امام غیب دان ہوتے ہیں۔ دور حاضر کے شیعہ اپنے اماموں کی قبروں کو مہبط وحی قرار دیتے ہیں حالانکہ ان قبروں میں بوسیدہ ہڈیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور بعض قبروں میں تو سرے سے کوئی امام مدفون ہی نہیں، جب یہ قبور جن میں ائمہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کی ہڈیاں مدفون ہیں، مہبط وحی ہیں تو ان کی عبادت کرنے والوں سے، یہ توقع کیوں کر کی جا سکتی ہے کہ وہ وحی کے معاملہ میں انبیاء و ائمہ کے مابین کچھ امتیاز قائم کریں گے، جو قبر حضرت علی کی جانب منسوب ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دراصل وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی قبر ہے، مزید برآں بعض شیعہ انبیاء علیہم السلام کے لئے از ابتدائے عمر تا انتہا عصمت کے قائل ہیں، یعنی وہ بعثت سے قبل بھی انبیاء علیہم السلام کو معصوم مانتے ہیں، حالانکہ اس وقت وحی نہیں آتی۔

قائم نہیں رہتے، ان کی بعثت کا مقصود بھی یہی ہے۔نبوت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت بھی گناہ وخطا سے پاک ہوں۔ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ہر شخص جو کفر قتل اور گناہوں سے محفوظ ہو، وہ اس شخص سے افضل ہے جو کفر کے بعد مشرف بایمان ہو، ضلالت کے بعد ہدایت یاب ہوا اور گناہوں کا مرتکب ہونے کے بعد تائب ہو تو ایسا شخص یقیناً دین کے اساسی اصول ونظریات کا مخالف ہے۔

یہ مسلمہ صداقت ہے کہ سابقین اولین صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے بیٹوں سے افضل تھے، جنہوں نے دور اسلام میں آنکھ کھولی۔ اس شخص کی حماقت و جہالت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، جو مہاجرین و انصار کے بیٹوں کو ان کے برابر تصور کرتا ہو۔ بھلا جو شخص اپنی قوت نظر و استدلال اور صبر وتوبہ کے بل بوتے پر کفر سے ایمان اور اعمال بد سے نیک اعمال کی جانب متوجہ ہوا اس شخص کے مساوی کیوں کر ہوسکتا ہے، جو اپنے آباء واقارب اور ہم وطنوں کو دین اسلام پر لائے اور امن و عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہو ۔حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں:

''جس شخص نے جاہلیت کو نہ پہچانا اس نے اسلام کے کڑے کو توڑ دیا۔''

تحریف قرآن اور شیعہ:

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص ہلاکت آفرین اعمال سے تائب ہوگا اور مشرف بایمان ہو کر نیک اعمال انجام دے گا تو اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ جمہور جو انبیاء علیہم السلام سے صغائر کا ارتکاب جائز سمجھتے ہیں کہتے ہیں: انبیاء علیہم السلام گناہ پر قائم نہیں رہتے، توبہ کرنے سے ان کے اعمال میں اور اضافہ ہوتا ہے۔نصوص وآثار اور اجماع سے مسلک جمہور کی تائید ہوتی ہے۔اس عقیدہ کے منکر قرآن کی تحریف کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت:

﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ ﴾ (الفتح: ۲)

''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے سابقہ اور اگلے گناہ معاف کر دے۔''

شیعہ کہتے ہیں کہ: '' مَا تَقَدَّمَ '' سے حضرت آدم علیہ السلام کا گناہ مراد ہے۔اسی طرح وہ ''مَا تَأَخَّرَ '' سے امت محمدی کے گناہ مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی ایک معزز نبی تھے، گویا وہ جس بات سے بچنا چاہتے تھے، اسی کے مرتکب ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گناہ کی نفی کی اور اسی گناہ کو حضرت آدم علیہ السلام سے چسپاں کر دیا، یہ کہاں کا انصاف ہے؟

مزید برآں زمین پر اترنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کر لی تھی، اس وقت حضرت نوح و ابراہیم علیہما السلام ابھی پیدا نہ ہوئے تھے۔علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ (النجم: ۳۸)

''کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

مقام حیرت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہ کو حضرت آدم علیہ السلام کی جانب کیوں کر منسوب کیا جاسکتا ہے......؟ جب مذکورۃ الصدر آیت نازل ہوئی، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ آیت تو خصوصی طور پر آپ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ہمارے متعلق کیا ارشاد ہے؟ تب مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ....﴾الخ (الفتح ۴۔۵)

''وہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکون و اطمینان کو نازل کیا تا کہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو۔''❶

ایک کم عقل آدمی بھی یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پوری امت کے گناہ معاف کر دیئے حالانکہ امت کے بعض افراد اپنے گناہوں کی بنا پر دوزخ میں جائیں گے، تو پھر مغفرت کیا ہوئی؟

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ انبیاء کو گناہ گار ٹھہرانے سے وہ قابل اعتماد نہیں رہتے اور لوگ ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

[جواب]: یہ درست نہیں؛ بخلاف ازیں کوئی نبی اپنے گناہ کا معترف ہو کر جب بارگاہ الٰہی میں تائب ہو؛ اور اللہ سے مغفرت و رحمت طلب کرے؛ تو اس سے واضح ہوگا کہ وہ کس قدر صادق، منکسر مزاج، عجب و کبر سے دور اور دروغ گوئی سے پاک ہے۔ وہ شخص اس کے عین برعکس ہے جو کہتا ہے کہ مجھے طلب مغفرت اور توبہ کی کوئی ضرورت نہیں ایسے شخص کے متعلق جب عام چرچا ہوگا تو لوگ اسے متکبر، جاہل اور کذاب کے القاب سے نوازیں گے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں داخل نہ ہوگا'' صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟ فرمایا: ''نہیں مگر یہ کہ اللہ کا فضل مجھے اپنے دامن رحمت میں چھپا لے۔''❷

سالار رسل ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ھَزْلِیْ وَجِدِّیْ وَخَطَاِیْ وَعَمَدِیْ وَکُلُّ ذٰلِکَ عِنْدِیْ)) ❸

نیز رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''سب بنی آدم خطا کار ہیں، اور خطا کاروں میں سب سے بہترین توبہ کرنے والے ہیں۔''❹

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ گناہ کے صدور سے انبیاء قابل اعتماد نہیں رہتے اور لوگ نفرت کرنے لگتے ہیں۔''

[جواب]: میں کہتا ہوں کہ: ''انبیاء قابل نفرت اس حالت میں ہوتے اگر وہ گناہوں کی کثرت کے باوصف ان پر مصر ہوں۔ شاذ و نادر گناہ کے صادر ہونے کے بعد جب وہ کثرت سے توبہ و استغفار کریں گے تو ہرگز ایسا نہ ہوگا۔ اس کے عین برخلاف پاک دامنی کا مدعی اور عفت و طہارت کا ڈھنڈورہ پیٹنے والا کہیں زیادہ رجوع و انابت الی اللہ کا محتاج ہے، ہمارے علم کی حد تک بنی اسرائیل یا کسی اور قوم نے صرف توبہ کرنے کے جرم میں کسی نبی کو ہدف ملامت نہیں بنایا تھا۔

مسئلہ عصمت میں شیعہ کی انفرادیت:

روافض کہتے ہیں کہ: ''انبیاء کرام علیہم السلام سے نبوت کے قبل یا بعد میں کسی خطا یا گناہ صغیرہ کا صدور ممکن نہیں، اسی طرح ائمہ اثنا عشر بھی کلیۃً معصوم ہیں۔'' [ہم کہتے ہیں کہ:] یہ شیعہ کا انفرادی عقیدہ ہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیۃ(ح:٤١٧٢)۔

❷ صحیح بخاری ۔ کتاب الرقاق۔ باب القصد والمداومۃ علی العمل(ح:٦٤٦٣)، صحیح مسلم کتاب صفات المنافقین، باب لن یدخل احد الجنۃ بعملہ (ح:٢٨١٦، ٢٨١٨)۔

❸ صحیح بخاری۔ کتاب الدعوات ۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم" اللّٰھم اغفرلی ما قدمت......" (حدیث:٦٣٩٨، ٦٣٩٩)، صحیح مسلم۔ کتاب الذکر والدعاء، باب فی الادعیۃ، (حدیث:٢٧١٩)۔

❹ الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ۔ باب (٤٩) (ح:٢٤٩٩) ابن ماجۃ کتاب الزھد۔ باب ذکر التوبۃ) (ح:٤٢٥١)۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو توبہ کے بعد جو مقام حاصل ہوا وہ توبہ سے پہلے حاصل نہ تھا۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ اگر توبہ اللہ تعالیٰ کو سب چیزوں سے محبوب تر نہ ہوتی تو وہ مخلوقات میں سب سے بزرگ تر لوگوں کو گناہوں میں مبتلا نہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ سچی توبہ کرنے والے اطاعت و عبادت میں زیادہ راسخ اور ان لوگوں کی نسبت گناہوں سے زیادہ بچنے والے ہوتے ہیں جو کبھی گناہ میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ جو شخص اللہ کے برگزیدہ و چیدہ تائب کو ناقص قرار دیتا ہے، وہ جاہل ہے۔

روافض کہتے ہیں کہ: ''ائمہ انبیاء علیہم السلام کی طرح گناہوں سے معصوم ہیں۔''

اس مسئلہ میں روافض منفرد ہیں۔ اور صرف وہی لوگ اس ضمن میں ان کے سہیم و شریک ہیں جو ان سے بھی گئے گزرے ہیں، مثلاً اسماعیلیہ جو محمد بن اسماعیل بن جعفر کی جانب منسوب ہیں جو کہ بنی عبید کو معصوم قرار دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ امامت جعفر کے بعد موسیٰ بن جعفر کی جانب نہیں، بلکہ محمد بن اسماعیل کی طرف منتقل ہوگئی تھی، اسماعیلیہ ملحد اور زندیق ہیں۔

[شبہ]: شیعہ کا یہ قول کہ: ''انبیاء سے سہو کا صدور بھی ممکن نہیں۔''

[جواب]: ہمارے علم کی حد تک کوئی شخص اس کا قائل نہیں۔

[اشکال]: شیعہ کہتے ہیں کہ: ''ائمہ معصومین نے اپنے جدامجد سے استفادہ کیا تھا۔''

[جواب]: ا۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ: شیعہ کے ائمہ معصومین نے اپنے جدامجد کا علم علماء سے حاصل کیا تھا، ان سے براہ راست استفادہ نہیں کیا۔ یہ بات ایک خبر متواتر کی طرح معروف و مسلم ہے۔ مثلاً علی بن حسین ابان بن عثمان سے اور وہ اسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح محمد بن علی حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ معصومین سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے دو صاحبزادوں حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اللہ کی قسم! آسمان سے زمین پر گر پڑنا میرے لیے اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھوں اور جب میں باہمی امور پر گفتگو کروں گا تو لڑائی میں فریب دہی کی اجازت ہے۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک بات کہہ کر اس سے رجوع کر لیا کرتے تھے، چنانچہ کتب شیعہ ائمہ سے نقل کردہ مختلف روایات سے لبریز ہیں۔

[اعتراض]: شیعہ کا یہ قول کہ: ''تم خلفا عن سلف روایت کرتے چلے جاؤ گے یہاں تک کہ ائمہ معصومین میں سے کسی امام تک پہنچ جائے گی۔''

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ: ''اگر یہ بات درست ہے تو ایک ہی معصوم سے روایت کرنا کافی ہے، ہر زمانے میں معصوم کی کیا ضرورت ہے؟ نیز جب نقل و روایت موجود ہے اور اس پر اکتفاء کیا جا سکتا ہے، تو اس امام منتظر کا کیا فائدہ جس سے ایک لفظ بھی منقول نہیں، اور اگر نقل ناکافی ہے تو شیعہ چار سو ساٹھ سال سے خسارہ و جہالت میں رہے۔

[1] مسند احمد(۱/ ۱۳۱) صحیح بخاری کتاب المناقب۔ باب علامات النبوۃ فی الاسلام (حدیث:۳۶۱۱)، صحیح مسلم کتاب الزکاۃ۔ باب التحریض علی قتل الخوارج (حدیث:۱۰۶۶)۔

شیعہ کی دروغ گوئی

روافض ائمہ پر دروغ بیانی کرنے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ امام جعفر صادق شیعہ کی دروغ گوئی کی خصوصی آماج گاہ ہیں، دروغ گوئی کی حد یہ ہے کہ انہوں نے مندرجہ ذیل کتب کو امام موصوف کی جانب منسوب کر رکھا ہے:

١۔کتاب الجفر و البطاقة ٢۔کتاب اختلاج الاعضاء۔

٣۔احکام الرعود والبروق ٤۔منافع القرآن۔

یہ کتب شیعہ فرقہ طرقیہ کا ذریعہ معاش ہیں۔

یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ صدق ناقل اور اتصال سند کو معلوم کیے بغیر کثرت سے جھوٹ بولنے والے شیعہ کی روایات پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ شیعہ کی دروغ گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کوفہ اور عراق کے باشندے بھی ان کی دیکھا دیکھی دروغ گوئی کے خوگر بن گئے اس کی حد یہ ہے کہ اہل مدینہ ان کی روایات کو قبول کرنے سے احتراز کرتے تھے، امام مالک رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

''اہل کتاب کی روایات کی طرح اہل عراق کی مرویات کی تصدیق کیجئے نہ تکذیب۔''

ایک مرتبہ محدث عبدالرحمٰن بن [1] مہدی نے امام مالک سے کہا:

''ابو عبداللہ! (امام مالک کی کنیت) ہم نے آپ کے شہر (مدینہ طیبہ) میں چالیس دن میں چار سو حدیثیں سنی ہیں، حالانکہ ہم (عراق میں) ایک دن میں اس قدر احادیث سن لیا کرتے تھے۔''

امام مالک نے فرمایا: ''ابو عبدالرحمٰن! آپ کی ٹکسال ہمیں کہاں نصیب! آپ راتوں کو ٹکسال میں حدیثیں گھڑتے اور دن میں ان کو پھیلاتے ہیں۔''

بایں ہمہ کوفہ میں بہت سے قابل اعتماد محدثین بھی موجود تھے۔ شیعہ کے کثرت کذب کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث میں مہارت نہ رکھنے والوں پر احادیث کی چھان پھٹک مشکل ہوگئی اور وہ صحیح وضعیف حدیث میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے کوئی اجنبی شخص ایک ایسے شہر میں داخل ہو جہاں کے باشندے سے آدھے دروغ پیشہ ہوں؛ تو وہ شخص جب تک کسی صادق اور ثقہ راوی کو پہچان نہ لے گا ان سے روایت نہیں کرے گا۔ یا جس طرح کسی شہر میں کھوٹے سکے زیادہ ہوں تو جو شخص کھرے کھوٹے میں تمیز نہیں کر سکتا معاملہ سے اجتناب کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ناقد کے لیے اہل بدعت کی کتب کا درس و مطالعہ جن میں روایات کا ذبہ کی بھر مار ہو؛ مکروہ ہے۔ اسی طرح افسانہ گو اور ان کے نظائر و امثال سے...... جو دروغ گوئی میں معروف ہوں ......علمی استفادہ ناروا ہے، اس امر میں علماء اسماء الرجال یک زبان ہیں کہ شیعہ سب فرقوں کی نسبت زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔

---

[1] عبدالرحمٰن بن مہدی کی کنیت ابو سعید اور نسبت لؤلوی بصری ہے۔ ان کی تاریخ ولادت و وفات (۱۳۵۔۱۹۸) ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ ان کے اساتذہ میں شعبہ بن حجاج، سفیان ثوری اور امام مالک کے نام قابل ذکر ہیں۔ عبداللہ بن مبارک اور امام احمد بن حنبل نے آپ سے روایت کی ہے یہ ہر سال حج کو جاتے اور ہر دو رات میں قرآن کریم ختم کیا کرتے تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''شیعہ رائے و قیاس کی جانب دھیان نہیں دیتے اور قیاس کو حرام قرار دیتے ہیں۔''

[جواب]: جہاں تک قیاس و رائے کا تعلق ہے اس میں اہل سنت اور شیعہ برابر ہیں۔ اہل سنت میں اہل رائے بھی ہیں؛ اور وہ بھی جو حجیت قیاس کے قائل نہیں۔ بغداد کے معتزلہ قیاس کو حجت قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح محدثین بھی قیاس کی مذمت کرتے ہیں۔ تاہم قیاس اور رائے کو حجت قرار دینا ایک مشہور جھوٹے اور غیر معصوم کے اقوال غیر مصدقہ کو مستند تصور کرنے سے بہتر ہے۔ یہ حقیقت کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ائمہ کبار کے نزدیک مسائل و احکام کی تنقیح و تخریج کیلئے اجتہاد کرنا شیعہ کے امام حسن عسکری اور ان کے فرضی بیٹے کی روایات کے ساتھ تمسک و احتجاج کرنے سے بہتر ہے۔

ائمہ دین مثلاً مالک، لیث، اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ حسن عسکری اور ان کے متعلقین زیادہ علم دین رکھتے تھے۔ اور امام عسکری کے لواحقین پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ ان حضرات سے علمی استفادہ کرتے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ علی بن حسین، ابوجعفر اور جعفر بن محمد عالم و فاضل تھے، ان کی اولاد میں کوئی عالم دین پیدا نہیں ہوا۔ بایں ہمہ وہ اپنے معاصر علماء سے علمی استفادہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

صفات باری اور اشاعرہ پر شیعہ بہتان:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''شیعہ کے علاوہ دیگر اہل اسلام مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اشاعرہ ذات اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ اور چیزوں کو بھی قدیم قرار دیتے ہیں، ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ صفات الٰہی موجود فی الخارج ہیں، اللہ کریم عالم ہونے میں صفت علم کا محتاج ہے اور قادر ہونے میں صفت قدرت کا'' وَهَلُمَّ جرًّا .''

اشاعرہ کی رائے میں اللہ تعالیٰ نہ قادر لذاتہ ہے، نہ عالم لذاتہ اور نہ حی لذاتہ۔ بخلاف ازیں ان صفات سے متصف ہونے میں وہ ان کا محتاج ہے، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نصاریٰ تین اشیاء کو قدیم مان کر کافر ہوگئے اور اشاعرہ نے قدماء کی تعداد نو تک بڑھا دی۔''

[جواب]: مذکورہ بالا امور کی تردید کئی طریقہ سے کی جاسکتی ہے:

وجہ اول: یہ اشاعرہ پر بہتان طرازی ہے، اشاعرہ میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ بذات خود کامل نہیں اور وہ اپنے کمال میں دوسروں کا محتاج ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی یہ بات کہیں نہیں لکھی۔ بلکہ امام رازی نے کسی کا یہ قول نقل کر کے اس کی مذمت بیان کی ہے۔ یہ صفات کی نفی کرنے والے جہمیہ کا پرانا اعتراض ہے، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جہمیہ کی تردید کرتے ہوئے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہم یوں نہیں کہتے کہ باری تعالیٰ ازلی ہے، اور اس کا نور و قدرت بھی ازلی ہے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ وہ اپنے نور و قدرت کے ساتھ ازلی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قدرت کی صفت اس میں کب آئی اور کیسے آئی؟

جہمیہ کہتے ہیں تم اس وقت تک موحد نہیں ہوسکتے، جب تک یہ نہ کہو کہ اللہ تعالیٰ ازل سے تھا اور دوسری کوئی چیز نہ تھی؟

ہم جواباً کہتے ہیں کہ:'' بلاشبہ اللہ تعالیٰ ازل سے تھا اور دوسری کوئی چیز نہ تھی، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ازل ہی

سے اپنی صفات کے ساتھ متصف تھا تو ہم تمام صفات کے ساتھ ایک ہی معبود کو موصوف قرار دیتے ہیں، ہم نے ایک مثال بیان کر کے جہمیہ پر اپنا مقصد واضح کیا ہے، دیکھئے یہ کھجور کا درخت ہے، یہ متعدد اشیاء سے مل کر بنا ہے، اس کے تنے ہیں، ٹہنیوں کی موٹی چوڑیاں ہیں، اس کی چھال ہے، شاخیں ہیں، پتے اور گوند ہے۔''

ان سب کو بحیثیت مجموعی ''نخلہ'' (کھجور کا درخت) کہا جاتا ہے، بعینہٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی جملہ صفات سے متصف معبود برحق ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ: ''باری تعالیٰ کسی وقت قدرت و علم سے عاری تھا، بعد ازاں اس نے علم و قدرت کو پیدا کیا، اور وہ ان سے متصف ہوا، حالانکہ جو علم و قدرت سے بہرہ ور نہ ہو وہ عاجز و جاہل ہوتا ہے، بخلاف ازیں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ عالم و قادر اور مالک رہا ہے، کب اور کیوں کر کا سوال لغو اور بیکار ہے۔''

✿ وجہ ثانی: مزید برآں یہ سب اشاعرہ کا قول نہیں۔ بلکہ صرف وہ اشاعرہ اس کے قائل ہیں جو حال کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں: ''عالمیت'' ایک حال ہے، جو معلل بالعلم ہے، ان کے نزدیک علم ایسے حال کا موجب ہے جو علم نہیں، بلکہ عالم ہوتا ہے امام باقلانی اور قاضی ابو یعلی رحمہما اللہ یہی نظریہ رکھتے ہیں، امام ابو المعالی رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

قائلین صفات کے دلائل:

بخلاف ازیں جمہور صفات کو ثابت ماننے والے کہتے ہیں:

''علم سے مراد عالم ہونا ہے، عالم وہی ہوتا ہے، جو علم سے بہرہ ور ہو اور قادر وہی ہے جو قدرت رکھتا ہو۔ مقصود یہ ہے کہ بلا علم کوئی عالم نہیں کہلا سکتا۔ جو قدرت سے بہرہ ور نہ ہو وہ قادر نہیں اور جو حیات سے محروم ہو وہ حی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اسم فاعل کا وجود مصدر کے بغیر ممتنع ہے، مثلاً صلوٰۃ [نماز] کے بغیر کوئی شخص مصلّی (نمازی) نہیں کہلا سکتا، روزہ کے بغیر صائم [روزہ دار] نہیں ہو سکتا اور نطق کے بغیر اسے ناطق نہیں کہہ سکتے۔ جب یہ کہا جائے کہ نماز کے بغیر کسی کو نمازی نہیں کہہ سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک نماز اور دوسرا حال معلل بالصلوٰۃ، بخلاف ازیں نمازی وہی ہوگا، جو نماز سے موصوف ہو۔''

منکرین صفات کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ زندہ ہے، مگر حیات سے بہرہ ور نہیں، اسی طرح وہ بلا قدرت قادر اور بلا علم عالم ہے۔ جو شخص باری تعالیٰ کو حی اور علیم و قدیر بالذات قرار دیتا ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات حیات اور علم و قدرت کو مستلزم ہے تو وہ دیگر کسی چیز کا محتاج نہیں، جو شخص منکرین صفات کے افکار و آراء پر زحمت غور و فکر گوارا کرتا ہے، اس پر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اثبات صفات کے لیے مجبور پاتے ہیں اور اپنے اور قائلین صفات کے اقوال و معتقدات میں کوئی نمایاں فرق ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ منکرین صفات بھی اللہ تعالیٰ کو حی، قادر اور عالم تسلیم کرتے ہیں، اور یہ نہیں کہتے کہ صفات عین ذات ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے ذات الٰہی پر ان زائد صفات کا اضافہ کر دیا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اہل سنت بہت سی چیزوں کو قدیم مانتے ہیں۔''

یہ ایک مبہم قول ہے جس کا مقصود واضح نہیں، اس سے وہم پیدا ہوتا ہے کہ اہل سنت ازل ہی میں ذات باری کے علاوہ متعدد معبود مانتے ہیں، یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے۔ اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ صفات قدیمہ سے موصوف ہے،

جس طرح اس کی ذات قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں، اس کا انکار ایک غلط کار اور ذلیل آدمی ہی کر سکتا ہے۔ لفظ ''اللہ'' اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ہر دو کو شامل ہے، صرف ذات مجرد کا نام نہیں ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے، کہ: ''اہل سنت کے نزدیک اللہ کا عالم ہونا صفت علم کے اثبات کا محتاج ہے۔''

[جواب]: یہ اعتراض مثبتین حال پر وارد ہوتا ہے، جمہور کی رائے میں ذات باری کا عالم ہونا ہی علم ہے اور بس! اگر یوں کہا جائے کہ اس کا عالم ہونا اس علم کا محتاج ہے جو لازم لذاتہ ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا محتاج ہے، اس لیے کہ اس کی ذات علم کو مستلزم ہے اور علم اس کے عالم ہونے کو مستلزم ہے، گویا اس کی ذات اس کی موجب ہے۔ بنا بریں علم بھی کمال ہے اور اس کا عالم ہونا بھی کمال، جب اس کی ذات ان دونوں کی موجب ہے، تو ایسے ہوا جیسے وہ حیات و قدرت کی موجب ہے۔

شیعہ مصنف کی غلط بیانی:

[اعتراض]: بقول شیعہ مصنف اہل سنت اللہ تعالیٰ کو عالم و قادر لذاتہ تسلیم نہیں کرتے۔

[جواب]: اگر شیعہ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت اللہ تعالیٰ کو منکرین صفات کی طرح علم و قدرت سے مجرد [خالی] نہیں مانتے تو یہ درست ہے؛ اس لیے کہ علم و قدرت سے مجرد ذات کا خارج میں کوئی وجود ہی نہیں اور اگر یہ مراد لیتا ہے، کہ اہل سنت اللہ کو عالم و قادر لذاتہ نہیں مانتے جو علم و قدرت کو مستلزم ہے تو یہ اہل سنت پر عظیم بہتان ہے کیونکہ اس کی ذات جو موجب علم و قدرت ہے یہی اس کے عالم و قادر ہونے اور اس کے علم و قدرت کو واجب ٹھہراتی ہے، اس لیے کہ یہ امور باہم لازم و ملزوم ہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے کہ: ''اہل سنت اللہ کو محتاج، ناقص فی ذاتہ اور کامل بغیرہ مانتے ہیں۔''

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ قول سراسر بے بنیاد ہے، اس لیے کہ ذات الٰہی صفات لازمہ سے موصوف ہے اور خارج میں کوئی ذات مجرد عن الصفات موجود ہی نہیں، علاوہ ازیں صفات ذات اللہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''نصاریٰ تین قدیم مان کر کافر ٹھہرے، مگر اشاعرہ کے نزدیک قدماء کی تعداد (نو) ہے۔''

[جواب]: جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کو اس لیے کافر قرار نہیں دیا کہ وہ تین قدماء تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں ''ثالث ثلاثۃ'' کہنے کی بنا پر انہیں کافر ٹھہرایا، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾ (المائدہ: ۷۳)

''بیشک اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے۔''

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ نصاریٰ کا جرم اللہ تعالیٰ لایزال کو ''ثالث ثلاثۃ'' قرار دینا تھا، اور اسی جرم کی پاداش میں انہیں کافر کہا گیا اب اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا: ''وَمَا مِنْ قَدِيْمٍ اِلَّا قَدِيْمٌ وَّاحِدٌ۔''

''صرف ایک ہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہیں۔''

اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: ﴿مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (المائدہ: ۷۵)

''مسیح ابن مریم تو بس ایک رسول تھے، بہت سے رسول آپ سے پہلے گزر چکے ہیں، آپ کی والدہ ایک راست باز خاتون

تھیں وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ﴾ (المائدہ: ۱۱٦)

''اور جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا، کہ مجھے اور میری والدہ دونوں کو اللہ کے سوا معبود بنالو، عیسیٰ نے کہا: ''تو اس سے پاک ہے۔''

المختصر! کتاب وسنت میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ قدیم بھی اللہ کا نام ہے، اگرچہ معنوی اعتبار سے یہ لفظ درست ہے۔

مزید برآں نصاریٰ خود اس بات کے معترف ہیں کہ حضرت مریم وعیسیٰ دونوں اس کائنات ارضی پر پیدا ہوئے تھے، للہذا حادث تھے، پھر وہ ان کو قدیم کیوں کر قرار دے سکتے تھے......؟

اشاعرہ پر اعتراض اور اس کا جواب:

مزید برآں صفات الٰہی کا اثبات کرنے والے یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ نو (۹) قدماء میں سے ایک ہے۔ بخلاف ازیں ان کے نزدیک لفظ ''اللہ'' ذات وصفات دونوں کا جامع ہے، وہ صفات باری کو بھی غیر ذات قرار نہیں دیتے۔

سرورکائنات ﷺ فرماتے ہیں: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔''[1]

حدیث صحیح میں اللہ تعالیٰ کی عزت[2] وحیات کے حلف اٹھانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی عزت وحیات کی قسم حلف بغیر اللہ میں شامل نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات آٹھ میں معدود ومحصور نہیں جیسا کہ بعض اشاعرہ کا قول ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کسی عدد میں بھی محدود نہیں ہے۔

نصاری تین اقانیم کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ: یہ تین جواہر ایک جوہر میں جمع ہیں، اقانیم ثلاثہ میں سے ہر اقنوم اللہ ہے جو پیدا کرتا اور رزق عطا کرتا ہے، کلمہ اور علم کے اقانیم مسیح کے ساتھ متحد ہیں، نصاری کے اس قول میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ متحد اگر صفت ہو تو صفت نہ پیدا کرتی نہ رزق عطا کرتی ہے ورنہ اپنے موصوف سے الگ ہوتی ہے۔ اور اگر صفت کا نام ہی موصوف ہے تو وہ جوہر واحد ہے اور وہی باپ ہے، اس سے مسیح کا باپ ہونا لازم آئے گا حالانکہ نصاری اس کے قائل نہیں، اب نصاریٰ کے عقیدہ کو ذہن میں رکھیے اور اہل سنت کے نقطۂ نظر پر غور کیجئے جو کہتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کے اسماء حسنیٰ اس کی صفات عالیہ پر دلالت کرتے ہیں اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ کوئی معبود۔''

ابن کلاب نے جب جہمیہ کی تردید میں کتاب تحریر کی تو انہوں نے ان کی بہن کے بارے میں ایک کہانی تصنیف کر ڈالی، کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ابن کلاب کی بہن نصرانی تھی، جب ابن کلاب مشرف باسلام ہوا تو بہن نے اس سے قطع تعلق کر

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الایمان والنذور۔ باب فی کراھیۃ الحلف بالآباء (حدیث: ۳۲۵۱)، سنن ترمذی۔ کتاب النذور والأیمان۔ باب ما جاء فی کراھیۃ الحلف بغیر اللّٰہ (حدیث:۱۵۳۵)

[2] صحیح بخاری۔ کتاب الأیمان والنذور۔ باب الحلف بعزۃ اللّٰہ و صفاتہ و کلامہ، و(ح:٦٦٦١، ۷۳۸۳)

[3] سنن ابی داوٗد، کتاب الایمان والنذور، باب ما جاء فی یمین النبی ﷺ ما کانت حدیث:۳۲٦٦۔

لیا، ابن کلاب نے کہا کہ میں تو مسلمانوں کے دین میں فساد پیدا کرنے کے لیے مسلمان ہوا ہوں، یہ سن کر وہ راضی ہوگئی۔

یہ کہانی گھڑنے والے کا مقصد یہ تھا کہ صفات باری کا اثبات نصاریٰ کا عقیدہ ہے، حالانکہ اہل سنت اور نصاریٰ کے نظریات کے مابین اتنا ہی فرق ہے جتنا بنیاد اور چوٹی میں۔

اہل سنت پر مجسمہ ہونے کا الزام:

[اعتراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''اللہ تعالیٰ کی ذات کو مخلوقات کے مماثل قرار دینے والے حشویہ ❶ کا قول ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ طول اور عرض و عمق رکھتا ہے۔ وہ مصافحہ بھی کرتا ہے، صلحاء دنیا میں اللہ تعالیٰ کی زیارت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ ❷ داؤد کے متعلق منقول ہے وہ کہا کرتا تھا: ''مجھ سے اللہ کی شرم گاہ اور داڑھی سے متعلق نہ پوچھو اور جو چاہو، دریافت کرو۔'' وہ یہاں تک کہتا تھا کہ میرا معبود جسم، گوشت اور خون رکھتا ہے، اس کے اعضا بھی ہیں۔ حشویہ کہتے ہیں کہ: اللہ کی آنکھیں دکھنے لگیں اور فرشتوں نے اس کی عیادت کی۔ طوفان آنے پر اللہ تعالیٰ اس قدر رویا کہ اس کی آنکھیں دکھنے لگیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ہشام بن حکم رافضی بھی تجسیم کا عقیدہ رکھتا تھا: متعدد ناقلین نے یہ نظریہ اس سے نقل کیا ہے، مثلاً ابوعیسیٰ الوراق زرقان ❸ ابن نوبختی، ابوالحسن اشعری، ابن حزم، شہرستانی اور علماء کی ایک جماعت نے یہ عقیدہ اس سے نقل کیا ہے۔

ان علماء کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے ذات باری پر جسم کا اطلاق کیا وہ ہشام بن حکم شیعہ تھا۔ سابق الذکر علماء نے بیان ❹ بن سمعان تمیمی...... ایک غالی شیعہ...... سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت انسان جیسی ہے، اس کا صرف

❶ عمرو بن عبید معتزلی نے سب سے پہلے حشویہ کا لفظ استعمال کیا اور کہا کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ حشوی تھے آغاز کار میں حشویہ سے عامۃ الناس مراد لیے جاتے تھے، کیونکہ حشو بھرتی کو کہتے ہیں، یعنی بھرتی کے لوگ، پھر دین میں عقلی ڈھکوسلوں کی پیروی کرنے والے متبعین سنت کو حشوی کا طعن دینے لگے، زیادہ تر معتزلہ ان کے پیرو روافض، شعوبیہ اور اہل الاہواء یہ لفظ استعمال کرتے تھے، ان کی رائے میں امام احمد بن حنبل اور ہر شخص جو حدیث صحیح سے استناد کرتا اور قیاس و رائے، کو نظر انداز کر دیتا ہو، حشوی ہے۔ جب اولین حشویہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حشویہ میں سے اوسط حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تھے تو ہر سنی کی یہ دلی آرزو ہے کہ یہ ان کا بستہ فتراک رہے اور آخرت میں انہی کے ساتھ اٹھایا جائے۔''

❷ یہ داؤد الجواربی کہلاتا تھا، امام ابوالحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین (۱/ ۲۵۸) میں اسے قائلین تجسیم میں شمار کیا ہے، علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں ہشام بن سالم جوالیقی کے بعد اس کا ذکر کیا ہے، اور بعینہ ابن المطہر شیعہ کا ذکر کردہ فقرہ اس سے نقل کیا ہے۔

❸ زرقان متعدد اشخاص کا نام و لقب ہے۔: ۱۔ محمد بن آدم مدائنی شیعہ۔ ۲۔ محمد بن عبداللہ بن سفیان زیات بغدادی محدث

۳۔ سیدنا ذوالنون مصری کے معاصر کا نام بھی زرقان بن محمد صوفی تھا۔

۴۔ اصمعی کے استاد کا نام ابوعمیر بن زرقان تھا، اس نے محمد بن سائب کلبی سے روایت کی ہے، ممکن ہے یہاں زرقان سے محمد بن آدم شیعہ مراد ہو، بشرطیکہ اس نے اسلامی فرقوں سے متعلق کوئی کتاب تصنیف کی ہو، تنقیح المقال میں اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے یہ بات ذکر نہیں کی اس نے فرقہ جات پر کوئی کتاب لکھی ہے، ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین میں اہل بدعت کے متعدد اقوال اس سے نقل کیے گئے ہیں، کتاب الفرق بین الفرق طبع ۱۳۶۷ (ص: ۴۲ و ۱۲۵) پر زرقان کا ذکر موجود ہے۔

❹ بیان بن سمعان اموی عہد خلافت میں ایک خبیث اور فریب کار شخص ہوا ہے۔ اس دور میں ''الوصفا'' نامی ایک جماعت پیدا ہوئی تھی، جس کا سرغنہ مغیرہ بن سعید تھا یہ ان سے ساز باز رکھتا تھا۔ یہ اعداء دین کی ایک جماعت تھی، جو اسلام کے استیصال کیلئے وجود میں آئی تھی۔ مالک بن سعید اور چند ذہین شعوبیہ اس کے ممبر تھے، ان کی جانب چند عقاید و افکار منسوب ہیں، جو انہوں نے جاہل مسلمانوں کو پھنسانے اور دین اسلام [......حاشیہ جاری ہے......]

چہرہ محفوظ رہے گا باقی جسم فنا ہو جائے گا، خالد بن عبداللہ قسری نے اسے قتل کر دیا تھا۔ مغیرہ بن سعید سے منقول ہے کہ اس کا معبود نور سے بنا ہوا ایک شخص ہے اس کے سر پر نور کا تاج رکھا ہے۔ اس کے اعضاء انسانوں جیسے ہیں وہ شکم اور دل بھی رکھتا ہے ابجد کے حروف اس کے اعضاء کی تعداد کے مطابق ہیں، وہ مردوں کو زندہ کرنے کے دعوے دار تھا اور لوگوں کو شعبدہ بازی کے کرتب دکھایا کرتا تھا، چنانچہ لوگوں نے اس کی نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

خالد بن عبداللہ نے (اپنے عہد امارت میں) اسے قتل کر دیا۔ ابو منصور ❶ کے متبعین جن کو منصوریہ کہا جاتا ہے، اس سے نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا: ''آل محمد آسمان ہیں، اور شیعہ زمین ہیں، اس کا دعویٰ تھا کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا۔ میرے معبود نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ''جا کر میرے دین کی تبلیغ کیجئے۔'' منصوریہ ان الفاظ کے ساتھ حلف اٹھایا کرتے تھے: ''لَا وَالْكَلِمَةَ ''ابو منصور کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ اس کا عقیدہ ہے کہ رسالت بند نہیں ہوئی۔ اس کی رائے میں جنت ایک آدمی کا نام ہے، اور جہنم بھی۔

سے منحرف کرنے کے لیے گھڑ رکھے تھے، دراصل یہ ان عقائد پر ایمان نہیں رکھتے تھے، بیان کے مخصوص افکار و معتقدات جن کا وہ داعی تھا وہ یہ تھے:

۱۔ حضرت علی الٰہ ہیں۔ ۲۔ الوہیت کا ایک جزاس میں حلول کر آیا اور اس کے جسم کے ساتھ متحد ہو گیا ہے۔

۳۔ وہ کہا کرتا تھا کہ: بعض اوقات میں ذات خداوندی کو دیکھا بھی کرتا ہوں۔

بیان بن سمعان آیت: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ ﴾ (البقرہ ۲۱۰)

''کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آ جائے۔''

کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بادل کے سایہ میں آئیں گے۔ بجلی کی کڑک ان کی آواز ہوگی اور اس کی چمک ان کی مسکراہٹ۔ بیان کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسرار پہلے ان کے فرزند محمد بن حنفیہ کی جانب منتقل ہوئے، اور پھر ان کے پوتے ابو ہاشم کی طرف۔ کچھ عرصہ کے بعد بیان نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابو ہاشم کی روح اس میں حلول کر آئی ہے۔ اور اس طرح بطریق تناسخ اس میں الوہیت سما گئی ہے۔ اسی اثنا میں بیان نے عمر بن ابی عفیف نامی قاصد کو محمد باقر کی طرف بھیج کر انہیں اپنی پیروی کی دعوت دی، محمد باقر نے قاصد کو حکم دیا کہ وہ دعوت نامہ نگل لے، چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کر دی، خالد بن عبداللہ قسری ان دنوں خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی جانب سے کوفہ کے گورنر تھے۔ جب ان کو بیان بن سمعان اور وصفاء کی جماعت کے حالات موصول ہوئے تو ۱۱۹ھ میں ان سب کو کوفہ کی جامع مسجد میں قتل کر دیا، وصفاء کی جماعت میں شامل ہونے والے نہ تو وہ کیسانیہ تھے جو محمد بن حنفیہ کے نام سے لوگوں کو دھوکہ دیا کرتے تھے اور نہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کی آل کا نام لے کر فریب دینے والے امامیہ، بخلاف ازیں یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و تابعین کے خلاف حقد و عداوت کا داعیہ لے کر اٹھے تھے اور یہی چیز ان کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا موجب بنی۔

❶ ابو منصور عجلی کوفہ کا رہنے والا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عبدالقیس کے موالی میں سے تھا۔ یہ امام باقر المتوفی (۵۹۔۱۱۶) کا معاصر تھا۔ اور آپ سے ملا کرتا تھا۔ اس کے خلاف اسلام عقائد سے متنفر ہو کر امام باقر اس سے بیزار ہو گئے تھے۔ امام باقر کی وفات کے بعد ۱۱۶ میں اس نے امام باقر کے وصی ہونے کا دعویٰ کر دیا، اور کہنے لگا: حضرت علی، حسن و حسین، علی بن حسین اور محمد باقر سب انبیاء تھے اور وہ بھی نبی و رسول ہے۔ اس کی چھٹی پشت تک نبوت جاری رہے گی۔ ان میں سے آخری شخص ''القائم'' ہوگا، جیسا کہ شیعہ علماء میں سے الکشی نے اعتراف کیا ہے۔ سب سے پہلے ابن سبا نے الوصی کا لفظ اختراع کیا۔ اسی طرح شیعہ فضلاء میں سے نوبختی کے بیان کے مطابق ''القائم'' کا لفظ اختراع کرنے والا ابو منصور تھا۔ گویا شیعہ حضرت علی کو وصی قرار دینے میں ابن سبا کے شاگرد ہیں اور تہ خانے میں چھپ رہنے والے مشکوک الولادت کو القائم کا لقب عطا کرنے میں ابو منصور کے تلمیذ رشید ہیں۔ ابو منصور کہا کرتا تھا کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا: اللہ تعالیٰ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سریانی زبان میں میرے ساتھ بات چیت کی پھر مجھے زمین پر اتارا گیا، آیت ذیل میں: ﴿ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ ﴾ (الطور: ۴۴) ''اگر آسمان سے ایک ٹکڑا (ڈوہ کا ڈوہ) گرتا ہوا دیکھیں۔''

جو کسف کا لفظ وارد ہے اس سے میری ذات مراد ہے۔ بعد ازاں کہا کرتا تھا کہ: کسف سے ذات الٰہی (یعنی خود ابو منصور) مراد ہے۔ وہ اپنے اتباع کو کہا کرتا تھا کہ مخالفین کا گلا گھونٹ کر انہیں قتل کر دیا کرو۔ جب یوسف بن عمر ثقفی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی جانب سے کوفہ کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے ابو منصور کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰ھ اور ۱۲۶ھ کے درمیان وقوع پذیر ہوا، ان دنوں یوسف بن عمر عراق پر حکمران تھا۔

وہ محرمات، خون، مردار اور شراب کو حلال قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قوموں کے نام ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی دوستی کو حرام ٹھہرایا ہے، وہ فرائض کو بھی ضروری تصور نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ آدمیوں کے نام ہیں، جن سے دوستی لگانا واجب ہے، یوسف بن عمر نے اسے قتل کر دیا تھا، فرقہ نصیریہ ❶ والے منصوریہ سے ملتے جلتے تھے۔

ابوالخطاب کے اتباع خطابیہ سے متعلق مذکور ہے کہ ان کی رائے میں ائمہ، انبیاء و رسل کا درجہ رکھتے ہیں، ان میں دو رسول ہر وقت موجود رہتے ہیں، ایک ناطق اور دوسرا ساکت، رسول ناطق محمد ﷺ ہیں، اور رسول صامت حضرت علی رضی اللہ عنہ، اس فرقہ کے لوگ ابوالخطاب کی عبادت کیا کرتے تھے، ابوالخطاب نے جب خلیفہ منصور کے خلاف خروج کیا تو عیسیٰ بن موسیٰ نے اسے کوفہ میں قتل کر دیا، خطابیہ کے نزدیک اپنے اعوان و انصار کے لیے جھوٹی شہادت دینا جائز ہے۔

❶ نصیریہ محمد بن نصیر کے پیرو ہیں، محمد بن نصیر بنی نمیر کے موالین سے تھا اور گیارہویں امام حسن عسکری المتوفی (۲۳۲۔۲۶۰) کی سکونت گاہ سامرا میں ان کے یہاں جایا کرتا تھا۔ جب ربیع الاول: ۲۶۰ھ میں امام عسکری لاولد فوت ہوگئے۔ تو آپ کے عقیدت مند اور ملاقاتی اس حقیقت کا اعتراف کر کے اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور خانہ نشین ہوگئے۔ امام حسن عسکری کے بھائی سید جعفران کی تدفین و تکفین میں مشغول ہوگئے اور اس اساس پر اس کا ترکہ تقسیم کیا گیا کہ ان کی کوئی اولاد نہیں۔ آپ کا کنبہ اور سب علوی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ امام عسکری بے اولاد ہیں۔ اس وقت ایک افسر بھی وہاں موجود تھا جس کے پاس ایک رجسٹر تھا۔ اس میں علویہ کی تاریخ ولادت مذکور تھی۔ اس وقت یہ ایک طے شدہ حقیقت تھی کہ امام عسکری لاولد تھے۔ تاہم نام نہاد ائمہ اہل بیت کے ارد گرد گھومنے والے غالی شیعہ کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے سمجھا کہ جس امر کی بنا پر وہ اہل اسلام کے خلاف جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے اب وہ باقی نہیں رہا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اس کا ایک حل تلاش کیا، اور وہ تھا امام غائب کا نظریہ......! انہوں نے یہ نظریہ گھڑ لیا کہ امام حسن عسکری کے یہاں ان کی وفات سے پانچ سال پہلے ایک لڑکا تولد ہوا تھا۔ اور وہ بمقام سامرا آپ کے گھر کے تہ خانہ میں پوشیدہ ہے۔ اس نظریہ کا موجد یا مشیر محمد بن نصیر تھا، محمد بن نصیر چاہتا تھا کہ وہ بارھویں من گھڑت امام اور ان کے اتباع و انصار کے مابین ایک واسطہ قرار پائے۔ اس واسطہ کو شیعہ اپنی اصطلاح میں ''الباب'' (دروازہ) کہتے تھے۔ امام حسن عسکری اور ان کے والد کا ایک خادم تھا جو اس کے گھر کے قریب ایک دکان میں گھی اور تیل فروخت کیا کرتا تھا، اس کا نام عثمان بن سعید تھا۔ اس کا ایک بیٹا بھی امام کی خدمت میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا اس کا نام محمد عثمان تھا۔ محمد بن نصیر کے رفقاء نے محسوس کیا کہ اگر محمد بن نصیر جیسے نو وارد کو ''الباب'' کے منصب پر فائز کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ دوسرے رفقاء اس پر رشک کرنے لگیں، خصوصاً جب کہ پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ فرضی امام کے لیے ان کے اتباع سے صدقہ فراہم کیا جائے۔ بریں بنا یہ بہتر ہوگا کہ گھی فروش اور اس کے لڑکے کو یہ منصب تفویض کیا جائے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ امانت محمد بن نصیر جیسے بااثر آدمی کی بجائے گھی فروش اور اس کے لڑکے کے پاس رہے۔ شیعہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ گھی فروش امام غائب کے والد اور دادا کی خدمت میں رہ چکا ہے اور اس طرح یہ راز محفوظ رہے گا اور لوگ اسے زائل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اس کے عین برخلاف محمد بن نصیر ''الباب'' کا منصب اختیار کرنے پر تلا ہوا تھا، مگر اس کے شرکاء مشورہ ہر قیمت پر اسے اس منصب سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد بن نصیر نے ناراض ہو کر امام غائب ہی سے انکار کر دیا، حالانکہ وہ خود اس عقیدہ کا تصنیف کنندہ تھا، چنانچہ اس نے شیعہ کا ایک جدید فرقہ تیار کرنے کی بنا ڈالی جن کے افکار و معتقدات بڑے عجیب و غریب ہیں، محمد بن نصیر کی جانب منسوب کر کے اس فرقہ کو نصیریہ کہتے ہیں۔ مشہور شیعہ عالم نوبختی اور دیگر متقدمین شیعہ بہت سی رسوا کن باتوں کو محمد بن نصیر کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ محمد بن نصیر بذات خود اپنے رفقاء و معاصرین سے متعلق ایسی باتوں کی تشہیر کیا کرتا تھا۔ اس کی تفصیلات ان کتب میں موجود ہیں جو اسلامی فرقہ جات اور ان کے عقائد و افکار کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں۔ شیعہ کا فرقہ نصیریہ مختلف مراحل و ادوار سے گزرا ہے، یہاں تک کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ المتوفی (۶۶۱۔۷۲۸) کا زمانہ آیا، شیخ الاسلام کا تلمیذ رشید شیخ شہاب الدین احمد بن محمود بن لہری شافعی نصیریہ کے بارہ میں لکھتا ہے:

نصیریہ کہتے ہیں: حضرت علی رب ہیں۔ محمد حجاب اور سلمان فارسی ''الباب'' (دروازہ)۔ جس اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا وہ حضرت علی ہیں۔ آپ ارض و سماء کے امام ہیں۔ اللہ (علی) کے اس زمین پر ظاہر ہونے کا مقصد یہ تھا کہ مخلوقات اس سے مانوس ہوں۔ وہ بندوں کو اپنی معرفت و عبادت کا طریقہ بتائے، فرقہ نصیریہ کے ہر فرد پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ مختلف انوار و ادوار میں ایسے امام اور رب کو پہچانے اور ہر زمانہ میں اس کے اسم و معنی میں جو تبدیلی ہوتی ہے اسے پہچانتا رہے، سب سے پہلے فرد کا نام آدم اور مفہوم شیث تھا، بعد ازاں اسم یعقوب اور معنی یوسف۔ پھر اسم موسیٰ اور معنی یوشع پھر نام سلیمان اور مفہوم آصف پھر نام عیسیٰ مسیح اور مفہوم شمعون تھا پھر نام محمد اور مقصود علی تھے، ایک شیعہ شاعر کہتا ہے: ......[حاشیہ جاری ہے]

شیعہ فرقے اور ان کے عقائد وافکار

شیعہ کے فرقہ بزیعیہ [1] سے متعلق منقول ہے کہ ان کی رائے میں جعفر بن محمد اللہ تھے۔ نیز یہ کہ ہر مومن پر وحی اتاری جا سکتی ہے۔ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

[گزشتہ حاشیہ......] ہابیل، شیث، یوسف ویوشع آصف شمعون الصفا حیدر

نصیریہ قدامت عالم اور تناسخ کا عقیدہ رکھتے ہیں، یہ جی اٹھنے کے منکر ہیں۔ اور جنت وجہنم کو ایک دنیوی رمز قرار دیتے ہیں۔ نصیریہ کے نزدیک پانچ نمازوں سے پنجتن یعنی حضرت علی، حسن وحسین محسن اور فاطمہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پنجتن کا نام ذکر کرنے کے بعد غسل جنابت وضو اور نماز کے باقی شروط وواجبات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان کے نزدیک روزہ سے تیس مرد اور تیس عورتوں کے اسماء مراد ہیں۔

ان کے نزدیک شراب حلال ہے، بقول ان کے (نعوذ باللہ من ذلک) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ (خاکم بدہن) سب سے بڑے ابلیس تھے، پھر حضرت ابو بکر، پھر حضرت عثمان، نصیریہ کی اصطلاح ہے، پانچ یتیم اور بارہ نقیب۔ آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں مصری حکومت کے یہاں نصیریہ سے متعلق سرکاری معلومات موجود تھیں۔ جن کو ابوالعباس احمد علی قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشیٰ (۱۳/ ۲۴۹۔۲۵۱) پر جمع کیا تھا۔ نصیریہ کے عقاید سے اخذ کر کے قانون بنایا گیا تھا کہ عدالتوں میں جب حلف دینے کی ضرورت لاحق ہو تو انہیں کس طرح حلف دیا جائے۔ نصیریہ کے متعلق سرکاری معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ سیدنا علی کی سکونت گاہ بادل ہے۔ ۲۔ بادل دیکھ کر نصیریہ کہا کرتے تھے: ''السلام علیک یا ابا الحسن''

۳۔ بادل کی گرج حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز اور بجلی کی چمک آپ کی ہنسی ہے، اسی بنا پر وہ بادل کی تعظیم بجا لاتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بھی رسول مانتے تھے۔

۴۔ نصیریہ حضرت علی کے قاتل ابن ملجم کو بنظر استحسان دیکھتے ہیں، بقول ان کے ابن ملجم نے لاہوت (سیدنا علی) کو ناسوت (عالم ارضی) سے چھڑایا، ابن ملجم پر لعنت کرنے والوں کو وہ خطا کار قرار دیتے ہیں۔

۵۔ ابن فضل اللہ العمری المتوفی (۷۰۰۔۷۴۹) اپنی تصنیف ''التعریف بالمصطلح الشریف'' میں لکھتے ہیں کہ نصیریہ شراب کی تعظیم بجا لاتے اور اسے نور تصور کرتے ہیں۔

۶۔ نصیریہ کی رائے میں انگور کی بیل قابل تعظیم ہے اور اس کا اکھاڑنا گناہ ہے، کیونکہ اس سے شراب تیار کی جاتی ہے۔

میں نے نصیریہ کے افکار ومعتقدات اور سیر وسوانح میں خاصی طوالت سے کام لیا ہے کیوں کر اس فرقہ کے افراد ہنوز دیار شام کے علاقہ لاذقیہ میں پائے جاتے ہیں۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ۲۸۹۰۰۰ (دو لاکھ نواسی ہزار) ہے۔ فرانسیسی استعمار کے زمانہ میں اہل فرانس نے اس فرقہ کے لیے مغرب میں رہنے والے بربر کے سے حالات پیدا کر دیئے تھے۔ جن کی تفصیل یہاں خارج از بحث ہے، نصیریہ نے سرزمین شام میں بود و باش رکھتے ہوئے، تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنا نام تبدیل کر کے ''علویہ'' رکھ لیا۔ نصیریہ میں سے صالح العلی نے انقلاب فرانس کے زمانہ میں بڑا کام کیا تھا، ان میں سے ایک شخص سلمان المرشد نامی نے تقیہ کے عقیدہ کے عین برعکس اعلانیہ رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ زمانہ نے نصیریہ میں ایسے ذہین آدمی پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مرور زمانہ کے باوصف نصیریہ کے قدیم افسانے تا حال پوری طرح صفحہ ارضی سے محو نہیں ہوئے۔

[1] یہ بزیع بن یونس بافندہ کے پیرو تھے، جو امام جعفر صادق المتوفی (۸۳۔۱۴۸) کا معاصر تھا، یہ اکثر امام موصوف کے گھر کے اردگرد گھوما کرتا تھا، جس سے اس کا مقصد اپنے غالی شیعہ کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا تھا، چونکہ یہ واشگاف الفاظ میں اپنا مقصد بیان کر دیا کرتا تھا، اس لیے امام جعفر نے اسے اپنی خصوصی لعنت کی آماج گاہ قرار دیا، اس کے رفقاء دین اسلام کی تخریب وتغییر کے لیے کوشاں رہتے تھے، مزید برآں وہ امام جعفر کی صحبت و رفاقت اور الفت ومودت کے مدعی تھے، وہ امام جعفر اور ان کے آباء کے پرستار بھی تھے۔

بزیع امام جعفر کی الوہیت کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ اپنے اور دوسروں کے لیے نزول وحی کا بھی دعوے دار تھا، وہ کہا کرتا تھا، جب شہد کی مکھی پر وحی نازل ہو سکتی ہے، تو ہم پر بالاولیٰ جائز ہوگی، جب بزیع کو قتل کیا گیا تو امام جعفر صادق نے فرمایا:

''الحمد للہ! ان مغیریہ کے حق میں سب سے بہتر چیز قتل ہے، اس لئے کہ یہ صرف حب اہل بیت پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ان کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے کہ لوگ دین اسلام سے منحرف ہو جائیں۔'' مغیریہ مغیرہ بن سعید کے پیرو تھے، ان کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔

بعض لوگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ نیز صوفیہ میں سے بعض زہاد کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں حلول کر آتا ہے۔ وہ جب کوئی اچھی چیز دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں: ''اس میں ذات الٰہی حلول کر آئی ہے۔''[1]

ان کا خیال ہے کہ بندہ جب اپنے معبود تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، تو اس سے واجبات ساقط ہو جاتے ہیں۔ بعض غالی روح القدس کو اللہ تصور کرتے ہیں یہ روح پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی، پھر حضرت علی اور پھر حضرت حسن میں منتقل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ یہ امام منتظر تک پہنچی۔[2] یہ سب ائمہ شیعہ کی نگاہ میں عقیدہ تناسخ کی بنا پر الوہیت کے مقام پر فائز ہیں، بعض شیعہ سرور کائنات کو برا بھلا کہتے ہیں اور حضرت علی کو الٰہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی الوہیت کی توضیح واشاعت کے لیے بھیجا تھا مگر آپ رسول بن بیٹھے۔

بعض شیعہ کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی، حسن وحسین اور فاطمہ میں حلول کر آیا ہے (مقالات اسلامیین: ۱/۸۲)

مندرجہ ذیل پانچ حضرات ان کی ضد ہیں: حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، معاویہ، اور عمرو بن عاص [رضی اللہ عنہم اجمعین]۔

شیعہ کا ایک فرقہ السبیئۃ کہلاتا ہے۔ یہ عبداللہ بن سبا کے پیرو ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی فوت نہیں ہوئے وہ دنیا میں لوٹ کر آئیں گے اور کرۂ ارضی کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔

السید الحمیری کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ مردے لوٹ کر دنیا میں آئیں گے۔ اس کا شعر ہے:

اِلٰی یَوْمٍ یَؤُبُ النَّاسُ فِیْہِ اِلٰی دُنْیَاھُمْ قَبْلَ الْحِسَابِ

''اس دن تک جب کہ لوگ حساب سے پہلے دنیا کی طرف لوٹ آئیں گے۔''

بعض شیعہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جملہ امور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کر دیے تھے چنانچہ آپ نے دنیا کو پیدا کیا اور اس کا نظام قائم کیا۔

شیعہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ: ائمہ شرعی احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں۔ اور فرشتے وحی لے کر ان پر نازل ہوتے ہیں۔ بعض شیعہ بادل کو سلام کہتے اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ قیام پذیر ہیں۔ امام اشعری نے اس کے علاوہ کچھ اور باتیں بھی ذکر کی ہیں اس وقت تک نصیریہ اور اسماعیلیہ عالم وجود میں نہیں آئے تھے۔

شیعہ کے عجیب وغریب عقائد:

شیعہ نصیریہ کے اشعار ہیں:

---

[1] صوفیہ کا نظریہ حلول ایک خطرناک مرض ہے اعداء اسلام نے اس کے جراثیم کو دین اسلام کے جسم میں پھیلا دیا تھا۔ اگر اسلام کے اصول ومبادی دیگر مذاہب وادیان کے مقابلہ میں اقوی واکمل نہ ہوتے تو وہ ان عظیم مصائب کے سامنے ٹھہر نہ سکتا۔ اور تشیع وفلسفیانہ تصوف کا سیلاب اسے خس وخاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص علی الصبح تصوف کا مسلک اختیار کرے اور چاشت کے وقت تک صوفی رہے اس کے احمق ہونے میں شبہ نہیں۔'' (دیکھیے حلیۃ الاولیاء ابو نعیم نیز مقدمۃ صفۃ الصفوۃ لا بن الجوزی)۔ صوفیہ فلسفۂ غیب کے مسئلہ میں اس قدر منہمک ہوئے کہ اس ضمن میں وارد شدہ نصوص صریحہ وصحیحہ کو بھی نظر انداز کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے اوہام وظنون میں ڈوب کر اس دھوئیں کی طرح ضائع ہوگئے جو فضا میں منتشر ہو جاتا ہے، ان کی حالت اس تنکا جیسی ہے جس سے آدمی لٹک جاتا ہے، مگر اس کا انجام کچھ نہیں ہوتا۔

[2] یہ شیعہ کا فرضی امام ہے جو ان کے زعم کے مطابق امام حسن عسکری کا بیٹا ہے، بقول شیعہ وہ تاہنوز بقید حیات ہے اس کی موت سے قبل حضرت ابوبکر وعمر اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین دوبارہ زندہ کیے جائیں گے وہ ان سے انتقام لے گا، ان کے انصار واعوان کو سخت سزائیں دے کر صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالے گا، پھر شیعہ کی دولت عظمیٰ قائم کرے گا اور مر جائے گا۔

اَشْهَـدُ اَنْ لَّا اِلٰـــهَ اِلَّا	حَيْدَرَةَ الْاَنْـزَعُ الْبَطِيْنُ
وَلَا حِـجَـابَ عَـلَيْـهِ اِلَّا	مُـحَـمَّـدُ الصَّادِقُ الْاَمِيْنُ
وَلَا طَـرِيْـقَ اِلَيْـهِ اِلَّا	سَـلْـمَانُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ

''میں گواہی دیتا ہوں کہ (حضرت علی) حیدر گنجے اور بڑے پیٹ والے کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نیز یہ کہ صادق وامین محمد کے سوا حضرت علی پر اور کوئی حجاب حائل نہیں ہے۔ حضرت علی کی طرف جانے کا راستہ صرف حضرت سلمان (فارسی) ہیں جو بڑے طاقت ور اور مضبوط تھے۔''

شیعہ کے نزدیک رمضان کا مقدس مہینہ تیس آدمیوں کے ناموں سے عبارت ہے مندرجہ بالا معائب (غلط عقائد) کے اولیں بانی وموسس شیعہ ہیں۔[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ شیعہ مصنف کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں]:

''جو بات تم نے نقل کی ہے، وہ ائمہ سنت، فقہاء حفاظ حدیث اور مشائخ طریقت میں سے کسی نے بھی نہیں کہی، ہم کسی شخص کو نہیں جانتے جو اللہ کے جسم اور اس کے طول وعمق کا عقیدہ رکھتا ہو، اس ضمن میں سب علماء یک زبان ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آخرت میں دیکھا جاسکے گا، دنیا میں نہیں، احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

''خوب جان لو کہ تم میں سے کوئی شخص موت سے قبل اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔''[1]

شیعہ مصنف کو چاہیے تھا کہ وہ اس قول کے قائل کا نام ذکر کرتا، ورنہ دروغ گوئی ہر کسی کے لیے ممکن ہے۔ تم نے حشویہ کا ذکر کیا ہے مگر کسی متعین شخص کا نام نہیں لیا، نہ جانے وہ کون ہیں؟ اور اگر حشویہ سے تم اہل حدیث مراد لیتے ہو تو وہ خالص سنت کے پیرو ہیں، اور ان میں ایک شخص بھی تمہاری ذکر کردہ بات کا معتقد نہیں۔

خلاصہ کلام! ''اس بات میں بھی تمہاری کذب بیانی الم نشرح ہوئی اور دوسرے اقوال میں بھی۔''

جہاں تک مشبہہ کے لفظ کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ جمیع اہل سنت ذات باری کو مخلوقات کی مماثلت سے منزہ قرار دینے میں یک زبان ہیں۔ مشبہہ وہ لوگ ہیں جو صفات باری کو صفات مخلوق کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ اہل سنت باری تعالیٰ کو انہی صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جو خود اللہ تعالیٰ یا نبی کریم ﷺ نے بیان کی ہیں وہ صفات الٰہی کو بلا تحریف وتعطیل اور بغیر کیفیت ومثال کے تسلیم کرتے ہیں۔ وہ صفات الٰہی کا اثبات کرتے ہیں مگر ان کی مثل کسی کو قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح وہ ذات اللہ تعالیٰ کو عیوب ونقائص سے منزہ مانتے ہیں مگر صفات سے معطل قرار نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ هُوَالسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اس آیت سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو صفات الٰہی کو صفات مخلوق کی مثل قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ آیت ان لوگوں کی بھی تردید میں وارد ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو صفات سے معطل ٹھہراتے ہیں۔

منکرین صفات کے اوہام وخیالات:

اہل سنت اللہ تعالیٰ کو صفات نقص مثلاً: نیند، اونگھ، نسیان اور عجز وجہل سے منزہ مانتے اور ان صفات کمال کیساتھ موصوف

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب ذکر ابن صیاد (حدیث: ۷۳۵۶)۔

قرار دیتے ہیں جو کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں۔ بخلاف ازیں منکرین صفات ذات الٰہی کی صفات کا اثبات کرنے والے ہر شخص کو مشبہ ٹھہراتے ہیں، باطنیہ یہاں تک کہتے ہیں کہ:

''جو شخص اللہ تعالیٰ کو اسماء حسنٰی سے موسوم کرتا ہے وہ مشبہہ میں سے ہے اور جو ذات باری کو حی اور علیم قرار دیتا ہے۔ وہ اس کو زندہ اور صاحب علم لوگوں کی مثل ٹھہراتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کو سمیع وبصیر کہتا ہے وہ اسے آدمی کی مانند تصور کرتا ہے۔ اور جو اللہ کو رؤف ورحیم تسلیم کرتا ہے وہ اسے رسول اللہ ﷺ کا مماثل ٹھہراتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات کو موجود بھی نہیں کہتے اس لئے کہ اس طرح باقی موجودات صفت وجود میں اس کی شریک ٹھہریں گی، بعینہ ہم اسے معدوم، حی اور میت بھی نہیں کہتے۔''

ہم باطنیہ کے ان نظریات کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس سے ذات الٰہی کا ممتنع الوجود ہونا لازم آتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح نقیضین کا اجتماع ممکن نہیں اسی طرح ان کا ارتفاع بھی ممنوع ہے۔ نظر بریں واجب الوجود کی نفی کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ممتنع الوجود ہے۔ باطنیہ کا یہ قول کہ ذات باری یہ نہیں اور وہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے حقائق کی نفی نہیں ہوتی بلکہ یہ فریب دہی کی ایک بدترین قسم ہے۔ جو شخص ذات باری کو ''لاموجود ولامعدوم'' قرار دیتا ہے، وہ عدم وثوق پر یقین رکھتا ہے۔ یاد رہے کہ مغالطہ بازی کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ حقائق کا انکار کرنا ۲۔ حقائق میں توقف کرنا اور کوئی فیصلہ صادر نہ کرنا۔

۳۔ حقائق کو ظنون واوہام کے تابع کر دینا۔

بعض علماء کے نزدیک سفسطہ کی ایک چوتھی قسم بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

۴۔ یہ کائنات ارضی جاری وساری ہے اور اسے کہیں قرار نہیں۔

باطنیہ کی بے راہ روی کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ لفظ تشبیہ میں اجمال وابہام پایا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر دو اشیاء کے مابین ایک قدر مشترک موجود ہے، جس کی بنا پر ذہن میں وہ دونوں چیزیں ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ وہ دونوں اس قدر مشترک میں برابر ہوں۔ بخلاف ازیں اکثر اوقات اشیاء کے درمیان قدر مشترک میں تفاضل پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ: ''فلاں فلاں زندہ ہیں اور فلاں فلاں صاحب علم ہیں۔'' تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علم وحیات میں ایک دوسرے کی مثل ہوں، اور نہ یہ کہ ایک شخص کی حیات وعلم بعینہٖ دوسرے کی حیات وعلم ہے۔ مزید برآں اس سے یہ نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا کہ وہ دونوں کسی موجود فی الخارج میں باہم سہیم وشریک ہیں۔ جہم بن صفوان اللہ تعالیٰ کو ان اسماء سے موسوم نہیں کیا کرتا تھا جس سے مخلوقات کو موصوف کیا جاتا ہے۔ البتہ وہ ذات باری کو قادر وخالق کہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہم جبر کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک بندے میں قدرت نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ باقی اشیاء کی طرح شے نہیں ہے۔'' اس سے ان کا یہ مقصود ثابت کرنا ہے کہ تشبیہ کی حقیقت اس سے منتفی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کتاب عزیز کے متعدد مقامات پر تمثیل کی نفی کی ہے، اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مانند کوئی چیز نہیں۔''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴾ (مریم: ٦٥)

''کیا اللہ کا کوئی ہم نام تجھے معلوم ہے۔''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ (اخلاص: ۴)

''اس کا کوئی ثانی نہیں۔''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا ﴾ (البقرۃ: ٢٢)

''اللہ کے لیے شریک نہ ٹھہراؤ۔''

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ﴾ (النحل: ۷۴)

''اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔''

جہاں تک جسم و جوہر اور تحیز و جہت کے الفاظ کا تعلق ہے کتاب و سنت میں نفیاً و اثباتاً ان کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ آثار صحابہ و تابعین میں بھی اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔ سب سے پہلے ان کی نفی و اثبات کے سلسلہ میں گفتگو کرنے والے جہمیہ، معتزلہ، اہل بدعت اور شیعہ کے مجسمہ تھے۔ منکرین صفات نے ان امور کی نفی کی اور اس میں اس حد تک غلو سے کام لیا کہ کتاب و سنت میں ثابت شدہ صفات مثلاً علم و قدرت، مشیت و محبت، رضا و غضب اور علو کی بھی نفی کر ڈالی۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ نہ وہ دیکھتا ہے اور نہ کلام کرتا ہے، خواہ قرآن ہو یا کچھ اور۔

مثبتین صفات کے افکار و آراء:

اس کے عین برخلاف صفات الٰہی کا اثبات کرنے والوں نے ان صفات کا بھی اقرار کر لیا اللہ و رسول نے جن کی نفی کی تھی۔ مثلاً ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کو دنیا میں ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ بقول انکے اللہ تعالیٰ مصافحہ و معانقہ کرتا ہے۔ اور عرفہ کی شام اونٹ پر سوار ہو کر نازل ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ نادم ہوتا، روتا اور اظہار رنج و الم بھی کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ صفات ہیں جو بنی نوع انسان کے ساتھ مختص ہیں۔ ہر ایسی صفت جو انسانوں کا خاصہ ہو وہ صفت نقص ہے اور ذات باری نقص سے منزہ ہے، اللہ تعالیٰ احد و صمد ہے، احد سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کوئی اس کا نظیر و مثیل نہیں، ''صمد'' تمام صفات کمال کو شامل ہے۔ مشہور لغوی اصمعی اور ابو زید کے قول کے مطابق جسم جسد یعنی بدن کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ﴾ (المنافقون: ۴)

''جب آپ انہیں دیکھیں تو ان کے جسم آپ کو پسند آتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ﴾ (البقرۃ: ۲۴۷)

''اور اسے علم اور جسم میں فراخی عطا کی۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ (الاعراف: ۱۴۸)

''ایک جسم دار بچھڑا تھا جس کی آواز تھی۔''

جسم کے لفظ سے بعض اوقات کثافت مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: ''هٰذَا اَجْسَمُ مِنْ هٰذَا'' (یہ اس سے زیادہ

کثیف ہے)۔متکلمین کے یہاں لفظ جسم بعد ازاں عام ترمعنی میں استعمال ہونے لگا چنانچہ انہوں نے ہوا کو بھی جسم قرار دیا۔ حالانکہ عرب اسے جسم نہیں کہتے ۔ متکلمین اس امر میں مختلف الخیال ہیں کہ جسم کسے کہتے ہیں؟۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کے یہاں حسب ذیل مذاہب پائے جاتے ہیں:

۱۔ جوہر فرد کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک جسم جواہر منفردہ متناہیہ سے مرکب ہے، نظام جسم کو جواہر متناہیہ سے مرکب قرار دیتا ہے، وہ ''طفرہ'' کا قائل ہے، جو اس کی معروف اصطلاح ہے۔

۲۔ بعض فلاسفہ کی رائے میں جسم مادہ وصورت سے مرکب ہے۔

۳۔ ہشامیہ، کلابیہ، تجاریہ، ضراریہ اور بہت سے کرامیہ کے نزدیک جسم کسی چیز سے بھی مرکب نہیں ۔ اکثر کتب میں یہ تیسرا مذہب مذکور نہیں۔

ان میں صحیح مسلک یہ ہے کہ جسم کسی چیز سے بھی مرکب نہیں، اسی بنا پر جو ہر فرد کی نفی کرنے والے کہتے ہیں کہ:'' حیوانات، نباتات اور معدنیات سب اعیان مخلوقہ ہیں۔

جو ہر فرد کا اثبات کرنے والے کہتے ہیں کہ:'' اللہ تعالیٰ اعراض وصفات کو پیدا کرتے ہیں، جواہر باقی رہتے ہیں اور ان کی ترکیب بدل جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:'' ایک حقیقت دوسری حقیقت میں تبدیل نہیں ہوتی، جنس بھی تبدیل نہیں ہوتی، بخلاف ازیں جواہر باقی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی ترکیب کو تبدیل کر دیتے ہیں۔''

اکثر فلاسفہ کے نزدیک ایک جسم دوسرے جسم میں اور ایک جنس دوسری جنس میں تبدیل نہیں ہوتی، جس طرح نطفہ پہلے منجمد خون میں تبدیل ہوتا ہے، پھر گوشت کے ٹکڑے کی صورت اختیار کرتا ہے اور پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہے، یہ فقہاء اور اطبا کا قول ہے، میرے علم کی حد تک تمام اہل مناظرہ اس بات پر متفق ہیں کہ جسم کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ رائے ان کے یہاں متنازع فیہ ہے کہ آیا جسم اجزائے منفردہ سے مرکب ہے یا مادہ وصورت سے یا کسی سے بھی مرکب نہیں۔

عقلاء کے تین اقوال:

عقلاء اس مسئلہ میں مختلف الرائے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز موجود ہو سکتی ہے، جو قائم بنفسہ ہو، مگر اس کی طرف اشارہ نہ کیا جا سکتا ہو، نہ اسے دیکھا جا سکتا ہو، اس میں تین اقوال ہیں:

پہلا قول: یہ ممکن نہیں بلکہ ممتنع ہے۔

دوسرا قول: یہ ان محدثات ممکنہ میں ممتنع ہے، جو وجود وعدم دونوں کو قبول کرتی ہیں۔

تیسرا قول: یہ ممکن و واجب دونوں میں ممکن ہے، یہ بعض فلاسفہ کا قول ہے۔ اہل مذہب میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں، یہ ایسی چیزوں کو مجردات و مفارقات سے موسوم کرتے ہیں۔ اکثر عقلاء کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ایسا صرف ذہنی اشیاء میں ممکن ہے، خارجی موجودات میں نہیں ۔ اس کا ثبوت اس روح سے ملتا ہے، جو عند الموت بدن انسانی سے الگ ہوتی ہے۔ جہاں تک ملائکہ کا تعلق ہے فلاسفہ ان کو عقول نفوس مجردہ اور جواہر عقلیہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اہل اسلام اور دیگر اہل ادیان و مذاہب ملائکہ کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ نور سے مخلوق ہیں، جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہے۔[1]

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الزھد۔ باب فی احادیث متفرقۃ (حدیث:۲۹۹۶)۔

نیز فرمان الٰہی ہے: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ (الانبیاء: ۲۶)
''انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے (فرشتوں کو) اولاد بنا لیا ہے، وہ (اولاد سے) پاک ہے، بلکہ فرشتے تو اس کے باعزت بندے ہیں۔''

ملائکہ کا ذکر کتاب عزیز کے متعدد مقامات پر ملتا ہے۔ اس کے عین برخلاف فلاسفہ جبریل امین کو عقل فعال یا ان خیالی صورتوں اور کلام الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، جن کا گزر سرور کائنات ﷺ کے قلب و دماغ پر ہوا کرتا تھا؛ جیسے سویا ہوا آدمی خواب میں طرح طرح کی چیزیں دیکھتا ہے۔ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے ارشادات عالیہ سے کلیۃً آگاہ ہے، وہ فلاسفہ کی ضلالت و جہالت سے آشنا ہے، اور بخوبی جانتا ہے کہ وہ مشرکین کی نسبت ایمان سے بعید تر ہیں۔

ذات باری کے مرکب ہونے میں اختلافِ آراء

جب جسم کی حقیقت کے بارے میں اہل مناظرہ کا اختلاف واضح ہوگیا تو اب اس میں مجال شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اجزائے منفردہ سے مرکب ہے، اور نہ مادہ وصورت سے، نہ وہ قابل انقسام ہے اور نہ تفریق وانفصال کو قبول کرتا ہے، ایسا بھی نہیں کہ پہلے وہ جدا جدا تھا پھر یک جا ہوگیا، بخلاف ازیں وہ احد وصمد ہے، اور وہ تمام معانی اس سے منتفی ہیں جن کی ترکیب کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے۔ مگر فلاسفہ اوران کے ہم نوا اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ:''جب وہ صفات سے موصوف ہے تو وہ مرکب ہوگا اور جب اس کی حقیقت ایسی ہے جو فقط وجود نہیں تو وہ مرکب ٹھہرے گا۔''

اس کے جواب میں صفات کا اثبات کرنے والے مسلمان کہتے ہیں:''نزاع لفظ ''مرکب'' میں نہیں۔ اس لفظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ غیر نے اسے ترکیب عطا کی اور کوئی عاقل نہیں کہتا کہ:''اللہ تعالیٰ اس لحاظ سے مرکب ہے، ذات اللہ تعالیٰ کے جامع صفات کمال ہونے مثلاً علم، قدرت اور حیات سے موصوف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مرکب ہے۔ لغت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بخلاف ازیں مرکب وہ ہے جس کے اجزاء الگ الگ ہوں، اور پھر اسے اختلاط یا غیر اختلاط کے طریقہ سے یک جا کر دیا جائے، جس طرح ماکولات، مشروبات، ادویات، تعمیرات، لباس اور زیور کو ترکیب دے کر بنایا جاتا ہے۔ مزید برآں تمام عقلاء ذات باری کے لیے متعدد صفات کا اثبات کرنے میں یک زبان ہیں۔ مثلاً معتزلہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حی، عالم اور قادر ہے، اس کا حی ہونا اور ہے اور قادر ہونا چیزے دیگر ہے۔ فلاسفہ کہتے ہیں کہ:''اللہ تعالیٰ عقل بھی ہے اور عاقل ومعقول بھی، وہ لذت بھی ہے، لذیذ ومتلذ ذ بھی۔''

[اعتراض]: [شیعہ کہتا ہے:] محقق طوسی شرح اشارات میں رقم طراز ہے:''علم عین معلوم ہے۔''

[جواب]: طوسی کا یہ قول صریح عقل کے منافی ہے۔ فلاسفہ صرف ترکیب کے مفہوم سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ترکیب کی نفی کے لیے ان کے یہاں کوئی دلیل موجود نہیں۔ وہ سب سے بڑی دلیل اس ضمن میں یہ پیش کرتے ہیں کہ مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے، اور اس کے اجزاء اس کے غیر ہیں۔ اور جو غیر کا محتاج ہو وہ واجب بنفسہ نہیں ہوسکتا بلکہ وہ معلول ہو گا۔ اس دلیل کے سب الفاظ کمزور ہیں۔ مثلاً واجب بنفسہ وہ ہے جس کا کوئی فاعل نہ ہو اور نہ علت فاعلہ، وہ کسی ایسی چیز کا محتاج نہ ہو جو اس سے مبائن ہو، وہ قائم بنفسہٖ ہو اور کسی مباین چیز کا محتاج نہ ہو۔ پہلی اور دوسری تعریف کی بنا پر صفات کا واجب

الوجود ہونا لازم آتا ہے۔ تیسری تعریف کی بنا پر جو ذات ان صفات سے موصوف ہے، وہی واجب ٹھہرے گی، صرف صفات کو واجب الوجود نہیں کہہ سکتے مگر وہ ذات سے جدا بھی نہیں۔

باقی رہا فلاسفہ کا یہ قول کہ جب اللہ کی ذات وصفات ہیں تو وہ مرکب ہوگا، اور مرکب اجزاء کا محتاج ہوتا ہے، اور اجزاء اس کے غیر ہوتے ہیں۔ اس میں غیر کا لفظ مبہم اور قابل توضیح ہے۔ اس سے مبائن مراد ہے، باہم غیر وہ دو چیزیں ہیں جو زمان ومکان یا وجود کے اعتبار سے جدا ہوسکیں اور ایک دوسرے کا عین نہ ہوں۔ یا وہ دو چیزیں کہ ان دونوں میں سے ایک کو جانتے ہوئے دوسری سے لاعلم رہنا جائز ہو۔ یہ اکثر معتزلہ اور ان کے اعوان و انصار کی رائے ہے۔ ائمہ سلف مثلاً امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک لفظ غیر کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے، اور اس پر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ علم الٰہی کو اس کا غیر بھی نہیں کہتے اور غیر ہونے کی نفی بھی نہیں کرتے۔

نظر بریں سلف صالحین یوں بھی نہیں کہتے کہ: ''علم الٰہی عین ذات ہے اور یہ بھی نہیں کہتے کہ وہ غیر ذات ہے۔''

جہمیہ کا یہ قول ہے: ''اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے، اس کا پیدا کردہ ہے، ماسوی اللہ میں کلام اللہ بھی داخل ہے، لہٰذا وہ بھی مخلوق ہے۔ بخلاف ازیں احادیث نبویہ سے صفات الٰہی مثلاً: ''اللہ تعالیٰ کی عزت وعظمت کی قسم کھانے کا جواز ثابت ہوتا ہے[1] حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔''[2]

اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوئی کہ صفات باری تعالیٰ کو عند الاطلاق غیر نہیں کہہ سکتے۔ جب غیر سے مراد یہ ہے کہ وہ بذات خود نہیں۔ تو بلاشبہ علم اور ہے اور عالم اور۔ اسی طرح کلام ومتکلم بھی ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ احتیاج سے تلازم مراد ہے یعنی وہ ایک دوسرے کے بغیر پائے نہیں جاسکتے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ ایک دوسرے میں مؤثر بھی ہوں، مثلاً باپ ہونا اور بیٹا ہونا کہ ایک کا معقول ہونا دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے کہ جہاں ابوت (باپ ہونا) ہوگی وہاں بنوت (بیٹا ہونا) بھی ہوگی۔ مرکب میں جو اشتراک پایا جاتا ہے، وہ معلوم ہو چکا۔ جب یوں کہا جائے کہ اگر وہ عالم ہے تو ذات اور علم سے مل کر بنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذات اور علم پہلے الگ الگ تھے اور پھر جمع ہو کر مرکب ہوگئے یہ بھی مراد نہیں کہ یہ ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں۔ بخلاف ازیں مقصود یہ ہے کہ عالم ہونے کی صورت میں ایک ذات ہے اور ایک علم جو اس کے ساتھ قائم و وابستہ ہے۔

فلاسفہ کی تردید:

فلاسفہ کا یہ قول کہ: ''مرکب اپنے اجزاء کا محتاج ہوتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ مجموع و مرکب کے محتاج اجزا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اجزاء نے اسے جنم دیا یا اجزا اس کے بغیر بھی موجود تھے، یا یہ کہ اجزا اس میں موثر ہیں۔ بخلاف ازیں مقصود یہ ہے کہ وہ مجموعہ کے بغیر پایا نہیں جاتا۔ جب یہ کہا جائے: ''ایک چیز اپنے آپ کی محتاج ہے'' ۔ اور اس کا مطلب یہی لیا جائے جو ہم نے بیان کیا تو یہ ممتنع نہیں بلکہ تقاضائے حق وصواب ہے۔ اس لیے کہ نفس واجب اپنے آپ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ جب کہا

---

[1] البخاري، كتاب الأيمان والنذور۔ باب الحلف بعزة الله وصفاته، تعليقاً و(ح: ٦٦٦١، ٧٣٨٣)

[2] سنن ابی داؤد: کتاب الأیمان والنذور۔ باب فی کراهية الحلف بالآباء (حدیث: ٣٢٥١)، سنن ترمذی، کتاب النذور والأیمان باب ما جاء فی کراهية الحلف بغير الله، (حدیث: ١٥٣٥)

جائے کہ اللہ تعالیٰ واجب بنفسہٖ ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے نفس نے اس کے وجوب کو جنم دیا، بلکہ مقصود و مراد یہ ہے کہ وہ بذات خود موجود ہے اور غیر کا دست نگر نہیں۔

جب کہا جائے: ''دس دس کے محتاج ہیں'' تو اس میں غیر کا ہرگز احتیاج نہیں۔ جب کہا جائے کہ دس ایک کے محتاج ہیں جو ان کا ایک جزو ہے تو اجزاء کی جانب یہ احتیاج و افتقار اس احتیاج سے بڑھ کر نہیں جو اسے مجموعہ کی جانب حاصل ہے۔ نظر بریں خالق و مبدع کا مستلزم صفات ہونا کسی حجت کی نفی نہیں کرتا، اور ظاہر ہے کہ اس تلازم کو فقر و احتیاج سے تعبیر نہیں کر سکتے۔

صفات قائمہ بالموصوف اس کا جزء نہیں:

مزید برآں صفات قائمہ بالموصوف کو جزء قرار دینا لغت کے خلاف ہے۔ یہ صرف فلاسفہ کی وضع کردہ اصطلاح ہے۔

تاہم اگر ہم فلاسفہ کے اس مفروضہ کو تسلیم کر لیں تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں۔ فلاسفہ اور ان کے اتباع کی تخویف و تہویل اس ضمن میں ناقابل التفات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم بالاشیاء کی نفی کرنے والے کہتے ہیں کہ: ''اس سے ''کثرت'' لازم آتی ہے۔'' اس کے پہلو بہ پہلو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عالم جزئیات ہونے کی نفی کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ: ''اس سے اللہ کا تغیر پذیر ہونا لازم آتا ہے۔'' گویا وہ تکثیر و تغیر کے بھاری بھرکم الفاظ سے دوسروں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں الفاظ حد درجہ مبہم ہیں اور ان کا مطلب واضح نہیں۔ اس سے وہ دوسروں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ صفات کا اثبات کرنے سے اللہ کا متعدد اور کثیر تعداد ہونا لازم آتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ انسان کی طرح تغیر پذیر ہے اور وہ اس طرح بدلتا رہتا ہے، جیسے زرد ہو کر آفتاب کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ان اقوال کا متکلم اس حقیقت سے یکسر ناآشنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی حادث چیز کو پیدا کرتا ہے، اپنے بندوں کی دعا سنتا ہے، یا اپنی مخلوقات کو دیکھتا ہے تو فلاسفہ اسے تغیر سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہونا اور اطاعت شعاری سے راضی ہونا بھی تغیر ہے۔ مزید برآں یہ نفی و انکار کسی دلیل پر مبنی نہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ خود ہی اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں شرعی و عقلی دلائل و براہین سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام! مدعی کا یہ دعویٰ کہ جس چیز کی طرف اشارہ کیا جائے، وہ جسم مرکب ہے قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔

جمہور اہل اسلام جو اللہ تعالیٰ کو مجسم قرار نہیں دیتے، وہ کہتے ہیں کہ: ''جو شخص اللہ کو جسم کہتا ہے، اور اس سے یہ مراد لیتا ہے کہ وہ موجود ہے یا قائم بنفسہٖ ہے یا اسے جوہر کہہ کر یہ مراد لیتا ہے کہ وہ قائم بنفسہٖ ہے تو وہ الفاظ میں خطاء کار ہے معنی میں نہیں۔ جب وہ یہ کہے کہ ذات اللہ تعالیٰ جواہر منفردہ سے مرکب ہے تو اس کے کفر میں شبہ نہیں۔

جسم کو جواہر سے مرکب قرار دینے والوں کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ جسم کا مسمّٰی کیا ہے؟

۱۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ جب جوہر واحد کے ساتھ کسی اور چیز کو ملایا جائے تو اسے جسم کہتے ہیں، ابن الباقلانی، ابو یعلی اور دیگر علماء رحمہم اللہ کا نقطۂ نظر یہی ہے۔

۲۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ دو یا زیادہ جوہر جب مل جاتے ہیں تو جسم تشکیل پاتا ہے۔

۳۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ چار یا چار سے زیادہ جواہر کے ملنے سے جسم قرار پاتا ہے۔

۴۔ چوتھے مذہب کے مطابق چھ یا چھ سے زیادہ جواہر کا ہونا ضروری ہے۔

۵۔ جسم کی تشکیل کے لیے آٹھ جواہر کا وجود ناگزیر ہے۔

۶۔ چھٹا مذہب یہ ہے کہ جسم کی ساخت کے لیے سولہ جواہر مطلوب ہیں۔

۷۔ ساتویں مذہب کے مطابق جسم کم از کم بتیس جواہر سے مرکب ہوتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ لفظ جسم میں بے شمار لغوی، اصطلاحی، عقلی اور شرعی تنازعات پائے جاتے ہیں۔ جن کا تقاضا ہے کہ اس ضمن میں باقی مباحث کو چھوڑ کر صرف کتاب وسنت کی پیروی کی جائے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران:۳/ ۱۰۳)

''سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور فرقے نہ بنو۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الاعراف:۳)

''جو (کتاب) تمہاری جانب تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اس کی پیروی کرو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنَافِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ (النساء: ۴/ ۶۱)

''جب انہیں کہا جاتا ہے کہ رسول کی طرف آؤ اور اس (کتاب) کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ منافقین آپ سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''جو شخص قرآن کریم پڑھتا اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے کہ وہ دنیا میں گمراہ ہوگا نہ آخرت میں اجر وثواب سے محروم رہے گا، پھر یہ آیت پڑھ کر سنائی:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ (طٰہٰ:۱۲۴)

''جو میرے ذکر سے منہ موڑتا ہے، اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔''[1]

جسم، جوہر اور جہت کے الفاظ سے احتراز:

بہر کیف اللہ و رسول ﷺ نے جس بات کا اثبات کیا ہے ہم اس کا اثبات کرتے ہیں اور جس کی نفی کی ہے اس کی نفی کرتے ہیں۔ ہم اثبات ونفی میں لفظاً ومعناً نصوص کے پیرو ہیں۔ جہاں تک ان الفاظ کا تعلق ہے جو ان کے ایجاد کنندگان کے یہاں مختلف فیہ ہیں، مثلاً جسم، جوہر، تحیز، جہت، ترکب اور تعین وغیرہ؛ ہم نفیاً واثباتاً اس وقت تک ان کا اطلاق نہیں کریں گے، جب تک یہ معلوم نہ کر لیں کہ ان کے قائل کا مقصود کیا ہے۔ اگر وہ نفی واثبات میں صحیح اور موافق نصوص معنے مراد لیتا ہو تو ہم اس معنی کو صحیح قرار دیں گے اور اس من گھڑت اور مجمل لفظ کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تاہم بوقت ضرورت فریق مقابل کی اصطلاح کے مطابق ہم اس کو استعمال کریں گے بشرطیکہ قرائن کی مدد سے مفہوم صاف سمجھ میں آتا ہو۔

مثلاً مخاطب ایسا شخص ہو جو صرف اسی لفظ سے مفہوم کو سمجھ سکتا ہو۔ تاہم ان الفاظ کو غلط معانی پہنانا صریح قسم کی بے راہ روی ہے۔ اگر مخاطب ایسے الفاظ سے حق وباطل دونوں قسم کے معانی مراد لیتا ہو تو اس کے سامنے حق کو باطل سے نکھار دیا جائے، اگر

[1] تفسیر ابن ابی حاتم(۷/ ۲٤۳۸، ۲٤۳۹)، تفسیر درمنثور(۵/ ٦۰۷)، مستدرك حاکم (۲/ ۳۸۱)۔

دو شخص ایک معنی میں متحد الخیال ہوں اور دلائل میں اختلاف ہو تو اقرب الی الصواب وہ ہے جس کی تائید لغت سے ہوتی ہو۔

متحیز لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جسے کسی چیز نے گھیر رکھا ہو، قرآن میں ہے: ﴿مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ﴾ (الانفال: ۱۶)

متحیز لازماً وہ چیز ہے جس پر کسی وجودی چیز نے احاطہ کر رکھا ہو۔ چونکہ مخلوقات میں سے کوئی چیز ذات باری کا احاطہ نہیں کر سکتی، لہٰذا لغوی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کو متحیز نہیں کہہ سکتے۔

متکلمین کی اصطلاح میں متحیز عام ہے۔ وہ ہر جسم کو متحیز کہتے ہیں: اور جسم ان کی اصطلاح میں وہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ بنا بریں ان کے نزدیک زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ متحیز ہے۔ مگر لغت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ وہ حیز سے امر معدوم مراد لیتے ہیں اور مکان سے امر موجود جو حیز عدمی کے خلاف ہو۔ لہٰذا جملہ اجسام جو کسی موجود چیز میں واقع نہیں، وہ کسی مکان میں نہیں، امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ حیز کو کبھی موجود قرار دیتے تھے اور کبھی معدوم۔

کیا اللہ تعالیٰ متحیز ہے؟:

عقل و نقل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے جدا ہے۔ اس لیے کہ وہ مخلوقات سے قبل بھی موجود تھا۔ پیدا کرنے کے بعد یا تو وہ ان مخلوقات میں داخل ہو گیا ہوگا یا مخلوقات اس میں سما گئی ہونگی، یہ دونوں باتیں ممتنع ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ مخلوقات سے جدا ہے۔ اس کی نفی کرنے والے کہتے ہیں کہ: ''وہ مخلوقات میں داخل ہے نہ ان سے جدا ہے، یہ بات خلاف عقل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ عقلاً ممتنع نہیں۔ بلکہ اس کو ممنوع قرار دینا قوت وہمیہ کی کرشمہ سازی ہے۔ بایں ہمہ ان کے افکار و آراء میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تو وہ جسم ہوگا کیوں کر اس کا آس پاس سے متحیز ہونا ضروری ہے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا: ''یہ بات عقل سے ثابت ہے کہ فوق العالم ایک ایسے موجود کا اثبات جو جسم نہیں ہے اقرب الی العقل ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک ایسے قائم بنفسہٖ کا اثبات کیا جائے جو نہ اس کائنات ارضی سے جدا ہے اور نہ اس میں داخل ہے۔

اسی طرح لفظ جہت سے امر موجود بھی مراد ہوتا ہے، جیسے فلک اعلیٰ اور امر معدوم بھی، جیسے ماوراء العالم۔ دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ: ''ہر جسم ایک جہت میں ہے۔'' جب پہلے معنی مراد لیے جائیں تو ایک جسم کا دوسرے جسم میں ہونا ممتنع ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ جہت میں ہے اور اس سے امر موجود مراد لے اس لیے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے، اس کی مخلوق ہے تو ایسا شخص یقیناً غلطی پر ہوگا۔ اور اگر جہت سے امر معدوم یعنی مافوق العالم مراد لے، اور یوں کہے کہ: ''اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے، تو یہ قول درست ہوگا۔ چونکہ فوق العالم اس کے سوا دوسری کوئی چیز موجود نہیں بنا بریں اللہ تعالیٰ موجودات میں سے کسی چیز میں حائل نہ ہوگا۔''

مشبہہ کون ہیں؟

مذکورہ بالا بیانات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ شیعہ مصنف اور اس کے ہم نوا اگر مشبہہ سے وہ لوگ مراد لیتے ہیں جو اللہ کے لیے ایسے اسماء کا اثبات کرتے ہیں جن سے بندوں کو بھی موسوم کر سکتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف باقی اسلامی فرقے بلکہ خود شیعہ بھی مشبہہ ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ اور اگر مشبہہ سے اس کی مراد وہ لوگ ہیں جو صفات باری کو

انسانی صفات کی مثل قرار دیتے ہیں تو ان کے گمراہ ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایسے لوگ شیعہ میں باقی فرقوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں۔

شیعہ مصنف کی یہ ستم ظریفی موجب حیرت واستعجاب ہے کہ وہ بعض الفاظ کو استعمال تو کرتا ہے مگر ان کے معنی اور موارد کے استعمال سے قطعی نابلد ہوتا ہے۔ وہ خود ہی ایک بنیاد قائم کرتا ہے، اور پھر اسی مفروضہ اساس پر اپنے خیالات کی عمارت استوار کرنا شروع کر دیتا ہے۔

شیعہ مصنف جہاں حشویہ مشبہہ کا ذکر کرتا ہے، وہاں اس کی مراد عراق وبغداد کے حنابلہ ہوتے ہیں۔ یہ اس کی جہالت کا بین ثبوت ہے، اس لیے کہ حنابلہ باقی اہل سنت سے کسی قول میں بھی منفرد نہیں ہیں۔ اور وہ وہی عقائد رکھتے ہیں جو باقی اہل سنت کے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب قدیم بھی ہے اور معروف ومشہور بھی۔ یہ اس وقت بھی معروف تھا، جب امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ یہ صحابہ کرام کا مذہب ہے، جنہوں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا۔ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک بدعتی ٹھہرے گا۔ اس لیے کہ اجماع صحابہ کی حجیت میں سب اہل سنت متحد الخیال ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں، البتہ علماء اس امر میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا صحابہ کے بعد آنے والے حضرات (تابعین وتبع تابعین) کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا دور ابتلاء:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو امام اہل سنت اور امام الصابرین قرار دینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کسی مسئلہ میں باقی ائمہ سے منفرد تھے یا آپ نے بذات خود کوئی قول گھڑ لیتا تھا۔ بخلاف ازیں اس کی وجہ یہ تھی کہ سنت آپ سے پہلے موجود تھی اور لوگ اس سے آشنا چلے آتے تھے۔ آپ نے صرف یہ کیا کہ سنت کی نشر واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ترک سنت پر مجبور کیا گیا تو اس ابتلاء میں صبر واستقامت کا دامن تھامے رکھا۔ باقی ائمہ دور ابتلاء سے قبل وفات پا چکے تھے۔ جب تیسری صدی ہجری کے اوائل اور خلیفہ مامون اس کے بھائی معتصم اور واثق باللہ کے عہد خلافت میں صفات الٰہی کا انکار کرنے والے جہمیہ نے انکار صفات کا بیڑا اٹھایا...... جسے متاخرین شیعہ نے بھی تسلیم کر لیا تھا...... بہت سے امراء وحکام بھی اس ضمن میں جہمیہ کے ہم نوا بن گئے، تو اہل سنت نے اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارباب اقتدار نے بعض علماء کو قتل کی دھمکی دی۔ بعض کو قید وبند کی صعوبتوں میں ڈالا اور طرح طرح سے ڈرایا دھمکایا اور لالچ دلا کر اس نظریہ سے باز رکھنا چاہا۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنے عقیدہ پر ڈٹے رہے، جس کے نتیجہ میں انہیں عرصہ دراز تک محبوس رکھا گیا۔

آخر مناظرہ کی ٹھانی اور اس مقصد کیلئے معتزلی علماء کو بلایا مگر سب نے منہ کی کھائی۔ امام اہل سنت کے سامنے لاجواب ہو گئے اور آپ کو دلائل کے ساتھ قائل نہ کر سکے۔ دوسری جانب امام موصوف نے ان کی ایک ایک غلطی کی قلعی کھول کر رکھ دی، اور ان کے دلائل کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ مخالفین نے مناظرہ کے لیے بصرہ اور دیگر اسلامی بلاد وامصار کے بڑے بڑے ماہرین علم الکلام کو بلایا تھا' جن میں حسین نجار کے تلمیذ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

یہ مناظرہ صرف فرقہ معتزلہ ہی کے خلاف نہ تھا، بلکہ جہمیہ کے سب فرقے مثلاً معتزلہ، نجاریہ، ضراریہ اور اسی طرح مرجیۂ کے سب فرقے امام کے خلاف امنڈ آئے تھے۔ جہمیہ ومعتزلہ کے مابین نسبت یہ ہے کہ ہر جہمی کا معتزلی ہونا ضروری نہیں، اور

ہر معتزلی، جہمی ضرور ہوتا ہے۔ البتہ جہم کا قدم نفی صفات میں معتزلہ سے آگے ہے اس لیے کہ وہ اسماء وصفات الٰہی دونوں کی نفی کرتا ہے۔ بخلاف ازیں معتزلہ صرف صفات کے منکر ہیں۔ بشر مریسی کبار جہمیہ میں سے تھا اور مرجیہ کا ہم نوا تھا، وہ معتزلی نہ تھا۔ حامی سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مبتلائے مصائب ہونے کی وجہ سے مذکورۃ الصدر مسائل میں بڑے زور کے معرکے بپا ہونے لگے۔ انہی حوادث میں مبتلا ہونے کی بنا پر امام احمد رحمہ اللہ اور ان کے اتباع کرام بارگاہ ربانی میں بڑے اونچے مرتبہ پر فائز ہوئے۔

روافض نے اپنی ڈفلی الگ بجانا شروع کی، ہر زاویہ نگاہ کے مسلمانوں کو تنقید شدید کا نشانہ بنایا اور کہنے لگے کہ وہ اصول وفروع دونوں کو ترک کر چکے ہیں۔ اور صرف شیعہ ہی ایک ایسا فرقہ ہے جو جرح وقدح سے بالا ہے۔ حالانکہ کرۂ ارضی کے تمام سلیم العقل مسلمان اس امر میں اتفاق رائے رکھتے ہیں کہ اہل قبلہ کے تمام فرقوں میں شیعہ کا گروہ جہالت وضلالت اور کذب وبدعت میں سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ گروہ ہر شر سے قریب تر اور ہر خیر سے بعید تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو الحسن اشعری رحمہ اللہ نے جب مختلف فرقوں کے عقائد وافکار پر: ''مقالات الاسلامیین'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تو سب سے پہلے شیعہ کے عقائد کا ذکر کیا اور اسے اہل سنت والحدیث کے افکار و آراء پر ختم کیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کیا کہ وہ خود بھی اہل سنت ومحدثین کے عقائد رکھتے ہیں اور اسی مسلک پر گامزن ہیں۔

مذکورۃ الصدر بیانات اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ شیعہ مصنف کا اہل الآثار [1] والاثبات کو مشبہہ کے نام سے موسوم کرنا بعینہ اسی طرح ہے جیسے شیعہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت کے قائل کو اس لیے ناصبی کہتے ہیں کہ ان کی رائے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عقیدہ اسی صورت میں درست تسلیم کیا جا سکتا ہے، جب خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے براءت کے اظہار کیا جائے۔ حالانکہ ناصبی دراصل وہ ہے جو اہل بیت سے بغض وعناد رکھتا ہو، [2] اسی طرح مشبہہ وہ ہیں جو صفات الٰہی کو بندوں کی صفات کی طرح خیال کرتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کسی کی مدح یا مذمت کرنا چاہتا ہے، اس پر لازم ہے کہ ممدوح ومذموم کا ان اسماء والقاب میں داخل ہونا ثابت کرے جن پر مدح وذم کا انحصار ہے، جب وہ اسم ولقب ہی شرعاً ثابت نہ ہو اور ممدوح ومذموم کا اس میں

---

[1] اہل الآثار وہ ہیں جو خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول احادیث وآثار کی پیروی کرتے ہیں، اس لیے کہ آپ نیکی کی تعلیم دیتے اور اللہ کی طرف سے ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث کیے گئے تھے۔ اہل الاثبات وہ ہیں جو اللہ ورسول کے ثابت کردہ غیبی امور کا اثبات کرتے ہیں، صفات الٰہی بھی غیبی امور میں سے ہیں، اور وہ ان پر ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کی شرط کے مطابق ایمان رکھتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ صفات کی تاویل کرتے ہیں نہ ان میں تبدیلی کا ارتکاب کرتے ہیں، اس لیے کہ مخلوقات میں غیبی امور کا علم رکھنے والا اللہ ورسول سے زیادہ اور کوئی نہیں۔

[2] اہل بیت کے ساتھ عظیم ترین بغض یہ ہے کہ ان پر جھوٹ کا طوفان باندھا جائے اور دین میں ایک ایسے فرقہ کی طرح ڈالی جائے جو ان کے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے ٹکراتا ہو۔ اور پھر اس سے بڑھ کر ظلم وبہتان اور کیا ہوگا کہ امت محمدی کے ان چیدہ وبرگزیدہ اصحاب کو مورد طعن بنایا جائے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اہل بیت کے ساتھ یہی وہ بدترین بغض ہے شیعہ جس کا عرصہ دراز سے ارتکاب کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور جوں ہی زمانہ گزرتا ہے، ان کا یہ بغض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ چنانچہ آپ اس کتاب میں آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغۃ کے اوراق مذمت صحابہ رضی اللہ عنہم سے پر ہیں اور کوئی شیعہ عالم ایسا نہیں جس نے صحابہ کی مذمت نہ کی ہو اور ان سے براءت کا اظہار نہ کیا ہو۔

داخل ہونا بھی متنازع ہو تو مدح و ذم دونوں باطل ٹھہرے۔

یہ امر پیش نظر رہے کہ کتاب وسنت میں ناصبہ، حشویہ، مشبہہ اور رافضہ کے الفاظ مذکور نہیں جب ہم رافضہ کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد اس سے شیعہ فرقہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے سب فرقے اس میں داخل ہیں گویا رافضہ کا لفظ جہلاء اور محروم صدق و یقین لوگوں کے لیے علم و لقب کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیعہ مصنف کی کم سوادی:

شیعہ مصنف کا ''داؤد طائی'' کہنا جہالت کی کرشمہ سازی ہے، صحیح ''داؤد جوار بی ہے'' امام اشعری رحمہ اللہ نے بھی اس کا یہی نام ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ''داؤد جوار بی اور مقاتل بن سلیمان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہے، اور اسکے انسان جیسے اعضاء ہیں، وہ گوشت پوست، خون، بال، ہڈیاں اور اعضاء و جوارح بھی رکھتا ہے، مگر بایں ہمہ کوئی چیز اس جیسی نہیں۔''

ہشام بن سالم جوالیقی [1] کہتا ہے: ''اللہ تعالیٰ انسانی شکل و صورت رکھتا ہے، مگر وہ گوشت پوست کا بنا ہوا نہیں، وہ ایک درخشندہ نور ہے، اس کے حواس خمسہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں، بنا بریں اس کی سمع اور ہے اور بصر اور، وہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، منہ، ناک اور سیاہ بال رکھتا ہے۔''

[ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں]: ''امام اشعری نے یہ اقوال معتزلہ کی تصانیف سے اخذ کیے ہیں۔ [2] اس لیے ان میں مقاتل بن سلیمان کے اصلی نظریات کی ترجمانی نہیں کی گئی، بلکہ انہیں بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ مقاتل سے ایسے افکار و آراء کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ امام شافعی مقاتل کے بارے میں فرماتے ہیں، ''جو شخص علم تفسیر کا طالب ہو وہ مقاتل کا بستہ فراک ہو کر رہے اور جو فقہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ امام ابوحنیفہ کا دامن تھام لے۔'' جہاں تک داؤد طائی [3] کا تعلق ہے وہ ایک فقیہ اور عابد و زاہد شخص تھے، انہوں نے کوئی ایسی غلط بات نہیں کہی اور نہ کسی طرح سے اس میں دخل دیا۔''

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''بعض اہل سنت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ جمعہ کی رات کو ایک بے ریش لڑکے کی شکل میں ایک گدھے پر سوار ہو کر اترتے ہیں، بغداد کے بعض آدمی شب جمعہ اپنے مکان کی چھت پر ایک برتن میں کچھ جو ڈال دیتے اور منتظر رہتے کہ اللہ تعالیٰ اس کی چھت پر نازل ہوں گے اس کا گدھا جو کھانے میں مشغول رہے گا اور اللہ تعالیٰ یہ پکارتے رہیں گے کہ آیا کوئی توبہ کرنے والا ہے؟'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ''اس قسم کی باتیں یا تو سفید جھوٹ ہیں یا جہالت کی کرشمہ سازی؛ کسی عالم یا معروف آدمی نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، اہل سنت کے علماء تو کیا عوام بلکہ بچے بھی ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کہہ سکتے۔ اس ضمن میں کوئی جھوٹی اور ضعیف روایت بھی نقل نہیں کی گئی، کسی شخص نے یہ بات نہیں کہی کہ اللہ تعالیٰ شب جمعہ ایک بے ریش لڑکے کی صورت میں نازل

---

[1] جوالیقی شیعہ کا مشہور امام ہے اور ان کے یہاں اسے قطب کا مقام حاصل ہے، قبل ازیں اس کے حالات زندگی تفصیلاً مذکور ہو چکے ہیں۔

[2] امام اشعری کا ماخذ فرقہ جات کے بارے میں ابوعیسیٰ وراق شیعہ عالم کی تحریر کردہ ایک کتاب ہے، وراق کا ترجمہ قبل ازیں لکھا جا چکا ہے، شیعہ کے یہاں مقاتل بن سلیمان جیسے بزرگوں پر افترا پردازی کچھ بھی محل تعجب نہیں، بلکہ وہ اسے عبادت شمار کرتے ہیں۔

[3] ابوسلیمان داؤد بن نصیر المتوفی ۱۶۰ھ داؤد طائی کے نام سے مشہور تھے، یہ بڑے فقیہ اور عابد شب زندہ دار تھے، یہ امام ابوحنیفہ، ثوری، شریک اور ابن ابی لیلیٰ کے معاصر تھے اور ان سے استفادہ کر چکے تھے، داؤد طائی کے بارے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''اگر وہ زمانہ ماضی میں ہوتے تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ضرور ان کا ذکر فرماتے۔'' شیعہ مصنف کی جہالت کا اندازہ لگائیے کہ داؤد طائی اور داؤد جوار بی کے مابین فرق نہ کر سکا۔

ہوتا ہے۔ یہ بے بنیاد بات ''جمل اورق'' (خاکستری رنگ کا اونٹ) والی حدیث کی مانند ہے یا اس حدیث کی طرح جس میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ عرفہ کی شام نازل ہوتا ہے، راہ چلنے والوں سے معانقہ کرتا اور سوار ہونے والوں سے مصافحہ کرتا ہے، اللہ یہ حدیث گھڑنے والے کو غارت کرے۔

شیعہ مذہب جھوٹ کا پلندہ:

یوں تو دنیا میں جھوٹ کی کمی نہیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ جھوٹ کے نو حصے یا اس سے کم و بیش شیعہ میں پائے جاتے ہیں، اور ایک حصہ باقی دنیا میں، اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پہلے آسمان پر نازل ہونے کی احادیث متواتر ہیں، عرفہ کی شام قریب آنے کی حدیث صحیح مسلم میں روایت کی گئی ہے [1] مگر ہمیں اس کے نزول یا استواء کی کیفیت معلوم نہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''فرقہ کرامیہ والے اللہ تعالیٰ کو بالائی جانب قرار دیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جو چیز کسی جہت میں ہو، وہ اس جہت کی محتاج ہوگی، اور اس کے ساتھ ساتھ حادث بھی ہوگی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ صرف کرامیہ کا ہی مذہب نہیں بلکہ متقدمین شیعہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کے ابطال پر تم کوئی دلیل بھی نہیں لا سکتے، جملہ مخلوقات کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے، اگر چہ وہ جہت کا لفظ بولنے سے احتراز کرتے ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کو فوق العالم تسلیم کرنا ان کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے، جیسا کہ ابوجعفر ہمدانی [2] نے امام ابوالمعالی سے کہا تھا۔ ابوجعفر ہمدانی کے قول کا خلاصہ یہ ہے:

''استواء کا علم ہمیں نقلی دلائل سے حاصل ہوا، ان کی عدم موجودگی میں ہم اسے معلوم نہ کر سکتے تھے۔ اب اسے چھوڑیے اور ہمیں ایک بدیہی بات کا پتہ بتلایئے جس کا احساس ہمارے دل میں جاگزیں رہتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی عارف زبان سے ''یااللہ'' کہتا ہے تو قبل اس کے کہ اس کی زبان پر یہ کلمہ جاری ہو، علو (بلندی) کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، (یعنی فوراً اس کا ذہن اس طرف مائل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فوق العالم ہے) وہ دائیں بائیں متوجہ نہیں ہوتا، کیا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحج، باب فضل یوم عرفة، (حدیث:۱۳٤۸)

[2] نام محمد بن حسن بن محمد کنیت ابوجعفر اور نسبت ہمدانی ہے۔ یہ بہت بڑے حافظ حدیث اور صادق القول۔ ابن السمعانی کہتے ہیں: یہ اپنے عصر و عہد میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے، ۔امام الحرمین فرماتے ہیں:

ظواہر نصوص کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے، علماء کی ایک جماعت آیات و احادیث نبویہ میں تاویل کی قائل ہے، ائمہ سلف تاویل نہیں کرتے، بلکہ نصوص کو ان کے ظاہری مفہوم پر محمول کرتے ہیں وہ ان کے مفاہیم و معانی علم اللہ کو تفویض کرتے ہیں ہمارا ذاتی زاویہ نگاہ اس ضمن میں یہ ہے کہ ہم سلف صالحین کی پیروی کرتے ہیں، اس مسئلہ میں قطعی دلیل یہ ہے کہ امت کا اجماع ایک لائق اتباع حجت ہے جس کی تائید شریعت حقہ سے ہوتی ہے۔ یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اصحاب رسول ﷺ ظواہر نصوص کے فہم و ادراک کے درپے نہیں ہوتے تھے۔

علامہ المناوی الجامع الصغیر کی شرح میں لکھتے ہیں: علامہ سمعانی رحمہ اللہ نے ابوجعفر ہمدانی رحمہ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے امام الحرمین ابو المعالی کو سنا فرماتے تھے: ''میں نے لاکھوں اوراق کا مطالعہ کیا اور پھر بغور اس بات کا جائزہ لیا کہ مسلمان اسلامی عقائد اور ظاہری علوم پر کہاں تک اعتماد رکھتے ہیں، میں بحر مواج میں سوار ہوا اور ان چیزوں میں سوار ہوا جس سے اسلام نے منع کیا ہے (یعنی فلسفہ و علم الکلام کا مطالعہ کیا) یہ سب کچھ حق کی تلاش میں کیا، میں اب ان تمام باتوں سے منہ موڑ کر کلمہ حق کی طرف لوٹ آیا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ انہی عقائد پر قائم رہو جن پر بوڑھی عورتیں یقین رکھتی ہیں، اسی پر میری موت واقع ہوگی اور میرا خاتمہ حق و صداقت اور کلمہ اخلاص پر ہوگا، اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو ابن الجوینی کے لیے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔ شذرات الذہب میں لکھا ہے کہ: یہ امام الحرمین کے اصلی الفاظ ہیں۔

آپ کسی حیلہ سے اس بدیہی بات کو ہمارے دل سے محو کر سکتے ہیں؟

مذکورہ صدر عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فوقیت کی نفی کے لیے جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ نظری کسبی ہے اور وہ کسی طرح ایک بدیہی وفطری دلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی، خصوصاً جب کہ باری تعالیٰ کا فوق العالم ہونا، نصوص متواترہ سے ثابت ہے۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بدیہیات کا نظری دلائل سے رد کرنا ناممکن ہے، اگر بدیہیات کو بھی ہدف تنقید بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اساسی نظریات پر جرح وقدح کا دروازہ کھول دیا جائے اور اس طرح فروعات کی بجائے اصول کو تنقید کے تیروں سے چھلنی کیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بدیہیات ونظریات دونوں ہی باطل ہو کر رہ جائیں گے۔

تاہم اللہ تعالیٰ کے فوق العالم ہونے کی نفی کرنے والوں نے اپنے زاویہ نگاہ کو عقلی دلائل کے بل بوتے پر ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے۔ جس طرح وہ یہ کہتے ہیں کہ: دو چیزیں جو موجود ہوں گی وہ باہم یا تو متباین ہوں گی یا متداخل۔ ان کے زعم میں یہ ایک بدیہی بات ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے موجود کا اثبات جس کی جانب اشارہ نہ کیا جا سکتا ہو حس وعقل کے منافی ہے۔ حالانکہ قرآن کے بیشتر مقامات پر اللہ تعالیٰ کا فوق العالم ہونا مذکور ہے، بعض علماء کا قول ہے کہ قرآن کریم میں ۳۰۰ جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔ احادیث نبویہ اس سے بھرپور ہیں۔ علماء سلف بھی اس میں متحد الخیال تھے۔ جو لوگوں پر تنقید کرنا چاہتا ہو اور اس کی انجام دہی میں دلائل قاطعہ کو بھی رد کر دے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے نظریات کو دلائل کی روشنی میں ثابت کرے۔

جہت سے کیا مراد ہے؟:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''جو چیز کسی جہت میں محدود ہو وہ حادث ہوگی اور اس جہت کی محتاج ہوگی۔''

[جواب]: یہ اسی صورت میں درست ہوگا جب وہ جہت ایک وجودی اور مثبت حیثیت کی حامل ہو اور اس چیز کے لیے لازم ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس طرح قائم بالمحل مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس محل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ ذات اللہ تعالیٰ کو محتاج قرار دیتا ہے۔ حالانکہ کوئی شخص یہ عقیدہ نہیں رکھتا اور نہ ہی ہمارے علم کی حد تک کوئی شخص اللہ کو مخلوقات کا محتاج تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے عرش کو پیدا کیا، عرش کی تخلیق اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہ عرش کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اس سے بے نیاز تھا اور اس کے بعد بھی بے نیاز رہا۔ اللہ تعالیٰ کے فوق العرش ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش کا محتاج ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے عالم ارضی کو پیدا کیا اس میں سے بعض حصے بالا ہیں اور بعض پست۔ ظاہر ہے کہ بلند حصے پست کے ہرگز محتاج نہیں۔ مزید غور کیجئے کہ پہلے زمین ہے پھر اس کے اوپر ہوا اور بادل ہیں، پھر آسمان پھر عرش تو کیا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں؟

ہم جانتے ہیں کہ قوت وطاقت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ حاملین عرش جس قوت سے بہرہ ور ہیں وہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ اگر تمہارے شیعہ اسلاف میں سے کوئی مثلاً علی بن یونس القمی (مشہور شیعہ عالم) یہ کہے کہ عرش نے اللہ تعالیٰ کو اٹھا رکھا ہے، (جیسا کہ اس کا عقیدہ ہے)؛ تو تم اس کے حق میں کوئی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہو گے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو فوق العرش قرار دیتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ عرش کا محتاج ہے، بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جب ہم نے ذات الٰہی کو ایک ایسی چیز پیدا کرنے پر قادر تسلیم کر لیا جس نے اسے اٹھا رکھا ہے، تو اس سے اس کی

قدرت کاملہ کا اظہار ہوتا ہے، نہ کہ عجز و درماندگی کا۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جہت سے امر موجود بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور امر معدوم بھی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو فوق العالم تسلیم کرتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ وہ ایک ایسی جہت میں ہے جو موجود ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جہت سے عرش مراد لیا جائے، اور باری تعالیٰ کے اس میں ہونے کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ وہ اس کے اوپر ہے۔ جیسے روایات میں آیا ہے کہ: "اِنَّـهُ فِـی السَّـمَآءِ"❶ (وہ آسمان میں ہے) یعنی "وہ آسمان کے اوپر ہے۔" مگر یہ لوگ جہت کو ایک مشترک لفظ قرار دیتے ہیں اور اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ کسی جہت میں ہونے کا مطلب کسی جگہ میں ہونا ہے۔ جیسے آدمی اپنے گھر میں ہوتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا محتاج الی الغیر ہونا لازم آتا ہے۔

یہ سب مقدمات باطل ہیں، مثلاً ان کا یہ قول کہ "اللہ تعالیٰ اگر کسی جہت میں ہوگا تو وہ مجسم ٹھہرے گا، اور جو چیز جسم دار ہو وہ حادث ہوتی ہے، کیونکہ جسم حوادث سے خالی نہیں، لہٰذا اس سے اللہ تعالیٰ کا حادث ہونا لازم آئے گا۔"

یہ سب مقدمات متنازع فیہا ہیں۔ اس لیے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ جہت میں قیام پذیر ہونے والی چیز جسم دار ہو۔ بلکہ غیر مجسم اشیاء کا قیام بھی جہت میں ممکن ہے۔ جب اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ یہ خلاف عقل ہے تو وہ کہتا ہے کہ کسی موجود چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ عالم میں داخل ہے اور نہ خارج؛ اس سے بھی زیادہ خلاف عقل ہے۔

بعض لوگ یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ ہر جسم حادث ہوتا ہے، مثلاً کرامیہ اور متقدمین شیعہ۔ اسی طرح بعض لوگ اس نظریہ کو نہیں مانتے کہ جسم حوادث سے خالی نہیں ہوتا، بعینہ اسی طرح بہت سے اہل الحدیث؛ متکلمین اور فلاسفہ کے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ جو چیز حوادث سے خالی نہ ہو وہ خود بھی حادث ہوتی ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: "اکثر اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بذات خود افعال قبیحہ اور کفر کا مرتکب ہوتا ہے، اور یہ سب کچھ اس کی قضا و قدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے، بندے کا اس میں کچھ دخل نہیں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ کافر معاصی کا مرتکب ہوتا رہے اور وہ کافر سے اطاعت نہیں چاہتے۔" [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے...... اور قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں...... کہ تقدیر اور عدل و جور کے مسائل کا امامت و خلافت کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر شیعہ مصنف بایں ہمہ وہی مسائل دہرائے جا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اقرار کرنے والے بعض لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں، اس کے برعکس بعض روافض تقدیر کے قائل ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے، کہ یہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور یہ باہم لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح ہے کہ مسئلہ تقدیر اور صفات الٰہی کے اثبات میں اہل بیت سے ان گنت روایات منقول ہیں، مگر متاخرین شیعہ نے تشیع کے عقائد کے ساتھ ساتھ جہمیہ اور قدریہ کے افکار و معتقدات کا ضمیمہ بھی لگا لیا تھا، اور وہ صرف شیعہ عقائد ہی کے حامل نہ تھے، یہ شیعہ مصنف بھی اسی زمرہ میں داخل ہے۔

---

❶ صحیح بخاری کتاب المغازی (ح:۴۳۵۱) و صحیح مسلم۔ کتاب المساجد، (ح:۵۳۷)، عن معاویة الحکم و سنن ابی داود۔ کتاب الأدب باب فی الرحمة (ح:۴۹۴۱) عن عبد اللّٰه بن عمر رضی اللہ عنہما)

بندوں کے افعال کا فاعل کون ہے؟

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اہل سنت کے نزدیک بندہ کفر و معاصی کے ارتکاب میں بے قصور ہے۔'' قطعی طور سے بے بنیاد ہے۔ تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے جمہور اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے اور وہ قدرت و استطاعت سے بہرہ ور ہے، وہ طبعی اسباب کی تاثیر کا انکار نہیں کرتے۔ بلکہ عقلی و نقلی دلائل کی بنا پر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہواؤں کے ذریعہ بادل کو پیدا کرتے پھر بادل سے پانی اتارتے اور پانی سے فصلیں پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سبب اور مسبب دونوں کا خالق ہے۔ بلوجود یہ کہ باری تعالیٰ خالق اسباب ہیں اس کے باوصف ایک اور سبب کا وجود ناگزیر ہے جو اس کا شریک ہو اور اس کے دوش بدوش ایک معارض کی بھی ضرورت ہے جو اسے روک دے اور اللہ کے پیدا کرنے کے باوجود اس کے اثر کو تکمیل پذیر نہ ہونے دے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ دوسرے سبب کو پیدا کر کے موانع کا ازالہ کر دے۔

شیعہ مصنف نے جو قول نقل کیا ہے اس کے قائل امام اشعری رحمہ اللہ اور ان کے ہم نوا ہیں۔ اشاعرہ مخلوقات میں قوی و طبائع کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ ان قوی کے ساتھ فعل کو انجام نہیں دیتے البتہ ان قوی کے ہوتے ہوئے وہ فعل انجام پذیر ہوتا ہے۔'' اشاعرہ کہتے ہیں کہ بندے کی قوت افعال میں مؤثر نہیں ہے۔

امام اشعری رحمہ اللہ اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے فعل کا فاعل نہیں، بلکہ اس کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ البتہ بندہ اپنے فعل کا کاسب ہے، اہل سنت اور جمہور کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا حقیقی فاعل ہے۔

ارادہ کی دو قسمیں:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کافر سے معاصی کا ارادہ کرتا ہے'' اہل سنت کا صرف ایک گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ''ارادہ'' کی صرف ایک قسم قرار دیتے ہیں اور محبت و رضا اور غضب کو ارادہ کا مترادف تصور کرتے ہیں، امام اشعری کے دونوں اقوال میں سے مشہور تر قول یہی ہے، ان کے اکثر اصحاب و اتباع بھی اسی کے قائل ہیں۔

بخلاف ازیں جمہور اہل سنت ارادہ، محبت اور رضا میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ معاصی کا ارادہ تو کرتا ہے۔'' مگر انہیں چاہتا نہیں اور ان سے راضی بھی نہیں ہوتا، بلکہ ناراض ہوتا ہے۔ محققین کا قول ہے کہ: ''ارادہ کا لفظ قرآن کریم میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ ارادہ قدریہ کونیہ ۲۔ ارادہ شرعیہ دینیہ۔''

ارادہ قدریہ جملہ حوادث کو شامل ہے جب کہ ارادہ شرعیہ محبت و رضا پر مشتمل ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ﴾ (ھود ۳۴)

''اگر اللہ تعالیٰ تمہیں گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہو۔''

اس ارادہ کا تعلق اضلال و اغواء کے ساتھ ہے، ارادہ شرعیہ کی مثال مندرجہ ذیل آیات ہیں۔قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (النساء: ۲۶)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے واضح کرنا اور ان لوگوں کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں جو تم سے پہلے تھے۔''

نیز فرمایا: ﴿ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (المائدہ: ۶)

''اللہ تعالیٰ تمہیں تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ ﴾ (الاحزاب: ۳۳)

''اے نبی کے گھر والو! اللہ تعالیٰ تم سے ناپاکی کو دور کرنا چاہتے ہیں۔''

ظاہر ہے کہ ان آیات میں ارادہ کے وہ معنی نہیں جو سابقہ آیات میں ہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: اہل سنت کا یہ قول چند قبائح پر مشتمل ہے۔ایک قباحت یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا سب ظالموں سے بڑا ظالم ہونا لازم آتا ہے۔اس لیے کہ وہ کافر کو کفر کے جرم کی سزا دیتا ہے، حالانکہ اس نے خود ہی اسے کفر کی قدرت عطا کی، اور اسے ایمان کی قدرت سے محروم رکھا، جس طرح کسی کو طویل القامت یا قصیر القامت ہونے پر سزا دینا ظلم ہے، اسی طرح اس معصیت کی سزا دینا بھی ظلم ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اس میں پیدا کی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ ظلم کی تفسیر میں جمہور کے دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ: ظلم ممتنع لذاتہٖ ہے اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے پر قادر نہیں۔امام اشعری، قاضی ابوبکر، ابوالمعالی، قاضی ابو یعلیٰ اور ابن الزاغونی رحمہم اللہ کی یہی رائے ہے۔ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ دروغ گوئی، ظلم اور افعال قبیحہ پر قادر نہیں اور نہ اسے ان کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے۔ذات باری سے ان افعال کا صدور اس لیے محال ہے کہ ظلم و قبح کا فاعل شرعاً مذموم ہے۔اور قابل مذمت وہی فاعل ہوتا ہے، جو ناروا کام کرے اور ایسے فعل کا مرتکب ہو جس کا حق اسے حاصل نہ ہو۔یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب فاعل اس چیز میں تصرف کرے جس میں تصرف کرنے کا حق اس کی نسبت کسی اور کو حاصل ہو۔بنا بریں ظلم کا صدور اللہ سے محال ہے، کیوں کہ اس کے تصرفات کا مالک کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا، اس تقریر سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے، کہ اللہ کے حق میں ظلم کا تصور بھی محال ہے۔

مذکورہ بالا قول کی حقیقت یہ ہے کہ قابل مذمت وہ فاعل ہے، جو غیر کی مملوکہ چیز میں دست درازی کا ارتکاب کرتا اور حکم کی نافرمانی کرتا ہو۔ظاہر ہے کہ کوئی شخص اللہ کو اپنے احکام کا مامور و مکلف نہیں بنا سکتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ غیر کی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، اس لیے کہ وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔

یہ قول ایاس بن معاویہ رحمہ اللہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں:

''میں نے اپنی پوری عقل سے کام لے کر قدریہ فرقہ سے مناظرہ کیا اور دریافت کیا کہ ظلم کیا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنے کو ظلم کہتے ہیں۔میں نے کہا: ''جب ہر چیز اللہ کی مملوک ہے تو وہ غیر کی ملکیت میں تصرف کیسے کرے گا؟''

مگر یہ لوگ تو کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر بھی سزا دینے کو جائز تصور کرتے ہیں، لہٰذا قصیر القامت کو چھوٹے ہونے اور سیاہ فام کو سیاہ ہونے کی بنا پر سزا دینے سے ان پر معارضہ نہیں کیا جا سکتا ان کا خیال ہے کہ سزا دینا مشیت ایزدی کے تابع ہے۔

ظلم سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ:

دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم پر قادر مگر اس سے منزہ ہے؛ جیسے کسی انسان کو کسی دوسرے شخص کے جرم کی سزا دینا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿ وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ (طه:۱۱۲)

''جو ایمان دار ہو اور پھر نیک اعمال انجام دے تو وہ کسی ظلم یا کمی سے نہیں ڈرے گا۔''

ان لوگوں کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ انسان کو اختیاری یا غیر اختیاری افعال کی بنا پر سزا دینے کا فرق انسانی فطرت میں جا گزیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:'' تقدیر سے گناہوں پر استدلال کرنا عقلاً باطل ہے۔ اس لئے کہ دوسروں پر ظلم وستم ڈھانے والا اگر تقدیر سے استدلال کرے گا (کہ میری تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا) تو جو شخص اس کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے، وہ بھی یہ دلیل پیش کر سکتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ معاصی کے ارتکاب پر تقدیر سے استدلال کرنا باتفاق ادیان وعقلاء باطل ہے۔ اور اس سے وہی شخص احتجاج کرتا ہے، جو اپنی خواہش کا پیروکار ہو۔ جیسے یہ مقولہ مشہور ہے کہ:'' تم اطاعت کے وقت قدری اور معصیت کے وقت جبری بن جاتے ہو۔'' مقولہ کا مطلب یہ ہے کہ تم ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہو جو مذہب اپنی خواہش کے موافق ہوا بس اسی کے ہو جاتیہو۔''

اگر قبائح کے مرتکب کے لیے تقدیر حجت ہوتی تو کوئی شخص دوسرے کو ملامت نہ کر سکتا اور نہ اسے سزا دے سکتا (کیونکہ مجرم آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا)۔ حقیقت کے بلند بانگ دعاوی کرنے والوں مثلاً فقراء اور صوفیہ کو اکثر اس سے سابقہ پڑتا ہے وہ تقدیر کا بہانہ کر کے اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی سے انحراف کرتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تقدیر کے بل بوتے پر کوئی شخص اوامر کو ترک کر سکتا ہے نہ محرمات کا ارتکاب کر سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حجت تمام کر دی ہے۔

جو لوگ تقدیر سے معاصی کے ارتکاب کے جواز پر استدلال کرتے ہیں وہ فرقہ قدریہ سے بھی بدتر ہیں جو سرے سے تقدیر کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کی ایک جماعت کو قدریہ کہا گیا حالانکہ وہ تقدیر کے منکر نہ تھے۔ قدریہ کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ تقدیر سے معاصی کے جواز پر احتجاج نہیں کرتے تھے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب کہا گیا کہ:'' ابن ابی ذئب منکر تقدیر تھے۔'' تو انہوں نے فرمایا: جو شخص بھی معاصی کی بنا پر لوگوں کو تنگ کرتا تو لوگ اسے قدری کہہ کر پکارتے تھے۔'' یہی وجہ ہے کہ قائلین تقدیر فواحش ومنکرات پر تنقید کرنے والے کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور کہتے ہیں یہ بات ان کی تقدیر میں لکھی تھی۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ منکرات پر رد وقدح بھی تقدیر الٰہی کے عین موافق ہے۔ گویا اس نے اپنے قول سے ہی اپنی دلیل کو توڑ دیا، بعض جاہل مشائخ کا قول ہے'' میں اس رب کو ماننے کے لیے تیار نہیں جس کی نافرمانی کی جاتی ہو اور اگر میں ستر انبیاء کو قتل کر دوں تو میں گناہ گار نہ ہوں گا۔'' ایک اور جاہل شیخ کا قول ہے:

''میں وہی کام کرتا ہوں جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا ہے، لہٰذا میرے سب کام عبادت میں داخل ہیں۔''

مسئلہ تقدیر میں احتجاج آدم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تقدیر کی بنا پر احتجاج اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ یہ کھلی ہوئی جہالت ہے۔ اس لیے کہ انبیاء سب لوگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرتے ہیں۔ پھر تقدیر کی بنا پر وہ اس کی نافرمانی کیوں کر سکتے ہیں۔ مزید برآں حضرت آدم علیہ السلام نے بارگاہ ازدی میں اپنے گناہ سے توبہ کر لی تھی اور ان کی توبہ قبول کر لی گئی تھی۔ اور اگر تقدیر سے احتجاج کرنا درست ہوتا تو ابلیس، فرعون اور ان کے ہم نوا اس سے ضرور استدلال کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو جو ملامت کی تھی، اس کی وجہ وہ مصیبت تھی جو حضرت آدم علیہ السلام کے شجرہ ممنوعہ کا پھل کھانے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہنچی اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

''آپ نے ہمیں اور اپنے بیٹوں کو جنت سے کیوں نکالا؟''[1]

حقیقت یہ ہے کہ بندہ عیب و گناہ کی بجائے مصائب و آلام کے وقت تقدیر کی جانب رجوع کرنے کیلئے مامور ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ وہ مصائب و آلام میں صبر و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور گناہوں سے توبہ کرتا رہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِکَ﴾ (غافر: ۵۵)

''صبر کیجئے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت طلب کیجئے۔''

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ افعال اختیاریہ کی بنا پر انسان صفات محمودہ اور صفات مذمومہ دونوں حاصل کر سکتا ہے۔ بخلاف ازیں قصیر القامت ہونے یا کالے گورے ہونے کی بنا پر ان کا حصول ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نیکی دل کا نور، چہرے کی رونق، وسعت رزق، قوت بدن اور مخلوقات کے دل میں محبت کی باعث ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو ان جملہ امور کا سبب بنایا ہے جس طرح زہر کھانے کو بیماری اور موت کا سبب قرار دیا ہے، تاہم تریاق سے اس کا ازالہ ممکن ہے، جس طرح برائیوں کو توبہ، اعمال صالحہ اور گناہ کو دور کرنے والے مصائب و آلام کے ذریعہ دور کیا جاتا ہے۔''

باقی رہی یہ بات کہ فعل کو پیدا کر کے خود ہی اس پر سزا دینا ظلم ہے۔ تو یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے زہر کو پیدا کر کے اسے موجب ہلاکت بنانا ظلم ہے۔ یقینی دلائل کی بنا پر یہ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ جو چیز بھی حادث ہے وہ اللہ کی پیدا کردہ ہے۔ ظاہر ہے کہ بندے کے افعال بھی حوادث کے زمرہ میں شامل ہیں، لہٰذا وہ بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں بنابریں جو اللہ نے چاہا ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ: ''فعل بندے کے ارادہ سے حادث ہوا۔'' تو ہم کہیں گے کہ: ''ارادہ بھی حادث ہے، لہٰذا اس کے لیے بھی کسی سبب کی ضرورت ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فعل ممکن ہے، (یعنی اس کا وجود و عدم برابر ہے) لہٰذا اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دینے کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہے، اسی طرح بندے کا فاعل ہونا بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اس کے لیے بھی کسی محدث و مرجح کا وجود ناگزیر ہے۔ اس میں سب حوادث مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

[1] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب وفاۃ موسیٰ و ذکرہ بعد (حدیث: ۳۴۰۹، ۷۵۱۵) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب حجاج آدم و موسیٰ صلی اللہ علیہما وسلم (حدیث: ۲۶۵۲)۔

بارگاہ ایزدی میں تقدیر کا عذر مسموع نہیں

مخلوقات میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو بعض لوگوں کے لیے موجب ضرر ہیں، جیسے بیماریاں اور مصائب و آلام، یہ حکمت ایزدی کا تقاضا ہے۔ جب بندے کو اس کے افعال اختیاری پر سزا دینا ظلم نہیں تو حوادث کو بارگاہ ربانی کی جانب منسوب کرنے میں بھی ایک ایسی حکمت مضمر ہے، جس کی بنا پر وہ حوادث مستحسن ٹھہرتے ہیں۔ جب بندے کی جانب اس کی نسبت کی جائے تو یہ عدل ہے، کیونکہ اسے جو سزا ملی ہے وہ اس کے جرم کی بنا پر ملی ہے، لہٰذا اللہ نے اس پر ظلم نہیں کیا بلکہ اس نے خود ہی اپنی جان پر ستم ڈھایا۔ جب کوئی حاکم چور کو سزا دے، اس کا ہاتھ کاٹ ڈالے اور مسروقہ مال اس کے اصلی مالک کو واپس کر دے تو وہ منصف حاکم کہلائے گا۔ اور اگر چور اسے کہے کہ میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا، پھر تم مجھے سزا کیوں دیتے ہو......؟ تو یہ بات چور کے حق میں مفید نہ ہوگی؛ اور حاکم اسے سزا دیئے بغیر نہیں رہے گا، اسی طرح جب روز قیامت اللہ تعالیٰ ظالم سے قصاص لے گا تو اس کا یہ فعل عدل و انصاف کا آئینہ دار ہوگا اور اگر ظالم یوں کہے کہ تو نے میری تقدیر میں اسی طرح لکھا تھا تو یہ بات اس کے حق میں کچھ بھی مفید نہ ہوگی اور تقدیر کا عذر درست نہیں مانا جائے گا، چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اس کی تخلیق خالی از حکمت نہیں اور اسی حکمت و مصلحت کے اعتبار سے تخلیق کا فعل مستحسن ہے۔

جو شخص یہ کہتا ہے، کہ: " جَبَرَ اللّٰہُ الْعِبَادَ' (اللہ کے بندوں کو مجبور محض بنایا ہے)۔ ائمہ حدیث مثلاً امام ثوری، اوزاعی، زبیدی، اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس پر بڑی جرح قدح کی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جبر کرنا، عاجز کا کام ہے۔ جیسے والد اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے خلاف مجبور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارادہ اور مراد دونوں کا خالق ہے، البتہ حدیث نبوی کے اتباع میں " جَبَلَ اللّٰہُ الْعِبَادَ " (اللہ نے بندوں کو پیدا کیا) کہہ سکتے ہیں، مگر " جَبَلَ "کی بجائے " جَبَرَ "کا لفظ نہیں بولا جا سکتا، نبی کریم ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہاری دو باتیں اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں:

۱۔ تحمل و بردباری ۲۔ سکون و وقار

اس نے عرض کیا: ''یہ فرمایئے کہ:'' کیا یہ دونوں باتیں میرے اخلاق و عادات میں داخل ہیں یا میری خلقت ہی ان پر ہوئی ہے......؟ فرمایا: ''یہ دونوں باتیں خلقۃً تمہیں ودیعت ہوئی ہیں۔''

اس نے عرض کیا اللہ کا شکر ہے جس نے دو ایسی باتیں مجھے عطا کیں جو اسے پسند ہیں؟ [1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خلق و تقدیر اور امر و تشریع کی جہتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، شرعی اوامر و احکام کا مقصد اس چیز کا اظہار و بیان ہے جو بندوں کے لیے نفع یا ضرر کی موجب ہو، جس طرح طبیب مریض کو فائدہ مند چیزوں کے استعمال کا حکم دیتا اور ضرر رساں اشیاء سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعہ صلحاء و اشقیاء دونوں کے انجام سے آگاہ کر دیا، سعادت کی موجب اشیاء کا حکم دیا اور شقاوت کے موجبات سے روک دیا۔

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ و رسولہ (ح: ۲۵/ ۱۷) مختصراً۔ مسند احمد (۴/ ۲۰۵۔۲۰۶)۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب الأدب۔ باب قبلۃ الرجل (ح:۵۲۲۵)، من طریق آخر و سندہ ضعیف۔

باقی رہا اللہ کے خلق و تقدیر کا معاملہ تو اس کا تعلق ذات باری اور جملہ مخلوقات کے ساتھ ہے۔ چنانچہ جس چیز میں عام مخلوقات کا فائدہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ وہ کام کرتے ہیں، اگر چہ اس سے بعض کو نقصان پہنچنے کا بھی احتمال ہو۔ مثال کے طور پر بارش کو لیجیے کہ اس کا نزول رحمت وحکمت کے پیش نظر ہوتا ہے، تاہم بعض اوقات اس سے نقصان بھی پہنچ جاتا ہے، مثلاً کسی کا مکان گر جاتا ہے، کوئی سفر سے رک جاتا ہے اور کسی کا کاروبار معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح رسل وانبیاء کی بعثت بھی عین عنایت ربانی ہے، اگر چہ بعض قوموں کو اس سے الم ورنج پہنچتا ہے، اوران کی قیادت وسیادت روبزوال ہو جاتی ہے۔

افعال اللہ وافعال العباد کے مابین فرق وامتیاز

جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر مقدر کیا جاتا ہے تو یہ گہری مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور کافر کو اس کے افعال اختیاری کی بنا پر سزا دی جاتی ہے، یہ سزا بھی حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کے افعال کو افعال العباد پر قیاس کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس لیے کہ آقا جب غلام کو کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ غلام کا محتاج ہوتا ہے، اور وہ کسی غرض کے تحت ایسا کرتا ہے۔ جب آقا غلام کو اس محنت وکاوش کا بدل عطا کرتا ہے تو یہ اس کا معاوضہ کہلاتا ہے۔ اندریں صورت آقا کو فعل مامور کا خالق نہیں کہہ سکتے۔ اللہ تعالیٰ بندوں سے بے نیاز ہے اس نے بندوں کو نہی باتوں کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے نفع رساں ہیں اور انہی باتوں سے روکا ہے جو ان کے لیے موجب ضرر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ احکام ارشاد وتعلیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ مامور کے بجالانے میں انسان کی مدد کرے تو اس کا احسان عظیم ہے اور اگر مدد نہ کرے اور بندے کو تنہا چھوڑ دے یہاں تک کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو تو یہ کسی اور حکمت پر مبنی ہوگا۔ اور اگر وہ افعال بندے کے لیے موجب الم ورنج ہوں تو وہ ان افعال کی وجہ سے دکھ پائے گا، جو آرام وراحت کے موجب ہوتے ہیں اور سبب الم ورنج بھی، یہ سب کچھ تقدیر ربانی کے تحت ہوگا، اوران دونوں میں کوئی منافات بھی نہیں پائی جاتی۔

اب یہ بات باقی رہی کہ آخر وہ کلی حکمت کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکمت کی معرفت حاصل کرنا بنی نوع انسان کے لیے ضروری نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ورحمت کے آگے سر نیاز خم کر دینا ہی کافی ہے، بعض علوم ایسے بھی ہیں جن کا حاصل کرنا، بہت سے لوگوں کے لیے ضرر رساں ہوتا ہے، عقل انسانی اس کی حکمت ومصلحت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

قرآن کریم میں فرمان الٰہی ہے:

﴿لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَلَکُمْ تَسُؤْکُمْ﴾ (المائدۃ: ۱۰۱)

''ایسے امور کے متعلق مت پوچھو کہ اگر ان کا اظہار کر دیا جائے تو تم پر ناگوار گزرے۔''

یہ مسئلہ افعال الٰہی کی غایات ومقاصد کے نام سے موسوم ہے۔ اور غالباً حکمت الٰہیہ کے تمام مسائل سے عظیم تر ہے، فرقہ قدریہ کی ضلالت وکج روی کی وجہ تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کے عدل وظلم پر قیاس کیا۔ اسی طرح جبریہ بھی یہ جادۂ مستقیم سے بھٹک گئے، کیونکہ وہ افعال الٰہی کو مصالح پر مبنی قرار نہیں دیتے اور نہ اسے ظلم وجور سے منزہ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اللہ کا دین افراط وتفریط کے بین بین [متوسط دین] ہے۔

شیعہ مصنف کا اہل سنت کی طرف یہ عقیدہ منسوب کرنا کہ ''اس میں ایمان کی قدرت پیدا نہ کی۔'' یہ اس شخص کا قول ہے

جو قدرت مع الفعل کا قائل ہے، اس کی رائے میں جو شخص کوئی فعل انجام نہیں دیتا تو وہ اس پر قادر نہیں تاہم اسے عاجز بھی نہیں کہہ سکتے ، یہ جمہور اہل سنت کا قول نہیں ، بخلاف ازیں اہل سنت انسان کے لیے اس قدرت کو ثابت مانتے ہیں جس پر امر و نہی کا مدار و انحصار ہے اور وہ قدرت مقارن للفعل نہیں ہوتی ، بلکہ فعل سے پہلے پائی جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ (آل عمران: ۹۷)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج فرض ہے جو وہاں پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔''

اس آیت میں صاحب استطاعت پر حج کو فرض قرار دیا گیا ہے، اگر صرف حج سے فارغ ہونے والے کو صاحب استطاعت تصور کیا جائے تو حج اسی شخص پر فرض سمجھا جائے گا جو فریضہ حج ادا کر لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک حج کے جرم میں کسی کو بھی سزا نہیں دی جائے گی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن: ۱٦)

''جس قدر ہو سکے تم اللہ سے ڈرو۔''

اس میں حسب استطاعت تقویٰ کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ اگر اللہ نہ ڈرنے والا تقویٰ کی استطاعت سے محروم ہوتا تو تقویٰ اسی شخص پر واجب ہوتا جو تقویٰ کی صفت سے بہرہ ور ہوتا۔ اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ کفار کو چھوڑ کر ایک اطاعت شعار شخص پر اللہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اسے اطاعت کی توفیق عطا کی۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ ﴾ (الحجرات: ۷)

''اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہاری نگاہ میں محبوب بنا دیا، تمہارے دلوں میں اسے مزین کر دیا اور کفر کو ناپسندیدہ بنا دیا۔''

قدریہ کے نزدیک ایمان سے آراستہ پیراستہ ہونا سب مخلوقات کے لیے عام ہے مگر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مومنین کی خصوصیت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا ﴾ (الانعام: ۱۲۲)

''کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اسے ایک نور عطا کیا۔''

مزید فرمایا: ﴿ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ ﴾ (الحجرات: ۱۷)

''بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا احسان جتلاتے ہیں کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ بتایا۔''

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ (الفاتحہ)

دعا سے زمانہ مستقبل میں ایسی چیز کا حصول مقصود ہوتا ہے جو قبل ازیں حاصل نہ ہو، اس دعا میں جس ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ سے ایک جداگانہ چیز ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ﴾ (النور: ۲۱)

''اگر فضل ربانی اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی پاک نہ ہوتا۔''

نیز فرمایا:﴿ وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا﴾ (الانبیاء:۷۳)
''ہم نے ان کو ایسے امام بنایا تھا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔''
دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:﴿ وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ﴾ (القصص ۴۱)
''ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو لوگوں کو جہنم کی جانب دعوت دیتے تھے۔''
اس ضمن میں بڑی کثرت سے آیات وارد ہوئی ہیں۔

استطاعت کی تعریف:

استطاعت کے بارے میں حسب ذیل آیات قابل ملاحظہ ہیں:
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ﴾
''جو تم میں سے آزاد مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔''
دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:﴿ وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِاسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ﴾ (توبہ:۴۲)
''وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ نکلتے۔''
نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا﴾ (مجادلۃ:۴)
''جو اس کی طاقت نہ رکھے، وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔''
سرور کائنات ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:
''کھڑے ہو کر نماز پڑھیے، اگر کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھنے پر قادر نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔''[1]
اس حدیث میں آپ نے ایسی استطاعت کی نفی فرمائی جس کے ساتھ فعل نہ پایا جاتا ہو۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ شریعت میں جو استطاعت مشروط ہے، وہ اس استطاعت سے خاص تر ہے جو عقل سے معلوم کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ شارع کا مقصد دین میں آسانی پیدا کرنا ہے، مثلاً مریض جو کھڑا ہونے پر قادر ہو مگر یہ خطرہ دامن گیر ہو کر کھڑا ہونے سے وہ بتاخیر صحت یاب ہوگا، ایسے شخص کو حصول ضرر کی بنا پر شرعاً غیر مستطیع تصور کیا جائے گا، اگرچہ اسے مستطیع کے نام سے موسوم کیا جائے۔
خلاصہ کلام! یہ کہ شارع کی نگاہ شرعی استطاعت میں صرف امکان ہی پر نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کے لوازم کو بھی ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ جب شارع امکان کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے کہ فساد کا غلبہ نہ ہو تو وہ کسی عاجز کو کیوں کر مکلف و مامور کر سکتا ہے، تاہم یہ استطاعت وجود فعل تک باقی رہنے کے باوصف فعل کے پائے جانے کے لیے کافی نہیں، اگر ایسی استطاعت کافی ہوتی تو تارک و فاعل مساوی ہو کر رہ جاتے، اور دونوں میں فرق و امتیاز مشکل ہو جاتا بخلاف ازیں مذکورہ استطاعت کے ساتھ ایک دوسری اعانت کا وجود ناگزیر ہے۔ جو اس کے مقارن ہو، مثلاً فاعل کا با ارادہ ہونا اس لیے کہ قدرت وارادہ کے بغیر فعل کا تکمیل پذیر ہونا ممکن نہیں۔ وہ ارادہ جس میں عزم و استقلال پایا جاتا ہو استطاعت مقارنہ للفعل میں داخل ہے، البتہ جو استطاعت احکام کا مکلف بنانے کے لیے شرط ہے اس میں ارادہ کا پایا جانا ضروری نہیں۔
مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارادہ نہ کرنے والے کو کسی فعل کا مامور و مکلف تو بناتے ہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب تقصیر الصلاۃ، باب اذا لم یطق قاعداً صلی علی جنب (حدیث:۱۱۱۷)

البتہ جو شخص کسی فعل کو انجام دینے سے عاجز ہو اس کو مامور نہیں کرتے ۔ جیسے آقا اپنے غلام کو ایسے کام کا حکم تو دیتا ہے، جس کو انجام دینے کا وہ ارادہ نہیں رکھتا البتہ اسے ایسے کام تفویض نہیں کرتا جن سے وہ عاجز ہو۔ جب عزم راسخ اور قوت تامہ دونوں یک جا ہوتے ہیں، تو فعل کا وجود پذیر ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک قدرت کا مع الفعل ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ہر کافر و فاسق کو تکلیف مالا یطاق دی گئی ہے، مگر جمہور اہل سنت اس کے قائل نہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب استطاعت پر حج فرض کیا ہے، خواہ وہ یہ فریضہ انجام دے یا اس کی تکمیل سے قاصر رہے۔ اسی طرح کفارہ میں دو ماہ کے روزے فرض کیے، خواہ وہ کفارہ دے یا نہ دے، بعینہ اسی طرح صاحب قدرت پر عبادت کو فرض قرار دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اس فریضہ کو انجام دے یا اس کی انجام دہی سے قاصر رہے۔

تقدیر کے بارے میں رافضی اشکالات:

تکلیف مالا یطاق کی تفسیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے:

۱۔ کسی شخص کو ایسی بات کا مکلف کیا جائے جس سے وہ عاجز ہے، ظاہر ہے کہ ایسی تکلیف کسی کو بھی نہیں دی گئی۔

۲۔ کسی شخص کو ایسی بات کا مکلف کیا جائے جس کو انجام دینے سے وہ اس لیے قاصر ہے کہ وہ اس کی ضد میں مشغول و منہمک ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بندوں کو اس قسم کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے، اور وہ باہم ایک دوسرے کو بھی ایسی ہی مکلف ٹھہراتے ہیں، آقا سبھی غلاموں کو یکساں تصور نہیں کرتا، بلکہ ان میں فرق و امتیاز روا رکھتا ہے، مثلاً وہ اندھے غلام کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ قرآن کریم پر نقطے لگائے اور نہ ہی اپاہج غلام کو کھڑا ہونے کے لیے مامور کرتا ہے، دونوں کا فرق واضح ہے۔

شیعہ مصنف کا اعتراض اور اس کا جواب:

[اشکال ۱]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اس سے انبیاء علیہم السلام کا لاجواب ہونا اور ان کے دلائل کا انقطاع بھی لازم آتا ہے، کوئی نبی جب کافر سے یوں مخاطب ہوگا کہ: ''مجھ پر ایمان لائیے اور میرے دعویٰ نبوت کی تصدیق کیجیے۔'' تو کافر اس کے جواب میں کہے گا:

''اپنے رب سے التجا کیجئے کہ: وہ مجھ میں ایمان اور قوت موثرہ پیدا کرے تاکہ میں ایسا کرسکوں، بجز اس کے میرے لیے ایمان لانا کیوں کر ممکن ہے، جب کہ سرے سے مجھ میں ایمان لانے کی قدرت ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ مجھ میں کفر کو جاگزیں کر دیا ہے اور میں اسے مغلوب نہیں کرسکتا۔'' نبی کافر کی یہ گفتگو سن کر لاجواب ہو جائے گا، اور کچھ کہہ نہ سکے گا۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: اس مسئلہ میں بہت لے دے کی جاتی ہے۔ بہت سے باطل پرستوں کی تو یہ حالت ہے کہ جب انہیں کسی واجب کا مامور ٹھہرایا جاتا ہے، تو وہ تقدیر کا بہانہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ہمارے لیے یہ کام مقدر کرے گا تو ہم اسے انجام دیں گے۔ اسی طرح جب کسی کو بری بات سے روکا جاتا ہے، تو وہ کہتا ہے: ''میری تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ تقدیر سے احتجاج کرنا ایک باطل دلیل ہے، جس کی بنا پر بندہ کو معذور قرار نہیں دیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ جب مشرکین نے کہا:

﴿ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ آبَآءُ نَا﴾ (الانعام: ۱۴۸)

''اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء شرک نہ کرتے۔''

تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا﴾ (الانعام: ۱۴۸)

''فرما دیں: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو اسے ہمارے لیے ظاہر کیجئے۔''

مشرکین تک اس بات سے آگاہ تھے کہ تقدیر سے استدلال کرنا بے کار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی کافر کسی کا مال چھینے، یا کسی کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو، یا کسی کے لڑکے کو موت کے گھاٹ اتار دے، یا دوسروں پر لگا تار مظالم ڈھاتا رہے اور لوگ اسے ان افعال قبیحہ سے روکنے کی کوشش کریں، اور وہ ان کے جواب میں کہے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ کام انجام نہ دیتا۔'' تو کوئی شخص اس کا عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا، اور وہ نہ خود ہی کسی شخص سے ایسا عذر تسلیم کرے گا، بلکہ وہ سزا کا مستحق ہوگا، ایسی دلیل وہ شخص پیش کرے گا، جو بلا وجہ اپنے سے ملامت کا داغ دھونا چاہتا ہو، اگر تقدیر سے استدلال کرنا صحیح ہوتا تو اطاعت کیش اور نافرمان میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر ایسے لوگوں پر حجت تمام کر دی ہے:

﴿ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾

''فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے لیے حجت بالغہ ہے۔''

پھر یہ کہہ کر تقدیر کا اثبات کیا: ﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾

''اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا۔'' یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں۔

[اشکال ۲]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''اہل سنت کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ سید الرسل ﷺ کو اطاعت شعاری کے باوصف عذاب دے سکتے ہیں، اور ابلیس اپنی معصیت کاری کے باوجود اجر و ثواب حاصل کر سکتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی مقصد کے پیش نظر کوئی فعل انجام نہیں دیتا۔'' علاوہ ازیں طاعات و عبادات کو انجام دینے والا حد درجہ احمق ہوگا، اس لیے کہ وہ یونہی عبادت میں منہمک رہ کر اپنے آپ کو محنت و مشقت میں ڈالتا، مسجدیں اور مہمان خانے بنانے کے لیے اپنا مال پانی کی طرح بہاتا ہے، مگر اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ بایں ہمہ بعض اوقات اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ اس کے عین برعکس اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کرے اور لذت گیر ہو، تاہم اللہ تعالیٰ اسے اجر و ثواب عطا کر سکتا ہے، ظاہر ہے کہ ان نظریات و افکار کا نتیجہ دنیا کی ہلاکت و بربادی اور دین میں ہلچل پیدا ہونے کی صورت میں ظہور پذیر سکتا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ قول قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ اہل سنت میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ بخلاف ازیں وہ ان کے اجر و ثواب پانے کے بارے میں ہم نوا ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا وعدہ کر چکا ہے اور وہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، بعض علماء کے نزدیک انبیاء کرام علیہم السلام کا حامل اجر و ثواب

ہونا دلیل سمعی اور بعض کے نزدیک عقلی دلیل سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ آمَنُوْا﴾ (الجاثیه: ۲۱)

'' کیا جن لوگوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ایمان داروں کی طرح کر دیں گے۔''

یہ استفہام انکاری ہے اور اس سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے جو اس زعم فاسد میں مبتلا تھے، اس سے واضح ہوا کہ اہل طاعت اور اہل کفر کی مساوات کا نظریہ ظاہر البطلان ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا حکم صادر کرنے سے منزہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ ﴾

'' کیا ہم اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کو زمین میں فساد بپا کرنے والوں کی طرح کر دیں اور اہل تقویٰ کو فاسق و فاجر لوگوں کی طرح بنا دیں؟۔'' (ص: ۲۸)

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ﴾ (القلم: ۳۵)

'' کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح بنا دیں؟۔''

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اہل سنت کے نزدیک انبیاء کو عذاب میں مبتلا کرنا جائز ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب دینے پر قادر ہے تو بلا شبہ اس کے قادر ہونے میں کوئی کلام نہیں، اور شیعہ کو بھی اس سے مفر نہیں۔ اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اہل سنت شک میں مبتلا ہیں کہ آیا اللہ تعالیٰ انبیاء کو عذاب میں گرفتار کر سکتا ہے، یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ہرگز شک میں مبتلا نہیں، بلکہ ہمارے نزدیک سب انبیاء و اولیاء قطعی جنتی اور ابلیس اور اس کے ہم نوا قطعی جہنمی ہیں۔ بخلاف ازیں اگر شیعہ مصنف کا مقصد یہ ہے کہ اہل سنت میں سے جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے بعض افعال حکمت سے عاری ہوتے ہیں، اس سے تعذیب انبیاء کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بعض متکلمین کی رائے ہے؛ اکثر اہل سنت یہ عقیدہ نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس سے مسئلہ میں متحد الخیال ہیں کہ اطاعت نفع رساں ہے اور عدم اطاعت موجب ضرر ہے۔

[اشکال ۲]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

'' اہل سنت کے نظریہ کے مطابق کوئی شخص نبی کی تصدیق نہ کر سکے گا، اس کی وجہ ہے کہ نبی کی تصدیق دو مقدمات پر مبنی ہے۔''

۱۔ پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ہاتھوں پر معجزہ کا اظہار اس لیے کیا کہ اس کی تصدیق کی جا سکے۔''

۲۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس کی تصدیق کی جاتی ہے وہ صادق ہوتا ہے۔''

اہل سنت کے قول کے مطابق یہ دونوں مقدمات تشنہ تکمیل ہیں، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ کے افعال اغراض کے تابع نہیں ہوتے، تو نبی کی تصدیق کے لیے معجزات کا ظہور پذیر ہونا بھی محال ہوگا، بقول اہل سنت جب اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ، معاصی، کذب اور ضلال کا مرتکب ہو سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی کی تصدیق کر دے (نعوذ باللہ من ہذہ الخرافات) بنا بریں معجزات کے ظہور سے کسی نبی کی صداقت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] : تقدیر کا اثبات کرنے والے اکثر اہل سنت کے نزدیک افعال الٰہی حکمت و مصلحت کے آئینہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا

یہ قول اور اس کی ضد اہل سنت کے اقوال سے باہر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ نبی کی صداقت صرف معجزات ہی کے ذریعہ ظاہر کی جا سکتی ہے بلکہ اس کی صداقت کا اظہار مختلف طرق و وجوہ سے ممکن ہے۔ جس شخص کے نزدیک صرف معجزات ہی سے نبی کی صداقت کا اظہار ہوسکتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس کی دلیل پیش کرے۔ اس پر مزید یہ کہ کسی نبی کے صادق ہونے پر معجزات کی دلالت ایک بدیہی امر ہے جو محتاج فکر و نظر نہیں، اس لیے کہ دعویٰ نبوت کے ساتھ معجزہ کا پایا جانا اس امر کی لازمی اور بدیہی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ معجزہ نبی کی صداقت کے لیے ظاہر کیا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص جب بادشاہ سے کہے کہ اگر آپ نے مجھے فلاں جانب ایلچی بنا کر بھیجا ہے تو خلاف معمول تین مرتبہ اٹھیے بیٹھیے اور بادشاہ اس کی تعمیل کر دے تو بادشاہ کا یہ فعل اس امر کی دلیل ہوگا کہ قاصد کی تصدیق کے لیے اس نے یہ فعل انجام دیا۔

باری تعالیٰ اور افعال قبیحہ کا صدور؟

باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ اہل سنت کے نزدیک جب اللہ تعالیٰ افعال قبیحہ کا مرتکب ہوسکتا ہے، تو وہ جھوٹے نبی کی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو قبائح کا مرتکب قرار نہیں دیتا، اس کی حد یہ ہے کہ جو لوگ باری تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: افعال قبیحہ کی قباحت کی ذمہ داری بندوں پر عائد ہوتی ہے، اللہ پر نہیں، اسی طرح ان کا ضرر بھی بندوں کو لاحق ہوتا ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کو۔

دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ؛ فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تاہم بندہ اس کا کاسب ہے' اللہ کا نہیں۔ جہاں تک معجزات کا تعلق ہے، یہ بندوں کے افعال نہیں ہوتے کہ ان کو بندوں کے افعال میں شمار کیا جائے۔ باقی رہا کذاب کی تصدیق کرنا تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے صادق ہونے کی خبر دی جائے خواہ قول کے ذریعہ ہو یا ایسے فعل سے جو قول کا قائم مقام ہو ظاہر ہے کہ ذات باری سے اس کا صدور محال ہے اس لیے کہ یہ (کذب بیانی) ایک مذموم وصف ہے، اور اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے، کہ ذات حق کو غفور و حلیم اور عفو کے صفات سے متصف نہ کیا جائے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان صفات سے اس صورت میں موصوف ہوسکتا ہے، جب وہ فساق و فجار کو سزا دینے کا مستحق ہو اور جب وہ یہ سزا معاف کر دے تو اسے غفور و حلیم کے اسماء حسنیٰ سے ملقب کیا جائے، ظاہر ہے کہ وہ فساق کو سزا دینے کا مستحق جبھی ہوگا کہ گناہ بندے سے سرزد ہوں نہ کہ اللہ تعالیٰ سے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طریق سے ممکن ہے۔

پہلا جواب: بہت سے اہل سنت کہتے ہیں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ غفور و حلیم کے القاب سے اللہ تعالیٰ کو اسی وقت ملقب کیا جا سکتا ہے جب وہ فساق کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو۔ بخلاف ازیں استحقاق سے قطع نظر وہ اس صورت میں بھی غفور و حلیم ہے، جب وہ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو اس لیے کہ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو حکم دینا چاہتا ہے دیتا ہے۔

دوسرا جواب: قائل کا یہ قول کہ اگر'' اللہ تعالیٰ انسان کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہو'' اس سے اس کی مراد یا تو یہ ہے کہ گناہ گاروں کو سزا دینا اس کا عدل ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج ہے۔ پہلی بات طر پر سب کا اتفاق ہے، اس سے ظاہر ہوا

کہ عفو و مغفرت اس کے فضل و احسان کی آئینہ دار ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیتے ہیں، ان کا یہی زاویہ نگاہ ہے جو لوگ افعال العباد کے متعلق یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ اللہ کی مخلوق ہیں اور بندہ صرف ان کا کاسب ہے، وہ اس بات میں متحد الخیال ہیں کہ سزا اس کے عدل پر مبنی ہے۔

تیسرا جواب: اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے متعلق دو صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ پہلی صورت: اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت کے ساتھ موصوف ہے اور سزا دینا اس کے لیے قبیح ہے۔

۲۔ دوسری صورت: اللہ تعالیٰ رحمت و مغفرت سے جبھی موصوف ہو سکتا ہے، جب سزا دینا اس کیلئے جائز ہو۔

پہلی صورت کے مطابق لازم آئے گا کہ وہ اہل ایمان اور نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے غفار نہیں، اس لیے کہ ان کو سزا دینا قبیح ہے اور ان کی مغفرت واجب ہے۔ مزید برآں اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ ذات باری تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے لیے غفور و رحیم نہیں اور ان لوگوں کے لیے بھی رحیم و کریم نہیں جو گناہ کر کے ان سے تائب ہو جائیں اور نیک کام کرنے لگیں، حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے لیے غفار اور مومنوں پر رحم کرنے والا ہے، مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اللہ تعالیٰ علی الاطلاق مغفرت و رحمت سے متصف ہے۔

بندہ معصیت کا فاعل ہے یا کاسب

بندے سے جو معصیت صادر ہوتی ہے اکثر علماء کے نزدیک وہ اس کا فاعل ہے اور بعض کے نزدیک کاسب۔ اس قول کی روشنی میں یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ آدمی ظالم کو سزا دینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ظالموں کو سزا دینے کا اس سے بھی زیادہ مستحق ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کے معصیت کو پیدا کرنے کا تعلق ہے، وہ اس کی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، یہ جمہور کا نظریہ ہے جو افعال الٰہی کو مبنی بر حکمت قرار دیتے ہیں، یا معصیت کی تخلیق اس کی مشیت کے تابع ہے، یہ ان لوگوں کا نقطۂ نظر ہے جو افعال باری تعالیٰ کو معلل بالحکمت نہیں سمجھتے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا قول ہے:

''اہل سنت کے نزدیک کافر ایمان لانے کے لیے مکلف و مامور ہے حالانکہ بقول ان کے اس میں یہ قدرت ہی موجود نہیں، اس سے تکلیف مالا یطاق لازم آتی ہے، جو شرعاً و عقلاً قابل مذمت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ قائلین تقدیر کے بندہ کی قدرت کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول: یہ ہے کہ قدرت مع الفعل ہوتی ہے بنا بریں جس کافر کے متعلق علم الٰہی میں لکھا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا وہ کبھی ایمان لانے پر قادر نہیں ہوگا۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ جو قدرت احکام کے مکلف بنانے میں شرط ہے وہ قبل از فعل اور تا وقوع فعل ہوتی ہے اور جو قدرت فعل کو مستلزم ہوتی ہے وہ لازماً مع الفعل ہوتی ہے۔ ان کے قول کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن پر اپنا فضل خصوصی فرمایا ہے

جس کی بنا پر وہ راہ ہدایت اختیار کرتا ہے، کافر اس سے محروم ہے۔ نیز یہ کہ عند الفعل بندے کا قادر ہونا ضروری ہے، اس کے برخلاف بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بندہ صرف قبل الفعل قدرت سے بہرہ ور ہوتا ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مورد فضل وعنایت ربانی ہونے کے اعتبار سے مومن و کافر مساوی ہیں۔

[شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں]: جمہور اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ کافر ایمان لانے کی قدرت سے بہرہ ور ہے اور ان کے نزدیک سابقہ اعتراض قطعی طور سے بے بنیاد ہے، یہ اعتراض صرف دوسرے لوگوں کے اقوال کے پیش نظر وارد ہوتا ہے، سابقہ ذکر کردہ دونوں اقوال میں سے جو قول بھی قرین صدق وصواب ہو وہ قول اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔

علاوہ ازیں تکلیف مالا یطاق ... مثلاً معذور کو چلنے کی تکلیف دینا اور آدمی کو اڑنے کا حکم دینا...... جمہور اہل سنت کے نزدیک جو تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں شرعاً ناروا ہے، مگر شیعہ مصنف نے جس تکلیف مالایطاق کا ذکر کیا ہے وہ صحیح نہیں، جہاں تک ان امور کا تعلق ہے، جن کو آدمی اس لیے انجام نہیں دے سکتا کہ وہ ان کی ضد میں مشغول ہوتا ہے، مثلاً کافر کا کفر میں منہمک ہونے کی بنا پر ایمان لانے سے قاصر رہنا، یا ایک شخص مثال کے طور پر بیٹھا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ بعینہ اسی حالت میں کھڑا ہونے پر قادر نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک ضد کو انجام دینے کا عزم مصمم کر لیا جائے تو دوسری ضد کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا، کافر کو ایمان کا مکلف کرنا اسی قبیل سے ہے، ظاہر ہے کہ یہ عقلاً قبیح نہیں، بخلاف ازیں سب عقلاء اس ضمن میں متفق الرائے ہیں کہ کسی شخص کو کسی بات کا حکم دینا یا منع کرنا جب کہ وہ حالت امر ونہی میں اس پر عمل پیرا ہونے سے اس لئے قاصر ہو کہ وہ اس کی ضد میں مشغول ہے، مگر وہ اس ضد کو چھوڑ کر مامور بہ کو انجام دینے پر قدرت رکھتا ہے، بالکل جائز اور روا ہے۔

تکلیف مالایطاق کا جواب

جب تکلیف مالایطاق کی تفسیر بایں طور کی جائے کہ وہ ایسا فعل ہے جس کو انجام دینے پر فاعل کو قدرت حاصل نہ ہو تو اس تفسیر کے مطابق امتناع کا دعویٰ مورد نزاع ہوگا اور اس کی نفی محتاج دلیل ہوگی۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اہل سنت کے نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ لازم آتا ہے کہ ہمارے وہ افعال اختیاری جو قصد وارادہ کے تحت ہم سے صادر ہوتے ہیں، جیسے دائیں بائیں حرکت کرنا وغیرہ ان اضطراری افعال کی مانند ہو کر رہ جائیں جو بلا ارادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، مثلاً نبض کی حرکت یا کسی اونچی جگہ سے گرنے والا جو حرکت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افعال اختیاری و اضطراری کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں یہ اس شخص کے نزدیک لازم آتا ہے، جس کا قول ہے کہ بندے کو اپنے افعال اختیاری پر قدرت حاصل نہیں یہ کسی معروف امام کا قول نہیں اور تقدیر کے قائلین اہل سنت میں سے کوئی بھی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ البتہ جہم بن صفوان اور اس کے غالی ہم نوا کہتے ہیں کہ: بندہ ہرگز قدرت سے بہرہ ور نہیں۔ وہ کہتے ہیں: بندہ اسی طرح حرکت کرتا ہے، جیسے درخت ہلانے سے ہلنے لگے۔ اسلامی فرقوں میں سے امام اشعری رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر ان سے قریب تر ہے، تاہم وہ بندہ کے لیے قدرت محدثہ کا اثبات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فعل بندے کا کسب ہے، مگر اس کے پہلو بہ پہلو وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

بندے کی قدرت کو ایجاد مقدور سے کوئی واسطہ نہیں۔ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ بندے میں جس کسب کا اثبات کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے۔

ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اہل سنت سے بعض اوقات خطا سرزد ہوتی ہے مگر سب اہل سنت خطا کاری کے مرتکب نہیں ، ہوتے ، بخلاف ازیں امامیہ خطا کے ارتکاب میں ایک دوسرے سے ہم نوا ہوتے ہیں اور اجماعی حیثیت سے اس کا ارتکاب کرتے ہیں ، یہ ایک مسلمہ حقیقت وصداقت ہے کہ جن جن مسائل میں امامیہ نے اہل سنت سے اختلاف کیا ہے ، ان میں اہل سنت کا مسلک قرین حق وصواب ہے ، مسئلہ زیر نظر میں جمہور کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بندہ میں حقیقی قدرت پائی جاتی ہے ، لہٰذا وہ فاعل حقیقی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے افعال کا خالق ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ ''وہ ہر چیز کا خالق ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ﴾ (البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے رب ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔''

نیز فرمایا: ﴿ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي ﴾ (ابرھیم:۴۰)

''اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنالے اور میری اولاد کو بھی۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ (الانبیاء:۷۳)

''ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔''

قرآن میں فرمایا: ﴿ وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا اَيْنَمَا كُنْتُ ﴾ (مریم:۳۱)

''اور مجھے بابرکت بنایا میں جہاں بھی ہوں۔''

مزید فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ﴾ (القصص:۴۱)

''اور ہم نے ان کو ایسے پیشوا بنایا تھا جو دوزخ کی طرف دعوت دیتے تھے۔''

ارشاد ہوتا ہے: ﴿ وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ﴾ (التکویر:۲۹)

''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔''

اس آیت سے بندے کی مشیت ثابت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر کام اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔قرآن کریم کے متعدد مقامات میں بتایا گیا ہے کہ بندے مختلف کام انجام دیتے ، ایمان لاتے ، کفر کرتے ، سچ بولتے اور دروغ گوئی کے مرتکب ہوتے ہیں ، نیز یہ کہ وہ قوت واستطاعت سے بہرہ ور ہیں۔

شیعہ مصنف نے جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے ، یہ اس شخص پر وارد ہوتے ہیں ، جو رب کے فعل اور مفعول کے مابین فرق وامتیاز نہیں کرتا یا افعال العباد کو افعال الٰہی قرار دیتا ہے ، یا یہ کہتا ہے کہ مخلوقات میں قوی وطبائع سرے سے موجود ہی نہیں ، حالانکہ نصوص وعقول دونوں سے ان کی شہادت ملتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ ﴾ (الاعراف:۵۷)

''ہم اسے مردہ شہر کی طرف ہانک لے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ بارش اتارتے اور بارش سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ﴾ (البقرۃ: ۱۶۴)

''اس (بارش) کے ساتھ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا۔''

مسئلہ متنازعہ پر قرآنی آیات سے استشہاد

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ ﴾ (المائدۃ: ۱۶)

''اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس شخص کو ہدایت کرتے ہیں جو اس کی رضا مندی کی پیروی کرتا ہے۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے: ﴿ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ﴾ (البقرۃ: ۲۶)

''اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے۔''

مزید فرمایا: ﴿ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ (الصافات: ۱۵)

''کیا ان کو معلوم نہیں کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ طاقت ور ہے۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ﴾ (الروم: ۵۴)

''اس نے تمہیں کمزور پیدا کیا اور پھر اس کمزوری کے بعد طاقت ور بنا دیا۔''

نبی کریم ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے ایک شخص کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تم میں دو باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں: ۱۔ بردباری ۲۔ نرم روی و تدریج۔''[1]

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے، کہ بندوں کے افعال معدوم ہونے کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں، لہٰذا ان کا حکم بھی وہی ہے جو باقی حوادث کا اور یہ بھی دیگر ممکنات کے زمرہ میں داخل ہیں۔ بنا بریں جس دلیل سے بھی حوادث و ممکنات کے مخلوق ہونے پر استدلال کیا جائے گا اس سے یہ بھی عیاں ہوگا کہ افعال العباد اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ہر محدث (حادث شدہ چیز) اپنے وجود میں محدث (وجود میں لانے والے) کا محتاج ہے، یہ مقدمہ جمہور کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ بعینہ اسی طرح ہر ممکن مرجح تام کا محتاج ہے، جب بندے کے افعال حادث ہیں تو ان کے لیے ایک محدث کا وجود ناگزیر ہے، جب بندے کو اپنے افعال کا محدث قرار دیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ بندہ آغاز کار میں محدث نہ تھا، یہ منصب اسے بعد میں ملا ہے، لہٰذا یہ ایک امر حادث ہے اور اسے بھی کسی محدث کی ضرورت ہوگی، اس لیے کہ اگر بندہ شروع ہی سے محدث ہوتا تو یہ فعل حادث بھی دائمی ہوتا۔ اور جب بندے کا محدث ہونا حادث ہے تو اس کے لیے کسی اور محدث کی ضرورت ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ بندے کا ارادہ محدث ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: بنا بریں ارادہ حادث ہے اور اس کے لیے کسی اور محدث کا وجود ناگزیر ہے، اور اگر کہا جائے کہ یہ ارادہ بندے کا ارادہ سے عالم وجود میں آیا تو کہا جائے گا کہ اس ارادہ کیلئے بھی محدث کی ضرورت ہے۔

[1] صحیح مسلم ۔ کتاب الایمان باب الامر بالایمان باللہ تعالیٰ و رسولہ (حدیث: ۲۵/ ۱۷، ۱۸)۔

خلاصہ کلام! بندے میں جس کو آپ محدث فرض کریں گے؛ تو اس کے ساتھ اسی قسم کی گفتگو کی جا سکتی ہے، جیسے حادث اول میں بیان ہوئی۔ اگر بندہ کے افعال کو قدیم اور ازلی قرار دو گے تو یہ محال ہے۔ اس لیے کہ جو فعل بندہ سے وابستہ ہو وہ قدیم نہیں ہوسکتا، اور اگر کہو کہ فعل بندے کا وصف ہے اور اس کی قدرت اس میں پیدا کی گئی ہے اور اس میں اسی طرح گفتگو کا امکان ہے جس طرح ارادہ میں تو اس صورت میں بھی مرجح تام کا وجود ضروری ہے۔[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مقام پر انتہائی دقت نظر اور ہمہ گیری سے کام لے کر حوادث کا تسلسل ثابت کیا ہے]۔

صالح و طالح کی عدم مساوات:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اہل سنت کے نقطۂ نظر کو ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ جو آدمی ساری عمر اعمال صالحہ انجام دینے میں کھپا دے اور جو عمر بھر افعال قبیحہ کا ارتکاب کرتا رہے دونوں مساوی ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، نہ ہم اول کی مدح کر سکتے ہیں اور نہ ثانی کی قدح اس لئے کہ ایک کی نیکی اور دوسرے کی برائی دونوں کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ بات قطعی طور سے بے بنیاد ہے اس لیے کہ نیکی و بدی کے مشترکہ طور پر اللہ کے پیدا کردہ ہونے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کا حکم بھی ایک ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کے سوا ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے اور اس کی مخلوق ہونے میں سب مشترک ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ﴾ (فاطر ۱۹)

''اندھا اور بینا برابر نہیں ہوتے۔''

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت و جہنم، عالم و جاہل، شہد و زہر، راحت و رنج اور آدم و ابلیس سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ جب شرع و عقل دونوں اس امر میں ایک دوسرے کے ہم نوا ہیں کہ جس چیز میں منفعت و مصلحت پائی جاتی ہو، وہ واجب المدح ہے اگرچہ جمادات ہی سے کیوں نہ ہو؛ تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات سے انتہائی احسان کرنے والا بنایا ہو وہ کیونکر مدح کیے جانے کا زیادہ مستحق نہ ہوگا، برائی کے بارے میں بھی یونہی کہا جا سکتا ہے۔

بخلاف ازیں منکرین تقدیر کہتے ہیں کہ: احسان کی بنا پر کوئی شخص قابل مدح ہوسکتا ہے اور نہ ایذا رسانی کے باعث قابل قدح، وہ مدح و ستائش کا مستحق اسی صورت میں ہوسکتا ہے، جب اللہ نے اسے محسن نہ بنایا ہو۔ اس نے نیک کام کر کے ہم پر احسان نہیں کیا اور نہ برائی کر کے ہمیں آزمائش میں ڈالا۔ ان کے قول کی حقیقت یہ ہے کہ جہاں بندے کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اللہ کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا اور جہاں شکر الٰہی مطلوب ہوتا ہے وہاں بندے کا شکریہ ادا کرنا بے سود ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہمیں جو تعلیم و تبلیغ بہم پہنچائی ہے یہ اس کا احسان نہیں ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

''اللہ تعالیٰ نے مومنوں میں اپنا رسول بھیج کر ان پر بڑا احسان کیا ہے۔''

منکرین تقدیر کہتے ہیں:

''فرشتوں کا بندوں کے لیے طلب مغفرت کرنا، علماء کا لوگوں کو علم و فضل سے بہرہ ور کرنا اور حکام کا عدل و انصاف کے

ساتھ معاملات طے کرنا انعامات الٰہیہ میں شامل نہیں ہے۔ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ ملوک ،سلاطین کو عادل یا ظالم بنانے پر قادر نہیں ہے، بعینہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی کو نفع رساں بنا سکتا ہے، نہ ضرر رساں۔''

منکرین تقدیر کے مذکورہ بالا اقوال کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی حال میں بھی مدح و ستائش کا مستحق نہیں، اس لئے کہ شکر اخروی انعامات پر ادا کیا جا سکتا ہے، یا دنیوی پر۔ جہاں تک دنیوی انعامات کا تعلق ہے، وہ منکرین تقدیر کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں۔ باقی رہا اخروی فضل و احسان؛ تو بقول منکرین تقدیر اللہ نے وہ بندوں پر کیا ہی نہیں تا کہ اس کا شکر ادا کیا جائے بلکہ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ کسی کو مومن متقی اور صالح نہیں بنا سکتا اور نہ ہدایت عطا کر سکتا ہے، جہاں تک اخروی انعامات کا تعلق ہے ان کی جزاء واجب ہے۔

خلاصہ کلام ! یہ کہ قائلین تقدیر محسن کی تعریف کرتے اور نقصان پہنچانے والے کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ اس امر میں متحد الخیال ہیں کہ دونوں فعل اللہ کے پیدا کردہ ہیں، اس سے واضح ہوا کہ منکر تقدیر کا یہ دعویٰ کہ تقدیر کا عقیدہ رکھنے والے اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتے قطعی طور پر بے بنیاد ہے، مزید برآں یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نیکی کرنے والا مدح و ثواب کا مستحق ہے اور برائی کا ارتکاب کرنے والا ذم و عقاب کا سزاوار ہے۔

روافض کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر دروغ گوئی

[اشکال] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''امام موسیٰ کاظم علیہ السلام صغیر السن تھے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے ان سے دریافت کیا، معصیت کس سے صادر ہوتی ہے؟ امام موسیٰ نے جواباً فرمایا:

۱۔ بندے سے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ سے۔ ۳۔ یا دونوں سے۔

اگر معصیت کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو اللہ تعالیٰ بندے پر کیوں کر ظلم کر سکتا ہے، اور اسے ناکردہ گناہ کی سزا کیونکر دے سکتا ہے......؟ اور اگر دونوں سے صادر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اور بندہ گناہ کے ارتکاب میں برابر کے شریک ہوئے، اللہ تعالیٰ قوی ہے اور اس لائق ہے کہ اپنے ضعیف بندے سے منصفانہ برتاؤ کرے گا۔

اور اگر بندہ گناہ کا مرتکب ہونے میں منفرد ہے تو مذمت و ملامت کا سزاوار بھی وہی ہوگا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے یہ سن کر فرمایا: ''یہ ایسی نسل ہے کہ اس کے بعض افراد کا دوسروں سے گہرا رابطہ ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب] : اس کہا جائے گا کہ جو بات سنداً مذکور ہو ہم اسکی صحت سے آگاہ ہیں، جو بات شیعہ مصنف نے بیان کی ہے وہ قطعی طور پر جھوٹ ہے؛ اس لیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تقدیر کے قائل ہیں اور انہوں نے فقہ اکبر میں منکرین تقدیر کی تردید کی ہے؛ لہٰذا وہ اس شخص کی تائید نہیں کر سکتے، جو یہ کہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو پیدا نہیں کیا۔ مزید برآں امام موسیٰ بن جعفر متقدمین شیعہ اور دیگر علماء اہل بیت تقدیر کے قائل تھے۔ انکار تقدیر شیعہ میں اس وقت ہوا جب وہ بنو بویہ [1]

---

[1] بنو بویہ نے ایران اور بلاد مشرق کو تشیع کے جہنم میں جھونک دیا، یہ شیعہ کا پہلا دور تھا، دوسرے دور کا آغاز خدا بندہ نامی سلطان کے عہد حکومت سے ہوتا ہے، اسی بادشاہ کے لیے اس شیعہ مصنف نے یہ کتاب تصنیف کی جس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کو قلم اٹھانا پڑا، شیعہ کا تیسرا دور ایران کے سلاطین صفویہ سے شروع ہوتا ہے۔

کے دورِ حکومت میں معتزلہ سے مل جل گئے، شیعہ مصنف نے امام موسیٰ بن جعفر سے جو قول نقل کیا ہے اس کے بیان کرنے والے زیادہ تر منکرین تقدیر کے کم سن لوگ اور بچے ہیں، یہ نظریہ قدریہ کے آغاز ظہور اور امام موسیٰ کی ولادت سے بھی پہلے لوگوں میں معروف تھا، یہ امر محتاج بیان نہیں کہ قدریہ نے اموی دور میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور عبدالملک بن مروان رحمہ اللہ کے عہد خلافت میں پر پرزے نکالنے شروع کیے۔

قائل کا یہ قول کہ: ''اَلْـمَعْصِیَۃُ مِمَّنْ'' ایک مجمل و مبہم لفظ ہے جو محتاج تشریح ہے۔ ظاہر ہے کہ معصیت ہو یا طاعت و عبادت ایک عرض (وہ چیز جو اپنے وجود میں کسی دوسری چیز کی محتاج ہو) ہے جو قائم بالغیر ہے؛ اور اپنے قیام میں کسی محل کی محتاج ہے۔ یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ اس کا قیام بندے کے ساتھ ہے، اللہ کے ساتھ نہیں، اور جو چیز بھی اللہ کی پیدا کردہ ہے اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، بایں معنی کہ وہ اس کی پیدا کردہ ہے، مگر اس سے الگ ہے، یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ قائم ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ مصوف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (الجاثیة:۱۳)

''جو چیز بھی آسمان وزمین میں ہے اللہ نے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:﴿ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ (النحل:۵۳)

''تمہارے جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''اہل سنت کے افکار و آراء سے لازم آتا ہے کہ: کافر اپنے کفر کے باوصف اطاعت شعار ہو اس لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق کیا ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ خیال اس امر پر مبنی ہے کہ آیا اطاعت اللہ تعالیٰ امر کے مطابق ہے یا ارادہ کے؟ نیز یہ کہ کیا امر ارادہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟ ہم قبل ازیں یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال کو اپنے ارادہ سے پیدا کیا۔ بعض اوقات وہ ایسی چیز کو پیدا کرتا ہے، جس کا وہ حکم نہیں دیتا، اس بات پر سب علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شخص حلف اٹھا کر یہ کہے کہ کل وہ اس کا حق ادا کر دے گا، ان شاء اللہ۔ کل کا روز گزر جائے اور وہ قدرت کے باوجود اس کی تعمیل سے قاصر رہے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ اور اگر ان شاء اللہ کے الفاظ میں مشیت کا لفظ امر کے معنی میں ہوتا تو وہ حانث ٹھہرتا، کیونکہ وہ اس کا مامور ہوتا۔ علی ہذا القیاس جب کسی فعل مامور پر حلف اٹھا کر اسے مشیت باری تعالیٰ سے معلق کر دیا جائے تو قسم اٹھانے والا اس میں حانث نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا﴾ (یونس:۹۹)

''اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کرۂ ارضی پر بسنے والے سب ایمان لے آتے۔''

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ امر اور مشیت میں فرق ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا﴾ (الانعام:۱۲۵)

''اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو تنگ کر دیتا ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، مگر ضلالت کا حکم نہیں دیتا، ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ لفظ ارادہ کا اطلاق دو معنوں پر کیا جاتا ہے:

۱۔ارادہ قدریہ ۲۔ارادہ شرعیہ

یہ دوسرا مفہوم محبت و رضا کو شامل ہے، پہلا نہیں۔

ابلیس سے پناہ جوئی:

[اعتراض]: [شیعہ مضمون نگار مزید لکھتا ہے]: اہل سنت کے بقول یہ لازم آتا ہے کہ ہم اللہ کی گرفت سے ڈر کر ابلیس لعین کی پناہ میں آ ئیں، جب کہ یہ آیت قرآنی: ''فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ'' کے صریح منافی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کفار و ابلیس کو گناہوں سے منزہ قرار دے کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، بنا بریں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ابلیس سے بھی بدتر ہے۔تعالیٰ اللہ عن ذلک۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: جواباً عرض ہے کہ یہ کلام ساقط عن الاحتجاج ہے، دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔پہلی صورت یہ ہے کہ ابلیس نے کچھ افعال انجام دیے ہوں گے۔

۲۔دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا۔

بصورت ثانی اس کی پناہ حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ جب ابلیس سرے سے کوئی کام ہی انجام نہیں دیتا تو وہ کسی کو پناہ بھی نہیں دے سکتا اور اگر بصورت اول وہ بعض افعال کا مرتکب ہو چکا ہے، تو وہ گناہوں سے منزہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا اعتراض دونوں صورتوں میں باطل ہے خواہ تقدیر کا اثبات کیا جائے یا نفی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ابلیس سے پناہ جوئی اس صورت میں مستحسن ہے جب وہ پناہ دینے پر قادر ہو، خواہ اللہ تعالیٰ کو افعال العباد کا خالق قرار دیا جائے یا نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ مصنف اور اس کے ہم نوا منکرین تقدیر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ابلیس وہ کام انجام دیتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھے۔ نیز یہ کہ ابلیس بلا ارادہ الٰہی بھی بعض افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو نیک عمل سے ہٹا کر برے کام پر نہیں لگا سکتا اور نہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ افعال قبیحہ سے ہٹا کر نیک اعمال پر لگا دے، جبکہ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ سرور کائنات ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَبِكَ مِنْكَ)) [1]

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات و افعال کے ساتھ اس کے بعض افعال سے پناہ طلب کیا کرتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے عقاب و عتاب سے خود اسی کی پناہ طلب کرتے تھے، پھر یہ کیونکر منع ہوا کہ اس کی بعض مخلوقات کی ایذا سے اس کی پناہ طلب کی جائے۔ اہل سنت کے یہاں اس بات میں کوئی قباحت نہیں پائی جاتی کہ بندہ اپنے رب کی پناہ طلب کر کے اور اسے پکار کر اپنی حاجات وضروریات کا ازالہ کرے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ مہربان ہے جتنی کہ والدہ اپنی اولاد پر ہوتی ہے، لہٰذا اسباب شر سے اس کی پناہ طلب کرنا عین قرین عقل و دانش ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، (حدیث:٤٨٦)

ارباب علت وحکمت کا قول ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اسی طرح پیدا کیا جس طرح سانپوں، بچھوؤں اور آگ جیسی موذی اشیاء کو۔ کیونکہ ان کی تخلیق گہری مصلحت پر مبنی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو اس نے حکم دیا ہے کہ ہم امکانی حد تک اپنے سے ضرر وایذا کو دور کریں جس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس کے دامن حکمت ورحمت میں پناہ لی جائے۔''

جو لوگ علت وحکمت کے قائل نہیں ان کا قول ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو خلق فرمایا باوجودیکہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ضرر رساں ہے۔ اس کے ضرر کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ ہم باری تعالیٰ کے دامن عافیت میں پناہ لیں جس طرح آگ کے ضرر سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے بجھا دیا جائے اور زہر کے ضرر سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ تریاق استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے نافع وضار دونوں قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں، اور ہمیں ان باتوں کا مامور فرمایا ہے جو ہمارے لیے سودمند ہیں۔ اگر وہ ہماری امداد فرمائے تو یہ اس کا احسان ہے ورنہ وہ جیسے چاہے کرے۔

[اہل سنت پر شیعہ مصنف کا افتراء]:

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار کا یہ قول کہ اہل سنت کے یہاں کافر وابلیس گناہوں سے پاک ہیں، یہ صریح قسم کا بہتان ہے، بخلاف ازیں اہل سنت بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معصیت کا ارتکاب کرنے والا عاصی اور قابل مذمت ہے، نیز یہ کہ افعال کے ساتھ اس شخص کو موصوف کر سکتے ہیں جو ان کو انجام دیتا ہو، پیدا کرنے والے کو نہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صفت کا انتساب اس موصوف کی جانب جس کے ساتھ اس کا قیام ہے، اضافۃ المخلوق الی الخالق کے قبیل سے ہے۔

منکر تقدیر شیعہ انتہائی طوالت سے کام لیتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''اہل سنت کے نقطۂ نظر کے مطابق اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید پر سے اعتماد اٹھ جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جانب دروغ گوئی کی نسبت درست ہے، بنا بریں اس کی دی ہوئی خبریں بھی جھوٹ ہوں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انبیاء کی بعثت عبث ہوگی اور کسی فائدہ کی موجب نہیں ہوگی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: یہ ہے کہ خالق وفاعل کے مابین فرق وامتیاز سب عقلاء کے نزدیک مسلم ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ جب کسی چیز میں حرکت پیدا کریگا تو ذات باری کو متحرک قرار نہیں دے سکیں گے، جب وہ بادل میں گرج پیدا کرتا ہے، تو گرج کو اس کی آواز نہیں کہہ سکتے۔ بعینہ اسی طرح جب وہ حیوانات ونباتات میں مختلف قسم کے رنگ پیدا کرتا ہے، تو اسے ان رنگوں سے موصوف قرار نہیں دے سکتے۔ جب وہ کسی چیز میں علم اور حیات وقدرت کی صفات پیدا کرتا ہے تو یہ اس کی صفات نہیں کہلا سکتیں۔ علی ہذا القیاس جب وہ کسی چیز میں اندھا پن اور بہرہ پن پیدا کرتا ہے، تو یہ اس کی صفت نہیں کہلاتی جب اللہ تعالیٰ کسی میں روزہ، طواف اور خشوع وخضوع پیدا کرتا ہے تو اسے روزہ دار، طواف کنندہ اور خاشع کے ناموں سے یاد نہیں کیا جا سکتا، باقی رہی قرآن حکیم کی یہ آیت کریمہ: ﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ (الانفال: ۱۷)

''جب آپ نے تیر پھینکا تو وہ آپ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکا ہے۔''

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ وہ تیر آپ نے پھینکا ہے، مگر اسے نشانہ پر لگانا آپ کا فعل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی عنایت ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ تیر اندازی سرور کائنات ﷺ کا فعل ہے اور اسے دشمنوں تک پہنچانا اللہ کا کام۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ تیر انداز اور تیر اندازی دونوں اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا حقیقی تیر انداز اللہ تعالیٰ

کی ذات ہے یہ خیال قطعی طور پر بے بنیاد ہے اگر کسی چیز کے پیدا کرنے کی بنا پر اس کی نسبت ذات باری کی جانب کی جاسکتی تو ہر فعل کو اللہ کی جانب منسوب کر دیا جاتا، حالانکہ یہ بداہۃً غلط ہے۔ روایات میں مذکور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور ہوئے تو بلوائی آپ پر پتھر پھینکنے لگے، حضرت عثمان نے پوچھا تم پتھر کیوں پھینکتے ہو.....؟ وہ کہنے لگے ہم پتھر نہیں پھینک رہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پھینکتا ہے، آپ نے فرمایا: تم جھوٹ کہتے ہو اگر اللہ تعالیٰ پتھر پھینکتا تو اس کا نشانہ ہرگز نہ چوکتا مگر تمہارے سب نشانے بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔''

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی رائے میں اللہ تعالیٰ یہ جانتے ہوئے دروغ گوئی کی قدرت پیدا کرتا ہے کہ وہ شخص جھوٹ بولے گا۔ اسی طرح وہ اس علم کے باوصف ظلم وفحش کی قدرت عطا کرتا ہے، کہ یہ آدمی ظلم وفحش کا مرتکب ہوگا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہم میں سے جو شخص افعال قبیحہ کے انجام دینے میں کسی کی مدد کرتا ہے، وہ گویا بذات خود ان افعال کا ارتکاب کرتا ہے، بنابریں ظلم وکذب کی مدد کرنے والے کو ظالم وکاذب قرار دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ: ۲)

''ظلم وتعدی میں کسی کی مدد نہ کرو۔''

اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات:

☆ اگر سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو قدرت اطاعت کے لیے عطا کی ہے نافرمانی کے لیے نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب اسے معلوم تھا کہ قدرت ملنے پر نافرمانی کرے گا تو یہ اسی طرح ہوا جیسے کسی کو کفار سے جہاد کرنے کے لیے تلوار دی جائے جب کہ یہ معلوم ہو کہ وہ اسی تلوار سے کسی نبی کو قتل کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ باتیں بندوں کے بھی مناسب حال نہیں ہیں تو اللہ کی ذات اس سے کہیں بلند ہے۔

تیسری بات: جو چیز ممکن الوقوع ہو اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز وقوع پذیر بھی ہو جائے۔ بخلاف ازیں ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ قدرت کے باوصف وہ بہت سے کام انجام نہیں دیتا، مثلاً وہ سمندر کو پارے میں تبدیل نہیں کرتا، پہاڑوں کو یاقوت کی شکل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کذب سے منزہ ہے اور کذب کا صدور اس سے محال ہے۔

چوتھی بات: یہ کہ اللہ تعالیٰ صفات کمال سے موصوف ہے، موجودات عالم میں جو کمال بھی پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے، وہ ہر نقص وعیب سے منزہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حیات اور علم وقدرت صفات کمال ہیں لہٰذا وہ ان کا زیادہ مستحق ہے، راست بازی وصداقت بھی اس کا خاص وصف ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ۸۷)

''اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچی بات کہنے والا اور کون ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اَصْدَقَ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ)) [1]

---

[1] النسائی۔ کتاب صلاۃ العیدین۔ باب کیف الخطبة (ح: ۱۵۷۹) کتاب السهو۔ باب نوع آخر من الذکر بعد التشهد (ح: ۱۳۱۲) بلفظ "احسن الکلام کلام الله" المطالب العالية (۳۱۰۵) بلفظ "ان اصدق الحدیث کلام الله۔"

''بیشک سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔''

پانچویں بات: یہ ہے کہ اہل سنت کی رائے میں اللہ کا کلام قائم اور غیر مخلوق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ کلام ایک صفت کمال ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اس سے متصف ہونا ناگزیر ہے، خواہ کلام کی کوئی صورت بھی ہو، اس ضمن میں ان کے متعدد اقوال ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ صفت کلام اللہ کی قدرت و مشیت سے وابستہ نہیں یہ ایک صفت ہے جو بذات خود قائم ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ کلام حروف یا اصوات قدیمہ کا نام ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ کلام مشیت ایزدی سے متعلق ہے۔

چوتھا قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے متکلم نہ تھا یہ صفت بعد ازاں اس میں پیدا ہوئی۔

پانچواں قول یہ ہے کہ وہ ازل ہی سے متکلم تھا۔

دروغ گوئی، بہرے پن اور گونگے پن کی طرح ایک عیب ہے۔ اللہ تعالیٰ بلاشبہ گونگے اور بہرے لوگوں کو پیدا تو کرتا ہے، مگر بذات خود اس میں یہ عیب نہیں پایا جاتا۔ بعینہ اسی طرح وہ کاذب میں کذب کو تو پیدا کرتا ہے، مگر خود دروغ گوئی کا ارتکاب نہیں کرتا۔

چھٹی بات: یہ سوال شیعہ پر وارد ہوتا ہے، شیعہ کا عقیدہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ دوسروں میں کلام پیدا کرتا ہے۔ اندریں صورت کلام کا قیام اگرچہ دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے مگر اسے اللہ کا پیدا کردہ قرار دیں گے۔ اس کیساتھ ساتھ شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو کلام بندوں سے صادر ہوتا ہے وہ خدا کا کلام نہیں۔ اور اس کا پیدا کردہ بھی نہیں، جب ان کے نزدیک یہ دونوں باتیں درست ہیں تو اس بات کا اعتراف کرنا ان کے لیے ناگزیر ہے کہ یہ اس کا کلام ہے اور وہ اس کا کلام نہیں۔

[**اعتراض**]: شیعہ مصنف کہتا ہے:

''اہل سنت کے قول کے مطابق یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی بھیجتا ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[**جواب**]: ہم جواباً کہیں گے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی بھیجتا ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيَاطِيْنَ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (مریم: ۸۳)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم شیطانوں کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا﴾ (الاسراء: ۵)

''ہم نے اپنے بندے تمہارے پاس بھیجے۔''

مگر اللہ تعالیٰ ان کے جھوٹ کو فوری طور پر آشکار کر دیتے ہیں۔ مثلاً مسیلمہ اور اسود عنسی جھوٹے نبی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا کاذب ہونا رسول اللہ ﷺ کے ذریعے واضح کر دیا تھا، بنابریں ان کا صدق و کذب کسی پر مخفی نہیں رہا۔ اگر وہ کہیں کہ جب اللہ تعالیٰ جھوٹے انبیاء کو پیدا کر سکتا ہے، تو ان پر صدق کے علامات ظاہر کرنا بھی اس سے کچھ بعید نہیں تو یہ سراسر باطل ہے۔ اور اگر کہیں کہ صدق کی علامات کا اظہار محال ہے تو ظاہر ہے کہ علامات صدق کے بغیر ادعائے نبوت بے سود ہے۔ جیسے کوئی شخص طبیب ہونے کا مدعی تو ہو مگر اس کے پاس اپنے دعویٰ کے اثبات میں کوئی دلیل نہ ہو۔

جھوٹے نبیوں کے ہاتھوں معجزات کا ظہور:

اگر یہ کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ کاذب کی ذات میں کذب کو پیدا کر سکتا ہو تو اس کے ہاتھوں ایسے معجزات کیوں ظاہر نہیں کر سکتا جو اس کی صداقت کی دلیل ہوں......؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں، اس لیے کہ صدق کے دلائل صداقت کو مستلزم ہیں، کیونکہ دلیل مدلول کو مستلزم ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ کذاب پر علامات صدق کا اظہار ممتنع لذاتہ ہے۔

اگر وہ کہیں کہ کذاب کے ہاتھوں خوارق کا ظہور جائز ہے، تو ہم کہیں گے کہ مدعی الوہیت مثلاً دجال کے حق میں یہ جائز ہے۔ مدعی نبوت سے خوارق کا ظہور صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ان خوارق سے اس کی صداقت واضح نہ ہوتی ہو جس طرح ساحر و کاہن سے ایسے خوارق کا ظہور جائز نہیں جو اس کے صدق کی دلیل ہوں۔

ساتویں بات: یہ ہے کہ نبوت کے دلائل و براہین کا دائرہ صرف خوارق ہی میں نہیں بلکہ ان کی کئی قسمیں ہیں جس طرح جھوٹ کی پہچان حاصل کرنے کے متعدد طریقے ہیں۔

[اعتراض]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:

"اگر اہل سنت کی بات تسلیم کر لی جائے تو اس سے شرعی حدود کا بے کار ہونا لازم آتا ہے، مثلاً زنا اور سرقہ جیسے جرائم کا صدور جب اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق ہو اور اس کا ارادہ ان افعال کی انجام دہی میں مؤثر ہو تو کسی بادشاہ کو اس پر گرفت کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا، اس لیے کہ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ چور و زانی کو اللہ کے ارادہ سے باز رکھنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ ظاہر کہ اگر کوئی شخص ہمیں اپنے ارادہ کی تکمیل سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو ہمیں اس سے کوفت ہوگی، تو پھر اللہ کو یہ بات کیوں کر پسند ہوگی؟ اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نقیضین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے، ایک طرف تو وہ معصیت کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اس سے روکتا بھی ہے۔"

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے صرف ان امور کو مقدر کیا تھا جو ظہور پذیر ہو چکے، جو امور تا ہنوز عالم وجود میں نہیں آئے، وہ اللہ کے علم میں مقدر بھی نہیں ہیں۔ جو امور وقوع پذیر ہو چکے ہیں، کوئی شخص ان کے روکنے پر قادر نہ تھا۔ شرعی حدود و زواجر سے ان امور کو روکا جاتا ہے، جو ابھی وقوع میں نہیں آئے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: "وہ شخص چور کو اللہ کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔" صریح جھوٹ ہے اس لیے کہ وہ شخص تو چور کو اس کام سے روکنا چاہتا ہے جو اس نے ابھی سرانجام نہیں دیا، اور جو کام ابھی وقوع پذیر نہیں ہوا، اس کا ارادہ اللہ نے بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص حلف اٹھا کر کہے کہ انشاء اللہ وہ اس مال کو چرا لے گا اور پھر اسے نہ چرائے تو وہ اجماعاً اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں چاہا کہ وہ چوری کا مرتکب ہو۔

ارادہ اور امر میں فرق و امتیاز:

بخلاف ازیں قدریہ (منکرین تقدیر) ارادہ کو امر کے معنی میں لیتے ہیں بنا بریں وہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ سرقہ جب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وقوع میں آتا ہے، تو وہ مراد کے ساتھ ساتھ مامور بھی ہے۔ حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرقہ کا حکم نہیں دیا۔ جو شخص اس کا قائل ہے اس کا کفر کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔

علاوہ ازیں بالاتفاق بندہ کی تقدیر میں بعض باتیں ایسی مقدر ہوتی ہیں جن کا دور کرنا ایک امر مستحسن ہوتا ہے۔ مثال کے

طور پر بیماری انسان کی تقدیر میں لکھی ہوتی ہے، مگر علاج معالجہ اور اس کے اسباب سے پرہیز کر کے اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بھی اللہ کے ارادہ کو دور کرنا ہوا۔ اسی طرح آگ کا بجھانا اور گرنے والی دیوار کی مرمت کرنا، لحاف اوڑھ کر سردی کا مداوا کرنا؛ حرارت سے بچنے کے لیے سایہ میں آنا یہ سب اسی قبیل سے ہیں۔ ان میں اللہ کی مراد و مقدر تکلیف کا ازالہ اسی کے پیدا کردہ راحت و آرام سے کیا جاتا ہے، یہ سب امور اللہ کے پیدہ کردہ اور بندہ کی تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں۔ سالار انبیاء ﷺ سے دریافت کیا گیا تھا کہ:

''ادویہ سے علاج کرنے، دم جھاڑ اور دوران مرض مضر اشیاء سے پرہیز کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور کیا یہ چیزیں اللہ کی تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بھی تقدیر میں شامل ہیں۔'' ❶

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُوْنَهُ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (الرعد: ۱۱)

''اس کے سامنے اور پیچھے باری باری آنے والے فرشتے ہیں، جو اسے حکم الٰہی سے محفوظ رکھتے ہیں۔''

[شبہ]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''اس سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ لازم آتا ہے کہ وہ نقیضین کا ارادہ کرنے والا ہے۔''

[جواب]: [یہ شبہ سرے سے] ساقط عن الاعتبار ہے، اس لیے کہ ان دو چیزوں کو باہم نقیض قرار دیتے ہیں جن کا اجتماع اور ارتفاع محال ہو یا وہ دو چیزیں جن کا باہم جمع ہونا ممکن نہ ہو ان کو ایک دوسرے کی ضد بھی کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زجر و عتاب اس امر کے بارے میں نہیں ہوتا، جو وقوع پذیر ہو چکا ہو اور اس کا ارادہ بھی کر لیا گیا ہو۔ بخلاف ازیں زجر کی حیثیت ماضی کے اعتبار سے سزا کی ہوتی ہے اور مستقبل کے لحاظ سے زجر و توبیخ کی۔ جو زجر اس کے حسب ارادہ ہوتا ہے، اگر اس سے امر مقصود حاصل ہو جائے تو اس سے صرف زجر مراد ہوتا ہے، اور اگر مقصود حاصل نہ ہو تو یہ زجر کامل نہیں۔ جس طرح کسی کو تلوار مارنے کا ارادہ کیا جاتا ہے اور کسی کو زندہ رکھنے کا۔ اور جس طرح اس مہلک مرض کا ارادہ کیا جاتا ہے جو بعض اوقات موت کا باعث بنتا ہے اور اس سے زندگی کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے۔

[شبہ]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ''یہ بات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ ہمارے افعال ہماری جانب منسوب کیے جاتے، اور ہمارے ارادہ کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم دائیں جانب حرکت کرنا چاہتے ہیں تو وہ بائیں جانب واقع نہیں ہوتی اور اگر بائیں جانب حرکت کرنا مقصود ہو تو دائیں طرف حرکت نہیں کرتے، یہ ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ اس میں کسی شک و ریب کی گنجائش نہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]: بلاشبہ جمہور اہل سنت یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہمارے افعال کی نسبت ہماری طرف کی جاتی ہے، اور ہم ہی ان کو عالم وجود میں لاتے ہیں۔ قرآن کی نصوص کثیرہ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر محتاج غور و فکر ہے کہ بندہ پہلے فاعل اور ارادہ کنندہ نہ تھا بعد میں اس وصف سے بہرہ ور ہوا۔ بنا بریں اس کا ایک امر حادث ہونا اظہر من الشمس ہے، اب دو ہی صورتیں ہیں:

۱۔ اس کا کوئی محدث ہوگا۔ ۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی اس کا محدث نہیں۔

❶ سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرقی والادویة (حدیث: ۲۰۶۵، ۲۱٤۸)، سنن ابن ماجة، کتاب الطب۔ باب ما انزل اللہ داء الا انزل له شفاء (حدیث: ۳٤۳۷)۔

بصورت ثانی حوادث کا ظہور بلا کسی محدث کے لازم آتا ہے۔ بصورت اول وہ محدث یا تو بندہ خود ہوگا، یا ذات باری تعالیٰ۔ اگر بندہ کو محدث قرار دیا جائے تو پھر اس کا اور بھی کوئی محدث ہوگا، جس کا نتیجہ تسلسل کی صورت میں رونما ہوگا، جو کہ باطل ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ عدم سے وجود میں آیا ہے۔لہٰذا اس کے ساتھ ایسے حوادث کا قیام ممکن نہیں جن کا نقطۂ آغاز معلوم نہ ہو، مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بندے کا مرید و فاعل ہونا ذات باری تعالیٰ کا رہین منت ہے، اسی لیے اہل سنت کہتے ہیں، کہ بندہ فاعل ہے اور اللہ نے اسے فاعل بنایا ہے، بندہ صاحب ارادہ ہے اور اللہ نے اسے صاحب ارادہ بنایا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (التکویر: ۲۹)

''اور تم نہیں چاہتے ،مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

نیز ارشاد فرمایا: ﴿ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ (ابرھیم: ۴۰)

''اے میرے رب مجھے نماز کا پابند بنا لے اور میری اولاد کو بھی۔''

انسانی ارادہ اور مشیت ایزدی:

سابق الذکر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ بندے کا ارادہ اپنی جگہ پر درست ہے مگر مشیت ایزدی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ بندے کا ارادہ کسی علت کا محتاج نہیں؛ اس کا قول بے حقیقت ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ارادہ ایک حادث چیز ہے۔لہٰذا اس کے لیے ایک محدث کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا سبب اور کسی محل کے بغیر ارادہ کو عالم وجود میں لاتا ہے، وہ تین محالات کا ارتکاب کرتے ہیں:

۱۔حادث کا اللہ تعالیٰ ارادہ کے بغیر وجود میں آنا۔

۲۔کسی سبب کے بغیر حادث کا ظہور پذیر ہونا۔

۳۔صفت کا قیام بلا محل۔

اگر سوال کیا جائے کہ جب بندہ اپنے ارادہ کی تکمیل خود کرتا ہے،تو اللہ تعالیٰ اس کا محدث کیوں کر ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ کو جنم دیا۔ بایں وہ اس کا محدث ہے۔ بندہ ارادے کا فاعل ہے کیونکہ اس نے اللہ کی ودیعت کردہ قدرت و مشیت سے اس ارادہ کی تکمیل کی ، یہ دونوں احداث ایک دوسرے کو مستلزم ہیں، اللہ تعالیٰ کا بندے کے فعل کو پیدا کرنا وجود فعل کو مستلزم ہے اور بندے کا فاعل ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ رب تعالیٰ اس کا خالق ہے۔

انسانی افعال اور مشیت ایزدی:

[شبہ]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''قرآن کریم میں اکثر افعال انسانی کو بنی نوع انسان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل:۳۲)

''جنت میں داخل ہو جاؤ بسبب ان نیک اعمال کے جو تم کیا کرتے تھے۔''

نیز ارشاد فرمایا:﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا﴾ (الجاثیۃ:۱۵)

''جو شخص نیک کام کرے گا وہ اپنے لیے کرے گا اور جو کوئی برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا۔''

اس ضمن میں شیعہ مصنف نے متعدد آیات نقل کی ہیں۔

[جواب]: ہم جواباً کہتے ہیں: ''یہ ٹھیک ہے کہ قرآن حکیم میں انسانی افعال کی نسبت بنی نوع آدم کی طرف کی گئی ہے، مگر قرآن میں ایسی آیات کی بھی کمی نہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسانی افعال مشیت ایزدی سے وجود میں آتے ہیں۔حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿ وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ مَااقْتَتَلُوْا﴾ (البقرۃ: ۲۵۳)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ نہ لڑتے۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا﴾ (الانعام: ۱۰۷)

''اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے۔''

﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو کھول دیتا ہے۔''

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (البقرۃ: ۲۶)

''وہ اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔''

﴿ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ﴾ (الانفال: ۲۴)

''خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل میں حائل ہو جاتا ہے۔''

[اعتراض]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''ہمارے مخالفین کا عقیدہ ہے کہ صاحب قدرت کے ہر دو مقدور میں سے بلا مرجّح کسی کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ترجیح دینے کی صورت میں فعل واجب ہو جاتا ہے، اور قدرت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں اس سے لازم آتا ہے کہ بندہ اللہ کا شریک ہو۔''[انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: پہلا جواب: یہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق سے مقابلہ کرنے والی بات ہے۔ اگر قدرت مرجّح کی محتاج ہو اور مرجّح سے نتیجہ کا ظہور وقوع واجب ہو جاتا ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مختار نہیں بلکہ موجب ہونا لازم آتا ہے، جس کا نتیجہ کفر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

❀ دوسرا جواب: جب اللہ تعالیٰ بندے کو مقہور و معدوم کرنے پر قادر ہے تو اس کے شریک ہونے کا احتمال کیوں کر پیدا ہو گیا؟ ۔

❀ آیت قرآنی ''وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ'' کا جواب یہ ہے کہ اس میں ان بتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جن کو وہ خود ہی گھڑا کرتے تھے، ان بتوں کی مذمت میں فرمایا:

﴿ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصافات: ۹۵۔ ۹۶)

''کیا تم ان کو پوجتے ہو جن کو خود ہی گھڑ لیتے ہو، حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔''

[شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں]:

شیعہ مصنف نے قائلین تقدیر کے صرف چند دلائل بیان کیے ہیں، بایں ہمہ تین دلائل کا شیعہ کے پاس کوئی صحیح جواب نہیں۔

پہلی دلیل کے معقول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص یہ دلیل پیش کرتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ جب فعل واجب ہو جاتا ہے تو

قدرت باقی نہیں رہتی، اس کے برخلاف عام اہل سنت کا قول ہے کہ بندے میں قدرت پائی جاتی ہے، اس کی حد یہ ہے کہ جبریہ بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ جبریہ کہتے ہیں کہ: یہ قدرت موثر نہیں ہوتی۔ ہم قبل ازیں واضح کر چکے ہیں کہ قدرت اسی طرح مؤثر ہوتی ہے جیسے اسباب اپنے مسببات پر اثر انداز ہوتے ہیں، البتہ قدرت میں خلق وابداع کی تاثیر نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں اس امر سے بھی مذکورہ بالا دلیل کی تائید ہوتی ہے، کہ صاحب قدرت کا مقدور کسی مرجح کے بغیر ترجیح نہیں پا سکتا، یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ مرجح بندے میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا اس کا من جانب اللہ ہونا متعین ہوا، یہ بھی ظاہر ہے کہ مرجح تام کے موجود ہونے کی صورت میں فعل کا پایا جانا ضروری اور اس کا عدم وجود ممتنع ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر مرجح کے پائے جانے کے بعد بھی فعل کا وجود وعدم مساوی ہو جیسا کہ وجود مرجح سے قبل تھا تو وہ فعل ممکن ٹھہرے گا اور ممکن کے وجود اسی صورت میں عدم کے مقابلہ میں راجح ہوتا ہے جب کوئی مرجح تام پایا جاتا ہو۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ اس سے فعل اللہ تعالیٰ کے ساتھ معارضہ لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عقلی ویقینی دلیل ہے اور یقینیات کا معارضہ ممکن نہیں، مزید برآں قدرت ربانی مرجح کی محتاج ہے، ظاہر ہے کہ مرجح صرف اللہ کا ارادہ ہی ہوسکتا ہے، یہ امر بھی مسلم ہے کہ ارادہ الٰہی کا صدور غیر سے ممکن نہیں بخلاف بندے کے ارادہ کے کہ وہ غیر سے صادر ہوسکتا ہے، جب ارادہ الٰہی مرجح ہوا تو فاعل بالاختیار ہوگا، نہ کہ موجب بالذات بلا اختیار۔ اندریں صورت کفر بھی لازم نہیں آئے گا۔

کیا اللہ تعالیٰ موجب بذاتہ ہے......؟:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اس سے اللہ تعالیٰ کا موجب بالذات ہونا لازم آتا ہے۔''

ہم پوچھتے ہیں کہ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا قدرت وارادہ تاثیر پیدا کر دیتا ہے؟ یا تمہارا مقصد یہ ہے کہ مرجح یعنی ارادہ مع القدرت کے ساتھ تاثیر کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بصورت اول ہم تلازم کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، اس لیے کہ ہم فرض کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صاحب قدرت اور ترجیح دینے والا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں دو چیزیں ہیں:

۱۔قدرت ۲۔دوسری چیز کو ہم ارادہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر یہ کہنا کیوں کر درست ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت وارادہ کے بغیر ترجیح دینے والا ہے؟

اور اگر شیعہ مضمون نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ارادہ مع القدرت کے پائے جانے کی صورت میں نتیجہ کا ظہور ایک لابدی امر ہے تو یہ ایک حق بات ہے اور سب اہل اسلام اس کے قائل ہیں، اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو عالم وجود میں لانا چاہتے ہیں وہ اس کی قدرت ومشیت کے مطابق ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس چیز کا وجود ذات باری کو پسند نہیں ہوتا وہ اس کی مشیت وقدرت کے نہ ہونے کی بنا پر عالم وجود میں نہیں آتی۔ پہلی قسم مشیت ایزدی کے باعث واجب اور دوسری عدم مشیت کی وجہ سے ممتنع ہوتی ہے۔

قدریہ کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ بعض اشیاء کو چاہتے ہیں مگر وہ وجود پذیر نہیں ہوتیں اور بعض اشیاء اس کے مشیت کے بغیر ظہور میں آجاتی ہیں، صریح ضلالت کا آئینہ دار ہے، اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ دو حال سے خالی نہیں:

۱۔اس کا وجود میں آنا واجب ہو۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اس کا ظہور پذیر ہونا واجب نہ ہو۔

بصورت اول مطلوب حاصل ہو گیا اور مرجح کے ہوتے ہوئے اثر و نتیجہ بھی رونما ہو گیا، خواہ اس کا نام موجب بالذات رکھا جائے، یا کچھ اور بصورت ثانی اس چیز کا وجود واجب نہیں۔ لہٰذا وہ ممکن ہوئی جس کا وجود وعدم مساوی ہے اور جس کے لیے کسی مرجح کا ہونا از بس ضروری ہے، علی ہذا القیاس۔

نیز ہم شیعہ قلمکار سے کہتے ہیں کہ: ''تم نے جو عقلی دلیل بایں طور پیش کی ہے کہ بندہ کے اختیاری افعال اسی کی جانب منسوب کیے جاتے ہیں، اور اسی کے حسب اختیار وقوع میں آتے ہیں ان افعال سے چکنا چور ہو جاتی ہے، جن کو بندہ انجام نہیں دیتا، مثلاً انسان اپنی صواب دید کے مطابق اپنے کپڑے کو رنگتا ہے، اور اس کو انسان کی صنعت شمار کیا جاتا ہے حالانکہ رنگ اس کا پیدا کردہ نہیں اسی طرح کھیتی باڑی اور درخت بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے بوتا ہے اور اس فعل کو انسان کی جانب منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ اگانا اس کا کام نہیں ہے، اس بیان سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ جو چیز انسان کی طرح منسوب ہو اور اس کے حسب مرضی وقوع پذیر ہو یہ ضروری نہیں کہ اس کی پیدا کردہ ہو، یہ عقلی معارضہ ہے۔''

باقی رہا شیعہ مضمون نگار کا یہ قول کہ ''اس میں شرک کیسے پیدا ہو گیا۔'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ حوادث کا بلا قدرت الٰہی پیدا ہو جانا ہی بہت بڑا شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین تقدیر کو مجوس کے مماثل قرار دیا گیا ہے، جو خیر و شر کے دو الگ الگ خالق تسلیم کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''توحید کی شیرازہ بندی عقیدہ تقدیر سے ہوتی ہے۔''[1]

قدریہ کا نقطۂ نگاہ نہ صرف شرک بلکہ صفات الٰہی کے انکار کو بھی مستلزم ہے۔ اس عقیدہ کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بعض حوادث کسی خالق کے بغیر از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیز یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اور فاعل مستقل بھی موجود ہے، یہ دونوں کفر کی شاخیں ہیں، اس لیے کہ ہر کفر کی جڑ تعطیل و شرک کے تخم سے جنم لیتی ہے۔ فلاسفہ بھی اسی زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ افلاک فاعل مستقل ہیں اور وہ حوادث ارضی کو جنم دیتے ہیں؛ مگر تعجب ہے کہ وہ قدریہ کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے کہ ''اللہ تعالیٰ اس عالم ارضی کو پیدا کرنے سے قبل بیکار تھا۔'' فلاسفہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلے بھی افعال سے معطل رہا ہے اور بدستور اسی حالت پر قائم ہے، جو چیزیں لوازم ذات میں داخل ہیں، مثلاً عقل و فلک یہ اس کا فعل نہیں، کیونکہ فعل کا ظہور تدریجی طور پر ہوتا ہے، جو چیز ذات کے لوازم میں سے ہو وہ صفات کے قبیل سے ہوتی ہے، مثلاً انسان کا رنگ اور درازی قد ظاہر ہے کہ یہ اس کا فعل نہیں، بخلاف ازیں اس کی حرکات کو اس کا فعل قرار دے سکتے ہیں، اگرچہ یہ حرکات بھی اس کے لیے مقدر تھیں۔

نفس انسانی کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اس میں مختلف تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں، دل میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں، وہ ہنڈیا کی اس حالت سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں جب وہ جوش و خروش کا پیکر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

فاعل کی تعریف:

خلاصہ کلام! فاعل دراصل وہ ہے جس کے ساتھ کوئی فعل وابستہ ہو اور اس فعل کا ظہور اس سے تدریجاً ہو۔ بخلاف ازیں جس کے ساتھ کوئی وصف ازل ہی سے مقارن چلا آ رہا ہو وہ وصف اس کا فعل نہیں، اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ

[1] السنة لعبد الله بن احمد (۹۲۵)، الشریعة للآجری (ص:۲۲۶، ح:۴۵۶)، وسنده ضعیف لجهالة الراوی۔

فلاسفہ اصلاً اللہ کے لیے کسی فعل کا اثبات کرتے ہی نہیں اور بایں طور پر وہ اصلی معطلہ ہیں ۔ ارسطو اور اس کے اتباع صرف علت اولیٰ کے قائل ہیں، اور وہ بھی اس لیے کہ وہ حرکت افلاک کی علت غائی ہے۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ حرکت فلک انسانی حرکت کی طرح اختیاری ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی مراد و مطلوب کا وجود ناگزیر ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ: افلاک کی حرکت علت اولیٰ کے ساتھ تماثل وتشابہ کی رہین احسان ہے۔ ان کے استدلال کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وجود عالم کی شرط ہے اور وہ عالم کو اسی طرح متحرک رکھتا ہے، جیسے معشوق عاشق کو۔

اس کو ایک مثال کے ذریعہ ذہن نشین کر سکتے ہیں، مثلاً ایک شخص لذیذ کھانے کو دیکھ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے یا محب محبوب کو دیکھ اس کی طرف حرکت کرے، ظاہر ہے کہ دونوں مثالوں میں حرکت کی علت لذیذ کھانا اور محبوب کا وجود ہے۔

مندرجہ بالا بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ فلاسفہ کے نزدیک حرکت افلاک کا محدث و خالق فلک کے سوا اور کوئی نہیں، جس طرح قدریہ کے نزدیک حیوان کے افعال کا خالق بھی حیوان ہی ہے۔ بنا بریں فلاسفہ کے نزدیک فلک ایک بڑے حیوان کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے واضح ہوا کہ فلاسفہ جملہ حوادث عالم کے بارے میں قدریہ کے ہم نوا ہیں اور بنا بریں شر و فساد کی جڑ ہیں۔ فلاسفہ قدریہ کی طرح حوادث کو جسمانی طبائع کی جانب منسوب کرتے ہیں اور ان کے خالق و موجد کو تسلیم نہیں کرتے، زیادہ سے زیادہ وہ خالق کائنات کو وجود عالم کی شرط قرار دیتے ہیں۔

فلاسفہ کی جہالت وضلالت:

بعض فلاسفہ فلک کو واجب الوجود ٹھہراتے ہیں' مگر اس کے لیے ایک علت غائی یا علت فاعلی کا اثبات کرتے ہیں جس کی عند التحقیق کوئی حقیقت نہیں، اس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے، کہ فلاسفہ ذات باری کے متعلق جاہل مطلق ہیں اور انہیں اللہ کی ہستی کا کچھ علم نہیں۔ فلاسفہ میں سے کچھ لوگ بعض مذاہب کی طرف منسوب ہیں مثلاً فارابی، ابن سینا، موسیٰ بن میمون یہودی اور یحییٰ بن عدی عیسائی یہ الحاد و دہریت کے ساتھ ساتھ فہم وفراست سے بیگانہ اور ارسطو کے اتباع سے بھی گئے گزرے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بعض متکلمین ان کے زمرہ میں شامل ہو کر توحید باری اور اسماء و صفات الٰہی کے اثبات جیسے اسلامی عقائد کو چھوڑ بیٹھے ۔ یہ لوگ صرف توحید ربوبیت کو تسلیم کرتے ہیں، توحید ربوبیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و رب ہے ظاہر ہے کہ مشرکین بھی اس توحید کے قائل تھے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (الزخرف:۸۷)

''اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ انھیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔''

ارشاد ہوتا ہے:﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۰۶)

''ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں لاتے مگر وہ مشرک ہوتے ہیں۔''

جو توحید بندوں سے مطلوب ہے دراصل وہ توحید الوہیت ہے جس میں توحید ربوبیت بھی داخل ہے۔ توحید الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، اسی سے ڈرا جائے اور اسی کو پکارا جائے۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی عجز و نیاز، ذات ربانی کے لیے صفات کمال کا اثبات اور اس کے لیے اخلاص نیت توحید میں داخل ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (البینة:۵)

’’انہیں تو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ خلوص نیت سے اس کی عبادت بجا لائیں۔‘‘

دو چیزیں شرک کی اصل و اساس ہیں:

۱۔ تعطیل (باری تعالیٰ کو صفات کمال سے عاری قرار دینا) فرعون اور نمرود تعطیل کا عقیدہ رکھتے تھے۔

۲۔ صفات باری میں دوسروں کو شریک قرار دینا، یہ عقیدہ امم و اقوام میں تعطیل کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ اہل شرک ہمیشہ انبیاء کے خلاف برسر پیکار رہے ہیں، حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالفین میں دونوں فریق پائے جاتے تھے۔ معطلہ بھی اور مشرکین بھی۔ تعطیل ذات کا عقیدہ تعطیل صفات کی نسبت کم رائج ہوا، تعطیل صفات کا نظریہ تعطیل ذات کو مستلزم ہے، تعطیل صفات کے قائل واجب الوجود کو ان صفات سے متصف کرتے ہیں جو ممتنع الوجود کا خاصہ ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سلف صالحین میں سے جو شخص رسول اللہ ﷺ صحابہ و تابعین کرام سے جتنا بھی زیادہ قریب تھا، وہ اسی قدر توحید و ایمان اور عقل و عرفان سے قریب تر تھا۔ اور جو شخص ان سے جتنا بھی زیادہ دور تھا وہ اسی قدر ان اوصاف سے بعید تر تھا۔ بنا بریں متکلمین میں سے جو لوگ متاخر تھے، اور جنہوں نے علم الکلام کو فلسفہ سے گڈ مڈ کر دیا۔ مثلاً امام رازی، علامہ آمدی اور ان کے نظائر و امثال۔ یہ لوگ اثبات توحید و صفات کمال میں امام جوینی رحمہ اللہ سے کم درجہ کے تھے۔ علی ہذا القیاس اس ضمن میں امام جوینی، قاضی ابوبکر، ابن الطیب رحمہ اللہ اور ان کے معاصرین سے فروتر درجہ کے تھے، اور یہ لوگ کسی طرح بھی امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ [1]

جبکہ امام اشعری کا درجہ ابو محمد بن کلاب سے نیچے ہے اور ابن کلاب اس ضمن میں ائمہ سلف کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ متکلمین میں سے جو لوگ تقدیر کے قائل ہیں وہ منکرین تقدیر معتزلہ و شیعہ کی نسبت اثبات توحید و صفات کمال میں ان سے کہیں بہتر ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قائلین تقدیر باری تعالیٰ کے لیے کمال قدرت، کمال مشیت، کمال خلق اور اس کے منفرد ہونے کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ وہ تنہا تمام اعیان و اعراض کا خالق ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے میں قوت اختراع اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت ہے، حقیقت یہ ہے کہ قدرت اختراع اللہ تعالیٰ کے جملہ خصائص میں سے ایک ہے اور صرف یہی صفت اس کی خصوصی صفت نہیں، بخلاف ازیں تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ و معتزلہ حیوان کے احوال کو اللہ کی مخلوق قرار نہیں دیتے، دراصل ان کے نزدیک ان حوادث کا کوئی بھی خالق نہیں، بلکہ ان کو انجام دینے والے اللہ کے

---

[1] متکلمین کے احوال و کوائف سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص دو حقیقتوں سے کلیۃً آگاہ ہے:

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ متکلمین اسلامی حقائق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والوں کے مقابلہ میں کلامی فلسفہ کے اسالیب کو ایک شرعی ضرورت تصور کیا کرتے تھے، البتہ عرصہ دراز تک اسے جاری رکھنے کی بنا پر وہ ان اسالیب و اطوار کے خوگر ہو گئے تھے۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ آگے چل کر جب ان میں پختگی کے آثار پیدا ہوئے تو نور الٰہی کی بدولت ان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کلامی مباحث سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ لاحق ہو رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ان اسالیب کو ترک کرنے کا میلان پیدا ہوا، اور وہ عقائد میں سلف صالحین کی پیروی کرنے لگے۔

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ امام جوینی کی کتاب ’’الرسالۃ النظامیۃ‘‘ میں ہے کہ جب ابو جعفر ہمدانی نے علو کے موضوع پر آپ سے تبادلہ افکار کیا تو امام جوینی طریق سلف کی جانب لوٹ آئے تھے، اس سے بھی عمدہ ترین واقعہ یہ ہے جو امام اشعری کو ان کی زندگی کے تیسرے دور میں پیش آیا اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا، یہ واقعہ ان کی تصنیف ’’کتاب الابانۃ‘‘ میں مذکور ہے جو ان کی آخری کتاب ہے۔ (شذرات الذھب: ۲/ ۳۰۳ نیز مجلۃ الازھر، م:۲۶ / ۳۱، ۳۳)۔

شریک ہیں، متاخرین قدریہ میں سے بہت سے لوگ بندوں کو ان کا خالق قرار دیتے ہیں، البتہ متقدمین قدریہ اس سے احتراز کرتے تھے۔

برہان تمانع:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس عالم ارضی کے دو صانع ہوتے تو ان میں سے ایک کسی بات کا ارادہ کرتا تو دوسرا اس کی مخالفت کرتا، مثلاً ایک چاہتا کہ آفتاب مشرق سے طلوع ہو اور دوسرا چاہتا کہ مغرب سے، ظاہر ہے کہ دونوں کا ارادہ پورا نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یہ جمع بین الضدین ہے، بنا بریں جس کی بات پوری نہ ہوگی، وہ رب نہیں ہوسکتا، بعینہٖ اسی طرح دونوں خداؤں میں سے ایک جب کسی چیز کو حرکت دینا چاہے اور دوسرا اسی چیز کو ساکن کرنا چاہے تو بھی یہی صورت ہوگی۔

- اگر سوال کیا جائے کہ دونوں خداؤں کے ارادے باہم متحد بھی ہو سکتے ہیں؟۔
- ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: دو رب فرض کرنے کی صورت میں یا تو ان میں سے ہر ایک بذات خود قادر ہوگا یا دوسرے کے ساتھ ملے بغیر قدرت سے بہرہ ور نہ ہوگا، بصورت ثانی وہ ممتنع لذاتہٖ ہوگا، نیز اس سے علت و فاعل دونوں میں دور لازم آئے گا۔ اس کی وجہ اس امر کا امکان ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو۔ یہ بات مسلم ہے کہ دونوں خداؤں میں سے ہر ایک اسی صورت فاعل ہوسکتا ہے جب وہ قدرت سے بہرہ ور ہو۔ جب دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو قادر بنایا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک نے دوسرے کو فاعل بھی بنایا یعنی رب ہونے میں اس کی مدد کی، ظاہر ہے کہ جب دونوں رب واجب و قدیم تھے تو وہ ایک دوسرے کے محتاج کیوں کر ہوئے، یہ بداہۃً ممتنع ہے۔

کیا رؤیت باری تعالیٰ ممکن ہے؟:

☆[اشکال]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''اشاعرہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرد عن الجہات ہونے کے باوصف آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، حالانکہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔''

اشاعرہ اس بدیہی بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ آنکھ سے صرف اس چیز کا ادراک کرنا ممکن ہوتا ہے جو بالکل سامنے ہو یا اس کے حکم میں ہو۔ اشاعرہ کہتے ہیں ممکن ہے کہ ہمارے سامنے رنگا رنگ کے بلند پہاڑ کھڑے ہوں اور ہم انہیں دیکھ نہ سکیں، ہر طرف سے مہیب آوازیں آرہی ہوں، اور ہم انہیں سن نہ سکیں یا کثیر تعداد عساکر برسر پیکار ہوں مگر ہم ان کی صورت حرکات کو دیکھنے سے قاصر رہیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہم دور افتادہ مغرب میں اقامت پذیر ہونے کے باوصف مشرق کے ایک ذرہ تک کو ملاحظہ کرسکیں، یہ ایک زبردست مغالطہ ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ ائمہ سلف آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے قائل ہیں، احادیث متواترہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جمہور قائلین رویت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بروز قیامت اسی طرح دیکھیں گے جیسے آمنے سامنے کسی چیز کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جس طرح دیکھنا عقلاً معروف ہے۔ سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم بروز قیامت اسی طرح دیدار الٰہی سے مشرف ہوگے جس طرح تم آفتاب کو دیکھتے ہو اور لوگوں کی بھیڑ دیکھنے سے

مانع نہیں ہوتی ''[1] ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جیسے تم مطلع صاف ہونے کی صورت میں شمس وقمر کو دیکھتے ہو۔''
دوسری روایت میں فرمایا: جب مطلع صاف ہو تو آفتاب و ماہتاب کو دیکھتے وقت کیا لوگوں کی بھیڑ مانع ہوتی ہے؟
لوگوں نے کہا: نہیں فرمایا'' تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح شمس وقمر کو دیکھتے ہو۔''[2]

جولوگ اس بات کے قائل ہیں کہ روبرو ہونے کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے ہیں ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ذات باری فوق العالم نہیں، چونکہ وہ ذات باری کیلئے رؤیت کا اثبات اور علو کی نفی کرتے ہیں۔ بنا بریں اس امر کی ضرورت لاحق ہوئی کہ دونوں مسئلوں میں تطبیق دے کر یہ ثابت کریں کہ ان میں تضاد نہیں ہے۔ اشاعرہ کی ایک جماعت بھی یہی نظریہ رکھتی ہے۔ اشاعرہ کے ائمہ اللہ تعالیٰ کو فوق العرش تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں معتزلہ فوقیت ورؤیت کسی کو بھی نہیں مانتے۔ جب ہم ذات باری کا تذکرہ کرتے ہوئے معتزلہ سے یہ کہتے ہیں کہ: نہ اس کی جانب اشارہ کیا جا سکتا ہے، نہ اس کی طرف کوئی چیز چڑھتی اور نہ اس کی جانب سے کوئی چیز اترتی ہے، نہ وہ عالم ارضی کے اندر داخل ہے اور نہ اس سے خارج، اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں اٹھائے جا سکتے تو معتزلہ ان سب باتوں سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کے عین برخلاف اشاعرہ یہاں تک کہتے ہیں کہ:'' اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے ایسے اجسام و اصوات پیدا کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے جن کو دیکھنے سے ہم قاصر ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں دور افتادہ ذرات دکھانے پر بھی قادر ہے۔ اشاعرہ یہ نہیں کہتے کہ ایسا وقوع پذیر بھی ہوتا ہے، یا نہیں صرف قدرت باری کا اعتراف کرتے ہیں کہ کسی چیز کے وقوع کا جواز اس کے ظہور پذیر ہونے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنے سے ایک جداگانہ چیز ہے۔

فرقہ کلّابیہ کا زاویہ نگاہ:

❀[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: اشاعرہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی ازل سے وابستہ ہیں، یہ احکام اس نے جب صادر فرمائے تو مخلوقات میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا چنانچہ:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ ﴾ ''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو۔''

نیز: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ ﴾ ''اے نبی! اپنے اللہ سے ڈرو۔''

وغیرہ سب احکام اسی زمانہ کے دیے ہوئے ہیں، اگر کوئی شخص تنہا بیٹھا ہو، کوئی غلام اس کے پاس نہ ہو اور وہ یوں کہے کہ'' اے فلاں اٹھ'' یا'' اے فلاں کھاؤ'' تو جو شخص یہ الفاظ سنے گا، حیرانی کے عالم میں اس سے پوچھے گا کہ تم کس سے مخاطب ہو، اور اگر وہ اس کے جواب میں کہے کہ میں یہ حکم ان خادموں کو دے رہا ہوں جو ایک سال کے بعد خریدوں گا۔ تو ہر شخص اسے احمق تصور کرے گا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

❀[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ فرقہ کلابیہ کا نظریہ ہے جو معتزلہ کی طرح قرآن کو مخلوق قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ قرآن کو غیر مخلوق قرار دیتے ہیں، مثلاً کرامیہ، سالمیہ ائمہ سلف اور مذاہب اربعہ کے اہل الحدیث وہ اس نظریہ کے قائل نہیں جس کا تذکرہ شیعہ مضمون نگار نے کیا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اکثر شیعہ اور ائمہ اہل بیت بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ فرقہ کلابیہ اور

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب التوحید۔ باب قول اللہ تعالیٰ ﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ......﴾ (ح:٧٤٣٤) لیکن اس میں سورج کے بجائے قمر کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم۔

[2] صحیح بخاری کتاب التوحید باب قول اللہ تعالیٰ ﴿ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ...... ﴾ (ح:٧٤٣٩) واللفظ لہ۔ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب معرفۃ طریق الرؤیۃ (ح:١٨٣)۔

اشاعرہ نے یہ نظریہ اس لیے اختیار کیا کہ اس مسئلہ کی اصل و اساس میں وہ معتزلہ کے ہمنوا ہیں۔ یہ سب حدوث اجسام کی دلیل کو صحیح تسلیم کرنے میں یک زبان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس چیز کو بھی حادث قرار دیتے ہیں جو حوادث سے خالی نہ ہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس چیز کے ساتھ حوادث کا قیام ہو وہ حوادث سے خالی نہ ہوگی، جب کہا جاتا ہے کہ جسم حرکت وسکون سے خالی نہیں ہے؛ تو وہ کہتے ہیں کہ: ازلی سکون ممتنع الزوال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ازل سے موجود ہے اور جو چیز ازل سے موجود ہو اس کا زوال محال ہوتا ہے۔ علی ہذا القیاس جو چیز حرکت کو قبول کر سکتی ہے اور وہ ازلی بھی ہو تو اس کی حرکت بھی ازلی اور ممتنع الزوال ہوگی۔ ازلی حرکت کو تسلیم کرنے سے یہ لازم آئے گا کہ کچھ ایسے حوادث بھی ہوں جو ازلی ہوں اور ان کا نقطۂ آغاز معلوم نہ ہو۔ حالانکہ یہ ممتنع ہے، اس سے یہ لازم آیا کہ ذات باری کے ساتھ حوادث کا قیام ممکن نہیں، علاوہ ازیں انہیں بخوبی معلوم ہے کہ کلام متکلم کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہوتا ہے، جس طرح صفت علم کا قیام عالم کے ساتھ ہوتا ہے، اور حرکت کا متحرک کے ساتھ، یہ بھی مسلم ہے کہ جو کلام اللہ تعالیٰ کسی دوسری چیز میں پیدا کر دیتے ہیں وہ اس کا کلام نہیں ہوتا بلکہ وہ اس چیز کا کلام کہلائے گا جس کے ساتھ وہ قائم ہے۔ جب ان کے نزدیک یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کلام کا قیام صرف متکلم کے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ معتزلہ کی ہم نوائی میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حوادث ذات قدیم کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتے، تو ان ہر دو قواعد سے کلام کا قدیم ہونا ثابت ہو گیا۔

کیا اصوات قدیم ہیں؟:

اشاعرہ کے نزدیک اصوات کی قدامت ممتنع ہے، وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ صوت (چونکہ عرض ہے اس لیے وہ) زمانوں تک باقی نہیں رہ سکتی، بنا بریں یہ بات متعین ہوگئی ہے، کہ کلام قدیم ایک معنوی چیز ہے اور حرف وصوت سے عبارت نہیں، اندریں صورت وہ ایک ہی صفت سے متصف ہوگا اگر وہ ایک سے بڑھ جائے تو اسے غیر محدود ماننا پڑے گا اور ظاہر ہے کہ غیر متناہی معانی کا وجود ممتنع ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں ہم اس بات میں تمہارے ہم خیال ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی مراد ومقدور ہو وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی، تاہم ہم یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ کلام الٰہی اس کا پیدا کردہ مگر اس سے منفصل ہے۔ اس سے مناقضہ لازم آیا۔ اگر کسی طرح جمع وتطبیق ممکن ہو تو تناقض رفع ہو جائے گا۔ تطبیق ممکن نہ ہونے کی صورت میں دونوں مسئلوں میں سے ایک کو مبنی برخطا تسلیم کرنا پڑے گا، یہ ضروری نہیں کہ وہی مسئلہ غلط ہو جس میں ہم نے تمہاری مخالفت کی ہے، بخلاف ازیں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ جس مسئلہ میں ہم متحد الخیال ہیں، وہی درست نہ ہو وہ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت وقدرت کے مطابق وہ کلام نہیں کرتا جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے، حالانکہ جمہور اہل الحدیث، متکلمین کرامیہ اور شیعہ سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیے کہ اکثر اسلامی فرقے اس کے قائل ہیں، جب مجبوراً ہمیں دونوں فرقوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ہم آہنگ ہونا پڑا تو ہم اس فرقہ کی موافقت کو پسند کریں گے جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے تو بولتا ہے، جو فرقہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اور چیز میں اپنا کلام پیدا کر دیتا ہے، ہم اس کے ہم نوا بننا پسند نہیں کریں گے، اس لیے کہ یہ نظریہ شرعاً وعقلاً فاسد ہے۔

ایک اور طریقہ سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک کسی معدوم چیز کو خطاب کا اہل نہیں سمجھا گیا اور کسی چیز سے بشرط وجود مخاطب ہونا اس متکلم کے وجود کو تسلیم کرنے کی نسبت اقرب الی العقل ہے جس کا کلام اس کے ساتھ قائم نہ ہو اور رب

ہونے کے باوصف جس سے صفات کمال مسلوب ہوں، اللہ تعالیٰ نے جس عرض کو بھی کسی جسم میں پیدا کیا ہے وہ اس جسم کی صفت ہے خالق کی نہیں، باقی رہا اس چیز سے مخاطب ہونا جو سر دست اگر چہ معدوم ہے تاہم اس کا وجود متوقع ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ وصیت کنندہ بعض اوقات کہتا ہے، کہ میری موت کے بعد ایسا کریں ویسا کریں اور جب میرا فلاں بچہ بالغ ہو جائے تو میرا یہ حکم اسے پہنچا دیا جائے ،بعض اوقات وہ اپنی جائیداد وقف کرنے کی وصیت کرتا ہے جو عرصہ دراز تک باقی رہتی ہے اور اس نگران کے نام وصیت کر جاتا ہے، جو وصیت کے وقت پیدا بھی نہیں ہوا ہوتا۔

❀ شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''غیر موجود غلام کا نام لے کر پکارنا حماقت کی دلیل ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

❀ اس کا جواب یہ ہو کہ اگر مالک اسے موجود سمجھ کر پکارے تو اس کی قباحت میں کلام نہیں اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس غلام کو پکار رہا ہے جس کا وجود متوقع ہے۔ مثلاً وہ یوں کہے کہ مجھے ایک صادق القول شخص نے بتایا ہے کہ میری لونڈی غانم نامی ایک بچہ جنے گی جب وہ بچہ پیدا ہو تو وہ آزاد ہے، میں اپنی اولاد کو بھی اس بات کی وصیت کر جاتا ہوں اور اس پیدا ہونے والے بچے کو فلاں فلاں بات کی وصیت کرتا ہوں یہ وصیت بالکل درست ہے، اس لیے کہ یہ خطاب ایک ایسے بچہ سے ہے جو حاضر فی العلم مگر مشاہدہ کے اعتبار سے غائب ہے۔

انسان بسا اوقات ان لوگوں سے خطاب کرنے کا خوگر ہے جو اس کے حاشیہ خیال میں موجود ہوں اور خارج میں موجود نہ ہوں، تخیل کے اسی عالم میں وہ ذہنی اشخاص سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ''اے فلاں! کیا میں نے تجھ سے فلاں بات نہیں کہی تھی......؟ '' حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آپ کا گزر صحرائے کربلا میں ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اے ابو عبداللہ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) صبر کیجئے۔''

اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ کے بندو ثابت قدم رہو۔'' [1]

حالانکہ وہ لوگ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، قرآن کریم میں بھی ایسی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں، مثلاً اپنی ذات اور ملائکہ کے بارے میں بعض باتیں بصیغۂ ماضی بیان کی ہیں حالانکہ وہ ظہور قیامت کے بعد وقوع پذیر ہوں گے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَنَادٰٓی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ (الاعراف: ۴۴)

''اور جنت والوں نے دوزخ والوں کو پکار لگائی:۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ (فاطر: ۳۴)

''اور انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔''

نیز فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ﴾ (غافر: ۴۹)

''دوزخ والے جہنم کے خازنوں سے کہنے لگے:۔''

❀❀❀❀

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب ذکر الدجال، (حدیث: ۲۹۳۷) مطولاً۔

مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام

[اعتراض]: رافضی مضمون نگار لکھتا ہے:
امامیہ و اسماعیلیہ کے علاوہ دیگر اسلامی فرقوں کا نقطۂ نظریہ ہے کہ انبیاء و ائمہ غیر معصوم ہیں۔ بنا بریں ان کے خیال میں ایک نبی کاذب و سارق اور سہو و نسیان کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ [نعوذ باللہ من ذلک]۔تو پھر عوام الناس کو ان کی باتوں پر کون سا اعتماد باقی رہ جائے گا؟ اور لوگ کیسے ان کی بات مانیں گے؟ نیز انؐ کے ماننے والوں پر انبیاء کی اتباع کیونکر واجب ہوگی جب کہ ان کے لیے غلط حکم دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں؟ ۔نیز انہوں نے ائمہ کی تعداد مقرر نہیں کی؟ بلکہ ان کے نزدیک جو بھی قریش کی بیعت کرے اس کی امامت و خلافت درست ہوگی۔اور تمام مخلوق پر اس کی اطاعت واجب ہوجائے گی اگر چہ وہ مستور الحال ہی کیوں نہ ہو۔اور بھلے وہ کفر؛فسق اور نفاق کی حدوں کو چھوتا ہو۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:
پہلی بات:......شیعہ مصنف نے جمہور کے متعلق جو ذکر کیا ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کو معصوم نہیں مانتے؛ اور ان کے لیے خطاء؛ جھوٹ؛ اور چوری کے صادر ہونے کو جائز سمجھتے ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ:'' یہ مسلک جمہور پر عظیم افترا ہے،خوارج کے سوا مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء اللہ تعالیٰ احکام کے پہنچانے میں معصوم تھے اور ان کی اطاعت واجب ہے۔ جمہور کے نزدیک انبیاء سے صغائر کا صدور ممکن ہے تاہم وہ صغائر پر قائم نہیں رہتے۔

❁ انبیاء کرام علیہم السلام جس بات کی خبر دیں؛ باجماع مسلمین اس کی تصدیق کرنا واجب ہوتی ہے۔اور جس چیز کا حکم دیں اور جس چیز سے منع کریں اس میں ان کا حکم ماننا واجب ہوجاتا ہے۔اس پر تمام مسلمان فرقوں کا اتفاق ہے۔سوائے خوارج کے ایک گروہ کے۔وہ کہتے ہیں:''نبی اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے میں معصوم ہوتا ہے؛ اپنی طرف سے حکم دینے اور منع کرنے میں معصوم نہیں ہوتا۔اہل سنت والجماعت کا اس فرقہ کے گمراہ ہونے پر اتفاق ہے۔

ہم اس سے پہلے کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ کوئی غلط بات کہہ دیں تو ان کی اس غلطی کی وجہ سے تمام مسلمانوں پر قدح وارد نہیں ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر رافضیوں کی خطاؤں کی مسلمانوں کے دین میں عیب سمجھا جاتا۔ تمام فرقوں اور گروہوں میں رافضیوں سے بڑھ کر جھوٹا اور خطاً کار فرقہ کوئی دوسرا نہیں۔مگر اس کے باوجود اس سے مسلمانوں پر کچھ ضرر نہیں آتا۔ ایسے ہی اگر رافضیوں کے علاوہ کوئی دوسرا خطا کار بھی ہوتا تو اس سے مسلمانوں کے دین میں کچھ فرق نہ آتا۔ اکثر لوگ -انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے- کبیرہ گناہ کو جائز نہیں سمجھتے ۔جمہور مسلمین جو کہ صغیرہ گناہ کے صدور کو جائز سمجھتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان غلطیوں پر مستمر نہیں رہنے دیا جاتا۔[فوراً اللہ تعالیٰ اس پر آگاہ کردیتے ہیں] ۔نیز توبہ کرنے کی وجہ سے انہیں پہلی منزلت سے زیادہ عالیشان اور بڑی منزلت نصیب ہوتی۔جیسا کہ پہلے بیان گزر چکا ہے۔
خلاصہ کلام ! مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو کہ:''خطأ کے جواز کے ساتھ رسولوں کی اطاعت واجب ہے۔ بلکہ سب کا اتفاق ہے کہ صرف صحیح حکم میں ہی رسول کی اطاعت واجب ہے۔پس رافضی کا یہ کہنا:''ان کے ماننے والوں

پر انبیاء کی اتباع کیونکر واجب ہوگی جب کہ ان کے لیے غلط حکم دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔'' امت میں سے کسی پر لازم نہیں آتا۔

اجتہادی مسائل میں انبیاء کرام علیہم السلام سے چونک ہو جانے کے مسئلہ میں لوگوں کے دو معروف قول ہیں:

۱۔ ان سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو خطا پر باقی نہیں رہنے دیا جاتا۔

۲۔ انبیا کی اطاعت ان امور میں ہوگی جن پر انہیں باقی رہنے دیا جائے؛ ان امور میں نہیں ہوگی جن میں تبدیلی کر دی جائے یا جن امور سے منع کر دیا جائے؛ اور ان امور میں بھی نہیں جن میں اطاعت کرنے کا حکم نہیں ملا۔

البتہ عصمت ائمہ کے بارے میں شیعہ مضمون نگار کا بیان درست ہے؛ ہم اس کے قائل نہیں۔ اور اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امامیہ و اسماعیلیہ کے سوا مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی ائمہ کو معصوم قرار نہیں دیتا۔ اس دعویٰ عصمت کے بے بنیاد ہونے پر آپ کے لیے اتنی ہی گواہی کافی ہے کہ منافقین اور ملحدین؛ جن کے بڑے شیوخ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے بڑے کافر ہیں؛ ان کے علاوہ کسی نے بھی اس مسئلہ میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ ہمیشہ سے رافضیوں کی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ ہمیشہ سے اقوال و افعال موالات اور قتال میں مسلمانوں کی جماعت کو چھوڑ کر یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے جا ملتے ہیں۔

کیا اس قوم سے بڑھ کر بھی کوئی گمراہ ہوگا جو مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین سے تو نفرت اور دشمنی کرتے ہیں؛ مگر یہود و نصاریٰ اور منافقین سے محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مَا ہُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْہُمْ وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَہُمْ یَعْلَمُوْنَ ❀ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا اِنَّہُمْ سَآءَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ❀ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَہُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَہُمْ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ ❀ لَنْ تُغْنِیَ عَنْہُمْ اَمْوَالُہُمْ وَلَآ اَوْلَادُہُمْ مِّنَ اللّٰہِ شَیْئًا اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ ❀ یَوْمَ یَبْعَثُہُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا فَیَحْلِفُوْنَ لَہٗ کَمَا یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّہُمْ عَلٰی شَیْءٍ اَلَآ اِنَّہُمْ ہُمُ الْکٰذِبُوْنَ ❀ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْہِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰہُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ ہُمُ الْخٰسِرُوْنَ ❀ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ❀ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ❀ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَہُمْ اَوْ اَبْنَآءَہُمْ اَوْ اِخْوَانَہُمْ اَوْ عَشِیْرَتَہُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَہُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ وَیُدْخِلُہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ہُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [المجادلۃ ۱۴۔۲۲]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے ان لوگوں کو دوست بنا لیا جن پر اللہ غصے ہو گیا، وہ نہ تم سے ہیں اور نہ ان سے اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، بے شک یہ لوگ، برا ہے جو کچھ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ایک طرح کی ڈھال بنا لیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، سو ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے اموال اللہ کے مقابلے میں ہرگز ان کے کسی کام نہ

آ ئیں گے اور نہ ہی ان کی اولاد۔ یہ لوگ آگ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ بے شک وہ کسی چیز پر (قائم) ہیں، سن لو! یقیناً وہی اصل جھوٹے ہیں۔شیطان ان پر غالب آ گیا، سو اس نے انھیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو! یقیناً شیطان کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہیں۔بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں۔اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے۔آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انھیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔''

یہ آیات منافقین کے متعلق نازل ہوئیں۔منافقین کی تعداد رافضیوں سے زیادہ کسی دوسرے گروہ میں نہیں ہیں۔یہاں تک کہ روافض میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس میں نفاق کا ایک شعبہ نہ پایا جاتا ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس شخص میں یہ چاروں خصلتیں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے۔اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے تو سمجھ لو کہ اس میں منافق کی ایک خصلت پیدا ہوگئی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے: جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔جب عہد کرے تو توڑ ڈالے۔جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر ہو جائے۔'' [صحیح مسلم:کتاب ایمان :باب منافق کی خصلتوں......ح۲۱۲]

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَ فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ☆وَ لَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ [المائدۃ ۸۰۔۸۱]

''ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے دوستیاں کرتے ہیں، جو کچھ انہوں نے اپنے لئے آگے بھیج رکھا ہے وہ بہت برا ہے کہ اللہ ان سے ناراض ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور نبی پر اور جو نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان ہوتا تو یہ کفار سے دوستیاں نہ کرتے،لیکن ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ کَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ☆ کَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ [المائدۃ ۷۸۔۷۹]۔

بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبانی لعنت کی گئی اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے اور حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ آپس میں ایک دوسرے کو برے کاموں سے جو وہ کرتے تھے روکتے نہ تھے جو کچھ بھی یہ کرتے تھے یقیناً بہت برا تھا۔''

غالب طور پر رافضی برائی کیے جانے پر اس سے منع نہیں کرتے ۔ بلکہ شیعہ کے علاقوں میں سب سے زیادہ جور وستم، ظلم اور فحاشی کا ارتکاب ہوتا ہے۔ اور یہ ان کفار سے دوستی لگاتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا ہے۔ پس یہ لوگ نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور نہ ہی کفار کے ساتھ ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَمْ تَرَی اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مَا ھُمْ مِنْکُمْ وَلَا مِنْھُمْ﴾ [المجادلة ۱۴]

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جنہوں نے اس سے دوستی کی جن پر اللہ غضبناک ہو چکا ہے نہ یہ (منافق) تمہارے ہی ہیں نہ ان کے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ جمہور مسلمین انہیں ایک دوسری قوم شمار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے ساتھ ان کے دیار میں جبال بلاد ساحل شام میں جنگ کی گئی؛ کیونکہ یہ [وہاں سے گزرنے والے] مسلمانوں کا خون بہاتے تھے' اور ان کا مال و اسباب چھین لیتے؛ راہزنی کی وارداتیں کرتے؛ اور اسے وہ اپنے مذہب میں حلال سمجھتے تھے۔ ترکمان کے ایک گروہ نے ان سے جنگ کی؛ تو یہ لوگ دہائیاں دینے لگے کہ ہم مسلمان ہیں ۔ مگر انہوں نے کہا: نہیں تم کوئی اور قوم ہو۔ ان لوگوں نے اپنے دلوں کی سلامتی کی وجہ سے سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے جداگانہ طور واطوار رکھتے ہیں اس لیے یہ مسلمان نہیں؛ بلکہ کوئی اور قوم ہیں۔ [بھلے یہ لوگ اپنی زبانی اسلام اور مسلمان ہونے کا دعوی کرتے رہیں] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾ [المجادلة ۱۴]

''باوجود علم کے پھر بھی جھوٹی قسمیں کھا رہے ہیں۔''

رافضیوں کا یہی حال ہے۔ ایسی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِتَّخَذُوْا اَیْمَانَھُمْ جُنَّۃً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ...... لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ ﴾ [المجادلة ۱۶۔۲۲]

''انھوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنالیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، .... ۔ آپ ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی۔''

ان میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اپنے دل کی گہرائیوں سے مسلمانوں سے بڑھ کر کفار سے محبت و دوستی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مشرق کی طرف سے ترک کفار کا خروج ہوا؛ اور انہوں نے بلاد خراسان عراق' شام' اور الجزیرہ وغیرہ میں مسلمانوں کا خون بہایا' اور انہیں قتل کیا۔ تو اس موقع پر رافضی مسلمانوں کے خلاف تاتاریوں کی مدد کر رہے تھے۔ حکومت بغداد کا وزیر ابن علقمی [شیعہ] اور اس جیسے دوسرے لوگ اس وقت میں مسلمانوں کے خلاف کفار کی مدد کرنے والے سب سے بڑے اور اہم ترین عنصر تھے۔ ایسے ہی جب عیسائیوں نے بلاد شام میں مسلمانوں سے جنگ چھیڑی؛ تو اس وقت رافضی ان کے

سب سے بڑے مددگار تھے۔ ایسے ہی جب یہودیوں نے بلادِ شام میں یہودی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس وقت رافضی ان کے سب سے بڑے حمایتی اور مددگار تھے۔ رافضیوں کا ہمیشہ کے لیے وطیرہ رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا ساتھ دیتے آئے ہیں۔

[اشکال:] شیعہ مصنف نے ائمہ کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ سوائے اس کے کہ روافض کا یہ قول ہے'' یہ عالم ارضی ائمہ کے وجود سے کبھی خالی نہیں رہتا، کیونکہ کائنات ارضی کی بھلائی اسی میں مضمر ہے۔''

[جوابی رد]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ شیعہ جس امام منتظر کے لیے زحمت انتظار میں ہیں اس کے وجود سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی۔ خواہ ہماری طرح انہیں مردہ تصور کیا جائے؛ جیسے جمہور کا مسلک ہے' یا شیعہ کی طرح انہیں زندہ قرار دیں۔ اسی طرح امام غائب کے اجداد کے وجود سے بھی دنیا کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا، جس طرح یہ خاک دان ارضی سرور کائنات ﷺ کے وجود مسعود سے ہجرت کے بعد نفع اندوز ہوا تھا۔ اس لیے کہ آپ اس وقت مؤمنین کے امام تھے جن کی اطاعت واجب تھی۔ اسی وجہ سے سعادت حاصل ہوئی۔ سرور کائنات ﷺ کے عہد سعادت مہد کے بعد دعویٰ عصمت کی سعادت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی۔

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو سکون و آرام نصیب ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پر آشوب و تفرقہ دور خلافت کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ امامیہ فرقہ والے جن ائمہ کے لیے معصوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان میں سے سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کسی بھی امام کی بیعت اہل حل وعقد نے نہیں کی۔ اور آپ کے عہد مسعود میں مکلفین کے لیے جو دینی و دنیاوی لطف و مہربانی اور مصلحتیں حاصل ہوئیں' وہ اس سے بہت کم تھیں جو آپ سے پہلے تین خلفاء کے دور میں حاصل ہوئیں۔ یہ بات ضرورت کے تحت سبھی لوگ جانتے ہیں کہ امامیہ فرقہ والے اپنے ائمہ معصومین کے ذریعہ جس لطف و مہربانی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ قطعی طور پر باطل ہیں۔

یہ تو بالکل ویسے ہی ہے جیسے کچھ لوگ لبنان کے پہاڑوں میں روپوش کسی مہدی پر ایمان رکھتے ہیں' اور اس کے ذریعہ ہدایت حاصل ہونے کے دعویدار ہیں۔ ایسے ہی دعوے کچھ اور پہاڑوں کے متعلق بھی کیے جاتے ہیں؛ جیسے: دمشق میں جبل قاسیون؛ اور مغارۃ الدم؛ مصر میں جبل فتح؛ اور اس طرح کے دیگر پہاڑ اور غار۔ ایسے مقامات پر جنات بسیرا کرتے ہیں۔ اور وہاں پر شیاطین بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ شیاطین اور جنات لوگوں کو نظر بھی آجاتے ہیں؛ جب کہ اکثر اوقات آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ جاہل لوگ انہیں [نیک] انسان گمان کرنے لگتے ہیں؛ بحالانکہ وہ جنات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ [الجن ۶]۔

''بیشک چند انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات اپنی سرکشی میں اور بڑھ گئے۔''

یہ لوگ ان رجال غیب پر اور اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنے والے گمراہ فرقوں کے مشائخ پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر وہ مشائخ جو کہ رجال غیب پر ایمان رکھتے ہیں؛ ان کی وجہ سے اتنا فتنہ و فساد پیدا نہیں ہوتا جتنا ان لوگوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس امام کے ماننے والے ہر طرح سے کثرت کے ساتھ فتنہ و فساد کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ صرف امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں [حالانکہ اس امام کی کوئی حقیقت نہیں]۔ اور ان کے ہاں

کوئی صاحب سیف وقوت حکمران نہیں پایا جاتا جس سے مدد حاصل کریں [اور وہ ان کی اصلاح کا کام کرے]؛ سوائے کچھ کفار و فجار اور فاسقین اور منافقین اور جہلاء کے۔ان کے سردار اور بڑے ان اصناف سے باہر نہیں ہو سکتے۔

اسماعیلیہ فرقہ کے لوگ ان میں سب سے زیادہ برے ہیں۔ وہ [ظاہر میں] تو امام معصوم کی طرف دعوت دیتے ہیں' مگر حقیقت میں ان کی دعوت فاسقین اور منافقین کی طرف ہوتی ہے جو اپنے باطن میں یہود و نصاری سے بڑے کافر ہوتے ہیں۔ امام معصوم کی دعوت دینے والے حقیقت میں حاکم معصوم نہیں بلکہ ایسے کافر حکمرانوں کی طرف بلاتے ہیں جو کفر وظلم میں انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا مشہور ہے کہ لوگ اپنے تجربات کی روشنی میں اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالی کی اور فرمانبرداری کرو (رسول اللہ علیہ وسلم) کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز پر اختلاف کرو تو اسے لوٹا، اللہ تعالی کی طرف اور رسول ﷺ کی طرف، اگر تمہیں اللہ تعالی پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔''

اللہ تعالی نے حکم دیا ہے کہ جب تنازع پیدا ہو تو اللہ ورسول کی طرف رجوع کیا جائے اگر مسلمانوں میں رسول ﷺ کے سوا کوئی اور بھی معصوم ہوتا تو اس کی طرف مراجعت کرنے کا حکم صادر کیا جانا ضروری تھا۔

فصل:

[ائمہ کی تعداد کا مسئلہ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: ''انہوں نے ائمہ کی تعداد مقرر نہیں کی۔''

[جواب]: اس نے یہ حق بات کہی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [النساء ۵۹]۔

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''

یہاں پر اللہ تعالی نے ان اختیار والے ائمہ کی تعداد متعین نہیں کی۔ایسے ہی نبی کریم ﷺ سے جو احادیث مبارکہ صحیح اسناد اور شہرت کے ساتھ ثابت شدہ ہیں ؛ ان میں بھی ائمہ [حکام] کی تعداد متعین نہیں کی گئی۔حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے میرے محب مکرم آنحضرت ﷺ نے وصیت فرمائی تھی:

''امیر کی بات سنتے رہو اور اطاعت کرتے رہو اگر چہ وہ مقطوع الاعضاء حبشی غلام ہو۔''[1]

ام الحصین رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''اطاعت کرتے رہو، اگر چہ تم پر ایک سیاہ فام کان کٹے حبشی غلام کو امیر کیوں نہ مقرر کر دیا جائے، بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں تمہاری قیادت کر رہا ہو۔[2]

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (ح: ۱۸۳۶)

[2] مسلم۔أیضاً(ح: ۱۸۳۷)

''سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر حبشی غلام حاکم ہی کیوں نہ ہو جس کا سر کشمش کی طرح (یعنی چھوٹا سا) ہو۔''❶

ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''یہ معاملہ (یعنی حکومت) قریش میں ہی رہے گا، جب تک کہ لوگوں میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔''

جب کہ بخاری کے الفاظ ہیں: ''جب تک کہ ان میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔''❷

صحیحین میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے چلا۔ اور میرے ساتھ میرے والد تھے۔ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''لوگوں کا معاملہ یعنی خلافت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ان میں بارہ خلفا ان کے حاکم رہیں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کلمہ ارشاد فرمایا؛ جسے میں نہ سمجھ سکا؛ یا مجھ پر مخفی رہا۔ تو میں نے اپنے باپ سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ تو انہوں نے کہا: [فرمایا ہے]: سب خلفاء قریش کے خاندان سے ہوں گے۔''❸

صحیحین میں ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''لوگوں کا معاملہ یعنی خلافت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک ان میں بارہ خلفاء ان کے حاکم رہیں گے۔''❹

حضرت عامر بن سعد ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے غلام نافع کی ذریعہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ آپ مجھے کسی ایسی حدیث کی خبر دیں جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو تو مجھے جواباً لکھا کہ:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کی شام کو جس دن ماعز اسلمی کو رجم کیا گیا سنا: ''دین ہمیشہ قائم وباقی رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے یا تم پر بارہ خلفا حاکم ہو جائیں اور وہ سب کے سب قریش سے ہوں۔''❺

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی احادیث ذکر کیں ان میں سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگ اس معاملہ میں یعنی خلافت وحکومت میں قریش کے تابع ہیں مسلمان قریشی مسلمانوں کے تابع ہیں اور کافر قریشی کافروں کے تابع ہیں۔''❻

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لوگ بھلائی اور برائی میں قریش کی پیروی کرنے والے ہیں۔''❼

صحیح بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خلافت قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو درست رکھیں گے جو شخص بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ گرا دے گا۔'' [صحیح بخاری: ح ۷۲۷]

---

❶ صحیح بخاری: حکام کا بیان: امراء قریش میں سے ہوں گے۔ ح ۲۰۲٦۔ ❷ صحیح مسلم۔ أیضاً (ح: ۱۸۳۸)

❸ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: لوگ قریش کے تابع ہیں اور خلافت قریش میں ہونے کے بیان میں؛ ۲۱۳۔

❹ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً ۲۱۲۔ ❺ صحیح مسلم: أیضاً؛ ۲۱٤۔

❻ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً ۲۰۵۔ ❼ صحیح مسلم: امارت اور خلافت کا بیان: أیضاً؛ ۲۰٦۔

فصل:

[قریش کی امامت وخلافت]

[اعتراض]:[شیعہ مصنف اہل سنت کا قول نقل کرتے ہوئے کہتا ہے]:'' جو بھی قریش کی بیعت کرے' اس کی امامت وخلافت منعقد ہوجاتی ہے' اور تمام لوگوں پر اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔حتی کہ اگر چہ وہ مستور الحال ہو۔ بھلے وہ انتہائی درجہ کے فسق و کفر اور نفاق میں مبتلا ہو'' ۔[انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس اعتراض کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلی بات: یہ اہل سنت والجماعت کا قول [عقیدہ] نہیں ہے۔اہل سنت کا مذہب یہ نہیں ہے کہ صرف کسی ایک قرشی کے بیعت کرنے سے بیعت منعقد ہوجاتی ہے اور تمام لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہوجاتی ہے۔ یہ بات اگر چہ بعض متکلمین [اہل کلام] نے کہی ہے؛ لیکن اس کا ائمہ اہل سنت والجماعت کے عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں' بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

'' جو کوئی بھی مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کرے۔تو نہ ہی اس بیعت کرنے والی کی بیعت کی جائے اور نہ ہی جس کی بیعت کی گئی ہے؛ اس کی بیعت کی جائے' بلکہ ان دونوں کو قتل کردیا جائے۔'' [رواہ البخاری]

دوسری بات: اہل سنت والجماعت حاکم کے ہر حکم کو واجب الاطاعت نہیں سمجھتے؛ بلکہ یہ حاکم کی اطاعت کو صرف ان امور میں ہی جائز سمجھتے ہیں جن میں اطاعت کرنے کی اجازت شریعت نے دی ہے۔پس اہل سنت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت کو جائز نہیں سمجھتے؛ بھلے وہ عادل [زاہد و عابد] حکمران ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے گا تو اس کی اطاعت کی جائے گی۔جیسے کہ: نماز قائم کرنے کا حکم دے؛ زکوٰۃ ادا کرنے ؛ سچائی ؛ عدل ؛ حج ؛ جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دے۔اس صورت میں لوگ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔اگر کوئی کافر اور فاسق کسی ایسے کام کا حکم دے جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو؛ تو پھر اس صورت میں اس کے فسق کی وجہ سے اس کی اطاعت کا وجوب ساقط نہیں ہوگا۔ جیسے اگر وہ حق بات کہے تو کسی کے لیے اس کی بات کو جھٹلانا جائز نہیں۔اور نہ ہی اتباع حق کا وجوب اس وجہ سے ساقط ہوگا کہ اس کلمہ کا کہنے والا فاسق ہے۔پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ اہل سنت والجماعت مطلق طور پر کسی حاکم کی اطاعت نہیں کرتے ؛ بلکہ صرف ان امور میں اطاعت کرتے ہیں جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کو متضمن ہوں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [النساء ۵۹]

''اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔''

یہاں پر مطلق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے۔اور پھر اطاعت رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے' اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں' جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء ۸۰]

'' جس نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔''

پھر حکمرانوں اور اولیاء الامور کی اطاعت کو بھی اسی ضمن میں شامل کیا گیا ہے۔جیسا کہ فرمایا: ﴿اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾

اس کے علاوہ کسی تیسری طاعت کا کوئی ذکر نہیں ۔ اس لیے کہ حاکم کی اطاعت مطلق طور پر نہیں ہوگی ۔ بلکہ صرف نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اس کی اطاعت ہوگی ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک اطاعت نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہوگی ۔'' [البخاری ٥/ ١٦١؛ مسلم ٣/ ١٤٦٩]

نیز ارشاد فرمایا: ''اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہوگی ۔'' [المسند ٤/ ٤٢٦]

اور ارشاد فرمایا: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی ۔'' [المسند ٥/ ٦٦]

مزید فرمایا: ''جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے' تو اس کی بات نہ مانو ۔'' [المسند ٣/ ٦٧]

ان رافضیوں کا قول جسے یہ شیعان علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ: ''غیر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کے ہر حکم میں مطلق طور پر واجب ہے؛ یہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ اہل شام کی طرف منسوب قول سے انتہائی برا اور فاسد ہے جو کہتے ہیں: ولی الامر کی اطاعت مطلقاً واجب ہے ۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو قوت و شوکت والے کی اطاعت کرتے ہیں جو زندہ اور موجود ہو؛ جب کہ رافضی معدوم امام معصوم کی اطاعت کو واجب ٹھہراتے ہیں ۔ نیز یہ لوگ اپنے ائمہ کے معصوم ہونے کا دعوی بھی نہیں کرتے جیسے شیعہ اپنے ائمہ کی عصمت کا دعوی کرتے ہیں ۔ بلکہ یہ لوگ اپنے ائمہ کو خلفاء راشدین اور عادل حکمران قرار دیتے ہیں؛ جن کی ایسے امور میں اطاعت کی جاسکتی ہے جن کی حقیقت منکشف نہ ہو ۔ اور کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ان کی نیکیاں قبول کرنے والا اور گناہوں کو معاف کرنے والا ہے ۔ یہ بات اس دعوی کی نسبت آسان ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ: امام معصوم ہوتا ہے اس سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی ۔

پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جن لوگوں کو ناصبیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے؛ اگرچہ ان سے بھی حق و عدل کا دامن کچھ نہ کچھ چھوٹ جاتا ہے' مگر ان کی نسبت رافضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک ہے' وہ حق و عدل سے بہت زیادہ اور سخت خروج کرنے والے ہوتے ہیں ۔ تو پھر اہل سنت والجماعت کا قول کیسے ہوگا جو کہ کتاب و سنت کے بالکل مطابق ہے ۔ ان کا قول یہ ہے کہ حاکم یا ولی امر کی اطاعت صرف ان امور میں ہوگی جن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو ۔ اگر وہ اللہ کی نافرمانی کا کوئی حکم دے تو اس کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی ۔

تیسری بات:: لوگوں نے فاسق اور جاہل حکمران [ولی امر کی اطاعت] کے بارے میں اختلاف کیا ہے:

پہلا قول: اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے' تو کیا اس کی اطاعت کی جائے گی؛ اور اس کے حکم کو نافذ کیا جائے گا اور اس کی قسم کو پورا کیا جائے گا؟ جب کہ وہ عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو ۔

دوسرا قول: کسی بات میں بھی اس کا حکم نہیں مانا جائے گا' اور نہ ہی اس کا حکم چلے گا اور نہ ہی اس کی قسم کو پورا کیا جائے گا ۔

تیسرا قول: امام اعظم یعنی حکمران اور اس کے فروع یعنی قاضی وغیرہ کے درمیان فرق کیا جائے گا ۔ [یہ تین اقوال ہیں] ۔

اہل سنت والجماعت کے ہاں سب سے ضعیف ترین قول اس کی تمام باتوں کا رد کرنا' حکم نہ ماننا اور قسم پوری نہ کرنا ہے ۔ جب کہ صحیح ترین قول پہلا قول ہے ۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے تو پھر اس کی بات مانی جائے گی ۔ اس کا حکم تسلیم کیا جائے گا' اور اس کی قسم کو پورا کیا جائے گا ۔ اس شرط کے ساتھ کہ جب اس کا حکم عدل پر مبنی ہو ۔ یہاں تک کہ جاہل قاضی اور ظالم انسان بھی اس کے حکم کو عدل و انصاف کے ساتھ نافذ کرے تو اس کی بات مانی جائے گی ۔ یہ اکثر فقہاء کا قول ہے ۔

تیسرا قول یہ تھا کہ: امام اعظم اور دوسروں کے درمیان فرق کیا جائے گا۔ اس لیے کہ حاکم کو فسق و فجور کی بنا پر اپنے عہدہ سے قتال اور فتنہ کے بغیر معزول کرنا ممکن نہیں۔ بخلاف قاضی یا گورنر وغیرہ کے ۔ انہیں معزول کیا جانا ممکن ہے۔ یہ فرق بھی ضعیف قول ہے ۔ اس لیے کہ جب گورنر وغیرہ کو اصحاب شوکت وقوت لوگوں نے مقرر کیا ہو تو اسے بھی فتنہ کے بغیر معزول کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ جب اسے معزول کرنے کی کوششوں میں اس کے اس عہدہ پر باقی رہنے سے زیادہ فساد کا اندیشہ ہو تو پھر اس صورت میں چھوٹے فساد کو ختم کرنے کے لیے بڑے فساد کو دعوت دینا کسی طرح بھی جائز نہیں ۔ یہی حال حکمران کا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے مذہب میں یہ مشہور ہے کہ: یہ لوگ حکمرانوں کے خلاف مسلح خروج اور ان سے جنگ وقتال کو جائز نہیں سمجھتے ۔ اگر چہ یہ حاکم ظالم ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں ۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ جنگ وقتال کرنے میں جو فتنہ وفساد ہے' وہ ان کے ظلم پر خاموش رہنے کے فتنہ وفساد سے بہت بڑھ کر ہے ۔ تو پھر اس صورت میں بڑے فتنہ وفساد سے بچنے کے لیے اس سے کم درجہ کے فتنہ وفساد کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ حکمران کے خلاف بغاوت کے نتیجہ میں کوئی فائدہ حاصل ہوا ہو؛ بلکہ اس بغاوت کی وجہ سے پہلے فتنہ وفساد سے بڑا فساد پیدا ہوا جسے یہ لوگ ختم کرنا چاہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر باغی اور ظالم کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا خواہ کیسے بھی ہو۔ اور نہ ہی باغیوں سے جنگ شروع کرنے کا حکم دیا ہے ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ ۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ ﴾ (الحجرات ۹)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسر پیکار ہوں تو ان میں صلح کرا دیجئے اور اگر ایک گروہ دوسرے پر ظلم کر رہا ہو تو اس سے لڑو جو دوسرے پر ظلم کر رہا ہو؛ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئے ۔ اگر وہ اللہ کے حکم پر لوٹ آئے تو ان کے مابین عدل وانصاف کے ساتھ صلح کرادو۔''

اللہ تعالیٰ نے ایک باغی جماعت سے بھی جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا تو پھر حکمران سے جنگ چھیڑنے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے؟ ۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''عنقریب ایسے امرا ہوں گے جن کے خلاف شریعت اعمال کو تم پہچان لوگے اور بعض اعمال نہ پہچان سکو گے ۔ پس جس نے اس کے اعمال بد کو پہچان لیا وہ بری ہوگیا۔ جو نہ پہچان سکا وہ محفوظ رہا۔ لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور تابعداری کی [وہ ہلاک ہوا]۔ صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز ادا کرتے رہیں۔'' [صحیح مسلم: ح ۳۰۳]

رسول اللہ ﷺ نے ان حکمرانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے منع فرمایا ہے؛ حالانکہ آپ ہی خبر بھی دے رہے ہیں کہ تم لوگ ان میں برے امور دیکھو گے ۔ پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حکمرانوں کے خلاف تلوار لیکر نکلنا جائز نہیں۔ جیسا کہ بعض فرقے حکمرانوں سے برسر پیکار رہتے ہیں جیسے خوارج ؛ معتزلہ وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عنقریب میرے بعد حقوق تلف کیے جائیں گے اور ایسے امور پیش آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرتے ہو۔صحابہ نے عرض کیا:''یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ہم میں سے انہیں حکم کیا دیتے ہیں؟ جو یہ زمانہ پائے۔آپ ﷺ نے فرمایا:''تم پر کسی کا جوحق ہو وہ ادا کر دو اور اپنے حقوق تم اللہ سے مانگتے رہنا۔'' [صحیح مسلم:ح ٢٧٨]

اس حدیث مبارک میں بھی رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ حکمران ظلم کریں گے اور برائیوں کے مرتکب ہوں گے۔ مگر اس کے باوجود آپ ہمیں حکم دے رہے ہیں کہ ہم حکمرانوں کا حق ادا کریں اور اللہ سے اپنے حق کے لیے دعا کرتے رہیں ۔ہمیں ہرگز یہ اجازت نہیں دی کہ ہم جنگ کرکے اپنا حق حاصل کریں۔اور نہ ہی اس بات کی رخصت دی ہے کہ ہم ان کا حق روک کر رکھیں۔[کیونکہ اس سے پھر فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے]۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو آدمی اپنے امیر میں کوئی ایسی بات دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو آدمی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی جدا ہوا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' [صحیح مسلم:ح ٢٩٣]

دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: رسول اللہ ﷺ فرمایا:

''جسے اپنے امیر سے کوئی بات ناپسند ہو تو چاہیے کہ اس پر صبر کرے کیونکہ لوگوں میں سے جو بھی سلطان کی اطاعت سے ایک بالشت بھی نکلا اور اس پر اسی کی موت واقع ہوگئی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' [صحیح مسلم:ح ٢٩٤]

اس سے پہلے ایک حدیث میں یہ بیان بھی گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''وہ [ایسے حکمران ہوں گے] جو میری سنتوں پر عمل نہیں کریں گے اور میری راہ پر نہیں چلیں گے ۔تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! پھر ہمیں کیا حکم ہے؟ اگر ہم انہیں ایسے پائیں تو کیا کریں؟ آپ نے فرمایا:'' حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو' اگر وہ تمہاری پیٹھ ٹھونکے اور تمہارا مال چھین لے تب بھی اس کی بات سن اور اطاعت کر۔'' [صحیح مسلم:ح ٣/ ١٤٧٦]

حکمران کے ظلم کے باوجود یہ اس کی اطاعت گزاری کا حکم ہے۔اس سے پہلے حدیث میں گزر چکا ہے آپ ﷺ نے فرمایا:''جس انسان پر کسی کو والی[حاکم] بنادیا جائے ؛ پس وہ انسان دیکھے کہ یہ والی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کررہا ہے۔تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو ناپسند کرے' اور [جائز امور میں] اس کی نافرمانی سے ہاتھ نہ کھینچے۔'' [تخریج گزر چکی ہے]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''ہم نے رسول اللہ ﷺ سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے۔'' [صحیح مسلم:٣/ ١٤٧٠؛ البخاری ٩/ ٤٧]

اس حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ ہمیں وصیت فرمارہے ہیں کہ ہم حکمرانوں کے ظلم و ستم کے باوجود ان کی اطاعت کریں؛ اور ان سے حکومت کے بارے میں جھگڑا نہ کریں۔اس میں حکمرانوں کے خلاف بغاوت اور خروج کی ممانعت ہے۔اس لیے کہ حکمرانوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔اس سے مراد وہ حاکم ہے جن کا حکم چلتا ہو۔اس سے مراد وہ نہیں ہے

جو کہ حاکم بننے کا مستحق ہو' مگر [حاکم نہ بنا ہو] اور اسے کوئی شوکت وغلبہ حاصل نہ ہو۔ اور اس سے عادل متولی بھی مراد نہیں اس لیے کہ کبھی کبھار وہ بھی ظلم کرتے ہیں ؛ پس حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد ظالم حکام سے جھگڑے کی ممانعت ہے۔ یہ ایک وسیع باب ہے۔

چوتھی بات: اگر ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ ہر حاکم کے لیے عدل کا ہونا شرط ہے۔ تو پھر اس صورت میں صرف ان ہی حکمرانوں کی اطاعت کی جائے گی جو عادل ہوں۔ ظالم کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کے لیے والیان کے لیے عادل ہونے کی شرط رکھنا گواہوں کے عادل ہونے کی شرط سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس لیے کہ گواہ کبھی ایسی چیز کی بھی گواہی دیتا ہے جس کے متعلق وہ کچھ حقائق نہیں جانتا۔ اگر وہ عادل نہ ہو تو پھر اس کی بتائی ہوئی بات کی تصدیق نہ کی جائے۔ جب کہ والی حکومت کسی چیز ایسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا علم اسے کسی دوسرے کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا کام ہے یا نافرمانی کا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ [الحجرات ۶]

''اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔''

اگر کوئی فاسق انسان کسی بات کی خبر دے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ظلم اطاعت کا کام کرنے اور نیکی کا حکم دینے میں مانع نہیں ہوسکتا۔ امامیہ کا اس بات پر ہمارے ساتھ اتفاق ہے۔ امامیہ یہ نہیں کہتے کہ: کبیرہ گناہ کرنے والا ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ ان کے نزدیک بھی فسق و فجور کی وجہ سے ساری نیکیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں ؛ جیسے معتزلہ' زیدیہ اور خوارج۔ جو کہتے ہیں کہ: فسق کی وجہ سے ساری نیکیاں تباہ ہوجاتی ہیں۔ اگر ساری نیکیاں ضائع ہوگئیں تو ایمان ضائع ہوگیا۔ جب ایمان ضائع ہوگیا تو انسان کافر اور مرتد ہوگیا' اس کا قتل کرنا واجب ہوجاتا ہے۔

جب کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی نصوص اور اجماع امت اس پر دلالت کرتے ہیں کہ چوری کرنے والا' زنا کرنے والا' شراب پینے والا' بہتان تراشی کرنے والا ؛ انہیں ان جرائم کی پاداش میں قتل نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ ان پر حد لگائی جائے گی۔ جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ لوگ مرتد نہیں ہوئے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ (الحجرات ۹)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں باہم برسر پیکار ہوں تو ان میں صلح کرادیجیے۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ان گروہوں کے آپس میں برسر پیکار ہونے [اور ایک دوسرے کو قتل کرنے] کے باوجود ان میں ایمان موجود ہے۔ صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

((من كانت له مظلمة من أخيه من عرضه فليتحلله منه اليوم قبل أن لايكون دينار ولا درهم۔ إن كان لـه عمل صالح أخذ منه بقدر مظلمته ، وإن لم يكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه فطرحت عليه ثم ألقي في النار)) [رواه البخاری]

''جس نے اپنے بھائی کو تکلیف پہنچائی ہو، یا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہو، پس اسے وہ اس دنیا میں ہی ختم کردے، اس

سے قبل کہ وہ دن آئے جب اس کے پاس نہ دینار ہوا اور نہ ہی درہم ،اور اگر اس کا کوئی نیک عمل ہوگا تو اس سے اس ظلم کی قدر اعمال لیکر مظلوم کو دیے جائیں گے ،اور اگر اس کی کوئی نیکی نہ ہوگی تو مظلوم کی برائیاں لیکر اس پر ڈالی جائیں گی ۔اور پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

صحیحین میں ایک حدیث ہے :ایک بار نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام سے پوچھا:

((أتدرون من المفلس ؟قالوا: المفلس فينا من لا درهم له ولامتاع له۔فقال :إنما المفلس من أمتي من يأتي بصلواة وصوم وزكوٰة ، ويأتي قد شتم هذا، وقذف هذا، وأكل مال هذا، وسفك دم هذا، وضرب هذا، فيعطى هذا من حسناته، وهذا من حسناته، فإن فنيت حسناته قبل أن يقضي ما عليه، أخذ من خطاياهم وطرحت عليه ثم طرح في النار)) [مسلم ٤/ ١٩٩٧۔ابن حبان ١٠/ ٢٥٩]

''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ کہنے لگے: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ دینار ہے اور نہ ہی درہم ہے،،۔ آپ ﷺ نے فرمایا:,,میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت والے دن نماز، روزے، اور زکوٰۃ لیکر آئیگا ،اور اس کی حالت یہ ہوگی کہ کسی کو اس نے گالی دی ہوگی ،اور کسی پر تہمت لگائی ہوگی، اور کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا ،اور کسی کا خون بہایا ہوگا،اور کسی کو مارا ہوگا۔پس اس کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی اور اس کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔اور اگر اس کی نیکیاں اس پر حساب پورا ہونے سے پہلے ختم ہوگئیں تو ان لوگوں کے گناہ لے کر اس شخص پر ڈالے جائیں گے اور اسے جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ [هود ١١٤]

''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ نصیحت ہے نصیحت پکڑنے والوں کے لئے۔''

یہ آیت مبارکہ دلالت کرتی ہے کہ انسان سے جب کوئی برائی ہو' اور اس کے بعد نیکیاں کی جائیں تو یہ نیکیاں ان برائیوں کے اثرات کو ختم کر دیتی ہیں ۔ اور یہ بھی ہے کہ اگر ایسی برائیاں ہوں جو نیک اعمال سے ختم نہ ہوں تو وہ توبہ سے معاف ہو جاتی ہیں۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ۔

نائب امام کی عصمت کا مسئلہ:

یہاں پر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فسق کو خبر کے قبول کرنے میں مانع قرار دیا ہے۔ جب کہ نیکی کے کمانے میں فسق مانع نہیں ہوسکتا۔ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے کہ گواہی صرف عادل لوگوں کی ہی قبول کی جائے گی اور اس میں صرف ظاہر پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی اگر ولایت میں بھی عادل ہونے کی شرط لگائی گئی تو اس کے لیے ظاہری حالت ہی کافی ہوگی ۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ ولایت [حاکم ہونے] کے لیے اتنے علم کی شرط نہیں ہے جتنے علم کا ہونا گواہوں کے لیے شرط ہے۔اس کی وضاحت اس مسئلہ سے بھی ہوتی ہے کہ امامیہ اور دوسرے سارے لوگ امام کے نائب کے لیے غیر معصوم ہونے کو جائز سمجھتے ہیں؛ اگرچہ امام کو اپنے نائبین کے گناہوں کا علم نہ ہو۔اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ بن

معیط کو والی مقرر فرمایا' پھر اس نے واپس آ کر ان لوگوں کی طرف سے جنگ شروع کرنے کی خبر دی جن کے پاس آپ کو بھیجا گیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ﴾ [الحجرات ٦]

''اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو پھر اپنے لئے پریشانی اٹھاؤ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائبین میں سے بہت سارے ایسے تھے جو آپ کے ساتھ خیانت کرتے تھے' اور بہت سارے آپ سے بھاگ گئے تھے۔ آپ کے نائبین کا کردار کسی سے مخفی نہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ایسے مفاسد کی موجودگی میں بھی ظاہر پر اعتبار کرنے میں امام معصوم کے لیے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ اور ائمہ کے لیے معصوم ہونے کی شرط ایسی شرط ہے جو نہ شریعت میں مامور بہ ہے؛ اور نہ ہی [احوال کے لحاظ سے] مقدور بہ ہے۔ اور ایسی شرط سے نہ ہی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کوئی اخروی فائدہ حاصل ہوا۔

جیسا کہ بہت سارے عباد جو اپنے مشائخ کے لیے ایسے امور کا عالم ہونا شرط لگاتے ہیں جنہیں بشریت میں کوئی دوسرا انسان نہیں جان سکتا؛ تو یہ لوگ اپنے مشائخ کے لیے بھی اس جنس کی صفات کا ہونا شرط لگاتے ہیں جو امام معصوم کے لیے امامیہ شرط لگاتے ہیں۔ لیکن انجام کار یہ ہوتا ہے کہ ایسی شرطیں لگانے والے کسی جاہل اور ظالم شیخ کے پیروکار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی حال شیعہ کا ہے آخر میں یہ لوگ بھی کسی ظالم و جاہل حاکم کو ہی قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی مثال اس بھوکے انسان کی ہے جو شرط لگا دے کہ وہ اس شہر کا کھانا اس وقت تک نہیں کھائے گا جب تک اس کے لیے جنت کے کھانوں جیسا کھانا پیش نہ کیا جائے۔ پھر اس کو کسی صحرا کی طرف نکال دیا جائے' تو وہاں پر اسے چوپائیوں کے چارے کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے؛ جو جنت کے کھانوں پر بضد تھا آخر کار مویشیوں کا چارہ کھا کر گزر کر رہا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو زہد و عبادت وغیرہ میں شریعت کے عادلانہ نظام سے تجاوز کر جاتے ہیں؛ ان کی خواہشات ایسے ہی آخر میں دم توڑ دیتی ہیں اور یہ لوگ حرام کے ارتکاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

فصل:

اہل سنت پر قیاس کا طعنہ

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''تمام اہل سنت نے رائے و قیاس کو اختیار کر کے اس چیز کو دین کا جزو قرار دیا ہے جو اس میں سے نہیں۔ علاوہ ازیں احکام شریعت میں تحریف کا ارتکاب کیا، مذاہب اربعہ ایجاد کیے، جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں موجود نہ تھے، اور اقوال صحابہ کو ترک کیا۔ حالانکہ ان سب نے قیاس ترک کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا: سب سے پہلے قیاس کرنے والا ابلیس ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

[جواب]: اس کا جواب کئی ایک طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی وجہ: شیعہ کا یہ دعوی کہ تمام اہل سنت والجماعت جو کہ سابقہ تین خلفاء کی خلافت کو درست مانتے ہیں' وہ قیاس کے قائل ہیں؛ یہ ایک باطل دعوی ہے۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو قیاس کو نہیں مانتے۔ جیسے معتزلہ اور بغدادیہ؛ ظاہریہ جیسے داؤد اور ابن حزم وغیرہ؛ اور ایک گروہ اہل حدیث میں اور صوفیاء کا ایک گروہ قیاس کو نہیں مانتے۔

خود زیدیہ شیعہ قیاس کے قائل ہیں۔ تو اس معاملہ میں شیعہ کے مابین بھی نزاع ایسے ہی ہو گیا جیسے اہل سنت کے مابین۔

دوسری وجہ: قیاس کو اگرچہ ضعیف کہا گیا ہے؛ تاہم یہ ان لوگوں کی تقلید کرنے سے کہیں بہتر ہے جو علم میں مجتہدین کے پایہ کو نہ پہنچ سکے ہوں۔ جس انسان کو بھی ادنی انصاف حاصل ہو' اور علم سے اس کا شغف ہو؛ وہ جانتا ہے کہ ائمہ مجتہدین جیسے: امام مالک، لیث بن سعد؛ اوزاعی اور ابوحنیفہ؛ ثوری، ابن ابی لیلی؛ اور جیسے کہ امام شافعی، احمد اسحق اور ابو عبید جیسے عظیم القدر مجتہدین رحمہم اللہ امام حسن عسکری رحمہ اللہ کے اتباع اور ان کے نظائر و امثال سے بڑے عالم اور مجتہد ہیں۔

نیز یہ علماء کرام و مجتہدین عظام اس امام منتظر سے ہزار درجہ بہتر ہیں جس کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے [اور کیا کرتا ہے]۔ حالانکہ ان ائمہ مذکورین کے پاس نبی کریم ﷺ سے منقول نصوص موجود ہیں۔ اور اس میں ادنیٰ سا بھی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے منقول نص کو قیاس پر ترجیح و برتری حاصل ہے۔ اگر اس کے پاس نص نہ ہو' اور قیاس سے بھی نہ کہے؛ تو پھر یہ انسان جاہل ہوگا۔ وہ قیاس جس سے انسان کو گمان [ظن/علم] حاصل ہو؛ وہ اس جہالت سے بہتر ہے جس کے ساتھ نہ کوئی علم ہو اور نہ ہی ظن۔

❀ اگر کوئی یہ کہے کہ: یہ [ائمہ] وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے پاس نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ ہوتا ہے۔''

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: یہ قول اس انسان کے قول سے کمزور ہے جو کہتا ہے: ''مجتہد کی ہر بات نبی کریم ﷺ کا قول ہوتی ہے۔ اہل رائے میں سے ایک گروہ کا یہی خیال ہے۔ ان لوگوں کا قول بھی رافضیوں کے قول کے قریب تر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کا قول ایک صریح جھوٹ ہے۔''

مزید برآں ان لوگوں کا قول جو اہل مدینہ کے عمل کو [بطور حجت] لیتے ہیں؛ کیونکہ انہوں نے یہ اعمال صحابہ کرام سے حاصل کیے ہیں' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ اعمال نبی کریم ﷺ سے حاصل کیے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو صحابہ کرام میں قیاس کو نہیں مانتے۔ اس لیے کہ صحابی صرف وہی بات کہہ سکتا ہے جو اسے نبی کریم ﷺ کی جانب سے پہنچی ہو۔

اور ایسے ہی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ: مجتہد کا قول اور عارف کا الہام اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتے ہیں' ان کی اتباع کرنا واجب ہوتا ہے۔

اگر اس پر اعتراض کیا جائے کہ: ''ان کا آپس میں اختلاف ہے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: فریق مخالف کا بھی ایسے ہی آپس میں اختلاف ہے۔ پس [رافضہ کے لیے] یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی بھی باطل دعوی کریں' مگر اس جیسے یا اس سے بہتر دعوی کا ساتھ اس سے معارضہ کیا جائے گا۔

اور ان میں کوئی سچی بات کہنے والا ایسا نہیں ہوگا جس سے بہتر اور بڑھ کر حق کہنے والا اہل سنت والجماعت میں موجود نہ ہو۔ اس لیے کہ بدعت کی سنت کے ساتھ مثال ایسے ہی ہے جیسے کفر کی مثال ایمان کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ [الفرقان ۳۳]

''یہ آپ کے پاس جو کوئی مثال لائیں گے ہم اس کا سچا جواب اور عمدہ دلیل آپ کو بتا دیں گے۔''

تیسری وجہ : باقی رہا شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اہل سنت نے دین میں وہ باتیں داخل کر دیں جو اس میں شامل نہ تھیں، اور احکام شریعت میں تحریف کا ارتکاب کیا۔'' تو یہ بات شیعہ میں سب فرقوں کی نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔ شیعہ نے اللہ کے دین میں رسول علیہ السلام تک کو جھوٹ کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا جب کہ دوسرا کوئی اسلامی فرقہ یہ جسارت نہ کر سکا۔ اور لاتعداد ایسی صداقتوں کو تسلیم نہ کیا جن کو رد کرنے کی جرأت کوئی دوسرا نہ کر سکا۔ اور انہوں نے قرآن میں ایسے تحریف کی کہ کوئی دوسرا اس تحریف کا ارتکاب نہ کر سکا۔ [شیعہ کی تحریف کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل تفسیری اقوال سے لگایئے]:

۱۔ ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ﴾ اس سے بقول شیعہ علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما ہیں۔

۲۔ ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ لولو و مرجان سے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مراد ہیں۔

۳۔ ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنٰهُ فِيْ إِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾۔ اس سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۳۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ﴾' آل عمران سے آل ابی طالب مراد ہے ابو طالب کو عمران سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۴۔ ﴿اَلشَّجَرَةُ الْمَلْعُوْنَةُ فِي الْقُرْآنِ﴾ اس سے مراد بنو امیہ ہیں۔

۵۔ ﴿فَقَاتِلُوْا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ﴾ اس سے مراد طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما ہیں۔

۶۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً﴾ بقرہ (گائے) سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔

۷۔ ﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ یعنی اگر تو نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ولایت میں شریک کیا۔

شیعہ مذہب کی کتابوں میں ایسی لاتعداد تحریفات پائی جاتی ہیں۔ شیعہ کے فرقہ اسماعیلیہ والوں نے واجبات و محرمات تک میں تحریف کرنے سے اجتناب نہ کیا، بنا بریں اگر ان کو ائمہ تحریف کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ لوگ آیات کو اپنے اصل مقصود سے بدل دیتے ہیں۔ اگر کوئی ان کے پاس مبلغ علم پر غور کرے تو اسے جھوٹی منقولات اور حق بات کی تکذیب؛ آیات کے معانی میں تحریف کے علاوہ کچھ بھی نہ ملے گا۔ یہ باتیں اس طرح آپ کو کسی دوسرے اسلامی فرقہ میں نہیں ملیں گی۔

شیعہ نے یقینی طور پر اللہ کے دین میں ہر فرقہ سے بڑھ کر چیزیں داخل کی ہیں اور کتاب اللہ میں ایسے تحریف کی ہے کہ

دوسرے لوگوں کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔

چوتھی وجہ: شیعہ قلمکار کا یہ قول کہ ''اہل سنت نے مذاہب اربعہ ایجاد کیے جو کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں نہیں تھے اور اقوال صحابہ کو ترک کر دیا۔''

جواب: ہم رافضی مصنف سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مخالفت اور ان کے اقوال سے انحراف کب سے مذموم قرار پائے؟

جب کہ اہل سنت والجماعت کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت و دوستی رکھنے اور باقی تمام زمانوں پر ان کو ترجیح دینے پر اتفاق ہے؛ اور ان کے ہاں صحابہ کرام کا اجماع حجت بھی ہے۔ اور انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اجماع سے کسی طرح بھی خروج کی اجازت نہیں۔ بلکہ عام ائمہ مجتہدین وضاحت وصراحت کے ساتھ فرما رہے ہیں:

''ہمارے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کو ترک کرنا جائز نہیں''۔

پھر جو لوگ [شیعہ] یہ کہتے ہیں کہ اجماع صحابہ حجت نہیں ہے' اور صحابہ کرام کو ظلم اور کفر کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ تو وہ کیسے اہل سنت پر اعتراض کر سکتے ہیں؟ [[کیا ہم اجماع صحابہ کے مخالف ہیں یا تم؟ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو گمراہ اور کافر کون کہتا ہے؟ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اہل سنت اجماع صحابہ کے خلاف متفق ہو جائیں]]۔

مزید برآں اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اجماع حجت ہے تو وہ دونوں گروہوں پر حجت ہے۔ اور اگر اجماع صحابہ حجت نہیں تو پھر اس کو بنیاد بنا کر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

[اعتراض]: اگر یہ کہے کہ: ''اہل سنت والجماعت اجماع صحابہ کو حجت مانتے ہیں اور پھر اس کی مخالفت کے مرتکب ہوئے ہیں۔''

[جواب]: اہل سنت والجماعت کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اجماع صحابہ کرام کے خلاف یک زبان ہو جائیں۔ جب کہ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ شیعہ امامیہ عترت [اہل بیت؛ بنو ہاشم] نبوی اور حضرات صحابہ دونوں کے متفق اجماع کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ سرور کائنات ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد سعادت مہد میں بنی ہاشم کا کوئی فرد اس بات کا مدعی نہ تھا کہ: ''بارہ امام معصوم ہوں گے؛ یا یہ کہ سالار رسل ﷺ کے بعد کوئی شخص معصوم بھی ہو سکتا ہے۔''

❀ بخلاف ازیں کوئی شخص خلفائے ثلاثہ کے کفر کا قائل تھا نہ ان کی امامت پر طعن و تشنیع کرتا تھا اور نہ ہی صفات اللہ تعالیٰ کا کوئی منکر تھا اور نہ تقدیر کا۔ [اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے، کہ امامیہ اہل بیت و صحابہ دونوں کی مخالفت کرنے میں متحد الخیال ہیں، پھر انہیں لوگوں پر معترض ہونے کا کیا حق ہے، جو اہل بیت و صحابہ دونوں کے اجماع کو حجت مانتے ہیں اور اس کی مخالفت سے اجتناب کرتے ہیں]]۔

پانچویں وجہ: یہ اعتراض کہ: ''اہل سنت نے مذاہب اربعہ ایجاد کر لیے جو نبی کریم ﷺ کے دور میں نہیں تھے۔''

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کے خیال میں اہل سنت نے حضرات صحابہ کے عین برخلاف جمع ہو کر باتفاق رائے یہ مذاہب ایجاد کر لیے تھے تو یہ عظیم افترا ہے۔ اس لیے کہ یہ چاروں مذاہب ایک ہی زمانہ میں نہ تھے۔ بلکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی وفات ۱۵۰ ہجری میں ہوئی۔ امام مالک رحمہ اللہ کی وفات ۱۷۹ ہجری میں ہوئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کی وفات ۲۰۴ ہجری میں ہوئی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی وفات ۲۴۱ ہجری میں ہوئی۔

مزید برآں ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا تھا اور نہ دوسروں کو اپنی پیروی کا حکم دیتا تھا، بخلاف ازیں یہ

سب ائمہ اتباع کتاب و سنت کی دعوت دیتے اور دوسروں پر تنقید کیا کرتے تھے۔

باقی رہا یہ معاملہ کہ لوگ ائمہ اربعہ کی اطاعت کرتے تھے تو یہ ایک اتفاقی بات تھی۔ نیز یہ کہ: جب ان میں سے کوئی ایک کوئی ایسی بات کہے جو کتاب و سنت کی مخالف ہو تو اس کو چھوڑ دینا واجب ہو جاتا ہے؛ اور لوگوں پر اس کی تقلید واجب نہیں ہوتی۔

اگر تم شیعہ کہو کہ: لوگ ان مذاہب کی پیروی کررہے ہیں؛ یہ کوئی اتفاقیہ امر نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں نے آپس میں اتفاق سے طے کیا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو اور تم اس کی پیروی کرو۔ ان کی مثال ان حجاج کی ہے جنہیں کسی رہبر کی تلاش ہو' پھر انہیں کوئی رہنما مل جائے۔ کچھ لوگ اسے ماہر راہبر سمجھ کر اس کے پیچھے چلنے لگیں اور کچھ لوگ اس کو چھوڑ کر الگ چل دیں۔

[**جواب**]: اگر واقعی ایسا ہے تو پھر بھی اہل سنت والجماعت کا اتفاق کوئی باطل نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک گروہ دوسرے کی خطا پر آگاہ کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا اتفاق اس بات پر نہیں ہے کہ جو کچھ بھی متعین شخص کہے؛ وہ ہر حال میں قبول کیا جائے۔ بلکہ جمہور مسلمین نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی متعین شخص کی تقلید کا حکم نہیں دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے اس امت کی عصمت کی ضمانت دی ہے۔ یہ عصمت کی نشانی ہے کہ اس امت میں کئی کئی علماء ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک کسی چیز میں غلطی کر جائے تو دوسرا کوئی اس مسئلہ میں حق پر ہوتا ہے تاکہ حق بات باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بعض علماء کرام کے ہاں بعض مسائل میں خطاء ہو جائے؛ جیسا کہ شیعہ مصنف نے بطور مثال کے کچھ مسائل ذکر کیے ہیں؛ تو [ان ہی علماء کے دوسرے قول میں یا] دیگر علما کے اقوال میں حق موجود ہوتا ہے۔ تو اس سے ظاہر ہوا کہ اہل سنت والجماعت کا اتفاق کبھی بھی گمراہی پر نہیں ہوا۔ رہ گیا بعض علماء کرام سے بعض دینی مسائل میں خطاء کا سرزد ہو جانا؛ تو ہم اس سلسلہ میں کئی بار وضاحت کر چکے ہیں کہ اس معمولی [یا جزوی] خطاء سے کوئی نقصان نہیں ہوتا: جیسا کہ بعض عام مسلمانوں سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ جب کہ شیعہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے؛ ہر وہ مسئلہ جس میں وہ تمام اہل سنت کی مخالفت کرتے ہیں' اس میں وہ خطاء پر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ یہود و نصاریٰ ہر اس مسئلہ میں خطاء پر ہیں جس میں وہ مسلمانوں کی مخالفت کررہے ہیں۔

چھٹی وجہ: شیعہ کا اعتراض ہے کہ: ''یہ مذاہب نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانہ میں موجود نہیں تھے۔''

جواب: اگر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے مذاہب کے اقوال نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے نقل نہیں کیے گئے؛ بلکہ ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے اقوال کو ترک کرکے اپنی طرف سے بدعات گھڑ لیں' تو یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مخالفت پر کبھی بھی اہل سنت کا اتفاق نہیں ہوا۔ بلکہ تمام اہل سنت اپنے اقوال و آراء میں صحابہ کرام کے پیروکار ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بعض اہل سنت والجماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کا علم نہ ہونے کی بنا پر مخالفت کے مرتکب ہوئے ہیں؛ تو پھر ایسے بھی ہے کہ باقی اہل سنت صحابہ کرام کی اتباع پر متفق ہیں؛ اور ان کی مخالفت کرنے والے کی غلطی سے اس کو آگاہ کررہے ہیں۔ [اور اس کو غلطی مان رہے ہیں]۔ اگر شیعہ کے اعتراض سے مراد یہ ہے کہ ان مذاہب اربعہ کے ائمہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں موجود نہیں تھے؛ تو اس میں کوئی ایسی ممانعت کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر آنے والے زمانے کے لوگ پہلے لوگوں کے بعد ہی آتے ہیں۔

مذاہب اربعہ پر شیعہ کا اعتراض:

ساتویں وجہ: شیعہ کا اعتراض: ''انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال کو ترک کر دیا۔''

[جواب]: یہ ایک من گھڑت جھوٹ ہے۔ بلکہ ان مذاہب کے ماننے والوں کی کتابیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال اوران سے استدلال سے بھری پڑی ہیں۔اگر چہ ان میں سے بعض مذاہب کے پاس ایسی روایات ہیں جو دوسرے فرقہ کے پاس نہیں ہیں۔اور اگر شیعہ مصنف کے اعتراض سے مراد یہ ہو کہ: یوں نہیں کہتے : یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے ؛ یہ عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے ؛ وغیرہ۔تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے کسی ایک نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اقوال جمع کیے اور پھر ان سے مسائل کا استنباط کیا ؛ اس بنا پر یہ اقوال کو ان ائمہ کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔جس طرح کتب حدیث کو ان کے جامعین مثلاً امام بخاری و مسلم اور ابو داؤد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، بعینہ اسی طرح مختلف قراءتوں کو ان ائمہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے جنھوں نے وہ اختیار کی تھیں ؛ جیسے کہ نافع اور ابن کثیر وغیرہ۔

غالب طور پر ان ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال سابقین سے منقول ہیں۔بعض کے ہاں ایسے بھی کچھ اقوال پائے جاتے ہیں جو کہ متقدمین سے منقول نہیں ہیں۔لیکن انہوں نے یہ اقوال ان ہی اصولوں کی بنیاد پر استنباط کیے ہیں۔اس سے ان کے اقوال میں موجود غلطی کی واضح ہوگئی۔ یہ سب کچھ دین کی حفاظت کے لیے ہوا ہے تاکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ اس صفت کے اہل ہو جائیں [جس میں ارشاد فرمایا ہے]: ﴿یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [التوبہ ۷۱]

''وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔''

پس جب بھی کسی سے بھول کر یا عمداً غلطی واقع ہوئی تو دوسرے علماء کرام نے اس پر آگاہ کیا ؛ اور اس غلطی کا انکار کیا۔

علمائے کرام رحمہم اللہ کا مرتبہ انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ﴾

[الأنبیاء ۷۸۔۷۹]

''اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو یاد کیجئے جبکہ وہ کھیت کے معاملہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر گئی تھیں اور ان کے فیصلے میں ہم موجود تھے۔ہم نے اس کا صحیح فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا ہاں ہر ایک کو ہم نے حکم و علم دے رکھا تھا اور داؤد کے تابع ہم نے پہاڑ کر دیئے تھے جو تسبیح کرتے تھے اور پرند بھی ؛ ہم ایسا کرنے والے ہی تھے۔''

صحیحین میں ثابت ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احزاب سے واپس ہوئے تو ہم لوگوں سے فرمایا:

''کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنی قریظہ میں پہنچ کر۔'' چنانچہ لوگوں کے راستہ میں ہی نماز عصر کا وقت ہو گیا، تو بعض نے کہا کہ: ہم نماز نہیں پڑھیں گے جب تک کہ وہاں (بنی قریظہ) تک پہنچ نہ جائیں۔اور بعض نے کہا کہ ہم تو نماز پڑھیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ نہ تھا کہ ہم قضا کریں۔اور بعض نے بنو قریظہ میں پہنچ کر غروب آفتاب کے بعد نماز پڑھی۔ جب اس کا ذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو ملامت نہ کی۔'' [صحیح بخاری: ح ۹۰۳]

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ مجتہدین کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھنے میں اختلاف ہوسکتا ہے ؛ مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی گنہگار نہیں ہوتا۔

آٹھویں وجہ: اس پر مزید یہ کہ اہل سنت نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ائمہ اربعہ کا اجماع ایک بے خطا دلیل ہے۔ اور نہ ہی کسی نے یہ کہا ہے کہ: حق ان کے اقوال کے دائرہ میں محدود و محصور ہو کر رہ گیا ہے؛ جو بات ان سے خارج ہے وہ باطل ہے۔ [1] بلکہ اگر ان ائمہ کے متبعین کے علاوہ کوئی دوسرا جیسا کہ سفیان الثوری؛ اوزاعی؛ لیث؛ سعد اور ان سے پہلے یا ان کے بعد والے مجتہدین اگر کوئی ایسی بات کہیں جو ان ائمہ اربعہ کے اقوال کے خلاف ہو' تو اس معاملہ کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ پر پیش کیا جائے گا۔ اور ان میں سے راجح قول وہی تصور ہوگا جس پر دلیل قائم ہوگی۔

نویں وجہ: شیعہ کا قول کہ: ''صحابہ کرام نے صراحت کے ساتھ قیاس ترک کرنے کا حکم دیا ہے۔''

[جواب]: [شیعہ سے کہا جائے گا کہ]: جمہور مسلمین جو قیاس کو حجت مانتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے قیاس ورائے اور اجتہاد بھی ثابت ہے۔ انہوں نے اجتہاد و قیاس کیا۔ اور ان سے قیاس کی مذمت بھی ثابت ہے۔ [قیاس و رائے کے موافق و مخالف دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں]۔ قیاس مذموم وہ ہے جو نص کا معارض ہو جسے ان لوگوں کا قیاس ہے جو کہتے ہیں کہ سود بھی تجارت کی طرح ہے۔ اور ابلیس مردود کا قیاس جب اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے حکم الٰہی پر اعتراض کیا تھا۔ اور مشرکین کا قیاس جو کہتے ہیں: کیا جسے تم قتل کرتے ہو' اس کا گوشت کھا لیتے ہو' اور جس کو اللہ مار دیتا ہے اس کا گوشت نہیں کھاتے؟ اللہ تعالیٰ [ایسے باطل قیاس کرنے والے لوگوں کے بارے میں] فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنَّ الشَّیٰطِیۡنَ لَیُوۡحُوۡنَ اِلٰۤی اَوۡلِیٰٓـِٕهِمۡ لِیُجَادِلُوۡكُمۡ وَ اِنۡ اَطَعۡتُمُوۡهُمۡ اِنَّكُمۡ لَمُشۡرِكُوۡنَ﴾

''اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ یہ تم سے جدال کریں؛ اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔'' [الانعام ۱۲۱]

اور ایسے ہی وہ قیاس بھی ہے جس میں فرع مدار حکم میں اصل کی شریک نہ ہو۔ ایسے قیاس کا فاسد ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔ [مگر اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ قیاس کوئی بھی ہو فاسد ہوتا ہے]۔ وہ قیاس فاسد ہوتا ہے جس میں شرطیں نہ پائی جائیں' اور وہ اصل مدار حکم میں مساوی نہ ہو۔ ایسا کسی مانع کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے؛ اور یہ مانع وہ نص ہو سکتی ہے جس کو قیاس پر مقدم کرنا واجب ہوتا ہے۔ اگر دونوں نفس امر میں متلازم ہوں' تو شرط کبھی بھی فوت نہیں ہو سکتی مگر وہاں پر کسی مانع کے موجود ہونے کی وجہ سے۔ اور جب بھی کوئی مانع پایا جاتا ہے تو شرط مفقود ہو جاتی ہے۔

پس رہ گیا وہ قیاس جس میں مدار حکم میں اصل اور فرع دونوں برابر ہوں' اور ان کے ساتھ اس سے راجح کوئی نص معارض بھی نہ ہو تو پھر یقیناً ایسا قیاس قابل اتباع ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں قیاس میں فاسد قیاس بھی پایا جاتا ہے۔ بہت سارے فقہاء نے فاسد قیاس کیا ہے۔ ان میں سے بعض نص کی روشنی میں باطل ہیں۔ اور بعض قیاس کے باطل ہونے پر اتفاق ہے۔ لیکن بہت سارے امور میں قیاس کے باطل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام کا تمام قیاس سرے سے ہی باطل ہے۔ جس طرح موضوع احادیث کے پائے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام احادیث نبویہ کو تسلیم نہ کیا جائے۔

❁❁❁❁

[1] [مجتہدین کے یہاں جو نزاع و اختلاف پایا جاتا ہے، وہ صرف کلام رسول ﷺ کے فہم و ادراک کے بارے میں ہے اور بس! [دراوی جی]

فصل:

[بعض فقہی مسائل پر شیعہ کی تشنیع]

[اعتـــراضـــات] : رافضی مضمون نگار رقم طراز ہے: قیاس کی وجہ سے اہل سنت لاتعداد امور قبیحہ میں گرفتار ہوگئے، چنانچہ حسب ذیل مسائل قیاس کی پیداوار ہیں:

۱۔ جو لڑکی زنا سے پیدا ہوئی ہو وہ زانی کے لیے حلال ہے۔

۲۔ جو شخص اپنی ماں اور بہن سے یہ جانتے ہوئے نکاح کرلے کہ یہ محرمات میں سے ہیں؛ اس پر حد شرعی نہیں۔

۳۔ جو انسان اپنے ذکر پر کپڑا لپیٹ کر اپنی ماں یا بیٹی سے زنا کرلے؛ اور جو کوئی لواطت کرے [تو اس پر کوئی حد نہیں] حالانکہ لواطت زنا سے زیادہ بری چیز ہے۔

۴۔ اگر کسی شخص کی بیٹی مشرق میں سکونت پذیر ہو اور خود مغرب میں رہتا ہو، پھر وہ مغرب ہی میں غائبانہ طور پر کسی آدمی سے اپنی لڑکی کا نکاح کردے، رات و دن میں کسی وقت بھی ان کا جوڑ نہیں ہوا ہو۔ چھ ماہ کے بعد اس لڑکی یہاں بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ اسی خاوند کا قرار دیا جائے گا۔ حالانکہ اس انسان کا اس عورت تک پہنچنا کئی سال کے بعد ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ بلکہ اگر کسی انسان کو حکمران اس کے نکاح کے وقت سے ہی قید کردے؛ اور پچاس سال تک کے لیے اس پر پہرہ بیٹھا دے؛ پھر جب وہ اپنی بیوی کے شہر میں پہنچے تو وہاں پر اپنے بچوں اور پوتوں وغیرہ کا ایک جم غفیر دیکھے؛ تو پھر بھی ان سب کا نسب اس انسان کیساتھ لگایا جائے گا جو ایک دن کے لیے بھی اس عورت کے قریب تک نہیں گیا۔

۵۔ نبیذ مباح ہے۔ نبیذ اگر چہ نشہ آور ہو۔ اور اس کے ساتھ وضو جائز ہے۔

۶۔ کتے کی کھال پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

۷۔ گندگی جب خشک ہوجائے تو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ بعض فقہاء سے بعض بادشاہوں کے دربار میں طریقہ ء نماز حکایت منقول ہے۔ بادشاہ کے پاس حنفی فقہاء موجود تھے۔ وہ اپنے غصب کردہ گھر میں داخل ہوا؛ نبیذ کے ساتھ وضوء کیا ؛ اور فارسی میں بغیر نیت کے تکبیر کہی۔ اور پھر ﴿مــدهــامتـــان﴾ آیت فارسی میں پڑھی۔ اس کے علاوہ کوئی آیت نہیں پڑھی؛ پھر اطمینان کے بغیر کچھ دیر کے لیے سر جھکایا؛ اور ایسے ہی سجدہ بھی کیا۔ پھر تلوار کی دہار کے برابر سر اٹھایا؛ پھر دوسرا سجدہ کیا۔ پھر کھڑا ہوگیا اور دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا۔ پھر سلام پھیرنے کے بجائے گوز ماری؛ [اور نماز ختم کردی؛ یہ دیکھ کر] بادشاہ نے - جو کہ حنفی مذہب رکھتا تھا - اس مذہب سے برأت کا اظہار کرلیا۔

۹۔ غصب مباح ہے۔ اگر چہ غصب کرنے والا اس میں تبدیلی ہی کیوں نہ کردے۔

۱۰۔ ان کا کہنا ہے: اگر چور کسی چکی پر پہنچ کر آٹا پیس لے تو وہ آٹے کا مالک قرار پائے گا، اگر مالک آ کر اس سے جھگڑنے لگے تو ظالم ہوگا، اور چور مظلوم ہوگا۔ اگر وہ دونوں لڑنے لگیں اور چور مارا جائے تو وہ شہید تصور کیا جائے گا، اگر چور مالک کو مار ڈالے تو چور پر قصاص یا دیت نہیں آئے گی۔

۱۱۔ اگر زانی گواہوں کو جھٹلا دے، تو اس پر حد لگائی جائے گی۔ اور اگر ان کی تصدیق کردے تو حد ساقط ہوجائے گی گویا مجرم

کے اقرار جرم اور گواہوں کی گواہی کے باوجود اس پر حد نہیں لگائی جائے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ پس جس کسی پر بھی زنا کی گواہی دی جائے اور وہ گواہوں کو جھٹلا دے تو گواہی ساقط ہو گی۔

۱۲۔ کتے کا گوشت کھانا مباح ہے۔

۱۳۔ غلام کے ساتھ لواطت مباح ہے۔

۱۴۔ باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔

ان کے علاوہ بھی ایسے مسائل ہیں جن کے بیان کا موقع یہ نہیں ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]۔

[جوابات] :

پہلا جواب : ان میں ایسے مسائل بھی ہیں جمہور اہل سنت پر محض بہتان ہیں۔ جمہور اہل سنت والجماعت ان میں سے کسی کو بھی درست تسلیم نہیں کرتے۔ [1] ان میں سے ہر ایک مسئلہ کے برعکس اقوال موجود ہیں۔ اگرچہ بعض لوگوں نے یہ باتیں کہی بھی ہوں تو اہل سنت میں دوسرے ایسے لوگ موجود ہیں جن کے پاس حق اور صواب موجود ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی بات درست ہو تو بھی حق اہل سنت والجماعت کے ساتھ ہی ہے۔ دونوں صورتوں میں اہل سنت والجماعت حق سے باہر نہیں جاتے۔

دوسرا جواب : ہم کہتے ہیں کہ: خود رافضی فقہ میں بھی ایسے مسائل کی کمی نہیں، جنہیں دین کے بارے میں ادنیٰ معرفت رکھنے والا مسلمان بھی اپنی زبان پر لانا گوارہ نہیں کرتا۔ ان میں سے بعض مسائل شیعہ کے یہاں متفق علیہا ہیں اور بعض متنازع فیہا ہیں۔ ان میں سے چند مسائل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ شیعہ جمعہ و جماعت کے تارک ہوتے ہیں۔

۲۔ روافض مساجد کو ویران رکھتے ہیں جنہیں آباد کرنے اور ان میں جمعہ اور با جماعت نماز ر میں اللہ کا ذکر کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اور مقبروں کو رونق بخشتے ہیں۔ جن کا بنانا ہی اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے۔ ان قبروں اور درگاہوں کو مندر بنا لیتے ہیں۔ اور ان میں بعض لوگ ان درگاہوں کی زیارت کو حج کے برابر قرار دیتے ہیں۔ [2]

اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ رافضی عالم شیخ مفید نے 'مناسک حج المشاہد'' (حج قبور کے احکام) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو بالکل عیسائیوں کی کتابوں کی طرح کذب و شرک کا پلندہ ہے۔

۳۔ شیعہ یہودیوں کی ہم نوائی کرتے ہوئے مغرب کی نماز میں تاخیر کرتے ہیں۔

---

[1] جاہل شیعہ...... جو روافض کے مشہور علماء میں شمار ہوتا ہے، ..... اور اس کے نظائر و امثال کی افتراء پردازیوں نے علامہ ہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کو مجبور کیا کہ آپ شیعی فقہ کے رسوائے عالم مسائل و احکام کا راز طشت از بام کریں، چنانچہ آپ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف تحفہ اثنا عشریہ کے ساتویں باب میں از صفحہ ۱۰۸ تا ۲۴۷ (طبع سلفیہ) اس قسم کے سب مسائل جمع کر دیے ہیں، ان سطور کے قاری سے گذارش کی جاتی ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تنقیدات کا مطالعہ کرنے کے بعد تحفہ اثنا عشریہ میں شیعی فقہ کے اعجوبۂ روزگار اور حیران کن مسائل ملاحظہ کرے اور پھر شیخ الاسلام کے بیان کردہ حقائق سے ان کا موازنہ کرے۔

[2] عجیب بات یہ ہے کہ بعض قبروں میں وہ لوگ سرے سے مدفون ہی نہیں جن کے نام سے وہ مشہور ہیں مثلاً نجف میں حضرت علی کی قبر اور کربلا میں حضرت حسین کا مزار صرف اسی امکان کی بنا پر بنا دیا گیا کہ یہ دونوں حضرات وہاں مدفون ہیں، یہ تاریخی حقائق ہیں شیعہ کا ان سے انکار ایک جداگانہ امر ہے، لطف یہ ہے کہ مقبرے تعمیر کرتے وقت شیعہ اس حقیقت سے کلیۃً آگاہ تھے کہ وہ حضرات یقیناً ان میں مدفون نہیں اس کے باوجود وہ مزار تعمیر کرنے اور انہیں ان کے نام سے مشہور کرنے پر مُصر تھے۔

۴۔ اہل کتاب کا ذبیحہ روافض کے نزدیک حلال نہیں۔
۵۔ شیعہ کے نزدیک ایک مخصوص مچھلی [مرماہی اور جری] حرام ہے۔
۶۔ بعض شیعہ کے نزدیک اونٹ کا گوشت حرام ہے۔
۷۔ بعض شیعہ طلاق کے وقت گواہوں کی موجودگی کو شرط قرار دیتے ہیں۔
۸۔ مسلمانوں کے اموال میں سے اس کا پانچواں حصہ بطور خمس کے وصول کرتے ہیں۔
۹۔ شیعہ کے نزدیک سب ورثہ بیٹی کو ملے گا، اور میت کے چچا اور باقی عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا۔
۱۰۔ شیعہ ہمیشہ کے لیے دو دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔
۱۱۔ بعض شیعہ کے نزدیک روزوں کا انحصار دنوں کی تعداد پر ہے چاند پر نہیں۔ چاند نظر آنے سے پہلے روزہ رکھتے ہیں اور چاند نظر آنے سے پہلے عید کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے دیگر مسائل و احکام بھی ہیں جن کے بارے میں یقینی طور پر علم ہونے کے بعد بھی کہ یہ اس دین اسلام کے خلاف ہیں' جو دین دیکر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث فرمایا' اور آپ پر اپنی کتاب قرآن مجید نازل کی۔ [پھر بھی شیعہ ان پر عمل پیرا ہیں۔] ہم نے ابھی تک ان امور کا ذکر کیا ہے جو عقل و شریعت کی رو سے باطل ہیں۔ اگرچہ بعض متقدمین نے اس پر ان کی موافقت کی ہو' مثال کے طور پر:
۱۲۔ روافض کے نزدیک متعہ حلال ہے۔
۱۳۔ طلاق معلق بالشرط قصد و ارادہ کے باوجود واقع نہیں ہوتی۔
۱۴۔ جو طلاق کنایات سے دی جائے وہ واقع نہیں ہوتی اور اس میں گواہ بنانا شرط ہے۔

تیسرا جواب: [جو مسائل اہل سنت پر تھوپے جا رہے ہیں] ان کہنے والے فقہاء کے ہاں ان کا کوئی نہ کوئی ماخذ ہے؛ اگرچہ جمہور کے ہاں وہ خطا پر ہی کیوں نہ ہو۔ اہل سنت خود ان لوگوں کی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس وجہ سے حق و صواب ان کے ہاں سے باہر نہیں جا سکتا۔ حق و صداقت کا بیان ان ہی کے ساتھ لازم رہتا ہے۔

[شیعی اعتراضات کے جوابات]:

زنا سے پیدا شدہ بیٹی کو جمہور اہل سنت جیسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ -ایک روایت میں- بالاتفاق حرام قرار دیتے ہیں؛ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ امام احمد کا خیال نہیں تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی نزاع ہوگا؛ اس وجہ سے انہوں نے اس کے مرتکب کے واجب القتل ہونے کا فتوی دیا تھا۔ جن لوگوں نے اس کے جواز کا کہا تھا جیسے : امام شافعی اور ابن ماجشون ؛[انہوں نے اسے احکام وراثت پر قیاس کیا تھا؛ اس لیے کہ] ان کا خیال ہے کہ جب [زنا کی اولاد کو] وراثت نہیں مل سکتی ؛ تو اس کے باقی سارے احکام کی بھی نفی ہوگی۔ اس حرمت کا مسئلہ بھی ان ہی احکام میں سے تھا۔ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے' وہ کہتے ہیں: نسب کے احکام وراثت کے احکام سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض انساب کے لیے ایسے احکام ثابت ہوتے ہیں جو دوسرے بعض انساب کے لیے نہیں ہوتے۔ جب کہ تحریم کا لفظ ان تمام احکام کو بھی شامل ہے اگرچہ وہ مجازاً ہی اس کے دائرہ میں آتے ہوں۔ یہاں تک کہ گھر والی کی بیٹی بھی حرام ہو جاتی ہے [مراد لے پالک ہو سکتی ہے]۔ بلکہ رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں۔ تو پھر جو لڑکی اسی کے پانی سے

پیدا ہوئی ہو وہ حکم حرمت کی زیادہ حق دار ہے۔ بخلاف وراثت کے۔ وراثت ان لوگوں کے لیے ہی ثابت ہو سکتی ہے جنہیں میت کی طرف منسوب کیا جاتا ہو۔ پس وراثت بیٹوں کی اولاد کے لیے تو ثابت ہوتی ہے مگر بیٹیوں کی اولاد کے لیے نہیں۔

محرمات سے نکاح کرنے کی صورت میں صورتی عقد کی موجودگی میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حد شرعی کے قائل نہ تھے ان کی رائے میں شبہ کی بنا پر حد ساقط ہو جاتی ہے۔ جب کہ بقیہ ائمہ کرام رحمہم اللہ اسے شبہ نہیں قرار دیتے۔ بلکہ وہ فرماتے ہیں: اس میں حد مغلظ ہوگی۔ اس لیے کہ اس نے دو حرام کاموں کا ارتکاب کیا ہے: حرام عقد؛ اور وطی۔

اکثر ائمہ لواطت کنندہ کے مطلق قتل کے قائل ہیں۔ اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہو۔ بعض کے نزدیک اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اہل مدینہ جیسے: امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام احمد و شافعی سے بھی ایک روایت اسی کے مطابق منقول ہے۔ اس کے مطابق اگر لواطت کرنے والا بالغ ہو تو اسے قتل کیا جائے۔ امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ لواطت کی حد وہی ہے جو زنا کی ہے، امام ابو یوسف و محمد رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لواطت کرنے والا زانی کی طرح ہے۔ اور کہا گیا ہے: اسے مطلق طور پر قتل کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فاعل کے اعتبار سے اس میں فرق کیا جائے گا۔ حد شرعی کے اسقاط میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منفرد ہیں [اور اس مسئلہ میں دوسرا کوئی امام آپ کا ہم خیال نہیں]۔

اسی طرح مشرق میں سکونت رکھنے والی عورت کے بچے کا مغربی آدمی کے ساتھ الحاق بھی امام موصوف کا مسلک ہے اور دوسرے ائمہ اس کی تائید نہیں کرتے۔ دراصل امام صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ نسب کا اثبات صرف میراث حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، اس مقصود کے مطابق وراثت تقسیم کی جائے گی۔ جیسا کہ جب دو عورتیں ایک بچے کی وراثت کا دعوی کریں تو وہ وراثت ان دونوں کے درمیان تقسیم کی جائے گی؛ اس کے مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ ان دونوں عورتوں سے پیدا ہوا ہے۔

ایسے ہی جب کوئی انسان اپنی بیوی کو وطی سے پہلے طلاق دیدے؛ تو بچے کو اس کی طرف منسوب کیا جائے گا؛ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے وارث بنیں گے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ بچہ اس کے پانی سے پیدا ہوا ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے مذہب کی حقیقت یہ ہے کہ آپ نسب کے ثبوت کے لیے حقیقی ولادت کو شرط نہیں مانتے۔ بلکہ آپ کے نزدیک بیٹا خاوند کا ہوگا۔ جو کہ اصل میں صاحب فراش ہے۔ حالانکہ اسے قطعی یقین ہے کہ یہ عورت اس سے حاملہ نہیں ہوئی۔ [1]

یہ بالکل ویسے ہی ہے جب کوئی انسان اپنی دو بیویوں میں سے کسی ایک کو طلاق دے' اور خود مر جائے؛ یہ پتہ نہ چلے کہ اس نے کونسی بیوی کو طلاق دی ہے؟ تو اس کی وراثت دونوں بیوں میں تقسیم کی جائے گی۔ جبکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دونوں بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالا جائے گا۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس میں توقف کیا ہے' ان کے نزدیک کوئی فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک معاملہ واضح نہ ہو جائے یا پھر دونوں آپس میں صلح کر لیں۔ جب کہ جمہور علماء کرام رحمہم اللہ [اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی] مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بچہ اس کا نہیں ہے تو پھر نہ ہی اس سے نسب ثابت ہوگا اور نہ ہی کوئی دوسرا حکم۔ جب کہ امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بچے کی نفی کے باوجود

---

[1] اصل میں امام صاحب اس حدیث کے مطابق فیصلہ دے رہے ہیں جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے: بچہ چارپائی والے کا ہوگا؛ اور زنا کار کے لیے پتھر ہوں گے۔ مختصر الطحاوی۔

بعض احکام ثابت ہوتے ہیں ۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کا صلبی بچہ ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ فقہی مسائل غلط ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ جمہور ائمہ ان کے خلاف ہیں اور اگر درست ہیں تو اقوال اہل سنت سے خارج نہ ہوں گے۔

جیسا کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ: اگر کوئی انسان اپنے سے بڑی عمر کے غلام سے اگر یہ کہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔تو اسے اس غلام کے آزاد کرنے سے کنایہ سمجھا جائے گا؛ اس سے نسب ثابت نہیں ہوگا۔ جب کہ جمہور علماء کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں یہ ایسا اقرار ہے جس کا جھوٹ ہونا ظاہر ہے۔اس کی بنا پر کوئی بھی حکم ثابت نہیں ہوگا۔

پس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جو الزام لگایا جارہا ہے' اگر وہ حق ہے تو جمہور اہل سنت آپ کی موافقت کرتے ہیں۔اور اگر جھوٹ و باطل ہے تو اس سے باقی لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔حالانکہ الزام لگانے والا اس خیال سے الزام لگاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ اولاد اسی آدمی کے پانی سے ہے؛ اگرچہ اس کا اپنی بیوی سے اجتماع نہ بھی ہوا ہو۔ایسی بات تو انتہائی درجہ کا بیوقوف انسان بھی نہیں کہہ سکتا۔تو پھر ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق اس قسم کے الزام کو کیوں سچ سمجھا جاسکتا ہے ۔مگر آپ کا یہ خیال ضرور ہے کہ آپ ولادت کا نہیں؛ بلکہ نسب کا حکم لگاتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں آپ منفرد ہیں؛ جمہور نے آپ کی مخالفت کی ہے' اور اس قول کو مبنی بر خطاء کہا ہے۔

بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے شوہر کے لیے وطی ممکن ہونے کی صورت میں نسب ثابت ہونے کا حکم لگایا ہے؛ جیسے امام شافعی اور امام احمد کے بہت سارے ساتھی یہی کہتے ہیں۔ رحمہم اللہ۔

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں : نسب اس وقت تک ثابت نہیں مانا جائے گا جب تک ان دونوں کے مابین خلوت [دخول] حاصل نہ ہوجائے۔یہ امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا دوسرا قول ہے۔

ایسے ہی نبیذ سے نشہ کا مسئلہ بھی ہے۔جمہور اہل سنت والجماعت اسے حرام قرار دیتے ہیں ۔اور اس میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں ؛ یہاں تک کہ جو انسان تاویل کی وجہ سے اسے پی لے تو اس پر شراب پینے والے کی حد لگاتے ہیں۔نبیذ پینے والے کے فاسق ہونے کے بارے میں دو قول ہیں:

۱۔ ایسا انسان فاسق ہے؛ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے' اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔

۲۔ اس کو فاسق نہیں کہا جائے گا؛ یہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں یہ منقول ہے۔

محمد بن الحسن رحمہ اللہ نبیذ کو حرام کہتے ہیں۔یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے اہل انصاف کے ہاں مختار قول ہے؛ جیسے ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ وغیرہ۔

شیعہ مضمون نگار کی بوالعجبی ملاحظہ کیجئے کہ وہ کہتا ہے:'' نشہ میں مشترک ہونے کے باوجود نبیذ کو مباح کہتے ہیں۔''

ابھی تو وہ قیاس سے انکار کررہا تھا؛ اور ابھی قیاس کی مدد سے نبیذ کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف احتجاج کررہا ہے،اگر قیاس حق ہے تو اس کا انکار باطل تھا۔اور اگر قیاس باطل تھا تو اس کی حجت باطل ہوگئی۔

اس کے بجائے اگر حدیث:'' كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٍ وَكُلُّ خَمْرٍ حَرَامٌ ''[1] سے استدلال کیا ہوتا تو یہ زیادہ بہتر تھا۔

رہا نبیذ سے وضوء کا مسئلہ؛ تو جمہور علماء اس کا انکار کرتے ہیں۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔

---

[1] صحيح مسلم كتاب الاشربة- باب بيان ان كل مسكر خمر ، (ح:٧٥/ ٢٠٠٣)-

اس بارے نے آپ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو اس باب میں نقل کی گئی ہے۔حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے: "تمرۃ طیبۃ و ماء طھور ۔"

''کھجور پاکیزہ پھل ہے' اوراس کا پانی پاک ہے۔''

جمہور اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں: اگر یہ حدیث صحیح بھی ہوتب بھی آیتِ وضوء اور آیت تحریم خمر سے منسوخ ہوچکی ہے۔

کتے کا چمڑا اور دباغت کا مسئلہ:

رہا کتے کے چمڑے میں نماز کا مسئلہ؛ توامام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں کہ چمڑے کو دباغت دی گئی ہو۔علماء کی ایک جماعت کا یہی خیال ہے ۔آپ اس مسئلہ میں منفرد نہیں ہیں۔ان کی دلیل یہ حدیث نبوی ہے: "أَیُّمَا إِھَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَھُرَ۔"[1] (جو چمڑا بھی رنگا جائے وہ پاک ہوجاتا ہے)۔[عموم حدیث کے پیش نظر کتے کا چمڑا بھی دباغت سے پاک ہوجاتا ہے]۔

یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔یہ ان شنیع مسائل میں سے نہیں ہے۔اگر شیعہ سے اس کی حرمت کی دلیل طلب کی جائے تو بتا نہ سکے گا۔بلکہ اگر اس سے کتے کے حرام ہونے پر دلیل طلب کی جائے؛ تا کہ امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ایک قول پر رد کیا جا سکے۔اس لیے کہ امام مالک اپنے ایک قول میں کہتے کو مکروہ قرار دیتے ہیں؛ حرام نہیں کہتے؛ تو اس کا رد کرنا رافضی کے بس کی بات نہ ہوگی۔حالانکہ صحیح بات جس پر جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا مذہب یہی ہے کہ کتے اور دیگر باقی درندوں کا چمڑا دباغت دینے سے پاک نہیں ہوتا۔اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی ایک اسناد کے ساتھ منقول ہے کہ آپ درندوں کے چمڑوں کو دباغت دینے سے منع فرمایا کرتے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

" أَیُّمَا إِھَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَھُرَ۔"(جو چمڑا بھی رنگا جائے وہ پاک ہوجاتا ہے)۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ایسے ہی کتے کے حرام ہونے پر شرعی دلائل موجود ہیں۔لیکن ان امامیہ کے بس میں نہیں ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ سے وارد ہونے والے ایک قول پر رد کرسکیں۔

خشک گندگی پر بغیر کسی حائل کے نماز پڑھنے کا مسئلہ:

یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ یا ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا۔لیکن اگر زمین کو نجاست لگے جائے۔تو پھر سورج کی وجہ سے یا ہواؤں کی وجہ سے یا زمین میں تحلیل ہوجانے کی وجہ سے ختم ہوجائے تو اکثر لوگوں کا مذہب ہے کہ یہ زمین پاک ہوگئی ہے ؛ اور اس پر نماز پڑھنا جائز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔اور امام مالک رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں منقول ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کا پچھلا قول بھی یہی ہے۔یہ قول ان لوگوں کے قول کی نسبت زیادہ ظاہر و مقبول ہے جو اسے پاک نہیں مانتے۔

وہ قصہ جس میں رافضی نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق بادشاہ کے دربار میں نماز پڑھنے کا واقعہ بیان کیا

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الحیض۔ باب طھارۃ جلود المیتۃ بالدباغ(ح:٣٦٦) سنن ترمذی۔ کتاب اللباس ۔ باب ما جاء فی جلود المیتۃ اذا دبغت ، (ح:١٧٢٧) واللفظ لہ ....

ہے ۔ یہاں تک کہ حنفی بادشاہ نے اپنے مذہب سے رجوع کر لیا ۔ یہ قصہ اہل سنت والجماعت کا مذہب فاسد ہونے پر دلالت نہیں کرتا ۔ اس لیے کہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: حق ان سے خارج نہیں ہوسکتا ۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ: ان میں سے کوئی ایک خطا نہیں کرسکتا ۔ اس طرح کی نماز کا جمہور اہل سنت والجماعت انکار کرتے ہیں ۔

جیسا کہ امام شافعی ؛ امام مالک ؛ احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا مذہب ہے ۔ جس بادشاہ کا ذکر اس رافضی نے کیا ہے وہ محمد بن سبکتکین ہے ۔ اس نے رجوع بھی اس چیز کی طرف کیا تھا جس کا سنت نبوی ہونا اس کے لیے ظاہر ہوگیا تھا ۔ یہ بادشاہ نیک اور اچھے بادشاہوں میں سے تھا ۔ اہل بدعت اور خصوصاً رافضیوں پر بہت سخت تھا ۔ اس نے اپنے ملک میں روافض اور ان جیسے دوسرے لوگوں پر لعنت کرنے کا حکم جاری کر رکھا تھا ۔ مصر کے عبیدی حاکم نے اسے خط لکھ کر دعوت دی تھی ؛ اس نے اس کے ایلچی کے سامنے یہ خط جلا دیا ۔ اور اہل سنت والجماعت کی جو مدد کی وہ تاریخ میں مشہور و معروف ہے ۔

[غصب کی اباحت]

[اعتراض] : رافضی کا کہنا کہ: انہوں نے غصب کو مباح قرار دیا ہے ۔ اگر چہ غصب کرنے والا اس میں تبدیلی ہی کیوں نہ کر دے ۔ ان کا کہنا ہے: اگر چور کسی چکی پر پہنچ کر آٹا پیس لے تو وہ آٹے کا مالک قرار پائے گا ، اگر مالک آ کر اس سے جھگڑنے لگے تو ظالم ہوگا ، اور چور مظلوم ہوگا ۔ اگر وہ دونوں لڑنے لگیں اور چور مارا جائے تو وہ شہید تصور کیا جائے گا ، اگر چور مالک کو مار ڈالے تو چور پر قصاص یا دیت نہیں آئے گی ۔''

[جواب] : یہ مسئلہ جمہور اہل سنت والجماعت کا نہیں ہے ۔ یہ جس کسی نے بھی کہا ہے ؛ جمہور اس کے مخالف ہیں ۔ اور اس کے قول پر شرعی دلائل کی روشنی میں رد کرتے ہیں ۔ یہ بعض علماء کا قول ہے ۔ لیکن فقہاء کا اس غاصب کے بارے میں اختلاف ہے جس نے غصب شدہ چیز میں ایسی تبدیلی کر دی ہو جس کی وجہ سے اس کا نام ہی بدل جائے ۔ مثال کے طور پر دانے پیسنے کے بعد آٹا بن جاتے ہیں ۔ کہا گیا ہے کہ: '' یہ ایسے ہی ہے جیسے اس [غصب شدہ] چیز کو تلف کر دینا ۔ تو اس صورت میں اس غاصب پر غصب شدہ چیز کی قیمت ادا کرنا واجب ہوگی ۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے : بلکہ وہ چیز اپنے اصل مالک کی ملکیت پر باقی رہے گی ۔ اگر اس میں جو کچھ زیادتی ہوگئی ہے تو وہ مالک کے لیے ہے ؛ اور اگر کچھ کمی ہوگئی ہے تو اس کا تاوان غصب کرنے والے پر ہے ۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: مالک کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ اپنی چیز قبضہ میں لے لے ' اور جو کچھ اس میں کمی واقع ہوئی ہے ' اس کا غصب کرنے والے سے تاوان طلب کرے ۔ یا پھر اس کے متبادل کا مطالبہ کرے ؛ یا پھر یہ چیز غصب کرنے والے کے لیے چھوڑ دے ۔ امام مالک کے مذہب میں یہ مشہور قول ہے ۔ اگر مالک اپنی ہی چیز لے لے ' تو پھر کہا گیا ہے کہ: غصب کرنے والے نے اس میں جو تبدیلی کی ہے ' وہ اس میں شریک ہے ۔ اور ایک قول یہ ہے کہ: اب اس کا کچھ بھی حق باقی نہیں ۔

یہ اقوال امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کے مذاہب میں موجود ہیں ۔ پس رافضی جس نے اس کا انکار کیا ہے ؛ وہ جمہور اہل سنت کے مذہب کے خلاف کہہ رہا ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ: رافضی نے اس قول کے نقل کرنے میں جھوٹ بولا ہے ۔ اس نے کہا ہے کہ: '' اگر وہ دونوں آپس میں لڑ پڑیں تو مالک ، ظالم ہوگا ۔'' اس لیے کہ اگر مالک متاول ہو' اور اس قول کے علاوہ کسی دوسرے قول پر اعتقاد نہ رکھتا ہو تو وہ

ظالم نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی اس کے لیے لڑائی کرنا جائز ہے ۔ بلکہ جب ان دونوں کے درمیان تنازع پیدا ہو جائے تو انہیں چاہیے کہ اپنا معاملہ کسی ایسے انسان کے پاس لے کر جائیں جو ان کے درمیان فیصلہ کر سکے۔ ایسا اس صورت میں ہوگا جب مالک کو یقین ہو کہ یہ چیز بعینہ ہی اس کی ملکیت ہے؛اور دوسرے کا خیال ہو کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔

❀ مزید برآں ان دونوں باتوں میں بھی فرق کیا جائے گا کہ جو کوئی دانے غصب کر لے؛ اور پھر ان دونوں کا ان کے پینے پر اتفاق ہو جائے۔ اور جو کوئی دانے اسی غرض سے پیس رہا ہو کہ وہ انہیں اپنی ملکیت بنائے گا۔ اس صورت میں اس کے ارادہ کا الٹ معاملہ کر کے سد ذرائع کے طور پر سزا دی جائے گی۔

خلاصہ کلام ! جن مسائل کا رافضی مصنف نے انکار کیا ہے ؛ وہ تمام کے تمام امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں ۔سوائے زنا سے پیدا ہونے والی لڑکی کے‘ کسی مسئلہ میں کوئی امام ان کے ساتھ ان مسائل میں شریک نہیں ؛ اس لڑکی کے مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ ان کے ہمنوا ہیں ۔

اس شیعہ کو [بطور جواب یہ بھی] کہا جائے گا:'' شیعہ کہتے ہیں:'' امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب باقی تینوں ائمہ کے مذاہب میں سے صحیح تر مذہب ہے ۔اور تمہارا کہنا ہے کہ جب انسان کو بوجہ مجبوری مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک سے فتوی لینا پڑے تو اسے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر فتوی لینا چاہیے۔ اور شیعہ محمد بن الحسن کو امام ابو یوسف پر ترجیح دیتے ہیں ۔اس لیے کہ شیعہ حدیث وسنت سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی نفرت رکھتے ہیں جو حدیث وسنت پر زیادہ پابند ہوں ۔''

یہ مسائل جنہیں رافضی مصنف نے شمار کیا ہے‘ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں ہیں ۔ جب مذاہب اربعہ میں سے آپ کا قول ہی [شیعہ کے نزدیک] راجح ہے ؛ تو ان اقوال پر طعنہ زنی کرنا شیعہ مذہب میں تناقض کی دلیل ہے ۔ اس لیے کہ شیعہ تو آپ کے قول کو راجح کہتے ہیں‘ اور آپ کے مذہب کو باقی مذاہب پر فضیلت دیتے ہیں ۔ تو پھر اس مذہب کی وہ کمزوریاں اور نقص بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مذہب دوسرے مذاہب کی نسبت کمزور اور ناقص ہے ۔شیعہ سے اس قسم کی تناقض کا وقوع پذیر ہونا کوئی بعید نہیں ہے ؛ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی جہالت اور ظلم کی وجہ سے بلا علم اور بلا عدل تعریف بھی کرتے ہیں اور مذمت بھی کرتے ہیں ۔ اگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہی راجح تھا تو خاص اس مذہب کے جن کمزور مسائل کا ذکر شیعہ مصنف نے کیا ہے‘ جو کہ امام صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کے مذہب میں نہیں پائے جاتے ؛ تو اس سے شیعہ کے اقوال کا تناقض ظاہر ہو گیا ۔ اگر امام صاحب کا مذہب راجح نہیں تھا تو پھر اسے دوسرے مذاہب پر ترجیح دینا باطل تھا ۔تو ہر صورت میں لازم آتا ہے کہ شیعہ باطل پر ہوں ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیعہ خواہشات نفس کے مارے ہوئے جاہل لوگ ہوتے ہیں ؛ یہ ہر موقع پر ایسی بات کرتے ہیں جو ان کی غرض و غایت کے مناسب ہو ۔ بھلے وہ بات حق ہو یا باطل ۔

اس جگہ پر یہ اعتراض کرنے سے شیعہ مصنف کا مقصد تمام اہل سنت گروہوں کی مذمت کرنا تھا ۔ پس یہ لوگ ہر مذہب میں سے جس چیز کو مذموم خیال کرتے ہیں‘ اس کی مذمت کرنے لگ جاتے ہیں ۔ بھلے وہ اس کے نقل کرنے میں سچے ہوں یا جھوٹے ۔ اور بھلے وہ اپنی ذکر کردہ مذمت میں وہ حق پر ہوں یا باطل پر ۔ اگرچہ خود شیعہ کے مذہب میں پائے جانے والے عیب دوسرے کسی بھی مذہب میں پائے جانے والے عیوب سے بڑھ کر ہیں ۔

[زنا سے پیدا شدہ بیٹی کا مسئلہ اور دیگر مسائل]:

[اعتراض]: شیعہ کا کہنا ہے: اگر زانی گواہوں کو جھٹلا دے، تو اس پر حد لگائی جائیگی اور اگر ان کی تصدیق کر دے تو حد ساقط ہو جائیگی گویا مجرم کے اقرار جرم اور گواہوں کی گواہی کے باوجود اس پر حد نہیں لگائی جائیگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے؛ کہ جس کسی پر بھی زنا کی گواہی دی جائے اور وہ گواہوں کو جھٹلا دے تو گواہی ساقط ہوگی۔''

[جواب]: یہ قول بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اقوال میں سے ہے۔ جمہور علماء جیسے: امام مالک؛ امام شافعی؛ احمد بن حنبل وغیرہم رحمہم اللہ نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مخالفت بھی کی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ جب مجرم اقرار کر لے گا تو شہادت کا حکم ساقط ہو جائے گا بشرطیکہ وہ چار مرتبہ اقرار کر لے۔ بخلاف ازیں جمہور کہتے ہیں کہ:'' مجرم کے اقرار سے شہادت میں مزید پختگی پیدا ہو جاتی ہے؛ شہادت باطل نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اس کا اقرار گواہی کے موافق ہے؛ اس کے مخالف نہیں ہے؛ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گواہوں کی تعداد چار سے بڑھ جائے۔ یا جیسے کوئی چار بار سے زیادہ اقرار کر لے۔

خلاصہ کلام! یہ جمہور اہل سنت والجماعت کا قول ہے۔ اگر یہ حق ہے تو ان کا ہی قول ہے۔ اور اگر اس کے برعکس ہے تو پھر بھی قول حق وصواب ان کے پاس موجود ہے۔ پھر اس شیعہ سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: جمہور اہل سنت والجماعت ان مسائل کا انکار کرتے ہیں۔ اور ان کے کہنے والوں پر ایسے دلائل اور حجتوں سے رد کرتے ہیں جنہیں امامیہ نہیں جانتے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: [اہل سنت کے ہاں]'' کتے کا گوشت کھانا مباح ہے؛ غلام کیساتھ لواطت مباح ہے باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔ انکے علاوہ بھی ایسے مسائل ہیں جن کے بیان کا موقع یہ نہیں ہے۔''

[جواب]: تمام اہل سنت کی طرف منسوب کر کے یہ قول نقل کرنا؛ اور ایسے ہی اس قول کو جمہور کی طرف منسوب کرنا بھی جھوٹ ہے۔ بلکہ اس پیرائے میں بعض ایسے جملے موجود ہیں جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ماننے والوں نے کہے ہیں۔ اور بعض ان پر جھوٹ اور بہتان ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہے۔ جو جملے بعض لوگوں نے کہے ہیں جمہور اہل سنت والجماعت نے ان کا انکار کیا ہے' [اور اس پر سختی سے رد کیا ہے] اور وہ اس گمراہی پر یک زبان نہیں ہوئے [وللہ الحمد]۔

پھر اس کے برعکس بہت سے برے اور شنیع اقوال شیعہ مذہب میں موجود ہیں جو کہ کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف ہیں؛ جو کسی بھی دوسرے مسلمان گروہ میں موجود اقوال سے بڑھ کر برے اور گندے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے کسی بھی گروہ میں کوئی ایسا ضعیف قول نہیں پایا جاتا جس سے بڑھ کر ضعیف اور شنیع قول شیعہ مذہب میں موجود نہ ہو۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اہل سنت والجماعت کا ہر گروہ ہر حال میں شیعہ سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ شیعہ مذہب میں جس کثرت سے جھوٹ' تکذیب حق؛ کثرت جہالت؛ محال امور کی تصدیق؛ قلتِ عقل؛ غلو؛ اتباع ہوی؛ مجہولات سے تعلق [اور اس طرح کے دیگر مذموم امور] پائے جاتے ہیں' اس کی مثال کسی دوسرے فرقہ میں نہیں ملتی۔

غلاموں سے لواطت کے جواز کے بارے میں شیعہ کا بیان صریح جھوٹ ہے، علماء اہل سنت میں سے یہ کسی کا قول نہیں۔

میرا خیال ہے کہ شیعہ کا مقصد امام مالک رحمہ اللہ پر طعنہ زنی کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے دیکھا ہے بعض جہلاء نے امام مالک رحمہ اللہ کی طرف ایک ایسی روایت منسوب کی ہے۔ اس کی اصل عورتوں کے ادبار کے بارے میں ہے۔ اہل مدینہ کا ایک

گروہ اسے مباح سمجھتا تھا۔ جب امام مالک سے اس بارے میں دو قول نقل کیے گئے تو جاہل نے یہ سمجھا کہ آپ نے غلاموں کے ساتھ لواطت کو مباح قرار دیا ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے ۔ کوئی ادنی انسان بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا تو پھر امام مالک رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر اور صاحب شرف و منزلت عالم کے متعلق کیسے یہ تصور کیا جاسکتا ہے ۔ جب کہ آپ کے مذہب میں انسداد فواحش اور احکام سد ذرائع بکمال موجود ہیں ۔ اور یہ مذہب حدود قائم کرنے کے بارے میں سب سے زیادہ حریص ہے۔ منکرات اور بدعات کے انکار میں سب سے آگے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ بالاتفاق کہتے ہیں کہ: ''غلاموں سے لواطت کو حلال قرار دینے والا کافر ہے۔ یہ قول تمام ائمہ مسلمین کا ہے۔ لواطت کو حلال سمجھنے والا ایسے ہی ہے جیسے اپنی رضاعی بیٹی یا رضاعی بہن سے وطی کو حلال سمجھنے والا؛ یا پھر جو اپنے باپ یا بیٹے کی بیوی سے جماع کو حلال سمجھتا ہو۔ پس رضاعی بیٹی یا ایسی مملوکہ جس نے اس سے دودھ پیا ہو' یا رضاعت اور سسرالی تعلق کی وجہ نکاح باتفاق مسلمین مباح نہیں ہوتا۔ پس اس کا غلام بالاولی اس حرمت کا زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے کہ یہ جنس نہ ہی نکاح سے حلال ہوسکتی ہے اور نہ ہی ملک یمین سے؛ بخلاف عورتوں کی جنس کے۔

امام مالک اور علماء اہل مدینہ رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ لوطی کو رجم کرکے قتل کیا جائے۔ خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ۔ خواہ وہ اپنے غلام سے لونڈے بازی کرے یا کسی دوسرے سے ۔ ان علماء کرام رحمہم اللہ کے ہاں فاعل اور مفعول دونوں کے لیے قتل کیے جانے کا حکم ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کردو۔'' [رواہ ابو داؤد ٤/ ٢٢٠؛ والترمذي ٣/ ٨]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی حکم ہے؛ اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ پس جس کا مذہب یہ ہو کہ لواطت زنا سے زیادہ سخت اور بری چیز ہے تو پھر اس سے کیسے یہ حکایت نقل کی جاسکتی ہے کہ اس نے لواطت کو مباح قرار دیا ہے؟ ۔ ایسے ہی آپ کے علاوہ بھی کسی دوسرے عالم نے اس عمل کو مباح نہیں کہا۔ بلکہ ان سب کا اس فعل کے حرام ہونے پر اتفاق ہے۔ لیکن بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ علماء کرام کا ان کے حرام ہونے پر اتفاق ہوتا ہے؛ مگر اس کا ارتکاب کرنے والے پر حد قائم کرنے کے بارے میں ان کے مابین اختلاف ہوتا ہے کہ کیا اس پر حد لگائی جائے؟ یا پھر اسے تعزیر سے سزا دی جائے جو کہ حد سے کم ہو؛ جیسے کوئی اپنی ایسی مملوکہ سے وطی کردے جو اس کی رضاعی بیٹی بھی ہو؟ ۔

[شطرنج' گانے اور ساز کی اباحت کا الزام]:

[الزام]:[شیعہ مصنف نے کہا ہے: اہل سنت کے ہاں]''شطرنج باجے گاجے اور ساز وغیرہ اسباب غفلت مباح ہیں۔''

[جواب] : جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کے مذہب میں شطرنج حرام ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو شطرنج کھیل رہے تھے؛ تو آپ نے فرمایا: ''یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم جم کر بیٹھے ہو؟ ۔''

ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ؛ ابن عباس ؛ ابن عمر ؛ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس کی ممانعت منقول ہے ۔ لیکن اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ: ان میں سے کس کی حرمت زیادہ ہے شطرنج کی یا نرد کی؟

امام مالک رحمہ اللہ شطرنج کو نرد سے زیادہ سخت حرام سمجھتے ہیں ۔ یہی بات ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ اس لیے کہ شطرنج دل کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے مشغول کردیتا ہے۔ اور نرد سے بڑھ کر نماز اور ذکر الٰہی میں غفلت کا سبب بنتا ہے ۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک نرد کی حرمت شطرنج سے بڑھ کر ہے۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے شطرنج کو حلال نہیں کہا؛ لیکن آپ نے یہ کہا ہے: ''نرد حرام ہے اور شطرنج اس سے کم درجہ کا ہے۔ اور میرے لیے شرح صدر نہیں ہورہی کہ کیا یہ بھی حرام ہے؛ تو آپ نے اسے حرام کہنے میں توقف کیا ہے۔ جب کہ اس بارے میں آپ کے اصحاب کے دو قول ہیں۔ اگر تحلیل کا قول راجح ہو تو پھر بھی اس میں کوئی ضرر نہیں۔ اور اگر تحریم کا قول راجح ہو تو پھر بھی یہی جمہور اہل سنت والجماعت کا قول ہے۔ پس دونوں صورتوں میں حق اہل سنت والجماعت سے باہر نہیں۔

[الزام]: [شیعہ مصنف کہتا ہے: اہل سنت کے ہاں] ''باجے گاجے اور ساز وغیرہ مباح ہیں۔''

[جواب]: یہ ائمہ اربعہ پر جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ ائمہ اربعہ کا ساز و باجے اور آلات لہو لعب کے حرام ہونے پر اتفاق ہے۔ اگر کسی ان میں سے کوئی چیز ضائع کردی تو اس تلف کرنے والے پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ بلکہ ائمہ اربعہ کے ہاں ان چیزوں کا رکھنا بھی حرام ہے۔ لیکن کیا وہ اس کے مادہ کا تاوان ادا کرے گا۔ اس بارے میں ان کے دو مشہور قول ہیں؛ جیسا کہ اگر کوئی شراب کے برتنوں کو تلف کردے؛ اور اس کے ساتھ ہی شراب بنانے کے مادہ کو بھی تلف کردیا تو ایک قول کے مطابق اس پر کوئی تاوان نہیں ہوگا؛ جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے دو مشہور روایتوں میں سے ایک یہی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو تلف کردیا تھا جسے سونے سے بنایا گیا تھا۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو وہ رنگے ہوئے دو کپڑے جلانے کا حکم دیا؛ جو کہ آپ پہنے ہوئے تھے۔''❶

اور جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے موقع پر وہ ہانڈیاں توڑنے کا حکم دیا تھا جن میں گدھے کا گوشت پکا ہوا تھا۔ پھر ان کے لیے ہانڈیوں میں موجود سالن وغیرہ گرانے کی اجازت دیدی۔ تو حدیث دونوں باتوں کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اور شراب حرام ہونے کے موقع پر آپ نے وہ ڈول توڑنے اور مشکیں پھاڑنے کا حکم دیدیا تھا جن میں شراب ہوتی تھی ❷ اور حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہما نے وہ گھر جلانے کا حکم دیدیا تھا جہاں پر شراب فروخت ہوتی تھی۔

جو اس کو جائز نہیں کہتے: جیسے اصحاب امام ابو حنیفہ؛ امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ اپنے ایک قول میں۔

ان لوگوں کا کہنا ہے: یہ مالی عقوبات ہیں جو کہ منسوخ ہوچکی ہیں۔ جب کہ پہلے قول والے لوگ کہتے ہیں: ان میں سے کچھ بھی منسوخ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ نسخ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب بعد والی نص پہلی نص سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کوئی چیز شریعت میں وارد نہیں ہوئی۔ بلکہ مالی عقوبات بھی بدنی عقوبات کی طرح ہیں جنہیں مشروع طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ بلکہ مالی عقوبات نافذ کرنا بدنی عقوبات کی نسبت زیادہ اہم و اولیٰ ہیں۔ اس لیے کہ جان یا کسی انسانی عضو کا ضائع ہوجانا مال کے ضائع ہونے سے زیادہ خطرناک اور برا ہے۔ جب بدنی عقوبات و سزائیں بھی شریعت نے مقرر کی ہوئی ہیں تو پھر مالی عقوبات اور سزائیں بالاولیٰ مشروع ہیں۔

ایسے ہی علماء کرام کے مابین قصاص اموال کے بارے میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ جب کوئی انسان کسی کی قمیض پھاڑ دے تو کیا وہ بھی قصاص میں اس کی قمیض اتنی ہی مقدار میں پھاڑ دے؟ اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں:

---

❶ تفسیر ابن کثیر ٥/ ٣٤٢۔ مسلم ٣/ ١٦٤٧۔

❷ البخاری ٥/ ١٣٠؛ مسلم ٣/ ١٤٢٧۔

پس جس نے یہ کہا ہے: ایسا کرنا جائز نہیں؛ ان کا مقصد یہ ہے کہ: ایسا کرنے میں فساد ہے۔ اور جس نے کہا ہے: ایسا کرنا جائز ہے؛ تو اس نے جواب دیا ہے کہ انسانی جان یا عضو کو قصاص میں ختم کرنے میں اس سے بڑا فساد ہے؛ مگر ایسا کرنا بطور عدل اور قصاص کے جائز ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے لوگوں کو ظلم و سرکشی سے روکا جاتا ہے؛ اور مظلوم کے دل کے لیے تسلی کا سامان ہے۔ جو اس کو ناجائز کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ: اگر جان کے بدلے جان کی قصاص مشروع نہ ہوتی تو لوگ قتل کرنے سے نہ رکتے۔ اس لیے کہ قاتل کو علم ہوتا کہ جب وہ قتل کرے گا تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا' بلکہ وہ دیت ادا کردے گا؛ تو اس طرح وہ قتل کا ارتکاب کر کے دیت ادا کر دیتا؛ بخلاف اموال کے۔ جبکہ اموال تلف کرنے والے سے اس مال کی طرح کا مال لیا جاسکتا ہے۔ پس اس سے قصاص اور تنبیہ حاصل ہوجاتے ہیں۔ جب کہ مال کو ضائع کر دینے میں کوئی حکمت نہیں؛ اس لیے کہ جس کا مال ضائع ہوا ہے وہ اس کا ضرورت مند ہے۔ اور قصاص کی صورت میں اس کا مال بھی ضائع ہوجاتا ہے اور اس کا عوض بھی۔ اس میں مظلوم کی تسلی کے بجائے مزید غصہ کا سامان ہے۔ ہاں اگر یہ صورت حال ہو کہ اس سے قصاص اس کا مال تلف کیے بغیر لینا ناممکن ہو تو پھر اس کا جواز صاف ظاہر ہے۔ اس لیے قصاص لینا عدل ہے۔ اور برائی کا بدلہ اس جیسی برائی سے دیا جاسکتا ہے۔ پس جب کوئی انسان کسی کا مال ضائع کر دے؛ اور اس کا مال تلف کیے بغیر اس سے قصاص لینا ناممکن ہو تو پھر ایسا کرنا جائز ہوجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علماء کرام کفار کے درخت اور ان کی کھیتی باڑی ضائع کرنے پر متفق ہیں؛ لیکن یہ اس صورت میں ہوگا جب وہ ہمارے ساتھ ایسا کریں۔ یا جب کفار پر غلبہ حاصل کرنا اس کے بغیر ممکن نہ ہو۔ اور اس کے بغیر اگر غلبہ ممکن ہو تو پھر کھیتی باڑی ضائع کرنے کے جواز کے بارے میں اختلاف بڑا مشہور ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں' اور امام شافعی رحمہ اللہ اور دوسرے لوگ اسے جائز کہتے ہیں۔

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ لہو ولعب کے آلات ائمہ اربعہ کے ہاں معروف ہیں۔ اس بارے میں ان میں سے کسی ایک سے بھی کوئی اختلاف نقل نہیں کیا گیا؛ سوائے خراسان کے متأخرین شافعیہ کے۔ ان سے اس مسئلہ میں دو قول نقل کیے گئے ہیں' صحیح ترین قول اس کی حرمت کا ہے۔ جبکہ اہل عراق اور قدیم اہل خراسان سے اس بارے میں کوئی اختلاف نقل نہیں کیا گیا۔

جب کہ فقط مجرد گانا گانا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام مالک رحمہ اللہ؛ امام احمد رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق حرام ہے۔ اور ان دونوں ائمہ کے ایک قول میں مکروہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ صرف گانا گانا مباح ہے۔ اگر اس قول کو حق مان لیا جائے تو اس میں کوئی ضرر والی بات نہیں۔ اور اگر یہ قول باطل ہو تو پھر بھی جمہور اہل سنت والجماعت گانے کو حرام کہتے ہیں۔ پس حق اہل سنت والجماعت سے باہر نہیں ہے۔

❁❁❁❁

فصل:

[رافضی مذہب کے راجح ہونے کا شیعی دعوی اور اس پر رد]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''شیعہ امامیہ کے مذہب کے واجب الاتباع ہونے کی دوسری وجہ: ہمارے استاد محترم امام اعظم خواجہ نصیر ملت وحق ودین محمد بن حسن طوسی ❶ قدس اللہ روحہ کا وہ قول ہے میرے ان سے مذاہب کے بارے میں سوال کرنے پر ارشاد فرمایا: ہم نے اس حدیث پر غور کیا ہے کہ ''میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی؛ ان میں سے ایک فرقہ نجات پانے والا ہوگا باقی سارے جہنم میں جائیں گے۔'' نبی کریم ﷺ نے نجات پانے والے اور ہلاک ہونے والے فرقہ کو ایک دوسری متفق علیہ حدیث میں متعین کیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

''میرے اہل بیت کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی ہے۔ جو اس میں سوار ہوا وہ نجات پا گیا' اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہوگیا۔'' غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ امامیہ کا فرقہ ہی ناجی ہے کیونکہ یہ باقی سب فرقوں سے الگ تھلگ ہے۔'' باقی تمام مذاہب اصول وعقائد میں مشترک ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا سکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں کہ: اس امامی رافضی نے اس شخص کو کافر کہا ہے جو اللہ تعالیٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے۔ اس نے کہا ہے: ''......اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجب بالذات ہے مختار نہیں' تو اس سے کفر لازم آتا ہے۔''

جس شخص کو اس نے اپنا شیخ اعظم کہا ہے اور اس کا قول بطور حجت کے نقل کیا ہے' یہ استاد طوسی تو قدامت عالم کا قائل ہے اور اللہ تعالیٰ کو موجب بالذات تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی کتاب ''شرح الاشارات'' میں ذکر کیا ہے۔ تو شیعہ مصنف کے اس قول کی بنا پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے جس شیخ کے قول کو بطور حجت پیش کر رہا ہے؛ وہ کافر ہے۔ اور کافر کی بات دین اسلام میں قبول نہیں کی جاتی۔

دوسری وجہ: ہر خاص و عام سبھی لوگ جانتے ہیں کہ طوسی ''الموت'' کے قلعہ میں ملحد اسماعیلیہ باطنیہ کا وزیر تھا۔ پھر جب ترک مشرکین نے مسلمانوں کے ملک پر حملہ کیا اور دار الخلافہ بغداد کی طرف پیش قدمی کی تو ترکوں کے مشرک بادشاہ ہلاکو خان کا مشیر اور نجومی بن گیا۔ اس نے ہلاکو خان کو خلیفہ وقت اور علماء دین کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ اور ان لوگوں کو باقی رکھنے کا کہا جو اہل حرفہ؛ صناعت گر اور تاجر وغیرہ ہوں' تاکہ ان سے دنیاوی امور میں فائدہ حاصل کیا جائے۔ اس نے مسلمانوں کے اوقاف پر قبضہ کرلیا۔ جس سے اس نے مشرکین کے علماء اور ان کے مشائخ ؛ جادوگروں اور ان جیسے دوسرے گندے لوگوں کو نوازنا شروع کیا؛ اور اتنا نوازا کہ اس کی صحیح مقدار کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

❶ یہ وہی خواجہ نصیر الدین طوسی ہے، جو اعداء اسلام ابن عـلقمی اور ابن ابی الحدید کے ساتھ اس عدیم المثال مسلم کشی وخونریزی میں برابر کا شریک ہے جو ہلاکو نے ۶۵۵ ھ میں دار السلام بغداد کے عظیم شہر میں بپا کی۔ طوسی کے الحاد وفساد اور اسلام اور مسلمانوں سے اس کی خیانت کاری سے متعلق قبل ازیں حاشیہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جس کتاب کی تردید کر رہے ہیں اس کا مصنف ابن المطہر اور اس کے ہم نوا عداوت صحابہ میں طوسی اور اس کے نظائر و امثال ہی کے مقلد اور زلہ ربا ہیں۔

اسی طوسی نے صابی مشرکین کی راہوں پر مراغہ کے مقام پر سرائے تعمیر کروائی؛ اس سرائے سے سب سے کم وہ لوگ فائدہ اٹھاسکتے تھے جو اہل ملت یا ان کے قریب تر ہوں۔ اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے صابی اور معطلہ مشرکین تھے۔

طوسی اور اس کے متبعین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسلام کو صرف بطور پردہ اور ڈھال کے استعمال کرتے تھے۔ نماز اور دیگر فرائض شریعت کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں جیسے فحاشی؛ زنا' شراب اور دوسری برائیوں سے رکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں کہا جاتا رمضان کے دنوں میں بھی شراب پیتے؛ حرام کاری کرتے اور نمازیں ضائع کرتے ہیں۔ اہل علم پر یہ باتیں مخفی نہیں ہیں۔ ان کی اپنی ذات قوت اور شوکت نہیں تھی؛ بلکہ مشرکین کے سہارے پر چلتے تھے؛ جن کا دین یہود و نصاری کے دین سے برا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جیسے جیسے مغلوں میں اسلام پھیلنے اور مضبوط ہونے لگا تو ان کی شان وشوکت دم توڑتی چلی گئی؛ اس لیے کہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام سے سخت بغض ونفرت رکھتے تھے۔ اسی بنا پر امیر نوروز جو کہ سچا مسلمان بادشاہ اور اللہ کی راہ کا سچا مجاہد تھا؛ جس نے مغل بادشاہ غازان کو اسلام کی دعوت دی۔ اور اس نے عہد کیا کہ اگر وہ مسلمان ہوگیا تو وہ اس کی مدد کریگا' جس نے جادوگروں اور بخشیہ وغیرہ مشرکین کو قتل کیا؛ ان کے مندر و معبد ہدم کیے؛ بت توڑے؛ اور یہود و نصاری پر جزیہ نافذ کیا؛ اس کی وجہ سے مغلوں میں اسلام پھیلا اور غالب ہوا؛ اس بادشاہ کے ہاں ان روافض کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

بہر کیف خواجہ طوسی اور اس کے اتباع کا معاملہ کچھ ڈھکا چھپا نہیں سب مسلمان اس کی بدکرداریوں سے آگاہ ہیں۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ نصیر الدین طوسی اپنی زندگی کے آخری دور میں بہت بدل گیا تھا اور پابندی سے نماز پڑھنے لگا تھا، وہ مشہور محدث وفقیہ امام بغوی کی تفسیر قرآن اور فقہ کا مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔ [1]

اگر اس نے واقعی اپنے الحاد سے توبہ کرلی تھی تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہ معاف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾

''فرما دیجیے: اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بیشک اللہ سب کے سب گناہ بخش دیتا ہے۔'' [الزمر ۵۳]

لیکن جو کچھ اس کے بارے میں نقل کیا گیا ہے؛ اگر یہ توبہ سے پہلے کا ہے' تو اس کا قول قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر یہ توبہ کے بعد کے واقعات ہیں تو پھر اس نے رافضیت سے سچی توبہ نہیں کی تھی۔ بلکہ ممکن ہے صرف الحاد سے توبہ کی ہو [اور رافضیت پر باقی رہا ہو]۔ ہر دو صورتوں میں اس کی بات ناقابل قبول ہے۔

ظاہر بات تو یہ ہے کہ یہ مغل بادشاہ کا نجومی تھا؛ اور اہل الحاد و مشرکین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

[اس کی توبہ کی روایت کے کوئی ثقہ راوی نہیں مل سکے]۔

[1] اگر طوسی کی زندگی میں انقلاب و اصلاح کی یہ خبر درست ہے تو اسے چاہیے تھا کہ وہ ان کفریات سے اعلانیہ توبہ کرتا جن سے اس کی کتاب زندگی لبریز ہے۔ اس نے تا زیست اعلانیہ جس کفر اور اللہ و رسول ﷺ نیز مسلمانوں کے خلاف جس خیانت کاری کا ارتکاب کیا اس سے خاموشی کے ساتھ تائب ہو جانا کمال توبہ کی دلیل نہیں۔ اور اگر اس کے سوا اس کا اور کوئی گناہ نہ ہوتا کہ اس نے ابن المطہر جیسے غالی شیعہ کے دلوں کو عداوت و بغض صحابہ سے بھر دیا تو لازم تھا کہ وہ اعلانیہ اپنی توبہ کا اس طرح اظہار کرتا جو ابن المطہر جیسے لوگوں پر ایک واضح حجت ہوتا۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو انسان حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان اور ان کے علاوہ دیگر سابقین اولین مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر جرح وقدح کرتا ہے؛ امام مالک؛ شافعی؛ ابوحنیفہ اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے لوگوں پر اور ان کے ماننے والوں پر طعن وتشنیع کرتا ہے اور انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے عار دلاتا ہے' جیسے شطرنج اور گانے کو مباح کہنا۔ اسے کیسے یہ گوارا ہوگیا کہ وہ ان لوگوں کی باتیں بطور حجت کے پیش کرے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے' اور نہ ہی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں۔ نہ ہی اللہ کے دین حق کو قبول کرتے ہیں۔ اور ان حرام چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں جنہیں حرام کہنے پر پوری امت کا اتفاق ہے؛ جیسے زنا کاری اور شراب نوشی؛ اور پھر وہ بھی رمضان کے دنوں میں؛! اور نمازیں ضائع کرنا' شریعت محمدی میں نقب زنی کرنا؛ محرمات دین کو حقیر سمجھنا؛ اور مؤمنین کی راہ چھوڑ کر مشرکین کی راہ اختیار کرنا۔ رافضیوں کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ سے اولیاء اور پرہیزگار و پارسا لوگوں صحابہ کرام مہاجرین و انصار اور سابقین اولین رضی اللہ عنہم اجمعین کے دشمن رہے ہیں۔ اور کفار ومنافقین سے ان کی دوستی رہی ہے۔

اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والوں میں سب سے بڑے منافق ملحد باطنی اسماعیلیہ ہیں۔ پس جو کوئی اپنے قول کی تائید میں ان کے اقوال بطور حجت کے پیش کرے؛ حالانکہ وہ اس سے پہلے ائمہ اسلام پر طعنہ زنی کر چکا ہے؛ تو ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑھ کر اہل نفاق سے دوستی رکھنے والا اور اہل ایمان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

[[باقی رہا یہ قول کہ: ''شیعہ باقی فرقوں سے الگ تھلگ ہیں۔''

ہم کہتے ہیں کہ: [محض ژاژ خائی ہے]: اسی طرح خوارج و معتزلہ بھی باقی فرقوں سے منفرد ہیں اس میں شیعہ کی کیا خصوصیت ہے، اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ شیعہ اپنے افکار و آراء میں منفرد ہیں تو یہ غلط ہے اس لیے کہ وہ مسئلہ تقدیر و توحید میں معتزلہ اور جہمیہ کے ہم نوا ہیں، پھر شیعہ کا باہمی جدل ونزاع سب اسلامی فرقوں پر سبقت لے گیا ہے اور ہم اس کی تفصیل بیان کرنے سے قاصر ہیں]]۔

طوسی کے متعلق ابن المطہر کی رائے:

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ یہ خبیث کذاب رافضی (ابن المطہر) جب سابقین اولین خلفاء راشدین ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین کرام اور دیگر ائمہ مسلمین اہل علم و دیندار لوگوں کا ذکر کرتا ہے تو ان کے خلاف من گھڑت کذب و دروغ کا طوفان کھڑا کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے طوسی کا تذکرہ چھیڑتا ہے، تو اسے ''شَیْخُنَا الْاَعْظَمْ'' اور قَدَّسَ اللّٰهُ رُوْحَهٗ'' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ پھر اسی شیخ الاعظم اور اس کے امثال پر کفر کا فتویٰ بھی لگاتا ہے۔ اور اگلے اور پچھلے دور کے بہترین اہل ایمان پر لعنت بھی کرتا ہے۔ یہ لوگ دراصل مذکورہ ذیل آیت قرآنی کے مصداق ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ وَ يَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ☆ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا﴾ (النساء: ۵۱۔۵۲)

''کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے؟ جو بت پرستی کا اور باطل معبود کا اعتقاد رکھتے ہیں اور کافروں کے حق میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان والوں سے زیادہ راہ راست پر ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ

نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ تعالیٰ لعنت کر دے تو آپ اس کا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔''

بیشک امامیہ فرقہ والوں کو کتاب اللہ کے بعض اجزاء پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے۔ اور ان میں طاغوت پر ایمان اور جادوگری کے شعبے بھی پائے جاتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ جس کی بھی بندگی کی جائے اس کو طاغوت کہتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے فلسفہ کی تعظیم کرتے ہیں اور مردوں کو پکارتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ قبروں پر درگاہیں تعمیر کرتے ہیں۔ ان قبروں کی زیارت کے سفر کو حج سے تعبیر کرتے ہیں؛ انہوں نے کتابیں تحریر کی ہیں: ''درگاہوں کے حج کے ارکان۔''

ہم سے بعض ثقہ لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ان شیعہ وروافض میں ایسے لوگ بھی ہیں جو درگاہوں کے حج کو بیت اللہ کے حج سے زیادہ باعث اجر وثواب سمجھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت سے عظیم تر اور اعلی سمجھتے ہیں۔ یہ طاغوت پر ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

شیعہ قدوم عالم اور ستاروں کے پجاریوں؛ اور مشرکین کو کافر کہنے کا انکار کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ پس بیشک یہ لوگ ان ملحدین اور مشرکین کو مہاجرین وانصار سابقین اولین اور تابعین کرام پر فضیلت دیتے ہیں۔ نیز مسلمانوں کو قتل کرنے کے لیے رافضیوں کی یہود ونصاری اور مشرکین کے ساتھ گٹھ جوڑ اتنی ظاہر وعام ہے کہ ہر خاص وعام اسے جانتا ہے۔ یہاں تک کہ کہا گیا ہے:

کبھی بھی مسلمانوں اور یہودیوں' مسلمانوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں اور مشرکین کی کوئی جنگ نہیں ہوتی مگر رافضی یہود ونصاری اور مشرکین کے ساتھ ہوتے ہیں۔

تیسری وجہ: یہ بات طے شدہ ہے کہ اسماعیلیہ اور نصیریہ میں سے ہر ایک گروہ شیعیت کا اظہار کرتا ہے۔ اگرچہ وہ باطن میں پکے کافر اور ہر ملت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ نصیریہ غالی رافضیوں میں سے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِلٰہ مانتے ہیں۔ یہ گروہ باتفاق مسلمین یہود ونصاری سے بڑے کافر ہیں۔

اسماعیلیہ باطنیہ ان سے بھی بڑے کافر ہیں۔ ان کے عقیدہ کی حقیقت تعطیل پر مبنی ہے۔ ان کے ناموس اکبر اور بلاغ اعظم جو کہ ان کے ہاں سب سے بڑا مرتبہ مانا جاتا ہے۔ ان کا شمار دھریوں میں ہوتا ہے جو کہتے ہیں: اس عالم کا بنانے والا کوئی بھی نہیں۔ نہ ہی عالم کو پیدا کرنے کی کوئی علت ہے اور نہ ہی کوئی پیدا کرنے والا خالق۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ: ''ہمارے اور فلاسفہ کے مابین صرف واجب الوجود کا اختلاف ہے۔ فلاسفہ اسے ثابت کرتے ہیں' حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خصوصی طور پر ''اسم جلالہ ''اللہ'' کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو اپنے پاؤں کے نیچے لکھتے ہیں تاکہ انہیں روند سکیں۔

ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ سابق اور لاحق کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جنہیں فلاسفہ عقل اور نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور مجوسی اسے نور اور ظلمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے لیے صابئیت اور مجوسیت کے عقائد سے ایک مذہب ترکیب دیا ہے جسے وہ شیعیت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مجوسی اور صابی یہود ونصاری سے برے ہیں؛ مگر انہوں نے شیعیت میں خود کو ظاہر کیا۔

ان کا کہنا ہے: تمام گروہوں میں سے شیعہ سب سے جلدی ہماری دعوت قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان

لوگوں میں شریعت سے خروج پایا جاتا ہے ؛ اور اس گروہ میں جہالت اور مجہول چیزوں کی تصدیق پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے ائمہ باطن میں فلاسفہ ہوا کرتے تھے ؛ جیسے مذکورہ بالا شخص نصیر طوسی وغیرہ۔ اور سنان بصری' جس نے شام کے علاقہ میں اپنے قلعے بنا لیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ: ان لوگوں سے نماز و روزہ و زکوۃ اور حج کے احکام ختم کر دیے گئے ہیں۔

اسماعیلیہ اپنے آپ کو شیعیت کے لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہ لوگ شیعیت کے راستہ سے ہی اسلام میں داخل ہوئے اور اسی راستہ سے اسلام سے نکل گئے۔ اسماعیلیہ فرقہ والے روافض کی طرف مہاجر اور ان کے انصار ہیں؛ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے انصار نہیں ہیں ؛ تو اس سے پتہ چلا کہ روافض کے حق میں اسماعیلیہ کی گواہی کہ وہ حق پر ہیں باتفاق عقلاء مردود ہے۔ اس لیے کہ یہ گواہ: اگر یہ بات جانتا ہے کہ وہ جس دین وعقیدہ پر ہے وہ باطن میں دین اسلام کے خلاف ہے؛ مگر وہ شیعیت کا اظہار اس لیے کرتا ہے تاکہ مسلمانوں کے سامنے منافقت کا مظاہرہ کر سکے ؛ تو اس صورت میں یہ انسان شیعہ کی تعظیم بیان کرنے کے لیے محتاج ہے۔ تو اس کی گواہی ایسے ہی ہے جیسے کوئی انسان اپنے نفس کے لیے گواہی دے۔ [کسی آدمی کی اپنی ذات کے لیے گواہی نا قابل قبول ہے]۔ لیکن اس گواہی میں گواہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ درایں حال وہ ویسے جھوٹا ہے جیسا کہ وہ باقی احوال و امور میں جھوٹ بولتا ہے۔

اور اگر وہ باطن میں دین اسلام کا عقیدہ رکھتا ہے' مگر یہ خیال کرتا ہے کہ یہی روافض دین اسلام پر ہیں۔ تو پھر بھی یہ اپنی ذات کے لیے گواہی دینے والا ہے؛ مگر اب اس کی گواہی جہالت اور گمراہی پر مبنی ہے۔ پس دونوں صورتوں میں کسی انسان کی اپنی ذات کے لیے گواہی نا قابل قبول ہے۔ خواہ اسے اپنے جھوٹ کا علم ہو یا وہ اپنے سچا ہونے کا یقین رکھتا ہو۔ جیسا کہ سنن میں نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

''جھگڑا کرنے والی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اپنے مسلمان بھائی سے حسد رکھنے والے اور کینہ وعداوت رکھنے والے کی گواہی جائز نہیں ہے۔'' [المسند ١٠/ ٢٢٤]

اسماعیلیہ جھگڑالو فریق اہل سنت والجماعت سے حسد کرنے اور بغض رکھنے والے ہیں؛ انکی گواہی ہر لحاظ سے مردود ہے۔

چوتھی وجہ: پہلے ان سے کہا جائے گا: ''تم تو ایسی احادیث سے استدلال نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ احادیث اہل سنت نے اپنی اسناد سے روایت کی ہیں۔ یہ حدیث بذات خود صحیحین میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس حدیث پر بعض محدثین جیسے ابن حزم وغیرہ نے جرح بھی کی ہے۔ لیکن اس حدیث کو روایت کرنے والے اصحاب سنن جیسے ابوداؤد' ترمذی؛ ابن ماجہ وغیرہ' اور اہل مسانید جیسے امام احمد وغیرہ محدثین ہیں۔ تمہارے اصولوں کے مطابق یہ حدیث ثابت کہاں ہے جو تم اسے بطور حجت پیش کرتے ہو؟۔ اور اگر اس کو ثابت مان بھی لیا جائے تو پھر بھی یہ روایت خبر واحد ہے۔ تو پھر تمہارے لیے کہ کیسے روا ہو گیا کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کیلئے تم اصول دین میں سے ایک اصل پر ایسی خبر واحد سے حجت پیش کرو جسے فروعات علمیہ میں بھی بطور حجت پیش نہیں کیا جاتا۔ یہ تمہاری سب سے بڑی جہالت اور بہت بڑا تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟۔

[زیر بحث حدیث کی تشریح]:

پانچویں وجہ: اس حدیث کی تفسیر وتشریح دو طرح سے کی گئی ہے:

پہلی صورت: نبی کریم ﷺ سے نجات پانے والے فرقہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

'' نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو اس راہ پر ہو جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ ہیں ۔''

اور دوسری روایت میں ہے: '' وہ جماعت ہیں ۔''

دونوں تفسیروں کی روشنی میں امامیہ کے قول میں تناقض پایا جاتا ہے ۔ اور اس کا تقاضا ہے کہ یہ لوگ فرقہ ناجیہ سے خارج ہوں ۔ اس لیے کہ امامیہ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ یہ لوگ اس جماعت کے ائمہ جیسے: حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر اور فاسق کہتے ہیں ؛ حضرت معاویہ اور خلفاء بنو امیہ اور بنو عباس کو تو چھوڑیے ؛ ان کی بات ہی علیحدہ ہے ۔ ایسے ہی امامیہ اہل سنت والجماعت کے ائمہ و علماء اور عباد و زھاد جیسے: امام مالک ' ثوری ؛ اوزاعی ؛ لیث بن سعد ؛ ابوحنیفہ ؛ شافعی ؛ احمد ؛ اسحق ؛ ابوعبید ؛ ابراہیم بن ادہم ؛ فضیل بن عیاض ؛ ابوسلیمان دارانی ؛ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہم ؛ اور ان جیسے دیگر لوگوں کو کافر و فاسق کہتے ہیں ۔ جب کہ یہ لوگ بذات خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی سیرت کی معرفت اور ان کی اقتداء سے بہت دور ہیں ۔ یہ باتیں ہر وہ شخص جانتا ہے جسے حدیث اور منقولات کا علم ہو ۔ اور ثقہ اور ضعیف راویوں کی معرفت حاصل ہو ۔

امامیہ تو ان علوم سے کورے اور بہت دور ہیں ۔ حدیث سے بغض رکھنے کی وجہ سے سب سے بڑے جاہل شمار ہوتے ہیں اور محدثین اور اہل سنت سے دشمنی میں بڑھے ہوئے ہیں ۔

پس اگر نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کا مقتدا اور پیروکار ہو ؛ تو پھر یہی تو اہل سنت والجماعت کا شعار ہے ۔ اس بنا پر نجات پانے والی جماعت اہل سنت والجماعت ہیں ۔ سنت اس چیز کو کہتے ہیں : جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ گامزن ہوں ۔ جس چیز کا آپ نے حکم دیا ہو' یا جس کو برقرار رکھا ہو' یا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو ۔ جماعت وہ لوگ ہیں جو اپنے دین کا شیرازہ بکھیر کر ٹولے ٹولے نہیں ہو گئے ' بلکہ وہ ایک چیز پر جمع رہے ۔ جن لوگوں نے دین میں تفرقہ ڈالا اور شیعہ [ٹولہ] بن گئے ' وہ اس جماعت سے خارج ہیں ' اور اللہ اور اس کا رسول ان سے بری ہیں ۔ تو معلوم ہوا کہ نجات یافتہ ہونا اہل سنت والجماعت کا وصف ہے ؛ رافضہ کا وصف نہیں ۔ اس حدیث میں فرقہ ناجیہ [اہل سنت والجماعت] کے اوصاف اتباع سنت اور صحابہ کرام کی راہ پر گامزن رہنے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ چپکے رہنے کی وجہ سے بیان ہوئے ہیں ۔

[**احتمال**]: اگر کہا جائے : حدیث میں آیا ہے: '' جو اس راہ پر ہو جس پر آج کے دن میں اور میرے صحابہ ہیں ۔'' پس جو لوگ اس کے بعد اس طریقہ سے نکل گئے ' تو وہ فرقہ ناجیہ میں سے نہیں ہوں گے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سارے لوگ مرتد ہو گئے تھے پس اس بنیاد پر وہ نجات پانے والے فرقہ میں سے نہیں ہوں گے ۔''

[**جواب**]: اس میں کوئی شک نہیں یہ درست بات ہے ؛ ارتداد میں سب سے مشہور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مخالفین ہیں ' جن سے آپ نے جنگیں لڑیں ۔ ان میں مسیلمہ کذاب اور اس کے اتباع وغیرہ شامل ہیں ۔ ان لوگوں سے تو رافضی محبت کرتے اور دوستی رکھتے ہیں ؛ جیسا کہ کئی ایک رافضی مشائخ نے واضح کیا ہے ۔ خود اس امامی شیعہ مصنف کا بھی عقیدہ ہے ۔ یہ مرتدین کے بارے میں کہتے ہیں : وہ حق پر تھے ۔ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں ناحق قتل کیا ہے ۔ پھر لوگوں میں سب سے بڑے مرتد وہ غالی شیعہ تھے جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت آگ میں جلا ڈالا تھا جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق الہ [یعنی رب] ہونے کا دعویٰ کیا ۔ یہ لوگ فرقہ سبائیہ سے تعلق رکھتے تھے جو عبداللہ بن سباء یہودی کے پیروکار تھے جس نے سب سے

پہلے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں دینا شروع کی تھیں۔

خود کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والوں میں سب سے پہلے جس نے نبوت کا دعوی کیا تھا وہ مختار بن ابوعبید ثقفی تھا؛ اس کا تعلق شیعہ سے تھا۔ معلوم ہوا کہ لوگوں میں سب سے بڑے مرتد شیعہ کی صفوں میں موجود ہیں۔ اس لیے نصیریہ باطنیہ شیعہ اور اسماعیلیہ ملحدہ سے بڑھ کر بدحال مرتدین کا علم نہیں ہوسکا۔ جب کے مرتدین کے ساتھ قتال میں سب سے مشہور ہستی جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ ان مرتدین کے علاوہ کسی بھی گروہ میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دشمن نہیں پاؤ گے۔ پس اس سے دلیل واضح ہوگئی ہے کہ جو مرتدین ہمیشہ سے اپنی ایڑیوں کے بل پھرتے رہے؛ وہ اہل سنت والجماعت کی نسبت رافضہ کے زیادہ قریب ہیں۔

یہ معاملہ ہر اس انسان کے لیے واضح ہے جسے اسلام اور مسلمانوں کی ادنی سی معرفت حاصل ہو۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ مرتد جو اپنے آپ کو شیعیت کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ ان مرتدین سے بڑے کافر اور ظالم ہیں جو اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ اگر ایسے کوئی مرتد ہوں؛ [لیکن ایسا ہے نہیں]۔

چھٹی وجہ: یہ دلیل جس سے طوسی نے امامیہ شیعہ کے فرقہ ناجیہ ہونے پر استدلال کیا ہے؛ اس نے اس کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اور خود یہ دلیل بھی اس استدلال میں باطل ہے۔ شیعہ کہتا ہے:

''امامیہ باقی تمام مذاہب سے جدا ہیں' اور باقی تمام مذاہب اصول عقائد میں مشترک ہیں۔''

اگر جدا ہونے سے شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ اپنے مخصوص مسائل میں باقی فرقوں سے جدا ہیں؛ تو تمام فرقوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے [اس میں شیعہ کی کوئی خصوصیت نہیں]۔ اس لیے کہ خوارج بھی اپنے مخصوص مسائل میں باقی تمام فرقوں سے جدا ہیں جیسے کہ وہ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے تکفیر کرتے ہیں؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کفر کا فتوی لگاتے ہیں؛ اور جس چیز کی خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ دی گئی ہو' اس میں رسول کی اطاعت کو ساقط شمار کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے حکم؛ تقسیم اور دیگر امور میں ظلم کو جائز کہتے ہیں۔ اور ان متواتر سنتوں کو نہیں مانتے جو ان کے خیال میں ظاہر قرآن کے مخالف ہیں؛ جیسے: چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا؛ اور اس طرح کے دیگر امور۔

علامہ اشعری رحمہ اللہ اپنی کتاب ''المقالات'' میں فرماتے ہیں: ''خوارج کا اجماع ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تحکیم کے قضیہ کے بعد کافر ہوگئے تھے۔ مگر اس بارے میں ان کا اختلاف ہے کہ کیا آپ کا کفر شرک بھی تھا یا نہیں؟۔

نجدات کے علاوہ باقی تمام خوارج کا اتفاق ہے کہ ہر کبیرہ گناہ کفر ہے۔ نجدات کبیرہ گناہوں کو کفر نہیں کہتے۔ اور ایسے ہی نجدات کے علاوہ باقی تمام خوارج کا اجماع ہے کہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا عذاب دیگا۔

ایسے ہی معتزلہ بھی اپنے مخصوص مسائل میں باقی تمام فرقوں سے جدا ہیں۔ مثال کے طور پر وہ دو منزلوں کے درمیان میں ایک منزل کا عقیدہ رکھتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کہ: ''کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا''۔ کیونکہ یہ لوگ نہ ہی مؤمن ہیں اور نہ ہی کافر۔ یہی وہ قول ہے جو اصل میں معتزلہ کا عقیدہ تھا؛ اور بعد میں ان سے زیدیہ نے لیا۔

ایسے ہی سنت اور اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب لوگوں میں سے بھی ہر ایک جماعت اپنے مخصوص مسائل میں دوسری جماعت سے جدا ہے۔ کلابیہ اپنے اس قول میں تمام لوگوں سے جدا ہیں کہ: کلام کا ایک ہی معنی ہے؛ یا متعدد معانی ہیں؛

یا تین چار معانی ہیں جو کہ متکلم کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔اس سے مراد امر و نہی اور خبر ہیں۔اگر اسے عربی میں تعبیر کیا جائے تو اس سے مراد قرآن ہے؛ اور اگر اسے عبری زبان میں تعبیر کیا جائے تو اس سے مراد تورات ہے۔ یہ بات باقی فرقوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہی۔

کرامیہ اپنے مخصوص عقیدہ میں باقی تمام لوگوں سے جدا ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے۔پس جو کوئی اپنی زبان سے اقرار کرے وہ مؤمن ہو جاتا ہے۔اگر چہ وہ اپنے دل سے اس کو نہ بھی مانتا ہو۔پس ایسا انسان مؤمن ہوگا لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔ یہ بات کرامیہ کے علاوہ کسی نے نہیں کہی۔

بلکہ اہل سنت والجماعت کے مشہور اہل علم گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کے کچھ ایسے اقوال بھی ہیں جن پر دوسرے گروہ کسی طرح بھی ان کی موافقت نہیں کرتے۔امام ابوحنیفہ؛ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ میں ہر ایک کے کوئی ایسے منفرد مسائل ہیں جن میں وہ دوسرے تینوں ائمہ سے جدا ہے۔

اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہو کہ: امامیہ اپنے تمام مسائل میں باقی فرقوں سے جدا ہیں؛ تو ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ امامیہ توحید میں معتزلہ کے ہم نوا اور موافق ہیں۔ان کے پرانے لوگ مجسمہ کے عقیدہ پر تھے۔ایسے ہی تقدیر کے مسائل میں بھی امامیہ معتزلہ سے موافقت رکھتے ہیں۔ان کے پرانے لوگوں میں سے بہت سارے تقدیر کو نہیں مانتے تھے۔ان کے قدماء میں انکار تقدیر کا مسئلہ انکار صفات ربانی سے زیادہ مشہور تھا۔

ایسے ہی جہنمیوں کو جہنم سے نکالے جانے اور اہل کبائر کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے معافی اور مغفرت کے بارے میں ان کے دو قول ہیں۔ان کے متاخرین اس مسئلہ میں وقفیہ کی موافقت رکھتے ہیں۔ وقفیہ کہتے ہیں: ہمیں پتہ نہیں کیا اہل قبلہ میں سے کوئی ایک جہنم میں داخل ہوگا یا نہیں؟ وقفیہ اصل میں اشعریہ کا ایک گروہ ہیں۔اگر چہ وہ یہ بھی کہتے ہیں: ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ بہت سارے اہل کبائر جہنم میں داخل ہوں گے۔ جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

جملہ طور پر ان کے کچھ خاص اقوال و عقائد ہیں۔اور کچھ ایسے اقوال ہیں جن میں دوسرے لوگ ان کے ساتھ شریک ہیں۔یہی حال معتزلہ اور خوارج کا بھی ہے۔ جب کہ اہل حدیث اہل سنت والجماعت ان کی خصوصیت کتاب و سنت کی اتباع اور اصول و فروع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کار کی اتباع ہے۔بخلاف خوارج' معتزلہ اور روافض کے۔جو کوئی بعض اقوال میں ان کی اتباع کرے گا؛ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ فرقے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثقہ راویوں کی اسناد سے ثابت شدہ احادیث پر عمل نہیں کرتے۔

معتزلہ کہتے ہیں: یہ اخبار احاد ہیں۔رافضہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر اور ان سے روایات نقل کرنے والے علماء پر طعن کرتے ہیں۔اس سے مقصود باطنی طور پر رسالت محمدی پر طعنہ زنی کرنی ہوتی ہے۔خوارج میں سے کوئی کہنے والا کہتا ہے:

اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ''عدل سے کام لیجئے۔ بیشک آپ عدل نہیں کر رہے۔'' یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ظلم کو جائز کہتے ہیں۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پہلے شخص کے لیے فرمایا تھا:

''تیری خرابی ہو جب میں عدل نہ کروں تو اور کون عدل کریگا؟۔اگر میں نے عدل نہ کیا تو تو ناکام و نامراد ہو گیا۔''[1]

---

[1] صحیح بخاری:ح:۱۸۳۸.

یہ لوگ جاہل ہیں جو اپنی جہالت کی وجہ سے سنت سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ جب کہ رافضہ کی بنیاد نفاق کی بدعت پر قائم ہے۔اس وجہ سے ان میں وہ زندیقیت پائی جاتی ہے جو خوارج میں بھی نہیں پائی جاتی ۔علامہ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ ''المقالات'' میں فرماتے ہیں:

''یہ حکایت اہل سنت والجماعت'اہل حدیث کی ہے : جملہ طور پر جس عقیدہ پر اصحاب الحدیث اور اہل سنت والجماعت قائم ہیں' وہ: اللہ تعالیٰ کا'اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اقرار ہے ۔اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اس پر ایمان ہے۔اور جو خبریں ثقہ راویوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہیں'ان کو رد نہیں کرتے ۔اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اکیلا معبود برحق ہے ؛ وہ اکیلا یکتا اور بے نیاز ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ۔ اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور یہ کہ جنت حق ہے' اور جہنم حق ہے ۔اور قیامت آنے والی ہے' اس میں کوئی شک نہیں ؛ اور بیشک اللہ تعالیٰ قبروں میں پڑے ہوؤں کو دوبارہ اٹھائیں گے ۔اور بیشک اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طه ۵]

''رحمن نے اپنے عرش پر قرار پکڑا ہے۔''

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں ؛ جن کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [ص ۷۵] ''میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔''

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾[المائدة ۶۴] ''بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔''

اور پھر آخر تک پورا کلام کیا ہے۔''

[اعتراض]: اگر کوئی کہے : جدا ہونے سے رافضی مصنف کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے دار کے علاوہ باقی تمام دار کے لوگوں کو کافر کہتے ہیں۔جیسا کہ کئی ایک شیعہ مشائخ نے فتوی دیا ہے کہ جب دار ایسا ہو جس میں ناصبیوں کا مذہب غالب اور ظاہر ہو جیسے : موزوں پر مسح کرنا ؛ جوس پینے کو حلال سمجھنا ؛ متعہ کو حرام سمجھنا ؛ تو ایسا دار دار کفر ہے ۔ یہاں کی مائع چیزوں پر نجاست کا حکم لگایا جائے گا۔''

[جواب]:اس وصف میں خوارج بھی ان کے ساتھ شریک ہیں ۔ بلکہ خوارج اس بارے میں ان سے زیادہ قوی ہیں۔ اس لیے کہ خوارج ان کو قتل کرنا حلال سمجھتے ہیں۔اہل سنت والجماعت کے ساتھ ان کی جنگیں بڑی مشہور ہیں۔خوارج کے نزدیک ان کے دیار کے علاوہ باقی تمام دیار دیار کفر ہیں۔ان میں سے بعض نے تکفیر عام میں اختلاف کیا ہے ۔ جیسے بعض امامیہ نے بھی عام تکفیر میں اختلاف کیا ہے ۔اصل تکفیر میں یہ دونوں ایک دوسرے کے موافق ہیں۔

رہا تلوار کے استعمال کا مسئلہ؛ تو زیدیہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔اور امامیہ اسے جائز نہیں سمجھتے ۔علامہ اشعری فرماتے ہیں:

''رافضہ کا خروج کے باطل ہونے اور تلوار کے انکار پر اجماع ہے' بھلے انہیں قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے ۔ یہاں تک کہ ان کا امام ظاہر ہو جائے اور وہ انہیں کسی بھی بات کا حکم دے۔''

میں کہتا ہوں: یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کفار کے ساتھ جہاد نہیں کرتے ۔اور نہ ہی اہل سنت والجماعت حکمرانوں کی قیادت میں جہاد کرتے ہیں ؛ سوائے اس حکمران کے زیر سایہ قتال کرتے ہیں جو ان کے مذہب پر چلتا ہو۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ اصول عقائد میں مباینہ اور اشتراک رافضہ اور دوسرے فرقوں کے مابین مشترکہ قدر ہے۔

ساتویں وجہ: ان سے کہا جائے گا: ان کا تمام مذاہب سے جدا ہونا ان کے قول کی صحت سے بڑھ کر اس کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ محض کسی گروہ کا دوسرے گروہوں سے جدا ہونا ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اور کسی قول میں ان کا مشترک ہونا بھی ان کے باطل ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

[تہتر فرقے ؟]:

[اعتراض]: اگر کوئی کہے: نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے تہتر فرقے بتائے ہیں۔ یہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے۔ تو یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس ایک فرقہ کا باقی تمام بہتر فرقوں سے جدا ہونا ضروری ہے۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں: ہاں؛ ایسے ہی یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ وہ بہتر فرقے آپس میں ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ جیسا یہ ایک ناجی فرقہ ان سے جدا ہوگا۔ اس حدیث میں کہیں بھی یہ دلالت نہیں ہے کہ یہ بہتر فرقے اصول و عقائد میں مشترک ہوں گے۔ بلکہ ظاہر حدیث دلالت کرتی ہے کہ یہ تمام تہتر فرقے ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں گے۔ یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ آپس میں افتراق و تفرقہ قابل مذمت ہے؛ قابل مدح نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یک جا ہونے اور جماعت بندی کرنے کا حکم دیا ہے' اور فرقہ بندی کی مذمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ [آل عمران ۱۰۳]

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۞﴾ [آل عمران ۱۰۵۔۱۰۶]

''تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا انہی لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جس دن بعض چہرے سفید ہونگے اور بعض سیاہ؛ سیاہ چہروں والوں (سے کہا جائے گا) کہ تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ اب اپنے کفر کا عذاب چکھو۔''

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے وہ اہل سنت والجماعت ہیں۔ اور جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ اہل بدعت اور فرقہ پرست لوگ ہیں۔ للہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام ۱۵۹]

''بیشک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ [البقرة ۲۱۳]

''صرف ان ہی لوگوں نے جو اسے دیئے گئے تھے، اپنے پاس دلائل آ چکنے کے بعد آپس کے بغض و عناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ [البینۃ ۴]
''اہل کتاب اپنے پاس ظاہر دلیل آ جانے کے بعد ہی (اختلاف میں پڑ کر) متفرق ہو گئے۔''

مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ ہونے والا گروہ جتنا ان سے دور ہے وہ بذات خود سب سے زیادہ قابل مذمت ہے۔ اور جو گروہ جماعت کے ساتھ جتنا کم تفرقہ ڈالنے والا ہے' وہ حق کے اتنا ہی زیادہ قریب ہے۔ جب امامیہ فرقہ کے لوگ باقی سارے گروہوں اور جماعتوں سے سب سے زیادہ جدا اور دور ہیں تو وہ حق سے بھی اتنے ہی دور ہیں۔ خصوصاً جب کہ امامیہ فرقہ کے لوگ اپنے اندر بھی امت کے تمام گروہوں سے بڑھ کر داخلی انتشار کا شکار ہیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے: بہتر فرقے تو صرف شیعہ کے اندر موجود ہیں۔ یہ تعداد تو طوسی سے اس کے بعض ساتھیوں نے نقل کی ہے۔ طوسی کہا کرتا تھا: شیعہ فرقوں کی تعداد بہتر تک پہنچتی ہے۔ شیعہ عالم نوبختی نے شیعہ فرقوں کی تعداد کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

جب کہ اہل سنت والجماعت اصول دین میں ان کے مابین باقی تمام گروہوں کی نسبت سب سے کم اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ہر فرقہ کی نسبت حق سے زیادہ قریب تر ہیں۔ اہل کلام کی اصطلاح میں یہی لوگ متوسط امت ہیں۔ جیسا کہ اہل اسلام باقی تمام مذاہب کے مابین متوسط ملت ہیں۔ اہل سنت والجماعت صفات باری تعالیٰ کے باب میں اہل تعطیل اور اہل تمثیل کے مابین متوسط طبقہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین کام متوسط درجہ کے ہیں۔'' اس لحاظ سے اہل سنت والجماعت باقی تمام فرقوں کی نسبت بہترین فرقہ ہیں۔ تقدیر کے باب میں بھی اہل سنت والجماعت جبریہ اور قدریہ کے درمیان میں ہیں۔ اسماء اور احکام کے باب میں بھی اہل سنت والجماعت وعیدیہ اور مرجئہ کے درمیان میں ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے باب میں بھی غالی اور جافی [جفا کرنے والے] کے درمیان میں ہیں۔ نہ ہی صحابہ کرام کی شان میں غلو کرتے ہیں جیسے رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرتے ہیں [ان کے بعض لوگ حضرت علی کو رب مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ آپ نبی تھے] اور نہ ہی خوارج کی طرح آپ کو کافر کہتے ہیں۔ ایسے ہی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے باب میں بھی خوارج اور روافض کے درمیان میں ہیں۔ نہ ہی خوارج کی طرح حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو کافر کہتے ہیں اور نہ ہی روافض کی طرح حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر کہتے ہیں۔

[رافضیت کی ابتداء]:

آٹھویں وجہ: ان کے جواب میں کہا جائیگا کہ: شیعہ کا کوئی ایک قول بھی ایسا نہیں ہے جس پر ان تمام کا اتفاق ہوا ہو۔ شیعہ مصنف نے جو قول ذکر کیا ہے وہ امامیہ شیعہ کا قول ہے۔ پھر امامیہ میں بھی ایسے گروہ ہیں جو ان سے توحید اور عدل میں اختلاف رکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے انکے بارے میں بیان ہو چکا۔ جمہور شیعہ بارہ اماموں کے بارے میں امامیہ اثنی عشریہ کے خلاف ہیں۔ پس زیدیہ؛ اسماعیلیہ اور کچھ دوسرے گروہ بارہ ائمہ کی امامت کے منکر ہونے پر متفق ہیں۔

لوگوں کے عقائد پر لکھنے والے علماء فرماتے ہیں: ''شیعہ تین قسم کے ہیں: انہیں شیعہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ لوگ [اپنے تئیں] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیروکار ہیں' اور آپ کو باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ غالیہ کہلاتا ہے۔ ان کا یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرتے ہیں اور ان کے بارے میں بہت ہی غلط قسم کے عقائد رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ آپ کو رب مانتے اور بعض نبی مانتے ہیں۔ پھر ان کی

بھی کئی ایک اقسام ہیں ۔ ان میں سے ایک گروہ نصیریہ کا ہے ۔ اور شیعہ کا دوسرا گروہ رافضہ کا ہے۔

علامہ اشعری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : '' ان میں سے ایک گروہ کا نام رافضی پڑ گیا ؛ اس لیے کہ یہ لوگ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت و امامت کا انکار کرتے ہیں ۔''

میں کہتا ہوں : صحیح یہ ہے کہ : ان کا نام رافضی اس وقت پڑا جب انہوں نے حضرت زید بن علی بن حسین بن علی ابن ابی طالب رحمۃ اللہ علیہ و رضی اللہ عنہم اجمعین کا ساتھ اس وقت چھوڑ دیا جب آپ نے خلیفہ ہشام بن عبد الملک کے دور میں کوفہ میں خروج کیا تھا ۔ امام اشعری نے یہ بھی ذکر کیا ہے ؛ اور دوسرے علماء نے بھی ذکر کیا ہے ۔

کہتے ہیں کہ : [شیعہ کے ایک گروہ کا نام] زیدیہ اس وجہ سے پڑ گیا کہ انہوں نے حضرت زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو پکڑے رکھا ۔ ہشام بن عبد الملک کے ایام حکومت میں کوفہ میں حضرت زید رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کی گئی تھی ۔ اس وقت کوفہ کا امیر یوسف بن عمر ثقفی تھا ۔ حضرت زید رحمۃ اللہ علیہ [اپنے پردادا] علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو باقی تمام صحابہ پر فضیلت دیتے تھے ؛ مگر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے تھے ۔ آپ ظالم حکمرانوں کے خلاف بغاوت کو جائز سمجھتے تھے ۔ جب کوفہ میں آپ کا ظہور ہوا تو آپ کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے آپ کی بیعت کی ۔ آپ نے ان میں سے بعض سے سنا وہ حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما پر طعن و تشنیع کر رہے تھے ۔ آپ نے ان کلمات کا انکار کیا [اور ایسا کہنے سے منع کیا] ۔ تو جن لوگوں نے آپ کی بیعت کی تھی [ان میں سے کچھ لوگ] آپ کو چھوڑ کر چلے گئے ۔ آپ نے ان سے پوچھا : کیا تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ؟

وہ کہنے لگے : ہاں ؛ پس اسی وجہ سے ان کا نام رافضی [ساتھ چھوڑنے والے] پڑ گیا ۔ کیونکہ حضرت زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا تھا '' رفضتمونی '' تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ۔ اس وقت آپ کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت باقی رہ گئی جن کی ہمراہی میں آپ نے یوسف بن عمر سے جنگ کی اور آپ کو شہید کر دیا گیا ۔

کہتے ہیں : رافضہ کا اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا حکم صراحت کے ساتھ دیا تھا ۔ اور اس بارے میں آپ کا نام لیکر آپ کو خلیفہ منتخب کیا تھا ۔ آپ نے بھی اس کا اظہار و اعلان کیا تھا ۔ مگر صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی اقتداء ترک کر کے گمراہ ہو گئے ۔ اور ان کا کہنا یہ ہے کہ : امامت نص اور وحی کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتی ۔ اور امامت حق قرابت بھی ہے ۔ اور امام کے لیے جائز ہے کہ وہ تقیہ کرتے ہوئے کہے کہ وہ امام نہیں ہے ۔ انہوں نے احکام میں تمام اجتہاد کو باطل قرار دیا ہے ۔ ان کا ایمان ہے کہ امام صرف وہی ہو سکتا ہے جو لوگوں میں سب سے افضل ہو ۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر حال میں حق پر تھے ۔ اور امور دین میں کبھی بھی آپ سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی ۔ سوائے شیعہ میں سے کاملیہ فرقہ کے ۔ کاملیہ فرقہ والے تمام لوگوں کو کافر کہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اتباع نہیں کی ۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں اس لیے کہ انہوں نے اپنے لیے خلافت کا مطالبہ نہیں کیا ۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ : ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہیں ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ : امام منصوص کے علاوہ کسی کے لیے خروج جائز نہیں ۔ امامیہ شیعہ کاملیہ کے علاوہ چوبیس فرقے ہیں ۔ یہ لوگ اپنے آپ کو امامیہ بھی اس وجہ سے کہلاتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصوص علیہ امام تھے ۔

[رافضی فرقے اور ان کے عقائد] :

[پہلا فرقہ] : ان میں سے پہلا فرقہ قطعیہ ہے ۔ انہیں قطعیہ اس وجہ سے کہتے ہیں کہ : ان لوگوں کا پکا اور قطعی عقیدہ ہے

کہ حضرت موسیٰ بن جعفر بن محمد رحمہ اللہ انتقال کر چکے ہیں ۔انکا اور جمہور شیعہ کا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وضاحت و صراحت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام اور خلیفہ منتخب کیا تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد اپنے لخت جگر علی بن حسین کو' علی بن حسین نے اپنے بیٹے ابوجعفر محمد کو؛ اور محمد نے اپنے بیٹے جعفر بن محمد کو؛ جعفر نے اپنے بیٹے موسیٰ کو؛ اور موسیٰ نے اپنے بیٹے علی کو' علی نے اپنے بیٹے محمد بن علی کو؛ محمد بن علی نے اپنے بیٹے علی بن محمد کو؛ اور علی بن محمد نے اپنے بیٹے حسن کو خلیفہ اور امام مقرر کیا تھا۔حسن بن علی نے اپنے بعد اپنے بیٹے محمد بن حسن کو امام مقرر کیا تھا۔ یہ وہی محمد بن حسن عسکری ہے جو کہ ان لوگوں کے عقیدہ کے مطابق غائب ہوگیا۔ اور ابھی تک ظاہر نہیں ہوا؛ یہ لوگ اس کے انتظار میں ہیں۔اور جب یہ امام ظاہر ہوگا تو زمین کو ایسے عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے وہ ظلم و جور سے بھری ہوگی۔

[دوسرا فرقہ]: ان کا دوسرا فرقہ کیسانیہ ہے۔ پھر کیسانیہ کے بھی گیارہ فرقے ہیں۔ان کا نام کیسانیہ اس وجہ سے پڑا ہے کہ مختار بن ابوعبید ثقفی جس نے خون حسین رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کیا تھا؛ اور [شروع میں] لوگوں کو حضرت محمد بن علی [محمد بن حنفیہ] کی بیعت کرنے کی دعوت دیتا تھا[بعد میں خود نبوت کا دعوی کر بیٹھا]۔اسے کیسان بھی کہا جاتا ہے ۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔کیسانیہ میں سے ایک گروہ کا دعوی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد محمد بن حنفیہ کو خلیفہ و امام مقرر کیا تھا۔اس لیے کہ بصرہ میں آپ نے اپنی فوج کا جھنڈا آپ ہی کے سپرد کیا تھا۔

ان میں سے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو امام مقرر کیا تھا۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ: محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ رضوی کے پہاڑوں میں زندہ ہیں۔آپ کے دائیں جانب شیر اور بائیں جانب چیتا ہے جو کہ آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اور آپ کے پاس صبح و شام رزق آتا رہے گا یہاں تک کہ آپ خروج کریں۔ان کا خیال ہے کہ جس سبب کی وجہ سے آپ اس پہاڑ میں چھپ کر انتظار کر رہے ہیں اور خلق کی نظروں سے اوجھل ہیں؛ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور حکمت ہے جسے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ بالکل ہی باطل پر مبنی ہے۔ایسے ہی امامت کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ باطل ہے۔اس لیے کہ ان [فرقہ کیسانیہ والوں] کا زندہ اور موجود امام [محمد بن حنفیہ] کے متعلق دعوی ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے ۔جب کہ امامیہ تو ایسے امام [منتظر] کے متعلق دعوی کیے بیٹھے ہیں جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں۔

پھر کیسانیہ میں سے ایک فرقہ کا دعوی ہے کہ محمد بن حنفیہ کا انتقال ہو چکا ہے۔اور آپ کے بعد آپ کا بیٹا ابو ہاشم عبداللہ امام بنا تھا۔پھر اس گروہ میں سے ایک اور گروہ نکلا ہے' وہ کہتے ہیں کہ: ابو ہاشم نے اپنے بعد اپنے بھائی حسن کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔اور حسن نے اپنے بیٹے علی بن حسن کے لیے وصیت کی تھی۔اور علی کی موت واقعہ ہوئی تو اس نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ پس اب یہ لوگ محمد بن حنفیہ کے واپس آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ محمد بن حنفیہ واپس آئیں گے اور اس زمین کے مالک بنیں گے۔اس فرقہ کے لوگ آج کل وادی ''التیہ'' میں موجود ہیں۔ [1]

---

[1] التیہ وہ وادی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس سال تک سرگرداں رہے۔ابن تیمیہ کے دور میں یہ لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔[دلدار جی]

اس وقت ان کا کوئی امام نہیں ہے' یہاں تک کہ محمد بن علی المعروف ابن الحنفیہ واپس آ جائیں۔

ان میں سے ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ: ابو ہاشم کے بعد امام محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس بنا تھا۔ اس لیے کہ امام ابو ہاشم کا شام سے واپسی کے سفر میں راستہ میں انتقال ہو گیا تھا؛ اس نے مرتے وقت محمد بن علی کے حق میں وصیت کی تھی۔ اور محمد بن علی نے مرتے وقت اپنے بیٹے ابراہیم بن محمد کو امام بنایا تھا۔ اور پھر ابراہیم بن محمد نے اپنے بعد ابو العباس السفاح کے لیے وصیت کی تھی کہ اسے امام بنایا جائے۔ پھر اس کے بعد خلافت ابو جعفر المنصور کے سپرد ہوئی۔ اور پھر ایسے ہی وصیت کے تحت امامت ان لوگوں میں چلتی رہی۔

پھر ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعد حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی وصیت فرمائی تھی؛ اور وضاحت و صراحت کے ساتھ اس کا حکم دیا تھا۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد اپنے بیٹے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ اور امام عبد اللہ بن عباس نے اپنے بیٹے علی بن عبد اللہ کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا یہاں تک کہ ابو جعفر المنصور تک پہنچ گیا۔ شیعہ کا یہ فرقہ راوندیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہ فرقہ بھی ابو مسلم [خراسانی] کے مسئلہ میں دو گروہوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو الرزامیہ کہا جانے لگا؛ اس فرقے کا بڑا رزام نامی ایک آدمی تھا۔ اس گروہ کا کہنا ہے کہ ابو مسلم کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے: ابو مسلم نہیں مرا۔ یہ لوگ ان چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں جسے ان کے اسلاف حلال نہیں سمجھتے تھے۔

کیسانیہ میں سے ایک تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ: ابو ہاشم نے اپنے بعد عبد اللہ بن عمرو بن حرب کو امام مقرر کیا تھا۔ اور ابو ہاشم کی روح اس میں حلول کر گئی تھی۔ پھر ان لوگوں نے عبد اللہ بن عمرو کے کچھ جھوٹ پکڑ لیے؛ اس وجہ سے اسے چھوڑ کر امام کی تلاش میں مدینہ چلے گئے۔ وہاں پر ان کی ملاقات عبد اللہ بن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر بن ابو طالب سے ہو گئی۔ اس نے انہیں اپنی اقتداء کرنے کی دعوت دی۔ پس ان لوگوں نے عبد اللہ بن معاویہ کو اپنا امام بنا لیا' اور اس کے لیے وصی ہونے کا دعوی کرنے لگے۔

پھر ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ: عبد اللہ بن معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور دوسرا گروہ کہنے لگا: نہیں' بلکہ وہ دوبارہ اٹھے گا؛ اور پھر انتقال ہوگا۔ ایک گروہ کہتا ہے: یہ وہی مہدی ہے جس کے بارے احادیث مبارکہ میں بشارت دی گئی ہے۔ اور یہ زندہ ہے اور اصفہان کے پہاڑوں میں روپوش ہے۔

ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے: ابو ہاشم نے اپنے بعد بیان بن سمعان کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے: ایسا نہیں' بلکہ علی بن حسین کو امام بنایا تھا۔ یہ ان لوگوں کے عقائد و اقوال ہیں جو محمد بن علی [الحنفیہ] کو امام مانتے ہیں۔

پھر رافضیوں میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ: حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنے بعد اپنے بیٹے علی بن حسین رضی اللہ عنہ کو امام بنانے کا حکم دیا تھا۔ پھر ان کے بعد ان کا بیٹا امام بنا؛ ابو جعفر کے دور تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ابو جعفر نے اپنے بعد مغیرہ بن سعید کے لیے وصیت کی تھی۔ یہ لوگ مغیرہ بن سعید کو ہی اپنا امام مانتے ہیں یہاں تک امام مہدی کا ظہور ہو جائے۔ اور ان کے عقیدہ کے مطابق امام مہدی محمد بن عبد اللہ بن الحسن بن علی بن ابی طالب ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ مہدی حاجر کے علاقہ میں

زندہ موجود ہے۔ اور اس وقت تک وہاں پر مقیم رہے گا جب تک کہ اس کے خروج کا وقت نہ آ جائے۔

روافضہ میں سے ایک گروہ کا ایمان ہے کہ: ابوجعفر محمد بن علی کے بعد امام محمد بن عبداللہ بن الحسن بنا تھا' جس نے خلیفہ ابوجعفر المنصور کے زمانہ میں مدینہ میں خروج کیا تھا۔ ان کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ یہ لوگ مغیرہ بن سعید کو امام نہیں مانتے۔

رافضیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ: ابوجعفر المنصور نے ابومنصور کو امام بنانے کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں: ابومنصور نے اپنے بیٹے حسین بن ابومنصور کے لیے وصیت کی تھی؛ اور ان میں سے بعض کہتے ہیں: محمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین اس کے بعد امام بنے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ: ابوجعفر نے ابومنصور کے لیے وصیت کی تھی ؛ باقی بنی ہاشم کے لیے نہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اور حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کو چھوڑ کر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے لیے وصیت کی تھی۔ پھر ابومنصور کے بعد امامت ایسے ہی ابومنصور کی اولاد میں واپس چلی گئی جیسے حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں واپس چلی گئی تھی۔

ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: بیشک ابوجعفر نے اپنے بعد اپنے بیٹے جعفر بن محمد کو امام بنانے کا حکم دیا تھا۔ اور یہ جعفر ابھی تک زندہ ہے؛ مرا نہیں؛ اور اس وقت تک مرے گا نہیں جب تک کہ اس کا ظہور نہ ہو جائے ؛ یہی امام القائم مہدی ہے۔

روافض میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتے ہیں: جعفر بن محمد مر گیا ہے؛ اور اس کے بعد اس کا بیٹا اسماعیل امام بنا ہے۔ یہ انکار کرتے ہیں کہ اسماعیل کا انتقال اس کے والد کی زندگی میں نہیں ہوا۔

اور اس اسماعیل کے بارے میں کہتے ہیں: اس کا انتقال اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک زمین میں بادشاہ نہ بن جائے۔ اس لیے کہ اس کے باپ نے بتایا ہے کہ اس کا وصی اور اس کے بعد امام اس کا یہی بیٹا اسماعیل ہوگا۔

رافضہ میں سے ایک گروہ قرامطہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے جعفر تک امامت منصوص چلتی آئی ہے۔ جیسا کہ اثنی عشریہ کا عقیدہ ہے۔ اور جعفر نے اپنے بعد اپنے پوتے محمد بن اسماعیل کو اپنا جانشین اور وصی [امام] بنایا تھا۔ اور ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ محمد بن اسماعیل آج کے دن تک زندہ ہے۔ ابھی تک اس کا انتقال نہیں ہوا۔ اور اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ زمین کا مالک نہ بن جائے۔ اور یہی وہ مہدی ہے جسکے متعلق احادیث میں بشارت دی گئی ہے۔ اس بارے میں انہوں نے اپنے اسلاف سے نقل کردہ روایات سے استدلال کیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ: ساتواں امام ہی قائم [یعنی مہدی] ہوگا۔ انہیں سبعیہ کہا جاتا ہے۔ جیسے دوسرے فرقہ کو اثنا عشریہ کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے متعلق چوتھی صدی ہجری میں مغرب اور قاہرہ میں انکے غالب آنے سے پہلے عقائد و ملل پر لکھنے والے علماء کرام نے اپنی کتابوں میں تفصیل لکھی ہے۔ اس لیے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد ان میں ایسی نئی نئی باتیں پیدا ہوگئیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں میں وہ الحاد اور زندیقیت پیدا ہوگئی جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی؛ نہ غالی رافضیوں میں نہ دوسروں میں۔

ان ملحدین کے کچھ بقایا بلادِ شام اور خراسان میں موجود تھے۔ ابن سینا کے گھر والوں نے حاکم کے زمانے میں ان کی دعوت قبول کر لی تھی۔ یہی حال طوسی اور اس کے اعوان و انصار کا ہے۔ اور یہی حال سنان کا ہے۔

ان کے ذہین و شاطر لوگ اپنی جہالت و جھوٹ کو جانتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کی خدمت گزاری کی وجہ سے انہیں وہ مقام و مرتبہ اور مال ملتا ہے اور اسبابِ شہوت میسر ہوتے ہیں؛ جو اس کے بغیر ناممکن ہیں۔ یہ لوگ اپنے ان ماننے والوں کے

ساتھ بھی ایسے ہی تعاون کرتے ہیں جیسے اپنے جیسے دوسرے جھوٹوں اور ظالموں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں تا کہ اپنا مطلب پورا کرسکیں۔

رافضہ میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتے ہیں: امامت کا سلسلہ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں جاری و ساری ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے: امامت کا سلسلہ محمد بن جعفر بن محمد کی اولاد میں جاری و ساری ہے؛ محمد بن اسماعیل کی اولاد میں نہیں اور نہ ہی موسیٰ بن جعفر کی اولاد میں۔

تیسرا گروہ کہتا ہے: امامت کا سلسلہ عبداللہ بن جعفر کی اولاد میں جاری و ساری ہے۔ یہ عبداللہ اپنے باپ کا بڑا بیٹا تھا۔ اس فرقہ والوں کو فطحیہ کہا جاتا ہے۔

روافض میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو کہ موسیٰ بن جعفر بن محمد کو ان کے والد کے بعد امام مانتا ہے۔ لیکن ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ: موسیٰ بن جعفر کا انتقال نہیں ہوا؛ بلکہ وہ زندہ ہے؛ اس وقت تک اس کا انتقال نہیں ہوگا جب تک وہ مشرق و مغرب کا بادشاہ نہ بن جائے۔ اس گروہ کا نام واقفہ ہے۔ کیونکہ یہ لوگ موسیٰ بن جعفر تک پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ اسے آگے کسی کو امام نہیں مانتے۔ ان کو ممطورہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب یونس بن عبدالرحمٰن نے ان کے ساتھ مناظرہ کیا تھا؛ تو انہوں نے دوران مناظرہ ان سے کہا تھا: ''أنتم أهون علي من كلاب ممطورة۔''

''تم میرے نزدیک بارش میں بھیگے کتے سے بھی بڑھ کر گندے اور ذلیل ہو۔''

اس کے بعد ان لوگوں کا یہی لقب پڑ گیا۔

ان میں سے بعض لوگ جو موسیٰ بن جعفر کے بارے میں توقف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہمیں پتہ نہیں کہ موسیٰ بن جعفر کا انتقال ہوا ہے یا نہیں؟ اور ایک گروہ کہتا ہے: موسیٰ بن جعفر نے اپنے بیٹے احمد کو امام مقرر کیا تھا۔

رافضہ کا ایک اور گروہ بھی ہے: وہ کہتے ہیں: اس کے بعد محمد بن حسن [العسکری] امام بنے تھے؛ جن کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ آخری امام ہے جس کا ظہور ہوگا' اور وہ دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا اور ظلم کا خاتمہ کر دے گا۔ اس گروہ کو اثنا عشریہ [بارہ اماموں کے ماننے والے] کہا جاتا ہے۔

یہ رافضیوں کا آپس میں اختلاف ہے جن کا دعویٰ ہے کہ خلافت و امامت نص سے ثابت ہے۔ امت کے تمام گروہوں سے بڑھ کر ان لوگوں کا آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ بات ہرگز نہیں ہوسکتی کہ رافضی وہ نجات پانے والا گروہ ہوں جس کے متعلق حدیث میں بشارت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ نجات یافتہ گروہ کو کم از کم اصول دین اور عقائد میں متفق ہونا چاہیے؛ جیسے اہل سنت والجماعت اصول دین میں متفق ہیں۔

امامیہ اثنا عشریہ کہتے ہیں: اصول دین چار ہیں: توحید؛ عدل؛ نبوت؛ اور امامت۔ ان کا توحید؛ عدل اور امامت کے مسئلہ میں آپس میں [بہت زیادہ] اختلاف پایا جاتا ہے۔ نبوت کے بارے میں یہ لوگ بھی ایسے ہی اقرار کرتے ہیں جیسے باقی ساری امت کے لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں۔ جب کہ امامت کے بارے میں ان کا اختلاف ساری امت کے اختلافات سے بڑا اور سخت ہے۔ اگر اثنا عشریہ یہ کہیں کہ: ہم ان تمام لوگوں سے زیادہ ہیں اس لیے حق صرف ہمارے ساتھ ہے' دوسروں کے ساتھ نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: اہل سنت والجماعت تعداد میں تم لوگوں سے زیادہ ہیں۔ تو حق بھی ان کے ساتھ ہے

تمہارے ساتھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ تمہارے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمہارے باقی فرقوں کے ساتھ تمہارا معاملہ ایسے ہی ہے جیسے باقی مسلمانوں کا تمہارے ساتھ۔ اور اسلام ہی وہ دین حق ہے جو لوگوں کو حق پر جمع کرتا ہے۔ [شیعہ کی دیگر اسلامی فرقوں سے علیحدگی ان کے عقائد کی صحت کی بجائے ان کے افکار و معتقدات کے فساد و بطلان پر دلالت کرتی ہے، اس لیے کہ دیگر فرق وطوائف میں سے کسی فرقہ کی انفرادیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ راہ حق پر گامزن ہیں]۔

فصل:

شیعہ اور یقین نجات

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: فرقہ امامیہ کے نجات یافتہ ہونے کی تیسری دلیل:

''یہ کہ انہیں اپنی اور اپنے ائمہ کی نجات کا قطعی یقین ہے۔ اور اپنے مخالفین کے لیے اس کے برعکس کا یقین جازم رکھتے ہیں۔ بخلاف ازیں اہل سنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اور نہ ہی وہ پختہ یقین کے ساتھ اپنی یا دوسروں کی نجات کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان [امامیہ] کی اطاعت اولیٰ ہے۔ [اس کی مثال یہ ہے] فرض کریں کہ دو شخص بغداد سے نکلے جو کوفہ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے آگے دو راستے دیکھے؛ ان میں سے ہر ایک ایک راستے پر چل پڑا۔ پھر ایک تیسرا آدمی آیا وہ بھی کوفہ جانا چاہتا تھا۔ اس نے ان دونوں میں سے ایک سے پوچھا: تم کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: کوفہ۔ پھر پوچھا: کیا تمہارا یہ راستہ تمہیں کوفہ پہنچا دے گا؛ اور کیا یہ راستہ پر امن ہے؟۔ اور کیا تمہارے ساتھی کا راستہ اسے اس کی منزل تک پہنچا دے گا؟ اور کیا اس کا راستہ پر امن ہے؟۔ تو اس نے کہا: میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ پھر اس کے دوسرے ساتھی سے یہی سوال کیے۔ اس نے جواب میں کہا: مجھے علم ہے میرا یہ راستہ مجھے کوفہ تک پہنچائے گا۔ اور یہ راستہ پر امن ہے۔ اور مجھے علم ہے کہ میرے ساتھی کا راستہ اسے کوفہ تک نہیں پہنچائے گا۔ اب یہ تیسرا انسان اگر اس کے باوجود پہلے ساتھی کی اتباع کرے گا تو اہل عقل و دانش اسے بیوقوف کہیں گے۔ اور اگر اس نے دوسرے ساتھی کی راہ اختیار کی تو اس نے یقین و جزم کی راہ اختیار کی۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب]: اس اعتراض و اشکال کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی وجہ: ہم کہتے ہیں: اگر ان ائمہ کی پیروی حق و صواب ہے جن کی اطاعت کا دم تم بھرتے اور اس کو موجب نجات تصور کرتے ہو تو پھر اموی خلفاء کے اتباع جو اپنے ائمہ کی اطاعت کو واجب اور موجب نجات سمجھتے تھے حامل صدق و صواب تھے۔ پھر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں پر جو طعن و تشنیع کرتے تھے؛ اور شیعان علی اور دوسرے لوگوں سے انہوں نے جو جنگیں لڑیں ان میں وہ حق پر تھے۔ اس لیے کہ ان کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ ہر بات میں ائمہ کی اطاعت واجب ہے۔ نیز یہ کہ ائمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں احتساب سے بالا ہیں۔ اور جو کام وہ اطاعت امام میں انجام دیں، اس میں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ دلیل کے اعتبار سے ان کا مسلک شیعہ کی نسبت قوی تر تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان ائمہ کی پیروی کرتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقرر و موید کیا، اور حکومت و سلطنت سے نوازا تھا۔ جب کہ منکرین تقدیر (جن میں شیعہ بھی شامل ہیں) کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

وہی کام کرتے ہیں جن میں بندوں کی کوئی مصلحت مضمر ہوتی ہے۔تو ان کو سلطنت وحکومت وتفویض کرنے میں بھی بندوں کی مصلحت ملحوظ رکھی ہوگی۔ یہ امرمحتاج بیان نہیں کہ اموی خلفاء سے امت کو جوفوائد حاصل ہوئے وہ ان مصالح کی نسبت عظیم تر تھے جو ایک عاجز و معدوم امام (یعنی امام غائب) کے ذریعہ معرض ظہور میں آئے۔ بنا بریں اموی خلفاء کے متبعین کو جو دینی و دنیوی فوائد حاصل ہوئے امام منتظر کے اتباع کو اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔شیعہ کا کوئی امام ایسا نہ تھا جو انہیں نیکی کا حکم دیتا، منکرات سے باز رکھتا اور دینی و دنیوی مصالح میں ان کی مدد کرتا۔ اس کے عین برخلاف اموی خلفاء کے اتباع نے ان سے لا تعداد دینی و دنیوی فوائد و منافع حاصل کیے۔

خلاصہ کلام! یہ کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان نام نہاد معاونین کی دلیل قرین صحت وصواب ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انصار و اعوان کی دلیل اقرب الی الصواب ہوگی۔ اور اگر پہلی دلیل باطل ہے تو دوسری اس سے باطل تر ہے۔ جب شیعہ اس بات میں اہل سنت کے ہم نوا ہیں کہ اموی خلفاء کی مطلق اطاعت میں نجات پر یقین کامل رکھنا خطا اور گمراہی ہے تو ائمہ معصومین اور ان کے نائبین کی اطاعت مطلقہ میں یقینی نجات اور ان کی اطاعت مطلقہ کا عقیدہ سابق الذکر ضلالت سے بھی عظیم تر گمراہی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کا سرے سے کوئی امام ہے ہی نہیں، ماسوا ان شیوخ کے جو ناجائز ذرائع سے ان کا مال بٹورتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

دوسری وجہ: مصنف کی ذکر کردہ مثال اس وقت صحیح مطابقت رکھے گی جب دو مقدمات صحیح ثابت ہو جائیں:

پہلا مقدمہ: امام معصوم کا اثبات۔

دوسرا مقدمہ: امام کے امر و نہی کا اثبات۔

یہ دونوں مقدمات نامعلوم ہی نہیں بلکہ باطل ہیں۔ پہلے مقدمہ کو چھوڑیے۔دوسرے مقدمہ میں: جن لوگوں کی عصمت کا دعوی کیا جاتا ہے؛ صدیوں سے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔[امامیہ کے ہاں]امام منتظر بھی صدیوں سے غار میں غائب ہو چکا ہے۔ جب کہ دوسرے لوگوں کے نزدیک یہ امام اصل میں معدوم ہے [اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں]۔اور جو لوگ ان رافضی شیوخ کی اتباع کرتے ہیں' یا ان کتابوں کے مطابق چلتے ہیں جو بعض رافضی شیوخ نے لکھی ہیں؛ جن کتابوں میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ روایات ائمہ معصومین سے منقول ہیں؛ تو یہ حقیقت ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین رافضی شیوخ بالاتفاق معصوم نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کی نجات کے بارے میں قطعی طور پر یقین کے ساتھ کچھ کہا جاسکتا ہے۔ پس اس بنا پر ثابت ہو گیا کہ رافضہ ان لوگوں کی اتباع نہیں کرتے جن کی نجات وسعادت کے بارے میں انہیں قطعی یقین ہے۔ اور نہ ہی اپنی نجات کے بارے میں یقین ہوسکتا ہے۔ اور نہ ہی ان ائمہ کی نجات کے بارے میں انہیں کوئی یقین ہے جو براہ راست امر و نہی کا کام کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ان کے ائمہ ہیں۔ان لوگوں کا اپنے ائمہ کی طرف منسوب ہونے میں وہی حال ہے جو بہت سارے ان لوگوں کا حال ہے جو خود کو مرے ہوئے مشائخ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہوتا کہ ان شیوخ نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس چیز سے منع کیا ہے۔ بلکہ ان شیوخ کے ایسے اتباع کار ہیں جو لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔اور لوگوں کو اللہ کی سیدھی راہ سے روکتے ہیں۔ اور انہیں ان مشائخ اور ان کے خلفاء کی شان میں غلو کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہیں اپنا رب بنا لیتے ہیں۔ جیسے شیعہ شیوخ اپنے پیروکاروں کو حکم دیتے ہیں۔ اور جیسے عیسائی علماء

اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے ہیں ۔ یہ لوگ عوام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیتے ہیں ۔اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں ۔اس بنا پر وہ ''لا إلـه إلا الله محمد رسول الله '' کلمہ توحید کی حقیقت سے خارج ہو جاتے ہیں ۔اس لیے کہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے ؛ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارا جائے ؛ اس کے علاوہ کسی کا خوف نہ رکھا جائے ؛ اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرا جائے ؛ اس کے علاوہ کسی پر توکل نہ کیا جائے ؛ اور دین کو صرف اس کے لیے خالص مانا جائے ؛ اس میں کسی مخلوق کے لیے حصہ نہ بنایا جائے ۔ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر فرشتوں اور انبیاء کو رب نہ بنانا چاہیے ۔تو پھر یہ امور ائمہ ' شیوخ ' علماء اور بادشاہوں سے کیونکر روا ہو سکتے ہیں ؟ ۔

رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے امر و نہی پہنچانے کا واسطہ ہے ۔ پس اللہ تعالیٰ کے علاوہ مخلوق میں سے کسی ایک کی بھی مطلق اطاعت نہیں کی جا سکتی ۔ جب امام یا شیخ کو الہ و معبود بنا لیا جائے کہ اسے اس کی عدم موجودگی میں یا موت کے بعد پکارا جائے ' اور اس سے مدد مانگی جائے ؛ اس سے اپنی حاجات طلب کی جائیں ؛ [تو یہ کہاں کی توحید اور کیسا دین ہے ؟ ۔]

یہ لوگ تو اپنے ائمہ کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں انہیں جو مرضی میں آئے اس کا حکم دیتے ہیں اور جس چیز سے چاہتے ہیں روک دیتے ہیں ۔ گویا کہ یہ لوگ اپنے مردہ ائمہ کو اللہ تعالیٰ سے تشبیہ دیتے ہیں ؛ اور زندوں کو رسول اللہ ﷺ سے ۔ اس بنا پر یہ لوگ 'لا إله إلا الله محمد رسول الله '' کلمہ توحید کی حقیقت سے خارج ہو جاتے ہیں ۔

پھر ان میں سے بہت سارے لوگ اپنے مشائخ سے نقل کردہ حکایات سے چمٹے رہتے ہیں ؛ ان حکایات میں سے اکثر جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہیں ۔اور بعض میں غلطی ہوتی ہے ۔ پس یہ رسول معصوم ﷺ سے منقول سچی احادیث کو چھوڑ کر جھوٹی اور غیر معصوم ائمہ کی طرف منسوب کہانیوں اور کہاوتوں پر اکتفاء کرتے ہیں ۔

اگر ان زندہ مشائخ کے پیروکاروں میں سے ایک گمراہ اپنے فوت شدگان مشائخ کی شان میں غلو کرنے کی وجہ سے ان کی قطعی اور دوٹوک نجات کا یقین رکھنے میں غلطی پر ہے تو شیعہ کی یہی غلطی اس سے کئی گنا بڑی اور خطرناک ہے ۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شیعہ کا طریقہ کار درست ہے ؛ اس لیے کہ انہیں اپنی نجات کا قطعی یقین ہے ۔تو پھر مشائخہ کا طریقہ کار بھی حق ہے ؛ وہ بھی اپنی نجات کے بارے میں قطعی یقین رکھتے ہیں ۔

تو پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ : یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان انبیاء کرام میں ہوتا ہے جو شراب پیتے تھے ؛ اور اس کے لیے شراب حلال تھی ؛ اس لیے کہ بعض انبیاء کرام نے بھی شراب پی ہے ۔اور یزید بھی ان ہی میں سے ایک ہے ۔اور یہ طریق کار درست اور حق ہے ۔اور یزید بھی نبی تھا ۔اور جو کوئی نبی کے خلاف خروج کرے وہ کافر ہے ۔ تو پھر اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کفر لازم آتا ہے ۔اور اس بنا پر ان لوگوں کے قول کی صحت بھی لازم آتی ہے جو کہتے ہیں : ہر وہ رزق جو میرا شیخ مجھے نہ دے مجھے اس رزق کی کوئی چاہت نہیں ۔اور ان لوگوں کی بات بھی درست ثابت ہوگی جو کہتے ہیں : اللہ تعالیٰ اتر کر زمین پر آتے ہیں ؛ اور ہر مسجد میں اللہ تعالیٰ نے اپنا پاؤں رکھا ہے ۔اور پھر وہ لوگ بھی صحیح کہتے ہوں گے : جن کا عقیدہ ہے کہ ان کے شیخ نے انہیں نمازیں معاف کر دی ہیں ۔ان کے علاوہ بھی کفر و گمراہی پر مشتمل کئی ایک باتیں ایسی ہیں جو ان مشائخ کے پیروکاروں نے اپنے ماننے والوں میں پھیلا رکھی ہیں ۔ [حالانکہ یہ ساری باتیں غلط اور اسلامی عقیدہ کے خلاف ہیں] ۔

ان میں سے بہت سارے لوگوں کو اپنے ائمہ ومشائخ کی سعادت ونجات کا پختہ یقین ہے۔ ان میں سب سے زیادہ بلا جھجک اور بغیر روک ٹوک یہ یقین ظاہر کرنے والے اثنا عشری ہیں۔ جو اپنے ائمہ اور ان کے متبعین کی نجات کا پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اگر یہ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے' اس کا شمار بھی اپنی نجات کے پکا یقین رکھنے میں واجب ہے؛ تو پھر ان دوسرے لوگوں [فرقہ مشائخہ] کی اتباع بھی واجب ہوتی ہے۔ جب ان کی اتباع واجب ہوگی تو اس سے پھر شیعہ عقیدہ پر قدح اور ان کے عقیدہ کو باطل سمجھنا بھی واجب ہوگا۔ اور اگر یہ طریقہ درست نہیں ہے تو پھر شیعہ کی دلیل خود بخود باطل ہو جائے گی۔ ❶

اس لئے ان دونوں فریقوں سے کہا جائے گا کہ: اگر اپنی نجات کا پختہ یقین رکھنے والوں کا طریقہ کار ان لوگوں کی راہ کی نسبت اتباع کا زیادہ حق دار ہے جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں؛ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں ان اہل علم و دین کی اتباع کرتے ہیں جو انہیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں؛ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بغیر کسی معین شخص کی اطاعت کو واجب نہیں سمجھتے۔ اور سعادت ونجات کی ضمانت صرف ان لوگوں کے لیے دیتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ اور کہتے ہیں: ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں ان سے غلطی بھی ہوسکتی ہے اور درستگی بھی۔ پس ان کی اطاعت مطلقاً نہیں کی جائے گی۔

اب اگر ان لوگوں کی اتباع میں نقص اور خطأ کا پہلو موجود ہے؛ اور اپنی نجات کا پختہ یقین رکھنے والوں کی رائے ہی درست ہوسکتی ہے' تو پھر شیعہ کے ائمہ معصومین اور شیخیہ کے مشائخ محفوظین کی اطاعت بھی واجب ہوتی ہے۔ [یہ دونوں علیحدہ علیحدہ گروہ ہیں]۔ پہلی قسم کے شیعہ دوسری قسم کے شیعہ پر جرح وقدح کرتے ہیں؛ اس سے لازم آتا ہے کہ یہ دونوں طریقے عند اللہ پکے باطل ہوں۔ اس لیے کہ ان میں جمع بین النقیضین ہے۔ کیونکہ ان کے اصول کی بنیاد ہی فساد پر رکھی گئی ہے۔ اور بنیاد یہ ہے کہ بغیر دلیل کے ان لوگوں کی اتباع جنہیں اپنی نجات کا پختہ یقین ہے۔ پس فرقہ مشائخہ یا امامیہ میں جو بھی اپنے مشائخ کی اتباع میں نجات کا پختہ یقین رکھتے ہیں؛ ان کا یہ قول بغیر علم اور دلیل کے ہے۔ اس سے ان کے اقوال میں تناقض لازم آتا ہے۔ بخلاف ان اقوال کے جن کی بنیاد صحیح اصولوں پر رکھی گئی ہے؛ ان میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

تیسری وجہ: رافضی مصنف نے جو مثال بیان کی ہے؛ اور اس کو اصل بنا کر اس پر قیاس کیا ہے؛ اس کے مطابق حکم لگانا ممتنع ہے۔ اس کہ دو آدمیوں میں سے کوئی ایک جب کہے گا کہ: کیا میرا راستہ پر امن ہے' اور مجھے منزل تک پہنچا دے گا۔ اور دوسرا آدمی اس سے کہے: مجھے پتہ نہیں کہ کیا میرا راستہ پر امن ہے؟ اور مجھے منزل تک پہنچائے گا یا نہیں؟۔ یا پھر پہلا انسان ایسی بات کہے؛ تو عقلاً صرف اس آدمی کے قول کی بنا پر اس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اہل عقل کے نزدیک ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ یہ انسان [اس پوچھنے والے کے لیے کوئی حیلہ گری کر رہا ہو]؛ تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ لیکر چلے' اور راستہ میں اسے قتل

❶ [[ہم اہل سنت والجماعت معتدل امت ہیں۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ راہ حق ہے؛ اور اس راہ پر چلنے میں کامیابی یقینی ہے۔ مگر متعین اشخاص و افراد کے متعلق بھلے وہ امام وعلماء ہی کیوں نہ ہوں' یہ دوٹوک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ ہر حال میں نجات یافتہ ہیں۔ بلکہ ہم اللہ تعالیٰ سے ان کے بارے میں نجات کی امید رکھتے ہیں' اور ان کی بخشش کے لیے دعا کرتے ہیں اور ایسے ہی اپنی ذات کے متعلق دوٹوک طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہر حال میں جنت میں ہی جائیں گے؛ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لے' اور وہ مہربان ذات ہماری مغفرت کردے۔ ہمارے ہاں نجات کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بعد توحید کی پابندی اور اعمال صالحہ کی بجا آوری ضروری ہے۔ جب کہ شیعہ مشائخہ کے ہاں فقط نسبت کام آسکتی ہے۔ اور ان کے مشائخ ہر حال میں مغفور و بخشے ہوئے ہیں۔ دلدار جی]]۔

کردے اور اس کا مال و اسباب چھین لے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسان راستے کی حقیقت سے لاعلم ہو اسے راستہ کے خوف اور بدامنی کا کوئی پتہ ہی نہ ہو۔جب کہ دوسرا انسان سوال کرنے والے کیلئے کوئی گارنٹی نہیں دیتا۔ بلکہ اسے خود غور و فکر کرنے کے لیے کہتا ہے۔پس ایسے موقع پر انسان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ خودسوچ و بچار کرے کہ اسے کون سے راستہ پر چلنا چاہیے؟۔کیا ان دونوں راستوں میں سے ہی کوئی ایک سیدھا راستہ ہے یا ان کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ بھی ہے؟۔

اگر ان دونوں میں سے ہر ایک انسان یہ دعوی کرے کہ میرا راستہ پر امن ہے' اور ہمیں منزل تک پہنچائے گا[تو پھر چاہیے تو یہ تھا کہ]ان دونوں کی بغیر کسی توقف کے تصدیق کی جائے ۔ حالانکہ [اس سے لازم آتا ہے کہ]ان میں سے ہر ایک جاہل اور دروغ گو ہے۔[یہی حال شیعہ مصنف کا ہے] ۔مشتبہ مسائل میں اس کا دعوی ہے کہ ہمارا قول ہی اس میں درست اور حق پر ہے۔اور میں دوٹوک طور پر یہ کہہ سکتا ہوں۔اس لیے میں ان دونوں گروہوں کی نسبت اتباع کا زیادہ حقدار ہوں جو مسائل میں غور و فکر کرتے ہیں' اور پھر ان سے استدلال کرتے ہیں۔تو پھر چاہیے تھا کہ یہ جھوٹے مشائخ جو اپنے مریدوں کے لیے جنت کی ضمانت دیتے ہیں۔اورانہیں آسرا دلاتے ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہوں گی۔ اور یہ کہ جوکوئی بھی ان سے محبت کرے گا وہ جنت میں داخل ہوجائے گا؛ اور جوکوئی انہیں مال دے گا؛ وہ اس کے بدلے میں انہیں وہ حال دیں گے جس سے وہ اللہ ذو الجلال کے قریب ہوجائیں گے۔

پھر یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت اتباع کے زیادہ حق دار ہوتے جو اہل علم و عدل ؛سچائی کے پیکر ہیں ؛ اور کسی چیز کی ضمانت بھی نہیں دیتے سوائے اس چیز کی ضمانت کے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے والوں کو دی ہے۔اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ائمہ اسماعیلیہ جیسے معز اور حاکم ائمہ اثنا عشریہ کی نسبت اتباع کے زیادہ حق دار ہوں ۔اس لیے کہ یہ لوگ اثنا عشریہ سے بڑھ کر غیب کا علم جاننے' باطن شریعت کے کشف؛ اور اعلی درجات کے دعویدار ہیں۔ یہ لوگ محرمات کو حلال سمجھنے اور واجبات ترک کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو جنت کی ضمانت بھی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ : ہم نے آپ سے نمازیں اور روزے اور زکوۃ اور حج ساقط کردیے ہیں۔اور ہم اس کا دوٹوک یقین رکھتے اور اظہار کرتے ہیں۔

اثنا عشری کہتے ہیں:''کوئی انسان اس وقت تک جنت کا مستحق نہیں ہوسکتا جب تک وہ محرمات کو ترک نہ کردے اور واجبات کو بجانہ لائے۔اگر پختہ نجات ، کے صرف دعوی پر ان کی اتباع کرنی چاہیے تو پھر یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت سے اتباع کے زیادہ حق دار ہیں جو کہتے ہیں: جب تم گناہ کروگے تو تمہیں سزا ہوسکتی ہے ؛ یہ احتمال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کردے ۔ پس یہ انسان خوف اور امید کے درمیان میں رہتا ہے۔اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔اس سے واضح ہوگیا کہ صرف اپنی نجات کے پختہ یقین کا دعوی کرلینا کسی کے اہل علم اور سچا ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔اور ایسے موقع پر اہل عقل لوگوں کی عادت یہ ہے کہ توقف اختیار کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے لیے دلیل کی روشنی میں مسئلہ واضح ہوجائے۔

چوتھی وجہ: شیعہ کا یہ قول کہ'' شیعہ اپنے ائمہ کے ناجی ہونے پر یقین رکھتے ہیں، جب کہ اہل سنت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔''

جواب : اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ ایسا اعتقاد رکھنے والا ہر ایک انسان ضرور جنت میں جائیگا، خواہ وہ شرعی اوامر کا تارک ہو اور منہیات سے کنارہ کش نہ رہتا ہو؛ تو بلاشبہ یہ امامیہ کا قول نہیں بلکہ کوئی ذی عقل اسے تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔

اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ایک ایسی عظیم نیکی ہے جس کی موجودگی میں کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا

تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے شخص کو نمازوں کے ترک کرنے، زنا کاری کا ارتکاب کرنے اور بنی ہاشم کا خون بہانے سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، بشرطیکہ وہ حب علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ دار ہو۔ اگر شیعہ یہ کہیں کہ سچی محبت تبھی ہو سکتی ہے، جب محبّ دیگر اعمال میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلتا ہو تو انہوں نے از خود اداء واجبات اور ترک منکرات کی ضرورت کو تسلیم کر لیا۔

اگر شیعہ مصنف یہ کہنے کے درپے ہے کہ جو شخص عقائد صحیحہ رکھتا ہو، واجبات کو ادا کرتا ہو؛ اور منکرات سے باز رہتا ہو وہ جنت میں جائے گا۔ تو بلاشبہ اہل سنت بھی یہی کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی اتباع میں اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے ہر متقی کے لیے نجات یقینی ہے۔ البتہ وہ کسی متعین شخص کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہتے کہ: وہ جنت میں جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا زمرہ متقین میں شامل ہونا قطعیت کے ساتھ تو معلوم نہیں۔ جب کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی موت تقویٰ پر ہوئی ہے تو اس کا جنتی ہونا بھی معلوم ہو جائے گا۔ بنا بریں اہل سنت ان لوگوں کو جنتی قرار دیتے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت ﷺ نے دی ہے۔ [1]

جو شخص لوگوں میں اپنے اوصاف حمیدہ کی بنا پر معروف ہو اور لوگ اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے ہوں، تو اس کے بارے میں اہل سنت کے دو قول ہیں:

مذکورۃ الصدر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ شیعہ کے یہاں کوئی ایسا محمود جزم و وثوق نہیں پایا جاتا جو اہل سنت میں موجود نہ ہوں۔ اگر شیعہ کہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی شرعی واجبات پر عمل پیرا اور منہیات سے باز رہنے والا دیکھتے ہیں اسے قطعی جنتی قرار دیتے ہیں خواہ اس کے باطن کا حال ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس مسئلہ کا امامیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس کی جانب کوئی صحیح راستہ جاتا ہے تو بالاتفاق اہل سنت کا راستہ ہے اور کوئی راستہ موجود نہیں تو یہ قول بلاعلم ہے جو کسی فضیلت کا موجب نہیں، بلکہ اس کا نہ ہونا فضیلت کا باعث ہے۔

بہر حال شیعہ جس علم صحیح کے بھی دعویٰ دار ہوں اہل سنت ان کی نسبت اس کے زیادہ حق دار ہوں گے اور اگر وہ جہالت کے مدعی ہوں تو جہالت ایک نقص ہے اور اہل سنت اس سے بعید تر ہیں۔

اور کسی مخصوص آدمی کے جنتی ہونے کی گارنٹی یا تو معصوم [2] (نبی ﷺ) کے قول کی بنا پر دی جا سکتی ہے یا مومنین کے متفق علیہ قول کی وجہ سے۔ اس لیے کہ اہل ایمان اس خطہ ارضی پر اللہ کے گواہ ہیں، حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سے ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے مرنے والے کی مدح وستائش کی، یہ سن کر آپ نے فرمایا:

"وَجَبَتْ" (واجب ہوگئی)۔ پھر ایک اور جنازہ گزرا اور لوگوں نے اس کی مذمت کی تو آپ نے وہی الفاظ دہرائے۔ صحابہ نے جب رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مفہوم دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: "جس جنازہ کی تم نے

---

[1] مثلاً صحابہ کرام میں سے دس حضرات کے بارے میں سالار رسل ﷺ نے جنتی ہونے کا مژدہ سنایا، مگر شیعہ رسول اللہ ﷺ کی بشارت سے صرف نظر کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا ان سب اصحاب کو جہنمی قرار دیتے ہیں، ان کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ اس سے بڑھ کر وہ افضل الصحابہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو "جبت و طاغوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

[2] معصوم سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے، ان کے سوا اس امت میں دوسرا کوئی معصوم نہیں، آپ نے دس صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق جنت کا مژدہ سنایا ہے، شیعہ اس بشارت کو تسلیم نہیں کرتے۔

تعریف کی اس کیلئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی مذمت کی اس کے لیے جہنم ،تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔ ❶

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' قریب ہے کہ تم اہل جہنم میں سے اہل جنت کو پہچان لو۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیسے؟ آپ نے فرمایا: لوگوں کے اچھی اور بری تعریف کرنے کی وجہ سے۔'' [مسند احمد ٣/ ٤١٦۔]

اور بسا اوقات اس کا سبب مسلسل مؤمنین کے لیے نیک خواب کا دیکھنا بھی ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

'' میرے بعد نبوت میں سے صرف اچھے خواب باقی رہ گئے ہیں۔ جو کہ نیک انسان خواب میں دیکھتا ہے یا اسے دیکھایا جاتا ہے۔'' [البخاري٩/ ٣١؛ مسلم ١/ ٣٤٨۔]

آپ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں سوال کیا گیا:

﴿لَهُمُ الْبُشْرٰی فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ [یونس ٦٤]

''ان کے لیے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشخبری ہے۔''

تو آپ نے فرمایا: ''یہ اچھے خواب ہیں جو نیک انسان دیکھتا ہے یا اسے دیکھایا جاتا ہے۔'' [الترمذي٣/ ٣٦٤]

اس کی تفسیر اہل ایمان کے تعریف کرنے سے بھی کی گئی ہے۔آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ ﷺ! کوئی انسان اپنی ذات کے لیے نیک کام کرتا ہے' اور لوگ اس پر اس کی تعریف کرتے ہیں؛ تو آپ نے فرمایا: ''یہ اسے جلدی میں ہی مل جانے والی خوشخبری ہے۔'' [مسلم ٤/ ٢٠٣٤؛ مسند أحمد ٥/ ١٥٦۔]

خواب کبھی کبھار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں اور کبھی انسان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں اور کبھی کبھار شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ جب اہل ایمان کا خواب کسی بات کے مطابق ہو جائے تو وہ حق ہوتا ہے؛ جیسا کہ بسا اوقات خواب اور روایات اور رائے میں مطابقت پائی جاتی ہے۔اس لیے کہ ایک انسان کبھی جھوٹ بھی بول سکتا ہے' اور اس سے غلطی بھی ہوسکتی ہے۔اور کبھی رائے میں خطاء بھی ہوسکتی ہے۔ یا جان بوجھ کر باطل بھی کرسکتا ہے۔لیکن جب تمام [اہل ایمان] لوگ جمع ہو جائیں تو وہ کبھی بھی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتے۔ اور جب روایات تواتر کے ساتھ ہوں تو ان سے حاصل کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی معاملہ خواب کا بھی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

'' میں دیکھتا ہوں کہ تمہارا خواب میں دیکھنا آخری سات راتوں کے مطابق ہے تو جو آدمی لیلۃ القدر کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔'' [صحیح مسلم:ح ٢٦٧]

❶ صحابہ کی شان میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ'' تم کائنات ارضی پر اللہ کے گواہ ہو۔'' صحابہ کی عظیم مدح ومنقبت پر مشتمل ہے، بنی اسرائیل کے کسی نبی نے اگر ان کی مدح میں ایسا کوئی جملہ کہا ہوتا تو اسرائیلی اس دن کو ایک بڑا مذہبی تہوار بنا لیتے اور ایسے کلمات کو بڑی اہمیت کا حامل سمجھتے، مگر شیعہ صحابہ کی شان میں واردشدہ مدحیہ کلمات کو چنداں وقعت نہیں دیتے، رسول اللہ کا ارشاد گرامی " انتم شهداء الله فی الارض " دراصل سورہ بقرہ کی آیت "لتکونوا شهداء علی الناس " کی جانب اشارہ ہے۔ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد مبارک سے صریح انکار غضب الٰہی کو دعوت دینے کے سوا اور کیا ہے؟۔صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت، (ح:١٣٦٧)، صحیح مسلم: کتاب الجنائز، باب فیمن یثنی علیه خیر أو شر من الموتی، (ح:٩٤٩)۔

یہ باب بھی اہل سنت والجماعت کے ہاں شیعہ کی نسبت کامل و اکمل ہے۔انہیں اپنی سعادت و کامیابی کے علم اور اس کے حصول کے لیے کوئی ایسی علمی راہ میسر نہیں ہے جس پر اہل سنت والجماعت گامزن نہ ہوں۔

[کامیابی ونجات پر یقین]:

پانچویں وجہ: یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اہل سنت اپنے ائمہ کی فلاح ونجات پر جس پختگی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں؛ شیعہ اس سے محروم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اہل سنت کے ائمہ سابقین اولین مہاجرین و انصار ہیں؛ جو ان کے نزدیک قطعی جنتی ہیں۔ اہل سنت کے یہاں یہ امر مسلم ہے کہ عشرہ مبشرہ یقیناً جنتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدری صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

((اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ .))[1]

''تم جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔''

اہل سنت اس سے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی تھی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا، جیسا کہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔[2] اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ بیعت الشجرہ میں شرکت کرنے والے چودہ صد سے زائد صحابہ اہل سنت کے امام ہیں، اور یہ قطعی جنتی ہیں، اور ان میں سے کوئی ایک بھی جہنم میں نہیں جائے گا۔ یہ دعوی علم کی روشنی میں ہے' اور اس پر کتاب وسنت کے دلائل پر مبنی ہے۔

چھٹی وجہ: اہل سنت جن لوگوں کے حق میں جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں، خواہ مطلقاً ہو یا معیناً؛ ان کی شہادت علم و دلیل پر مبنی ہے۔ اس کے عین برخلاف روافض اگر گواہی دیتے ہیں تو ایسی بات کی گواہی دیتے ہیں جس کی حقیقت کے بارے میں وہ خود بھی کچھ نہیں جانتے؛ یا پھر ان کی شہادت جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہے؛ اور انہیں اس کے جھوٹ ہونے کے بارے میں علم بھی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ کو کہنا پڑا:

" مَا رَاَیْتُ قَوْمًا اَشْھَدَ بِالزُّوْرِ مِنَ الرَّافِضَۃِ "

''میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی شہادت دینے والا کسی قوم کو نہیں دیکھا۔''

ساتویں وجہ: یہ امر قابل غور ہے کہ شیعہ جس امام کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں یا تو وہ ہر چیز میں واجب الاطاعت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے اہل ایمان لوگ اس ضمن میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ یا اس کی اطاعت صرف انہی امور میں کی جائے گی جو اللہ و رسول کے بیان کردہ ہوں؛ یا اس کے اجتہاد پر مبنی ہوں۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب اس سے بڑھ کر کسی اہل علم اور افضل کا علم نہ ہو۔ بصورت اول اہل سنت والجماعت کے یہاں ایسا کوئی امام ہی نہیں جس کی ہر بات اور ہر حکم میں اطاعت کی جاتی ہو سوائے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے۔ ان کا قول وہی ہے جو کہ امام مالک، مجاہد اور حکم رحمہم اللہ فرمایا کرتے تھے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً(حدیث:۳۹۸۳، ۳۰۰۷) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة (حدیث: ۲٤۹٤)

[2] صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل اصحاب الشجرة (حدیث: ۲٤۹٦)۔

''ہر شخص کی بات کو (بشرط صحت) تسلیم بھی کیا جا سکتا ہے اور (غلط ہونے کی صورت میں) رد بھی کیا جا سکتا ہے، مگر سرور کائنات ﷺ کی ہر بات قابل تسلیم ہے۔''

اہل سنت اپنے امام (سالار رسل ﷺ) کو خیر الخلائق قرار دیتے اور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کی پیروی کرنے والا ہر شخص جو آپ کے اوامر کو بجالاتا ہو اور منع کردہ چیزوں سے رک جاتا ہو؛ وہ جنت میں جائے گا۔ یہ شہادت شیعہ کی اس یقین دہانی سے اتم و اکمل ہے کہ امام عسکری کے متبعین اور ان کے ہمنوا و امثال جنتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اہل سنت کا امام اور ان کی شہادت دونوں شیعہ کی شہادت کی نسبت زیادہ مکمل اور قابل اعتماد ہیں۔ ان دونوں کے مابین کوئی برابری اور مساوات نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ءٰٓ اللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [النمل ۵۹]

''کیا اللہ بہتر ہے یا جو کچھ وہ شریک ٹھہراتے ہیں؟۔''

مقابلہ کے وقت خالص شر اور برائی کے مقابلہ میں خالص نیکی اور بھلائی کا ذکر کیا جائے گا؛ اگرچہ شر میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔

اگر شیعہ کی مراد امام سے محدود و مقید امام ہے؛ تو اہل سنت کے نزدیک کوئی امام اس وقت تک واجب الاطاعت نہیں جب تک اسکے اوامر امام مطلق سرور کائنات ﷺ کے ارشادات سے ہم آہنگ نہ ہوں۔ اہل سنت جب شرعی حکم کے مطابق اللہ تعالیٰ کے احکام میں ایسے امام کی اطاعت کرتے ہیں تو انہیں اس بات کی مطلقاً پروا نہیں ہوتی کہ آیا وہ جنت میں جائے گا یا نہیں، اس لیے کہ وہ دراصل اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کر رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح امام معصوم کی اتباع بعض اوقات اس کے نائبین کی اطاعت کرتے ہیں، حالانکہ وہ دوزخی بھی ہوسکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض اوقات امام کے نائب یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا وہ وہی حکم دیتے ہیں جو حکم امام معصوم نے دیا ہے۔ کیونکہ انہیں امام معصوم کے کسی حکم کا کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی کسی سے ڈھکے چھپے نہیں؛ جب کوئی اہل سنت حدیث کے مطابق حکم دیتا ہے تو یہ بات فوراً معلوم ہوجاتی ہے کہ کون ان کے موافق حکم دے رہا ہے اور کون مخالف۔ اختلافی امور کا فیصلہ اجتہاد سے کرلیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حدیث نبوی پر عمل پیرا ہونا امام معصوم کے نائبوں کی اطاعت کرنے سے بدر جہا افضل ہے۔

خصوصاً جب کہ یہ پتہ بھی نہ ہو کہ امام غائب نے کیا حکم دیا، اور نہ اس کی کچھ خبر ہو کہ نائب آیا امام کے موافق ہے یا مخالف۔ اگر شیعہ یہ دعویٰ کریں کہ نائبین اپنے پیش کردہ علماء کے اقوال پر عمل پیرا اور ان کے عالم ہوتے ہیں۔ تو اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اہل سنت کے علماء کو حدیث نبوی کے بارے میں جو علم حاصل ہے وہ ان کے علم سے بدر جہا اتم و اکمل ہے۔ اگر کسی شیعہ سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے امام سے کوئی روایت صحیح بتلادے تو وہ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ کا درجہ احادیث کی اسناد اور اسماء الرجال کے فن میں اہل سنت کے علماء کی نسبت فروتر ہے۔

[کامیابی کا دار و مدار]:

آٹھویں وجہ: رافضی کے کلام کا جواب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو کامیابی اور سعادت کی ضمانت دی ہے جو اس کی اطاعت کریں اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں۔ اور جو لوگ ایسا نہ کریں انہیں شقاوت و بدبختی سے ڈرایا ہے۔

پس سعادت کا دارو مدار اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، جیسے نبی اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ بہترین ساتھی ہیں۔''

اور اس طرح کی دیگر آیات بھی بہت سی ہیں۔

جب معاملہ ایسے ہی ہے تو اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن ۱۶]

''تم سے جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

پس جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں اپنی وسعت بھر کوششیں کرے؛ وہ ان شاء اللہ تعالیٰ اہل جنت میں سے ہوگا۔ پس رافضیوں کا یہ کہنا کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوگا جو امامیہ میں سے ہوگا؛ یہ بالکل یہود و نصاری کے قول کی طرح ہے؛ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ❀ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [البقرۃ ۱۱۱۔۱۱۲]

''یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاری کے سوا اور کوئی نہ جائے گا یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ: اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو۔سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔''

اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس منتظر کے دعویدار رافضی ہیں؛ اس کی اطاعت کسی ایک پر بھی واجب نہیں ہے۔اس لیے کہ اس سے کسی منقول قول کا علم حاصل ہی نہیں ہوسکا۔پس پھر جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرے گا' وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ بھلے وہ اس خود ساختہ امام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔اور جو کوئی اس امام پر ایمان رکھتا ہو وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کرلے۔اس لیے کہ سعادت کا دارو مدار اپنے عدم اور وجود کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ہے۔پس یہی چیز اطاعت گزاری اہل جنت اور اہل جہنم میں فرق کرنے والی ہے۔محمد رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان وجہ فرق ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنی خلقت کو آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے' اور اس طرف رہنمائی فرمائی ہے۔پس اس سے ظاہر ہوگیا کہ اہل سنت والجماعت ان لوگوں کی نجات کے بارے میں پختہ یقین رکھتے ہیں جو کہ سنت پر پابند ہوں۔

❀❀❀❀

فصل:

جھوٹا رافضی دعوی اور مذہب کی ظاہری چمک

[اشکالات] شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''شیعہ مذہب کی صداقت کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ:''انہوں نے یہ مذہب ان ائمہ معصومین سے اخذ کیا ہے جو علم و فضل؛ زہد و ورع میں شہرت رکھتے تھے۔اور ہر وقت دعا و عبادت اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے۔ان کا یہی حال بچپن سے لیکر آخری عمر تک رہا۔اور ان میں ایسے بھی تھے جو لوگوں کو علوم سکھانے میں مشغول رہتے۔ان ہی کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی:﴿هل أتی﴾ [الإنسان ۱]۔اور آیت طہارت؛اور ان کے لیے وجوب محبت کی آیت؛اور آیت مباہلہ وغیرہ اسی بارے میں نازل ہوئیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کثرت عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپ جنگوں میں مشغول رہنے کے باوجود شب و روز میں ایک ہزار رکعات نوافل پڑھا کرتے تھے۔''

ان میں سب سے پہلے امام حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب مخلوق میں سے فضل ترین انسان تھے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرار دیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾ [آل عمران ۶۱] ''اور ہمارے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا بھائی بنایا؛ اور اپنی بیٹی کو آپ کی زوجیت میں دیا۔آپ کی فضیلت کسی پر مخفی نہیں ہے۔ آپ سے بہت سارے معجزات ظاہر ہوئے۔یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے آپ کے رب ہونے کا دعوی کیا؛ پھر انہیں قتل کر دیا گیا۔پھر یہی بات ان کی جگہ کچھ دوسرے لوگ کہنے لگے: جیسے کہ غالیہ اور نصیریہ وغیرہ۔آپ کے دو بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؛ جو کہ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔اور وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح اور واضح حکم کے مطابق امام تھے۔یہ دونوں حضرات اپنے دور کے سب سے بڑے زاہد اور بڑے عالم تھے۔انہوں نے اللہ کی راہ میں ایسے جہاد کیا جیسے جہاد کرنے کا حق ہے؛ یہاں تک کہ دونوں اللہ کی راہ میں شہید کر دیے گئے۔حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے فاخرانہ لباس کے نیچے اون کا لباس اس طرح پہنا کرتے تھے کہ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی دائیں ران پر بٹھایا اور ابراہیم کو اپنی بائیں ران پر بٹھایا؛ تو جبریل امین نازل ہوئے اور فرمایا:''اللہ تعالیٰ ان دونوں کے آپ کے لیے جمع نہیں کرے گا۔آپ ان دونوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اگر حسین مر گیا تو میں علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہم تینوں روئیں گے۔اور اگر ابراہیم مر گیا تو اس پر مجھے ہی رونا پڑے گا؛ پس میں ابراہیم کی موت کو اختیار کرتا ہوں۔اس واقعہ کے تین دن بعد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔اور اس کے بعد جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لاتے تو آپ فرماتے:'' خوش آمدید و مرحبا اے بیٹے! جس کے بدلے میں میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کی قربانی پیش کی ہے۔اسی طرح امام زین العابدین اور امام

باقر بھی بڑے عابد شب زندہ دار تھے اور کتاب اللہ کی تلاوت میں مگن رہتے ۔ اور دن و رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔اور ہر دو رکعتوں کے بعد اپنے آباء کرام سے منقول دعائیں پڑھا کرتے ۔اور بے قراری کے عالم میں مصحف کو چھوڑ دیتے؛......اور پھر فرمایا کرتے: مجھے علی رضی اللہ عنہ والی عبادت کہاں نصیب ہوگی؟۔آپ بہت زیادہ رویا کرتے تھے یہاں تک کہ کثرت گریہ کی وجہ سے آپ کے گالوں کا گوشت ختم ہوگیا تھا۔اور آپ کو لمبے سجدہ کرنے کی وجہ سے آپ کوذا ثـــفــــن (لمبا سجدہ کرنے والا] کا نام دیا گیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو زین العابدین کا خطاب دیا تھا۔جب ہشام بن عبد الملک نے حج کیا تو حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش کی؛ مگر رش کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔اتنے میں زین العابدین تشریف لائے؛ تو لوگ ٹھہرے گئے ؛ اور آپ کے لیے جگہ چھوڑ دی؛ یہاں تک کہ آپ نے حجر اسود کا استلام کیا۔اس وقت آپ کے علاوہ کوئی ایک بھی حجر اسود کے پاس باقی نہ رہا۔ یہ دیکھ کر ہشام بن عبد الملک نے کہا: یہ کون ہے؟ تو فرزدق نے جواب میں اپنے مشہور اشعار کہے۔تو حضرت زین العابدین نے فرزدق کو ہزار دینار بھیجے ۔اس نے وہ دینار واپس کر دیے؛ اور کہا: میں نے یہ اشعار اللہ اور اس کے رسول کی وجہ سے غصہ کھاتے ہوئے کہے ہیں میں ان پر کوئی اجرت نہیں لیتا۔تو حضرت علی بن الحسین رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا:''ہم اہل بیت ہیں ؛ جو کچھ ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے' ہم اسے واپس نہیں لیا کرتے ۔تو فرزدق نے وہ دینار قبول کر لیے۔

مدینہ میں کچھ لوگ تھے جنہیں رات میں ان کا غلہ پہنچ جایا کرتا تھا؛ مگر انہیں علم نہیں ہوتا تھا کہ یہ کہاں سے آتا ہے۔جب زین العابدین کا انتقال ہوگیا تو اس رزق کا آنا بند ہوگیا؛ تو انہیں پتہ چل گیا کہ یہ زین العابدین کی طرف سے تھا۔آپ کا بیٹا محمد الباقر لوگوں میں سب سے بڑا عابد وزاہد انسان تھا۔آپ کی پیشانی پر سجدہ کی وجہ سے نشان پڑ گئے تھے۔آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا نام باقر رکھا تھا۔ جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے ۔آپ اس وقت بہت چھوٹے تھے؛ جابر نے کہا: آپ کے نانا نے آپ کو سلام کہا ہے ۔آپ نے کہا: اور میرے نانا پر بھی سلام ہو۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا:''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا: اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آپ کی گود میں کھیل رہے تھے ۔آپ نے فرمایا:''اے جابرؓ! اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؛ اس کا نام علی ہوگا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو آواز لگانے والا آواز لگائے: سید العابدین کہاں ہے' اسے چاہیے کہ وہ کھڑا ہو جائے ۔تو اس کا بیٹا کھڑا ہوگا۔ پھر اس کے گھر ایک بیٹا پیدا ہوگا؛ اس کا نام محمد الباقر ہوگا۔وہ ایک بار پڑھنے سے سارا علم حاصل کرلے گا۔ جب تم اس کو دیکھو تو اسے میرا سلام کہنا۔آپ سے ابو حنیفہؒ اور دوسرے علماء نے روایات نقل کی ہیں ۔آپ کا بیٹا الصادق اپنے زمانہ کا سب سے افضل اور عابد انسان تھا۔علماء سیرت کا کہنا ہے: آپ حکومت طلبی چھوڑ کر عبادت میں ہی مشغول رہے ۔عمر بن ابو المقدام کہتے ہیں: جب میں جعفر بن محمد الصادق کی طرف دیکھا کرتا تو پتہ چل جاتا تھا کہ آپ انبیاء کی اولاد میں سے ہیں ۔آپ نے ہی فقہ امامیہ؛ معارف حقیقت اور عقائد یقینیہ کی نشرواشاعت کا کام کیا۔آپ جب بھی کسی بات کی خبر دیتے تو وہ بالکل ویسے ہی پوری ہوتی۔ بلکہ آپ کا نام صادق اور امین رکھا گیا تھا۔اور عبداللہ بن الحسن نے تمام علویوں کو اپنی اولاد کی بیعت کے لیے جمع کیا

تھا۔تو امام صادق نے فرمایا: ایسے نہیں ہو سکتا۔ اس پر عبداللہ کو غصہ آ گیا۔اور اس نے کہا: یہ پیلے جبے والے کا ساتھی ہے ۔اس سے منصور کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔۔ جب منصور تک یہ خبر پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا کیونکہ جیسے آپ نے خبر دی تھی ویسے ہی ہونا تھا۔اور اس نے جان لیا کہ اب خلافت اسے مل کر رہے گی۔اور جب وہ بھاگ رہا تھا تو کہہ رہا تھا: تمہارے صادق کی پیشین گوئی کہاں ہے؟اور پھر بعد میں خلافت اسے ہی مل کر رہی۔

آپ کا بیٹا موسیٰ الکاظم ہے؛ اسے العبد الصالح [نیک انسان] کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عابد و زاہد تھے۔دن کو روزہ رکھتے اور رات کو نماز پڑھتے رہتے ۔آپ کو کاظم اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جب آپ کسی کے متعلق سنتے کہ وہ آپ کی برائی بیان کر رہا ہے تو آپ اس کے پاس کچھ مال بھیج دیا کرتے ۔آپ کے فضائل موافقین و مخالفین نے نقل کیے ہیں۔حنابلہ میں سے ابن جوزی رحمہ اللہ کہتے ہیں: شقیق البلخی سے روایت کیا گیا ہے :'' وہ کہتے ہیں: میں ایک سو چورانوے ہجری میں حج کے لیے نکلا۔ پس میں نے وہاں پر ایک نوجوان کو دیکھا ؛ خوبصورت چہرہ اور گوری رنگت ۔اس پر اونی لباس تھا؛ جو کہ شملہ پر مشتمل تھا۔اور اس کے پاؤں میں دو جوتیاں تھیں۔وہ لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔میں نے اپنے جی میں کہا:'' یہ نوجوان صوفیاء میں سے ہے جو لوگوں پر بوجھ بننا چاہتا ہے ۔اللہ کی قسم ! میں اس کے پاس جاؤں گا اور اسے جھڑکوں گا۔جب میں آپ کے قریب ہوا؛ تو آپ نے مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا۔آپ نے فرمایا: اے شقیق ! بدگمانی سے بہت زیادہ بچا کر۔اس لیے کہ بدگمانی گناہ کا کام ہے۔میں نے اپنے جی میں کہا: یہ کوئی نیک انسان ہے' اس نے وہی بات کہی جو میرے دل میں تھی۔میں ضرور اس کے پاس جاؤں گا' اور اس سے سوال و جواب کروں گا۔تو آپ میری نظروں سے غائب ہو گئے ۔جب ہم نے اگلی منزل پر پڑاؤ ڈالا تو آپ وہاں پر نماز پڑھ رہے تھے۔اور آپ کے اعضاء کانپ رہے تھے ۔اور آنسو رواں دواں تھے۔میں نے کہا: میں ان کے پاس جا کر معذرت کروں گا۔آپ نے نماز مختصر کی ؛ اور فرمایا: اے شقیق ![اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی﴾ [طه ۸۲]

''اور بیشک میں انہیں بخش دینے والا ہوں جو توبہ کریں ایمان لائیں نیک عمل کریں اور راہ راست پر بھی رہیں۔''

میں نے کہا:'' یہ کوئی ابدال ہے ۔آپ نے دو بار میری اسرار کی بات کہی ہے۔جب ہم نے اگلے مقام پر پڑاؤ ڈالا تو دیکھا کہ آپ وہاں پر کنوئیں پر کھڑے؛ آپ کے ہاتھ میں چھاگل ہے اور پانی نکال کر پلا رہے ہیں ؛آپ کے ہاتھ سے چھاگل کنوئیں میں گر گیا۔آپ نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں اور کہا:

'' اے اللہ ! تو میرا رب ہے جب مجھے پانی کے لیے پیاس محسوس ہو' اور تو ہی میرا کھانا ہے جب مجھے کھانے کی حاجت ہو۔'' اے میرے آقا! میرے لیے اس کے سوا کوئی نہیں۔شقیق بلخی کہتے ہیں:'' اللہ کی قسم ! میں نے دیکھا کنوئیں کا پانی بلند ہوا؛ آپ نے چھاگل لیا؛ اور اسے بھر لیا؛ پھر وضوء کر کے چار رکعت نماز پڑھی۔پھر وہاں پر ایک ریت کے ٹیلے کے پاس چلے گئے آپ ایک ایک مٹھی [ریت] بھر کر چھاگل میں ڈالتے اور اس سے پیتے جاتے ۔میں نے کہا: جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے دیا ہے' اور جو آپ پر انعام کیا ہے ؛ اس میں سے مجھے بھی کچھ کھلا دیجیے۔آپ نے فرمایا:'' اے شقیق ! ہم پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ظاہری و باطنی نعمتیں جاری و ساری رہی ہیں ۔اپنے رب سے اچھا گمان رکھیں۔پھر

آپ نے مجھے وہ چھاگل پکڑا دیا۔ میں نے جب اس میں سے پیا تو دیکھا کہ وہ ستو اور شکر تھا۔ اللہ کی قسم! میں نے اس سے میٹھا اور خوشبودار کبھی بھی نہیں پیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر میں کئی دن ایسے ہی رہا۔ نہ ہی مجھے کھانے کی خواہش ہوتی اور نہ ہی پیاس لگتی۔ پھر میں نے آپ کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ پھر ایک رات میں نے آپ کو میزاب کے قریب قبہ کے پاس دیکھا۔ آپ آدھی رات میں خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے۔ آپ ساری رات ایسے ہی روتے رہے۔ جب صبح طلوع ہوگئی تو آپ اپنی نماز کی جگہ پر بیٹھ گئے اور تسبیح میں مشغول ہو گئے۔ پھر آپ نماز فجر کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور اس کے بعد بیت اللہ کے سات چکر لگائے۔ پھر آپ باہر نکل گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے اموال ساز و سامان اور غلام ہیں۔ اب آپ کی وہ حالت نہیں تھی جو میں نے راستہ میں دیکھی تھی۔ لوگ آپ کے گرد گھوم رہے ہیں' اور آپ کو سلام کرتے ہیں' اور تبرک حاصل کرتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے کہا ہے: یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ''موسی بن جعفر۔ میں نے کہا: مجھے بھی یہی تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے عجائب صرف کسی سید سے ہی صادر ہو سکتے ہیں۔'' یہ حنبلی کی روایت ہے۔

آپ کے ہاتھ پر بشر الحافی نے توبہ کی۔ اس لیے کہ آپ کا بغداد کے ایک محلے سے گزر ہوا۔ آپ نے ساز و موسیقی اور گانے بجانے کی آوازیں سنی۔ اور لوگ ایک گھر سے نکل رہے تھے۔ وہاں سے ایک لونڈی نکلی۔ اس کے ہاتھ میں کوڑے والا تھیلا تھا۔ وہ اسے لیکر گلی میں سے گزری۔ آپ نے اس لونڈی سے کہا: اے لڑکی! اس گھر والا آزاد ہے یا غلام؟ اس نے کہا: آزاد ہے۔ تو آپ نے فرمایا: ''تم نے سچ کہا: اگر غلام ہوتا تو اپنے آقا سے ڈرتا۔ جب وہ لونڈی واپس گھر میں گئی تو اس کے آقا نے جو کہ اس وقت نشہ کی حالت میں تھا؛ اس سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی؟ تو اس نے کہا: ایک آدمی نے مجھ سے ایسے ایسے کہا ہے۔ آپ یہ سن کر ننگے پاؤں موسی بن جعفر کے پیچھے نکل پڑے یہاں تک کہ انہیں جالیا اور ان کے ہاتھ پر توبہ کی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[سلسلہ جوابات]: ان باتوں کا جواب کئی طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلا جواب: ہم شیعہ کا یہ دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے کہ انہوں نے یہ مذہب اہل بیت سے اخذ کیا ہے؛ نہ ہی اثنا عشریہ نے اور نہ ہی کسی دوسرے نے۔ کیونکہ شیعہ جن اصولوں میں بھی اہل سنت سے متفرق ہوئے ہیں ان تمام اصولوں اور فروعات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت کی مخالفت کرتے ہیں؛ جیسے توحید؛ عدل اور امامت۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت صفات الٰہی اور تقدیر کا اثبات کرتے ؛خلفاء ثلاثہ کی خلافت اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت کے قائل ہیں۔ اسی طرح دیگر بھی کئی ایک مسائل ہیں جن میں رافضی مذہب تناقض کا شکار ہے۔ جو کہ اہل علم کی کتابوں میں منقول موجود ہیں اس باب میں ائمہ اہل بیت سے منقول علوم کی معرفت سے پتہ چلتا ہے کہ رافضی اہل بیت کے مخالف ہیں موافق نہیں ہیں۔

دوسرا جواب: اس سے کہا جائے گا کہ: یہ بات معلوم شدہ ہے کہ رافضیوں کے مابین امامت؛ صفات الٰہیہ اور تقدیر اور اس کے کئی ایک اصول دین کے مسائل پر بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ تو پھر ان میں سے کون سا قول اہل بیت سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک کہ مسئلہ امامت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور اس باب میں ان کا اضطراب و اختلاف بڑا مشہور ہے۔

اس سے پہلے مہدی منتظر اور امام منصوص کے بارے میں ان کا اختلاف گزر چکا ہے۔ امام منتظر کے بارے میں ان کے

کئی ایک اقوال ہیں: ان میں سے بعض کہتے ہیں: جعفر بن محمد زندہ باقی ہے ۔بعض کہتے ہیں: عبد اللہ بن معاویہ زندہ باقی ہے۔بعض کہتے ہیں: محمد بن عبد اللہ بن حسن زندہ باقی ہے ۔بعض کہتے ہیں: اس کا بیٹا موسی بن جعفر زندہ باقی ہے ۔بعض کہتے ہیں: محمد بن الحنفیہ زندہ باقی ہے ۔ایک گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو امام مقرر فرمایا تھا؛ جب کہ دوسرا گروہ کہتا ہے: نہیں' بلکہ محمد بن الحنفیہ کو امام بنایا تھا۔ پھر ایک گروہ کہتا ہے کہ علی بن الحسین نے اپنے بیٹے ابوجعفر کو امام بنانے کی وصیت کی تھی؛ جب کہ دوسرا گروہ ان کے بیٹے عبد اللہ کی امامت کا قائل ہے۔اس گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ عبد اللہ نے اپنے بیٹے محمد بن عبد اللہ بن الحسن کو امام بنانے کی وصیت کی تھی۔ جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ جعفر نے اپنے بیٹے اسماعیل کو امام بنایا تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں: اسماعیل نے اپنے بیٹے محمد کو امام بنایا تھا۔ جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ کہتے ہیں: اپنے بیٹے عبد اللہ کو امام بنایا تھا۔پھر یہ کہتے ہیں کہ: اس کا بیٹا موسی امام بنا تھا۔ یہ لوگ محمد بن حسن تک سلسلہ امامت کو اسی موسی کی اولاد میں مانتے ہیں۔ جب کہ دوسرے گروہ کے لوگ امامت کو عبد اللہ بن میمون القداح شیعہ حکمران تک تسلیم کرتے ہیں۔ پھر ایک گروہ کہتا ہے: امامت بنی ہاشم سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی تھی۔ [جب ان کے آپس میں اتنے اختلافات ہیں] تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ تمام متناقض اقوال ائمہ اہل بیت سے ماخوذ ہوں۔ پس شیعہ کا یہ دعوی باطل ٹھہرا کہ ان کا مذہب اہل بیت سے ماخوذ ہے۔

تیسرا جواب: تصور کیجیے حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے۔ جب شیعہ کا آپس میں اس قدر اختلاف ہے؛ اور مسئلہ امامت میں اتنا سخت تنازع ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کی صحت کیسے معلوم ہوسکتی ہے۔اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کا دعوی ہے کہ جو کچھ بھی وہ کہتا ہے؛ اس کا قول ائمہ معصومین سے ماخوذ ہے۔اس پر مزید یہ کہ شیعہ کے یہاں اسانید متصلہ نہیں ہیں جن کو تحقیق کی کسوٹی پر رکھ کر جانچا جا سکے۔ البتہ یہ ایسے اقوال ہیں جو جھوٹ پر مشتمل اور منقطع اسناد سے روایت کیے گئے ہیں۔ان کے ہاں نقل کرنے میں تناقض اور جھوٹ کی کثرت شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی ہے۔تو پھر کیا کوئی عاقل ان کی باتوں کی تصدیق کرسکتا ہے۔شیعہ کے یہاں دروغ گوئی کی فراوانی ہے، اگر وہ ان نصوص کے تواتر کا دعویٰ کریں تو کوئی چیز مخالفین کو بھی ایسے دعویٰ سے باز نہیں رکھ سکتی، جب دوسرے لوگ بھی اسی قسم کا دعویٰ کھڑا کر دیں گے تو فریقین کے دعاوی میں کچھ فرق وامتیاز باقی نہیں رہے گا۔اگر بالفرض حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عصمت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو پھر بھی ان وجوہات کی بنا پر ماننا پڑے گا کہ امامیہ کا مذہب اہل بیت سے ماخوذ نہیں ہے۔اس سے ان کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معصوم ہونے کا دعوی بھی ویسے ہی باطل ثابت ہوا؛ جیسے عیسائیوں کا حضرت عیسی علیہ السلام کے رب ہونے کا دعوی۔ کیونکہ عیسائی جو تعلیمات پیش کررہے ہیں وہ حضرت عیسی علیہ السلام سے ماخوذ نہیں ہے۔

چوتھا جواب: شیعہ اپنے مذہب کی صداقت کے اثبات میں دو باتوں کے محتاج ہیں:

۱۔ ائمہ کی عصمت کا دعوی جن کی طرف ان کا مذہب منسوب ہے۔

۲۔ دلائل و براہین سے ائمہ سے اس نقل کو ثابت کرنا۔

شیعہ کے پاس مذکورہ بالا دونوں امور کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔لہٰذا دونوں باتیں باطل ٹھہریں۔

بیشک جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام الہ اور رب نہیں ہیں۔ بلکہ آپ ایک مہربان اور عزت والے رسول ہیں۔ بالفرض اگر

مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی رب ہیں؛ تب بھی جو کچھ عیسائی پیش کررہے ہیں' وہ آپ کی تعلیمات نہیں ہیں۔اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ایک گونہ مشابہت عیسیٰ علیہ السلام کی پائی جاتی ہے: کچھ لوگوں نے آپ کو آپ کے اصلی مقام سے بہت آگے بڑھایا [یہاں تک کہ آپ کو رب بنادیا] اور کچھ لوگوں نے آپ کو آپ کے شایان شان مقام ہی نہیں دیا۔ پس یہ دوسرا گروہ یہودیوں کی طرح ہے [جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح مقام و مرتبہ کا خیال ہی نہیں کیا]؛ بلکہ آپ کو کافر اور زانیہ کی اولاد کہنے لگے۔ اور پہلا گروہ عیسائیوں کی طرح ہے جنہوں نے آپ کو ہی رب اور معبود بنالیا۔ [یہ دونوں گروہ راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں]۔

پانچواں جواب: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ حضرت حسن اور حضرت حسین؛ علی بن الحسین؛ ان کے بیٹے محمد؛ جعفر بن محمد؛ رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے ابناء و احفاد کے حق میں جو مناقب و فضائل ثابت ہیں، شیعہ مصنف نے ان کا ذکر تک نہیں کیا، البتہ کچھ جھوٹے مناقب تحریر کردیے ہیں، جو اس کی جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔

شیعہ مصنف کے ذکر کردہ حسب ذیل مناقب و فضائل قابل ملاحظہ ہیں:

۱۔ شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: آیت: ﴿ هَلْ اَتٰی ﴾ اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی۔ حالانکہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہجرت کے تیسرے سال اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ چوتھے سال پیدا ہوئے۔ یہ سورت اس سے کئی سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔

نظر بریں شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورہ مذکور اہل بیت کے بارے میں نازل ہوئی صریح کذب ہے اور اس سے ہر وہ شخص آشنا ہے جو علم نزول قرآن اور اہل بیت کے کوائف و احوال سے معمولی واقفیت بھی رکھتا ہے۔

۲۔ جہاں تک آیت تطہیر کی تعلق ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْرًا﴾ ''اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کردے اور تمہیں خوب پاک کردے۔'' کا تعلق ہے اس میں نجاست کو دور کرنے کی خبر نہیں دی گئی، بلکہ پاکیزگی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے درج ذیل آیت میں ہے:

﴿ مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلٰکِنْ یُرِیْدُ لِیُطَهِّرَکُمْ ﴾ (المائدۃ : ۶)

''اللہ تعالیٰ تمہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا بلکہ پاک کرنا چاہتا ہے۔''

نیز فرمایا:﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَ یَهْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ یَتُوْبَ عَلَیْکُمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ٭وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْکُمْ وَ یُرِیْدُ الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِیْلُوْا مَیْلًا عَظِیْمًا٭ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا﴾ (النساء: ۲۶۔ ۲۸)

''اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے خوب کھول کر بیان کرے اور تمہیں تم سے پہلے کے (نیک) لوگوں کی راہ پر چلائے اور تمہاری توبہ قبول کرے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے اور جو لوگ خواہشات کے پیرو ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم اس سے بہت دور ہٹ جاؤ۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر تخفیف کردے اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

مذکورۃ الصدر آیات میں ارادہ کا لفظ حکم دینے اور محبت و رضا کے معنوں میں استعمال اس کا ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا ارادہ کیا تھا اسے عملی جامہ پہنا دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ جس کی تطہیر کا ارادہ کرتے وہ پاک و صاف ہو جاتا۔ ہمارے معاصر شیعہ کے قول کے مطابق آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ ہمارے زمانہ کے شیعہ معتزلہ کے ہم خیال ہیں اور ان کی ہم نوائی میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کا ارادہ بھی کرتا ہے، جو عالم وجود میں نہیں آتیں، اور ایسی باتیں بھی وجود میں آجاتی ہیں؛ جن کا اللہ تعالیٰ کوئی ارادہ نہیں کرتا۔ ان کے خیال میں آیت قرآنی اسی قبیل سے ہے:

﴿ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۳۳)

''اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھر والو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔''

آیت تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اہل بیت شرعی اوامر و احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور محرمات سے باز رہیں گے تو ان کو پاک کر دیا جائے گا۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو انہیں پاک نہیں کیا جائے گا۔ ان لوگوں [معتزلہ اور شیعہ قدریہ] کا یہ بھی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے افعال کا خالق نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو پاک کرنے اور ان سے نجاست کے دور کرنے پر قادر نہیں ہے۔ جب کہ تقدیر کا اثبات کرنے والے کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان تمام امور پر قادر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں افعال کا بجالانا اور ممنوعات کا ترک کرنا الہام کر دے تو ان کے لیے پاکی حاصل ہو جائے گی؛ اور ان سے نجاست ختم کر دی جائے گی۔

گویا ان کی تطہیر ان کے اپنے ارادوں اور افعال سے وابستہ ہے۔ وہ دلیل جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت امر ہے خبر نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے کہ آپ نے حضرت علی، فاطمہ، اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو چادر میں چھپا لیا، اور فرمایا: اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں تو ان سے نجاست کو دور کر کے ان کو پاک کر دے۔''[1]

[اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نجاست کو دور کرنے اور پاک و صاف کرنے پر قادر ہے نیز معتزلہ کے عین برخلاف یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ افعال العباد کا خالق ہے، مندرجہ ذیل آیت سے یہ بھی امر مستفاد ہوتا ہے، کہ مذکورۃ الصدر آیت میں حکم دیا گیا ہے، خبر نہیں بیان کی گئی]۔

یہ حدیث دو وجوہات کی بنا پر رد رافضیت پر دلالت کرتی ہے:

پہلی وجہ: نبی کریم ﷺ نے ان کی طہارت اور پاکیزگی کے لیے دعا فرمائی ہے؛ یہ دلیل ہے کہ ان لوگوں کو پاک کرنے کی ابھی تک خبر نہیں دی گئی تھی۔ اگر ایسے ہی ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی اور اس کا شکر بجا لایا جاتا۔ محض دعاء پر اقتصار نہ کیا جاتا۔

دوسری وجہ: یہ دعا دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کرنے اور ان سے ناپاکی کے ختم کرنے پر قادر ہے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ اس آیت کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کریمہ امر و نہی کو متضمن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ

[1] صحيح مسلم۔ كتاب فضائل الصحابة۔ باب فضائل اهل بيت النبى ﷺ (حديث: ٢٤٢٤) عن عائشه، رضی اللہ عنہا، و مسند احمد (٦/ ٢٩٢) سنن ترمذی۔ كتاب المناقب۔ باب ما جاء فى فضل فاطمة رضی اللہ عنہا (حديث: ٣٨٦٧) و عن ام سلمة۔ كتاب تفسير القران۔ باب و من سورة الاحزاب (حديث: ٣٢٠٥، ٣٧٨٧) عن عمر بن ابى سلمة رضی اللہ عنہ)۔

يَسِيْرًا☆وَ مَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا☆يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا☆وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا☆وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا☆﴾ (الاحزاب: ۳۰۔۳۴)

''اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو بھی کھلی بے حیائی (کا ارتکاب) کرے گی اسے دوہرا دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت ہی سہل (سی بات) ہے۔ اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گی اور نیک کام کرے گی ہم اسے اجر (بھی) دوہرا دیں گے اور اس کے لئے ہم نے بہترین روزی تیار کر رکھی ہے۔ اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو تو نرم لہجے سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کوئی برا خیال کرے اور ہاں قاعدے کے مطابق کلام کرو۔ اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنے بناؤ کا اظہار نہ کرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاری کرو۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اے نبی کی گھر والیو! تم سے وہ (ہر قسم کی) گندگی کو دور کر دے اور تمہیں خوب پاک کر دے۔ اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور رسول کی جو احادیث پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو یقیناً اللہ تعالیٰ مہربانی کرنے والا خبردار ہے۔''

اس سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں امر و نہی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں۔ کیونکہ آیت کے سیاق میں ان سے ہی خطاب کیا گیا ہے۔ اور آیت میں ضمیر خطاب ﴿لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ ضمیر مذکر سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کے علاوہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ابناء و احفاد بھی شامل ہیں۔ آیت میں مذکر ضمیر لائی گئی ہے؛ اس لیے کہ اس میں مذکر و مونث سب شامل ہیں۔ ان ازواج مطہرات کو اہل بیت میں سے ہونے کی وجہ سے خاص کیا گیا ہے۔ اسی لیے باقی کے حضرات [علی و فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم] کو چادر کے نیچے داخل کر کے ان کے لیے دعا کی گئی۔

جس طرح مسجد نبوی اور مسجد قبا دونوں کی اساس خلوص و تقویٰ پر رکھی گئی تھی، بلکہ مسجد نبوی اس وصف میں افضل و اکمل تھی، جب آیت قرآنی:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبہ: ۱۰۸)

''البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

نازل ہوئی تو مسجد کے لفظ سے مذکورہ دونوں مساجد کو مراد لیا جانے لگا، بلکہ مسجد نبوی اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہے۔

پھر علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے کہ کیا آپ کی ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں شامل ہیں؟۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں منقول ہیں۔ بروایت صحیح تر منقول ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ)) [1] دوسرے مقام پر یہ درود تفصیل کے ساتھ ہے۔

جب کہ ان کے غلام اور باندیاں وغیرہ بلا اختلاف اہل بیت میں سے نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ صدقہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے لیے مباح تھا۔ابورافع رضی اللہ عنہ کا شمار بھی آپ کے موالین میں سے ہوتا ہے۔اسی لیے انہیں صدقہ لینے سے منع کیا گیا؛ اس لیے کہ کسی قوم کے موالی انہی میں سے شمار ہوتے ہیں۔ان پر صدقہ حرام ہونے کا سبب بھی ان کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق پاک کرنا ہے۔اس لیے کہ صدقہ لوگوں کا میل کچیل ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کے لیے وجوب محبت کی تفسیر میں بھی غلطی ہوئی ہے۔صحیح بخاری میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجیے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

تو میں نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت کا تعلق رکھنے والوں سے محبت کرو۔'' اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے: ''تم نے بہت جلدی کی۔قریش کی کوئی بھی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق قرابت داری نہ ہو۔ [2]

بنا بریں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ (اے نبی) آپ فرمائیں کہ میں اس کے سوا تم سے کچھ اجر طلب نہیں کرتا کہ ان قرابت دارانہ تعلقات کی بنا پر جو میرے اور تمہارے درمیان پائے جاتے ہیں تو مجھ سے الفت و محبت کا سلوک روا رکھو۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اہل بیت کے ایک بڑے فرد اور تفسیر قرآن کے علماء میں سے ایک ہیں۔یہ تفسیر آپ سے ثابت ہے۔قابل غور بات یہ ہے کہ مذکورہ آیت میں '' اِلَّا الْمَوَدَّةَ لِذِي الْقُرْبٰى '' کے الفاظ نہیں فرمائے بلکہ یوں فرمایا'' فِي الْقُرْبٰى '' حالانکہ جہاں اقارب مراد لینا مقصود ہوتا ہے وہاں لِذِي الْقُرْبٰى ''کی تصریح ہوتی ہے، جیسے آیت کریمہ: ﴿ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى ﴾ (الانفال: ۴۱)

''بیشک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور قریبی رشتہ داروں کے لیے۔''

میں صراحتہ یہ الفاظ موجود ہیں۔اگر یہاں بھی قرابت داروں کی محبت مقصود ہوتی تو ﴿ وَلِذِي الْقُرْبٰى ﴾: کے الفاظ استعمال کیے جاتے۔تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ﴿ الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾: سے مراد اقرابت داروں کی محبت ہے۔اس کی مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل پر کسی قسم کے اجر و بدلہ کے طلب گار تھے ہی نہیں۔آپ کا اجر اللہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب أحادیث الانبیاء باب (۱۰)، (حدیث:۳۳۶۹)، صحیح مسلم۔ کتاب الصلاۃ۔ باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیه وسلم بعد التشهد(حدیث:۴۰۷)

[2] صحیح بخاری کتاب التفسیر۔ سورۃ الشوری۔ باب قوله ﴿الا المودة فی القربی﴾ (حدیث:۴۸۱۸)

تعالیٰ پر ہے۔ اور مسلمانوں پر لازم ہوتا ہے کہ آپ سے اور آپ کے اہل بیت سے موالات اور دوستی رکھیں؛ لیکن اس کا ثبوت اس آیت سے نہیں دوسری آیات سے ملتا ہے۔ اہل بیت کے ساتھ ہماری دوستی رسول اللہ ﷺ کے اجر میں داخل نہیں اس لیے آپ کہ اجر سے بے نیاز تھے اور صرف اللہ تعالیٰ سے اجر طلب کیا کرتے تھے۔

نیز یہ آیت مکی ہے؛ اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہی نہیں ہوئی تھی؛ اور نہ ہی اس وقت میں ان کی کوئی کسی قسم کی اولاد تھی۔

باقی رہا آیت مباہلہ کا معاملہ۔ صحیح بخاری میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے ہاتھ پکڑ لیے تا کہ ان سے مباہلہ کریں۔ ❶ انہیں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دوسرے لوگوں کی نسبت آپ کے زیادہ قریبی تھے۔ اور آپ کی کوئی نرینہ اولاد بھی نہ تھی جس کو آپ ساتھ لیکر مباہلہ کے لیے چلتے۔ لیکن آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے: میرا یہ بیٹا سردار ہوگا۔'' پس یہ دونوں اور آپ کے بیٹے اور عورتیں مباہلہ کے لیے چلے۔ اس لیے کہ اس وقت تک نبی کریم ﷺ کی باقی بیٹیاں وفات پا چکی تھیں۔ مباہلہ کا قصہ اس وقت کا ہے جب نجران کا وفد حاضر خدمت ہوا تھا۔ یہ لوگ عیسائی تھے۔ یہ فتح مکہ کے بعد سنہ ۹ ہجری کا قصہ ہے۔ اسی بارے میں سورت آل عمران کے شروع کی آیات نازل ہوئیں۔ اسی سال آپ ﷺ پر حج فرض کیا گیا۔ اس سال کو وفود کا سال بھی کہا جاتا ہے۔ جب سن آٹھ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تو ہر طرف سے وفود آنے شروع ہوگئے۔ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کمال تعلق و صلہ پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ اس قسم کی دلالت حدیث کساء میں بھی ہے۔ لیکن اس آیت کا تقاضا یہ بھی نہیں ہے کہ ان سے بڑھ کر کوئی بھی دوسرا افضل یا بڑا عالم نہ ہو۔ اس لیے کہ فضیلت کمال ایمان اور تقوی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ نہ کہ نسبی قرابت کی وجہ سے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ [الحجرات ۱۳]

''بیشک اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے؛ جو تم میں سے بڑا متقی ہو۔''

اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس امت میں سب سے بڑے متقی اور کتاب و سنت کے بڑے عالم تھے۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے آپ نے فرمایا:

''اگر میں نے اہل زمین میں سے کسی کو اپنا دوست بنانا ہوتا تو میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا دوست بناتا۔'' ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک ہزار رکعات؟:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ دعویٰ کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ شب و روز میں ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے۔''

[جواب]: ایسا کہنا درست نہیں۔ یہ دعوی مصنف کی جہالت اور حقائق سے لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔

پہلی بات: [یہ کہنا کہ] آپ ایک رات میں ایک ہزار نفل پڑھا کرے تھے۔ یہ کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اس کے عین برخلاف صحیحین میں ثابت ہے کہ سرور کائنات ﷺ رات بھر میں ۱۳ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ ❸

❶ صحیح مسلم ٤/ ١٨٧١۔ والترمذي ٤/ ٢٩٣۔ ❷ البخاري ١/ ٨٦۔ ومسلم ٤/ ١٨٥٤۔
❸ البخاري ٢/ ٥١؛ مسلم ١/ ٥٠٨۔

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''سب سے بہترین قیام حضرت داؤد علیہ السلام کا تھا۔ آپ آدھی رات تک سوئے رہتے ۔ پھر ایک تیسرا حصہ قیام فرماتے ۔ اور پھر رات کا چھٹا حصہ سو جاتے ۔'' ❶

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ صبح کو مرغ کی آذان سننے کے بعد بیدار ہوا کرتے تھے ۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جب آپ ﷺ کو کچھ لوگوں کے بارے میں خبر ہوئی کہ:

''ایک نے کہا میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، تیسرے نے کہا میں نکاح نہیں کروں گا اور عورت سے ہمیشہ الگ رہوں گا، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کیا: تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ تعالی سے تمہاری بہ نسبت بہت زیادہ ڈرنے والا اور خوف کھانے والا ہوں، پھر میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور ساتھ ساتھ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یادرکھو جو میری سنت سے روگردانی کرے گا، وہ میرے طریقے پر نہیں ۔'' ❷

آپ ﷺ ساری رات کے قیام کو ناپسند فرماتے تھے ۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہہ رہے ہیں: میں دن کو روزہ رکھا کروں گا اور رات کو قیام کیا کروں گا تو آپ ان سے یوں مخاطب ہوئے:

''ایسا نہ کرنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تیری آنکھوں میں گڑھے پڑ جائیں گے اور بدن کمزور ہو جائے گا ۔ اور بیشک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے' اور تمہاری جان کا تم پر حق ہے؛ تمہاری ملاقات کے لیے آنے والے کا تم پر حق ہے ۔ اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے ۔ پس ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو ۔'' ❸

پس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ساری ساری رات عبادت کرنا مستحب یا پسندیدہ نہیں ہے ۔ بلکہ نبی کریم ﷺ سے ثابت سنتوں کی روشنی میں ایسا کرنا مکروہ ہے ۔ ایسے ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روزہ رکھنے کا حکم بھی ہے ۔ بیشک افضل ترین روزے حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے تھے ۔ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کیا کرتے تھے ۔

احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ شب و روز میں تقریباً چالیس رکعات پڑھا کرتے تھے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے طریق کار سے بخوبی آگاہ تھے، اور بڑھ چڑھ کر آپ ﷺ کی سنتوں کی پابندی کرنے والے تھے ۔ آپ سے سنت کی مخالفت ممکن ہی نہیں ۔ پھر اس حد تک وہ آپ کی مخالفت کیوں کر کر سکتے تھے، بشرطیکہ ایک ہزار رکعات ادا کرنا ممکن بھی ہو ۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر واجبات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ایک ہزار رکعات پڑھنا ممکن ہی نہیں ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مختلف قسم کے مشاغل میں گھرا رہتا ہے، جسم کی راحت و آرام سونا، کھانا پینا، وضو کرنا، وظیفہ زوجیت ادا کرنا، اہل و عیال کی دیکھ بھال کرنا، رعیت کے امور سے عہدہ برآ ہونا، غرض یہ کہ دسیوں قسم کے لوازمات ہیں جن

---

❶ مسلم ٢/ ٨١٦ - البخاري ٤/ ١٦١ -

❷ صحيح بخاري - كتاب التهجد - باب كيف صلاة النبى صلى الله عليه وسلم (حديث:١١٣٨، ١١٤٠)، صحيح مسلم - كتاب صلاة المسافرين - باب صلاة الليل (حديث:٧٣٧، ٧٣٨، ٧٦٤)

❸ صحيح بخارى كتاب الصوم - باب حق الجسم فى الصوم، (حديث:١٩٧٥) صحيح مسلم - كتاب الصيام، باب النهى عن صوم الدهر، (حديث:١١٥٩) -

پر بلا مبالغہ انسان کا نصف وقت صرف ہو جاتا ہے، ایک گھنٹہ میں اسی رکعات ادا نہیں کی جا سکتیں، بجز اس کے کہ صرف سورہ فاتحہ پڑھی جائے اور وہ بھی بلا سکون و اطمینان کوے کی طرح ٹھونگیں ماری جائیں۔ ہمارے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ نماز میں منافقوں کی طرح ٹھونگے مارنے لگیں اور اللہ کو بہت کم یاد کریں، جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ منافق کی نماز ہے کہ سورج کو بیٹھے دیکھتا رہتا ہے جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں مارنے لگ جاتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا مگر بہت تھوڑا۔'' [صحیح مسلم:ح 1407]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی حکایات نقل کرنا مصنف کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ پھر راتوں کو تہجد پڑھنا اور ایک رکعت میں قرآن ختم کرنا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے۔ اور آپ کی تہجد گزاری اور تلاوت قرآن صاف ظاہر ہے۔

انفس سے کیا مراد ہے؟:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ترین ہستی ہیں۔''

[جواب]: یہ فقط دعویٰ ہے؛ جس میں اگلے اور پچھلے جمہور مسلمین کی مخالفت کی گئی ہے۔ [شیعہ کے پاس اس کی کوئی مستند دلیل نہیں ہے؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنے سے افضل مانتے تھے]۔

[اشکال]: شیعہ کا قول کہ: اللہ نے آپ کی ذات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرار دیا اور فرمایا: ﴿وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور ہمارے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھائی بنالیا۔''

[جواب]: [مذکورہ] حدیث مواخات سند کے اعتبار سے موضوع ہے؛ اس لیے کہ آپ نے کسی کو بھائی نہیں بنایا۔ مزید برآں مواخات کا رابطہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے درمیان آپس میں یا انصار کے مابین استوار نہیں تھا بلکہ مہاجرین و انصار کے درمیان تھا؛ جیسا کہ آپ نے سعد بن ربیع اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا۔ اور سلیمان الفارسی اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کے مابین؛ جیسا کہ صحیحین میں ثابت ہے۔

[باقی رہا] شیعہ مصنف کا یہ کہنا کہ سورہ آل عمران کی آیت ﴿وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ﴾ (آل عمران: ۶۱) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نفس رسول قرار دیا گیا ہے؛ بالکل غلط ہے۔ اس آیت میں انفس کا لفظ اسی طرح استعمال کیا گیا ہے کہ جس طرح مندرجہ ذیل آیات میں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

''اسے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی۔''

یہ آیت کریمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت میں قصہ افک میں نازل ہوئی۔ یہاں پر مؤمنین میں سے کسی بھی مؤمن مرد یا عورت کو دوسرے مؤمن کی ذات [نفس] سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَتُوبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۵۴)

''اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ إِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَ کُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِ کُمْ ﴾ (البقرہ:۸۴)

''اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں خون نہ بہانا (قتل نہ کرنا) اور ایک دوسرے کو جلا وطن مت کرنا۔''

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو اپنے شہروں سے نہ نکالنا۔ یہاں پر انفس [نفوس] سے مراد اپنے بھائیوں کے نفس ہیں؛ خواہ یہ بھائی چارہ نسبی ہو یا دینی۔ ان آیات میں انفس سے نسبی یا دینی بھائی مراد ہیں۔

سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ((اَنْتَ مِنِّیْ وَاَنَا مِنْكَ)) [1]

''تم مجھ سے ہو اور میں تجھ سے ہوں۔''

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کسی غزوہ کے دوران جب قبیلہ اشعر کے لوگوں کا توشہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے باقی ماندہ توشہ کو ایک چادر میں جمع کر کے اسے برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں اس لیے یہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔'' [2]

سرور کائنات ﷺ نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ [3] کے بارے میں فرمایا:

((هٰذَا مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ .)) یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں۔ [4] ان کی تفصیل اپنی جگہ پر موجود ہے۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح:

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی عظمت و فضیلت کا موجب ہے، جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دونوں بہنوں کے ساتھ (یکے بعد دیگرے) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے باعث فضیلت ہے، اور نبی کا عقد مبارک حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی بیٹیوں کے ساتھ ان دونوں کی عزت افزائی کا موجب ہے، خلاصہ کلام یہ کہ چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رشتہ مصاہرت [سسرالی] میں جکڑے ہوئے تھے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت سے معجزات صادر ہوئے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اگر معجزات کے لفظ سے شیعہ مصنف کرامات مراد لیتا ہے جیسا کہ لوگ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں' تو اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بہت سے صاحب کرامات اولیاء سے افضل تھے۔ اور کرامات جیسے ان اہل سنت والجماعت عوام سے بھی ثابت ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کرامات کیسے ثابت نہیں ہو سکتیں؟ اور صرف کرامات کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ سے دوسرا کوئی افضل نہیں ہے۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دعویٰ ربوبیت]:

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب هذا ما صالح فلان (حدیث: ۲۶۹۹)، مطولاً۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الشرکة۔ باب الشرکة فی الطعام والنهد (حدیث:۲٤۸٦) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل الاشعریین رضی الله عنهم (حدیث: ۲۵۰۰)

[3] رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کی وجہ یہ تھی کہ صحابی حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ ایک غزوہ میں گم ہو گئے اور آپ نے ان کو تلاش کرنے کا حکم دیا، تلاش کرنے پر آپ کی نعش ملی، سات مشرکین آپ کے ارد گرد مقتول پڑے تھے، ان کو ٹھکانے لگانے کے بعد آپ نے جام شہادت نوش کیا، یہ منظر دیکھ کر آپ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی، نیز فرمایا: '' هٰذَا مِنِّیْ وَاَنَا مِنْهُ ''

[4] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة ۔ باب من فضائل جلیبیب رضی الله عنه (حدیث: ۲٤۷۲)۔

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:

''بہت سے لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربوبیت کا دعویٰ کیا اور آپ نے انہیں قتل کروا دیا۔''

[جواب]: یہ عقیدہ جہالت کی انتہاء ہے۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: سالار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات بہر حال اکثر واعظم تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ کسی نے آپ کو رب قرار نہ دیا۔

دوسری وجہ: حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے معجزات بہت زیادہ ہیں؛ لیکن ان میں سے بھی کسی ایک کو رب نہیں قرار دیا گیا۔

تیسری وجہ: ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے بہت زیادہ ہیں مگر پھر بھی ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی رب نہیں مانا گیا جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں لوگوں نے غلو کیا۔

چوتھی وجہ: حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بڑے زور و شور سے رب ہونے کا دعویٰ کیا گیا؛ ایسا دعویٰ محمد، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کے بارے میں نہیں کیا گیا؛ مگر پھر بھی کسی نے نہیں کہا کہ حضرت مسیح ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام سے افضل ہیں۔ اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا کہ آپ کے معجزات ان سے بڑھ کر اور زیادہ زوردار ہیں۔

پانچویں وجہ: ان دونوں کے متعلق رب ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔ اس کے مقابلہ میں بھی ایک باطل دعویٰ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہودیوں کا دعویٰ ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خوارج کا دعویٰ ہے۔ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے ہیں۔ اگر قوت شبہ کی بنا پر آپ کے متعلق یہ دعویٰ کرنا جائز ہوسکتا ہے کہ آپ رب ہیں تو پھر قوت شبہ کی بنا پر خوارج کا دعویٰ بھی صحیح ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہوسکتا ہے کہ آپ سے کچھ ایسی خطائیں ہوگئی تھیں جن کی بنا پر خوارج نے آپ کو کافر کہا۔ اور خوارج ان لوگوں سے بڑھ کر دین دار اور عالم تھے جنہوں نے آپ کے رب ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اگر ایسے دعووں کو دلیل بنانا اور انہیں منقبت شمار کرنا جائز ہے؛ تو پھر آپ سے بغض رکھنے والوں اور خوارج کا دعویٰ بھی اس سے کئی درجہ زیادہ قوی ہے۔ اس بارے میں رافضی غالی خوارج کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں؟۔

خوارج لوگوں میں سب سے زیادہ نمازی؛ روزہ دار اور قرآن کی تلاوت کرنے والے تھے۔ ان کے اپنے لشکر اور فوجیں تھیں۔ وہ ظاہری اور باطنی طور پر دین اسلام کے دعویدار تھے۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں غالی رافضی یا تو لوگوں میں سب سے بڑے جاہل ہوا کرتے تھے یا پھر سب سے بڑے کافر۔ امامیہ غالیہ کے کافر ہونے پر تمام لوگوں کا اجماع ہے۔ جب کہ خوارج کو وہی لوگ کافر کہتے ہیں جو امامیہ کو بھی کافر کہتے ہیں۔ بلکہ خوارج امامیہ سے بہت بہتر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو کافر نہ کہتے تھے۔ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک پر قدرت پاکر اسے قتل کرنے کا حکم دیتے۔ جس طرح غالیہ کو آگ میں جلانے کا حکم دیا تھا۔ بلکہ انہیں اس وقت تک قتل نہیں کیا گیا جب تک انہوں نے عبداللہ بن خباب کو قتل نہ کیا اور لوگوں پر شب خون نہ مارا۔

صحابہ کرام، علماء امت اور دیگر کے اجماع سے ثابت ہے کہ خوارج غالیہ شیعہ سے بہت بہتر اور افضل ہیں۔ پھر اس کے باوجود اگر شیعہ کے لیے جائز ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق غالیہ کے دعویٰ الوہیت کو آپ کی فضیلت میں حجت تسلیم کریں تو پھر شیعان عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے لیے جائز ہے کہ وہ خوارج کے دعویٰ کفر کو بھی دلیل بنالیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایسے دلائل سے صرف جاہل لوگ ہی حجتیں پکڑتے ہیں۔ پھر یہی دلیل ان پر حجت بن جاتی ہے، ان کے حق میں نہیں رہتی۔ اسی لیے لوگ جانتے تھے کہ رافضی نواصب سے بڑے جاہل اور جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔

[حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اور جہاد فی سبیل اللہ]:

[اشکال]: آپ کے دو بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے؛ جو کہ جنت کے نوجوانوں کے سردار ہوں گے۔ اور وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح اور واضح حکم کے مطابق امام تھے۔''

[جواب]: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''❶

اور صحیح احادیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ آپ کو ایک ران پر بٹھاتے اور اسامہ بن زید کو دوسری ران پر بٹھاتے اور فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں' تو بھی ان دونوں سے محبت کر۔ اور ان لوگوں سے بھی محبت کر جو ان دونوں سے محبت کریں۔'' [المسند ۵/ ۲۰۵]

اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت کے مسئلہ پر جو جنگ ترک کی؛ اور مسلمانوں کے درمیان صلح کروائی؛ تو یہ امر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔ یہ کوئی معصیت نہ تھی؛ بلکہ جنگ و قتال کی نسبت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں محبوب ترین چیز تھی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے اور اسامہ سے محبت کا اظہار کیا' ان دونوں کے لیے دعا بھی فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں حضرات جنگ و قتال اور فتنہ کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے تو جنگ و قتال میں حصہ ہی نہیں لیا؛ نہ ہی آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور نہ ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ اپنے والد محترم کو جنگ بند کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

یہ رافضیوں کے عقیدہ اور دعوی کے الٹ ہے۔ اس لیے کہ وہ صلح کو مصیبت اور ذلت شمار کرتے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی امام معصوم ہوتا تو ہر ایک پر اس کی اطاعت واجب ہوتی۔ اور جو کوئی اس معصوم کے علاوہ کسی دوسرے کو امام بناتا تو اس کی امامت وولایت باطل ہوتی۔ نہ ہی اس کے ساتھ جہاد کرنا جائز ہوتا اور نہ ہی اسکے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہوتی۔ تو پھر اس صورت میں یہ صلح امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑے مصائب میں سے ایک ہوتی۔ اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کا دین فاسد ہو جاتا۔

تو پھر اس صلح میں کونسی ایسی فضیلت تھی جس پر رافضہ ان کی تعریف و ثنا بیان کرتے ہیں۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ آپ کو کمزوری کی وجہ سے جنگ کرنے سے معذور سمجھا جاتا۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو صلح کی وجہ سے قابل تعریف سردار قرار دیا ہے' عاجز اور معذور نہیں کہا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی نسبت لڑائی سے نہ ہی عاجز آگئے تھے اور نہ ہی کمزور پڑے تھے۔ بلکہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر قتال پر قادر تھے؛ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس وقت تک جنگ کی یہاں تک کہ آپ کو شہید کر دیا گیا۔ جو کچھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کیا اگر ایسا کرنا افضل اور واجب ہوتا تو پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس واجب کو ترک نہ کرتے اور کمزوری کی وجہ سے پیچھے نہ ہٹتے۔ اور اگر جو کچھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا تھا؛ وہی افضل اور زیادہ مناسب تھا تو یہ دلیل ہے کہ جنگ کو ترک کرنا اور صلح کر لینا ہی افضل تھا۔ اور جو کچھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب اور پسندیدہ تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اہل تقوی مؤمنین کے درجات کو آپس میں ایک

❶ صحیح بخاری، حوالہ سابق (ح: ۳۶۲۹)۔

دوسرے پر بلند کرتا ہے۔ اور یہ سب کے سب جنت میں ہوں گے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین ۔

پھر اگر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو امام بنایا تھا؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان کو امام بنانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امام مقرر کرنا معنی رکھتا ہے؟۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس دنیا میں نبی کریم ﷺ کے دو خوشبودار پھول تھے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں کو ان کے والدین کے ساتھ اپنی چادر میں داخل کیا تھا اور دعائی فرمائی تھی:

''اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے ناپاکی کو دور کردے؛ اور انہیں ہر طرح سے پاک کردے۔''

اور مباہلہ کے وقت آپ نے ان دونوں کو بھی ساتھ بلایا تھا۔ ان کے فضائل بہت زیادہ ہیں۔ اور آپ اہل ایمان کے بڑے جلیل القدر سرداروں میں سے ہیں۔ باقی رہا یہ دعوی کرنا کہ یہ دونوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے زاہد اور سب سے بڑے عالم تھے؛ یہ دعوی بغیر دلیل کے ہے۔

[اشکال]: رافضی کا کہنا ہے: ''ان دونوں نے اللہ کی راہ میں حق کیساتھ جہاد کیا یہاں تک کہ شہید کردیے گئے۔''

[جواب]: یہ ان دونوں کے متعلق یہ دعوی جھوٹ ہے۔ کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ یہ تمام معاملات حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو تفویض کر کے خود کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی عراقی لشکر بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلے گئے۔ آپ جنگ و قتال کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے یہ بات آپ کی سیرت سے صاف ظاہر ہے۔

آپ کی موت کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کو زہر دیکر مارا گیا۔ یہی آپ کی شہادت اور آپ کے حق میں کرامت ہے۔ لیکن آپ کی موت قتال کرتے ہوئے نہیں آئی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی جنگ و قتال کے لیے نہیں نکلے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں گے۔ جب آپ نے دیکھا کہ لوگ آپ سے منہ موڑ چکے ہیں تو آپ نے تین مطالبات کیے:

۱۔ آپ کو واپس اپنے وطن جانے دیا جائے۔

۲۔ آپ کو محاذ جنگ پر جانے دیا جائے تاکہ دشمن سے جہاد کرسکیں۔

۳۔ یا پھر آپ کو یزید کے پاس پیش ہونے دیا جائے۔

پس ان ظالموں نے ان تینوں میں سے ایک بات بھی نہ مانی؛ بلکہ آپ سے گرفتاری پیش کرنے مطالبہ کیا تاکہ آپ کو قیدی بنا کر یزید کے سامنے پیش کیا جائے۔ آپ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا' یہاں تک لڑتے ہوئے مظلومیت کے ساتھ شہید ہوگئے۔ لیکن شروع میں آپ کا ارادہ ہرگز جنگ کرنے کا نہیں تھا۔

[اشکال]: رافضی کا کہنا کہ: ''آپ فاخرانہ لباس کے نیچے اونی لباس پہنا کرتے تھے۔''

[جواب]: یہ قول بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ ایک رات میں ایک ہزار رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک سفید جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ کاٹن کے فاخرانہ لباس کے نیچے اونی لباس پہننے میں اگر کوئی فضیلت ہوتی تو نبی کریم ﷺ ضرور اپنی امت کی اس طرف رہنمائی فرماتے۔ یا آپ خود ایسا کرتے؛ یا پھر ایسا کرنے کا حکم دیتے؛ یا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کے عہد مبارک میں ایسا کیا ہوتا اور آپ نے اسے

برقرار رکھا ہوتا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا؛ اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم دیا؛ اور نہ ہی آپ کے عہد مبارک میں صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے ایسے کیا۔تو ظاہر ہوا کہ اس فعل میں فضیلت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک سفر میں اپنے عام لباس کے اوپر اونی جبہ پہنا تھا۔صرف اونی جبہ پہننے میں کوئی فضیلت نہیں ہے اور نہ ہی نبی کریم ﷺ نے اس طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کہا گیا: کچھ لوگ اونی لباس پہنتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام اونی لباس پہنا کرتے تھے ۔تو آپ نے فرمایا: ہمارے لیے ہمارے نبی کریم ﷺ کا طریقہ دوسروں کے طریقوں سے بڑھ کرمحبوب اور پسندیدہ ہے۔

علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ کیا اقامت کی حالت میں بغیر ضرورت کے اونی لباس پہننا مکروہ ہے یا نہیں؟ جب کہ سفر میں اونی لباس پہننا اچھی بات ہے' اس لیے کہ سفر میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر اگر مان لیا جائے کہ اونی لباس پہننا اطاعت گزاری اور قربت کا کام ہے۔تو پھر اس صورت میں اونی لباس کو تواضع کے اظہار کے لیے فاخرانہ لباس کے نیچے چھپا کر پہننے کے بجائے اس کے اوپر پہننا افضل اور بہتر تھا۔ اس لیے کہ اندر میں اونی لباس پہننے میں صرف نفس کے لیے بلا فائدہ تکلیف ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اسی چیز کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے زیادہ نفع بخش اور سہل ہو۔انہیں کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیا جس میں ان کے نفس کے لیے عذاب تو ہو مگر کوئی فائدہ نہ ہو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ انسان کے اس کے نفس کو عذاب دینے سے بے پرواہ و بے نیاز ہے۔''[1]

[اشکال]: رافضی مضمون نگار رقم طراز ہے:

> ''ایک روز سرور کائنات ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے آپ کا لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ گود میں تھا، اسی اثناء میں حضرت جبریل تشریف لائے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ حسین و ابراہیم کو جمع نہیں ہونے دے گا، اس لیے آپ جس کو چاہیں پسند فرمائیں، آپ نے فرمایا: حسین رضی اللہ عنہ کی موت کی صورت میں علی و فاطمہ اور میں تینوں روئیں گے اور اگر ابراہیم موت سے ہم کنار ہوا تو میں اکیلا آہ و بکا میں مبتلا ہوں گا، اس لیے میں ابراہیم کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔''
>
> چنانچہ تین دن کے بعد ابراہیم فوت ہوگئے۔اور اس کے بعد جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لاتے تو رسول اللہ ﷺ فرماتے: مرحبا اور خوش آمدید جس کے بدلے میں نے اپنے بیٹے ابراہیم کا فدیہ پیش کیا ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ روایت کسی بھی قابل اعتماد اہل علم نے نقل نہیں کی۔ نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے؛ اور نہ ہی معروف کتب حدیث میں اس روایت کا کوئی نام ونشان ملتا ہے۔اس حکایت کو نقل کرنے والے نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی اور نہ ہی اسے کسی معروف کتاب کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلکہ شیعہ مصنف نے اپنی عادت کے مطابق ایک بے سند بات کی ہے اور بہت گھٹیا قسم کا جھوٹ بولا ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ منقولات میں سچی اور جھوٹی روایت میں فرق اس کی اسناد کی بنا پر ہوتا ہے۔ورنہ یہ بھی محض ایک جھوٹا دعوی ہے جس طرح کئی ایک لوگوں نے اس طرح کے دیگر بھی دعوے کر رکھے ہیں۔

پھر اس سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: اس روایت کے جھوٹا ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔اس قسم کی باتیں جاہل لوگ

---

[1] سنن ابي داؤد ۳/ ۳۱۹؛ الترمذي ۳/ ٤٦۔

کیا کرتے ہیں، بھلا حضرت ابراہیم و حسین رضی اللہ عنہما کو جمع کرنے میں کونسا نقصان ہے جو حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو جمع کرنے میں نہیں۔ اگر حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی موت ابراہیم کی موت سے بڑھ کر تھی تو پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زندگی بھی ان سے بہت زیادہ بڑھ کر ہوتی۔ حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ زندہ رہے۔

نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا حق باقی لوگوں کے حق سے بہت زیادہ اور بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انہیں اپنی جان سے بڑھ کر محبوب ہیں۔ اور آپ نبی کریم ﷺ سے اپنی جان سے بڑھ کر محبت کرتے تھے۔ تو اس صورت میں اگر حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ مر جاتے تو نبی کریم ﷺ کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے بہت زیادہ روتے جتنا وہ اپنے بیٹے حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر روتے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ بیٹے کی محبت طبعی ہوتی ہے؛ جس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہی وصف نبی کریم ﷺ کی محبت میں موجود ہے۔ جب ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ فرما رہے تھے:

''آنکھ رو رہی ہے۔ دل غمگین ہے۔ اور ہم زبان سے صرف وہی کہیں گے جس سے ہمارا اللہ راضی ہو جائے۔ اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں۔'' [البخاری و مسلم]

یہ تو صحیح احادیث میں ثابت ہے۔ پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جگہ اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی؛ اور ان کی جگہ اپنے بیٹے کی موت کو اختیار کیا؟

پھر کیا یہ بھی جائز ہے کہ ایک معصوم انسان کے بدلے کسی دوسرے معصوم کے خون کا بدلہ پیش کیا جائے؟

اگر ایسا کرنا جائز ہوتا تو اس کا الٹ کرنا زیادہ مناسب تھا۔ اس لیے کہ اگر کسی انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو صرف اتنا خرچہ ہو جو یا تو اپنے بیٹے پر خرچ کرے یا پھر اپنے نواسے وغیرہ پر خرچ کرے؛ تو باتفاق مسلمان اس پر اپنے بیٹے پر خرچ کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس اصول کے پیش نظر اگر واقعی ایسے ہی ہوتا کہ اپنے بیٹے یا نواسے میں سے کسی ایک کی موت کو اختیار کیا جائے تو آپ کو چاہیے تھا کہ اپنے بیٹے کا خیال رکھتے۔ خصوصاً جب کہ شیعہ کے ہاں اصل تو نبی کریم ﷺ کی قرابت ہے۔ اور حضرت علی اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے بڑے فضائل میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی قرابت کو شمار کرتے ہیں۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ باقی لوگوں کی نسبت بیٹے کا رشتہ زیادہ قریبی ہوتا ہے۔ تو پھر دور کے رشتہ کو قریبی رشتہ پر مقدم کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب کہ فضیلت اور خصوصیت تو قرابت میں ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر نبی کریم ﷺ کے بعد کسی نبی کے ہونے کو تسلیم کر لیا جاتا تو پھر آپ کے بعد ابراہیم رضی اللہ عنہ زندہ رہتے۔ دوسرے لوگوں نے حضرت انس کے ساتھ اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا آپ کے بعد بھی کسی نبی کو پیدا کرنے کا ارادہ ہوتا تو اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ ابراہیم ہی نبی ہوتا۔

پھر یہ کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا فدیہ کیوں قرار پائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا فدیہ کیوں نہیں بنے؟ جب کہ احادیث میں واضح دلالت موجود ہے کہ ان دونوں بھائیوں میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ افضل تھے۔ اس پر تمام شیعہ اور اہل سنت کا اتفاق ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میں اس سے محبت کرتا ہوں' تو بھی اس سے محبت کر؛ اور اس سے بھی محبت کر جو کوئی اس سے محبت کرے۔''

فصل:

رافضی کا دعویٰ محبت حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ

حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کبار تابعین میں سے تھے ؛ آپ علم اور دینداری کے اعتبار سے سردار شمار ہوتے ہیں ۔ انہوں نے اپنے والد ؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ؛ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ ؛ ابو رافع رضی اللہ عنہ غلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم ؛ اور امہات المومنین میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا؛ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ' اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے علم حاصل کیا۔ ان کے علاوہ مروان بن حکم ؛ سعید بن مسیب ؛ عبداللہ بن عثمان بن عفان ؛ ذکوان مولی عائشہ ؛ وغیرہ رحمہم اللہ سے بھی کسب فیض کیا۔ آپ سے علم نقل کرنے والوں میں سلمہ بن عبدالرحمن ؛ یحی بن سعید انصاری ؛ زہری ؛ ابو زناد ؛ زید بن اسلم اور ان کے بیٹے جعفر رحمہم اللہ کے نام شامل ہیں ۔ یحی بن سعید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے آپ کو مدینہ کے ہاشمیوں میں سب سے افضل پایا۔''

محمد بن سعد طبقات میں فرماتے ہیں:

''آپ کثرت کے ساتھ حدیث روایت کرنے والے ثقہ ؛ مامون ؛ بلند قدر اور عالیشان عالم تھے۔''

حماد بن زید نے یحی بن سعید الانصاری سے روایت کیا ہے : وہ فرماتے ہیں : میں نے حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ کو سنا ؛ آپ کو میں نے سب ہاشمیوں میں سے افضل پایا ؛ آپ فرمارہے تھے :'' اے لوگو! ہم سے اسلام کے اصولوں کے مطابق محبت کرو۔ تم ہم سے ایسی محبت کرتے رہے کہ اب تمہاری محبت ہمارے لیے عار بن گئی ہے۔''

شیبہ بن نعمہ کا قول ہے : حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ لوگوں کو بخیل لگتے تھے ۔ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو پتہ چلا کہ آپ چپکے سے خاموشی میں اہل مدینہ کے ایک سو گھرانوں کی مدد کیا کرتے تھے ۔

نماز میں آپ کا خشوع ؛ خفیہ صدقات وغیرہ کے علاوہ آپ کے کئی ایک ایسے فضائل ہیں جو لوگوں کے مابین بڑے معروف ہیں ۔ آپ کی دینداری اور خیر خواہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کی مجلس میں شریک ہوتے ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے غلام زید بن اسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے ۔ اور تابعین میں سے آپ کا شمار بڑے اہل علم اور دیندار لوگوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ سے کہا جاتا : آپ اپنی قوم کی مجلس چھوڑ کر اس آدمی کی مجلس میں بیٹھتے ہیں ؟ ۔ تو آپ جواب میں فرمایا کرتے :'' انسان وہیں بیٹھتا ہے جہاں وہ اپنے دل کی اصلاح پاتا ہے۔''

باقی رہا مسئلہ کہ آپ کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے کہ آپ رات کو ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے ؛ تو اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے ۔ شریعت ایسے امور کو ناپسند کرتی ہے ۔ نیز ایسا کرنا بھی کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے ۔ ایسی باتوں کو مناقب میں ذکر کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں ہے۔''

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار یہ بھی کہتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن حسین کا نام ''زین العابدین'' تجویز کیا۔

[جواب]: یہ بے اصل بات ہے اور کسی عالم نے یا دیندار انسان نے ایسی کوئی روایت بیان نہیں کی ۔

[اشکال]: شیعہ کا یہ قول کہ:'' ابو جعفر محمد بن علی [بن حسین] اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور بہترین عالم اور

دیندار تھے۔ اور کہا جاتا ہے کہ آپ کو باقر اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے تمام علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی؛ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کی پیشانی پر سجدہ کے نشانات ہیں۔''

[جواب]: آپ کے متعلق زمانے کا سب سے بڑا عالم ہونے کا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ امام زہری اسی زمانہ میں بقید حیات تھے اور وہ لوگوں کے نزدیک ابو جعفر رحمہ اللہ کی نسبت بڑے عالم تھے۔ یہ صریح جھوٹ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ابو جعفر کا نام باقر تجویز کیا تھا؛ اہل علم کے ہاں کسی بھی ایسی روایت کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ بلکہ اس کا شمار من گھڑت روایات و حکایات میں ہوتا ہے۔ یہی حال حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب سلام پہنچانے والی روایت کا ہے۔ یہ روایت بھی موضوع اور من گھڑت ہے۔ لیکن اس راوی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دیگر چند روایات نقل کی ہیں۔ جیسے کہ غسل اور حج کی احادیث؛ اور ان کے علاوہ دیگر بھی کئی ایک صحیح احادیث منقول ہیں۔ آپ اپنے والد علی بن حسین کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت تشریف لے گئے جب وہ نابینا ہو چکے تھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے بہت زیادہ محبت کیا کرتے تھے۔ آپ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی صحابہ کرام میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما ابو سعید؛ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ سے بھی روایات نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ سعید بن المسیب؛ محمد بن الحنفیہ؛ وعبید اللہ بن ابی رافع منشی حضرت علی؛ ابو اسحٰق ہمدانی؛ عمرو بن دینار زہری؛ عطاء ابن ابی رباح؛ ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن رحمہم اللہ سے بھی کسب فیض کیا ہے۔ امام اعرج عمر میں آپ سے بڑے تھے۔ ان کے بیٹے جعفر؛ ابن جریج؛ یحیٰ بن ابی کثیر اور اوزاعی وغیرہ۔ رحمہم اللہ۔ سے بھی کسب علم کیا ہے۔

جعفر بن محمد رحمہ اللہ کی مدح و ستائش:

جعفر الصادق رحمہ اللہ اہل علم و دین کے بہترین لوگوں میں سے تھے۔ آپ نے اپنے دادا سے کسب فیض کیا؛ ان کی والدہ ام فروہ بنت القاسم بن محمد بن ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ تھیں۔ ان کے علاوہ محمد بن المنکدر؛ نافع مولی ابن عمر؛ زہری؛ عطاء ابن ابی رباح؛ اور دوسرے تابعین کرام رحمہم اللہ سے بھی علم حاصل کیا۔ آپ سے یحیٰ بن سعید الانصاری؛ مالک بن انس؛ سفیان ثوری؛ سفیان بن عیینہ؛ ابن جریج؛ یحیٰ بن سعید القطان؛ حاتم بن اسماعیل؛ حفص بن غیاث؛ محمد ابن اسحٰق ابن یسار رحمہم اللہ نے کسب فیض اور نقل علم کیا ہے۔ عمرو ابن ابو المقدام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب میں امام جعفر بن محمد رحمہ اللہ کو دیکھتا تھا تو پتہ چلتا تھا کہ آپ انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں۔''

[اشکال]: شیعہ مصنف آپ کے بارے میں کہتا ہے: ''آپ حکومت طلبی کو چھوڑ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔''

[جواب]: یہ امامیہ کے اقوال میں تناقض کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک امامت کا بوجھ برداشت کرنا امامت کے واجبات میں سے ہے۔ آپ کے زمانے میں آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام بھی نہیں تھا۔ اگر اس عظیم الشان امر کو ادا کرنا واجب تھا تو پھر اس کے حقوق پورے کرنا نفل عبادت میں مشغول ہونے سے زیادہ اولیٰ تھا۔

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''جعفر بن محمد نے امامیہ کی فقہ اور عقائد و معارف کو خوب پھیلایا۔''

[جواب]: اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے وہ مسائل اختراع کیے جو متقدمین کو معلوم نہ تھے یا یہ کہ ان کے پیش رو اپنے واجبات کی ادائیگی اور علم کی نشر و اشاعت میں کوتاہی کا ارتکاب کرتے رہتے تھے۔ کیا اس میں کوئی

مسلمان شک کر سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام علوم و معارف اور امورِ عقائد و ایمان بوجہ اکمل سیکھے تھے؛ اور پھر انہیں آگے مسلمانوں تک بھی پہنچایا تھا۔

اس دعویٰ کا مقتضی آپ کی تعریف نہیں' بلکہ آپ کی شان میں قدح کرنا ہے۔ بلکہ امام جعفر الصادق پر ان کے متقدمین ائمہ کی نسبت بہت زیادہ جھوٹ بولا گیا ہے۔ یہ تمام تر آفات جھوٹ گھڑنے والوں کی طرف سے پیش آئی ہیں' آپ اس سے بری ہیں۔ حقیقت میں حضرت جعفر رحمہ اللہ سے متعلق جھوٹ کا طومار باندھنے والے اس آفت کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے جھوٹ موٹ کتاب البطاقہ، کتاب الجفر، کتاب الہفت، کلام فی النجوم؛ مقدمہ رعود و بروق؛ اختلاج الاعضاء اور دیگر کتب کو ان کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ ایسے ہی [شیعہ مفسر] ابو عبد الرحمن نے اپنی تفسیر ''حقائق التفسیر'' میں آپ پر وہ جھوٹ باندھے جن سے آپ اللہ کے نزدیک بری ہیں۔ یہاں تک کہ جو بھی انسان اپنے جھوٹ کی دکان چمکانا چاہتا ہے' وہ اسے جعفر الصادق کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

دروغ گوئی کی حد یہ ہے کہ ''رسائل اخوان الصفا'' بعض لوگوں کے نزدیک امام جعفر سے ماخوذ ہیں۔ اس کا جھوٹ ہونا ہر ایک پر عیاں ہے۔ اس لیے کہ امام جعفر رحمہ اللہ کا انتقال ۱۴۸ ہجری میں ہوا۔ حالانکہ یہ رسائل ان کے دوصد سال بعد اس زمانہ میں تصنیف کیے گئے تھے جب اسماعیلیہ باطنیہ نے مصر کی حکومت پر قبضہ جمایا اور قاہرہ میں المعزیہ نام سے شہر قائم کیا۔ یہ سن ۳۵۰ ہجری کے بعد کی بات ہے۔ اس وقت میں اس مذہب کے زور پکڑ جانے کی وجہ سے یہ رسائل تصنیف کیے گئے۔ جن کے ظاہر میں شیعیت ٹپکتی ہے اور اندر خالص کفر و شرک بھرا ہوا ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ شریعت کے پیرو ہیں اور شریعت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، باطن شریعت اس کے ظاہر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ دراصل یہ لوگ درپردہ فلسفہ زدہ لوگ تھے اور اسی اساس پر انہوں نے وہ رسائل تصنیف کیے تھے۔ نصاریٰ نے ملک شام کے جس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اس کا ذکر ان رسائل میں ملتا ہے۔ ان میں سے پہلا رسالہ چوتھی صدی ہجری کے شروع میں لکھا گیا تھا۔

فصل:

[موسیٰ بن جعفر]

[شیعہ مصنف نے کہا ہے]: جعفر کے بعد موسی بن جعفر کا نام آتا ہے۔ ان کے متعلق محدث ابو حاتم الرازی لکھتا ہے:

''آپ ثقہ اور صدوق ہیں اور مسلمان ائمہ میں سے ایک امام ہیں۔'' [الجرح والتعدیل (۸/ ۱۳۹)]

[جواب]: میں کہتا ہوں: موسی کی پیدائش ایک سو بیس ہجری کے بعد مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ [خلیفہ] مہدی آپ کو ساتھ لیکر بغداد آئے؛ اور پھر مدینہ طیبہ واپس کر دیا۔ خلیفہ رشید کے دور تک آپ مدینہ میں مقیم رہے۔ ہارون جب عمرہ سے واپس آتے ہوئے مدینہ سے گزرا تو اس نے موسی کو بھی اپنے ساتھ بغداد لے لیا۔ اور آپ کو وہاں پر نظر بند کر دیا؛ یہاں تک کہ نظر بندی کے عالم میں ہی آپ کی موت واقع ہوگئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ ۱۸۳ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ نیز ابن سعد نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''موسیٰ بن جعفر کثیر الروایت نہیں ہے۔'' آپ نے اپنے باپ جعفر سے روایات نقل کی ہیں۔ اور آپ سے آپ کے بھائی علی نے روایت کیا ہے؛ ان سے امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایات نقل کی ہیں۔

جہاں تک موسیٰ بن جعفر کے بعد میں آنے والے ائمہ کا تعلق ہے ان سے علوم وفنون اور فتاویٰ کے اخذ واستفادہ اور علم و تاریخ کے بارے میں شیعہ نے جو روایات ذکر کی ہیں ان میں سے ایک بھی درست نہیں۔ پہلے تینوں سے ذکر کردہ روایات صحاح ؛سنن اور مسانید میں موجود ہیں۔اور سلف کے فتاوی کی کتابوں میں ان کے فتاوی جات پائے جاتے ہیں ؛ جیسے کہ ابن مبارک کی کتابیں ؛سعید بن منصور اور عبدالرزاق؛ ابوبکر ابن ابی شیبہ؛ اور دیگر لوگوں کی کتابیں [بھی ان کے فتاوی سے منور ہیں]۔ جب کہ ان کے بعد آنے والوں سے کوئی بھی روایت کسی بھی مستند کتاب حدیث میں نہیں ملتی۔ جب کے ان کے بعد نہ ہی کسی اہم ترین کتاب حدیث میں ان سے کوئی روایت نقل کی گئی ہے اور نہ ہی سلف کے فتاوی کی معروف کتابوں میں ان کا کوئی فتوی ہے ؛ اور نہ ہی تفاسیر کی کتابوں میں ان کا کوئی قول نقل کیا گیا ہے۔لیکن اس کے باوجود ان کے وہ فضائل ومناقب مسلمہ ہیں جن کے وہ اہل ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب پر راضی ہو جائے۔

ان میں سے موسی بن جعفر زہد وعبادت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔

باقی رہی شقیق بلخی کی طرف منسوب حکایت ؛ وہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔اس لیے کہ یہ حکایت موسی بن جعفر کے معروف احوال کے برعکس ہے۔موسی اپنے والد جعفر کی وفات کے بعد مدینہ میں ہی مقیم رہے۔جعفر کا انتقال ۱۴۸ہجری میں ہوا۔آپ اس وقت تک بغداد تشریف ہی نہیں لائے تھے کہ آپ قادسیہ کے مقام پر موجود ہوتے۔نیز آپ کی شہرت کی وجہ سے آپ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔اس لیے کہ لوگ آپ کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔نیز آپ پر یہ تہمت بھی تھی کہ آپ ملک حاصل کرنا چاہتے ہیں ؛اسی لیے پہلے مہدی نے آپ کو ساتھ بغداد میں لے لیا تھا؛اور پھر منصور آپ کو ساتھ لے گیا۔

[اشکال]:شیعہ کی یہ روایت کہ:''حضرت بشر حافی رحمہ اللہ نے موسیٰ بن جعفر کے ہاتھ پر توبہ کی تھی۔''

[جواب] :یہ صاف جھوٹ ہے۔اور وہی شخص اس کو تسلیم کرسکتا ہے جو تاریخی حقائق سے نابلد ہو۔اصل قصہ یہ ہے کہ ہارون الرشید عباسی نے موسیٰ بن جعفر کو عراق بلا کر قید کر دیا تھا اور بس! آپ کو یہ موقع ہی نہیں دیا گیا تھا کہ آپ بشر وغیرہ کے محلہ میں یا عام لوگوں کے ساتھ گھو میں پھریں۔

[اشکال]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:''علی بن موسیٰ الرضا اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم وزاہد تھے۔آپ سے جمہور فقہاء نے علم روایت کیا ہے۔مامون نے آپ کو آپ کے علم وفضل اور کمال کی وجہ سے والی بنالیا تھا۔ایک دن آپ نے اس کے بھائی زید کو وعظ کیا۔آپ نے فرمایا:''اے زید تم رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دو گے جب خون بہایا جائے' اور ناحق اور حرام طریقہ سے مال چھینا جائے اور راستوں کو پرخطر بنادیا جائے۔اور اہل کوفہ کے بیوقوف آپ کو دھوکہ میں مبتلا کر دیں۔حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی ؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو جہنم پر حرام کردیا ہے۔''اور ایک روایت میں ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ! آپ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا نام کیوں رکھا؟ آپ نے فرمایا:''اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی اولاد کو جہنم کی آگ سے آزاد کردیا تھا۔اور یہ عفت و پاکدامنی ان کے اولاد کے لیے جہنم کی آگ پر حرام ہونے کا سبب ہے: اور تو ان پر ظلم کررہا ہے۔اللہ کی قسم !انہوں نے یہ مقام اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے حاصل کیا ہے؛ اورتم یہ مقام اللہ کی نافرمانی سے حاصل کرنا چاہتے ہو جو انہوں نے اسکی فرمانبرداری سے حاصل کیا ہے۔

''مامون نے درہم اور دینار پر آپ کا نام لکھنا شروع کیا؛ اور ملک کے ہر کونے میں آپ کی بیعت کے لیے آڈر جاری کیا اور کالے لباس اتار کر سبز لباس پہننے کا حکم دیا''۔[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: واقعہ یہ ہے کہ: حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کے متعلقین جن مصائب و آلام میں مبتلا ہوئے ان میں سے شیعہ کا آپ کی طرف منسوب ہونا ہے۔ شیعہ نے ان کی مدح وستائش میں حد درجہ مبالغہ آمیزی سے کام لینا شروع کیا۔ اور آپ کی مدح میں ایسی باتیں کرنے لگے جو حقیقت میں مدح نہیں تھیں۔ اور آپ کے متعلق ایسے دعوے کرنے لگے جن کی کوئی دلیل نہیں۔ اور آپ کے فضائل میں ایسی باتیں کرنے لگے کہ اگر دوسرے لوگوں کی روایات سے آپ کے فضائل و مناقب معلوم نہ ہوتے تو شیعہ رافضہ کا کلام مدح کے روپ میں حقیقت میں آپ کی مذمت اور جرح وقدح پر مشتمل ہوتا۔ اس لیے کہ حضرت علی بن موسیٰ رحمہ اللہ کے فضائل و معارف اور محاسن معلوم و مشہور ہیں۔ اور آپ کی تعریف و توصیف بھی ان مناسب الفاظ میں ہونی چاہیے جنہیں اہل معرفت جانتے ہیں۔ جب کہ یہ رافضی ایسے الفاظ میں آپ کے فضائل بیان کرتا ہے جن کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

[اشکال]: شیعہ مصنف کا قول کہ: ''آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم اور زاہد تھے۔''

[جواب]: یہ دعویٰ بغیر دلیل کے ہے۔ جو کوئی بھی کسی کی شخصیت میں غلو کرتا ہے؛ اس کے لیے ایسے دعوے کرنا ممکن ہیں۔ یہ درست ہے کہ علی بن موسیٰ عظیم المرتبت بزرگ تھے، مگر ان کے زمانہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو آپ سے بڑے عالم اور زاہد تھے۔ بڑے عالم جیسے امام شافعی؛ اسحق بن راہویہ؛ احمد بن حنبل؛ اور اشہب بن عبد العزیز رحمہم اللہ بقید حیات تھے جو ان کی نسبت بہت بڑے عالم تھے۔ اور معروف کرخی و ابو سلیمان دارانی رحمہم اللہ بھی تھے جو علی بن موسیٰ سے کہیں زیادہ زہد و تقویٰ رکھتے تھے۔ ان محدثین میں سے کسی ایک نے بھی آپ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ اور نہ ہی معروف کتب صحاح ستہ میں آپ سے کوئی روایت نقل کی گئی ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ چند افراد مثلاً ابو الصلت ہروی وغیرہ نے ان سے ان روایات میں استفادہ کیا تھا جو وہ اپنے آباء و اجداد سے نقل کرتے ہیں، مگر اس میں اتنا جھوٹ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے عام سچے لوگوں کو بھی منزہ رکھا ہے؛ تو پھر سچے اہل علم کا کیا حال ہوگا؟۔

[اشکال]: شیعہ مصنف کا کہنا ہے کہ ''جمہور فقہاء نے علی بن موسیٰ سے بہت کچھ اخذ کیا۔''

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ اور بہتان عظیم ہے۔ ان مشہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی آپ سے کوئی ایسی روایت نقل نہیں کی جو کہ اہل علم میں معروف ہو۔ اگر کسی نے کوئی روایت بھی کی ہوگی تو کوئی ایسا ہوگا جو مشہور و معروف فقہاء میں سے نہیں؛ تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ علم کے طلب گار متوسطین اور اس سے بھی کم درجہ کے لوگوں سے بھی علم حاصل کرتے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے جو ذکر کیا ہے کہ معروف کرخی آپ کے خادم تھے؛ اور آپ کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کیا تھا؛ اور آپ کو علی بن موسیٰ کی طرف سے خرقہ بھی ملا تھا۔ یہ تمام باتیں بالاتفاق جھوٹ ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی معروف نہیں ہے۔

شان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میں مبالغہ آمیزی:

[اشکال]: رافضی مضمون نویس کا یہ قول کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت و عصمت کی وجہ سے

اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد پر دوزخ کو حرام کر دیا۔''

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔اس روایت کے من گھڑت ہونے پر تمام اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔عام لوگوں کیلئے بھی اس روایت کا جھوٹ اس کے الفاظ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔یہ کہنا کہ:''سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت وعصمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد پر دوزخ کو حرام کر دیا۔''

اس کا تقاضا یہ ہے کہ: کسی عورت کا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنا اس کے لیے اور اس کی اولاد کے لیے جہنم کی آگ سے آزادی کا سبب بن جائے گا۔ یہ بات قطعی طور پر باطل ہے۔اس لیے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے بھی اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی؛ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام اولاد کو جہنم کی آگ پر حرام نہیں کیا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ ۞ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِنَفْسِهِ مُبِينٌ﴾ [الصافات ۱۱۲۔۱۱۳]

''اور ہم نے اس کو اسحاق (علیہ السلام) نبی کی بشارت دی جو صالح لوگوں میں سے ہوگا۔اور ہم نے ابراہیم واسحاق (علیہما السلام) پر برکتیں نازل فرمائیں اور ان دونوں کی اولاد میں بعضے تو نیک بخت اور بعض اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَإِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ فَمِنْهُمْ مُهْتَدٍ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ [الحدید ۲٦]

''بیشک ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا اور ہم نے دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی تو ان میں کچھ تو راہ یافتہ ہوئے اور ان میں سے اکثر نافرمان رہے۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہیں۔اور ان میں اتنے کافر ہیں جن کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔اور ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہا پاک دامن عورت تھیں؛ ان کی اولاد میں سے ظالم بھی تھے اور نیک وکار اور احسان کرنے والے بھی۔

خلاصہ کلام! معصوم وعفیف عورتیں اتنی لا تعداد ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔اور ان کی اولاد میں اچھے اور برے؛ مؤمن اور کافر بھی قسم کے لوگ ہیں۔بنا بریں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صرف عفت وعصمت کی وجہ سے یہ فضیلت نہیں حاصل ہوسکتی۔اس لیے کہ اس وصف میں جمہور مسلمان عورتیں شامل ہیں۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا صرف اس وصف کی بنا پر تمام جہان کی خواتین کی سردار قرار نہیں پائیں۔بلکہ اس کا ایک خاص سبب ہے۔رافضی ہمیشہ اسی طرح کے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔اپنی جہالت کی وجہ سے انہیں صحیح طرح سے استدلال کرنا بھی نہیں آتا۔اور جھوٹ بھی ایسے بولتے ہیں کہ وہ نفاق کا مظہر ہوتا ہے[اور فوراً پکڑا جاتا ہے]۔

مزید برآں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تمام اولاد کو جہنم کی آگ پر حرام نہیں کیا گیا۔بلکہ ان میں نیک لوگ بھی ہیں اور بد کردار بھی ہیں۔پھر اس پر طرہ یہ کہ خود شیعہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اہل سنت اولاد پر جو کہ حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے ہیں کفر وفسق کا فتوی لگاتے ہیں، مثلاً حضرت زید بن علی۔آپ کو صرف اسی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں کہ آپ حضرت ابو بکر و

عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے تھے۔ رافضیہ شیعہ نے اسی بنا پر آپ کا ساتھ چھوڑ دیا؛ اور آپ کو کافر و فاسق کہنے لگے۔ اس بنا پر رافضی اولاد فاطمہ سے سب سے زیادہ دشمنی رکھنے والے ہیں؛ خواہ ایسا ان کی جہالت کی وجہ سے ہو یا بغض وعناد کی وجہ سے۔

پھر حضرت علی بن موسیٰ رحمہ اللہ علیہ کی اپنے بھائی کو وعظ و نصیحت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں مطیع و فرمانبردار بھی ہیں اور نافرمان بھی۔ اور انہوں نے کرامت اور عزت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے پائی ہے۔ یہ قدر تمام مخلوق کے مابین مشترک ہے۔ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اسے عزت دیتے ہیں۔ اور جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کردے۔ اس پر کتاب و سنت سے دلائل موجود ہیں۔

باقی رہا جو شیعہ مصنف نے خلیفہ مامون کی طرف سے آپ کو خلیفہ بنانے کا لکھا ہے؛ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن پھر ایسا نہیں ہوسکا۔ بلکہ یہ معاملہ ایسے ہی رہا یہاں تک کہ علی بن موسیٰ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کو خلیفہ نے اپنا ولی عہد نہیں بنایا تھا۔ رافضیوں کا خیال ہے کہ آپ کو زہر دیکر مارا گیا۔ اگر مامون کا آپ کو خلافت کے لیے تجویز کرنا حجت ہوسکتا ہے تو پھر یہ بھی حجت ہے کہ آپ حقیقت میں خلیفہ بن نہیں سکے۔ اگر یہ پہلا فعل حجت نہیں ہے؛ تو دوسرا بھی حجت نہیں ہوسکتا۔ اور ایسی باتوں کو مناقب میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مگر رافضیوں کا کیا جائے وہ حقیقت میں مناقب و مثالب کو جانتے ہی نہیں۔ اور نہ ہی انہیں ان اسناد کا کچھ علم ہے جن سے علم حاصل ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی صحیح دلیل کے بجائے ابونواس کے اشعار سے استدلال کیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے؛ تو تب بھی ابونواس جیسے جھوٹے اور فاسق و فاجر شاعر کے ابیات سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ اس کا فسق و فجور کسی ادنی علم رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں ہے۔ یہ اپنے شعر میں کہتا ہے:

''میں اس امام کی مدح کیسے بیان کرسکتا ہوں جس کے باپ کے خادم حضرت جبریل تھے۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں [اگر یہ منقبت ہے تو] اس میں تمام انبیاء کی اولاد شامل ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد بھی اس میں برابر کی شریک ہے۔ تو پھر اس میں کون سی ایسی خصوصیت ہے کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر آپ ہی امام ہوں؟

اس کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی ایک کی بھی تعریف و توصیف نہ کی جائے۔ اس لیے کہ یہ وصف تو ان تمام کے مابین مشترک ہے۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد ہونا لوگوں کے مابین ایک مشترکہ وصف ہے۔ اس لیے کہ تمام لوگ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ایسے ہی بنی اسرائیل خواہ وہ یہودی ہوں یا غیر یہودی وہ حضرت ابراہیم؛ حضرت اسحق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

ایسے ہی حضرت جبریل علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم قرار دینا بھی ایک اچھوتی بات ہے۔ ایسی بات وہی کہہ سکتا ہے جو ملائکہ کی قدر و منزلت سے ناواقف ہو۔ اور نہ ہی انہیں فرشتوں کے انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس آنے کی وجہ و منزلت کا علم ہو۔ مگر کیا کریں رافضیوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے اشعار سے ایسی دلیلیں حجت میں پیش کرتے ہیں جو ان کی جہالت اور ظلم کے مناسب ہوتی ہیں۔ اور ایسی من گھڑت اور جھوٹی روایات پیش کرتے ہیں جو کہ رافضیوں کے ہی شایان شان ہوسکتی ہیں۔ کیا ایسے اشعار اور روایات سے بھی دین کے اصول ثابت ہوسکتے ہیں؟ ایسا تو وہی انسان کرسکتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے بصیرت چھین لی ہو۔

فصل:

مناقب محمد بن علی الجواد

[رافضي مصنف كهتا هے] : آپ کا بیٹا محمد بن علی الجواد علم وتقوی' اور جود وسخا میں اپنے باپ کے نقش قدم پر گامزن تھا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو آپ کی چھوٹی عمر کے باوجود کثرت علم؛ دینداری اور وفور عقل کی وجہ سے خلیفہ مامون آپ سے محبت کرنے لگا۔ اور اس کا خیال یہ ہوا کہ وہ اپنی بیٹی ام فضل آپ کو بیاہ دے۔ اور اس سے پہلے اس کے باپ امام رضا سے اپنی بیٹی ام حبیب کی شادی بھی کر چکا تھا۔ اس وجہ سے عباسیوں کو اس بات پر بہت غصہ ہوا: اور انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں حکومت ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اور آپ کی بھی اسی طرح بیعت کر لی جائے' جیسے آپ کے والد کی بیعت کر لی گئی تھی۔

پس خلیفہ کے حاشیہ نشین جمع ہو گئے اور اسے اپنے ارادہ سے باز رہنے کے لیے کہا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ: ابھی یہ چھوٹا بچہ ہے' اسے کوئی علم نہیں۔ اس کے جواب میں خلیفہ نے کہا: ''میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' اگر تم چاہتے ہو تو پھر اس کا امتحان لے لو۔ وہ لوگ اس بات پر راضی ہو گئے۔ انہوں نے قاضی یحیی بن اکثم کو اس کا بہت سخت امتحان لینے کے لیے بہت بڑی رشوت دی کہ ایسا سوال پوچھا جائے جس کا جواب دینے سے یہ عاجز آ جائے۔ ایک دن کا وقت مقرر ہوا۔ مامون نے آپ کو حاضر کیا۔ قاضی اور عباسیوں کی ایک جماعت بھی حاضر ہوئی۔ قاضی نے کہا: میں آپ سے ایک چیز کے بارے میں سوال کروں گا؟ آپ نے کہا: پوچھو۔ اس نے پوچھا: تم اس محرم کے بارے میں کیا کہتے ہو جس نے شکار کو مار دیا ہو؟

آپ نے اس کے جواب میں پوچھا: کیا اس نے حل میں شکار مارا ہے یا حدود حرم میں؟ ۔ اور کیا وہ اس مسئلہ کا علم رکھتا تھا یا اس سے جاہل تھا؟ ۔ جانور کو پہلی بار مارا ہے یا پھر دوسری بار پلٹ کر مارا ہے یا پھر اپنی طرف سے بغیر کسی بات کے اسے مار ڈالا؟ ۔ اور کیا جانور چھوٹا تھا یا بڑا؟ کیا شکار پرندہ تھا یا پھر کوئی دوسرا؟ ۔ اس پر یحیی بن اکثم بہت حیران ہوا؛ اور عاجزی کے آثار اس کے چہرہ پر نمایاں نظر آنے لگے۔ حتی کہ اہل مجلس کو آپ کی قدر و منزلت کا علم ہو گیا۔ مامون نے اپنے اہل بیت سے کہا: کیا جس چیز کا تم انکار کرتے تھے' اب اس کو سمجھ لیا؟ ۔ پھر امام صاحب خلیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: کیا آپ اب یہ رشتہ مجھے دیں گے؟ ۔ خلیفہ نے کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا: آپ خود ہی خطبہ نکاح پڑھ دو۔ پس خلیفہ نے خطبہ پڑھا' اور پانچ سو عمدہ دراہم پر نکاح ہوا جس مہر پر آپ کی دادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا تھا۔ اور پھر اس کی شادی کر دی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب : محمد بن علی الجواد بنی ہاشم کے مشہور و معروف افراد میں سے تھے' آپ سخاوت و قیادت میں مشہور تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو جواد کہا جاتا ہے۔ آپ کا انتقال جوانی میں ہی پچیس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ آپ کی پیدائش سن پچانوے ہجری میں ہوئی اور ایک سو بیس یا ایک سو انیس ہجری میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ مامون نے اپنی بیٹی کی شادی آپ سے کر دی تھی۔ خلیفہ ان کے پاس دس لاکھ درہم بھیجا کرتا تھا۔ پھر آپ کو بغداد بلا لیا' اور وہیں پر آپ کا انتقال ہو گیا۔

باقی جو کچھ اس رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے' یہ بھی اس سے پہلے کے کلام کی طرح ہے۔ اس لیے کہ رافضیوں کے پاس

نہ ہی عقل صریح موجود ہے اور نہ ہی نقل صحیح ۔ نہ ہی حق کو قائم کر سکتے اور نہ ہی باطل کو مٹا سکتے ہیں ۔ نہ ہی حجت و بیان کے ساتھ اور نہ ہی ہاتھ اور شمشیر کے ساتھ ۔اس لیے کہ جو کچھ اس نے ذکر کیا ہے اس سے محمد بن علی کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی چہ جائے کہ اس سے امامت ثابت ہو جائے ۔اس لیے کہ یہ حکایت جسے یحی بن اکثم سے بیان کیا جار ہا ہے' ان جھوٹی داستانوں میں سے ایک ہے جنہیں سن کر جاہل لوگ ہی بغلیں بجا سکتے ہیں ۔ یحی بن اکثم بہت بڑے عالم و فاضل اور فقیہ تھے ؛ ان کا رتبہ اس مقام سے بہت بلند تھا کہ وہ کسی کو عاجز کرنے کے لیے حالت احرام میں شکار کرنے کا سوال پوچھیں ۔اس لیے کہ چھوٹے چھوٹے علماء بھی اس مسئلہ کا حکم جانتے ہیں ۔ یہ کوئی نادر یا دقیق علمی مسئلہ نہیں ہے جس کے حل کیلئے بڑے علماء کی ضرورت ہو ۔

پھر جو کچھ اس نے بیان کیا ہے' اس میں فقط شکاری کے مختلف احوال کا بیان ہے ۔اور صرف اس تقسیم کا ہونا اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ان میں سے ہر قسم کا حکم بھی معلوم ہو ۔بس اس سے صرف سوال کرنے کا اچھا انداز ظاہر ہوسکتا ہے ۔ ہر اچھا سوال کرنے والے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ اچھی طرح جواب بھی دے سکتا ہو ۔اور پھر اگر اس نے ان ممکنہ اقسام کو اگر بطور واجب کے ذکر کیا ہے تو ان اقسام کا مکمل احاطہ نہیں کیا گیا ۔اور اگر ایسا کرنا واجب نہ تھا تو پھر بعض چیزوں کی تفصیل ذکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔اس لیے کہ ان جملہ اقسام کے بارے میں اتنا ہی پوچھ لینا کافی تھا کہ کیا اس نے یہ شکار غلطی سے کیا ہے یا جان بوجھ کر؟ ۔

ان الفاظ میں سوال کرنا یہ زیادہ بہتر تھا بجائے یہ کہنے کے کہ: کیا وہ اس کا حکم جانتا تھا یا نہیں جانتا تھا؟ ۔اس لیے کہ خطاء کار اور متعمد کے مابین فرق ثابت ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے ۔جب کہ خطاء کی جزاء لازم ہونے کے بارے میں اختلاف مشہور ہے ۔ امام احمد اور سلف و خلف کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ خطاء کار پر کوئی جزاء نہیں ہوتی ۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے ۔ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''اور جو کوئی تم میں سے اس کو عمداً قتل کر بیٹھا تو اس کا بدلہ مساوی کا جانور ہوگا جس کو اس نے قتل کیا ہے ۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے جان بوجھ کر شکار کرنے والے کے ساتھ خاص طور پر جزاء کا ذکر کیا ہے ۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ خطاء کار پر کوئی جزاء نہ ہو ۔اصل تو اپنی ذمہ داری سے برأت ہے ۔اور اس نص کی روشنی میں یہ جزاء متعمد پر واجب ہوتی ہے ۔ جب کہ خطاء کار اپنی اصل پر ہے ۔اور اس لیے بھی کہ اس حکم میں خاص طور پر متعمد کا ذکر کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ خطا کار پر اس حکم کا اطلاق نہ ہو ۔سیاق شرط سے یہ مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے ۔ یہاں پر عام کے بعد خاص کا ذکر کیا گیا ہے ۔اگر ان دونوں کا حکم ایک ہی ہوتا تو پھر اتنا کہہ دینا کافی تھا: ﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ منکم﴾ ''اور جو شخص تم میں سے اس کو قتل کرے'' ۔اس طرح انتہائی اختصار کے ساتھ حکم واضح ہو جاتا ۔لیکن یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے: ﴿وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا﴾ ''اور جو شخص تم میں سے اس کو جان بوجھ کر قتل کرے'' ۔ یہاں پر متعمد کا لفظ زیادہ کرنے سے اس کے معانی میں کمی آگئی ۔ یہ حکمت لوگوں میں سے کسی ادنی ترین آدمی کے کلام سے بھی سمجھی جا سکتی ہے؛ تو پھر کلام اللہ جو کہ بہترین اور افضل ترین کلام ہے' اور اس کلام کی فضیلت بھی مخلوق کے کلام پر ایسے ہی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر؛ [تو پھر اس سے کیوں یہ بات سمجھ نہیں آسکتی] ۔

جمہور علماء جو کہ خطاء کار پر جزاء کو واجب کرتے ہیں' وہ عموم احادیث اور آثار صحابہ سے استدلال کرتے ہیں ۔ نیز وہ قتل

خطا پر بھی قیاس کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعمد کو بطور خاص ذکر کیا ہے' اس لیے کہ اس موقع پر ان لوگوں کے لیے احکام اور وعید بیان ہو رہی تھی جو عمداً ایسے کام کرتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد جزاء بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ﴾ [المائدة ۹۵]

''تاکہ وہ اپنے شامت اعمال کا مزہ چکھے، اللہ تعالیٰ نے سابقہ معاف کر دیا اور جو کوئی دوبارہ ایسی ہی حرکت کرے گا تو اللہ انتقام لے گا۔''

جب یہاں پر اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا ذکر کیا ایک جزاء اور دوسرا انتقام ؛ تو ان دونوں کا مجموعہ متعمد کے ساتھ خاص ہے۔ جب مجموعی سزا متعمد کے لیے خاص ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سزا کا بعض حصہ خطا کار کے لیے ثابت نہ ہوتا ہو۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ [النساء ۱۰۱]

''اور جب تم لوگ سفر کے لیے نکلو تو تم پر کوئی مضائقہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کر دو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔''

یہاں پر مراد تعداد اور ارکان دونوں میں قصر [کمی] کرنا ہے۔ اس قصر میں دونوں اقسام شامل ہیں : نماز سفر ؛ اور نماز خوف۔ یہاں ان دونوں احکام کے ان دوقسموں کی نماز کے بارے میں خاص ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے کسی ایک نماز کے لیے کوئی ایک حکم خاص ہو۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔

اور ایسے ہی یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کرتا کہ: جب اس نے شکار کیا تو کیا اسے اپنا حالت احرام میں ہونا یاد تھا یا پھر اسے بھول گیا تھا۔ اس لیے کہ بھولے ہوئے انسان پر حکم لگانے کے بارے میں جاہل سے زیادہ اختلاف ہے۔ انہیں تو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا اس نے شکار اس وجہ سے کیا ہے کہ شکار نے اس پر حملہ کر دیا تھا' اور وہ اپنے دفاع پر مجبور ہو گیا تھا' یا پھر اس نے بغیر کسی وجہ کے شکار کر ڈالا۔

نیز اس قسم کی تقسیم سے سائل کی جہالت ٹپکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان ائمہ معصومین کو اس قسم کی جہالت سے مبراء رکھا تھا۔ نیز یہ سوال کرنا کہ: اس نے شکار حدودِ حرم میں کیا ہے یا پھر حِل میں ؟۔ بیکار سی بات ہے۔ اس لیے کہ محرم جب شکار کر دے تو اس پر جزاء واجب ہو جاتی ہے ؛ خواہ اس نے حدودِ حرم کے اندر شکار کیا ہو یا اس سے باہر۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور حرم کے جانور کا شکار کرنا حالت احرام میں اور بغیر احرام کے ہر دونوں طرح سے حرام ہے۔ لیکن جب کوئی انسان حالت احرام میں حرم کا شکار شکار کر لے تو اس کی حرمت زیادہ متاکد ہو جاتی ہے ؛ مگر دونوں کی جزاء ایک ہی ہے۔ نیز یہ سوال کرنا کہ اس نے شکار پر پہلی بار حملہ کیا' یا دوسری بار پلٹ کر مارا؟ یہ بہت ہی کمزور اختلاف ہے۔ بعض اہل علم نے اسے اختلاف سمجھا اور ذکر کیا ہے۔ جب کہ جمہور اہل علم ہر دونوں حالتوں میں شکار کرنے والے پر جزاء کو واجب کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ﴾ [المائدة ۹۵]

''اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا۔''

کہا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: جو انسان اسلام لانے کے بعد دوبارہ ایسی حرکات کرے؛ حالانکہ اس سے پہلے عہد جہالت کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مراد ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ [النساء ۲۲]

''اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا ہے مگر جو گزر چکا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ [النساء ۲۳]

''اور تمہارا دو بہنوں کا جمع کرنا۔ ہاں جو گزر چکا سو گزر چکا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ [الانفال ۳۸]

''آپ کافروں سے کہہ دیجئے! کہ اگر وہ باز آ جائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

اگر اس سے مراد یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار معاف کر دیا ہے؛ تو پھر نہ ہی اس پر جزاء واجب ہوتی اور نہ ہی اس سے انتقام کی بات کی جاتی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار کے ساتھ ہی اس پر جزاء کو واجب کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا ہے: ﴿لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ﴾ [المائدۃ ۹۵]

''تاکہ وہ اپنے کیے کی شامت کا مزہ چکھے۔''

جس انسان کو اللہ تعالیٰ اس کے برے اعمال کا بدلہ دیدیں تو اس کے لیے معافی کیسے ہو سکتی ہے؟ نیز یہ بھی فرمایا کہ:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے گزشتہ کو معاف کر دیا۔''

یہ عام لفظ ہے جس میں تخصیص کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا کہ اس سے صرف ایک بار ہی مراد لی جا سکتی ہے۔ یہ چیز عربی زبان میں نہیں پائی جاتی۔ اگر اس آیت سے مراد یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی بار معاف کر دیا ہے۔ اور ﴿من عاد﴾ سے مراد دوبارہ قتل کی طرف لوٹنا ہوتا؛ تو ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ کے انتقام سے جزاء ساقط نہ ہوتی۔ اس لیے کہ گناہ کی سختی اور شدت کی وجہ سے واجب ساقط نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی انسان کئی ایک قتل کر دے تو اس سے قصاص اور دیت یا کفارہ ساقط نہیں ہوں گے۔

[حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر]:

[**اشکال**]: شیعہ عالم کا یہ کہنا کہ: ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر پانچ سو درہم تھا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[**جواب**]: یہ بات کہیں بھی ثابت نہیں ہے۔ بلکہ ثابت یہ ہے کہ نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی کسی بیوی کو؛ اور نہ ہی آپ کی بیٹیوں میں سے کسی ایک کو پانچ سو درہم سے زیادہ مہر دیا گیا۔ یعنی ساڑھے بارہ اوقیہ [چاندی]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہی بات معروف ہے۔ لیکن حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی شادی نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرائی تھی؛ اس لیے اس نے اپنی طرف سے زیادہ مہر ادا کیا۔ خواہ یہ بات ثابت ہو یا نہ ہو؛ اتنی بات ضرور ہے کہ کم مہر کا خیال رکھنا سنت ہے۔ اسی لیے علماء کرام رحمہم اللہ مستحب سمجھتے ہیں کہ کسی کا مہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں یا بیٹیوں کے مہر سے زیادہ نہ ہو۔ روایت میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مہر میں اپنی درع دی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو یہ دونوں

باتیں کسی فضیلت پر دلالت نہیں کرتیں؛ چہ جائے کہ اس سے امامت کی فضیلت ثابت کی جائے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علاوہ آپ کے [بہت سارے] فضائل ثابت شدہ ہیں۔

فصل:

[فضائل علی ھادی العسکری]

رافضی کہتا ہے:'' آپ کا بیٹا علی ہادی تھا؛ اسے عسکری بھی کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ متوکل آپ کو مدینہ سے بغداد لے آیا تھا' پھر وہاں سے''سرَّ من رأی ''منتقل ہو گئے۔وہاں آپ جس جگہ پر ٹھہرے ہوئے تھے اس کے قریب ایک عسکر نامی جگہ تھی۔پھر آپ سامراء چلے گئے اور بیس سال نو ماہ تک وہاں رہے۔متوکل نے آپ کو اس لیے مجبور کیا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا۔ جب اسے اطلاع ملی کہ مدینہ میں لوگ حضرت علی الہادی کی کس قدر عزت کرتے ہیں اوران کی جانب میلان رکھتے ہیں' تو اسے خوف محسوس ہوا۔اس نے یحی بن ہبیرہ کو بلا کر حکم دیا کہ علی الہادی کو اس کے پاس حاضر کیا جائے۔اس وجہ سے اہل مدینہ میں خوف و دہشت طاری ہوگئی؛ اس لیے کہ اہل مدینہ کے ساتھ آپ کے بہت بڑے احسانات تھے۔اور آپ ہمیشہ کے لیے مسجد میں ہی رہتے تھے۔یحی نے قسم اٹھائی کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔پھر یحی نے ان کے گھر کی تلاشی لی؛ اسے قرآن مجید' کچھ دعاؤں اور اہل علم کی چند کتابوں کے علاوہ کچھ بھی نہ ملا۔اس وجہ سے اس کی نظر میں آپ کی منزلت بڑھ گئی۔اور وہ خود آپ کی خدمت میں مصروف رہنے لگا۔ جب واپس بغداد پہنچا تو سب سے پہلے اسحق بن ابراہیم طائی والی بغداد کے پاس گیا۔اور اس سے کہا: اے یحی! اسے رسول اللہ ﷺ نے جنم دیا ہے' اور آپ جانتے ہیں کہ متوکل کون ہے؟۔اگر آپ اسے ان کے خلاف برانگیختہ کریں گے تو وہ انہیں قتل کردے گا۔اور قیامت والے دن رسول اللہ ﷺ اس کی طرف سے تیرے خلاف دعوی کرنے والے ہونگے۔یحی نے اسے جواب دیا: اللہ کی قسم! میں تو ان کے متعلق صرف خیر کا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔آپ کہتے ہیں: جب میں متوکل کے پاس گیا تو اسے آپ کی حسن سیرت' زہد و ورع کے بارے میں خبر دی۔تو متوکل نے آپ کا خوب احترام کیا۔پھر متوکل بیمار ہو گیا تو اس نے منت مانی کہ اگر وہ تندرست ہو گیا تو بہت سارے دراہم صدقہ کرے گا۔پھر اس نے تندرست ہونے پر اس بارے میں فقہاء سے سوال کیا؛ مگر کسی کے پاس کوئی جواب نہ پایا۔پھر اس نے علی ہادی کے پاس آدمی بھیج کر دریافت کیا' تو آپ نے کہا: تراسی (۸۳) درھم خیرات کردو۔جب متوکل نے اس کا سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ﴾ [التوبہ ۲۵]

''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر آپ کی مدد فرمائی۔''

یہ مواطن و مقامات اپنی جگہ ایک معنی رکھتے ہیں۔نبی کریم ﷺ نے ستائیس غزوات کئے اور چھپن سرایا بھیجے۔مسعودی نے کہا ہے کہ: اس کے بعد متوکل کے پاس جھوٹی شکایات کی گئیں کہ محمد بن علی اہل قم شیعہ میں تیز دھار اسلحہ کی منزلت

رکھتے ہیں اور آپ وہاں اپنا ملک قائم کرنا چاہتا ہے۔ خلیفہ نے ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ترکوں کی ایک جماعت بھیجی۔ انہوں نے رات کے وقت آپ کے گھر پر حملہ کیا؛ مگر انہیں کچھ بھی نہ ملا؛ اور انہوں نے دیکھا کہ آپ گھر کا دروازہ بند کیا ہوئے ہیں' اور آپ پر ایک اونی جبہ ہے' اور آپ کچھ پڑھ رہے ہیں؛ اور آپ ریت پر اور ایک چٹائی پر بیٹھ کر تلاوت کرر ہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں۔ آپ کو اسی حالت میں اٹھا کر متوکل کے پاس لایا گیا۔ جب انہیں متوکل کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ شراب کی مجلس میں تھا؛ اور جام اس کے ہاتھ میں تھا؛ اس نے آپ کی بڑی تعظیم کی اور انہیں اُپنے پہلو میں بیٹھایا؛ اس نے ایک جام آپ کے ہاتھ میں بھی دیا؛ تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! کبھی بھی میرے خون اور گوشت کے ساتھ شراب کا قطرہ نہیں ملا؛ مجھے اس سے معاف رکھیے۔ اس نے آپ کو چھوڑ دیا اور کہا: مجھے اپنی آواز میں کچھ سنایئے۔ تو آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ﴾ [الدخان ۲۵]

''ان لوگوں نے کتنے ہی باغات اور چشمے [اپنے پیچھے] چھوڑے۔''

پھر اس نے آپ سے کہا: مجھے کچھ شعر سنایئے؟ تو آپ نے فرمایا: مجھ شعر بہت کم یاد ہیں۔ اس نے کہا شعر سنانا لازمی ہے۔ تو آپ نے اس وقت یہ شعر پڑھے: [ترجمہ اشعار]:

''انہوں نے پہاڑ کی چوٹیوں پر رات گزاری؛ اور مسلح افراد ان کی پہرہ داری کرر ہے تھے؛ مگر انہیں یہ چوٹیاں کچھ کام نہ آئیں۔ انہیں اس عزت کے بعد ان کے ٹھکانوں سے اتارا گیا؛ اور انہیں ایک گڑھے میں رکھا گیا' یہ ان کے پڑاؤ کی بہت بری جگہ ہے۔ ان کو دفن کرنے کے بعد ایک آواز لگانے والے نے آواز لگائی: ''تمہارا خاندان' تاج اور زیورات کہاں ہیں؟۔ اور وہ شیریں ودلکش پرنعم چہرے کہاں ہیں جنہیں پردوں میں چھپایا جاتا تھا۔ قبر نے اس سوال کا فصیح جواب دیا اور کہا: ''ان چہروں پر اب کیڑے مسلط ہو چکے ہیں' جو انہیں ختم کرر ہے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کھایا پیا تھا' اس پر ایک لمبا زمانہ گزر چکا ہے؛ اور کے بعد اب تو وہ خود ہی کھایا ہوا بھس ہو گئے ہیں۔''

متوکل یہ سن کر اتنا رویا کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہوگئی۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

جواب: یہ بھی اپنے سے پہلے کلام کی طرح ہے۔ اس نے کسی بھی صحیح دلیل کے ساتھ آپ کی کوئی منقبت نہیں بیان کی۔ بلکہ اس نے ایسی چیز بیان کی ہے جس کے باطل ہونے کو علماء کرام جانتے ہیں۔

اس نے لکھا ہے کہ بغداد کا والی اسحق بن ابراہیم طائی تھا۔ یہ شیعہ مصنف کی جہالت کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ اسحق بن ابراہیم اور اس کے اہل خانہ کا تعلق خزاعہ سے ہے۔ اس کا پورا شجرہ یہ ہے: اسحق بن ابراہیم بن حسین بن مصعب۔ اس کا چچا زاد بھائی عبد اللہ بن طاہر بن حسین بن مصعب خراسان کا امیر تھا۔ اور اس کی سیرت معلوم ومشہور ہے۔ اس کا بیٹا محمد بن عبد اللہ بن طاہر متوکل کے دور میں بغداد میں اس کا نائب تھا۔ یہ وہی انسان ہے جس نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔ جب کہ اسحق بن ابراہیم معتصم اور واثق کے دور؛ اور خلیفہ متوکل کی خلافت کے کچھ ایام میں ان کا نائب رہا ہے۔

یہ تمام لوگ بنو خزاعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنی طے سے ان کا تعلق نہیں۔ ان کا خاندان مشہور ہے۔

رہا اس فتوی کا مسئلہ جو رافضی نے ذکر کیا ہے کہ متوکل نے نذر مانی تھی کہ اگر وہ صحتیاب ہوگیا تو بہت سارے دراہم

صدقہ کرے گا۔اور پھر اس نے فقہاء سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کے پاس کوئی جواب نہ پایا' اور یہ کہ علی بن محمد نے آپ کو تراسی درہم صدقہ کرنے کا حکم دیا' اور اس کی دلیل میں اس نے یہ آیت پیش کی:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ﴾ [التوبہ ۲۵]

''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مقامات پر آپ کی مدد فرمائی ہے۔''

یہ مواطن و مقامات اپنی جگہ ایک معنی رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ستائیس غزوات کیے اور چھپن سرایا بھیجے۔ یہ حکایت تو علی بن موسیٰ کی مامون کے ساتھ بیان کی جاتی ہے۔ یہاں پر دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے۔ یا تو یہ من گھڑت اور جھوٹی کہانی ہے۔ یا پھر فتوی دینے والے کی جہالت پر دلالت کرتی ہے۔

اس لیے کہ جب کوئی اعتراف کرتا ہے کہ فلاں انسان کے مجھ پر بہت سارے دراہم ہیں۔ یا پھر وہ منت مانتا ہے کہ وہ بہت سارے دراہم صدقہ کریگا' یا یہ کہتا ہے کہ میں فلاں آدمی کو بہت سارے دراہم دوں گا تو علماء مسلمین میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے مراد تراسی ہوں گے۔ رافضی مصنف کی دلیل کئی وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ: یہ کہنا کہ: قرآن میں ذکر کردہ مواطن یا مقامات میں ستائیس غزوات اور چھپن سرایا تھے؛ یہ بات صحیح نہیں ہے۔اس لیے سیرت نگار علماء کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ستائیس سے کم غزوات کیے ہیں۔

دوسری وجہ: یہ آیت غزوہ حنین کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس آیت میں یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان مواقع کی خبر دی ہے جو اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پس واجب ہوتا ہے اس آیت میں اس سے پہلے مواطن کثیرہ کے واقعات پیش آ چکے ہوں۔ غزوہ حنین کے بعد غزوہ طائف اور تبوک پیش آئے۔ اور بہت سارے سرایا حنین کے بعد پیش آئے ہیں' جیسا کہ سریہ جریر بن عبد اللہ بجلی؛ ذی الخلصۃ بت کی طرف۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ جب بہت سارے سرایا اور کچھ غزوات اس آیت کے نزول کے بعد پیش آئے ہیں تو پھر یہ ممتنع ہے کہ اس آیت میں ماضی میں ہی تمام غزوات اور سرایا کی خبر دی گئی ہو۔

تیسری وجہ: مسلمانوں کی ہر موقع پر نصرت نہیں ہوئی؛ بلکہ بعض مواقع پر انہیں پیچھے بھی ہٹنا پڑا۔ احد کے دن ایسا ہی ہوا تھا؛ یہ سخت آزمائش و امتحان کا دن تھا۔ ایسے ہی موتہ اور بعض دوسرے سرایا میں فتح حاصل نہیں ہوئی۔ اگر مان لیا جائے کہ تمام غزوات اور سرایا کی تعداد تراسی تھی؛ تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان تمام غزوات و سرایا میں مسلمانوں کو ہی فتح نہیں ہوئی کہ اس سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کے تراسی مقامات ثابت ہوتے۔

چوتھی وجہ: بالفرض اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ اس آیت میں وارد لفظ کثیر سے مراد تراسی ہے؛ تو اس کا تقاضا ہرگز نہیں کہ کثیر کا لفظ صرف تراسی کے عدد کے ساتھ خاص ہو۔ اس لیے کہ کثیر سے مراد ہزار' دو ہزار' ہزاروں بھی ہو سکتی ہے۔ جب مقداریں مختلف ہوں تو اس حساب سے اس کا اطلاق بھی ہوا۔ بعض مقادیر کے ساتھ اس کو خاص کرنا غلطی ہے۔

پانچویں وجہ: بیشک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ [البقرۃ ۲۴۵]

''ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا۔''

نص قرآنی سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا ثواب سات سو گنا تک بڑھاتے ہیں۔ اور حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ اجر و ثواب دس لاکھ گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بڑھانے اور زیادہ کرنے کو بالکل ویسے ہی کثیرہ کہا ہے جیسے مواطن کثیرہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرة ۲۴۹]

''بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پا لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں پر اس آیت میں کثیر سے مراد کوئی قسم کی مقداریں ہیں۔ اس لیے کہ وہ جماعتیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے معلوم ہونے کے باوجود انہیں کسی متعین عدد میں محدود کرنا ممکن نہیں۔ ایسے بھی ہوسکتا ہے کہ کبھی چھوٹی جماعت کی تعداد ایک ہزار ہو اور بڑی جماعت کی تعداد تین ہزار ہو۔ اور کبھی اس سے کم و زیادہ بھی ممکن ہے۔ پس کثیر تعداد کا اطلاق اس کی نسبت سے کم کے ساتھ مقابلہ کے طور پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَ لَوْ أَرٰكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ﴾ [الأنفال ۴۳]

''جب اللہ آپ کو آپ کے خواب میں دکھا رہا تھا کہ وہ تھوڑے ہیں اور اگر وہ آپ دکھاتا کہ وہ بہت ہیں تو تم ضرور ہمت ہار جاتے اور ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑ پڑتے اور لیکن اللہ نے سلامت رکھا۔''

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو سو سے کچھ زیادہ دکھایا تھا۔ یہ کمی اور زیادتی باعتبار نسبت کے ہے۔

اس تمام بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قلت اور کثرت کا انحصار اس کی اضافت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے کہ جب کوئی انسان اقرار کرے کہ فلاں انسان کے مجھ پر بہت سارا مال ہے' یا بہت زیادہ مال ہے؛ یا کہے کہ: کافی مقدار میں مال ہے؛ تو اس کی وضاحت کے لیے اسی آدمی سے رجوع کیا جائے گا؛ اور وہی اس کی وضاحت بیان کرے گا۔ جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے ایک گروہ کا قول ہے۔ اور اس کی وضاحت بھی اس مقدار میں ہی تسلیم کی جائے گی جسے زیادہ مانا جاسکتا ہو۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور اصحاب احمد میں سے بعض کا قول ہے۔ دوسری رائے والوں میں سے بعض کا کہنا ہے: اتنا مال جو چوری کی حد کی مقدار کو پہنچتا ہو وہ مال کثیر ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: اتنا مال جس کے نصاب پر زکوٰۃ لازم آتی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں: دیت کی مقدار میں مال کثیر تصور ہوگا۔ اور یہ نزاع بھی اقرار میں ہے۔ اس لیے کہ یہ واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ اور ماضی کی خبر کو اقرار کرنے والا جانتا ہے۔ جب کہ مذکورہ بالا مسئلہ کا تعلق خبر سے نہیں بلکہ انشاء سے ہے۔ جیسا کہ اگر کوئی بہت سارے دراہم کی وصیت کرے تو راجح یہ ہے کہ بات کہنے والے کے عرف کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پس جتنی مقدار کو وہ کثیر کہتا ہو؛ اس پر اس کے کلام کا اطلاق ہوگا۔

جب خلیفہ نذر مانتے ہوئے بہت سارا مال کہے تو اس کی نذر کو سو یا دو سو درہم پر محمول نہیں کیا جائے گا؛ بلکہ یہاں پر اس کی علیحدہ سے مستقل حیثیت ہے۔ یہاں پر اگر اس کلام کو دیت کی مقدار یعنی [کم از کم] بارہ ہزار درہم پر محمول کیا جائے تو یہ اس سے کم پر محمول کرنے کی نسبت سے زیادہ اولی ہوگا۔ اس لفظ میں اس سے زیادہ کا بھی احتمال ہے۔ لیکن شریعت میں مسلمان

نفس کی دیت اسی مقدار میں رکھی گئی ہے؛ اور شریعت میں مسلمان نفس کی دیت زیادہ مال ہی ہوسکتی ہے [چند ٹکے نہیں]۔

اور جب خلیفہ ''کثیر'' کا لفظ استعمال کرے تو اس اطلاق اتنی مقدار پر ہوگا جس پر عام لوگوں کے اس لفظ کے استعمال کرنے سے اطلاق نہ ہوسکتا ہو۔

اس لیے کہ اگر ہزار درہم رکھنے والا یوں کہے کہ فلاں کو کافی سارے دراہم دیدو؛ تو اس سے مراد دس؛ بیس دراہم بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ تمام باتیں حالات کے اعتبار سے ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ کم اور زیادہ ہونا اضافت اور نسبت کے اعتبار سے ہے۔ جیسے کہ لفظ عظیم وغیرہ۔ لوگوں کے اختلاف کے لحاظ سے ان کلمات کے اطلاق میں موقع و مناسبت کی طرح اختلاف ہوتا ہے۔ اور جو حکایت مسعودی سے ذکر کی گئی ہے' وہ منقطع الاسناد ہے۔ تاریخ مسعودی میں اتنی جھوٹی روایات ہیں جن کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ تو پھر اس کی بیان کردہ ایسی حکایت کو جس کی کوئی سند ہی نہ ہو؛ کیسے معتبر سمجھا جاسکتا ہے؟۔ مسعودی جھوٹی روایات ذکر کرنے میں معروف ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس حکایت میں کوئی فضیلت کی بات بھی نہیں' اس لیے عام مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اس سے زیادہ فہم و دانست اور علم رکھتے ہیں۔

رافضی مصنف کا یہ قول کہ: ''اس کا بیٹا حسن عسکری اپنے زمانہ میں بہت بڑا عالم و فاضل؛ عابد و زاہد تھا۔ ان سے عامہ الناس نے بہت بڑی مقدار میں احادیث روایت کی ہیں۔''

یہ دعوی بھی اس سے پہلے کے دعوی کی طرح محض ایک جھوٹ اور فقط دعوی ہی ہے۔ کیونکہ حسن بن علی عسکری کے زمانہ میں جو محدثین احادیث روایت کرنے میں مشہور تھے' ان سے کوئی ایک روایت بھی کسی معتمد اہل کی کتاب میں جیسے امام بخاری' امام مسلم' ابو داؤد' ترمذی؛ ابن ماجہ اور امام نسائی وغیرہ کے ہاں؛ ایسی نہیں ملتی جس کی سند حسن عسکری سے ملتی ہو۔

یہ لوگ اس زمانے میں موجود تھے؛ یا اس کے قریب قریب تھوڑا پہلے یا تھوڑا بعد میں ہوگزرے ہیں۔ حافظ ابو القاسم بن عساکر نے ان تمام محدثین کے شیوخ کی روایات جمع کی ہیں۔ ان ائمہ میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے حسن بن علی عسکری سے کوئی ایک بھی روایت نقل کی ہو' حالانکہ انہوں نے ہزاروں علماء و محدثین سے روایات نقل کی ہیں۔ تو پھر یہ دعوی کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ عامۃ الناس نے آپ سے روایات نقل کی ہیں۔

اور یہ دعوی کہ: ''آپ اپنے زمانہ میں افضل ترین انسان تھے۔''

یہ بھی اس سے پہلے دعوی کی طرح صرف دعوی ہی ہے۔

فصل:

[حضرت امام مہدی]

''رافضی مصنف کہتا ہے: ''پھر ان کے بیٹے: ہمارے آقا مہدی علیہ السلام ہیں۔'' ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا؛ آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' آخری زمانے میں میری اولاد میں سے ایک آدمی پیدا ہوگا؛ اس کا نام میرے نام پر اور کنیت میری کنیت پر ہوگی؛ وہ زمین کو عدل و انصاف سے ایسے بھر دیگا جیسے وہ ظلم سے بھری ہوگی آگاہ رہو وہی مہدی ہوگا۔''

[جـــــواب]: اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ محمد بن جریر الطبری اور عبدالباقی بن قانع [1] اور دوسرے اہل علم مؤرخین و محدثین اور ماہرین علم انساب نے لکھا ہے کہ: ''حسن بن علی عسکری کی کوئی نسل باقی نہیں رہی اور نہ ہی انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد چھوڑی۔

امامیہ جن کا خیال ہے کہ آپ کا ایک بیٹا بھی تھا جس کے بارے میں ان کا دعوی ہے کہ وہ اپنے بچپن میں ہی سامراء کے تہ خانہ میں داخل ہوگیا تھا۔ بعض کہتے ہیں اس وقت اس کی عمر دو سال تھی۔ اور بعض کہتے ہیں تین سال، اور بعض کے ہاں پانچ سال۔ اگر امامیہ کی اس رائے کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کے متعلق کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع امت کی نصوص کی روشنی میں ایسے نوخیز بچے کا اپنی والدہ [2] دائی یا کسی اور قریبی رشتہ دار کے زیر تربیت ہونا ضروری تھا، جو اس کی پرورش و تربیت کرے۔ نیز یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے مال و متاع کی دیکھ بھال کرتا، یا تو یہ محافظ اس کا کوئی وصی ہوتا؛ یا غیر وصی؛ پھر یا تو کوئی قریبی رشتہ دار ہوتا یا سلطان کی طرف سے کوئی نائب۔ اس لیے کہ ایسا بچہ اپنا باپ مرجانے کی وجہ سے یتیم ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یتیم کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَ ابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَ لَا

---

[1] ابن قانع کا نام و نسب عبدالباقی بن قانع بن مرزوق کنیت ابوالحسن نسبت بغدادی اور لقب الحافظ ہے، ماہ شوال ۳۵۱ میں بعمر ۸۶ سال فوت ہوا، اس نے حارث بن ابی اسامہ اور ابراہیم بن ہیثم بلدی اور ان کے طبقہ کے دیگر علماء سے حدیث روایت کی، اس نے متعدد کتب تصنیف کیں، حسن عسکری کی وفات ابن قانع کی ولادت کے قریب زمانہ میں ہوئی، ابن قانع کے اقارب و اساتذہ امام حسن عسکری کے زمانہ کے چشم دید گواہ تھے۔

[2] اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ حسن عسکری کا نوزائیدہ فرزند اس وقت پانچ برس کا تھا جیسا کہ امامیہ کا دعوی ہے تو اسے اپنے چچا جعفر کے زیر سرپرستی و تربیت ہونا چاہیے تھا، علاوہ ازیں یہ بھی ضروری تھا کہ حسن عسکری کا جو ورثہ ان کے بھائی جعفر کی زیر سرپرستی تقسیم کیا گیا تھا۔ اس میں سے ان کے نوعمر فرزند کا حصہ بھی الگ کیا جاتا، جیسا کہ احتیاط کا تقاضا ہے۔ جعفر نے اپنے بھائی کی بیویوں اور لونڈیوں کو آدمیوں کے ساتھ اتصال و اختلاط سے بدیں وجہ روکے رکھا کہ مبادا ان میں سے کوئی حاملہ ہو مگر کسی کا حاملہ ہونا ظاہر نہ ہوا اور کسی لونڈی نے بھی.... خواہ وہ نرگس نامی باندی ہو یا کوئی اور .... یہ دعوی نہ کیا کہ حسن عسکری سے اس کے یہاں کوئی بچہ ہے۔ علاوہ ازیں کوئی سیاسی امر بھی اس بات کا متقاضی نہ تھا کہ نومولود کو اس حد تک مخفی رکھا جائے کہ علویہ کے نقیب کو جو بڑے اہتمام کے ساتھ ایک مخصوص رجسٹر میں اس کنبہ کے افراد کی تاریخ ولادت تحریر کیا کرتا تھا پتہ نہ چل سکا۔ اس پر مزید یہ کہ اس مزعوم نومولود کے والد حسن عسکری اپنے زمانہ میں بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے جاتے تھے اور کوئی حاکم یا غیر حاکم ان کی حریت و کرامت میں دخل انداز نہیں ہوسکتا تھا، پھر ایسے بچے کو پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو نہ تو حکام وقت کا اقتدار غصب کرنا چاہتا تھا، نہ انقلاب بپا کرنے کا خواہاں تھا اور نہ کسی کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہتا تھا۔

روافض کا عقیدہ ہے کہ حسن عسکری کا یہ کم سن لڑکا اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک شیعہ کو چھوڑ کر سب مخالفین کو تہ تیغ نہ کر لے۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ جب اسے موت کا اندیشہ لاحق نہ تھا تو پوشیدہ رہنے کا کیا مطلب؟ وہ تہ خانہ جس کے متعلق شیعہ کا گمان ہے کہ وہ لڑکا وہاں پوشیدہ ہے ایک سراب ہے، جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں، جس گھر میں بقول شیعہ یہ تہ خانہ موجود تھا، حسن عسکری کے بھائی جعفر کی ملکیت میں آچکا ہے، ظاہر ہے کہ گھر کا مالک اس امر سے بخوبی آگاہ ہے کہ گھر میں کیا کچھ پوشیدہ ہے، جن لوگوں نے یہ گپ ہانکی تھی کہ اس گھر کے تہ خانہ میں حسن عسکری کا بیٹا پوشیدہ ہے، ان کا رابطہ اس گھر سے کٹ گیا تھا اور وہ اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے، تیل فروش یا گھی فروش کا بیٹا (ابن الزیات اَوالسمان) جس کی دوکان مذکورہ گھر کے قریب تھی حسن عسکری کی وفات کے بعد ان کے بھائی جعفر سے نہ کبھی ملاقات ہوئی اور نہ اس کے اس گھر میں داخل ہونے کا اتفاق ہوا جس میں وہ سرد خانہ تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ گھی فروش کے بیٹے کی دوکان کے قریب ایک درخت تھا، شیعہ عوام جن کو کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تھا شام کے وقت آتے اور اپنے استفتا اس درخت کے سوراخ میں رکھ جایا کرتے تھے، ان کے چلے جانے کے بعد گھی فروش کا بیٹا آ کر یہ کاغذ نکال لیتا اور کسی رافضی فقیہ سے ان کا جواب لکھوا کر پھر اسی سوراخ میں رکھ دیتا، نادان شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا تھے کہ ان کا بارہواں امام جو ہنوز پیدا نہ ہوا اور نہ اس نے کسی سے تعلیم پائی یہ جوابات لکھ رہا ہے شیعہ اور ابن الزیات (زیت فروش کا بیٹا) کا رابطہ اس تہ خانہ یا درخت کے ساتھ بس اتنا ہی تھا وگرنہ ہیچ۔

تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ﴾ [النساء ٦]

''اور یتیموں کو آزماؤ، حتیٰ کہ جب وہ بالغ ہو جائیں، پھر اگر تم ان سے کچھ سمجھداری محسوس کرو تو ان کا مال ان کے سپرد کر دو اور فضول خرچی سے اور جلدی سے اسے مت کھاؤ کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔''

یہ جائز نہیں ہے کہ یتیم بچے کے بالغ و ہوشیار و سمجھدار ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے سپرد کر دیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مقام حیرت ہے کہ ایسا بچہ جو کہ اپنی جان و مال میں تصرفات کے اختیار سے محروم اور دوسروں کے زیر تربیت ہو وہ پوری امت مسلمہ کا امام معصوم بن جائے؟۔ اور کوئی انسان اس امام پر ایمان رکھے بغیر مؤمن نہ ہو سکتا ہو۔

مزید برآں اگر ایسے امام کے وجود یا عدم وجود کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے کوئی دینی یا دنیوی مصلحت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی اس امام نے کسی ایک کو بھی کسی چیز کی کوئی تعلیم دی۔ اور نہ ہی اس کی کسی اچھی یا بری بات کا کسی کو کوئی اتا پتہ ہے۔ اس امام کی وجہ سے مقاصد و مصالح امامت میں سے کسی بھی عام یا خاص کو کوئی بھی چیز حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر ایسے امام کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ تمام اہل ارض کے لیے بلا مقصد اور نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ اس امام پر ایمان لانے والوں کو تو اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ نہ ہی کوئی مصلحت حاصل ہوئی اور نہ ہی کوئی مہربانی۔ اور اس امام کے جھٹلانے والے اس کے ماننے والوں کے نزدیک مبتلائے عذاب ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا یہ کہ امام محض ایک شر و برائی ہے جس میں خیر کی کوئی ایک بات بھی نہیں۔ ایسا امام کسی حکیم و عادل کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔

[امام غائب کیوں ہوا؟]:

اگر یہ کہا جائے کہ: ''وہ لوگوں کے ظلم کے خوف سے چھپ گیا تھا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: پہلی بات: ''ظلم تو اس کے آباؤ اجداد کے زمانہ میں بھی ہو رہا تھا، مگر انہوں نے چھپنے کو مناسب خیال نہ کیا۔ [1]

دوسری بات: مزید برآں اس کے عقیدت مند ہر جگہ کرۂ ارضی پر موجود ہیں؛ تو امام صاحب چلو بعض اوقات چند گھڑیوں کیلئے

[1] سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اکابر شیعہ نے جن کے سرغنہ نصیر الدین طوسی، ابن العلقمی اور ابن ابی الحدرد تھے...... انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازش کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتارا، یاجوج ماجوج (تاتار) کی تلواروں سے اسلامی سلطنت کا چراغ گل کر دیا اور علوم اسلامیہ کی لاکھوں کتب دریائے دجلہ میں پھینک دیں، جن کی وجہ سے اس کا پانی کئی دن تک سیاہ رہا تو ایسے آڑے وقت میں بقول شیعہ تہ خانہ کا یہ مکین کس لیے تہ خانہ سے باہر نہ نکلا نہ ان کے سامنے اپنی موجودگی کا اعلان کیا؟ حالانکہ شیعہ مذہب کے مطابق وہ اس وقت بقید حیات تھا اور اب بھی زندہ ہے اور شیعہ اس کے عاجلانہ ظہور کے لیے دست بدعا بھی رہتے تھے اس وقت سے موزوں تر وقت اور کون سا ہو سکتا تھا......؟

علاوہ ازیں یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ آج کل اطراف عالم میں شیعہ کی کثرت ہے، دجلہ و فرات کے دونوں کنارے اور ایران شیعہ سے بھرپور ہیں، پھر دور حاضر میں کون سا ظلم امام غائب کے خروج سے مانع ہے......؟ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے امام غائب کی حفاظت اور اس کے تحفظ و بقا کی ذمہ داری اپنی ذات پر عائد کی ہے، ظاہر ہے کہ تحفظ و بقا کی اس گارنٹی کی موجودگی میں ان کی زندگی کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ آخر تہ خانہ کی تاریکیوں میں دفن رہنے اور دریائے دجلہ و فرات کے جاذب نظر مناظر سے متمتع نہ ہونے میں کیا مصلحت پائی جاتی ہے، خداوند کریم ہمیں اصلاح عقائد کی توفیق عطا فرمائیں آمین۔ ''برحمتك یا ارحم الراحمین۔''

ہی اپنے ماننے والوں کے ساتھ مل کر کیوں نہیں بیٹھ جاتے ۔ یا پھر وہ اپنا کوئی ایلچی ان لوگوں کی طرف بھیجتا جو ان لوگوں کو کوئی نفع بخش علم کی باتیں سکھاتا ۔

تیسری بات: امام صاحب کے لیے ممکن تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ ظہور پذیر ہو گیا ہوتا، جہاں اس کے ارادت مند بکثرت ہوں ۔ جیسا کہ بلادشام کے پہاڑ ؛ جن میں کثرت کے ساتھ رافضی آباد ہیں ۔ اور ان کے علاوہ بھی شیعہ کی کئی ایک مضبوط پناہ گاہیں اور بستیاں ہیں ۔

چوتھی بات: جب امام صاحب کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس خوف کی وجہ سے کسی ایک انسان کو بھی علم یا دین کی کوئی فائدہ مند بات بتا سکے تو پھر اس امام کی وجہ سے کونسا فائدہ یا مصلحت حاصل ہوئی ؟ ۔ پس یہ بات نظریہ امامت کے بنیادی اصولوں کے ہی خلاف ہے؟ ۔ بخلاف ان انبیاء کرام و مرسلین عظام علیہم السلام کے ' جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ؛ انہیں جھٹلایا گیا ' مگر انہوں نے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں ' اور رسالت کا حق ادا کیا ۔ لوگوں کو اللہ کا دین پہنچایا اور سکھایا ۔ اور ان پر ایمان لانے والوں کو فائدہ اور مصلحت بھی حاصل ہوئی ؛ جو کہ ان اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا انعام تھا ۔ جب کہ اس معدوم و موہوم ؛ کبھی بھی نہ آنے والے امام کے ماننے والوں کو سوائے اس انتظار طویل اور حسرت و الم اور دنیا بھر کی دشمنی کے سوا کیا فائدہ پہنچا؟ ۔ یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ شیعہ ساڑھے چار سو (۴۵۰) [اور آج تک ساڑھے بارہ سو] سال سے اس کے خروج و ظہور کی دعائیں کرتے چلے آ رہے ہیں مگر ان کی دعائیں قبولیت سے ہم کنار نہیں ہوتیں [اور کبھی بھی قبول نہ ہوں گی] ۔ ❶

پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ امت محمدیہ کے کسی مسلمان کو اگر اتنی لمبی عمر مل بھی جائے تو اس پر اس جھوٹ کا پردہ کھل جائے گا ۔ اسلام میں کسی انسان کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے ایک سو بیس سال سے زیادہ کی عمر پائی ہو ۔ چہ جائے کہ کسی کو پانچ سو یا ہزار سال کی عمر ملے [تا کہ وہ اس امام کی صحبت سے شرفیاب ہو] ۔ صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ نے فرمایا:

> '' تمہاری آج کی رات میں نے تمہیں دیکھا ؛ بیشک جو لوگ آج زمین پر موجود ہیں ایک سو سال گزرنے کے بعد ان میں سے ایک بھی زندہ باقی نہیں رہے گا ۔ ''

پس جس انسان کی عمر اس وقت ایک سال یا اس کے قریب تھی ؛ وہ قطعی ایک سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہا ۔ پس جب اس وقت میں لوگوں کی عمریں اس حد سے تجاوز نہیں کرتی تھیں ؛ تو عام طور پر غالب عادت کے مطابق اس کے بعد کے لوگوں کی عمریں اس حد تک نہیں پہنچ سکتیں ۔ اس لیے کہ بنی آدم کی عمریں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہیں ' بڑھتی نہیں ۔ بیشک حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال قیام کیا تھا ؛ اور حضرت آدم علیہ السلام کی عمر صحیح روایت کے مطابق ایک ہزار سال تھی ۔ [یہ صحیح حدیث میں ثابت ہے ' اسے ترمذی نے روایت کیا ہے] ۔

اس زمانہ میں عمریں بہت لمبی ہوا کرتی تھیں ؛ جب کہ اس امت کی عمریں ساٹھ سے ستر سال کے درمیان میں ہیں ' بہت

❶ اس چھپا چھپی کے کھیل کو ساڑھے بارہ سو برس گزر چکے ہیں، شیعہ ابھی تک بعجز و انکسار مصروف دعا ہیں، کیا اتنی طویل مدت میں ایک بھی مستجاب الدعوات شیعہ نہ تھا جس کی دعا قبولیت سے آراستہ ہوتی، اور امام غائب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جاتے ۔

کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس عمر سے تجاوز کریں گے۔'' [یہ صحیح حدیث میں ثابت ہے]۔

اس موقع پر حضرت خضر علیہ السلام کی زندگی سے دلیل لینا؛ باطل در باطل ہے۔ بقائے خضر کی ان کی بات کو کون تسلیم کریگا۔ تمام محقق علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا انتقال ہو چکا ہے۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آپ ابھی تک زندہ ہیں' تو پھر بھی آپ کا شمار اس امت میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ایسے جھوٹے جنات اور انسان پائے جاتے ہیں جن کا خضر ہونے کا دعوی ہے۔ اور جو کوئی اُنہیں دیکھ لیتا ہے اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس نے خضر کو دیکھا ہے۔ اس بارے میں بہت ساری صحیح روایات ہمارے علم میں ہیں' مگر ان کا یہاں پر تذکرہ کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔

یہی حال امام منتظر محمد بن الحسن کا ہے۔ بلاشبہ لوگوں میں بہت سارے ایسے بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کا محمد بن الحسن مہدی ہونے کا دعوی ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں کے گروہوں کے سامنے بھی آتے اور اظہار کرتے ہیں۔ اور بعض اس بات کو چھپاتے ہیں ؛ ایک یا دو افراد کے علاوہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان میں سے کوئی ایک دعویدار بھی ایسا نہیں ہے جس کا جھوٹ خضر کے مدعی ہونے والے کے جھوٹ کی طرح سامنے نہ آجاتا ہو۔

حدیث مہدی سے رافضی استدلال کا جواب:

ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آخری زمانہ میں میری اولاد میں سے ایک شخص نکلے گا؛ اس کا نام میرے نام پر اور کنیت میری کنیت پر ہوگی؛ وہ زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دیگا جیسے وہ ظلم سے بھری ہوگی؛ آگاہ رہو وہی مہدی ہوگا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[سلسلہ جوابات]:

پہلا جواب: آپ لوگ تو اہل سنت والجماعت کی احادیث سے استدلال نہیں کرتے؛ ایسی روایت کے نقل کرنے سے آپ کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اہل سنت پر حجت ہے تو پھر اہل سنت علماء کرام کا کلام بھی آگے آرہا ہے [اسے بھی تسلیم کرنا پڑے گا]۔

دوسرا جواب: اس حدیث کا تعلق خبر واحد سے ہے؛ پھر اس سے اصول دین میں سے کوئی ایسی اصل کیسے ثابت کی جاسکتی ہے جس کے بغیر ایمان صحیح نہ ہوتا ہو۔

تیسرا جواب: حدیث کے الفاظ کی دلالت خود تمہارے حق میں نہیں بلکہ خلاف ہے۔ اس لیے کہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''اس کا نام میرے نام پر ہوگا' اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ جس مہدی کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں اس کا نام محمد بن عبداللہ ہوگا نہ کہ محمد بن الحسن۔ اور یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ یہ مہدی حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا نہ کہ حسین بن علی کی اولاد سے رضی اللہ عنہم اجمعین۔

مہدی کے بارے میں احادیث بہت مشہور و معروف ہیں۔ انہیں امام احمد' امام ابو داؤد' امام ترمذی اور دوسرے محدثین رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوگا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد

میں سے نہیں۔ ❶

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر دنیا کے ختم ہونے میں صرف ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ نے اس دن کو اتنا لمبا کر دیں گے یہاں تک کہ ایک آدمی اہل بیت میں سے بھیجیں گے جس کا نام میرے نام سے اور جس کے باپ کے نام میرے باپ کے نام سے مطابقت رکھتا ہوگا۔ وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گہ جیسے وہ ظلم وجور سے بھر دی گئی تھی۔'' [سنن ابوداؤد: ۸۹۰]

چوتھا جواب: شیعہ نے یہ حدیث ان الفاظ میں ذکر کی ہے کہ: ''اس کا نام میرے نام کے مطابق اور اس کی کنیت میری کنیت کے مطابق ہوگی۔'' اس نے یہ نہیں کہا کہ: ''اس کا نام میرے نام پر اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام پر ہوگا۔'' اہل علم نے حدیث کی معروف ترین کتب میں یہ روایت ان الفاظ میں نقل نہیں کی۔ اس رافضی نے حدیث کو کتب احادیث میں وارد اس کے معروف الفاظ میں نقل نہیں کیا؛ جیسا کہ مسند احمد؛ سنن ابی داؤد ترمذی اور دوسری کتب حدیث میں ہے۔ بلکہ اس نے اپنی طرف سے تراشے ہوئے جھوٹے الفاظ میں نقل کی ہے [تا کہ اپنے مسئلہ پر استدلال کر سکے]۔

❀ **شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:** ''ابن جوزی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔''

❀: اگر اس سے مراد وہ مشہور عالم ہیں جن کی بہت زیادہ کتب ہیں؛ یعنی ابو الفرج ابن جوزی؛ تو پھر یہ آپ پر جھوٹ ہے۔ اور اگر اس سے مقصود ان کا نواسہ یوسف بن قزاُوغلی ''مرآۃ الزمان'' تاریخ کا مصنف ہے؛ اور جس نے ''اثنا عشریہ'' پر بھی کتاب لکھی ہے جس کا نام اس نے رکھا ہے: ''اعلام الخواص''؛ تو یہ انسان اپنی کتابوں میں ہر طرح کی باتیں ذکر کر دیتا ہے۔ اور اپنے مطلب کی بات پر حجت پیش کرنے کے لیے ضعیف اور موضوع روایات تک سے استدلال کرتا ہے۔ یہ صاحب لوگوں کی حاجات اور مقاصد کے مطابق تالیف کیا کرتے تھے۔ شیعہ کے لیے ایسی کتابیں لکھتے جو ان کے لیے مناسب ہوتیں تا کہ ان سے معاوضہ حاصل کر سکیں۔ اور بعض بادشاہوں کے لیے حنفی مذہب کے مطابق کتب لکھتے تا کہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں۔ ان کا طریقہ اس واعظ جیسا تھا جس سے پوچھا گیا: تم کس مذہب پر ہو؟ تو اس نے جواب میں پوچھا: کون سے شہر میں؟

---

❶ سنن ابی داود، کتاب المھدی، حدیث: (٤٢٩٠) اموی خلافت کے آخری دور میں بنو ہاشم قبیلہ قریش کے محمد نفس زکیہ بن عبداللہ بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط کو مہدی خیال کرتے تھے، ایک مرتبہ مکہ کو جاتے ہوئے، ابواء کے مقام پر یہ واقعہ پیش آیا کہ وہاں حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی نسل کے چند لوگ جمع ہو گئے، عباسی خاندان کے ابراہیم وسفاح، منصور اور صالح بن علی بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن حسن المثنیٰ اور ان کے دونوں بیٹے محمد اور ابراہیم ان سب کے سردار تھے۔ ابو جعفر منصور کے ایماء پر ان سب لوگوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسن کی بیعت کر لی۔ منصور نے سب سے پہلے بیعت کی، جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا اور منصور خلیفہ قرار پایا، تو اس کی سب سے پہلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اپنے مرشد وہادی محمد بن عبداللہ کی بیعت سے آزاد ہو اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ابراہیم کو بھی تہ تیغ کر دے۔ اس ضمن میں خاص بات یہ ہے کہ بنی ہاشم کے عقیدہ کے مطابق مہدی امام حسین کی اولاد سے نہیں، بلکہ حضرت حسن کی نسل سے ہوگا۔ چونکہ محمد بن عبداللہ بن حسن حدیث نبوی میں مندرج شرائط کے مطابق تھے اور حضرت علی کی روایت کے مطابق آپ حضرت حسن کی اولاد سے تھے، بنابریں بنی ہاشم نے مہدی سمجھ کر ان کی بیعت کر لی، خواہ ان کا یہ اقدام صحیح ہو یا غلط، اس لیے کہ حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہدی کا نام رسول اللہ کے نام پر اور ان کے والد کا نام رسول اللہ کے والد کے نام پر ہوگا، چونکہ شیعہ اس بات کے مدعی تھے کہ حسن عسکری کا ایک بیٹا موجود ہے مگر وہ حسن کے نام کو عبداللہ کی صورت میں تبدیل کرنے پر قادر نہ تھے لہٰذا انہوں نے صرف اسی پر اکتفا کیا کہ بارہویں امام کا نام محمد ہوگا، مگر حدیث نبوی نے انہیں رسوا کر دیا (کیونکہ ان کے والد کا نام عبداللہ نہیں، بلکہ حسن ہے) بہرکیف مہدی سے متعلق احادیث کی چھان بین اور ان کا دقیق وعمیق مطالعہ ضروری ہے۔

❀ یہی وجہ ہے کہ اس کی بعض کتابوں میں خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں تنقید اور مثالب بھی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ شیعہ کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کرکے ان کی توجہ چاہتے تھے۔ اور بعض کتابوں میں خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی تعظیم و مناقب بھی پائے جاتے ہیں۔

جب اہل علم کے سلف و خلف کے ہاں مہدی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشہور حدیث ان الفاظ میں تھی:

''جس کا نام میرے نام سے اور جس کے باپ کے نام میرے باپ کے نام سے مطابقت رکھتا ہوگا'' تو پھر بہت سارے لوگ یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش وہی مہدی ہوں۔ یہاں تک کہ منصور نے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا اور اسے مہدی کا لقب دیا تاکہ اس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے اور اس کے باپ کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باپ کے نام کے مطابق ہو جائے۔ مگر یہ مہدی موعود ہرگز نہیں تھا۔

اور ابو عبد اللہ محمد بن التومرت جس کا لقب مہدی تھا؛ جس کا ظہور مغرب میں ہوا' اور اس نے اپنی جماعت کے لوگوں کو موحدین کا نام دیا۔ اس کے احوال معروف ہیں۔ اس کا یہ دعوی تھا کہ وہ وہی مہدی ہے جس کے متعلق احادیث میں بشارت سنائی گئی ہے؛ اسکے ماننے والے خطبہ دیتے ہوئے منبر پر اس کا نام لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خطبات میں یوں کہا کرتے تھے:

" الإمام المعصوم المهدي المعلوم الّذي بشرت به في صريح وحيك الذي الكتنفته بالنور الواضح والعدل اللائح؛ الّذي ملأ البرية قسطاً و عدلاً كما ملئت ظلماً و جوراً".

اس مہدی کا ظہور سن پانچ سو ہجری کے کچھ عرصہ کے بعد ہوا اور پانچ سو چوبیس ہجری میں انتقال کر گیا۔ اس کی نسبت آل حسن رضی اللہ عنہ کی طرف کی جاتی تھی۔ چونکہ یہ علم حدیث رکھنے والا انسان تھا؛ اس لیے اس نے یہ دعوی کیا کہ اسی کے متعلق بشارت دی گئی ہے۔ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس نے زمین کو عدل و انصاف سے بھرا۔ اس نے دین میں کئی بدعات بھی داخل کیں' اور کئی ایک اچھے کام بھی کیے۔

اس سے قبل عبید اللہ بن میمون قداح نے بھی مہدی ہونے کا دعوی کیا تھا۔ مگر نہ ہی اس کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مطابقت رکھتا تھا اور نہ ہی اس کے والد کا نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کے نام سے مطابق تھا۔ اس کا دعوی تھا کہ وہ محمد بن اسماعیل بن جعفر کی اولاد سے ہے۔ اور میمون ہی محمد بن اسماعیل ہے۔ شجرہ نسب کے ماہرین اور دوسرے علماء کرام جانتے ہیں کہ اس کا نسب کا دعوی جھوٹ پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ اس کا والد خود یہودی تھا جو کہ ایک مجوسی کا لے پالک تھا۔ اس لحاظ سے اس کی دو نسبتیں ہیں: ایک نسبت یہود کی طرف اور دوسری نسبت مجوس کی طرف۔

عبید اللہ اور اس کے اہل خانہ ملحدین تھے۔ ان کا تعلق اسماعیلیہ فرقہ کے ائمہ میں سے ہوتا ہے؛ جن کے بارے میں علماء کرام فرماتے ہیں: ''ان کا مذہب ظاہر میں رافضیت ہے' اور باطن میں خالص کفر ہے۔''

ان کے اسرار اور خفیہ رازوں سے پردہ چاک کرنے کے لیے علماء کرام نے کئی ایک کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں ان کے نسب کے جھوٹ اور اسلام کے جھوٹے دعوی سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کا دین اسلام یا نسب کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہیں۔

عبید اللہ بن میمون قداح کا ظہور سن ۲۹۹ ہجری میں ہوا۔ اور سن ۳۲۴ ہجری میں ہلاک ہو گیا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا

القائم اس کا جانشین بنا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا المنصور جانشین ہوا۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا المعز؛ جس نے قاہرہ شہر کی تعمیر کی ۔ پھر اس کے بعد العزیز؛ اس کے بعد الحاکم' پھر اس کا بیٹا الظاہر؛ پھر اس کا بیٹا المستنصر جانشین بنا ۔ اس کی ولایت کا عرصہ بہت طویل رہا۔ اسی کے دور میں ''بساسیری'' کا فتنہ بپا ہوا۔ بغداد میں ایک سال تک اس کے نام کا خطبہ دیا جاتا رہا۔ اور ابن الصباح جس نے اسماعیلیہ کے لیے چھری کی بدعت ایجاد کی وہ اسی مستنصر کے پیروکاروں میں سے تھا۔

سن پانچ سو اڑسٹھ ہجری میں قاہرہ میں ان لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا ۔ یہ لوگ دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک مصر پر غالب رہے ۔ منافقت وارتداد' الحاد اور اللہ اور اس کے رسول کی دشمنی میں ان لوگوں کے واقعات وقصص سے علماء کرام اچھی طرح خبردار ہیں۔

ابن ماجہ کی وہ حدیث جس میں ہے:

"لا مهدي إلا عيسى ابن مريم۔" [سنن ابن ماجة ۲/ ۱۳۴۰]

''عیسی بن مریم علیہ السلام کے علاوہ کوئی مہدی نہیں ۔''

یہ حدیث ضعیف ہے۔ یہ حدیث یونس نے شافعی سے روایت کی ہے' اور انہوں نے اسے یمن کے ایک مجہول شیخ سے روایت کیا ہے۔ اس سند کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوتی ۔ یہ روایت امام شافعی کی مسند میں بھی موجود نہیں ۔ بلکہ اس کا سارا دارو مدار یونس بن عبد الاعلی پر ہے۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ: یونس نے یہ بھی کہا ہے : میرے سامنے امام شافعی سے حدیث بیان کی گئی۔ ''خلیعات'' اور بعض دوسری کتابوں میں ہے : ہم سے یونس نے حدیث نے بیان کی وہ امام شافعی سے روایت کرتے ہیں ۔ یہ نہیں کہا کہ: ان سے شافعی نے حدیث بیان کی ۔ پھر اس کے بعد کہا ہے :'' محمد بن خالد جندی کی روایت میں تدلیس پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی سند کمزور ہو جاتی ہے۔

اور بعض علماء کرام یہ بھی کہتے ہیں کہ: یہ حدیث اصل میں امام شافعی سے روایت ہی نہیں کی گئی ۔

فصل:

رافضی کا غرور

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''یہ تھے معصوم ائمہ جو فضل و کمال کی آخری حد تک پہنچے ہوئے تھے اور دوسرے اماموں کی طرح حکومت و سلطنت، فواحش و منکرات، لغویات اور شراب نوشی میں منہمک نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ہی لوگوں سے وہ سلوک کیا جو لوگوں کے مابین تواتر کے ساتھ مشہور ہے۔ اسی بنا پر امامیہ کہتے ہیں کہ:'' اللہ کریم ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا:

إِذَا شِئْتَ اَنْ تَرْضٰى لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا ... وَتَعْلَمَ اَنَّ النَّاسَ فِىْ نَقْلِ اَخْبَارٍ

فَدَعْ عَنْكَ قَوْلَ الشَّافِعِيِّ وَ مَالِكٍ ... وَاَحْمَدَ وَالْمَرْوِيِّ عَنْ كَعْبِ اَحْبَارٍ

وَوَالِ اُنَاسًا قَوْلُهُمْ وَحَدِيْثُهُمْ ... رَوٰى جَدُّنَا عَنْ جِبْرِيْلَ عَنِ الْبَارِیْ

ا۔ جب تو اپنے لیے کوئی مذہب پسند کرنا چاہے اور یہ معلوم کرنا چاہے کہ روایات کے نقل کرنے میں لوگوں کی کیا حالت ہے۔ ۲۔ تو شافعی، مالک اور احمد کے اقوال اور کعب احبار کی روایات ترک کر دو۔ ۳۔ اور ان لوگوں سے دوستانہ مراسم استوار کر جن کا قول اور حدیث یہ ہے کہ ہمارے نانا نے جبریل سے اور جبریل نے باری تعالیٰ سے روایت کی۔''

اہل سنت کے جوابات:

شیعہ مصنف کی ذکر کردہ دلیل کا جواب کئی طرح پر ہے:

پہلا جواب: ائمہ کے معصوم ہونے کی شیعہ کے پاس اس دعوی کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ ہر زمانہ میں امام معصوم کا وجود لوگوں کے لیے لطف و مصلحت کا باعث ہوتا ہے، لہٰذا ایسے امام کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ ہم قبل ازیں اس دلیل کا بطلان و فساد کئی وجوہ سے واضح کر چکے ہیں کہ:

ا۔ یہ لطف و مصلحت موجود نہیں مفقود ہے، اس لیے کہ یہ امام ہنوز مفقود ہے اور شیعہ بے تابی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

۲۔ [رافضی اصولوں کے مطابق] کوئی ایسا امام موجود نہیں ہے جس سے لطف و مصلحت حاصل ہوئی ہو۔

۳۔ ایسے امام کی نفی کیلئے یہی دلیل کافی ہے کہ امام کا وجود صریح عقل کے منافی ہے اور کسی شخص نے امام منتظر سے کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ کسی مکلف کو کوئی مصلحت حاصل ہوئی، تاہم اسکے علاوہ دیگر دلائل و براہین بھی موجود ہیں۔

دوسرا جواب: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ'' ہر امام فضل و کمال کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔'' یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ بلا علم قول کا مقابلہ اس جیسے ہی قول سے کیا جاسکتا ہے۔ اور ہر شخص ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ دعویٰ صحابہ و تابعین کے بارے میں کیا جائے جو علم و فضل اور دینداری اور اتباع شریعت میں دونوں گروہوں کے لوگوں میں ان کے ہم مثل موجود تھے؛ اور ان کے اتباع سے افضل واشہر تھے۔ تو یہ دعویٰ اولیٰ بالقبول ہوگا۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ وہ

دینی اور علمی فضائل کئی ایک ائمہ دین سے تواتر کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں؛ وہ ان اخبار سے بہت زیادہ ہیں جو جھوٹ موٹ عسکریین اوران کے امثال کے بارے میں نقل کی گئی ہیں؛ سچائی کوتو دور چھوڑ یے۔

تیسرا جواب: شیعہ مصنف کا قول: ''ہمارے ائمہ۔'' اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے ائمہ معصومین قوت وشوکت اور سیف وسنان سے بہرہ ور تھے تو یہ صریح کذب ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا سب امام اپنے آپ کو عاجز ومغلوب قرار دیتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر چہ خلافت وسلطنت سے بہرہ ور تھے، تاہم متعدد امور میں آپ کو سخت تکالیف کا سامنا ہوا۔ ❶ اس پر مزید یہ کہ آدھی امت مسلمہ یا اس سے کم وبیش نے سرے سے آپ کی بیعت ہی نہیں کی۔ بلکہ آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے، بہت سے لوگوں نے نہ آپ کی مخالفت کی نہ معاونت بلکہ غیر جانب دار رہے؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑے اور نہ ہی آپ کے ساتھ مل کر لڑے۔ اوران میں ایسے اصحاب علم وفضل بھی تھے کہ ان جیسے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو لوگ لڑائی سے پیچھے رہے؛ وہ ان لوگوں سے بہت افضل تھے جنہوں نے آپ سے جنگ کی' اور جنہوں نے آپ سے مل کر جنگ کی۔

یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے جنگ جدال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا وہ آپ کے احباب و انصار کی نسبت افضل تھے۔ اور اگر شیعہ قلمکار کی مراد یہ ہے کہ شیعہ کے اکابر علم ودین کے بل بوتے پر امام قرار دیئے جانے کا استحقاق رکھتے تھے تو اگر اس دعوی کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو اس سے ان کا واجب الاطاعت امام ہونا لازم نہیں آتا۔ جس طرح کسی شخص کے مستحق امامت یا قاضی بننے کی صلاحیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع امام یا قاضی ہو۔ یا امارت حرب کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ درحقیقت اس منصب پر فائز ہو۔ نماز اس شخص کی اقتداء میں جائز ہے جو بالفعل امام ہو نہ کہ مستحق امامت کے پیچھے۔ بعینہ اسی طرح لوگوں کے متنازع امور میں فیصلہ وہی شخص صادر کرے گا جو صاحب سلطنت و قدرت ہو نہ کہ وہ شخص جو قضا کا استحقاق رکھتا ہو۔ لشکر اس شخص کے زیرفرمان لڑے گا جو ان کا امیر حرب ہو نہ کہ مستحق امارت کے زیر اثر؛ جو کہ امیر کارواں ہی نہ ہو۔

خلاصہ کلام! ہر فعل قدرت کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ لہٰذا قدرت وسلطنت سے محروم شخص ولایت وامارت پر فائز نہیں ہوسکتا۔ استحقاق ایک جداگانہ شے ہے؛ اگر چہ وہ اس کا استحقاق رکھتا ہو کہ اسے قدرت وسلطنت سے بہرہ ور کیا جائے؛ مگر اس منصب پر بہرہ ور ہونے والے کے ہم پلہ ہرگز نہیں۔ پس کسی کا قدرت وسلطنت کا مستحق ہونے سے اس کا ان امور سے فی الواقع بہرہ ور ہونا لازم نہیں آجاتا۔ خلیفہ وامام دراصل وہ ہوتا ہے، جو شوکت وقدرت کی صفات سے موصوف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا ایک امام بھی ایسا نہیں جو ان صفات سے بہرہ ور ہو۔

چوتھا جواب: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ استحقاق سے تمہاری مراد کیا ہے؟ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ باقی تمام قریش کو چھوڑ کر

❶ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی مشکلات کا دائرہ کافی وسیع ہے، مثلاً یہ کہ آپ کے رفقاء کما حقہ آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ آپ صدق دل سے قاتلین حضرت عثمان سے قصاص لینا چاہتے تھے، مگر آپ کے شیعہ اس میں روڑے اٹکاتے رہتے تھے، علاوہ ازیں ابن سبا کی، دسیسہ کاریوں سے متاثر ہو کر آپ کے ارادت مندوں میں کفر والحاد کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے ان میں سے ایک فریق کو نظر آتش کر دیا، اور دوسرے کو جلا وطن کیا، نیز آپ کے شیعہ میں سے کچھ لوگ آپ کے مخالف بن گئے تھے، اس کے علاوہ بھی بہت سی تکالیف تھیں جن کا شکوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرمایا کرتے تھے۔

ائمہ شیعہ میں سے کسی ایک کا خلیفہ ہونا ضروری تھا؟ یا یہ مطلب کہ ائمہ میں سے ہر ایک ان لوگوں میں سے ہے جو خلافت کی صلاحیت رکھتے ہیں؟۔ پہلی بات اس لیے غلط ہے کہ احادیث نبویہ سے صراحۃً امامتِ قریش کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اگر دوسری بات تسلیم کی جائے تو اس وصف میں قریش کے دوسرے لوگ مساوی طور پر شریک ہیں۔

پانچواں جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: امام وہ ہے جس کی اقتدا کی جائے؛ اس کے دو طریقے ہیں:

اول: علم و دین میں اس کی طرف رجوع کیا جائے اور اطاعت کنندہ اس بنا پر اس کی اطاعت اختیار کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و احکام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے تاہم اس میں ایسی کوئی قوت نہیں ہوتی کہ کسی کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکے۔

دوم: دوسری صورت یہ ہے کہ وہ صاحب قوت و شوکت اور مالک سیف و سنان ہو۔ اور لوگوں کو طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑے، آیت کریمہ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ میں ''اولی الامر'' سے اصحاب قدرت مثلاً امراء حرب اور علماء دونوں مراد لیے گئے ہیں۔ اور یہ دونوں معانی حق ہیں۔ یہ اوصاف یوں تو چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں مکمل طور پر پائے جاتے تھے۔ وہ علم و عدل اور سیاست و سیف و سنان دونوں کے دھنی تھے۔ تاہم ان میں بھی تفاوت درجات موجود ہے، مثلاً حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی نسبت اکمل و افضل تھے۔ ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی خلیفہ ان اوصاف کا جامع نہ تھا۔ [1] بعض اشخاص خلفاء و سلاطین کی نسبت علم و فضل و دین داری میں آگے تھے، بعض حکومت و سلطنت میں کامل تھے، مگر علم و فضل اور تدین میں ان کو وہ مقام حاصل نہ تھا۔

اگر شیعہ کے ائمہ کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ بااقتدار بھی تھے، تو یہ باطل ہے۔ اور وہ خود بھی اس کے مدعی نہیں تھے۔ اور اگر اقتدار سے محرومی کے باوصف علم و دین میں ان کی امامت کو تسلیم کیا جائے؛ اور یہ لوگ کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے کی قدرت نہ رکھتے تھے؛ تو دوسرے علماء بھی اس وصف میں ان کے شریک تھے۔ [یہ پھر ان کی کوئی خصوصیت نہ ہوئی]۔

بلکہ ان کے معاصرین میں سے بہت سے علماء، علم و تقویٰ میں ان سے بہت آگے تھے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ان کے معاصرین سے جو علمی آثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں وہ ائمہ شیعہ کی علمی خدمات سے بہت زیادہ ہیں۔ شیعہ کے متقدمین ائمہ مثلاً علی بن حسین رحمہ اللہ ان کے بیٹے ابوجعفر رحمہ اللہ اور ان کے بیٹے جعفر بن محمد رحمہ اللہ سے کچھ علمی آثار نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ان کے معاصرین کی علمی خدمات ان پر بدرجہا فائق ہیں۔

متاخرین ائمہ شیعہ کی علمی خدمات کا دائرہ بے حد محدود ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس دور کے مشاہیر اصحاب علم و حدیث و فتویٰ کے زمرہ میں شمار ہی نہیں کیے جاتے، ان کی شان میں جو مناقب و محاسن ذکر کیے جاتے ہیں اس سے زیادہ فضائل ان کے ہم عصر علماء کے بیان کیے جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: یہ ائمہ علم اور دین کے اعتبار سے تمام امت سے افضل ہیں۔'' [تاریخی حقائق کے پیش نظر ان کو علم دین میں افضل الامت قرار دینا خلاف واقع ہے]۔

---

[1] عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو حضرت امیر معاویہ سے افضل و اعلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تابعین کرام جیسے حسن بصری اور امام شریک وغیرہ سے منقول ہے اگر لوگ حضرت امیر معاویہ کو دیکھ لیتے تو انہیں مہدی گمان کرنے لگتے۔ ابن تیمیہ کے بقول: آپ دنیا کے بہترین بادشاہوں میں سے تھے۔ [دلدار جی]

دونوں صورتوں میں ائمہ شیعہ کی امامت اہل سنت کے نزدیک مسلم ہے، اس کی وجہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص بھی اللہ و رسول کی اطاعت کی دعوت دیتا اور اعمال صالحہ کی تلقین کرتا؛ اور خود وہ کام کرتا ہو جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ہو تو اس کی بات مان لینی چاہیے۔ بنا بریں اہل سنت اعمال صالحہ کی جانب دعوت و تبلیغ میں ائمہ کی اطاعت کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔[بلاشبہ ان امور میں یہ ائمہ مقتدی ہیں]۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ (السجدة: ۲۴)

''اور جب ان لوگوں نے صبر کیا تو ہم نے ان میں سے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ (البقرة: ۱۲۴)

''میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ شمشیر بکف لوگوں سے لڑیں گے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ واجب الاطاعت ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ لوگ آپ کی اطاعت کریں یا اس سے منحرف ہو جائیں۔

شیعہ کے امام، اہل سنت ائمہ کی طرح عز و شرف کے حامل ہیں اور اہل سنت ان باتوں میں ان کی اطاعت کرتے ہیں جن امور میں شرعاً ان کی فرمانبرداری روا ہے۔ شیعہ کے ائمہ کا اجلال و اکرام اہل سنت کے یہاں اسی طرح ضروری ہے جس طرح ان کے مسلمہ ائمہ کی عزت و افزائی مثلاً ابوبکر و عمر، ابن مسعود، ابی بن کعب، معاذ، ابوالدرداء اور سابقین اولین میں سے ان کے ہمنوا و ہم پلہ لوگ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور تابعین و تبع تابعین میں سے سعید ابن المسیب؛ سلیمان بن یسار، عبیداللہ بن عبداللہ، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زید؛ رحمہم اللہ؛ یہ لوگ مدینہ کے سات فقہاء ہیں۔

اور جیسے علقمہ، اسود بن زید، اسامہ بن زید، محمد بن سیرین، حسن بصری، سالم بن عبداللہ، ہشام بن عروہ، عبدالرحمٰن بن قاسم، زہری، یحییٰ بن سعید انصاری، ابوالزناد۔ علاوہ ازیں امام مالک، اوزاعی، لیث بن سعد، ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن ابراہیم وغیرھم رحمہم اللہ۔

مذکورہ بالا اصحاب کی علمی حیثیت ہرگز مساوی نہیں، بلکہ ان میں بعض اکابر کا علمی پایہ حدیث اور فتوی میں دوسروں کی نسبت بلند تر ہے۔ اور ان کی شہرت کثرت علم، قوت دلیل یا دوسرے اوصاف کی رہین منت ہے۔ بنا بریں اہل سنت یہ نہیں کہتے کہ یحییٰ بن سعید، ہشام بن عروہ اور ابوالزناد، جعفر بن محمد کی نسبت اولیٰ بالاتباع ہیں۔

علی ہذا القیاس وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ امام زہری، یحییٰ بن ابی کثیر، حماد بن ابی سلمہ، سلیمان بن یسار اور منصور بن معتمر کی اطاعت جعفر بن محمد کے والد ابو جعفر الباقر کی نسبت واجب تر ہے، نہ یہ کہ قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر اور سالم بن عبداللہ رحمہم اللہ کی فرمانبرداری علی بن حسین رحمہ اللہ کی اطاعت سے زیادہ ضروری ہے۔

اس کے عین برخلاف اہل سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ: ان میں سے ہر امام کی مرویات و منقولات وثوق و اعتماد کے قابل ہیں۔ اور جو کچھ ان سے نقل کیا گیا ہے؛ اس میں وہ سچے ہیں۔ اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا جو حکم واضح ہو؛ تو پس وہی

اصل علم ہے جو ان لوگوں سے مستفاد ہو رہا ہے۔ [1] [یعنی کتاب و سنت کی مطابقت و توضیح میں ان کا ہر ارشاد واجب الاتباع ہے]۔ جب کوئی امام ایسا فتویٰ دے جو دوسرے علماء و ائمہ کے خلاف ہو تو امر متنازع کو بمُوائے قرآن کریم اللہ و رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ حکم سب ائمہ کے لیے عام ہے، کوئی امام اسثنائی حیثیت کا حامل نہیں۔ عہد رسالت اور خلفاء راشدین کے زریں دور میں بھی مسلمان اسی پر عمل پیرا تھے۔

چھٹا جواب: ان سے کہا جائے گا کہ: یہ قول کہ:''دوسرے اماموں کی طرح حکومت و سلطنت، فواحش و منکرات، لغویات اور شراب نوشی میں منہمک نہ ہوئے۔'' شیعہ مصنف کی یہ بات غلط ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک سلاطین و ملوک کی ہر جائز و ناجائز بات قابل اطاعت ہے تو یہ ان پر صریح بہتان ہے۔ اہل سنت کے معروف بالعلم علماء کا قول ہے، کہ اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے، اور نہ ایسے شخص کو امام مقرر کیا جائے۔

اور اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ طاعات و عبادات کے انجام دینے میں اہل سنت سلاطین سے طلب امداد کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام کرتے ہیں' اس میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انہیں اس اعتبار سے امام بنانا ناروا ہے، تو خود روافض بھی اس جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہمیشہ کفار و فجار سے طالب امداد ہوتے اور بہت سی باتوں میں خود بھی ان کی امداد کرتے ہیں۔ [2]

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں؛ ہر زمان و مکان میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اس کتاب'' منھاج الندامه '' کا شیعہ مصنف اور اس کے ہم نوا بھی اس الزام سے بچ نہیں سکتے اس لئے کہ منگول؛ تاتاری کافر اور دیگر فساق و جہال ان کے ائمہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

ساتواں جواب: شیعہ مصنف نے اپنی کتاب میں جن ائمہ کا ذکر کر کے ان کے معصوم ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ اس قوت و شوکت سے بہرہ ور نہ تھے جس کے ساتھ امامت و خلافت کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کی اقتداء عبادت

---

[1] بشرطیکہ امام سے روایت کرنے والے صادق الروایت و ثقہ ہوں بعض شیعہ نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی شان میں اس دعویٰ کے ساتھ سوء ادبی کی جسارت کی ہے کہ آپ نے اہل بیت کی روایات نقل کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ یہ ایک عظیم جسارت و حماقت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام موصوف نے اس ضمن میں تساہل سے کام نہیں لیا۔ بخلاف ازیں ان کے یہاں روایت حدیث کے شرائط ان راویوں میں سرے سے مفقود ہیں جو اہل بیت سے روایات نقل کرتے ہیں بلکہ ایسی روایات جھوٹ کا طومار ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب کو روایات کاذبہ سے پاک رکھنے کے التزام کو قائم رکھا ہے۔ کتاب کے شروع میں ہم امام مالک، شافعی، یزید بن ہارون، اور اعمش کے اقوال درج کر چکے ہیں کہ شیعہ دروغ گو و کذاب ہوتے ہیں۔ بے شک صدق شعار بدعتی کی روایت اس شرط کے ساتھ مقبول ہے کہ وہ اپنی بدعت کا داعی نہ ہو۔ مگر شیعہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ شیعہ کی روایت اہل بیت و غیر اہل بیت کسی سے بھی مقبول نہیں اس لیے کہ وہ احادیث گھڑ کر ان کو دین و مذہب کا درجہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے شیعہ کی جھوٹی روایات اور ان کا تاریخی اختلاف ہی کافی ہے، کیا امام بخاری سے انہیں اس بات کی توقع تھی، کہ وہ ان کی دروغ گوئی کے دھوکہ میں آ جائیں گے۔

[2] شیعہ مصنف ابن المطہر کا استاد نصیر الدین طوسی اس امر کی بہترین مثال ہے کہ شیعہ علماء کس حد تک کفار و فجار سے طلب امداد کرتے اور ان کی خدمت و خوشامد کو اپنے لیے سرمایہ افتخار خیال کیا کرتے تھے، ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتاب'' روضات الجنات، ص: ۵۷۸'' طبع ثانی سے نقل کر چکے ہیں کہ طوسی نے جس عظیم خیانت کا ارتکاب کیا تھا شیعہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ہلاکو خاں تاتاری سے لے کر سلطان خدابندہ ...... جس کے لیے ابن المطہر رافضی نے یہ رسوائے عالم کتاب لکھی ...... تک جتنے بت پرست بادشاہ ہوئے ہیں شیعہ علماء ان کی خدمت و استعانت کو اپنے لیے سرمایہ افتخار تصور فرمایا کرتے تھے، سلطان خدابندہ قبل ازیں بت پرست تھا، موجب حیرت ہے کہ ابن المطہر رافضی کے نزدیک اس مشرک بادشاہ کا پایہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ...... جن سے بلند تر حاکم انبیاء کے بعد اس کرۂ ارضی پر پیدا ہی نہیں ہوا...... سے بڑھ کر تھا۔

الٰہی اوراس کے ضروری معاونات کے حصول میں کافی تھی۔اور نہ ہی ان سے انہیں کوئی قوت حاصل تھی جس سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کاموں پر معاونت حاصل ہوسکتی ہو۔ ملک و سلطنت سے محروم ہونے کی بنا پر نہ ہم ان کے پیچھے نماز یا جمعہ ادا کر سکتے ہیں۔ نہ حج و جہاد میں ان کو امیر مقرر کر سکتے ہیں نہ وہ شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہیں۔ اور نہ جھگڑوں میں فیصلہ کرنے کی قدرت سے بہرہ ور ہیں۔ان کی مدد سے کوئی شخص لوگوں سے یا بیت المال سے اپنے حقوق وصول نہیں کر سکتا۔ نہ ان کی بدولت راستے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ یہ جملہ امور ایک صاحب اقتدار خلیفہ کے محتاج ہیں اور صاحب اقتدار وہی ہوگا جو احباب و اعوان رکھتا ہو۔شیعہ کے یہ ائمہ ان سب اوصاف سے محروم تھے۔ بخلاف ازیں ان کے مخالفین اس قدرت سے بہرہ ور تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک عاجز امام سے یہ جملہ امور طلب کرے گا وہ حد درجہ جاہل و ظالم شخص ہوگا۔ اور جو صاحب قدرت سے کرے گا وہ راہ حق وصواب پر گامزن ہوگا اور دین و دنیا کی مصلحتوں کو حاصل کر لے گا، اس کے عین برخلاف پہلا شخص دونوں قسم کے مصالح سے محروم رہے گا۔

آٹھواں جواب: جملہ خلفاء سے متعلق [شیعہ کا] یہ دعویٰ جھوٹ ہے کہ وہ مے نوشی اور فجور میں محو رہا کرتے تھے۔ اس ضمن میں جو حکایات بیان کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں [1] یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ان میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور خلیفہ مہتدی [2] باللہ جیسے عادل و زاہد بھی تھے۔ مزید برآں بنوامیہ و بنوعباس کے اکثر خلفاء کا دامن فواحش و منکرات سے پاک تھا۔

خلفاء میں سے کوئی ایک [3] اگر کسی گناہ میں ملوث ہو بھی جاتا تو فوراً اس سے تائب ہوجاتا۔ بعض اوقات اس کی نیکیاں بہت زیادہ ہوتیں جن سے اس کی برائیاں مٹ جاتیں یا مصائب و آلام میں مبتلا ہو کر اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے۔ [4]

---

[1] یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ بھی اس بہتان طرازی میں شامل ہے۔ حالانکہ محمد بن علی بن ابی طالب رحمہ اللہ ...... جن کو ابن الحنفیہ کہا جاتا ہے...... کے نزدیک یزید کا دامن ان معائب و نقائص سے پاک تھا۔ (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر: ۸/۲۳۳)۔
یزید نے اپنے ننھیال کے قبیلہ قضاعہ میں پرورش پائی تھی اور اس کی والدہ میسون بنت بجدل نے یزید کو مردانہ کمالات و اوصاف سے آراستہ و پیراستہ کرنے میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ بٹایا تھا، شیعہ مذہب کی کتب یزید کی قباحت و مذمت سے پر ہیں یہ سب کذب و بہتان اور ظلم کے مترادف ہے اور شیعہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

[2] خلیفہ مہتدی باللہ عباسی (۲۲۲۔ ۲۵۶) کی تاریخ فضائل و فواضل سے لبریز ہے، میں نے دور حاضر کے جس مورخ و ادیب سے بھی خلیفہ مذکور کے محاسن و مناقب کا ذکر کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، حالانکہ تاریخ اسلام کا حق یہ تھا کہ ایسے پاک باز خلیفہ کی سیرت و سوانح سے متعلق لوگوں کے ہاتھوں میں دسیوں تصانیف ہوتیں۔

[3] بنوامیہ و بنوعباس کی تاریخ قلم بند کرنے اور ان کی روایات و اخبار کی تشہیر کرنے والے مصنفین شیعہ یا شعوبیہ تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امت مسلمہ کی تاریخ کو بگاڑ کر اس کے محاسن کو معائب میں بدل دیا، ذہین طبقہ اگر اسلامی تاریخ کے درس و مطالعہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو تو تھوڑی سی مدت میں ان کثیر تحریفات کی اصلاح ہوسکتی ہے۔

[4] میں مسلم فضلاء و مصنفین کی توجہ و فکر کو اس حقیقت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ شیعہ بشر کو بشر نہیں سمجھتے۔ ان کی رائے میں یا تو انسان فرشتوں کی طرح معصوم ہوتا ہے۔ بلکہ ان سے بھی بالاتر یا ابلیس کی طرح ملعون بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض انسانوں کو جو نبی بھی نہ تھے معصوم قرار دیا اور مسلمانوں کے خلفاء و حکام اور داعیان حق کے خلاف از راہ بغض و عداوت کذب و دروغ کا طومار جمع کر دیا، ان اصحاب خیر و برکت کا سلسلہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے شروع ہو کر عصر حاضر تک پہنچ جاتا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ شیعہ نہ ہوتے اور اس لقب کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے، اس لئے کہ تشیع نام ہے تخریب و تعصب کا اور بس! ونعوذ باللہ من التعصب، آمین یا رب العالمین"

خلاصہ کلام! سلاطین و ملوک اعمال صالحہ انجام دیتے تھے تو ان کی نیکیاں بھی بڑی ہوتی تھیں۔ اور برائیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے تو ان کی برائیاں بھی بڑی ہوتی تھیں۔ اگر ان میں سے کوئی لاتعداد برائیوں کا ارتکاب کرتا جس کی حد یہ ہے کہ امت کا کوئی فرد اس ضمن میں اس کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا تو بلا شبہ اس کی نیکیاں بھی اتنی زیادہ ہوا کرتی تھیں کہ کوئی شخص ان کا حریف نہ ہوسکتا۔ ان کے اعمال صالحہ کا دائرہ خاصا وسیع تھا، مثلاً امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ حدود، جہاد فی سبیل اللہ، اداء حقوق، دفع ظلم اور قیامِ عدل وغیرہ۔

ہم خلفاء کو گناہوں اور مظالم سے مبرا قرار نہیں دیتے۔ جیسا کہ ہم اکثر عام مسلمانوں کو بھی ایسی چیزوں سے بری قرار نہیں دیتے۔ البتہ یہ کہتے ہیں کہ خلفاء یا عوام سے ظلم و معاصی کے صدور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا دامن نیکیوں سے بالکل خالی ہوتا ہے، اور اس بات میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام میں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

اہل سنت یہ بھی نہیں کہتے کہ جملہ امور میں خلفاء کی موافقت ضروری ہے، بلکہ اطاعت صرف نیک اعمال میں ضروری ہے، معصیت میں نہیں۔ جو شخص طاعات و عبادات میں کسی دوسرے کے ساتھ شریک ہو اور اعمال قبیحہ میں اس سے کنارہ کش رہے تو اسے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص لوگوں کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے جائے اور ان کے ساتھ وقوف وطواف انجام دے تو کسی حاجی کے گنہگار ہونے سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بعینہ اسی طرح اگر کوئی شخص جمعہ و جماعت یا کسی علمی مجلس یا غزوہ میں شریک ہو اور اس کے رفقاء میں سے کوئی شخص متعدد گناہ کر چکا ہو تو اسے اس کے گناہوں کی وجہ سے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ خلفاء اس ضمن میں دوسروں لوگوں کے ساتھ مساوی ہیں کہ وہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام کرتے ہیں تو طاعات میں ان کی موافقت کی جائے، اور اگر اللہ کی نافرمانی کے کام کرتے ہیں تو معصیت میں ان کے ساتھ اشتراک کرنے سے اجتناب کیا جائے۔

ائمہ اہل بیت کا برتاؤ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ اسی قسم کا تھا۔ جو نیک کاموں میں ان کی اطاعت کرے گا وہ ان کا پیرو کہلائے گا اور جو سابقین اولین و جمہور اہل علم سے اظہار براءت کر کے ان کی دشمنی میں کفار و منافقین کا ساتھ دے گا۔ جیسا کہ شیعہ کا طرز عمل ہے...... تو وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

نواں جواب: خلیفہ و امام ایسا ہونا چاہیے جو قدرت و شوکت سے بہرہ ور ہو اور جس سے لوگوں کی بہبود و مصلحت کی شیرازہ بندی ہو جائے، مزید برآں خلیفہ میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا بے حد ناگزیر ہے۔

۱۔ خلیفہ کی وجہ سے راستوں میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔
۲۔ شرعی حدود قائم کرنے پر قادر ہو۔
۳۔ ظلم کا ازالہ کر سکے۔
۴۔ دشمن کے خلاف جہاد کر سکتا ہو۔
۵۔ دوسروں کے حقوق انہیں دلوانے پر قادر ہو۔

ایسے امام کا ہونا اس امام معدوم سے بہت بہتر ہے جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہ ہو۔

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ شیعہ جس امام معصوم کے دعوے دار ہیں وہ سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں، گویا

شیعہ باطن میں جس امام کے دعوے دار ہیں وہ معدوم ہے۔ اور بظاہر جن کو امام مانتے ہیں وہ کافر و ظالم ہیں (مثلاً تاتاری کافر)۔اس کے عین برخلاف اہل سنت کے امام اگر ان کے متعلق کتنے ہی ظلم و گناہ کے مرتکب ہونے کو تسلیم کرلیا جائے تو بھی اس کے باوصف شیعہ کے ان ائمہ اطہار سے بدر جہا بہتر ہیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں۔اور اس امام سے بھی بڑھ کر ہیں جو بے حقیقت اور معدوم ہے۔ جہاں تک باقی ائمہ کا تعلق ہے جو کہ موجود تھے۔تو اہل سنت بھی ان کی اتباع ایسے ہی کرتے ہیں جیسے ان جیسے دوسرے لوگ اپنے ائمہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فریقین کے ائمہ کی اطاعت کرنے والا اس شخص سے بہتر ہے جو صرف ایک ہی فریق کے ائمہ کا اطاعت گزار ہو۔ اس لیے کہ روایت و درایت کا نام علم ہے اور اس میں جس قدر بھی علماء ہوں گے اور ان میں باہم اتفاق و اتحاد پایا جائے گا تو وہ اولیٰ بالاتباع ہوگا۔شیعہ کے یہاں جو بھی خیر موجود ہے اہل سنت اس میں برابر کے شریک ہیں، مگر جو خیر اہل سنت کے یہاں پائی جاتی ہو شیعہ اسے حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں۔

دسواں جواب: رافضی نے جو دلیل پیش کی ہے اہل سنت اس پر اس سے سخت اور شدید ترین دلیل سے معارضہ کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ: سعید بن میتب، علقمہ، اسود، حسن بصری، عطا بن ابی رباح، محمد بن سیرین، مطرف، مکحول، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، سالم بن عبداللہ اور دیگر تابعین و تبع تابعین (رحمہم اللہ) سب ائمہ دین میں شمار ہوتے ہیں۔ دینی امور میں جس طرح ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بادشاہوں کی اطاعت بھی ان امور دین میں کی جاتی ہے جہاں پر ان کی ضرورت ہو۔ ان کے ساتھ ساتھ علی بن حسین رحمہ اللہ اور ان کا فرزند نیز جعفر بن محمد رحمہ اللہ وغیرہم بھی یکساں طور پر اہل سنت کے ائمہ میں شامل ہیں۔ قصہ مختصر! شیعہ علم و زہد سے بہرہ ور جس امام کی بھی اطاعت کرتے ہیں اہل سنت اس میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو اپنے ائمہ کے بھی تابع فرمان ہیں جو علم و زہد میں شیعہ کے ائمہ سے بڑھ کر تھے۔ بفرض محال اگر اہل سنت نے معاصی کا ارتکاب کرنے والے کسی شخص کو امام بنانے کی غلطی کا ارتکاب کیا تو شیعہ نے اس سے بھی بدتر شخص کو امام مقرر کرلیا۔ پس جن امور میں ائمہ کی اطاعت کرنی ہے' اہل سنت والجماعت ان امور میں ائمہ عدل کے پیروکار ہیں۔ اور ظلم و جور کے امور میں ائمہ ظلم کی اتباع سے بہت دور بہت دور ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اہل سنت نے ظالم خلفاء کی اطاعت صرف ان باتوں میں کی تھی، جو ظلم و معصیت نہ تھیں، بنا بریں اہل سنت بہر کیف روافض سے افضل ہوئے۔

گیارہواں جواب: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اللہ تعالیٰ ہمارے اور اہل سنت کے درمیان فیصلہ فرمائے گا؛ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

اس کے جواب میں اس امامی شیعہ سے کہا جائے گا کہ: دلائل و براہین کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ دنیا ہی میں کر دیا ہے، مزید برآں اہل سنت قوت و شوکت کے اعتبار سے بھی ہمیشہ شیعہ پر غالب رہتے ہیں گویا اہل سنت کا یہ غلبہ دوگونہ ہے:

۱۔ حجت و برہان کے اعتبار سے۔

۲۔ سیف و سنان کے بل بوتے پر، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین باقی ادیان کے مقابلہ میں غالب ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ (التوبة: ۳۳)

''وہ اللہ کی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر مبعوث کیا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگر چہ مشرکین کو یہ بات بری ہی کیوں نہ لگے۔''

یہ نا قابل انکار صداقت ہے کہ اہل سنت کے عقائد و افکار ہی دین ہیں جن کی تم مخالفت کرتے ہو۔ ان عقائد کا حامل شخص دلیل و برہان کی بنا پر شیعہ پر غالب آئے گا جس طرح دین اسلام باقی ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں غالب رہا ہے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ دیگر ادیان و مذاہب پر دین اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ اہل سنت کی وجہ سے ہوا۔ دین اسلام کو جو غلبہ کامل خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے عہد سعادت مہد میں حاصل ہوا، وہ دوسرے کسی دین کو نصیب نہ ہو سکا۔ ❶

حضرت علی رضی اللہ عنہ اگر چہ خلفائے راشدین میں شامل ہیں اور سابقین اولین کے سرداروں میں شمار ہوتے ہیں مگر آپ کے عہد خلافت میں اسلام کو یہ غلبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ❷ بخلاف ازیں آپ کے دور میں فتنہ پردازی کی وجہ سے اہل اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اعداء دین مثلاً کفار، نصاریٰ و مجوس مختلف دیار و امصار میں بلاد مشرق اور شام کے کفار اسلامی ممالک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد اہل سنت کے سوا نہ کوئی اہل علم باقی رہا اور نہ ہی زور بازو والا غازی و مجاہد جن کی بدولت اسلام کو غلبہ نصیب ہوتا۔ روافض کا یہ حال تھا کہ یا تو اعداء ❸ اسلام کا ساتھ دیتے یا غیر جانب دار رہتے۔ ❹ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت سابقین اولین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے اعداء کے درمیان اسی طرح فیصلہ فرمائے گا جس طرح اہل اسلام اور کفار کے مابین فیصلہ صادر کرے گا۔

بارھواں جواب: ہم شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ آخر کس کے ظلم سے تم آہ و فریاد کر رہے ہو.....؟

اگر شیعہ کہیں کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مظالم ڈھائے تھے اور ہم ان کے ظلم سے فریاد کے خواہاں ہیں۔

تو ہم جواباً کہیں گے کہ اس دعویٰ کا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پہنچتا تھا، اور آپ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرح وفات پا چکے ہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ اہل سنت و شیعہ سے متعلق نہیں سوائے اس کے کہ حق کی وضاحت کر کے اہل حق کی موالات کی جائے۔ ہم دلائل قاہرہ کی روشنی میں یہ صداقت واضح کر سکتے ہیں کہ اس امت میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر نہ کوئی عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کر سکا اور نہ ظلم سے کنارہ کش رہا، ہم آگے چل کر یہ حقیقت واضح کریں گے کہ حضرت

---

❶ یہ حقیقت ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بعد اموی خلافت کے زمانہ میں شرق و غرب اور یورپ میں اسلامی دعوت کو جو فروغ حاصل ہوا وہ اموی خلفا کی مساعی جمیلہ کا رہین منت ہے۔

❷ سیدنا علی کی خلافت میں اسلامی دعوت کے ناکام ہونے کے ذمہ دار وہ شیعہ تھے، جو آخر کار کئی حصوں میں بٹ گئے، ان میں سے بعض آپ کے موافق اور بعض مخالف ہو گئے، آپ کے معاصر شیعہ پر مقابلۃً متاخرین شیعہ کی نسبت کم ذمہ داری عائد ہوتی ہے، متاخرین شیعہ نے اسلام کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی مذموم سعی کی تھی اور اس کی ظاہری صورت کو اس طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا کہ وہ اسلام کے سوا کچھ اور معلوم دیتا تھا۔

❸ چنانچہ جب ہلاکو خاں نے یاجوج ماجوج (تاتاری فوج) کی مدد سے بغداد پر حملہ کیا تو شیعہ نے نصیر الدین طوسی اور ابن العلقمی کی قیادت میں کفار کا ساتھ دیا۔

❹ اس کی دلیل یہ ہے کہ تاتاریوں نے جب بلاد اسلامیہ پر حملہ کیا تو شیعہ اس میں غیر جانب دار رہے، پھر صلیبی جنگوں کے زمانہ میں بھی روافض نے یہی کردار ادا کیا اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان واقعات کے عینی شاہد تھے۔

علی رضی اللہ عنہ کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ صرف آپ ہی امامت و خلافت کے منصب پر فائز ہیں [1] اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو یہ مرتبہ حاصل نہ تھا۔

❀ اگر شیعہ کہیں کہ ہم ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں جنہوں نے ائمہ شیعہ کو امامت و خلافت کے حقوق سے محروم رکھا تو ہم ان سے دریافت کریں گے کہ کیا ان ائمہ نے خلافت کا مطالبہ کیا تھا؟ یا وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ معصوم امام ہیں؟ یہ ان پر صریح بہتان ہے۔ بہرکیف! سچ ہو یا جھوٹ؛ اگر ان کا آپس میں واقعی کوئی ایسا جھگڑا تھا تو اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کا فیصلہ فرمائیں گے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ (الزمر: ۴۶)

''آپ فرمادیجئے! کہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، چھپے کھلے کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں میں ان امور کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ الجھ رہے تھے۔''

اور اگر وہ ان ملوک و سلاطین کے ظلم سے دادرسی چاہتے ہیں جن کے ساتھ وہ کسی ولایت یا مال کے بارے میں برسر جدل و نزاع تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت سب متنازع فریقین کے مابین فیصلہ فرمائے گا، خود شیعہ کے مابین اتنے مخاصمات اور تنازعات پائے جاتے ہیں؛ جو کہ اہل سنت اور کسی بھی دوسرے گروہ کے باہمی اختلافات سے کہیں زیادہ ہیں۔ بنو ہاشم بھی باہم برسر پیکار رہ چکے ہیں، بنو حسن و بنو حسین کے مابین اسی قسم کی لڑائیاں ہو چکی ہیں، جو آج کل ان جیسے دوسرے لوگوں میں بپا ہیں۔ پچھلے زمانوں میں بعض بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں کے درمیان جو معرکے بپا ہوئے وہ ان لڑائیوں کی نسبت بہت زیادہ تھے، جو ابتدائی ایام میں بنو امیہ اور بنو ہاشم کے مابین ہوئیں۔ [2]

اس کی وجہ نسبی شرافت نہیں بلکہ اس لیے کہ سب سے بہتر زمانہ وہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تھے،

---

[1] بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تاہنوز اور تا قیام قیامت ایسا شخص پیدا ہی نہیں ہوگا، مزید یہ کہ سب سے بڑا ظالم تو وہ ہے جو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ظلم و تعدی کا شاکی ہے، بلکہ بالفاظ صحیح تر وہ حد درجہ کوتاہ فہم اور انسانیت کے اوصاف کمال سے بیگانہ ہے، ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف بغض و عداوت رکھنے والا ان کی ذات میں اس دین کے سوا اور کوئی نقص و عیب نہیں پائے گا، جس نے انہیں انسانی کمالات کی آخری منزل تک پہنچا دیا، ایسا شخص دراصل اس دین کا دشمن ہے جس کی پیروی کا فخر ابوبکر و عمر کو حاصل تھا، اور جس کی امانتوں کے وہ اس کرۂ ارضی پر سب سے بڑے امین تھے، تاہم ہم ان کو معصوم قرار نہیں دیتے، معصوم ہونا خاصہ انبیاء ہے، البتہ یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ کی مخلوقات میں افضل و اکمل تھے، حضرت علی نے جو کلمات کوفہ کے منبر پر ارشاد فرمائے تھے تاریخی اسلام انہیں فراموش نہیں کر سکتی، آپ نے فرمایا تھا، ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر اور پھر عمر فاروق ہیں۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''جو شخص مجھے ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں افضل قرار دے گا میں اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا۔''

[2] بنو امیہ و بنو ہاشم کے مابین جس طرح اختلافات پائے جاتے تھے بعینہ اسی طرح محبت و مؤدت اور قرابت داری کے روابط بھی موجود تھے، اگر کوئی مورخ ایسے تاریخی حقائق جمع کرنے کی زحمت گوارا کرے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں کس حد تک الفت و محبت کے تعلقات موجود تھے، اور ان سے کیا ثمرات ظہور میں آئے۔ اور پھر ان واقعات کو اسانید سمیت کسی کتاب میں جمع کرنے کا التزام کرے تو یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگی کہ فریقین میں محبت کے جذبات و احساسات اصلی و پائیدار تھے اور اختلافات ہنگامی و عارضی۔ خالد بن یزید بن معاویہ رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ حجاج بن یوسف کی ایک غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا تھا: ''قریش باہم لڑتے جھگڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ صاحب حق کو حق عطا کر دیں گے تو ان کے تعلقات اور لاتعلقی، عقل و دانش اور شرافت و فضیلت کی بنا پر ہوگی۔'' خالد بن یزید کا مطلب یہ ہے کہ قریش میں سے جو لوگ باہم خاندانی علائق و روابط کو قائم رکھیں گے وہ ان مراسم کو توڑنے والوں کی نسبت فہم و فراست اور فضل و شرف میں بڑھ کر ہوں گے بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں [...... حاشیہ جاری ہے......]

پھر صحابہ کا زمانہ پھر تابعین کا [1] بہر کیف آپ کے زمانہ میں خیر کا دور دورہ تھا اس کے برعکس آئندہ زمانوں میں شر کا غلبہ ہو گیا۔

اگر شیعہ ان دین دار اور بے ضرر علماء دین کے ہاتھوں فریاد کناں ہیں، جنہوں نے کسی پر ظلم کیا نہ ظالم کی امداد کے مرتکب ہوئے۔ بجز اس کے کہ وہ حق بات کو بدلائل قاہرہ واضح کر دیتے ہیں تو یہ بڑی غلط بات ہے۔ کوئی احمق شخص ہی اس بات میں شک وشبہ کا اظہار کرے گا کہ امام مالک، اوزاعی، ثوری، ابو حنیفہ، لیث بن سعد، شافعی، احمد، اسحق (رحمہم اللہ) اور دیگر محدثین کو ہشام بن حکم و ہشام بن سالم اور ان کے ہم نوا روافض کے ہم پلہ کہے، تو یہ انتہائی ظلم ہے۔ اسی طرح جو شخص یہ کہے کہ مسئلہ تقدیر کا انکار کرنے والے شیعہ مثلاً نعمی، کراجکی اور ان کے نظائر و امثال معتزلی علماء مثلاً ابو علی، ابو ہاشم اور قاضی عبد الجبار اور ابو حسین بصری کے ہم رتبہ ہیں؛ تو اس کا ظالم ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔ یہ معتزلہ کے اکابر علماء ہیں۔ اس ضمن میں اہل سنت علماء کا تو نام لینا ہی مناسب نہیں، مثلاً متکلمین اہل اثبات میں سے محمد بن ہیصم اور قاضی ابو بکر بن الطیب اور حدیث وفقہ اور تصوف کے علماء مثلاً ابو حامد اسفرائنی، ابو زید مروزی، ابو عبد اللہ بن بطہ، ابو بکر عبد العزیز، ابو بکر رازی، ابو الحسین قدوری، ابو محمد بن ابو زید، ابو بکر ابہری، ابو الحسین دارقطنی؛ ابو عبد اللہ بن مندہ، ابو الحسن بن سمعون، ابو طالب مکی، ابو عبد الرحمن السلمی اور ان کے امثال وہمنوا دوسرے علماء کرام رحمہم اللہ وغیرہم۔

تحقیق کرنے پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اہل سنت کے مختلف ومتعدد فرقوں میں سے ہر فرقہ شیعہ کی نسبت علم وعدل سے قریب تر اور ظلم وجہل سے بعید تر ہے۔ بفرض محال اگر اہل سنت کے کسی فرقہ نے ظالم کی اعانت کا ارتکاب کیا ہے تو شیعہ اس جرم کے ارتکاب میں [ہر موڑ پر] ان سے دو قدم آگے ہی ہوں گے۔ اور اگر شیعہ نے کبھی ظلم وتعدی سے اجتناب کیا ہے تو اہل سنت اس میدان میں بھی کئی قدم آگے ہوں گے۔ یہ بات تجربہ ومشاہدہ پر مبنی ہے اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی فرقوں میں شیعہ سے زیادہ جھوٹا اور زیادہ ظالم و جاہل دوسرا کوئی فرقہ نہیں، لطف یہ ہے کہ شیعہ کے شیوخ وعلماء نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

اس حقیقت سے آگاہ تھے اور اس کے قدر شناس تھے، بخلاف ازیں شیعہ اس سے نابلد محض ہیں اور ان کی راہ بنو ہاشم و بنو امیہ دونوں سے الگ ہے۔ شیعہ کا مقصد وحید فتنہ پروری اور اسلامی حقائق کے خلاف بغض وعناد کی آگ کو ہوا دینا ہے اور بس۔ محی الدین خطیب نے جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ میں مجلہ الفتح کے شمارہ: ۸۳۴ص: ۶، ۷ میں قریش کی اس قدیم عادت کا ذکر کیا تھا کہ بعض اوقات وہ عداوت کے باوجود بھی الفت ومحبت کا اظہار کرنے سے نہیں ہچکچاتے، اس مضمون کا محرک یہ ہوا کہ جب امام ضحیانی فوت ہو گئے تو یمن کے امام یحییٰ بن حمید الدین نے ان کی وفات پر ایک دلدوز مرثیہ لکھا، حالانکہ عثمانی حکومت کے عہد میں یہ دونوں مدعی امامت ہونے کی بنا پر عرصہ دراز تک ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے تھے، قریش کے علماء میں بھی اظہار مودت کی یہ رسم جاری رہی، جب تک کرۂ ارضی پر قریش کے ایسے علماء بقید حیات ہیں جو اسلامی اخلاق وآداب سے بہرہ ور ہیں الفت ومحبت کے یہ مراسم باقی رہیں گے، اگرچہ فتنہ پرور لوگ ان باتوں کو پسند نہیں کرتے۔

[1] عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سب سے بہتر زمانہ میرا ہے (جس میں صحابہ تھے) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (عہد تابعین) پھر وہ زمانہ جو اس کے قریب ہے (تبع تابعین کا عہد مبارک) (صحیح بخاری، کتاب الشهادات، باب لا یشهد علی شهادة......(ح:۲۶۵۱)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة ثم الذین یلونهم...... (ح:۲۵۳۵)۔ آخری زمانہ اموی خلافت کے آخری دور پر ختم ہوتا ہے، عباسی خلافت کا ابتدائی زمانہ بھی اس میں شامل ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں: ''اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ تبع تابعین میں سے آخری مقبول القول شخص وہ ہے جو ۲۲۰ھ تک بقید حیات رہا، اسی زمانہ میں بدعات نے پر پرزے نکالنے شروع کیے معتزلہ نے اپنی زبانیں کھول دیں، فلاسفہ نے سر اٹھایا، اور خلق قرآن کے مسئلہ میں علماء کو شدید امتحان میں ڈالا گیا اس دور میں حالات سخت بدل گئے اور آئندہ زمانوں میں تنزل وانحطاط کی یہ رو حافظ ابن حجر کے زمانہ یعنی (۷۷۳۔۸۵۲) ہجری تک جاری رہی، رسول اللہ کے ارشاد مبارک کے مطابق اقوال وافعال سے لے کر افکار ومعتقدات تک جھوٹ سے ملوث ہو گئے۔ (فتح الباری: ۷/۴)

''اے گروہ اہل سنت! تم میں جوان مردی کے آثار پائے جاتے ہیں، تم پر قابو پانے کی صورت میں ہم تم سے ہرگز وہ سلوک نہیں کر سکتے جو تم عندالقدرت ہم سے روا رکھتے ہو۔''

تیرھواں جواب: شیعہ نے جس شعر کو پسند کیا اور اس سے دلیل پیش کی ہے؛ وہ اس شاعر کی جہالت کا مظہر ہے۔ اہل سنت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں: ''رَوٰی جَدُّهُمْ عَنْ جِبْرِيْلَ عَنِ الْبَارِی'' اس سے بڑھ کر اہل سنت اقوال رسول پر بلا توقف عمل پیرا ہوتے ہیں اور یہ دریافت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھتے کہ رسول اللہ نے وہ قول کہاں سے اخذ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت رسول اللہ ﷺ کو معصوم سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ☆ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾ (النجم: ۳، ۴)

''وہ اپنی مرضی سے نہیں بولتا، بلکہ وہ تو وحی ہے جو آپ کی جانب بھیجی جاتی ہے۔''

اہل سنت کو اہل سنت کہا ہی اس لیے جاتا ہے کہ وہ سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ سنت کے اثبات کے لیے ثقہ راویوں کی ضرورت ہے۔ قطع نظر اس سے کہ روایت کرنے والا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہو تو اس سے بھی استفادہ کرتے ہیں، یا کوئی اور شخص صرف ہو تو اس کے بھی علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اتنی بات ہرگز کافی نہیں کہ کوئی روایت محض ''عَنْ جِبْرِيْلَ عَنِ الْبَارِی '' کے بل بوتے پر بلا تحقیق مان لی جائے۔ ایسے بہتان تراش لوگوں کا کیا کیا جائے؟

یہ بات محتاج بیان نہیں کہ امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی بات صرف اس لیے حجت مانی جاتی ہے کہ وہ اپنے اقوال کو نبی کریم ﷺ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ ورنہ ان کے اپنے اقوال کسی درجہ میں بھی حجت نہیں۔ حالانکہ یہ ائمہ احادیث نبویہ سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی معرفت و اتباع میں ان کا اجتہاد حق و صواب پر مبنی ہے۔ ورنہ ائمہ کی اتباع کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح مذکورہ ائمہ احادیث کی روایت کرتے ہیں، اسی طرح دوسرے لوگ بھی اس ضمن میں ان سے پیچھے نہیں اور اگر ائمہ مسائل کا جواب دیتے ہیں تو دوسروں کو بھی یہ شرف حاصل ہے، بایں ہمہ اہل سنت کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں، اور کسی کا قول بھی واجب الاتباع نہیں۔

بخلاف ازیں ائمہ کے مابین جب بھی کسی بات میں تنازع بپا ہوگا تو اہل سنت اسے اللہ و رسول ﷺ کے احکام کی جانب لوٹائیں گے۔ اگر بچشم خود اس کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اپنے زمانہ کے محدثین و فقہاء کو دیکھ لیں، یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ شیعہ علماء کی اکثریت حافظ قرآن نہیں ہوتی، اور حدیث نبوی سے بھی انہیں بہت ہی معمولی لگاؤ ہوتا ہے، کتاب و سنت کے مفہوم و معنی سے وہ بالکل بے گانہ ہوتے ہیں۔

باقی رہا شیعہ شاعر کا یہ قول کہ '' رَوٰی جَدُّنَا عَنْ جِبْرِيْلَ عَنِ الْبَارِیْ''

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ائمہ اربعہ تمہارے نانا کی روایات کو شیعہ سے بہتر جانتے ہیں، اور شیعہ بھی احادیث کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب متقدمین و متاخرین بنی ہاشم، احادیث رسول بنی ہاشم کے علاوہ دوسرے لوگوں سے حاصل کرتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ بنی ہاشم دوسروں سے زیادہ علم نہیں رکھتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ کس کی اقتدا کریں اور کس سے استفادہ کریں؟ آیا ان لوگوں سے اخذ و استفادہ کریں جو علم سے آگاہ ہیں یا ان لوگوں سے جو اس سے قطعی نابلد ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے

درہم و دینار کا ورثہ نہیں چھوڑا بلکہ اپنے پیچھے علم کا ورثہ باقی چھوڑا ہے، جس نے یہ ورثہ حاصل کرلیا، اس نے بہت بڑا حصہ پایا۔
اور اگر شیعہ مصنف کہے کہ ''میری مراد اس سے بارہ امام ہیں۔'' تو ہم کہیں گے کہ علی بن حسین ابو جعفر رحمہ اللہ اور دیگر اہل بیت اپنے جدامجد (نبی اکرم ﷺ) سے جو روایات نقل کرتے ہیں وہ اسی طرح قابل قبول ہیں جس طرح دیگر راویان حدیث کی مرویات، اور اگر لوگ امام مالک شافعی اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ اور محمد بن علی رحمہم اللہ کی نسبت زیادہ روایات نہ پاتے تو اہل بیت کے علماء کو چھوڑ کر کبھی ان ائمہ دین کی بارگاہ میں حاضر نہ ہوتے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آخر لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ وہ موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ سے ہٹ کر امام مالک بن انس رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے، حالانکہ یہ دونوں اکابر بہ یک وقت ایک ہی شہر میں بود و باش رکھتے تھے، بشرطیکہ موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ کے ہاں سے بھی انہیں علمی تشنگی کو دور کرنے کا وہی سامان میسر آتا جو امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں دستیاب تھا۔ خصوصاً جب کہ اس زمانہ کے لوگ حدیث رسول کے شیدائی تھے، اس پر مزید یہ کہ خود بنی ہاشم اپنے چچا زاد موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ کی بجائے امام مالک رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے بعد امام شافعی رحمہ اللہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، آپ نے بہت سے مسائل میں اپنے استاد محترم امام مالک رحمہ اللہ سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی تردید کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب و تلامذہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے مابین شدید تنازعات بپا ہوگئے، امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت بلحاظ نسب بنی ہاشم سے قریب تر تھے، آپ احادیث نبویہ کے سچے عاشق تھے اور جہاں سے بھی حصول علم کی توقع ہوتی اس میں ذرہ بھر غفلت اور سستی کو راہ نہ دیتے، خواہ یہ علم بنی ہاشم کے یہاں سے حاصل ہو رہا ہو یا کسی اور جگہ سے۔ اگر آپ امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت کسی ہاشمی کے یہاں علم پاتے تو آستانہ مالک کی بجائے بنی ہاشم کی بارگاہ علم پر دستک دیتے، امام شافعی رحمہ اللہ خود اس امر کے معترف ہیں کہ انھوں نے کسی ایسے شخص سے استفادہ نہیں کیا جو امام مالک رحمہ اللہ اور سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ سے بڑا عالم ہو، مزید برآں امام شافعی رحمہ اللہ کی تصانیف ان دونوں اکابر سے ماخوذ معلومات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی بات بھی موسیٰ بن جعفر رحمہ اللہ اور دیگر بنی ہاشم سے مستفاد نہیں، یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ جو علم حاصل کرنے کے درپے تھے بنی ہاشم کی نسبت امام مالک کے یہاں اس کی فراوانی تھی۔

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا عشق رسول حدیث نبوی کے ساتھ والہانہ شغف، رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال سے ماہرانہ واقفیت و آگاہی، رسول اللہ ﷺ کے احباب و انصار کے ساتھ گہری محبت و مودت اور اعداء رسول ﷺ کے ساتھ شدید عداوت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ بنی ہاشم کے ساتھ آپ کی عقیدت و ارادت کا یہ عالم تھا کہ فضائل صحابہ کے ساتھ ساتھ حضرت علی اور حسن و حسین کے فضائل و مناقب پر کتابیں تصنیف کیں۔ بایں ہمہ آپ کی تصانیف امام مالک، ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، وکیع بن جراح، یحییٰ بن سعید القطان، ہشیم بن بشیر، عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہم رحمہم اللہ کی روایات سے لبریز ہیں اور ان میں کوئی روایت موسیٰ بن جعفر، علی بن موسیٰ اور محمد بن علی رحمہم اللہ کے نظائر و امثال سے ماخوذ نہیں، یہ حقیقت ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل ان علماء بنی ہاشم کے یہاں اپنا علمی مطلوب پا سکتے تو اس میں انتہائی دلچسپی لیتے۔

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہاشمی علماء گنجینۂ معلومات تھے، ان کے مقابلہ میں دیگر علماء ان علوم سے بے بہرہ تھے، البتہ وہ

اپنے علم کا اظہار نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: پوشیدہ علم سے کیا فائدہ؟ ۔جس علم کا اظہار نہ کیا جائے وہ اس خزانہ کی مانند ہے جسے خرچ نہ کیا جائے۔ جو شخص اپنے علم کا اظہار نہیں کرتا، لوگ اس کی پیروی کیوں کر کریں گے؟ پوشیدہ علم (شیعہ کے) امام معدوم کی طرح بیکار ہے اور دونوں سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

[اشکال]: اگر شیعہ کہیں کہ: ''ہاشمی علماء اپنے علوم کا کشف و اظہار صرف خواص پر کرتے تھے۔''

[جواب]: تو ہم کہیں گے کہ: ''یہ ان پر بہتان ہے۔جعفر بن محمد رحمہ اللہ بے نظیر عالم تھے اور ان کے بعد ایسا شخص پیدا نہیں ہوا۔ تاہم وہ تحصیل علم میں امام مالک، ابن عیینہ، شعبہ، ثوری، ابن جریج، یحییٰ بن سعید وغیرہ علماء و مشاہیر رحمہم اللہ کے مرہون احسان تھے۔ جو شخص اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ ہاشمی علماء مذکورہ ائمہ سے علم کو پوشیدہ رکھتے اور مجہول الحال لوگوں پر اس کا اظہار کرتے تھے؛ وہ ان اکابر کے بارے میں بدظنی کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ ائمہ مذکور ین میں اللہ و رسول کی محبت، جذبہ تبلیغ دین، احباب رسول سے محبت اور اعداء رسول سے بغض و عداوت کا جو جذبہ پایا جاتا تھا، شیعہ کے شیوخ میں اس کا عشر عشیر بھی موجود نہیں۔ جو شخص ائمہ اہل سنت اور شیعہ کے ائمہ و شیوخ دونوں سے آشنا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ ہر زمانہ کے شیوخ اہل سنت و روافض میں تقابل کر کے اس حقیقت کو دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ [1] مثال کے طور پر اسی شیعہ مصنف (ابن المطہر جس کی تردید میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنة تصنیف فرمائی) کو لیجیے۔ [2]

شیعہ کے نزدیک یہ یگانہ روزگار عالم تھا، بعض شیعہ کا قول ہے کہ علوم اسلامیہ کے اعتبار سے بلاد مشرق میں یہ عدیم

---

[1] الفاظ کے لغوی و اصطلاحی مفہوم میں اہل سنت اور شیعہ کے یہاں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ فریقین کے مابین اختلافات کی ایک زبردست خلیج حائل ہے، شیعہ جب حب الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں تو یہ محبت وجوب علی اللہ کے عقیدہ سے مقید ہوتی ہے، جب شیعہ حب رسول کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں تو اس کے پہلو بہ پہلو وہ عصمت ائمہ کا دعویٰ کر کے شریعت کا مصدر و مأخذ ہونے میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ٹھہراتے ہیں، جس سے حب رسول میں بلاشبہ خلل اندازی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اکابر شیعہ کے اس فعل پر اس لیے رضا مند نہیں کہ مصدر شریعت ہونے کے اعتبار سے رسول اللہ کا شریک ہونا ایک غیر شرعی بات ہے، وہ اس سے اظہار براءت کرتے اور اسے ایک افترا قرار دیتے ہیں۔
تحفظ دین سے متعلق بھی شیعہ کا دعویٰ ایک انوکھی چیز ہے، دین کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے وہ کتاب و سنت سے بالکل الگ ایک جداگانہ نوعیت کی چیز ہے اس کا انحصار ان روایات کاذبہ کی تشہیر و ترویج پر ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت سے منقول ہیں، اس طرح حب و بغض کا مفہوم بھی اہل سنت اور شیعہ کے یہاں یکساں نہیں تاکہ دونوں میں تقابل کر کے اہل سنت کی موالات کو درست اور شیعہ کی موالات کو ناروا قرار دیا جا سکے ۔اس میں شبہ نہیں کہ اہل سنت امت محمدی کے تمام صالحین سے یکساں طور پر محبت رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ آل محمد کے صالحین یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور آپکی ازواج مطہرات ان میں شامل ہیں۔ بخلاف ازیں شیعہ عصمت کے دعویٰ کی اساس پر بعض اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، حالانکہ خود اہل بیت عصمت کے دعویٰ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، شیعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر رقیہ اور ام کلثوم کے وجود تک میں صرف اس لیے شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ان کے دشمن ہیں، چند افراد کو چھوڑ کر شیعہ اصحاب رسول کے جانی دشمن ہیں، خلاصہ یہ کہ اہل سنت اور شیعہ کا اختلاف مقدار محبت میں نہیں، بلکہ محبت کے لغوی، اصطلاحی اور دینی مدلول و مفہوم میں ہے، علی ہذا القیاس فہم قرآن، روایان حدیث کی روایات صحیحہ کا قبول و عدم قبول اور جھوٹے راویوں کی بیان کردہ روایات کاذبہ سے عدم احتجاج، یہ جملہ مسائل فریقین کے مابین متنازع فیہا ہیں۔

[2] اہل سنت و شیعہ کے مابین فرق و امتیاز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل سنت کے نزدیک دینی حقائق تبدیل نہیں ہوتے، بلکہ ہر دور میں یکساں رہتے ہیں، وہ حدیث صحیح جو عہد صحابہ و تابعین میں رسول اللہ سے روایت کی گئی ہو، وہ اہل سنت اور ان کے ائمہ کے نزدیک ایک ابدی حجت اور واجب الاتباع دلیل کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے عین برخلاف شیعہ کی رائے میں دین کا تصور ہر عصر و عہد میں بدلتا رہتا ہے، ہم کئی دفعہ بیان کر چکے ہیں کہ شیعہ عالم المامقانی نے اپنی کتاب ''تنقیح المقال'' میں جہاں غالی شیعہ علماء کی سیرت و سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔جن کی روایات [......حاشیہ جاری ہے......]

المثال فاضل تھا۔ [1] بایں ہمہ اس کے رشحات قلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کائنات ﷺ کے احوال واقوال واعمال میں اس کرۂ ارضی پر شاید ہی کوئی دوسرا آدمی اس سے زیادہ جاہل ہو، وہ ایسی جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے، جن کا جھوٹا ہونا مختلف وجوہ واسباب سے ظاہر ہوتا ہے، دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ اگر وہ دانستہ جھوٹی روایات بیان کرتا ہے تو اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''جو میری طرف سے کوئی حدیث بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ جھوٹی ہے تو وہ جھوٹوں میں سے ہے۔'' [2]

۲۔ اور اگر اس کے جھوٹا ہونے سے آگاہ نہیں تو وہ رسول اللہ کے بارے میں اجہل الناس ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

فَإِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِيْ فَتِلْكَ مُصِيْبَةٌ ۔۔۔ وَإِنْ كُنْتَ تَدْرِيْ فَالْمُصِيْبَةُ أَعْظَمُ

''اگر تو جانتا نہیں تو یہ مصیبت کا باعث ہے اور اگر جانتا ہے تو یہ اس سے بھی بڑی آفت ہے۔''

شیعہ ناظم کے جو اشعار ازیں تحریر کیے جا چکے ہیں ان کے جواب میں مندرجہ ذیل اشعار کہے گئے ہیں:

إِذَا شِئْتَ أَنْ تَرْضٰى لِنَفْسِكَ مَذْهَبًا ۔۔۔ تَنَالُ بِهِ الزُّلْفٰى وَتَنْجُوْ مِنَ النَّارِ

فَدِنْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَالسُّنَّةِ الَّتِيْ ۔۔۔ أَتَتْ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مِنْ نَقْلِ أَخْيَارِ

فَدَعْ عَنْكَ دَاعِيَ الرَّفْضِ وَالْبِدْعِ الَّتِيْ ۔۔۔ يَقُوْدُكَ دَاعِيْهَا إِلَى النَّارِ وَالْعَارِ

وَسِرْ خَلْفَ أَصْحَابِ الرَّسُوْلِ فَإِنَّهُمْ ۔۔۔ نُجُوْمُ هُدًى فِيْ ضَوْئِهَا يَهْتَدِيْ السَّارِيْ

وَعُجْ عَنْ طَرِيْقِ الرَّفْضِ فَهُوَ مُؤَسَّسٌ ۔۔۔ عَلَى الْكُفْرِ تَأْسِيْسًا عَلٰى جُرُفٍ هَارِ

هُمَا خُطَّتَانِ إِمَّا هُدًى وَسَعَادَةٌ ۔۔۔ وَإِمَّا شَقَاءٌ مَعَ ضَلَالَةِ كُفَّارِ

فَأَيُّ فَرِيْقَيْنَا أَحَقُّ بِأَمْنِهِ ۔۔۔ وَأَهْدٰى سَبِيْلًا عِنْدَ مَا يَحْكُمُ الْبَارِيْ

شیعہ علماء کے نزدیک ان کے غلو کی وجہ سے ناقابل قبول تصور کی جاتی تھیں...... وہاں یہ بھی بیان کیا ہے کہ ازمنہ سابقہ میں جو باتیں مبالغہ پر محمول کی جاتی تھیں اب وہ ضروریات مذہب میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ بات شیعہ مذکور نے رافضی جرح و تعدیل کی ایک بہت بڑی اور جدید ترین کتاب میں تحریر کی ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اب شیعہ مذہب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں جو بات غلو ہونے کی بنا پر ناقابل قبول تھی، اب ضروریات مذہب میں تصور کی جانے لگی ہے۔

خلاصہ کلام! شیعہ کا موجودہ مذہب وہ نہیں جو ایران کے سلاطین صفویہ سے پہلے تھا۔ اسی طرح صفویہ سے پہلے جو مذہب تھا، وہ شیعہ مصنف ابن المطہر سے پہلے نہ تھا اور ابن المطہر سے پہلے کا مذہب خاندان بنی بویہ سے قبل موجود نہ تھا، علی ہذا القیاس بنی بویہ سے پہلے کا شیعہ مذہب وہ نہ تھا جو شیطان الطاق سے پہلے تھا اور شیطان الطاق سے پہلے کا مذہب حضرت علی، حسن و حسین اور علی بن حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ کے مذہب سے قطعی مختلف تھا۔

[1] چنانچہ شیعہ جب ''علامہ'' کا لفظ علی الاطلاق بولتے ہیں تو اس سے مراد ابن المطہر لیتے ہیں۔ شیعہ ابن المطہر کو آیت اللہ فی العالمین، نور اللہ، استاذ الخلائق، مرکز اسلام وغیرہ القاب سے یاد کرتے اور عجمی طرز و انداز کی یہ مبالغہ آمیزی کرتے ہوئے اللہ سے نہیں ڈرتے۔ کتاب ہذا کا قاری اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ ابن المطہر حد درجہ جاہل اور فریب کار شخص ہے اور اس کا دل رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال کے حامل صحابہ و تابعین کی عداوت سے لبریز ہے، مقام حیرت ہے کہ کرۂ ارضی میں اللہ کے آخری پیغام کو پھیلانے والے صحابہ کے بارے میں شیعہ جس دریدہ دہنی کا ارتکاب کرتے ہیں شائد کوئی غیر مسلم مستشرق بلکہ عیسائی مشنری بھی ایسا نہ کر سکتے۔

[2] صحیح مسلم۔ المقدمة باب وجوب الروایة عن الثقات (حدیث: .....)۔

اَمَنْ سَبَّ اَصْحَابَ الرَّسُوْلِ وَخَالَفَ الْكِتَابَ وَلَمْ يَعْبَأْ بِثَابِتِ اَخْبَارِ

اَمِ الْمُقْتَدِیْ بِالْوَحْیِ یَسْلُکُ مَنْهَجَ الصَّحَابَةِ مَعَ حُبِّ الْقَرَابَةِ الْاَطْهَارِ

۱۔ جب تو اپنے لیے ایسا مذہب پسند کرنا چاہے جس سے اللہ کا قرب حاصل کر سکے اور دوزخ سے نجات پائے۔

۲۔ تو کتاب اللہ تعالیٰ اوران احادیث نبویہ کی اطاعت کیجئے جو نیک لوگوں کی روایت سے ہم تک پہنچیں۔

۳۔ رفض و بدعات کے داعی کو چھوڑ یے کہ یہ شخص ناروعار کی جانب لے جاتا ہے۔

۴۔ اصحاب رسول کے نقش قدم پر چل اس لیے کہ وہ ہدایت کے ستارے ہیں جن کی روشنی میں چل کر سالک راہ ہدایت پاسکتا ہے۔

۵۔ رفض اور تشیع کی راہ سے منحرف ہو جا۔ اس لیے کہ اس کی اساس کفر اور ایک گر پڑنے والے گڑھے پر رکھی گئی ہے۔

۶۔ (دنیا میں) دو ہی باتیں ہیں یا تو ہدایت وسعادت ہے اور یا ضلالت کفار کے ساتھ ملی ہوئی بدبختی ہے۔

۷۔ ذرا غور فرمایئے اہل سنت وشیعہ کے دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق اس وقت امن کا زیادہ حق دار اور راہ رست پر ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرمائیں گے۔

۸۔ کیا وہ شخص (حق پر ہوگا) جو اصحاب رسول کو گالیاں بکے، کتاب اللہ تعالیٰ کی خلاف ورزی کرے اور احادیث صحیحہ کی پرواہ نہ کرے۔

۹۔ یا وہ شخص (راہ حق کا سالک ہے) جو وحی کی پیروی کرتا، راہ صحابہ پر گامزن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اہل بیت اطہار کے ساتھ بھی محبت رکھتا ہے۔

❁❁❁❁

فصل:

شیعہ کا الزام: اہل سنت اور دنیا پرستی

[اشکال]: رافضی نے لکھا ہے: ,,اور میرا خیال نہیں ہے کہ آسودہ حال لوگوں میں سے کوئی ایسا ہوگا جسے مذاہب کے بارے میں اطلاع ہو' اور اس نے باطنی طور پر امامیہ مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کیا ہو۔ بھلے وہ ظاہر میں دنیا طلبی کے لیے کسی دوسرے مذہب کی طرف ہی مائل کیوں نہ رہا ہو۔ اس لیے کہ ان کے لیے مدارس اور رباط کا قیام عمل میں لایا گیا؛ اوقاف مقرر کیے گئے تاکہ بنی عباس کی دعوت باقی رہے' اور عام لوگ ان کی امامت کا اعتقاد رکھتے ہوئے ان کے دست و بازو کو مضبوط کریں۔'' [انتهى كلام الرافضي]

[جواب] یہ بات صرف وہی انسان کہہ سکتا ہے جو پرلے درجے کا جاہل انسان ہو؛ اور اسے اہل سنت والجماعت کے احوال کی معرفت بالکل نہ ہو۔ اور وہ لوگوں میں سب سے بڑا جھوٹا اور ضدی بھی ہو۔ اس کلام کا باطل ہونا کئی وجوہات کی بنا پر صاف ظاہر ہے:

۱۔ اس سے قبل کے اس قسم کے مدارس بنائے جائیں اہل سنت والجماعت اس سے زیادہ طاقتور اور غالب تھے۔ بغداد میں مدارس کا قیام پانچویں صدی ہجری میں عمل میں آیا۔ اور تقریباً چار سو ساٹھ ہجری کے قریب قریب مدارس نظامیہ قائم ہوئے۔ یہ ائمہ اربعہ میں سے صرف ایک امام کے مذہب پر تھے۔ جب کہ اس وقت تک زمین کے مشرق و مغرب میں مذاہب اربعہ پھیل چکے تھے۔ بلاد مغرب میں مالکیہ موجود تھے؛ مگر ان کے ہاں کوئی عباسی نہیں تھا۔

۲۔ بنو عباس کی حکومت سے پہلے اہل سنت والجماعت زیادہ غالب اور قوی تھے۔ اس لیے کہ بنی عباس کی حکومت میں بہت سارے شیعہ اور دوسرے اہل بدعت بھی داخل ہوگئے تھے۔

۳۔ اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ خلافت بنو عباس کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کوئی علوی یا اموی یا کوئی دوسرا قریشی خاندان حاکم بن جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

۴۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ علماء اہل سنت جیسا کہ امام احمد بن حنبل اور امام مالک رحمہما اللہ وہ لوگ ہیں جو بادشاہوں کا لحاظ کرنے والے [یا ان کے سامنے دب جانے والے] اور ان کی قربت اختیار کرنے والے ہرگز نہ تھے۔

۵۔ پھر یہ کہ اہل سنت والجماعت خلفاء راشدین کی تعظیم بجالاتے ہیں' اور ان میں سے کوئی ایک بھی بنو عباس میں سے نہ تھا۔

۶۔ نیز ہر عاقل انسان یہ بات بھی جانتا ہے کہ مشہور مسلمان علماء کرام رحمہم اللہ میں سے کوئی ایک بھی رافضی نہ تھا۔ بلکہ ان تمام کا روافض کے جاہل اور گمراہ ہونے پر اتفاق تھا۔ ان کی کتابیں اس بات پر بہترین شاہد موجود ہیں۔ یہ تمام گروہوں کی کتابیں پکار پکار کر اس موقف پر اپنی گواہی پیش کر رہی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی ایک کو بھی روافض اور ان کی جہالت و گمراہی کا ذکر کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ روافض کی گمراہی اور جہالت کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں؛ جس سے اضطراری طور پر معلوم ہوسکتا ہے کہ ان سب علماء کرام کا اعتقاد ہے کہ شیعہ سب سے بڑے جاہل اور گمراہ لوگ ہیں؛ اور ملت کے تمام گروہوں میں سے مہدی سے سب سے دور یہی لوگ ہیں۔ اور ایسا ہوتا بھی کیوں نہیں؛ جب کہ امامیہ روافض کے ہاں ہر بڑی بدعت اور برائی پائی جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ لوگ جہمیہ قدریہ رافضیہ ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک گروہ کی مذمت میں سلف صالحین سے جو کلام وارد ہے' اس کا صحیح علم صرف اللہ تعالیٰ کو

ہے۔اور کتابیں ان باتوں سے بھری پڑی ہیں۔جیسا کہ کتب حدیث و آثار فقہ و تفسیر ؛ اصول و فروع اور دوسری کتابیں۔ یہ تین گروہ باقی کے تمام فرقوں جیسے مرجئہ اور حروریہ کی نسبت سب سے بڑے گمراہ اور بدکردار اور بدعتی ہیں۔

۷۔ یہ بات اللہ جانتا ہے کہ میرے کثرت مطالعہ اور تلاش ؛لوگوں کے اقوال و مذاہب کی معرفت کے باوجود مجھے کسی ایک بھی ایسے انسان کے بارے میں علم نہیں ہوسکا جس کے سچے ہونے کا شہرہ لوگوں میں ہو؛ اور وہ امامیہ مذہب کا ادنیٰ سا بھی اہتمام کرتا ہو چہ جائے کہ وہ باطن میں اس کا عقیدہ رکھتا ہو[اور اسے صحیح سمجھتا ہو]۔

۸۔ حسن بن صالح بن حي پر زیدی ہونے کا الزام لگایا گیا؛ حالانکہ وہ نیک' صالح ؛ عالم وفقیہ اور زاہد انسان تھا۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ پر یہ الزام جھوٹ ہے۔ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ منقول نہیں ہے کہ انہوں نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر طعن و تشنیع کی ہو؛ چہ جائے کہ وہ ان کی امامت میں شک کریں۔

۹۔ اوائل شیعہ کے ایک گروہ پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔ان میں سے کسی ایک پر بھی یہ تہمت نہیں ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر ترجیح دیتے ہوں۔ بلکہ عام طور پر اوائل شیعہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے؛ اور آپ پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ترجیح دیا کرتے تھے۔لیکن ان میں ایسا گروہ ضرور موجود تھا جو آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

۱۰۔ اس فتنہ کے دور میں لوگوں کے دو گروہ ہو گئے تھے۔عثمانی شیعہ اور علوی شیعہ۔اور ایسا ہرگز نہیں تھا کہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر شریک جنگ ہو؛ وہ آپ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر فضیلت بھی دیتا ہو۔جیسا کہ تمام اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

الزام :اہل سنت والجماعت باطن میں شیعہ ؛اور اس پر رد:

رافضی نے کہا ہے :''اور ہم نے اکثر اوقات ان لوگوں کو دیکھا ہے جو باطن میں امامیہ مذہب رکھتے ہیں۔مگر وہ دنیا کی محبت اور مقام و مرتبہ کی طلب کی وجہ سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ میں نے حنبلی مذہب کے بعض ائمہ کو دیکھا ہے جو یہ کہتے تھے :''ہم امامیہ کے مذہب پر ہیں ۔ میں نے پوچھا:'' تو پھر آپ حنبلی مذہب پر تدریس کیوں کر رہے ہیں ؟ تو اس نے کہا:'' تمہارے مذہب میں مشاہراہ اور معاوضہ نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کا ایک بڑا شافعی مدرس تھا؛ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ: میری تجہیز و تکفین شیعہ کے سپرد کی جائے۔اور اسے سیدنا کاظم کی درگاہ میں دفن کیا جائے۔اور اس نے اس بات پر گواہ بھی متعین کیے کہ وہ امامیہ کے مذہب پر تھا۔''[انتهىٰ كلام الرافضي]

جواب : رافضی کا یہ کہنا کہ:''ہم نے اکثر دیکھا ہے'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ہاں ایسے ضرور ہوا ہوگا کہ مذاہب اربعہ کی طرف منسوب لوگوں میں سے کچھ باطن میں رافضی عقیدہ رکھتے ہوں ۔جیسا کہ اسلام کا اظہار کرنے والوں میں منافقین بھی پائے جاتے ہیں ۔اس لیے کہ رافضی بھی منافقین کی جنس میں سے ہیں ُاور جب انہیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف ظاہر کریں تو وہ اپنے عقیدہ کو چھپا لیتے ہیں ۔جیسا کہ منافقین کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ وہ اپنے کفر کے برعکس ظاہر کریں۔اور یہ بات صرف ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی احوال اور شروع کے دور میں مسلمانوں کے حالات سے جاہل ہوں۔ جب کہ وہ لوگ جنہیں صحیح معنوں میں اسلام کے ابتدائی حالات کا علم ہو؛ اور ظاہری و باطنی طور پر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا اقرار بھی کرتا ہو' اس کا باطن میں رافضی ہونا انتہائی مشکل بات

ہے۔اور باطن میں رافضی ہونے کا تصور بھی صرف اس انسان کے متعلق کیا جاسکتا ہے جو زندیق یا منافق ہو یا پھر اسلام کے احوال انتہائی درجہ کا لاعلم اور جاہل ہو۔

❀ جس امام و مدرس کے بارے میں حکایت نقل کی گئی ہے۔اس کے بارے میں ہمیں بعض اہل بغداد علماء نے اطلاع دی ہے کہ یہ بات محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔اگر رافضی ان بعض مدرسین سے اپنی بات نقل کرنے میں سچا بھی ہوتو بھی اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کی طرف خود کو منسوب کرنے والا کوئی زندیق دائرہ اسلام سے خارج انسان ہو؛ مگر پھر بھی اس کا رافضی ہونا محال لگتا ہے۔اور جس کسی نے بعض لوگوں کے باطن میں زندیق ہونے کی وجہ سے یہ کہہ دیا کہ تمام مسلمان باطن زندیق ہیں؛ وہ پرلے درجے کا جاہل ترین انسان ہے۔اور ایسے ہی جو کوئی بعض لوگوں کے باطن میں رافضی ہونے کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو باطن میں رافضی سمجھتا ہو۔

اگر یہ رافضی مصنف اس مدرس کا نام بھی لے لیتا تو ہم ایسی تحقیق کے ساتھ سب بات بیان کردیتے جس سے حقیقت حال کھل کر سامنے آجاتی اور رافضی کی جہالت واضح ہوجاتی۔

❀ اور کیا تاتاریوں اور کافروں کے ملکوں میں یا نئے مسلمانوں ہونے والوں میں محض کسی انسان کے منصب تدریس پر فائز ہونے سے؛ کسی انسان کو وہ مقام مل جاتا ہے جو اس کی فضیلت اور دیانت کی دلیل سمجھا جائے۔ یہاں تک کہ اس کی بات کو بطور عقیدہ دلیل میں پیش کیا جائے۔حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اکثر اوقات ظالم لوگوں کے ہاں تدریس پر مامور لوگ خود بھی بڑے ظالم اور جاہل ہوتے ہیں۔

❀ علماء کی فضیلت پر دلالت کرنے والی چیز لوگوں کے مابین مشتہر ان کے علوم ہوتے ہیں یا پھر جو چیز ان کے کلام اور تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔تو کیا امام شافعی' امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ رافضی تھا؟۔ بلکہ یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ ان میں سے ہر ایک انسان بہت سختی کے ساتھ رافضیت کا رد کرنیوالا تھا۔ان ائمہ کے متبعین میں سے ایک گروہ پر اعتزال کی ایک قسم کی طرف مائل ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔مگر ان میں سے کسی ایک پر بھی رافضی ہونے کی تہمت ہرگز نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضی اہل علم کی راہ سے بہت ہی دور ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ معتزلہ کے بعض عقائد و اقوال میں بہت بڑی بدعات پائی جاتی ہیں' مگر پھر بھی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں علم اور دین داری پائی جاتی ہے۔اور یہ لوگ شرعی اور عقلی دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔اور اسلام سے دور رہنے والوں فرقوں ملاحدہ اور دوسرے لوگوں پر رد کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے رافضہ پر اس طرح سے رد کیا کہ بہت سارے لوگ افرادی اور جماعت کی صورت میں ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔اگرچہ ان میں سے کچھ اپنے آپ کو ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے بعض کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ جیسا کہ امام ابی حنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ۔بخلاف رافضہ کے۔ یہ منقول اور معقول میں تمام فرقوں سے بڑے جاہل ہیں۔اور وہ لوگ بھی ان ہی میں سے ہیں جو علم اور دین کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہوگئے۔ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑا جاہل ہی ہوسکتا ہے؛ یا پھر زندیق اور ملحد ہوسکتا ہے۔

❀❀❀❀

فصل:

[امامیہ کی اتباع کے متعلق خوش فہمی]

❀[تہمت]: رافضی مصنف نے کہا ہے: ''پانچویں وجہ: ''امامیہ مذہب کی اتباع واجب ہونے کے بیان میں۔''

اس لیے کہ انہوں نے مخالفین کے برعکس کبھی بھی ناحق تعصب کا ساتھ نہیں دیا۔ غزالی اور ماوردی؛ جو کہ شافعی مذہب کے دو امام ہیں؛ نے ذکر کیا ہے کہ قبروں کی سطح برابر کرنا مشروع ہے۔ مگر جب رافضہ نے اسے اپنا شعار بنالیا تو ہم نے یہ کام چھوڑ دیا۔ اور زمخشری جو کہ حنفیہ کے امام ہیں؛ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىٕكَتُهٗ﴾ [الاحزاب ۴۳]

''وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے۔''

''اس آیت کی روشنی میں مسلمانوں میں سے کسی ایک پر رحمتیں بھیجنا جائز ہے۔ لیکن جب رافضیوں نے اپنے ائمہ کے متعلق اسے شعار بنالیا تو ہم نے اس سے منع کرنا شروع کر دیا۔ حنفیہ میں سے ہدایہ کے مصنف نے کہا ہے: ''مشروع یہ ہے کہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنی جائے؛ لیکن جب رافضیوں نے اسے اپنی پہچان بنالیا تو ہم نے بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا شروع کر دیا۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ پس اب یہ دیکھنا چاہیے کہ شریعت کو کون بدلتا ہے؟۔ اور کون ان احکام میں تبدیلی کرتا ہے جن کے بارے میں شریعت میں نبی کریم ﷺ سے نصوص منقول ہیں۔ اور ایک متعین قوم کی ضد میں آ کر اس کے خلاف کرتا ہے؟؛ تو پھر کیا ان لوگوں کی اتباع کرنا اور ان کے اقوال کی طرف رجوع کرنا جائز ہے؟۔'' [انتہی کلام الرافضی]۔

✿ [جواب]: اس کا جواب دو طرح سے دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات: اس رافضی مصنف نے جو الزام لگائے ہیں؛ حقیقت میں خود روافض ان کے زیادہ اہل ہیں۔

دوسری بات: ائمہ اہل سنت والجماعت عنداللہ ان الزامات سے بالکل بری ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے: ہم نہیں جانتے کہ کوئی فرقہ رافضیوں سے بڑھ کر باطل پر تعصب کرنے والا ہو۔ یہاں تک کہ باقی تمام فرقوں میں رافضی اپنے موافق کی خاطر جھوٹی گواہی دینے [اور جھوٹی قسم اٹھانے] میں مشہور و معروف ہیں۔ تعصب میں جھوٹ سے بڑھ کر بڑا گناہ کوئی نہیں ہوتا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ:

۱۔ انہوں نے تعصب میں آ کر تمام میراث کا وارث صرف بیٹی کو ٹھہرایا ہے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وارث صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی تھیں؛ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔

۲۔ شیعہ میں بعض لوگ اونٹ کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ جمل میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں۔ اس طرح یہ لوگ کتاب اللہ؛ سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع صحابہ کرام و اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین کی مخالفت کے مرتکب ہوئے۔ یہ ایسی بات ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ اونٹ جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سوار ہوئی تھیں وہ تو کبھی کا مر چکا۔ اگر بالفرض یہ کہہ لیا جائے کہ وہ اونٹ ابھی تک زندہ ہے؛ تو پھر بھی جب

کفار کے اونٹ پر سوار ہونے کی وجہ سے اس کی حرمت واجب نہیں ہوتی؛ اور کفار برابر اونٹ کی سواری کرتے چلے آرہے ہیں اور مسلمانوں کو ان سے یہ اونٹ مال غنیمت میں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا گوشت ان کے لیے حلال ہوتا ہے۔تو پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ پر سوار ہونے میں وہ کونسی بات مضمر ہے جس کی وجہ سے اونٹ کا گوشت حرام قرار دیا جاتا ہے؟۔اس کی انتہاء تو یہی ہوسکتی ہے کہ جن بعض لوگوں کو یہ رافضی کافر کہتے ہیں ؛ وہ اونٹ پر سوار ہوئے تھے۔حالانکہ رافضی ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگاتے ہیں' اس میں وہ جھوٹے اور بہتان تراش ہیں۔

[رافضی تعصب کی مثالیں]:

❀ ان کے تعصب کی حد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی زبان پر ''دس'' کا لفظ نہیں لاتے۔بلکہ یوں کہتے ہیں: نو اور ایک۔اور جب ستون وغیرہ بناتے ہیں تو خصوصی خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تعداد دس نہ بنے۔ایسے ہی بہت سارے دیگر امور میں بھی اس چیز کا خصوصی خیال رکھتے ہیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر دس کا لفظ ذکر کیا ہے۔[بلکہ بہت سارے مواقع پر اللہ تعالیٰ نے لفظ ''دس'' کے مسمیٰ کی تعریف کی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ حج تمتع کے بارے میں فرماتے ہیں]:

﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ [البقرة ۱۹۶]

''تو تین روزے تو ایام حج میں رکھے اور سات گھر واپس پہنچ کر، یہ کل دس روزے ہو جائیں گے۔''

اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ [البقرة ۲۳۴]

''تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ [الأعراف ۱۴۲]

''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب و روز کے لیے (کوہِ سینا پر) طلب کیا اور بعد میں دس دن کا اور اضافہ کر دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَالْفَجْرِ ❀ وَلَيَالٍ عَشْرٍ﴾ [الفجر ۱۔۲]

اور قسم ہے فجر کے وقت کی' اور دس راتوں کی۔''

اللہ تعالیٰ نے لفظ ''دس'' کے مسمیٰ کا قابل مدح و تعریف مواقع پر کیا ہے۔جب کہ لفظ ''نو'' کے مسمی کا ذکر قابل مذمت موقع پر کیا ہے۔جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں؛

﴿وَ كَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ﴾ [النمل ۴۸]

''اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔''

لیلۃ القدر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''اسے رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو۔''[1]

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک کی آخری دس راتیں اعتکاف کیا کرتے تھے۔یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی۔'' [البخاري (۳/ ۴۷) مسلم (۲/ ۸۳۰)]۔

اور صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں کے بارے میں] ارشاد فرمایا:

[1] البخاري كتاب الصوم' باب(۷۲)؛ مسلم (۲/ ۸۲۳)۔

''اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی بھی عمل ان دنوں کے عمل سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں۔''❶

جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس عدد ''دس'' کے ساتھ کلام کیا ہے' اور اس کے ساتھ بہت سلسلے محمود احکام شرعیہ کو معلق کیا ہے تو پھر ان لوگوں کا لفظ ''دس'' سے عشرہ مبشرہ کی اصطلاح کی وجہ سے نفرت رکھنا؛ کیونکہ ان سے یہ لوگ بغض رکھتے ہیں؛ انتہائی جہالت اور تعصب کی نشانی ہے۔

پھر ان لوگوں کا یوں کہنا: ''نو اور ایک'' عبارت کی طوالت کے ساتھ دس کا یہی معنی ہے۔ جب نو یا دس یا سات کا لفظ اس عدد کے ساتھ معدود ہر چیز پر واقع ہوتا ہے خواہ اس کا تعلق انسانوں سے ہو یا پھر چو پاؤں سے یا پھر لباس اور درہم و دینار سے۔ ان میں سے بعض معدودات محمود ہوتے ہیں اور بعض مذموم۔ پس ان جاہلوں کا گنتی کے یہ اعداد اپنی زبان پر لانے سے نفرت کرنا بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ لوگ ان سے بھی نفرت کرتے ہیں جن کے نام ان لوگوں کے ہم نام ہوں جن سے یہ بغض رکھتے ہوں۔ جیسا کہ یہ لوگ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں سے بھی نفرت کرتے ہیں جن کے نام ان صحابہ کرام کے اسماء پر رکھے گئے ہوں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے ہم نام لوگ کفار میں بھی موجود تھے۔ جیسا کہ ولید بن ولید۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نماز میں دعائے قنوت میں یوں دعاء کیا کرتے تھے:

((اللهم أنجِ الولِيد بن الولِيدِ وسلمة بن هِشام [وعياش بن أبِي ربيع] والمستضعفِين مِن المؤمِنِين .)) [صحیح بخاری: ح ۷۷۰]

''اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیع اور کمزور مسلمانوں کو کفار سے نجات دے۔''

بیٹا ولید مومن اور متقی انسان تھا جب کہ اس کا باپ ولید کافر اور بد بخت ترین انسان تھا۔ ایسے کفار قریش میں عقبہ بن ابی معیط بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((رأيت كأني في دار عقبة بن رافع وأتينا برطب من رطب ابن طاب. فأولت أن الرفعة لنا في الدنيا والعاقبة في الآخرة وأن ديننا قد طاب .)) [سنن ابوداؤد: ۱۶۱۹]

''رات میں نے دیکھا گویا ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں۔ اور ہمارے پاس ابن طاب کی تازہ تر کھجوروں میں سے رطب لائی گئی۔ میں نے اس کی یہ تعبیر و تاویل کی کہ دنیا کی بلندی و رفعت ہمارے لیے ہے: اور آخرت میں عاقبت اور عمدہ انجام بھی ہمارے لیے ہیں اور بیشک ہمارا دین پاکیزہ اور عمدہ ہوگیا۔''

رسول اللہ ﷺ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔ اور کفار میں علی بن امیہ بن خلف بھی تھا جو کہ بدر کے دن اپنے والد کے ساتھ حالت کفر میں قتل ہوا۔

صحابہ کرام میں سے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کہ شاعرِ نبی ﷺ تھے۔ اور کعب بن اشرف کافر نے رسول اللہ ﷺ کو اتنی اذیت پہنچائی کہ آپ نے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو اسے قتل کرنے کے لیے بھیجا۔

صحابہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔ جن سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

❶ البخاري ۲/ ۲۰۔ الترمذي ۲/ ۱۲۹۔

''بیشک اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں یہ سورت پڑھ کر سناؤں: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [البينه: ١]
مراد تبلیغ کے لیے پڑھنا تھا تعلیم کے لیے نہیں۔ جب کہ مشرکین میں بھی ابی بن خلف نامی انسان تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے احد کے دن اپنے ہاتھ سے قتل کیا؛ اس کے علاوہ کسی کو آپ نے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا؛ اور فرمایا:
''بروز قیامت سب سے زیادہ سخت عذاب اس انسان کو ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو یا پھر اسے کسی نبی نے قتل کیا ہو۔'' [مسند أحمد٥/ ٣٣٢؛ تحقيق أحمد شاكر]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹوں کے نام ابوبکر و عمر رکھے۔

خلاصۂ کلام! اسم علم کافر اور مسلمان کے مابین مشترک ہوتا ہے۔ جیسا کہ یہود و نصاری بھی ابراہیم' موسیٰ' اسحق اور یعقوب نام رکھتے ہیں۔ اور مسلمان بھی یہ نام رکھتے ہیں۔ کافر کا کوئی نام رکھ لینے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے اس نام کو سرے سے ترک کر دینا واجب ہوتا ہو۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ صحابہ کرام کافر تھے - العیاذ باللہ - جیسا کہ یہ لعنتی بہتان تراش بکواس بکتے ہیں؛ تو پھر بھی ان اسماء میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ان ناموں کا ترک کرنا واجب ہوتا ہو' بلکہ یہ جہالت اور تعصب کی انتہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ ان اسماء سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کا مسمیٰ اہل سنت ہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: یہ لوگ انسان کا مذہب جانتے ہوئے بھی اسے اس نام سے مخاطب نہیں کرتے۔ بلکہ اسے کوئی دوسرا نام دیتے ہیں۔ ایسا ان اسماء سے انتہائی نفرت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ان کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ جب کسی ایسے انسان کو دیکھتے ہیں جس کا نام علی' یا جعفر یا حسن' یا حسین ہو تو اس کی عزت و احترام میں پیش پیش رہتے ہیں۔ حالانکہ ایسا انسان کبھی تو بالکل فاسق و فاجر ہوتا ہے' اور کبھی وہ اہل سنت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اہل سنت والجماعت یہ نام بھی رکھتے ہیں۔ ان کی یہ تمام تر حرکات انتہائی تعصب اور جہالت کی وجہ سے ہیں۔

❀ ان کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ رافضی تمام بنو امیہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ ایسے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

حالانکہ بنو امیہ میں بہت سارے نیکوکار صالحین بھی تھے جو کہ فتنہ کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ بنو امیہ وہ لوگ تھے جن میں سے نبی کریم ﷺ کے عمال سب سے زیادہ تھے۔ جب سرور کائنات ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو:

۱۔ عتاب بن اُسید بن ابو العاص بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ کو حاکم مکہ مقرر کیا؛ جو کہ روئے زمین کا سب سے محترم گوشہ ہے۔[1]

۲۔ خالد بن سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ کو صنعاء یمن اور بنی مذحج سے صدقات وصول کرنے پر عامل مقرر کیا تھا؛ آپ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک اسی منصب پر فائز رہے۔

۳۔ اس کے دونوں بھائیوں حضرت ابان بن سعید ابن العاص رضی اللہ عنہ اور سعید بن سعید رضی اللہ عنہ کو دوسرے اعمال [تیماء؛ خیبر؛ اور عرینہ کی بستیوں] پر عامل مقرر فرمایا تھا۔

---

[1] سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان(ح:٦٣٣)، سنن ابن ماجة۔ کتاب الاذان۔ باب الترجیع فی الاذان(ح:٧٠٨)، و کتاب التجارات، باب النھی عن بیع ما لیس عندك(ح:٢١٨٩)۔

۴۔ ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پہلے بعض سرایا پر امیر مقرر کیا اور پھر آپ کو بحرین کا والی مقرر کیا ۔ آپ حضرت العلاء الحضرمی رضی اللہ عنہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے ۔

۵۔ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ اموی رضی اللہ عنہ اور اس کے بیٹے حضرت یزید رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل مقرر فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو یہ لوگ اسی منصب و ذمہ داری پر تھے ۔

ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ سے سسرالی رشتہ قائم کرتے ہوئے اپنی تین بیٹیاں بنو امیہ کو بیاہ کر دیں ۔ سب سے بڑی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ابوالعاص بن ربیع بن امیہ بن عبد شمس سے کر دی ۔ اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوجہل کی بیٹی سے شادی کا ارادہ کیا تو آپ نے اپنے اس داماد کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تعریف کی ؛ اور فرمایا:

''اس نے جب بھی مجھ سے بات کی تو سچ بولا اور جب بھی مجھ سے وعدہ کیا تو اسے پورا کیا ۔''

اور اپنی دو بیٹیوں کا نکاح یکے بعد دیگر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کر دیے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرما دیا تھا:''اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں وہ بھی عثمان رضی اللہ عنہ کو دیدیتا۔''[رواہ أحمد فی الفضائل ۱/ ٤٨١]۔

❀ ایسے ہی ان لوگوں کے تعصب اور جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اہل شام سے صرف اس لیے بغض و نفرت رکھتے ہیں کہ ان میں وہ پہلا انسان تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا ۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ مکہ میں کفار بھی تھے اور اہل ایمان بھی ۔ یہی حال مدینہ کا بھی تھا کہ وہاں پر اہل ایمان اور منافقین دونوں پائے جاتے تھے ۔ اس دور میں تو شام میں کوئی ایک بھی ایسا باقی نہیں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہو؛ یا اس کا اظہار کرتا ہو ۔ مگر ان کی شدت جہالت کی وجہ سے بغض و نفرت کی دُم ان کے ساتھ لگی ہوئی ہے ۔

❀ ان کی جہالت اور تعصب کی انتہاء یہ ہے کہ رافضی ان لوگوں کی انتہائی سخت مذمت کرتے ہیں جو بنی امیہ کے آثار [بقایا جات] سے فائدہ حاصل کریں ۔ مثلاً اگر کوئی نہر یزید سے پانی پی لے ۔ حالانکہ یہ نہر یزید نے نہیں کھدوائی بلکہ اس نے اس نہر میں فقط توسیع کی ہے ۔ ایسے ہی بنو امیہ کی تعمیر کی کردہ جامع مسجد اموی میں نماز نہیں پڑھتے ۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے ۔ اور اس وقت کی تعمیر کعبہ مشرکین کے ہاتھوں ہوئی تھی ۔ ایسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے بنائے ہوئے گھروں میں بھی رہتے تھے ۔ ان چشموں سے پانی پیا کرتے تھے جو کفار نے کھودے ہوتے ۔ ان کے تیار کردہ لباس پہنتے ۔ ان کے تیار کردہ دراہم سے لین دین کرتے ۔ جب یہ حال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھروں سے استفادہ کر رہے ہیں' ان کے تیار کردہ لباس' جاری کردہ چشمہ' اور بنائی گئی مساجد سے فائدہ حاصل کرتے تھے تو پھر اہل قبلہ کا کیا عالم ہوگا ۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ یزید کافر تھا؛ اور اس نے نہر کھودی؛ تو مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اس نہر سے پانی پینا مکروہ نہیں ۔ مگر یہ لوگ اپنے انتہائی تعصب کی وجہ سے ان لوگوں کی طرف منسوب چیزوں کو استعمال کرنا حرام سمجھتے ہیں جن سے یہ لوگ بغض و نفرت رکھتے ہیں ۔

ہم سے ایک ثقہ آدمی نے بیان کیا ہے کہ کسی ایک رافضی کے پاس ایک کتا تھا؛ ان ہی میں سے ایک دوسرے رافضی نے اسے بکیر کہہ کر بلایا تو اس پر رافضی نے لڑنا شروع کر دیا کہ :''تم جہنمیوں کے نام پر ہمارے کتے کا نام رکھتے ہو۔'' اور بات

خون خرابے تک جا پہنچی۔'' تو پھر کیا ان رافضیوں سے بڑا جاہل کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟

❀ نبی کریم ﷺ اپنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ نام دیتے تھے جو کہ اس سے پہلے جہنمی لوگوں کے نام بھی ہوگزرے ہیں۔جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بھی کیا۔[جیسا کہ ولید بن مغیرہ؛ لوگوں میں سب سے بڑا کافر تھا]۔قرآن میں وارد لفظ ''وحید'' سے یہی مراد ہے:

﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا﴾ [المدثر ۱۱]

''چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔''

اس کے بیٹے کا نام بھی ولید تھا' اور نبی کریم ﷺ نماز میں ان دونوں باپ بیٹے کا نام لیتے ؛ اور قنوت میں یوں دعا فرمایا کرتے تھے:

"اللهم أنج وليد بن وليد بن المغيرة۔" [البخاری ۶/ ۴۸]۔

''اے اللہ! ولید بن ولید بن مغیرہ کو نجات عطا فرما۔'' جیسا کہ دیگر صحیح روایات میں بھی ثابت ہے۔

❀ ان لوگوں کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دن یوم عاشوراء کا روزہ نہیں رکھتے بلکہ اس دن افطار کو افضل سمجھتے ہیں۔حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو یوم عاشورا کا روزہ رکھتے ہوئے پایا یہودیوں نے بتایا کہ یہ بہت بڑا دن ہے اسی دن اللہ نے موسیٰ کو نجات دے کر فرعونیوں کو غرق کیا تھا تو شکرانہ کے طور پر موسیٰ نے اس دن روزہ رکھا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' میں ان سب میں سے موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہوں لہٰذا آپ نے اس کا روزہ رکھا اور دوسروں کو رکھنے کا حکم دیا۔'' [صحیح بخاری:جلد دوم:ح ۶۳۲]

❀ ان لوگوں کی جہالت اور تعصب کی حد یہ ہے کہ: یہ بے زبان چوپائے کو پکڑ کر بلاوجہ عذاب دیتے ہیں؛ اور اسے ان لوگوں کی طرح تصور کرتے ہیں جن سے یہ نفرت رکھتے ہیں۔مثلاً: سرخ رنگ کی دنبی پکڑ کر اس کا نام عائشہ رکھتے ہیں اور پھر اس کے بال نوچ کر اسے تکلیف دیتے ہیں۔اور کسی چوپائے کو پکڑ کر اس کا نام ابوبکر یا عمر رکھتے ہیں اور پھر اسے ناحق اور بلاوجہ مارتے ہیں۔اور پھر گھی بھری مشک کو حضرت عمر سے تشبیہ دیکر درمیان سے تیز دھار چیز سے پھاڑتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمر کا گوشت کھا رہے ہیں اور ان کا خون پی رہے ہیں۔

دوسری بات:

❀ جواب کے اس دوسرے مرحلہ میں ہم کہتے ہیں: ائمہ اہل اسلام کا طریق کار یہ ہے کہ مشروع چیز کو اہل بدعت رافضہ یا کسی بھی دوسرے کے افعال کی وجہ سے ترک نہیں کیا جائے گا۔تمام ائمہ کے ہاں مسلمہ اصول اس کے موافق ہیں۔ان ہی میں سے ایک تسطیح [سطح برابر کرنے] کا مسئلہ بھی ہے جس کا رافضی مصنف نے ذکر کیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ قبر کو تھوڑا سا اونچا کیا جائے۔جیسا کہ صحیح روایات میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر کی سطح اونچی تھی۔اس لیے کہ ایسا کرنا دنیاوی عمارتوں کی مشابہت سے بہت دور ہوتا ہے۔اور قبروں پر بیٹھنے سے منع کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ قبروں کی سطح کو بالکل

برابر کیا جائے۔ اس لیے کہ حدیث میں قبروں کو برابر کرنے کا حکم آیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ قبر کو زمین کو برابر کر دیا جائے۔ پھر بعض نے کہا کہ: یہ رافضیوں کا شعار ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ جب کہ دوسرے اہل علم حضرات نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا: ''ایسا کرنا ہی مستحب ہے؛ بھلے رافضی اسے اپنا شعار بنالیں۔''

❀ ایسے ہی جہری بسم اللہ پڑھنا رافضیوں کا شعار ہے۔ اس وجہ سے اور دعائے قنوت کی وجہ سے بعض لوگوں نے امام شافعی رحمہ اللہ پر تنقید بھی کی ہے۔ اور اسے قدریہ اور رافضہ کا عقیدہ و مسلک بتایا ہے۔ اس لیے کہ عراق میں مشہور تھا کہ جہری بسم اللہ رافضیوں کا شعار ہے۔ یہاں تک کہ امام سفیان ثوری اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کے عقیدہ میں جہری بسم اللہ کا ترک کرنا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے نزدیک یہ رافضیوں کا شعار تھا۔ جیسا کہ ان سے موزوں پر مسح کرنے کا ذکر نقل کیا جاتا ہے' اس لیے کہ موزے پر مسح ترک کرنا رافضیوں کا شعار تھا۔ مگر اس کے باوجود جب امام شافعی رحمہ اللہ نے دیکھا کہ یہ سنت ہے' تو آپ نے اسے اپنا مذہب بنالیا۔ اگر چہ یہ رافضی عقیدہ کے موافق ہی کیوں نہ ہو۔

❀ ایسے ہی اہل عراق کا عقیق سے احرام باندھنا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب ہے؛ اگر چہ رافضیوں کا بھی یہی مذہب ہے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

❀ امام مالک رحمہ اللہ موزوں پر مسح کی روایت کو ضعیف سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ سے مشہور ہے کہ: حضر میں موزوں پر مسح نہ کیا جائے۔ بھلے یہ رافضیوں کے مذہب کے موافق کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ محرم محمل کے سایہ سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ بھلے رافضی مذہب بھی اس کے موافق ہی کیوں نہ ہو۔

❀ ایسے ہی امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ زمین کی جنس کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ کرنا مکروہ ہے۔ ایسے ہی رافضی بھی زمین کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ کرنے سے منع کرتے ہیں۔

❀ ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ حج تمتع کو مستحب اور افضل سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے اور دوسرے ائمہ حدیث کے ہاں مستحب یہ ہے کہ: جس انسان نے حج قران یا افراد کا احرام باندھا ہو وہ اسے فسخ کرکے عمرہ سے بدل دے تاکہ اس کا حج حج تمتع ہو جائے۔ اس لیے کہ صحیح احادیث میں اس کی ترغیب آئی ہے۔ سلمہ بن شبیب نے حضرت امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: اے ابوعبداللہ! آپ نے اہل خراسان کو حج تمتع کا فتوی دیکر رافضیوں کے دلوں کو مضبوط کر دیا؛ تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! مجھے آپ کے بارے میں اطلاع ملا کرتی تھی کہ تم بیوقوف ہو؛ اور میں تمہارا دفاع کیا کرتا تھا؛ اور اب میرے نزدیک بھی یہ ثابت ہوگیا کہ تم احمق ہو۔ میرے پاس اس مسئلہ میں گیارہ صحیح احادیث موجود ہیں؛ تو کیا میں ان احادیث کو تمہاری باتوں کی وجہ سے چھوڑ دوں۔''

❀ ایسے ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی بھی دوسرے؛ جیسے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر درود پڑھنا جائز ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے کئی ساتھیوں نے بھی آپ سے یہی نقل کیا ہے۔ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: '' صلی اللہ علیك ۔'' آپ پر اللہ کی رحمتیں ہوں۔''

آپ کے اکثر اصحاب نے یہی قول اختیار کیا ہے جیسا کہ قاضی ابو یعلی؛ ابن عقیل' ابو محمد عبد القادر الجیلی؛ اور دیگر۔

جب کہ امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ اس سے منع کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے بعض اصحاب نے یہی مسلک اختیار کیا ہے' اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے' آپ فرماتے ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور پر درود پڑھنا مناسب نہیں۔''

شاید ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول اس وقت کا ہے جب شیعہ نے بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ واللہ اعلم۔ وہ اس پر یوں عمل پیرا ہو گئے تھے گویا کہ انہیں حکم دیا گیا ہو کہ باقی لوگوں کو چھوڑ کر بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھا کریں۔ ایسا کرنا بالاتفاق غلط ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر اپنی ذات سے اور اپنی آل سے کی ہے۔ پس آپ کی اتباع میں آپ کی آل پر بھی درود پڑھا جائے گا۔

- امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک آل رسول وہ لوگ ہیں جن پر صدقہ لینا حرام ہے۔
- امام احمد اور امام مالک رحمہ اللہ کے کچھ اصحاب نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ آل محمد سے مراد آپ کی امت ہے۔
- صوفیاء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ: اس سے مراد آپ کی امت کے اولیاء اور نیک لوگ ہیں۔ اس میں تمام اہل ایمان و اہل تقوی شامل ہیں۔ اس متعلق ایک ضعیف حدیث بھی روایت کی گئی ہے جو کہ اصل میں ثابت نہیں ہے۔
- کچھ احناف اور دوسرے لوگوں نے کہا ہے: جب انسان کسی ایسی قوم کے پاس ہو' جو باقی تمام صحابہ کو چھوڑ کر بطور خاص صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھتے ہوں' اور جب اس نے بھی صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر درود پڑھا' اور یہ گمان پیدا ہو گیا کہ یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے؛ تو ایسا کرنا مکروہ ہے تا کہ اس کے رافضی ہونے کا گمان تک پیدا نہ ہو۔ ہاں اگر یہ پتہ چل سکتا ہو کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر بھی درود پڑھا ہے تو پھر ایسا کرنے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔
- تمام ائمہ کرام رحمہم اللہ یہی فرماتے ہیں کہ: اگر کسی مستحب فعل میں فساد کا پہلو راجح ہو تو پھر وہ مستحب نہیں رہتا۔ یہاں سے بعض ان فقہاء نے دلیل لی ہے جو بعض مستحبات کو اس وجہ سے ترک کر دیتے ہیں کہ وہ کسی بدعتی فرقہ کے شعار کے طور پر مشہور ہیں۔ [تا کہ اہل بدعت سے ان مشابہت نہ ہو]۔

لیکن ایسی کسی بات کو بنیاد بنا کر کسی واجب کو ہرگز ترک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کہا گیا ہے کہ اس کا اظہار کرنے میں رافضیوں سے مشابہت ہوتی ہے۔ اور سنی اور رافضی میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اور ان سے امتیازیت کی مصلحت ان کی مخالفت اور قطع تعلقی پر مبنی ہے۔ یہ مستحب کی مصلحت سے زیادہ بڑھ کر ہے۔

- اس مذہب کے مطابق بعض مواقع پر مستحب کو بجالانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے بھلے میں اس میں روافض کے ساتھ اختلاط اور ان کی مشابہت لازم آتی ہو۔ لیکن یہ ایک عارضی بات ہے؛ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی ایسی چیز کو ہمیشہ کے لیے مشروع بنا لیا جائے جو کہ اصل میں مشروع نہیں ہے۔ مثال کے طور پر: کفار کا شعار پہننا۔ اگر کوئی چیز ان کا شعار نہ ہو تو اس کا پہننا مباح ہوتا ہے۔ مثلاً پیلا عمامہ پہننا جائز ہے اگر یہ یہود کا شعار نہ ہو۔ اور اگر ان کا شعار ہو تو پھر اس کا پہننا منع ہے۔

فصل:

اہل سنت پر بدعات کا الزام

[الزام]: رافضی مصنف نے کہا ہے:

''اس کے ساتھ ہی اہل سنت نے بہت ساری بدعات ایجاد کرلیں' اوران کے بدعت ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''ہر بدعت گمراہی ہے' اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔''

اورآپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز داخل کی جو اس میں سے نہیں ہے' تو وہ مردود ہے۔''

اور اگر ان پر رد کیا جائے تو ان کے جی اسے ناپسند کرتے ہیں' اور دل اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ جمعہ کے خطبہ میں خلفاء راشدین کا نام لینا۔ حالانکہ بالاجماع رسول اللہ ﷺ کے دور میں ایسا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی صحابہ اور تابعین کے دور میں ایسا ہوتا تھا۔ نہ ہی بنو امیہ اور کے؛ اور نہ ہی بنو عباس کے شروع کے دور میں۔ بلکہ یہ ایسی بدعت ہے جو کہ منصور نے اس وقت ایجاد کرلی جب اس کے اور علویوں کے مابین فتنہ پیدا ہوا۔ اس وقت اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں ان کے ناک خاک میں ملاؤں گا اور ان پر بنی عدی اور بنی تیم کا ذکر بلند کروں گا۔ اس نے خطبہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا نام لینا شروع کیا۔ اور یہ بدعت ہمارے اس دور تک جاری ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

[پہلی بات]: منبر پر خطبہ میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا ذکر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور میں شروع ہوا۔ بلکہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ ذکر شروع ہوگیا تھا۔ اس مسئلہ میں ضبہ بن محصن کی روایت مشہور ترین احادیث میں سے ہے۔ طلمنکی نے میمون بن مہران کی حدیث سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ کے والی تھے۔ جب آپ جمعہ کا خطبہ دیتے تو نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتے' اور پھر اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کرتے۔ اس پر ضبہ بن محصن کھڑے ہوئے اور کہا: تو ان سے پہلے ساتھی کا ذکر کہاں گیا جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی افضلیت دیا کرتے تھے۔ اس سے مراد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔

جب کئی بار ایسے ہوا تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دربار میں ضبہ بن محصن کی شکایت لکھ بھیجی کہ وہ ہم پر طعنہ زنی کرتا ہے' اور اس قسم کی دیگر حرکات کا ارتکاب کرتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خط لکھ کر ضبہ بن محصن کو اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے انہیں مدینہ بھیج دیا۔

جب ضبہ مدینہ دربار فاروقی میں پہنچے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ ضبہ العنزی دروازے پر اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ تو آپ نے اجازت دیدی۔ جب آپ اندر گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ضبہ کو نہ ہی مرحبا اور نہ ہی أھلا[و سھلاً]۔ اس پر ضبہ نے کہا: ''مرحبا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جبکہ أھلاً؛ تو میرے پاس نہ ہی اہل ہیں اور نہ ہی مال۔

تو پھر آخر کر تم نے مجھے میرے شہر سے لیکر یہاں تک کی تکلیف کیوں دی؛ میں نہ ہی کوئی برا کام کیا تھا اور نہ ہی گناہ؟ تو آپ نے فرمایا: تمہارے مابین اور تمہارے گورنر کے مابین کیا معاملہ پیش آیا؟

تو میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اس بارے میں میں ابھی آپ کو خبر دیتا ہوں۔ جب وہ [حضرت ابوموسیٰ] خطبہ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام کے بعد دوبارہ آپ کے لیے دعا کرتا ہے۔ اس کی اس بات پر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے کہا: ''ان کے دوسرے ساتھی کا تذکرہ کہاں ہے جس پر تو انہیں فضیلت دیتا ہے۔ اس پر اس نے آپ کے دربار میں میری شکایت لکھ بھیجی۔

[حضرت ضبـــــہ کہتے ہیں]: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ پھوٹ کر رونے لگے؛ اور فرمانے لگے: اللہ کی قسم! تم اس کی نسبت زیادہ توفیق دیے گئے اور ہدایت یافتہ ہو۔ کیا آپ میری غلطی مجھے معاف کر دیں گے اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف کر دے گا؟ میں نے کہا: اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف فرمائے۔ پھر آپ روتے رہے' اور یہ فرماتے رہے:

''اللہ کی قسم! ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک دن اور رات عمر اور آل عمر سے بہتر ہیں۔''

کیا میں تمہیں اس دن اور رات کے متعلق نہ بتاؤں؟۔ میں کہا: اے امیر المؤمنین! ضرور بتائیے۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رات کا تعلق ہے؛ تو رسول اللہ ﷺ مشرکین کے شر سے بچنے کیلئے ہجرت کرتے ہوئے رات کے وقت نکلے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کبھی رسول اللہ ﷺ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے؛ کبھی دائیں جانب چلتے تو کبھی بائیں جانب۔ رسول اللہ ﷺ نے آپ سے کہا:

''اے ابوبکر! آج آپ کچھ اوپری سی حرکت کر رہے ہیں؛ ایسا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! جب مجھ خیال آتا ہے کہ دشمن آپ کے آگے گھات لگا کر نہ بیٹھا ہو تو میں آپ کے آگے چلنا شروع کر دیتا ہوں؛ اور جب یہ خیال آتا ہے کہ دشمن آپ کے پیچھے لگا ہو گا تو پھر میں آپ کے پیچھے اور دائیں بائیں چلنا شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے آپ کے متعلق خوف محسوس ہوتا ہے۔''

❀ رسول اللہ ﷺ اپنی پاؤں کی انگلیوں پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ جب آپ تھک گئے؛ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی تھکاوٹ کو محسوس کر لیا اور آپ کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ یہاں تک کہ جب غار کے منہ پر پہنچ گئے تو آپ کو نیچے اتارا؛ اور عرض گزار ہوئے: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے! آپ اس وقت تک غار میں داخل نہیں ہونگے جب تک میں غار میں داخل نہ ہو جاؤں۔ اگر غار میں کوئی موذی چیز ہوگی تو وہ آپ سے پہلے مجھے تکلیف دیگی۔ پھر آپ کو غار میں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے کوئی پریشانی کی توقع کی جاتی ہو؛ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو اٹھا کر غار میں داخل کیا۔ غار میں ایک چھوٹا سوراخ تھا جس میں سانپ تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی ایڑی وہاں پر رکھ دی؛ سانپ آپ کی ایڑی کو ڈسنے لگے؛ یہاں تک کہ درد و تکلیف کی شدت سے آپ کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے گالوں پر گرنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا: ''اے ابوبکر غم نہ کر! بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر اطمینان اور سکون نازل کیا۔'' یہ اس رات کا قصہ ہے۔

❀ جہاں تک آپ کے دن کا تعلق ہے تو جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوا تو عرب مرتد ہو گئے۔ ان میں سے بعض کہنے

لگے : ہم نماز تو پڑھیں گے مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ اور بعض کہنے لگے: ہم زکوٰۃ تو دیں گے مگر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ آپ کو نصیحت کروں ۔ میں نے عرض کی: اے خلیفہ رسول اللہ! لوگوں کے ساتھ مہربانی کیجیے؛ اور نرمی سے پیش آیئے۔ تو آپ نے مجھے جواب دیا: کیا تم جاہلیت میں تو بڑے سخت تھے' مگر اسلام میں خواری دکھا رہے ہو؟۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کے پاس چلے گئے اور وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اللہ کی قسم! اگر لوگ مجھ سے ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے؛ تو میں اس پر بھی ان سے جنگ و قتال کروں گا۔''

ہم نے آپ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑیں۔ اللہ کی قسم! آپ اس معاملہ میں رشد و ہدایت پر تھے۔ یہ آپ کے دن کا قصہ ہے۔'' پھر آپ نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے نام خط لکھ کر انہیں ملامت کی۔ [1]

اگر یہ کہا جائے کہ: اس میں صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے جو کہ زندہ حکمران تھے۔ تو کہا جائے گا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا تھا؛ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے۔

[دوسری بات]: بیشک یہ بھی کہا گیا ہے کہ:'' جمعہ کے خطبہ میں خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے دور میں اس وقت شروع ہوا جب آپ نے دیکھا کہ بعض بنوامیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس کی جگہ پر آپ نے خلفاء اربعہ کا تذکرہ اور ان سے رضامندی کے اظہار کا اعلان و اقرار شروع کیا۔ تا کہ اس بیہودہ طریقہ کا خاتمہ کیا جا سکے۔

[تیسری بات]: رافضی نے جو کہا ہے کہ یہ کام منصور نے شروع کیا؛ یہ ایک باطل اور غلط بات ہے۔ اس لیے کہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی ولایت بنوامیہ اور منصور سے بہت پہلے تھی۔ اس میں منصور کے لیے کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ آل علی یا کسی اور کی ناک کو نیچا دیکھا سکتا۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ جب بنی تیم یا بنی عدی کے کچھ لوگ بھی آل علی کی طرح خلافت کے طلبگار ہوتے؛ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی ان لوگوں سے اس معاملہ میں اختلاف کرنیوالا نہیں تھا۔

[چوتھی بات]: اہل سنت والجماعت ہرگز یہ بات نہیں کہتے کہ خطبہ میں خلفاء اربعہ کا ذکر کرنا فرض ہے۔ بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ: صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفا کرنا یا پھر بارہ ائمہ کا ذکر کرنا ایسی بدعت منکرہ ہے؛ جس کا ارتکاب آج تک کسی نے نہیں کیا۔ نہ ہی صحابہ کرام نے اور نہ ہی تابعین نے' نہ ہی بنی امیہ نے اور نہ ہی بنو عباس نے۔ جیسا کہ اہل سنت والجماعت یہ بھی کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا سلف صالحین میں سے کسی دوسرے پر سب و شتم کرنا انتہائی بری بدعت ہے۔ اگر خلفاء اربعہ کا ذکر کرنا بدعت ہے' حالانکہ بہت سارے خلفاء ایسا کرتے رہے ہیں؛ تو پھر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اکتفاء کرنا' حالانکہ اس سے پہلے امت میں سے کسی ایک نے بھی ایسے نہیں کیا؛ تو یہ بدعت ہونے کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے امیر المؤمنین ہونے کی وجہ سے آپ کا ذکر کرنا مستحب ہے تو پھر خلفاء راشدین کا تذکرہ استحباب کا زیادہ حق دار ہے۔ لیکن رافضی لوگ ناپ تول میں کمی کرنے والے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کی آنکھوں میں تنکا تو انہیں نظر آجاتا ہے' مگر اعتراض کرنے والے کو اپنے اندر پورا تنا نظر نہیں آتا۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر تمام مسلمانوں کو اتفاق ہوگیا تھا۔ ان کے دور تلوار کفار پر آویزاں تھی اور مسلمانوں

[1] الریاض النضرۃ لمحب الطبري ١/ ١٠٥۔

سے بہت دور تھی۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کا آپ کی بیعت پر اتفاق نہیں ہوسکا۔ بلکہ اس عرصہ میں فتنہ برپا ہوا؛ اس عرصہ میں تلوار کفار سے دور اور مسلمانوں کے سروں پر آویزاں رہی۔ پس اس صورت میں صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفا کرنا اور آپ سے پہلے کے ان خلفاء ثلاثہ کا ذکر ترک کر دینا' جن پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوگیا تھا؛ اور وہ اپنے دشمنوں پر کامیاب ومنصور رہے تھے ؛ اور صرف اس امام کا ذکر کرنا جس کے دور میں مسلمانوں میں افتراق پیدا ہوگیا اور دشمن ان کے علاقوں کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگا؛ [یہ بوالعجبی ہے]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے مابین فتنہ وافتراق کے اس دور میں بلاد شام اور خراسان کے کفار بلاد مسلمین کو للچائی نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس لیے کہ مسلمان آپس میں مشغول ہوگئے۔ تو اب کیا باقی تمام خلفاء کا ذکر ترک کر کے صرف ایک ایسے خلیفہ کا ذکر کیا جائے جنہیں نہ تو پوری خلافت مل سکی اور نہ ہی مقصود خلافت حاصل ہوا۔

یہی چیز ان لوگوں کی دلیل تھی جو چوتھے خلیفہ کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بجائے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام لیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اندلس میں اور بعض دوسری جگہوں پر کیا جاتا تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ: چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر تمام لوگوں کا اجماع ہوگیا تھا؛ [اس لیے ان کا نام بطور خلیفہ چہارم لیا جاتا ہے]۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں کا یہ نظریہ غلط ہے؛ لیکن ان سے بڑھ کر وہ لوگ غلطی پر ہیں جو خلفاء ثلاثہ کو چھوڑ کر صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ لوگ غلطی پر ہیں جو خطبہ میں یا دوسرے مواقع پر بارہ ائمہ کا ذکر کرتے ہیں؛ یہ دیواروں پر ان کے نام کا نقش بناتے ہیں یا پھر میت کو اس کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ ایسی برائی اور بدعت ہے کہ دین اسلام میں اس کا انتہائی بری بدعت ہونا اضطراری طور پر معلوم ہے۔

اگر خطیب ان چاروں خلفاء کا ذکر کرنا چھوڑ دے تو اس پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انکار اس بات پر ہے کہ ان سابقہ تین خلفاء کو؛ جن کی خلافت زیادہ کامل تھی؛ اور سیرت کے لحاظ سے بھی وہ افضل تھے؛ انہیں چھوڑ کر صرف ایک کے ذکر اکتفاء کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے پر انکار کیا گیا۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ سلطان اور موجود خلیفہ تھے۔

[پانچویں بات]: اہل سنت والجماعت کے تمام خطباء خطبہ میں خلفاء اربعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ مغرب میں اور بعض دوسرے شہروں میں بہت سارے خطباء ایسے ہیں جو کہ خطبہ میں نام لیکر کسی ایک خلیفہ کا تذکرہ بھی نہیں کرتے۔ اور مغرب میں بہت سارے خطباء ایسے بھی تھے جو کہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد چوتھے خلیفہ کے طور پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام لیا کرتے تھے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان باقی خلفاء کی خلافت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوگیا تھا جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع نہیں ہوا۔

پس اگر خلفاء کا نام لیکر ان کا ذکر کرنا اچھی بات ہے تو بعض اہل سنت والجماعت ایسا کرتے ہیں۔ اور اگر ایسا کرنا اچھی بات نہیں ہے تو پھر بھی بعض اہل سنت ایسا نہیں کرتے۔ جو بھی صورت حال ہو' حق اہل سنت سے باہر نہیں ہوسکتا۔

[چھٹی بات]: جن لوگوں نے جمعہ میں منبر پر خلفاء راشدین کا نام لینا شروع کیا؛ انہوں نے اس بدلہ کے طور پر ایسا کیا کہ بعض لوگ ان پر تنقید اور سب وشتم کرتے تھے۔ ایسا کرنے میں اسلام میں جو فساد پیدا ہوگیا تھا وہ کسی پر بھی مخفی نہیں

ہے۔ پس اس کے بجائے اعلانیہ ان کا ذکر خیر اور مدح سرائی کی جانے لگی؛ تا کہ ان سے موالات اور دوستی کے اظہار اور ان کی مدح و توصیف کے بیان سے اسلام کی حفاظت کی جائے۔ اس لیے کہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ خلفاء راشدین کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

((علیکم بسنتي و سنة خلفاء الراشدین المهدیین من بعدي تمسکوا بها و عضوا علیها بالنواجذ . و إیّاکم ومحدثات الأمور؛ فإن کل بدعة ضلالة .))

''تم پر میری سنت اور میرے بعد میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے۔ اس کے ساتھ چمٹے رہو' اور اسے اپنے کچلی کے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ لو۔ خبردار! اپنے آپ کو نئے کاموں سے بچا کر رکھنا؛ اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔'' [سنن أبي داؤد ٤/ ٤٨٠٠؛ وابن ماجة ١/ ١٥۔ والدارمي ١/ ٤٤.]۔

❀ ان کی خلافت کی احادیث بہت زیادہ ہیں۔ جب بنوامیہ میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیا کرتے اور آپ کی مذمت کیا کرتے تھے؛ اور یہ کہتے کہ: آپ خلفاء راشدین میں سے نہیں ہے۔ تو پھر ان لوگوں کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: سب سے پہلے آپ نے برسر منبر خلفاء اربعہ کا نام لینا شروع کیا؛ ان سے موالات کا اظہار کیا؛ ان کی مدح سرائی کی اور فضائل بیان کیے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والوں کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا۔ خوارج حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے بغض رکھتے تھے اور انہیں کافر کہتے تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ ان دونوں حضرات کا ذکر خیر کرنے میں ان خوارج پر بھی رد تھا جن سے قتال کرنے کا حکم رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔

❀ روافض ان سب لوگوں سے بڑھ کر برے ہیں؛ یہ لوگ حضرت ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھتے ہیں اور ان پر سب شتم کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان حضرات کو کافر تک کہتے ہیں۔ پس منبر پر ان لوگوں کا ذکر کرنے اور ان کے فضائل بیان کرنے میں ان رافضہ پر رد تھا۔

جب ان لوگوں کو خدابندہ بادشاہ کے ملک میں؛ جس کے لیے اس رافضی مصنف [ابن مطہر] نے یہ کتاب ''[منہاج الکرامہ]'' لکھی ہے؛ پذیرائی مل گئی تو ان لوگوں نے چاہا کہ اپنے مذہب کا اظہار کریں اور اہل سنت والجماعت کے حق مذہب کو نیچا دیکھائیں۔ اور انہوں نے اس فتنہ کو پہلی ترجیح دی۔ اس لیے ان لوگوں نے بدعات کی لگام کھلی چھوڑ دی؛ اور وہ شر و فساد اور فتنہ پیدا کرنے کے درپے ہوگئے جس کی صحیح حقیقت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے بعض اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب لوگوں سے منبر پر خلفاء راشدین کا تذکرہ کرنے کے بارے میں فتوی لیا کہ کیا ایسا کرنا واجب ہے۔ پس فتوی دینے والوں میں سے بعض نے ان لوگوں کے شر سے خوف کی بنا پر اپنی جان بچاتے ہوئے اور بعض لوگوں نے جہالت کی بنا پر فتوی دیدیا کہ ایسا کرنا واجب نہیں۔

ان لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ منبروں پر خلفاء راشدین کا تذکرہ بند کروایا جائے۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے گمان کے مطابق گیارہ معصومین میں سے ایک جناب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرنا اور ان کے فضائل بیان کرنا شروع کر دیے۔

❀ پس جب مفتی کو یہ معلوم ہو جائے کا سائل کا مقصود یہ ہے کہ اس فتوی سے:

۱۔ خلفاء راشدین کا ذکر ترک کر کے ان کی جگہ [خود ساختہ] بارہ ائمہ کا ذکر کیا جائے۔

۲۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کیساتھ منقول اذان کو ختم کر کے اس کی جگہ حی علی خیر العمل کی نداء لگائی جائے۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت صحیح احادیث کی قرأت کو روک کر اس کی جگہ اپنی طرف سے من گھڑت اور خود ساختہ قصوں کہانیوں کو جگہ دی جائے۔

۴۔ دین اسلام کے معلوم اور ثابت شدہ شرائع کو باطل قرار دیا جائے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ اور گمراہ کن بدعات کو جگہ دی جائے۔

۵۔ اور لوگ اس فتویٰ کو ملاحدہ کے دین کے اظہار کے لیے ایک وسیلہ بنالیں' وہ ملاحدہ جو باطن میں فلاسفہ کا مذہب چھپائے ہیں اور دین اسلام کا اظہار کرتے ہیں؛ جو کہ یہود و نصاریٰ سے بڑے کافر ہیں۔

۶۔ یا ان کے علاوہ جہالت و ظلم اور دروغ گوئی پر مشتمل کچھ اور مقاصد ہوں جن سے مقصود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنا اور چالیں چلنا ہو۔ تو پھر اس صورت میں:

''مفتی کیلئے حلال نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا فتویٰ دے جس سے مذکورہ بالا شرور و فساد میں سے کوئی شر پیدا ہوسکتا ہو۔''

❀ جب ایسے احوال میں خلفاء راشدین کا ذکر کرنے سے مامور بہ مقاصد حاصل ہو سکتے تھے؛ تو پھر ان کا تذکرہ کرنا ایسے احوال میں مامور بہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تذکرہ مطلق واجبات میں سے نہیں ہے۔ اور ان نہ ہی ان سنن میں سے ہے جن کی ہر حال میں اور ہر دور اور ہر جگہ پر حفاظت کی جائے۔

❀ جیسا کہ اگر کفار کے لشکر کا کوئی شعار اور خاص علامت ہو' اور مسلمانوں کے لشکر کا بھی کوئی خاص شعار ہو تو پھر اس صورت میں کفار کے شعار کے برعکس مسلمانوں کے شعار کا اظہار کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ یہ بات ہر جگہ اور ہر دور میں واجب ہے۔

❀ اگر یہ بات مان لی جائے کہ واجبات شریعت خلفاء راشدین کا ذکر کیے بغیر قائم نہیں ہو سکتے؛ اور یہ کہ اگر ان کا تذکرہ ترک کر دیا جائے تو اہل بدعت و ضلال کو اپنے شعار کا اظہار کرنے کا موقع مل جائے گا؛ تو پھر ایسے احوال میں خلفاء راشدین کا برسر منبر تذکرہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

❀ مامور بہ امور میں سے کچھ واجب ہوتے ہیں' یا ہمیشہ کے لیے مسنون ہوتے ہیں؛ جیسے کہ پانچ نمازیں؛ اور وتر؛ فجر کی دو سنتیں وغیرہ۔ اور کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حکم بعض احوال میں اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کے بغیر واجب کا حصول ممکن نہ ہو' یا پھر اس کے بغیر حرام سے بچنا ممکن نہ ہو۔

[ساتویں بات]: اس کو یہ کہا جائے گا کہ: جب منبر پر خلفاء راشدین کے ذکر' یا سلطان وقت کے لیے دعاء' یا اس طرح کے دیگر امور میں جب وہ اہل علم والدین علماء کلام کریں جو کہ شرعی دلائل کی روشنی میں ہی بات کرتے ہیں' تو ان کا کلام مقبول ہوتا ہے؛ اور ان میں سے حق بات کو پالینے والے کے لیے دوہرا اجر ہوتا ہے۔ اور خطاء کار کی خطاء و غلطی معاف ہوتی ہے۔

❀ یہ علیحدہ بات ہے کہ کوئی انسان ان پر تو اعتراض شروع کردے؛ لیکن خود اس سے بھی بڑا شر و فساد پھیلانا چاہتا ہو؛ جیسا کہ

ابن تومرت کا گروہ ؛ جو کہ اس کے مہدی ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اور اسے امام معصوم گمان کرتے تھے۔ جب اس کا نام بھی منبر پر لیا جانے لگا اور اس کی ایسی صفات بیان کی جانے لگیں جن کا باطل ہونا معلوم شدہ تھا۔ اور یہ لوگ اپنے جماعت کے افراد کو خواص امت محمد قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں نے حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین ان خلفاء راشدین ؛ اور ائمہ رشد و ہدایت کا تذکرہ کرنا بند کر دیا تھا جن کے اس امت کے بہترین افراد ہونے پر کتاب و سنت اور سابقین اولین صحابہ اور تابعین کرام کے کلام سے دلائل موجود ہیں ۔ خلفاء راشدین ہی وہ ائمہ ہدایت تھے جن کا تعلق علی الاطلاق افضل زمانہ سے تھا۔

❀ پھر یہی تومرتیہ گروہ یہ کہنے لگے کہ: منبر پر خلفاء راشدین کا ذکر خیر کرنا سنت نہیں بلکہ بدعت ہے۔ حالانکہ یہ انتہائی بودی اور بے کار بات ہے؛ جو کہ واپس ان کے منہ پر مارے جانے کے قابل ہے۔ یہ لوگ اپنے امام ابن تومرت کے مرجانے کے بعد بھی منبر پر اس کا نام لیا کرتے تھے۔ حالانکہ اللہ [اور اس کے رسول] پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا اس بات میں ذرا بھر بھی شک و شبہ نہیں کرسکتا کہ حضرات خلفاء ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین اس سے بہت بہتر اور افضل تھے۔ اور وہ اتباع نبوت اور تعمیل احکام میں زیادہ اکمل تھے۔ بلکہ خلفاء بنو امیہ اور بنو عباس میں سے کسی ایک کا ذکر خیر کرنا مہدی کا لقب اختیار کرنے والے اس ابن تومرت کا ذکر کرنے سے بہت بہتر تھا اور زیادہ استحقاق رکھتا تھا۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی خلافت ابن تومرت کی خلافت سے بہت بہتر تھی۔ اور ان کا اسلام کو قائم کرنا اس کی نسبت بہت بہتر تھا۔ اور انہیں زمین کے مشرق و مغرب میں اس سے بڑھ کر غلبہ اور پذیرائی حاصل تھے۔ اور ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر خیر و بھلائی کے کام کئے تھے۔ اور اس نے جھوٹ' ظلم' جہالت اور شر کے وہ کام کئے جو کہ باقی لوگ نہ کر سکے۔ تو پھر ان دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر یہ انسان کیسے مہدی ہوسکتا ہے؟۔ یا پھر باقی خلفاء کو چھوڑ کر اس کا نام لینا اور جمعہ کے خطبہ میں اس کا تذکرہ کرنا کیسے مشروع ہوسکتا ہے؟۔ اور جو اس کا نام لینے والے ہیں' وہ دوسرے لوگوں پر کیسے کوئی اعتراض کرسکتے ہیں؟

❀ ان سے بڑھ کر بودا اور بے کار اعتراض امامیہ کا ہے ؛ جو کہ خلفاء راشدین کے تذکرہ پر اعتراض کرتے ہیں لیکن خود بارہ ائمہ کا نام لیتے اور ان کا ذکر کرتے ہیں۔ حالانکہ خلفاء ثلاثہ میں سے ہر ایک ان بارہ ائمہ سے بہتر اور افضل ہے۔ اور ان کی خلافت و امامت زیادہ اکمل ہے۔ جب کہ بارہ ائمہ کی مختلف اصناف ہیں۔ جن میں سے کچھ تو وہ صحابہ ہیں جن کے اہل جنت ہونے کی شہادت دی گئی ہے؛ جیسا کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما۔ اور ان کے علاوہ بھی سابقین اولین میں سے بہت سارے لوگ ہیں جو کہ ان دونوں سے افضل ہیں ؛ مثلاً : اہل بدر۔

❀ یہ دونوں حضرات اگرچہ اہل جنت نوجوانوں کے سردار ہیں ؛ تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما جنتی بوڑھوں کے سردار ہیں۔ یہ صنف پہلی صنف سے زیادہ کامل ہے۔

❀ اور اگر یہ کہا جائے کہ: یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے لخت جگر ہونے کی وجہ سے افضل ہیں''۔

❀ [جواب]: تو ان سے کہا جائے گا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل سنت والجماعت اور شیعہ کے نزدیک بالاتفاق ان دونوں حضرات سے افضل ہیں' وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے لخت جگر نہیں [بلکہ ان کے شوہر ہیں]۔

- حضرت ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کو ان دونوں حضرات کی نسبت زیادہ قربت کا تعلق ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ سابقین اولین سے افضل نہ تھے۔ایسے ہی حضرت امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی نواسی بھی ہیں۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا بھی رسول اللہ ﷺ کا نواسہ تھا۔
- اور اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد ہیں[اس وجہ سے افضل ہیں]۔

[جواب]: تو ان سے کہا جائے گا کہ: نبی کریم ﷺ کے چچاؤں اور چچازادوں کی ایک جماعت اہل ایمان اور صحابہ کرام میں سے تھے۔جیسا کہ حضرت حمزہ' عبداللہ و فضل پسران عباس؛ ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم اجمعین۔حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔اور حضرت علی اور جعفر رضی اللہ عنہما دوسرے چچا زادوں سے افضل ہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس سے افضل ہیں۔تو اس سے معلوم ہوا کہ فضیلت ایمان اور تقوی کی بنیاد پر ہوتی ہے حسب و نسب کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔

- ان بارہ ائمہ میں کچھ ایسے بھی تھے جو کہ علم و فضل اور دینداری میں شہرت رکھتے تھے؛ جیسے حضرت علی بن الحسین' ان کا بیٹا ابو جعفر؛ ان کا بیٹا جعفر بن محمد رحمہ اللہ؛ ان لوگوں کا بھی وہی حکم ہے جو دوسرے اہل علم و فضل کا ہے۔امت محمد میں خلقت کی بہت بڑی تعداد ان کی ہم مثل بھی ہیں اور ان سے افضل بھی۔اور ان بارہ ائمہ میں ایسا منتظر بھی ہے جس کا اصل میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں' اور نہ ہی اس سے کسی کو کوئی فائدہ حاصل ہوا۔ایسے لوگوں کی اتباع میں کوئی خیر کی چیز نہیں' صرف شر ہی شر ہے۔
- جب کہ ان کے علاوہ جتنے بھی بنی ہاشم ہیں خواہ علوی ہوں یا عباسی؛ ان میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو علم و فضل اور دینداری میں ان کے برابر ہیں؛ بلکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان ائمہ سے بڑھ کر اہل علم و دین ہیں۔تو پھر خلفاء راشدین کے ذکر پر کیسے عیب لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں ان سے افضل کوئی دوسرا نہیں۔اور پھر ان کے بجائے مسلمانوں میں ایسے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے بڑھ کر اہل علم و دین اور افضل دوسرے مسلمان بھی موجود ہیں۔اور ان سے مسلمانوں ان ائمہ کی نسبت کئی گنا بڑھ کر دینی اور دنیاوی فائدہ بھی حاصل کیا ہے۔ان لوگوں کا تو مقصد صرف یہ ہے کہ ائمہ اثنا عشریہ کا ذکر کر کے باقی تمام مسلمانوں سے اختلاف اور ان سے دشمنی کا اظہار کیا جائے۔اور یہ لوگ اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے کفار و منافقین تک سے مدد حاصل کرتے ہیں تا کہ اللہ کے روشن کردہ چراغ کو بجھا سکیں۔اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغام اور محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین حق کی شمع گل کرسکیں۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس کا یہ دین باقی تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا۔یہ لوگ دین میں زندیقیت اور الحاد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں تا کہ منافقین کو بگاڑ پیدا کرنے کے لیے راہ مل سکے۔

❀❀❀❀

فصل:

[مسح کا مسئلہ]

[اعتـــراض]: رافضی مصنف کہتا ہے: ''اور جیسا کہ پاؤں پر مسح کرنے کے بارے میں کتاب اللہ العزیز میں نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

''تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کہنیوں تک دھولو۔ اور اپنے سروں کو مسح کرو: اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: دو اعضاء کو دھویا جاتا ہے اور دو پر مسح کیا جاتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے اس حکم کو بدل ڈالا اور پاؤں دھونے کو واجب قرار دیا۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جـــواب]: وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے قولاً وفعلاً وضوء نقل کیا اور آپ ﷺ سے وضوء کرنے کا طریقہ سیکھا، اور آپ کے عہد مبارک میں وضوء کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ انہیں اس طرح کرتے ہوئے دیکھتے اور پھر اس فعل پر برقرار رکھتے؛ اور انہوں نے اپنے بعد والوں کے لیے یہ طریقہ نقل کیا؛ ان کی تعداد ان سے بہت زیادہ ہے جنہوں نے اس آیت کا یہ معنی ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

اس لیے کہ سبھی مسلمان رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں وضوء کیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے وضوء کرنے طریقہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ہی سیکھا تھا؛ اس لیے کہ عہد جاہلیت میں وضوء نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اور خود نبی کریم ﷺ کو وضوء کرتے ہوئے اتنے لوگوں نے دیکھا ہے کہ جن کی صحیح تعداد کو صرف اللہ ہی جانتا ہے؛ ان لوگوں سے مروی تمام احادیث میں پاؤں کو دھونے کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تک کہ صحاح اور دوسری کتب احادیث میں کئی ایک اسناد سے رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: "ویل لِلأعقابِ وبطون الأقدام مِن النارِ" [1]

''ایڑیوں اور پاؤں کی ہتھیلیوں کے لئے آگ سے تباہی ہوگی۔''

اور اگر پاؤں پر صرف مسح کرنے کا حکم ہوتا تو ظاہری پاؤں پر مسح کرلینا کافی تھا؛ اور تمام پاؤں کو دھونا ایک ایسا تکلف ہوتا جسے طبیعت جلدی سے تسلیم نہ کرتی۔ جیسا کہ طبیعت میں مال و جاہ کی طلب ہوتی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ: ان لوگوں نے جھوٹ بولا ہے' یا پھر وضوء کا طریقہ نقل کرنے میں ان سے غلطی ہوگئی ہے تو یہی جھوٹ یا غلطی کا احتمال فرد واحد کی روایت میں اس سے بڑھ کر ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ: نہیں' بلکہ آیت کا لفظ تواتر کے ساتھ ثابت ہے جس میں غلطی کا احتمال و امکان نہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: وضوء کا طریقہ بھی اسی طرح نقل متواتر کے

---

[1] صحیح بخاری: جلد اول: ح163۔ میں پوری روایت اس طرح ہے: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کسی سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پالیا: اور ہم کو عصر کی نماز میں دیر ہوگئی تھی، لہٰذا ہم وضو کرنے لگے اور اپنے پیروں پر جلدی کے مارے مسح کرنے لگے، آپ ﷺ نے بلند آواز سے پکار کر دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا کہ:'' ویل لِلعقابِ مِن النارِ''
اس روایت میں بطون الاقدام کے الفاظ نہیں۔ یہ الفاظ مستدرک حاکم سے لیے گئے ہیں۔

ساتھ ثابت ہے۔اور آیت کے الفاظ کا ثابت شدہ سنت کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں۔اس لیے کہ لفظ مسح دو جنس کو شامل ہے:

۱۔اسالہ ۲۔غیر اسالہ۔

جیسا کہ عرب کہتے ہیں:''تـمسحت للصلاۃ۔'' (میں نے نماز کے لیے مسح کیا)۔پس جو چیز اسالہ [پانی بہانے] سے ہوا سے غسل کا نام دیا جاتا ہے۔اگر کسی ایک نوع کو غسل کے نام کے ساتھ خاص کیا جاسکتا ہے تو دوسری قسم کو بنام مسح بھی خاص کیا جاسکتا ہے۔پس لفظ مسح عام ہے جس کے تحت غسل کا لفظ بھی آجاتا ہے۔اور کبھی یہ لفظ خاص ہوتا ہے جس کے تحت غسل کا معنی شامل نہیں ہوتا۔

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔مثال کے طور پر''ذوی الارحام'' کے لفظ کو لیجیے۔یہ لفظ تمام عصبہ اور اصحاب الفروض کو شامل ہے۔تو پھر جب عصبہ اور اصحاب الفروض کے کچھ خاص اسماء بھی تھے تو اب صرف''ذوی الارحام'' کا لفظ باقی رہ گیا۔یہ عرف میں ان لوگوں کے لیے مختص ہوگیا جنہیں فرائض یا تعصیب کسی ایک میں سے بھی میراث کوئی حصہ نہیں ملتا۔

یہی حال لفظ''جائز''اور''مباح'' کا ہے۔یہ ان تمام چیزوں کے لیے عام الفاظ ہیں جو کہ حرام نہ ہوں۔پھر انہیں پانچ اقسام میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص کردیا گیا۔

یہی حال لفظ''ممکن'' کا ہے۔یہ اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو ممتنع نہ ہو۔پھر اسے اس کے لیے خاص کردیا گیا جو نہ ہی واجب ہو اور نہ ہی ممتنع۔پس واجب؛ جائز؛ ممکن؛ اور خاص و عام کے مابین فرق کیا جائے گا۔

یہی حال لفظ''حیوان'' کا ہے۔یہ لفظ انسان اور دوسرے جانوروں کو شامل ہے۔مگر بعد میں اسے غیر انسان کے لیے مختص کردیا گیا ہے۔اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

جب دو اقسام میں سے کسی ایک کا ایسا نام ہو جو صرف اسی کے ساتھ خاص ہو' تو پھر دوسری قسم کے لیے اسم عام ہی باقی رہ جاتا ہے۔لفظ مسح کا تعلق بھی اسی باب سے ہے۔بلکہ غسل بھی مسح کی ہی ایک قسم ہے۔قرآن کی آیت میں وارد لفظ مسح سے مراد وہ مسح نہیں جو کہ غسل کے ساتھ اس لفظ سے مراد دوسری قسم ہے؛ بلکہ اس سے مراد عین غسل ہے جو کہ معانی مسح میں سے ایک ہے۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿إِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ ''دونوں ٹخنوں تک۔'' یہ نہیں فرمایا کہ: ٹخنے تک۔جیسا کہ ہاتھ دھونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا تھا:﴿إِلَى الْمَرَافِقِ﴾ ''کہنیوں تک۔تو اس سے واضح ہوا کہ ہر پاؤں میں ایسے ہی ایک ٹخنہ نہیں ہے جیسے کہ ہر ہاتھ میں ایک کہنی ہوتی ہے' بلکہ ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہوتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے جوان دو ابھری ہوئی ہڈیوں تک مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔اس سے مراد انہیں دھونا ہے؛ اس لیے کہ اگر اس سے مراد عرف عام کا مسح ہوتا تو پھر پاؤں کی پشت پر ہاتھ پھیر کی مسح کرلینا ہی کافی تھا۔[مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ دھونے کی حد مقرر کردی گئی ہے]۔

دوسری جو بات اہم ترین ہے وہ یہ کہ: پہلے دو دھوئے جانے والے اعضاء کا ذکر کرکے پھر مسح والے عضو کا ذکر کرنا اور پھر دھوئے جانے والے عضو کا ذکر کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلے دو اعضاء میں وضوء کرنے کے لیے ہر حال میں دھونا واجب ہے؛ اور تیسرے عضو میں ہر حال میں مسح ہی واجب ہے جب کہ چوتھے عضوء میں کبھی دھونا ہی واجب ہوتا ہے؛ جس وقت کہ پاؤں کھلے ہوئے ہوں؛ اور کبھی موزے پہنے ہوئے ہونے کی صورت میں مسح بھی کفایت کرجاتا ہے۔

❀ رسول اللہ ﷺ سے متواتر سنت کے ساتھ پاؤں کو دھونا اور ان پر مسح کرنا دونوں باتیں ثابت ہیں۔رافضی اس سنت

متواترہ کی مخالفت کرتے ہیں ۔جیسا کہ خوارج بھی اس جیسی سنت میں مخالفت کے مرتکب ہیں ۔ یہاں پر یہ وہم پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ اہل سنت کا عمل ظاہر قرآن کے مخالف ہے۔ایسا ہر گز نہیں ؛ بلکہ رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ دونوں سنتیں ثابت ہیں ؛ پاؤں کو دھونا اور ان پر مسح کرنا ۔ یہ تواتر چوتھائی دینار' یا تین دراہم یا دس دراہم میں چور کا ہاتھ کاٹنے یا اس جیسے دیگر متواترات سے بڑھ کر ہے۔

❀ پاؤں کا ذکر کرتے ہوئے مسح کا لفظ ذکر کرنا اس بات کی طرف تنبیہ بھی ہے کہ پاؤں دھوتے وقت پانی کم استعمال کیا جائے اور اس میں اسراف سے کام نہ لیا جائے ۔ کیونکہ عام عادت کے مطابق پاؤں دھوتے ہوئے پانی بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ فضول خرچی کی علامت ہے ۔ نیز اس میں کلام کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ کلام لیا گیا ہے ۔ اس لیے کہ جب معطوف اور معطوف علیہ پر واقع ہونے والے فعل کی جنس ایک ہی ہو تو پھر ان میں سے کسی ایک کا ذکر کر لیا جانا ہی کافی ہوتا ہے ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ❀ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ❀ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ❀ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ❀ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ❀ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴾

[الواقعة ۱۸۔۲۲]

''ہمیشہ نوجوان رہنے والے خدمت گار لڑکے ان کے پاس پھرتے رہیں گے۔نتھری شراب کے جام و ساغر اور آبخوروں کے ساتھ۔اس شراب سے نہ تو انہیں سر درد ہوگا اور نہ عقل میں فتور آئے گا۔انہیں وہ پھل (کھانے کو) ملیں گے جو وہ پسند کریں گے ۔ نیز پرندوں کا گوشت جونسا وہ چاہیں گے ۔اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی ۔''

حالانکہ حورعین کو تو نہیں پھیرایا جارہا ہوگا ۔ معنی یہ ہے کہ ان پر ہر چیز پیش کی جائے گی ۔ یہاں پر ان الفاظ کو حذف کر دیا گیا ہے جن کی جنس پر ظاہر میں دلالت موجود تھی ۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [الإنسان ۳۱]

''وہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ۔''

معنی یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں کو وہ دردناک عذاب دے گا۔

اس [مذکورہ بالا] آیت [وضوء] میں دو مشہور قرأتیں ہیں ۔ایک زبر کے ساتھ ہے اور دوسری زیر کیساتھ ۔ جو لوگ اس کو زبر کے ساتھ [أرجلَکم] پڑھتے ہیں ؛ تو ان میں سے کئی ایک نے کہا ہے کہ: یہاں پر دوبارہ پاؤں دھونے کا حکم دیا جارہا ہے ۔ گویا کہ یوں کہا جارہا ہے: [وامسحوا برؤسکم واغسلوا أرجلکم إلی الکعبین] ''یعنی اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھولو'' ۔ان دو قراتوں کا مطلب یہ ہے گویا کہ یہ دو آیتیں ہیں ۔

اور جن لوگوں [نے اسے زیر کے ساتھ [أرجلِکم] پڑھا ہے ؛ ان کا] کہنا ہے : یہ جار و مجرور کی جگہ پر عطف ہے ۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ: [وامسحوا برؤسکم وامسحوا أرجلِکم إلی الکعبینَ] ''یعنی اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرلو'' ۔ عربوں کا یہ کہنا: [مسحت الرجلَ] ''میں نے اپنے پاؤں کا مسح کیا'' ۔ یہ اس قول کے مترادف

نہیں :[مسحت بالرجل]۔اس لیے کہ جب فعل کوحرف باء کے ساتھ متعدی بنایا جائے تو اس سے الصاق ''یعنی متصل'' کا معنی پیدا ہوتا ہے۔ یعنی میں نے کسی چیز کو اس پر چسپاں کر دیا۔اور اگر اس سے حرف باء کو حذف کر دیا جائے تو بالا جماع اس سے مجرد مسح ہی مراد ہوگا۔تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہاں پر پانی کے ساتھ پاؤں کا مسح کرنا مقصود ہے ؛ جس سے مراد پاؤں کا دھونا ہے ۔ یہ ایک مجمل کلام ہے جس کی تفسیر وتوضیح سنت نبوی سے ہوتی ہے اور زیر کے ساتھ قرأت سے یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام ! قرآن میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر پاؤں دھونے کے وجوب کی نفی ہوتی ہو۔ بلکہ اس میں مسح کا وجوب ہے۔اگر اس بات کو مقدر مان لیا جائے کہ سنت نے قرآن کی عبارت سے زائد کسی چیز کو واجب کیا ہے؛ تو پھر بھی اس صورت میں قرآنی حکم میں کوئی فرق نہیں آتا۔تو درایں صورت کیسے کوئی اعتراض کر سکتا ہے جب سنت قرآن کی وضاحت اور تفسیر کر رہی ہو۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔

❀ جملہ طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت قرآن کی وضاحت اور تفسیر بیان کرتی ہے؛اس کے معانی پر دلالت کرتی ہے۔ پس سنت متواترہ کا تقاضا وہی ہے جو کہ بعض لوگوں نے قرآن کے ظاہری الفاظ سے سمجھا ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے لیے قرآن کے الفاظ اور معانی بیان کیا کرتے تھے۔جیسا کہ حضرت ابوعبدالرحمن سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھایا کرتے تھے' جیسے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام۔آپ فرماتے ہیں:''ہم جب نبی کریم ﷺ سے دس آیات سیکھ لیتے تو اس وقت تک اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک کہ ان کے معانی بھی آپ سے نہ سیکھ لیتے۔''

❀ جو کچھ امامیہ فرقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ: پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرنا فرض ہے؛ تو یہ ایسی بات ہے کہ قرآن سے کسی طرح بھی اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی ۔اور نہ ہی ایسا کرنا سنت رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔اور نہ ہی سلف امت میں یہ چیز معروف تھی۔ بلکہ یہ لوگ قرآن کریم' سنت متواترہ' اور سابقین اولین صحابہ اور تابعین کے اجماع کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔اس لیے کہ [أرجلكم] کو جب زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں تو اس کا عطف ہاتھوں کے دھونے پر ہوتا ہے۔ پس زبر کے ساتھ اس کی قرأت پاؤں کے دھونے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ظاہری قرأت قرآن بھی اسی پر دلیل ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو ظاہر قرآن کا بھی کچھ بھی علم نہیں ۔ یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے جو ضعیف اقوال پر عمل کرتے ہیں اور ظاہر قرآن پر عمل کے دعویدار ہیں ؛ حقیقت میں وہ لوگ سنت نبوی کی مخالفت کے مرتکب ہیں ۔اس لیے کہ ظاہر قرآن میں ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو کہ سنت کے مخالف ہو۔جیسا خوارج کا دعوی ہے کہ ہم سفر میں صرف چار رکعت ہی پڑھیں گے۔اور جو لوگ یہ کہتے ہیں: صرف میں چار رکعت پڑھنا دو رکعت پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔اور جو لوگ کہتے ہیں: ہم ایک گواہ اور قسم کی موجودگی میں حکم نہیں لگا سکتے ۔

اس مسئلہ پر کئی مواقع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔اور یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے' وہ حق ہے۔اور یہ عام مخصوص نہیں ہے۔اس لیے کہ یہاں پر کوئی لفظی عموم نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ مطلق ہے۔جیسا فرمان الٰہی ہے:

﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [التوبة ٥] ''اور مشرکین کو قتل کرو۔''

یہ تمام اعیان مشرکین کے لیے عام حکم ہے۔ اور تمام احوال میں مطلق ہے۔ اور جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت فرماتا ہے۔''

یہ حکم بھی تمام اولاد کے لیے عام ہے اور ہر حال میں مطلق ہے۔

❀ لفظ ''ظاہر'' سے کبھی مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی انسان کے لیے ظاہر ہو۔ اور کبھی اس سے مراد وہ معنی ہوتا ہے جس پر لفظ دلالت کرتا ہو۔ پہلی مراد لوگوں کے افہام کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اور قرآن میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جو کہ فاسد فہم کے خلاف ہیں۔ جب کہ ساری بحث کا مرکز دوسرا معنی ہے۔

فصل:

[حج تمتع اور متعہ کا مسئلہ]

[اعتراض]: رافضی مصنف کہتا ہے: ''اور جیسا کہ متعتین جن کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ متعۃ الحج کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے: ﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ﴾ [البقرة ۱۹۶]

''تو جو شخص حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کرنے کا فائدہ اٹھانا چاہے وہ قربانی کرے جو اسے میسر آسکے۔''

جب رسول اللہ ﷺ نے حج قران کیا تو حج تمتع کے چھوٹ جانے پر افسوس کا اظہار کیا؛ اور فرمایا: ''اگر مجھے اس کا بروقت علم ہو جاتا تو میں قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا اور میں بھی تم سے پیچھے نہ رہتا۔'' اور متعہ نساء کے متعلق فرمایا:

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ [النساء ۲۴]

''اور ان خواتین میں سے جن سے تم فائدہ اٹھالو انہیں ان کی اجرت دیدو۔''

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع کے دور میں ان دونوں چیزوں کے متعلق یہی عمل سنت رہا۔ یہاں تک کہ عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور اعلان کیا: ''دو قسم کے متعہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں حلال تھے؛ میں ان سے منع کرتا ہوں۔ اور ایسا کرنے والوں کو سزا دوں گا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس رافضی سے کہا جائے گا کہ: حج تمتع کے جواز پر تمام ائمہ اسلام کا اتفاق ہے۔ یہ دعویٰ کرنا کہ اہل سنت نے حج تمتع کی حرمت کی بدعت گھڑ لی؛ یہ ان پر جھوٹا الزام ہے۔ بلکہ اکثر علماء اہل سنت حج تمتع کو یا تو واجب کہتے ہیں اور اسے ترجیح دیتے ہیں یا پھر اسے مستحب سمجھتے ہیں۔ تمتع ایک جامع نام ہے جو ان لوگوں کو شامل ہے جو کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کرلیں اور پھر اسی ایک سفر میں حج بھی کریں' خواہ اس نے عمرہ کرنے کے بعد حلال ہو کر دوبارہ حج کا احرام باندھا ہو یا پھر بیت اللہ کا طواف شروع کرنے سے قبل حج کی نیت کرلی ہو تو اس کا حج قران ہو جائے گا۔ یا پھر طواف کے بعد صفا و مروہ کے مابین سعی کرتے ہوئے حلال ہونے سے پہلے اس لیے حج کی نیت کرلی کہ وہ اپنے ساتھ قربانی کا جانور بھی لایا تھا یا پھر مطلق طور پر حج کی نیت کرلی۔ اور بسا اوقات تمتع سے مراد حج کے مہینوں میں عمرہ کرلینا بھی لیا جاتا ہے۔

❀ اکثر علماء جیسے امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء حدیث رحمہم اللہ؛ اور امام ابوحنیفہ اور دیگر فقہائے عراق رحمہم اللہ؛ اور ایک قول

میں امام شافعی اور دیگر فقہائے مکہ رحمہم اللہ؛ حج تمتع کو مستحب کہتے ہیں۔ اگر چہ ان میں ایسے بھی ہیں جو کہ حج قران کو ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ۔ اور بعض فقہاء بالخصوص حج تمتع کو ترجیح دیتے ہیں؛ جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ سے ایک قول میں منقول ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ سے صراحت کے ساتھ منقول ہے کہ: اگر حاجی اپنے ساتھ قربانی لیکر آیا ہے تو پھر اس کے حق میں حج قرآن افضل ہے۔ اور اگر قربانی ساتھ نہیں لایا تو پھر عمرہ کے بعد احرام کھول کر حلال ہو جانا ہے افضل ہے۔ اس لیے کہ حج قران خود رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ اور حج تمتع کا اپنے صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کو حکم دیا تھا جو اپنے ساتھ قربانی کا جانور نہیں لائے تھے۔

❀ بہت سارے علمائے اہل سنت والجماعت ایسے بھی ہیں جو حج تمتع کو واجب کہتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے؛ اہل جیسے امام ابن حزم رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس کا حکم دیا تھا۔

❀ جب اہل سنت والجماعت حج تمتع کے جواز پر متفق اور یک زبان ہیں اور اکثر لوگ اسے مستحب کہتے ہیں؛ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو حج کی اس قسم کو واجب کہتے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اہل سنت پر حج تمتع کے حرام ہونے کی بدعت ایجاد کرنے کا الزام لگا رہے ہیں' وہ اپنے اس قول میں سخت جھوٹے ہیں۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو نقل کیا گیا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ: تصور کیجیے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بات کہہ دی؛ جس میں دوسرے صحابہ کرام اور تابعین نے آپ کی مخالفت کی ہو؛ یہاں تک کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حج تمتع کیا؛ اور اس کے متعلق قرآن نازل ہوا؛ پھر ایک آدمی نے اپنی مرضی سے اس میں کچھ کہہ دیا۔'' [البخاري ۲/ ۱٤٤؛ مسلم ۲/ ۹۰۰]

❀ اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ لوگوں میں سے ہر ایک کی بات قبول بھی کی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی؛ سوائے رسول اللہ ﷺ کے قول کے۔ پس رافضی کا اگر مقصد مطلق طور پر اہل سنت والجماعت پر رد کرنا ہے تو پھر یہ اعتراض ان پر وارد نہیں ہوتا۔ اور اگر مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں خطاء کا ارتکاب کیا ہے تو پھر بھی اہل سنت رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کو بھی خطاء سے منزہ و مبرا نہیں مانتے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خطائیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت کم ہیں۔ علماء نے فقہ کے وہ مسائل جمع کیے ہیں جن میں ان دو میں سے کسی ایک کے قول کو ضعیف قرار دیا گیا ہے؛ تو پتہ چلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زیادہ اقوال ضعیف ہیں۔ مثال کے طور پر:

۱۔ بیوہ کی عدت کے مسئلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فتوی یہ ہے کہ: اس کی عدت ابعد الاجلین (یعنی زیادہ لمبے وقت والی) ہے۔ جب کہ کتاب اللہ کے موافق رسول اللہ ﷺ سے ثابت سنت یہ ہے کہ بچہ جننے کے ساتھ ہی اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔ یہی فتویٰ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔

۲۔ آپ کا فتوی ہے کہ مفوضہ کا مہر موت کی وجہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتوی مہر مثل کا ہے۔ جیسا کہ اشجع قبیلہ والوں نے بروع بنت واشق کے مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ بھی نقل کیا ہے۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول مسائل میں طلاق اور ام الولد اور میراث کے حصوں کے بارے میں متناقض اقوال پائے

جاتے ہیں۔

- جو انسان حج کو عمرہ سے فسخ کے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو؛ تو اس مسئلہ میں فقہائے حدیث امام احمد بن حنبل اور دیگر فقہاء رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے۔ یہ حضرات بطور استحباب حج کو عمرہ سے فسخ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور بعض لوگ اسے واجب کہتے ہیں جیسا کہ ظاہر یہ کا مسلک ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اور شیعہ کا بھی مسلک ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ فسخ کو جائز نہیں سمجھتے۔ اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ بہت سارے صحابہ ایسا کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کے ایک گروہ سے اس کی ممانعت نقل کی گئی ہے۔ اگر حج کو عمرہ سے فسخ کرنا درست ہے تو یہ اہل سنت و الجماعت کے اقوال میں سے ایک قول ہے۔ اور اگر ایسا کرنا درست نہیں تو پھر بھی اہل سنت کے اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے۔ الغرض حق کسی طرح بھی اہل سنت و الجماعت سے باہر نہیں۔
- اگر یہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اس کے منع کرنے کی وجہ سے قدح کرتے ہیں تو پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بھی آپ سے بڑھ چڑھ کر اس سے منع کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''حج تمتع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا۔''

شیعہ حضرات حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور آپ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ میں غلطی کر جانا قدح کی موجب ہے تو پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر بھی قدح ہونی چاہیے۔ وگرنہ یہ کیا معیار ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اسی مسئلہ میں قدح کی جائے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی باری خاموشی اختیار کر لی جائے حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ سے افضل بڑے فقیہ اور بڑے عالم تھے۔

- دوسرا جواب یہ ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حج تمتع کو حرام نہیں کیا۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت ضبی بن معبد رحمہ اللہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ عرض کیا کہ: میں نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا ہے تو آپ نے فرمایا: '' آپ نے سنت نبوی کی اتباع کے لیے ہدایت پالی۔'' [رواہ النسائی ۵/۱۱۳؛ سنن ابن ماجہ ۲/۹۸۹]۔
- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما لوگوں کو حج تمتع کا حکم دیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جاتا کہ: آپ کے اباجی تو اس سے منع کیا کرتے تھے؛ تو آپ جواب میں فرمایا کرتے: ''میرے اباجی کا مقصد وہ نہیں جو کچھ تم لوگ مراد لینے لگے ہو۔''

جب لوگ بہت زیادہ اصرار کرتے تو آپ فرماتے: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ تم ان کی اتباع کرو یا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ؟''

- اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''اگر میں حج کرتا تو تمتع کرتا؛ اگر میں حج کرتا تو تمتع کرتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ لوگوں کو افضل چیز کا حکم دیتے۔ لوگوں نے سہولت کی وجہ سے اشہر الحج کے علاوہ باقی مہینوں میں عمرہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ سارا سال بیت اللہ کو ایسے خالی نہ چھوڑا جائے۔ پس جب لوگ حج افراد کرنے لگیں گے تو باقی سارا سال عمرہ جاری رہے گا۔ اشہر الحج کے علاوہ باقی مہینوں میں عمرہ کرنا اشہر الحج میں حج تمتع کے لیے عمرہ کرنے سے افضل ہے؛ اس پر تمام ائمہ اربعہ اور دیگر علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے۔
- ایسے ہی حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی یہ تفسیر منقول ہے: ﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ ''حج اور

عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو۔'' [یہ دونوں حضرات]فرماتے ہیں: حج اور عمرہ کے پورا کرنے کا مطلب یہ ہے ان دونوں کا احرام اپنے گھر سے باندھا جائے۔ ان حضرات کی مراد یہ تھی کہ: حج کے لیے علیحدہ سفر کیا جائے اور عمرہ کے لیے علیحدہ سفر کیا جائے۔ وگرنہ نہ ہی ان دونوں حضرات نے اپنے گھر سے احرام باندھا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے ایسے کیا اور نہ ہی آپ کے خلفاء راشدین میں سے کسی ایک نے ایسے کیا۔

❀ جب امام اپنی رعیت کے لیے کسی افضل چیز کو اختیار کرے: تو اس صورت میں کسی بات کا حکم دینا گویا کہ اس کی ضد [الٹ] سے منع کرنا ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حج تمتع سے منع کرنا افضل کے اختیار کرنے کے لحاظ سے تھا تحریم کے لیے نہیں تھا۔ آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا تھا: ''میں ان دونوں کو حرام کرتا ہوں'' جیسا کہ رافضی نے نقل کیا ہے۔ بلکہ آپ نے فرمایا تھا: ''میں ان دونوں سے منع کرتا ہوں۔'' پھر حج تمتع سے منع کرنا بھی اس لیے تھا کہ لوگ افضل چیز کو اختیار کریں تحریم کے لیے یہ ممانعت نہیں تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے تو حج کو عمرہ سے فسخ کرنے سے منع کیا تھا۔

❀ بہت سارے فقہاء کے نزدیک فسخ حرام ہے۔ یہ اجتہادی مسائل میں سے ہے۔ امام ابو حنیفہ' امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ فسخ کو حرام کہتے ہیں۔ لیکن امام احمد رحمہ اللہ اور دوسرے فقہاء حدیث فسخ کو حرام نہیں کہتے؛ بلکہ اسے مستحب کہتے ہیں' اور بعض اسے واجب قرار دیتے ہیں۔ اور اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نہیں لیتے۔ بلکہ اس مسئلہ میں حضرت علی' حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول اختیار کرتے ہیں۔

[متعہ کا مسئلہ]:

❀ ایسے ہی عورت سے متعہ کرنا بھی متنازع فیہا مسائل میں سے ایک ہے۔ آیت کریمہ میں اس کے حلال ہونے کے متعلق نص صریح نہیں پائی جاتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے:

﴿وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ [النساء ۲۴]

''ان کے ماسوا جتنی بھی عورتیں ہیں انہیں اپنے مال کے ذریعہ حاصل کرنا تمہارے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ اس سے تمہارا مقصد نکاح میں لانا ہو، محض شہوت رانی نہ ہو۔ پھر ان میں سے جن سے تم (نکاح کا) لطف اٹھاؤ تو انہیں ان کے مقررہ حق مہر ادا کرو۔ ہاں اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد زوجین میں باہمی رضا مندی سے کچھ سمجھوتہ ہو جائے تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

❀ اس آیت میں یہ قول: ﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ ﴾ ''پھر ان میں سے جن سے تم لطف اٹھاؤ'' یہ تمام مدخول بہا عورتوں کو شامل ہے۔ اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ ان تمام عورتوں کو ان کا حق مہر ادا کیا جائے۔ بخلاف اس عورت کے جسے دخول سے پہلے ہی طلاق ہو جائے؛ اور اس سے کوئی لطف نہ اٹھایا گیا ہو۔ اس لیے کہ ایسی عورت صرف آدھے مہر کی حق دار ہوتی ہے؛ پورے مہر کی نہیں۔ یہ بالکل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے:

﴿وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ [النساء ۲۱]

’’اور تم لے بھی کیسے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔‘‘

❀ اس آیت کریمہ میں عقدِ نکاح کیساتھ ایک دوسرے سے لطف اندوزی کو استقرار مہر کا موجب قرار دیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ اس میں اجرت کی ادائیگی کو نکاح مؤبد کو چھوڑ کر نکاح مؤقت کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی معنی نہیں بنتا۔ بلکہ نکاح مؤبد میں پورا مہر ادا کرنا یہ زیادہ اولی ہے۔تو ضروری ہوا کہ آیت بھی نکاح مؤبد پر دلالت کرتی ہو۔خواہ یہ دلالت بطور تخصیص کے ہو یا بطور عموم کے۔

❀ اس کی یہاں سے بھی ملتی ہے کہ نکاح کے بعد لونڈیوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ تو اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ اس سے پہلے بیان گزرا ہے وہ مطلق طور پر آزاد عورتوں سے نکاح کے متعلق تھا۔

[اعتراض]: اگر کوئی یہ بات کہے کہ: ایک قرأت میں یوں بھی آیا ہے: ﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰىٓ اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ ’’پھر ان میں سے جن سے تم لطف اٹھاؤ ایک مقررہ وقت تک۔‘‘ [1]

[جــواب]: پہلی بات یہ قرأت متواتر نہیں ہے۔زیادہ سے زیادہ یہ خبر واحد کی طرح ہی ہو سکتی ہے۔تو ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ شروع اسلام میں متعہ حلال تھا۔لیکن انکار تو اس مسئلہ میں قرآن سے استدلال لینے پر ہے۔

[1] (الی اجل مسمی): کی قرأت کے راوی صرف عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہیں جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت صرف ۱۳ سال تھی۔جمع و تدوین قرآن کے وقت آپ قسم اٹھا کر کہتے ہی رہے کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے (اور ممکن ہے کہ جن ایام میں متعہ کا جواز تھا یہ قرأت بھی پڑھی گئی ہو۔لیکن ایسی قرات بھی رخصت اور نسخ کے ضمن میں آتی ہیں)۔مگر آپ کی اس بات کو دو وجوہ کی بنا پر پذیرائی نہ ہو سکی۔ایک یہ کہ جمع و تدوین قرآن کے معاملہ میں خبر متواتر کو قبول کیا گیا تھا اور آپ کی یہ خبر واحد تھی۔جس کا دوسرا کوئی راوی نہ تھا۔اور دوسری وجہ یہ تھی کہ پہلے سے دو مکی سورتوں مومنون اور معارج میں یہ محکم آیات موجود تھیں: ﴿والذین هم لفروجهم حافظون﴾ (المؤمنون) یعنی حفاظت فروج کے دو ہی ذریعے ہیں ایک بیوی، دوسرا لونڈی۔ان کے علاوہ جو کچھ ہے وہ حد سے گزرنا ہے۔اور یہ تو ظاہر ہے کہ ممتوعہ عورت نہ بیوی ہوتی ہے نہ لونڈی۔لونڈی نہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں اور بیوی اس لیے نہیں ہوتی کہ بیوی کو میراث ملتی ہے۔اور ایسی عورت کو میراث نہیں ملتی۔

نکاح متعہ ایک اضطراری رخصت تھی۔دور نبوی میں نکاح متعہ تین مواقع پر مباح کیا گیا اور پھر ساتھ ہی اس کی حرمت کا اعلان کیا۔یہ مواقع جنگ خیبر، فتح مکہ اور اوطاس اور جنگ تبوک ہیں۔ان مواقع پر ابتداء میں نکاح متعہ کی اجازت دی جاتی تھی اور جنگ کے اختتام پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔گویا یہ ایک اضطراری رخصت تھی اور صرف ان مجاہدین کو دی جاتی تھی جو محاذ جنگ پر موجود ہوتے تھے؛ اور اتنے عرصہ کے لیے ہی ہوتی تھی۔اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جنگ بدر، احد اور جنگ خندق کے مواقع پر ایسی اجازت نہیں دی گئی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حنین کے دن ایک لشکر اوطاس کی طرف روانہ کیا۔ان کا دشمن سے مقابلہ ہوا،مسلمانوں نے فتح پائی اور بہت سے قیدی ہاتھ آئے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان قیدی عورتوں سے صحبت کرنے کو گناہ سمجھا کہ ان کے مشرک شوہر موجود تھے۔اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرما کر عدت کے بعد ان لونڈیوں کو ان کے لیے حلال کر دیا۔(مسلم۔ کتاب الرضاع، باب جواز وطی المسبیة)۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے غزوہ میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی رخصت دی تھی؛ یاد رکھو بیشک اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔جس کے پاس اس قسم کی کوئی عورت ہو تو اسے چاہئے کہ اسے چھوڑ دے اور تم نے جو کچھ انہیں دے رکھا ہو اس میں سے ان سے کچھ نہ لو۔‘‘

قیدی عورتوں اور لونڈیوں سے تمتع کی شرائط یہ تھیں:

۱۔صرف اس قیدی عورت سے تمتع کیا جا سکتا ہے جو امیر لشکر دیگر اموال غنیمت کی طرح کسی مجاہد کی ملکیت میں دے دے۔اس سے پہلے اگر کوئی شخص کسی عورت سے تمتع کرے گا تو وہ دو گناہوں کا مرتکب ہوگا۔ایک زنا کا اور دوسرے مشترکہ اموال غنیمت کی تقسیم سے پیشتر ان میں خیانت کا۔

۲۔امیر لشکر کا کسی عورت کو کسی کی ملکیت میں دینے کے بعد اس سے نکاح کی ضرورت نہیں رہتی۔ملکیت میں دے دینا ہی کافی ہوگا اور اس کا سابقہ نکاح از خود ختم ہو جائے گا۔[......حاشیہ جاری ہے......]

❀ دوسری بات: ان حروف میں اگر چہ قرآن نازل ہوا تھا؛ لیکن اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ قرأت مشہور اور ثابت قراءات میں سے نہیں ۔ پس اس لحاظ سے یہ قرأت منسوخ ہوگی ۔ اور اس کا نزول اس وقت ہوا ہوگا جب متعہ مباح تھا۔ جب متعہ حرام ہوگیا تو یہ قرأت بھی منسوخ ہوگئی ۔ تو اس صورت میں مہر دینے کا حکم مطلق نکاح میں رہ گیا۔

❀ اس کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہوسکتی ہے کہ یوں کہا جائے: یہ دونوں قرأتیں ہیں اور دونوں حق ہیں' اور مقررہ وقت تک لطف اندوزی کی صورت میں عورت کا حق دینے کا حکم اسی صورت میں نافذ ہوگا جب یہ حلال ہو۔ اور یہ سارا معاملہ اس وقت تک تھا جب تک ایک مقررہ وقت تک کے لیے نکاح کرنا حلال تھا۔ یہ اسلام کے شروع کی بات ہے۔ اب اس آیت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ایک مقررہ وقت تک نکاح کے حلال ہونے کا ثبوت مل سکتا ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''میں تمہارے لیے عورتوں سے ایک مقررہ وقت تک کے لیے لطف اندوزی کو حلال کرتا ہوں۔'' بلکہ یہ ارشاد فرمایا: ﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ﴾ ۔

''پھر ان میں سے جن سے تم (نکاح کا) لطف اٹھاؤ تو انہیں ان کے مقررہ حق مہر ادا کرو۔''

پس یہ ہر استمتاع اور لطف اندوزی کو شامل ہے جو یا تو حلال ہو یا پھر شبہ کی وجہ سے وطی واقع ہو جائے۔

❀ یہی وجہ ہے کہ نکاح فاسد میں سنت نبوی اور اجماع امت کی روشنی میں مہر مثل واجب ہو جاتا ہے۔ اور جب متعہ کرنے والا اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھ کر متعہ کر لے تو اس پر مہر واجب ہو جاتا ہے ۔ جبکہ یہ آیت حرام لطف اندوزی کو شامل نہیں۔ اس لیے کہ اگر کسی عورت سے بغیر عقد نکاح کے لطف اندوزی کی گئی؛ اگر وہ عورت اس پر راضی؛ تو اسے زنا شمار کیا جائے گا۔ اور اس میں کوئی مہر نہیں ہوگا۔ اور اگر اسے زبردستی مجبور کیا گیا تھا تو پھر اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو نکاح متعہ کی ممانعت نقل کی جاتی ہے؛ تو یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متعہ کو حلال قرار دینے کے بعد حرام بھی کر دیا تھا۔ ثقہ راویوں نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔

[......سابقہ حاشیہ......]: ۳۔ تقسیم کے بعد ایسی عورت سے فوری طور پر جماع نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اسے کم از کم ایک حیض نہ آ لے۔ اور یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ حاملہ ہوگی تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ اس سے بیشتر جماع نہیں کیا جا سکتا۔ اور مزید احکام یہ ہیں:

۴۔ ایسی عورت سے صرف وہی شخص جماع کر سکتا ہے جس کی ملکیت میں وہ دی گئی ہو۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

۵۔ اگر اس قیدی عورت سے اولاد پیدا ہو جائے تو پھر اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ اگر ایسی قیدی عورت کو اس کا مالک کسی کے نکاح میں دے دے تو پھر وہ اس سے دوسری خدمات تو لے سکتا ہے لیکن صحبت نہیں کر سکتا۔

۷۔ جب عورت سے مالک کی اولاد پیدا ہو جائے تو مالک کے مرنے کے بعد وہ ازخود آزاد ہو جائیگی۔ شرعی اصطلاح میں ایسی عورت کو ام ولد کہتے ہیں۔

۸۔ اگر امیر لشکر یا حکومت ایک عورت کو کسی کی ملکیت میں دے دے تو پھر وہ خود بھی اس کو واپس لینے کی مجاز نہیں ہوتی۔ الا یہ کہ اس تقسیم میں کوئی ناانصافی کی بات واقع ہو جس کا علم بعد میں ہو۔ اس طرح چند در چند شرائط عائد کر کے اسلام نے ایسی عورتوں سے تمتع کی پاکیزہ ترین صورت پیش کر دی ہے جس میں سابقہ اور موجودہ دور کی فحاشی، وحشت اور بربریت کو حرام قرار دے کر اس کا خاتمہ کیا گیا ہے اور تمتع کے بعد اس کے نتائج کی پوری ذمہ داری مالک پر ڈالی گئی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ 'جس شخص کے پاس کوئی لونڈی ہو وہ اس کی تعلیم و تربیت کرے اسے ادب سکھائے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ (بخاری، کتاب العتق، باب فضل من ادب جاریته و علمها)۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ لونڈیوں سے تمتع ایک رخصت ہے حکم نہیں ہے اور یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے ایسی اجازت دے دی ہے کیونکہ جہاد اور اس میں عورتوں کی گرفتاری ایسی چیز ہے جس سے مفر نہیں اور ایسا بھی عین ممکن ہے کہ جنگ کے بعد قیدیوں کے تبادلہ یا اور کوئی باعزت حل نہ نکل سکے اسی لیے اللہ نے سے کلیتاً حرام قرار نہیں دیا۔

[متعہ کی حرمت کب ہوئی]:

❀ بخاری و مسلم میں ہے: امام زہری عبداللہ و حسن پسران محمد بن حنفیہ سے نقل کرتے ہیں' وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے متعہ کو مباح کہا' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''تم بیکار آدمی ہو' بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والے دن نکاح متعہ سے اور گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرمادیا تھا۔''

امام زہری رحمہ اللہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم اور سنت کے سب سے بڑے محافظ تھے۔ان کے زمانہ میں بڑے بڑے ائمہ اسلام پائے جاتے تھے جیسے: حضرت مالک بن انس' حضرت سفیان بن عیینہ رحمہما اللہ اور دیگر وہ علماء کرام جن کے علم و فضل ؛ عدالت اور حافظہ پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور اس حدیث کے صحیح اور قابل قبول ہونے کے متعلق حدیث کا علم رکھنے والے کسی ایک عالم نے بھی انکار نہیں کیا۔ اور نہ ہی اہل علم میں سے کوئی فرد ایسا ہے جس نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر کوئی جرح یا تنقید کی ہو۔

ایسے ہی صحیح حدیث میں یہ بھی ثابت ہے کہ: فتح مکہ کے غزوہ کے موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو قیامت تک کے لئے حرام کردیا ہے۔'' [صحیح مسلم کی یہ حدیث دو صفحات پہلے حاشیہ میں گزر چکی ہے]۔

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کرنے والے راویوں میں اختلاف ہے کہ آپ کا قول: ''خیبر والے سال'' کیا یہ گدھے کے گوشت کی حرمت کا وقت بیان کرنے کے لیے ہے یا پھر اس کے ساتھ ساتھ متعہ کی حرمت کے لیے بھی؟

پہلا قول امام ابن عیینہ رحمہ اللہ اور دیگر علماء کا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: متعہ فتح مکہ والے سال حرام ہوا ہے۔ جب کہ دوسرے قول والے اصحاب کا کہنا ہے کہ: خیبر والے سال متعہ حرام ہوا تھا پھر حلال ہوا' پھر دوبارہ حرام ہوا۔ اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس کے بعد بھی ایک بار متعہ حلال ہوا اور حجۃ الوداع والے سال حرام ٹھہرایا گیا۔

❀ اس بارے میں مشہور روایات متواتر کی حد تک پہنچتی ہیں کہ متعہ حلال ہونے کے بعد پھر حرام ٹھہرایا گیا۔ درست بات یہ ہے کہ متعہ جب سے حرام ہوا ہے اس کے بعد دوبارہ کبھی حلال نہیں ہوا۔اور اس کی حرمت کا صحیح وقت فتح مکہ کا ہے۔ اس کے بعد کبھی بھی حلال نہیں ہوا۔ خیبر کے موقع پر اس کی حرمت نہیں آئی۔ خیبر والے سال گھریلو پالتو گدھوں کا گوشت حرام ہوا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما گدھے کے گوشت اور متعہ دونوں کو مباح سمجھتے تھے۔ جس پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سخت انکار کیا اور فرمایا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے کو اور گدھے کے گوشت کو خیبر کے دن حرام ٹھہرایا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں چیزوں کو ملا کر اس لیے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان دونوں کو مباح سمجھتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ جب آپ کو نہی [ممانعت] کی حدیث پہنچی تو آپ نے اپنے سابقہ قول سے رجوع کرلیا تھا۔

پس اہل سنت والجماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول روایت پر عمل کے لیے حضرت علی اور دوسرے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیروی کرتے ہیں۔ جب کہ شیعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منقول اس روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف چل رہے ہیں' اور آپ

کی مخالفت کرنے والوں کی پیروی کررہے ہیں۔

❀ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں شادی اور ملک یمین کو حلال ٹھہرایا ہے۔ متعہ کروانے والی عورت ان دونوں میں سے کسی ایک قسم سے بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اگر یہ بیوی ہوتی تو میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے وارث بنتے۔ اور خاوند مرجانے کی صورت میں اس پر وفات کی عدت گزارنا بھی واجب ہوتی۔ اس پر طلاق ثلاثہ کے احکام بھی مرتب ہوتے۔ اس لیے کہ بیوی کے یہ احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں۔ جب لوازم نکاح ثابت نہیں ہوتے تو نکاح کی نفی ہوگئی۔ اس لیے کہ لازم کے انتفاء کا تقاضا ہے کہ ملزوم کا بھی انتفاء ہو۔

❀ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دو ہی چیزیں حلال ٹھہرائی ہیں: عقد نکاح اور ملک یمین۔ اس کے علاوہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کا شمار حرام کاموں میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ ❀ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ❀ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ﴾ [المؤمنون ۵۔۷]

''اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا (کنیزوں سے) جو ان کی ملک ہوتی ہیں کہ (ان سے) مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں۔ اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ حد سے نکل جانے والے ہیں۔''

اس تحریم کے بعد متعہ کی جانے والی عورت نہ ہی بیوی رہتی ہے اور نہ ہی ملک یمین۔ پس قرآنی نصوص کی روشنی میں اس کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ ملک یمین یعنی لونڈی تو نہیں ہوسکتی؛ یا صاف ظاہر ہے۔ اور بیوی اس لیے نہیں ہوسکتی کہ یہاں پر نکاح کے لوازم نہیں پائے جاتے۔ اس لیے نکاح کے لوازم میں سے ایک دوسرے کا وارث بننا' اور شوہر کی موت کی صورت میں عدت وفات ؛ اور طلاق ثلاثہ کے احکام کا لازم آنا ہے۔ اور اگر دخول سے پہلے طلاق ہوجائے تو اس صورت میں مرد پر آدھا مہر لازم آئے گا۔ ان کے علاوہ دیگر لوازم بھی ہیں۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: کبھی بیوی ایسی بھی ہوتی ہے جو کہ وارث نہیں بنتی ؛ جیسے کہ: ذمیہ اور لونڈی۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ:

پہلی بات: شیعہ کے نزدیک ذمیہ سے نکاح جائز نہیں۔ اور لونڈی سے نکاح ضرورت کے وقت میں ہوتا ہے۔ جب کہ یہ لوگ مطلق طور پر متعہ کو مباح ٹھہراتے ہیں۔

دوسری بات: ذمیہ اور لونڈی سے شادی کرنا توارث کے اسباب میں سے ہے؛ مگر یہاں پر توارث کے موانع پائے جاتے ہیں اور وہ مانع ہے غلام ہونا اور کفر۔ جیسا کہ نسب وراثت کے اسباب میں سے ہے سوائے اس صورت کے کہ بیٹا یا تو کافر ہو یا پھر غلام ہو۔ پس مانع اپنی جگہ پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر غلام بیٹے کو آزادی مل جائے یا پھر کافر بیٹا اسلام قبول کرلے تو وہ اس کی زندگی میں والد کا وارث بنے گا۔ بس یہی حال ذمی بیوی کا ہے۔ اگر وہ اپنے شوہر کی زندگی میں اسلام قبول کرلے تو تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ اپنے شوہر کی وارث بنے گی۔ اور ایسے ہی اگر وہ غلام ہو اور شوہر کی زندگی میں اسے آزادی مل جائے ؛ اور وہ اس نکاح کو برقرار رکھے تو باتفاق مسلمین وہ وارث بنے گی۔ بخلاف اس عورت کے جس سے متعہ کیا گیا ہو؛ اس لیے کہ نکاح متعہ سے وراثت ثابت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی کسی بھی صورت میں یہ وارث بن سکتی

ہے۔ پس یہ نکاح اس ولد زنا کی طرح ہے جو کسی شوہر کے بستر پر پیدا ہوتا ہے' تو اس کا نسب کسی بھی صورت میں زانی سے نہیں ملایا جاسکتا۔ پس وہ اس کا بیٹا ثابت نہیں ہوسکتا کہ اس کا وارث بنے۔

❀ اور اگر یہ کہا جائے کہ: نسب کے بعض احکام کی تبعیض ممکن ہے۔ پس یہی صورت اس نکاح کی بھی ہے۔

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ جمہور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس میں شیعہ کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ متعہ کی جانے والی عورت سے بیوی کے تمام احکام منتفی ہیں۔ اس میں حلال نکاح کے خصائص میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں پائی جاتی۔ اور جو چیزیں اس میں ثابت ہیں جیسے: نسب کا الحاق' وجوب استبراء' حد کا خاتمہ؛ وجوب مہر وغیرہ۔ اس طرح کے احکام تو وطی ءشبہ میں بھی ثابت ہوجاتے ہیں۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ مستمتع سے وطی کرنا حلال بیوی سے وطی کرنے جیسا نہیں۔ لیکن اگر اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھا جائے تو پھر اس کی مثال وطی شبہ جیسی ہے۔ رہ گیا یہ مسئلہ کہ کیا اس سے وطی کرنا حلال ہے؟ تو یہ مسئلہ محل نزاع ہے۔ اس سے متنازعین میں سے کوئی ایک بھی استدلال نہیں کرسکتا۔ بلکہ فریق مخالف پر موارد نص و اجماع سے ہی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔

❀❀❀❀

میراث فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مسئلہ

[سلسلہ اعتراضات]: [پہلا اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ ❶ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ دینے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: اے ابو قحافہ کے بیٹے! کیا تم اپنے باپ کے وارث بن سکتے ہو اور میں اپنے باپ کی وارث نہیں بن سکتی؟ اور ایک منفرد روایت سے احتجاج کیا۔ -اور آپ [ابو بکر رضی اللہ عنہ] پر ان کا قرض تھا؛ آپ کے لیے صدقہ حلال تھا- اور اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہم انبیاء کی جماعت ہیں۔ ہم وراثت نہیں چھوڑتے؛ جو کچھ ہم اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' حالانکہ اس بارے میں جو کچھ آپ سے روایت کیا گیا ہے قرآن اس کے خلاف کہہ رہا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر صرف امت کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ بلکہ ان کی روایات کو جھٹلایا ہے۔ جیسا کہ دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوُوْدَ﴾ [النمل ۱۶]

''اور حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث بنے۔''

اور حضرت زکریا علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا٭یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ﴾ [مریم ۵۔۶]

''اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے تو مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرما۔ جو میری اولاد اور اولاد یعقوب کی میراث کا مالک ہو۔''

[جوابات]: اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاسکتا ہے:

پہلا جواب: شیعہ نے جو قول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: کیا تم اپنے باپ کے وارث بن سکتے ہو اور میں اپنے والد کی وارث نہیں بن سکتی؟ اس قول کی صحت کا کوئی علم نہیں ہوسکا۔ اگر یہ قول صحیح ثابت بھی ہو جائے تو اس میں رافضی کے لیے کوئی حجت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے والد محترم کو کائنات بھر کے کسی فرد و بشر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور ابو بکر مؤمنین کو ان کی جانوں سے بڑھ کر عزیز نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ آپ کے

❶ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ترکہ چھوڑا تھا تو سیدہ فاطمہ اس کی تنہا وارث نہ تھیں، بلکہ آپ کی ازواج مطہرات اس میں برابر کی شریک تھیں۔ مزید یہ کہ سیدہ عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اس ضمن میں سرفہرست تھیں جن کے گھر میں آپ نے وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے، حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما بھی برابر کی وارث تھیں۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ورثہ نہ پاسکیں تو آپ کی ازواج مطہرات اور آپ کے چچا عباس بھی ورثہ سے محروم رہے، مگر شیعہ سیدہ فاطمہ کے سوا دیگر اقارب کا ذکر تک نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں باغ فدک اور خیبر کا خمس اہل بیت کے لیے مباح تھا اور وہ ان سے اپنی ضروریات اسی طرح پوری کرتے تھے جس طرح آپ کی زندگی میں، جو بچ جاتا وہ ان مصارف میں صرف کیا جاتا، جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔

والدمحترم جناب رسول اللہ ﷺ ہیں۔اور نہ ہی آپ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے نفلی یا فرض صدقہ کو حرام کیا ہے جیسے آپ کے والدمحترم پر تھا۔اور نہ ہی آپ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جن کی محبت کو اللہ تعالیٰ اپنی جان و مال اور اہل خانہ کی محبت سے مقدم کرنے کا حکم دیا ہے؛ جیسا کہ آپ کے والدمحترم کے لیے یہ حکم تھا۔

انبیائے کرام علیہم السلام اور دوسرے لوگوں کے درمیان فرق یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کے وارث بننے سے پاک رکھا ہے۔تاکہ ان لوگوں کے لیے شبہ کی گنجائش نہ رہے جو کہتے ہیں: انبیاء کرام علیہم السلام نے دنیا اس لیے طلب کی تھی کہ اسے اپنے بعد اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ جائیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے امثال کو وہ مقام نبوت حاصل نہیں ہے جس پر قدح کا اندیشہ نہ ہو۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خط و کتابت ؛ شعر گوئی وغیرہ سے محفوظ رکھا تھا تاکہ نبوت پر کوئی شبہ واقع نہ ہو۔اگرچہ کسی دوسرے کے لیے اس حفاظت میں کوئی حجت نہیں ہے۔

دوسرا جواب: گزارش ہے کہ شیعہ مصنف کا اس کو منفرد روایت قرار دینا صاف جھوٹ ہے۔نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان:

''ہم وراثت نہیں چھوڑتے ؛ جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔'' یہ حدیث خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، زبیر، سعید، عبدالرحمن بن عوف، عباس، ابوہریرہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور آپ کی ازواج مطہرات (رضی اللہ عنہن) نے روایت کی ہے۔ان لوگوں سے یہ روایت مسانید' صحاح ؛ اور دوسری مشہور کتب احادیث میں موجود ہے؛ جسے محدثین کرام اچھی طرح جانتے ہیں۔

اب رافضی کا اس روایت کو منفرد کہنا اس کی انتہائی جہالت یا جان بوجھ کر جھوٹ بولنے پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرا جواب: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ، فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مقروض تھے'' صریح کذب ہے۔کیونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ترکہ کے دعوی دار نہ تھے؛ اور نہ ہی اس مال کو اپنے اہل خانہ کے لیے روکنا چاہتے تھے۔ بلکہ آپ کا ترک کردہ مال صدقہ تھا اور وہ ان کو ملنا چاہیے تھا جو اس کے مستحق ہیں۔جیسا کہ مسجد مسلمانوں کا حق ہے۔اور عدل یہ ہے کہ اگر کوئی انسان کسی دوسرے پر گواہی دے کہ اس نے اپنے گھر کو مسجد کے لیے وقف کرنے کی وصیت کی تھی ۔یا اپنے پانی کے کنوئیں کو عام گھاٹ بنانے یا پھر اپنی زمین کو قبرستان بنانے کی وصیت کی تھی۔تو ایسی گواہی باتفاق مسلمین جائز ہے۔اس کنوئیں سے پانی پیا جائے گا؛ اور اس زمین میں مردوں کو دفن کیا جائے گا۔اس لیے کہ یہ گواہی عوام کی طرف سے غیر محصور ہے۔اور گواہ بھی اس عموم کے حکم میں داخل ہے۔اس کے متعین ہونے کے لیے کسی خاص حکم کی کوئی ضرورت نہیں۔ایسے معاملات میں کوئی فریق مخالف[خصوم] نہیں ہوتا۔

ایسے ہی کسی مسلمان کی بیت المال کے لیے گواہی کا مسئلہ ہے۔مثال کے طور پر کوئی گواہی دے کہ فلاں انسان کے پاس بیت المال کا کوئی حق ہے؛ اور یہ گواہی دینا کہ فلاں انسان کا بیت المال کے علاوہ کوئی وارث نہیں؛ اور ذمی پر گواہی دینا کہ اس نے عہد ذمہ توڑ دیا تھا؛ اور اب اس کا مال مالِ فئے کے طور پر بیت المال میں داخل ہوگا؛ وغیرہ۔

اگر کوئی انسان گواہی دے کہ فلاں انسان نے اپنا مال فقراء اور مساکین پر وقف کردیا تھا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔اگرچہ گواہی دینے والا کوئی فقیر انسان ہی کیوں نہ ہو۔

چوتھا جواب: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس صدقہ کے مستحق نہ تھے۔بلکہ وہ ایسی چیزوں سے بے نیاز انسان تھے۔اور نہ ہی

آپ نے خود اور نہ ہی آپ کے اہل خانہ نے اس صدقہ سے کسی قسم کا فائدہ اٹھایا۔ آپ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مالدار لوگوں کی ایک جماعت کسی انسان کے متعلق گواہی دے کہ اس نے اپنا مال فقراء کے لیے صدقہ کرنے کی وصیت کر دی تھی تو ان لوگوں کی گواہی بالاتفاق مقبول ہوگی۔

پانچواں جواب: یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کا فائدہ یہ حدیث روایت کرنے والے صحابہ کو بھی حاصل ہوتا ہو تو تب بھی ان کی روایت قبول کی جاتی۔ اس لیے کہ اس کا شمار روایت کے باب میں ہوتا ہے گواہی کے باب میں نہیں۔ اسی لیے جب محدث کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس میں اس کے اور فریق مخالف کے درمیان فیصلہ کن حکم موجود ہو تو اس کی روایت حدیث کو قبول کیا جائے گا۔ اس لیے کہ روایت کا حکم عام ہے اس میں راوی اور دوسرے لوگ برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس کا تعلق خبر کے باب سے ہے۔ جیسے کہ چاند دیکھنے کی گواہی۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے جو حکم بیان کیا ہے وہ راوی اور دوسرے لوگوں کے لیے عام ہے۔ ایسے ہی جس چیز سے آپ نے منع کیا ہو یا جس چیز کو مباح قرار دیا ہو۔

یہ حدیث بھی ایک شرعی حکم کی روایت کو متضمن ہے۔ اسی وجہ سے یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی میراث کی حرمت کو شامل ہے۔ اور یہ میراث کی اشیاء کو آپ کے ورثہ سے خریدنے کی حرمت کو بھی متضمن ہے۔ اور اس حدیث میں اس مال کو صدقات کے مصاریف میں خرچ کرنے کے وجوب کا حکم بھی ہے۔

[آیات میراث پر بحث]:

چھٹا جواب: شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ: حالانکہ اس بارے میں جو کچھ آپ سے روایت کیا گیا ہے قرآن اس کے خلاف کہہ رہا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر صرف امت کے ساتھ خاص نہیں کیا۔

☆ اس کا جواب یہ ہے کہ: آیت کے الفاظ کے عموم سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نبی کریم ﷺ وارث بنیں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ فَاِنْ کُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَیْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَکَ وَ اِنْ کَانَتْ وَاحِدَۃً فَلَھَا النِّصْفُ وَ لِاَبَوَیْہِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَکَ اِنْ کَانَ لَہٗ وَلَدٌ فَاِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَہٗٓ اَبَوٰہُ فَلِاُمِّہِ الثُّلُثُ فَاِنْ کَانَ لَہٗٓ اِخْوَۃٌ فَلِاُمِّہِ السُّدُسُ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے اور اگر اولاد میت صرف لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ؛ تو کل ترکے میں انکا دو تہائی اور اگر صرف ایک لڑکی ہو تو اس کا حصہ نصف۔ اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ ہوگا؛ بشرطیکہ میت کی اولاد ہو اور اگر اس کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو ایک تہائی ماں کا حصہ ہے؛ اور اگر میت کے بھائی بھی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ....إلى قوله تعالى........ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ﴾ [النساء ١٢]

''اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں، اگر ان کے اولاد نہ ہوتو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے اور اگر اولاد ہوتو ترکے میں تمہارا حصہ چوتھائی ہے......آگے یہاں تک کہ فرمایا......ادائے وصیت وقرض بعد کے بشرطیکہ میت نے ان میں سے کسی کا نقصان نہ کیا ہو۔''

یہ ان لوگوں کے لیے ایک شامل خطاب ہے جو کہ یہاں پر مقصود ہیں۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے موجب ظاہر ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس آیت میں مخاطب ہیں۔

مخاطب کا ''کاف'' ان کو شامل ہوتا ہے جو خطاب سے مقصود ہوں۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کوئی خاص اس خطاب سے مقصود ہے تو وہ اس خطاب میں شامل نہیں ہوگا۔ پھر بعض علماء کرام نے یہ بھی کہا ہے کہ ضمائر مطلق طور پر تخصیص کو قبول نہیں کرتے۔ تو پھر ضمیر مخاطب کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے کہ ضمیر خطاب تو صرف اس کے لیے ہوتی ہے جو مخاطب کا مقصود ہو؛ یہ ضمیر ان لوگوں کو شامل نہیں ہوتی جن کا قصد نہ کیا جائے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ ضمیر عام ہے' اور تخصیص قبول کرتی ہے؛ تو بلاشبہ یہ ان لوگوں کے لیے عام ہے جو اس خطاب سے مقصود ہیں۔ اس آیت میں کوئی ایک اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کا مقتضی ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان مخاطبین سے مقصود ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: تصور کیجیے! تمام ضمائر خطاب؛ متکلم اور غائب بذات خود کسی متعین چیز پر دلالت نہیں کرتیں؛ مگر اپنے قرائن کی روشنی میں ان کی دلالت واضح ہوتی ہے۔ پس ضمائر خطاب ان لوگوں کے لیے وضع کی گئی ہیں جو مخاطب کے خطاب سے مقصود ہو۔ اور ضمائر متکلم کلام کرنے والے کے لیے ہیں خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ لیکن یہ بات معروف ہے کہ قرآن میں خطاب سے مقصود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مؤمنین ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ [المقرۃ ۱۸۳]

''مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ [المائدہ ٦]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو۔''

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

بلکہ کبھی کبھار قرآن مجید میں جمع کا ''کاف'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مؤمنین کے لیے آتا ہے۔ اور کبھی کبھار صرف مؤمنین کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُوْلٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ﴾ [الحجرات ۷]

''اور جان رکھو کہ تم میں اللہ کے رسول ہیں اگر بہت سی باتوں میں وہ تمہارا کہا مان لیا کریں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ؛ لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔''

یہاں پر کاف صرف امت کے لیے ہے نبی کریم ﷺ کے لیے نہیں۔ اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التوبة ۱۲۸]

''(لوگو) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف انکو گراں معلوم ہوتی ہے اور تمہاری بھلائی کے بہت خواہشمند ہیں۔ اور مومنوں پر نہایت شفقت کرنیوالے اور مہربان ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۳۳]

''مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ [آل عمران ۳۱]

''فرما دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس طرح کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔ ان مواضع پر ''کاف'' خطاب میں رسول اللہ ﷺ شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ﴾ بھی ''کاف'' اسی طرح ہے جیسے مذکورہ بالا آیات میں۔ پس سنت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ظاہر قرآن کے مخالف ہو۔ اسی آیت کی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ☆ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ [النساء ۳۔۴]

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ۔ اور عورتوں کو ان

کے مہر راضی خوشی دے دو ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔''

ان آیات میں ضمائر جیسے: ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ ﴾اور ﴿ تُقْسِطُوْا ﴾اور ﴿فَانْكِحُوْا ﴾اور ﴿ مَا طَابَ لَكُمْ ﴾ ﴿مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ﴾ امت کے لیے ہیں؛ نبی کریم ﷺ کے لیے نہیں۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے لیے جائز تھا کہ آپ چار سے بیویوں سے شادیاں کریں۔اور آپ کو یہ بھی اختیار حاصل تھا کہ بلا مہر شادی کریں۔جیسا کہ نص اور اجماع کی روشنی میں ثابت ہے۔

اگر کوئی یہ بات کہے کہ: جو دلائل تم نے ذکر کیے ہیں ان مثالوں میں ایسے قرآئن موجود ہیں جو ان کے امت کے لیے خاص ہونے کا تقاضا کر رہے ہیں۔پس بیشک آپ ﷺ کی اطاعت کے وجوب کا ذکر کیا جائے؛ یا آپ کی اطاعت و محبت کے لیے خطاب کیا جائے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ اس خطاب میں شامل نہیں ہیں۔

تو اس اعتراض کرنے والے کو کہا جائے گا: ایسے ہی میراث والی آیت کا حال ہے؛ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ﴾ [النساء ۱۲]

''ادائے وصیت و قرض کے بعد کے بشرطیکہ ان سے میت نے کسی کو کوئی تکلیف نہ دی ہو۔''

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ☆وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ [النساء ۱۳۔۱۴]

''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریگا اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کریگا اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے گا اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ نے ان سے عدم درایت کا خطاب کیا؛ جو کہ رسولوں کے احوال کے متناسب نہیں ہو سکتی؛ تو پھر اس کے بعد وہ امور ذکر کیے جن میں ان رسولوں کی اطاعت واجب ہوتی ہے؛ ان ہی امور میں سے میراث کے حصوں کی مقدار بھی تھی اور یہ کہ اگر وہ ان حدود کو قائم رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے تو ثواب کے مستحق ٹھہریں گے۔اور اگر اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں گے تو سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔یہ مخالفت اس طرح ہوگی کہ کسی وارث کو اس کے مقرر شدہ حصہ سے زیادہ دیا جائے۔یا وارث جتنے حصہ کا مستحق ہے؛ اس میں سے کچھ حصہ روک لیا جائے۔آیات مبارکہ دلالت کرتی ہیں کہ ان کے مخاطبین سے درایت کا علم سلب ہے۔تبھی رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر وعدوں کا ذکر کیا گیا۔اور اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے پر برے انجام سے ڈرایا گیا ہے۔حدود میراث میں تجاوز کے خطاب میں

رسول اللہ ﷺ شامل نہیں ہیں۔ جیسا کہ اس جیسے دوسرے خطاب کے مواقع پر امت کو خطاب شامل ہے' آپ کو نہیں۔
جب مال وراثت میں مقرر شدہ حصے ذکر کرنے کے بعد حدود سے تجاوز کرنے کی حرمت کا ذکر کیا گیا تو اس سے دلالت واضح ہوتی ہے کہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کے مقررہ شدہ حصہ میں زیادہ کرے؛ اور آیت دلالت کرتی ہے کہ ان ورثاء کے لیے وصیت کرنا بھی جائز نہیں۔ یہ حکم پہلے حکم کا ناسخ ہے جس میں والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے۔ اب وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔'' [1]

یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے آیت وصیت منسوخ ہوئی ہے۔ اس لیے کہ استحقاق میراث اور استحقاق وصیت میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی۔ اور نسخ اسی وقت ہوتا ہے جب ناسخ اور منسوخ کے مابین منافات پائی جائے۔
سلف اور جمہور مسلمین کہتے ہیں: یہاں پر ناسخ آیت میراث ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے میراث کے حصے مقرر کر دیے ہیں۔ اور پھر ان حصوں سے تجاوز کرنے سے منع کر دیا ہے۔ پس جب مرنے والا اگر وارث کو اس کے مقرر حصہ سے زیادہ دے گا تو وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا ہوگا۔ اور ایسا کرنا حرام ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ اس نے مقرر کردہ حصہ میں زیادہ کیا ہے حقیقت میں وہ دوسرے وارثوں کا اور عصبہ کا حق تھا۔ جب عصبہ کا حق لیا جائے اور اس کو دیا جائے تو ایسا کرنے والا اللہ کے ہاں ظالم ٹھہرے گا۔
اس لیے علمائے کرام کے مابین اس انسان کے مسئلہ میں اختلاف واقع ہوا ہے جس کا کوئی عصبہ نہ ہو۔ تو کیا یہ مال باقی ورثہ پر رد کیا جائے گا یا نہیں؟ جس نے اس رد سے منع کیا ہے؛ انہوں نے کہا ہے: میراث بیت المال کا حق ہے۔ کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں۔ اور جنہوں نے جائز کہا ہے؛ وہ اس پر رد کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس مال کو بیت المال میں اس وقت رکھا جائے گا جب اس کا کوئی خاص مستحق نہیں ہوگا۔ جب کہ ان لوگوں کے عام اور دیگر خونی [رحمی] رشتہ دار موجود ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''حصہ والے اس کے زیادہ حقدار ہیں جن کا کوئی حصہ نہ ہو۔''
یہاں پر بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ رافضیوں کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ اس آیت کے رسول اللہ ﷺ کو شامل ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کر سکیں۔
اگر یہ کہا جائے کہ: اگر نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے کوئی ایک مر جائے؛ جیسے آپ کی تین بیٹیوں کو انتقال ہوا؛ اور آپ کے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا؛ تو کیا آپ ان کے وارث بنیں گے؟
جواب: اس آیت میں خطاب موروثین کے لیے ہے' وارثین کے لیے نہیں۔ تو اس سے لازم نہیں آتا کہ جب آپ کی اولاد موروثین ہونے کی وجہ سے کاف خطاب میں داخل ہیں؛ تو وارثین میں بھی شامل ہوں۔ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہوتی ہے:

﴿وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ﴾ [النساء ١١]

''اور میت کے ماں باپ کا یعنی دونوں میں سے ہر ایک کا ترکے میں چھٹا حصہ ہوگا؛ بشرطیکہ میت کی اولاد ہو۔''

---

[1] رواہ اہل السنن' ابو داؤد ۳/ ۱۵۵؛ والترمذي ۳/ ۲۹۳۔ ورواہ اہل سیر؛ واتفقت الأمة علیه۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر غائب کی ضمیر کے ساتھ ذکر کیا ہے' ضمیر خطاب کے ساتھ نہیں۔ پس نبی کریم ﷺ کے علاوہ آپ کی اولاد یا باقی لوگوں سے میں جتنے بھی موروث ہیں سب کو شامل ہے۔ نبی کریم ﷺ ان مخاطبین کے وارث تھے۔ اور آپ کو اس طرح خطاب نہیں کیا گیا ہے کہ کوئی آپ کا وارث بنے۔ نبی کریم ﷺ کی اولاد بھی ان میں سے ہیں جن کو کاف خطاب شامل ہے۔ تو ان کو وصیت کی گئی ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دولڑکیوں کے برابر ہوگا۔ پس حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ کی وصیت ہے کہ بیٹوں کے لیے دولڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔ اور ان کے والدین کے لیے اگر [اولاد] والدین کی موجودگی میں فوت ہو جائیں؛ تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔

❀ اگر یہ کہا جائے کہ: آیت زوجین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تم [شوہروں کے لیے] اور ان [بیویوں کے لیے]۔''

❀ تو اس کا جواب یہ ہے کہ: پہلی بات یہ ہے کہ: نبی کریم ﷺ کی بیویاں آپ کی وارث نہیں بنیں اور نہ ہی آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے وارث بنے؛ بس صرف آپ کی اکیلی بیٹی ہی آپ کی وارث بنی تھی۔

❀ دوسری بات: اس آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ کی کسی ایسی بیوی کے مرنے کا علم نہیں ہوسکا جس کے پاس مال ہو اور آپ اس کے وارث بنیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال مکہ میں ہوگیا تھا۔ جب زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا الہلالیہ کا انتقال مدینہ میں ہوا؛ لیکن ہمیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ آپ نے کوئی مال بھی چھوڑا تھا؟ اور اس سے پہلے آیتِ فرائض نازل ہو چکی تھی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان سب کو شامل ہے:

﴿وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ﴾ [النساء ۱۱]

''اور جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔''

یہ خطاب عام ہے تم میں سے جس کی بھی بیوی مرے' اور اس کا کوئی ترکہ ہو۔ پس اگر کسی کی بیوی مری ہی نہیں' یا اگر مری ہے تو اس نے اپنے پیچھے کوئی مال نہیں چھوڑا تو ایسا انسان اس کاف خطاب میں شامل نہیں ہے۔

اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ ایک کاف کے شامل ہونے کی وجہ سے دوسرے کاف کا شمول بھی لازم آئے گا۔ بلکہ یہ امر دلیل پر موقوف ہے۔

اگر یہ کہا جائے: تم کہتے ہو: ''' جو احکام آپ کے حق میں ثابت ہیں؛ وہ آپ کی امت کے حق میں بھی ثابت ہیں۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس۔ پس بیشک جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا حکم دیتے ہیں تو وہ تمام امت کو شامل ہوتا ہے۔ یہ بات شارع کی عادت سے معلوم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا﴾ [الأحزاب ۳۷]

''پس جب زید نے اس عورت سے اپنی غرض پوری کر لی تو ہم نے اسے آپ کے نکاح میں دے دیا تا کہ مسلمانوں پر اپنے لے پالک کی بیویوں کے بارے میں کسی طرح تنگی نہ رہے جب کہ وہ اپنی غرض ان سے پوری کر لیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اسے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے تا کہ آپ کی امت کے لیے بھی حلال ہو جائے۔ آپ کو اس حلت میں خاص نہیں کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اگلے حکم میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الأحزاب ۵۰]

''اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کر دے یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے یہ خاص طور پر صرف آپ کے لئے ہی ہے اور مومنوں کے لئے نہیں۔''

تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کاف آپ کو شامل نہیں ہے؟

جواب: شارع کی عادت سے معلوم ہے کہ جب اس کی طرف سے خطاب آتا ہے تو وہ عام اور شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بادشاہوں کی عادت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ کسی امیر کو کوئی حکم دیتے ہیں' تو اس امیر یا عامل کے امثال و نظائر بھی اس میں مخاطب ہوتے ہیں۔ تو یہ عادت اور استقراء سے مخاطب کے لیے کئے گئے خطاب سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ الفاظ کے معانی اہل لغت کے ہاں استقراء و تتبع سے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں فلاں کلمے کا یہ معنی لیا جاتا ہے۔

پس قرآن کریم کی عادت مبارک ہے کہ جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے مختلف رنگ و اسلوب اختیار کرتا ہے۔ کبھی یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو شامل ہوتا ہے اور کبھی شامل نہیں ہوتا۔ تو اس سے واجب نہیں آتا کہ اس موقع پر بھی یہ خطاب آپ ﷺ کو شامل ہو۔ مدعی کے دعوی کی آخری حد یہ ہو سکتی ہے کہ: اصل میں ''کاف'' خطاب آپ کو بھی شامل ہے۔ جیسا کہ اصل میں آپ ﷺ ساری امت کے ساتھ احکام میں برابر ہیں۔ اور احکام شریعت میں آپ اس امت کے ساتھ مساوی ہیں۔ یہاں تک کہ کسی مسئلہ کے آپ کے ساتھ خاص ہونے کی کوئی دلیل مل جائے۔ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بہت سارے خصائص ہیں جو باقی امت کے برعکس صرف آپ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں۔ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے کہ آپ وراثت نہیں چھوڑتے۔ پس کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس حکم میں آپ کی خصوصیت کا انکار کرے؛ یہ انکار وہی کر سکتا ہے جو باقی تمام خصوصیات کا انکار کرتا ہو۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کسی بھی انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ آپ کی خصوصیت کے لیے دلیل طلب کرے۔ پس بطور دلیل اس بارے میں صحیح اور مشہور بلکہ متواتر احادیث موجود ہیں کہ آپ نے وراثت نہیں چھوڑی۔ آپ کے اختصاص میں مروی اہم ترین احادیث میں سے مال فئے کے آپ کے ساتھ خاص ہونے کی احادیث ہیں۔

سلف و خلف میں بہت سارے احکام کے متعلق اختلاف موجود ہے کہ کیا یہ احکام آپ کے ساتھ خاص تھے؟ جیسا کہ فئے اور خمس کے متعلق اختلاف ہے کہ کیا یہ مال آپ کی ملکیت ہوا کرتا تھا یا نہیں؟ اور کیا جو عورتیں آپ پر حرام تھیں وہ آپ کے لیے مباح کر دی گئی تھیں یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿لله و للرسول﴾ [الانفال ۴۱] بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہ فرمان: ﴿لله و الرسول﴾ یہ خمس اور فئے کے بارے میں ہے۔ پس یہاں پر رسول اللہ ﷺ کی طرف اضافت اس حیثیت سے ہے کہ آپ اللہ کے حکم سے اس مال کو تقسیم کرتے ہیں' نہ کہ آپ اس کے مالک ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ کی قسم! میں تم میں سے کسی کو نہ کچھ دیتا ہوں اور نہ ہی کسی سے کچھ روکتا ہوں؛ بلکہ میں تقسیم کرنے والا ہوں؛ میں وہیں پر رکھتا ہوں جہاں کا مجھے حکم دیا جاتا ہے۔'' [البخاری ۴/ ۸۵]

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آپ اموال کے مالک نہیں ہیں' بلکہ آپ اس مال میں اللہ کے حکم کو نافذ کرنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا تھا کہ آپ بادشاہ نبی بن جائیں یا پھر اللہ تعالیٰ کے متواضع بندے اور رسول بن جائیں تو آپ نے متواضع بندہ اور رسول بن جانے کو اختیار فرمایا۔ یہ ان دونوں منزلتوں میں سے اعلیٰ ترین منزلت ہے۔ بادشاہ مال کو اپنی پسند میں خرچ کرتا؛ اس کا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ جب کہ متواضع بندہ رسول مال کو صرف اس جگہ پر خرچ کرتا ہے جہاں کا اسے حکم دیا جائے۔ پس اس لحاظ سے آپ جو بھی کام کرتے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت ہوتی۔ آپ کی تقسیم میں کوئی ایسا مباح امر نہیں ہوتا تھا جس پر آپ کو ثواب نہ ملے۔ بلکہ آپ کو ہر ایک کام پر ثواب ملتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مال فئے دیا ہے' اس میں سے میرا صرف پانچواں حصہ ہے۔ اور یہ پانچواں حصہ بھی آپ لوگوں کی ہی واپس دیا جاتا ہے۔''❶

پس اس اصل کی بنیاد پر آپ کے ہاتھ میں جو بھی اموال تھے؛ اموال بنی نضیر؛ فدک؛ خیبر کا خمس وغیرہ؛ یہ تمام اموال مال فئے تھے؛ جو کہ آپ کی ملکیت نہیں تھے؛ اس وجہ سے وہ آپ کی طرف سے کسی کو وراثت نہیں ملیں گے۔ وراثت میں تو وہ مال ملتا جو آپ کی ملکیت ہوتا۔ بلکہ ان اموال کے متعلق واجب تھا کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے پسندیدہ اور محبوب کاموں میں خرچ کیا جائے گا۔ یہی بات تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے تھے۔

رہی وہ روایات جن کی بنا پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ آپ اس مال کے مالک تھے۔ جیسے کہ وہ مال جس کا ایک حصہ حضرت مخیریق کو دینے کی وصیت کی تھی؛ تو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ: اس مال کا حکم پہلے مال کا ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ وہ مال آپ کی ملکیت تھا۔ لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لیا کریں۔ اور جو ضرورت سے بچ جائے وہ صدقہ ہوگا' اسے وراثت میں نہیں دیا جائے گا۔

جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''میرے ورثہ درہم و دینار تقسیم نہیں کریں گے۔ جو کچھ میں اپنے بعد چھوڑوں گا وہ میری بیویوں کا خرچہ ہوگا اور میرے عمال کی محنت مزدوری ہوگی [جو اس سے بچ جائے] وہ صدقہ ہوگا۔''❷

اور صحیحین میں ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ہم وراثت نہیں چھوڑتے؛ جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔''❸

اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے جن میں سے ابو ہریرہ بھی ہیں۔ اور امام مسلم نے بھی آپ سے اور دوسرے صحابہ کرام سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

یہ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے سیاق میں واقع ہے: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ

❶ سنن أبي داؤد ۳/ ۱۰۹۔ والنسائي ۷/ ۱۱۹۔ ❷ البخاري ٤/ ۱۲۔ مسلم ۳/ ۱۳۸۲۔

❸ البخاري ۸/ ۱۲۵؛ ومسلم ۳/ ۱۳۷۹۔

خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا ☆ وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا﴾ [النساء ۳۔۴]

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو دیگر عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی؛ یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ۔ اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو۔''

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم ارشاد فرمایا:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ [النساء ۱۱]

''اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت فرماتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔''

یہ بات معلوم شدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس آیت میں مخاطب نہیں ہیں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کے لیے دو تین یا چار بیویاں نہیں تھیں۔ بلکہ آپ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ اس سے زیادہ جتنی بھی چاہیں شادیاں کر لیں۔ اور نہ ہی آپ کو یہ حکم تھا کہ بیویوں کو ان کا مہر پورا پورا ادا کریں۔ بلکہ آپ کو اختیار حاصل تھا کہ اگر کوئی عورت اپنا نفس آپ کو ہبہ کر دے تو آپ اسے بغیر مہر کے قبول کر سکتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ وَّ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ [الأحزاب ۵۰]

''اے نبی! ہم نے آپ کے لئے وہ بیویاں حلال کر دی ہیں جنہیں آپ ان کے مہر دے چکے ہیں؛ اور وہ لونڈیاں بھی جو اللہ تعالیٰ نے غنیمت میں آپ کو دی ہیں اور آپ کے چچا کی لڑکیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں بھی جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ باایمان عورت جو اپنا نفس نبی کو ہبہ کر دے یہ اس صورت میں کہ خود نبی بھی اس سے نکاح کرنا چاہے یہ خاص طور پر صرف آپ کے لئے ہی ہے اور مومنوں کے لئے نہیں ہم اسے بخوبی جانتے ہیں جو ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں (احکام) مقرر کر رکھے ہیں یہ اس لئے کہ آپ پر حرج واقع نہ ہو اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بڑے رحم والا ہے۔''

جب یہ سیاق کلام ہے؛ تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ [سابقہ آیت] خطاب امت کے لیے ہے آپ کے لیے نہیں؛ آپ اس آیت کے عموم میں داخل نہیں ہیں۔

❀ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ: اس آیت [سابقہ] میں خطاب عام ہے جو کہ آپ ﷺ کو اور امت کو شامل ہے؛ مگر اسے آیت نکاح اور آیت مہر سے خاص کیا گیا ہے۔

جواب: تو اس سے کہا جائے گا: ایسے ہی آیت میراث سے بھی اس حکم کو خاص کیا گیا ہے۔ جو کچھ بھی تم اس کے جواب میں کہو گے وہی تمہارے اعتراض کا جواب ہوگا۔ بھلے آپ یہ کہو کہ آیت کے الفاظ آپ کو شامل ہیں اور پھر آپ کو اس سے خاص کیا گیا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے کہ: یہ آیت آپ کو شامل نہیں ہے؛ اس لیے کہ آپ اس کے مخاطبین میں سے نہیں تھے ۔یہی بات اس موقع پر بھی کہی جائے گی۔

ساتویں وجہ: اس آیت کا مقصود یہ بیان کرنا نہیں کہ کون وارث بنے گا اور کون وارث نہیں بنے گا اور نہ ہی اس میں وارث اور موروث کے احوال و اوصاف کا بیان ہے ۔ بلکہ یہاں پر مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ مالِ موروث اس تفصیل کیساتھ ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ پس یہاں پر مقصود یہ ہے کہ ان حصہ داروں کو جب وہ وارث بنیں تو اس تفصیل کے ساتھ حصے دیے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مرنے والا مسلمان ہو اور اس کے ورثاء کافر ہوں تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ وہ کفار اس مسلمان کے وارث نہیں بنیں گے۔ اور ایسے ہی اگر مرنے والا کافر ہو اور اس کے اقرباء مسلمان ہوں تو بھی وہ اس کے مال کے وارث نہیں بنیں گے؛ جمہور مسلمین کا یہی مسلک ہے۔ ایسے ہی اگر مرنے والا غلام ہو اور اس کے ورثہ آزاد ہوں؛ یا مرنے والا آزاد ہو اور اس کے ورثہ غلام ہوں؛ اور ایسے ہی جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنے والا بھی جمہور مسلمین کے نزدیک وارث نہیں بنیں گے۔ ایسے ہی غلطی سے قتل کرنے والا دیت میں وارث نہیں بنے گا۔ اس طرح کے باقی مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ جب یہ علم حاصل ہو گیا کہ مرنے والوں میں بعض ایسے بھی ہونگے جنکی اولاد ان کی وارث بنے گی اور بعض کی اولاد ان کی وارث نہیں بنے گی۔ آیت نے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی کہ کون اس کا وارث بنے گا اور کون اس کا وارث نہیں بنے گا۔ اور نہ ہی وارث اور موروث کے کوئی اوصاف و احوال بیان ہوئے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا یہاں پر مقصود اس کی تفصیل کا بیان کرنا نہیں؛ بلکہ ان وارثوں کے حقوق بیان کرنا ہے۔ پس اس آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ کون وارث بنے گا اور کس کا وارث بنے گا۔ اس میں کوئی ایسی دلالت نہیں ہے کہ غیر نبی وارث بنے گا یا اسے وراثت نہیں دی جائے گی۔ تو پھر اس میں نبی کریم ﷺ کے موروث نہ ہونے پر دلالت بدرجہ اولیٰ موجود ہے۔

آٹھویں وجہ: اس سے کہا جائے گا: تصور کیجیے! اس آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اور اس میں سے کسی کافر بیٹے؛ یا غلام یا قاتل کو ایسے دلائل سے خاص کیا گیا ہے جو ان دلائل سے کمزور تر ہیں جن کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کو اس آیت کے عموم سے خارج کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جن صحابہ کرام نے یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے کہ: آپ وراثت نہیں چھوڑتے۔'' وہ ان صحابہ سے زیادہ جلیل القدر اہل علم اور کثرت کے ساتھ ہیں جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں بنے گا۔ یا قاتل کو میراث نہیں ملے گی۔ اور یہ کہ جو کوئی اپنے غلام کو فروخت کرے؛ اور اس غلام کا کچھ مال بھی ہو؛ تو وہ مال بیچنے والے کا ہوگا سوائے اس صورت کے کہ خریدنے والا اس مال کی شرط بھی لگائے۔

❀ خلاصہ کلام! جب یہ آیت کسی نص سے یا اجماع سے مخصوص ہے تو پھر کسی دوسری نص سے اس کی تخصیص کرنا باتفاق مسلمین جائز ہے۔

نویں وجہ: نبی کریم ﷺ کا وراثت نہ چھوڑنا قطعی دوٹوک سنت اور اجماع صحابہ سے ثابت ہے۔ سنت اور اجماع میں سے ہر ایک دلیل قطعی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی ایسی روایت سے نہیں کیا جاسکتا جس کے عام ہونے کے بارے میں گمان کیا جاتا

ہو۔ اگر ایسا کوئی عموم ہو بھی تو نبی کریم ﷺ کا مسئلہ مخصوص ہے۔ اور اگر اسے دلیل تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ دلیل ظنی ہوگی۔ دلیل قطعی کو دلیل ظنی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت کو کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے مختلف اوقات اور مختلف مجالس میں بیان کیا ہے۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس کا انکار کیا ہو۔ بلکہ ہر ایک نے اسے مانا اور اس کی تصدیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی ایک نے بھی میراث حاصل کرنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اور نہ ہی آپ کے چچا محترم [حضرت عباس رضی اللہ عنہ] نے میراث کے لیے اصرار کیا۔ بلکہ ان میں سے اگر کسی نے ایسا کوئی مطالبہ کیا بھی تو اسے جب نبی کریم ﷺ کے اس قول کی خبر دی گئی تو انہوں نے اپنے مطالبہ سے رجوع کر لیا۔ یہ معاملہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے مبارک عہد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور تک ایسے ہی رہا۔ اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی گئی اور نہ ہی آپ کا ترکہ تقسیم کیا گیا۔

[[صحابہ اس بات پر یقین رکھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ضمن میں پیش پیش تھے...... کہ سرور کائنات ﷺ کا وارث کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب منصب خلافت پر فائز ہوئے، تو انہوں نے آپ کے ترکہ کو تقسیم کیا نہ اس کے مصرف میں کوئی تبدیلی پیدا کی۔ آیت میراث کے عموم سے آپ کی وراثت پر استدلال کرنا اس لیے صحیح نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت اس سے مستثنیٰ ہے، جس طرح یہ مسائل استثنائی حیثیت رکھتے ہیں، کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا اور قتل عمد کا مرتکب ورثہ سے محروم رہتا ہے، نیز یہ کہ غلام وارث نہیں ہوتا]]۔

دسویں وجہ: یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے متعلقین کو رسول اللہ ﷺ کے ترکہ سے کئی گنا زائد مال دے دیا تھا۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ بات بھی فراموش کرنے کے قابل نہیں کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے خود اس مال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا؛ بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا متروکہ مال حضرت علی رضی اللہ عنہ و عباس رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے پیش نظر دے دیا تھا کہ وہ اسے انہی مصارف میں خرچ کریں جن میں رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے[1] اس سے اس تہمت کا ازالہ ہو جاتا ہے جو ان دونوں اکابر پر عائد کی جاتی ہے۔

گیارھویں وجہ: شیعہ کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ظالم بادشاہوں کی عادت رہی ہے کہ وہ جب ان دوسرے لوگوں کے بعد اقتدار میں آجاتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ احسان کیا ہو اور ان کی اچھی تربیت کی ہو اور انہوں نے اس گھرانے سے بادشاہی چھین لی ہو؛ تو وہ اس متاثرہ گھرانے کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کرتے ہیں اور انہیں عطیات سے نوازتے ہیں تا کہ انہیں اس منازعت [تنازعہ] سے روک سکیں۔ [اور انہیں کچھ دیکر خاموش کرا دیں]۔

اگر شیعہ کا یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ - العیاذ باللہ - حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ظالم و غاصب تھے، اور انہوں نے جبراً خلافت پر قبضہ جما لیا تھا تو اس کا تقاضا تھا کہ وہ ان ورثاء سے مزاحم نہ ہوتے جو خلافت و امامت کا استحقاق رکھتے تھے، بلکہ خلافت کے دعوی سے دور رکھنے کے لیے انہیں من مانی دولت عطا کر دیتے تا کہ وہ حکومت و خلافت کا مطالبہ نہ کریں۔ جب کہ حکومت بھی چھین لینا اور میراث بھی کلی طور پر روک لینا بادشاہوں کی سیرت میں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی؛ اگر چہ وہ سب سے ظالم اور فاسق و فاجر حکمران ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کچھ نبی کریم ﷺ کے بارے میں کیا گیا ہے وہ بادشاہوں اور حکمرانوں کی عادت و طبیعت سے خارج امر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مؤمنین کی عادات شرعیہ سے بھی خارج

[1] صحیح بخاری ٣٠٩٤، صحیح مسلم:٤٩/ ١٧٥٧۔

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس معاملہ میں خاص کیا ہوا تھا یہ خصوصیت دوسرے حکمرانوں کی نصیب میں نہیں آئی۔آپ کی خصوصیت نبوت تھی؛ اور انبیاء کرام علیہم السلام وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔

انبیاء کی میراث:

بارھویں وجہ: شیعہ قرآن کریم کی آیت:﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ ''اور سلیمان داؤد کے وارث بنے'' نیز:
﴿فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ☆ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ [مریم ۵۔۶]
''پس تو مجھے اپنے پاس سے وارث عطا فرما۔جو میرا بھی وارث ہو اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔''
[ان مذکورہ بالا آیات] سے انبیاء علیہم السلام کی وراثت پر استدلال کرتے ہیں۔حالانکہ ان کا دعوی اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا۔اس لیے کہ ''ورثہ'' اسم جنس ہے اور اس کے تحت متعدد انواع ہیں۔اور ایک عام چیز کا ذکر کرنے سے کسی خاص چیز کا ذکر لازم نہیں آتا۔مثلاً اگر کہا جائے کہ یہاں حیوان موجود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں انسان یا گھوڑا یا اونٹ موجود ہے۔بعینہ اسی طرح ورثہ کا لفظ میراث علم و نبوت اور ملوکیت اور مادی وراثت پر بولا جاتا ہے،مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:
﴿ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ﴾ (فاطر:۳۲)
''پھر ہم نے ان لوگوں کو (اس) کتاب کا وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں پسند فرمایا۔''
نیز فرمانِ الٰہی ہے:﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ☆ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ [المؤمنون]
''وہ ہی ہیں میراث لینے والے۔جو فردوس کے وارث ہونگے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''
نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا ﴾ (الزخرف:۷۲)
''یہ وہ جنت ہے جس کے وارث تمہیں بنایا گیا ہے۔''
اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ ﴾ (الاحزاب:۲۷)
''اور تمہیں ان کی زمینوں کا وارث بنایا۔'' (یہاں پر وراثت سے مراد بادشاہی و خلافت ارضی ہے)۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ ﴾ (الاعراف:۱۲۸)
''بے شک زمین اللہ کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے۔''
﴿ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ ﴾ (الاعراف:۱۳۷)
''ہم نے اس قوم کو وارث بنایا جس کو ضعیف سمجھا جاتا تھا۔''
محدث ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''بیشک انبیاء علیہم السلام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے، بلکہ علمی ورثہ عطا کرتے ہیں۔جس نے یہ علمی ورثہ لے لیا اس نے بہت بڑا حصہ پالیا۔'' [1]
ایسے ہی خلافت کا لفظ بھی ہے۔اسی لیے میت کے پیچھے رہ جانے والوں کو بھی خلیفہ کہتے ہیں۔یعنی اس نے اپنے ترکہ

[1] سنن ابی داود۔ کتاب العلم۔ باب الحث علی طلب العلم، (ح:۳۶۴۱) سنن ترمذی۔ کتاب العلم۔ باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة (حدیث:۲۶۸۲)، ابن ماجة، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم (ح:۲۲۳)

میں فلاں پیچھے [اپنا خلیفہ] چھوڑا۔ [اس لحاظ سے] خلافت کبھی مال میں ہوتی ہے، اور کبھی علم میں ہوتی ہے، اور کبھی ان کے علاوہ دیگر امور میں۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ نیز: ﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ ان میں لفظ ارث جنس وراثت پر دلالت کرتا ہے۔ مالی وراثت پر دلالت نہیں کرتا۔ پس ان آیات سے خاص طور پر مالی وراثت پر استدلال کرنا مصنف کی وجوہ دلالت سے جہالت کی نشانی ہے۔

جیسا کہ اگر کہا جائے: یہ شخص اس کا خلیفہ ہوگا۔ اور اس نے اسے اپنے بعد چھوڑا ہو۔ تو اس سے مطلق خلافت پر دلالت ہوتی ہے؛ اس میں کہیں بھی یہ دلیل نہیں ہے کہ وہ اس کے مال کا یا اس کی عورت و اہل خانہ کا یا اس کی املاک کا وارث بنے گا۔

تیرھویں وجہ: ہم ان نصوص صریحہ کی روشنی میں کہتے ہیں کہ: زیر تبصرہ آیت میں مالی ورثہ مراد نہیں، بلکہ علم و نبوت کی میراث مقصود ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ ﴾ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان کے سوا حضرت داؤد کے متعدد بیٹے اور بھی تھے، اگر مالی ورثہ مراد ہوتا تو وہ تنہا حضرت سلیمان کو ملتا، علاوہ ازیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مالی ورثہ پانے میں کسی کی مدح و ستائش نہیں کی جا رہی نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اور نہ حضرت داؤد علیہ السلام کی، اس لیے کہ نیک و بد سبھی اپنے والد کا مالی ورثہ پاتے ہیں اس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے؟ حالانکہ آیت کا سیاق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مدح اور ان کی خصوصیات کا متقاضی ہے۔ ظاہر ہے کہ مالی میراث ایک عام چیز ہے جو سب لوگوں کے یہاں مشترک ہے؛ جیسے کھانا پینا؛ میت کو دفن کرنا۔ لہٰذا اس طرح کے امور کا انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ذکر و بیان عبث اور کسی فائدہ سے خالی ہے۔ بلکہ وہ چیز بیان کی جاتی ہے جس میں عبرت اور فائدہ ہو۔ وگرنہ کوئی کہنے والا کہے: فلاں انسان مرگیا اور اس کا بیٹا اسکے مال کا وارث بنا۔''

❀ یہ تو اسی طرح ہے جیسے کوئی کہے: اسے دفن کیا؛ اور کوئی کہے: انہوں نے کھایا پیا اور سو گئے؛ یعنی اس طرح کی باتیں جن کا ذکر کرنا [بے موقع اور بے فائدہ ہے] قرآن کے ساتھ اچھا نہیں لگتا۔

اسی طرح زکریا علیہ السلام کے متعلق آیت قرآنی: ﴿يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾ (مریم: ٦)

اس آیت میں بھی مالی ورثہ مراد نہیں، اس لیے کہ حضرت یحییٰ نے آل یعقوب سے مالی میراث حاصل نہیں کی تھی، بلکہ یہ میراث ان کی اولاد اور دیگر ورثہ نے پائی ہوگی؛ اگر ایسا ہوگا۔ [ورنہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مالی وراثت نہیں ہوتی]۔ اور نبی اللہ زکریا علیہ السلام نے بیٹا اس لیے طلب نہیں کیا تھا کہ ان کے مال کا وارث بنے۔ اس لیے کہ اگر مالی وراثت مراد ہوتی تو لازمی طور پر یہ مال آپ سے دوسرے لوگوں کو منتقل ہونا ہی تھا خواہ وہ آپ کا بیٹا ہو یا کوئی اور ہو۔ نیز یہ کہ اگر اس سے مقصود یہ ہوتا کہ صرف بیٹا ہی مالی وارث بنے؛ تو اس سے لازم آتا کہ بیٹے کے علاوہ کوئی دوسرا وارث نہ بنے۔

ایسا کوئی بخیل سے بخیل انسان بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اگر بیٹا موجود ہو تو اسے دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود ہی بیٹے کو نوازنا ہے۔ اور اگر بیٹا نہ ہو تو؛ پھر بیٹے سے صرف یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا یہ مال نہ لے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام مال دار نہ تھے جن کا ورثہ حاصل کیا جاتا۔ آپ بڑھئی کا کام کرتے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام دنیوی مال و متاع سے بے نیاز تھے، لہٰذا حضرت یحییٰ علیہ السلام کا مالی میراث حاصل کرنا خارج از بحث ہے۔

فدک کا معاملہ

[اعتراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے:

''جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:'' میرے والد محترم نے مجھے فدک کی جاگیر ہبہ میں عطا کی تھی۔''❶ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا کہ''کوئی کالا یا گورا لائیے جو اس کی گواہی پیش کرے۔''

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ام ایمن رضی اللہ عنہا کو گواہ کے طور پر پیش کیا؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا کہ''یہ عورت ہے لہٰذا اس کی شہادت مقبول نہیں۔'' حالانکہ روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ''ام ایمن ایک جنتی عورت ہے۔'' پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں شہادت دی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''یہ آپ کے خاوند ہیں لہٰذا ان کی شہادت بھی مقبول نہیں۔'' تمام لوگوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''علی رضی اللہ عنہ حق پر ہے اور علی رضی اللہ عنہ اور حق لازم و ملزوم ہیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے یہاں تک کہ بروز قیامت میرے حضور حوض کوثر پر وارد ہوں۔''

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا یہ سن کر ناراض ہو گئیں اور حلف اٹھایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بات چیت نہیں کریں گی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر ہوں گی (بعد از وفات) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا شکوہ کریں گی۔

جب ان کی وفات کا وقت آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی:'' مجھے رات کی تاریکی میں دفن کرنا اور میرا جنازہ پڑھنے کے لیے ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں بلانا۔

سب روایات میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ! تیری رضا رضائے الٰہی کے موجب ہے اور تیری ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔'' سب کتب احادیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:'' فاطمہ میرا جگر پارہ ہے؛ جس نے اسے تکلیف دی اس نے مجھے تکلیف دی؛ اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی۔'' اگر حدیث نبوی ''لَا نُوْرِثُ'' صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار عمامہ اور خچر حضرت

---

❶ فدک مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر واقع حجاز میں ایک بستی ہے۔ یہ بستی ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد مصالحت کے نتیجہ میں کسی جنگ و قتال کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آئی۔ اس میں پانی کا چشمہ اور کچھ کھجوروں کے درخت تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی آمدنی صدقات و خیرات اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف فرمایا کرتے تھے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ بھی اپنی خلافت کے زمانہ میں اسوۂ نبوی پر گامزن رہے۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو آپ نے حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کے ذمہ یہ خدمت تفویض فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اس بستی کی آمدنی کو رفاہ عام کے کاموں میں صرف کرتے رہیں۔ بعض اوقات حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کے مابین اختلاف رونما ہوتا اور عقدہ کشائی کے لیے بارگاہ فاروقی پر حاضر ہوتے، حضرت عمر ان کے مابین فیصلہ صادر کرنے سے گریز فرمایا کرتے تھے۔ جب اموی خلافت کا زمانہ آیا تو فدک کی بستی پہلے مروان پھر اس کے بیٹوں اور پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تحویل میں آئی، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فدک کا مال اپنے پیش رو خلفاء اربعہ کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیا کرتے تھے۔ ۲۱۰ھ میں خلیفہ مامون کے حکم سے یہ بستی اولاد فاطمہ کے زیر تصرف آئی، چنانچہ محمد بن یحییٰ بن حسین بن زید اور محمد بن عبداللہ بن حسین بن علی اس کے متولی قرار پائے، خلیفہ متوکل عباسی کے عہد خلافت میں جب فدک کے بارے میں اولاد فاطمہ کے مابین نزاع بپا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ فدک کی آمدنی حسب سابق رفاہی کاموں پر خرچ کی جائے جیسا کہ خلافت صدیقی سے لے کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے زمانہ تک ہوتا رہا تھا، یہ طے پایا کہ حکومت اس کی آمدنی اصلاحی کاموں پر صرف کرے گی اور دوسرا کوئی شخص خواہ وہ اولاد فاطمہ میں سے ہو یا کوئی اور اس کا متولی نہیں ہوگا۔

علی رضی اللہ عنہ کو نہ دیتے۔ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دعوی کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ قابل ترجیح نہ ہوتا۔ اور اہل بیت جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں نجاست سے پاک قرار دیا ہے؛ اس چیز کے مرتکب نہ ہوتے جو ان کے لیے جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان پر صدقہ لینا حرام ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بحرین کا مال آیا تو حضرت جابر انصاری رضی اللہ عنہ کے یہ کہنے پر کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا:

''جب بحرین کا مال آئے گا تو میں تمہیں تین لپیں بھر کردوں گا۔'' تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آگے بڑھو اور اس تعداد میں لے لو۔'' اس طرح وہ مال ان کو دے دیا گیا اور گواہ بھی طلب نہ کیا؛ صرف ان کے قول پر اعتبار کیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب :

پہلی وجہ : شیعہ مصنف کے اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ مذکورۃ الصدر واقعہ روافض کا پہلا بہتان نہیں ہے بلکہ وہ ایسے لاتعداد جھوٹ وفساد اور بہتان تصنیف کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں:

شیعہ مصنف نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جاگیر فدک کے جس دعوی کا ذکر کیا ہے؛ یہ دعوی ان کی میراث کے متناقض ہے۔ اگر وہ جاگیر بطور ہبہ آپ کی ملی ہوئی تھی تو پھر اسے بطور وراثت ملنے کا سوال باطل ہے۔ یعنی:

۱۔ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا فدک کی جاگیر ورثہ کی بنا پر طلب کرتی تھیں، تو یہ ہبہ نہیں ہوسکتا۔

۲۔ اور اگر یہ جاگیر آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی تو ورثہ باطل ہوا۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں یہ جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دی تھی - حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منزہ ہیں - اور اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ دوسروں کی طرح آپ کا ترکہ ورثاء کے مابین تقسیم کیا گیا تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ آپ نے اپنی بیماری کی حالت میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ان کے حق سے زیادہ مال کی وصیت کی حالانکہ آپ وارث تھیں ۔ اور اس طرح کی وصیت کرنا وارث کے حق میں ناروا ہے۔ [یا حالت مرض میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کے حق سے زیادہ مال عطا کیا]۔ اور اگر حالت صحت میں آپ نے فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی تھی، تو وہ ہبہ قبضہ ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ ہبہ کرنے والا اگر کوئی چیز ہبہ کرے اور جس کو ہبہ کیا گیا ہے، وہ اس پر قابض نہ ہو، یہاں تک کہ ہبہ کرنے والے کی موت واقع ہو جائے تو ایسا ہبہ جمہور علماء کے نزدیک باطل ہے۔

یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک کی جاگیر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عطا کی اور ام ایمن رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا جملہ صحابہ میں سے کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا۔

دوسری وجہ : سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق اس قسم کے دعوی کا دعوی کرنا آپ پر بہتان ہے۔ امام ابوالعباس بن سریج نے جو کتاب عیسی بن ابان کے رد پر تصنیف کی ہے؛ جس میں انہوں نے ان کیساتھ ''قسم اور گواہ'' کے بارے میں گفتگو کا تذکرہ کیا ہے اور انہوں نے وہاں پر کئی دلائل ذکر کیے ہیں؛ اور عیسی بن ابان کے معارضات کا جواب دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ''بختری بن حسان کی حضرت زید بن علی سے حدیث ذکر کی ہے جس میں انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا ہے کہ: انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فدک کی جاگیر عطا کی تھی۔ اور آپ گواہی میں

ایک مرد اور ایک عورت کو لیکر پیش ہوئیں۔ اور فرمایا: مرد کیساتھ مرد اور عورت کیساتھ عورت۔ سبحان اللہ! یہ کتنی عجیب بات ہے ۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے اپنی میراث کا سوال کیا؛ اور آپ نے انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ہم [انبیاء کی جماعت] وارث نہیں بنتے۔'' دیگر احادیث میں کوئی ایسی چیز روایت نہیں کی گئی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کے علاوہ بھی کسی چیز کا دعویٰ کیا ہو؛ یا کوئی گواہ پیش کیا ہو۔

جریر نے مغیرہ سے اور اس نے عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے' آپ فدک کے بارے میں فرماتے ہیں:

''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سوال کیا تھا کہ جاگیر فدک آپ کو ہبہ کردی جائے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کردیا۔اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اس میں سے خرچ کیا کرتے تھے' اور بنی ہاشم کی بیواؤں کی شادی کراتے اور ان کے کمزور اور ضعیف لوگوں پر خرچ کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معاملہ ایسے ہی رہا۔ آپ نے اس کے صدقہ کرنے کا حکم دیا؛ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے قبول کرلیا۔ اور میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں اس جاگیر کو اسی ڈھنگ پر واپس کرتا ہوں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھی۔''

اس کے علاوہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ انہوں نے دعویٰ کیا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ جاگیر ہبہ کردی تھی۔ ایسی کوئی ایک بھی حدیث متصل سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی گواہ نے آپ کے حق میں کوئی ایسی گواہی دی۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہوتا تو اسے ضرور نقل کیا جاتا۔ اس لیے کہ آپ اس جھگڑے میں فریق تھیں' اور آپ کا معاملہ ظاہر تھا۔ اس معاملہ میں امت کا بھی اختلاف واقع ہوا؛ اور آپس میں بحث مباحثے ہوئے۔ ان میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ گواہی نہیں دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کوئی جاگیر عطا کی ہے۔ یا آپ نے کسی چیز کے بارے میں دعویٰ کیا ہو۔ یہاں تک کہ بختری بن حسان کا دور آگیا۔ اس نے حضرت زید سے کچھ ایسی چیزیں روایت کیں جن کی کوئی اصل ہی نہیں۔ اور نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں اس سے پہلے کس نے روایت کیا۔ یہ سند اہل علم کے ہاں روایت کردہ احادیث [کی اسناد] میں سے نہیں ہے: فضل بن مرزوق نے البختری سے اس نے زید سے روایت کیا ہے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ بعض ان جملوں پر توقف کرکے غور وفکر کرتا جن کا کوئی معنی ہی نہیں بنتا۔

اس روایت میں حضرت زید رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بھی ہیں: اگر اس جگہ پر میں ہوتا تو میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کیا ہے۔ اس سے کوئی بات نہ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر؛ اگرچہ اس [روایت] کی مخالفت کرنے والا کوئی ایک بھی نہ ہو۔ اور اگرچہ اس بارے میں مناظرہ بھی نہ ہوا ہو۔ تو پھر کیسے یہ ہوسکتا ہے جب کہ اس بارے میں روایات بھی موجود ہوں۔

دین کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہوجائے؛ اور پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کہیں [تو حجت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوگی]۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں سے ایسی بات ہوسکتی ہے؛ جیسا کہ دادی کے مسئلہ پر آپ سے غلطی ہوگئی تھی؛ مگر جب آپ کو صحیح حدیث پہنچ گئی تو آپ نے اس کی طرف رجوع کرلیا۔

اگر یہ حدیث ثابت بھی ہوجائے تو پھر بھی رافضی کے لیے اس میں کوئی حجت نہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے یہ نہیں فرمایا: میں اپنے گواہ کے ساتھ قسم اٹھاتی ہوں؛ اور آپ کو منع کردیا گیا ہو۔ یا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہو کہ: میں گواہ کیساتھ قسم اُٹھانے کو جائز

نہیں سمجھتا۔

نیز علماء کرام رحمہم اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: یہ حدیث غلط ہے۔ اس لیے کہ حضرت اسامہ بن زید سے زہری روایت کرتے ہیں ان سے مالک بن اوس بن حدثان روایت کرتے ہیں: آپ نے فرمایا: ''جس چیز سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا ہے' کہ آپ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین قسم کے اموال تھے: بنونضیر۔ خیبر اور فدک۔

بنونضیر کے اموال کو آپ کے نائبین و عمال کے لیے روک کر رکھا گیا تھا۔

فدک کی جاگیر مسافروں اور ابناء سبیل کے لیے تھی۔

خیبر: اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ دو حصے مسلمانوں کے مابین تھے۔ اور ایک حصہ آپ کے اہل خانہ کے نان و نفقہ کے لیے تھا۔ جو کچھ آپ کے اہل خانہ کے اخراجات سے بچ جاتا اسے آپ دو حصے کر کے فقراء مہاجرین میں تقسیم کر دیتے تھے۔

حضرت لیث عقیل سے؛ وہ ابن شہاب سے؛ وہ عروہ روایت کرتے ہیں: بیشک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو خبر دی کہ: دختر نبی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے (کسی کو) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے زمانہ خلافت میں بھیجا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مال کی جو اللہ تعالی نے آپ کو مدینہ اور فدک میں دیا تھا اور خیبر کے بقیہ خمس کی میراث چاہتے ہیں۔ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''ہمارے مال کا کوئی وارث نہیں، جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے ہاں آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے (بقدر ضرورت) کھا سکتی ہے۔'' اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں آپ کے عہد مبارک کے عمل کے خلاف بالکل تبدیلی نہیں کر سکتا؛ اور میں اس میں اسی طرح عمل درآمد کروں گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے۔'' یعنی حضرت ابوبکر نے اس میں ذرا سی چیز بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا'' [1]۔

ابوالیمان شعیب سے' وہ زہری سے' وہ حضرت عروہ بن زبیر سے؛ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ:

''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کے پاس آدمی بھیج کر ان سے اپنی میراث طلب کی یعنی وہ چیزیں جو اللہ تعالی نے اپنے رسول کو فئے کے طور پر دی تھیں؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مصرف خیر جو مدینہ منورہ اور فدک میں تھا اور خیبر کی متروکہ آمدنی کا پانچواں حصہ۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے؛ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مال یعنی اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مال میں سے کھا سکتے ہیں' ان کو یہ اختیار نہیں کہ کھانے سے زیادہ لے لیں'' [2]۔

صالح ابن شہاب سے' وہ عروہ بن زبیر سے' وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں آپ فرماتی ہیں:

''صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ مال دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اس میں تصرف فرمایا ہے میں اس میں سے آپ کے کسی عمل کو نہیں چھوڑ سکتا؛ میں ڈرتا ہوں کہ اگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ عمل سے کچھ بھی چھوڑ دوں گا تو گم کردہ راہ ہو جاؤں گا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مال موقوفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت

[1] صحیح بخاری: ح:١٤١٦۔ [2] صحیح بخاری: ح ٩٢٥۔

علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا۔ لیکن خیبر اور فدک اپنی نگرانی میں رکھا تھا اور کہا تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا وقف ہے اور آپ نے ان دونوں کو ان مصارف وضروریات کے لیے رکھا تھا' جو درپیش ہوتے رہتے تھے۔ اور ان کے انتظام کا اختیار خلیفہ وقت کو دیا تھا۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ یہ دونوں آج کی تاریخ تک اپنی اسی حالت وکیفیت میں بطور وقف موجود ہیں۔'' ❶

یہ احادیث ثابت شدہ اور اہل علم کے ہاں بڑی معروف ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جناب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنے والد کی میراث طلب کی تھی۔ اس لیے کہ آپ یہ جانتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کی میراث ہے۔ لیکن جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بتائی گئی؛ تو آپ نے اسے مان لیا' اور واپس چلی گئیں۔ اور آپ اسے بطور وراثت کیسے طلب کرسکتی تھیں کہ آپ کے متعلق ان چیزوں کی ملکیت ہونے کا دعوی بھی تھا۔ یہ تو ایک لایعنی سی بات ہے۔

اس کتاب کے مصنف [ابن مطہر] کو چاہیے تھا کہ وہ غور وفکر سے کام لیتا۔ مگر کسی بھی چیز کی محبت انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ......میں بھی [قرآن کو] ایسے ہی پڑھتا ہوں؛ جیسے آپ پڑھتی ہیں؛ لیکن میرے علم میں آپ نے کہیں بھی یہ نہیں فرمایا کہ: [یہ سارا مال آپ کے لیے ہے]

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا؛ کیا یہ مال آپ کے لیے اور آپ کے اقارب کے لیے ہے؟

آپ نے فرمایا: نہیں ؛ اور آپ میرے نزدیک سچی اور امانت دار ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے آپ سے اس قسم کا کوئی عہد لیا ہے' یا آپ سے کوئی وعدہ کیا ہے' یا پھر کوئی ایسی بات کہی ہے جس کے موجب یہ صدقات آپ کے ہوسکتے ہیں؟

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ؛ صرف اتنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

''اے آل محمد! تمہیں خوشخبری ہو؛ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تونگری لے آئے ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے سچ فرمایا' اور آپ بھی سچ کہتی ہیں۔ آپ کے لیے مال فئے ہے۔ اور میرے علم کے مطابق اس آیت کی تاویل کی روشنی میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ پورے کا پورا حصہ آپ لوگوں کو دیدیا جائے۔ لیکن آپ کے لیے آپ کی ضرورت کے مطابق مال فئے ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بات سنتے اور مانتے تھے۔ تو پھر جب آپ کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت گواہ بھی موجود ہوں تو آپ کی بات کیسے رد کی جاسکتی تھی؟

تیسری وجہ : اگر اس مفروضہ کی صحت تسلیم کر لی جائے کہ نبی کریم ﷺ کا ترکہ بھی تقسیم کیا جاتا؛ تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعویٰ کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے حریف ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کے خلاف صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جمہور مسلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اور اگر آپ کا ورثہ ناقابل تقسیم تھا تو اس معاملہ میں فریق حریف تمام مسلمان ہیں؛ ان کے خلاف بھی صرف ایک عورت یا صرف ایک مرد اور ایک عورت کی شہادت جمہور مسلمین کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ البتہ ایسے واقعات میں فقہاء حجاز اور محدثین کے نزدیک مدعی کے حق میں ایک گواہ کیساتھ اس کی حلف کو شامل کر کے فیصلہ صادر کیا جاسکتا ہے۔

❶ صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر ۳٤٤۔

بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت کے بارے میں علماء کے دو مشہور اقوال ہیں، امام احمد سے بھی اس ضمن میں دو روایتیں منقول ہیں:

۱۔ پہلی روایت: مقبول نہیں، امام ابوحنیفہ، مالک، لیث بن سعد، اوزاعی، اسحاق رحمہم اللہ اور دیگر ائمہ کا مذہب بھی یہی ہے۔

۲۔ امام احمد کا دوسرا قول: خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہے، امام شافعی، ابوثور اور ابن المنذر کی بھی یہی رائے ہے۔

بنا بریں اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ کی صحت کو تسلیم بھی کیا جائے، تو حاکم وقت ایک مرد یا ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کر سکتا، خصوصاً جب کہ اکثر علماء کے نزدیک خاوند کی شہادت بیوی کے حق میں مقبول ہی نہیں۔ اور پھر علماء کرام کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صرف ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ اور جو کوئی ایک گواہ اور قسم کی بنا پر فیصلہ کرنے کا کہتے ہیں: تو وہ بھی طالب دعوی کے لیے اس وقت تک فیصلہ کرنے کا نہیں کہتے جب تک اس سے پختہ حلف نہ لے لیا جائے۔

چوتھی وجہ: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کو لے کر آئیں؛ اور انہوں نے گواہی دی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورت کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔'' سب محدثین نے روایت کیا ہے کہ ام ایمن ایک جنتی خاتون ہیں۔''

جواب: یہ ایک جاہلانہ بات ہے، شیعہ مصنف ایسی روایات سے استدلال کرنا چاہتا ہے جو اس کے حق میں مفید ہونے کی بجائے مضر ہے۔ اگر ایسی بات حجاج بن یوسف یا مختار بن ابی عبید جیسے ظالم لوگوں کے منہ سے بھی نکلتی تو اس کی صداقت میں ذرہ بھر بھی شبہ نہ ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالی معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا خصوصاً جب کہ مدعی ایک ایسی چیز کی ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہو جو کسی اور کے زیر تصرف ہو اور ظاہر میں وہ کسی غیر کا حق ہو۔ مگر یہاں تو اس کے قائل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے صادق القول بزرگ ہیں۔

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار نے کہا ہے کہ حدیث ''ام ایمن ایک جنتی عورت ہے۔'' سب محدثین نے روایت کی ہے۔''

[جواب]: یہ صریح کذب ہے۔ یہ روایت کتب حدیث میں مذکور نہیں اور نہ ہی کسی محدث نے اسے روایت کیا ہے۔ ام ایمن اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی والدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ رہ چکی تھیں۔ یہ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچی تھیں اور صحابیات میں بڑی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ بایں ہمہ روایت حدیث میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل علم پر افترا پردازی کر کے کوئی روایت بیان نہیں کی جا سکتی۔

باقی رہی یہ بات کہ بقول شیعہ مصنف ''یہ روایت سب نے ذکر کی ہے۔'' بالکل غلط ہے، ایسا دعویٰ صرف حدیث متواتر کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص اکابر صحابہ کی بیان کردہ حدیث ''لا نــورث '' کا منکر ہو اور ام ایمن کے بارے میں ذکر کردہ حدیث کو متواتر قرار دیتا ہو اس کے اجہل الناس اور منکر حق وصداقت ہونے کے بارے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

اگر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بشرط صحت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بارے میں جنت کی بشارت دی ہے؛ تو ایسا مژدہ آپ نے دیگر صحابہ کے بارے میں بھی سنایا ہے۔ آپ نے دس صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں جنت کی بشارت سنائی ہے۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ: بیعت الشجرہ میں شمولیت کرنے والوں میں سے کوئی بھی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ [1]

یہ حدیث سنداً صحیح اور محدثین کرام کے نزدیک مسلّم ہے۔ وہ حدیث جس میں آپ نے صحابہ کے بارے میں جنت کی شہادت دی ہے، اہل سنن نے متعدد طرق سے بروایت عبدالرحمٰن بن عوف، سعید بن زید نقل کی ہے۔ [2]

یہ روایات محدثین کے نزدیک عام طور سے معروف ہیں۔

پھر جن احادیث میں صحابہ کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے، شیعہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور صحابہ پر یہ کہہ کر معترض ہوتے ہیں کہ وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہوں نے ایک عورت کی گواہی قبول نہیں کی؛ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اسے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے، کیا اس سے بڑا جہل وعناد اور بھی ہوسکتا ہے؟

علاوہ ازیں یہ ضروری نہیں کہ جو شخص جنتی ہو وہ مقبول الشہادۃ بھی ہو۔ اس لیے کہ اس امر کا احتمال موجود ہے کہ وہ شہادت دینے میں غلطی کا ارتکاب کررہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر حضرت خدیجہ، فاطمہ و عائشہ رضی اللہ عنہن جیسی جنتی عورتیں شہادت دیں تو قرآن کے حکم کے مطابق ان کی شہادت کو مرد کی شہادت کے مقابلہ میں نصف شہادت قرار دیا جائے گا۔ جس طرح ان میں سے کسی ایک کا میراث میں حصہ مرد کے مقابلے میں نصف ہوتا ہے۔ اور اس کی دیت بھی مرد سے آدھی ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف مذکور نہیں، تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے۔ پس کسی عورت کے جنتی ہونے سے اس کا مقبول الشہادۃ ہونا لازم نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شہادت دینے غلطی کررہی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جھوٹا شخص دروغ گوئی سے تائب ہوکر جنت میں جاسکے۔

پانچویں وجہ: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اس لیے قبول نہ کی کہ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے۔'' یہ صریح کذب ہے، اگر اس کی صحت کو تسلیم کرلیا جائے تو بھی ہمارے حق میں مضر نہیں۔ اس لے کہ بیوی کے حق میں خاوند کی شہادت اکثر علماء کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ جو علماء اس کی قبولیت کے قائل ہیں وہ اس شرط کے ساتھ قبول کرتے ہیں کہ شہادت کا نصاب پورا ہوجائے، مثلاً خاوند کے ساتھ ایک مرد گواہ اور بھی ہو یا دو عورتیں ہوں، ایک آدمی اور ایک عورت کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر کرنا جب کہ مدعی سے حلف بھی نہ لیں؛ ناروا ہے۔

چھٹی وجہ: شیعہ مصنف کی پیش کردہ روایت کہ ''علی رضی اللہ عنہ حق پر ہیں اور حق آپ کے ساتھ لگا لپٹا رہے گا؛ اور یہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہوجائیں۔''

اور پھر یہ کہنا کہ یہ روایت سب علماء نے بیان کی ہے۔ یہ روایت بیان کرنے میں کذب و جہالت کی انتہا ہے۔ یہ روایت بسند صحیح یا ضعیف کسی نے بھی نقل نہیں کی۔ پھر یہ کہنا کس حد تک صحیح ہے کہ ''یہ روایت سب محدثین نے بیان کی ہے۔'' اس شخص سے زیادہ جھوٹا اور کون ہوسکتا ہے، جو کسی روایت سے متعلق کہے کہ سب صحابہ و علماء نے یہ روایت بیان کی ہے، حالانکہ وہ حدیث اصلاً کسی ایک سے بھی منقول نہ ہو؛ یہ کھلا ہوا کذب و افترا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل اصحاب الشجرة رضی اللہ عنہم (حدیث:٢٤٩٦)

[2] سنن ابی داؤد۔ کتاب السنة۔ باب فی الخلفاء (حدیث:٤٦٤٩، ٤٦٥٠) و سنن ترمذی کتاب المناقب۔ باب مناقب سعید بن زید رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٥٧) عن سعید بن زید رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٤٧) عن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ۔

البتہ اگر یوں کہا جاتا کہ بعض علماء نے یہ روایت بیان کی ہے تو بھی یہ بات کسی حد تک دائرہ امکان کے اندر ہوسکتی تھی ۔ لیکن اس روایت کا اعتبار ہی کیا ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ پر سراسر بہتان اور جھوٹ ہے ۔ بخلاف اس روایت کے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''ام ایمن جنتی عورتوں میں سے ہے ۔'' ایسا کہنا ممکن ہے ۔ اس لیے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نیک عورت تھیں ' آپ مہاجرات صحابیات میں سے تھیں ؛ آپ کو جنت کی بشارت دیے جانے میں کوئی حرج والی بات نہیں ۔ بخلاف اس کے کہ کسی ایک انسان کے متعلق کہا جائے کہ: ''حق اسی کیساتھ ہوگا وہ جہاں کہیں بھی ہوگا اور یہ اس وقت تک جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں ۔'' رسول اللہ ﷺ کی ہستی ایسے کلام سے منزہ و مبراء ہے ۔

[مذکورۃ الصدر حدیث درج ذیل وجوہ و اسباب کی بنا پر معنوی اعتبار سے بھی نا قابل قبول ہے]:

اول: حوض نبوی پر اشخاص وارد ہوں گے ۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا تھا:

''تم صبر کرو یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے آملو ۔''

اور دوسری روایت میں ہے: ''بیشک میرا حوض ایلہ سے لیکر عدن تک بڑا ہوں گا ۔ اور اس حوض پر آنے والے سب سے پہلے لوگ فقراء مہاجرین ہوں گے ۔ پراگندہ سروں والے میلے کپڑوں والے ' جو مالدار عورتوں سے شادی نہیں کر سکتے ' اور جن کے لیے بند دروازے نہیں کھولے جاتے ۔ ان میں سے کسی ایک کی موت آتی ہے تو اس کی خواہش اس کے سینے میں ہوتی ہے ۔ اس کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی ۔'' [رواہ مسلم ٤/ ١٩٠٢؛ البخاری ٣/ ١٩٠]۔

جب کہ حق کوئی مجسم چیز یا اشخاص میں سے نہیں جو حوض پر وارد ہونے کے قابل ہو ۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ؛ وہ کتاب اللہ اور میرے اہل بیت کی عترت ؛ یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں ۔''

وہ حدیث [حضرت علی رضی اللہ عنہ والی] بھی اسی باب سے ہے ۔ اس میں کچھ کلام بھی ہے جو کہ اپنے موقع پر ذکر کیا جائے گا ۔

اگر اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے مراد قرآن کا ثواب ہوگا ۔ رہا یہ مسئلہ کہ حق ایک شخص کیساتھ گھومتا ہو' اور وہ شخص حق کے ساتھ گھومتا ہو؛ وہ اس شخص کی صفت [لازمہ] ہو کہ اس سے آگے تجاوز نہ کر سکتا ہو ۔ تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس کا قول سچا ہوگا؛ عمل نیک اور صالح ہوگا؛ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہوسکتی کہ اس کے علاوہ کسی غیر کے پاس حق میں سے کچھ بھی نہیں ہوگا ۔

حالانکہ حق صرف آنحضرت ﷺ کیساتھ گردش کرتا ہے اور دوسرا کوئی انسان اس خصوصیت کا حامل نہیں ۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ وصف تسلیم کیا جائے تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی طرح معصوم ہونا لازم آتا ہے ۔ شیعہ جہالت کی بنا پر عصمت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ کرتے ہیں ۔ جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ علی، ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی نسبت معصوم تر نہ تھے ؛ بلکہ یوں کہیے کہ ان میں سے کوئی بھی معصوم نہیں ۔ اور لوگ شیعہ کی دروغ گوئی سے بخوبی واقف ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل و فتاویٰ بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے فتاویٰ ۔ ایسا ہرگز نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ خلفاء ثلاثہ کے فتاویٰ کی نسبت اولیٰ بالصواب ہوں ۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات کی نسبت ضعیف و مرجوح ہیں ۔ یہ بھی درست نہیں کہ آپ دیگر خلفاء کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ

سے زیادہ خوش اور ان کے زیادہ ثنا خواں تھے۔ بخلاف ازیں اگر کوئی شخص کہے کہ رسول اللہ ﷺ عمر بھر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی ناراض نہیں ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متعدد مرتبہ زجر و عتاب فرمایا تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے بارگاہ نبوی میں یہ شکوہ پہنچایا اور کہا: ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹیوں کی حمایت نہیں فرماتے۔'' تو آپ نے مسجد نبوی میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا:

''بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اپنی بیٹی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے کی اجازت طلب کی ہے۔''

واضح رہے کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، میں اس کی اجازت نہیں دیتا، [آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے]۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ اگر میری بیٹی کو طلاق دے دیں تو ان کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ! میرا جگر پارہ ہے جو اس کو شک میں ڈالتا ہے، وہ مجھے شک میں مبتلا کرتا ہے اور جو چیز اس کو ایذا دیتی ہے وہ مجھے ایذا دیتی ہے۔ پھر آپ نے اپنے ایک داماد [1] کا ذکر کیا جو بنی عبد شمس کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

آپ نے فرمایا: اس (آپ کے داماد ابوالعاص) نے جب بات کی تو سچ بولا اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کیا۔ [2]

---

[1] ان کا نام ابوالعاص بن ربیع بن عبدالعزی بن عبد شمس بن عبد مناف ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کے سب سے پہلے داماد اور آپ کی سب سے بڑی دختر فرخندہ اختر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے خاوند تھے، ان کی بیٹی کا نام امامہ تھا جن کو حالت نماز میں آپ کندھے پر اٹھا لیا کرتے تھے، جب سجدہ کو جاتے تو زمین پر رکھ دیتے اور جب کھڑے ہوتے اٹھا لیا کرتے تھے، (صحیح بخاری۔ کتاب الصلاۃ ، باب اذا حمل جاریۃ صغیرۃ علی عنقه فی الصلاۃ (ح:٥١٦)، صحیح مسلم۔ کتاب المساجد، باب جواز حمل الصبیان فی الصلاۃ (حدیث: ٥٤٣) یہ وہی امامہ بنت ابوالعاص ہیں کہ جب ان کی خالہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا تو حضرت علی نے ان سے نکاح کر لیا تھا۔ ابوالعاص متاخر الاسلام ہیں۔ غزوۂ بدر میں یہ قریش کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے کے لیے گئے تھے، اور قید کر لئے گئے، جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا تو حضرت زینب نے وہ ہار مدینہ روانہ فرمایا جو رخصتی کے وقت ان کی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو پہنایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ہار پہچان لیا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا:
''اگر تم مصلحت دیکھو تو زینب کے قیدی کو رہا کر دو اور ہار اسے واپس دے دو۔'' (سنن ابی داؤد۔ باب فی فداء الاسیر بالمال، (ح:٢٦٩٢)
صحابہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ بعد ازاں حضرت زینب نے ابوالعاص سے ہجرت کی اجازت طلب کی جو اس نے دے دی، ابوالعاص ایک تجارتی قافلہ کو لے کر ملک شام گئے، ساحل سمندر پر مسلمانوں کی ایک جماعت آباد تھی جس میں ابو جندل اور ابو بصیر بھی شامل تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ابوالعاص کو قید کر لیا اور مدینہ پہنچا دیا۔ نبی ﷺ نے یہ دیکھ کر فرمایا: زینب نے ابوالعاص کو مال و متاع سمیت پناہ دی ہے۔ قید کرنے والوں نے ابوالعاص کو اسلام لانے کی ترغیب دلائی اور ابوالعاص کو مخاطب کر کے کہا ''ابوالعاص! آپ اشراف قریش میں شمار ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ آپ رسول اللہ کے چچا زاد اور داماد بھی ہیں اگر آپ مشرف باسلام ہو جائیں تو اہل مکہ کا سب مال آپ کو غنیمت میں مل جائے گا۔ ابوالعاص نے جواباً کہا ''تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے، کہ میں مکر و فریب کے ساتھ اپنے مذہب کو چھوڑوں۔'' جب آپ نے ابوالعاص کو رہا کیا تو پہلے مکہ گئے اور حق داروں کی ایک ایک پائی ادا کی، پھر کھڑے ہو کر اہل مکہ کو مخاطب کر کے کہا ''مکہ والو! بتائیے کیا میں نے واجب الاداء حقوق ادا کیے یا نہیں۔''؟ انہوں نے کہا 'اللہ کی قسم! ضرور۔'' تب ابوالعاص نے کلمہ شہادت پڑھا اور عازم مدینہ ہوئے، سرور کائنات ﷺ نے حضرت زینب کو ابوالعاص کے یہاں بھیج دیا، اور نکاح جدید کی ضرورت نہ سمجھی۔ (مستدرك حاكم (٣/٢٣٦-٢٣٧) سيرة ابن هشام (ص:٣١٢، ٣١٤) سنن ابی داؤد۔ باب الی متی ترد علیه امراته (ح٢٢٤٠) بذكر النكاح فقط۔ ابوالعاص اموی اور ان کے اشباہ و امثال جن بلند اخلاق اور اوصاف کے حامل تھے، ان کا ذکر و بیان یہاں ممکن نہیں۔
ظہور اسلام سے قبل وہ جس طرح عرب بھر میں ممتاز تھے، اسلام لانے کے بعد تاریخ اسلام میں بھی انہیں بلند مقام حاصل ہوا۔ عربوں کے اخلاق جلیلہ اور ان کی بلند پایہ عربی فطرت ہی ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم قوم کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب ذکر اصهار النبی ﷺ (ح:٣٧٢٩، ٥٢٣٠)۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل فاطمة رضی اللہ عنہا، (ح:٢٤٤٩) اس کے سیاق و سباق میں اختلاف ہے۔

ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر دستک دے کر دریافت فرمایا:

''کیا تم نماز (تہجد) نہیں پڑھتے ہو؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں جب چاہتا ہے جگا دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر افسوس کے عالم میں اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چل دیئے، زبان مبارک پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری تھے:

﴿ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴾ [الکهف ۵۴]

''انسان جھگڑا کرنے میں سب چیزوں سے بڑھا ہوا ہے۔''❶

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مسائل و فتاویٰ کا تعلق ہے، آپ نے فتویٰ دیا تھا کہ جب کسی عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت ''اَبْعَدُ الاجَلَيْنِ'' (عدت وفات اور وضع حمل ہر دو میں سے جو بعید تر ہو) ہے، عہد نبوت میں جب ابو سنابل بن بعکک نے یہی فتویٰ دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابو سنابل جھوٹ کہتا ہے۔❷

اس کے نظائر و امثال بہت ہیں۔ بہر کیف صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی بنا پر فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ وہ خود اپنے حق میں فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

شیعہ مضمون نگار نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا جو واقعہ ذکر کیا ہے وہ ان کے شایان شان نہیں۔ شیعہ مصنف اس زعم باطل میں مبتلا ہے کہ اس سے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح و ستائش ہو رہی ہے، حالانکہ یہی واقعہ ان کے حق میں تنقیص شان کا موجب ہے۔ بشرط صحت اس واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں فیصلہ صادر نہ کیا تو آپ کس لیے ناراض ہو گئیں......؟ اس لیے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ حق و صداقت پر مبنی تھا، جس کی خلاف ورزی کسی کے لیے بھی درست نہیں، لہٰذا اس میں ناراض ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اللہ و رسول ﷺ کے حکم کے برخلاف اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے اور جب حاکم ایسا نہ کر سکے تو وہ اس سے ناراض ہو جائے اور بات چیت ترک کرنے کی قسم کھالے تو یہ بات اس شخص کے لئے نہ موجب مدح ہے اور نہ حاکم کے حق میں سبب جرح و قدح۔ بخلاف ازیں یہ بات ایسا تقاضا کرنے والے کے لیے جرح و قدح سے قریب تر ہے۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا و دیگر صحابہ سے اس قسم کے جو واقعات منقول ہیں ان میں سے اکثر صریح کذب اور بعض تاویل پر مبنی ہیں۔ اور اگر ان میں سے بعض گناہ کے موجب بھی ہوں تو ہمیں کب اس سے انکار ہے، کیونکہ ہم صحابہ کو معصوم نہیں مانتے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ اولیاء اللہ اور اہل جنت میں سے ہونے کے باوصف گناہوں سے بری نہ تھے۔ ہم پرامید ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی مغفرت فرمائے گا۔

رافضی مصنف نے جو ذکر کیا ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ سے گفتگو نہ کرنے کی قسم کھا لی اور کہا کہ اپنے والد محترم (ﷺ) سے مل کر اس کا شکوہ کریں گی؛ یہ بات شان فاطمہ رضی اللہ عنہا کے منافی ہے۔ شکوہ صرف بارگاہ ربانی میں

❶ صحیح بخاری، کتاب التهجد۔ باب تحریض النبی صلی الله علیه وسلم علی قیام اللیل، (حدیث:۱۱۲۷) صحیح مسلم ۔ کتاب صلاة المسافرین۔ باب الحث علی صلاة اللیل و ان قلت۔(حدیث:۷۷۵)۔

❷ صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً(حدیث:۳۹۹۱) صحیح مسلم۔ کتاب الطلاق، باب انقضاء عدة المتوفی عنها زوجها، (حدیث:۱۴۸۴) مسند احمد(۱/ ۴۴۷)۔

کیا جا سکتا ہے اور بس! قرآن میں ارشاد ہوتا ہے اللہ کے ایک نبی نے کہا تھا:

﴿ اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (یوسف: ۸۶)

''میں بارگاہ ایزدی میں اپنے حزن و ملال کا شکوہ کرتا ہوں۔''

موسیٰ علیہ السلام دعا فرمایا کرتے تھے: ''بارالٰہی! مدح و ستائش صرف تیرے لیے ہے، تیرے حضور ہی میں شکایت کی جاتی ہے تجھی سے مدد چاہی جاتی ہے اور تجھی سے فریادرسی کی جاتی ہے، ہمارا تکیہ صرف تیری ہی ذات پر ہے۔''

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے کیجئے، اور اگر مدد طلب کرنا ہو تو اللہ سے کیجئے۔''[1]

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے سوال کیجئے یا مجھ سے طلب امداد کیجئے، قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾ (الانشراح: ۷، ۸)۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی شخص حاکم سے مال طلب کرے اور غیر مستحق ہونے کی بنا پر حاکم اس کا مطالبہ پورا نہ کرے اس پر مزید یہ کہ حاکم اس مال کو اپنے عزیز و اقارب پر بھی صرف نہ کر رہا ہو بلکہ حسب موقع و مقام سب مستحق مسلمانوں کو دیتا ہو۔[2] پھر کہا جائے کہ وہ طالب مال حاکم سے بگڑ گیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی ناراضگی کا موجب صرف یہ امر ہے کہ حاکم نے اس کو مال نہ دیا اور یہ کہہ دیا کہ دوسرے لوگ اس کی نسبت اس مال کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس ناراضگی میں طالب مال کے لیے مدح و ستائش کا کوئی پہلو باقی نہیں رہتا اگرچہ طالب مظلوم بھی ہو۔ تاہم اس کی ناراضگی صرف دنیوی مال کی خاطر ہے۔ اس صورت میں طالب مال کو متہم کرنا حاکم کو مطعون قرار دینے کی نسبت اقرب الی الصحت ہے۔ خصوصاً جب کہ حاکم یہ مال خود نہیں لے رہا اور طالب مال اسے خود اپنی ذات کے لیے حاصل کرنے کے درپے ہے۔ حاکم واشگاف الفاظ میں کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم مجھے مال دینے سے مانع ہے، میرے لیے یہ کیوں کر روا ہے کہ مستحق سے مال لے کر غیر مستحق کو دے دوں؟ طالب مال اس کے سوا آخر کیا کہہ سکتا ہے کہ میری ناراضگی کا باعث صرف قلیل مال ہے دگر ہیچ۔

جو شخص سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے متعلق ایسا واقعہ بیان کر کے اسے ان کی مدح پر محمول کرتا ہے، اس کا جاہل ہونا کسی شک و شبہ سے بالا ہے، اللہ تعالیٰ منافقین کی مذمت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

﴿ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّلْمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ یُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ یَسْخَطُوْنَ ☆ وَ لَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَیُؤْتِیْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ

---

[1] مسند احمد (۱/ ۲۹۳، ۳۰۷) سنن ترمذی۔ کتاب صفة القیامة۔ باب (۵۹) (حدیث: ۲۵۱۶)۔

[2] اگر حدیث نبوی ''لانورث'' سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس میں شبہ نہیں کہ سیدہ عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما اور حفصہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں ورثاء میں شامل تھیں، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مذکورۃ الصدر حدیث کی تعمیل میں دونوں کو ورثہ سے محروم کر کے آپ کے صدقہ کو عام صدقات میں جمع کر دیا تھا، تاہم آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے، اہل بیت کو بیت المال سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت دے دی تھی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جملہ امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے کے التزام کو قائم رکھا اور ہر صورت میں اسے نباہنے کی کوشش کی، آپ نے بدعات سے کنارہ کش رہنے کی قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی بدعت اور کیا ہوتی کہ آپ حدیث ''لانورث'' کی خلاف ورزی کرتے، حالانکہ یہ روایت کثیر صحابہ سے مروی ہے، اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی یہ روایت بیان کی ہے۔

اِنَّآ اِلَی اللّٰہِ رٰغِبُوْنَ﴾ (التوبہ: ۵۸۔ ۵۹)

’’بعض منافق صدقات کے متعلق آپ پر طعن کرتے ہیں، اگر صدقات مل گئے تو خوش، ورنہ ناخوش اور اگر وہ اللہ کے عطا کردہ مال پر رضامندی کا اظہار کرتے، اور یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ ہمیں اپنے فضل و کرم سے دیتا رہے گا، ہماری رغبت صرف بارگاہ ربانی کی جانب ہے۔‘‘

اس آیت میں منافقین کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ وہ دیے جانے کی صورت میں خوش ہوتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو غیظ و غضب کا اظہار کرنے لگتے ہیں، منافقین کی زندگی کا یہی پہلو ان کی مذمت کا موجب ہوا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ جو شخص اسی خصوصیت کی بنا پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح سرائی کرتا ہے، جس کی مذمت بیان کی گئی ہے تو وہ بلاشبہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ روافض نے اہل بیت کی شان میں جو گستاخیاں کی ہیں اور جس طرح ان کی زندگیوں کو داغ دار کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کسی بھی اہل بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ اہل بیت کی جانب سے اللہ تعالیٰ ہی اس کا انتقام لے گا۔

[اشکال]: اگر کوئی شخص یہ کہے: سیدہ فاطمہ اپنا حق طلب کرنے آئی تھیں اور حق کا مطالبہ کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔‘‘

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو یہود و نصاریٰ تک کے حقوق ادا کرنے میں تامل نہیں کرتے تھے، بھلا آپ سیدۃ النساء سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق ادا کرنے سے کیوں کر انکار کر سکتے تھے؟ مزید برآں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا مال اللہ کی راہ میں صرف کیا کرتے تھے، پھر آپ لوگوں کے حقوق ادا کرنے سے کیوں کر باز رہ سکتے تھے۔ ❶

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مال کا مطالبہ کیا تھا؛ اور آپ اسے پورا نہ کر سکے۔ بخاری و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بارگاہ نبوت میں خادم طلب کرنے آئیں اور آپ نے خادم عطا کرنے کی بجائے ان کو تسبیح کے کلمات پڑھتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ ❷

جب یہ جائز ہے کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ یہ مطالبہ پورا نہ کریں اور اس کا پورا کرنا آپ پر واجب بھی نہ ہو؛ تو اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ وہ خلیفہ رسول سے کوئی چیز طلب کریں اور آپ اس مطالبہ کی تکمیل سے قاصر رہیں۔ خصوصاً جبکہ ہم اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا معصوم نہیں اور ممکن ہے آپ ایسا مطالبہ کریں جس کی تکمیل ضروری نہ ہو۔ جب مطالبہ کا پورا کرنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر واجب نہ ہوا تو ایک غیر واجب امر کے ترک

---

❶ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ کی مالی امداد فرمایا کرتے تھے، اس ضمن میں سورہ نور کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَۃِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ (نور:۲۲) (صحیح بخاری کتاب المغازی، باب حدیث الافک، (حدیث: ٤١٤١) صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی حدیث الافک (حدیث: ٢٧٧٠)

اگر یہ آیت کریمہ کسی انسان کے بارے میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی پر نازل ہوتی تو اس نبی کی امت کا سخت بے شرم آدمی بھی اس شخص کی شان میں گستاخی کرنے سے شرم محسوس کرتا، جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی مگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخی کرنے والے جذبہ حیاء سے عاری ہیں، اس لیے کہ حیا ایمان کا جزء ہے، اور انہیں ایمان سے کوئی سروکار نہیں۔

❷ صحیح بخاری کتاب الدعوات، باب التکبیر والتسبیح عند المنام (حدیث:٦٣١٨)، صحیح مسلم کتاب الذکر والدعاء باب التسبیح اوّل النہار و عند النوم (حدیث:٢٧٢٧)۔

کرنے پر آپ ہرگز قابل مذمت نہیں، یہ امر مباح ہی کیوں نہ ہو۔ جب ہم یہ فرض کر لیں کہ اس مطالبہ کا پورا کرنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے مباح بھی نہ تھا تو اس کی عدم تکمیل پر آپ مدح کے قابل ہوئے نہ کہ مذمت کے مستحق۔ اور یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کے بعد کسی کا حق ادا کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وصیت فرمائی تھی کہ: ''انھیں رات کو دفن کیا جائے تا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ان کا جنازہ نہ پڑھے۔'' صرف وہی شخص اس قصہ کو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرسکتا ہے جو بالکل جاہل ہو اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر ایسے الزامات لگانا چاہتا ہو جو کہ آپ کی شان کے لائق نہیں۔ آپ کی شان میں ایسے کلمات کہے جو آپ کی عزت وعظمت کے منافی ہوں۔ بشرط صحت یہ بات چنداں مفید نہیں۔ اس لیے کہ جنازہ پڑھنے سے میت کو فائدہ ہی پہنچتا ہے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں۔ نیز یہ کہ اگر ایک کم درجہ کا شخص افضل الخلق کا جنازہ پڑھے تو اسے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی لیجیے کہ سب ابرار واشرار اور منافقین آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔ بفرض محال اگر اس سے آپ کو نفع نہیں پہنچتا تو ضرر بھی لاحق نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ آپ کی امت میں منافقین بھی ہیں۔ اس کے باوصف آپ نے کسی کو بھی درود وسلام سے نہ روکا، بلکہ مومن ومنافق سب کو درود وسلام کا حکم دیا۔

مذکورۃ الصدر حقائق اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ قبل ازیں ذکر کردہ واقعہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مدح وستائش پر دلالت نہیں کرتا اور اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت پر وہی شخص استناد کرتا ہے جو جاہل مطلق ہو۔ مزید برآں یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ مسلمان اس کا جنازہ نہ پڑھیں تو اس کی وصیت نافذ نہیں کی جائے گی اس لیے کہ نماز جنازہ اُس کے لیے ہر حال میں مفید ہے۔ [1]

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی انسان پر کسی نے ظلم کیا ہو اور مظلوم وصیت کر جائے کہ ظالم اس کے جنازہ میں شریک نہ ہو تو اس کا یہ فعل ایسی نیکی نہیں ہے جو اس کے لیے قابل ستائش ہو۔ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا حکم نہیں دیا۔ مقام تعجب ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعریف وتوصیف کرنے والے ایسے واقعات کس لیے بیان کرتے ہیں جو ان کے لیے موجب مدح ہونے کی بجائے ان کی شان میں قدح وارد کرتے ہیں جیسا کہ کتاب وسنت اور اجماع سے مستفاد ہوتا ہے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سب لوگوں نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اے فاطمہ! تیرے ناراض ہونے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور تیرے راضی ہونے سے وہ راضی ہوتا ہے۔''

یہ صریح کذب ہے۔ یہ روایت آپ سے منقول نہیں اور کتب حدیث میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں اس کی کوئی سند صحیح یا حسن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتی۔ اس پر مزید یہ کہ جنتی ہونے اور تعالیٰ کی رضامندی کی شہادت اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شان میں ملتی ہے تو یہی شہادت حضرات صحابہ کرام، حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعید اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی موجود ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے

---

[1] امام ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی اس وصیت کا ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو غسل دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی ہی نے آپ کے لیے نعش کا انتخاب کیا تھا جیسا کہ وہ ملک حبشہ بچشم خود ملاحظہ کر چکی تھیں۔ دیکھیے حلیۃ الاولیاء، ابونعیم: ۲/ ۴۲، نیز السنن الکبریٰ امام بیہقی: ۴/ ۳۴، نیز ۳/ ۹۶۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے اپنی رضا مندی کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبۃ:۱۰۰)

''اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح:۱۸)

''یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہوگیا جبکہ وہ درخت تلے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔''

احادیث نبویہ سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفات پائی تو آپ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے رضا مند تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم جس سے راضی ہوں تو دنیا میں سے کسی شخص کی ناراضگی بھی اسے ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص سے راضی ہوگیا وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہوگا۔ اور جانبین کی رضا مندی و خوشنودی میں کامل یگانگت و مطابقت ہوگی۔ گویا ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا حکم اس کی رضا کے موافق ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہے وہ اس کے ناراض ہونے سے ناراض بھی ہوگا۔ اس لیے کہ جو شخص کسی دوسرے کے ناراض ہونے پر راضی ہوتا ہے وہ اس کے غضب آلود ہونے پر غضب آلود بھی ہوگا۔

شیعہ کی پیش کردہ حدیث پر نقد و جرح:

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''فاطمہ میرا جگر پارہ ہے۔ جو کوئی اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے' اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف دی۔''

یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں کی گئی۔ احادیث میں مذکور الفاظ اس سے مختلف ہیں، جس حدیث میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے، میں ہرگز اس کی اجازت نہ دوں گا۔'' یہ الفاظ آپ نے تین مرتبہ دہرائے۔ پھر فرمایا: ''فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، مجھے بھی وہ چیز شک میں ڈالتی ہے جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔ اور جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے۔'' البتہ یہ ممکن ہے کہ علی رضی اللہ عنہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کر لے۔'' ایک روایت میں یوں ہے: ''مجھے ڈر ہے کہ فاطمہ کہیں دینی ابتلاء میں نہ پڑ جائے۔'' پھر آپ نے اپنے ایک داماد (ابوالعاص) کا ذکر کر کے اس کی تعریف فرمائی اور کہا: ''اس نے جب بھی بات کی سچ بولا۔ اور جب وعدہ کیا تو اسے پورا کر دکھایا۔ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال تو نہیں کرتا۔ مگر اللہ کی قسم! جگر گوشۂ رسول اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک شخص کے گھر میں جمع نہیں ہو سکتیں۔''[1]

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ح:۳۷۲۹، ۵۲۳۰) و صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا (ح ۲۴۴۹) تاہم اس کے سیاق و سباق میں اختلاف ہے۔

حدیث بیان کرنے کا سبب خود روایت میں موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانا چاہتے تھے۔ بنا بریں بیان کردہ سبب کو حدیث سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کے الفاظ واضح ہیں:

''جو چیز فاطمہ رضی اللہ عنہا کو شک میں مبتلا کرتی ہے وہ مجھے بھی شبہ میں ڈالتی ہے اور جس بات سے فاطمہ کو دکھ پہنچے وہ میرے لیے بھی رنج والم کی موجب ہے۔''

حدیث میں آپ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

''جو اسے شک میں ڈالتی ہے۔ اور جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے بھی دکھ پہنچتا ہے۔'' یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تکلیف محض اس لیے پہنچی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگر یہ وعید ایذا دینے والے کو لاحق ہو سکتی ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس وعید کی لپیٹ میں آنا ضروری ہے۔ اور اگر اس کا احتمال نہیں ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت اس وعید سے بعید تر ہوں گے۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اس سے توبہ کر لی تھی۔ تو ہم کہیں گے کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا غیر معصوم ہونا لازم آتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء کا ازالہ توبہ سے ہو سکتا ہے تو اس کے علاوہ دیگر نیک اعمال بھی یقیناً اس کو محو کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اعمال صالحہ مصائب و آلام اور توبہ سے تو اس سے بھی بڑے بڑے گناہ ختم ہو سکتے ہیں۔ مزید براں یہ گناہ کفر نہیں ہے کہ بلا توبہ معاف نہ ہو سکتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مرتد ہو چکے ہوتے۔ (العیاذ باللہ)۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے مبرا و منزہ قرار دیا ہے۔ [اس لیے آپ کا مومن و مسلم ہونا ایک یقینی امر ہے]۔ خوارج جنھوں نے آپ کے مرتد ہونے کا دعویٰ کیا تھا وہ بھی یہی کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام سے منحرف ہو گئے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں ہی مرتد ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں مرتد ہونے والے کو یا قتل کر دیا جاتا تھا یا وہ پھر دین اسلام کی طرف لوٹ آتا تھا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن اس سے پاک رہا۔ اگر آپ کا یہ فعل شرک سے کم تر تھا تو یہ جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (النساء: ۱۱٦)

''اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے کم جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

اگر شیعہ لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کفر ثابت کرنے کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذاء کو کفر قرار دیں تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی کافر ہونا لازم آئے گا۔ اور جب لازم باطل ہے تو ملزوم کے بطلان میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ شیعہ کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی عیب چینی کرتے ہیں؛ اور ایسے امور کی بنا پر ان کی تکفیر کرتے ہیں جن کی مثل بلکہ اس سے بھی پرے بلا عذر افعال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صادر ہو چکے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان افعال میں اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ماجور یا معذور ہیں تو خلفاء ثلاثہ بالاولیٰ اجر یا عذر کے مستحق ہوں گے اور اگر کسی معمولی امر کی بناء پر خلفاء ثلاثہ فاسق یا کافر قرار پائیں گے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس سے شنیع تر فعل کے مرتکب ہونے پر بھی کفر و فسق سے بچ جائیں؟

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ستانا اس لیے بڑا گناہ ہے کہ اس سے ان کے والد محترم کو دکھ پہنچتا ہے۔ کسی معاملہ میں جب یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آیا سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا دینے سے احتراز کیا جائے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ستم رانی کرنے سے۔ تو ظاہر ہے کہ اندریں صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء سے دست کشی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اذیت کی نسبت واجب تر ہوگی۔

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (انبیاء کی عدم توریث) ایک حکم دیا تھا اور یہ دونوں اصحاب اس کی خلاف ورزی کر کے آپ کو ایذا پہنچانے سے امکانی حد تک کنارہ کش رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عہد لیا تھا؛ اور ان کو اس بارے میں ایک حکم دیا تھا۔ یہ دونوں حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی سے بچنا چاہتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی حکم عدولی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوں یا آپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی رعایت کرنا زیادہ اہم تھا [یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بات کا حکم دیں اور سیدہ فاطمہ اس کے برخلاف مطالبہ کریں تو حکم رسول کی مراعات اولیٰ ہوگی۔ ہر سلیم العقل آدمی اس بات سے اتفاق کرے گا کہ] آپ کی اطاعت گزاری واجب؛ جب کہ نافرمانی حرام ہے۔ اور اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے سے کسی کو دکھ پہنچتا ہے تو وہ غلطی پر ہے اور آپ کی اطاعت کرنے والا حق اور راہ راست پر ہے۔ یہ اس صورت سے مختلف ہے جب کوئی شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے بلکہ کسی اور مقصد کے لیے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ستائے۔

جو شخص اس بات پر غور کرے گا کہ مذکورہ واقعہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقصد صرف نبی کریم رضی اللہ عنہ کی اطاعت تھی اور اس کے سوا کوئی بات آپ کے پیش نظر نہ تھی تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقدام کے مقابلہ میں اکمل و افضل ہے۔ تاہم دونوں کی عظمت و فضیلت میں کلام نہیں۔ آپ دونوں اکابر اولیاء اللہ سابقین اولین اور اللہ کے مقربین؛ کامیابی پانے والی اللہ کی جماعت [حزب اللہ] میں سے' اور اللہ کے نیک بندے اکابر متقین میں سے تھے جو حوض تسنیم سے سیراب ہوں گے۔ [ان شاء اللہ تعالیٰ]۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اللہ کی قسم! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت ذاتی قرابت کی نسبت مجھے عزیز تر ہے۔''[1]

یہ بھی آپ ہی کا قول ہے: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا خیال رکھیے۔''[2]

مقصود یہ ہے کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رنج و الم پہنچایا تھا تو یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے کسی ذاتی غرض کے تحت ایسا نہیں کیا تھا، اس کی اصل وجہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت، نیز یہ جذبہ اس کا محرک تھا کہ حق دار کو حق مل کر رہے۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ شادی کر کے آپ کو دکھ پہنچانا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام ذاتی غرض پر مبنی تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ مذکورہ بالا واقعات اس بات کے زندہ گواہ ہیں کہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذا سے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل مذمت کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے، اس لیے کہ حضرت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب مناقب قرابۃ رسول اللہ ﷺ (حدیث:۳۷۱۲) صحیح مسلم۔ کتاب الجہاد، باب قول النبی ﷺ" لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ" (حدیث:۱۷۵۹) مطولاً۔

[2] صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث:۳۷۱۳)

[3] یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق یہ آمدنی رفاہ عام کے کاموں پر صرف کی جائے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے لیے ایسا کیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذاتی غرض کی بنا پر ۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا شمار ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہجرت کی تھی ۔ ظاہر ہے کہ کسی عورت سے نکاح کرنے کی نیت سے ہجرت کرنے والا، ان کا ہم پلہ کیسے ہوسکتا ہے ۔ [1]

بے شک سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ایذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث رنج و ملال ہے، بشرطیکہ وہ بات حکم الٰہی کے خلاف نہ ہو ۔ جب کسی بات میں حکم الٰہی موجود ہوتو اس کی انجام دہی ضروری ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ امر کسی کے لیے موجب اذیت ہو ۔ اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے باعث اذیت وہ بات ہوگی جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے منافی ہو ۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل حدیث نبوی ہے:

''جس شخص نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی حکم عدولی کی، اور جس نے میرے امیر کے حکم سے سرتابی کی اس نے میری نافرمانی کی ۔'' [2]

پھر آپ نے ان الفاظ میں اس حدیث کی توضیح فرمائی: ''کسی کی اطاعت صرف نیکی کے کاموں میں ہے ۔'' [3]

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امراء کی اطاعت کو مطلق بیان کیا' اور پھر اسے اس شرط کے ساتھ مقید کردیا کہ اطاعت صرف نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہوگی ۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک کہ:

---

[1] اہل سنت کی بلند اخلاقی کی اعلیٰ مثال ہے کہ وہ ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عزم نکاح اور اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وسیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شدید ناراضگی کا واقعہ شاذ و نادر ہی ذکر کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے منبر پر جو شہرۂ آفاق خطبہ دیا وہ قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتب حدیث کے اوراق میں محفوظ ہے ۔ دوسری جانب شیعہ کا یہ حال ہے کہ تمام تاریخی اَدوار میں انھوں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف شور وشغب بپا کیے رکھا ۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے حکم کو نافذ کرنے کی غلطی کی جو انھوں نے بذات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا ۔ علاوہ ازیں کثیر صحابہ اور خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی براہ راست اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکے تھے ۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت موزوں طریقہ سے امر نبوی کی تکمیل فرمائی ۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر اہل بیت کو اس جاگیر سے اپنی ضروریات پوری کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ۔ اور جو باقی رہ جاتا تھا اس کو اسوۂ نبوی کے مطابق رفاہ عام کے کاموں پر صرف کرنے کی ہدایت کی ۔ شیعہ کے شور وشغب اور دروغ گوئی کا نتیجہ ہے کہ لوگ مسئلہ فدک کی تفصیلات سے آگاہ ہیں، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عزم نکاح سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ فاطمہ کس حد تک برہم ہوئے تھے، یہ دونوں واقعات (مسئلہ فدک اور ابوجہل کی بیٹی سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عزم نکاح) جملہ اختلافی مسائل میں اہل سنت و شیعہ کے مابین ایک عمدہ معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سے عیاں ہوتا ہے کہ صحابہ و اہل بیت کے بارے میں فریقین کا موقف کیا ہے ۔ یہ دونوں واقعات اس بات کے شاہد عدل ہیں کہ اہل سنت صحابہ و اہل بیت دونوں کو عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ بخلاف ازیں شیعہ کے دل بغض صحابہ سے لبریز ہیں اور اہل بیت کی محبت کے بارے میں ان کے سب دعوے بے بنیاد ہیں، اہل بیت کی محبت شیعہ میں صرف اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ان کی قبروں کو بت بنا کر ان کی پرستش کرتے رہیں اور اس طرح صنم پرستی کے دور کی یادیں تازہ کردیں ۔
دیگر بہنوں کو چھوڑ کر صرف سیدہ فاطمہ سے اظہار محبت کذب و دروغ پر مبنی ہے ۔ علاوہ ازیں شیعہ، بعض بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت کرتے ہیں اور بعض سے بغض و عناد رکھتے ہیں ۔ مگر حق و صداقت کسی کے چھپائے چھپتی نہیں اور اس کا نور ظاہر ہوکر رہتا ہے ۔ ﴿وَاللّٰهُ يُحِقُّ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ﴾

[2] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب یقاتل من وراء الامام و یتقی به، (حدیث:۲۹۵۷)، صحیح مسلم ۔ کتاب الامارة ۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (حدیث: ۱۸۳۵) باختلاف ۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الاحکام ۔ باب السمع والطاعة للامام ما لم تکن معصیة (حدیث: ۷۱۴۵)، صحیح مسلم ۔ کتاب الامارة ۔ باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (حدیث: ۱۸۴۰) ۔

'' جس نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا دی اس نے مجھے تکلیف دی۔'' بالاولیٰ اذی فی المعروف پر محمول ہوگا۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کے امراء کی اطاعت فرض ہے اور ان کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، مگر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایذا پہنچانے کا فعل نبی کریم ﷺ کی نافرمانی کے مساوی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اللہ و رسول ﷺ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے امراء کی نافرمانی آپ کی نافرمانی ہے، اور آپ کے حکم سے سرتابی معصیت الٰہی ہے۔

پھر اعتراض کرنے والے سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ: حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں ولی الامر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ولی امر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔ ولی امر کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اور اس کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ جو ولی امر کے حکم اور فیصلہ پر ناراض ہو، یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ پر ناراض ہے۔

پھر اعتراض کرنے والا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر تنقید کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ: '' انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کیا؛ اور اس کے فیصلہ پر ناراض رہے۔ اور اس چیز کو ناپسند کیا جس پر اللہ راضی ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو اس پر راضی ہوتا ہے کہ اس کی اور اس کے ولی امر کی اطاعت کی جائے۔ پس جو کوئی ولی امر کی اطاعت کو ناپسند کرتا ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی پر ناراض ہوتا ہے؛ اور ولی امر کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ پس جو کوئی ولی امر کی معصیت کی اتباع کرے یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے پیچھے چلتا ہے۔ جبکہ اللہ کی رضامندی کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر یہ جرح کرنا روافض کے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر جرح کرنے کی نسبت زیادہ معقول و مقبول ہوسکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے وارد ہونے والی نصوص میں ولاۃ امور [حکمرانوں] کی اطاعت اور مسلمان کی جماعت کے ساتھ منسلک رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور [اگر ان حکمرانوں کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر] صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بارے میں وارد احادیث کثرت کے ساتھ اور بہت مشہور ہیں۔ بلکہ کوئی کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

((عنقریب میرے بعد حقوق تلف کئے جائیں گے [اور ایسے امور پیش آئیں گے جنہیں تم ناپسند کرتے ہو] پس تم صبر کرتے رہنا یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے آملو))[1]

ایک دوسری روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((تم پر کسی کا جو حق ہو وہ ادا کردو اور اپنے حقوق تم اللہ سے مانگتے رہنا))[2]

اس طرح کی دیگر بھی کئی ایک روایات ہیں۔ اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ظالم تھے؛ وہ اپنی ذات کے لیے لوگوں کا مال چھیننا چاہتے تھے تو اس کے باوجود احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان کے ظلم پر صبر کرنا اور نیکی کے کاموں میں ان کی اطاعت کرنا واجب تھا۔

پھر اگر یہ اعتراض کرنے والا حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما پر طعن و تنقید اور جرح و قدح کرنا شروع کردے؛ اور کہے کہ: ان لوگوں نے صبر نہیں کیا [جیسا کہ احادیث مبارکہ میں حکم تھا] اور انہوں نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ انہوں نے جماعت

[1] صحیح مسلم قد تقدم تخریجہ۔

[2] صحیح مسلم قد تقدم تخریجہ۔

میں تفریق پیدا کی جو کہ بہت بڑا گناہ ہے۔ تو یقیناً یہ جرح حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر روافض کی جرح نسبت زیادہ معقول اور حق پر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے خلاف کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جس کی روشنی میں واجب آتا ہو کہ آپ نے کسی واجب کو ترک کیا ہو اور نہ ہی کسی حرام کا ارتکاب کیا ہو۔ اور جس دلیل سے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو اس معصیت سے مبراء و منزہ مانا جائے گا' اسی دلیل کی روشنی میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کسی بھی ظلم و معصیت سے بدرجہ اولیٰ منزہ و مبرا ہوں گے۔ اور جو شبہ بھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر وارد ہوگا کہ آپ نے واجب کو ترک کیا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کیا؛ تو وہ شبہ زیادہ قوت اور زور کے ساتھ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما پر بھی وارد ہوگا۔

کوئی انسان اگر حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما کو گناہوں سے پاک اور معصوم قرار دیکر ان کی مدح سرائی اور تعریف و توصیف بیان کرے؛ اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو گنہگار' اور نا قابل مغفرت و بخشش خیال کرتا رہے تو یہ اس کی طرف سے سب سے بڑا ظلم اور جہالت ہوگی۔ وہ ان لوگوں سے بھی بڑھ کر جاہل ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعریف کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر طعن و تشنیع کرنے لگے۔

آٹھویں وجہ: شیعہ مصنف کا قول: ''اگر حدیث " لا نُـــورِث " صحیح ہوتی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، خچر اور عمامہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے دعویٰ کی موجودگی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تفویض نہ فرماتے۔''

جواب: ہم پوچھتے ہیں کہ: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے یہ فیصلہ کب فرمایا تھا؟ اور کس نے یہ واقعہ نقل کیا ہے؟ یہ ان پر صریح بہتان ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ اشیاء جہاں تھیں وہاں رکھی رہتیں اور کوئی ان کا مالک قرار نہ پاتا۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات کو حضرت علی و عباس رضی اللہ عنہما کی تحویل میں دے دیا تھا کہ وہ اسے شرعی مصارف میں صرف کردیں۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ورنہ اہل بیت جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پاکیزہ قرار دیا ہے ناروا امور کے مرتکب ٹھہریں گے۔''

❀ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب اہل بیت کو پاک و صاف نہیں کیا۔ اور ایسا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ پر افتراء پردازی کرنے کے مترادف ہے۔ یہ دعویٰ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے؟ جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض بنی ہاشم گناہ و نجاست سے پاکیزہ نہیں ہیں؛ اور نہ ہی انہیں گناہوں سے پاک کیا گیا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ خود روافض کو بھی اس کا اعتراف ہے؛ شیعہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بنی ہاشم میں سے جو شخص ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتا ہے وہ پاک نہیں ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ﴾ (الاحزاب)

''اے اہل بیت! اللہ تعالیٰ تم سے نجاست کو دور کرنا چاہتے ہیں۔''

مندرجہ بالا آیت سورہ مائدہ کی حسب ذیل آیت کی مانند ہے:

﴿مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (المائدہ:٦)

''اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے اور لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تا کہ وہ اپنی نعمت تم پر پوری کرے،

تاکہ تم شکر کرو۔''

سورہ نساء کی حسب ذیل آیت بھی اسی قبیل سے ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ﴾ (النساء:۲۶)

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی ہدایت دے جو تم سے پہلے تھے اور تمہاری توبہ قبول فرمائے۔''

علاوہ ازیں اس نوع کی وہ آیات جن میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے فلاں چیز کو پسند کرتے اور اس کا حکم دیتے ہیں جو شخص یہ کام کرے گا وہ مقصود کو پالے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد سے دور رہے گا۔ دوسرے موقع پر اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ؛ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ: یہ بات منکرین تقدیر روافض پر چسپاں ہوتی ہے۔ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ ارادۂ الٰہی سے اس کا حکم مراد ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ وہی کام کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔ بنا بریں یہ ثابت ہوا کہ تطہیر کا ارادہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ شخص فی الواقع پاک بھی ہو جائے۔ شیعہ کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کوئی کسی کو پاک کرے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو پاک کرنا چاہتے ہیں اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو پاک کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ شیعہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی کی تطہیر پر قادر نہیں ہے۔

[صدقات اور بنی ہاشم]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کا یہ قول: ''بنی ہاشم پر صدقہ حرام ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: صرف فرض صدقات بنی ہاشم پر حرام ہیں۔ نفلی صدقات مباح ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بنی ہاشم وہ خیراتی پانی پی لیا کرتے تھے جو مکہ و مدینہ کے مابین تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ فرضی صدقات ہم پر حرام ہیں نفلی صدقات نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بنی ہاشم اجنبی لوگوں کے نفلی صدقات سے متمتع ہو سکتے تھے تو نبی کریم ﷺ کے صدقات سے نفع اندوز ہونا ان کے لیے بالاولیٰ روا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ مال زکوٰۃ نہ تھا جسے لوگوں کی میل کچیل کہا گیا ہے، اور جو بنی ہاشم پر حرام ہے۔ بلکہ یہ وہ مال تھا جو کسی جہاد و قتال کے بغیر صلح کے نتیجہ میں نبی کریم ﷺ کو ملا تھا۔ یہ بنی ہاشم کے لیے حلال تھا اور نبی ﷺ یہ سب مال صدقہ کر دیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آپ کی ملکیت تھا اور آپ صدقہ کے طور سے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے اقارب صدقہ کے زیادہ مستحق تھے کیوں کہ صدقہ مسلمانوں کے حق میں صرف صدقہ ہے اور اقارب کے حق میں صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ [1]

نویں وجہ: شیعہ قلم کار نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت پر جو معارضہ کیا ہے۔'' ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کسی غیر کے حق کا دعویٰ نہیں کیا تھا جو اس سے چھین کر ان کو دیا جائے۔ ان کا مطالبہ بیت المال سے تھا جو حاکم بآسانی نبی کریم ﷺ کے وعدہ کے بغیر بھی پورا کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے وعدہ کرنے کی صورت میں حاکم کے

[1] سنن ترمذی۔ کتاب الزکاۃ۔ باب ما جاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ (حدیث:۶۵۸)، سنن نسائی۔ کتاب الزکاۃ باب الصدقۃ علی الاقارب (حدیث:۲۵۸۳)، سنن ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ، باب فضل الصدقۃ (حدیث:۱۸۴۴)۔

لیے اس مطالبہ کی تکمیل اولیٰ بالجواز ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں گواہ کی ضرورت محسوس نہ کی۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص آتا ہے اور وہ بیت المال کی کسی زمین پر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ میرا حق ہے۔تو امام کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ بغیر شرعی حجت [اور گواہی] کے وہ زمین بیت المال کے قبضہ سے نکال کر اس کو دیدے۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا انسان آتا ہے' اس کا کوئی ایسا دعویٰ تو نہیں' مگر وہ بیت المال میں سے جو مال مسلمانوں میں تقسیم ہونے کے لیے موجود ہے' اس سے میں سے کچھ بغیر دعویٰ کے طلب کرتا ہے۔تو ایسے انسان کے لیے جائز ہے کہ بغیر گواہی کے بھی اس کی طلب پوری کر دی جائے۔

کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صدقات اوقاف ہیں۔اور آپ کے علاوہ باقی مسلمانوں کے صدقات کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان صدقات کے اصل مال کا مالک بن جائے۔اور یہ جائز ہے کہ اس کے نفع کو ایسے تقسیم کیا جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔پس جو مال حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے طلب کیا تھا' وہ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے جو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کے لیے تھا۔ بخلاف اصول اموال کے۔

اسی لیے حضرت ابوبکر و عمر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹوں حضرت حسن و حسین کو اور حضرت عباس اور ان کی اولاد کو اور دیگر بنی ہاشم رضی اللہ عنہم اجمعین کو بیت المال سے اس سے بہت زیادہ دے دیا کرتے تھے جیسے جابر رضی اللہ عنہ کو دیا۔یہ وہ مال ہوا کرتا تھا جو مسلمانوں کے درمیان میں تقسیم کے لیے ہوا کرتا۔بھلے ان میں سے کسی کے پاس نبی کریم ﷺ کی جانب سے کوئی عہد و پیمان نہ بھی ہو [تب بھی یہ مال انہیں ملا کرتا تھا]۔

جاہل رافضی کا یہ قول کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے بیت المال سے بغیر کسی گواہی اور دلیل کے صرف اپنے دعویٰ کی بنیاد پر مال لے لیا؛ یہ ایسے جاہل انسان کا کلام ہوسکتا ہے جو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو نہ جانتا ہو۔اس لیے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو جو مال دیا گیا اس کا تعلق ان اموال سے تھا جن کا مسلمانوں کے مابین تقسیم کیا جانا واجب تھا۔اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بھی مسلمانوں میں سے ایک ہیں۔اور ان کا اس مال میں حق بھی تھا۔ وہ بیت المال کے شرکاء میں سے ایک ہیں۔ جب مسلمان حاکم مسلمانوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے بیت المال میں سے کچھ مال دیدے تو یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے بغیر کسی دلیل کے مسلمانوں کے بیت المال میں سے مال دیدیا۔اس لیے کہ مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے اور انہیں عطیات دینے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اس کے کہ کوئی انسان تمام مسلمانوں کے برعکس کسی اصل مال کا ہی دعویٰ کرے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان حکمران کو اپنے اجتہاد و تقدیر سے مال تقسیم کرنے کی اجازت ہے۔ نبی کریم ﷺ حثیات بھر بھر کر مال تقسیم کیا کرتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔حثیات ایک قسم کا پیمانہ ہے [اس کا لفظی ترجمہ لپیں بھر کر دینا ہے۔دراوی]۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں تین حثیات بھر کر دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں یہ عام سا فعل ہے [اس لیے کہ آپ لوگوں کو ایسے ہی نوازا کرتے تھے]۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے صرف وہی چیز بیان

کی تھی جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اور یہ ایسا کام تھا جس میں نبی کریم ﷺ کی اقتداء واتباع کرنی چاہیے تھے۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو اتنا دیا جو نبی کریم ﷺ نے کہا تھا۔ پھر آپ نے جب ان کی تعداد دیکھی تو اتنا ہی آپ کو دوبار مزید بھی دیا۔ تاکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہو جائے [اور اس میں کسی قسم کی کمی نہ ہو]۔اس لیے کہ حسب امکان فرمان نبوت کی موافقت کرنا واجب ہوتا ہے۔ اگر اس کا علم حاصل ہو جائے تو ٹھیک ہے' ورنہ اجتہاد سے کام لیا جائیگا۔

باقی رہا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دعوی ہبہ کا قصہ؛ اور آپ کا گواہوں کو لانا وغیرہ۔ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو جو لوگ اس سے مدح کا پہلو نکالنا چاہتے ہیں' ان کے لیے اتنی ہی قدح اس قصہ سے ثابت ہوتی ہے۔

فصل:

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ اور لقب صدیق؟

[اعتراض]: رافضی مضمون نگار لکھتا ہے: ''سب محدثین نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''نہ ہی آسمان نے کسی پر سایہ کیا ہوگا اور نہ ہی زمین نے کسی کو اٹھایا ہوگا جو ابو ذر سے بڑھ کر سچے لہجے والا ہو۔''❶

[اہل سنت نے] ان کا نام تو صدیق نہیں رکھا؛ جب کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہی نام دیا جانے لگا۔ حالانکہ آپ کے حق میں کوئی ایسی روایت وارد نہیں ہوئی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ روایت تمام محدثین نے روایت نہیں کی؛ بلکہ نہ ہی شیخین نے روایت کی ہے اور نہ ہی اصحاب سنن نے۔ بلکہ اگر اس کی صحت اور ثبوت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ بعض دیگر حدیث کی کتابوں میں روایت کی گئی ہے۔ یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس حدیث سے یہ مراد نہیں ہے کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ تمام مخلوق سے بڑھ کر سچے ہیں۔ کیونکہ پھر اس سے لازم آتا ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے اور باقی سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی بڑھ کر سچے ہوں۔ علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ سے بھی بڑھ کر سچے ہوں۔ یہ بات شیعہ و اہل سنت تمام مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ابو ذر رضی اللہ عنہ سچے انسان ہیں؛ ان سے بڑھ کر کوئی سچائی کا طلب گار نہیں۔

جب کوئی انسان سچائی کی تلاش میں رہتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ فلاں سچے لہجے والا ہے۔ اگرچہ اسے انبیاء کرام علیہم السلام کی لائی ہوئی تعلیمات سے بہت کم آگاہی ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ: آسمان نے کسی ایسے پر سایہ نہیں کیا جو ابو ذر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر سچائی کی تصدیق کرنے والا ہو۔ بلکہ آپ نے فرمایا ہے: ''سچے لہجے والا۔'' اور صدیق کا معنی یہ ہے کہ جس نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کی؛ صرف اس کے سچا ہونے کے بنا پر نہیں؛ بلکہ آپ کی مدح انبیاء کرام علیہم السلام کی تصدیق کرنے کی وجہ سے ہے۔ اور پھر نبی کریم ﷺ کی تصدیق تو ایک خاص معاملہ ہے۔ آپ کی مدح اس تصدیق کی وجہ سے کی جاتی ہے؛ جو کہ ایک خاص قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ جب کہ کسی انسان کا اپنے من میں سچا ہونا ایک علیحدہ بات ہے۔ پس اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ: ہر صدیق صادق ہوتا ہے۔ اور ہر صادق صدیق نہیں ہوتا۔

❶ رواه الحاكم في المستدرك و الآجري في الشريعة وابن أبي عاصم في الأحاد و المثاني۔"

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''سچ نیکی کا راستہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اور انسان سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ سچا لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ برائی کا راستہ دکھاتا ہے اور برائی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے اور انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔''[1]

پس صدیق سے کبھی تو مراد سچائی میں کامل ہونا ہے۔ اور کبھی اس سے مراد تصدیق میں کامل ہے۔ صدیق کی فضیلت صرف سچائی کی تلاش میں رہنا نہیں ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے' آپ اسے اجمالاً وتفصیلاً جانتے تھے۔ اور پھر آپ نے ان تمام امور میں قولاً وفعلاً؛ علماً وعملاً تصدیق کی۔

یہ مقام ومرتبہ نہ ہی حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو ملا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کو۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی بتائی ہوئی اخبار وانباء کو جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جانتے تھے' ایسے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نہیں جانتے تھے۔ اور نہ ہی آپ کو ایسے تصدیق مفصل کا مقام ملا تھا جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا؛ اور نہ ہی آپ کو کمال تصدیق میں وہ مقام حاصل تھا جیسا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے بڑے عالم' اللہ اور اس کے رسول سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے؛ اللہ اور اس کے رسول کی سب سے زیادہ نصرت کرنے والے اور اپنی جان و مال سے سب سے بڑھ کر جہاد کرنے والے تھے۔ اس کے علاوہ بھی آپ میں وہ صفات موجود تھیں جو کہ آپ کو کمال صدیقیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ احد پہاڑ پر چڑھے۔ حضرت ابوبکر عمر عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ تو وہ پہاڑ حرکت کرنے لگا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے احد! ٹھہر جا؛ کیونکہ تیرے اوپر سوائے نبی یا صدیق یا شہید کے اور کوئی نہیں ہے۔''[2]

سنن ترمذی میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا آتَوا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ [المؤمنون ۶۰]

''اور جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور انکے دل اس سے ڈرتے ہیں۔''

اور عرض کیا کہ: ''کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے صدیق کی بیٹی! نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے نماز پڑھتے صدقہ دیتے اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے قبول نہ کیا جائے۔'' [جامع ترمذی: ح 1122]

❁❁❁❁

[1] صحیح مسلم: ح ۲۱۳۸۔ [2] البخاري ۵/ ۹؛ ومسلم ۴/ ۱۸۹۰۔

فصل:

خلیفہ رسول اللہ ﷺ خطاب کا مستحق کون؟

[اعتراض]: رافضی مضمون نگار لکھتا ہے: اہل سنت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول کہتے ہیں، حالانکہ آپ نے اپنی زندگی میں بعداز وفات آپ کو اپنا خلیفہ (نائب و قائم مقام) مقرر نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اہل سنت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ رسول نہیں کہتے۔ حالانکہ آپ ﷺ نے ان کو کئی بار اپنی عدم موجودگی میں مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ایسے ہی غزوہ تبوک کے موقع پر بھی آپ مدینہ میں خلیفہ بنے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا تھا: ''میرے اور آپ کے سوا کوئی شخص حاکم مدینہ بننے کا اہل نہیں ہے۔ کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سالار لشکر مقرر فرمایا؛ اس لشکر میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ تاہم اہل سنت اسامہ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ کے لقب سے یاد نہیں کرتے۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر فائز ہوئے تو اسامہ رضی اللہ عنہ نے بگڑ کر کہا: ''مجھے آپ پر امیر بنایا گیا تھا۔ بتایئے! آپ کو کس نے میرا حاکم بنایا؟ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں پاپیادہ اسامہ رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے اور ان کو راضی کیا۔ اور آپ دونوں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو تاحیات امیر کہتے رہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] خلیفہ کی تعریف:

اس کا جواب یہ ہے کہ خلیفہ کا لفظ دو معنوں پر بولا جاتا ہے:

۱۔ جو کسی کا قائم مقام ہو، اس کو خلیفہ کہتے ہیں، بھلے اسے پہلے نے اپنے بعد خلیفہ نہ بھی مقرر کیا ہو۔ جیسا کہ لغت میں معروف ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔

۲۔ خلیفہ وہ ہے جس کو کوئی شخص اپنا نائب مقرر کرے۔ یہ روافض اور بعض ظاہریہ کا مسلک و مذہب ہے۔ [1]

پہلے معنی کی بناء پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول ﷺ تھے، کیوں کہ سرور کائنات ﷺ کی وفات کے بعد آپ ان کے قائم مقام ہوئے اور آپ دوسروں کی نسبت اس منصب کے لیے موزوں تر تھے۔ لہٰذا آپ خلیفہ قرار پائے اور دوسرا کوئی شخص یہ مقام حاصل نہ کر سکا۔ شیعہ اور دیگر فرقوں میں سے کوئی بھی اس مسلمہ صداقت کا منکر نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے تھے۔ آپ نماز پڑھاتے [2] شرعی حدود قائم کرتے اور صلح کی بنا پر حاصل کردہ مال مسلمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ کفار سے جہاد کرتے، عمال و امراء مقرر کرتے اور دیگر سیاسی امور انجام دیا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بالاتفاق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ جملہ امور انجام دیا کرتے تھے۔ لہٰذا بلا

---

[1] محدث ابن حزم اپنی کتاب ''الامامة والمفاضلة'' میں جو ان کی شہرہ آفاق تصنیف کتاب الفصل کی جلد چہارم میں شامل ہے۔ صفحہ: ۱۰۷، پر رقم طراز ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے صادق القول ہونے کی شہادت دی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ان کے انصاری بھائی اس امر میں متفق اللسان ہیں کہ سیدنا ابوبکر خلیفۂ رسول تھے۔ اور کسی شخص کا خلیفہ (قائم مقام) وہ ہوتا ہے جس کو وہ خود اپنا نائب مقرر کرے نہ وہ جو کہ از خود کسی کا قائم مقام بن جائے۔

[2] سیدنا علی رضی اللہ عنہ دیگر لوگوں کی طرح سیدنا ابوبکر کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

نزاع آپ خلیفہ رسول تھے اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ❶

اہل سنت والجماعت کہتے ہیں : نبی کریم ﷺ نے آپ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا؛ اور آپ ہی اس خلافت کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ جب کہ [پرانے دور کے] شیعہ کہتے تھے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر [جب خلیفہ بن ہی گئے تو آپ] کی خلافت درست ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جائز نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بنتے ؛ مگر جب آپ بالفعل خلیفہ بن گئے تو اب اس میں تنازع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اور اب آپ اس نام کے مستحق ہیں۔اس لیے کہ خلیفہ اسی کو کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام بنے۔

دوسرے معنی کی بنیاد پر: خلیفہ وہ ہے جسے دوسرا اپنا قائم مقام مقرر کرے۔بعض اہل سنت اور بعض شیعہ اس دوسرے معنی کو اختیار کرتے ہیں۔اہل سنت والجماعت میں سے جن لوگوں نے یہ معنی اختیار کیا ہے' وہ اس معنی کی بناء پر کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نص جلی یا خفی کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔جیسا کہ شیعہ جو کہ نص سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ہونے کا دعوی کرتے ہیں' ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آپ نص جلی کی روشنی میں خلیفہ تھے اور امام تھے جیسا کہ امامیہ کا عقیدہ ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ: نہیں' بلکہ آپ کی خلافت نص خفی سے ثابت ہے؛ جیسا کہ زیدیہ میں سے جارودیہ کا عقیدہ ہے۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں نص جلی یا خفی کا یہ دعویٰ شیعہ کے اس دعویٰ سے اقوی واظہر ہے جو وہ خلافت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق نصوص کے بارے میں کرتے ہیں، اسی لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں کثیر التعداد نصوص وارد ہوئی ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں واردشدہ نصوص یا تو جھوٹی ہیں یا ان سے یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا۔ بنابریں یہ مسلمہ صداقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی موت کے بعد صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کو خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔لہٰذا نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صرف آپ ہی خلیفہ برحق تھے۔خلیفہ مطلق وہ ہے جو آپ کی وفات کے بعد خلیفہ بنے یا آپ اپنی موت کے بعد اس کو خلیفہ مقرر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں وصف سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی اور میں موجود نہ تھے اور اسی بنا پر آپ خلیفہ برحق تھے۔

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کرنے کا تعلق ہے وہ اس بات میں منفرد نہ تھے۔ نبی کریم ﷺ جب بھی کسی غزوہ میں نکلتے تو مدینہ منورہ میں اپنے صحابہ میں سے کسی کو بھی اس منصب پر فائز کرتے۔ یہ واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ جب نبی کریم ﷺ بنی نضیر سے لڑنے کے لیے مدینہ سے باہر نکلے تو عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔

❶ خلافت صدیقی میں جو مال بنا بر مصالحت بلاقتال وجدال بیت المال میں آیا تھا اس میں سے بنی حنیفہ کے قبیلہ کی ایک لونڈی بھی تھی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے شرعی حکم کے مطابق حق ملکیت حاصل کر کے اسے اپنی لونڈی بنالیا اور اس کے بطن سے ایک عالم باعمل اور صالح بیٹا محمد بن علی بن ابی طالب تولد ہوا جو بعد میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی رائے میں سیدنا ابوبکر کی خلافت غیر شرعی ہوتی تو وہ لونڈی کو اپنے لیے حلال نہ سمجھتے۔حرام وحلال عورتوں کے مابین فرق وامتیاز ایک طے شدہ بات ہے، جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ایک مشہور ترین شیعہ عالم سید عبداللہ بن حسن سُویدی نے ماہ شوال ۱۱۵۶ھ میں جب اکابر علماء شیعہ کی موجودگی میں اس سے احتجاج کیا تھا تو سب خاموش ہو گئے اور کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ (دیکھیے۔ رسالہ مؤتمر النجف ،ص:۳۱۔۳۲) اگر شیعہ حق کے طالب ہوتے اور فتنہ پردازی ان کا مقصد نہ ہوتا تو مذکورہ دلیل اور دیگر سینکڑوں دلائل و براہین ان کے لیے وجہ اطمینان ہوتے۔مگر شیعہ کا مقصد وحید مسلم معاشرہ میں شور وشر پیدا کرنا، افکار باطلہ کی تشہیر دین حنیف کی تحریف وتغییر اور شریعت کے مآخذ ومصادر کی تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ کا وجود انسانیت کے لیے ایک عظیم آفت سے کم نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ باطل کے پرستار ہیں اور باطل فنا پذیر ہوتا ہے بلکہ جو چیز بھی کذب وافترا پر مبنی ہو وہ بے کار اور عبث ہے۔

۲۔ غزوۂ ذات الرقاع اور غزوہ غطفان کے لیے جاتے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاکم مدینہ قرار پائے۔ [1]

۳۔ غزوۂ بدر؛ غزوہ بنی قینقاع اور غزوہ سویق کیلئے تشریف لے گئے تو ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔ [2]

۴۔ غزوہ بدر الموعد میں آپ نے ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ پر عامل مقرر فرمایا۔

۵۔ غزوہ المریسیع میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

۶۔ غزوہ ابواء میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۷۔ غزوہ بواط میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۸۔ غزوہ عشیرہ میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جن لوگوں پر عامل بنایا وہ ان لوگوں سے اکثر و افضل نہ تھے جن پر آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو عامل یا خلیفہ مقرر فرمایا تھا۔ بلکہ تقریباً ہر غزوہ کے موقع پر مدینہ نبویہ میں کچھ نہ کچھ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین موجود ہوا کرتے تھے۔ وہ ان لوگوں سے بہت افضل تھے جو کہ غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ غزوہ تبوک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھی پیچھے رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اور نہ ہی اس غزوہ میں کوئی پیچھے رہا تھا سوائے منافق یا معذور کے۔ اور تین افراد وہ تھے جن کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کی بڑی تعداد خواتین اور بچوں پر مشتمل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں نائب بنا کر چھوڑا تو آپ روتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل پڑے؛ اور آپ کی خدمت میں یوں عرض گزار ہوئے: کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض منافقین نے آپ پر طعنہ زنی کی تھی؛ اور یہ کہا تھا کہ: آپ کو اس لیے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بغض رکھتے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار دوسرے لوگوں کو بھی مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا؛ اور وہ لوگ بھی تعداد میں زیادہ ہوا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں سے افضل ہوا کرتے تھے جن پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا گیا تھا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم موجودگی میں ایک مخصوص گروہ پر کسی کو نائب مقرر کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی امت پر استخلاف مطلق نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصحاب میں سے کسی کو بھی خلیفۂ رسول نہیں کہا گیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خطاب دیا جائے تو دوسرے جو صحابہ وقتاً فوقتاً مدینہ میں نائب بنتے رہے ہیں پھر وہ بھی اس خطاب کے مستحق ہیں۔ تو پھر یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوئی۔

نیز یہ بات بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جو انسان کسی رسول کے مرنے کے بعد خلیفہ بنتا ہے وہ لوگوں میں سے افضل ترین انسان ہوتا ہے۔ جب کہ دوسرا وہ انسان ہے جو دشمن سے جہاد کی مہم کے دوران خلیفہ بنتا ہے؛ اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ تمام لوگوں سے افضل ہو۔ بلکہ عادتاً دیکھا گیا ہے کہ دوران جہاد جو انسان افضل ہوتا ہے؛ اسے جہادی ضرورت کے پیش نظر ساتھ لے جایا جاتا ہے۔ بخلاف اس انسان کے جسے عورتوں اور بچوں پر نائب مقرر کیا جائے۔ اس لیے کہ جہاد میں کام آنے والا انسان اس مہم میں ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کا مقام بچوں پر نائب بن کر پیچھے رہنے والے کی نسبت زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ھشام (ص: ٤٥٤)، جوامع السیرۃ لابن حزم (ص: ١٨٢، ١٨٣)۔

[2] سیرۃ ابن ھشام (ص: ٢٩٢)، جوامع السیرۃ لابن حزم (ص: ١٠٧، ١٠٨)۔

اس لیے کہ نائب بن کر پیچھے رہنے والے کا فائدہ اس انسان کی طرح نہیں ہے جو جہاد میں ساتھ شریک ہو۔
رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام سے تشبیہ صرف اصل استخلاف میں دی تھی۔ [1] کمال استخلاف میں نہیں۔ اس استخلاف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شریک کار دوسرے لوگ بھی ہیں۔ اسکی وضاحت یہ ہے کہ اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام جب اپنے رب سے ملاقات کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ اس امر میں کوئی دوسرا شریک نہیں تھا۔ ورنہ حضرت ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں بنی اسرائیل کے حاکم بنائے گئے تھے۔ اس کے برخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مدینہ میں نبی کریم ﷺ کے قائم مقام قرار پائے تو اکثر لوگ وہاں سے نبی کریم ﷺ کو رفاقت میں جا چکے تھے سوائے معذوروں [اور منافقین] کے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت محض عورتوں، بچوں اور ضعیف لوگوں کے لیے باقی رہ گئی تھی۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے مدینہ میں نائب بنایا جانا ہر لحاظ سے ایسے نہیں تھا جیسے حضرت ہارون علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں نائب بنایا جانا۔ بلکہ آپ کو اپنی عدم موجودگی میں ایسے امین بنایا تھا جیسے ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عدم موجودگی میں امین بنایا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے آپ کے لیے واضح کیا کہ نائب بنائے جانے سے مقام و مرتبہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے انسان کی امانت داری ظاہر ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم پر اپنا نائب بنایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے روتے ہوئے چل پڑے تھے۔ اور عرض گزاری کی تھی کہ: کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑے جا رہے ہیں؟ یعنی آپ نبی کریم ﷺ سے پیچھے رہنا ناپسند کرتے تھے۔

شیعہ مصنف کا قول "اِنَّ الْمَدِیْنَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا بِیْ اَوْ بِكَ" صریح کذب اور موضوع روایت ہے۔ [2]

---

[1] سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی موت کے بعد سیدنا یوشع آپ کے قائم مقام قرار پائے تھے نہ کہ سیدنا ہارون علیہ السلام، مزید براں یہ امر قابل غور ہے کہ ہارون نبی تھے اور علی رضی اللہ عنہ نبی نہ تھے۔ ہارون سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے بھائی تھے اور علی رضی اللہ عنہ ان کے بھائی نہ تھے۔ مذکورہ فرق و امتیاز کے علاوہ اب یہ بات باقی رہی کہ غزوۂ تبوک پر جاتے وقت آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا جس طرح سیدنا موسیٰ نے کوہِ طور کو جاتے وقت سیدنا ہارون علیہ السلام کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اصل وجہ مشابہت و مماثلت صرف یہی امر ہے، خاص مدینہ پر استخلاف کا شرف دوسرے لوگوں کو بھی حاصل ہوا مگر کسی نے بھی ان کو نبی کریم کا خلیفہ عام تصور نہ کیا۔ لطف یہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی اس غلطی میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔ علاوہ ازیں حدیث نبوی "اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْن" محدثین کے نزدیک متنازع فیہ ہے، بعض اسے صحیح کہتے ہیں اور بعض ضعیف (ا) امام ابوالفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ اس کو موضوع قرار دیتے ہیں۔ نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا تو انھوں نے اس پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا" کیا آپ مجھے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا: "اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْن" اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا یہ استخلاف ان کے لیے موجب مدح و منقبت ہوتا تو جیسے کہ شیعہ کا خیال ہے تو اس بات پر اظہار ناراضگی کرنے کی بجائے ان کو خوش ہونا چاہئے تھا، حالانکہ یہ بات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اہل سنت و شیعہ کے مابین جملہ اختلافی مسائل میں شیعہ کا طرز فکر ہمیشہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ابنا علی رضی اللہ عنہ سے مختلف ہوتا ہے، اگر کوئی شخص سعی کامل کو کام میں لا کر ایسے مسائل تلاش کرنا چاہے، جن میں شیعہ نے علماء اہل بیت کی مخالفت کی ہے تو ان سے ایک بڑی کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ تبوك (حدیث:٤٤١٦)، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (حدیث: ٢٤٠٤)۔

[2] شیعہ نے سرکار دو عالم ﷺ اور مشاہیر اسلام پر افتراء پردازی کے جو طریقے رائج کر رکھے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی معروف حدیث کے اصل الفاظ میں بقدر ضرورت اضافہ کر لیتے ہیں، اس کی مثال مذکورۃ الصدر حدیث ہے۔ بعض اوقات شیعہ یوں کرتے ہیں کہ حدیث کا جو حصہ مفید مطلب ہوتا ہے لے لیتے ہیں اور جو جز وان کے خلاف پڑتا ہے، اسے نظر انداز کر دیتے ہیں، اس کی مثال قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: [...... حاشیہ جاری ہے......]

احادیث مبارکہ کے کسی بھی معتمد مجموعہ میں اس کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ جس چیز سے اس روایت کا جھوٹا ہونا ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کیساتھ کئی بار مدینہ سے باہر کا سفر کر چکے تھے۔ اس وقت مدینہ میں نہ ہی نبی ﷺ تھے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ تو پھر آپ کیسے یہ فرما سکتے ہیں کہ: ''میرے اور آپ کے سوا کوئی شخص حاکم مدینہ بننے کا اہل نہیں ہے۔ بدر کے دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ بدر اور مدینہ کے مابین کئی مراحل کا فاصلہ ہے۔ ان دونوں ہستیوں میں سے کوئی ایک بھی مدینہ میں موجود نہیں تھا۔ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ ❶

ایسے ہی فتح مکہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجود باتفاق علماء ثابت ہے۔ آپ کی بہن ام ہانی نے اپنے دونوں دامادوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت کی: یا رسول اللہ! میرا بھائی ان آدمیوں کو قتل کرنا چاہتا ہے جنہیں میں نے پناہ دے رکھی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ام ہانی! جس کو تو نے پناہ دی؛ ہم بھی اس کو پناہ دیتے ہیں۔'' یہ حدیث صحیح ہے۔ [رواه البخاري ٤/ ١٠٠]۔

اس موقع پر مدینہ میں نہ ہی نبی کریم ﷺ تھے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ ایسے ہی خیبر کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا۔ آپ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپ نے [ان کی آنکھوں میں لعاب ڈالا] اور پھر انہیں جھنڈا عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔ اس وقت بھی مدینہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ میں سے کوئی ایک بھی نہیں تھا۔

اور ایسے ہی حنین اور طائف کے غزوات میں شریک رہ چکے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے واپس تشریف لائے تھے؛ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ میں اکٹھے ہوئے اور حج کیا۔ اور ان دنوں آپ دونوں میں سے کوئی ایک بھی مدینہ میں نہیں تھا۔ [آپ کی عدم موجودگی میں دیگر صحابہ مدینہ میں آپ کے قائم مقام تھے]۔

رافضی اپنی جہالت کی وجہ سے ایسا جھوٹ بولتے ہیں جو کہ سیرت کی ادنیٰ معرفت رکھنے والے انسان پر بھی مخفی نہیں رہتا۔

[.....گزشتہ سے پیوستہ.....] ''فاطمہ میرا جگر پارا ہے جو اسے ایذا دیتا ہے وہ مجھے دکھ پہنچاتا ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ میری بیٹی کو طلاق دے کر ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کر لے۔'' صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب ذکر اصہار النبی ﷺ (ح: ۳۷۲۹، ۵۲۳۰)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل فاطمۃ رضی اللہ عنہا ح: ۲٤٤۹، باختلاف)

اس حدیث سے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے غیر معصوم ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور یہ بات شیعہ کے خلاف ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایسی خطا سرزد ہوسکتی ہے جس پر نبی کریم ﷺ اس پر اظہار ناراضگی فرمائیں۔ شیعہ تجاہل عارفانہ سے کام لے کر حدیث کے اس ٹکڑے کو چھپانے کی کوشش کرتے اور اس حدیث کے دوسرے حصہ ''اِنَّمَا فَاطِمَةُ بُضْعَةٌ مِنِّي'' کو امکانی حد تک اچھالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ شیعہ حدیث کے اس ٹکڑے کو باقی حدیث سے الگ کر کے بیان کرتے اور بے محل و مقام اس کو بڑھا چڑھا کر ذکر کرتے رہتے ہیں۔ شیعہ کی دروغ گوئی و تحریف کی مثالیں کوئی کہاں تک گنائے، یہ ایک جداگانہ تصنیف کی متقاضی ہیں، اسلامی تاریخ اور مشاہیر اسلام پر شیعہ نے جو مظالم ڈھائے ہیں اس کا دائرہ اس سے بھی وسیع تر ہے، اس کی حد یہ ہے کہ ہمارا تاریخی ذخیرہ بھی اس وبا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس سے امت مسلمہ کو بڑا نقصان پہنچا۔ حال ہی میں مسلم نوجوانوں نے اس جانب توجہ مبذول کر کے ایسے واقعات کو چھانٹ کر الگ کر دیا ہے۔ وللہ الحمد۔

❶ اس کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین مکہ کے مبارزت طلب کرنے پر مہاجر مجاہدین کی جو پہلی کھیپ مشرکین سے مقابلہ کے لیے روانہ فرمائی؛ اس میں حضرت ابوعبیدہ؛ حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے حریف ولید بن عتبہ کو قتل کیا تھا۔ اور پھر فتح بدر کے بعد راستہ میں واپس جاتے ہوئے آپ نے نبی کریم ﷺ کے حکم سے نضر بن حارث کو الصفر آء کے مقام پر قتل کیا۔ اس غزوہ میں مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے نائب حضرت ابولبابہ ابن المنذر رضی اللہ عنہ تھے۔ لیکن رافضی کو عقل کہاں کہ تاریخ کی روشنی میں بات کرے۔ [دراوی]

[اعتراض]: شیعہ کہتا ہے: ''نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا؛ اس لشکر میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں موجود تھے۔''

[جواب]: یہ ایسا جھوٹ ہے جو حدیث کے کسی ادنی طالب علم پر بھی مخفی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیش اسامہ میں شامل ہی نہ تھے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے آغاز مرض ہی سے ان کو امامت نماز کا منصب تفویض فرمایا تھا؛ اور وفات نبوی ﷺ تک یہ منصب آپ کے ہی پاس رہا۔

یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بیماری شروع ہونے سے پہلے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو علم عطا کیا تھا۔ پھر جب آپ بیمار ہوگئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں۔ تو آپ نبی کریم ﷺ کے انتقال تک امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بالفرض اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیماری سے پہلے آپ کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جہاد کے لیے جانے کا حکم دیا تھا۔ تو پھر نبی کریم ﷺ کا آپ کو نماز پڑھانے کے لیے حکم دینا؛ حالانکہ آپ نے بیماری میں بھی حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانگی کی اجازت دے رکھی تھی؛ تو یہ بعد والا حکم پہلے حکم کے لیے ناسخ ہوگا؛ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت منسوخ ہوگئی۔ تو یہ کہنا کیسے روا ہوسکتا ہے خصوصاً جب کہ آپ پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر ہی نہیں کیا گیا تھا؟

مزید برآں کہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ نہیں تھی کہ کسی سریہ کے لیے یا پھر کسی غزوہ کے لیے نام لیکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو متعین کریں۔ لیکن آپ مطلق طور پر ترغیب دیا کرتے تھے۔ تو صحابہ کرام کو کبھی علم ہوتا تھا کہ آپ نے نام لیکر کسی کو اپنے ساتھ جانے کے لیے متعین نہیں کیا، لیکن خروج برائے جہاد کی ترغیب دی ہے؛ جیسا کہ غزوہ غابہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی تھی۔ اور کبھی کبھار بعض لوگوں کو ان کے خاص احوال کی وجہ سے متعین کرتے تھے۔ جیسا کہ غزوہ بدر کے موقع پر آپ نے اعلان کیا تھا کہ وہ لوگ نکلیں جن کے پاس سواری ہو۔ اسی وجہ سے بہت سارے مسلمان آپ کے ساتھ نہ جاسکے۔ اور غزوہ سویق کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا تھا کہ: ''صرف وہی لوگ جہاد کے لیے نکلیں جو کہ احد میں شریک ہوئے تھے۔'' اور بسا اوقات عام کوچ کا حکم ہوتا تھا؛ جس میں کسی کو پیچھے رہنے کی اجازت نہ ہوتی تھی جیسا کہ تبوک کے موقع پر ہوا۔

آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء کا بھی یہی طریق کار رہا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ایک سریہ کے امیر تھے۔ سرایا کے امراء کو خلفاء نہیں کہا جاتا تھا۔❶ اس لیے کہ وہ نہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے نائب قرار پائے اور نہ آپ کی زندگی ہی میں ہر چیز میں آپ کے قائم مقام تھے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ کے حکم سے ان لوگوں نے ایک جہادی مہم پر کوچ کیا؛ جس میں آپ ﷺ نے ان ہی لوگوں میں سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ان پر امیر مقرر کردیا۔ یہ ایک نئی مہم تھی جس پر آپ متولی تھے؛ اپنے سے پہلے کسی کے خلیفہ یا نائب نہیں تھے۔ اس لیے کہ بستیوں اور شہروں کے امراء [گورنروں] کو بھی خلیفہ کہا جاتا

---

❶ ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اس لیے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی جانب سے سریہ ذات السلاسل میں امیر لشکر مقرر ہوئے تھے۔ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ ذات السلاسل، (ح:۴۳۵۸)، مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۴) اور بڑے بڑے صحابہ مثلاً ابوبکر و عمر و ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم آپ کے تابع فرماتھے۔

ہے۔ یہ لفظی امور ہیں جن کا اطلاق لغت اور استعمال کے حساب سے ہوتا ہے۔

[اشکال]: شیعہ کا کہنا: ''آپ کا انتقال ہوا اور آپ کو معزول نہیں کیا تھا۔''

[جواب]: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ حالانکہ بعض لوگوں نے دشمن کے خوف سے اس لشکر کو واپس بلانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! میں اس جھنڈے کو کبھی بھی نہیں کھولوں گا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا تھا؛ اور پھر امکان کے باوجود اسے نہیں کھولا۔''

آپ بھی اس جھنڈے کو کھول سکتے تھے؛ اس لیے کہ اب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم مقام تھے۔ لیکن آپ نے وہی کیا جو مسلمانوں کے لیے زیادہ مصلحت خیز تھا۔

[شیعہ کا ایک اور جھوٹ]:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ناراض ہونے کا واقعہ بھی صریح کذب ہے۔ یہ ایک مسجع ومن گھڑت پلندہ ہے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت اور آپ کی اطاعت اتنی مشہور ہے کہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ اسامہ تفرق واختلاف کے خوگر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ومعاویہ کی لڑائی میں وہ غیر جانب دار رہے۔ [1] علاوہ ازیں آپ قریشی نہ تھے اور کسی اور وجہ سے بھی خلافت کے لیے موزوں نہ تھے۔ اور نہ ہی کبھی آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ کو خلیفہ بنایا جائے۔ تو پھر آپ کے اس سوال میں کون سا فائدہ باقی رہ گیا تھا کہ آپ پوچھتے کہ آپ کو کس نے خلیفہ بنایا؟ حالانکہ آپ جانتے تھے کہ جو بھی اس معاملہ کا مالک بنے گا وہ آپ پر خلیفہ ہوگا۔

بفرض محال اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر حاکم بنایا تھا، پھر آپ نے وفات پائی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنائے گئے۔ تو اب لشکر کو بھیجنا نہ بھیجنا اور امراء کا معزول ومتعین کرنا خلیفہ کے ہاتھ میں تھا۔ [2]

اگر وہ کہتے کہ: مجھے آپ پر امیر بنایا گیا ہے' تو آپ کو مجھ پر خلیفہ کس نے بنادیا؟ تو اس کے جواب میں آپ کہہ سکتے تھے کہ: اسی نے مجھے آپ پر خلیفہ بنایا ہے جس نے تمام مسلمانوں پر اور آپ سے افضل لوگوں پر خلیفہ بنایا ہے۔

اگر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے کہ: مجھے آپ پر امیر بنایا گیا ہے؛ تو جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی کہہ سکتے تھے کہ: مجھ پر تیری امارت خلیفہ بنائے جانے سے پہلے تھی۔ اب جب کہ میں خلیفہ بن گیا ہوں' تو میں ہی تجھ پر امیر بھی ہوں۔ یہ ایسے ہی ہے اگر فرض کرلیا جائے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کسی کو امیر مقرر کیا تھا؛ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بن گئے؛ تو آپ اس پر بھی امیر بن گئے جو کچھ دیر پہلے آپ پر امیر تھا۔ اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کسی کو امیر مقرر کردیتے؛ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوجاتا اور ان دونوں میں سے کوئی ایک امیر بن جاتا تو وہ انسان پر بھی امیر ہوتا جو کہ ان پر امیر بنایا گیا تھا۔

---

[1] صحابہ میں سے سیدنا عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ، ابوموسیٰ اشعری، اور ابوبکرہ رضی اللہ عنہم اجمعین بھی غیر جانب دار رہے تھے۔

[2] اس لیے کہ عالم اسلامی مصالح حالات کے بدل جانے سے تبدیل ہوجاتے ہیں اگر اسلام کو سیدنا اسامہ یا ان کے لشکر کی کسی اور سلسلہ میں ضرورت لاحق ہوتی تو اسلامی مصلحت کو ہر چیز پر مقدم رکھا جاتا۔

اگر فرض کرلیا جائے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی مہم پر روانہ فرمایا ہو؛اور آپ پر کسی دوسرے کو امیر بنایا ہو جیسے حج میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر بنایا تھا۔سن نو ہجری میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج پر روانہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے جاملے ۔آپ نے پوچھا: کیا امیر بن کرآئے ہو یا مأمور بن کر؟ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلکہ مامور بن کرآیا ہوں۔''

پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر امیر تھے۔اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی خلیفہ تھے تو آپ اس قابل تھے کہ آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر امیر بنایا جائے۔یہ ایسی بات ہے کہ ایک جاہل شخص ہی اس سے منکر ہوسکتا ہے۔تو پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ زیادہ عقل مند؛ زیادہ متقی اہل علم تھے؛ آپ کی زبان سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے انسان کے حق میں اس قسم کی ہذیان گوئی نہیں ہوسکتی۔

اس کذاب کا یہ قول موجب حیرت و استعجاب ہے کہ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر چل کر گئے اور اسامہ رضی اللہ عنہ کو راضی کیا۔''

دوسری جانب شیعہ یہ کہتے ہیں کہ: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ و عباس، بنی ہاشم و بنی عبد مناف کو مغلوب کرلیا تھا اور ان کو راضی نہ کیا۔مقام حیرت ہے کہ جب ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اشراف قریش اور انصار عرب کے بڑے بڑے قبائل کو راضی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو کیا پڑی تھی کہ ایک انیس سالہ مفلس وقلاش اور بے یارومددگار نوجوان کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کرتے۔اگر نبی کریم ﷺ کی محبت نہ ہوتی اور آپ کو رسول اللہ ﷺ نے مقدم نہ کیا ہوتا تو آپ بھی دوسرے فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی مانند ہوتے۔

[اشکال]:''اگر شیعہ کہیں کہ اسامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے محب تھے۔''

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ تم دوسری جانب یہ بھی تو کہتے ہو کہ: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے نبی کریم ﷺ کے عہد و وصیت کو بدل ڈالا تھا۔اور آپ کے وصی پر ظلم کیا اور ان کا حق غصب کرلیا۔جو کوئی صحیح وصریح حکم میں نافرمانی کرے؛ کھلے ہوئے واضح عہد کو بدل ڈالے' ظلم وسرکشی کرے؛ اور دوسروں کو مغلوب کرلے۔اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی پرواہ نہ کرے؛ اور نہ ہی آل محمد ﷺ کے لیے کسی تعلق وقرابت کا خیال کرے' وہ اسامہ جیسے انسان کا اتنا خیال رکھے گا؟ حتی کہ آپ کو راضی کرنے کیلئے چل کر جائے۔حالانکہ اس نے [اسامہ کی ماں] ام ایمن رضی اللہ عنہا کی گواہی رد کی ہو؛ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غضبناک کیا ہو اور آپ کو تکلیف دی ہو؛ حالانکہ آپ اس بات کی زیادہ حق دار تھیں کہ آپ کو راضی کیا جاتا۔جو کوئی اتنا کچھ کرسکتا ہو تو اس کو کون سی ایسی حاجت پڑی ہے کہ وہ اسامہ رضی اللہ عنہ کو راضی کرے؟ اس لیے کہ کسی شخص کو یا تو اس کے دین کی وجہ سے راضی کیا جاتا ہے یا پھر دنیا کی وجہ سے۔اگر اس کے پاس اتنا دین بھی نہ ہو جو کہ راضی کرنے والے انسان کے لیے ترغیب کا سبب بن سکے؛ اور نہ ہی انہیں دنیا کی کسی چیز میں اس کی کوئی ضرورت ہو۔تو پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے کہ انہیں راضی کرنے کی کوشش کی جائے؟ رافضی اپنی جہالت اور دروغ گوئی کی وجہ سے ایسے تناقضات بیان کرتے ہیں جن کا متناقض اور جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہوتا ہے۔بیشک ان لوگوں کے اقوال میں انتہائی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۞ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ أُفِكَ﴾ [الذاریات ۹،۸]

''بلا شبہ تم یقیناً ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو۔اس سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے سے) بہکا ہوا ہو۔''

فصل:

فاروق خطاب رضی اللہ عنہ پر رافضی غصہ

[اعتراض]: شیعہ قلم کار لکھتا ہے:

''اہل سنت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کے نام سے یاد کرتے ہیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے ؛ حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کی شان میں فرمایا تھا:''ھٰذَا فَارُوْقُ اُمَّتِیْ'' (یہ میری امت کا فاروق ہے)۔ جو حق اور باطل کے مابین فرق کرنے والا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہم منافقین کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بغض کی وجہ سے پہچانتے تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ:

پہلی بات: اہل علم محدثین بغیر کسی شک وشبہ کے جانتے ہیں کہ: یہ دونوں حدیثیں جھوٹی' موضوع اور من گھڑت ہیں۔ شیعہ کی طرف سے یہ پہلی جھوٹی حدیث نہیں، بلکہ وہ متعدد دیگر جھوٹی حدیثیں وضع کر چکے ہیں۔ ہمیں اس حدیث کی کوئی سند معلوم نہیں۔اور نہ ہی حدیث کی کسی بھی معتمد کتاب میں ایسی کوئی صحیح روایت موجود ہے۔

دوسری بات: جو کوئی اگر فرعی مسائل میں بھی کسی حدیث سے استدلال کرے تو اس کیلئے لازمی ہے کہ وہ اس حدیث کی سند بھی پیش کرے ۔تو پھر اصول دین میں کیسے بلا سند حدیث پیش کی جاسکتی ہے؟ کسی کہنے والے کا فقط یہ قول کہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' حجت نہیں ہوسکتا؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ اگر یہ حجت ہوتا تو ہر وہ حدیث جس میں کوئی ایک محدث اور اہل سنت یہ کہتا کہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے'' حجت بن جاتی ۔ ہم اس باب میں اس بات پر قناعت کرتے ہیں کہ حدیث کو ان لوگوں سے نقل کیا جائے جو سچائی میں معروف ہوں' خواہ ان کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو۔

لیکن جب حدیث کی اسناد نہ ہوں' تو ناقل حدیث اگر چہ جھوٹ نہ بھی بول رہا ہو' وہ کسی دوسرے کی کتاب سے نقل کر رہا ہو۔اور نقل کرنے والا نہ جانتا ہو کہ [اس سے پہلے] یہ روایت کس سے نقل کی گئی ہے؟ اس باب میں جھوٹ کی کثرت بڑی ہی معروف ہے ۔تو پھر کسی کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی ایسی حدیث سے استدلال کرے جس کی سند کو وہ نہ جانتا ہو؟

تیسری بات: یہ بات ہر علم رکھنے والا انسان جانتا ہے کہ محدثین کرام رحمہم اللہ سب سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے علم کی تلاش میں رہنے والے تھے۔اور سب سے زیادہ اتباع حدیث میں رغبت رکھنے والے تھے۔

اور لوگوں میں سب سے زیادہ اتباع ہوی سے دور رہنے والے تھے ۔ اگر محدثین کے ہاں یہ ثابت ہوجائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی ایسا جملہ ارشاد فرمایا تھا؛ تو ان محدثین سے بڑھ کر کوئی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا حریص نہ ہوتا۔اس لیے کہ یہ مقدس جماعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال پر عمل کرنے کو اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے تھے اور آپ کی محبت میں آپ کی اطاعت کرتے تھے۔اس کے علاوہ کسی ممدوح شخص سے انہیں کوئی غرض نہ ہوتی

تھی۔ اگر ان کے ہاں یہ حدیث ثابت ہو جاتی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا ہے کہ: ''یہ اس امت کے فاروق ہیں'' تو محدثین اسے قبول کرتے۔ اور اسے نقل کرتے۔ جیسا کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا گیا قول نقل کرتے ہیں:

" هذا أمين هذه الأمة ۔" ''یہ اس امت کا امین ہے۔'' [رواه البخاري ٥/ ٢٥]

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا تھا: " لكل نبي حواري و حواري الزبير۔" [رواه البخاري ٥/ ٢١]

''ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے' اور میرا حواری زبیر رضی اللہ عنہ ہے۔''

اور جیسا کہ محدثین کرام رحمہم اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان قبول کیا اور نقل کیا ہے:

" لأعطين الراية غداً رجلاً يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله ۔" [رواه البخاري ٥/ ١٨]

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

اور چادر والی حدیث جس میں آپ نے حضرت علی' حضرت فاطمہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے فرمایا تھا:

''یا اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے پلیدی کو دور کر دے' اور انہیں بالکل پاک کر دے۔'' [مسلم ٤/ ١٨٨٣]

ان کے علاوہ ایسی دیگر بھی کئی ایک روایات ہیں۔

چوتھی بات: ان دونوں روایتوں میں سے ہر ایک کا جھوٹ اور باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔ ان روایات کا نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کے فاروق امت ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیا حق و باطل میں فرق کرنا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد یہی ہو کہ اس سے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان امتیاز ہوتا ہے؛ اور مؤمنین اور منافقین میں فرق ہوتا ہے؛ تو یہ ایسا معاملہ ہے جس پر انسانوں میں سے کسی ایک کا بس نہیں چلتا۔ نہ ہی کسی نبی کا نہ ہی کسی دوسرے کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ وَ مِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ [التوبة ١٠١]

''اور ان لوگوں میں سے جو تمھارے ارد گرد بدویوں میں سے ہیں، کچھ منافق ہیں اور کچھ اہل مدینہ میں سے بھی جو نفاق پر اڑ گئے ہیں، آپ انھیں نہیں جانتے، ہم ہی انھیں جانتے ہیں۔''

نبی کریم ﷺ بھی اہل مدینہ میں سے اور مدینہ کے گرد و نواح کے منافقین میں سے ہر ایک کو متعین طور پر نہیں جانتے تھے؛ تو پھر کوئی دوسرا کیسے جان سکتا ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ اہل حق اور اہل باطل کی صفات بیان کیا کرتے تھے؛ تو یقیناً قرآن میں مجید میں اس کا کافی و شافی بیان موجود ہے۔ اور قرآن ہی وہ فرق کرنے والی کتاب ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں فرق کیا ہے؛ اس میں کوئی شک و شبہ والی بات ہی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: جو لوگ آپ کے ساتھ مل کر لڑتے تھے وہ حق پر تھے' اور جو آپ سے لڑ رہے تھے وہ باطل پر تھے۔ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر اس بات کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے آپ کے اور صرف

اس خاص گروہ کے درمیان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔پس اس لحاظ سے ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اس کے زیادہ حق دار ہیں۔اس لیے کہ انہوں نے اہل حق مؤمنین کو ساتھ لیکر کفار اہل باطل سے قتال کیا۔ان لوگوں کی وجہ سے جو فرق و تمیز حاصل ہوئی وہ زیادہ اکمل و افضل تھی۔اس لیے کہ کوئی عقلمند اس بات میں شک نہیں کرسکتا کہ جن لوگوں سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے قتال کیا وہ باطل پرستی کے زیادہ قریب تھے بہ نسبت ان لوگوں کے جن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتال کیا۔اس لیے کہ جب بھی دشمن جتنا زیادہ باطل پر ہوتا ہے اس سے لڑنے والے اس قدر زیادہ حق پر ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بروز قیامت سب سے زیادہ عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے کسی نبی کو قتل کیا ہو' یا پھر کسی نبی کے ہاتھوں سے قتل ہوا ہو۔وہ مشرکین جو کہ براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دیا کرتے تھے؛ جیسے ابو جہل' ابولہب وغیرہ؛ یہ دوسرے لوگوں سے بڑھ کر برے تھے۔پس جب خلفاء ثلاثہ سے لڑنے والے سب سے بڑے باطل پرست تھے تو ان کی ہمراہی میں لڑنے والے سب سے بڑے حق پرست تھے۔اس لحاظ سے یہ لوگ صفت فرقان کے زیادہ حق دار ہیں[کہ انہیں فاروق کا خطاب دیا جائے]۔

اگر یہ کہا جائے کہ:'' آپ اس لیے فاروق ہیں کہ آپ کی محبت اہل حق و اہل باطل کے مابین فرق کرنے والی ہے۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: اولاً: یہ آپ کا ذاتی فعل نہیں ہے کہ اس وجہ سے آپ کو فاروق کہا جائے۔

ثانیاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اہل حق و اہل باطل کے درمیان سب سے بڑی وجہ تمیز و تفریق ہے۔اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

ثالثاً: اگر کوئی اعتراض کرنے والا اعتراض کرے اور کہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت اہل حق و اہل باطل کے مابین فرق کرنے والی ہے تو ان کا دعوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہی دعوی کرنے والوں سے کسی طرح کمزور نہیں ہوگا۔

حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے آپ نے جب فتنہ کا ذکر کیا تو [حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق] فرمایا:

''اس دن یہ اور اس کے ساتھی حق پر ہوں گے۔'' [رواہ الترمذي ٥/ ٢٩١]۔

اگر یہی دعوی حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں کہا جائے تو یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ ان کا دعوی غالب ہوگا۔اور جس کسی کا قول صرف دعوے تک محدود ہو تو اس کا مقابلہ ایسے ہی دعوی سے کیا جاسکتا ہے۔

اگر اس سے مطلق محبت کا دعوی مراد ہو تو پھر اس میں غالی لوگ بھی داخل ہوں گے؛ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رب یا نبی مانتے ہیں۔تو پھر یہ لوگ زیادہ حق پر ہوں گے۔حالانکہ ایسا کہنا صریح کفر ہے اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

اور اگر اس سے مطلق محبت مراد ہو تو پھر اس کا معاملہ بھی علیحدہ ہے۔اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: ہم شیعہ سے بڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے والے ہیں۔اس لیے کہ جس محبت میں غلو پایا جائے' وہ یہود کی حضرت موسی علیہ السلام سے اور نصاری کی حضرت عیسی علیہ السلام سے محبت کی طرح ہے۔یہ محبت باطل ہے۔صحیح محبت یہ ہے کہ محبت کرنے والا اپنے محبوب سے ان اوصاف و خصال کی وجہ سے محبت کرے جو اس میں موجود ہیں۔اگر کوئی شخص کسی نیک انسان کے متعلق یہ نظریہ رکھے کہ فلاں ولی اللہ کا نبی ہے۔یا اس کا شمار سابقین اولین میں ہوتا ہے؛ وہ اس بنیاد پر اس سے محبت کرنے لگ جائے۔حقیقت میں اس نے ایسی چیز سے محبت کی ہے جس کی کوئی اصل یا حقیقت نہیں ہے۔اس لیے کہ محبت کرنے والے نے اس وجہ سے محبت کی

ہے کہ وہ صفات اس کے محبوب میں موجود ہیں ۔ جب کہ یہ صفات اس میں اصل سے موجود ہی نہیں ۔تو پھر اس نے موجود اوصاف سے محبت نہیں کی بلکہ معدوم سے محبت کی ہے۔اس کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی عورت سے یہ سوچ کر شادی کرے کہ وہ بڑی مال دار ہے ؛ بہت خوبصورت ہے؛ دیندار اور حسب و نسب والی ہے۔ پھر اس کے لیے عیاں ہوں کہ اس میں ان کے خیالات و تصورات میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی ۔تو یقیناً جتنی اس عورت میں کمی نظر آئے گی؛ اس قدر اس کی محبت میں بھی کمی آئے گی۔اس لیے کہ جب حکم کسی علت کی وجہ سے ثابت ہو تو اس علت کے ختم ہونے سے حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔

یہودی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرتا ہے تو وہ اس بنیاد پر محبت کرتا ہے : آپ نے فرمایا: ''جب تک آسمان وزمین باقی رہیں' تم ہفتہ کے دن میں رکے رہنا۔اور آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کی پیروی کرنے سے منع کیا ہے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا ۔جب قیامت والے دن یہودیوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حقیقت واضح ہوگی تو وہ جان لیں گے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی اوصاف کی وجہ سے آپ سے محبت نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ ان کی محبت کی بنیاد ایسے اوصاف تھے جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ۔پس اس بنا پر اس کی محبت باطل ہو گی ۔اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بشارت دینے والا نہ ہوگا۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ))❶

''آدمی [بروز قیامت] اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس نے محبت کی ہوگی ۔''

یہودی کی محبت اس چیز سے ہے جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ۔

محبت؛ ارادہ اور اس طرح کے امور میں علم اور اعتقاد پر چلا جاتا ہے ۔یہ شعور کی ایک قسم ہے۔جو کسی باطل چیز کا کو اپنے اعتقاد میں محبوب رکھے؛ تو یقیناً وہ باطل سے محبت کرنے والا ہوگا۔ یہ باطل محبت اسے کوئی نفع نہیں دے گی۔ایسے ہی جو انسان کسی بشر کے متعلق رب ہونے کا اعتقاد رکھے اور پھر اس بنا پر اس سے محبت کرے ؛ جیسے کہ وہ لوگ جو فرعون کو اپنا رب سمجھتے تھے؛اور اسماعیلیہ [اپنے ائمہ کے متعلق اسماعیلیہ ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں]؛ اور بعض وہ لوگ جو اپنے مشائخ کے رب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔اور بعض لوگ کچھ اہل بیت کے متعلق ایسا ہی دعوی کرتے ہیں ۔یا بعض لوگ انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ اور ملائکہ کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں؛ جیسے عیسائی لوگ۔ پس جو انسان حق کی پہچان حاصل کر لیتا ہے' وہ اسی سے محبت کرتا ہے؛ تو اس کی محبت بھی حق کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ اور جس کی محبت حق کی بنیاد پر ہوتی ہے وہ اسے نفع دیتی ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ٭ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ کَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ٭ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ کَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ﴾ [محمد ۱۔۳]

''وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اللہ نے ان کے اعمال برباد کر دیے۔اور جو لوگ ایمان لائے

---

❶ صحیح بخاری ، کتاب الأدب 'باب : علامة حب الله عزو جل 'ح: ٥٨٢٢۔ صحیح مسلم ؛کتاب البر ...... ' باب: المرء مع من أحب ؛ ح: ٤٨٨٥ ، صحیح الجامع:٦٦٨٩ .

اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اس نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور بے شک جو لوگ ایمان لائے وہ اپنے رب کی طرف سے حق کے پیچھے چلے۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے حالات بیان کرتا ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شیعہ کی محبت اسی نوع کی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نصاریٰ کی محبت۔ جس طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰ کے خداداد مرتبہ پر راضی نہ تھے اور انھوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا، اور آپ کے متعلق ایسے اوصاف گھڑ کر محبت کرنے لگے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ جب ان لیے کہ عیاں ہوگا کہ حضرت عیسی علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' تو اس کی ساری محبت کافور ہو جائے گی؛ اور انہیں آپ کا ساتھ بھی نصیب نہ ہوگا۔ اسی طرح شیعہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں اغراق و غلو سے کام لیتے ہیں۔ اور ایسے ہی ان لوگوں کی محبت بھی ہے جو صحابہ کرام تابعین عظام اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے باطل تصورات قائم کر کے ان سے محبت کرتے ہیں۔ تو اس محبت کی بنیاد ہی باطل پر ہوتی ہے' لہٰذا یہ محبت بھی باطل ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رافضی کے دعویٰ محبت کا یہی عالم ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسی چیزوں سے محبت کرتے ہیں جن کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں۔ مثال کے طور پر رافضی کہتے ہیں: آپ امام منصوص ہیں؛ آپ کو امام بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہیں ہوسکتا۔

ایسے لوگوں کا اعتقاد ہوتا ہے کہ حضرات شیخین جناب ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ظالم اور کافر تھے - معاذ اللہ - ۔ جب روز محشر واضح ہو جائے گا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی افضل نہ تھے؛ بلکہ اس کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ آپ ان دونوں کے قریب تر ہوں؛ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ ان دونوں اصحاب کی خلافت؛ عظمت و امامت اور فضیلت کے قائل تھے۔ اور نہ ہی آپ گناہوں سے معصوم تھے؛ اور نہ ہی آپ کے بعد کوئی دوسرا منصوص امام۔ تو ان کو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہ کرتے تھے۔ بلکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سب سے بڑھ کر بغض رکھنے والے تھے۔ اس لیے کہ جو صفات حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کامل طور پر موجود تھیں رافضی تو ان صفات سے بغض رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ پہلے تینوں خلفاء کی خلافت اور ان کی فضیلت کو مانتے تھے۔ آپ ان کو فضیلت دیتے اور ان کی خلافت کا اقرار کرتے تھے۔ تو اس وقت رافضیوں کو پتہ چل جائے گا کہ وہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا بیان سے اس حدیث کی وضاحت ہو جاتی ہے، جو صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا کہ صرف مومن ہی تجھ سے محبت کرے گا۔ اور صرف منافق ہی تجھ سے بغض و عداوت رکھے گا۔''❶

یہ حدیث صحیح اور ثابت شدہ ہے۔ روافض صحیح معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے اصل اوصاف کی بنیاد پر دوستی نہیں رکھتے، بلکہ ان کی محبت یہودیوں کی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسائیوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام محبت کی جنس سے ہے۔ بلکہ رافضی ایک اعتبار سے جناب علی رضی اللہ عنہ سے بغض و عداوت رکھتے ہیں۔ جس طرح یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

❶ صحیح مسلم۔ کتاب الایمان۔ باب الدلیل علی أن حب الانصار و علی رضی اللہ عنہم من الایمان(ح:۷۸)۔

کے [حقیقی] اوصاف سے بغض رکھتے ہیں ۔ اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والوں کونفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں، حالانکہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام آپ کی رسالت ونبوت کے معترف تھے ۔[[اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ الفت ومحبت رکھتے تھے ۔ مگر شیعہ اس کے باوصف ان سے عداوت رکھتے ہیں، بنابریں وہ نبی کریم کے اس قول میں داخل ہیں کہ ''صرف منافق ہی آپ سے بغض رکھے گا]]۔''

علی ہذا القیاس جو شخص بھی کسی بزرگ سے ایسی صفت کی بنا پر محبت رکھتا ہے جو فی الواقع اس میں نہیں پائی جاتی تو گویا وہ اس سے عداوت رکھتا ہے ۔ مثلاً کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا مرشد اپنے تمام مریدوں کی سفارش کرے گا ۔ اور وہ شیخ اسے رزق پہنچاتا اور اس کی مدد کرتا ہے، اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے؛ یا اس کی حاجات وضروریات پوری کرتا ہے، یا یہ کہ وہ شیخ اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک ہے؛ یا وہ یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اس کا شیخ عالم الغیب ہے ۔ یا پھر وہ بادشاہ مطلق بن گیا ہے؛ اور معاملہ حقیقت میں ایسے نہ ہو؛ تو یقیناً اس نے ایسی چیز سے محبت کی ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان کہ: '' صرف مومن ہی مجھ سے محبت کرے گا ۔ اور صرف منافق ہی مجھ سے بغض وعداوت رکھے گا ۔'' یہ آپ کے خصائص میں سے نہیں ۔ بلکہ بخاری ومسلم میں ثابت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایمان والے کی نشانی انصار سے محبت کرنا ہے' اور منافق کی نشانی انصار سے بغض رکھنا ہے ۔'' ❶

اور آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

'' جو شخص اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ انصار کا دشمن نہیں ہوسکتا ۔'' ❷

نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

'' انصار سے صرف مؤمن ہی محبت رکھے گا' اور ان سے منافق ہی نفرت وبغض رکھے گا ۔''

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ کے لیے یہ دعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دے ۔'' ❸

آپ فرمایا کرتے تھے: آپ کوئی بھی مؤمن نہیں پائیں گے مگر وہ مجھ سے اور میری ماں سے محبت کرتا ہوگا ۔''

ان احادیث کی روشنی میں مذکورہ بالا احادیث اور شیعہ کی روایت کردہ حدیث میں فرق واضح ہوجاتا ہے ۔

شیعہ مصنف لکھتا ہے: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ: '' ہم منافق کو صرف بغض علی کی بنا پر پہچانا کرتے تھے ۔'' اس روایت کے بارے میں ہر عالم جانتا ہے کہ یہ من گھڑت جھوٹ ہے ۔ اس لیے کہ نفاق کی بہت ساری نشانیاں ہیں؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بغض کے علاوہ بھی متعدد اسباب ہیں ۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کے علاوہ کوئی نفاق کی نشانی کیسے نہیں ہوسکتی ۔

---

❶ البخاري ٥/ ٣٢؛ مسلم ١/ ٨٥۔

❷ صحیح مسلم، حواله سابق (ح:٧٧)۔

❸ صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل ابی هريرة رضی اللہ عنہ (حدیث: ٢٤٩١) ۔

علامات نفاق:

[نفاق کی بہت سی نشانیاں ہیں]۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''انصار سے عداوت رکھنا علامت نفاق ہے۔''[1]

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے؛ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔''[2]

قرآن کریم میں منافقین کے اوصاف کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّلۡمِزُكَ فِی الصَّدَقٰتِ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا﴾ (التوبۃ:۵۸)

''ان (منافقین) میں سے وہ بھی ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ کو طعن دیتے ہیں اگر ان کو صدقات دیے جائیں تو وہ راضی ہو جاتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ مِنۡهُمُ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ النَّبِیَّ﴾ (التوبۃ:۵۸)

''منافقین میں سے وہ بھی ہیں جو نبی کو ایذا دیتے ہیں۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ﴾ (التوبۃ ۷۵)

''ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے [جھوٹے] وعدے کرتے ہیں۔''

اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّیۡ وَ لَا تَفۡتِنِّیۡ﴾ (التوبۃ: ۴۹)

''منافقین میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجیے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے۔''

دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ اَیُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِیۡمَانًا﴾ (التوبۃ: ۱۲۴)

''ان میں سے بعض کہتے ہیں: اس آیت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا۔''

اللہ کریم نے سورۂ توبہ اور دیگر مقامات پر منافقین کی جو علامات بیان کی ہیں انھیں یہاں تفصیلاً بیان نہیں کیا جا سکتا۔

شیعہ نے جو جھوٹی روایت ذکر کی ہے، اگر اس کے الفاظ یہ ہوتے کہ ہم منافقین کو بغض علی رضی اللہ عنہ کی بنا پر پہچان لیا کرتے تھے۔ تو بھی ایک بات تھی۔ جس طرح بغض انصار کو علامت نفاق قرار دیا گیا، بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کے بغض کو بھی نفاق کی علامت ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو شخص دانستہ اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس کے ساتھ آپ ﷺ محبت رکھا کرتے تھے؛ اور وہ اللہ کے نبی ﷺ سے سچی محبت اور دوستی رکھا کرتا تھا؛ اس کا بغض و عناد بلا شبہ علامات نفاق میں سے ایک علامت ہے۔ یہ دلیل خود ان لوگوں کا رد کرتی ہے؛ جب کہ اس کا عکس کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے سب سے بڑے منافق سمجھے جاتے تھے۔ کیوں کہ صحابہ میں سے کوئی شخص بھی نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عزیز تر نہ تھا اور نہ ہی صحابہ میں کوئی شخص نبی کریم ﷺ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ چاہنے والا تھا، اس سے واضح ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد رکھنا نفاق کی عظیم ترین علامت

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان۔ باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی رضی اللہ عنہم...... ''(حدیث:۷٤) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامۃ الایمان حب الانصار (حدیث:۱۷)

[2] البخاری، کتاب الایمان۔ باب علامات المنافق(ح:۳۳) مسلم کتاب الایمان باب خصال المنافق(ح:۵۹)

ہے اسی بنا پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے عناد رکھنے والے نصیریہ اور اسمٰعیلیہ سب سے بڑے منافق ہوتے ہیں۔

[اعتراض]: اگر کوئی معترض یہ بات کہے کہ: رافضی جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں' ان کا ایمان تھا کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو ایسی کہانیاں گھڑ کر سنائی گئی ہیں جن کا تقاضا ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت اطہار سے بغض رکھتے ہوں۔ اس لیے وہ بھی جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں۔''

[جواب]: اگر یہ واقعی عذر ہے تو پھر ان لوگوں کے منافق ہونے میں کیا مانع ہے جو جہالت اور تاؤیل کی بنا پر آپ سے بغض رکھتے ہیں۔ تو پھر یہی حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والوں کا ہوگا' جن کا اعتقاد ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کافر اور مرتد ہو گئے تھے۔ یا آپ ظالم اور فاسق تھے۔ تو وہ بھی آپ سے اس وجہ سے بغض رکھتے ہیں کہ آپ دین اسلام سے بغض رکھتے تھے۔ یا اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو عدل و انصاف کا حکم دیا تھا' اس سے محبت نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ نے حکومت کی تلاش میں امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قتل کروایا۔ اور آپ نے زمین میں فساد پھیلایا۔ اور آپ کی مثال ایسے ہی تھی جیسے فرعون یا اس جیسے دوسرے لوگوں کی۔ ایسا کہنے والے بھی اگر چہ جاہل ہیں؛ مگر ان لوگوں سے بڑھ کر جاہل نہیں ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس امت کا فرعون کہتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کا اپنی جہالت اور تاویل کی وجہ سے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنا منافقت نہیں ہے؛ تو پھر دوسرے لوگوں [خوارج و نواصب] کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنا بھی بدرجہ اولی منافقت نہیں ہے۔

اگر بغض علی رضی اللہ عنہ نفاق ہے' بھلے وہ جہالت اور تاؤیل کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو؛ تو پھر اس وقت حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بغض رکھنا بدرجہ اولی نفاق ہوگا' اگر چہ جہالت و تاؤیل کی بنا پر ہی کیوں نہ ہو۔

فصل:

تعظیم ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر رافضی غیض وغضب

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول: ''اہل سنت باقی ازواج مطہرات پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی عظمت وفضیلت کے قائل ہیں حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کو یاد فرمایا کرتے تھے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بھی اس کو اس کثرت سے کیا یاد کرتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان سے بہتر بدل عطا فرمایا۔تو آپ نے فرمایا:'' اللہ کی قسم! اس سے بہتر بدل مجھے نہیں مل سکا۔اس نے اس وقت میری تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا۔اور جب لوگوں نے مجھے جھڑک دیا؛ تو اس نے مجھے اس وقت ٹھکانہ اور پناہ دی۔اس نے اپنے مال کیساتھ میری مدد کی۔اللہ تعالیٰ نے اس سے مجھے اولاد عطا فرمائی۔جب کہ کسی دوسری بیوی سے میری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: اہل سنت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے سب ازواج سے افضل ہونے کے بارے میں متحد الخیال نہیں ہیں۔ہاں اکثر لوگوں کا یہی خیال ہے۔جو لوگ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کے قائل ہیں وہ یہ حدیث نبوی پیش کرتے ہیں جسے امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اور انس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' آپ نے فرمایا:

''عائشہ باقی عورتوں پر اسی طرح فضیلت رکھتی ہیں جیسے ثرید باقی کھانوں سے افضل ہے۔''[1]

ثرید میں گوشت میں بھگوئی ہوئی روٹی ہونے کی وجہ سے باقی کھانوں سے افضل ہے۔

گندم کی روٹی بہترین کھانا ہے' اور گوشت بہترین سالن ہے۔جیسا کہ ابن قتیبہ کی روایت کردہ حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:'' دنیا والوں کے لیے تمام سالنوں کا سردار گوشت ہے۔''[سنن ابن ماجة ۲/ ۱۰۹۹ا ضعیف]

جب گوشت ہر قسم کے سالن کا سردار ہے' اور گندم کی روٹی تمام غذاؤں کی سردار ہے' تو ان دونوں کا مجموعہ ثرید ہے؛ جو کہ تمام کھانوں کا سردار ہے۔اس لیے ثرید تمام کھانوں سے افضل ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ احادیث کئی اسناد سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عائشہ باقی عورتوں پر اسی طرح فضیلت رکھتی ہیں جیسے ثرید باقی کھانوں سے افضل ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ازواج مطہرات میں سے آپ کو کون عزیز تر ہے؟ آپ نے جواباً فرمایا:''عائشہ رضی اللہ عنہا۔''

میں نے عرض کیا اور مردوں میں سے آپ کس کے ساتھ زیادہ محبت رکھتے ہیں؟ فرمایا:''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔''

میں نے عرض کیا ان کے بعد اور کس سے؟ فرمایا:'' عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل أصحاب النبی ﷺ۔ باب فضل عائشة رضی الله عنها۔(ح:۳۷۶۹، ۳۷۷۰)، صحیح مسلم ۔ کتاب فضائل الصحابة باب فی فضائل عائشة رضی الله عنها(ح:۲٤٤٦)۔

اس کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ دریافت کرتے چلے گئے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے درجہ بدرجہ متعدد صحابہ کا ذکر کیا۔ [1]

شیعہ جو کہتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی شان میں فرمایا ہے کہ:

" مَا اَبْدَلَنِیَ اللّٰہُ خَیْرًا مِّنْھَا ۔" [2]

''اللہ تعالیٰ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے عوض مجھے ان سے بہتر بیوی عطا نہیں کی۔''

اگر اس کی سند کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کا عقیدہ رکھنے والے بشرط صحت اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ آغاز اسلام میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ذریعہ آپ کو جو فائدہ پہنچا تھا وہ نفع کسی اور سے حاصل نہیں ہوا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے افضل ہونے کا پہلو گویا یہ امر ہے کہ آپ نے آڑے وقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کی۔ اس کے عین برخلاف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت نبوی کی سعادت اس آخری وقت میں حاصل ہوئی جب نبوت پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور دین حق تکمیل کے آخری مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کمالِ علم وایمان کی وہ دولت نصیب ہوئی جو آغاز اسلام والوں کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ اس اعتبار سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے افضل ٹھہریں۔

امت محمدی بڑی حد تک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علم وفضل سے متمتع ہوئی اور آپ نے علم وعمل دونوں سے حظ وافر پایا۔ گویا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود ہے۔ نہ آپ کو تبلیغ احکام کا شرف حاصل ہوا اور نہ ہی امت آپ سے نفع اندوز ہو سکی۔ جب کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے امت کو بڑا فائدہ پہنچا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دین اسلام اس وقت تکمیل کو نہیں پہنچا تھا اور ابھی ان کمالات کی تحصیل کا وقت نہیں آیا تھا جو بعد میں آنے والے لوگوں نے حاصل کیے۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جو شخص اپنی توجہات کو ایک ہی بات پر مرکوز کر دے، وہ اس کی نسبت بہتر ہو گا جس نے مختلف امور و اعمال کو اپنی نظر و فکر کی آماج گاہ بنا رکھا ہو۔ یہ ہے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کی وجہ وجیہ! مگر معاملہ یہ ہے کہ نیکی کے جملہ اقسام افضلیت کے اس پہلو میں محصور و محدود نہیں ہیں۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ صحابہ کرام میں سے جو لوگ ایمان و جہاد میں پیش پیش تھے، مثلاً حضرت حمزہ، علی، سعد بن معاذ، اُسید [3] بن حُضیر رضی اللہ عنہم اجمعین وہ ان لوگوں کی نسبت افضل تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت و نفع رسانی میں ان سے سبقت لے گئے تھے۔ مثلاً ابورافع اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما۔

---

[1] صحیح بخاری۔ باب غزوۃ ذات السلاسل، (ح:۴۳۵۸) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸٤)۔

[2] مسند احمد(٦/ ١١٧۔١١٨)۔

[3] یہ انصار کے قبیلہ بنی عبد الاشہل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد قبیلہ اوس کے مشہور شہسوار اور جنگ بُعاث میں سالار لشکر تھے۔ اسید سابقین اوّلین میں سے تھے۔ یہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے یہ لیلۃ العقبہ کے نقباء میں سے ایک تھے۔ یہ زندگی بھر شرافت کا مجسمہ رہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسید کو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا بھائی قرار دیا تھا۔ یہ غزوۂ احد میں ثابت قدم رہے اور ان کے جسد اقدس پر سترہ زخم آئے۔ یہ خلافت فاروقی تک بقید حیات رہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیت المقدس کی فتح کے وقت وہاں موجود تھے۔ سرور کائنات نے ان کی مدح میں فرمایا: ''اسید بہت اچھے آدمی ہیں۔'' (سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب مناقب معاذ بن جبل...... رضی اللہ عنہ (ح: ۳۷۹۵) مطولاً، مستدرك حاكم (۳/۲۸۸)، جس طرح عمرو بن العاص کی مدح میں فرمایا تھا: ''عبد اللہ کے سب گھر والے اچھے ہیں۔ عبد اللہ، ابو عبد اللہ اور ام عبد اللہ رضی اللہ عنہم سب نیک لوگ ہیں۔'' (مسند احمد (۱/ ۱٦۱، ٤/ ۱۵۰) اسید رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعش اٹھانے میں حصہ لیا اور بقیع میں مدفون ہوئے۔ (مستدرك حاكم(۳/۲۸۷) معجم كبير طبرانی (۱/ ۲۰۳)

بہر کیف یہاں سیدہ عائشہ و خدیجہ رضی اللہ عنہا کی افضلیت کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں۔ اصلی مقصد یہ بتانا ہے کہ اہل سنت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم و تکریم اور محبت کے بارے میں متفق اللسان ہیں۔ نیز یہ کہ جملہ ازواج مطہرات میں سے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کو عزیز تر تھیں؛ آپ ان سب میں سے بڑی عالم تھیں۔ مسلمان بھی جملہ امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سے ان کا زیادہ اکرام و احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔

روایات صحیحہ میں موجود ہے کہ صحابہ دانستہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحائف بھیجا کرتے تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ دیگر ازواج آپ کو رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بارگاہ نبوی میں بھیجا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: آپ کی بیویاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں عدل و انصاف کا تقاضا کرتی ہیں۔'' آپ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا:

''پیاری بیٹی! جس سے مجھے محبت ہے کیا تو اسے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی؟''

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: کیوں نہیں!

تو آپ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''تو اس سے محبت رکھیے۔''[1]

حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

عائشہ!'' جبریل علیہ السلام آپ کو سلام کہتے ہیں۔'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، ہم کو نظر نہیں آتا۔''[2]

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا[3] کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے آپ کی اجازت سے اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الھبۃ، باب من اھدی الی صاحبہ (حدیث:۲۵۸۱)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ، باب فی فضائل عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ (حدیث: ۲۴۴۱، ۲۴۴۲)

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ باب فضل عائشۃ رضی اللہ عنہا۔ (حدیث:۳۷۶۸)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب فی فضائل عائشۃ رضی اللہ عنہا۔(حدیث:۲۴۴۷)

[3] ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا قریش کے قبیلہ بنی عامر سے تعلق رکھتی تھیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا و سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک ہی وقت میں عقد باندھا گیا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت کم سن تھیں۔ اس لیے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ان سے پہلے آپ کے گھر میں آباد ہوئیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو انھوں نے عرض کیا۔ مجھے خاوند کی حاجت نہیں، میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میں بروز قیامت آپ کی بیوی کی حیثیت سے اٹھائی جاؤں۔ جب انھوں نے اپنی باری کا دن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ﴾ (سنن ابی داود۔ باب فی القسم بین النساء (ح:۲۱۳۵) سنن ترمذی(۳۰۴۰) عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ بمعناہ.
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرماتی ہیں: سودہ رضی اللہ عنہا کے سوا دوسری کوئی عورت نہیں جس کے بارے میں میری یہ خواہش ہو کہ میں اس کی کھال میں داخل ہو جاؤں۔ (اپنے آپ کو اس سے تبدیل کر لوں) (مسلم۔ کتاب الرضاع، باب جواز ھبتھا نوبتھا لضربھا، (ح: ۱۴۶۳)
خلافت فاروقی میں جب بلا جنگ و قتال بہت سا مال آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک تھیلا درہموں سے بھر کر بھیجا۔ حضرت سودہ نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا: درہم، آپ نے فرمایا: یہ تو کھجوروں کے تھیلے کی طرح بھرا ہوا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے وہ سب درہم تقسیم کر دیے۔ (طبقات ابن سعد(۸/۵۶)۔

جب نبی کریم ﷺ مرض الموت میں مبتلا تھے،تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے باری کے دن کا بے تابانہ انتظار کرتے اور فرمایا کرتے تھے،''میں آج کا دن کہاں گزاروں گا؟'' پھر سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں قیام کی اجازت دے دی۔ آپ آخر دم تک وہاں مقیم رہے۔ [1]

آپ نے اپنے اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لعاب دہن کو یک جا کیا [2] اسی دوران سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی آغوش میں عالم آخرت کو سدھار گئے۔ [3]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا وجود مسعود امت کے لیے لاتعداد فوائد و برکات کا موجب ہوا۔ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے آیت تیمم نازل ہوئی تو حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے آل ابی بکر رضی اللہ عنہ! یہ تمہاری اوّلین برکت نہیں ہے۔ اے عائشہ رضی اللہ عنہا! تم پر جو مصیبت بھی نازل ہوئی، اسے اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت کا موجب بنایا۔'' [4]

❁❁❁❁

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب مرض النبی ﷺ و وفاته (حدیث:۴۴۵۰)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضائل عائشة رضی اللہ عنہا (حدیث:۲۴۴۳)۔

[2] صحیح بخاری، حواله سابق(حدیث:۴۴۵۱)، صحیح مسلم، حواله سابق۔

[3] صحیح بخاری ۔ کتاب التیمم(ح:۳۳۴، ۳۳۶) صحیح مسلم۔کتاب الحیض۔ باب التیمم(ح:۳۶۷)،

[4] صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب حدیث الافك (حدیث:۴۱۴۱)، صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی حدیث الافك(حدیث:۲۷۷۰)۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر رافضی اعتراضات

[اعتراضات]: رافضی مصنف لکھتا ہے:''عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کا وہ راز افشاء کردیا۔ نبی کریم ﷺ نے عائشہ سے کہا تھا کہ تو علی رضی اللہ عنہ سے لڑے گی اور تو اس پر ظلم کرنے والی ہو گی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج النبی کو حکم دیا تھا:﴿وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ ''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ اور ایک جماعت کی رفاقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے نکلیں۔ حالانکہ ان کا کوئی گناہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ سب مسلمانوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر اتفاق کر لیا تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرانے کی سازش کرتی رہتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ ''بوڑھے احمق کو تہ تیغ کردو۔'' ''اللہ اس بوڑھے احمق کو قتل کرے۔'' جب آپ کی قتل کی خبر اس تک پہنچی تو بہت خوش ہوئی۔ پھر پوچھنے لگی: ان کے بعد کون خلیفہ بنا؟ لوگوں نے کہا: علی رضی اللہ عنہ۔ تو اس نے عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کے بدلہ کے نام پر علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا۔ حالانکہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کیا گناہ تھا؟ اور طلحہ، زبیر رضی اللہ عنہما اور دس ہزار مسلمانوں کو کیوں کر زیب دیتا تھا کہ وہ ان کے زیر اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوتے۔ بروز قیامت یہ لوگ نبی کریم ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے، تو اس عورت کا خاوند اس کا انتہائی دشمن بن جائے گا۔ موجب حیرت تو یہ امر ہے کہ یہ سب لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ متحد ہو گئے، مگر جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنا حق طلب کرنے گئیں تو کسی نے بھی ان کا ساتھ نہ دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کا زاویہ نگاہ مبنی بر عدل و انصاف اور تناقض سے پاک ہے۔ ان کا کلام حق و عدل سے عبارت ہے جس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ اس کے برخلاف روافض و مبتدعین کے افکار و آراء میں تناقض پایا جاتا ہے۔ جن میں بعض باتوں کے متعلق آگے چل کر ہم آگاہ کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

[جنتی ہونے کے لیے معصومیت شرط نہیں]:

اہل سنت کے نزدیک بدری صحابہ اور سب امہات المومنین رضی اللہ عنہن قطعی جنتی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے علاوہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و علی و طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین یہ تمام لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جنت کے سرداروں میں سے ہیں۔

اہل سنت کا زاویہ فکر یہ ہے کہ جنتی ہونے کے لیے گناہ و خطاء سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ بلکہ اس امر کا بھی احتمال ہے کہ کوئی شخص صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر کے پھر اس سے سچی توبہ کر لے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے یہاں متفق علیہا ہے۔ اگر توبہ نہ بھی کرے تو صغیرہ گناہ، کبائر سے اجتناب کرنے کی بنا پر بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ یہ جمہور کا مذہب ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک کبائر، اعمالِ صالحہ بلکہ حوادث و آلام میں گرفتار ہونے کی بنا پر بھی معاف کر دیے جاتے ہیں۔

بنا بریں اہل سنت کہتے ہیں کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی جو برائیاں بیان کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر جھوٹ ہیں۔ اور اکثر

ان کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ مگر بہت سارے لوگوں کو وجہ اجتہاد معلوم نہیں ہوسکی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مفروضہ گناہوں میں سے بعض توبہ کی بنا پر اور بعض اعمال صالحہ اور حوادثِ روزگار یا کسی اور وجہ سے معاف کیے جا چکے ہیں۔ اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جن سے ان کا جنتی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسے افعال کا ارتکاب نہیں کر سکتے جو دوزخ میں جانے کے موجب ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب انھوں نے موجبات نار سے اپنا دامن بچائے رکھا تھا؛ اور ان کی موت ایسے اعمال پر نہیں ہوئی جو جہنم میں جانے کا موجب ہوں تو کوئی دوسری چیز ان کے جنتی ہونے میں قادح نہیں ہوسکتی [تو وہ یقیناً جنتی ٹھہریں گے]۔

وثوق و یقین سے یہ جاننے کے باوجود کہ صحابہ قطعی جنتی ہیں۔ اگر ہمیں کسی متعین صحابی کے جنتی ہونے کا علم حاصل نہ بھی ہو پھر بھی ہم غیر یقینی امور کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے جنتی ہونے کی نفی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایک عام مومن؛ جس کا حتمی طور پر جنتی ہونا دوٹوک طور پر معلوم نہ بھی ہو تب بھی اس کے جنتی ہونے کی نفی کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح صرف احتمال کے بل بوتے پر کسی کو دوزخی قرار دینا بھی ناروا ہے۔ خصوصاً صلحاء کے بارے میں ایسی بات کہنا بڑی مذموم حرکت ہے۔ کسی فرد واحد کے ظاہر و باطن اور اعمالِ صالحہ و سیہ کی تفصیلات معلوم کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ اس لیے اس ضمن میں کوئی فیصلہ صادر کرنا بلا علم و دلیل ہے اور کلام بلا علم حرام ہے۔ اسی بنا پر مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے زبان کو روکنا اس ضمن میں اظہار خیال سے افضل ہے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں زیادہ غور و خوض کرنا اور کلام کرنا بلا علم ہے۔ جو کہ حرام ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ ساتھ ہوائے نفس اور حق سے روگردانی بھی شامل ہو۔ پھر جب کلام ہی صرف اس نیت سے کیا جائے کہ ہوائے نفس کو طیش دینا اور حق کو ٹھکرانا مقصود ہو تو پھر اس کی حرمت کا کیا عالم ہوگا؟ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''قاضی تین ہیں، ان میں سے دو قاضی جہنمی اور ایک جنتی ہے:

۱۔ جو قاضی حق کو معلوم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ جنتی ہے۔

۲۔ وہ قاضی جو حق سے آگاہ ہو اور دانستہ اس کے خلاف فیصلہ کرے وہ دوزخی ہے۔

۳۔ جو شخص جہالت کی بنا پر فیصلہ کرے وہ جہنمی ہے۔''[1]

جب قلیل و کثیر مالی معاملات میں فیصلہ صادر کرنا اس قدر اہم ہو؛ تو مشاجراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر بہت سارے بڑے بڑے امور میں زبان کھولنا کس قدر نازک کام ہوگا۔

نظر بریں جو شخص جہالت کی بنا پر اپنے علم کے خلاف اس موضوع پر زبان سخن دراز کرتا ہے تو وہ سخت وعید کا مستوجب ہے۔ اور اگر کوئی شخص ہوائے نفس یا معارضۂ حق کے لیے سچی بات کہتا ہے؛ اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہ ہو؛ یا پھر اس سے کسی دوسری حق بات کو ٹھکرانا چاہتا ہو تو وہ بھی مذمت و عقاب کا مستحق ہے۔

جو شخص کتاب و سنت کی روشنی میں صحابہ کے فضائل و مناقب، ان کے جنتی ہونے نیز اس بات سے آگاہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے رضامندی کا اظہار کیا؛ اور انہیں جنت کا مستحق قرار دیا؛ اور ان کو اس خیر الامت کے بہترین لوگ قرار دیا ہے جو امت لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ وہ ان یقینی امور کو ترک کر کے درج ذیل مشتبہ امور کو خاطر میں نہیں لائے گا، یہ مشتبہ امور حسب ذیل کیفیت کے حامل ہیں:

[1] سنن ابی داؤد - کتاب الاقضیة - باب فی القاضی یخطئ (حدیث:۳۵۷۳)، سنن ابن ماجة - کتاب الاحکام - باب الحاکم یجتهد فیصیب الحق، (حدیث:۲۳۱۵)۔

۱۔صحابہ سے متعلق بعض شبہات کی صحت معلوم نہیں۔
۲۔بعض شبہات صریح کذب ہیں:
۳۔بعض کا وقوع پذیر ہونا سرے سے معلوم ہی نہیں۔
۴۔بعض شبہات کا عذر سب کے نزدیک مسلم ہے۔
۵۔بعض امور میں صحابہ کا توبہ کرنا سب کو معلوم ہے۔
۶۔بعض برائیوں کو اُنکی نیکیوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ جو شخص اہل سنت کی راہ پر گامزن ہوگا وہ مسلک استقامت و اعتدال کا سالک ہوگا، ورنہ شیعہ کی طرح جہالت وضلالت کی گہری کھائیوں میں جا گرے گا۔جیسا کہ ان گمراہوں کے حال سے واضح ہے۔

[پہلا اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کا راز منکشف کر دیا تھا۔'' اللہ تعالیٰ [اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے] فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ﴾ [التحریم ۳]

''اور یاد کرو کہ جب نبی نے اپنی بعض عورتوں سے ایک پوشیدہ بات کہی پس جب اس نے اس بات کی خبر کر دی اور اللہ نے اپنے نبی کو آگاہ کر دیا تو نبی نے تھوڑی سی بات تو بتا دی اور تھوڑی سی ٹال گئے پھر جب نبی نے اپنی اس بیوی کو یہ بات بتائی تو وہ کہنے لگی اسکی خبر آپکو کس نے دی کہا سب جاننے والے پوری خبر رکھنے والے اللہ نے مجھے یہ بتلایا ہے۔''

صحیح حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:''اس سے مراد عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں۔''

پہلا جواب: جن نصوص قرآنیہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی بعض لغزشوں کا ذکر ہے؛ شیعہ ان کی تاویلات کر کے ان کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔اہل سنت ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ: صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے توبہ کر لی تھی۔اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کے درجات بلند کر دیئے۔شیعہ نے افشائے راز کے بارے میں جو آیت ذکر کی ہے وہ اس نوع کی پہلی آیت نہیں ہے؛ اور دیگر آیات کی طرح اس کی تاویل بھی ممکن ہے۔اگر اس آیت کی تاویل کرنا باطل ہے تو دوسری آیات کی تاویل بھی باطل ہوگی۔

دوسرا جواب: بفرض محال اگر سیدہ عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما نے کوئی لغزش کی بھی تھی تو حسب ذیل آیت کریمہ کے مطابق اس سے تائب ہو گئی تھیں۔جیسا کہ قرآن کے اس فرمان سے ظاہر ہے:

﴿اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ (التحریم: ۴)

''اگر تم دونوں اللہ کے سامنے توبہ کر لو (تو بہت بہتر ہے) یقیناً تمہارے دل جھک پڑے ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو توبہ کی دعوت دی ہے۔سیدہ عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما کی عظمت شان کے پیش نظر یہ بدگمانی درست نہیں کہ انھوں نے توبہ نہیں کی ہوگی۔حالانکہ ان کے بلند درجات ثابت شدہ ہیں۔مزید برآں ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپ جنت میں بھی آپ کی زوجیت سے مشرف ہوں گی۔نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اختیار دیا تھا کہ دنیا کی زیب و زینت یا اللہ و رسول ﷺ اور دار آخرت میں سے جس کو چاہیں منتخب کریں؛ تو انھوں نے اللہ و رسول اور دار آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دی۔انھی خصوصیات کا تقاضا تھا کہ ان کے عوض دوسری ازواج سے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا گیا تھا اور ان کے علاوہ دیگر مستورات کو نکاح میں لانے کی بھی ممانعت کر دی گئی تھی۔جب آپ کا انتقال ہوا تو آپ

کی ازواج بنص قرآنی امہات المومنین کا درجہ رکھتی تھیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ توبہ نیز اعمال صالحہ اور مصائب مکفرہ سے بھی گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب: ازواج مطہرات کے بارے میں جن گناہوں کی نشان دہی کی جاتی ہے وہ اسی طرح ہیں جیسے اہل بیت وصحابہ میں سے مشھود لھم بالجنۃ کی جانب بعض گناہوں کی نسبت کی جاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''بنو ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے علی کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کرنے کی اجازت طلب کی ہے۔ واضح ہو کہ میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے البتہ اگر علی چاہے تو میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح باندھ لے۔ فاطمہ میرا جگر پارہ ہے، جو چیز اسے ایذا دیتی ہے اس سے مجھے دکھ پہنچتا ہے۔''[1]

یہ سوء ظن بے بنیاد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ظاہری طور پر بنت ابی جہل سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا، حق یہ ہے کہ آپ نے خلوص دل سے توبہ کی تھی۔

اسی طرح جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں کفار کے ساتھ مصالحت کی تو صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''اونٹوں کو نحر کیجیے اور سر منڈایئے۔'' یہ حکم سن کر جب کوئی صحابی نہ اٹھا۔ اور آپ ناراض ہو کر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ تو انھوں نے کہا: جس نے آپ کو ناراض کیا اللہ اسے ناراض کرے۔ آپ نے فرمایا:

''میں کیوں کر ناراض نہ ہوں میں ایک حکم صادر کرتا ہوں اور کوئی شخص اس کی اطاعت نہیں کرتا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: حضرت! اپنی قربانی منگوا کر ذبح کیجیے، اور حجام کو طلب کر کے سر منڈوایے۔

دوران صلح آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دستاویز سے اپنا نام محو کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں آپ کا نام نہیں مٹاؤں گا۔'' چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستاویز لے کر اپنا نام مٹا دیا۔[2]

ظاہر ہے کہ مذکورہ واقعات میں ارشاد نبوی کی تعمیل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کا اس حد تک پس و پیش کرنا کہ نبی کریم ناراض ہو گئے۔ اگر کسی کے نزدیک گناہ ہو تو جو جواب اس کا ہے وہی سیدہ عائشہ کے واقعہ کا جواب ہے۔

بعض لوگ تاویل کی پناہ لے کر کہتے ہیں کہ صحابہ نے تعمیل ارشاد میں اس لیے دیر لگائی کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے کی امید تھی۔ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہوتی تو آپ کے برہم ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بخلاف ازیں صحابہ نے بارگاہ ایزدی سے اس تاخیر کی معافی طلب کی تھی۔ حالانکہ بلا توبہ، اعمال صالحہ سے بھی ایسے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تاخیر کرنے والوں میں شامل تھے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)

[دوسرا اعتراض]: شیعہ مصنف نے جو ایک روایت نقل کی ہے؛ جس میں [حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا ہے]:

''تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑو گی اور اس پر ظلم کرنے والی ہو گی۔''

جواب: [یہ روایت صریح کذب ہے] حدیث کی کسی بھی معتمد کتاب میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور نہ ہی اس روایت کی

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب ذکر اصهار النبی ﷺ (ح:۳۷۲۹، ۵۲۳۰)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل فاطمة رضی اللہ عنہا (ح:۲٤٤۹)

[2] صحیح بخاری، کتاب الشروط۔ باب الشروط فی الجهاد (حدیث:۲۷۳۱، ۲۷۳۲)

کوئی معروف سند ہے۔ بلکہ یہ ان موضوع روایات میں سے ہے جو اپنی طرف گھڑ لی گئی ہیں۔ اور انہیں صحیح احادیث کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے نہیں نکلی تھیں۔ اور نہ ہی آپ کی نیت جنگ کرنے کی تھی۔، بلکہ مسلمانوں کے مابین صلح کرانے کے جذبہ سے باہر نکلی تھیں۔ [1] ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ مدینہ سے نکلنا ان کے لیے موزوں نہ تھا۔ چنانچہ ان کی یہ حالت تھی کہ جب بھی مدینہ سے نکلنے کا واقعہ یاد آتا تو اس قدر روتیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا۔ [طبقات ابن سعد(۸/ ۵۸)]

سابقین اوّلین صحابہ جنہوں نے اس جنگ میں شرکت کی تھی؛ مثلاً: حضرت طلحہ و زبیر اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین [2] نے بھی اس پر اظہار افسوس کیا تھا۔ جمل کا واقعہ قصداً نہیں بلکہ غیر اختیاری طور پر پیش آیا تھا۔

---

[1] مورخہ ۲۵/ ذوالحجہ ۳۵ھ بروز جمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے۔ مسلمان متوقع تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر حد شرعی قائم کریں گے۔ مگر ربیع الاول ۳۶ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ عازم عراق ہوئے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی دلی تمنا یہ تھی کہ ان کے والد مدینہ ہی کو اپنا مستقر قرار دیں۔ (تاریخ طبری: ۵/۱۷۱)، قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ زیادہ تر کوفہ و بصرہ کے رہنے والے تھے اور وہ آپ کے لشکر میں شامل تھے۔ کوفہ پہنچ کر ان کی قوت اور بڑھ گئی اور ان کے قبائل ان کی امداد کے لیے تیار ہو گئے۔ تاریخ اسلام کے اوراق اس امر کے زندہ گواہ ہیں کہ حضرت علی قاتلین حضرت عثمان سے براءت کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء قاتلین عثمان رضی اللہ عنہا سے قصاص لینے کی اساس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مفاہمت کے خواہاں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء کے مابین مشہور صحابی قعقاع بن عمرو تمیمی رضی اللہ عنہ صلح کی سعی کر رہے تھے۔ مصالحت سے متعلق مساعی بار آور ہو رہی تھیں۔ امدریں اثناء حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے نام پیغام بھیجا جس میں کہا: قعقاع بن عمرو کے ساتھ آپ نے جو گفتگو کی تھی اگر اس پر قائم رہو تو ذرا انتظار کیجیے تاکہ ہم اتر کر اس معاملہ پر غور کر لیں۔

اس کے جواب میں ہر دو اصحاب نے یہ پیغام بھیجا: ہم نے قعقاع بن عمرو کے ساتھ مصالحت کی جو گفتگو کی تھی ہنوز اس کے پابند ہیں۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: حضرت علی و عائشہ رضی اللہ عنہما کے رفقاء ہر طرح مطمئن اور پرسکون تھے۔ جب رات ہوئی تو حضرت علی نے عبداللہ بن عباس کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا۔ ادھر حضرت عائشہ نے محمد بن طلحہ سجاد کو قاصد بنا کر حضرت علی کی خدمت میں روانہ کیا۔ فریقین صلح کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ یہ رات سب راتوں کی نسبت زیادہ اطمینان و عافیت سے گزری۔ دوسری جانب قاتلین عثمان رات بھر جاگتے اور لڑائی کی تدبیریں کرتے رہے۔ آخر یہ طے کیا کہ منہ اندھیرے لڑائی چھیڑ دی جائے۔ چنانچہ رات کی تاریکی میں نکلے اور چپکے سے حضرت علی اور ان کے برادران طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین جنگ چھیڑ دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء اس زعم میں مبتلا تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دھوکا دیا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ اللہ و رسول اور دین حق کے ساتھ یہ خیانت کرنے والے قاتلین عثمان تھے، جو شیعہ کے اسلاف میں سے ہیں۔ شیعہ ان کی امداد کا دم بھرتے اور ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ دوسری جانب حضرت عثمان سے بغض و عداوت رکھتے اور اس بات کو سرے سے تسلیم ہی نہ کرتے تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ازواج مطہرات حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما اجمعین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر تھیں۔ خلاصہ یہ کہ امت محمدی کے صلحاء اس طرح منافقین و اشرار کی بھینٹ چڑھے۔ اب ان کے درمیان اللہ تعالیٰ ہی اپنا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۷/ ۲۳۹)

[2] حافظ ابن عساکر نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی میں امام شعبی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک وادی میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو پڑے ہوئے دیکھا تو ان کے چہرے سے مٹی پونچھی اور کہا اے ابو محمد! اس بے کسی کی حالت میں آپ کا مردہ پڑا ہوا ہونا مجھ پر بڑا شاق گزرا ہے میں اللہ کے حضور ہی میں اس کا شکوہ عرض کرتا ہوں۔'' نیز کہا: ''اے کاش! میں آج سے بیس سال پہلے فوت ہو جاتا۔'' مستدرك حاكم (۳/ ۳۷۲، ۳۷۳)، معجم كبير طبراني (۲۰۲، ۲۰۳) واقعہ جمل کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا عمران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسے خوش آمدید کہا اور اپنے قریب بٹھا کر فرمایا: مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کے والد کو ان لوگوں میں شامل کرے گا جن کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ﴾ (مستدرك حاكم (۳/ ۳۷۷، ۲/ ۳۵۳)۔ حارث بن عبداللہ اعور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ حارث کہنے لگا۔ یہ بات عدل باری تعالیٰ کے منافی ہے کہ ہم عائشہ رضی اللہ عنہا کے رفقاء کو قتل کریں اور وہ جنت میں ہمارے رفیق بھی ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: دفع ہو جاؤ اگر میں اور طلحہ رضی اللہ عنہ جنت میں نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا؟ یہ کہہ کر آپ نے ایک دوات اعور پر کھینچ ماری مگر وار خطا گیا اور وہ دوات اسے نہ لگی۔

اس لیے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے درمیان جب مراسلت کا آغاز ہوا اور انہوں نے مصالحت پر اتفاق کر لیا کہ جب بھی انہیں قوت حاصل ہوگی وہ اہل فتنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے بدلہ لیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر ہرگز راضی نہ تھے۔ اور نہ ہی آپ نے اس قتل میں کوئی مدد کی۔ آپ حلف اٹھایا کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

''اللہ کی قسم! میں نے نہ ہی عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی ان کے قتل کی کوئی سازش کی۔''

آپ اپنی قسم میں سچے تھے۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر ان لوگوں کا آپس میں اتفاق ہوگیا تو یہ لوگ ہمیں پکڑ کر قتل کر ڈالیں گے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ ان صاحبان نے یہ خیال کیا کہ شاید حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دھوکہ سے ہم پر حملہ کر دیا۔ ان لوگوں نے اپنے دفاع میں جنگ لڑنی شروع کی۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنے دفاع میں لڑنا شروع کر دیا۔ پس اس وجہ سے یہ فتنہ غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار تھیں۔ انہوں نے نہ ہی قتال کیا؛ اور نہ ہی جنگ و قتال کا حکم دیا۔ یہ بات کئی ایک مؤرخین نے ذکر کی ہے۔

[**تیسرا اعتراض**]: شیعہ مصنف کا قول کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حکم الٰہی ﴿وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ کی مخالفت کی تھی۔

[**جواب**]: آپ جاہلیت کی سی بے پردگی کرتے ہوئے نہیں نکلیں۔ نیز یہ کہ کسی مامور بہا مصلحت کے لیے گھر سے نکلنا استقرار فی البیوت کے منافی نہیں۔ مثلاً حج و عمرہ کے لیے جانا یا اپنے خاوند کی معیت میں سفر پر روانہ ہونا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور آپ اس کے نزول کے بعد ازواج مطہرات کیساتھ حجۃ الوداع کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس سفر میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر امہات المومنین بھی شریک تھیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھائی عبد الرحمن رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا۔ آپ ان کے پیچھے ایک ہی اونٹ پر سوار تھیں۔ عبد الرحمن رضی اللہ عنہ نے مقام تنعیم سے آپ کو عمرہ کرایا۔ [1]

❀ حجۃ الوداع کا واقعہ اس آیت کے نزول کے بعد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین ماہ سے بھی کم عرصہ پہلے وقوع پذیر ہوا۔ خلافت فاروقی میں بھی ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم حج کے لیے جایا کرتی تھیں۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بھیجا کرتے تھے۔ جب امہات المومنین کو کسی مصلحت کی بنا پر سفر کی اجازت تھی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا واقعہ جمل کے لیے اپنے خروج کو بھی مصلحت عامہ پر محمول کرتی تھیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیات و احادیث میں باہمی جنگ و جدال سے منع کیا گیا ہے، لہٰذا معترض کہہ سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں واردشدہ وعید کے مستحق ہیں کیوں کہ آپ مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے ان کو مباح الدم قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (النساء: ۲۹)

''ایمان والو! اپنا مال آپس میں ناروا طریقے سے نہ کھاؤ۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العمرۃ، باب عمرۃ التنعیم، (حدیث: ۱۷۸٤، ۱۷۸۵)، صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب بیان وجوہ الاحرام (حدیث: ۱۲۱۲، ۱۲۱۳)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَ لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النساء: ۲۹)

''آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔'' اس آیت میں مؤمنین کو باہم جنگ و قتال کرنے سے روکا گیا ہے۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:﴿وَ لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الحجرات: ۱۱)

''ایک دوسرے کو طعن نہ دو۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:﴿لَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا﴾ (النور: ۱۲)

''جب تم نے یہ (واقعہ) سنا تو مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے متعلق کیوں نہ نیک گمان کیا۔''

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:''تمہارے خون تمہارے مال اور تمہاری آبرو تم پر اسی طرح حرام ہے جیسے اس دن کی حرمت اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔''[1]

آپ ارشاد فرماتے ہیں:'' جب قاتل و مقتول تلواریں لے کر لڑنے لگیں تو وہ دونوں جہنمی ہیں۔'' دریافت کیا گیا کہ یارسول اللہ! قاتل تو جہنمی ہوا مقتول کیوں کہ دوزخ میں جائے گا؟ فرمایا:''وہ بھی تو اپنے حریف کو قتل کرنا چاہتا تھا۔''[2]

ان آیات و احادیث کی روشنی میں ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواروں سے مسلمانوں کا استقبال کیا' اور ان کے خون کو مباح قرار دیا' پس آپ اس فعل پر بیان شدہ وعید کے مصداق ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تاویل کرنے والا مجتہد اس وعید کا مصداق نہیں ٹھہرے گا؛ اگرچہ اس سے غلطی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کی دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

''اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو جائے تو ہم پر مواخذہ نہ کر۔'' [اللہ فرماتے ہیں] میں نے ایسا کردیا۔

اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے نسیان و خطاء کو معاف کردیا ہے، خطا کار مجتہد کی خطا بھی معاف ہے۔ جب مؤمنین سے برسرپیکار ہونے کے بارے میں ان کی خطا معاف ہے تو اجتہاد کی بنا پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا مدینہ سے خروج بالاولیٰ مغفرت کا مستحق ہوگا۔ اگر کوئی معترض بذیل احادیث کو پیش کرے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

۱۔ ''مدینہ طیبہ گندی اور خبیث چیزوں کو دور کرتا ہے اور پاک و ناپاک کو چھانٹ دیتا ہے۔''[3]

۲۔ ''جو شخص بے اعتنائی سے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس سے بہتر آدمی کو مدینہ میں آباد ہونے کی سعادت عطا کرتے ہیں۔''[4]

---

[1] صحیح بخاري، کتاب العلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "رب مبلغ اوعی من سامع" (ح:٦٧)، صحیح مسلم، کتاب القسامة، باب القسامة (حدیث: ١٦٧٩)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الایمان باب ﴿ وَ اِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (حدیث:٣١) صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب اذا تواجه المسلمان بسیفهما، (حدیث:٢٨٨٨)۔

[3] صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینة۔ باب المدینة تنفی الخبث (حدیث: ١٨٨٣)، صحیح مسلم۔ کتاب الحج۔ باب المدینة تنفی خبثها (حدیث:١٣٨٣، ١٣٨٢)۔

[4] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب المدینة تنفی خبثها (حدیث:١٣٨١) مطولاً عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ، موطا امام مالك(٢/ ٨٨٧)، کتاب الجامع(ح:٦) عن عروة مرسلاً۔

امام مالک نے موطأ میں روایت نقل کی ہے جو صحیحین میں بھی ہے' حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: آپ نے فرمایا:

''بیشک مدینہ پاکیزہ ہے۔ یہ گندے لوگوں کو ایسے دور کرتا ہے جیسے آگ لوہے کی میل کو دور کر دیتی ہے۔''[1]

اور وہ کہے: بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مدینہ سے خروج کیا' اور سابقہ خلفاء راشدین کی طرح مدینہ میں مقیم نہ رہے۔اسی وجہ سے آپ پر امت کا اجماع نہ ہو سکا۔

[تو شیعہ کا جواب ہوگا کہ]: حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہد تھے۔اگر کوئی علی رضی اللہ عنہ سے کم مرتبہ کا بھی ہو تو مجتہد ہونے کی بنا پر وعید اسے لاحق نہیں ہوسکتی۔تو علی رضی اللہ عنہ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ وعید ان پر صادق نہ آئے۔ پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خروج کا بھی یہی جواب ہے کہ یہ مبنی براجتہاد تھا اور اجتہادی غلطی از روئے کتاب وسنت معاف ہے۔

[چوتھا اعتراض]: شیعہ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے نکلی تھیں حالانکہ آپ بے قصور تھے۔''

[جواب]: یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر عظیم افتراء ہے۔آپ جنگ کی نیت سے نہیں نکلی تھیں' اور نہ ہی حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کے خواہاں تھے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ دونوں گروہ لڑنے کے لیے نکلے تھے تو یہ وہی قتال تھا جس کا ذکر مذکورہ ذیل آیت میں کیا گیا ہے اور اس خطا کو معاف کر دیا گیا ہے:

﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ❀ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات: ۹۔۱۰)

''اور اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دیا کرو پھر اگر ان دونوں میں سے ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اگر لوٹ آئے تو پھر انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور عدل کرو بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔(یاد رکھو) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔''

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ مومن باہم لڑنے جھگڑنے کے باوصف مومن ہی رہتے ہیں۔یہ حکم جب ان لوگوں کے بارے میں ثابت ہے جو ان حضرات صحابہ کرام سے [علم و عمل و ایمان میں] کم تر تھے' تو پھر آپ اس حکم کے زیادہ حقدار ہیں۔

[پانچواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر سب مسلمانوں کا اجماع قائم ہو گیا تھا۔''

[جواب]: اس کے جواب میں کئی نکات ہیں:

پہلی وجہ: بڑا گھناؤنا جھوٹ ہے۔ اس لیے کہ جمہور نے نہ ہی قتل کا حکم دیا؛ نہ ہی اس قتل میں شریک ہوئے اور نہ ہی وہ اس پر راضی تھے۔علاوہ ازیں اکثر مسلمان مدینہ میں اقامت گزیں نہ تھے۔ بلکہ مختلف دیار و امصار مکہ؛ شام؛ یمن ؛ کوفہ؛ بصرہ ؛مصر اور بلاد مغرب سے لے کر خراسان تک آباد تھے۔اہل مدینہ ان مسلمانوں کا ایک حصہ تھے۔

دوسری وجہ: مزید یہ کہ چند شریر اور فتنہ پرور اوباش؛ زمین میں فساد پھیلانے والے آدمی اس فعلِ شنیع کے مرتکب ہوئے

تھے، صلحائے امت نہ اس میں شریک تھے؛ اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ حلف اٹھایا کرتے اور فرمایا کرتے تھے: ''اللہ کی قسم! میں نے نہ ہی عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور نہ ہی ان کے قتل کی کوئی سازش کی۔'' آپ قاتلین عثمان پر بددعا کیا کرتے اور فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! تو قاتلین عثمان پر، بحر و برّ اور کوہ و میدان میں لعنت بھیج۔'' [1]

اس باب میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ: جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کا حق تھا' ایسے ان کی مدد نہیں کی گئی۔ چونکہ لوگوں کا خیال تھا کہ معاملہ آپ کے قتل تک نہیں پہنچے گا۔ [2] اس لیے انھوں نے آپ کی عملی مدد کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ معاملہ اتنا خطرناک ہو جائے گا تو وہ ضرور آپ کے دفاع میں کھڑے ہو جاتے۔

---

[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے متعدد مواقع پر قاتلین عثمان سے براءت کا اعلان کیا اور ان پر لعنت بھیجی، حافظ ابن عساکر (۷/۸۵) کی روایت کے مطابق آپ نے آخری اعلان واقعہ جمل کے موقع پر کیا۔ مورخ مذکور لکھتے ہیں: جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنگ جمل کے لیے تشریف لے گئیں تو کعب بن سُور ازدی اونٹ کی مہار پکڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کعب کو مخاطب کر کے کہا: ''مہار کو چھوڑ یے اور آگے بڑھ کر لوگوں کو قرآن کی طرف بلایے۔'' یہ کہہ کر آپ نے کعب کو قرآن کریم کا ایک نسخہ دیا۔ دوسری جانب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سبائی پیش پیش تھے۔ انھیں خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں فریقین میں صلح نہ ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی فوج کو پیچھے دھکیل رہے تھے مگر وہ بزور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ سبائیوں نے آگے بڑھ کر کعب پر بیک وقت اتنے تیر چلائے کہ وہ موقع پر ہی جان بحق ہو گئے۔ سبائی پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف بڑھے تو آپ نے پہلی مرتبہ ان الفاظ میں ان کو خطاب فرمایا: ارے لوگو! قاتلین عثمان اور ان کے انصار و اعوان پر لعنت بھیجیے''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ بصرہ والے چیخ چیخ کر دعا کرنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ آہ و بکا کیسی ہے؟ جواب ملا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں بددعا کر رہی ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی دعا کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! قاتلین عثمان اور ان کے ہم نواؤں پر لعنت بھیج۔''

جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو آپ کی حفاظت کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہر قیمت پر ان کی حفاظت کرنا خواہ تمہاری جان کیوں نہ چلی جائے۔ مگر حضرت عثمان برابر ان کو مدافعت سے منع کرتے رہے۔ حضرت حسن آخری شخص تھے جو سانحہ شہادت کے دن آپ کے گھر سے نکلے۔ حضرت حسن و حسین کے علاوہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور مروان بن حکم بھی آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں حاضر ہوئے تھے۔ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بتاکید ان سے کہا کہ ہتھیار رکھ کر اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ (دیکھئے: العواصم من القواصم: ۱۳۴)

[2] حافظ ابن عساکر نے کہا کہ جب حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تو بنو عمرو بن عوف نے حضرت زبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: ''ابو عبداللہ! ہم آپ کی خدمت میں حضرت عثمان کی مدافعت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔'' ابو حبیبہ کہتے ہیں: حضرت زبیر نے یہ پیغام دے کر مجھے حضرت عثمان کے پاس بھیجا۔'' بعد از سلام ان سے عرض کیجیے کہ تمہارا بھائی زبیر عرض کرتا ہے کہ بنو عمرو بن عوف نے آپ کی مدافعت کے لیے اپنی خدمات کی پیش کش کی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے یہاں چلا آؤں تاکہ جو تکلیف آپ کو پہنچے وہ مجھے بھی پہنچے۔ یا بنو عمرو بن عوف کے ذریعہ آپ کی مدافعت کروں جیسے آپ کا ارشاد ہو۔'' ابو حبیبہ کا بیان ہے کہ میں حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ کے یہاں حضرت حسن بن علی، عبداللہ بن عمر، ابو ہریرہ،...... اور عبداللہ بن زبیر بھی موجود تھے، میں نے حضرت زبیر کا پیغام پہنچایا تو فرمانے لگے: اللہ اکبر! اللہ کا شکر ہے جس نے میرے بھائی زبیر کو محفوظ رکھا۔ میری جانب سے انھیں کہیے: اگر آپ میرے گھر میں تشریف لائیں گے تو آپ کی وہی حیثیت ہوگی جو ایک مہاجر کی ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مدافعت کے لیے بنو عمرو بن عوف کا انتظار کریں۔'' ابو حبیبہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

میرے ان دو کانوں نے آں حضرت کو یہ فرماتے سنا تھا کہ میرے بعد فتن و حوادث ظہور پذیر ہوں گے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان سے نجات کی کیا صورت ہوگی؟ آپ نے حضرت عثمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''امیر (عثمان) اور اسکی جماعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیے۔'' (مسند احمد (۲/۳۴۵) و فضائل الصحابة، (۷۲۳) مستدرك حاكم(۳/۹۹، ۴/۴۳۳) و صححه و وافقه الذهبی) لوگوں نے عرض کیا ہمیں لڑنے کی اجازت دیجیے، حضرت عثمان نے فرمایا: میں اپنے اطاعت شعاروں کو بتاکید لڑائی سے روکتا ہوں۔ ابو حبیبہ کا بیان ہے کہ بنو عمرو بن عوف کے آنے سے پہلے ہی فتنہ پردازوں نے حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔ (سيرة ابن هشام(ص: ۲۲۷۔۲۲۹)، صحيح بخاری كتاب الصلاة۔ باب هل تنبش قبور مشركی الجاهلية(ح:۴۲۸)، صحيح مسلم۔ كتاب الصلاة۔ باب ابتناء مسجد النبی صلی الله عليه وسلم (حديث: ۵۲۴)۔

اور اس فتنہ کو روک لیتے۔ بس یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے:

﴿وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ [الأنفال ۲۵]

''اور تم ایسے وبال سے بچو! جو خاص کر صرف ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا تم میں سے جنہوں نے ظلم کیا....''

اس لیے کہ جب ظالم انسان لوگوں پر ظلم کرتا ہے؛ تو اس کی وجہ سے لوگ فتنہ و آزمائش کا شکار ہو جاتے ہیں' اور وہ لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جن کا اس ظلم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس وقت بڑے بڑے لوگ اس فتنہ کو رد کرنے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ظالم کو شروع سے ہی روک دیا جائے تو اس فتنہ کا سد باب ہو سکتا ہے۔

تیسری وجہ: رافضی انتہائی سخت جھوٹے اور بہت بڑے تناقض کا شکار ہیں۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اجماع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر نہیں بلکہ آپ کی بیعت خلافت پر منعقد ہوا تھا۔ تمام ملک کے رہنے والے آپ کی بیعت پر یک زبان تھے۔ اگر ظاہری اجماع سے دلیل لینا جائز ہے تو پھر واجب ہوتا ہے کہ آپ کی بیعت بھی حق ہو' اس لیے کہ آپ کی بیعت پر تمام لوگوں کا اجماع ہو گیا تھا۔ اگر اس سے استدلال لینا جائز نہیں تو پھر آپ کے قتل پر اجماع کا کہنا کھلم کھلا ایک باطل بات ہے۔ خصوصاً جب کہ آپ کو قتل کرنے والے چند ایک فسادی لوگ تھے۔ پھر اس پر مزیدار بات تو یہ ہے کہ شیعہ آپ کی بیعت خلافت پر اجماع کے منکر ہیں' اور کہتے ہیں: اہل حق نے زبردستی اور خوف کے مارے آپ کی بیعت کی۔ [مگر قتل پر اجماع ثابت کرنے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں]۔ اس کے بجائے اگر یوں کہتے کہ:'' اہل حق آپ کے قتل پر متفق تھے: اور اہل حق کو زبردستی آپ کے قتل میں شریک کیا گیا اور وہ اس پر اپنی کمزوری کی وجہ سے خاموش رہے۔ تو پھر بھی ہم کہہ سکتے تھے کہ یہ بات کسی حد تک ممکن ہے۔ اس لیے کہ لوگ یہ بات جانتے ہیں جو کوئی حکومت سے ٹکرا کر تختہ الٹنا چاہتا ہو' عام لوگ اس کی مخالفت کرنے سے ڈرتے ہیں۔ بخلاف اس کے جو کوئی حاکم کی بیعت کرنا چاہتا ہو۔ اس لیے کہ اسے کسی مخالف سے نہیں ڈرایا جا سکتا۔ جیسے کہ اس انسان سے ڈرایا جا سکتا ہے جو کسی کو قتل کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ قتل کا ارادہ رکھنے والے کا شر زیادہ تیز ہوتا ہے' اور وہ خون بہانے میں دریغ نہیں کرتا؛ لوگ اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔

[فرض محال شیعہ کی بات تسلیم کرتے ہیں] کہ تمام لوگوں کا آپ کے قتل پر اجماع ہو گیا تھا؛ تو پھر اس کا کیا جواب دو گے کہ جمہور صحابہ کرام آپ کے قتل کا انکار کرتے تھے۔ اور جن لوگوں نے آپ کے گھر میں رہتے ہوئے آپ کا دفاع کیا جیسے حضرت حسن و حسین حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ؛ یہ علیحدہ داستان ہے۔

مزید برآں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جو اجماع منعقد ہوا ایسا اتفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت اور قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اور دوسرے کسی معاملہ میں نہیں ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت سے صرف چند اشخاص پیچھے رہے تھے۔ جن میں سے ایک حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے رہ جانے کا سبب معلوم ہے۔ (واللہ یغفرلہٗ ویرضی عنہ)۔ آپ سابقین اولین انصار میں سے ایک نیک فرد تھے جنہیں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے واقعہ افک والی روایت میں ہے آپ فرماتی ہیں:'' آپ منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی کا دفاع کرنے لگے۔ اس سے قبل آپ ایک نیک انسان تھے؛ مگر قبائلی حمیت کی وجہ سے ان سے اس حرکت کا ارتکاب ہو گیا۔''[1]

---

[1] رواہ البخاري ۳/ ۱۸۶۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جس آدمی کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہو وہ بعض اوقات گناہ کا مرتکب بھی ہوتا ہے [اس لیے کہ وہ معصوم نہیں]۔مگر پھر وہ ان سے توبہ کر لیتا ہے؛ یا اس گناہ کو اس کی نیکیاں مٹا دیتی ہیں۔ یا مصائب و آلام اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں؛ یا کوئی دوسرا سبب ایسا پیدا ہو جاتا ہے۔

جب کوئی انسان گناہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے اس گناہ کی سزا بچنے کے دس اسباب ہوتے ہیں۔تین سبب اس کی ذات سے؛ تین سبب لوگوں کی طرف سے؛ اور چار اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔توبہ و استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ اس کے لیے مؤمنین کی دعا؛ نیک اعمال کا ہدیہ؛ نبی کریم ﷺ کی شفاعت؛ دنیا میں کفارہ بننے والے مصائب؛ برزخ اور میدان محشر میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل اور اس کی جانب سے بخشش۔

یہاں پر اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ: یہ اجماع ظاہر ہے اور اسے سبھی جانتے ہیں۔تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل جیسے مسئلہ پر کیسے اجماع کا دعوی کیا جا سکتا ہے؟ بلکہ یہ بات سبھی جانتے ہیں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر قتال کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے وہ تعداد میں ان لوگوں سے کئی گنا بڑھ کر تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل میں شریک ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے: ایک گروہ جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا؛ ایک گروہ جو آپ سے برسر پیکار رہا؛ اور تیسرا گروہ جو نہ آپ کے ساتھ تھے اور نہ ہی آپ کے خلاف۔سابقین اولین کی اکثریت اسی گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔اگر اور کچھ بھی نہ ہوتا صرف وہی لوگ آپ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے ہوتے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے؛ کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنواؤں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی۔وہ تعداد میں ان لوگوں سے کئی گناہ بڑھ کر ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔نیز جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا انکار کر رہے تھے وہ بھی ان لوگوں سے تعداد میں کئی گنا بڑھ کر تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔[تو پھر اگر] یہ کہنا باطل ہے کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ پر متفق ہو گئے تھے؛ پھر یہ کہنا بھی سب سے بڑا باطل ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر متفق ہو گئے تھے۔

اور اگر یہ کہنا جائز ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر جمع ہو گئے تھے؛ کیونکہ یہ واقع پیش آیا اور آپ کا دفاع نہیں کیا جا سکا۔تو پھر معترض کا یہ قول بھی بجا ہے کہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے پر اور آپ کی بیعت سے پیچھے رہنے پر متفق ہو گئے تھے؛ بلکہ اس قول کا جواز سب سے بڑھ کر ہے۔اس لیے کہ یہ واقعہ بھی پیش آیا؛ مگر اس کا دفاع نہیں کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ: جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ لوگوں پر آپ کی بیعت کو لازم کریں۔اور ان سب کو آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیں؛ اور انہیں آپ سے جنگ کرنے سے روکیں۔اس لیے کہ وہ اس سے عاجز آ گئے تھے۔تو پھر اس کا جواب دیا جائے گا کہ: محاصرہ کے وقت جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے' ان کے لیے بھی آپ کا دفاع کرنا ممکن نہ رہا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے تقصیر ہوئی؛ اور وہ عاجزی کی وجہ سے جنگ پر قابو نہ پا سکے؛ یا ان پر وہ لوگ غالب آ گئے جو جنگ کرنا چاہتے تھے۔یا وہ لوگوں کو آپ کی بیعت پر جمع کرنے میں ناکام رہے۔

تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ: ''جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے؛ ان سے بھی ایسے ہی کوتاہی و تقصیر ہوئی

؛ یہاں تک فتنہ پرداز آپ کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے ۔ پھر یہ دعویٰ کرنا یہ ایک کھلا ہوا واضح جھوٹ ہے کہ لوگوں کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل اجماع ہوگیا تھا؛ حالانکہ جمہور امت اس کا انکار کرتی ہے؛ اور لوگ آپ کی مدد کے لیے اور پھر بعد میں آپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

شیعہ مصنف کا یہ قول اس کی جہالت کا آئینہ دار ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ تو بعینہ اسی طرح ہے جیسے ناصبی کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے اجماع کے مطابق قتل کیے گئے تھے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ لڑنے والوں اور آپ کو قتل کرنے والوں میں سے کسی نے بھی آپ کی مدافعت نہیں کی تھی۔ ❶

اس قول میں ناصبی اتنے ہی جھوٹے ہیں جتنے شیعہ اپنے اس دعویٰ میں کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر اجماع منعقد ہوا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی مذمت قتل حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید و نصرت اور ان کے قصاص کا مطالبہ ❷ کرنے والے لوگوں کی تعداد حامیانِ حسین سے بہت زیادہ تھی۔ ❸ قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے امت میں جو شر و فساد پھیلا؛ قتل حسین رضی اللہ عنہ کے فتنہ کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ قباحت و شناعت کے اعتبار سے اللہ، رسول اور مومنین کے نزدیک قتل حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ اس لیے کہ حضرت عثمان سابقین اولین اور حضرت علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ خلیفۂ برحق تھے اور آپ کی خلافت پر مسلمانوں کا اجماع منعقد ہوا تھا۔ آپ نے کسی مسلمان پر تلوار اٹھائی نہ کسی کو موت کے گھاٹ اتارا، آپ کی ساری عمر جہاد کفار میں بسر ہوئی خلافت صدیقی و فاروقی کی طرح خلافت عثمانی میں بھی مسلمانوں کی تلوار اہل قبلہ سے الگ تھلگ اور کفار کے سر پر آویزاں اور اہل قبلہ سے ہر لحاظ سے دور رہی۔

---

❶ حالانکہ آپ کو شیعی ماحول (عراق) میں قتل کیا گیا تھا۔ وہ شیعہ جو کرۂ ارضی کے دور افتادہ گوشوں سے چل کر آپ کے مقتل پر جمع ہوتے ہیں یہی آپ کو دھوکہ دینے والے تھے۔ پہلے بڑے زور و شور سے خط لکھ کر بلایا۔ جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کا ساتھ چھوڑ کر صف اعداء میں شریک ہوگئے۔ استاد موسیٰ یعقوبی نجفی ایک معاصر شیعہ ادیب لکھتا ہے:

قَدْ كَاتَبَتْهُ أُولُوا الْخِيَانَةِ أَنَّهَا جُنْدٌ وَلَيْسَ لَهَا سِوَاهُ إِمَامٌ

خیانت کار لوگوں نے آپ (حضرت حسین) کو لکھا تھا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں اور آپ کے سوا ہمارا کوئی امام نہیں۔"

لٰكِنَّهُمْ خَانُوْا الذِّمَامَ وَلَمْ يَفُوْا أَنّٰى وَمَا لِلْخَائِنِيْنَ ذِمَامٌ

"مگر انھوں نے اپنے عہد میں خیانت کی اور اسے پورا نہ کیا اور خیانت پیشہ لوگ عہد کے پابند ہی کب ہوتے ہیں۔"

اگر شیعہ خود فریبی کا شکار نہ ہوتے تو وہ اپنے گھروں میں مقیم رہتے اور خط لکھ کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو دعوت نہ دیتے تو لوگوں کا خون ضائع ہونے سے بچ جاتا اور امت اس عظیم فتنہ میں مبتلا نہ ہوتی۔ اپنی قدر نہ جاننے کا یہ ثمرہ برآمد ہوا کہ شیعہ تا قیام قیامت یہ داغ دور نہ کرسکیں گے۔ حضرت زینب بنت علی رضی اللہ عنہا جب عاشوراء کے بعد کوفہ میں داخل ہوئیں اور اہالیان کوفہ حضرت زینب اور ان کے بھائی کا خوشامدانہ الفاظ میں استقبال کرنے نکلے تو انھوں نے اس وقت یہی الفاظ کہے تھے۔ مزید براں حضرت حسین سے خیانت کرنے والے شیعہ بعد میں آنے والے شیعہ سے بہر حال بہتر تھے۔

❷ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی فوج میں طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما جیسے گرامی قدر صحابہ شامل تھے، جو عشرہ مبشرہ میں شمار ہوتے ہیں، اور جن کا مقصد وحید قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت کرنا تھا۔ جنگ صفین انہی مقاصد کی تکمیل کے لیے وقوع میں آئی تھی۔

❸ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے سب سے پہلے ذات باری تعالیٰ نے انتقام لیا۔ تفصیلات ملاحظہ فرمائیے:

ا۔ جہجاہ بن سعید غفاری: یہ وہ بدبخت ہے کہ جب حضرت عثمان مسجد نبوی کے منبر پر خطبہ دے رہے تھے تو اس نے عصائے نبوی آپ کے ہاتھ سے چھین لیا اور اس زور سے آپ کے دائیں گھٹنے پر مارا کہ عصا ٹوٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد اس سے انتقام لیا۔ عصائے نبوی ا...... حاشیہ جاری ہے

حالت خلافت میں شرپسندوں نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ نے صبر سے کام لیا[1] اور مزاحمت نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔[2] اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان، حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی نسبت زیادہ اجر و ثواب کے مستحق

کا ایک ٹکڑا اس کے زانو میں گڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے پھر پتہ نہ چل سکا کہ اس کا کیا انجام ہوا۔ ظن غالب ہے کہ وہ اسی تکلیف سے جہنم رسید ہوا۔

۲۔ حرقوص بن زہیر سعدی: عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت کے بعد اس نے جب حضرت علی پر خروج کیا تو آپ نے یوم النہروان ۳۹ ہجری میں اسے مرواڈالا۔

۳۔ حکیم بن جبلہ عبدی: جنگ جمل میں اس کا پاؤں کٹ گیا تھا۔ قریب الموت تھا کہ کسی نے ان الفاظ میں پکارا امام مظلوم پر مظالم ڈھانے کی بنا پر جب اللہ کی گرفت میں آئے ہو تو اے خبیث! اب چلا رہے ہو، تم نے مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کیا اور ناحق خون بہائے۔ اب انتقام الٰہی کا مزہ چکھو۔''

۴۔ ذریح بن عباد عبدی: یہ حکیم بن جبلہ عبدی کا رفیق کار تھا جنگ جمل میں مارا گیا۔

بصرہ کے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو جنگ جمل میں زندہ بچ گئے تھے ان کے قبیلہ والے پکڑ کر ان کو کتوں کی طرح طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں لائے اور وہ سب تہ تیغ کر دیے گئے۔ بصرہ والوں میں سے صرف حرقوص بن زہیر بچا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے یوم النہروان میں قتل کیا۔

۵۔ جندب بن زہیر غادری: معرکہ صفین میں قبیلہ ازد کے ایک شہسوار کو للکارا تو ازدی نے اسے قتل کر دیا۔ اسکا خالہ زاد بھائی مخنف بن سُلیم کہا کرتا تھا کہ جندب بچپن میں بھی اور بڑا ہو کر بھی دونوں حالتوں میں منحوس تھا۔ جاہلیت و اسلام دونوں اُدوار میں جندب ہمیشہ بری چیز کا انتخاب کیا کرتا تھا۔

۶۔ ابوزینب بن عوف: یہ ۳۷ ہجری میں معرکہ صفین میں مارا گیا۔

۷۔ شریح بن اوفی عبسی: اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا تھا۔ پہلے اس کا پاؤں کاٹا گیا اور پھر قتل کیا گیا۔ بوقت قتل اس نے یہ اشعار پڑھے:

اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰى اَبَا حَسَنٍ ضَرَبْتُهٗ بِالسَّيْفِ حَتّٰى يَطْمَئِنَّ
اَضْرِبُهُمْ وَلَوْ اَرٰى عَلِيًّا اَلْبَسْتُهٗ اَبْيَضَ مُشْرِقِيًّا

''میں ان کو مارتا رہوں گا اور اگر کہیں علی کو دیکھ پایا تو اس کو ضرور تلوار ماروں گا۔ یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔ میں ان کو مارتا جاؤں گا اور اگر علی کو دیکھ لیا تو میں اس کو صیقل شدہ مشرقی تلوار کا لباس پہناؤں گا۔''

۸۔ علباء بن ہیثم سدوسی: عمرو بن یثربی قاضی بصرہ نے اسے جنگ جمل میں قتل کیا۔

۹۔ عمرو بن حمق خزاعی: ۵۱ ہجری تک زندہ رہا پھر موصل میں اسے نیزے کی اتنی ہی ضربیں لگیں جتنی اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لگائی تھیں۔

۱۰۔ عمیر بن ضابی: یہ وہ بدبخت ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی پسلی توڑ دی تھی۔ جب حجاج عراق کا حاکم قرار پایا تو یہ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر رحم و کرم کا طالب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ حجاج اس سے واقف نہیں۔ حجاج نے کہا کیا تو وہی شخص نہیں جس نے یہ شعر کہا تھا:

هَمَمْتُ وَلَمْ اَفْعَلْ وَكِدْتُ وَلَيْتَنِىْ تُرِكْتُ عَلٰى عُثْمَانَ تَبْكِىْ حَلَائِلُهٗ

''میں نے (قتل عثمان کا) ارادہ کیا تھا مگر یہ کام نہ کر سکا اے کاش! مجھے اس معاملہ میں کھلی چھٹی ملتی تو عثمان رضی اللہ عنہ کی بیویاں ان پر رونے لگتیں۔''

پھر حجاج کے حکم سے اس کو قتل کر دیا گیا۔

۱۱۔ کعب بن ذی الحبکہ نہدی: بسر بن ابی ارطاۃ نے اس کو قتل کیا۔

۱۲۔ کنانہ بن بشر تُجیبی: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں اسے قتل کیا۔ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شدید مخالف تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں جو لوگ قتل کیے گئے تھے۔ یہ ان کو دفن کرنے سے روکتا تھا۔

۱۳۔ ابن الکوّاء یشکری: اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بھی خروج کیا تھا اور قتل ہوا۔

۱۴۔ محمد بن ابی حذیفہ: اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے احسانات کی ناشکری کی۔ سزا کے طور سے یہ ۳۶ ہجری میں بمقام عریش مقتول ہوا۔

علی ہذا القیاس قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے آخرت سے پہلے دنیا میں ہی اپنے کیے کی سزا پالی تھی۔ قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ پیش پیش تھے ان کے انجام سے بچے بھی آگاہ ہیں۔

[1] جب باغیوں نے مدینہ طیبہ کا رخ کیا تو اس وقت عساکر اسلامی مختلف بلاد شرق و غرب میں کفار کے خلاف مصروف جہاد تھیں۔ اسلامی لشکر زیادہ تر ان ممالک میں برسر پیکار تھے جو آج کل روس کے زیر تسلط ہیں۔

[2] محب الدین الخطیب ''العواصم من القواصم'' ص: ۱۳۲ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ: ''اخبار و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کی مدافعت کرنے یا تقدیر ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دار رضاہ کا موقف یہ تھا کہ آپ فتنہ پردازی اور خون [......حاشیہ جاری ہے......]

ہیں ۔اسی نسبت سے قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں کی نسبت بڑے مجرم ہیں ۔ اور ان کا گناہ زیادہ گھناؤنا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آپ اقتدار سے محروم تھے اور طلب اقتدار کی خاطر گھر سے نکلے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ برسر اقتدار تھے ان کے اعوان وانصار آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے شہادت پائی۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ جو شخص اپنی خلافت و ولایت کا دفاع کرنا چاہتا ہے وہ اس شخص کی نسبت لڑنے کا زیادہ حق دار ہے جو دوسروں سے اقتدار کو چھیننے کا خواہاں ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت سے دفاع بھی نہیں کیا تھا۔ بنا بریں آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہر حال میں افضل ہیں اور آپ کا قتل قتل حسین سے شنیع تر ہے۔ جیسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اقتدار کے لیے جنگ نہیں لڑی تھی بلکہ جدال وقتال سے کنارہ کش رہ کر امت میں صلح کرائی تھی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح جوئی کے اس اقدام پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش کرتے ہوئے فرمایا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔'' ❶

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حامی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام تھے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لینے والے مختار بن ابی عبید ثقفی اور اس کے اعوان و انصار تھے۔ کوئی سلیم العقل آدمی یہ بات کہنے میں تامل نہیں کرے گا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ، مختار ثقفی ❷ سے افضل تھے، مختار کذاب تھا اور اس نے نبوت کو دعویٰ بھی کیا تھا۔

ریزی سے ڈرتے تھے۔ آخر کار آپ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اگر آپ ایسی قوت سے بہرہ ور ہوں جس کے سامنے باغیوں کو لامحالہ جھکنا پڑے اور جدال و قتال کی نوبت نہ آئے تو یہ بڑی اچھی بات ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملک شام سے ایک ایسی فوج بھیجنے کی پیش کش کی تھی جو آپ کے اشارہ کی منتظر رہے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ پیش کش ٹھکرا دی تھی کہ میں مدینہ میں ایسی فوج نہیں رکھنا چاہتا جو یہاں مقیم رہے۔ (تاریخ طبری: ۵/۱۰۱)
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ مسلمان اس حد تک جرأت نہیں کر سکتے کہ دین اسلام کے اولین مہاجر (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کا خون تک بہانے سے گریز نہ کریں۔ جب باغی اکھٹے ہو کر آ گئے اور آپ نے سمجھا کہ مدافعت کرنے میں ناحق خون ریزی ہوگی، تو آپ نے اپنے حامیوں کو بہ تاکید تشدد سے روک دیا۔ اہل سنت وشیعہ سب کی تصانیف ایسے اخبار و آثار سے پُر ہیں۔ تاہم اگر ایسی منظم قوت وشوکت بروئے کار آتی جو باغیوں کی شرارت و جہالت کو بزور روک دیتی تو یہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے راحت و مسرت کی موجب ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ آپ شہادت کے متمنی تھے اور اس کے سوا کوئی چیز آپ کے لیے موجب سکون واطمینان نہ تھی۔

❶ صحیح بخاری ۔ کتاب الصلح۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حدیث: ۲۷۰٤)

❷ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف سے شیعہ کے جواب میں یہ بات الزاماً کہی گئی ہے ورنہ مختار کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کیا نسبت؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلفاء راشدین کے بعد پہلے قابل فخر خلیفہ تھے۔ حافظ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ :۸/۱۳۳) پر مصر کے مشہور امام اور عالم لیث بن سعد المتوفی ۱۷۵ ہجری سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد اس گھر والے (حضرت معاویہ) سے زیادہ کسی کو حقوق کا پورا کرنے والا نہیں دیکھا۔'' حافظ ابن کثیر کتاب مذکورہ (۸/ ۱۳۵) پر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی سے جو بڑے عالم و حافظ تھے روایت کرتے ہیں، انھوں نے معمر بن راشد سے اور معمر نے ہم بن منبہ صنعانی سے جو ثقات تابعین میں سے تھے، سنا انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ''میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر کسی شخص کو حکومت وسلطنت کا اہل نہیں دیکھا۔''
ظاہر ہے کہ سلطنت کی اہلیت وصلاحیت اسی شخص میں ہوتی ہے جو حکیم، حلیم اور عادل ہو۔ ملک کا دفاع کرتا اور دین اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے کوشاں رہتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جو امانت اللہ نے اس کو تفویض کی ہے، اس میں خیانت کو راہ نہ دیتا ہو۔ امام ترمذی ابو ادریس خولانی سے روایت کرتے ہیں: جب عمر رضی اللہ عنہ نے عمیر بن سعد انصاری کو حمص کی ولایت سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تو لوگوں نے ازراہِ تعجب یہ کہنا شروع کیا۔ ''عمیر جیسے آدمی کو معزول کر کے معاویہ کو مقرر کیا۔'' (سنن ترمذی، باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیان [......حاشیہ جاری ہے]:

بقیہ سابقہ حاشیہ

(ح ۳۸۴۳)۔ علامہ بغوی معجم الصحابہ میں لکھتے ہیں کہ عمیر کو لوگ "نَسِيجُ وَحْدِهِ" (اپنی مثال آپ) کہا کرتے تھے۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثرت زہد کی وجہ سے عمیر کو یہ نام دیا تھا۔ عمیر نے لوگوں کی یہ گفتگو سن کر کہا: ''معاویہ کا ذکر اچھے انداز میں کیجیے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اے اللہ معاویہ کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت عطا فرما۔'' (سنن ترمذی، باب مناقب معاویۃ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (ح ۳۸۴۳)
بعض روایات میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ شہادت خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔ بشرط صحت حضرت فاروق کی شہادت سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت ثابت ہوتی ہے، تاہم اگر یہ شہادت دینے والے عمیر ہوں..... اس کے باوصف کہ آپ کو معزول کر کے حضرت معاویہ کو ان کا قائم مقام بنایا گیا تھا...... تو بھی اس شہادت کا درجہ حضرت عمر کی گواہی سے کم نہیں ہے، اس لیے کہ عمیر اصحاب رسول اور زہاد انصار میں سے تھے۔
امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب ''مناقب الصحابہ'' میں ابن ابی ملیکہ تیمی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا گیا کہ امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ ایک وتر پڑھتے ہیں۔ یہ سن کر انھوں نے فرمایا: ''معاویہ رضی اللہ عنہ فقیہ ہیں۔'' (صحیح بخاری۔ باب ذکر معاویۃ رضی اللہ عنہ (حدیث: ۳۷۶۵)
عبدالرحمن بن ابی عمیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ دعا فرمائی: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا وَاهْدِبِهِ" (سنن ترمذی۔ كتاب المناقب۔ باب مناقب معاوية بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ (ح: ۳۸٤۲)۔
عبدالرحمن بن ابی عمیرہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ دعا فرمائی: ''اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَقِهِ الْعَذَابَ'' (معجم کبیر طبرانی (۱۰۸/۲۵۲)۔
مذکورہ بالا روایت امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ابو مسہر سے نقل کی ہے۔ (تاریخ کبیر بخاری (۳۲۷/۷)، امام احمد یہی روایت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ (مسند احمد (۱۲۷/٤)، صحیح ابن حبان (۲۲۷۸: الموارد) مفسر ابن جریر اسے ابن مہدی سے روایت کرتے ہیں۔
علاوہ ازیں مندرجہ ذیل محدثین نے یہ روایت اپنی تصانیف میں نقل کی ہے:
۱۔ اسد بن موسیٰ المتوفی ۱۳۲۔۲۱۲ ہجری جن کو ''اسد السنہ'' کہا جاتا تھا۔
۲۔ بشر بن السری الافواہ البصری (۱۳۲۔۱۹۵) یہ امام احمد کو استاد تھے ان کی روایت میں " اَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ" کے لفظ بھی ہیں۔
۳۔ عبداللہ بن صالح مصری یہ امام لیث بن سعد کے کاتب تھے۔ ۴۔ ابن عدی وغیرہ نے یہ روایت ابن عباس سے نقل کی ہے۔
۵۔ محمد بن سعد۔ صاحب الطبقات یہ روایت مسلمہ بن مخلد فاتح وامام مصر سے بیان کرتے ہیں۔
حضرت معاویہ کے بارے میں مذکورہ دعائے نبوی کے ناقل لاتعداد صحابہ ہیں۔ (دیکھیے البداية النهاية: ۱۲۰/۸۔۱۲۱) نیز ترجمہ معاویہ حرف المیم تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر)۔
مذکورۃ الصدر روایات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ ہدایت یافتہ اور لاتعداد فضائل ومناقب کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں شیعہ کے مفروض مہدی کی کیا حقیقت جو نہ ابھی پیدا ہوا اور نہ اس سے کوئی اس سے مستفید ہو سکا۔ جو شخص دانستہ ان احادیث کو تسلیم نہ کرے وہ حدیث نبوی کا منکر ہے مقام حیرت ہے کہ بعض شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجنے اور ان سے بغض وعداوت رکھنے کے باوصوف اپنے آپ کو مسلمان قرار دیتے ہیں ان کو دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنا چاہئے کہ آپ نے حضرت معاویہ کے حق میں ایسی دعا کیوں فرمائی: ''بے حیا باش ہر چہ خواہی کن''
حافظ ابن عساکر امام ابوزرعہ رازی سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے کہا: ''میں معاویہ سے بغض رکھتا ہوں۔'' ابوزرعہ نے کہا: ''معاویہ کا رب بڑا رحیم وکریم ہے اور آپ کے حریف (حضرت علی) بھی بڑے شریف آدمی تھے۔ تم دونوں کے درمیان مداخلت کرنے والے کون ہو۔''
امام بخاری اپنی صحیح میں جو قرآن کریم کے بعد اس کرۂ ارضی پر صحیح ترین کتاب ہے نیز امام مسلم اپنی صحیح کی کتاب ''الامارۃ'' میں نبی کریم کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مقام قباء میں تشریف لے گئے اور انس کی خالہ ام حرام بنت ملحان کے یہاں قیلولہ فرمایا تو آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی امت کے کچھ لوگ تاج وتخت سے آراستہ اعداء دین سے بحری جنگ لڑ رہے ہیں آپ پھر سو گئے اور وہی خواب دیکھا ام حرام نے کہا حضور دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان مجاہدین میں شامل کر دے۔ آپ نے فرمایا تو پہلے مجاہدین میں شامل ہے۔'' (صحیح بخاری كتاب الاستئذان۔ باب من زار قوماً فقال عنها (حدیث: ٦٢٨٣، ٦٢٨٢)، صحیح مسلم۔ كتاب الامارة۔ باب فضل الغزو فی البحر (حدیث: ۱۹۱۲) حافظ ابن کثیر "البداية والنهاية" (۲۲۹/۸) پر لکھتے ہیں: ''حدیث میں جس غزوہ کی پیش گوئی کی گئی ہے اس سے مراد وہ بحری لڑائی ہے جو ۲۷ ہجری میں حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں حضرت معاویہ کے زیر قیادت لڑائی لڑی گئی اور جس میں آپ نے جزیرہ قبرص کو فتح کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ آپ اولین اسلامی بحری بیڑے کے بانی تھے۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات

احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''ثقیف کے قبیلہ میں ایک کذاب اور ایک قاتل ہوگا۔''❶

کذاب سے مختار مراد ہے اور قاتل سے مراد حجاج بن یوسف۔ مختار کا والد ابوعبید ثقفی بڑا نیک آدمی تھا اس نے مجوس سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ مختار کی بہن صفیہ بنت ابی عبید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ یہ بڑی نیک دل خاتون تھیں۔ جب کہ مختار بدترین شخص تھا۔

[چھٹا اعتراض]: شیعہ کا یہ قول کہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرانا چاہتی تھیں اور اسی سازش میں شریک رہا کرتی تھیں۔ وہ دعا کیا کرتی تھیں: ''اللہ اس بیوقوف بوڑھے کو قتل کرے۔'' اور کہا کرتی تھیں: ''بوڑھے احمق کو قتل کر دو۔''❷ جب عائشہ رضی اللہ عنہا کو قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر پہنچی تو بہت خوش ہوئیں۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: ا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس روایت کی دلیل پیش کیجیے۔

۲۔ جو چیز اماں عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے وہ اس رافضی دعوی کو رد کرتی ہے۔ اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ حضرت

میں شامل ہے کہ ام حرام رضی اللہ عنہا جس نے مجاہدین کے زمرہ میں شریک ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور آپ نے اس کو پہلے مجاہدین میں شمولیت کی بشارت دی تھی امیر معاویہ کے بحری بیڑہ میں شریک تھیں ان کے خاوند حضرت عبادہ بن صامت اور دیگر صحابہ میں سے ابودرداء اور ابوذر رضی اللہ عنہما بھی رفیق لشکر تھے۔ ام حرام نے اسی جگہ وفات پائی اور آج تک آپ کی قبر قبرص میں موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر مزید فرماتے ہیں:

''غزوہ قسطنطنیہ کے موقع پر دوسرے لشکر کی قیادت کا شرف یزید بن معاویہ کے حصہ میں آیا جس سے نبی کریم کے دوسرے خواب کی تعبیر بروئے کار آئی۔ یہ آپ کی رسالت کی صداقت کے عظیم دلائل میں سے ایک ہے۔''

عباسی خلافت میں تملق و خوشامد کا دور دورہ تھا۔ اور لوگ بنوامیہ کے محاسن کو معائب کا رنگ دے کر عباسی خلفاء کی خوشنودی حاصل کرتے تھے اسی دوران میں چند طالب علم امام الائمہ سلیمان بن مہران الاعمش کوفی رحمہ اللہ کے یہاں جمع ہوکر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عدل و انصاف کا ذکر کرنے لگے یہ سنکر امام اعمش بولے: ''اگر تم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا۔'' طلبہ نے عرض کیا: ''کیا آپ کی مراد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حلم اور بردباری سے ہے۔'' فرمایا اللہ کی قسم! نہیں بلکہ آپ عدل وانصاف میں یکتا تھا۔''

امام اعمش مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا: ''اگر تم حضرت معاویہ کو دیکھ لیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں۔''

یونس بن عبید قتادہ بن دعامہ سدوی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ اس نے کہا: ''اگر تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے کام کرنے لگو تو اکثر لوگ کہنے لگیں کہ تم ہی مہدی ہو۔'' ابواسحاق السبیعی نے ایک دن حضرت معاویہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''اگر تم ان کا زمانہ پالیتے تو کہتے کہ یہی مہدی ہیں۔''

امام احمد بن حنبل ﷺ نے اپنی تصنیف کتاب الزہد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نام زہد میں ضرب المثل کے طور پر بیان کیا ہے۔ محی الدین خطیب نے کتاب ''العواصم من القواصم'' کے حواشی پر اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ایک طرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ اصلی تصویر ہے جو صلحائے امت محمدی سے منقول ہے۔ دوسری جانب شیعہ کی پیش کردہ جعلی تصویر ہے جو فساق و فجار نے اپنی پر از ضلالت کتب میں امت محمدی کے لاتعداد لوگوں کو مبتلائے فریب کرنے کے لیے وضع کی ہے۔ (فَاللّٰهُ حَسِيْبُهُمْ وَ هُوَ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ)

❶ صحيح مسلم۔ كتاب فضائل الصحابة۔ باب ذكر كذاب ثقيف و مبيرها (حديث: ٢٥٤٥)

❷ یہ شیعہ کا وضع کردہ جھوٹ ہے۔ نعثل کا لفظ صرف قاتلین عثمان کی زبان پر جاری ہوا۔ قاتلین عثمان میں سے اولین شخص جس نے نعثل کا لفظ بولا وہ جبلہ بن عمرو ساعدی تھا۔ اس نے کہا: ''اے نعثل میں آپ کو قتل کرکے ایک خارشی اونٹ پر سوار کروں گا اور اسے شہر سے باہر پتھریلی زمین کی طرف ہانک دوں گا۔ (دیکھیے تاریخ طبری: ۵/۱۱۴، مطبع حسینیہ) بعد ازاں یہ لفظ جنگ جمل کے موقع پر ہانی بن خطاب ارجی کی زبان پر جاری ہوا وہ کہتا ہے۔

اَبَتْ شُيُوْخُ مُذْحِجٍ وَّ هَمْدَانَ ۔۔۔ اَنْ لَّا يَـرُدُّوْا نَـعْثَلًا كَمَـا كَـانَ

تیسری مرتبہ یہ لفظ عبدالرحمن بن حنبل جمحی نے جنگ صفین کے موقع پر بولا۔ وہ کہتا ہے:

اِنْ تَقْتُلُوْنِيْ فَاَنَا ابْنُ حَنْبَلٍ ۔۔۔ اَنَا الَّذِيْ قَتَلْتُ فِيْكُمْ نَعْثَلًا

جب جبلہ بن عمرو ساعدی نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرتے ہوئے پہلی مرتبہ نعثل کا لفظ بولا حضرت عائشہ اس وقت مکہ مکرمہ میں محو عبادت تھیں۔ جب حج سے واپس لوٹیں تو یہ لفظ آپ کے کانوں تک پہنچا۔

کے قتل پر سخت انکاری تھیں۔ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو مذمت اور نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتیں اور اس میں شرکت کرنے والوں کو...... خواہ ان کا بھائی محمد بن ابوبکر ہو یا کوئی اور مذموم قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بھائی محمد بن ابو بکر اور مشارکین قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر بددعا کی تھی۔

[غلط فہمی کی بنا پر اہل حق کا باہم کفر و نفاق کا فتوی]:

۳۔ فرض کیجیے صحابہ میں سے کوئی...... حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوں یا کوئی اور...... غصہ کی حالت میں کوئی بات کہے؛ اس لیے کہ وہ بعض خرابیوں کا انکار کرنا چاہتا ہو' تو اس کی بات کیوں کر حجت ہو سکتی ہے۔ [1] اس سے نہ کہنے والے کی شان میں کوئی فرق آتا ہے نہ اس کی شان میں جس کے بارے میں وہ لفظ کہا گیا۔ بایں ہمہ وہ دونوں جنتی بھی ہو سکتے ہیں اور اللہ کے ولی بھی۔ حالانکہ ان میں سے ایک دوسرے کو واجب القتل اور کافر تصور کرتا ہے مگر وہ اس ظن میں خطاء کار ہے۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ مذکور ہے؛ جو بدر اور حدیبیہ میں شرکت کر چکے تھے۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے ان کے غلام نے کہا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! حاطب بن ابی بلتعہ جہنم میں جائے گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے جھوٹ بولا؛ وہ بدر اور حدیبیہ میں شرکت کر چکا ہے۔'' [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

((جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا ارادہ کیا تو حاطب نے مشرکین مکہ کے نام ایک خط لکھا اور اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام راز منکشف کر دیے۔ وحی کے ذریعہ آپ ان تمام حالات سے باخبر ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ و زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا مکہ کی جانب چلتے جاؤ اور جب باغ خاخ آ جائے تو وہاں تمہیں ایک شتر سوار عورت ملے گی اس کے پاس ایک خط ہوگا۔ وہ خط اس سے لے لیجیے۔ جب علی و زبیر رضی اللہ عنہما وہ خط لے کر واپس لوٹے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کو بلا کر خط لکھنے کا سبب دریافت کیا۔ حاطب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں نے یہ فعل اس لیے انجام نہیں دیا کہ میں مرتد ہو گیا یا کفر پر راضی ہو گیا تھا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ میں نسباً قریشی نہیں ہوں، بلکہ باہر سے آ کر مکہ میں آباد ہوا تھا۔ مدینہ میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے ہیں، مکہ میں ان کے عزیز و اقارب ہیں جو ہر طرح ان کے گھر بار کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس طرح قریش کو ممنون کر دوں تا کہ وہ میرے کنبہ کی حفاظت کرتے رہیں۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا: '' حاطب بدر میں شرکت کر چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے متعلق فرمایا ہے: ﴿إِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ﴾ (جو اعمال چاہو انجام دو میں نے تمہیں بخش دیا۔'' اسی دوران میں سورۂ ممتحنہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

---

[1] اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ انسان خطا و نسیان سے مرکب ہے، اور رسولوں کے سوا کوئی بشر معصوم نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرام اور خاص طور پر خلفاء راشدین انسانیت کی اعلیٰ ترین صفات سے بہرہ ور ہیں، تاہم وہ خطاء کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی خطا کو درست بھی کرتے ہیں، وہ خطا کے مرتکب ہونے کے باوصف قلبی طہارت، صفاء نیت، صدق جہاد اور سلامت مقاصد کی بنا پر باقی مسلمانوں سے بلند ترین مقام و مرتبہ پر فائز ہیں۔

[2] البخاري ٤/ ٥٩؛ مسلم ٤/ ١٩٤١۔

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ﴾

''ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے ساتھ دوستی لگانا چاہتے ہو۔''[1]

[حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ:]

اہل علم حاطب کے واقعہ کی صحت پر متفق ہیں۔ یہ واقعہ مفسرین، فقہاء اور علماء سیر و تواریخ کے یہاں خبر متواتر کا درجہ رکھتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں جب فتنہ پروری کا دور دورہ تھا یہ واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کا راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کاتب عبداللہ بن ابی رافع ہے۔ واقعہ بیان کرنے سے آپ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین باہمی مشاجرات و تنازعات کے باوصف اللہ تعالیٰ کے نزدیک مغفور ہیں۔ خواہ ان کے مابین کچھ بھی ہوا ہو۔

اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ: حضرت عثمان و طلحہ زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین حاطب رضی اللہ عنہ سے بہر حال افضل ہیں۔ حاطب اپنے غلاموں کے ساتھ سخت سلوک کرتے تھے۔ نیز یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مشرکین مکہ کو خط لکھ کر حاطب رضی اللہ عنہ نے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا وہ ان لغزشوں کی نسبت عظیم تر تھا جو سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی جانب منسوب ہیں۔ بایں ہمہ آپ نے اس کو قتل کرنے سے روکا اور اس کے جہنمی ہونے کی تردید کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ حاطب رضی اللہ عنہ بدر و حدیبیہ میں شرکت کر چکا تھا۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے اسے منافق کہا اور مباح الدم قرار دیا۔ اس کے باوجود کسی کے ایمان میں فرق آیا نہ جنتی ہونے میں۔

صحیحین میں واقعہ افک کی تفصیل مذکور ہیں۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے رئیس المنافقین سے نجات حاصل کرنے کے لیے فرمایا:

''مجھے ایسے شخص کی ایذا سے کون نجات دے گا، جس نے میرے اہل کے بارے میں مجھے بڑی تکلیف دی ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے اپنے اہل کے بارے میں خیر ہی کی امید ہے اور جس شخص کے ساتھ ان کو متہم کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں بھی میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔''

یہ سن کر قبیلہ اوس کے سردار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھے...... یہ وہی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ہیں جن کی موت پر عرش الٰہی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ احکام الٰہی میں انھیں کسی ملامت گر کی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے اپنے حلیف بنی قریظہ کے بارے میں فیصلہ صادر کیا تھا کہ لڑنے والوں کو قتل کیا جائے۔ بچوں کو قیدی بنایا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت تصور کیا جائے۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ''آپ نے ان کے بارے میں اللہ کا وہ فیصلہ صادر کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر سے نازل ہوا تھا۔''...... اور [حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے] کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اس خدمت کے لیے حاضر ہیں، اگر وہ اوس کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو گا تو ہم اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور اگر خزرج کا آدمی ہوا تو اس کے بارے میں ہم آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے۔

یہ سن کر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہا: ''آپ نے جھوٹ بولا، اللہ کی قسم! آپ اسے قتل نہیں کر سکتے؛ اور نہ ہی اسے قتل

[1] صحیح بخاری۔ کتاب المغازی۔ باب فضل من شهد بدراً (حدیث: ۳۹۸۳، ۴۸۹۰)، صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل حاطب بن ابی بلتعة (حدیث: ۲۴۹۴)

کرنے پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: آپ جھوٹ بولتے ہیں، اللہ کی قسم! ہم اسے قتل کر کے رہیں گے۔ آپ منافق ہیں اور اسی لیے منافقین کی وکالت کر رہے ہیں۔''

اوس وخزرج آپس میں گتھم گتھا ہونے والے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے منبر سے اتر کر انھیں خاموش کرا دیا۔ [1]

اب ظاہر ہے کہ یہ تینوں اصحاب سابقین اوّلین میں سے تھے۔ اور اس کے باوصف اُسید رضی اللہ عنہ نے سعد رضی اللہ عنہ کو منافق کہا، حالانکہ دونوں کا ولی اللہ اور جنتی ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔ اس سے یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک شخص بنا بر تاویل دوسرے شخص کو کافر قرار دیتا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی کافر نہیں ہوتا۔

حضرت عتبان بن مالک سے روایت ہے: آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے اور گھر میں داخل ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ مگر صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں گفتگو میں مشغول رہے۔ [دوران گفتگو مالک بن دخشم کا تذکرہ آیا لوگوں نے اس کو مغرور اور متکبر کہا کہ وہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سن کر بھی حاضر نہیں ہوا معلوم ہوا وہ منافق ہے]، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا:

''ہم دل سے چاہتے تھے کہ آپ ﷺ اس کیلئے بددعا کریں کہ وہ ہلاک ہو جائے یا کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''کیا وہ اللہ تعالیٰ کی معبودیت اور میری رسالت کی گواہی نہیں دیتا؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''زبان سے تو وہ اس کا قائل ہے مگر اس کے دل میں یہ بات نہیں۔'' فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کی توحید اور میری رسالت کی گواہی دے گا وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا یا یہ فرمایا کہ اس کو آگ نہ کھائے گی۔'' [2]

جب یہ اصول ہے؛ اور پھر یہ ثابت ہو جائے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا حضرت عمار رضی اللہ عنہ یا کوئی دوسرا اصحابی اگر کسی دوسرے صحابی کو کافر سمجھے؛ مثلاً: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے صحابی کو؛ اور تاویل کی بنا پر اس کو قتل کرنا جائز سمجھے؛ تو اس کا شمار بھی مذکورہ بالا تاویل کے باب سے ہوگا۔ اور یہ بات ان میں سے کسی ایک کے ایمان پر بھی قادح نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی اس سے کسی کے اہل جنت ہونے میں کوئی فرق آئے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی غلطی بہت بڑی ہے؛ جب آپ کی یہ غلطی معاف کر دی گئی ہے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی غلطی بالاولی مغفرت کی مستحق ہے۔

اور جب یہ جائز ہے کہ حضرت عمر اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما جیسے انسان کفر کا حکم لگانے اور مباح الدم سمجھنے میں اجتہاد کر سکتے ہیں، اگرچہ یہ اجتہاد حقیقت واقع کے مطابق نہ بھی ہو؛ تو پھر اس قسم کے اجتہاد کا حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس قسم کے اجتہاد کا ہونا زیادہ اولیٰ ہے۔

[بڑے آدمی کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں]:

چوتھی بات: ان سے کہا جائے گا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قدح کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت منقول

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب حدیث الافك (حدیث ۴۱۴۱)۔ صحیح مسلم کتاب التوبة، باب فی حدیث الافك (حدیث ۲۷۷۰)

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلاة، باب المساجد فی البیوت (حدیث: ۴۲۵)، صحیح مسلم ۔ کتاب الإیمان۔ باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید..... (حدیث: ۳۳) واللفظ له۔

ہے؛ اگر یہ صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس میں دو احتمال ہیں: یا تو آپ کی رائے درست ہوگی؛ یا غلط ۔ اگر آپ کی رائے درست ہے؛ تو پھر اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برائیوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر آپ کی یہ رائے غلط ہے تو پھر اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی برائیوں میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے۔ [ان روایات کی بنا پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نقائص کو جمع کرنا قطعی طور پر باطل ہے]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر جس دکھ و رنج کا اظہار کیا؛ آپ کے قاتلین کی مذمت کی؛ اور آپ کے خون کا انتقام چاہا؛ اس کا تقاضا ہے [کہ اگر بالفرض کبھی کوئی ایسی بات سے آپ ہوئی ہے تو اس پر] ندامت ہے۔ جیسا کہ آپ نے مدینہ طیبہ سے جنگ جمل کے لیے نکلنے پر ندامت کا اظہار فرمایا تھا۔ بیشک اگر اس واقعہ پر آپ کی ندامت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے حق کا اعتراف ہے؛ تو پھر یہ [قتل عثمان پر] ندامت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور ان کے حق کا اعتراف ہے۔ اگر یہ اعتراف درست نہیں تو پہلا اعتراف بھی درست نہیں ۔

مزید برآں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جمہور صحابہ اور جمہور مسلمین سے جس قدر ملامت کا اظہار حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہوا ہے؛ ایسی ملامت کا اظہار عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے نہیں ہوا۔ اگر یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے حجت ہے؛ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے بھی حجت ہے۔ اگر اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے کوئی حجت نہیں ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ملامت کے لیے بھی کوئی حجت نہیں ہے۔ اگر اس سے مقصود اس ملامت گری پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں قدح کرنا ہے تو پھر یہ جان لینا چاہیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا [اس مسئلہ میں اکیلی نہیں ہیں' بلکہ آپ] جمہور صحابہ کیساتھ ہیں۔ مگر اس ملامت گری کے درجات مختلف ہیں۔

اور اگر اس سے مقصود تمام لوگوں پر قدح کرنا ہو جیسے : حضرت عثمان؛ حضرت علی ؛ حضرت طلحہ ؛ حضرت زبیر؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین نیز ملامت کیے گئے اور ملامت کرنے والے ۔

تو ان سے کہا جائے گا کہ: ہم ان میں سے ہر ایک کے لیے معصوم ہونے کا دعوی نہیں کرتے ۔ بلکہ ہم کہتے ہیں : یہ لوگ اولیاء اللہ متقین تھے؛ ان کا شمار نجات پانے والی اللہ تعالیٰ کی جماعت میں ہوتا ہے۔ اللہ کے نیک بندے تھے؛ اور جنت کے سرداروں میں سے تھے۔ اور ہم یہ بھی کہتے ہیں : گناہ کا صادر ہونا ان لوگوں کے لیے بھی جائز ہے جو صدیقین سے افضل ہوں' اور صدیقین سے بڑے ہوں ۔ مگر ان گناہوں کی سزا توبہ' استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیوں ؛ مصائب و آلام؛ اور دوسرے امور کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ پس یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ان کے لیے توبہ و استغفار بھی ثابت ہے' اور ان کی اتنی نیکیاں ہیں جو ان کے بعد آنے والے کسی کے حصہ میں نہیں آئیں۔ اور انہیں ایسی آزمائشوں اور مصیبتوں سے پالا پڑا ہے [جنہوں نے ان کے گناہ دھو کر ختم کر دیے ہیں]۔ یہ مصیبتیں کسی دوسرے پر نہیں آئیں۔ ان کی اتنی قابل شکر کوششیں اور نیک اعمال ہیں جو ان کے بعد آنے والوں کے حصہ میں نہیں آئے ۔ یہ جماعت گناہوں کی بخشش کے بعد میں آنے والے لوگوں کی نسبت زیادہ حق دار ہیں ۔

لوگوں کے بارے میں جو گفتگو ہو وہ ظلم و جہل کی بجائے علم و عدل پر مبنی ہونی چاہیے؛ ظلم و جہالت پر مبنی نہیں ہونی چاہیے جیسا کہ اہل بدعت کا شیوہ ہے ۔ روافض کا یہ حال ہے کہ وہ دو قریب الفضیلت اشخاص میں تقابل کرتے ہوئے ایک کو معصوم

قرار دیتے اور دوسرے کو ظلم و گناہ کا مجسمہ کافر و فاسق قرار دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے جہل، تناقض کی آئینہ دار ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی یہودی یا نصرانی جب حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی نبوت کا اثبات کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر تنقید کرے گا تو اس کے عجز و جہل اور تناقض کا اظہار ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ یا عیسیٰ کی رسالت کے اثبات میں وہ جو دلیل پیش کرے گا، اسی دلیل کو بلکہ اس سے بھی قوی تر دلیل و برہان سے نبی کریم ﷺ کی رسالت ثابت ہوگی۔ اور نبی کریم ﷺ کی نبوت پر جو بھی شبہ پیش کیا جائے گا اس سے زیادہ قوی شبہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہم السلام پر پیش کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص بھی دو مماثل چیزوں میں تفریق پیدا کرے گا یا ایک چیز کی مدح کرے اور بعینہٖ اس جیسی چیز کی مذمت کرے یا بالعکس وہ اسی قسم کے عجز و جہل اور تناقض کا شکار ہوگا۔ علماء و مشائخ کے اتباع کا بھی یہی حال ہے، جب کوئی شخص اپنے ہادی و پیشوا کی مدح میں رطب اللسان ہو اور اس جیسے دوسرے بزرگ کی مذمت کا مرتکب ہو تو وہ بھی تناقض کے مرض میں مبتلا ہوگا۔

[ساتواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا خلافت کے منصب پر کون فائز ہوا ہے؟'' لوگوں نے جواب دیا: حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ قرار پائے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا، عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے دعویٰ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑنے کے لیے تیار ہوگئیں۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قاتل قرار دیا تھا۔ اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے۔ صریح بہتان ہے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تحویل میں دے دیں۔ وہ اس حقیقت سے کلیتاً آگاہ تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دامن قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے اتنا ہی پاک تھا جتنا کہ خود ان کا؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر چونکہ قاتلین نے آپ کے پاس پناہ لے لی تھی۔ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ جن قاتلوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں پناہ لی ہے وہ ان کو تفویض کر دیے جائیں۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا دونوں اس پر قادر نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے قبائل ان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ فتنہ کی حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ بپا ہو جاتا ہے تو عقلاء اس کو فرو کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بڑے بڑے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس فتنہ کی آگ بجھانے اور اسے روکنے سے قاصر رہے۔ فتنوں میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ﴾ (انفال)

''اس فتنہ سے بچ جاؤ جو صرف ظالموں کو ہی اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔''

جب فتنہ کا ظہور ہوتا ہے تو وہی شخص اس میں آلودہ ہونے سے محفوظ رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچا لے۔

[آٹھواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''[قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی بنا پر] حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیا جرم عائد ہوتا ہے۔''

[جواب]: [یہ اعتراض شیعہ مصنف] کے تناقض کا آئینہ دار ہے۔ رافضی مصنف اس زعم میں مبتلا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، قتل عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ جنگ و قتال کو مباح تصور کرتے تھے۔ اور یہ قتل آپ کی مساعی کا رہین منت تھا۔ اس

لیے کہ شیعان علی اور شیعان عثمان رضی اللہ عنہما میں سے بہت سے لوگ یہ قتل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ❶ ایک گروہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے یہ الزام [بطور فخر] لگاتا ہے' اور دوسرا گروہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کی وجہ سے یہ الزام [بطور نفرت و اثبات جرم کے] لگاتا ہے۔ [یہ دونوں گروہ تعصب کے مریض ہیں ایک فریق حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بے جا طرف داری کا ارتکاب کرتا ہے اور دوسرا حضرت عثمان کا حامی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دشمن ہے]۔ جمہور اہل اسلام ان دونوں فرقوں کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

روافض کا قول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، قتل عثمان رضی اللہ عنہ بلکہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قتل کو مباح سمجھتے۔ اور ان کو قتل کرنے والے کی تائید و نصرت کو اجر و ثواب کا موجب قرار دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو وہ یہ بات کیوں کر کہہ سکتا ہے کہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کیا گناہ ہے؟ البتہ اہل سنت کے قول کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ قرار دے سکتے ہیں یہ امر اس بات کا آئینہ دار ہے کہ روافض کے یہاں کس قدر تناقض پایا جاتا ہے۔

[انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج پر رافضی الزام]:

[نواں اعتراض]: مصنف کا قول کہ ''طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اعانت و رفاقت کیوں کر جائز ہوئی؟'' بروز قیامت یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے، تو اس عورت کا خاوند اس کا انتہائی دشمن بن جائے گا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ شیعہ کے جہل و تناقض کا بین ثبوت ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بڑے بڑے الزام لگاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بری قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں قرآن نازل ہوا ہے [جو قیامت تک پڑھا جائے گا]۔

ان کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس قسم کا دعوی دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج کے متعلق کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی ایک غلط کار عورت تھی۔ اور جس بیٹے کو نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہونے کے لیے بلایا تھا؛ وہ

❶ قبل ازیں شیعہ مصنف کا یہ قول بیان کیا جا چکا ہے کہ سب لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے حق میں تھے'' ہم نے وہاں بیان کیا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ اسی بنا پر آپ نے حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو ان کی حفاظت و نگرانی کے لیے مامور فرمایا تھا۔ ہم نے یہ واقعہ بھی ذکر کیا تھا کہ ایک مرتبہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو اپنی بیٹیوں کو روتا ہوا پایا اور جب انھوں نے یہ بتایا کہ وہ قتل عثمان رضی اللہ عنہ پر آنسو بہا رہی ہیں تو آپ نے فرمایا ''روتی رہو۔''

جنگ جمل میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیج رہی ہیں اور فوج کے لوگ آپ کی دعا کو دہرا رہے ہیں تو آپ نے یہ دعا فرمائی: '' اَللّٰهُمَّ الْعَنْ قَتَلَةَ عُثْمَانَ '' (اے اللہ! قاتلین عثمان پر لعنت بھیج)۔ یہ دلائل و براہین ذکر کرنے سے ہمارا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں وہی رائے رکھتے ہیں جو اہل سنت کی ہے اور وہ بھی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجتے تھے۔ نیز یہ کہ آپ روافض کی طرح اس غلط فہمی میں مبتلا نہ تھے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بغض و عناد رکھنا قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی مدد کرنا اور ان کے فعل شنیع کو سراہنا ایک مستحسن امر ہے۔ ہم شیعہ مصنف کے اس دعویٰ کا ذکر کر چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مباح الدم تصور کرتے تھے۔ اب وہ اس کے عین برعکس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جائز القتل تصور کرتے ہیں اور اسی بنا پر آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ حالانکہ جن و انس اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعہ کے ہم خیال ہرگز نہ تھے۔ بخلاف ازیں وہ آغاز اسلام سے تادم واپسیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی سمجھتے رہے۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے اعوان و انصار کا مقصد وحید قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ (لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَ اَعَدَّ لَهُم جَهَنَّم) سے قصاص لینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون اور امداد کرنا تھا اور بس!''

آپ کا بیٹا نہیں تھا' بلکہ اس بیوی کا تھا[معاذ اللہ]۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ [هود ٤٦]
''اس کے اعمال اچھے نہیں تھے'' سے مراد یہ ہے کہ: یہ بیٹا غلط کام کا نتیجہ ہے۔ اور ان میں سے بعض پڑھتے ہیں:
﴿وَ نَادٰى نُوْحُ ِ ابْنَهُ﴾ [هود ٤٢] ''نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔'' اور اس سے مراد آپ کا بیٹا لیتے ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل لیتے ہیں: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ﴾۔ ''وہ آپ کے اہل خانہ میں سے نہیں۔''
نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تأویل کرتے ہیں:
﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا﴾ [التحريم ١٠]
''اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے نوح کی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی؛ یہ دونوں ہمارے بندوں میں دو (شائستہ اور) نیک بندوں کے گھر میں تھیں، پھر ان کی انہوں نے خیانت کی۔''
کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ اس عورت نے حضرت نوح علیہ السلام کے بستر پر خیانت کی تھی؛ یہ ایک فاحشہ عورت تھی۔
اپنے ان الزامات میں رافضی ان منافقین و فاسقین کی برابری کرتے ہیں ہیں جنھوں نے بہتان گھڑ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر فحاشی کا الزام لگایا تھا۔ پھر انہوں نے اس سے توبہ بھی نہ کی؛ اور ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تھا:
''مجھے ایسے شخص کی ایذا سے کون نجات دے گا، جس نے میرے اہل خانہ کے بارے میں مجھے بڑی تکلیف دی ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے اپنے اہل کے بارے میں خیر ہی کی امید ہے اور جس شخص کے ساتھ ان کو متہم کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں بھی میں خیر کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔''[1]

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ انسان کے لیے سب سے بڑی تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ اس کی بیوی [یا اہل خانہ] پر ایسا گندا الزام لگایا جائے۔ کہتے ہیں: وہ فاحشہ تھی۔ اور یہاں تک کہ ایسی عورت کا شوہر بھی ان کے ہاں ایک فاحش کا شمار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کے مابین ایک دوسرے کو دی جانے والی گالیوں میں یہ سب سے بری گالی ہے۔ بلکہ انتہائی درجہ کی مبالغہ آمیزی پر مبنی گالی ہے۔
اللہ تعالیٰ نے فحاشی کا الزام لگانے والے کے لیے حد قذف مقرر کی ہے جو کہ باقی کسی بھی گناہ پر نہیں۔ اس لیے کہ تہمت لگائے گئے انسان کے لیے جتنی تکلیف دہ بات اس الزام میں ہے ایسی تکلیف دوسری کسی بھی چیز میں نہیں۔ اس لیے کہ اگر کوئی کسی انسان پر کفر کا الزام لگائے؛ تو اس کے لیے اپنے اسلام کا اظہار کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنا ممکن ہے؛ بخلاف فحاشی کے الزام کے۔ اس لیے کہ الزام لگانے والی کی تردید کسی بھی ایسے کلام سے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ فحاشی کو خفیہ رکھا جاتا ہے' اسے چھپایا جاتا ہے' ظاہر نہیں کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو مؤمنین کے مابین فحاشی کی باتیں پھیلانا چاہتے ہوں۔ اس لیے کہ ایسی باتوں کی اشاعت کرنے میں لوگوں کے لیے تکلیف دہی اور ان پر ظلم ہے۔ مزید برآں ایسا کرنے میں نفوس کے لیے برائی کی دعوت کا ایک پہلو بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں دوسروں کے لیے تشبیہ و اقتداء کا سامان ہے۔ جب کوئی انسان کسی کے بارے میں اس طرح کی بات سنتا ہے' تو وہ بھی اس کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش

[1] رواه البخاري ٣/ ١٧٣۔

کرتا ہے۔لہٰذا اس طرح [فحاشی] کی تہمت لگانے میں وہ ظلم وفحاشی ہے جو کسی اور الزام کے لگانے میں نہیں۔اس لیے کہ نفوس میں ایسے کاموں کے لیے شہوت پائی جاتی ہے ؛ بخلاف کفر اور قتل کے۔نیز اس لیے بھی کہ کفر اور قتل کے اظہار میں لوگوں کو اس کام کی مضرت سے خبردار کیا جاتا ہے۔ایسے فاعل کا فعل ظاہر کرنے میں مصلحت اس کے چھپانے کی مصلحت پر راجح ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں دو گواہوں کی گواہی کافی سمجھی جاتی ہے۔اور ایک بار اقرار کرنے سے اس پر حد قائم کی جاسکتی ہے۔جب کہ فحاشی کا معاملہ اس کے خلاف ہے۔فحاشی اس وقت تک ثابت نہیں ہوسکتی جب تک چار گواہ یک زبان ہوکر گواہی نہ دیدیں۔اور اقرار کی صورت میں صرف ایک بار کا اقرار کافی نہیں ہے' بلکہ چار بار اقرار کرنا پڑے گا۔ بہت سارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے۔

جب کسی انسان کی بیوی پر اس طرح کا الزام لگایا جاتا ہے تو اسے ویسے ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی انسان کی بیوی کے ارتکاب فحاشی سے۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی انسان اپنی بیوی پر تہمت لگائے تو شریعت نے ان کے لیے لعان کو مشروع کیا ہے۔ یہ کہ لعان [آپس میں ایک دوسرے پر لعنت] کرنے سے حد قذف ساقط ہوجائے گی۔ اگر غیر شادی شدہ پر الزام لگایا جائے تو اس وقت گواہی پیش کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔حد اس صورت میں ہوگی جب وہ انسان حد لگانا طلب کرے جس پر الزام لگایا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر کسی غیر شادی شدہ عورت پر فحاشی کا الزام لگایا جائے؛ اور اس کا شوہر شادی شدہ ہو؛ تو تہمت لگانے والے پر حد قذف واجب ہوتی ہے۔یہی علماء کے مختلف اقوال میں سے ایک قول ہے' اور امام احمد سے بھی ایک روایت میں نقل کیا گیا ہے۔

یہ شرعی اور عرفی گواہی ہے کہ کسی انسان کی بیوی پر اگر بے حیائی کا الزام لگایا جائے تو اسے جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس تکلیف سے بڑھ کر ہے کہ اگر اس کی بیوی کو گھر سے کسی بڑی مصلحت کے پیش نظر نکالا جائے۔

حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کو گھر سے نہیں نکالا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو آپ مکہ مکرمہ میں تھیں؛ مدینہ میں نہیں تھیں۔اور نہ ہی آپ کے قتل کے وقت آپ موجود تھیں۔ جب حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مکہ گئے تو یہ سارے لوگ وہاں پر اکٹھے ہوگئے۔

رافضی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کی ازواج' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نوح علیہ السلام کی بیوی پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔اس طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کو ایذاء دیتے ہیں؛ جوکہ بالکل ان منافقین جیسا فعل ہے جو اللہ کے رسولوں کو جھٹلاتے رہے ہیں۔ پھر اعتراض یہ کرتے ہیں کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مکہ سے بصرہ تک کا سفر حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ کیا۔حالانکہ اس میں کسی بھی اعتبار سے فحاشی کا شک وگمان تک بھی نہ تھا۔مگر کیا کریں رافضی لوگوں میں سب سے بڑے متناقض؛ جاہل اور احمق جو ٹھہرے۔

اہل سنت والجماعت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی بھی نبی کی بیوی غلط کاری کی مرتکب نہیں ہوئی۔حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا آپ کا ہی بیٹا تھا۔جیسا کہ سچے بادشاہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ نَادٰی نُوۡحُ ۣ ابۡنَہٗ ﴾ [هود ۴۲] ''نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

اور فرمایا: ﴿ یٰبُنَیَّ ارۡکَبۡ مَّعَنَا ﴾ [هود ۴۲] ''اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجاؤ۔''

نیز نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا: ﴿ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ ﴾ [ھود ۴۵] ''بیشک میرا بیٹا میرے اہل خانہ میں سے تھا۔''

اللہ اور اس کا رسول دونوں کہتے ہیں کہ: وہ نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا۔ جبکہ یہ جھوٹے دروغ گو اور انبیاء کو اذیت دینے والے کہتے ہیں: ''وہ آپ کا بیٹا نہیں تھا۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ''وہ آپ کا بیٹا نہیں' بلکہ یوں فرمایا:

﴿ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِكَ ﴾ [ھود ۴۶] ''وہ آپ کے اہل بیت میں سے نہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴾ [ھود ۴۰]

''ہم نے کہا کہ کشتی میں ہر قسم کے (جانداروں میں سے) جوڑے (یعنی) دو (جانور، ایک نر اور ایک مادہ) سوار کر لے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی، سوائے ان کے جن پر پہلے سے بات پڑ چکی؛ اور سب ایمان والوں کو بھی؛ اس کے ساتھ ایمان لانے والے بہت ہی کم تھے۔''

یعنی ان کو اپنے ساتھ سوار کر جو ایمان لائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اہل خانہ کو سوار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ بلکہ ان لوگوں کو اس حکم میں سے مستثنیٰ قرار دیا تھا جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا [یعنی جو ایمان نہیں لائے تھے' اور ان کے غرق ہونے کا فیصلہ ہو چکا تھا] اور آپ کا بیٹا بھی ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا تھا۔ نوح علیہ السلام کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اسی لیے آپ نے یہ کہا:

﴿ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ ﴾ [ھود ۴۵] ''اے میرے رب! بیشک میرا بیٹا میرے اہل خانہ میں سے تھا۔''

آپ کا یہ خیال تھا کہ شاید بیٹا ان لوگوں میں سے ہو گا جن کی نجات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بہت سارے علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ: ''آپ کے اہل خانہ میں سے نہیں'' اس کی تفسیر یہ ہے کہ: ''آپ کے ان اہل خانہ میں سے نہیں جن کو بچانے کا آپ کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔'' اگر چہ وہ نسب کے اعتبار سے آپ کے اہل میں سے ہی تھا؛ مگر دینی اعتبار سے ان میں سے نہیں تھا۔ کفر کی وجہ سے مؤمنین اور کفار کے درمیان موالات ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں: ابولہب آل محمد اور اہل بیت میں سے نہیں ہے۔ اگر چہ وہ نسب کے اعتبار سے آپ کے قریب ترین رشتہ داروں میں سے تھا۔ پس جب ہم درود پڑھتے ہیں: ''اللھم صل علی محمد و علی آل محمد۔'' ''اے اللہ! محمد ﷺ پر اور آپ کی آل پر درود بھیج'' تو ابولہب اس میں داخل نہیں ہوتا۔

نوح علیہ السلام کی بیوی کی ان کے ساتھ خیانت دین میں تھی۔ اس لیے کہ آپ کی بیوی بھی آپ کو پاگل کہتی تھی۔ ایسے ہی لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت بھی ان کے دین میں خیانت تھی۔ وہ آپ کے مہمانوں کے بارے میں اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتی تھی۔ اس کی قوم کے لوگ لونڈے باز تھے۔ وہ لوگ عورتوں کے ساتھ زنا کی بیماری میں گرفتار نہیں تھے جو کہا جائے کہ اس نے کوئی فحاشی کی ہوگی۔ بلکہ وہ گناہ کے کاموں میں ان کی مدد کرتی تھی؛ اور ان کے ان برے اعمال پر راضی رہتی تھی۔

رافضیوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے انساب کی آباء و ابناء کے لحاظ سے تعظیم کرتے ہیں اور ان کی ازواج پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔ یہ سب خواہشات نفس کی پیروی اور عصبیت کی وجہ سے ہے۔ اس طرح وہ حضرت

فاطمہ' حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعظیم کی راہ نکالنا چاہتے ہیں: اور اس کے ساتھ ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا - ام المؤمنین - پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں۔ساتھ یہ بھی کہتے ہیں- ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں-: ابراہیم علیہ السلام کا والد آزر مؤمن تھا۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین بھی اہل ایمان تھے۔تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ نبی کا والد کافر تھا؛ اگر باپ کافر ہوگا تو پھر بیٹے کا کافر ہونا بھی ممکن ہے۔تو خالی نسب سے تو کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔اس لیے کہ اس سے ثابت ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا۔ نبی کا بیٹا کافر ہو [شیعہ مذہب کے مطابق] ایسا نہیں ہوسکتا: [اسی لیے وہ اسے آپ کا بیٹا ہی نہیں مانتے]۔ایسے ہی شیعہ کہتے ہیں: جناب ابو طالب مؤمن تھا۔ان میں سے بعض کہتے ہیں: اس کا نام عمران تھا۔جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [آل عمران ۳۳]

''بیشک اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کے لوگوں میں سے آدم علیہ السلام کو اور نوح علیہ السلام کو، ابراہیم علیہ السلام کے خاندان اور عمران کے خاندان کو منتخب فرمایا۔''

[اپنے مطلب کی بات نکالنے کے لیے] ان لوگوں کی یہ کارستانیاں ہیں؛ حالانکہ اس میں جو جھوٹ' افتراء؛ بہتان اور حصول مقصود میں جو تناقض ہے' وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے؛ جو کسی پر مخفی نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے باپ یا بیٹے کے کافر ہونے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس انسان میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی۔یہ اللہ کی مشیت ہے وہ زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے۔

اس میں کوئی شک و شبہ والی بات نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اپنے والدین سے افضل تھے۔ان کے باپ دادا کافر تھے۔ بخلاف اس کے کہ کوئی کسی فاحشہ کا شوہر ہو۔اس لیے کہ یہ کسی انسان کی مذمت اور عیب جوئی کے لیے سب سے بڑا طعنہ ہے۔اس کی مضرت انسان کو لاحق ہوتی ہے؛ اس کے برعکس باپ یا بیٹے کے کافر ہونے سے کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا۔

مزید برآں اگر ایسے ہی ہوتا کہ مؤمن والدین سے ہمیشہ مؤمن اولاد ہی پیدا ہوگی؛ تو پھر اس کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمام اولاد اہل ایمان ہوتی۔اللہ تعالیٰ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المائدة ۲۷]

''آدم (علیہ السلام) کے دونوں بیٹوں کا کھرا کھرا حال بھی انہیں سنا دو ان دونوں نے ایک نذرانہ پیش کیا، ان میں سے ایک کی نذر قبول ہوگئی اور دوسرے کی مقبول نہ ہوئی تو کہنے لگا کہ میں تجھے مار ہی ڈالوں گا؛ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ تقوی والوں کا ہی عمل قبول کرتا ہے۔''

صحیحین میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی بھی انسان ظلم کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا مگر ابن آدم پر اس کے خون کے برابر گناہ ہوگا؛ اس لیے کہ اس نے سب سے پہلے قتل کرنے کی رسم کی طرح ڈالی۔''❶

مزید برآں شیعہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر قدح کرتے ہیں؛ حالانکہ ان کا ایمان

❶ رواه البخاري ٢/ ٧٩۔مسلم ٣/ ١٣٠٤۔

لانا تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ابوطالب کی مدح و تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں؛ جس کی موت باتفاق اہل علم کفر کی حالت پر ہوئی ہے۔ جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں ۔صحیحین میں حضرت مسیب بن حزن رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں:

''جب ابوطالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے (اس وقت) ابوطالب کے پاس ابوجہل بھی تھا۔تو آپ نے ان سے فرمایا: اے میرے چچا صرف ایک کلمہ'' لا إلـه إلا الله '' کہہ دیجئے تو میں اللہ کے ہاں اس کی وجہ سے (آپ کی بخشش کے لئے) عرض و معروض کرنے کا مستحق ہو جاؤں گا۔تو ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ نے کہا:'' اے ابوطالب! تم عبدالمطلب کے دین سے پھرے جاتے ہو؟ پس یہ دونوں برابر ان سے یہی کہتے رہے حتی کہ ابوطالب نے ان سے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی کہ: (میں) عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں اس کے لئے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے روکا نہ جائے تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ [التوبة ۱۱۳]

''نبی اور ایمان والوں کے لئے مناسب نہیں ہے کہ مشرکین کے لئے استغفار کریں اگر چہ وہ ان کے قرابتدار ہوں جب کہ انہیں یہ ظاہر ہو چکا کہ وہ دوزخی ہیں۔'' [صحیح بخاری:جلد دوم:حدیث نمبر ۱۰۸٦]

اور یہ آیت نازل ہوئی کہ:﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص ۵٦]

''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے ؛مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔''

صحیح مسلم کی روایت میں ہے : ابوطالب نے کہا: قریش مجھے بدنام کریں گے اور کہیں گے کہ ابوطالب نے ڈر کے مارے ایسا کیا۔اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں کلمہ پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔اسی پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرمائی:﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص ۵٦]

''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے ؛مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔''[صحیح مسلم:ح۱۳۸]

صحیحین میں حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں : میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! ابوطالب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے تھے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرتے ؛اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لوگوں پر غصے ہوتے تھے تو کیا ان باتوں کی وجہ سے ان کو کوئی فائدہ ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں نے انہیں آگ کی شدت میں پایا تو انہیں نکال کر ہلکی آگ میں لے آیا۔'' [صحیح مسلم:ح۵۱۱]

حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کے چچا ابوطالب کا تذکرہ ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''شاید کہ قیامت کے دن میری شفاعت سے ابوطالب کو فائدہ پہنچے کہ دوزخ کے اوپر والے حصے میں لایا جائے گا کہ جہاں آگ ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی جس کی شدت سے اس کا دماغ کھولتا رہے گا۔''[صحیح مسلم:ح ۵۱۳]

مزید برآں صرف نسب پر اللہ تعالیٰ نے کسی کی کوئی تعریف نہیں کی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ایمان اور تقوی کی بنیاد پر تعریف کرتے ہیں؛ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات ۱۳]

''بیشک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیز گار ہو۔''

جب اصول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''تم لوگوں کو معدنیات جیسا پاؤ گے جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں جو لوگ بہترین تھے زمانہ اسلام میں بھی وہ لوگ بہترین ہوں گے جبکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کریں۔'' [صحیح مسلم:ح ۱۹۵۵]

شیعہ کے تناقض کی انتہاء یہ ہے کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو ہدف ملامت بنانے کے لیے وہ اس موقع پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ان کے اعتراض کی اصل آماج گاہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بے حد اکرام و احترام کرتے تھے۔ آپ کے موافقین اور آپ کے حکم کی تعمیل کرنے والے تھے۔ اور ان کے یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کسی غلط کاری کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر شیعہ مصنف طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ ''وہ نبی کریم ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے'' ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بیوی کے ساتھ بات چیت کرے۔ اور سفر میں اسے اپنے ہم راہ لے جائے......'' حالانکہ یہ دونوں حضرات آپ کو ایک ملکہ کی طرح لے کر گئے تھے جس کی بات مانی جاتی ہے اور حکم پر تعمیل کی جاتی ہے۔ ان کو گھر سے نکالنے میں کسی برائی کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

تو ایک ناصبی (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف) یہ کہنے کا مجاز ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے جب کہ وہ آپ کی بیوی (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور آپ کو اس حد تک تکلیف پہنچائی کہ ان کے اعوان و انصار نے اس اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں جس پر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سوار تھیں۔ نتیجتاً سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا محمل سے گر پڑیں۔ اور ان کے اعداء ایک قیدی عورت کی طرح آپ کو گھیرے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تذلیل ہے۔ جس میں کسی انسان کی اس کے اہل خانہ میں ہتک عزت ہے؛ اور پھر انہیں قیدی بنانے کی کوشش کرنا' اور اجنبی لوگوں کو ان پر مسلط کرنا' انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کرنا فقط گھر سے نکالنے سے زیادہ گناہ کا کام ہے۔ جب کہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے ایک باعزت ملکہ کی طرح بحفاظت تمام آپ کو لائے، کسی کو آپ کے پاس پھٹکنے کی اجازت نہ تھی۔ نہ ہی کوئی آپ کے پردہ کی ہتک کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی آپ کی چادر کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

نیز طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما اور دوسرے اجنبی آپ کو نہ اٹھاتے تھے۔ علاوہ ازیں فوج میں بہت سے لوگ آپ کے محرم تھے۔ مثلاً عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کہ آپ کے بھانجے تھے اور ان کی خلوت آپ کے ساتھ کتاب و سنت اور اجماع کی رو سے جائز ہے۔ اسی طرح شرعاً محرم کے ساتھ سفر کرنے کی بھی اجازت ہے۔

جہاں تک اس لشکر کا تعلق ہے جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے برخلاف برسر پیکار تھا؛ اگر اس میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھائی محمد بن ابی بکر...... جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب دست تعدی دراز کیا تھا...... نہ ہوتا تو اجنبی لوگ آپ پر زیادتی کرنے سے نہ چوکتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دست درازی کرنے والے کے بارے میں دریافت فرمایا: ''یہ کس کا ہاتھ ہے اللہ اسے آگ

میں جلائے؟'' محمد بن ابی بکر نے کہا: ''ہمشیرہ! کیا آخرت سے پہلے دنیا میں جلائے؟''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''ہاں دنیا میں آخرت سے پہلے'' چنانچہ محمد بن ابوبکر کو مصر میں جلا دیا گیا تھا۔

اگر ناصبی شیعہ کو مخاطب کر کے کہے: جب حسین رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے تھے تو تمہارے قول کے مطابق آل حسین رضی اللہ عنہ کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ حالانکہ ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو سلوک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روا رکھا گیا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو واپس مدینہ بھیج دیا گیا اور حسب ضرورت نان و نفقہ بھی دیا گیا تھا۔ اسی طرح قابو پا کر آل حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے گھروں میں پہنچا دیا گیا اور نان و نفقہ بھی دیا گیا تھا۔ اگر اس کا نام قیدی بنانا ہے اور یہ حرمت نبوی کے منافی ہے تو بے شک سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی قیدی بنایا گیا اور حرمت رسول کو پیش خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔''

شیعہ اہل سنت پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ایک شامی نے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہ کو قیدی بنانا چاہا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسے روکتے ہوئے کہا: ''اللہ کی قسم! ہم اسی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنا دین چھوڑ کر پورے کافر ہو جائیں۔''

بفرض محال اگر ایسا ہوا بھی تھا تو جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس بات کی اجازت طلب کرتے تھے کہ جنگ جمل و صفین میں جو لوگ ان کے حریف ہیں ان کو قیدی بنایا جائے اور ان کے مال کو مال غنیمت تصور کیا جائے وہ رفقائے عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت بڑے مجرم تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں کو قیدی بنانا پیش نظر تھا ان میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر خواتین بھی تھیں۔ علاوہ ازیں جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ مطالبہ کر رہے تھے وہ دینی اعتبار سے اسے جائز سمجھتے اور اس پر اصرار کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے افکار و آراء سے متفق نہ ہوئے۔ تو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا اور آپ ان کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ اس کے عین برخلاف جس شامی نے فاطمہ بنت حسین رضی اللہ عنہا کو قیدی بنانا چاہا تھا وہ ایک محروم اقتدار غیر معروف آدمی تھا۔ نیز یہ کہ وہ شخص دینی حیثیت سے نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ جب حاکم با اختیار نے اس سے روکا تو وہ اس سے باز رہا۔

خلاصہ کلام یہ کہ مسلمانوں کے خون ناموس و آبرو اور حرمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حلال قرار دینے والوں کی تعداد اموی فوج کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں زیادہ تھی۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس پر سب لوگوں کا اتفاق ہے، خوارج ہی کو دیکھیے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے الگ ہو گئے تھے۔ یہ عسکر معاویہ رضی اللہ عنہ کے شریر ترین لوگوں سے بھی شریر تر تھے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف جنگ لڑنے کا حکم دیا[1] اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور علماء کرام رحمہم اللہ نے ان کے خلاف صف آراء ہونے پر اجماع منعقد کر لیا تھا۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ روافض خوارج سے بھی زیادہ جھوٹے، ان سے بڑے ظالم اور کفر و نفاق اور جہالت میں بھی ان سے سبقت لے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں روافض خوارج کی نسبت عجز و ذلت میں بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ دونوں فریق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کی فوج سے وابستہ تھے۔ یہی لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کمزوری کا سبب قرار

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام (حدیث:٣٦١١)، صحیح مسلم۔ کتاب الزکاۃ۔ باب التحریض علی قتل الخوارج (حدیث:١٠٦٦)۔

پائے اور آپ اپنے حریفوں کے مقابلہ سے عاجز رہے۔

ہمارا مقصد یہاں یہ بتانا ہے کہ شیعہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کو جن اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان سے بھی زیادہ اہم اعتراضات وارد ہوتے ہیں ۔ اگر شیعہ یہ جواب دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مجتہد تھے؛ بنا بریں وہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کی نسبت اقرب الی الحق تھے ۔ تو ہم کہیں گے: طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی مجتہد تھے ۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے افضل تھے تاہم اگر عائشہ رضی اللہ عنہا کی امداد کیلئے ان کا مدینہ سے نکلنا گناہ کا کام تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اقدام اس سے بھی بڑا جرم ہے۔

اگر شیعہ کہیں کہ طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما چونکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو لے کر لڑنے کے لیے آ گئے تھے اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فعل کی ذمہ داری ان دونوں پر عائد ہوتی ہے ۔ تو اہل سنت اس کے جواب میں یہ مثال پیش کر سکتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کرایا؛ حالانکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا ہم نے عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؟ ان کے قتل کے ذمہ دار تو وہ لوگ ہیں جو ان کو ہماری تلواروں کے نیچے لے آئے تھے۔''[1]

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یہ دلیل قابل تسلیم نہیں تو ان لوگوں کی دلیل و برہان بھی ناقابل قبول ہے، جو کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی توہین و تذلیل کے ذمہ دار طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما ہیں ۔ اور اگر یہ دلیل قابل احتجاج ہے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے استدلال سے بھی انحراف کی گنجائش نہیں ۔

روافض دیگر ظالم و جاہل لوگوں کی طرح ہمیشہ اسی قسم کے دلائل کا سہارا لینے کے عادی ہیں جن سے ان کے اپنے اقوال کا فساد و تناقض ثابت ہوتا ہے ۔ یہ دلائل ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے نظائر و امثال سے شیعہ کے خلاف احتجاج کیا جائے تو ان کے اقوال کا تانا بانا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے ۔ اور اگر ان کے نظائر ناقابل احتجاج ہوں تو اس سے ان دلائل کا بطلان لازم آتا ہے ۔ اس لیے کہ متماثلین کے مابین مساوات ضروری ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ کا منتہائے مقصود صرف خواہش نفس ہے جس کے لیے علم کی چنداں ضرورت نہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (القصص: ۵۰)

''اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے؟ جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو بغیر اللہ کی رہنمائی کے، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

جمہور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما سے افضل ہیں؛ معاویہ رضی اللہ عنہ کی تو بات ہی دور کی ہے ۔ اہل سنت کہتے ہیں: جب مسلمانوں کے مابین آپ کی خلافت کے دور میں اختلاف واقع ہو گیا تو ایک گروہ وہ تھا جو آپ سے برسر پیکار تھے؛ اور دوسرا گروہ آپ کے ساتھ مل کر قتال کر رہا تھا ۔ ان دونوں گروہوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی حق پر تھے ۔ جیسا کہ صحیحین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

''جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہوگا تو ایک فریق خروج کرے گا ۔ انہیں مسلمانوں کی دو جماعتوں میں سے وہ جماعت قتل کرے گی جو اقرب الی الحق ہوگی۔'' [صحیح مسلم باب ذکر الخوارج و صفاتھم (ح: ۱۵۳)]

---

[1] مسند احمد(٤/ ١٩٩)، مستدرك حاكم(٤/ ٣٨٦، ٣٨٧)۔

خروج کرنے والے خوارج تھے۔جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا۔ اس حدیث سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ کی نسبت اقرب الی الحق تھی۔اہل سنت والجماعت علم کی روشنی میں عدل وانصاف کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرتے ہیں۔

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نصرت پر رافضی کا تعجب]:

[اشکال]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:

''یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرا ہوئیں تو دس ہزار مسلمان آپ کی تائید و نصرت کے لیے تیار ہو گئے۔اور جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے گئیں تو کسی ایک شخص نے بھی آپ کے حق میں ایک لفظ تک نہ کہا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: واضح رہے کہ یہ دلیل شیعہ کے حق میں مفید ہونے کے بجائے انکے سخت خلاف ہے[اوران پر ایک بڑی حجت ہے]۔کوئی سلیم العقل آدمی اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں سمجھتا کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے تھے؛ اسی لیے آپ کی بھی تعظیم کرتے تھے اور آپ کے قبیلہ اور بیٹی کی بھی تعظیم کرتے تھے۔آپ کے اقارب خصوصاً آپ کی دختر نیک اختر کا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سب سے زیادہ احترام کرتے تھے؛ اگر آپ رسول نہ بھی ہوتے۔تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اور لوگوں کو اپنی جان و مال آل واولاد سے بڑھ کر محبوب ہیں۔

یہ امر بھی کسی بھی عاقل کے لیے شک و شبہ سے بالا ہے کہ عرب جاہلیت و اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ بنی عبد مناف کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنی تیم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنی عدی سے زیادہ مطیع فرمان تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو ان کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔تو اس نے کہا: بہت بڑا حادثہ پیش آگیا۔آپ کے بعد کون خلیفہ بنا؟ لوگوں نے کہا: ابوبکر رضی اللہ عنہ۔تو ابوقحافہ نے پوچھا: کیا بنومخزوم اور بنوعبد شمس رضا مند ہیں؟'' لوگوں نے کہا، ہاں! ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ خاص عنایت ایزدی ہے۔'' [طبقات ابن سعد(۳/ ۱۸٤)]

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت خلافت ہوئی تو ابوسفیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں آئے اور کہا: ''تمھیں یہ بات پسند ہے کہ خلافت بنوتیم میں ہو؟'' تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا'' ابوسفیان! اسلام کا معاملہ جاہلیت سے مختلف ہے۔''

[سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا مظلوم نہ تھیں]:

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی مسلمان نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مظلوم نہیں سمجھا۔اور نہ ہی کسی نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ کہا کہ: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا ان کے پاس کوئی حق ہے' اور نہ ہی ان دونوں حضرات کو ظالم تصور کیا تھا۔کسی مسلمان نے اس بارے میں ایک لفظ تک زبان پر نہیں لایا۔ بفرض محال اگر مسلمان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی امداد سے قاصر تھے تو آخر بات کرنے میں کیا حرج تھا؟ تو یہ اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ لوگ جانتے تھے کہ آپ پر ظلم نہیں

ڈھایا گیا تھا۔اس لیے کہ اگر لوگوں کو علم ہوتا کہ آپ مظلوم ہیں تو آپ کی نصرت کا ترک کرنا دو میں سے کسی ایک سبب کے بنا پر ہوتا: ا۔ یا تو لوگ آپ کی نصرت سے عاجز آ گئے ہوتے ۔۲۔ یا پھر سستی کی وجہ سے آپ کا حق ضائع کر دیا گیا ہوتا۔
یا پھر بغض کی وجہ سے لوگوں نے ایسا نہیں کیا ہوگا ؟ [یہ سب فرضی احتمالات ہیں]۔

اس لیے کہ انسان اگر کوئی کام نہ بھی کرسکتا ہو؛ پھر بھی جب پختہ ارادہ کر لیتا ہے تو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ اور جب ایسا نہیں کرنا چاہتا؛ حالانکہ اس چیز کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ کام کیا جائے؛ تو پھر اس کا سبب یا تو اس کام [کی اہمیت] سے جہالت ہے یا پھر کوئی ایسی رکاوٹ موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا ارادہ پورا نہیں کر سکتا۔

پس اب اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے شرف' اپنے قبیلہ اور والد محترم کے شرف و احترام کے باوجود مظلوم ہوتیں؛ حالانکہ آپ کے والد محترم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل ترین انسان اور امت کو سب سے بڑھ کر محبوب ہستی ہیں ۔ اور لوگوں کو یہ علم ہو کہ آپ مظلوم ہیں ؛ اور پھر بھی لوگ آپ کی نصرت سے رُکے رہیں ؛ تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو لوگ آپ کی نصرت کرنے سے عاجز آ گئے ہوں ؛ یا پھر آپ کے ساتھ بغض کی وجہ سے آپ کی نصرت کا ارادہ ترک کر دیا ہو۔ یہ دونوں باتیں [فقط احتمال اور] باطل ہیں ۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سارے کے سارے عاجز بھی نہیں آ گئے تھے کہ آپ کی نصرت میں ایک کلمہ تک اپنی زبانوں پر نہ لاسکیں ۔ بلکہ وہ کسی بھی بڑی سے بڑی برائی کو روکنے پر قادر تھے۔

اس پر مزید یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس ضمن میں کسی کی گفتگو پر کان دھرنے سے منکر نہ تھے ۔ وہ طبعاً جابر بھی نہ تھے ۔ نظر بریں یہ کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ الفت و مودّت کے اسباب کی موجودگی میں سب مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر رضی اللہ عنہا کے دشمن بن گئے تھے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال ہے ۔ یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ دورِ جاہلیت و اسلام میں جمہور قریش و انصار کو خصوصاً اور اہل عرب کو عموماً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی شکایت نہ تھی ۔ اور نہ ہی آپ نے اپنے اقارب میں سے کوئی قتل کیا۔ جن لوگوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کیا ان کا تعلق کسی بڑے قبیلہ سے نہیں تھا۔

البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بدوعربوں کے حق میں بڑے سخت تھے ۔ یوں بھی آپ کی شدت و حدّت ضرب المثل کی حد تک معروف تھی ۔ مگر بایں ہمہ آپ خلیفہ منتخب ہوئے اور اس قدر مقبول ہوئے کہ جب شہید ہوئے تو کوئی شخص آپ سے ناراض نہ تھا بلکہ تمام لوگ اچھے الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے تھے اور آپ کے لیے دست بہ دعا تھے ۔ سب لوگوں کو آپ کی شہادت کا صدمہ ہوا۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعہ کے دعوے من گھڑت اور بے بنیاد ہیں ۔ نیز یہ کہ مسلمان سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قطعی طور پر مظلوم تصور نہیں کرتے تھے۔

پھر یہ بات کس قدر حیرت آفریں ہے کہ مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے لیے تو اپنی جانیں تک قربان کر دیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا کوئی یار و مددگار نہ ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ صفین میں بنو عبد مناف کی مخالفت کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نصرت و اعانت کے لیے گردنیں تک کٹوا دیں ؛ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد ان کو منصب خلافت سے الگ کرنے کے لیے کوئی مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دے ۔ حالانکہ بنو عبد مناف ان کے ساتھ تھے ۔ مثلاً عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ، بنی ہاشم میں سب سے بڑے تھے اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ بنو امیہ میں سب سے بڑے تھے ۔ اور یہ دونوں اکابر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف مائل تھے ۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے نازک مرحلہ پر ابتداء ہی میں

لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آرائی کیوں نہ کی ؟ حالانکہ صدیقی خلافت کا ابھی آغاز تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت وحمایت کے لیے لڑنا اولیٰ وافضل تھا؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ولایت کا حاصل ہونا آسان بھی تھا۔ تاریخ اسلام کے ایسے نازک موڑ پر اگر کچھ لوگ سامنے آ کر یہ کہہ دیتے کہ علی رضی اللہ عنہ وصی ہیں، لہٰذا ہم کسی اور کی بیعت کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا ارتکاب نہیں کر سکتے ۔ نیز یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بنو ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر بنو تیم کے ظالموں اور منافقوں کا ساتھ دیں؟ ۔ حالانکہ بنو ہاشم جاہلیت اور اسلام ہر دور میں بہترین لوگ رہے ہیں۔

اگر ایسا ہوتا تو عوام الناس ان کی حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے خصوصاً جب کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ترغیب و تخویف کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ فرض کیجیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امداد کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی ۔ تو یہ لوگ کسی صورت میں بھی تعداد کے اعتبار سے ان لوگوں سے زیادہ نہیں ہو سکتے جو واقعہ جمل میں طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما اور واقعہ صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور اس کے باوصف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی تھی۔ باوجود اس کے کہ یہ لوگ علم و دین کے اعتبار سے حضرات سابقین اولین سے بہت ہی فروتر تھے۔ ان میں سابقین اولین کی بہت کم تعداد تھی ۔ تو پھر اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت حق پر تھے اور ان کے مخالفین باطل پر تھے تو ان لوگوں سے انہوں نے قتال کیوں نہ کیا جو ان کی نسبت بہت زیادہ افضل تھے؟ حالانکہ اس وقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اولیاء وانصار کثرت کے ساتھ ساتھ شان وشوکت سے بہرہ ور تھے؛ اور علم و ایمان میں بھی عظمتوں کے حامل تھے۔ اور آپ کے مخالفین - بالفرض اگر اس وقت کوئی مخالفت تھا - عاجزی و کمزوری کا شکار تھے ؛علم وایمان میں بھی فروتر تھے۔ اور دشمنی میں بھی کم تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہونے میں کیا چیز مانع تھی؟ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر ہوتے تو ابوبکر وعمر اور سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم دنیا کے بدترین لوگوں میں سے ہوتے اور ان کا ظالم و جاہل ہونا کسی شک وشبہ سے بالا ہوتا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے فوراً بعد دین کو بدل دیا' اور اس میں تحریف کر دی ؛ آپ کے وصی پر ظلم کیا ۔ اور آپ کی نبوت کے ساتھ وہ حشر کیا جو یہود ونصاری حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام کی موت کے فوراً بعد نہ کر سکے۔ اس لیے کہ یہودیوں نے موسی علیہ السلام کی موت کے بعد وہ کچھ نہیں کیا جو رافضیوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نبی کی موت کے بعد ایسے کیا۔ ان کے قول میں اگر واقعی سچائی ہوتی تو اس امت کا شمار بدترین اور شریر ترین امتوں میں ہوتا ۔ اور اس کے پہلے لوگ سب سے بڑے شریر ہوتے ۔ حالانکہ یہ بات ظاہر البطلان ہے۔ اور اہل اسلام کے لیے اس عقیدہ ونظریہ کا فساد وخرابی معلوم شدہ چیز ہے۔

[شیعہ مذہب کی بنیاد]:

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ شیعہ مذہب کا بانی ملحد و زندیق اور دین اسلام واہل اسلام کا دشمن تھا۔ اور وہ تاویل کرنے والے مبتدعین مثلاً خوارج وقدریہ کی طرح نہ تھا۔ بعد کے دور میں اہل ایمان میں شیعہ کے اقوال اس لیے رائج ہو گئے کہ وہ جہالت کی بنا پر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز قائم نہ کر سکے۔

یہ بڑا اہم سوال ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کے تحت صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا ساتھ دیا؟ مگر جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اپنا حق طلب کرنے کے لیے آئیں تو

کوئی بھی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے خلاف ان کی مدد کے لیے تیار نہ ہوا؟ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین دنیوی مال ومتاع اور سیاسی اقتدار کے بھوکے تھے تو انھیں بنو ہاشم (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کا ساتھ دینا چاہیے تھا جو عرب بھر میں ممتاز تھے۔ اسی بنا پر صفوان بن اُمیہ جمحی نے غزوہ حنین کے موقع پر جب لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے؛ اور کسی نے کہا: ان کو اب سمندر ہی قبول کرے گا۔ اور کوئی کہنے لگا: سارا جادو ٹوٹ گیا؛ [اس وقت صفوان نے] کہا تھا:

'اللہ کی قسم! اگر کوئی قریشی مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ ثقیف کا کوئی آدمی میرا آقا ہو۔''

جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، صفوان ان میں سرکردہ آدمی تھا وہ سابقہ مقولہ کی طرح یہ بات کہنے کا حق رکھتا تھا۔ اگر بنی عبد مناف کا کوئی شخص مجھے اپنا غلام بنالے تو یہ بات مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ بنی تیم کا کوئی آدمی میرا آقا ہو۔'' اگر اسی بنا پر کسی کو تقدیم حاصل ہوتی تو باتفاق العقلاء بنی ہاشم کو بنی تیم پر تقدیم وسبقت حاصل تھی۔ [تو اس صورت میں] اگر علی رضی اللہ عنہ کو آگے نہ کرتے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنالیتے۔ یہ سوال بھی بے جا نہیں کہ اگر صحابہ دنیوی اقتدار کے حریص تھے تو اس مقصد کے لیے عباس رضی اللہ عنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت موزوں تر تھے، پھر ان کو خلیفہ کیوں نہ بنالیا؟

[فرض کر لیجیے کہ] اگر یہ لوگ ہاشمی وصی پر ظلم کرنے پر تل ہی گئے تھے؛ اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لیے مقدم نہیں کیا وہ اس کو ناپسند کرتے تھے؛ تو پھر بھی جن سے مقصود خلافت حاصل ہوسکتا تھا دوسرے ہاشمی یعنی حضرت عباس رضی اللہ عنہ؛ انہیں مقدم کیا ہوتا' اور خلیفہ بنایا ہوتا۔ آپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتے تھے؛ جو لوگوں کی ایسے مدد نہیں کرسکے جیسے عباس رضی اللہ عنہ کرتے۔ اور انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اس کڑوے حق پر بھی لگاتے۔ اگر اس کڑوے حق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ناپسند کیا جانا تھا؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ ناپسندیدہ لگتا۔ اور اگر اس سے مقصود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس میٹھی اور شیریں دنیا کا حصول تھا؛ تو اس کے مواقع حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے بھی تھے۔ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا؛ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ نے حق پر عمل کیا تھا اور وہ حق وصداقت کا دامن کسی صورت میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور انہوں نے وہ کام کیا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی رہنمائی کی تھی۔ اور صحابہ جانتے تھے کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم پر راضی تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس بات کا واضح اور کھلا ہوا علم حاصل تھا۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قسم کی باتیں سنتے رہتے تھے [جن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر ہوتی تھی]۔ اس تجربہ' مشاہدہ' اور سماع کی روشنی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم وفضیلت اور آپ کے واجب الاطاعت ہونے کا پتہ چل گیا تھا۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''تم میں سے ایک شخص بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا نہیں جس کی خاطر گردنیں کٹوائی جائیں۔''[1]

اس سے مقصود یہ تھا کہ تم پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت ظاہر اور کھلی ہوئی ہے۔ اس میں کسی بحث اور غور وفکر کی ضرورت نہیں۔

ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار کی موجودگی میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔''[2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب رجم الحبلی فی الزنا اذا احصنت (حدیث: ٦٨٣٠)، مطولاً۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لو کنت متخذا خلیلا" (حدیث:٣٦٦٨)، مطولاً۔

تمام لوگوں نے اس کا اقرار کیا؛ کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی کسی ایک نے اس بارے میں کوئی جھگڑا کیا۔ حتی کہ انصار میں سے جو لوگ خلافت کے طلبگار تھے؛ انہوں نے بھی اس دعوے کو رد نہیں کیا؛ نہ ہی کسی ایک نے یہ کہا کہ: نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب تھے: یا کوئی دوسرا آپ کو زیادہ محبوب تھا؛ اور وہ آپ سے افضل و بہتر ہے۔

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ عادتاً یہ بات ممتنع ہے خصوصاً صحابہ کرام کی عادات کے اعتبار سے؛ جو کہ کمال دین اور معرفت حق کی وجہ سے حق بات کہنے کے خوگر تھے؛ کہ ان میں سے کوئی [باقی صحابہ پر] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت جانتا ہو اور پھر اس بارے میں گفتگو نہ کرے؛ بلکہ سارے کے سارے بغیر کسی خوف اور لالچ کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقدیم و فضیلت پر یک زبان تھے۔

فصل:

ازواج النبی رضی اللہ عنہن، سب امہات المومنین تھیں

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کہہ کر پکارتے ہیں جب کہ دیگر امہات المومنین کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے۔ اور ایسے ہی آپ کے برادر محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کے شرف و منزلت اور اپنے باپ اور بہن سے قربت کے باوجود مؤمنین کا ماموں نہیں کہتے؛ جب کہ امیر معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کو مؤمنین کا ماموں کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی بہن ام حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا بھی رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ایک تھیں۔ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بہن اور اس کا باپ معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن اور باپ کی نسبت بہت بڑے اور عظیم مرتبہ والے تھے۔''

[جواب]: ''شیعہ کا دعوی ہے کہ: ''[اہل سنت] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ام المومنین کہہ کر پکارتے ہیں جب کہ دیگر امہات المومنین کو اس لقب سے ملقب نہیں کرتے۔''

ہم کہتے ہیں کہ: یہ کھلا ہوا بہتان ہے اور ہر کس و ناکس اس سے آگاہ ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ یہ شیعہ مصنف اور اس جیسے اس فرقہ کے دوسرے لوگ جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں' یا پھر خواہشات پرستی میں تجاوز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھیں اندھی کردی ہیں کہ ان پر اس بات کا جھوٹا ہونا بھی مخفی رہ گیا۔ وہ نواصب پر رد کرتے ہیں کہ: جب ان سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: کیا تم جانتے ہو کہ میں رسول اللہ ﷺ کی دختر کا جگر گوشہ ہوں؟ ۔ تو وہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! ہم نہیں جانتے۔''

ایسی بات وہی منکر کہا سکتا ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نسب کا انکار کرتا ہو۔ اور جان بوجھ کر جھوٹ گھڑتا اور افتراء پردازی کرتا ہو؛ اور اللہ تعالیٰ نے اتباع ہوا کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندھی کردی ہوں۔ یہاں تک کہ اس پر ایسا واضح حق بھی پوشیدہ رہ جائے۔ بیشک خواہش پرستی کی آنکھ ہمیشہ کے لیے اندھی ہی ہوتی ہے۔

رافضہ حق کے انکار میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں؛ اور جان بوجھ کر اندھے بنے رہتے ہیں۔ فرقہ نصیریہ کہتا ہے کہ حسن و حسین حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے بیٹے نہ تھے۔ بلکہ ان کے والد سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہی جو کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فوت نہیں ہوئے۔ اور ایسا ہی دعوی بعض دوسرے لوگوں کے متعلق بھی کیا گیا ہے۔

بعض شیعہ کا قول ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کے پہلو میں مدفون نہیں ۔ نیز یہ کہ حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کی بیٹیاں نہیں، بلکہ کسی دوسرے خاوند سے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹیاں ہیں ۔'' ❶

اس کے علاوہ بھی انکار حق میں ان کی داستانیں سبھی جانتے ہیں جو ان نواصب کی داستانوں سے بڑھ کر ہیں جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیعہ ان ناصبیوں سے بڑے جھوٹے' بڑے ظالم اور بڑے جاہل ہیں ؛جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔

کسی شخص سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ ازواج النبی میں سے ہر ایک کو آیت قرآنی کے اتباع میں ام المومنین کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ عائشہ؛ حفصہ؛ زینب بنت جحش؛ ام سلمہ؛ سودۃ بنت زمعہ؛ میمونہ بنت الحارث الہلالیہ؛ جویریہ بنت الحارث المصطلقیہ ؛صفیہ بن حیی بن اخطب الہارونیہ؛ رضی اللہ عنہن ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ [الأحزاب ۶]

''پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔''

تمام علماء اس بات کو جانتے ہیں' (کسی پر بھی یہ چیز پوشیدہ نہیں)۔ اور تمام علماء کرام رحمہم اللہ کا اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ان ازواج مطہرات کا نکاح کسی دوسرے انسان سے حرام ہے۔ اور ان کا احترام تمام لوگوں پر واجب ہے۔ پس آپ نکاح کی حرمت اور عزت و احترام کے لحاظ سے مائیں ہیں ۔ محرم ہونے کے لحاظ سے مائیں نہیں۔ ان کے اقارب [محرم] کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ان کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا یا چلنا جائز نہیں ۔ اور نہ ہی ان کے ساتھ اکیلے میں سفر کیا جا سکتا ہے ۔ جیسے کوئی انسان اپنی محرم رشتہ داروں کے ساتھ سفر کر سکتا ہے ۔ اسی لیے انہیں پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ﴾ [الأحزاب ۵۹]

''اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر چادریں لٹکایا کریں۔ اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب ۵۳]

''جب تم نبی کی بیویوں سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو تمہارے اور ان کے دلوں کیلئے کامل پاکیزگی یہی ہے؛ اور تمہیں جائز نہیں ہے کہ تم رسول اللہ کو تکلیف دو اور نہ تمہیں یہ حلال ہے کہ آپ کے بعد کسی وقت بھی

❶ آخری شخص جس نے حضرت رقیہ و ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے اللہ کا دشمن محمد مہدی کاظمی قزوینی ہے۔ موصوف شیعہ مصنف نے اپنی کتاب ''منہاج: ۲/۲۹۱ میں نہ صرف دونوں کے دختر رسول ہونے سے انکار کیا ہے بلکہ وہ ان کی فضیلت وعظمت کا بھی منکر ہے۔

آپ کی بیویوں سے نکاح کرو۔ یاد رکھو اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

ازواج مطہرات عزت و احترام کے لحاظ سے ماں کی منزلت پر ہیں۔ اسی وجہ سے علماء کے یہاں یہ امر متنازع فیہ ہے کہ آیا ازواج النبی کے بھائیوں کو ''ماموں'' کہا جائے یا نہیں؟ بعض نے اسے جائز ٹھہرایا ہے۔ ❶

کچھ لوگوں نے کہا ہے: انہیں ماموں کہا جائے گا۔ اس قول کے مطابق یہ حکم صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص نہیں؛ اس صورت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد اور عبد الرحمن؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے: عبد اللہ؛ عبید اللہ؛ اور عاصم ان میں شامل ہوں گے۔ ان میں عمرو بن الحارث بن ابو ضرار حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے بھائی؛ اور عتبہ بن ابوسفیان اور یزید بن ابو سفیان معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دونوں بھائی بھی شامل ہوں گے۔

بعض علماء اہل سنت والجماعت کہتے ہیں: ازواج مطہرات ﷺ کے بھائیوں کو ماموں نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ اگر انہیں ماموں کہا جائے تو پھر لازم ہوگا کہ ان کی بہنیں خالائیں ٹھہریں گی۔ اگر یہ لوگ ماموں اور خالائیں بن جائیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ خالہ کا نکاح بھانجے سے نہیں ہو سکے گا۔ اور ماموں کا نکاح بھانجی سے حرام ہوگا۔

یہ بات نص اور اجماع سے ثابت ہے کہ مومن مردوں اور عورتوں کے لیے جائز ہے کہ وہ ازواج مطہرات کی بہنوں اور بھائیوں سے نکاح کریں۔ جیسا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ام المؤمنین میمونہ بنت الحارث کی بہن ام الفضل سے شادی کی تھی؛ اور ان سے حضرت عبد اللہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے۔ عبد اللہ بن عمر؛ عبید اللہ بن عمر؛ اور عاصم بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین نے بھی مؤمن عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ ایسے ہی معاویہ؛ عبد الرحمن بن ابو بکر؛ محمد بن ابو بکر؛ [اور دوسرے افراد] رضی اللہ عنہم اجمعین نے اہل ایمان عورتوں سے شادیاں کی تھیں۔ اگر یہ حضرات ان خواتین کے ماموں ہوتے؛ تو ماموں کے لیے ہرگز جائز نہ تھا وہ اپنی بھانجی سے نکاح کرے۔

ایسے ہی امہات المؤمنین کی ماؤں کو مؤمنین کی نانیاں اور ان کے باپوں کو نانا نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ امہات المؤمنین کے حق میں نسب کے تمام احکام ثابت نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی حرمت اور تحریم ثابت ہے۔ نسب کے احکام بہت سارے ہیں۔ [اس کا یہی حال ہے] جیسے دودھ پینے سے حرمت اور تحریم تو ثابت ہوتی ہے مگر اس سے نسب کے سارے احکام ثابت نہیں ہوتے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

جن لوگوں نے ان میں سے کسی ایک کے لیے مؤمنین کے ماموں ہونے کا کہا' اس نے ان باقی احکام میں کوئی تنازع نہیں کیا۔ مگر ان کا قصد یہ تھا کہ وہ ثابت کریں کہ ان حضرات کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سسرالی رشتہ ہے۔ ان میں سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زیادہ مشہور ہو گئے۔ جیسے کاتبین وحی دوسرے لوگ بھی تھے' مگر آپ کو کاتب وحی مشہور کیا گیا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ سواری پر پیچھے بیٹھنے والے دوسرے لوگ بھی تھے۔ [مگر حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اس میں زیادہ مشہور ہیں]۔

---

❶ [یہ جاہل اہل سنت کا قول ہے اور وہ شیعہ کو چڑانے کے لیے اس طرح کہتے ہیں ورنہ دونوں میں کوئی فرق نہیں]۔ چونکہ شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی عظمت وفضیلت کے منکر تھے اور اس میں وہ حد درجہ تجاوز کر گئے تھے اس کا ردعمل یہ ہوا کہ لوگوں نے حضرت معاویہ کو اس لقب (خال المومنین) سے نوازا۔ قاضی ابوبکر بن العربي المتوفی (۴۶۸.....۵۴۳) لکھتے ہیں کہ انھوں نے عباسی خلافت کے زمانہ یعنی پانچویں صدی کے نصف ثانی اور چھٹی صدی کے نصف اول میں بغداد کی مساجد کے دروازوں پر یہ الفاظ لکھے ہوئے بچشم خود مشاہدہ کیے تھے۔ نبی ﷺ کے بعد سب لوگوں سے بہتر ابوبکر ہیں، پھر عمر، پھر عثمان، پھر علی اور پھر مومنوں کے ماموں معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (العواصم من القواصم، ص: ۲۱۳)

جو لوگ ایسا کلام کرتے ہیں' ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیات بیان کریں؛ بلکہ وہ آپ کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ تعلق بیان کرنا چاہتے ہیں [کیونکہ رافضی اس کے منکر ہیں]۔ جس طرح آپ کے باقی فضائل بیان کیے جاتے ہیں' ان سے مقصود آپ کی خصوصیات بیان کرنا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کل میں جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔'' [البخاري ٥/ ١٨؛ مسلم ٤/ ١٨٧١]

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی امی ﷺ نے مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ مجھ سے محبت صرف وہی انسان رکھے گا جو مؤمن ہوگا اور مجھ سے بغض وہی رکھے گا جو منافق ہوگا۔'' [تقدم تخریجه]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔ بس اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔'' [البخاري ٥/ ١٩؛ مسلم ٤/ ١٨٧١]

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیات نہیں ہیں' بلکہ آپ کے فضائل و مناقب ہیں جن کی وجہ سے آپ کی فضیلت پہچانی جاتی ہے۔ یہ روایات اہل سنت کے ہاں مشہور ہیں تاکہ ان سے ان لوگوں پر رد کریں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح کرتے ہیں اور آپ کو ظالم اور کافر کہتے ہیں جیسے خوارج اور نواصب اور بعض دیگر لوگ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی رسول اللہ ﷺ کی صحبت میسر آئی ہے' اور آپ کے ساتھ خانگی تعلق بھی ہے۔ جب روافض نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی تکفیر اور ان پر لعنت بھیجنے کی اجازت دے دی تو بعض اہل سنت نے آپ کو ''خال المومنین'' کے لقب سے ملقب کیا۔ تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کا تعلق لوگوں کو یاد دلائیں۔ اور اس طرح سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کے حقوق کا ان کے درجات کے حساب سے خیال رکھا جائے۔

اگر اس قدر کوئی انسان اجتہاد کرے اور خطاء کا ارتکاب کر جائے؛ تو وہ یقیناً اس انسان سے بہت بہتر ہوگا جو ان کے ساتھ بغض کرنے میں اجتہاد کرے اور غلطی کا مرتکب ہو۔ اس لیے کہ لوگوں کے ساتھ احسان کرنا اور معاف کر دینا برائی کرنے اور بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

''شبہات کی وجہ سے حدود کو ختم کرو۔'' [ضعيف الجامع الصغير ١/ ١١٧؛ للألباني۔]

ایسے ہی وہ مجہول جو فقیر ہونے کا دعویٰ کرے' اسے صدقہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دو آدمیوں کو دیا تھا جنہوں نے آپ سے سوال کیا تھا۔ [آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگاہ اٹھا کر ان کو دیکھا پھر نظر جھکا لی]؛ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پایا کہ یہ دونوں آدمی تندرست جوان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر تم چاہو تو میں تم کو صدقہ دے دوں گا لیکن صدقہ میں اس شخص کا کوئی حق نہیں جو غنی ہو یا صحت مند ہو اور کمانے کے لائق ہو۔'' [سنن ابو داؤد: ح ١٦٢٩]

اس لیے کہ مال دار کو دینا فقیر کو محروم رکھنے سے بہتر ہے۔اور مجرم کو معاف کرنا بری انسان کو سزا دینے سے بہتر ہے۔
جب یہ لوگوں میں سے کسی ایک عام انسان کے بارے میں ہے تو نبی کریم ﷺ کے صحابہ اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اگر کوئی مجتہد صحابہ کیساتھ احسان ؛ ان کے لیے بھلائی کی دعا؛ ان کی تعریف وثناء اوران کا دفاع کرتے ہوئے غلطی کا مرتکب ہوجائے تو وہ اس انسان سے [لاکھ درجہ] بہتر ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر طعن و تشنیع ٗ لعنت و ملامت کرنے میں غلطی کا مرتکب ہو۔

صحابہ کرام کے مابین جو جھگڑے ہوئے ؛ ان کی آخری حد یہ ہوسکتی ہے کہ وہ گناہ کا کام تھے۔گناہوں کی مغفرت کئی اسباب کی بنا پر ہوجاتی ہے۔اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بعد میں آنے والے باقی لوگوں سے بڑھ کر اس مغفرت کے حق دار ہیں۔ آپ کسی ایک کو بھی ایسا نہیں پائیں گے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی لغزشوں کو بڑا بنا کر لوگوں میں پیش کررہا ہو ٗ مگر وہ خود اس سے بہت بڑی خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑی جہالت اور بہت بڑا ظلم ہے۔

رافضی چھوٹے گناہوں اور لغزشوں کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر زبان طعن دراز کرتے ہیں؛ مگر ان کفار اور منافقین کے کبیرہ گناہوں سے چشم پوشی کرتے ہیں جن کی یہ لوگ مدد کرتے ہیں۔ جیسے یہود و نصاری؛ مشرکین؛ اسماعیلیہ؛ نصیریہ وغیرہ۔ پس جو کوئی مسلمانوں کے ساتھ ان کے گناہوں پر تو تکرار کرے ؛ مگر کفار اور منافقین کے ساتھ ان کے کفر و نفاق پر بھی خاموش رہے؛ بلکہ اکثر و بیشتر اوقات ان کفار و منافقین کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہے ٗ تو ظاہر ہے کہ ایسا انسان لوگوں میں سب سے بڑا جاہل اور ظالم ہے۔ بھلے اس کی جہالت اور ظلم و ستم اسے درجہ کفر تک نہ بھی پہنچائیں۔

شیعہ کے تناقض اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس نے یہ تو کہا ہے کہ: معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگ اہل ایمان کا ماموں کہتے ہیں مگر محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں یاد نہیں کرتے۔[ہم شیعہ مضمون نگار سے پوچھتے ہیں کہ]اس نے باقی ان لوگوں کا ذکر کیوں نہیں کیا جو اس وصف میں برابر کے شریک ہیں۔اس نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا [جو معاویہ اور محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہما دونوں سے افضل تھے] اور ان جیسے دوسرے لوگوں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ اہل سنت والجماعت اس وصف کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خصوصیات میں شمار نہیں کرتے۔جبکہ رافضی اس کے مقابلہ میں محمد بن ابو بکر کو خاص طور پر پیش کرتے ہیں۔ جب کہ اسے علم و دین [تقوی اور زہد] میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ بلکہ وہ اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما کے برابر بھی نہیں ہے۔ حضرت عبد الرحمن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما کو صحبت رسول اللہ ﷺ کا شرف حاصل ہے۔جبکہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حجۃ الوداع والے سال ذوالحلیفہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ تو نبی کریم ﷺ نے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ: حالت نفاس میں ہی غسل کریں اور احرام کی نیت کرلیں۔بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے یہ عمل ایک سنت بن گیا۔

محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے صرف پچیس ذوالحجہ سے لیکر ربیع الاول کے شروع تک کے ایام پائے ۔ یہ چارہ ماہ بھی نہیں بنتے۔جب آپ کے والد محترم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر تین سال سے بھی کم تھی۔آپ کو نبی کریم ﷺ کا صحابی ہونے کا شرف حاصل نہیں۔اور نہ ہی باپ کی منزلت سے کوئی قربت حاصل ہے۔بس صرف اتنی ہی قربت تھی جو اس عمر کے کسی بھی بچے کو اپنے باپ سے ہوتی ہے۔

محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص ہونے کی وجہ یہ تھی کہ محمد آپ کے پروردہ اور آپ کی بیوی کے بیٹے تھے ۔اس لیے کہ حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کی بیوی اور محمد کی ماں اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کرلیا تھا۔عثمانی خلافت کے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محمد بن ابی بکر پر شرعی حد لگائی تھی؛ جس کا محمد نے اپنے باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی منزلت کی وجہ سے اپنے دل میں ملال محسوس کیا۔یہی وجہ تھی کہ جب اہل فتنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تو یہ بھی ان کیساتھ تھا۔ بلکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہوا اور ان کی داڑھی پکڑی۔تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تم نے بہت بڑی جگہ ہاتھ ڈالا ہے؛ تمہارا باپ اس داڑھی کو کبھی ہاتھ لگانے والا نہیں تھا۔کہا جاتا ہے: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات کہے تو محمد واپس چلا گیا۔جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا وہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔

پھر اس نے مختلف جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ آپ کی جانب سے والی مصر قرار پایا۔ پھرلڑائی میں مارا گیا۔شیعان عثمان نے اسے قتل کیا؛ اورنعش گدھے کی کھال میں بند کرکے جلا دی گئی؛ اسے قتل کرنے والا معاویہ بن حدیج نامی شخص تھا۔[اور اس طرح اسکے گناہوں کا کفارہ ہوگیا اور قتل اسکے حق میں بہتر ثابت ہوا]۔

روافض کی یہ پرانی عادت ہے کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں کی مدح وستائش میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاونین کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔اسی عادت کے مطابق وہ محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں۔جس کی حد یہ ہے کہ وہ محمد کو ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں افضل قرار دیتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل امت پر تو لعنت بھیجی جائے اوران کے اس بیٹے کی مدح وستائش میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جائیں جس کوصحبت نبوی حاصل ہے نہ کوئی سبقت اور فضیلت۔اس سے تعظیم فی الانساب میں تناقض لازم آتا ہے۔اگر کسی شخص کے والد کے کافر یا فاسق ہونے سے اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا تو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے آباء کے کافر ہونے کی بنا پر کچھ ضرر لاحق نہیں ہوگا۔اور اگر ضرر پہنچتا ہے تو (العیاذ باللہ) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کفر وفسق سے یقیناً محمد بن ابی بکر کی ذات میں بھی قدح وارد ہوگی۔شیعہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مداح ہیں۔ادھر جمہور اہل اسلام محمد کے بیٹے قاسم [1] اور اس کے پوتے عبدالرحمن بن قاسم کو اس سے افضل قرار دیتے ہیں۔شیعہ محمد کے بیٹے قاسم اور پوتے عبدالرحمن کو صرف اس لیے نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ شرارت پسند نہ تھے۔

[**اشکال**]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''محمد بن ابی بکر عظیم المرتبت تھا۔''

[**جواب**]: اگر عظمت سے مراد عظمت نسب ہے؛ تو یہ بے کار ہے۔اس لیے کہ شیعہ اس کے والد اور بہن کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے ہیں۔اہل سنت کا معاملہ اس سے یک سر جداگانہ نوعیت کا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں عظمت وفضیلت کا مدار وانحصار نسب پر نہیں، بلکہ تقوی پر ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ﴾ (الحجرات:۱۳)

---

[1] قاسم بن محمد فقہائے سبعہ اور ان فضلاء میں سے تھے جو شریعت وسنت کی عمارت کے لیے ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ابو الزناد عبداللہ بن ذکوان جو امام مالک ولیث بن سعد رحمہ اللہ کے استاد تھے،فرماتے ہیں کہ:''میں نے قاسم سے بڑھ کر عالم حدیث نہیں دیکھا۔''

''تم میں سب سے زیادہ باعزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

اگر شیعہ مصنف کے نزدیک محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی عظمت شان اس کی سبقت اسلام اور ہجرت و نصرت کی رہین منت ہے۔ تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ محمد صحابہ میں شمار نہیں ہوتا۔ وہ مہاجرین و انصار صحابہ کے کسی بھی گروہ میں شامل نہیں۔

اور اگر رافضی قلم کار محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑا دین دار تصور کرتا ہے تو وہ غلطی کا شکار ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ محمد علماء و فضلاء اور اپنے طبقہ کے صلحاء میں شمار نہیں ہوتا۔ اور اگر جاہ و منزلت اور ریاست کی بنا پر رافضی مضمون نگار اسے عظیم قرار دیتا ہے تو اس فضیلت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ صاحب جاہ و منزلت؛ اور صاحب ریاست تھے۔ اور اس سے بڑھ کر دین دار اور زیادہ حلیم و کریم تھے۔ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے یہ فضیلت کم ہے کہ آپ حدیثیں روایت کرتے اور فقہی مسائل پر تنقید و تبصرہ فرمایا کرتے تھے۔ محدثین نے آپ کی روایات اپنی کتب میں درج کی ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے فیصلہ جات اور فتاویٰ جمع کیے ہیں، اس کے عین برخلاف حدیث و فقہ کی قابل اعتماد کتب میں محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔

[**اشکال**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''محمد بن ابی بکر کا باپ اور اسکی بہن معاویہ کے باپ اور اسکی بہن سے افضل تھے۔''

[**جواب**]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ دلیل سابقہ ذکر کردہ دونوں قاعدوں کی بنا پر باطل ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ اہل سنت کے یہاں کسی شخص کی فضیلت کا معیار حسب و نسب نہیں، بلکہ اس کی اپنی ذات ہے۔ نظر بریں محمد کے لیے یہ امر ذرہ بھر مفید نہیں کہ وہ حضرت ابوبکر و عائشہ رضی اللہ عنہما سے قریبی تعلق رکھتا ہے، دوسری طرف یہ نسبی فضیلت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں کچھ بھی قدح وارد نہیں کرتی۔ اہل سنت کے یہاں یہ معروف اصل ہے۔

اس قاعدہ کو ایک مثال کے ذریعہ یوں واضح کر سکتے ہیں کہ حضرت بلال و صُہیب و خباب رضی اللہ عنہم اجمعین اور ان کے نظائر و امثال وہ لوگ ہیں جو سابقین اوّلین صحابہ میں شامل ہیں اور فتح مکہ سے قبل انفاق و جہاد کے ذریعے عظیم انسانی و اسلامی خدمات انجام دے چکے تھے۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔ مثلاً ابوسفیان بن حرب اور آپ کے دونوں بیٹے معاویہ و یزید رضی اللہ عنہم اجمعین۔ نیز ابوسفیان بن حارث؛ ربیعہ بن حارث اور عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ حسب و نسب کے اعتبار سے پہلے لوگوں کے مقابلہ میں افضل ہیں؛ یہ لوگ قریش کے بنو عبدالمطلب کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ شرافت نسبی سے بہرہ ور نہیں۔ مگر ان کی فضیلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے؛ جس کی وجہ فتح سے قبل اسلام لانا؛ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ اس لیے جو فضیلت ان لوگوں کے حصہ میں آئی؛ دوسرے اس میں شریک نہیں ہیں جو بعد میں ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کے شرف سے باریاب ہوئے۔ [اگر فضیلت و شرافت کا مدار حسب و نسب پر ہوتا تو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے یہ قریش سب سے زیادہ افضل و اکرم ہوتے]۔

اگر روافض حسب و نسب کو فضیلت کا معیار قرار دیں تو محمد ان کے اس معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ بلکہ وہ ان کے وضع کردہ قاعدہ کی بنا پر شرّ الناس ٹھہریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ محمد کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمشیرہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اپنے قاعدہ کے مطابق محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ عظیم

المرتبت نہیں ہو سکتے۔ اور اگر شیعہ اہل سنت کو قائل کرنے کے لیے الزامی جواب کے طور پر محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ بات کہتے ہیں تو اہل سنت تو صرف تقویٰ کو معیار عظمت و شرافت قرار دیتے ہیں اور بس! جس کی دلیل یہ آیت قرآنی ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاكُمْ﴾

''تم میں سب سے زیادہ باعزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

فصل:

[کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات اور ان کے جوابات]

[پہلا اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طلیق بن طلیق (جو لوگ فتح مکہ کے دن اسلام لائے ان کو طلیق کہتے ہیں اس کی جمع طلقاء ہے) معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کی اور فرمایا: جب اسے میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دو۔'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تألیف قلب رکھنے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی جب کہ آپ امام برحق تھے۔ اور جو کوئی بھی امام برحق سے جنگ کرتا ہے' وہ ظالم اور باغی کہلاتا ہے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی کا لقب دیا حالانکہ اس نے وحی کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا وہ صرف خطوط لکھا کرتا تھا۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چودہ افراد وحی لکھنے پر مامور تھے۔ ان میں سب سے پہلے' سب سے خاص اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین شخص حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حالانکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا سارا وقت برابر مشرک رہے؛ وحی کو جھٹلایا کرتے اور اللہ کی وحی اور شریعت کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: رافضی مصنف نے جو کہا ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ پر لعنت کی اور فرمایا: جب اسے میرے منبر پر دیکھو تو قتل کر دو۔''

یہ حدیث کسی بھی نقل و روایت کے اعتبار سے معتمد اسلامی کتاب میں نہیں ہے۔ [1] حفاظ حدیث اسے جھوٹ کہتے ہیں؛ جسے اپنی طرف سے گھڑ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ رافضی [کٹھ ملّے] نے اس کی کوئی سند ذکر نہیں کی تاکہ اس پر تحقیق کی جا سکے۔ محدث ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ جس چیز سے رافضی کا جھوٹ کھل کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد ایسے لوگ بھی آپ کے منبر پر چڑھے جو باتفاق مسلمین معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی بدتر تھے؛ اگر صرف منبر پر چڑھنے کی وجہ سے قتل کیا جانا واجب تھا تو پھر کیا ان تمام کا قتل واجب ہو گیا تھا؟۔ [اور انہیں قتل نہ کیا جا سکا]۔ [یہ بات ادنیٰ علم و عقل رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں] کہ ایسا کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ صرف منبر پر چڑھنے سے کسی کا قتل کرنا جائز نہیں ہو جاتا۔

اور اگر اس وجہ سے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا ہو کہ آپ خلیفہ بن گئے تھے اور اس منصب کے قابل نہیں تھے۔ تو پھر اس سے واجب لازم آتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد جتنے بھی لوگ مسند خلافت پر متمکن ہوئے انہیں قتل کر دیا جائے؛ اس لیے کہ

[1] حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو منبر رسول پر دیکھا تھا اور آپ کی اقتداء میں نماز بھی پڑھی اس لیے کہ آپ شرعی امام اور نائب رسول تھے۔ اگر یہ قتل بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واجب تھا تو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اس کی تعمیل نہ کر کے گنہگار ٹھہرے' پھر معصوم نہ رہے۔

معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے افضل تھے۔ یہ بات تواتر کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے منقول سنن کے خلاف ہے۔آپ حکمرانوں کو قتل کرنے اور ان کے ساتھ جنگ کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ امت اس نظریہ کے برعکس متفق ہے۔اس لیے کہ امت نے کسی بھی خلیفہ بننے والے کو قتل نہیں کیا۔اور نہ ہی اس کو جائز و حلال سمجھا۔کیونکہ اس کے نتیجہ میں وہ قتل و غارت گری اور دنگا و فساد پیدا ہوتے ہیں؛ جو کہ ظالم حکمران کے ظلم پر صبر کرنے سے بڑھ کر نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں ۔تو پھر نبی کریم ﷺ کسی ایسی چیز کا حکم کیونکر دے سکتے ہیں جس کا نقصان اس کے فائدہ سے بڑھ کر ہو؟

[دوسرا اعتراض]: باقی رہا رافضی کا [حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں] قول ''طلیق بن طلیق''۔

[جواب]: اس میں مذمت کی کوئی بات نہیں۔اس لیے کہ فتح مکہ کے روز جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، انھوں نے خلوص دل سے دین کو قبول کیا تھا۔رسول اللہ ﷺ نے [انہیں قیدی نہیں بنایا تھا بلکہ] سب کو آزاد کر دیا تھا۔ان کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ تھی۔ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے ؛ مثلاً حارث بن ہشام اور ان کا بھتیجا حضرت عکرمہ، سہیل بن عمرو [1] صفوان بن امیہ، یزید بن ابی سفیان، حکیم بن حزام؛ ابو سفیان ابن الحارث ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد تھے ؛ یہ پہلے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ اور عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کا والی مقرر کیا۔ان کے نظائر و امثال یہ سب لوگ خالص الاسلام تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو دل کی سچائی سے اسلام لائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے بعد ان کو والیٔ شام مقرر کیا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ

---

[1] سہیل بن عمرو خطیب قریش تھا اور بنی عامر بن لوی کے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کا سفیر بن کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، فتح مکہ کے دن جب آپ نے اہل مکہ کو خطاب کر کے کہا تھا: ''تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟'' تو وہ سہیل ہی تھا جس نے یہ جواب دیا: ''ہم بھلائی کی توقع رکھتے ہیں، کیوں کہ آپ اچھے بھائی اور اچھے بھتیجے ہیں۔'' نبی ﷺ نے جواباً فرمایا: میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے کہی تھی، آج تم پر بھی کچھ عتاب نہیں۔'' (ابن زنجویه فی الاموال، الاصابة(۲/۹۵) طبقات ابن سعد(۷/۱۲٦) نبی ﷺ نے تالیف قلب کے طور پر سہیل رضی اللہ عنہ کو سو اونٹ عطا کیے۔(مستدرك حاكم(۳/۲۸۱)، وانظر الاصابة(۲/۹۵)، مسند احمد(۳/۲٤٦)

خلافت فاروقی میں مہاجرین و انصار حضرت عمر کے دروازہ پر کھڑے تھے اور آپ انھیں مقام و مرتبہ کے مطابق باری باری اندر بلاتے جاتے تھے۔اس موقع پر فتح مکہ کے دن مسلمان ہونے والے چند صحابہ بھی موجود تھے، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، سہیل بن عمرو نے یہ دیکھ کر کہا تم خود قصوروار ہو، جب نبی کریم ﷺ نے دعوت اسلام دی، تو انھوں نے جلدی اس دعوت پر لبیک کہا اور تم نے دیر لگا دی اب اسی تاخیر کا خمیازہ بھگت رہے ہو، جب جنت کے دروازوں کی جانب دعوت دی جائے گی تو اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔'' یہ کہہ کر سہیل جہاد کے لیے روانہ ہوئے اور کہا اللہ کی قسم! میں نے جتنی لڑائیاں کفار کے ساتھ ہو کر لڑی ہیں اب اسی قدر مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے لڑوں گا، اور جتنا مال میں نے کفر کی حمایت میں صرف کیا تھا اتنا ہی مسلمانوں پر خرچ کروں گا۔'' (مستدرك حاكم(۳/۲۸۱)، معجم كبير طبرانی(٦۰۳۸)، و فی اسناده انقطاع)

امام شافعی رحمہ اللہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: جب سے اسلام لائے اسی وقت سے خالص الاسلام تھے۔ جن لوگوں کو شیعہ اور انکے اتباع طنزاً ''طلقاء'' کہہ کر پکارتے ہیں ان کے بارے میں انھیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ اولیاء اللہ و اصحاب رسول میں سے تھے، ان میں بعض لوگ سہیل بن عمرو سے بھی افضل اور جہاد میں پیش پیش تھے۔ان کے سرخیل حضرت معاویہ اور ان کے بھائی تھے، جن کے اسلام پر بڑے احسانات ہیں۔ حضرت معاویہ کی چھوٹی سے چھوٹی فضیلت یہ ہے کہ آپ اوّلین اسلامی بحری بیڑے کے بانی اور پہلے شخص تھے جس نے سمندر میں بحری جنگ کا آغاز کیا۔سرور کائنات ﷺ نے مقام قباء میں جو خواب دیکھا تھا اس میں آپ نے اس پیشین گوئی کا اظہار فرمایا۔(صحیح بخاری۔ کتاب الاستئذان، باب من زار قوما فقال عندهم، (حدیث: ٦۲۸۲)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارة، باب فضل الغزو فی البحر (حدیث: ۱۹۱۲)۔

طرف داری کرنے والے نہ تھے اور نہ انھیں کسی کی ملامت کی پرواہ تھی۔ یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما بہترین مسلمانوں میں سے تھے۔ آپ کا شمار ان جرنیلوں میں ہوتا ہے جنہیں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے شام فتح کرنے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ ان جرنیلوں میں یزید بن ابوسفیان' شرحبیل بن حسنہ؛ عمرو ابن العاص؛ ابوعبیدہ بن جراح اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ جب یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ ان کے بھائی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس علاقہ پر والی مقرر فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ہی آپ ولایت سے محبت رکھنے والے تھے۔ مزید برآں معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کے دوستانہ مراسم بھی نہ تھے۔ بلکہ اسلام سے پہلے ابوسفیان کے بڑے دشمنوں میں سے ایک تھے۔ یہاں تک کہ جب فتح مکہ کے موقع پر جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو بارگاہ نبوی میں لائے تھے تو آپ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ [1] اسی بنا پر آپ کے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ تلخ گفتگو بھی ہوئی۔ کیونکہ عمر رضی اللہ عنہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے بہت زیادہ بغض رکھتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کرنا کسی دنیاوی لالچ کی وجہ سے نہ تھا۔ اگر آپ امیر بنائے جانے کے مستحق نہ ہوتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی بھی آپ کو امیر نہ بناتے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دمشق اور دیگر بلاد شام میں بیس سال تک امیر اور بیس سال تک خلیفہ رہے۔ آپ کی رعایا آپ کے حسن سلوک، تالیف قلب اور خوبیٔ انتظام و انصرام کی مداح تھی اور آپ پر جان چھڑکتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ صفین میں انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نظائر و امثال سے افضل و اولیٰ بالحق تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے فوجی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے معترف تھے۔ اور سبھی اس بات کے معترف تھے کے خلافت کے حق دار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ آپ کی فضیلت کا انکار صرف اسی کو ہوسکتا ہو جو حق کے سامنے سرکش اور خواہشات نفس کے سامنے اندھا ہو۔

ادھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی مسئلہ تحکیم سے پہلے کبھی بھی اپنی ذات کے لیے خلافت کی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی آپ کو امیر المؤمنین کہا جاتا تھا۔ آپ نے تحکیم کے بعد خلافت کی طلب کی۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں کئی ایک لوگ ایسے تھے جو یہ سوال اٹھاتے تھے: ہم علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیوں کریں؟ جب کہ آپ کو نہ ہی سابقت اسلام کا شرف حاصل ہے' اور نہ ہی کوئی دیگر ایسی فضیلت؛ اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دامادی کا شرف [جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہے]۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس چیز کا اعتراف کیا کرتے تھے۔ تاہم اسکے باوجود انھوں نے جنگ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ شامل ہیں جنھوں نے سراسر ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ اور وہ اب ان سے اس سلوک کا بدلہ لینا چاہتے تھے جو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا ہے۔ لڑائی کا آغاز کرنے والے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے اور حملہ آور سے لڑنا روا ہے۔ یہ لوگ اس وقت تک نہ لڑتے تھے جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر سے لوگ ان پر حملہ نہ کردیتے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سرگرم معاون اشتر نخعی نے کہا تھا: ''لوگ ہمارے مخالفین کی مدد کرتے ہیں کیوں کہ ہم نے لڑائی کا آغاز کیا ہے۔''

[1] سیرة ابن هشام (٥٤٣-٥٤٥)۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے لشکر میں موجود قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی سرکوبی سے قاصر تھے۔ علاوہ ازیں آپ کے امراء و اعوان آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے، اس کے برعکس حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء آپ کے مطیع فرمان تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ جنگ سے مسئلہ حل ہو جائے گا؛ مگر نتیجہ آپ کی سوچ کے برعکس نکلا۔ [اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ] حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں ایسے لوگ بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم کا الزام لگاتے تھے؛ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس چیز سے بالکل بری تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں سے طالبین حق یہ بھی کہتے تھے: ''ہم صرف اس آدمی کی ہی بیعت کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرے؛ اور ہم پر ظلم نہ کرے۔''

اگر ہم علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کریں گے تو ہم پر ان کا لشکر ایسے ہی ظلم کریگا؛ جیسے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم کیا۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرنے سے عاجز آ گئے ہیں؛ یا پھر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے۔ تو پھر ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ایسے انسان کی بیعت کریں جو ہمارے ساتھ عدل و انصاف کرنے سے عاجز آ گیا ہو یا پھر اس نے عدل و انصاف کرنا ہی ترک کر دیا ہو۔

ائمہ اہل سنت والجماعت جانتے ہیں کہ یہ قتال نہ ہی مامور بہ تھا' نہ ہی واجب تھا اور نہ ہی مستحب۔ لیکن اس انسان کا عذر مقبول ہے جس نے اجتہاد کیا اور غلطی کا شکار ہو گیا۔

[تیسرا اعتراض]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تالیف قلب والوں میں سے تھے۔''

[جواب]: درست بات ہے؛ فتح مکہ پر بہت سارے آزاد کردہ لوگ تالیف قلب والوں میں سے تھے۔ جیسے حارث بن ہشام؛ عکرمہ بن ابو جہل؛ سہیل بن عمرو؛ صفوان بن امیہ؛ حکیم بن حزام؛ یہ لوگ بہترین مسلمانوں میں سے تھے۔ تالیف قلب والوں کی اکثر تعداد بعد میں بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ ایسا ہوتا تھا کہ صبح کے وقت کوئی انسان دنیا کی لالچ میں مسلمان ہوتا؛ مگر شام ہونے تک اس کی حالت یہ ہوتی کہ اسلام اس کے لیے روئے زمین کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب ہو گیا ہوتا۔

[کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی تھے؟]:

[چوتھا اعتراض]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے: ''معاویہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف صف آراء ہوئے، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل سنت کے نزدیک چوتھے خلیفہ برحق تھے اور جو شخص خلیفہ برحق سے لڑتا ہے وہ باغی اور ظالم ہوتا ہے۔''

[جواب]: پہلی بات: ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں: باغی بعض اوقات بنا بر تاویل اپنے آپ کو حق پر تصور کرتا ہے۔ بعض دفعہ اس کی بغاوت جان بوجھ کر [بغیر تاویل کے] ہوتی ہے۔ اور کبھی محرک اس کی تاویل بازی، شہوت نفس یا کوئی شک و شبہ ہوتا ہے؛ اکثر بغاوت کی یہی وجہ ہوتی ہے۔ بہر کیف یہ اعتراض سرے سے اہل سنت والجماعت کے عقیدہ پر وارد ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بلکہ ان سے افضل لوگوں کو بھی گناہوں سے پاک تصور نہیں کرتے۔ چہ جائے کہ انہیں اجتہاد میں خطاء سے مبرا و منزہ سمجھیں۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کہتے ہیں:

''گناہوں کی سزا معاف ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں: توبہ و استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ کفارہ بننے والے مصائب؛ اور ان کے علاوہ دیگر امور۔''

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور دوسرے لوگوں کے لیے عام ہے۔

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ تاریخ میں مشہور ہے؛ آپ چھوٹے صحابہ میں سے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مسور رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ خلوت نشین تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: آپ مجھ میں کیا عیب دیکھتے ہیں؟ مسور رضی اللہ عنہ نے چند امور کا ذکر کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے مسور! کیا آپ سے کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں؟'' کہا: ''ہاں۔''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا تمھیں مغفرت کی امید ہے؟'' مسور نے کہا: ''ہاں! کیوں نہیں''

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا'' تم مجھ سے زیادہ رحمت الٰہی کے امیدوار کیوں کر ہوئے؟'' اللہ کی قسم! مجھے جب بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے سوا کسی دوسری چیز میں اختیار دیا گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ترجیح دی۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ: جہاد، اقامت حدود، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں میرے اعمال کا پلڑا آپ سے بھاری ہے۔ علاوہ ازیں میں ایسے دین پر عمل پیرا ہوں جس کا اللہ حسنات کو قبول کرتا اور سیئات سے درگزر کرتا ہے۔'' تو پھر کس چیز کی بنا پر آپ مجھ سے زیادہ اللہ کی رحمت کے طلب گار ہوئے؟[1] حضرت مسور رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ گفتگو میں مجھ پر غالب آ گئے۔''

دوسری بات: ان سے یہ بھی کہا جائے گا کہ: اس باب میں اہل سنت والجماعت اس صحیح اور سیدھی سادی اصل پر قائم ہیں۔ جب کہ آپ کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر خوارج ونواصب اور دوسرے لوگ [معتزلہ مروانیہ وغیرہ] جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر و فاسق اور ظالم کہتے ہیں؛ اور آپ کے عادل ہونے میں شک کرتے ہیں؛ اگر شیعہ حضرات سے پوچھیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحب ایمان و امام اور عادل ہونے کی کیا دلیل ہے؟

تو تم شیعہ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوسکتی۔ آپ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا مشرف بہ اسلام ہونا اور آپ کی کثرت عبادت تواتر سے ثابت ہے۔

اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ: یہ تواتر صحابہ و تابعین ؛ خلفاء ثلاثہ ؛ خلفاء بنو امیہ؛ جیسے معاویہ ؛ یزید اور عبدالملک رحمہم اللہ وغیرہ سے بھی ثابت ہے۔ جب کہ تم ان کے ایمان پر زبان طعن دراز کرتے ہو۔ ہمارا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے ایمان پر قدح کرنا تمہارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان پر قدح کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔ جن کی شان میں تم قدح کرتے ہو وہ ان سے بڑھ کر اور زیادہ عظمت والے ہیں جن کی شان میں ہم قدح کرتے ہیں۔

اگر شیعہ ظواہر قرآنیہ سے احتجاج کریں کہ قرآن میں ان کی مدح وتوصیف بیان ہوئی ہے۔ تو وہ جواب میں کہیں گے: قرآنی آیات عام ہیں یہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ایسے ہی شامل ہیں جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو۔ بلکہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر ان آیات کے موجب مدح وثناء کے مستحق ہیں۔ اگر روافض پوری جماعت کو اس فضیلت سے مستثنیٰ کریں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان سے الگ کر دینا بہت آسان ہے۔ [حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی شان میں بھی احادیث وارد ہیں۔ لہٰذا ان کو بھی قبول کرنا چاہئے اور اگر شیعہ صحابہ کو مطعون کریں گے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس سے بچ نہیں سکتے]۔

اگر شیعہ صحابہ کے بارے میں وارد شدہ فضائل و مناقب سے احتجاج کریں تو یہ فضائل جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیے ہیں؛ انہی صحابہ نے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل بھی روایت کیے ہیں۔ اگر یہ راوی [تمہارے نزدیک] عادل

---

[1] البدایۃ والنھایۃ (۸/ ۱۳۳۔۱۳۴) بحوالہ عبد الرزاق۔

ہیں تو تمام روایات کو ماننا پڑے گا؛ اور اگر کہو کہ فاسق ہیں تو پھر جب فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اس کے لیے تحقیق کرنا پڑتی ہے [تاکہ حق بات واضح ہو جائے]۔ کسی انسان کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ گواہوں کے بارے میں یوں کہے:

''اگر یہ میرے حق میں گواہی دیں تو عادل ہوں گے۔ اور اگر میرے خلاف گواہی دیں تو فاسق و فاجر ہوں گے۔''

یا یوں کہے کہ: ''اگر ان لوگوں کی مدح میں گواہی دیں جن سے میں محبت کرتا ہوں؛ تو پھر عادل ہوں گے۔ اور اگر ان لوگوں کی مدح میں گواہی دیں جن سے میں بغض رکھتا ہوں' تو پھر فاسق ہوں گے۔''

رہا امامتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مسئلہ؛ تو یہ لوگ اور دیگر فرقے [خوارج ونواصب] آپ سے اس بارے میں تنازع کرتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوی کے مطابق ان کے منصوص ہونے کی دلیل پیش کرتے ہو؛ تو وہ اس کے مقابلہ میں ایسی ہی دلیل پیش کریں گے؛ جیسے ان کا دعوی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں ہے' یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں [جیسا کہ مروانیہ کا عقیدہ ہے]۔ حدیث و آثار کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا دعوی زیادہ قابل قبول ہے۔ ایسے ہی ان حضرات کی خلافت کے برحق ہونے پر ایسے دلائل بھی پیش کیے جاسکتے ہیں جن کو سمجھنے کیلئے علم حدیث کا ہونا ضروری نہیں۔

❀[اشکال]: اگر شیعہ اس بات سے احتجاج کریں کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔

❀[جواب]: تو خوارج ونواصب کہہ سکتے ہیں کہ: یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم خلفائے ثلاثہ کی بیعت اس بیعت سے کہیں بڑھ کر تھی، [اس لیے کہ اہل شام اور اکثر اہل مصر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی تھی]۔ جب کہ تم ان کی بیعت کو غلط کہتے ہو۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت پر قدح کرنا بہت ہی آسان ہے۔ تم جس بھی نص سے یا اجماع سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت پر استدلال کرو گے تو وہی نص و اجماع خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی بیعت و خلافت پر زیادہ قوت سے دلالت کرے گی۔ تو اس طرح جن کی خلافت پر تم قدح کرتے ہو' ان کی خلافت کا اثبات اس سے زیادہ اولی ہوگا جس کی خلافت کے اثبات کے لیے تم دلیل پیش کرتے ہو۔

❀ یہ اشکال اہل سنت والجماعت پر وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اہل سنت تمام خلفاء کی خلافت کو ثابت مانتے ہیں۔ اور ان کی خلافت کے درست ہونے پر اس باب میں وارد ہونے والی نصوص سے استدلال کرتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں:

''خلافت اہل حل وعقد و اصحاب شوکت کی بیعت سے منعقد ہوتی ہے۔ اہل شوکت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ اگر چہ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ایسے جمع نہ ہو سکے جیسے پہلے تین خلفاء رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت پر ان کا اجماع ہوا تھا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جن اہل شوکت و اصحاب قدرت نے آپ کی بیعت کی تھی اس وجہ سے آپ کو قوت و شوکت حاصل ہوگئی تھی۔ اور نص بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کی خلافت' خلافت نبوت تھی۔''

پس جو لوگ آپ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے؛ اس بارے میں ان کا عذر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے عذر سے بڑھ واضح ہے جو کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ اگر چہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی بھی آپ کی بیعت سے پیچھے نہیں رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بلا خلاف لوگوں کے سامنے آپ کی بیعت کی تھی۔ مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''آپ چھ ماہ تک بیعت سے پیچھے رہے' اور بعد میں بیعت کر لی۔''

شیعہ سے وہ لوگ بھی یہی کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو باتوں میں سے ایک ہے:

ا۔ یا تو آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہے' اور پھر چھ ماہ کے بعد بیعت کر لی؛ جیسے شیعہ کا اور اہل سنت والجماعت کے ایک گروہ کا خیال ہے۔

۲۔ یا تو پھر آپ نے پہلے ہی دن سے بیعت کر لی تھی؛ جیسے اہل سنت والجماعت کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے۔

❀ اگر یہ دوسرا قول درست اور حق ہے؛ تو شیعہ کا استدلال باطل ہوا کہ آپ بیعت سے پیچھے رہ گئے تھے۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آپ بیعت کرنے والوں میں سبقت لے جانے والے اور پہلے نمبر پر تھے۔

اور اگر پہلے قول کو درست مانا جائے تو پھر بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہ جانے والوں کا عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہنے والوں کی نسبت زیادہ ظاہر اور مقبول ہے۔ اس لیے کہ جیسی نصوص اور اجماع ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت کرنے والوں کے پاس ہیں' ایسی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر موجود نہیں۔ صحیحین میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ہے جو آپ کی خلافت پر دلالت کرتی ہو۔ بلکہ یہ روایت اہل سنن نے نقل کی ہیں۔

بعض محدثین نے حدیثِ سفینہ پر جرح بھی کی ہے۔ جب کہ اجماع کا دعوی کرنا بھی درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ آپ کی بیعت سے آدھی سے زیادہ امت یا اس سے کچھ کم وبیش لوگ پیچھے رہ گئی تھی۔

نبی کریم ﷺ سے ثابت نصوص کے مقتضیٰ کے مطابق دونوں فریقوں کے لیے جنگ وقتال ترک کرنا ہی بہتر تھا۔ اور جنگ سے پیچھے بیٹھ جانا جنگ میں شرکت کرنے سے زیادہ افضل تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے باوجود کہ آپ حق پر تھے' حق آپ کے ساتھ تھا؛ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت آپ ہی حق خلافت رکھتے تھے؛ پھر بھی اگر آپ جنگ ترک کر دیتے؛ تو یہ آپ کے حق میں زیادہ افضل' اصلح اور بہتر تھا۔

اہل سنت والجماعت ان تمام صحابہ کے لیے رحمت کی دعا کرتے اور ان کے لیے استغفار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (الحشر ۱۰)

''اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کے لیے ہمارے دل میں کہیں (بغض) نہ ڈال؛ اے ہمارے رب بیشک تو شفقت ومہربانی کرنے والا ہے۔''

جب کہ رافضی جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں طعن کریگا' اور کہے گا کہ آپ ظالم اور باغی تھے؛ تو نواصب بھی ان سے کہیں گے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی باغی تھے۔ آپ اپنے دور امارت میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ سے ظالم بھی تھے۔ آپ نے امن عامہ میں خلل ڈالا اور لڑائی کا آغاز کر کے بلاوجہ وبلا فائدہ امت کا خون بہایا؛ نہ ہی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل ہوا اور نہ ہی کوئی دینی فائدہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شمشیر کفار سے دور اور مسلمانوں کے سر پر آویزاں رہی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پر قدح کرنے والے کئی گروہ ہیں۔ ایک گروہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ جنگ کرنے والے تمام لوگوں پر قدح کرتے ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ: علی رضی اللہ عنہ اور معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں میں سے ایک فاسق تھا مگر یہ معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ ۔ جیسا کہ عمرو بن عبید اور معتزلہ کی ایک جماعت کا عقیدہ ہے۔ یہ لوگ جنگ جمل والوں کے بارے میں

کہتے ہیں: ان دونوں گروہ میں سے ایک گروہ فاسق تھا؛ مگر اس کا پتہ نہیں کہ وہ کون سا گروہ تھا۔ کچھ لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو فاسق کہتے ہیں۔ ایک گروہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظالم کہتا ہے' جیسا کہ مروانیہ کا عقیدہ ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے: پہلے آپ حق پر تھے۔ جب آپ نے دو جرگہ داروں کے جرگہ [تحکیم الحکمین] پر رضا مندی کا اظہار کیا تو آپ نے کفر کا ارتکاب کیا اور اسلام سے مرتد ہوگئے' اور کفر کی حالت میں موت آئی۔ یہ خوارج کا عقیدہ ہے۔

[حدیث عمار رضی اللہ عنہ کا جواب]:

خوارج؛ مروانیہ؛ اور بہت سارے معتزلہ اور دوسرے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں جرح وقدح کرتے ہیں۔ یہ تمام لوگ اس مسئلہ میں خطاء پر؛ بدعات کا شکار اور گمراہ ہیں۔ مگر ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی شان میں شیعہ کا طعن وتشنیع کرنا ان لوگوں کے جرم سے بڑا جرم اور گھمبیر خطاء ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا کہے: ''جن لوگوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ کی وہ [یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی] باغی تھے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا:

''تجھے باغی جماعت قتل کرے گی۔''[1] ان لوگوں نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا۔

بعض محدثین نے اس حدیث پر جرح کی ہے۔ بعض نے اس کی تاویل کی ہے اور باغی سے طالب مراد لیا ہے۔ مگر یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ جب کہ ائمہ سلف جیسے: امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں باغی لشکر کی شرائط نہیں پائی جاتی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آغاز کار میں ان سے لڑنے کا حکم نہیں دیا؛[2] بلکہ یہ حکم ملا کہ جب دو فریق لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادی جائے؛ پھر جو جماعت ظلم وتعدی کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب التعاون فی بنا المسجد، (حدیث:٤٤٧، ٢٨١٢) ہم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ یہ الفاظ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت ارشاد فرمائے۔ باقی صحابہ ایک ایک اینٹ لا رہے تھے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ دو دو، یہ دیکھ کر آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے یہ روایت ابو سعید خدری نے عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور علی بن عبداللہ بن عباس کو سنائی رضی اللہ عنہم اجمعین۔

[2] محب الدین خطیب ''العواصم من القواصم'' (ص:١٧٠) میں حاشیہ پر لکھتے ہیں: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ جنگ صفین میں آپ کی حیثیت ایک باغی کی نہ تھی کیونکہ آپ نے اس کا آغاز نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں معاویہ رضی اللہ عنہ لڑائی کے لیے اس وقت نکلے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ سے نکل کر شام پر حملہ کرنے کے لیے نخیلہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمار رضی اللہ عنہ مارے گئے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عمار رضی اللہ عنہ کے قتل کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ان کو یہاں لائے۔''

خطیب فرماتے ہیں: ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جو مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مارے گئے، ان کے قتل کے ذمہ دار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہیں۔ اس لیے کہ انھوں نے فتنہ کے دروازوں کو کھولا اور لمبے عرصہ تک اس آگ کو ہوا دیتے رہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے مابین جذبات حقد وعناد کے بھڑکانے کا موجب ہوئے۔ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ خون فشاں پیش نہ آتا تو جنگ جمل وصفین وقوع پذیر نہ ہوتے۔ جس طرح یہ فتنہ پرداز احمق لوگ قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے مرتکب ہوئے؛ اسی طرح اس واقعہ کے بعد تہ تیغ ہونے والے مسلمانوں کے قاتل بھی یہی لوگ ہیں۔ مقتولین میں نہ صرف حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بلکہ ان سے افضل لوگ بھی شامل ہیں، مثلاً طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما، اس فتنہ پردازی کا انجام یہ ہوا کہ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرکے دم لیا۔ حالانکہ یہ آپ کے لشکر میں شامل تھے۔

مذکورۃ الصدر بیان سے عیاں ہے کہ ذکر کردہ حدیث نبوی اعلام نبوت میں سے ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ صفین میں لڑنے والے دونوں فریق زمرۂ مومنین میں شامل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بلا شبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ تاہم دونوں صحابہ رسول اور دین اسلام کے رکن رکین تھے، اس دور میں جس قدر فتنے بپا ہوئے، اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے اس آگ کو ہوا دی۔ آنے والے ادوار میں تا قیام قیامت جو لوگ ان کے فعل کو سراہتے ہیں وہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ ہی وہ باغی ہیں جو بعد میں قتل ہونے والے سب مسلمانوں کے ذمہ دار ہیں۔ اسی طرح بعد ازاں جو فتنے بپا ہوئے اس کا اصل سرچشمہ وہی فتنہ پرور لوگ ہیں۔

مرتکب ہو اس سے لڑا جائے۔ان لوگوں سے ابتداء میں ہی؛ ان کی طرف سے جنگ شروع کرنے سے پہلے لڑا گیا ہے۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر مانعین زکوٰۃ کہیں کہ: ہم زکوٰۃ اپنے ہاتھوں سے ادا کریں گے؛ ہم حاکم وقت کو زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔تو امام [حاکم] کے لیے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔اسی بنا پر امام احمد اور امام مالک رحمہ اللہ اسے ''جنگ فتنہ'' قرار دیتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''باغیوں سے اس وقت لڑنا جائز ہے جب وہ حاکم وقت کے خلاف نبرد آزما ہوں۔'' مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ بلکہ خوارج نے جنگ کا آغاز کیا۔جب کہ خوارج سے جنگ کرنا نص اور اجماع امت سے ثابت ہے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دفاع کرنے والا کہے کہ: آپ اس بارے میں مجتہد تھے۔

تو فریق مخالف بھی کہہ سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس مسئلہ میں مجتہد تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ مجتہد حق پر تھے۔

تو اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ: معاویہ بھی مجتہد اور حق پر تھے۔لوگوں میں ایسے افراد موجود ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مجتہد برحق کہتے ہیں۔اسکی بنیاد یہ ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والا حق پر ہوتا ہے۔یہ امام اشعری رحمہ اللہ کا قول ہے۔

ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد تھے مگر خطاء پر تھے۔مجتہد کی خطاء قابل مغفرت ہے۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کہتا ہے: ان دونوں میں سے ایک گروہ حق پر تھا' مگر یہ پتہ نہیں کہ کون سا گروہ حق پر تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ برحق ہونے کے بارے میں تنازع کرنے والوں کی حجتوں اور دلائل کا توڑ کرنا رافضیوں کے بس کا کام نہیں۔ جو لوگ آپ کو امام حق تسلیم کرتے ہیں؛ ان کا وہی عقیدہ و مسلک ہے جو اہل سنت والجماعت کا ہے۔

اہل سنت کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ امام حق کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر اس شخص سے لڑا جائے جو اس کی اطاعت کے دائرہ سے خارج ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معصیت میں بھی اس کی اطاعت کی جائے۔اس حالت میں اس کی اطاعت کا چھوڑ دینا افضل ہے۔اسی بنا پر صحابہ کی ایک جماعت جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہیں دیا تھا وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ قتال کا ترک کرنا قتال میں ملوث ہونے سے بہتر ہے۔اور بعض کا خیال تھا کہ جنگ کرنا گناہ کا کام ہے' اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینا ان پر واجب نہیں۔

جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے وہ تین حال سے خالی نہیں:

۱۔وہ عاصی ہوں گے ۲۔خطا کار مجتہد ہوں گے۔

۳۔یا اپنے اجتہاد میں صحت وصواب کے حامل ہوں گے۔

بہر کیف کوئی صورت بھی ہو اس سے ان کے ایمان میں اور جنتی ہونے میں قدح وارد نہیں ہوتی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوْتُوا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا

بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ [الحشر ۹۔۱۰]

''اور (ان کے لئے) جنھوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی؛ اور اپنی طرف ہجرت کرکے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے ؛ بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں گو خود کتنی ہی سخت حاجت ہو (بات یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب اور با مراد ہے ۔اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کہیں (اور دشمنی) نہ ڈال اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔''

[[نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ (الحجرات: ۹،۱۰)

''اگر مومنوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ اگر ایک فریق دوسرے پر ظلم و تعدی کا مرتکب ہو تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی جانب واپس آ جائے۔ اندریں صورت بہ تقاضائے عدل ان میں صلح کرادو کیوں کہ اللہ تعالیٰ باانصاف لوگوں کو چاہتا ہے۔ مومن باہم بھائی بھائی ہیں، لہٰذا بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیجیے]]۔

اس آیت میں متحارب فریقین کو ﴿ اِخْوَةٌ ﴾ ''بھائی'' فرمایا ہے؛ اور انہیں ایمان سے موصوف بتایا ہے؛ باوجود کہ ان کے درمیان جنگ و قتال پیش آئے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر سرکشی کے مرتکب ہوئے۔

پس جو کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرے' اگر اسے باغی شمار کیا جائے تو پھر بھی اسے خارج از ایمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس وجہ سے اس کو جہنمی کہا جاسکتا ہے۔ نہ ہی اس کے جنتی ہونے میں کوئی چیز مانع ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ جب بغاوت کسی تاویل کی بنا پر ہو تو ایسا باغی مجتہد ہوتا ہے۔ اسی لیے اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ: ان دونوں گروہوں میں سے کسی کو بھی فاسق نہ کہا جائے۔ اگر چہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ان دو میں سے ایک گروہ باغی تھا؛ اور یہ باغی گروہ بھی [خواہش نفس کی وجہ سے نہیں' بلکہ] اجتہاد کی بنا پر بغاوت کا مرتکب ہوا تھا۔ خطا کار مجتہد کو کافر و فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ اگر انسان حق بات جانتے ہوئے بھی [بغیر کسی تاویل کے] بغاوت پر اتر آئے؛ تب بھی یہ بغاوت فقط گناہ کا کام ہے۔ اور کئی وجوہات کی بنا پر گناہوں سے معافی مل جاتی ہے جیسے: توبہ و استغفار؛ گناہ مٹانے والی نیکیاں؛ گنہگار کے لیے مؤمنین کی دعا؛ نیک اعمال کا ہدیہ ثواب؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت' وغیرہ۔

[پانچواں اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: ''اس کا سبب یہ تھا کہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے تھے؛ اور اپنے باپ کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے تھے ... ۔''

[جواب]: یہ ایک کھلا ہوا واضح جھوٹ ہے۔ محمد بن ابو بکر اپنے والد کی زندگی میں محض چھوٹے سے بچے تھے جن کی عمر تین سال سے بھی کم تھی۔ اپنے والد کی موت کے بعد لوگوں میں سب سے بڑھ کر اپنے والد کی تعظیم کرنے والے تھے۔ اور اس تعلق کو وہ اپنے لیے شرف سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے لوگ بھی آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

[چھٹا اعتراض]: شیعہ مصنف کہتا ہے: ''محمد بن ابو بکر کو چھوڑ کر معاویہ رضی اللہ عنہ کو موٴ-ن کا ماموں کہنے کی وجہ یہ ہے کہ محمد بن ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے جب کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ آپ سے بغض رکھتے تھے۔''

[جواب]: یہ بھی صاف جھوٹ ہے۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان دونوں سے بڑھ کر اس لقب کے مستحق تھے۔اس لیے کہ آپ نے نہ ایک گروہ کے ساتھ جنگ کی اور نہ ہی دوسرے گروہ کے ساتھ۔اور آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے اور آپ سے محبت رکھتے تھے۔آپ کے فضائل و مناقب کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جب لوگوں کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر لوگوں کا اتفاق ہوگیا تو آپ نے بھی ان کی بیعت کی اور ان کے خلاف خروج نہیں کیا۔آپ کی بہن معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہن سے افضل ہیں؛ اور آپ کے والد معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد سے افضل ہیں ۔ اور لوگ بھی معاویہ اور محمد رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر آپ سے محبت رکھتے اور آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔اس کے باوجود یہ بات مشہور نہیں ہوئی کہ آپ کو موٴمنین کا ماموں کہا گیا ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ رافضی کا ذکر کردہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔

اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال نہ کرنے والوں سے ان لوگوں کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہیں جنہوں نے آپ سے قتال کیا۔ اور جن لوگوں نے آپ سے قتال نہیں کیا انہیں قتال کرنے والوں پر فضیلت دیتے ہیں؛ جیسے سعد بن ابی وقاص؛ اسامہ بن زید؛ محمد بن مسلمہ؛ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین ۔اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ حضرات ان لوگوں سے افضل ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ۔ نیز اہل سنت یہ بھی کہتے ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنا؛ اور جنگ کو ترک کرنا؛ آپ سے بغض رکھنے اور جنگ کرنے سے بہتر تھا؛ اس پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ نیز اہل سنت کا یہ بھی اتفاقی مسئلہ ہے: آپ سے محبت رکھنا اور دوستی کرنا واجب ہے۔اہل سنت آپ کے دفاع میں ہر جگہ پیش پیش رہتے ہیں۔اور خوارج ونواصب کے طعنوں کا جواب دیتے ہیں لیکن ہر بات کے لیے ایک مناسب موقع محل ہوتا ہے۔

جس طرح اہل سنت والجماعت آپ سے محبت کے وجوب کو [دلیل کی روشنی میں] ثابت کرتے ہیں؛ روافض کے لیے ایسے ثابت کرنا ہرگز ممکن نہیں۔اہل سنت والجماعت خوارج کی مذمت پر یک زبان ہیں جو کہ حضرت کے سب سے بڑے دشمن اور آپ سے بغض وعداوت رکھنے والے ہیں۔'' نیز اہل سنت والجماعت ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے پر یک زبان ہیں۔

تو پھر اس جھوٹے شیعہ مصنف نے اپنی طرف سے کیسے یہ بات گھڑ لی کہ اہل سنت ایک سے محبت اس لیے رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا تھا' اور دوسرے سے بغض اس لیے رکھتے ہیں کہ وہ آپ سے محبت کرتا تھا۔[معاذ اللہ]۔

حالانکہ اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض کو نیکی شمار کرتا ہو'یا آپ سے بغض رکھنے کا حکم دیتا ہو۔اور نہ ہی کوئی آپ سے فقط محبت رکھنے کو برائی اور معصیت کا کام کہتا ہے' اور نہ ہی اس سے منع کرتا ہے۔''

اہل سنت والجماعت کے تمام گروہوں کی کتب آپ کے فضائل ومناقب کے ذکر سے بھری پڑی ہیں ۔ان میں ان تمام فرقوں کی مذمت کی گئی ہے جو آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت ان لوگوں کا انکار کرتے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہیں؛ اور ایسے لوگوں کو ناپسند رکھتے ہیں۔

رہا معاملہ جو ان دونوں لشکروں میں ایک دوسرے پر لعنت کی گئی؛ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ان دونوں لشکروں کے مابین قتال کا حادثہ پیش آیا۔ اہل سنت والجماعت سب لوگوں سے بڑھ کر آپ کے خلاف قتال اور سب وشتم کے امور سے

نفرت رکھنے والے ہیں ۔تمام اہل سنت والجماعت آپ کی قدرومنزلت پر متفق ہیں۔ آپ امامت وخلافت کے زیادہ حق دار تھے۔ اور آپ اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد اور بھائی کی نسبت زیادہ افضل انسان تھے اور ان لوگوں سے بہتر تھے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے بھی افضل ہیں جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں جیسے مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین ؛ جنہوں نے ببول کے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی ؛ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ کے علاوہ باقی تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں؛ رضی اللہ عنہم اجمعین ۔

اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی بھی صحابی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل سمجھتا ہو۔ بلکہ آپ کو[ان تین کے علاوہ] تمام باقی تمام اہل بدر ؛ اہل بیعت رضوان؛ اور مہاجرین و انصار سابقین اولین رضی اللہ عنہم اجمعین سے افضل وبہتر مانتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت میں کوئی ایک ایسا بھی نہیں جو حضرت طلحہ' زبیر؛ سعد بن ابی وقاص عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین کو آپ سے افضل سمجھتا ہو۔ بلکہ اس کی آخری حد یہ ہے کہ بعض لوگ اہل شوریٰ کو آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت دینے سے سکوت اختیار کرتے ہیں۔ یہ اہل شوریٰ ان کے نزدیک سابقین اولین سے افضل ہیں۔ اور سابقین اولین فتح کے بعد اسلام لانے والوں اور اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کرنے والوں سے افضل ہیں ۔ سابقین اولین صحیح قول کے مطابق وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی۔ اس قول کی کوئی صحت ثابت نہیں۔

حدیبیہ کے بعد اسلام لانے والوں میں حضرت خالد بن ولید ؛ شیبہ الحجبی ؛ عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہم اور دوسرے لوگ شامل ہیں ۔ جب کہ سہیل بن عمرو؛ عکرمہ بن ابو جہل ؛ ابوسفیان بن حرب؛ اس کے دونوں بیٹے یزید اور معاویہ ؛ صفوان بن امیہ وغیرہ رضی اللہ عنہم اجمعین یہ فتح مکہ کے مسلمان ہیں ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے پہلے اسلام لے آئے تھے؛ اس لیے انہیں پہلی قسم کے لوگوں میں شمار کیا گیا ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے:''حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے خالد! میرے کسی صحابی کو برا نہ کہو؛ کیونکہ تم میں سے کوئی آدمی اگر احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو وہ میرے صحابی کو دو مد یا آدھے مد کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا۔'' [صحیح مسلم:ح ۱۹۸۹]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس سے منع کیا۔ جو کہ بیعت رضوان کے بعد اسلام لائے' اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا؛ اور جہاد فی سبیل اللہ کیا۔ انہیں کہا گیا کہ ان لوگوں سے تعرض نہ کریں جو اس سے پہلے اسلام لائے اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور جہاد کیا۔ اور یہ بھی واضح کیا کہ بعد والوں میں سے اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کردیں تو سابقین صحابہ کرام کے خرچ کردہ ایک مٹھی جو یا اس کے آدھے کے اجر وثواب کو نہیں پہنچ سکتا۔

اگر یہ ممانعت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور ان لوگوں کیلئے ہے جو حدیبیہ کے بعد اسلام لائے ۔تو پھر ان لوگوں کو کیا حق حاصل ہوگا جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے؟ جبکہ خالد رضی اللہ عنہ مہاجر تھے۔ بیشک حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما

حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل اسلام لانے والوں میں سے ہیں ۔آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی؛ آپ مہاجرین میں سے تھے۔جبکہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والوں کو ہجرت کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں مگر جہاد اور اس کی نیت ہے؛ اور جب تمہیں جہاد کے لیے نکلنے کا کہا جائے تو نکل پڑو۔''

[رواه البخاري ٤/ ١٥؛ مسلم ٣/ ١٤٨٧]۔

جب اہل سنت والجماعت کے ہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے یہ مراتب ہیں؛ جیسا کہ کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہے ۔اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمنوا دوسرے لوگ وہ ہیں جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے ؛ جن کا اسلام لانا حدیبیہ والوں سے متاخر ہے ۔ اور حدیبیہ والوں کا اسلام سابقین اولین سے متاخر ہے [اس لحاظ سے ان کے فضائل ومناقب ہیں] ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان تمام صحابہ کرام سے افضل ہیں ۔ خلفاء ثلاثہ کے علاوہ کسی کو آپ پر فضیلت حاصل نہیں ۔تو پھر اہل سنت والجماعت پر کس منہ کے ساتھ یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برابر سمجھتے ہیں یا آپ پر تقدیم وفضیلت دیتے ہیں؟ ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مروانیہ اور دوسرے لوگوں کا ایک گروہ تھا۔جنھوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا ؛ اور ان کے بعد ان کے ماننے والے کہتے ہیں:'' بیشک آپ [حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ] اس قتال میں اصابت رائے والے مجتہد اور حق پر تھے'' ۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یا تو ظالم تھے؛ یا پھر مجتہد تھے ؛ مگر اجتہاد میں خطاٗ پر تھے۔اس بارے میں انہوں نے کتابیں تصنیف کی ہیں جیسے جاحظ کی تصنیف کردہ کتاب'' المروانیہ'' اور ایک گروہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے فضائل گھڑ لیے۔اور نبی کریم ﷺ سے ایسی روایتیں نقل کیں جو کہیں بھی ثابت نہیں ۔اس بارے میں ان کی بڑی بڑی حجتیں ہیں جنہیں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہ لوگ غلطی پر ہیں ۔ اگرچہ رافضیوں کی غلطی ان کی غلطی سے بہت بڑھ کر ہے۔ رافضیوں کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ امامیہ مذہب پر عقیدہ رکھتے ہوئے ان لوگوں کے دلائل کا رد کرسکیں ۔اس لیے کہ امامیہ کے دلائل میں تناقض پایا جاتا ہے۔ایسے دلائل سے استدلال کرتے ہیں جنہیں خود ہی دوسرے موقع پر توڑ دیتے ہیں۔ عقلی اور سمعی دلائل سے حجت لیتے ہیں؛ اور جو چیز اس سے بڑھ کر ہے[کتاب وسنت] اس کا انکار کرتے ہیں ۔بخلاف اہل سنت والجماعت کے؛ ان کے دلائل صحیح اور اپنے موقع محل پر درست ہوتے ہیں۔

[اہل سنت والجماعت کے ساتھ ان روافض کا معاملہ ایسے ہی ہے] جیسے مسلمانوں کیساتھ عیسائیوں اور دیگر اہل کتاب کا معاملہ۔

اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصرت میں ان کی مذمت کرنے والوں اور بغض رکھنے والوں؛ یا آپ سے برسر پیکار لوگوں کو حق پر کہنے والوں پر حجت قائم کرسکتے ہیں ۔جیسا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو جھٹلانے والے یہودیوں اور دوسرے لوگوں پر حجت قائم کرسکیں ۔ بخلاف نصاری کے ۔اس لیے کہ عیسائی حضرت عیسی علیہ السلام کو جھٹلانے والے یہود ونصاری پر علمی اور مدلل حجت قائم نہیں کرسکیں گے۔

شانِ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کوتاہی:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کوتاہی کرنے والے اہل بدعت کے کئی گروہ ہیں:

۱۔ خوارج کا گروہ: جو کہ آپ کو کافر کہتا ہے۔ یہ لوگ آپ کیساتھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جمہور مسلمین کو کافر قرار دیتے ہیں۔ جب کہ اہل سنت والجماعت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان کو ثابت مانتے ہیں؛ اور آپ سے محبت و دوستی کو واجب قرار دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایمان کو ثابت مانتے ہیں۔ اور آپ سے محبت و دوستی کو واجب کہتے ہیں۔

۲۔ ایک گروہ کہتا ہے: ''اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ مگر قتال کے مسئلہ میں معاویہ رضی اللہ عنہ حق پر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے قتال کرنے میں حق پر نہیں تھے۔ یہ کہنے والے لوگ بہت زیادہ ہیں' جیسے کہ وہ لوگ جنہوں نے آپ کے ساتھ مل کر قتال کیا۔ ان کے جمہور یا اکثر لوگ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے حاکم نہیں تھے جن کی اطاعت واجب ہوتی۔اس لیے کہ آپ کی خلافت نص یا اجماع سے ثابت نہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ: ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت حق پر تھے۔ ان کا کہنا ہے: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قتال میں حق پر نہیں تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''یہ زمانہ فتنہ اور اختلاف و افتراق کا زمانہ تھا۔ اس وقت پوری امت اسلامیہ کا کوئی نہ ہی [متفقہ] امیر تھا اور نہ ہی خلیفہ۔ اس قول کے کہنے والے اہل بصرہ' اہل شام؛ اہل اندلس اور بہت سارے دوسرے علماء و محدثین تھے۔ اندلس میں بہت سارے بنوامیہ کے علماء اسی قول کے قائل تھے۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے رحم و مغفرت کی دعا کرتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن کہتے تھے: آپ خلیفہ نہیں تھے۔ اس لیے کہ خلیفہ وہ ہوتا جس کی بیعت پر لوگ جمع ہو جائیں۔ آپ کی بیعت پر لوگ جمع نہیں ہوئے۔

۴۔ ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے جمعہ کے خطبات میں چوتھا خلیفہ شمار کرتے تھے۔ پس تین پہلے خلفاء کو شمار کرتے اور چوتھا خلیفہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شمار کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام نہیں لیا کرتے تھے۔ یہ لوگ دلیل پیش کرتے تھے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی تو آپ پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوگیا؛ بخلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛ آپ کے ہاتھ پر مسلمانوں کا اجتماع نہیں ہوسکا۔ یہ لوگ کہتے ہیں: ہم امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ اس لیے نہیں شمار کرتے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ سے افضل ہیں۔ جیسا کہ دوسرے کئی صحابہ کرام حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں' اگرچہ وہ خلفاء نہیں بن سکے۔ امام احمد بن حنبل اور دوسرے علماء رحمہم اللہ جو خلافت علی رضی اللہ عنہ کے قائل تھے نے آپ کی خلافت پر حدیث سفینہ سے استدلال کیا؛ جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے بعد تیس سال خلافت ہوگی، پھر ملوکیت کا آغاز ہو جائے گا۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ شمار نہ کرنے والے گدھے سے بڑھ گمراہ و بدتر ہیں۔'' بعض لوگوں نے اس جملہ کی وجہ سے بعض لوگوں نے حضرت امام احمد رحمہ اللہ پر کلام کیا ہے' اور کہا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انکار کرنے والوں میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور دوسرے وہ لوگ شامل ہیں جن کے متعلق اس طرح کا جملہ کہنا زیب نہیں دیتا۔ اور انہوں نے بہت ساری ان احادیث مبارکہ سے بھی استدلال کیا ہے جن میں خلافت نبوت کا

[1] سنن ابی داؤد ـ کتاب السنة ، باب فی الخلفاء (ح:٤٦٤٦) سنن ترمذي ، باب فی الخلافة (ح:٢٢٢٦) ـ

ذکر ہے ؛ مگر ان میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ کسی دوسرے کا تذکرہ نہیں ۔

جیسا کہ مسند امام احمد میں ہے حماد بن سلمہ سے روایت ہے ' وہ علی بن زید بن جدعان سے روایت کرتے ہیں ' وہ عبد الرحمن بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

''کیا تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکایا گیا ہے پھر آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ وزن کیا گیا اور آپ بھاری نکلے ۔ پھر حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما کو تولا گیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ والا پلڑا جھک گیا ۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں وزن کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ وزنی ثابت ہوئے ۔ پھر ترازو اٹھالیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ خلافت نبوت کی جانب اشارہ ہے اس کے بعد اللہ جسے چاہے حکومت وسلطنت سے نوازے ۔''❶

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آج ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے باندھ دیا گیا ہے، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے وابستہ کردیا گیا تھا۔''

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم بارگاہ رسالت سے اٹھے تو ہم نے کہا: نیک آدمی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس مراد ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ آپ کے خلفاء ہیں ۔❷

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے خواب دیکھا کہ گویا ایک ڈول آسمان پر لٹکایا گیا۔ پس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے اس ڈول کے کنارے پکڑ کر تھوڑا سا پی لیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انہوں نے اس کے کنارے پکڑے اور اتنا پیا کہ پیٹ بھر گیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو انہوں نے اس کے کنارے پکڑے اور یہاں تک کہ سیر ہوگئے ۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انہوں نے اس کے دونوں کنارے پکڑے تو وہ ڈول ہل گیا اس کے پانی کے کچھ چھینٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پڑ گئے ۔''❸

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: خلفاء تین ہیں: ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سے منقول تمام احادیث صحیحہ برحق ہیں ۔ وہ خلافت جس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہوا تھا؛ اور جس دور میں کفار سے قتال کیا گیا اور دین اسلام کو غلبہ نصیب ہوا وہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دور میں مسلمانوں کا آپس میں اختلاف ہوگیا تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی قوت کچھ اچھی حالت میں باقی نہ رہی تھی ۔ اور نہ ہی اس دور میں کفار پر کوئی غلبہ اور رعب باقی رہا۔ یہ بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ راشد ہونے میں قدح کا سبب نہیں بن سکتی ۔ [حقائق کے پیش نظر] اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح پہلے خلفاء کو اقتدار اور قوت حاصل تھی ؛ ایسی

❶ مسند احمد(٥/ ٤٤ ، ٥٠) سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ۔ باب فی الخلفاء (حدیث: ٤٦٣٤۔٤٦٣٥) تاہم اس میں خواب دیکھنے والے حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نہیں تھے بلکہ ایک دوسرے صحابی تھے ۔ واللہ اعلم)
❷ سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ۔ باب فی الخلفاء (حدیث:٤٦٣٦)
❸ سنن ابو داد: جلد سوم: حدیث نمبر ١٢٣٤ ۔

قوت آپ کو حاصل نہ ہوسکی۔ اور امت آپ کی اطاعت سے ایسے شرفیاب نہ ہوسکی جیسے آپ سے پہلے کے خلفاء کی اطاعت کرتی تھی۔ پس اس بنا پر آپ کے عہد مسعود میں ایسی عام اور مکمل خلافت قائم نہ ہوسکی جیسے آپ سے پہلے تین خلفاء کے دور میں تھی۔ حالانکہ آپ کا شمار بھی ہدایت یافتہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین میں ہوتا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو جنگ کرنے میں حق پر تھے؛ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ معاویہ رضی اللہ عنہ کیساتھ جنگ میں حق پر نہیں تھے۔ان کا قول پچھلے گروہ کے قول کی نسبت ضعیف ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ: ''حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا مطالبہ کررہے تھے۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے چچا زاد اور ولی تھے۔ اولاد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے دیگر رشتہ دار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوگئے تھے؛ اور ان کا مطالبہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا تو قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کے حوالے کردیں' یا پھر خود ان سے قصاص لیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس وجہ سے انہوں نے آپ کی بیعت ترک کردی اور آپ کے خلاف برسر پیکار ہوگئے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ شروع کی تھی؛ انہوں نے اپنے نفوس و بلاد کے دفاع میں اسلحہ اٹھایا تھا۔اس وجہ سے انہوں نے کہنا شروع کردیا تھا: کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر ظلم اور سرکشی کرتے ہیں۔

رہی وہ حدیث جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا: ''تجھے باغی جماعت قتل کرے گی۔''

بعض محدثین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔بعض نے اس کی تاویل کی ہے۔بعض نے کہا ہے: اس سے مراد خون [عثمان رضی اللہ عنہ] کا مطالبہ کرنے والی جماعت ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ نعرہ لگاتے تھے کہ ہمیں خون عثمان رضی اللہ عنہ کا بدلہ چاہیے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے قتل حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

''کیا ہم نے انہیں قتل کیا ہے؟ انہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے جو انہیں ہماری تلواروں کے نیچے لے کر آئے۔''

جب یہ تاویل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ذکر کی گئی تو آپ نے فرمایا: ''تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جنگ احد کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا ہوگا کیونکہ وہ اس دن مشرکین سے جنگ کررہے تھے۔''

اس قول کے قائلین کا ائمہ اربعہ کے اصحاب اور معتبر علماء اہل سنت والجماعت کے ہاں کوئی کھوج نہیں مل سکا۔ اصل میں یہ بہت سارے مروانیہ اور ان کی موافقت رکھنے والوں کا قول ہے۔

ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے میں شریک تھے۔ پھر بعض کہتے ہیں: آپ نے اعلانیہ اس کا حکم دیا تھا۔ بعض کہتے ہیں: نہیں' بلکہ چپکے سے سازش کی تھی۔ بعض کہتے ہیں: آپ اس قتل پر راضی رہے اور خوش ہوئے تھے۔ اور بعض لوگ اس طرح کی دیگر باتیں بناتے ہیں۔ یہ تمام باتیں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹ اور بہتان ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہوئے' نہ ہی اس پر راضی تھے اور نہ ہی اس پر خوش ہوئے۔ اور نہ ہی آپ نے کوئی سازش کی۔ آپ سے روایت کیا گیا ہے۔ اور آپ اپنے اس قول میں بالکل سچے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''اللہ کی قسم! میں نہ ہی قتل عثمان رضی اللہ عنہ میں شریک ہوا اور نہ ہی ایسی کوئی سازش کی۔''

دوسری روایت میں ہے آپ نے فرمایا: ''نہ ہی میں نے قتل کیا اور نہ ہی اس پر راضی تھا۔''

ایک روایت میں ہے: آپ نے سنا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں پر لعنت کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: ''اے اللہ! عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں پر خشکی اور سمندر میں اور پہاڑ اور وادی میں لعنت کر۔''

اہل شام کا عذر:

اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے اہل شام کے پاس جا کر جھوٹی گواہی دی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں میں شریک تھے۔ یہ گواہی آپ کی بیعت ترک کرنے کا سبب بنی تھی؛ اس لیے کہ ان لوگوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آپ ظالم ہیں؛ اور آپ کا شمار قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں ہوتا ہے۔ اور آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو اس وجہ سے پناہ دی ہوئی ہے کہ آپ اس قتل پر موافق تھے۔

اس طرح کی کئی ایک دیگر باتوں سے ان لوگوں کے قتال میں اجتہاد کی وجہ اور شبہ ظاہر ہو جاتا ہے جنہوں نے آپ سے جنگ کی تھی۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ بھی نہیں کہ آپ کے ساتھ قتال اور ترک بیعت کے متعلق اجتہاد میں انہوں نے حق بات تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اور نہ ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل ہو جانے کی وجہ سے یہ لازم آتا ہے کہ آپ اس قتل [میں شریک یا پھر اس] پر موافق تھے۔ بعض لوگوں نے علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ بھی عذر پیش کیے ہیں کہ:

۱۔ آپ ان لوگوں کو متعین طور پر نہیں جانتے تھے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔

۲۔ یا آپ یہ سمجھتے تھے کہ ایک آدمی کے بدلہ میں ایک پوری جماعت کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ آپ کے پاس مقتولین کے وارثوں نے قصاص کا مطالبہ نہیں کیا' جس کی روشنی میں قاتلین میں پکڑا جاتا۔

ایسے عذر پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اتنی قوت حاصل نہ ہو سکی تھی کہ آپ قاتلین عثمان کو قتل کرتے۔ اگر ایسے ہوتا بھی تو اس سے مزید فتنہ و فساد اور بہت بڑا شر پھیل جاتا۔ جبکہ بڑے فساد سے بچنے کیلئے چھوٹے فساد کو قبول کر لینا یہ مصلحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ پورا لشکر تھے۔ ان کے پیچھے ان کے قبائل تھے جو ان کا دفاع کر رہے تھے؛ اور جو لوگ براہ راست قتل میں شریک ہوئے تھے؛ قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے قبائل کے سرکردہ لوگ تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ آپ کے قتل کرنے پر قادر نہ ہو سکتے تھے۔ جب حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما قاتلین عثمان کو قتل کرنے کے لیے بصرہ کی طرف چل پڑے تو اس وجہ سے جنگ بپا ہوئی جس میں بہت ساری خلقت قتل ہوئی۔

جس چیز سے یہ معاملہ مزید واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جمع ہو گئے تھے؛ اور آپ مسلمانوں کے امیر عام بن گئے تھے؛ مگر اس کے باوجود آپ نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ میں سے جو لوگ باقی رہ گئے تھے' انہیں قتل نہ کر سکے۔ بلکہ یہ روایت کیا گیا ہے کہ: جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سفر حج کے لیے مدینہ پہنچے تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر سے آوازیں سنیں: ہائے امیر المؤمنین! ہائے امیر المؤمنین!۔'' آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہے جو ان کے خون کا مطالبہ کر رہی ہے۔ آپ نے لوگوں کو اسی حال میں چھوڑا؛ اور خود اس کی طرف چلے گئے؛ اور یوں گویا ہوئے: اے میری چچا زاد!'' لوگوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری اطاعت کی ہے۔ اور ہم غصہ کے باوجود ان کیساتھ بردباری اور تحمل مزاجی کا سلوک کر رہے ہیں۔ اگر ہم ان کے ساتھ بردباری نہ کریں تو وہ ہماری اطاعت ترک کر دیں۔ اور یہ کہ تم امیر المؤمنین کی بیٹی کی حیثیت سے عزت و اکرام کے ساتھ بیٹھو' اس سے

بہتر ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں کھیل بن جاؤ۔'' آج کے بعد میں نہ سنوں کہ تم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یاد کیا ہے۔''

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو کہ آپ کے قصاص کے طلب گار تھے؛ جو کہتے تھے کہ: آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ قتال میں حق پر ہیں؛ اس لیے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو قتل کرنا چاہتے تھے؛ مگر جب آپ کو قدرت واختیار حاصل ہو گیا؛ اور لوگ آپ کے ہاتھ پر جمع ہو گئے؛ تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلین کو قتل نہیں کیا؛ اگر چہ انہیں قتل کرنا واجب بھی تھا؛ اور اب آپ کو قدرت واختیار بھی حاصل تھا؛ تو مسلمانوں سے جنگ کیے بغیر یہ کام کر گزرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں سے جنگ کرنے کی نسبت زیادہ اولی واسہل تھا۔ اور اگر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل بھی کر دیتے تو اتنا بڑا فساد نہ پیدا ہوتا جتنا صفین کی راتوں میں ہوا تھا۔

اور اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے میں معذور تھے؛ خواہ اپنے عجز وکمزوری کی وجہ سے یا پھر فتنہ برپا ہونے کے اندیشہ سے؛ کیونکہ اس سے پھر جماعت بندی کا شیرزارہ بکھر جاتا [اور لوگ بغاوت کر جاتے] اور آپ کی حکومت کمزور ہو جاتی۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عذر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عذر سے زیادہ مقبول ہے۔ اس لیے کہ فتنہ گروں اور فسادیوں کو قتل کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سے مزید فتنہ پیدا ہوتا؛ اختلاف پیدا ہوتا؛ حکومت کمزور ہو جاتی؛ خواہ اس بارے میں جتنی بھی سخت کوششیں کی جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ فتنہ کے شر وفساد کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب فتنہ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب فتنہ برپا ہو رہا ہوتا ہے اس وقت وہ خوبصورت نظر آتا ہے؛ اور لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس میں خیر وبھلائی ہوگی۔ جب انسان اس کے شر وفساد کی تلخی کو چکھ لیتے ہیں تو اس کے نقصانات ظاہر ہوتے ہیں۔

دونوں گروہوں کی طرف سے جو لوگ اس فتنہ میں شریک ہوئے؛ انہیں اس جنگ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات کا علم نہیں تھا۔ اور انہیں اس فتنہ کے بپا ہونے تک اس کی تلخی کا اندازہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ یہ واقعات ان لوگوں کے لیے اور ان کے بعد آنے والوں کے لیے درس عبرت بن کر رہ گئے۔

جو کوئی مسلمانوں کے مابین واقعہ ہونے والے فتنوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے تو اس کے لیے واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے جس نے ان فتنوں میں شرکت کی ہو اور ان کی وجہ سے اس کا انجام کار قابل تعریف رہا ہو۔ اس لیے کہ ان فتنوں میں دین ودنیا کا نقصان ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فتنوں میں شرکت سے منع کیا تھا' اور ان سے بچ کر رہنے کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النور ٦٣]

''ان لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو آپ کے حکم کے خلاف کرتے ہیں کہ انھیں کوئی فتنہ آپہنچے، یا انھیں دردناک عذاب آپہنچے۔''

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق شبہ اور اس کا جواب]:

معترض کا یہ کہنا کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جنگ شروع کی۔''

[تو اس کا جواب یہ ہے کہ] ان لوگوں نے آپ کی اطاعت اور بیعت سے اپنے ہاتھ کو روکا؛ اور آپ کو ظالم اور خون عثمان رضی اللہ عنہ کا شریک قرار دینے لگے۔ آپ کے بارے میں جھوٹے لوگوں کی گواہی قبول کی۔ اور آپ کی طرف ایسی باتیں

منسوب کیں جن سے حقیقت میں وہ اللہ کے ہاں بری تھے۔''

❀ اب اگر کوئی کہے کہ: ''صرف اس بنا پر تو ان سے جنگ کرنا جائز نہ تھا۔''

❀ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''ایسے ہی دوسرے لوگوں کو قتل کرنا بھی آپ کے حق میں مباح نہ تھا؛ اس لیے کہ آپ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے سے عاجز تھے۔ اگر مان لیا جائے کہ آپ ایسا کر سکتے تھے' مگر نہیں کیا؛ تو اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے واجب ترک کیا؛ اس میں یا تو آپ تاویل کر رہے تھے' یا پھر گنہگار تھے۔ تو پھر بھی اس بنا پر جماعت مسلمین میں تفریق پیدا نہیں کی جا سکتی تھی اور نہ ہی آپ کی بیعت سے پیچھے رہنا اور آپ سے جنگ کرنا جائز تھا۔ بلکہ آپ کی بیعت کر لینے میں دین کے لحاظ سے ہر حال میں خیر اور بہتری تھی۔ اس میں مسلمانوں کے لیے بھی نفع تھا؛ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے زیادہ قریب تر تھا۔

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین باتیں پسند کرتے ہیں: ۱۔ تم اللہ کی بندگی کرو' اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ ۲۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو' اور آپس میں تفرقہ نہ کرو۔ ۳۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ تم پر حکمران بنا دے اس کے لیے خیر خواہی کرتے رہو۔''[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان مرد پر حاکم کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے خواہ اسے تنگی ہو یا آسانی؛ اور خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو۔ سوائے اس کے کہ اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے پس اگر اسے معصیت و نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ اس کی بات سننا لازم ہے اور نہ اطاعت۔''[2]

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تنگی اور آسانی میں پسند و ناپسند میں اور اس بات پر کہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور اطاعت کرنے کی بیعت کی۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم حکام سے حکومت کے معاملات میں جھگڑا نہ کریں گے۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہوں گے حق بات ہی کہیں گے اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ رکھیں گے))[3]

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص اپنے امیر کی کوئی ایسی بات دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہو تو اس پر صبر کرے، کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوا یقیناً اس اپنی گردن سے اسلام کا طوق اتار پھینکا۔''

اور ایک روایت میں ہے: ''جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر الگ ہوتا ہے، اور اسی حالت میں مر جاتا ہے، تو

---

[1] [رواہ البخاری ۲/ ۱۲۴، مسلم ۳/ ۱۲۴۱، موطأ ۲/ ۹۹۰]۔

[2] صحیح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح:۲۷۰ غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

[3] صحیح مسلم؛ امارت اور خلافت کا بیان: ح:۲۷۱ غیر معصیت میں حاکموں کی اطاعت کے وجوب...... کے بیان میں۔

اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔'' ❶

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اطاعت امیر سے ہاتھ نکال لیا تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اسکے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو اس حال میں مرا کہ اسکی گردن میں کسی کی بیعت نہ تھی وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' ❷

ایک روایت میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تین لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن بات بھی نہیں کریگا؛ اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور نہ ہی ان کی جانب دیکھے گا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا: پہلا وہ آدمی جو دنیا کی غرض کے لیے حاکم کی بیعت کرے۔ اگر اسے کچھ مل جائے تو خوش ہو جائے' اور اگر کچھ نہ ملے تو ناراض رہے......'' [البخاری ۳/ ۱۷۸؛ مسلم ۱/ ۱۰۳]

بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام ہی حاکم کیوں نہ ہو جس کا سر کشمش کی طرح (یعنی چھوٹا سا) ہو۔'' ❸

اہل کوفہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی؛ آپ کے وقت میں آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا خلافت کا حق دار نہیں تھا۔ آپ خلیفہ راشد تھے اور آپ کی اطاعت واجب تھی۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ قاتل کو قتل کرنا خون کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔ جب ایسا احتمال ہو کہ چند لوگوں کے قتل کیے جانے کی وجہ سے بہت بڑا فتنہ و فساد بپا ہوگا' اور اس سے کئی گنا زیادہ لوگ قتل ہو جائیں گے ؛ تو پھر ایسا کرنا نہ ہی اطاعت کا کام ہوتا ہے اور نہ ہی مصلحت ۔ صفین [اور جمل] کے موقع پر عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں سے کئی گنا زیادہ لوگ قتل ہو گئے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ: ''مسلمانوں کی تفرقہ بندی کے وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔'' [مسلم ۲/ ۷٤٥؛ سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]۔

یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حق کے اتنے زیادہ قریب نہیں تھے۔ [جیسا کہ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے]۔

اور ایسے ہی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا:

''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔'' یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا ہم نے عمار رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؟ ان کے قتل کے ذمہ دار تو وہ لوگ ہیں جو ان کو ہماری تلواروں کے نیچے لے آئے تھے۔'' ❹

اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے کئی کئی اسناد سے نقل کیا ہے۔ جن لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے انہیں قتل کیا۔ اور باغی جماعت سے مراد دم عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ ان تاویلات کا فاسد ہونا ہر خاص و عام کے لیے ظاہر ہے۔ یہ روایت بخاری اور مسلم میں صحیح اسناد کے ساتھ منقول ہے۔

❶ صحیح بخاری کتاب الفتن ۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "سترون بعدی اموراً تنکرونھا" (ح:۷۰٥٤) صحیح مسلم ۔ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین (ح:۱۸٤۹)۔

❷ صحیح مسلم: ح :۲۹٦۔ ❸ صحیح مسلم۔ أیضاً (ح: ۱۸۳۸)۔

❹ رواہ البخاری ٤/ ۲۱؛ مسلم ٤/ ۲۲۳٥۔ مسند احمد(٤/ ۱۹۹)، مستدرك حاکم(٤/ ۳۸٦، ۳۸۷)۔

فصل:

[حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات]

[**ساتواں اعتراض**]: [شیعہ مصنف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں] کہتا ہے: ''[اہل سنت] آپ کو کاتب وحی کہتے ہیں؛ حالانکہ اس نے وحی کا ایک لفظ بھی تحریر نہیں کیا۔''

[**جواب**]: مصنف کا یہ قول جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔[اس کے دیگر دعووں کی طرح یہ بھی کذب صریح ہے]۔اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ نے وحی کا ایک کلمہ تک نہیں لکھا' بلکہ آپ خطوط لکھا کرتے تھے۔؟ [1]

[**آٹھواں اعتراض**]: رافضی کا کہنا کہ:'' کاتبین وحی کی تعداد دس سے کچھ زیادہ تھی ان میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے خاص اور قریب ترین کاتب وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔''

[**جواب**]:اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا کرتے تھے۔جیسا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین کے مابین حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی آپ کے منشی تھے۔اس میں کوئی شک وشبہ والی بات نہیں۔

صحیحین میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [النساء ۹۵]
''نہیں برابر ہوسکتے مؤمنین میں سے بیٹھ جانے والے......''

تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کتابت وحی کا فریضہ سرانجام دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے منشی گیری[کتابت] کا کام کرنے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق؛ حضرت عمر فاروق؛ حضرت عثمان غنی؛ حضرت علی المرتضے؛ حضرت عامر بن فہیرہ؛ حضرت عبداللہ بن ارقم؛ حضرت ابی ابن کعب؛ حضرت ثابت بن قیس؛ حضرت خالد بن سعید بن العاص؛ حضرت حنظلہ بن الربیع الاسدی؛ حضرت زید بن ثابت؛ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں۔

[**نواں اعتراض**]: [رافضی کہتا ہے]:''امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی پوری مدت مشرک رہے۔''

[**جواب**]:اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت امیر معاویہ ان کے والد اور بھائی رضی اللہ عنہم اجمعین فتح مکہ کے موقع پر اسلام لائے۔یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تین سال پہلے کا واقع ہے۔تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہے کہ بعثت کا پورا عرصہ مشرک رہے؟جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس وقت معاویہ صغیر السن تھے۔ہند اسے کھیلایا کرتی تھی۔معاویہ رضی اللہ عنہ بھی فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں کے ساتھ اسلام لے آئے۔جیسے دوسرے لوگ آپ کا بھائی یزید؛ سہیل بن عمرو؛ صفوان بن امیہ؛ عکرمہ بن ابوجہل؛ ابوسفیان بن حرب؛ رضی اللہ عنہم اجمعین اسلام لائے۔یہ لوگ اسلام لانے سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ کی نسبت سے بڑے کافر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے دشمن اور برسر پیکار رہنے والے لوگ تھے۔

---

[1] رافضی قلم کار نے خود تسلیم کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ظاہر ہے کہ آپ کے خطوط میں بھی وہی بات ہوتی ہوگی جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئی ہو۔قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (سورۃ النجم)
علاوہ ازیں آپ لکھواتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھتے تھے کہ یہ وحی ہے یا غیر وحی۔جو صحابہ بھی آپ کی خدمت میں کتابت کا کام کرتے تھے وہ ہر ایسی چیز لکھتے جس کی ضرورت ہوتی تھی۔

صفوان' عکرمہ اور ابوسفیان احد کے موقع پر کفار کے لشکر کے سرادر تھے۔اور غزوۃ خندق کے موقع پر بھی بڑے سردار تھے مگر اس کے باوجود یہ تینوں اصحاب بعد میں بہترین مسلمان ثابت ہوئے ؛ اور یرموک کے موقع پر شہادت پائی ۔ اسلام لانے سے قبل معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کبھی بھی آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زبان یا ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچائی ہو۔ جو لوگ معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر دشمن اور مخالفت کرنے والے تھے ؛ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت کرنے والے بن گئے [یہاں تک کہ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کردیں] اور اللہ اور اس کا رسول ان لوگوں سے محبت کرنے لگ گئے تھے ۔تو پھر کون سی چیز اس راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان جیسے ہو گئے ہوں؟''

اپنی ولایت کے عرصہ میں آپ سب سے بااخلاق اور اعلیٰ سیرت و کردار کے حامل تھے۔آپ ان لوگوں میں سے تھے جو بہترین مسلمان ثابت ہوئے ۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ اور آپ کے بادشاہ بن جانے کا معاملہ نہ ہوتا تو آپ کا تذکرہ صرف خیر کے الفاظ میں ہی کیا جاتا ۔ جیسا کہ آپ جیسے دوسرے لوگوں کو صرف خیر کے ساتھ ہی یاد کیا جاتا ہے ۔ حالانکہ ان کا شمار بھی فتح مکہ کے موقع پر اسلام لانے والوں میں ہوتا ہے ۔ان لوگوں نے اسلام لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کئی ایک غزوات میں شرکت کی ۔ جیسے : غزوہ حنین ؛ غزوہ طائف ؛ غزوہ تبوک وغیرہ ۔آپ نے بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے جیسے آپ جیسے دوسرے صحابہ نے جہاد کیا تھا۔ پھر ان لوگوں کو کفار کیسے کہا جاسکتا ہے حالانکہ یہ لوگ سن آٹھ' نو' دس اور گیارہ ہجری کا عرصہ مؤمنین اور مجاہدین تھے؟

مکہ مکرمہ کی فتح رمضان سن آٹھ ہجری میں ہوئی ۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے ۔اور اس پر بھی لوگوں کا اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ربیع الاول سن گیارہ ہجری میں ہوئی ۔ایمان سے پہلے تمام لوگ ہی کافر تھے ۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے ؛ مگر پھر وہ اسلام لائے اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے ۔ جیسے ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچازاد بھائی تھا۔ آپ کی سب سے زیادہ ہجو کیا کرتا تھا۔اور اسلام سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سخت دشمنی رکھتا تھا۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور اس کا والد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سخت دشمنی رکھتے تھے ۔ یہی حال ان کی والدہ کا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جب مسلمان ہوگئی تو اس نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

'' اب سے پہلے روئے زمین پر کسی گھرانے کی ذلت مجھے آپ کے گھرانہ کی ذلت سے زیادہ پسند نہ تھی مگر اب روئے زمین پر کسی گھرانے کی عزت آپ کے گھرانے کی عزت سے زیادہ پسند نہیں ۔'' [صحیح بخاری:ح۱۰۲۹]

ان ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی:

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَّاللّٰهُ قَدِيْرٌ وَّاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

[الممتحنة ٧]

'' بہت قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ میں اور آپ کے دشمنوں میں محبت پیدا کردے اللہ کو سب قدرتیں ہیں اور اللہ غفور رحیم ہے۔''

بیشک اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے دشمنی رکھنے والے ابوسفیان' ہند اور دوسرے لوگوں کے مابین محبت پیدا کردی۔اور وہ ان لوگوں کی توبہ پر ان کے گناہ جیسے شرک وغیرہ بخشنے والا مہربان ہے۔وہ مؤمنین پر بڑا رحیم ہے۔اور یہ

سارے لوگ اس کے بعد اہل ایمان ہو گئے تھے۔

[**دسواں اعتراض**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''جب مکہ فتح ہوا تو معاویہ رضی اللہ عنہ یمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مورد طعن بتانے میں مشغول تھے۔ جب ان کے والد ابوسفیان حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کو عار دلانے کے لیے چند اشعار لکھے اور یہ بھی کہا کہ تم دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم اختیار کر کے صابی ہو گئے ہو۔ فتح مکہ کا واقعہ ہجرت کے آٹھویں سال پیش آیا۔ اس وقت تک معاویہ اپنے شرک پر قائم تھے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگ رہے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا۔ آپ بھاگ کر مکہ چلے گئے۔ جب کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مجبوراً بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف پانچ ماہ قبل اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ اور معافی طلب کرنے کیلئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر گر پڑے۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں سوال کیا؛ تو آنحضرت آپ کو معاف کر دیا۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سفارش کی کہ انہیں شرف بخشا جائے' اور کاتبین کی جماعت میں آپ کا بھی اضافہ کیا جائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی بات مان لی' اور دیگر چودہ کاتبین وحی کے ساتھ آپ کا بھی اضافہ کر دیا۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ آپ کاتب وحی تھے؛ تو اس مختصر سی مدت میں آپ نے کتنا نصیب کمایا ہوگا؟ جو اس کے بدلہ میں دوسروں کو چھوڑ کر آپ کو کاتب وحی کی صفت سے موصوف کیا جائے؟ حالانکہ زمخشری۔ جس کا شمار مشائخ حنفیہ میں ہوتا ہے۔ اپنی کتاب ''ربیع الابرار'' میں لکھتے ہیں: انہوں نے چار آدمیوں کیساتھ نبوت کا دعوی کیا تھا۔ جملہ کاتبین میں سے ایک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھا' جو مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ [النحل ۱۰۶]

''لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے تو ان لوگوں پر اللہ کا بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''ابھی یہاں ایک شخص آئے گا جس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہوگی۔'' اتنے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر باہر چل دیے تو آپ نے فرمایا: ''اللہ قیادت کرنے والے اور جس کی قیادت کی گئی ہے؛ دونوں پر لعنت کرے۔'' یعنی جس دن امت اس گستاخ معاویہ کے ساتھ ہوگی۔

معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ میں پورا زور لگایا۔ اور بہترین صحابہ کو موت کے گھاٹ اتارا۔ خلافت معاویہ میں برسر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیجی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اسی سال تک جاری رہا یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے اسے بند کیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر کھلایا اور اس کے بیٹے یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور ان کا مال و متاع لوٹا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد ابوسفیان نے غزوۂ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے دانت توڑے اور اس کی ماں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[[**سلسلۂ جوابات**]]: ہم تردیداً کہتے ہیں کہ: اللہ کی ذات پاک ہے جس نے کذب و دروغ کو روافض کا خاصہ

بنایا؛ اس بیچارے مصنف کا یہ حال ہے کہ اسے صحیح تاریخ کا بھی پتہ نہیں' ہم ان شاء اللہ اس کا مبلغ علم آگے چل کر پوری طرح واضح کریں گے؛ اور ایک ایک کر کے اس کے اعتراضات کا جواب دیں گے۔

[**گیارھواں اعتراض**]: جب مکہ فتح ہوا تو معاویہ رضی اللہ عنہ یمن میں نبی کریم ﷺ کو مورد طعن بتانے میں مشغول تھے۔ جب ان کے والد ابوسفیان حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو معاویہ نے ان کو عار دلانے کے لیے چند اشعار لکھے......۔''

[**جواب**]: اس اعتراض کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ معاویہ [فتح مکہ سے قبل] مکہ میں تھے' یمن میں نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے مکہ وارد ہونے سے پہلے اس وقت اسلام لائے تھے جس رات آپ مرّ الظہران [1] نامی مقام پر اترے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ابو

---

[1] ظہران چند مقامات کا نام ہے، اس سے مراد یہاں وہ وادی ہے جو مدینہ سے مکہ آتے ہوئے راستہ میں پڑتی ہے، اس وادی کے قریب ایک گاؤں مرّ نامی آباد تھا اس وادی کی مناسبت سے اسے مرّ الظہران کہنے لگے۔ اسی وادی میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے حدیث میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جس گھر کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہی جگہ ہے جہاں مکہ میں دولت عثمانیہ کے آخری دور میں ایک شفاخانہ ''مستشفی الغربان'' نامی تعمیر کیا گیا تھا۔ یادگار کے طور پر اس گھر کے ایک حصہ میں مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ محی الدین خطیب رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے بچشم خود خوبصورت عثمانی خط میں یہ الفاظ دیکھے: ''مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ فَھُوَ اٰمِنٌ'' گھر کے اندر مسجد کے قریب ایک حوض تھا جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ شاید مکہ میں صرف وہی ایک حوض ہے جس میں ہمیشہ پانی بہتا رہتا ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے گھر کو یہ عظیم خصوصیت اس لیے عطا ہوئی کہ مکہ کے لوگ جب نبی کریم ﷺ کو ایذا دیا کرتے تھے تو آپ ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں پناہ گزیں ہوتے۔ (دیکھیے :الاصابہ لابن حجر : ۲/ ۱۷۹، بروایت طبقات ابن سعد)۔

بدایں وجہ ابوسفیان وہ شخص تھا جو قرابت داری کی بنا پر آپ سے وابستہ تھا اور اس لیے محبت کیے جانے کا مستحق تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی﴾ (شوریٰ)

''آپ فرما دیں میں قرابت داری کی محبت رکھنے کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے سے پہلے بھی نبی کریم ﷺ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مابین قرابت دارانہ الفت و مودّت کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ نبی ﷺ نے عمرو بن امیہ کے ہاتھ ابوسفیان کو بہترین قسم کی کھجوریں ہدیہ کی تھیں۔ ابوسفیان نے یہ ہدیہ قبول کیا اور آپ کی خدمت میں چمڑے کا تحفہ بھیجا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے یہ ہدیہ خود طلب فرمایا تھا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے سے پیشتر نبی کریم ﷺ نے ان کی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا، ام حبیبہ کا نام رملہ تھا۔ یہ مسلمان ہو کر اپنے خاوند عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ چلی گئی تھیں۔ عبید اللہ وہاں نصرانی ہو گیا اور اسی جگہ اس کی موت واقع ہوئی۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں ''ام المومنین'' کہہ کر پکار رہا ہے۔ جونہی ان کی عدت گزری نجاشی شاہ حبشہ کی ایک لونڈی حاضر ہوئی اور کہا: ''شاہ حبشہ نے پیغام بھیجا ہے کہ نکاح کے لیے آپ اپنا وکیل مقرر کر لیں۔'' چنانچہ آپ نے خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے حکم سے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کی جانب سے چار صد دینار مہر ادا کیا۔ (مسند احمد(٦/ ٤٢٧) و مستدرک حاکم(٤/ ٢٠، ٢١) من طریق الواقدی سنن ابی داؤد۔ کتاب النکاح۔ باب الصداق (حدیث: ۲۱۰۷، ۲۱۰۸) مختصراً۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے نجاشی کی لونڈی کو چاندی کے دو کنگن ہدیہ کیے۔

م حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا مطالبہ کرنے میں نجاشی رحمہ اللہ کی جانب نبی کریم ﷺ نے عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجا۔ یہ وہی عمرو ہے جو کھجوروں کا ہدیہ لے کر ابوسفیان کے ہاں گیا تھا اور پھر ابوسفیان کا ہدیہ آپ کو پہنچایا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے قاصد شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ سے مدینہ پہنچیں۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ تاہنوز مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نبی کریم ﷺ کے نکاح میں آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی مدح کرتے ہوئے کہا: یہ مرد مجھے رسوا نہیں کرے گا۔'' (مستدرک حاکم(٤/ ٢٢) طبقات ابن سعد(٨/ ٩٩) و فی اسنادہ الواقدی متروک) ابوسفیان جب مشرف باسلام ہوئے تو نبی کریم ﷺ نے آپ کو قریش کے مشہور بت ''منات'' کو منہدم کرنے کیلئے مامور فرمایا۔ چنانچہ آپ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ غزوہ حنین و طائف کے موقع پر ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ غزوہ طائف میں ابوسفیان کی آنکھ میں تیر لگا۔ شدید درد ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں سرور کائنات نے فرمایا: ''اگر آپ چاہیں تو بارگاہ ایزدی میں آنکھ کی واپسی کے لیے دعا کروں اور آپ کو دوبارہ آنکھ عطا ہو، اور اگر آپ چاہیں تو اس کے عوض جنت خرید لیں۔'' ابوسفیان نے کہا میں جنت کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ وعدہ سرکار دو عالم نے جہاد کے موقع پر فرمایا۔ جو [حاشیہ جاری ہے]

ابوسفیان عز و وقار کے خواہاں ہیں۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: '' جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا سے امن دیا جائے اور جو مسجد میں داخل ہو وہ بھی امن کا مستحق ہے اور جو ہتھیار ڈال دے وہ بھی مامون ہے۔''❀

ابوسفیان دلائل نبوت سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایام صلح میں اسلام لانے سے چند ماہ قبل خود ہرقل کی زبان سے نبی کریم ﷺ کی رسالت کے براہین و دلائل سنے تھے۔ ❶ علاوہ ازیں امیہ بن ابی الصلت نے بھی [اس موقع سے] استفادہ کیا تھا۔ تاہم حسد ❷ کا جذبہ اسے ایمان سے مانع رہا، یہاں تک کہ بحالت مجبوری اس نے اسلام قبول کیا۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی یزید رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعہ مصنف نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اس کے ذکر کردہ اشعار بھی جھوٹے ہیں۔ اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا؛ اور تمام بتوں کو ختم کر دیا گیا۔ [ان خودساختہ اشعار میں جس بت عزی کا ذکر ہے] نبی کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ

[گزشتہ سے پیوستہ]: اکمل العبادات ہے، اس سے ابوسفیان کا جنتی ہونا واضح ہوتا ہے۔ خواہ اس کو ناپسند کرنے والا کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہو۔ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ابوسفیان اللہ کی راہ میں مسلسل جہاد کرتے رہے۔ ابن سعد بسند صحیح سعید بن مسیب سے روایت کرتے ہیں، وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ یرموک کے دن سب آوازیں خاموش ہو گئی تھیں صرف ایک آواز آ رہی تھی: '' يَا نَصْرَ اللّٰهِ اقْتَرِبْ. ''

سعید بن مسیب کے والد ان لوگوں میں سے تھے جو بیعت الشجرہ میں شامل تھے۔ یہ کہتے ہیں میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ پکارنے والا ابوسفیان تھا، جو اپنے بیٹے یزید کے جھنڈے تلے مصروف پیکار تھا۔ (اسد الغابة (٥/ ٢١٢) یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے کہ کذب و دروغ کے خوگر روافض کے نزدیک ان مجاہدین ابرار کی شان میں گستاخی کرنا اور ان کے بارے میں غلط سلط روایات بیان کرنا گویا کوئی جرم ہی نہیں۔ دوسری جانب اہل سنت کا یہ حال ہے کہ یہ سب بدگوئی سن کر اس لیے اَن سنی کر دیتے ہیں کہ مسلمانوں کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ یہ اچھی شیرازہ بندی ہے کہ خلفائے ثلاثہ اور ان مجاہدین صحابہ کی شان میں گستاخی کی جاتی ہے جنھوں نے اقصائے عالم میں دین حق کے جھنڈے گاڑے تھے اور ان کے سِیَر و سوانح کا حلیہ بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ادھر اہل سنت ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ یاد رہے کہ اسلام کی شیرازہ بندی کثرت تعداد سے نہیں بلکہ اکابر اولیاء اللہ مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے متبعین سے ہوتی ہے۔ جب تک لوگ ان مجاہدین ابرار کی محبت سے سرشار رہے اور اپنے آپ کو ان کے اخلاق و عادات سے آراستہ کیے رکھا، دین حق ترقی پذیر رہا۔ دین کی تفریق دراصل یہ ہے کہ روافض کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ صحابہ کے محاسن کو معائب بنا کر پیش کریں اور نہایت مذموم انداز میں ان کی تصویر کھینچیں۔

❀ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج۔ باب ما جاء فی خبر مکة (ح: ٣٠٢١، ٣٠٢٢)۔

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی۔ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول الله ﷺ (ح: ٧)، صحیح مسلم کتاب الجهاد۔ باب کتاب النبی ﷺ الی هرقل ملك الشام (ح: ١٧٧٣)۔

❷ حسد کے لفظ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کی جانب اشارہ کیا ہے جسے ابن سعد نے ابوالسفر سعید بن محمد ہمدانی ثوری التوفی ۱۱۲ھ سے روایت کیا ہے کہ ابوسفیان نے جب مرالظہران کے مقام پر دیکھا کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور ہر شخص آپ کے بہت قریب آنا چاہتا ہے تو آتش حسد سے جل اٹھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے اس کے سینہ پر دے مارے اور کہا: '' تب اللہ آپ کو رسوا کرے گا۔'' ابوسفیان نے کہا: ''میں توبہ کرتا اور اللہ سے اپنے گناہ کی مغفرت چاہتا ہوں۔ اللہ کی قسم! میرے جی میں یہ خیال ضرور آیا تھا۔ البتہ میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔''

ابواسحاق السبیعی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے مگر یہ الفاظ زائد ہیں کہ ابوسفیان نے کہا '' مجھے اسی وقت یقین آیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ابوسفیان حضرت عباس کی معیت میں مشرف باسلام ہونے کے لیے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ چند لمحات ابوسفیان پر اس وقت گزرے جب وہ اپنا پرانا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس کو حسد کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ابوسفیان جاہ و ریاست کی گود میں پلے تھے ایسے وقت میں ان کا کفر و ایمان کے مابین تردّد و تذبذب حبّ سیادت و قیادت کی دلیل ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ابھی تک ان کی ملاقات نبی کریم ﷺ سے نہیں ہوئی تھی اور وہ کلام الٰہی سے بھی ناآشنا تھے۔ بنابریں راہ ایمان پر مخلصانہ گامزن ہونے کے لیے ابوسفیان ایسے معجزہ کے محتاج تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوسفیان بارگاہ ایزدی میں تائب ہوئے اور دین اسلام آپ میں رچ بس گیا۔

بت توڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ بت عرفات کے قریب ایک جگہ پر نصب تھا۔ فتح کے بعد مکہ میں نہ ہی کوئی عزیٰ باقی رہا اور نہ ہی کوئی عزیٰ کی پوجا ترک کرنے پر ملامت کرنے والا باقی رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار کسی جھوٹے نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زبانی گھڑے ہوئے ہیں۔ اور اس کی جہالت کی انتہاء یہ ہے کہ اسے واقعات کا درست علم ہی نہیں۔

ایسے ہی آپ کے نانا ابو امیہ عتبہ بن ربیعہ اور ان کے ماموں ولید بن عتبہ' اور آپ کی والدہ کے چچا شیبہ بن ربیعہ اور اس کے بھائی حنظلہ کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے؛ یہ معاملہ جمہور قریش اور ان لوگوں کے مابین مشترک ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کے کافر رشتہ دار مکہ میں نہ ہوں۔ جو حالت کفر میں ہی قتل ہوئے' یا اپنی موت مر گئے۔ تو کیا پھر [ان کا کفر] ان لوگوں کے اسلام لانے میں کسی رسوائی کا سبب ہوسکتا ہے؟

جو لوگ متاخر الاسلام ہیں جیسے حضرت عکرمہ بن ابو جہل، صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ یہ بہترین مسلمانوں میں سے تھے۔[1] ان دونوں کے والد بدر کے موقع پر قتل ہو گئے تھے۔ اور ایسے ہی حارث بن ہشام[2] کا بھائی بھی بدر کے موقع پر قتل ہوا۔ ایسی باتیں سامنے رکھ کر طعن و تشنیع کرنا حقیقت میں تمام اہل ایمان پر طعن و تشنیع ہے۔ [ان پر طعن و تشنیع کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے]۔

کیا کسی کے لیے یہ جائز ہوسکتا ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر صرف اس وجہ سے طعن و تشنیع کرے کہ آپ کے چچا ابو لہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر طعن کرے کہ ان کا بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا۔ یا ابو طالب کے کفر کی وجہ سے حضرت علی یا حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو طعن دلائے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ طعن صرف وہی لوگ کر رہے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں؟

رافضی مصنف کے پیش کردہ اشعار خود اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ من گھڑت ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کی شان سے صادر شدہ نہیں۔ اس لیے کہ صحابہ کے ساتھ ان اشعار کی کوئی مناسبت ہی نہیں۔

رافضی کا یہ کہنا کہ: فتح مکہ کا واقعہ ہجرت مدینہ طیبہ کے آٹھویں سال رمضان میں پیش آیا۔

یہ درست ہے۔

[حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام]:

[بارھواں اعتراض]: شیعہ کہتا ہے: ''اس وقت تک معاویہ اپنے شرک پر قائم تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگ رہے تھے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو مباح الدم قرار دیا تھا۔ آپ بھاگ کر مکہ چلے گئے۔ جب کوئی جائے پناہ نہ ملی تو مجبوراً بارگاہ نبوی میں حاضر ہوکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف پانچ ماہ قبل اپنے اسلام کا اظہار کیا۔''

---

[1] صفوان کا شمار ان دس آدمیوں میں ہوتا ہے جو دورِ جاہلیت میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے۔ یہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو امان دی تھی اور ان کے چچا زاد بھائی عمیر بن وہب جمحی رضی اللہ عنہ ان کو لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے۔ (طبقات ابن سعد (٤/ ١٤٣۔ ١٤٧)

[2] حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ ابوجہل کے بھائی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ابن العم تھے۔ امام بخاری نے ان سے بڑی اہم روایات نقل کی ہیں۔ یہ شرفاء مکہ میں شمار ہوتے تھے اور کفار قریش کیساتھ جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ حسان بن ثابت نے جب بدر سے بھاگ جانے کی عار دلائی اور انھوں نے اشعار میں اسکا جو جواب دیا، کہا جاتا ہے کہ وہ اعتذار من الفرار میں عمدہ ترین اشعار ہیں۔ (مستدرك حاكم ٣/ ٢٧٩، الاصابة ١/ ٢٩٣)۔
صحيح بخاري، كتاب الحج۔ باب الحلق والتقصير عند الاحلال (حديث: ١٧٣٠)، صحيح مسلم، كتاب الحج۔ باب جواز تقصير المعتمر (حديث: ١٢٤٦)

[جواب]: اس قول کا جھوٹ ہونا صاف طور پر ظاہر ہے۔ یہ بات متفق علیہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس سال مشرف بہ اسلام ہوئے جس سال مکہ فتح ہوا تھا۔ شیعہ مصنف ابن المطہر کا یہ قول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نبی کریم ﷺ نے تالیف قلب فرمائی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولفۃ القلوب کو آپ نے جنگ حنین [ہوازن] کے مال غنیمت میں سے مال عطا کیا تھا۔ اور معاویہ بھی ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے تالیف قلب کیلئے مال عطاء فرمایا تھا۔ نبی کریم ﷺ قبائل کے سرداروں کی تالیف کے لیے انہیں نوازا کرتے تھے۔ اگر معاویہ یمن بھاگ گئے ہوتے، جیسا کہ شیعہ مصنف نے لکھا ہے، تو آپ مؤلفۃ القلوب میں سے نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ آپ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے پانچ ماہ قبل ہی اسلام قبول کیا ہو۔ تو پھر انہیں حنین کی غنیمت میں سے بھی کچھ حصہ نہ ملا ہوتا۔ اور اگر آپ ایسے ہی ایمان لائے ہوتے' تو پھر تألیف قلب کی ضرورت نہ ہوتی ❶۔''

جس چیز سے رافضی کا جھوٹ کھل کر واضح ہوتا ہے وہ یہ کہ اہل مکہ میں سے کسی ایک نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے میں اتنی دیر نہیں کی۔ نبی کریم ﷺ نے سن نو ہجری میں فتح مکہ کے سوا سال بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر روانہ فرمایا۔ اور یہ اعلان کروایا کہ اس سال کے بعد کوئی بھی مشرک حج نہ کرے۔ اور کوئی برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔ اس سال مشرکین کے ساتھ کیے گئے تمام وعدے واپس کر دیے گئے۔ اور انہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔ یہ مدت سن دس ہجری میں پوری ہوگئی۔ یہ امان تمام مشرکین عرب کے لیے عام تھی۔ سن نو ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اہل شام عیسائیوں سے جنگ لڑنے کے لیے غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے۔ اس موقع پر اسلام پورے عرب میں غالب ہو چکا تھا۔

معاویہ رضی اللہ عنہ کے خواہ جتنے بھی گناہ ہوں' وہ ان کے اسلام لانے سے ختم ہو چکے۔ تو پھر کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بغیر کسی معلوم شدہ گناہ کے آپ بھاگتے پھرتے ہوں' یا پھر آپ کا خون رائیگاں قرار دیا جائے؟

مغازی اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معاویہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کا خون فتح مکہ والے سال رائیگاں قرار دیا گیا تھا۔ یہ عروہ بن زبیر کی مغازی ہے؛ [ان کے علاوہ مغازی] الزہری؛ موسیٰ بن عقبہ' ابن اسحق' واقدی؛ سعید بن یحی اموی؛ محمد بن عائذ؛ ابن اسحق الفرازی اور دوسرے لوگ۔ اور ان کے علاوہ کتب تفسیر و حدیث تمام اس رافضی کے دعویٰ کے خلاف بول رہی ہیں' ان تمام مصنفین نے ان لوگوں کے نام ذکر کیے ہیں جن کا خون نبی کریم ﷺ نے رائیگاں قرار دیا تھا؛ جیسا کہ: قیس بن صبابہ؛ عبداللہ بن اخطل' ان دونوں کو قتل کر دیا گیا؛ ایسے ہی عبداللہ بن ابی سرح کا خون بھی

❶ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے مروہ پہاڑی پر تیر کے پھالے سے نبی کریم ﷺ کے بال کاٹے۔'' صحیح بخاری، کتاب الحج - باب الحلق والتقصیر عند الاحلال (حدیث: ۱۷۳۰)، صحیح مسلم، کتاب الحج - باب جواز تقصیر المعتمر (حدیث: ۱۲٤٦)۔ یہ واقعہ یا تو عمرہ قضا سن سات ہجری کا ہو سکتا ہے' یا فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد عمرہ جعرانہ کا۔ اس لیے کہ سن دس ہجری میں آپ نے عمرہ کر کے بال نہیں کٹوائے تھے۔ آپ حج قران کر رہے تھے' اور قربانی تک احرام میں ہی رہے تھے۔ حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں معاویہ بن ابی سفیان کے حالات زندگی میں میں تصریحاً لکھا ہے کہ حضرت معاویہ صلح حدیبیہ اور عمرۃ القضا کے درمیان اسلام قبول کر چکے تھے۔ البتہ قریش کے ڈر سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔'' واقعہ یہ ہے کہ دین اسلام قریش کے ذہین نوجوانوں کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا، صرف اتنا فرق ہے کہ جو لوگ ہجرت مکہ کی قدرت سے بہرہ ور تھے وہ مدینہ کا رخ کرتے اور مسلمانوں میں جا ملتے تھے، حضرت خالد بن ولید وعمرو بن العاص اور کعبہ کے کنجی بردار عثمان بن طلحہ عبدری رضی اللہ عنہم نے یونہی کیا تھا۔ جو نوجوان مکہ سے ہجرت نہیں کر سکتے تھے وہ مکہ میں اقامت گزیں رہ کر دعوت اسلام کی کامیابی کے منتظر رہتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا انہی لوگوں میں شامل تھے۔

رائیگان قرار دیا تھا؛ مگر اس نے بعد میں [اسلام قبول کرتے ہوئے] بیعت کر لی۔ جن لوگوں کا خون رائیگاں قرار دیا تھا وہ گنتی کے چند آدمی تھے؛ جن کی تعداد دس کے قریب ہے۔

ابوسفیان نبی کریم ﷺ کے سب سے بڑے دشمنوں میں سے تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے غزوہ بدر کے موقع پر مکہ مکرمہ آدمی بھیج کر مشرکین سے مدد طلب کی تھی۔ غزوہ احد کے موقع پر اس نے اپنے پاس موجود اموال جمع کیے اور لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس مال کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ میں خرچ کریں۔ اور غزوہ احد کے موقع پر مشرکین کے لشکر کا سب سے بڑا قائد یہی تھا۔ غزوہ خندق کے موقع پر بھی کافروں کے لشکر کی قیادت اسی کے ہاتھ میں تھی۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں بغیر کسی عہد و عقد کے اپنے ساتھ لیا اور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور یہ عرض گزاری کر رہے تھے کہ: اے اللہ کے نبی! یہ اللہ کا دشمن ابوسفیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر عہد و پیمان کے اسے آپ کے قبضہ میں دیدیا ہے؛ آپ اس کی گردن مار دیجیے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی باتوں کا جواب دیا۔ پس ابوسفیان نے اسلام قبول کرلیا اور نبی کریم ﷺ نے آپ کو امن دیدیا' اور آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا: ''جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا اسے امن دیا جائے اور جو مسجد میں داخل ہو وہ بھی امن کا مستحق ہے اور جو ہتھیار ڈال دے وہ بھی مامون ہے۔'' [یہ حدیث ابھی گزر چکی ہے]۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا خون کیسے رائیگاں قرار دیا جا سکتا تھا' جب کہ آپ اس وقت کم عمر تھے' اور آپ کا کوئی خاص گناہ بھی نہیں تھا۔ اور نہ ہی آپ کے متعلق یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے خلاف لوگوں کو ابھارا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑے بڑے گروہوں کے سرداروں کو امان دیدی تھی؛ تو پھر کیا سیرت کے باب میں لوگوں میں سب سے جاہل انسان کے علاوہ کوئی شخص ایسا گمان بھی رکھ سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے' اس پر اہل علم کا اتفاق ہے' اور اس مسئلہ پر لکھنے والے مؤرخین نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ہم نے اس موضوع پر اپنی کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول'' میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اور ان لوگوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جن کا خون فتح مکہ کے موقع پر رائیگاں قرار دیا گیا تھا۔ ہم نے وہاں پر ایک ایک کر کے سب کے نام لیے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان لوگوں میں سے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھے' مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں لیکر آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر خدمت ہوئے۔ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا' اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے خون کو محفوظ قرار دیدیا۔

[**تیرھواں اعتراض**] : شیعہ مصنف کہتا ہے: ''[اہل سنت] صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتب وحی سمجھتے ہیں۔''

[جواب] : یہ اہل سنت والجماعت پر محض ایک الزام ہے۔ اہل سنت میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہے جو یہ کہتا ہو۔ بلکہ ہم کہتے ہیں: ''آپ جملہ کاتبین وحی میں سے ایک تھے۔ جب کہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ مرتد ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے نبی کریم ﷺ پر الزام تراشی کی؛ مگر پھر دوبارہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔''

[**چودھواں اعتراض**]: شیعہ مصنف نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا﴾ [النحل ١٠٦] ''لیکن جو کوئی کفر کے لیے سینہ کھول دے......'' یہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی۔

[جــــواب] : یہ دعویٰ بالکل باطل ہے۔ یہ آیت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کفر یہ کلمات کہنے پر مجبور کیا گیا۔'' جب کہ ابن سرح کے ارتداد کا واقعہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں پیش آیا۔ اگر فرض محال یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ آیت ابن سرح کے بارے میں ہی نازل ہوئی تھی ؛ تو پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ' کیونکہ انہوں نے پھر اسلام قبول کرلیا تھا' اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۞ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۞ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [آل عمران ۸۶۔۸۹]

''اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا اور (اس کے بعد کہ) انھوں نے شہادت دی کہ یقیناً یہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ چکیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ لوگ! ان کی جزاء یہ ہے کہ بے شک ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ مہلت دیے جائیں گے۔ مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''

[پندرھواں اعتراض]: شیعہ مصنف کی ذکر کردہ حدیث یعنی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی روایت کہ : میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے سنا کہ فرما رہے تھے: ابھی ایک شخص نمودار ہوگا اس کی موت تارک سنت ہونے کی حالت میں ہوگی۔'' اتنے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے ۔ نبی ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر باہر چل دیے تو آپ نے فرمایا: اللہ قیادت کرنے والے اور جس کی قیادت کی گئی ہے۔ دونوں پر لعنت کرے۔'' یعنی جس دین امت اس گستاخ معاویہ کے ساتھ ہوگی۔''

جواب: اس سلسلہ میں کئی جوابات ہیں:

[پہلا جواب]: یہ ہے کہ حدیث کی صحت ثابت کیجیے۔ اس لیے کہ اثبات صحت سے پہلے کوئی حدیث قابل احتجاج نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ہم بطور مناظرہ کہتے ہیں' ورنہ ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ یہ اپنی طرف سے گھڑی ہوئی روایت ہے۔

دوسرا جواب: یہ روایت باتفاق محدثین موضوع ہے اور کسی قابل اعتماد کتاب میں اس کا ذکر نہیں۔ علاوہ ازیں یہ حدیث بلاسند ہے اور اس سے احتجاج کرنے والے شیعہ مصنف نے بھی اس کی کوئی معروف سند بھی بیان نہیں کی۔ شیعہ مصنف کی جہالت کا بین ثبوت ہے کہ اس حدیث کا راوی عبد اللہ بن عمر کو ٹھہرایا ہے۔ بھلا حضرت عبد اللہ ایسی حدیث کے راوی کیوں کر ہو سکتے ہیں جس میں صحابہ کے معائب و مثالب بیان کیے گئے ہیں [آپ صحابہ کرام کے متعلق لب کشائی کرنے والوں سے سب سے دور رہتے تھے] جب کہ آپ نے بہت سی وہ احادیث نقل کی ہیں جن میں صحابہ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مدح وستائش میں معروف ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

'' میں نے رسول کریم ﷺ کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی رئیس ایسا بردبار نہیں دیکھا۔ ان سے دریافت کیا

گیا، کیا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی آپ سے بڑھ کر نہ تھے۔؟ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ان سے افضل تھے۔''❶ [پھر دوبارہ آپ نے فرمایا: ''میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی رئیس ایسا بردبار نہیں دیکھا۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بردبار سردار معاویہ۔ ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے کریم وحلیم تھے۔''

- باقی رہا شیعہ کا یہ کہنا کہ: [[نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ دینے کے لیے اٹھے؛ اسی دوران معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے یزید کا ہاتھ تھام کر چلد یے]]۔
- تو اس کا جواب یہ ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات مختلف قسم کے ہوا کرتے تھے۔ آپ جمعہ، عیدین اور حج کے موقع پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد ابوسفیان رضی اللہ عنہ دیگر مسلمانوں کی طرح بالالتزام آپ کے خطبات میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا معاویہ رضی اللہ عنہ ہر خطبہ سے اٹھ جایا کرتے تھے اور سنتے نہ تھے ؟ ظاہر ہے کہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سب صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے موجب اہانت ہے کہ ہمیشہ دو شخص آپ کے خطبہ کے دوران اٹھ کر چلے جایا کریں [اور باقی صحابہ خاموش یہ تماشا دیکھتے رہیں]۔ ان دونوں کو جاتے رہنے دیں یہ نہ ہی کسی خطبہ میں حاضر ہوں اور نہ ہی جمعہ میں۔ نیز یہ کہ اگر وہ دونوں ہر خطبہ میں حاضر ہوا کرتے تھے تو اس سے اٹھ کر چلے جانے کا کیا معنی؟

اس پر مزید یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بڑے حلیم و بردبار اور صابر تھے، جیسا کہ آپ کی سیرت اور حالات زندگی میں یہ بات معروف ہے۔ مقام حیرت ہے کہ وہ اس صبر وحلم کے باوصف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نفرت کرتے تھے حالانکہ آپ دین و دنیا میں سب لوگوں کے سردار تھے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہر بات میں آپ کے محتاج بھی تھے۔ اور یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ آپ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے حالانکہ جب تاج وتخت سے بہرہ ور ہوئے تو لوگ آپ کے روبرو ان کو برا بھلا کہتے اور وہ خاموشی سے سنا کرتے تھے اور پھر حیرت بالائے حیرت اس بات پر ہے کہ ایسے شخص کو آپ کا تب وحی بھی مقرر فرماتے ہیں جو آپ کی بات ہی نہ سنتا ہو؟۔

[سولہواں اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''معاویہ نے اپنے بیٹے زید یا یزید کا ہاتھ پکڑا اور باہر چل دیا۔''

[جواب]: یہ صریح کذب ہے کیوں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی بیٹا زید نامی نہیں تھا۔ یزید جو آپ کے بعد تاج و تخت کا وارث بنا اور جس کے عہد میں سانحہ کربلا پیش آیا اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی ولادت عثمانی خلافت میں ہوئی؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ عہد رسالت میں معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

حافظ ابوالفضل ابن ناصر لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت میں رشتہ طلب کیا تھا؛ مگر مفلس ہونے کی بنا پر ان کی یہ آرزو بر نہ آئی۔ آپ کی شادی خلافت فاروقی میں ہوئی اور یزید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ۲۷ ہجری میں پیدا ہوا۔''

[تیسرا جواب]: مذکورہ حدیث کا تیسرا جواب یہ ہے کہ معارضہ کے طور پر ہم اس جیسی موضوع روایات بیان کر سکتے ہیں جن سے

❶ اسد الغابة (٥/ ٢٢١۔٢٢٢)، البداية والنهاية (٨/ ١٣٥)

حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔مشہور محدث ابوالفرج ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الموضوعات'' میں لکھتے ہیں:
''بعض مدعیان سنت نے شیعہ کو چڑانے کے لیے حضرت معاویہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی ہیں۔ دوسری طرف روافض نے ان کی مذمت میں حدیثیں وضع کیں۔فریقین نے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ ❶

[سترھواں اعتراض]: شیعہ کا کہنا ہے کہ:'' حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت سخت جنگ کی۔''

[جواب]: اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں لشکروں کے مابین صفین کے موقع پرلڑائی ہوئی۔ جناب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہرگز ان لوگوں میں سے نہ تھے جو جنگ شروع کرنا چاہتے ہوں۔ بلکہ آپ لوگوں میں سب سے بڑھ کراس بات کے حریص تھے کہ جنگ تک نوبت نہ آئے۔ جب کہ دوسرے لوگ جنگ وقتال کے لیے بڑے حریص تھے۔ جنگ صفین کے بارے میں علماء کرام کے کئی اقوال ہیں: ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ:''ان دونوں فریقوں میں سے ہرفریق مجتہد تھا'اور ان کا اجتہاد اپنی جگہ پر درست تھا۔'' ان کا کہنا ہے کہ دونوں حضرات مجتہد تھے۔یہ اکثر اشاعرہ' کرامیہ اور دیگر فقہاء کا قول ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب میں سے ایک گروہ اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔

کرامیہ کہتے ہیں: ان میں ہرایک حق پر تھا؛ اور بوقت ضرورت دوامیر مقرر کرنے جائز ہیں۔

ان میں سے ایک گروہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ: ان دو میں سے ایک گروہ حق پر تھا۔مگر وہ اس گروہ کو متعین نہیں کرتے۔

ایک گروہ کا کہنا ہے کہ:'' صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مجتہد تھے' مگر غلطی پر تھے۔ مذاہب اربعہ کے فقہاء اور اہل کلام میں سے بعض گروہوں کا یہی مسلک ہے۔ یہ تینوں اقوال ابوعبداللہ بن حامد نے امام احمد کے ساتھیوں سے نقل کیے ہیں۔

ان میں سے بعض یہ بھی کہتے ہیں:'' حق تو یہ تھا کہ ان کے مابین جنگ نہ ہوتی۔ جنگ کا ترک کرنا دونوں گروہوں کے حق میں بہتر تھا۔ اس لیے کہ جنگ میں کوئی بھی اصابت نہیں ہوتی۔مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب تھے۔ یہ قتال قتال فتنہ تھا' نہ ہی واجب تھا اور نہ ہی مستحب۔ اس قتال کا ترک کرنا ہی دونوں گروہوں کے حق میں بہتر تھا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حق کے زیادہ قریب تر تھے۔یہ قول امام احمد اور اکثر اہل حدیث اور اکثر ائمہ فقہاء کا ہے۔اور یہی قول بہت سارے اکابر صحابہ کرام اور تابعین کا ہے۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بھی یہی کہتے ہیں۔آپ لوگوں

❶ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت و سوانح میں متوسط راستہ وہ ہے جو قبل ازیں آپ کے حالات میں روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اختیار کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قباء کے مقام پر جو خواب دیکھا اور جس کا ذکر قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب یعنی بخاری و مسلم میں موجود ہے وہ بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ اس خواب کی تعبیر عملی طور پر اس وقت ظہور پذیر ہوئی جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ فتح قبرص کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بحری بیڑے میں شامل ہوکر جہاد کے لیے گئیں اور ان کی موت اسی جگہ واقع ہوئی۔ (بخاری، کتاب الاستئذان۔ باب من زار قوما فقال عندهم (ح:٦٢٨٢) مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الغزو فی البحر (ح:١٩١٢)۔ یہ امیر معاویہ جیسے ولی، صالح اور مجاہد فی سبیل اللہ کا اولین وصف ہے۔ آخری تعریف وہ ہے جو امام احمد نے اپنی تصنیف ''کتاب الزہد'' میں اس امام مظلوم (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) کے زہد وتقویٰ کے واقعات بیان کرتے ہوئے فرمائی۔ ہم نے اس ضمن میں مشہور ومعتبر مصادر و مآخذ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد مسلم سلاطین وخلفاء میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کوئی ہم سر پیدا نہیں ہوا۔ بنا بریں ان کی شان میں ایسی موضوعات گھڑنے کی قطعاً ضرورت نہیں جن کی جانب محدث شہیر ابن الجوزی نے اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح متعصب روافض کی من گھڑت روایات سے بھی ان کی شان میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی۔ مثلاً زیر تبصرہ حدیث جس کو روافض نے حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف منسوب کیا ہے اور جس کو دیکھ کر با انصاف شیعہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہوئے جاتے ہیں۔

کو اس جنگ میں اسلحہ بیچنے سے منع کیا کرتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ: یہ فتنہ میں اسلحہ کی فروخت ہے۔ یہی قول حضرت اسامہ بن زید، محمد بن مسلمہ، ابن عمر، سعد بن ابی وقاص؛ اور باقی زندہ رہنے والے اکثر سابقین اولین اور مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اس لیے اہل سنت والجماعت کا مذہب اور عقیدہ یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بپا ہونے والی لڑائیوں کے بیان کرنے سے اپنی زبانوں کو روک کر رکھا جائے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ثابت شدہ ہیں۔ اور ان سے دوستی اور محبت رکھنا واجب ہے۔ ان کے مابین جو کچھ ہوا اس کا ایسا عذر بھی ہوسکتا ہے جو انسان پر مخفی رہا ہو۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی اس لغزش سے توبہ کرلی تھی۔ اور ان میں سے کچھ ایسے ہی جن کے گناہ معاف کردیے گئے ہیں۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ہونے والے جھگڑوں میں پڑنے سے انسان کے دل میں بغض و مذمت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس معاملہ میں وہ غلطی پر ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اس معاملہ میں عاصی و گنہگار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ اپنے آپ کو بھی اور اپنے ان ساتھیوں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے جو اس کے ساتھ ایسے معاملات میں گفتگو کرتا ہے۔ جیسا کہ ان اکثر لوگوں کیساتھ یہ معاملہ پیش آچکا ہے جو اس موضوع کو اپنے لیے مشق سخن بنایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے ایسی باتیں کی تھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے ہاں ناپسندیدہ تھیں۔ اس کی وجہ یا تو ان لوگوں کی مذمت کرنا ہے جو مذمت کے مستحق نہیں ہیں۔ یا پھر ایسے امور کی مدح کرنے کی وجہ سے جو مدح کے قابل نہیں۔

فصل:

[حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین جنگ]

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ آزمائی کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خارج از اسلام نہیں ہو سکتے]۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جنگ آزمائی ایسے امور کی بنا پر تھی جن کی وجہ سے حضرت معاویہ خارج از اسلام نہیں ہو سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بخاری و مسلم کی روایت کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اقرب الی الحق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

''جب مسلمانوں میں فرقہ بندی کا ظہور ہوگا تو ایک فریق خروج کرے گا اور دوسرا فریق اس سے جنگ آزما ہوگا۔ یہ جماعت اقرب الی الحق ہوگی۔''[1]

خروج کرنے والے وہی لوگ تھے جو جنگ نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کیخلاف صف آرا ہوئے۔ اس حدیث سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت حضرت معاویہ کے گروہ کی نسبت اقرب الی الحق تھی۔

صحیح بخاری میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین مصالحت کرائے گا۔''[2]

مذکورہ بالا حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالحت کرانے کی بنا پر حضرت حسن کی مدح فرمائی اور دونوں جماعتوں کو

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الزکاۃ۔ باب ذکر الخوارج و صفاتهم (حدیث: ۱۵۳/ ۱۰۶۵)

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حدیث: ۲۷۰٤)

مومن قرار دیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قابل ستائش فعل صلح کرانا ہے نہ کہ جنگ آزما ہونا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ایک فتنہ بپا ہوگا اس میں بیٹھ رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہوگا۔''❶

آپ نے مزید فرمایا: ''عنقریب مومن کا سب سے بہتر مال بکریاں ہوگا، جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش والی جگہوں پر چلا جائے گا اور اس طرح اپنے دین کو فتنوں کی زد سے بچا لے گا۔''❷

جن صحابہ نے فتنہ سے احتراز و اجتناب کی حدیث روایت کی ہے مثلاً سعد بن ابی وقاص❸ و محمد بن مسلمہ❹ اور اسامہ رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں؛ انھوں نے جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی کا بھی ساتھ نہیں دیا تھا۔

فصل:

رافضی دعوی کا فساد

جب یہ معاملہ واضح ہوگیا تو اب کہا جائے گا کہ: رافضیوں کا عقیدہ سب سے برا اور بہت بڑے تناقض کا شکار ہے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کی بہت سخت مذمت کرتے ہیں جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قتال کیا۔ حالانکہ شیعہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح کرتے❺ اور ان کے فعل شنیع پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ جن لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ❻ کو قتل کیا' وہ ان لوگوں سے بڑھ کر مذمت کے مستحق اور گنہگار ہیں جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی۔ بیشک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسے خلیفہ تھے جن پر تمام لوگوں کا اجماع ہوگیا تھا۔ آپ نے کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا۔ باغی آپ کے خلاف نبرد آزما ہوئے تاکہ آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ آپ کا خلافت پر باقی رہنے کا عذر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے اطاعت کے مطالبہ کے عذر سے بڑھ کر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صبر کا مظاہرہ کیا یہاں تک کہ آپ انتہائی مظلومیت کی حالت میں شہید کردیے گئے۔ مگر آپ نے اپنی جان بچانے کے لیے جنگ نہیں کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ کی ابتداء کی۔ جب کہ وہ لوگ جنگ نہیں کرنا چاہتے تھے؛ لیکن وہ آپ کی بیعت نہیں کررہے تھے۔ اگر ان لوگوں سے جنگ کرنا جائز ہے جو کسی ایسے امیر کی بیعت نہ کرنا چاہتے ہوں جن کی بیعت آدھے مسلمان؛ یا اس سے کم یا زیادہ لوگ کر چکے ہوں؛ تو پھر ایسے لوگوں سے جنگ کرنا زیادہ اہم ہے جو ایسے امام یا خلیفہ سے جنگ کریں اور اسے قتل کر ڈالیں جس کی بیعت پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہو چکا ہو۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب تکون فتنۃ القاعد فیھا خیر من القائم، (حدیث: ۷۰۸۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الفتن۔ باب نزول الفتن کمواقع القطر (حدیث: ۲۸۸۶)

❷ صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ باب من الدین الفرار من الفتن (حدیث:۱۹)

❸ صحیح مسلم۔ کتاب الزھد۔ باب(۱)، (حدیث:۲۹۶۵)

❹ سنن ابن ماجۃ۔ کتاب الفتن، باب التثبت فی الفتنۃ، (حدیث:۳۹۶۲)

❺ صحیح بخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی (حدیث: ۷۱۱۰)، موقوفا علیہ

❻ قاتلین عثمان جنگ جمل میں حضرت علی کے لشکر میں تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے رفقاء جب قاتلین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لعنت بھیج رہے تھے تو یہ لوگ بذات خود سب کچھ سن رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم نوا ساتھ ساتھ آمین کہتے جاتے تھے۔ کوفہ کے بعض قاتلین عثمان جنگ صفین تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود تھے جب بھی ان کا ذکر آتا حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر لعنت فرماتے۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ❀ سے چند ایسے فعل سرزد ہوئے جو کہ آپ کے شایان شان نہ تھے۔

ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے خلیفہ کو خلافت سے معزول کرنا یا اسے قتل کر دینا جائز نہیں ہو جاتا۔ اگر ان امور کی وجہ سے امام کو معزول کرنا یا قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کا ترک کرنا' اور آپ سے انتقام لینا زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بنی امیہ کی اقرباء پروری کا الزام لگایا ہے' تو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ان کے خلاف شدت اور انصاف ترک کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ [[حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسے نامناسب افعال صادر ہوئے تھے جن کی وجہ سے بعض صحابہ ان کی بیعت میں دیر سے شریک ہوئے]]۔

مزید براں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا۔ حالانکہ آپ معزول کیے جانے کے مستحق نہ تھے۔ سرکار دو عالم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ آپ ﷺ نے نجران کے علاقہ پر ابوسفیان کو عامل بنا کر بھیجا۔ جب آپ نے وفات پائی تو ابوسفیان اس وقت بھی امیر نجران تھے۔ آپ کے بہت سے امراء اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً آپ نے عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا حاکم مقرر کیا۔ [1] اسی طرح خالد بن سعید بن عاص بن امیہ کو بنی مذحج اور صنعاء یمن کے صدقات واموال پر عامل مقرر فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات تک آپ اس عہدہ پر فائز رہے۔

حضرت عمرو کو تیماء؛ خیبر اور عرینہ کا عامل مقرر فرمایا۔ اور ابان بن سعید بن عاص کو اس وقت بحرین کے بحر و بر پر عامل مقرر کیا جب حضرت علاء حضرمی نے اپنے آپ کو اس معاملہ سے الگ کر دیا تھا۔ آپ بھی نبی کریم ﷺ کی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پہلے آپ کو سرایا کا امیر بھی بنایا تھا؛ ان میں سے ہی ایک سریہ بلاد نجد کی طرف تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو عامل مقرر کیا۔ آپ کی زندگی دین داری و سیاست رانی دونوں اعتبار سے بے داغ تھی۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

> ''تمہارے بہترین خلفاء وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تم سے محبت کرتے ہوں۔ تم ان کے لیے دعا کرو اور وہ تمھیں دعا دیں۔ بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں۔ تم ان پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔'' [2]

صحابہ کا قول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کا مصداق تھے اس لیے کہ رعیت آپ کو چاہتی تھی اور آپ رعیت کو چاہتے اوران کے لیے دعا کرتے تھے اور رعیت آپ کے لیے دعا کرتی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہے گا اور کوئی مخالف ان کو ضرر پہنچا سکے گا اور نہ رسوا کر سکے گا۔'' [3]

❀ روافض قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے مداح ہیں اور ان سے اظہار خوشنودی کرتے ہیں حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر لعنت بھیجتے اور ان کے فعل پر راضی ہونے والے کو بھی ملعون قرار دیتے تھے۔ جن لوگوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ لعنت بھیجتے ہوں کیا وہ آپ کے شیعہ ہو سکتے ہیں؟ دراصل یہ لوگ فتنہ پردازی میں پیش پیش ہیں۔ قاتلین عثمان کے اعتراضات اور ان کے جوابات کے لیے دیکھیے: ''العواصم من القواصم: ۶۱ تا ۱۴۱، یہ صفحات نادر تحقیقات پر مشتمل ہیں۔

[1] سنن نسائی، کتاب الاذان، باب کیف الاذان (حدیث:٦٣٣)، سنن ابن ماجة (٧٠٨، ٢١٨٩)

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب خیار الائمة و شرارهم (حدیث:١٨٥٥)

[3] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب (٢٨)، (حدیث:٣٦٤١)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارة، باب قوله صلی اللّٰه علیه وسلم "لا تزال طائفة من امتی (حدیث: ١٧٤ / ١٠٣٧)

مالک بن یخامر فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ اس سے اہل شام مراد ہیں۔ ❶

صحابہ کا خیال ہے کہ اس سے شامی لوگ مراد ہیں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں تھے۔

صحیح مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اہل مغرب ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔'' ❷

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل مغرب سے اہل شام مراد ہیں۔''

ہم نے دوسری جگہ اس پر مکمل گفتگو کی ہے، یہ نص عسکرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو شامل ہے۔

صحابہ کا قول ہے کہ: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بہت سے مقرر کردہ امراء سے افضل تھے۔ لہٰذا ان کو معزول کر کے سیاست میں ان سے فروتر درجہ کے لوگوں کو حاکم مقرر کرنے میں کوئی مصلحت مضمر نہ تھی۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زیاد بن ابیہ کو امیر مقرر کیا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو امیر رہنے دیں۔ لوگوں نے کہا: انہیں چند ماہ کے لیے عامل مقرر کر دیں او پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معزول کر دیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کر لینے میں مصلحت تھی۔ خواہ ایسا کرنا آپ کے استحقاق کی وجہ سے ہو یا پھر آپ کی تالیف قلب اور خیر سگالی و نرمی کے لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے والد جناب ابوسفیان کو والی مقرر کیا۔ معاویہ ان سے بہتر تھے۔ تو جو ہستی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہتر تھی اس نے ایسے انسان کو والی مقرر کیا جو معاویہ رضی اللہ عنہ سے کم تھا۔ [اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدستور والیٔ شام رہنے دیتے تو امت فتنہ پردازی اور خونریزی سے محفوظ رہتی]۔

اگر یہ کہا جائے کہ: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کی بنا پر ایسا کیا تھا۔''

تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی جو امور صادر ہوئے وہ ان کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔

مزید برآں یہ کیا اجتہاد ہے کہ بعض لوگوں کو ولایت و امارت پر فائز کیا جائے اور بعض کو محروم رکھا جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو امت میں خون ریزی کا باب اس حد تک کھل جائے کہ مسلمان ذلیل و خوار ہو جائیں اور کفار کو نیچا دکھانے کے قابل نہ رہیں بلکہ کفار میں مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی جسارت پیدا ہو جائے۔ اس بات میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر علی و معاویہ کے مابین جنگ صفین پیش نہ آتی۔ ❸ [اور دونوں حضرات اپنے اپنے علاقہ پر قابض رہتے] حضرت امیر معاویہ اپنی رعایا اور ران کی سیاست پر قائم رہتے' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی رعایا کی تدبیر وتنسیق و سیاست پر قائم رہتے [تو امت لڑائی کے فتنہ سے بچ جاتی اس لیے کہ لڑائی سے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوتے] اور امت میں اتنا فساد اور خون خرابہ نہ ہوتا جو اس جنگ و قتال کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ اس جنگ کی وجہ سے امت ہمیشہ تفرقہ بازی کا شکار رہی اور ایک امام پر جمع نہ ہو سکی۔ بلکہ خون ریزی کا سلسلہ تا دیر جاری رہا اور بغض و عداوت کے جذبات زور پکڑ گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گروہ جو اُقرب اِلی الحق

❶ البخاری، ح(۳٦٤۱) ❷ مسلم۔ کتاب الامارۃ، باب قولہ ﷺ" لا تزال طائفة من امتی ......"(ح:۱۹۲۵)

❸ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دین اسلام کے تحفظ و بقاء اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت میں جس حد تک اہتمام کیا تھا، اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم ایک عظیم لشکر کے ساتھ اسلامی سلطنت پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو آپ نے اس کو ان الفاظ پر مشتمل ایک خط لکھا: ''اللہ کی قسم! اگر تو اس حرکت سے باز آ کر واپس اپنے وطن نہ لوٹا تو میں اپنے چچا زاد بھائی (حضرت علی) سے صلح کر لوں گا اور ہم دونوں تجھے تیرے ملک سے نکال کر دم لیں گے اور اللہ کی زمین کو تجھ پر تنگ کر دیں گے۔'' شاہ روم یہ خط پڑھ کر ڈر گیا اور اپنے ارادہ سے باز رہا۔

تھا کمزور ہوکر صلح کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوا۔ حالانکہ شروع میں آپ صلح کے طلبگار نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ جس فعل کی مصلحت اس کے فساد پر غالب ہو، اس کا وجود پذیر ہونا اس کے نہ ہونے کی نسبت زیادہ خیر و برکت کا موجب ہوتا ہے۔ موضوع زیر بحث میں بھی لڑائی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ بلکہ لڑائی نہ ہونے کے فوائد و مصالح کہیں بڑھ کر تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کثرت تعداد اور قوت و شوکت کے لحاظ سے برتر تھی۔ اور حضرت معاویہ ان سے مصالحت و موافقت اور جنگ بندی کرنے کے لیے تیار تھے۔ جس اجتہاد سے اس قدر تباہ کن نتائج ظہور پذیر ہوں، اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس میں بے گناہ تصور کیا جائے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد میں بالاولیٰ عفو و درگزر کے مستحق ہوں گے۔

- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اعوان و انصار کہتے تھے: ''لڑائی کا آغاز کرنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، ہم صرف اپنی جانوں اور اپنے ملک کی مدافعت کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہم سے جنگ کا آغاز کیا تو ہم نے اس کا جواب جنگ کی صورت میں دیا۔ اور ہم نے جنگ کا آغاز نہیں کیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم و تعدی کا ارتکاب بھی نہیں کیا۔''

جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے رفقاء سے یوں کہا جاتا: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ واجب الاطاعت امام ہیں اور ان کی بیعت آپ کے لیے ناگزیر ہے، کیوں کہ بیعت نہ کرنے سے مسلمانوں میں تفرقہ بازی پیدا ہوتی ہے۔''

تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے: ''ہمیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واجب الاطاعت امام ہونا کسی دلیل سے معلوم نہیں۔'' خصوصاً شیعہ کے ہاں امامت نص سے ثابت ہوتی ہے۔ اور ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی کوئی نص موصول نہیں ہوئی جس کی روشنی میں آپ کی امامت اور اطاعت واجب ہوتی ہو۔''

ظاہر ہے کہ اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ عذر معقول ہے۔ اس لیے کہ شیعہ امامیہ جس نص جلی کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر اسے حق بھی فرض کر لیا جائے (حالانکہ وہ باطل ہے)[1] تو یہ نص ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم خلفاء ثلاثہ کے عہد خلافت میں پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ تو پھر ہم کیسے واجب کر سکتے ہیں کہ اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ اس سے آگاہ ہوں۔ یہ مفروضہ اس صورت میں ہے جب نص مذکور حق ہو؛ مگر وہ حق نہیں بلکہ باطل ہے۔

- شیعہ کا یہ کہنا کہ: ''خلافت تیس سال تک ہوگی۔'' وغیرہ۔

[جواب]: یہ احادیث [اس وقت] اتنی مشہور نہیں تھیں کہ وہ لوگ بھی اس کو جانتے ہوتے۔ یہ روایت چند خاص لوگوں نے نقل کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری اور مسلم وغیرہ جیسے محدثین نے بھی یہ روایت نقل نہیں کی۔ جب عبدالملک بن مروان جیسے انسان پر یہ حدیث مخفی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا:

''اے عائشہ! اگر تمہاری قوم سے جاہلیت کا زمانہ قریب نہ ہوتا تو میں خانہ کعبہ کو منہدم کر دیتا اور [اس میں سے جو حصہ نکال دیا گیا ہے اسے میں اس میں شامل کر دیتا] اور اس کو زمین سے ملا دیتا اور اس میں دو دروازے رکھتا۔''[2]

جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی تعمیر کو منہدم کر دیا گیا' اور اس تک یہ روایت پہنچی تو اس نے کہا: ''میری تمنا تھی کہ

---

[1] اہل سنت کے نزدیک وہ نص باطل ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسی کوئی نص موجود ہوتی تو اصحاب ثلاثہ کی دین داری، اخلاق و مروّت اور حکومت و سلطنت سے بیزاری کی بنا پر توقع کی جاتی تھی کہ سب سے پہلے وہ اس نص پر عمل کرتے۔

[2] رواہ البخاری ' حج کا بیان: ح:236۔ مکہ کی فضیلت اور اس کی عمارتوں کا بیان۔

جو کام آپ نے کیا تھا وہ میرے ہاتھوں سے ہوا ہوتا۔''

حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بالکل صحیح اور متفق علیہ ہے۔ پس اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کہ: ''میرے بعد خلافت تیس سال تک ہوگی' اور پھر اس کے بعد بادشاہت ہوگی۔'' بالاولی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب پر مخفی رہی ہوگی۔ حالانکہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ابتداء تھی؛ اور اس حدیث میں کسی کی ذات کا کوئی تعین نہیں تھا۔ یہ دلالت تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اس نص کی روشنی میں معلوم ہوئی۔ حالانکہ اس حدیث میں کسی متعین خلیفہ کی تحدید نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''جب وہ ہمارے ساتھ ہماری نصرت کے بارے میں اپنی عاجزی یا تاویل کی وجہ سے انصاف نہیں کر سکتے؛ تو ہم پر بھی یہ لازم نہیں ہوتا کہ ہم اس انسان کی بیعت کریں جس کے دور میں ہم ظلم کی شکایت کرتے ہیں' جو لوگ ہم سے جنگ کرنے کو جائز کہتے ہیں؛ ان کا کہنا ہے: ''ہم باغی ہیں'' ۔اور بغاوت کرنا ظلم ہے۔ اگر صرف ظلم کی وجہ سے قتال حلال ہو جاتا ہے' تو یہی ظلم بیعت ترک کرنے کے جواز میں زیادہ اولی اور مناسب ہے۔ اس لیے کہ جنگ کرنے میں بغیر جنگ کے بیعت ترک کر دینے سے بڑھ کر فساد ہے۔''

- اگر شیعہ کی طرف سے یہ کہا جائے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ ان پر ظلم نہیں کرنا چاہتے تھے' بلکہ آپ عدل قائم کرنے میں مجتہد تھے' وہ ان کے ساتھ بھی عدل کرنا چاہتے تھے اور ان پر عدل قائم کرنا چاہتے تھے۔
- تو اسکے جواب میں [اصحاب معاویہ کی طرف سے] کہا جاسکتا ہے کہ: ''ہم بھی عمداً بغاوت نہیں کرنا چاہتے؛ بلکہ ہم ان کیساتھ اور اپنے ساتھ عدل کرنا چاہتے ہیں۔اور اگر مان لیا جائے کہ ہم تاویل کی بنا پر باغی بھی ہیں' تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جنگ شروع کرنے کا حکم نہیں دیا؛ اور فقط کسی کی بغاوت سے اسے قتل کرنا حلال نہیں ہو جاتا۔ بلکہ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [الحجرات ۹]

''اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔''

یہاں پر اللہ نے پہلے ان کے مابین صلح کرانے کا حکم دیا ہے۔اور پھر یہ ارشاد فرمایا: ﴿فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾ [الحجرات ۹] ''پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔''

یہ زیادتی و بغاوت قتال و جنگ کے بعد کی ہے؛ کہ دو جنگجو گروہوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرتا ہے۔ جنگ کے بغیر کوئی زیادتی اور بغاوت نہیں۔پس اس بنا پر صرف زیادتی کی وجہ سے کسی کو قتل کرنا حلال نہیں ہو جاتا۔

[اٹھارھواں اعتراض]: شیعہ کا یہ قول کہ ''معاویہ رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک کثیر جماعت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ مقتولین کسی ایک جماعت میں محدود نہ تھے بلکہ ہر فریق نے فریق مخالف کے اعوان و انصار کو قتل کیا۔حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے جو جنگ آزما لوگ تھے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے کسی کے بھی اطاعت کیش نہ تھے۔ جبکہ حضرت علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں مصالحت چاہتے تھے اور خون ریزی سے بیزار تھے۔لیکن اس واقعہ کے پیش آنے میں دونوں [فسادیوں کے سامنے] مغلوب ہو گئے تھے۔[ان دونوں کے رفقاء

یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے]۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ فتنہ کی آگ جب ایک مرتبہ مشتعل ہو جاتی ہے تو دانش مندوں کے بجھائے بھی فرو نہیں ہوتی۔ فریقین میں اشتر نخعی؛ ہاشم بن عتبہ [1]، عبدالرحمٰن [2] بن خالد بن ولید؛ اور ابو الاعور السُّلَمِی [3] جیسے لوگ تھے جو جنگ کی آگ کو فرو نہیں ہونے دیتے تھے۔

کچھ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شدید حمایت کرتے تھے اور کچھ ان کے خلاف تھے۔ دوسری طرف حامیان علی رضی اللہ عنہ تھے اور کچھ لوگ ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں جو لوگ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حامی تھے، وہ ذات معاویہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر اسباب و محرکات کی بنا پر شریک جنگ ہوئے تھے۔ جنگ، فتنہ اور قتال جاہلیت کی طرح ایک ہی قسم کے مقاصد و

---

[1] ہاشم بن عتبہ المرقال حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھتیجا تھا۔ اس نے اپنے چچا کے ساتھ جنگ قادسیہ میں حاضر ہوکر بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ حضرت سعد نے جو لشکر جلولاء کے مقام پر یزدگرد شاہ ایران سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔ ہاشم اس کے سپہ سالار تھے، جنگ صفین میں ہاشم نے حضرت علی کا ساتھ دیا، یہ آپ کی فوج کے علم بردار تھے۔ یہ جنگ صفین میں مارے گئے۔

[2] ایک قدیم مورخ سیف بن عمر تمیمی جس سے مورخ طبری بھی استفادہ کر چکے ہیں، لکھتا ہے: ''عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے والد کے ساتھ فتوحات شام میں شریک تھے۔ یہ اس وقت بالکل نوعمر تھے۔ ابن سعد نے ان کو تابعین مدینہ کے طبقۂ اوّل میں شمار کیا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کے زمانہ میں مسلمانوں نے رومیوں سے جو جنگیں لڑیں۔ یہ ان میں سپہ سالار ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ ابو ایوب انصاری جیسے مقتدر صحابہ آپ کے زیر قیادت شریک جہاد ہوئے۔ عبدالرحمٰن اس وقت عنفوان شباب میں تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے چار عجمی کافر قید کیے اور حکم دیا کہ انھیں تیروں سے قتل کیا جائے، جب حضرت ابو ایوب کو پتہ چلا تو انھوں نے اس سے منع فرمایا اور کہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ عبدالرحمٰن نے اس گناہ کی پاداش میں چار غلام آزاد کیے۔ (سنن ابی داؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب فی قتل الاسیر بالنبل (حدیث: ۲۶۸۷)، وسندہ ضعیف اس کی سند میں بکیر بن الاشج راوی مجہول الحال ہے۔ خلافتِ عثمانی میں حضرت معاویہ نے عبدالرحمٰن کو ملک شام کی شمالی جانب حمص سے لے کر جزیرہ ابن عمر تک کا حاکم مقرر کیا تھا۔ آپ نے ایک بیدار مغز اور جرأت مند حاکم کی طرح اپنے فرائض منصبی ادا کیے۔ خلافت عثمانی میں جب فتنہ پردازوں نے کوفہ میں شرانگیزی کا آغاز کیا تو حضرت عثمان نے ان کو معاویہ کی خدمت میں بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت معاویہ نے اپنے حلم و ادب کے ذریعہ ان کی اصلاح کرنا چاہی مگر وہ حلم و ادب کی لغت سے واقف ہی نہ تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت معاویہ نے ان کو عبدالرحمن بن خالد کے پاس بھیجا۔ عبدالرحمٰن نے ان کو متنبہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے: ''اے شیطان کے آلہ کار! میں تمھیں خوش آمدید نہیں کہنا چاہتا۔ اب شیطان تھک کر عاجز آ گیا ہے، مگر تمہاری پھرتی و چالاکی میں کمی نہیں آئی۔ اللہ عبدالرحمٰن کو ناکارہ کردے، اگر ادب سکھا کر وہ تمھیں فرماں بردار نہ بنائے۔ اے ان لوگوں کے گروہ جن کے متعلق مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ عرب ہیں یا عجم۔ تمھیں واضح ہو کہ میں اس خالد بن ولید کا بیٹا ہوں جو بڑی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ جنھوں نے فتنہ ارتداد کی آگ کو فرو کیا۔ اے صعصعہ بن ذل! اگر مجھے پتہ چلا کہ میرے رفقاء میں سے کسی نے میری ناک توڑی اور پھر تجھے دودھ پلایا تو میں تجھے عبرتناک سزا دوں گا۔'' (تاریخ طبری: ۵/ ۸۷)
عبدالرحمٰن بن خالد کہا کرتے تھے: ''جس کی خیر سے اصلاح ممکن نہ ہو اسے شر کے ذریعے ٹھیک کر سکتے ہیں۔'' یہ سن کر سب شریر عبدالرحمٰن سے کہنے لگے: ''ہم بارگاہ ایزدی میں توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف فرمایئے اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے۔'' (طبری: ۵/ ۸۷۔ ۸۸)
مگر ان کی یہ توبہ مخلصانہ نہ تھی۔ رہا ہوکر انھوں نے حج کرنے کے بہانے سے امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ عبدالرحمٰن بن خالد جنگ صفین میں حضرت معاویہ کے ہم راہ تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

[3] ابو اعور کا اصلی نام عمر بن صفوان ذکوانی ہے۔ ذکوان بنی سُلیم کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ یہ صحابی ہیں غزوۂ حنین کے بعد اسلام لائے۔ محمد بن حبیب لکھتے ہیں: ''حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف دیار و امصار کے امراء کو لکھا تھا کہ ہر علاقہ میں سے ایک صالح ترین شخص آپ کی خدمت میں بھیجا جائے۔ چنانچہ بصرہ، کوفہ اور شام و مصر سے چار آدمی آپ کے یہاں بھیجے گئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ چاروں قبیلہ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں سے ایک ابو اعور سُلَمی تھے۔ امام مصر حضرت لیث بن سعد فرماتے ہیں: ''جب ۲۳ھ میں عموریہ کی جنگ ہوئی تو اس میں مصری فوج کے امیر وہب بن عمیر جمحی تھے اور شامی لشکر کے سپہ سالار ابو اعور سلمی تھے۔'' ابو زرعہ اپنی تاریخ دمشق میں لکھتے ہیں: ''۲۶ھ میں ابو اعور سلمی نے قبرص کی جنگ میں شرکت کی تھی۔'' جنگ صفین میں ابو اعور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں تھے اور بہت بڑے قائد خیال کیے جاتے تھے۔ ان کی شجاعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابو اعور نے یہ سمجھ کر اشتر نخعی کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔

اعتقادات کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقاصد مختلف ہوا کرتے ہیں، امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب فتنہ بپا ہوا تو اصحاب رسول کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اجماع کر لیا تھا کہ جس خون، مال یا عفت و عصمت کو بنا بر تاویل حلال کیا گیا ہو وہ ہدر (جس پر شرعی سزا نہ دی جائے) ہے؛ اور اس جاہلیت کا سا معاملہ سمجھا۔''

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے لعنت کا تعلق ہے، فریقین دعا میں ایک دوسرے پر لعنت کرتے تھے؛ جیسا کہ ان کے مابین جنگ بھی بپا ہوئی۔ ان کے سردار اُن پر اپنی دعاؤں میں لعنت کرتے تھے' اور دوسرے گروہ کے سردار پہلے گروہ کے بڑوں پر لعنت کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں سے ہر گروہ دوسرے کے خلاف دعاء قنوت پڑھ کر بددعا کرتا تھا ۔کسی کے خلاف جنگ آزما ہونا اس پر لعنت بھیجنے سے بھی عظیم تر ہے۔ لعنت بھیجنے کا فعل خواہ گناہ ہو یا صحیح و غلط اجتہاد پر مبنی ہو، اللہ کی مغفرت کا حصول بنا بر توبہ گناہوں کا ازالہ کرنے والے اعمال صالحہ اور گناہوں کا کفارہ بننے والے حوادث و آلام کی وجہ سے ممکن ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ روافض سَبِّ علی کو ناپسند کرتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کرنے اور ان کو اور ان سے محبت رکھنے والوں کو برا بھلا کہنے سے نہیں شرماتے۔ بخلاف ازیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے احباب و انصار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کرتے، آپ کی تکفیر صرف خوارج کرتے ہیں، جو دین اسلام سے نکل چکے ہیں، رافضہ ان سب سے برے ہیں۔ اگر خوارج اس گالم گلوچ کا انکار کرتے تو ان کے قول میں تناقض ہوتا۔ تو پھر رافضی اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک کو گالی دینا جائز نہیں۔ نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور نہ ہی ان دونوں کے علاوہ کسی اور کو۔ پھر جو کوئی حضرات ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کو گالی دے' اس کا گناہ اس سے بڑھ کر ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دے۔ اگرچہ ان صحابہ کو گالی دینے والا کسی تاویل کا بھی شکار ہو؛ تو اس کی تاویل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دینے والے کی تاویل سے بڑھ کر فاسد اور بے کار ہے۔ اگر ان صحابہ کو تاویل کی وجہ سے گالی دینے والا برا نہیں ہے تو پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی برے نہیں ہو سکتے۔ اور اگر یہ حرکت مذموم ہے' تو پھر شیعہ جو کہ خلفاء ثلاثہ کو گالی دیتے ہیں وہ نواصب سے بڑھ کر مذمت کے مستحق ہیں جو کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالی دیتے ہیں۔ خواہ جس زاویہ سے بھی اس معاملہ کو لیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ شیعہ سب سے زیادہ حق سے دور ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے صحابہ کو گالی نہ دو، مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے پہاڑ جتنا سونا بھی خرچ کرے، تو وہ ان کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔''[1]

[حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قاتل کون؟]:

[انیسواں اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''معاویہ رضی اللہ عنہ نے حسن کو رضی اللہ عنہ زہر کھلایا تھا۔''

[جواب]: بعض لوگوں نے یہ بات کہی ہے۔[2] مگر کسی شرعی دلیل و برہان سے یا کسی معتبر کے اقرار یا کسی سچے ناقل کے کلام سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی اس کا علم ممکن ہے۔ پس یہ کہنا کہ آپ نے حضرت حسن کو زہر دیا تھا؛ بغیر علم

---

[1] صحیح بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قول النبی ﷺ، لو کنت متخذاً خلیلاً (ح:۳۶۷۳)، مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب تحریم سب الصحابة رضی اللہ عنہم (ح:۲۵٤۱) العواصم من القواصم: ۳۲ تا ۳٤۔

[2] یہ شیعہ کا قول ہے، جو بلا دلیل و ثبوت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اتہام طرازی کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ اس کے قائل ہیں جو شیعہ کے دام فریب میں آ کر ان کے جھوٹے اقوال سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

کے بات ہے۔ ہمارے اس زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ کو زہر دے کر قتل کیا گیا۔ مگر لوگوں کا اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جس جگہ و مقام پر جس قلعہ میں اس بادشاہ کا انتقال ہوگیا ہو وہاں کے رہنے والوں میں بھی اس حقیقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہر آدمی دوسرے کے برعکس کوئی اور بات کہتا ہے۔ کوئی ایک کہتا ہے: اس کو فلاں نے زہر دی۔ دوسرا کہتا ہے: نہیں اسے فلاں نے زہر دی؛ کیونکہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آ گیا تھا۔ یہ حال تو آپ کے زمانے میں پیش آنے والے واقعات کا ہے۔ اور ان لوگوں کا بیان ہے جو خود اس قلعہ کے اندر موجود تھے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ممکن بھی ہے۔ اس لیے کہ زہر دے کر قتل کیے جانے والے کی موت کسی پر مخفی نہیں رہتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیوی نے آپ کو زہر کھلایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی موت مدینہ طیبہ میں واقع ہوئی۔ جب کہ معاویہ رضی اللہ عنہ شام میں تھے۔ اس بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو بھیجا ہو' یا پھر کسی کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی بیوی نے آپ کو زہر اس لیے دیا چونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کثرت سے طلاق دیا کرتے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ان کی بیوی نے کسی مقصد کے لیے آپ کو زہر کھلایا ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس عورت کے والد اشعث بن قیس نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر کھلانے کا حکم دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندرونی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ و حسن رضی اللہ عنہ سے منحرف ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے والد کو اس بات پر مامور کیا تھا۔ یہ ظن محض ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ" [1]

''بدگمانی سے بچو، کیوں کہ یہ بڑی جھوٹی بات ہے۔''

خلاصہ یہ کہ باتفاق مسلمین شرعاً ایسی بلا دلیل بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس پر کسی کی مدح یا مذمت کا ترتب درست ہے۔

[حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کس نے قتل کیا]:

[بیسواں اعتراض]: [**شبہ**] کہتے ہیں: ''معاویہ کے بیٹے یزید نے حضرت حسین کو قتل کیا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنایا۔''

[جواب]: یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید نہیں کیا' اور نہ ہی آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا؛ اس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔ مگر اس نے ابن زیاد کو یہ خط لکھا کہ آپ کو عراق کی ولایت سے روکے۔ جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اہل عراق آپ کی نصرت کریں گے؛ اور آپ کی طرف لکھے گئے وعدے پورے کریں گے۔ [2] چنانچہ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ جب انھوں نے دھوکہ سے مسلم کو قتل کر کے ابن زیاد کی بیعت کر لی، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپس جانے کا ارادہ کیا، مگر ابن زیاد کی ظالم فوجوں نے آپ کو واپس جانے سے روکا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ: مجھے یزید کے

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب۔ باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر، (حدیث:٦٠٦٤)، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ۔ باب تحریم الظن والتجسس (حدیث:٢٥٦٣)۔ [2] ہمارے معاصر مشہور شیعہ شاعر محمد جواد خضر نے ان تاریخی حقائق کو تسلیم کیا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حق و انصاف کو اس کی زبان پر جاری کر دیا، حضرت علی بن حسین بال بچوں سمیت جب کربلا سے کوفہ پہنچے اور خیانت کار شیعہ مستورات سمیت روتے دھوتے اور دامن پھاڑتے آپ کے استقبال کے لیے نکلے (جیسے شیعہ آج کل عاشوراء کے موقع پر کرتے ہیں) تو آپ نے اہل کوفہ کو مخاطب کر کے کہا: ''اہل کوفہ! اب تم رو رہے ہو بتائیے تمہارے سوا ہمیں اور کس نے قتل کیا ہے؟''

پاس جانے دیا جائے۔ یا ملکی سرحد کی راہ لینے دی جائے۔ یا اپنے شہر کو واپس جانے دیا جائے۔ مگر انھوں نے آپ کو قیدی بنانے کے سوا دوسری سب تجویزیں مسترد کر دیں۔ آپ نے قیدی ہونے اور عبداللہ بن زیاد کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف لڑتے ہوئے بحالت مظلومی شہادت پائی۔ جب یزید کو شہادت حسین رضی اللہ عنہ کی خبر پہنچی تو اس نے بڑے درد و کرب کا اظہار کیا اور اس کے اہل خانہ نے آہ و بکا کا آغاز کیا۔ یزید رحمہ اللہ نے اہل بیت کی خواتین میں سے کسی کو قید نہیں کیا تھا۔ [1] بلکہ انھیں عطیہ جات دیے اور عزت و احترام سے انھیں مدینہ رخصت کر دیا۔ [اس لیے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو خصوصی وصیت کی تھی کہ ہر قیمت پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اکرام و احترام ملحوظ رکھے]۔

اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ: ''یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا'' تو اس میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیا گناہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [فاطر ۱۸]

''کوئی جی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔''

تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حق کا خیال رکھنے' آپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے' اور آپ کی تعظیم و توقیر بجالانے کی وصیت کی تھی۔ عمر بن سعد اس جماعت کا سردار تھا جنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ جب کہ اس کے والد حضرت سعد رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ فتنہ سے دور رہنے والے تھے۔ اس بیٹے کا اپنے باپ کیساتھ طلب خلافت کے مسئلہ میں ایک مشہور مکالمہ ہے؛ جس میں حضرت سعد اس مطالبہ سے باز رہے۔ اس وقت آپ کے علاوہ اہل شوریٰ میں سے کوئی ایک بھی زندہ باقی نہیں تھا۔

حضرت عامر بن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنے اونٹوں میں (موجود) تھے کہ اسی دوران ان کا بیٹا عمر آیا؛ تو جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو فرمایا:

''میں اس سوار کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جب وہ اترا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ: کیا آپ اونٹوں اور بکریوں میں رہنے لگے ہیں اور لوگوں کو چھوڑ دیا ہے اور وہ ملک کی خاطر جھگڑ رہے ہیں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: خاموش ہو جا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''اللہ اپنے بندے سے پیار کرتا ہو جو پرہیز گار اور غنی ہے اور ایک کونے میں چھپ کر بیٹھا ہو۔'' [2]

محمد بن ابوبکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کرنے میں مدد کی تھی۔ جب کہ اس کے والد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ لوگوں میں سب سے زیادہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تعظیم کرنے والے تھے۔ تو کیا اس بیٹے کی وجہ سے کسی ایک اہل سنت نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کی ہے؟

[اکیسواں اعتراض]: اگر یہ کہا جائے کہ: ''حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ مقرر کر دیا تھا؛ اس کی ولایت کی وجہ سے یہ فساد پیدا ہوا۔''

---

[1] اس فقرہ سے شیعہ کی تردید مقصود ہے، ورنہ یزید اور اس کے اہل بیت آج کل کے جھوٹے مدعیان حب اہل بیت سے کہیں بڑھ چڑھ کر بنی ہاشم کا اعزاز و احترام بجالاتے تھے، موجودہ شیعہ حب اہل بیت کے بہانہ سے ان کے دین میں مسخ و تحریف کرنا چاہتے ہیں ایک مرتبہ حجاج ثقفی نے بنی ہاشم کے قبیلہ میں رشتہ کرنا چاہا تو بنوامیہ نے اسے ناپسند کیا کیوں کہ وہ حجاج کو بنوعبد مناف کا کفو (ہمسر) تصور نہیں کرتے تھے۔

[2] صحیح مسلم 'زهد و تقوی کا بیان :۱۰۶۔

[جواب] :حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے اس کو خلیفہ مقرر کرنا جائز تھا۔اس فعل سے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔اگر آپ کے لیے اس کو خلیفہ مقرر کرنا ناجائز بھی ہوتا تو یہ علیحدہ سے ایک گناہ تھا؛ اگر چہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل نہ بھی کرتا۔ یزید لوگوں میں سب سے بڑھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزت و آبرو کا خیال رکھنے کا حریص تھا چہ جائے کہ وہ آپ کے خون کا پیاسا ہوتا۔اس کوشش و جدو جہد کے باوجود فسادیوں کے افعال کو آپ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

[بائیسواں اعتراض]:رافضی مضمون نگار کا یہ قول کہ''[معاویہ کے والد]ابوسفیان نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے دانت توڑے تھے؛ اوراس کی والدہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا۔''

[جواب] :اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوسفیان احد کے موقع پر مشرکین کے لشکر کا قائد تھا۔اوراس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت بھی توڑے گئے۔مگر کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ کے دندان مبارک پر وار کرنے والا ابوسفیان تھا۔ بلکہ یہ دانت توڑنے والا عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ [1] یہ درست ہے کہ ہند زوجۂ ابوسفیان نے سید شہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبا کر تھوک دیا تھا۔ [2] یہ اسلام لانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔پھر یہ تمام گھرانہ عنایت ایزدی سے مشرف بہ اسلام ہوگیا؛ اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہند رضی اللہ عنہا کی اس بنا پر تکریم فرمایا کرتے تھے[کہ رشتہ سے وہ آپ کی ساس ہوتی تھی]۔اسلام قبول کرنے سے پہلے کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ [3] اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے تھے:

﴿قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال:۳۸)

''جولوگ کافر ہیں،ان سے فرمائیں کہ اگر وہ باز آجائیں توان کے سابقہ گناہ معاف کردیے جائیں گے۔''

[[جب حضرت معاویہ کی والدہ ہند حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو اس نے کہا:''اللہ کی قسم!کرۂ ارضی پر کوئی گھر ایسا نہ تھا جس کے اہل خانہ کا رسوا ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے رسوا ہونے سے زیادہ عزیز تر ہواور آج یہ عالم ہے کہ اس کائنات ارضی پر کسی اہل خانہ کا معزز ہونا مجھے آپ کے اہل خانہ کے اعزاز و اکرام سے زیادہ محبوب نہیں]]❀

---

[1] دیکھیے تاریخ طبری(۳/۱۷)طبع حسینیہ نیز(ج:۱/۱۴۰۳)طبع یورپ۔عتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بھائی تھا۔یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جنتی ہیں اور عتبہ جہنمی۔محمد بن اسحاق حضرت سعد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے:''اللہ کی قسم!میں عتبہ سے بڑھ کر کسی شخص کو قتل کرنے کا حریص نہ تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ اپنی قوم میں بدخلق مشہور تھا اور سب لوگ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔میرے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کافی ہے کہ:''اس شخص پر اللہ کا شدید غضب ہوگا جس نے رسول اللہ کے چہرے کو خون آلود کیا۔''(طبری:۳/۲۰)
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد مقسم روایت کرتے ہیں کہ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ کے حق میں بددعا کی تھی کہ سال گزرنے سے پیشتر وہ بہ حالت کفر مرجائے گا۔''چنانچہ عتبہ ایک سال کے اندر اندر کافر ہونے کی حالت میں مرگیا۔یہ بھی مروی ہے کہ جنگ بدر کے بعد حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ پر قابو پاکر اس کا سر اڑادیا تھا۔(رواه الحاكم فى المستدرك) اور سيرة ابن هشام(ص:۳۸۶)۔

[2] سیرة ابن هشام(ص:۳۹۳)، مسند احمد۱۰/ ۴۶۳)، مطولاً

[3] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب كون الاسلام۔ يهدم ما قبله(حديث:۱۲۱)

❀۔ صحيح بخارى، كتاب مناقب الانصار۔ باب ذكر هند بنت عتبة بن ربيعة رضی اللہ عنہا، (حديث:۳۸۲۵)، صحيح مسلم۔ كتاب الاقضية، باب قضية هند، (حديث: ۸/ ۱۷۱۴)۔

فصل:

سیف اللہ کون تھا؟

[اعتـــــراض] : رافضی قلم کار رقم طراز ہے:''اہل سنت چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عناد رکھتے ہیں، اس لیے ان کے بجائے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ حالانکہ آپ اس لقب کے سب سے زیادہ حقدار تھے۔ آپ نے اپنی تلوار سے کئی کافروں کو قتل کیا۔ اور آپ کی وجہ سے دین اسلام کو ثابت قدمی نصیب ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ:''علی رضی اللہ عنہ اللہ کی تلوار اور اس کا تیر ہیں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے برسر منبر فرمایا تھا:'' میں اعدائے دین کے لیے اللہ کی تلوار ہوں؛ اور اس کے اولیاء کے لیے اس کی رحمت ہوں۔''

❀ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہمیشہ دشمن رسول صلی اللہ علیہ وسلم رہے اور آپ کی تکذیب کرتے رہے۔ غزوۂ احد میں مسلمانوں کے شہید کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک توڑنے کی ذمہ داری بھی خالد پر عائد ہوتی ہے۔ آپ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کا سبب بنے۔ جب خالد رضی اللہ عنہ نے اظہار اسلام کیا تو نبی کریم رضی اللہ عنہ نے اسے بنی جَذِیمہ کی طرف بھیجا تاکہ ان سے صدقات وصول کرے۔ خالد نے اس راہ میں خیانت کی۔ امر رسول کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو قتل کرایا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے' آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے ہوئے تھے؛ یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔ آپ دعا کر رہے تھے:'' اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جـــــواب] : حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو''سیف اللہ'' قرار دینا صرف آپ کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ بلا ریب حضرت خالد رضی اللہ عنہ'' سیف من سیوف اللہ'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں' جنہیں اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مسلط کیا تھا۔ آپ کو اس نام سے ملقب کرنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ پہلے آدمی ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب سے ملقب فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:''جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید و جعفر و ابن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی شہادت کی خبر ملی تو آب دیدہ ہو گئے، پھر فرمایا:

''زید نے جھنڈا سنبھالا؛ اور وہ شہید ہو گئے۔ پھر ان کے بعد جعفر نے جھنڈا تھاما؛ وہ بھی شہید ہو گئے۔ ان کے بعد ابن رواحہ نے جھنڈا سنبھالا وہ بھی شہید ہو گئے۔ [یہ بیان کرتے ہوئے] آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس کے بعد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (حضرت خالد رضی اللہ عنہ) نے جھنڈے کو تھاما تو اللہ تعالیٰ نے فتح مرحمت فرمائی۔''[1]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ[2] کے علاوہ اور کوئی شخص سیف اللہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة موتة من ارض الشام، (حدیث:٤٢٦٥)

[2] حضرت خالد بن ولید اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے اپنی مرضی سے ہجرت کی تھی۔ آپ کے والد مکہ کے عظیم رئیس تھے۔ اور آپ وہاں فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ نے عیش و مسرت کی زندگی کو لات مار کر اقامت حق کی خاطر عازم مدینہ ہوئے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا:'' مکہ نے اپنے جگر کے پارے تمہارے یہاں پھینک دیے ہیں۔'' سیرۃ ابن ہشام (ص:۴۸۴) مستدرک حاکم (۳/۲۹۷ـ۲۹۸) اگر حضرت خالد اپنی عظیم فتوحات کی بنا پر جنت اور تاریخ اسلام کے اوراق میں بقاء دوام سے بہرہ ور ہیں تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ جن احوال و ظروف میں اسلام لائے اور نبی کریم نے ان پر مدح و ستائش کے پھول نچھاور کیے ان کی بنا پر دینی و دنیوی مجد و شرافت میں وہ اس سے زیادہ خلود و دوام سے بہرہ ور ہیں۔

''سیوف اللہ'' اور بھی ہیں۔ اور آپ ان جملہ تلواروں میں سے ایک ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے دیگر صحابہ کی نسبت زیادہ کفار کو جہنم واصل کیا۔ آپ غزوات میں ہمیشہ نیک فال رہے۔ فتح مکہ سے پہلے اور واقعہ حدیبیہ کے بعد اسلام لائے؛ آپ' عمرو بن العاص اور شیبہ بن عثمان نے بیک وقت اسلام قبول کیا اور ہجرت کی سعادت حاصل کی۔ آپ جب سے اسلام لائے اسی وقت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سپہ سالار مقرر کرنا شروع کیا۔ آپ نے غزوہ مؤتہ میں شرکت کی۔ جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''تمہارا امیر زید ہوگا۔ اگر وہ قتل کر دیے جائیں تو پھر جعفر؛ اور اگر وہ بھی قتل ہو جائیں تو پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ۔''

یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔ اسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں کا نام نہیں ملتا۔ جب یہ امراء شہید کر دیے گئے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بغیر امارت کے جھنڈا سنبھالا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح دی۔ غزوہ مؤتہ کے موقع پر آپ کے ہاتھ میں نو تلواریں ٹوٹیں۔ آخر میں ایک یمانی تلوار آپ کے ہاتھ میں باقی رہی۔''[1]

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر امیر مقرر فرمایا؛ اور آپ کو عزیٰ نامی بت گرانے کے لیے مہم پر روانہ فرمایا۔ اور پھر آپ کو بنی جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا۔ اس کے علاوہ بھی کئی مہمات آپ کو تفویض کیں۔ اور کبھی کبھار آپ سے کوئی ایسا کام ہو جاتا جس کا انکار کیا جاتا۔ جیسا کہ بنی جذیمہ کے موقع پر آپ سے ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جذیمہ کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے فعل سے اظہار براءت کیا۔[2] البتہ انھیں معزول نہیں کیا۔ بلکہ آپ اپنی امارت پر برقرار رہے۔ بنی جذیمہ کے موقع پر آپ کے اور جناب حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین اختلاف ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میرے اصحاب کو برا نہ کہو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کوئی تم میں سے احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ تبارک وتعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے تو میرے اصحاب کے ایک مد (سیر بھر وزن) یا آدھے کے ثواب کے برابر بھی (ثواب کو) نہیں پہنچ سکتا۔'' [صحیح بخاری: جلد دوم: ح ۸۸۷]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے خلاف جنگ میں امیر لشکر مقرر فرمایا۔ آپ نے شام اور عراق کے علاقے فتح کیے۔ دشمن کے خلاف جنگوں میں آپ کا کردار بہت اہم رہا ہے؛ جس کا کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ بلاشبہ آپ دشمن کے خلاف اللہ کی تلواروں میں سے ایک برہنہ تلوار تھے؛ جسے اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر مسلط کر دیا تھا۔

[اعتراض]: رافضی قلمکار کہتا ہے: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لقب کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔''

[جواب]: **پہلی بات**: یہ بھی درست ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی ''سیوف اللہ'' میں سے ایک سیف تھے، اس میں تنازع کی گنجائش ہی کیا ہے؟ صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی تلواریں کئی ایک ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں سے بڑے معزز اور عظیم مرتبت والے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں ہے جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا ہو۔ اور کسی نے یہ وصف حضرت خالد بن ولید کے ساتھ

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عزوة موتة فی ارض الشام، (حدیث: ٤٢٦٥)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم خالد بن الولید ... (حدیث: ٤٣٣٩)

ہی مختص نہیں کیا۔آپ کے لیے یہ لقب رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔آپ ﷺ نے ارشادفرمایا تھا:

''بیشک خالد اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں۔''

دوسری بات: حضرت علی رضی اللہ عنہ علم وفضل،فصاحت و بلاغت اور سبقت اسلام کی بنا پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔آپ کی منزلت اس چیز سے بہت بلند ہے کہ آپ کا مقابلہ کسی تلوار سے کیا جائے۔حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں جہاد وقتال کے سوا علم و بیان' دین وایمان اور سبقت اسلام کے علاوہ اور بھی بہت سے فضائل ایسے تھے جن کی وجہ سے آپ کی شان اس امر سے بہت بلند ہو جاتی ہے کہ آپکی صفت صرف اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہونا قرار دیا جائے؛تلوار کا کام صرف لڑنا ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جملہ فضائل واوصاف میں سے ایک وصف قتال بھی تھا۔جبکہ حضرت خالد کا خصوصی اور امتیازی وصف قتال تھا۔آپکو نہ ہی سابقت اسلام کی فضیلت حاصل ہے' نہ ہی کثرت علم اور بہت بڑا عابد وزاہد ہونے کی۔ہاں آپ جنگ وقتال باقی لوگوں پر فائق تھے؛یہی ان کی وجہ فوقیت ہے اور اسی بنا پر آپ کو سیف اللہ کا لقب ملا۔

[**شبہ**]: رافضی کا قول ہے:''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار سے کئی کفار کو قتل کیا۔''

[**جواب**] :اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے کچھ کفار کو قتل کیا ہے۔جیسا کہ دیگر مشہور جنگجو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قتال کیا؛ جیسے حضرت عمر' حضرت زبیر؛ حضرت حمزہ؛ حضرت مقداد؛ حضرت ابوطلحہ؛ اور حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر صحابہ کرام۔ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اپنی تلوار سے کفار کی ایک جماعت کو قتل نہ کیا ہو۔براء بن مالک ہی کو لیجیے۔انھوں نے میدان مبارزت میں سو آدمیوں کو قتل کیا تھا۔یہ تعداد ان لوگوں کے علاوہ ہے جن کے قتل میں شریک ہوئے۔[1] نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''ابوطلحہ کی آواز لشکر میں ایک جماعت سے بہتر ہے۔''[2]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر ایک نبی کا ایک حواری ہوتا ہے' اور میرا حواری زبیر ہے۔''[3] یہ دونوں احادیث صحیح ہیں۔

مغازی میں ہے آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے احد کے دن؛ جب کہ آپ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے تلوار کے بارے میں فرمایا تھا:''اسے بغیر مذمت کے دھوڈالو۔'' فرمایا:''اگر تم نے اچھا کیا ہے تو فلاں اور فلاں نے بھی تو اچھا کیا ہے۔''[4]

حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: [رسول اللہ ﷺ نے فرمایا]:

''بیشک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اگر اللہ کے نام پر قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کرتا ہے' ان میں سے براء بن مالک بھی ہے۔''[5]

غزوات میں لوگ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ سے گزارش کیا کرتے تھے: اے براء! اپنے رب کی قسم اٹھایئے' تو آپ کفار کے خلاف فتح کے لیے اپنے رب کی قسم اٹھاتے؛ اور اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی سے نوازتے۔پھر جب آپ نے آخری غزوہ میں شرکت کی تو یوں دعا کی:''اے اللہ میرے نام کی قسم اٹھا کر تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ جب تو کفار کی گردنوں کو ہمارے قبضہ

---

[1] مصنف عبد الرزاق، ۹٤٦۹، طبرانی(۱۱۷۸، ۱۱۷۹)، مستدرك حاكم(۳/ ۲۹۱)

[2] مسند احمد(۳/ ۲۰۲)، طبقات ابن سعد(۳/ ۵۰۵)، مستدرك حاكم (۳/ ۳۵۲، ۳۵۳)

[3] البخاری ۲/ ٤/ ۲۷۔مسلم ٤/ ۱۸۷۹۔

[4] مختصر سیرة لابن هشام ۳/ ۱۰٦۔

[5] رواه البخاری ۳/ ۱۸٦۔ ومسلم ۳/ ۱۳۰۲۔

میں دے دے تو سب سے پہلے مجھے شہادت نصیب فرما۔'' اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلعت شہادت سے سرفراز فرمایا۔

روافض کے یہاں تناقض کی بھر مار ہے، وہ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معاون رسول تھے اور اگر وہ نہ ہوتے تو دین کی اشاعت نہ ہوتی اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تقیہ کرتے تھے جو ضعف و عجز کی دلیل ہے۔

دعا سے بھی جنگ ایسے ہی لڑی جاتی ہے جیسے ہاتھ سے لڑی جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم رزق دیے جاتے ہو اور مدد کیے جاتے ہو مگر تمہارے کمزور لوگوں کی وجہ سے؛ ان کی دعاؤں ان کی التجاؤں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے۔''❶

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فقراء مہاجرین سے فتح کے لیے دعاء کروایا کرتے تھے۔ اس سب کے باوجود جناب سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ جیسے کتنے ہی لوگوں سے افضل ہیں۔ تو پھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے افضل کیوں نہ ہوں گے؟

[شبہ]: رافضی کا کہنا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''علی اللہ تعالیٰ کی تلوار اور اللہ کا تیر ہیں۔''

[جواب]: یہ روایت حدیث کی معروف کتابوں میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اور نہ ہی اس کی کوئی معروف سند ہے۔ اس کا معنی بھی باطل ہے۔ اس لیے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی اللہ تعالیٰ کا تیر اور اس کی تلوار نہیں ہیں۔ اس عبارت سے یہ جملہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے محصور اور خاص لگتا ہے۔

جو صحیح روایت ہے وہ کچھ اس طرح ہے: حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے غزوہ حنین کے موقع پر یوں ارشاد فرمایا تھا:

''اللہ کی قسم! ہرگز نہیں؛ اب ہم ایسے آدمی کے پاس جائیں گے' جو اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر ہے' وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑے گا؛ اور ہم اسے مقتول کا مال دیں گے۔''

مزید برآں ہم کہتے ہیں کہ: اگر اس جملہ سے مقصود یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اکیلے ہی اللہ کی تلوار اور اس کا تیر ہیں؛ تو پھر یہ دعوی باطل ہے۔ اور اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ آپ بھی اللہ کی تلواروں میں ایک تلوار اور تیروں میں سے ایک تیر ہیں' تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان اس سے کئی درجہ بڑھ کر ہے؛ یہ تو آپ کے جملہ اوصاف میں سے ایک وصف ہے۔

[شبہ]: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے برسر منبر فرمایا تھا: ''میں اعدائے دین کے لیے اللہ کی تلوار ہوں؛ اور اس کے اولیاء کے لیے اس کی رحمت ہوں۔''

[جواب]: یہ ایسی روایت ہے جس کی نہ ہی کوئی سند پائی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی صحت کا کوئی اعتبار ہے۔ لیکن اگر آپ نے ایسا فرمایا بھی ہو تو اس کا معنی بالکل صحیح ہے۔ اور یہ قدر آپ کے اور دوسرے صحابہ کرام کے درمیان مشترک ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ [الفتح ۲۹]

''وہ کافروں پر بڑے سخت ہیں اور آپس میں بہت مہربان ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾ [المائدة ۵۴]

''وہ مؤمنین پر بڑے نرم اور کافروں کے لیے بڑے سخت ہیں۔''

---

❶ رواه البخاري ٤/ ٣٦۔

مہاجرین و مجاہدین میں سے ہر ایک دشمن پر اللہ کی تلواروں میں سے تلوار اور اللہ کے اولیاء کے لیے بڑے نرم و بردبار تھے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی یہ دعوی کرے کہ میں اکیلا اللہ کی تلوار ہوں' اور میں اکیلا اولیاء اللہ کے لیے رحمت ہوں۔ یہ ایسا جھوٹ ہے جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ ماننا واجب ہے۔ ہاں اگر اس قول سے یہ مقصود ہو کہ دوسروں کی نسبت کامل تھے؛ اور اس میں حصر کمال کے لیے ہو تو پھر ایسا کہنا صحیح ہے؛ اس لیے کہ آپ اپنے زمانے میں دوسروں سے بڑھ کر کامل تھے۔ ورنہ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غیض و غضب کفار کے لیے دوسروں سے بڑھ کر تھا۔ اور آپ سے مسلمانوں کو فائدہ بھی زیادہ پہنچا۔ یہ بات ہر وہ انسان جانتا ہے جو ان دونوں خلفاء کرام کی سیرت سے واقف ہو۔

اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مبارک دور میں تمام مسلمانوں کے لیے ان کے دین و دنیا میں وہ رحمتیں اور برکتیں حاصل ہوئیں جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں حاصل نہ ہوسکیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مشرکین' اہل کتاب اور منافقین پر جو غلبہ و رعب حاصل تھا' وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں نہ ہوسکا۔ یہ بات خاص و عام سبھی لوگ جانتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں مؤمنین کو وہ رحمت اور برکت نہ مل سکی جو اس سے پہلے حضرت ابو بکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں ملی تھی۔ بلکہ آپس میں لڑتے اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے رہے۔ کفار پر ان کا کوئی غلبہ اور دسترس باقی نہ رہی۔ بلکہ کفار ان پر ہاتھ اٹھانے کے لیے طمع کرنے لگے۔ اور کئی شہر اور علاقے مسلمانوں سے چھین لیے گئے۔ تو پھر کوئی یہ کیسے گمان کر سکتا ہے کہ [کفار کیساتھ جنگ و قتال کے] اس وصف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ جناب حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر اور فائق تھے۔

پھر یہ کہ رافضیوں کے قول میں انتہائی سخت تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنے والے اور آپ کے ناصر ہیں؛ اگر آپ نہ ہوتے تو یہ دین قائم نہ ہوتا۔ پھر دوسری طرف آپ کو انتہائی عاجزی ولاچاری اور پستی سے موصوف کرتے ہیں۔

[اعتراض]: رافضی کہتا ہے: ''خالد بن ولید ہمیشہ رسول اللہ کے دشمن رہے اور آپ کو جھٹلاتے رہے۔''

[جواب]: یہ اسلام لانے سے پہلے تھا۔ جیسے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بنی ہاشم اور غیر بنی ہاشم اسلام لانے سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھتے تھے اور آپ کو جھٹلاتے تھے؛ جیسے ابوسفیان' ربیعہ؛ حمزہ؛ اور عقیل وغیرہ۔

[حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی اجتہادی غلطی پر اعتراض]:

[اعتراض]: نبی کریم رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد کو بنی جذیمہ کی طرف بھیجا تا کہ ان سے صدقات وصول کریں۔ خالد نے اس راہ میں خیانت کی؛ اور امر رسول کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو قتل کرایا۔ یہ دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام میں خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے' آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی' آپ دعا کر رہے تھے: ''یا اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ ان کے نقصان کی تلافی کریں' اور ان کو راضی کر دیں۔''

[جواب]: اس عبارت کے نقل کرنے میں جہالت اور تحریف کا عنصر موجود ہے جو کہ کسی بھی سیرت کے عالم پر مخفی نہیں۔ فتح مکہ کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو قبیلہ بنی جذیمہ سے لڑنے کے لیے مامور فرمایا۔ انھوں نے

اَسْلَمْنَا (ہم اسلام لائے) کی بجائے صَبَانَا (ہم صابی ہو گئے) کہنا شروع کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے اسلام پر محمول نہ کیا اور ان کو قتل کر دیا[1]۔ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ بڑے بڑے صحابہ کرام جیسے سالم مولی ابی حذیفہ' عبداللہ بن عمر اور دیگر نے اس فعل پر انکار کیا تھا' اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے؛ اور یہ دعا فرمائی: ''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔'' اس لیے کہ آپ کو خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ آپ سے یہ پوچھ لے کہ ان لوگوں پر زیادتی کیوں کی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّي بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الشعراء ۲۱۶]

''پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو فرما دیں کہ بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم کرتے ہو۔''

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ مال دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور انھوں نے نصف دیت ادا کر دی۔ جو مالی نقصان ہوا تھا اس کی تلافی کی۔ یہاں تک کہ کتا جس برتن سے پانی پیتا ہے اس کی قیمت بھی ادا کی[2] اور پھر ان کا باقی مال بھی انہیں واپس کر دیا تا کہ ان کا کچھ مال باقی نہ رہ جائے۔ مگر اس کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو برابر امیر مقرر کیا جاتا رہا اور لشکروں کی قیادت آپ کے سپرد کی جاتی رہی۔ اس لیے کہ جس امیر سے کوئی غلطی یا گناہ ہو جائے تو اسے رجوع کرنے کا حکم دیا جاتا؛ اور اسے اس کی ولایت پر باقی رکھا جاتا۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی نہیں کی تھی، بلکہ وہ آپ کے حد درجہ اطاعت کیش تھے۔ البتہ آپ فقہ فی الدین میں دوسرے صحابہ کی منزلت پر نہ تھے؛ اس معاملہ کا حکم آپ پر مخفی تھا۔ اس وجہ سے اس موقع پر ان سے اجتہادی غلطی صادر ہوئی۔

❀ شیعہ کا قول کہ: ''پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو راضی کر دیں۔''

جواب: یہ کلام جہالت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اس لیے بھیجا تھا کہ ان کے ساتھ انصاف کریں' اور ان کے نقصان کی تلافی کریں۔ معاملہ صرف راضی کرنے کا ہی نہیں تھا۔

❀ شیعہ کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ قول کہ: ''انہوں نے خیانت کی؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو قتل کیا۔''

یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہے۔ اس لیے کہ آپ نے عمداً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ خیانت نہیں کی۔ اور نہ ہی آپ کی مخالفت کا ارادہ کیا۔ اور نہ ہی ان مسلمانوں کو قتل کیا تھا جو آپ کے نزدیک معصوم تھے۔ لیکن آپ سے یہ غلطی ہوئی۔ جس طرح حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس شخص کے بارے میں غلطی کی تھی جس نے ''لا الہ الا اللہ'' کہا اور اس کے باوجود حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا[3] اور جس طرح اس لشکر سے غلطی سرزد ہوئی تھی جس نے بکریوں والے اس شخص کو قتل کر دیا تھا جس نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا۔ یہ آیت کریمہ اسی موقع پر نازل ہوئی:

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب بعث النبی ﷺ خالد بن الولید..... (ح:۴۳۳۹)۔

[2] سیرۃ ابن ھشام (ص:۵۵۸)۔

[3] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید.....''(حدیث:۴۲۶۹)، صحیح مسلم، کتاب الایمان۔ باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا الہ الا اللہ، (حدیث:۶۸)

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا﴾(نساء: ۹٤) [1]

''اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں؛ تم دنیاوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو تو اللہ تعالی کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں؛ پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا؛ لہٰذا تم ضرور تحقیق اور تفتیش کر لیا کرو، بیشک اللہ تعالی تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں قبیلہ حرقات کی طرف بھیجا جو قبیلہ جہینہ میں سے ہے۔ ہم صبح صبح وہاں پہنچ گئے اور ان کو شکست دے دی۔ میں نے اور ایک انصاری نے مل کر اس قبیلہ کے آدمی کو گھیر لیا جب وہ ہمارے حملہ کی زد میں آ گیا تو اس نے کہا لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ۔ انصاری تو یہ سن کر علیحدہ ہو گیا؛ لیکن میں نے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اس کی خبر پہنچ چکی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

''اے اسامہ! کیا لا اِلٰہ اِلا اللّٰہ کہنے کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر ڈالا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے اپنی جان بچانے کے لئے ایسا کہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار یہی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے بار بار آرزو ہونے لگی کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔'' [صحیح مسلم: جلد: ۱، ح۲۷۸]

فصل:

[اہل یمامہ کے ساتھ جنگ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اہل یمامہ سے لڑنے کے لیے لشکر روانہ کیا؛ جنھوں نے اظہار اسلام کے باوجود ۱۲۰۰ آدمیوں کو قتل کر دیا۔ مالک بن نُویرہ کو گرفتاری کی حالت میں قتل کیا گیا' جب کہ وہ مسلمان تھا؛ اور اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ زکوٰۃ نہ ادا کرنے کی بنا پر بنو حنیفہ کو مرتد قرار دیا؛ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہیں بھیجی تھی اور آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ان کے خون و اموال اور عورتوں کو حلال قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کا انکار کیا۔ ان لوگوں نے زکوٰۃ روکنے والوں کو مرتد کا نام دیا۔ اس کے برعکس جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور جنھوں نے مسلمانوں کے خون کو مباح قرار دیا تھا، ان کو مرتد قرار نہ دیا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْكُمْ﴾ (حدیث ٤٥٩١)، صحیح مسلم کتاب التفسیر، باب تفسیر آیات متفرقۃ، (حدیث: ۳۰۲۵)۔

''اے علی! تجھ سے لڑائی کرنا میرے خلاف جنگ آزما ہونا ہے۔''

ظاہر ہے کہ رسول ﷺ کے خلاف صف آرائی کرنے والا اجماعاً کافر ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] :ان سے کہا جائے گا: اللہ اکبر! یہ جھوٹے مرتد ؛مفتری؛ مرتدین کے پیروکار جنہوں نے اللہ' کتاب اللہ' رسول اللہ اور دین اللہ کے لیے اپنی دشمنی کا کھل کر اظہار کیا ہے؛ یہ لوگ دین اسلام سے خارج ہو چکے ہیں' اور اسلام کو پس پشت پھینک دیا ہے۔ یہ اللہ و رسول اور نیک بندوں کی مخالفت کرتے اور اہل ارتداد و شقاق سے الفت و محبت رکھتے ہیں۔ روافض کے ایسے بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلاف روافض کا بغض و عناد کسی طرح ان مرتدین سے کم نہیں جن کے خلاف حضرت صدیق رضی اللہ عنہ صف آراء ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل یمامہ بنوحنیفہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے؛ جو کہ مشہور مدعی نبوت مسیلمہ کذاب پر ایمان لا چکے تھے۔ مسیلمہ نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارک میں نبوت کا دعوی کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ مدینہ طیبہ آکر اسلام کا اظہار کر چکا تھا ۔ پھر جب یمامہ گیا تو اس نے یہ کہا کہ: اگر محمد ﷺ نے اپنے بعد یہ زمام کار میرے سپرد کردی تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔ پھر جب یہ انسان واپس یمامہ پہنچا تو اس نے کہنا شروع کر دیا کہ وہ محمد ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک ہے اور یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں اس کی تصدیق کر دی ہے۔ اس بات پر رجال بن عنفوہ نامی انسان نے گواہی بھی دیدی۔

مسیلمہ نے اپنا الگ قرآن تصنیف کیا تھا۔ جس میں یہ کہتا ہے:

١ ......" والطاحنات طحناً فالعاجنات عجناً فالخابزات خبزاً إهالة و سمناً إن الأرض بيننا و بين قريش نصفين ؛ ولكن قريشاً قوم لا يعدلون . "

اس کی جھوٹی وحی میں یہ بھی تھا:

٢ ......"يَا ضِفْدَعُ بِنْتُ ضِفْدَ عَيْنِ نَقِيٌّ كَمْ تَنَقِّيْنَ ، لَا الْمَاءَ تُكَدِّرِيْنَ وَ لَا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ ، رَاسُكِ فِي الْمَاءِ وَ ذَنْبُكِ فِي الطِّيْنِ . "

٣ ...... "اَلْفِيْلُ ، وَمَا الْفِيْلُ وَ مَا اَدْرَاكَ مَا الْفِيْلُ ، لَهُ زَنُوْمٌ طَوِيْلٌ ، اِنَّ ذَالِكَ مِنْ خَلْقِ رَبِّنَا الْجَلِيْلِ . "

مسیلمہ نے جو قرآن مرتب کیا تھا، وہ حد درجہ مضحکہ انگیز اور اس کی حماقت و سفاہت کا آئینہ دار تھا۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کلام سنا تو فرمایا:

''تمہارے لیے ہلاکت ہو! مسیلمہ تمہاری عقلوں کو کہاں لیے جا رہا ہے، یہ کلام اللہ کا نازل کردہ نہیں۔''

اس کذاب نے نبی کریم ﷺ کو یہ خط بھی لکھا تھا:

''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف؛ امابعد:

''بیشک میں اس امر [نبوت و رسالت] میں آپ کا شریک ہو چکا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے اس کا جواب دیتے ہوئے یہ خط تحریر فرمایا:

''محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی جانب۔''

جب رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس کی طرف بھیجا۔ آپ نے اپنے ساتھ موجود مسلمان لشکر سے مل کر ان لوگوں سے جنگ کی۔ اس سے پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ طلیحہ اسدی سے قتال کر چکے تھے؛ اس نے بھی جھوٹی نبوت کا دعوی کیا تھا۔ اور اہل نجد کے کچھ گروہ اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف مؤمنین کی مدد کی' تو انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس موقع پر جناب حضرت عکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس کے بعد طلیحہ اسدی نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد مؤمنین کا لشکر یمامہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس جنگ میں مؤمنین کو بہت سخت امتحان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں خیار [بہترین] صحابہ کرام کا ایک پورا گروہ شہید کردیا گیا۔ جیسے زید بن خطاب؛ ثابت بن قیس بن شماس' اسید بن حضیر اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین۔

[[مسیلمہ اس کے علاوہ بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نامہ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ لکھا جا چکا ہے کہ آپ نے ان مرتدین سے لڑنے کے لیے بہترین صحابہ کا ایک لشکر بھیجا اور اس کی سپہ سالاری حضرت خالد سیف اللہ کو تفویض کی]]۔

بہر کیف مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت، بنوحنیفہ کا اس پر ایمان لانا اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا ان کے خلاف نبرد آزما ہونا تاریخ اسلام کے مشہور واقعات ہیں اور متواتر کی حد تک معروف ہیں۔ عام و خاص سب ان سے آشنا ہیں اور ان کا علم صرف طبقہ خواص ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ لوگ ان واقعات کو جنگ جمل و صفین سے بھی بڑھ کر جانتے ہیں۔

بعض متکلمین نے جنگ جمل و صفین سے انکار کیا ہے، اگرچہ یہ باطل ہے، مگر اہل یمامہ کی لڑائی اور مسیلمہ کے دعوی نبوت سے کسی شخص کو مجال انکار نہیں ہوئی۔ اور یہ کہ مسیلمہ کذاب نے جھوٹی نبوت کا دعوی کیا تھا؛ اور اسی بنا پر اس سے جنگ لڑی گئی۔

البتہ روافض بنا بر عداوت و جہالت ان واقعات سے اسی طرح انکار کرتے ہیں جیسے دیگر تاریخی حقائق سے، شیعہ مندرجہ ذیل مشہور واقعات کو تسلیم نہیں کرتے:

۱۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا نبی کریم ﷺ کے پہلو میں مدفون ہونا۔

۲۔ شیعہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو والہانہ محبت تھی۔

۳۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تصریحاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔

۴۔ شیعہ کے نزدیک حضرت زینب، رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہن نبی کریم کی بیٹیاں نہیں تھیں۔ [1] بلکہ کہتے ہیں: یہ خدیجہ کی بیٹیاں ہیں جو اس کے پہلے کافر خاوند سے ہیں' جو نبی کریم ﷺ سے پہلے تھا۔

۵۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام کلثوم چھین لی تھی؛ یہاں تک کہ پھر اس سے نکاح کرلیا۔ اور یہ کہ یہ شادی اسلام میں غصب ہے۔

۶۔ بعض شیعہ کا قول ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا پیٹ چاک کردیا جس سے آپ کا حمل ساقط ہوگیا۔

۷۔ بقول روافض صحابہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مکان منہدم کردیا اور اہل خانہ اس کے نیچے دب گئے۔

---

[1] شیعہ آج تک اس نظریہ پر مصر ہیں، چنانچہ انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب میں جو نجف کے مطبع علویہ میں ۱۳۴۸ھ میں چھپی ہے۔ اس نظریہ کا اثبات کیا ہے۔ دیکھیے کتاب مذکور جلد: ۲/ ۲۹۱)

خلاصہ کلام! اس طرح کے من گھڑت اور جھوٹے قصے بیان کرتے ہیں جن کا جھوٹ ہونا کسی بھی ایسے آدمی پر مخفی نہیں ہوتا جسے تاریخ سے ادنیٰ سی شناسائی ہو۔ شیعہ ثابت شدہ تاریخی حقائق کا انکار کرتے اور ان امور کا اثبات کرتے ہیں جو معدوم یا لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں۔ گویا وہ اس آیت کے مصداق ہیں:

﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ﴾ (العنکبوت: ۶۸)

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا جب حق آئے تو وہ اس کی تکذیب کرنے لگے۔''

روافض صحیح معنی میں مذکورہ بالا آیت کے مصداق ہیں، وہ حق کی تکذیب کرتے اور کذب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرتدین کا بھی یہی حال تھا۔

ان کا دعویٰ ہے کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے اتباع اسلام سے منحرف ہو چکے تھے۔ ❶ حالانکہ عام و خاص اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے جنھوں نے مرتدین کے خلاف جہاد کیا۔

مقام افسوس ہے کہ شیعہ اہل یمامہ کو مظلوم مسلمان قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انہیں ناحق قتل کیا گیا۔ اور ان لوگوں کے خلاف قتال کے منکر ہیں؛ جس کی بنا پر یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ آج کے روافض ان کے خلف ہیں؛ اور وہ مرتدین ان کے سلف تھے۔ اور یہ بھی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور اس کے ماننے والے ہمیشہ مرتدین سے قتال کرتے ہی رہیں گے۔

فصل:

[بقول روافض اہل یمامہ مرتد نہ تھے]

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''بنو حنیفہ نے چونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہ دی تھی۔ اس لیے انھیں مرتدین کا نام دیا۔''

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بنو حنیفہ کے خلاف اس لیے صف آراء ہوئے تھے کہ انھوں نے مسیلمہ کذاب کو نبی تسلیم کیا تھا، اور اس کے نبی ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ باقی رہے مانعین زکوٰۃ تو وہ بنو حنیفہ نہ تھے، بلکہ دیگر قبائل تھے۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ لڑنے میں بعض صحابہ کو شبہ لاحق ہوا تھا۔ البتہ بنو حنیفہ کے خلاف جنگ آزما ہونے میں سب صحابہ یک زبان تھے اور کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ جب کہ مانعین زکاۃ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: اے خلیفہ رسول اللہ! آپ ان لوگوں سے جہاد کس طرح کریں گے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((میں حکم دیا گیا ہوں کہ لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ لوگ گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ جب وہ اس کلمہ کا اقرار کرلیں تو مجھ سے اپنے مال اور اپنی جان کو بجز اس کے حق کے بچا لیں گے؛ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا یہ نہیں فرمایا: ''اس کے حق کے ساتھ'' بیشک زکوٰۃ اسلام کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر ان

❶ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، جس میں مکابرہ و مجادلہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بلکہ جمیع صحابہ شیعہ کے مخصوص دین سے منحرف تھے اور شیعہ...... جیسا کہ وہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں...... حضرت ابوبکر و عمر اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دین سے مرتد ہو چکے ہیں۔ جو شخص کلمہ توحید کی یگانگت سے دھوکہ کھا کر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا، وہ یا تو شیعہ و شیخین کے مذہب و دین کے باہمی فرق و امتیاز سے ناآشنا ہے یا شیعہ کے ساتھ تقیہ کے طریقے پر عمل پیرا ہے جس نے لوگوں کے دین و اخلاق کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

لوگوں نے ایک رسی بھی روکی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دیا کرتے تھے، تو میں اس کے نہ دینے والوں سے جنگ کروں گا۔'' [صحیح بخاری:ح ۲۱۶۰]

ان لوگوں سے اس وجہ سے قتال نہیں کیا گیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے زکوٰۃ ادا کرتے' اور خود فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیتے تو ان کے خلاف جنگ نہ لڑی جاتی۔ یہی جمہور علماء کرام کا قول ہے جیسے کہ حضرت امام ابوحنیفہ؛ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ۔

ان کا کہنا ہے: اگر کوئی یہ کہے کہ: ہم اپنی زکوٰۃ حکمران کو نہیں دیں گے' بلکہ اپنے ہاتھوں سے تقسیم کریں گے۔ تو ان کے خلاف لڑنا جائز نہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کسی ایک سے بھی اپنی اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے جنگ نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی ایک پر اپنی بیعت کو لازم ٹھہرایا۔ اسی لیے حضرت سعد رضی اللہ عنہ آپ کی بیعت کرنے سے پیچھے رہے' مگر آپ نے انہیں بیعت کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔

❀ شیعہ کا یہ کہنا کہ: ''بنو حنیفہ نے چونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ نہ دی تھی؛ اور آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لیے انھیں مرتدین کا نام دیا۔''

❀ **جواب:** ہم کہتے ہیں: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ اسی طرح یہ دعویٰ کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بنو حنیفہ سے جنگ کا انکار کیا۔ صاف دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ [جیسا کہ ابھی سطور بالا میں واضح کیا]۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ''جن لوگوں نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اہل سنت ان کو مرتد نہیں کہتے، حالانکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنا ہوا ہے کہ:

"يَا عَلِيُّ حَرْبِیْ حَرْبُكَ وَ سَلْمِیْ سَلْمُكَ"

''اے علی تیری جنگ میری جنگ ہے' اور تیری صلح میری صلح ہے۔''

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے والا بالاتفاق کافر ہے۔

[جواب]: یہ دعویٰ کرنا اہل سنت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سن رکھی تھی؛ محض کذب و دروغ ہے۔ کس نے یہ بات نقل کی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہوئی تھی؟ حدیث کی کتب معروفہ میں موجود نہیں اس کی کوئی سند معروف نہیں اور یہ جھوٹی اور موضوع حدیث ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی موقع پر ایسا فرمایا بھی تھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب نے سنا ہو۔ اس لیے کہ جو کچھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے' تمام لوگ اسے نہیں سنا کرتے تھے [بلکہ وہ صحابہ جو موقع پر موجود ہوتے' وہی سنا کرتے تھے]۔ تو پھر اس وقت کیا کیفیت ہوگی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات کہی ہی نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ معروف اسناد کیساتھ منقول ہو۔ بلکہ اس پر مستزاد کہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑی گئی ہے۔ اور اس پر تمام اہل علم و محدثین کا اتفاق ہو۔

علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل و صفین سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بنا پر نہیں لڑی تھی بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر ان میں شرکت کی تھی۔ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت قیس بن عباد سے نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ جنگ لڑنے کا عہد لیا تھا یا آپ اپنی مرضی سے جنگ کر رہے

ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہیں بلکہ میری رائے پر مبنی ہے۔ ❶

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑنے والا محارب رسول اور دین اسلام سے مرتد ہوتا تو آپ ان جنگ آزماؤں سے مرتدین جیسا سلوک کرتے۔ بلکہ بروایات متواترہ آپ سے منقول ہے کہ آپ نے جنگ جمل میں کسی بھاگنے والے کا تعاقب کیا نہ کسی زخمی کو قتل کیا ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا نہ ان کے بچوں کو قیدی بنایا۔ آپ نے منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ لشکر میں اعلان کرے کہ: بھاگنے والا کا پیچھا نہ کیا جائے۔ زخمی کو قتل نہ کیا جائے' اور ان کے اموال کو غنیمت نہ بنایا جائے۔ اگر یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک مرتد ہوتے تو آپ ان کے زخمیوں کو قتل کرتے' اور بھاگنے والوں کا پیچھا کرتے۔

خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف یہی اعتراض اٹھایا تھا۔ خوارج نے کہا: ''اگر آپ کے مخالفین مومن ہیں، تو آپ ان کے خلاف جنگ آزما کیوں ہوئے؟ اور اگر کافر ہیں تو ان کی عورتیں اور مال کیوں کر حرام ٹھہرا۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج سے مناظرہ کرنے کے لیے اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے خوارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''مخالفین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، اگر تم کہو کہ وہ تمہاری ماں نہیں تو تم نے قرآن کو جھٹلایا اور اگر یہ کہو کہ وہ ہماری ماں ہیں اور تم ان کو قید کرنے اور ان سے مجامعت کرنے کو حلال قرار دو تو تم کافر ٹھہرے۔'' ❷

حضرت علی رضی اللہ عنہ اصحاب جمل کے بارے میں فرمایا کرتے تھے۔

''وہ ہمارے بھائی ہیں، مگر انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کر دی، اور تلوار نے ان کو گناہوں سے پاک کر دیا۔'' ❸

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فریقین کے مقتولوں کا جنازہ پڑھا تھا۔ اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

''علاوہ ازیں اگر اہل صفین مرتد تھے تو بقول شیعہ امام حسن رضی اللہ عنہ جیسے امام معصوم کے لیے خلافت سے دست برداری اور اسے ایک مرتد کو تفویض کرنا کیوں کر جائز ہوا؟ ان کے عقیدہ کے مطابق معصوم نے اسلام کی باگ ڈور ایک مرتد کے سپرد کردی۔ یہ تو کسی عام مسلمان کا کام بھی نہیں ہوسکتا چہ جائے کہ کوئی معصوم ایسی حرکت کرے؟''

نیز یہ بھی کہا جائے گا کہ: اگر [سنی] حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی مؤمنین تھے' اور ان کے مخالفین مرتد تھے؛ تو اس سے لازم آتا ہے کہ کفار اور مرتد ہمیشہ مؤمنین پر غالب رہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہونگے۔''

---

❶ مسند احمد(۱/ ۱۱٤) و فضائل الصحابة لامام احمد (٤٤٧)، والسنة لعبد الله بن احمد (۱۳۲۷)۔ قیس بن عباد اصحاب علی رضی اللہ عنہ سے ہیں، ان سے روایت کردہ احادیث بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں موجود ہیں۔ یہ حضرت حسن بصری کے استاد تھے۔
❷ مسند احمد(۱/ ۸٦۔۸۷) بمعناہ، طبقات ابن سعد(۳/ ۳۲)، معجم کبیر طبرانی (۱۰/ ۳۱٤) مجمع الزوائد(٦/ ۲۳۹۔۲٤۸)، تاریخ الاسلام للذھبی (عھد الخلفاء: ، ص:۵۸۸۔۵۹۰)
❸ سنن کبریٰ بیہقی (۸/ ۱۸۲)۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۞ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۞ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ [الصافات ۱۷۱۔۱۷۳]

''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔ بیشک یقیناً ان کی مدد کی جائے گی۔ اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ﴾ [المنافقون ۸]

''حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے۔''

یہ روافض جن کا دعوی ہے کہ ہم مؤمن ہیں یہ ہمیشہ ذلت اور پستی میں رہے ہیں۔ ان پر ہر جگہ میں ہمیشہ کے لیے ذلت مسلط کر دی گئی ہے' سوائے اس کے کہ یہ لوگوں کا سہارا لیں' اور کچھ اللہ کی طرف سے انہیں ڈھیل مل جائے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ ذیل آیت میں فریقین کو آپس میں جنگ و قتال اور زیادتی کے باوجود مومن قرار دیا ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ [1] (الحجرات: ۹)

''اگر مومنوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان دونوں کے مابین صلح کرا دیجیے۔''

صحیح حدیث میں یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیکہ آپ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے مابین تفرقہ بازی کے

---

[1] اہل ایمان سے خطاب کر کے فرمایا کہ: ان کا موقف یہ ہونا چاہئے کہ فریقین جب بھی برسر پیکار ہوں وہ ان کے مابین صلح کرانے کے لیے سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ کسی شخص میں اصلاح بین المومنین کا جذبہ جس حد تک بھی موجزن ہوگا وہ اس قدر صادق الایمان ہوگا اور وہ اتنا ہی زیادہ روح اسلام اور اس کے غایات و مقاصد سے قریب تر ہوگا۔ اور وہ جس قدر متنازع فریقین کے مابین شقاق و نفاق کا آرزو مند ہوگا، اسی قدر ضعیف الایمان اور روح ایمان سے بعید تر ہوگا۔ مختلف مذاہب و ادیان کے لوگ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے۔ غیر مسلم قاری جب جملہ اختلافی مباحث کے بارے میں اہل سنت و شیعہ کے رجحانات و میلانات کا موازنہ کرے گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے اخوان کرام صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں شیعہ کی ہر ممکن کوشش ہوگی کہ وہ شدت وحدت اور الحاح و اصرار سے ان کو بڑھاتا اور پھیلاتا چلا جائے گا۔ اس کے عین برعکس اہل سنت اس امر میں کوشاں ہوں گے کہ حکمت و دانش اور رفق و انصاف کو کام میں لا کر فریقین کے درمیان کوئی عذر شرعی تلاش کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ دونوں فریق حق سے دور نہیں۔ نیز یہ کہ یہ واقعات خارجی عوامل و اسباب کے تحت وقوع پذیر ہوئے۔ جن میں سب سے بڑا مؤثر اہل فتنہ کا وجود نامسعود ہے۔ اہل سنت ہمیشہ اتحاد و یگانگت اور موافقت و مطابقت کا پہلو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مومن خالص اور زیر تبصرہ آیت کا اصلی مخاطب تصور کرتے ہیں جب کہ شیعہ اپنے آپ کو اس آیت کا مخاطب تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی راہ پر گامزن نہیں، جو مسلک محمدی کے سالک تھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اہل سنت صالحین کے وارث ہیں اور شیعہ ان اہل فتنہ کی یادگار ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شریک تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ شیعہ آج تک اسی ڈگر پر گامزن ہیں اور فتنہ پردازی کے پرانے طریق کار کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو عبد اللہ بن مصعب بن زبیر نے خلیفہ ہارون الرشید کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جن لوگوں نے اعتراضات کیے تھے وہ شیعہ خارجی اور اہل بدعت تھے اور جن لوگوں نے آپ کی حمایت کی تھی وہ وہی لوگ تھے جن کو آج کل اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے۔''

خلیفہ ہارون الرشید نے غور و فکر کے بعد اس بات کو درست پایا اور کہا: ''اس کے بعد مجھے یہ مسئلہ دریافت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

وقت ایک فرقہ کا ظہور ہوگا' اور ان دو گروہوں میں سے ان کو وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔''
[مسلم ۲/ ۷٤٥؛ سنن ابو داؤد ٤/ ۳۰۰]

[لڑنے والے دونوں فریق مومن ہیں]:

سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''میرا یہ بیٹا (حضرت حسن رضی اللہ عنہ) سردار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کے مابین صلح کرائے گا۔''❶

نیز سرور کائنات ﷺ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کرے گا۔''

یہ نہیں فرمایا کہ: ''تجھے کافروں کا گروہ قتل کرے گا۔'' [یہ حدیث پہلے کئی مقامات پر گزر چکی ہے]

یہ احادیث مبارکہ اہل علم کے ہاں صحیح ہیں' اور متعدد اسناد سے روایت کی گئی ہیں۔ ان میں سے کوئی حدیث بھی دوسری روایت سے تعارض نہیں رکھتی۔ ان احادیث کے مضمون سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں متفرق گروہ مسلمان ہوں گے۔ اور اس انسان کی مدح کی ہے جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ ان دونوں کے مابین صلح کرائے گا۔ اور یہ بھی خبر دی کہ اسلام سے ایک گروہ نکلے گا' اور انہیں ان دو جماعتوں میں سے وہ لوگ قتل کریں گے جو حق کے زیادہ قریب ہوں گے۔ پھر اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نواصب (اللہ ان کو رسوا کرے) شیعہ سے کہیں کہ:

'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیا اور حصول اقتدار کے لیے جنگ لڑی، حالانکہ رسول ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔''❷

اور نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے پھرو۔''❸

تو اس حدیث کی رو سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فر ٹھہرے۔ تمہاری [شیعہ کی] دلیل نواصب کی دلیل سے زیادہ قوی نہ ہوگی۔ اس لیے کہ نواصب نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے' وہ صحیح روایات ہیں۔ ایسے ہی نواصب [روافض سے] یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ: کسی نفس کو قتل کرنا زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ اور جو کوئی اپنی اطاعت منوانے کے لیے لوگوں کو قتل کرے وہ بلند مرتبہ کی تلاش میں زمین میں فساد پھیلانے والا ہے۔ یہی حال فرعون کا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾

''یہ آخرت کا گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا اور اچھا انجام متقی لوگوں کے لیے ہے۔'' [القصص ۸۳]

جو کوئی زمین میں فساد و سرکشی پھیلائے وہ آخرت میں اہل سعادت میں سے نہیں ہوسکتا۔ یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مانعین زکوۃ اور مرتدین سے قتال کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی ﷺ للحسن بن علی رضی اللہ عنہما (حدیث: ۲۷۰٤)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب خوف المؤمن من ان یحبط عمله، (حدیث: ٤٨)، صحیح مسلم۔ کتاب الایمان، باب بیان قول النبی صلی الله علیه وسلم سباب المسلم فسوق...... "(حدیث: ٦٤)۔

❸ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات للعلماء (حدیث: ۱۲۱، ۷۰۸۰)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان معنی قول النبی صلی الله علیه وسلم " لا ترجعوا بعدی کفاراً " (حدیث: ٦٥، ٦٦)۔

اطاعت پر قتل کیا تھا؛ نہ کہ اپنی اطاعت پر۔ اس لیے کہ زکوٰۃ ان پر فرض تھی ۔تو آپ نے ان سے اس کا اقرار کروانے اور ادا کروانے کے لیے قتال کیا۔ بخلاف اس کے جو صرف اس وجہ سے قتال کرے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔

اسی لیے امام ابوحنیفہ' امام احمد اور دوسرے علماء کرام رحمہم اللہ نے فرمایا ہے:'' جو انسان یہ کہے کہ:'' میں زکوٰۃ ادا کرتا ہوں' مگر حاکم وقت کو نہیں دوں گا[بلکہ خود اپنے ہاتھ سے کسی کو دوں گا] تو امام کے لیے اس کے خلاف جنگ کرنا جائز نہیں۔ ❶

یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں فقہاء کے مابین اختلاف و نزاع ہے۔ پس جو لوگ حکمران کی اطاعت ترک کرنے پر قتال کو جائز قرار دیتے ہیں' وہ اس جنگ کو بھی جائز کہتے ہیں۔ یہ فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے' اور امام شافعی سے بھی منقول ہے۔

اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ترک کے علاوہ کسی چیز پر قتال کو جائز نہیں سمجھتے' اور نہ ہی کسی متعین شخص [حاکم] کی اطاعت ترک کرنے پر قتال کو جائز سمجھتے ہیں' وہ ان لوگوں سے قتال کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔

پس جملہ طور پر خلاصہء کلام یہ ہے کہ: جن لوگوں سے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قتال کیا' وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت

---

❶ [[اس مسئلہ کی مزید تفصیل منہاج السنہ میں یوں نقل کی گئی ہے]]: واضح رہے کہ فقہائے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی ایک جماعت نے مانعین زکوٰۃ اور خوارج سے لڑنے کو باغیوں کے خلاف جہاد و قتال قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جمل و صفین کی لڑائیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ قول مبنی بر خطا اور امام ابوحنیفہ، مالک، احمد اور دیگر اسلاف کی تصریحات نیز سنت نبوی کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے خوارج سے لڑنے کا حکم دیا تھا اور سب صحابہ اس میں یک زبان تھے۔ البتہ جمل و صفین کی لڑائی قتال فتنہ تھی؛ باغیوں کے خلاف جنگ نہ تھی۔ اس کے بارے میں آپ نے کوئی حکم دیا نہ اس پر اجماع صحابہ قائم ہوا۔ علاوہ ازیں اہل صفین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف لڑائی کا آغاز بھی نہیں کیا تھا۔ [اس ضمن میں حضرات صحابہ تین فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ اس لیے اجماع منعقد نہ ہوسکا۔ ایک فریق تو حضرت علی کا معاون تھا اور دوسرا حضرت معاویہ کا۔ تیسرا فرقہ جس کے سرخیل عبد اللہ بن عمر بن خطاب تھے، اسے فتنہ قرار دیتے اور اس سے کنارہ کش تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تحکیم کے واقعہ میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کی پیش کش کی گئی تو آپ نے معذرت فرمائی۔ ان امور میں صحابہ کا اجماع منعقد نہیں ہوا تھا۔'']

امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر علماء باغیوں سے اس وقت لڑنے کی اجازت دیتے ہیں جب وہ حاکم وقت کے خلاف لڑائی کا آغاز کردیں۔ امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک خلیفہ ان لوگوں سے لڑنے کا مجاز نہیں جو شرعی واجبات ادا کرتے ہوں مگر یہ کہیں کہ ہم فلاں شخص کو زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بنا بریں قتال مرتدین اور خوارج کے خلاف جہاد و قتال کے مابین فرق و امتیاز ضروری ہے۔ البتہ مانعین زکوٰۃ جب زکوٰۃ بالکل ادا نہ کریں اور اس کی فرضیت کے بھی قائل نہ ہوں تو ان کے خلاف صف آراء ہونا خوارج کے مقابلہ میں لڑنے سے زیادہ ضروری ہے۔

مزید براں قرآن کریم میں باغیوں کی جس لڑائی کا ذکر کیا گیا ہے وہ سابقاً ذکر کردہ دونوں لڑائیوں سے بالکل مختلف ہے اور وہ قتال کی تیسری جداگانہ قسم ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے باغیوں سے ابتداء لڑنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ ان کی اصلاح کا حکم دیا ہے، حالانکہ مرتدین اور خوارج کے بارے میں شرعی حکم اس سے مختلف ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جنگ جمل و صفین باغیوں کے خلاف لڑی گئیں یا ان کو قتال فتنہ قرار دیا جائے۔ جس میں بیٹھ رہنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے۔ صحابہ میں سے جو لوگ ان میں شریک نہیں ہوئے تھے اور وہ جمہور اہل حدیث ان کو قتال فتنہ ٹھہراتے ہیں۔

ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اگر اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کرنے کی بنا پر باغی ہوگئے تھے تو مذکورہ آیت میں ان کے جنگ آزما ہونے کا حکم موجود نہیں اور اگر فرض کیا جائے کہ وہ جنگ کے بعد باغی ہوگئے تھے تو صلح کرانے والا کوئی نہ تھا۔ امام ذہبی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ حضرت عمار والی حدیث میں کہ'' تجھے باغی جماعت قتل کرے گی'' ان کو باغی قرار دیا ہے۔ یہ ایسے مباحث ہیں جن کی بنا پر اصحاب معاویہ کی تکفیر ہرگز درست نہیں۔

ایک مرتبہ ابوموسیٰ منبر پر لوگوں کو یہ حدیث سنا رہے تھے، اسی دوران اشتر نخعی نے چند آدمیوں سمیت دارالامارۃ پر قبضہ کرلیا۔ جب ابوموسیٰ دارالامارۃ کی طرف لوٹے تو اشتر نے یہ کہہ کر داخل ہونے سے روک دیا کہ'' ہماری امارت کو چھوڑ دو۔'' ابوموسیٰ فتنہ بازی کی یہ زندگی چھوڑ کر عرض نامی گاؤں میں عزلت گزیں ہوگئے، جب لوگ خون ریزی سے سیر ہوگئے اور انھوں نے محسوس کیا کہ ابوموسیٰ جنگ سے روکنے میں حق بجانب تھے تو انھوں نے حضرت علی سے مطالبہ کیا کہ ابوموسیٰ تحکیم کے معاملہ میں اہل عراق کے نمائندہ ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ کو گوشہ عافیت سے اٹھا کر لایا گیا اور آپ نے ایک ناصح کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کیا۔

سے رکے ہوئے تھے اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کو نہیں مانتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ مرتد ٹھہرے۔ بخلاف ان لوگوں کے جو اس کا اقرار کرتے ہیں؛ لیکن کسی متعین شخص کی اطاعت کو تسلیم نہیں کرتے؛ جیسے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام ۔ اس لیے کہ یہ لوگ ان تمام چیزوں کو مانتے تھے جو رسول اللہ ﷺ لیکر آئے تھے۔ نماز قائم کرتے تھے' زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ: ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت میں داخل ہوئے بغیر بھی واجبات ادا کریں گے۔ ایسا کرنے میں ہمیں ضرر لاحق ہوگا۔ تو پھر کہاں یہ لوگ اور کہاں وہ لوگ؟ [تو شیعہ اس کے جواب میں نواصب کو کیا کہیں گے؟]

جنگ جمل و صفین کی شرعی حیثیت:

- شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث: ''اے علی تجھ سے لڑائی مجھ سے جنگ آزما ہونے کے مترادف ہے۔''
- جواب: اس روایت کا کذب اس بات سے ظاہر ہے کہ اگر حرب علی، حرب رسول ہوتی تو جنگوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کامیابی ناگزیر تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء و رسل کی نصرت و تائید کا کفیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔''

نیز فرمایا: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ ۝ وَإِنَّ جُندَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾ [الصافات ۱۷۱۔۱۷۳]

''اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔ بیشک یقیناً ان کی مدد کی جائے گی۔ اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

اس آیت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ حدیث صحیح ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اعداء ہمیشہ مغلوب ہوتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خوارج جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کا حکم دیا تھا' وہ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والوں میں سے بھی تھے۔ ان کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نصرت حاصل ہوئی جیسے رسول اللہ ﷺ اور دیگر مرسلین علیہم السلام کے دور میں ان کے مخالفین پر مدد کی جاتی تھی۔ اگرچہ ان جنگوں میں بہت بڑے امتحان کا بھی سامنا کرنا پڑتا؛ مگر آخر میں اچھا انجام کار مؤمنین کے حق میں ہی ہوتا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ رسول اللہ ﷺ کی جنگ ہوتی تو آخر کار آپ کو فتح و کامرانی ضرور نصیب ہوتی۔ حالانکہ ایسا ہوا نہیں۔ بلکہ آخر میں آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے جنگ بندی اور صلح کرنا چاہی۔ اور معاملہ ویسے ہی ہوا جیسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شروع میں چاہتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ: یہ جنگ و قتال؛ اگرچہ اس کی بنیاد اجتہاد پر تھی؛ مگر یہ ایسی جنگ بھی نہیں تھی کہ اس جنگ کے لڑنے والوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑنے والے سمجھ لیا جاتا۔ اور پھر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے والے تھے؛ تو ان محاربین کا حکم راہزنوں کا حکم ہوتا ہے؛ اگر یہ مسلمان ہوں تو انہیں کافر نہیں کہا جاسکتا۔

[ان کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾

''ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں۔''

اس کے باوصف ہم خوارج کی تکفیر نہیں کرتے، اس لیے کہ تکفیر کی صورت میں ان کے خلاف نبرد آزما ہونا ضروری ہے۔]

فصل:

بقول شیعہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر ؟

[کج فہمی]: شیعہ مضمون نگار لکھتا ہے:

❁ ''بعض فضلاء نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ:'' معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر تھے، کیونکہ شیطان نے تو کچھ نیکیاں بھی انجام دی تھیں، اس کے برخلاف معاویہ اعمال صالحہ سے محروم تھے۔ البتہ میدان معصیت میں شیطان کیساتھ تھا۔ علماء کے ہاں مسلم ہے کہ ابلیس سب فرشتوں سے زیادہ عبادت کرتا تھا۔ اور اس نے چھ ہزار سال تک تنہا عرش معلیٰ کو اٹھائے رکھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا' اور انہیں زمین میں خلیفہ بنایا۔ اور اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو یہ تکبر کر کے ملعون و مردود ٹھہرا۔ مگر معاویہ رضی اللہ عنہ اسلام لانے تک مشرک اور صنم پرست رہا ' یہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح کے ایک لمبے عرصہ بعد اسلام قبول کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنا بر کبر خلیفہ [امام] نہ مان کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کیا ' حالانکہ تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی تھی؛ اور آپ کو مسند خلافت پر بیٹھا دیا تھا؛ لہٰذا وہ ابلیس سے بدتر ٹھہرا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ یہ کلام جہل و ضلال کا آئینہ دار اور دین اسلام اور ہر دین سے خروج ہے۔ بلکہ اس عقل سلیم کے بھی منافی ہے جو بہت سارے کفار کو میسر ہوتی ہے۔ اس کی وجوہات کسی بھی غور کرنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتیں۔

[**پہلی بات**]: اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس لعین سب کفار سے بڑا کافر ہے، بلکہ سب کافر اس کے اتباع اور کشتۂ ضلالت ہیں۔ پس جو کوئی بھی جہنم میں داخل ہوگا' وہ اس کے اتباع کاروں میں سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص ۸۵]

''میں ضرور بالضرور جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا، جو ان میں سے تیری پیروی کریں گے۔''

شیطان ہر برائی کا حکم دیتا ہے' اور اسے لوگوں کے لیے خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ تو پھر کوئی شیطان سے بڑھ کر برا کیسے ہوسکتا ہے؟ اور پھر خاص کر مسلمانوں میں سے اور خصوصاً صحابہ کرام میں سے؟

[[لہٰذا اس سے بدتر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ میدان معصیت میں کوئی بشر ابلیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اس نے اعلانیہ حکم الٰہی سے عدول کیا اور پھر ہمہ تن اس کے بندوں کو گمراہ کرنے میں لگ گیا۔ بنا بریں اگر اس نے کچھ عبادت انجام دی تھی تو وہ اس کے کفر کی وجہ سے ضائع ہو گئی]]۔

[**اعتراض**]: شیعہ کا یہ کہنا ہے کہ:'' معاویہ رضی اللہ عنہ شیطان سے بدتر تھے، کیوں کہ شیطان نے تو کچھ نیکیاں بھی انجام دی تھیں، اس کے برخلاف معاویہ اعمال صالحہ سے محروم تھے۔ البتہ میدان معصیت میں شیطان کیساتھ تھا۔''

[**جواب**]: اس جملے کا تقاضا یہ ہے کہ جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے' وہ ابلیس سے بدتر ہو۔ اس لیے کہ اس کا اطاعت میں کوئی سابق یا پیشوا نہیں ہوتا۔ اور وہ میدان معصیت میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ تو پھر اس بنا پر آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ابلیس سے بدتر ہوں گے۔ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''تمام کے تمام بنی آدم خطا کار ہیں' اور ان میں سے بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں۔'' [ترمذی ٤/ ٧٠]

پھر کیا اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ:'' مسلمانوں میں سے جو کوئی گناہ

کرے وہ شیطان ابلیس سے بھی بدتر ہوگا؟ کیا اس قول کا باطل اور فاسد ہونا دین اسلام میں اضطراری طور پر معلوم نہیں ہے؟ ایسی بات کا کہنے والا یقیناً کافر ہے؛ اس کا کفر دین اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم ہے۔

اس قول کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ: شیعہ ہمیشہ گناہ کرتے ہیں۔تو ان میں سے ہر ایک ابلیس سے بھی بڑھ کر برا ہوگا؟

پھر اگر خوارج کہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گناہ کیا؛ لہٰذا آپ بھی ابلیس سے برے ہوئے۔''تو روافض کے پاس آپ کی عصمت کے دعوی کی کوئی دلیل نہ ہوگی۔اور نہ ہی شیعہ اس پر قادر ہیں کہ [اپنے اصولوں کے مطابق]خوارج کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان' امامت اور عدالت پر حجت پیش کر سکیں۔تو پھر آپ کے معصوم ہونے پر حجت کیسے پیش کر سکتے ہیں؟۔لیکن اہل سنت والجماعت اس پر قادر ہیں کہ آپ کے ایمان اور امامت پر حجت قائم کر سکیں۔اس لیے کہ رافضی جس چیز سے استدلال کرتے ہیں ان میں بہت سارا تناقض اور تعارض پایا جاتا ہے اس وجہ سے ان سے استدلال کرنا باطل ہو جاتا ہے۔

پھر جمہور کے قول پر قرآن کریم سے دلیل بھی قائم ہے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ [طه ۱۲۱]

''آدم سے اپنے رب کی نافرمانی ہوئی اور راہِ راست سے ہٹ گیا۔''

[اگر اسے شیعہ مسلک کے مطابق لیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ] آدم علیہ السلام ابلیس سے بھی برے ہوں۔ الغرض ان کے اس عقیدہ کی وجہ سے جو برائیاں پیدا ہوتی ہیں' وہ اعداد و شمار سے بڑھ کر ہیں۔

دوسری بات: رافضی کا کلام بغیر کسی دلیل کے ہے۔ بلکہ وہ فی نفسہ باطل ہے۔تم نے یہ کیوں کہا کہ: شیطان سے بدتر وہ ہے اطاعت میں جس کا کوئی سلف نہ ہو' اور میدان معصیت میں اس کے ساتھ ساتھ ہو؟۔اس لیے کہ شیطان کا ہر میدان معصیت میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔اور نہ ہی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایک نافرمانی میں ابلیس کے برابر ہو۔اور وہ لوگوں کو بہکاتا اور گمراہ کرتا ہو۔

ابلیس کی سابقہ اطاعت؛ اس کے کفر کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔اس لیے کہ مرتد ہوجانے بعد تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔پس اگر اس نے اس سے پہلے کوئی اطاعت وفرمانبرداری کے کام کیے ہوں گے تو وہ کفر اور ارتداد کی وجہ سے باطل ہو گئے اور جو کچھ نافرمانی کے کام کرتا ہے' ان میں اس کا کوئی مماثل و مقابل نہیں۔تو پھر یہ کہنا غلط ہوا کہ فلاں انسان ابلیس سے بڑھ کر برا ہے۔اس کی مثال ایسے ہی ہو سکتی ہے جیسے کوئی انسان مرتد ہو جائے' پھر زنا کرے' لوگوں کو قتل کرے' اور اپنی سابقہ اطاعت گزاری کے بعد انواع و اقسام کے گناہ کرے۔پس جو شخص اس کے بعد آئے؛ وہ ان ضائع شدہ اطاعات میں اس کے مقام کو نہ پہنچ سکے؛ مگر وہ کچھ محدود گناہوں میں اس کے ساتھ شریک رہے؛ تو ان کی وجہ سے وہ اس سے برا نہیں ہو جائے گا۔ تو پھر کوئی ابلیس سے بڑھ کر برا کیوں ہوسکتا ہے؟۔

اس سے خود شیعہ کے اصولوں پر کاری ضرب لگتی ہے۔خواہ وہ حق ہوں یا باطل۔اس سے سب سے کم یہ چیز لازم آتی ہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ ساتھی جو آپ سے مل کر برسر پیکار رہتے تھے' وہ کبھی کبھار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نافرمانی بھی کیا کرتے تھے؛ وہ ان لوگوں سے برے ہوئے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی بیعت کرنے سے رک گئے تھے۔اس لیے کہ ان لوگوں نے اصحاب علی رضی اللہ عنہ سے پہلے اللہ کی بندگی کی؛ جب کہ یہ لوگ میدان معصیت میں ساتھ چلتے رہے۔

تیسری بات: کون کہتا ہے کہ ابلیس فرشتوں سے زیادہ عبادت گزار تھا؟ اس کی کیا دلیل ہے کہ اس نے تنہا عرش کو چھ ہزار سال تک اٹھائے رکھا؟ یا پھر اس کا شمار عرش اٹھانے والوں میں ہوتا تھا؟ یا یہ کہ وہ ''طاؤس الملائکہ'' (فرشتوں کا مور) تھا؟ اور اس نے زمین و آسمان پر کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں سجدہ نہ کیا ہو اور ایک رکعت ادا نہ کی ہو؟ یا اس طرح کی دیگر باتیں جو عوام الناس میں مشہور کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی اساس نقل صادق پر ہے۔ حالانکہ یہ کسی آیت میں یا صحیح حدیث میں مذکور نہیں۔ تو پھر کیا اس سے کوئی انسان استدلال کرسکتا ہے سوائے اس کے جو اصول دین میں سب سے بڑا جاہل ہو۔

[شبہ] : بڑی عجیب بات تو یہ ہے کہ: ''رافضی مصنف کہتا ہے: ''علماء کے مابین اس بابت کوئی شک نہیں کہ ابلیس ملائکہ سے زیادہ عبادت گزار تھا۔''

[جواب] ہم پوچھتے ہیں کہ: ''یہ بات کس نے کہی؟ صحابہ کرام تابعین عظام میں سے کسی نے یا دیگر علماء کرام نے؟۔ تو پھر چہ جائے کہ یہ دعوی کیا جائے کہ علماء کرام کے مابین متفق علیہ ہے۔ یہ بات ہرگز کسی ایسے مسلمان عالم نے نہیں کہی جس کی بات قابل قبول ہو۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں صرف منقول پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ یہ حکایت کسی طرح بھی نبی کریم ﷺ سے نقل نہیں کی گئی؛ نہ ہی کسی صحیح سند سے اور نہ ہی کسی ضعیف سند سے۔ شیعہ مصنف کی افتراء پردازی کا یہ عالم ہے کہ اس جھوٹ کو علماء کے ہاں مسلم قرار دیتا ہے، اگر یہ بات کسی وعظ گو ملا نے کہی ہو یا ترغیب وترہیب [1] کی کسی کتاب میں درج ہو۔ یا کسی ایسی بے اصل تفسیر میں منقول ہو جو اسرائیلیات سے لبریز ہو تو بھی اس سے کسی معمولی بات پر احتجاج کرنا بھی درست نہیں چہ جائیکہ اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جائے کہ ابلیس گناہ گار بنی آدم سے افضل تھا اور صحابہ کو ان لوگوں کو شامل کیا جائے جن سے ابلیس بہتر تھا۔

اللہ و رسول نے کہیں بھی ابلیس لعین کا ذکر مدح وستائش کے انداز میں نہیں کیا۔ نہ ہی اس کی سابقہ کی عبادت کی وجہ سے اور نہ ہی کسی دوسری وجہ سے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر اس کی کوئی عبادت تھی بھی؛ تو وہ اس کے مرتد ہونے سے ضائع ہوگئی۔

اس سے بھی عجیب بات رافضی کا یہ کہنا ہے کہ: ''اکیلے ابلیس نے چھ ہزار سال تک اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے رکھا۔''

سبحان اللہ! کیا یہ بات کسی ایسے مسلمان عالم نے کہی ہے جس کی بات مسلمانوں میں مقبول ہو؟ اور کیا کسی جاہل اور غلو کار کے علاوہ کوئی دوسرا بھی یہ بات کہہ سکتا ہے؟ اگر یہ بات سچ ہوتی تو کسی بھی طرح نبی کریم ﷺ سے ضرور منقول ہوتی۔

پھر اکیلے فرشتہ کا بھی عرش کو اٹھانے کا کہنا صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ ابلیس تو حاملین عرش میں بھی شامل نہ تھا، تنہا حامل عرش ہونا تو ایک جداگانہ بات ہے۔ یہ سب یاوہ گوئی ہے اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ ابلیس کے جملہ اعمال

---

[1] یہ وہ کتب ہیں جو عوام کو وعظ سنانے کے لیے ترتیب دی گئی ہیں، ان میں ترغیب وترہیب پر مشتمل مبالغہ آمیز حکایات ہوتی ہیں، جو تاریخ وتراجم کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ یہ مبالغہ سنت الٰہی کے منافی ہو یا نہ ہو، البتہ کتاب وسنت کی تصریحات کے ضرور خلاف ہوتا ہے، ان کتب کے مصنفین باسند یا بے سند اور مصادر کا نام لے کر یا نام لیے بغیر جو احادیث بیان کرتے ہیں ان کی صحت کے اثبات میں چشم پوشی سے کام لیتے ہیں کہ یہ احادیث عوام کو وعظ سنانے کے لیے ذکر کی جاتی ہیں، استنباط احکام کے لیے نہیں، حالانکہ ان لوگوں کو احادیث سنانے کی بجائے ان کے سامنے اپنا عملی نمونہ پیش کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے، اگر نبی کریم یہ احادیث سنتے تو ان میں سے اکثر کو رد فرما دیتے۔

صالحہ اگر تھے بھی تو وہ ضائع ہو گئے تھے۔[نیز یہ کس نے کہا کہ: اکیلا ابلیس حاملین عرش میں سے تھا؟] یہ سب سے بڑا اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ [غافر ۷]

''وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے۔''

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس کا عرش اٹھانے والے کئی فرشتے ہیں' صرف کوئی ایک نہیں ہے۔ اور یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں اور اہل ایمان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: ''یہ عرش اٹھائے جانے کے متعلق مطلق ایک خبر ہے۔ اس میں کہیں بھی بیان نہیں ہے کہ وہی حاملین ابھی تک عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: صحیح روایات میں آیا ہے کہ وہی حاملین عرش ابھی تک اللہ تعالیٰ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ عبداللہ بن صالح اور معاویہ بن صالح سے روایت ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے عرش کو پیدا کیا تو فرشتوں کو عرش اٹھانے کا حکم دیا۔ وہ عرض گزار ہوئے: ہم اس عرش کو کیسے اٹھائیں گے جب کہ اس پر آپ کی عظمت ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کہو: لاحول ولاقوۃ إلا باللہ۔'' جب فرشتوں نے یہ کلمہ کہا تو ان میں عرش اٹھانے کی طاقت پیدا ہوگئی۔''

چوتھی بات: ان سے کہا جائے گا کہ: ابلیس نے کفر کیا تھا؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق خبر دی ہے' فرمایا:

﴿اِلَّا اِبْلِیْسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ﴾ [ص ۷۴]

''سوائے ابلیس کے' اس نے تکبر کیا' اور وہ کافروں میں سے تھا۔''

اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اس کے کچھ نیک اعمال بھی تھے' تو اس کے کفر کرنے کی وجہ سے وہ سارے ضائع ہوگئے۔ ایسے ہی باقی لوگوں کا حال ہے؛ جو بھی کفر کریگا اس کے اعمال ضائع کردیے جائیں گے۔ تو پھر ایسے مؤمنین سے تشبیہ کیسی؟

پانچویں بات: ان سے کہا جائے گا: ''تمہارا یہ کہنا کہ معاویہ شرک و کفر میں ہی رہے یہاں تک اسلام قبول کرلیا۔''

اس سے ان دونوں کے درمیان اجتماع کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کفر کے بعد ایمان لائے؛ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال:۳۸)

''جو لوگ کافر ہیں، ان سے فرمائیں کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کردیجیے جائیں گے۔''

آپ نے اپنے شرک سے توبہ کی؛ نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ ادا کرنے والے بن گئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ﴾ [التوبة ۱۱]۔

''اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

ابلیس نے ایمان کے بعد کفر کیا' جس کی وجہ سے اس کے ایمان والے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔ جب کہ امیر

معاویہ رضی اللہ عنہ نے کفر کے بعد اسلام قبول کیا؛ تو اسلام لانے سے ان کے دور کفر کے تمام اعمال ختم ہو گئے ۔تو پھر ان دونوں کے درمیان موازنہ کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ ایک ایمان لانے کے بعد کافر ہوا؛ اور دوسرا کافر تھا ایمان لے آیا؟

چھٹی بات: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا ثابت ہے۔ اسلام اپنے سے پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔اب جو کوئی آپ کے مرتد ہونے کا دعوی کرے؛ اور اس کا جھوٹا ہونا معلوم نہ بھی ہو تب بھی یہ دعوی بغیر کسی دلیل کے ہے ۔تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب اس دعویدار کا جھوٹا ہونا معلوم ہو۔ آپ مرتے دم تک اسلام پر قائم رہے۔ جس طرح دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اسلام پر باقی رہنا معلوم ہے۔ جس ذریعہ سے باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا [مرتے دم تک] اسلام پر قائم رہنا معلوم ہوتا ہے؛ اسی ذریعہ سے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا بھی اسلام پر قائم و باقی رہنا معلوم ہوتا ہے۔ شیعہ حضرت ابوبکر وعمر وعثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر صحابہ کو مرتد قرار دینے میں اسی طرح غلطی پر ہیں جیسے خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر تصور کرنے میں۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر قرار دینے والے جھوٹے ہیں' ایسے ہی ان باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو کافر و مرتد قرار دینے والوں کا جھوٹ بالکل واضح اور ظاہر ہے۔اس لیے کہ ان لوگوں کے ایمان پر باقی رہنے کی دلیل صاف واضح اور ظاہر ہے۔اور خوارج کا شبہ روافض کے شبہ سے زیادہ قوی ہے۔

ساتویں بات: اگر اس دعوی کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور دیگر کے لیے قدح واہانت ہے جو کہ کسی پر بھی پوشیدہ نہیں۔[شیعہ صحابہ کو مرتد قرار دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ] حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمیشہ مرتدین کے مقابلہ میں مغلوب رہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دستبردار ہو کر اسے مرتدین کو تفویض کر دیا۔ جبکہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مرتدین کو مغلوب و مقہور کیا تھا۔تو نتیجہ یہ ہوا کہ کفار کے خلاف نصرت الٰہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے ہمیشہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے شامل حال رہی۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ عادل ہے؛ وہ کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا۔تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا فتح و نصرت کا استحقاق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تھا۔اس وجہ سے وہ اللہ کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ٹھہرے۔

یہی نہیں' بلکہ حضرت ابوبکر وعمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے لشکر اور نائبین کافروں پر غالب و فاتح رہے؛ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتدین کی سرکوبی سے عاجز رہے؛ یہ مرتدین بھی کفار ہی تھے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران ۱۳۹]

''اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد:۳۵]

''پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو اور اللہ تمھارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تم سے تمھارے اعمال کم نہ کرے گا۔''

جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکے [اور ہر طرف سے شورشوں کے مقابلہ میں عاجز آ گئے] تو انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر صلح طلب کی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقہ پر حاکم رہے گا۔ جب کہ اللہ

تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ﴾ [محمد ۳۵]

''پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو۔''

[شیعہ کے مفروضات کے مطابق] اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی ہی مؤمن تھے' اور ان کے مخالفین مرتد تھے؛ تو ضروری تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی غالب رہتے؛ حالانکہ واقعات حال اس کے خلاف ہیں۔

آٹھویں بات: جو کوئی یہ کہتا ہے: '' معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین کو حاکمت سلیم کرنے کے حکم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری سے تکبر کیا۔'' [ہم اسے پوچھتے ہیں] آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت صحیح ہونے کا علم تھا؟ اور یہ کہ آپ کی اطاعت گزاری ان پر واجب ہے؟ اس لیے کہ آپ کی ولایت کے ثبوت او راطاعت کے واجب ہونے کی دلیل ان مشتبہ مسائل میں سے ہے جو بحث ونظر کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ بخلاف ان کے کہ جن کی اطاعت پر لوگوں کا اجماع ہو چکا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس بات کا علم ہو چکا تھا؛ تو [سیاسی مسائل میں] ہر نافرمانی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کرنے والا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ نافرمانی کبھی شہوت کی وجہ سے صادر ہوتی ہے اور کبھی تکبر کی وجہ سے۔ تو پھر کیا یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ہر نافرمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ایسے ہی تکبر کرنے والا ہے جیسے ابلیس نے تکبر کیا تھا؟

نویں بات: [شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتا ہے] '' عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔''

اگر اس دلیل میں کوئی حجت نہیں تو پھر اس کے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر اس میں حجت ہے تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ان تمام کا اجماع تھا؛ اور آپ کی بیعت بھی بہت عظیم الشان تھی۔ جبکہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اطاعت سے سرکشی کرنے والے کو کافر نہیں کہتے؛ بلکہ اسے مؤمن اور متقی شمار کرتے ہیں۔

دسویں بات: تمہارے اس قول کے مطابق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اجماع زیادہ کامل تھا۔ تم اور دوسرے لوگ کہتے ہو: حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کی خلافت سے ایک مدت تک پیچھے رہے۔ تو تمہارے اس قول کے مطابق حضرت علی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امام تسلیم کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک عرصہ تک تکبر کرتے رہے۔ تو تمہاری اس حجت کے مقتضی کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کفر لازم آتا ہے [معاذ اللہ]۔ یا پھر تمہاری یہ دلیل ہی سرے سے باطل ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کفر کا قول باطل ہے؛ تو اس سے لازم ہوا کہ تمہاری دلیل سرے سے باطل ہے۔

گیارھویں بات: یہ کہنا کہ: '' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد تمام لوگوں نے آپ کی بیعت کی۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ بہت سارے مسلمان؛ آدھے یا اس سے کچھ زیادہ یا کم مسلمان آپ کی بیعت میں شریک نہیں ہوئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ نے آپ کی بیعت نہیں کی۔

بارھویں بات: [شیعہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتا ہے] '' وہ آپ کی جگہ پر بیٹھ گیا۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع میں اپنے لیے ہرگز خلافت طلب نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امارت سے معزول کرنا چاہتے تھے۔ لیکن آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہیں کی۔ اور آپ اس علاقے پر والی رہے جہاں کی ولایت حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں آپ کے پاس تھی۔ جب فریقین کے درمیان صلح کے

لیے جرگہ ہوا تو اس وقت آپ صرف اپنی رعیت کے متولی تھے ۔ ہاں اگر اس سے مراد یہ ہے کہ آپ نے اپنے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا؛ تو پھر یہ بات درست ہے ۔لیکن حضرت امیر معاویہ فرمایا کرتے تھے :'' جو چیز آپ کے ہاتھ میں ہے میں اس کے بارے میں آپ سے جھگڑا نہیں کرتا ؛ لیکن میرے ہاں کوئی ایسا ثبوت بھی نہیں ہے جس کی روشنی میں مجھ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت گزاری میں داخل ہونا واجب ہوتا ہو۔''

یہ کلام خواہ حق ہو یا باطل ؛ مگر ایسا کہنے والے کو ہرگز ابلیس سے برا نہیں کہا جاسکتا ۔ پس جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو ابلیس سے برا کہتا ہے : تو اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے رسول پر اور اہل ایمان پر جھوٹ گھڑنے والا اور بہتان تراشی کرنے والا اور خیر القرون پر سرکشی کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ھوسکتا ۔اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ :

﴿اِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر ۵۱]

'' بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

جب کسی انسان کو ہوا پرستی اس حد تک پہنچادے تو وہ عقل کے دائرہ سے بالکل باہر ہوجاتا ہے ۔ چہ جائے کہ اس کے پاس علم اور دین ہو۔ ہم ہر آزمائش سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کو ذلیل و رسوا کرے ۔ اور اپنے مؤمن بندوں -اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ردیگر- کی نصرت فرمائے ۔ اوران ظالموں اور جھوٹوں کے ظلم سے نجات عطا فرمائے ۔

فصل:

[اہل سنت پر تعصب کا الزام]

[اشکالات]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:

'' بعض اہل سنت نے اس حد تک غلو سے کام لیا حتی کہ یزید بن معاویہ کو امام تصور کرنے لگے؛ حالانکہ اس نے انتہائی قبیح افعال کا ارتکاب کیا؛اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ ان کے اموال پر قبضہ کرلیا؛اورعورتوں کو قیدی بنالیا۔ اور اہل بیت خواتین کو ننگے اونٹوں پر سوار کرکے مختلف شہروں میں گھمایا۔ جب کہ زین العابدین کے گلے میں طوق پڑا تھا۔صرف قتل حسین رضی اللہ عنہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ آپ کو گھوڑوں کے نیچے کچل ڈالا؛ اور آپ کی پسلیاں توڑ دیں ۔اور آپ کے سر کو نیزے پر اٹھایا گیا۔ حالانکہ مشائخ نے یہ روایت کیا ہے کہ جس دن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے اس دن آسمان سے خون کی بارش برسی ۔ رافعی نے اپنی کتاب '' شرح الوجیز'' میں اور ابن سعد نے ''الطبقات'' میں ذکر کیا ہے کہ :جس دن حسین رضی اللہ عنہ قتل ہوئے اس دن آسمان میں ایک سرخی ظاہر ہوئی جو کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی ۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ :اس دن دنیا میں کوئی ایسا پتھر نہیں اٹھایا گیا جس کے نیچے سے خون نہ نکلا ہو۔ آسمان سے ایسی بارش برسی کہ اس کا اثر کپڑوں میں ان کے ختم ہونے تک رہا۔امام الزہری فرماتے ہیں :'' قاتلین حسین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جسے دنیا میں سزا نہ مل گئی ہو۔ یا تو اسے قتل کردیا گیا ؛ یا پھر وہ اندھا ہوگیا ؛ یا اس کا

چہرہ کالا ہوگیا؛ یا پھر بہت ہی کم مدت میں اس کی حکومت ختم ہوگئی۔''

رسول اللہ ﷺ کثرت کے ساتھ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے میں وصیت فرمایا کرتے تھے۔اور فرماتے تھے: یہ دونوں تمہارے پاس میری امانت ہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ﴾ (الشوریٰ ۲۳)

''آپ فرمادیں کہ میں قرابت داری کی محبت رکھنے کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

[جواب]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:''بعض اہل سنت نے اس حد تک غلو سے کام لیا حتی کہ یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو امام تصور کرنے لگے۔''

اگر شیعہ مصنف کی مراد یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یزید بھی ہدایت یافتہ خلفاء راشدین ابوبکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی طرح تھا؛ تو [یہ جان لینا چاہیے کہ] مسلمان علماء میں سے کوئی ایک بھی یہ بات نہیں کہتا۔اگر چہ بعض جاہل [اور متعصب] لوگ اس طرح کا نظریہ رکھتے ہوں۔جیسا کہ بعض جاہل کُردوں [1] سے نقل کیا گیا ہے؛ جو کہتے ہیں کہ: یزید صحابہ کرام میں سے تھا۔یا بعض کہتے ہیں: وہ نبی تھا۔بعض کہتے ہیں: وہ خلفاء راشدین میں سے تھا۔یہ نظریات رکھنے والے ان قابل اعتماد اہل علم میں سے نہیں ہیں جن کی باتیں قابل نقل و حجت ہوں۔مگر اس جہالت کے باوجود وہ شیعہ کے جہلاء و ملحدین سے بہتر ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الٰہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔یا پھر آپ کو نبی مانتے ہیں۔یا پھر کہتے ہیں کہ: شریعت کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہے۔جیسا کہ اسماعیلیہ' نصیریہ اور دوسرے [شیعہ فرقے] کہتے ہیں کہ: ان کے خواص سے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج ساقط ہو چکے ہیں۔یہ لوگ معاد [آخرت] کے منکر ہیں۔بلکہ ان میں سے غالی لوگ تو خالق کے ہی منکر ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ محمد بن اسماعیل [اسماعیلیہ فرقہ کا امام] محمد بن عبداللہ [رسول اللہ ﷺ] سے بہتر ہے اور اس نے آپ ﷺ کی شریعت کو منسوخ کردیا ہے۔اور اپنے ائمہ کے بارے میں اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام ائمہ معصوم ہیں۔

[1] شیخ عدی بن مسافر المتوفی (۴۶۷۔۵۵۷) ایک عابد و زاہد شخص تھے انھوں نے دیکھا کہ شیعہ یزید پر طرح طرح کے بہتان باندھتے اور اس کے دین واخلاق پر حملے کرتے ہیں۔روافض کے اس رویہ سے تنگ آ کر شیخ عدی نے اعلان کردیا کہ یزید امام تھا اور شیعہ کے سب اتہامات اس کے خلاف کذب ہیں۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ''العدویہ'' میں لکھا ہے کہ شیخ عدی کا مسلک افراط و تفریط سے پاک تھا۔شیخ عدی کے ایک نائب حسن کے زمانہ میں روافض اتباع عدی کی ایک جماعت پر حملہ آور ہوئے۔اور عدی کے خلیفہ شیخ حسن کو قتل کردیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ عدی کے مریدوں نے اس طرح غلو سے کام لینا شروع کیا جس طرح شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کے بارے میں مبالغہ آمیزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔کرد جو شیخ عدی کے مرید تھے یزید کو نبی قرار دینے لگے۔امام ابن تیمیہ کے زمانہ میں بعض کرد یہی عقیدہ رکھتے تھے۔شیخ الاسلام نے ان کو راہ راست پر لانے کے لیے ''الرسالہ العدویہ'' تصنیف کیا اور اس میں واضح کیا کہ شیخ عدی نیک آدمی تھے۔اگر اس وقت زندہ ہوتے تو ارادت مندوں کے اس اغراق و مبالغہ کو ناپسند کرتے۔''الرسالہ العدویہ'' کا ایک قدیم ناقص الآخر نسخہ دارالکتب المصریہ میں تاہنوز محفوظ ہے۔علامہ محقق احمد تیمور پاشا نے الرسالہ العدویہ کے چند فقرے اپنے رسالہ''الیزیدیت'' میں درج کیے ہیں ہم رسالہ مذکورہ کو دو مرتبہ طبع کرا چکے ہیں۔آخری مرتبہ یہ ۱۳۵۲ ہجری میں چھپا۔رسالہ مذکور سے واضح ہوتا ہے کہ کرد یزید کو نبی قرار دیتے ہیں، پھر اس سے بڑھ کر منصب الوہیت پر فائز کردیا، اس فرقے کا نام''یزیدیہ'' ہے۔قبیلہ کرد کی یہ جماعت شمالی عراق کے علاقہ منجار میں بود و باش رکھتی ہے۔کچھ لوگ روس کے صوبہ اور دمشق و بغداد و حلب کے نواح میں بھی سکونت گزیں ہیں۔شیخ عدی کردوں کے یہاں جبال ہکار میں جانے سے پیشتر لبنان و شام کے ایک گاؤں میں رہ کر مصروف عبادت رہا کرتے تھے۔یہ بعلبک کے قریب بیت فار نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔تصوف میں شیخ عبدالقادر جیلانی اور عبدالقاہر سہروردی، عقیل منبجی۔حماد دباس اور ابوالوفا حلوانی کے شاگرد تھے۔اگر شیخ عدی کے اتباع ان کے طریقہ پر گامزن رہتے تو نہایت ہی صالح مسلمان ہوتے مگر انھوں نے کفر کی حد تک غلو سے کام لیا۔دراصل ان کا غلو روافض کے غلو سے پیدا شدہ اور اس کا توڑ ہے۔

جیسے ان کا مہدی اور اس کی اولاد؛ مثلاً: معز' حاکم اور ان کے امثال ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ خلفاء بنوامیہ اور بنوعباس کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں [اگر چہ یہ بھی غلط ہے؛ تاہم] یہ لوگ شیعہ سے کئی وجوہات کی بنا پر بہتر ہیں ۔ اس لیے کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے خلفاء ظاہری و باطنی طور پر مسلمان تھے ۔ ان کے گناہ بھی ایسے ہی تھے جیسے دیگر کسی مسلمان کے گناہ ہو سکتے ہیں؛ وہ کافر یا منافق نہیں تھے ۔

یہ باطنیہ [شیعہ] فرقہ کے لوگ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں ۔ جو ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے وہ ان لوگوں سے بڑھ کر جاہل اور گمراہ ہے جو خلفاء بنوامیہ اور بنوعباس کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔ بلکہ اگر کوئی تمام مسلمان بادشاہوں کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے جو ظاہری و باطنی طور پر مسلمان تھے؛ تو پھر بھی [باطنی شیعہ ان سے بڑھ کر گمراہ ہیں؛ یہ لوگ] ان سے بہتر ہیں جو ان ائمہ کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو جہالت اہل سنت والجماعت کے لوگوں میں پائی جاتی ہے؛ شیعہ میں پائی جانے والی جہالت اور گمراہی اس سے کئی درجہ بڑھ کر ہے ۔ خصوصاً ان [باطنیہ' اسماعیلیہ وغیرہ] کی گمراہی نفاق اور زندیقیت پر مبنی ہوتی ہے نہ کہ جہالت اور تاویل کی وجہ سے ۔ جب کہ ان [اہل سنت] میں جہالت کی وجہ سے زندیقیت یا نفاق نہیں ہوتے؛ بلکہ ان کی وجہ بدعات؛ تاویل یا علم شریعت کی کمی ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان لوگوں کے لیے کتاب و سنت کا صحیح پیغام سامنے آتا ہے تو اپنے سابقہ عمل و عقیدہ سے رجوع کر لیتے ہیں ۔ جب کہ ملحدین اپنے باطن میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ محمد ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ تناقض رکھتا ہے ۔ مگر پھر بھی وہ اس مخالفت پر اس لیے کمر بستہ رہتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ آپ نے اپنے عقل و فضیلت کی بنا پر ناموس [دین کو پوشیدہ اور راز میں] رکھا تھا ۔ پس ہمارے لیے بھی ایسے ہی ناموس رکھنا جائز ہے جیسے آپ نے رکھا تھا ۔ [یعنی نبی کریم ﷺ پر دین چھپانے کا الزام لگا کر خود حق بات چھپاتے ہیں] ۔ اس لیے کہ ان کے ہاں نبوت ایک کسبی چیز ہے ۔ ان کے ہاں نبوت ایسے ہی جیسے علماء و عباد کو حاصل ہونے والی فضیلت ۔ اور شریعت ویسے ہی ہے جیسے کسی عادل بادشاہ کی سیاست ۔ اس بنا پر وہ اس شریعت کو کسی دوسرے امام کی وضع کردہ شریعت سے منسوخ کرنا جائز سمجھتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے: ''بیشک شریعت عامہ [عوام الناس؛ یا اہل سنت] کے لیے ہے ۔ جب کہ ان کے لیے وہی کچھ ہے جس پر باطن میں وہ عمل کرتے ہیں ۔ ان سے واجبات ساقط ہو چکے ہیں' اور محرمات ان کے لیے مباح کر دی گئی ہیں ۔

یہ لوگ اور ان جیسے دوسرے لوگ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں ۔ بلکہ اگر مان لیا جائے کہ کچھ لوگ بنی امیہ یا بنی عباس میں سے کسی ایک عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں' یا [خیال کرتے ہیں کہ] ان کا کوئی گناہ نہیں؛ یا پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے ان کے گناہوں پر مؤاخذہ نہ کرے گا ۔ جیسا کہ بنوامیہ کے بعض اتباع سے نقل کیا گیا ہے کہ خلیفہ کے نیک اعمال قبول کیے جاتے اور برے اعمال سے درگزر کی جاتی ہے ۔ یہ لوگ بلاشبہ گمراہ ہیں ۔ مگر ان کی گمراہی ان لوگوں کے مقابلہ میں کم ہے جو امام منتظر کی عفت و عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں جو کہ اصل میں معدوم ہے ۔ یا ان لوگوں کی عصمت کے قائل ہیں جنہیں کوئی قوت و اختیار حاصل نہیں جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکے ۔ اور نہ ہی ان کے پاس کسی عام مسلمان سے بڑھ کر کوئی علم اور دین ہے ۔ [جب کہ اس کے برعکس] ان [اہل سنت] کا عقیدہ ہے کہ حاکم کی نیکیاں بھی اتنی زیادہ ہوتی ہیں جو اس کے گناہوں کو ڈھانک لیتی ہیں ۔ اور ایسا ہونا فی الجملہ ممکن ہے ۔ کسی بھی مسلمان کے لیے اس بات کا امکان ہے اس کی نیکیاں اتنی ہوں

جو اس کی برائیوں پر غالب آ جائیں۔ اگر چہ یہ گواہی کسی متعین شخص کے لیے بغیر کسی شرعی دلیل کے نہیں دی جا سکتی۔ مگر یہ دعوی کرنا کہ مسلمانوں میں کوئی [ایک صاحب شریعت سے] بڑھ کر دیندار اور عالم ہے' اور خطاً سے معصوم ہے؛ تو یہ نظریہ بالکل باطل ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کے لیے بھی معصوم ہونے کا دعوی کرنا قطعی طور پر باطل ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ ان لوگوں میں سے جس کسی نے کسی کے معصوم ہونے کا دعوی کیا ہے وہ اپنی جہالت اور گمراہی کے باوجود حق کے زیادہ قریب اور رافضیوں سے کم درجہ کا جاہل ہے۔ جس انسان نے یزید کے صحابی یا نبی ہونے کا دعوی کیا وہ [گمراہ ہونے کے باوجود] ان رافضیوں سے جہالت و گمراہی میں کم تر ہے جو شیعہ شیوخ کے لیے نبوت و الوہیت کا دعوی کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر اسماعیلیہ اور نصیریہ کے شیوخ؛ جو کہ یہود و نصاری سے بڑے کافر ہیں' اور ان کے ماننے والے ان کے متعلق الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

جب کہ علماء اہل سنت والجماعت کے مقبول و مروی قول کے مطابق ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو یزید اور اس جیسے دوسرے خلفاء کو جناب حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین خلفاء راشدین مہدیین کے برابر سمجھتے ہوں۔ بلکہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ و ایمان اصحاب سنن کی روایت کردہ اس حدیث کے مطابق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' خلافت نبوت تیس سال تک ہوگی پھر ملوکیت کا آغاز ہوگا۔'' [یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔

اگر یزید کی امامت سے مراد یہ ہے کہ وہ دیگر اموی و عباسی خلفاء کی طرح سلطان وقت اور صاحب السیف تھا تو یہ ایک یقینی بات ہے جسے سبھی جانتے ہیں۔ اور اس کا انکار کرنے والا حقیقت واقعہ کا منکر ہے۔ یزید کی بیعت اس وقت کی گئی جب ان کے والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ اس طرح یزید بلاد شام؛ مصر' عراق؛ خراسان اور دیگر علاقوں کا حاکم بن گیا۔ [1]

---

[1] خلافت یزید کے سلسلہ میں دو باتیں محل فکر و نظر ہیں (۱) آیا یزید منصب خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟ (۲) یزید کی نامزدگی۔
جہاں تک پہلے مبحث کا تعلق ہے، ہم اس پر قبل ازیں اظہار خیال کر چکے ہیں کہ یزید اپنے ننھال قبیلہ قضاعہ کے بدویانہ خیموں میں جرأت و شہامت اور تکلف و تصنع سے پاک و سادہ ماحول میں پروان چڑھا۔ شیعہ نے اپنی کتابوں میں یزید کی سیرت و سوانح سے متعلق جھوٹ کا جو طوفان باندھا ہے، یہ یزید پر عظیم ظلم ہے۔ یزید کی سیرت و کردار کے بارے میں حضرت محمد بن حنفیہ کی شہادت کے بعد مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ جب حضرت ابن زبیر کا داعی عبد اللہ بن مطیع لوگوں کو یزید کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا اور یزید کی جانب ان باتوں کو منسوب کر رہا تھا جو اس میں نہ تھیں مثلاً یہ کہ یزید شراب پیتا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا اور احکام قرآنی سے تجاوز کرتا ہے۔ یہ سن کر محمد بن علی بن ابی طالب المعروف بہ ابن الحنفیہ نے فرمایا:
''تم یزید کے بارے میں جن باتوں کا ذکر کرتے ہو وہ میں نے اس میں نہیں دیکھیں۔ حالانکہ میں نے اس کے یہاں قیام کیا تھا۔ دوران قیام میں نے دیکھا کہ یزید پابندی سے ہمیشہ نماز ادا کرتا۔ نیک اعمال میں پوری دلچسپی لیتا اور فقہی مسائل کا جواب دیتا، اس کے ساتھ ساتھ وہ سنت نبوی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔'' لوگوں نے کہا: ''یزید آپ کو دکھانے کے لیے یہ اعمال انجام دیتا تھا۔'' یہ سن کر امام ابن الحنفیہ نے فرمایا:
''یزید کو مجھ سے کس بات کا خوف یا لالچ تھا کہ اس نے تصنع سے عجز و انکساری کا اظہار کیا؟ کیا تم نے خود اسے شراب پیتے دیکھا ہے؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو تم شراب پینے میں اس کے شریک ٹھہرے، اور اگر نہیں دیکھا تو علم کے بغیر شہادت دینا تمہارے لیے کیوں کر روا ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''اگرچہ ہم نے یزید کو شراب پیتے نہیں دیکھا تاہم یہ بات درست ہے۔'' اس کے جواب میں حضرت ابن الحنفیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل شہادت کے بارے میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (سورہ زخرف: ۸۶)
میں اس معاملہ میں تم سے بری ہوں۔'' لوگوں نے کہا: ''آپ خلیفہ بننا چاہتے ہیں تو چلیے ہم آپ کو اپنا حاکم تسلیم کرتے ہیں۔'' امام ابن الحنفیہ نے فرمایا: میں حاکم یا محکوم کسی صورت میں بھی لڑائی کو حلال نہیں سمجھتا۔'' لوگوں نے کہا: ''آپ اپنے والد کی حمایت میں لڑ چکے ہیں۔'' ابن الحنفیہ نے فرمایا:
''میرے والد جیسا کوئی شخص لے آؤ، میں اس کی حمایت میں لڑنے سے گریز نہیں کروں گا۔'' لوگوں نے کہا: ''تو اپنے دونوں بیٹوں قاسم اور ابوالقاسم سے

بقیہ حاشیہ

کہیے کہ وہ ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے لڑیں۔'' ابن الحنفیہ نے کہا: ''اگر میں نے بیٹوں کو لڑائی کا حکم دے دیا تو گویا خود لڑائی میں شریک ہوا۔'' لوگوں نے کہا: ''ہمارے ساتھ کسی جگہ چل کر لوگوں کو جنگ کی رغبت دلائیں۔'' ابن حنفیہ نے کہا: ''سبحان اللہ! میں لوگوں کو ایسی بات کہوں جس پر خود عمل پیرا نہیں اور اسے پسند بھی نہیں کرتا۔'' لوگوں نے کہا: ''تو ہم آپ کو اس بات پر مجبور کریں گے۔''
ابن حنفیہ نے فرمایا: میں تو لوگوں کو اللہ سے ڈرنے اور اس بات کا حکم دوں گا کہ مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اللہ کی ناراضگی مول نہ لیں۔''
اس کے بعد ابن حنفیہ عازم مکہ ہوئے۔(البدایہ والنہایۃ ، لابن کثیر:۸/۲۳۳)
یزید کے حق میں یہ ایک عینی شاہد کی بیان کردہ تاریخی نص ہے۔ ابن حنفیہ ایک ایسے معتبر راوی ہیں کہ اگر ان سے کوئی بھی نص شرعی منقول ہوتی تو سب ائمہ اسلام اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا وصف مطلوب ہے کہ ابن حنفیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جگر گوشہ ہیں۔
صحیح مسلم کی کتاب الامارۃ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اس ضمن میں عبداللہ بن مطیع کے یہاں گئے، تو اس نے کہا ابوعبدالرحمٰن کے لیے مسند رکھیے۔ حضرت عبداللہ نے کہا: میں آپ کے یہاں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا بلکہ ایک حدیث سنانے آیا ہوں جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، آپ نے فرمایا: ''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ کو اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی اور جو شخص بیعت کے بغیر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' (صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین (حدیث:۱۸۵۱)
صحیح بخاری کتاب الفتن میں ہے کہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بیعت ترک کردی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے خدم و حشم اور بچوں کو جمع کیا اور کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: ''ہر دھوکہ باز کے لیے بروز قیامت جھنڈا نصب کیا جائے گا۔''
''ہم اللہ و رسول کے حکم کے مطابق یزید کی بیعت کر چکے ہیں اور میرے نزدیک اس سے بڑا دھوکا اور کچھ نہیں کہ حکم الٰہی کے مطابق ایک شخص کی بیعت کی جائے پھر اس کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جائے۔ مجھے جس شخص کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے یزید کی بیعت ترک کر کے کسی اور کی بیعت کر لی ہے میں اس سے باز پرس کروں گا۔'' (صحیح بخاری کتاب الفتن۔ باب اذا قال عند قوم شیئا ثم خرج.....'' (حدیث:۷۱۱۱)
حافظ ابن کثیر ''البدایہ والنہایۃ'' (۸/۲۲۸) میں امام مدائنی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لائے، اسی دوران یزید تعزیت کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا۔
جب یزید چلا گیا تو ابن عباس نے کہا: جب بنوامیہ رخصت ہوجائیں گے تو اہل علم کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔(البدایۃ والنہایۃ:۸/۲۲۸)
یہ وہ امور ہیں جو یزید کی صلاحیت امامت، صحابہ کے اس کو تسلیم کرنے اور ابن حنفیہ کی یزید کے حق میں تائید و شہادت سے متعلق ہیں۔ ابن حنفیہ نے تصریحاً کہہ دیا کہ یزید کے بارے میں دھوکہ بازوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صاف جھوٹ ہے۔
یہ بات ہنوز محتاج غور و فکر ہے کہ حضرت معاویہ نے یزید کو خلیفہ کیوں مقرر کیا جب قریش کے متعدد نوجوان جو یزید کے معاصر تھے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اپنے آپ کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ مثلاً سعید بن عثمان بن عفان بلکہ ان سے فروتر درجہ کے لوگ بھی اس منصب کو سنبھالنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ شوریٰ کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب ولی عہد نامزد کرنے سے بلاشبہ اولیٰ و افضل ہے۔ مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر اس وقت شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ منتخب کرنے کا سوال اٹھایا گیا تو امت میں خون ریزی کا ایسا دروازہ کھلے گا جو اسی وقت بند ہوگا جب قریش میں ولایت و خلافت کی اہلیت رکھنے والے سب لوگ صفحہ ارضی سے نابود ہو جائیں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ فضائل و مناقب اور خصوصیات ان مدعیان خلافت کے مابین تقسیم شدہ ہیں۔ اگر ایک شخص ایک خصوصیت رکھتا ہے تو دوسرا کسی اور وصف کا حامل ہے جو اس میں موجود نہیں۔
جہاں تک یزید کا تعلق ہے وہ اپنے معاصر مدعیان امارت و ولایت کے اوصاف و خصوصیات میں برابر کا سہیم و شریک تھا۔ البتہ حکومت و سلطنت کی ایک لابدی خصوصیت یزید میں ایسی تھی جس سے دوسرے یک سر محروم تھے۔ اور وہ یہ ہے کہ یزید عسکری قوت سے بہرہ ور تھا جو بوقت ضرورت اسلام کی ایک عظیم قوت ثابت ہوسکتی تھی اور اگر یزید خلافت میں مزاحمت کرنے والوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا تو یہ قوت وہاں بھی اس کا ساتھ دے سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اگر یزید کے ننھال قبیلہ قضاعہ اور اس کے حلیف یمنی قبائل کے سوا اس کا کوئی مددگار بھی نہ ہوتا تو بھی وہ اپنے سب مخالفین کو زیر کرسکتا تھا۔ اس موقع پر ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں حضرت حسین کے سفر عراق کا حال بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ ابن خلدون مقدمہ تاریخ کی فصل ''ولایۃ العہد'' میں لکھتا ہے: ''قوت و شوکت کا اندازہ لگانے میں حضرت حسین سے غلطی سرزد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مضر کی عصبیت ان دنوں قبیلہ قریش میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ قریش کی عصبیت عبد مناف میں اور عبد مناف کی حمایت و طرف داری بنو امیہ میں آ کر گھر گئی تھی۔ سب قریش اس حقیقت کا اعتراف کرتے تھے اور کسی کو اس سے مجال انکار نہ تھی۔ آغاز اسلام میں جب لوگ معجزات اور وحی الٰہی میں منہمک ہو [حاشیہ جاری ہے.....]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ سن ٦١ ہد دس محرم کو پیش آیا۔ یہ یزید کی بادشاہی کا پہلا سال تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کسی بھی شہر پر غلبہ حاصل کرنے سے پہلے ہی واقع ہوگئی۔ پھر یزید اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مابین جو کچھ واقعات پیش آئے؛ اور اہل مکہ اور حجاز میں سے جن لوگوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔ آپ کا ظہور یزید کی موت کے بعد ہوا؛ جب آپ نے خلافت کی طلب شروع کی۔ اس وقت آپ امیر المؤمنین کہلانے لگے۔ اہل شام کے علاوہ باقی لوگوں نے آپ کی بیعت کرلی۔ اسی لیے آپ کی ولایت کو یزید کی موت کے بعد سے شمار کیا جاتا ہے۔

جب کہ یزید کی زندگی میں پہلے آپ اس کی بیعت کرنے سے گریزاں رہے؛ پھر بیعت کرلی مگر یزید اس پر راضی نہ ہوا اس کا اصرار تھا کہ آپ کو قید کر کے اس کے پاس پیش کیا جائے۔ اسی وجہ سے ان کے مابین فتنہ پیدا ہوا۔ یزید نے آپ کی طرف ایک لشکر روانہ کیا؛ جس نے مکہ میں آپ کا محاصرہ کرلیا۔ آپ محصور ہی تھے کہ یزید کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد اہل شام کے ایک گروہ اور اہل عراق وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلی۔ ادھر یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تخت نشین ہوا۔ اس میں کچھ خیر اور اصلاح کا پہلو موجود تھا؛ مگر زندگی نے اسے زیادہ موقع نہ دیا۔ یہ صرف چالیس دن تک حاکم رہا؛ مگر اپنے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا۔ اس کے بعد مروان بن الحکم شام کا امیر بن گیا۔ اسے بھی زیادہ مہلت نہ ملی۔ پھر اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالملک بن مروان شام کا امیر بن گیا۔ اس نے حضرت مصعب بن زبیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی اور نائب سے لڑنے کے لیے ایک لشکر عراق روانہ کیا۔ مصعب بن زبیر قتل ہوگئے اور عراق کی حاکمیت عبدالملک کے پاس چلی گئی۔ ایک لشکر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کیا؛ جس نے مکہ میں آپ کا محاصرہ کرلیا۔ ان میں جنگ ہوئی۔

[... گزشتہ سے پیوستہ ...] گئے تو یہ جاہلی عصبیت فراموش ہوگئی تھی۔ نبوت اور خوارق و معجزات کا انقطاع ہونے کے ساتھ ہی یہ عصبیت لوٹ کر آ گئی اور قبیلہ مضر کے لوگ باقی لوگوں کو چھوڑ کر بنوامیہ کا ساتھ دینے لگے۔'' (مقدمہ ابن خلدون)

یزید کی نامزدگی میں حضرت معاویہ نے اسلامی شہنشاہیت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا تھا جس کا ان دنوں بڑا چرچا تھا اور جس کے پھلنے پھولنے اور وسعت پذیر ہونے میں دعوت اسلامی کی توسیع کا راز مضمر تھا۔ یہ توسیع زیادہ تر حضرت معاویہ وعثمان رضی اللہ عنہما اور ان کے خلفاء کے عہد میں ہوئی، نظر بریں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ عرب کے دونوں بازو یعنی یمن ومضر یا قحطان وعدنان میں کامل اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے۔ یزید کو ولی عہد نامزد کرنے سے پیشتر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کو امور سلطنت سکھایا کرتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ۴۹ ہجری میں یزید کو رومی سلطنت کے استقبال کے لیے روم بھیجا اور اس کے جھنڈے قسطنطنیہ کی دیواروں پر لہرانے لگے۔ یہ وہ بابرکت لشکر تھا جس میں حضرت عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، ابوایوب انصاری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابہ شریک تھے۔ اس عظیم اسلامی جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خواب کی تعبیر ظاہر کی جو آپ نے بمقام قباء حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ کے یہاں دیکھا تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب الاستئذان۔ باب من زار قوماً فقال عندھم (حدیث: ٦٢٨٢، ٦٢٨٣)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب فضل الغزو فی البحر (حدیث: ١٩١٢)

اگر ان تاریخی حقائق پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لخت جگر ابن الحنفیہ کی شہادت کا بھی اضافہ کرلیا جائے جس میں انھوں نے یزید پر عائد کردہ اتہامات کو بے بنیاد قرار دیا تھا تو اس مظلوم قریشی نوجوان (یزید) کی اصلی صورت سامنے آجاتی ہے جو اس پر از خیر و برکت زمانہ سے بالکل ہم آہنگ تھی جس کے ائمہ میں سے یزید بھی ایک امام تھا۔ علاوہ ازیں اس سے تاریخ اسلام کے وہ داغ دھبے دور ہو جائیں گے جن سے شریر لوگ اس کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں۔

اگر اس کتاب کے دامن میں مزید وسعت ہوتی تو ہم بہت سے تاریخی حقائق بیان کرتے۔ (بعض حقائق کے لیے دیکھیے ہمارے حواشی بر العواصم من القواصم) اگر زندگی نے مہلت دی تو میں اسلام کے اس قرض کو جس سے میری گردن زیر بار ہے صدر اسلام کی ایک ایسی تاریخ پیش کر کے ادا کروں گا جن کو دیکھ کر مسلم نوجوان عش عش کر اٹھیں اور مسلمانوں پر یہ راز آشکار ہو جائے گا کہ اموی دور میں اسلام یورپ اور افریقہ میں کیوں کر اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ایسی تاریخ امت مسلمہ کی ایک اہم ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایسے شخص کو اس خدمت کی توفیق ارزانی کرے جو بہمہ وجوہ اس کا حق ادا کرنے کے قابل ہو۔

یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ شہید کردیے گئے ۔اور نظام حکومت مکمل طور پر عبد الملک بن مروان کے ہاتھوں چلا گیا۔ پھراس کی اولاد میں بھی حکومت مستحکم رہی ۔اسی کی حکومت میں بخاری اور ماوراء النہر کے علاقے فتح ہوئے ۔ انہیں قتیبہ بن مسلم نے فتح کیا؛ جو کہ حجاج بن یوسف کا نائب تھا۔حجاج بلاد عراق پر عبد الملک کا نائب تھا۔ان میں ظلم وستم ہونے کے باوجود [ان کے دور میں] مسلمانوں نے ترک بادشاہ خاقان سے جنگ لڑی ؛ خاقان کوشکست دیکراسے اس کی اولاد سمیت قید کرلیا۔ نیز اسی کی حکومت میں بلاد سندھ فتح ہوئے ۔ بلاد اندلس پر غلبہ حاصل کیا ۔قسطنطنیہ پر غزوہ کیا۔اور ایک مدت تک اس کا محاصرہ کیے رکھا۔موسم گرما وسرما میں جہاد کو جاری رکھا۔

پھر جب حکومت بنوعباس کے پاس چلی گئی تو بلاد عراق، شام،مصر؛ خراسان ؛ حجاز ؛ یمن؛ اور دیگر جن علاقوں پر بنوامیہ کی حکومت تھی ؛ وہاں پر بنو عباس حاکم بن گئے سوائے بلاد مغرب کے۔ بنوامیہ نے بلاد مغرب [اندلس] پر اپنی حکومت قائم کرلی ۔اور بلاد قیروان کی حکومت ان دونوں کے درمیان میں تھی ۔

یزید اپنے عہد ولایت میں مسلمان بادشاہوں میں سے ایک تھا ؛ جسے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکومت دی تھی۔لیکن جب یزید کا انتقال ہوا تو مکہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے اس کی بیعت سے خارج تھے ۔ یزید بھی تمام بلاد اسلامیہ پر حاکم نہیں بن سکا جیسے بنوعباس تمام اسلامی ممالک کے حاکم نہ بن سکے ۔بخلاف عبد الملک اور اس کی اولاد کے ؛ انہیں تمام بلاد اسلامیہ پر حاکم بننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ایسے ہی خلفاء ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہ تمام اسلامی شہروں کے حاکم تھے۔لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام اسلامی شہروں پر حاکم نہ بن سکے۔

ان لوگوں کے امام ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حکومت وسلطنت اور سیف وسنان سے بہرہ ور تھے کسی کو حاکم مقرر کرتے اور کسی کو معزول کرتے ۔کسی کو دیتے اور کسی کو نہ دیتے ۔ ان کے احکام حدود سلطنت میں نافذ ہوتے تھے ۔ وہ شرعی سزائیں دیتے، کفار سے جہاد کرتے اور لوگوں میں مال تقسیم کیا کرتے تھے۔

یہ سب باتیں متواتر کی حد تک معروف ہیں اور ان سے مجال انکار نہیں ۔ان کے امام خلیفہ یا سلطان ہونے کا یہی مطلب ہے، جیسے امام صلوٰۃ وہ ہے جو لوگوں کو نماز پڑھاتا ہو جب ہم دیکھیں کہ کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھا رہا ہے تو اس کا امام ہونا ایک مشہود ومحسوس امر ہے جس میں جدل و بحث کی کوئی گنجائش نہیں ۔ باقی رہا اس کا نیک یا بد ہونا؛ نافرمان یا تابع فرمان ہونا تو یہ ایک الگ بات ہے ۔ اہل سنت سلاطین وخلفاء مثلاً یزید یا عبد الملک یا منصور میں سے جب کسی کو امام تصور کریں گے تو اس کی یہی حیثیت ہوگی ۔ جو شخص اس میں جدل یا بحث سے کام لیتا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے کوئی حضرت ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی ولایت یا قیصر وکسریٰ اور نجاشی کی بادشاہت کو تسلیم نہ کرے اور اس میں جھگڑنے لگے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کیا یہ ائمہ وخلفاء معصوم تھے؟ یا سب باتوں میں عدل وانصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے ؟ اور سب افعال وامور میں اللہ تعالیٰ کے اطاعت کیش تھے؟ تو کوئی مسلمان یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ ایسے ہی ان کے ہر حکم کے واجب الاطاعت ہونے کا عقیدہ کوئی بھی مسلمان عالم نہیں رکھتا ؛ اگر ان کا حکم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر ہو۔

تاہم اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعات وعبادات اور جن چیزوں میں ان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے' ان میں ان کے ساتھ شرکت کرسکتے ہیں ۔ چنانچہ ہم ان کی اقتداء میں جمعہ وعیدین اور دیگر نمازیں پڑھ سکتے ہیں، اس لیے کہ

اگر ان کی اقتداء میں نماز نہ پڑھی جائے تو نمازیں معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ ہم ان کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف جہاد کر سکتے ہیں۔ بیت اللہ کا حج کر سکتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت حدود میں ان کا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان ایسے ساتھیوں کے ساتھ حج کرنے جائے جن کے کچھ گناہ ہوں ؛ اور وہ حج کرنے آئے ہوں۔ تو ان کے گناہ اس کو کچھ بھی نقصان نہیں دیں گے۔ ایسے ہی غزوات اور دوسرے اعمال صالحہ کا معاملہ ہے۔[کوئی انسان نیک عمل انجام دے] اور اس میں اس کے ساتھ کوئی فاسق و فاجر آدمی بھی شریک ہو تو اس کی شرکت کی وجہ سے اسے کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور پھر اس وقت کیا کہنا جب اس طریقہ کے بغیر کسی کام کرنا ممکن ہی نہ ہو۔ اور جب ایسا والی ہو جو گناہ کے کام کرتا ہو؟ اسی طرح عدل و انصاف اور تقسیم مال وغیرہ میں بھی ان سے اعانت طلب کی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات ان کے احکام اور ان کی تقسیم عدل و انصاف پر مبنی ہوتی ہے وہ نیک کاموں میں اعانت کرتے ہیں [1] اور اثم و عدوان میں تعاون کرنے میں احتراز کرتے ہیں۔

فصل:

[یزید کے بارے میں لوگوں کی آراء]

جب یہ معاملہ واضح ہو گیا تو اب ہم کہتے ہیں: یزید کے بارے میں لوگ تین طرح کی رائے رکھتے ہیں:

ا۔ افراط۔ ۲۔ تفریط۔ ۳۔ وسط۔

پہلا گروہ: ان کا خیال ہے کہ یزید صحابہ کرام میں سے تھا؛ یا اس کا شمار خلفاء راشدین میں ہوتا ہے؛ یا پھر انبیاء میں سے تھا۔ یہ تمام باتیں باطل ہیں۔ دوسرا گروہ: ان کا خیال ہے: یزید باطن میں کافر اور منافق تھا۔ اس نے اپنے کافر رشتہ داروں کا

[1] اللہ کا شکر ہے کہ امت محمدیہ تاہنوز بخیر و عافیت ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ امت کے اوّلین ولاۃ و حکام غیر معصوم ہونے کے باوجود صلاح و استقامت کے انتہائی بلند معیار پر فائز تھے اقوام عالم میں جو لوگ مرتبہ و مقام کے لحاظ سے فروتر ہیں وہ ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ ان کی لغزشوں کا ذکر نہایت نرم الفاظ میں کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مناسب عذر تلاش کیا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دور حاضر کے بعض شریر ہمارے بعض نیک نہاد سلاطین و ملوک کی سیرت و سوانح کو بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کو چھپاتے اور ان کی تاویلیں کرتے اور ان سے صادر شدہ لغزشوں کو رائی کو پہاڑ بنا کر دکھا رہے ہیں، وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ وہ ان ولاۃ و حکام کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں حالانکہ اس کا سب سے بڑا نقصان ملت اسلامیہ کو پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے ملت کے اذہان و قلوب میں مایوسی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی سے بددل ہو جاتی ہے۔

حق کے پرستار و مددگار اہل سنت مثلاً امام بخاری و مسلم اور دیگر حفاظ حدیث کا معاملہ اس سے یک سر مختلف ہے، صداقت شعار راویان حدیث کی جمع و تدوین میں انھوں نے حد درجہ اعتدال سے کام لیا۔ خلفائے راشدین کے بعد آنے والے ولاۃ و حکام کے اخبار و واقعات جمع کرنے میں مؤرخین غالباً یہ نظریہ رکھتے تھے کہ تقابل کے نقطہ نظر سے وہ حکام خلفائے راشدین کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے، اس لیے انھوں نے ان کے بعض ایسے حقوق ادا کرنے میں فیاضی سے کام لیا جو بذات خود عظیم مگر خلفائے راشدین کے مقابلہ میں فروتر درجہ کے تھے۔ بہر کیف اہل سنت رسول اللہ ﷺ کے ماسوا کسی کو معصوم قرار نہیں دیتے اور ہر مستحق کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔ دور حاضر میں جب ہم از سر نو تاریخ اسلام کا جائزہ لے کر اسے کذب و دروغ سے پاک و صاف کرنے کا بیڑا اٹھائیں گے تو ہمیں ان اسباب نصرت و توفیق تک رسائی حاصل ہو گی جو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے مقدر کر رکھے تھے جنھوں نے عالم اسلام کی بنیاد رکھی اور اللہ کی دعوت کو اکناف ارضی تک پہنچایا اس وقت یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئے گی کہ باطل پرستوں نے جن لوگوں کی زندگی کو داغ دار کرنے کی سعی کی ہے وہ تاریخ اسلام کے عظیم ہیرو اور اپنے عصر و عہد کے چشم و چراغ تھے۔ (رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

اہل مدینہ اور بنی ہاشم سے بدلہ لیا۔ یہ دونوں قول باطل ہیں ؛ ان کا باطل ہونا کسی بھی عقلمند پر مخفی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یزید بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا۔ اور بادشاہ کا خلیفہ تھا۔ رہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مسئلہ؛ تو اس میں کسی کو بھی ذرا بھر بھی شک نہیں ہے کہ آپ کو مظلومیت کی حالت میں شہید کیا گیا۔ جس طرح کہ آپ جیسے دوسرے بہت سارے لوگ مظلومیت میں شہید کیے گئے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا یا اس قتل پر راضی رہنا یا قتل پر مدد کرنا ان کے قاتلین کی طرف سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی تھی۔ قتل حسین رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لیے ایک بہت ہی دردناک مصیبت تھی جو کہ اپنوں اور پرائیوں کی وجہ سے پہنچی۔ جب کہ یہ شہادت آپ کے حق میں شہادت؛ درجات کی بلندی اور شرف و منزلت کا سبب تھی۔

آپ کے لیے اور آپ کے بھائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعادت اور خوش نصیبی مقدر ہو چکی تھی۔ جو کہ کسی مصیبت اور پریشانی کے آئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ اہل بیت کے گھرانے میں ان بھائیوں جیسی مثالیں نہیں ملتی۔ انہوں نے اسلامی ماحول میں تربیت پائی؛ عزت و شرف کے ساتھ امن و امان میں رہے۔ پھر ان میں سے ایک کو زہر دیکر شہید کیا گیا؛ اور دوسرے کو قتل کر کے خلعت شہادت سے سرفراز کیا گیا۔ تاکہ یہ دونوں حضرات جنت میں شہداء کی منزلتیں پاسکیں۔

مگر یہ بھی یاد رہے جو کچھ اس واقعہ میں پیش آیا؛ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے قتل سے بڑھ کر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کو ناحق قتل کیا کرتے تھے۔ کسی نبی کا قتل ہونا بہت بڑی مصیبت اور بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسے ہی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے بڑا گناہ اور مصیبت ہے۔ ایسے ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل بہت بڑی مصیبت اور بڑا گناہ تھا۔ جب یہ سارے امور مصائب و ابتلاء ہیں تو مصیبت اور پریشانی کے وقت مسلمان پر صبر و استقامت کے دامن کو تھامنے رکھنا' اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا واجب ہو جاتا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ۞الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ [البقرہ]

''اور ان صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجیے' جنہیں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

فاطمہ بنت حسین، حضرت حسین سے روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس پر کوئی پریشانی آئی پھر وہ اس کو یاد کر کے ازسرنو (إنـا لِـلّٰـهِ وإنـا إلیـهِ راجعون) کہے؛ خواہ ایک زمانہ گزرنے کے بعد ہو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اتنا ہی اجر لکھیں گے جتنا پریشانی کے دن لکھا تھا۔''[1]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور آپ کی دختر محترمہ کی روایت اس قتل گاہ پر ایک گواہی اور شہادت ہے۔ بیشک قتل حسین رضی اللہ عنہ ایسی مصیبت ہے جسے یاد کرتے رہنا چاہیے بھلے جتنا لمبا زمانہ بھی گزر جائے۔ تو مسلمان کے لیے مشروع یہ ہے کہ اس موقع پر ازسر نو (إنـا لِـلـهِ وإنا إليهِ راجعون) کہے۔ باقی جو کچھ دیکھنے میں آتا ہے اپنے چہرے پیٹنا؛ گریبان پھاڑنا؛ اور جاہلیت کی طرح آہ و بکا کرنا؛ یہ ایسے امور ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناپسند کرتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں ایسی حرکات حرام ہیں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حرکات کے کرنے والوں سے برأت کا اظہار کیا ہے۔

صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] سنن ابن ماجه: حديث نمبر ١٦٠٠۔

''جوشخص (غمی و ماتم میں) اپنے رخساروں کو پیٹے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت کے لوگوں کی طرح گفتگو کرے تو وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''

ایک روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے اظہار برأت فرمایا:

''مصیبت کے وقت آواز بلند کرنے والی سے ؛ پریشانی میں اپنا سر منڈوانے والی سے ؛ اور ماتم میں اپنا گریبان پھاڑنے والی سے۔''[1]

اور مسلم شریف کی صحیح روایت میں یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نوحہ کرنے والی اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گی کہ اس پر گندھک کا کرتا اور زنگ کی چادر ہوگی۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوحہ کرنے والی عورت کو پیش کیا گیا تو آپ نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ آپ سے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! اس نے شعر پڑھ کر نوحہ شروع کیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا: ''اس نے صبر نہیں کیا؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے اور اپنی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس [ماتم اور آہ و بکا] سے منع کیا ہے۔ آہ و بکا کرنا زندہ کو فتنہ میں ڈالتا ہے۔ اور میت کو تکلیف دیتا ہے۔...... بیشک یہ میت پر نہیں رو رہی بلکہ تمہارے دراہم کے لیے رو رہی ہے۔''

فصل:

[قتل حسین رضی اللہ عنہ میں لوگوں کی آراء]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ افراط وتفریط اور وسط۔

۱۔ ایک گروہ کا کہنا تھا: آپ کو برحق قتل کیا گیا۔ اس لیے کہ آپ مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ بکھیرنا چاہتے تھے۔ صحیحین میں نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کر دو۔'' [صحیح مسلم ۳/ ۱٤۷۹؛ وسنن ابو داؤد ٤/ ۳۳٤]

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے خروج کیا تو اس وقت مسلمانوں کا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ آپ اس جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں: ''آپ پہلے خارجی تھے جنہوں نے اسلام میں مسلمان حکمرانوں پر خروج کیا۔''

۲۔ دوسرا گروہ کہتا ہے: ''آپ واجب الاطاعت امام تھے۔ آپ کے حکم کے بغیر امور ایمان میں سے کوئی بھی حکم نافذ نہیں ہوسکتا تھا۔ باجماعت نماز اور جمعہ صرف اسی کے پیچھے پڑھے جاسکتے ہیں جس کو آپ والی مقرر کر دیں۔ اور آپ کے حکم کے بغیر کفار سے جہاد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان لوگوں کے اور اس طرح کے دیگر اقوال بھی ہیں۔

۳۔ تیسرا گروہ: متوسط گروہ ہے؛ اہل سنت والجماعت؛ یہ نہ ہی پہلی بات کہتے ہیں اور نہ ہی دوسری۔ بلکہ ہم کہتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری: ح ۷٤۸۔ [2] مسلم ۲/ ٦٤٤۔

آپ کو مظلومیت میں شہید کیا گیا ہے۔ لیکن آپ اس امت کے ولی امر بھی نہیں تھے۔ حدیث مذکور آپ کو شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کا کو اپنے چچا زاد حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے خلافت کی طلب ترک کر دی تھی۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ آپ کو یزید کے پاس جانے دیا جائے؛ یا پھر انہیں محاذ جنگ پر جانے دیا جائے۔ یا پھر واپس اپنے شہر میں جانے دیا جائے۔ مگر ظالموں نے ایسا کچھ بھی نہیں کرنے دیا۔ بلکہ آپ سے گرفتاری پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایسا کرنا آپ پر واجب نہیں تھا۔ [بلکہ آپ کی شان کے خلاف تھا' اسی لیے آپ ڈٹ گئے' اور یہ واقعہ پیش آیا]۔

فصل:

[شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور بدعات کی شروعات]

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے سبب لوگوں میں دو قسم کی بدعات پیدا ہوئیں:

۱۔ یوم عاشوراء پر ماتم اور غم و حزن کی مجالس قائم کرنے کی بدعت۔ جس میں چہروں کو پیٹا جاتا ہے؛ نوحہ گری کی جاتی ہے' اور رویا اور چلایا جاتا ہے؛ پیاس کاٹی جاتی ہے؛ اور مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ سلف صالحین پر لعن وطعن اور ملامت کی جاتی ہے۔ اور گنہگاروں کے ساتھ ان لوگوں کو بھی شامل کر دیا جاتا ہے جن کا کوئی گناہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ سابقین اولین رضی اللہ عنہم کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ اور لوگوں کو ایسی روایات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جن میں اکثر جھوٹ ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ایجاد کرنے والے کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور فتنہ کا دروازہ کھولنا تھا۔ [حالانکہ] ایسا کرنا باتفاق مسلمین نہ ہی واجب ہے اور نہ ہی مستحب۔ بلکہ پرانے مصائب پر گریہ وزاری اور نوحہ کرنا ان بڑے امور میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام ٹھہرایا ہے۔ اور یہی حال فرحت و خوشی کی محفلیں جمانے کا ہے۔

کوفہ میں شیعان حسین رضی اللہ عنہ کی ایک قوم آباد تھی؛ جو آپ کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ان کا بڑا سردار مختار بن عبید ثقفی کذاب تھا۔ اور ایک قوم نواصب کی تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد سے بغض رکھتے تھے۔ ان میں سے حجاج بن یوسف ثقفی تھا۔ صحیح مسلم میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''قبیلہ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک سفاک (ناحق خون بہانے والا) ہوگا۔'' [مسلم ٤/ ١٩٧١]

آپ کے ارشاد گرامی کے مطابق ثقیف کا کذاب مختار بن ابی عبید شیعہ تھا اور سفاک حجاج بن یوسف ثقفی ناصبی تھا۔

شیعہ نے غم و اندوہ کی مجلسیں لگانی شروع کیں تو ناصبیوں نے خوشی اور مسرت کی مجالس جمالیں۔ اور انہوں نے روایات گھڑ لیں کہ: جو کوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کے کھانے میں وسعت کرتا ہے' اللہ تعالیٰ سارے سال کے لیے اس کے رزق میں وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ [یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ اور الزام تراشی ہے۔ دس محرم کے روزے کے علاوہ کسی چیز کی کوئی فضیلت ثابت نہیں]۔ امام حرب الکرمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے اس روایت کے متعلق پوچھا: تو آپ نے فرمایا: اس روایت کی کوئی اصل [بنیاد] ہی نہیں ہے۔''

سوائے اس روایت کے جو سفیان بن عیینہ نے ابراہیم بن محمد بن منتشر کوفی سے روایت کیا ہے؛ وہ اپنے والد سے نقل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ: جو کوئی عاشوراء کے دن اپنے اہل خانہ کے کھانے میں وسعت کرتا ہے......''

ابن منتشر کوفی نے ایسے لوگوں سے سنا ہے اور روایت کیا ہے جنہیں وہ جانتا نہیں ہے۔

ایسے ہی انہوں نے ایک اور روایت گھڑ لی ہے کہ: جس نے عاشوراء کے دن سرمہ لگایا؛ اسے پورا سال آنکھ میں تکلیف نہیں ہوگی۔اور جس نے عاشوراء کے دن غسل کیا وہ اس سال میں بیمار نہیں ہوگا۔اس وجہ سے کچھ لوگ عاشوراء کے دن غسل کرنے اور سرمہ لگانے؛ اپنے اہل وعیال کے خرچ میں وسعت کرنے اور نئے نئے کھانے بنانے کو مستحب سمجھنے لگ گئے۔

یہ حقیقت میں بدعات ہیں جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر تعصب رکھنے والے لوگوں نے گھڑ لی ہیں۔اور دوسری طرف وہ بدعات ہیں جو آپ کی ذات کے لیے تعصب کرنے والوں نے گھڑ لی ہیں۔[حقیقت میں یہ سب بدعات اور باطل امور ہیں] ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔

ائمہ اربعہ یا ان کے علاوہ دیگر ائمہ میں سے کسی ایک نے بھی اسے مستحب نہیں کہا۔نہ ہی یہ امور اور نہ ہی وہ امور۔اور نہ ہی ان چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی مستحب ماننے کی کوئی شرعی حجت موجود ہے۔بلکہ جمہور علماء کرام کے نزدیک یوم عاشورا کا مستحب عمل روزہ رکھنا ہے۔اس کے ساتھ نویں محرم کا روزہ رکھنا بھی مستحب ہے۔اور بعض نے صرف دس تاریخ کے روزہ کو مکروہ جانا ہے۔یہ ایک لمبی تفصیل ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

جن لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا قصہ نقل کیا ہے؛ انہوں نے اس میں بہت کچھ جھوٹ اپنی طرف سے زیادہ کردیا ہے؛ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ نقل کرنے والوں نے اس میں بہت کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔ ان لوگوں کا ارادہ یہ تھا کہ اس طرح کے واقعات و حادثات کو لوگوں کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کریں۔جیسا کہ مغازی اور فتوحات کے ضمن میں اس طرح کی چیزیں زیادہ کی گئی ہیں۔

شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو اہل علم ہیں' جیسے کہ علامہ بغوی اور ابن ابی الدنیا؛ وغیرہما۔ مگر اس کے باوجود ان کی مرویات میں منقطع آثار اور باطل قصے بھی پائے جاتے ہیں۔جو واقعات مصنفین نے بغیر اسناد کے ذکر کیے ہیں ان میں بہت سارا جھوٹ ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا گیا تو آپ کا سر عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لاکر رکھا گیا۔اس نے چھڑی سے آپ کے دانتوں پر مارا۔اس مجلس میں انس بن مالک اور ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہما موجود تھے۔صحیح بخاری میں ہے؛ محمد بن سیرین حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

''جب عبیداللہ بن زیاد کے پاس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا اور طشت میں رکھا گیا؛ تو ابن زیاد ان کی آنکھ اور ناک میں مارنے لگا[اور آپ کی خوبصورتی پر اعتراض کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا]:

''آپ سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔اور اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر اور داڑھی میں وسمہ کا خضاب کیا ہوا تھا۔''[صحیح بخاری:ح ٩٥٤]

بخاری شریف میں ہی ہے: حضرت ابن ابی نعیم سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

''میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سنا ان سے کسی نے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا اگر کوئی محرم (یعنی وہ شخص جو احرام کی حالت میں ہو) کسی مکھی کو مار ڈالے (تو کیا حکم ہے؟) تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''اے اہل عراق! تم مکھی کے قتل کا مسئلہ دریافت کرتے ہو؛ حالانکہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے بیٹے

(حسین رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دیا؛ حالانکہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''یہ دونوں میری دنیا کے دو پھول ہیں۔''
[صحیح بخاری:ح٩٥٩]

ایک مجہول سند کے ساتھ یہ بھی روایت کیا گیا ہے یہ واقعہ یزید کے سامنے پیش آیا۔اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر یزید کے پاس لے جایا گیا تھا۔اور اس نے چھڑی سے آپ کے دانتوں پر مارا تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ واقعہ ثابت نہیں ہے؛ پھر بھی روایت میں اس کے جھوٹے ہونے کی گواہی موجود ہے۔اس لیے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین چھڑی مارنے کے وقت موجود تھے وہ عراق میں تھے' شام میں نہیں تھے۔اور کئی لوگوں نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔اور نہ ہی وہ آپ کو قتل کروانا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ آپ کو عزت و اکرام سے رکھنا چاہتا تھا جیسا کہ اس کے والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسے وصیت فرمائی تھی۔مگر اس کی چاہت یہ بھی تھی کہ آپ کو خروج سے روکا جائے' اور آپ کو عراق میں حکومت قائم نہ کرنے دی جائے۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ عراق پہنچے تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اہل عراق انہیں رسوا کریں گے' اور انہیں گرفتار کرلیں گے؛ تو آپ نے تین مطالبات کیے:

١۔ مجھے یزید کے پاس جانے دیا جائے۔
٢۔ یا پھر مجھے اپنے وطن واپس جانے دیا جائے۔
٣۔ یا کسی محاذ جنگ پر جانے دیا جائے۔

مگر انہوں نے گرفتار کرنے کے علاوہ کسی بات پر رضامندی ظاہر نہ کی ۔ اور آپ سے جنگ کی یہاں تک کہ آپ مظلومیت کی حالت میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اور جب آپ کے قتل کی خبر یزید اور اہل کے اہل خانہ تک پہنچی تو ان پر بہت گراں گزری۔اور آپ کے قتل پر رونے لگے۔یزید نے کہا: اللہ تعالیٰ ابن مرجانہ-یعنی عبیداللہ بن زیاد- پر لعنت کرے؛ اللہ کی قسم! اگر اس کے اور حسین کے مابین کوئی رحم کا تعلق ہوتا تو وہ آپ کو قتل نہ کرتا۔'' اور کہا: میں قتل حسین رضی اللہ عنہ کے بغیر اہل عراق کی اطاعت پر راضی تھا۔اور پھر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اہل خانہ کو بہترین انداز میں تیار کر کے مدینہ روانہ کیا۔مگر اس کے ساتھ ہی اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ نہیں لیا' اور نہ ہی آپ کے قاتل کو قتل کیا۔

باقی رہا یہ قصہ جو آپ کے اہل خانہ خواتین اور بچوں کو قیدی بنانے اور بغیر پالان کے اونٹوں پر بیٹھا کر شہروں میں گھمانے کے بارے میں نقل کیا گیا؛ یہ سراسر جھوٹ اور باطل ہے۔مسلمانوں نے کبھی بھی کسی ہاشمیہ کو قیدی نہیں بنایا۔ وللہ الحمد۔اور نہ ہی کبھی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ہاشمیہ کو قیدی بنانے کو حلال سمجھا ہے۔مگر اہل ہواء اور جاہل لوگ بہت زیادہ جھوٹ بولتے ہیں۔جیسا کہ ان میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ: حجاج بن یوسف نے بنی ہاشم کی ایک جماعت کو قتل کیا تھا۔''

بعض وعاظ اور علوی ہونے کے دعویداروں؛ جن کے نسب میں طعن تھا؛ کے مابین ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ان میں سے ایک آدمی نے منبر پر کہا: ''حجاج نے سارے سید قتل کر دیے تھے؛ ان کی عورتوں کے لیے کوئی ایک بھی مرد باقی نہیں بچا تھا؛ پھر انہوں نے دوسرے لوگوں سے شادیاں کرلیں۔پس یہ لوگ انہی میں سے ہیں۔''

حقیقت میں یہ تمام باتیں جھوٹ ہیں۔حجاج نے باوجود اس کے کہ اس دوسرے لوگوں میں قتل عام کیا تھا مگر بنی ہاشم میں سے کسی ایک فرد کو بھی قتل نہیں کیا۔اس لیے کہ عبدالملک نے اس کے پاس خصوصی پیغام بھیجا تھا کہ خبردار بنی ہاشم کے ساتھ کچھ

بھی تعرض نہ کرنا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بنی حرب نے جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے تعرض کیا تو ان کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ حجاج نے دیگر بہت سارے عرب سرداروں اور باقی لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اس رافضی جاہل نے جب سنا کہ حجاج نے عرب اشراف کو قتل کیا تھا؛ تو اس نے یہ سوچ لیا کہ اس نے سادات ہی کو قتل کیا ہو گا۔ اس لیے کہ عام طور پر اشراف کا لفظ بنی ہاشم یا بعض بنی ہاشم پر بولا جاتا ہے۔ اور بعض علاقوں میں اشراف سے مراد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد لیے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کے ہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد اشراف شمار ہوتے ہیں۔

لفظ ''اشراف'' پر کوئی شرعی حکم مرتب نہیں ہوتا۔ بلکہ حکم کا تعلق بنی ہاشم سے ہے۔ جیسا کہ ان لوگوں پر صدقہ حرام ہے۔ اوران کا شمار آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا ہے؛ اس کے علاوہ بھی کچھ احکام ہیں۔

حجاج نے عبداللہ بن جعفر کی بیٹی سے شادی کرر کھی تھی۔ اس پر بنی امیہ راضی نہیں ہوئے یہاں تک کہ اسے طلاق دلوا دی؛ اس لیے کہ بنوامیہ بنو ہاشم کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ [اس لیے کہ بنو ہاشم اور بنوامیہ دونوں کا تعلق بنومناف سے ہے]۔

خلاصہ کلام! اسلام کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ انہوں نے کسی ایسی عورت کو قیدی بنایا ہو جس کا تعلق بنو ہاشم سے ہو۔ اور نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو قیدی بنایا گیا۔ بلکہ جب یہ لوگ یزید کے گھر میں داخل ہوئے تو وہاں پر آہ و بکاء سے کہرام مچ گیا۔ یزید نے ان لوگوں کی خوب عزت افزائی کی؛ اور انہیں اپنے پاس شام میں رہنے یا مدینہ طیبہ واپس جانے کا اختیار دیا۔ ان لوگوں نے مدینہ واپس جانے کو پسند کیا۔ نہ ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے سر کو گھومایا گیا؛ [اور نہ ہی کچھ دیگر ایسا ہوا] ان واقعات میں اتنے جھوٹے قصے شامل کر دیے گئے ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

باقی رافضی نے قتل حسین رضی اللہ عنہ کے بعد جن واقعات اور عقوبات کا ذکر کیا ہے؛ تو اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل بہت بڑے گناہوں اور جرائم میں سے ہے۔ اور آپ کو قتل کرنے والا؛ اس قتل پر راضی رہنے والا اور اس پر مدد کرنے والا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سزا وعقاب کا مستحق ہے جو ایسے قتل پر ملنی چاہیے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل ان لوگوں کے قتل سے بڑھ کر نہیں ہے جو آپ سے افضل تھے اور قتل کر دیے گئے؛ جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور سابقین اولین؛ اور وہ لوگ جو مسیلمہ کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔ اور شہدائے احد؛ اور وہ لوگ جو بئر معونہ پر قتل کیے گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قتل سے بڑھ کر نہیں۔ خصوصاً جن لوگوں نے آپ کے والد ماجد کو قتل کیا؛ وہ تو آپ کو کافر اور مرتد سمجھتے تھے۔ اور آپ کے قتل کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ آپ کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ آپ کو قتل کرنے کے خلاف تھے۔ اور آپ کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے قتل کیا۔ جیسا کہ لوگ اقتدار کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں بہت زیادہ جھوٹ ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہنا کہ اس دن آسمان سے خون کی بارش ہوئی۔ ایسا تو کسی ایک کے قتل پر بھی کبھی نہیں ہوا۔ اور یہ واقعہ بیان کرنا کہ اس دن دو پہر کے وقت آسمان پر سرخی ظاہر ہو گئی۔ یہ سرخی اس سے پہلے کبھی ظاہر نہیں ہوئی۔ یہ ایسی من گھڑت باتیں ہیں؛ جن کی مثال سابق میں نہیں ملتی۔ اس لیے کہ یہ سرخی تو ظاہر ہوتی رہتی ہے مگر اس کے کچھ اور طبعی اسباب ہیں؛ یہ ایسے ہیں جیسے شفق۔

ایسے ہی رافضی کا یہ دعوی کرنا کہ: ''اس دن جو بھی پتھر اٹھایا جاتا اس کے نیچے سے خون نکلتا۔'' یہ صاف جھوٹ ہے۔
امام زہری فرماتے ہیں: قاتلان حسین رضی اللہ عنہ میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جسے دنیا میں سزا نہ دی گئی ہو۔ گناہوں میں سے جس گناہ کی سزا بہت ہی جلد مل جاتی ہے وہ کسی پر ظلم کرنا ہے۔ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر ظلم کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔

[اشکال]: رافضی مصنف کا کہنا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق مسلمانوں کو بہت زیادہ وصیت کیا کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی:

﴿ قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ (الشوریٰ)

''آپ فرمادیں کہ میں قرابت داری کی محبت کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

[جواب]: حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا حق واجب ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ کے مابین غدیر خم کے مقام پر لوگوں سے خطاب کیا؛ آپ نے فرمایا:

''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہے ہوں، ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت اور نور ہے تو تم اللہ کی اس کتاب کو پکڑے رکھو اور اس کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہو اور آپ نے اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی خوب رغبت دلائی، پھر آپ نے فرمایا: ''(دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں۔ میں تم لوگوں کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم لوگوں کو اللہ یاد دلاتا ہوں۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب حسن و حسین رضی اللہ عنہما سب سے بڑے اہم ترین اور خواص اہل بیت میں سے ہیں جیسا کہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور ان سب پر ایک چادر ڈال دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے تھے پھر ان پر بھی چادر ڈال دی اور دعا کی:

''یا اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں، ان سے گناہ کی نجاست دور کر دے اور ان کو بھی خوب پاک کر دے۔''[2]

رافضی مصنف کا کہنا ہے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق مسلمانوں کو بہت زیادہ وصیت کیا کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے: ''یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں۔''

حدیث کی معروف کتابوں میں اس طرح کی کوئی حدیث نہیں پائی جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے بلند و برتر ہیں کہ وہ اپنے بیٹے مخلوق کے پاس امانت چھوڑ کر جائیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی کوئی وصیت کی ہوتی تو ان کی ایسے حفاظت کی

---

[1] صحیح مسلم: ح ۱۷۲۵۔ اس حدیث کا بقیہ حصہ یہ ہے: حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اے زید! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ کے اہل بیت میں سے ہیں، اور وہ سب اہل بیت میں سے ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ (زکوٰۃ، صدقہ و خیرات وغیرہ) حرام ہے۔ حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان، حضرت عقیل کا خاندان، آل جعفر، آل عباس۔ حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ان سب پر صدقہ وغیرہ حرام ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! ان سب پر صدقہ، زکوٰۃ وغیرہ حرام ہے۔ اس سے ظاہر ہوا جو لوگ صرف اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کو عترت یا اہل بیت شمار کرتے ہیں وہ خطاء پر ہیں۔

[2] جامع ترمذی: حدیث نمبر ۱۱۵۳۔

جاتی جیسے امانت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ مردوں کو امانت نہیں رکھا جاتا۔ اگر چہ بچوں کو ایسے لوگوں کے پاس امانت رکھا جاتا ہے جو ان کی تربیت کریں اور ان کی خاطر خواہ حفاظت کرسکیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب بچے چھوٹے اور گود میں ہوں۔ پھر جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کو گود نہیں لیا جاتا۔ ان میں سے ہر کوئی خود مختار ہو جاتا ہے۔ اور اگر رافضی مصنف یہ کہنا چاہتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ امت آپ کی حفاظت کرے اور آپ کی چوکیداری کرے۔ تو یقیناً اللہ تعالیٰ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تو پھر امت کے کسی فرد سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مصائب و آفات سے آپ کی حفاظت کرے۔

اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ انہیں تکلیف نہ دی جائے؛ ان پر ظلم نہ کیا جائے۔ اور جو کوئی ان پر ظلم کرے تو اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے؛ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کسی ادنی مسلمان کے لیے بھی واجب ہے؛ تو پھر آپ کے لیے کیسے واجب نہ ہوتا؟ یہ مسلمان کے مسلمان پر حقوق میں سے ہے۔ جبکہ ان دونوں شہزادوں کا کسی بھی دوسرے کے حق سے بڑھ کر ہے۔

آیت ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ کا شان نزول:

❀ شیعہ کا کہنا کہ: پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل کی: ﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ (شوریٰ)

''آپ فرمادیں کہ میں قرابت داری کی محبت کے سوا تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔''

یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ یہ آیت سورت شوریٰ میں ہے۔ جو کہ بالاتفاق مکی سورت ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ اس کا نزول حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی ولادت سے بہت پہلے ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں شادی کی تھی۔ اور غزوہ بدر کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی۔ [1] غزوہ بدر سن دو ہجری میں پیش آیا تھا۔ اس پر تفصیلی کلام پہلے گزر چکا ہے۔ اور اس سے وہی مراد ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں قریش کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا تعلق قرابت داری نہ ہو اس آیت کے بارے میں:

﴿قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾ [الشوری ۲۳]

''کہہ دیجیے! کہ میں اس پر تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا مگر محبت رشتہ داری کی۔''

آپ فرماتے ہیں: کہ ان قرابت دارانہ تعلقات کی بنا پر جو میرے اور تمہارے درمیان پائے جاتے ہیں تو مجھ سے الفت ومحبت کا سلوک روا رکھو۔'' [2]،[3]

اہل سنت والجماعت اور شیعہ میں سے مصنفین کی ایک جماعت اور امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب نے ایک حدیث ذکر کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فرض الخمس، باب فرض الخمس (ح:۳۰۹۱) صحیح مسلم، کتاب الاشربۃ۔ باب تحریم الخمر (ح:۱۹۷۹)۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب المناقب (حدیث:۳۴۹۷)

[3] قبیلہ قریش کے ساتھ سرور کائنات ﷺ کی قرابت داری کی روشن مثال حضرت ابوسفیان کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے عزیزانہ مراسم ہیں۔ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب کفار مکہ نبی کریم ﷺ کو ستاتے تو آپ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیتے تھے۔ اسی لیے آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا وہ امن پائے گا۔ (سنن ابی داود۔ کتاب الخراج۔ باب ما جاء فی خبر مکۃ، (ح: ۳۰۲۱، ۳۰۲۲) اس کی تفصیلات کے لیے وہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے جس میں نبی کریم ﷺ اور ابوسفیان کے باہمی روابط وتعلقات کی تفصیل درج ہے۔

ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''علی اور فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔'' یہ روایت باجماع محدثین جھوٹ اور من گھڑت ہے۔

اس کی وضاحت اس چیز سے ہوتی ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ مفسرین کا اتفاق ہے کہ پوری کی پوری سورت شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بلکہ ساری حوامیم [السبع] مکی سورتیں ہیں۔ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی مدینہ میں ہجرت کے بعد ہوئی ہے۔ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی ولادت بالترتیب سن تین اور چار ہجری میں ہوئی ہے۔ تو پھر یہ کہنا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مکہ میں جب یہ سورت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''علی اور فاطمہ اور ان کے دو بیٹے۔''

فصل:

[یزید پر لعنت کا مسئلہ]

[اشکالات]: شیعہ مصنف رقم طراز ہے: ''اہل سنت کی ایک جماعت یزید کو خلیفہ نہ ماننے کے باوجود اس پر لعنت نہیں بھیجتی؛ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یزید ظالم تھا؛ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا؛ اور آپ کے اہل خانہ کو گرفتار کیا۔ حالانکہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ﴾ (ھود:۱۸)

''آگاہ ہو جاؤ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

حنابلہ کے شیوخ میں سے ابو الفرج ابن جوزی رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' آپ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی طرف وحی کی: میں نے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے بدلہ میں ستر ہزار کو قتل کیا۔ اور میں آپ کے نواسے کے بدلے میں انچاس کروڑ لوگوں کو قتل کروں گا۔ اور اہل سنت کے فضلاء میں سے سدّی رحمہ اللہ نے حکایت نقل کی ہے کہ: جب میں کربلا میں اترا تو میرے پاس تجارت کے لیے غلہ وغیرہ تھا۔ ہم نے ایک آدمی کے پاس پڑاؤ ڈالا اور اس کے ہاں شام کا کھانا کھایا۔ ہم قتل حسین رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو یاد کرنے لگے۔ ہم نے کہا: قتل حسین رضی اللہ عنہ میں جو کوئی بھی شریک ہوا تھا وہ انتہائی بری موت مرا ہے۔ تو وہ آدمی کہنے لگا: تم سے بڑھ کر جھوٹا کوئی نہیں۔ میں آپ کے قتل میں شریک تھا۔ اور ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے آپ کو قتل کیا؛ مجھے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ کہتے ہیں: جب رات کا آخری حصہ تھا تو ایک چیخنے والے نے چیخ لگائی۔ ہم نے پوچھا: کیا ہوا؟ کہنے لگے: گھر والا آدمی چراغ کو ٹھیک کرنے کے لیے اٹھا تھا تو اس کی انگلی جل گئی؛ پھر آگ اس کے جسم پر پھیل گئی اور وہ جل گیا۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم! میں نے اسے دیکھا کہ وہ جل کر کوئلہ بن گیا تھا۔

مُہَنّا بن یحییٰ نامی ایک شخص نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب یزید کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا: ''یزید نے جو کرنا تھا کیا۔'' میں نے کہا: اس نے کیا کیا؟ آپ نے فرمایا: اس نے مدینہ کو پامال کیا۔

امام موصوف کے بیٹے صالح نے آپ سے دریافت کیا کہ بعض لوگ ہمیں یزید کی دوستی سے متہم کرتے ہیں۔''

امام احمد نے جواباً فرمایا: ''بیٹا جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ یزید کا دوست کب ہوسکتا ہے؟''

صالح نے کہا: ''تو پھر آپ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتے۔''

امام احمد نے فرمایا: ''جس پر اللہ نے لعنت کی ہے میں اس پر لعنت کیوں نہ بھیجوں؟'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۲، ۲۳)

''بہت ممکن ہے اگر تم برسر اقتدار ہوئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور باہمی تعلقات توڑ دو گے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت بھیجی اور انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

اس سے بڑا فساد اور کیا ہوگا کہ یزید نے تین دن تک مدینہ کے شہر کو لوٹا۔ وہاں کے رہنے والوں کو قید کیا۔ سات سو قریش وانصار اور مہاجرین کے بڑے بڑے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور عام خواتین اور مردوں میں سے دس ہزار ایسے آدمیوں کو قتل کیا جن کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ آزاد تھے یا غلام۔ حتی کہ لوگ خون میں ڈوب گئے۔ یہاں تک کہ روضۂ رسول اور مسجد خون سے بھر گئے۔ پھر کعبہ پر منجنیق سے پتھر پھینک کر اسے منہدم کیا اور آگ لگا دی۔

نبی ﷺ فرماتے ہیں: ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آگ کے ایک صندوق میں ہوگا اور اسے تمام اہل جہنم سے آدھا عذاب ہو رہا ہوگا۔'' اور اس کے ہاتھ اور پاؤں آگ کی زنجیروں سے باندھ دیے گئے ہوں گے۔ یہاں تک کہ اسے جہنم کے ایسے انتہائی گہرے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا اس کے عذاب اور بدبو سے جہنمی بھی اپنے رب سے پناہ مانگ رہے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس دردناک عذاب میں مبتلا رہے گا۔ جب بھی اس کی چمڑی جل کر ختم ہو جائے گی اللہ تعالیٰ اسے ایک دوسری چمڑی سے بدل دیں گے۔ تاکہ اسے خوب عذاب دیا جائے۔ اس عذاب سے اسے ایک پل کے لیے بھی نجات نہیں ملے گی۔ اور اسے جہنمیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔ اور اس کے لیے ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دردناک عذاب کی۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: ''میرا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوگا جس نے میرے اہل کا خون بہایا اور میرے اہل بیت میں مجھے ستایا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: اس کا جواب یہ ہے کہ: یزید پر لعنت بھیجنے کے بارے میں شرعی حکم وہی ہے جو اس کے نظائر و امثال خلفاء وملوک کے بارے میں ہے۔ بلکہ یزید مقابلتاً ان سے بہتر ہے۔ مثلاً یزید مختار بن ابوعبید ثقفی امیر عراق سے افضل ہے۔ جس نے قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے انتقام لیا تھا۔ مختار کا دعویٰ تھا کہ اس پر جبرائیل علیہ السلام نازل ہوتا ہے۔ اسی طرح یزید حجاج کے مقابلہ میں بھی بہتر ہے۔ حجاج کے یزید سے بڑے ظالم اور فاسق ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

تاہم یزید اور اس کے امثال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فاسق تھے۔ اور کسی مخصوص فاسق پر لعنت کرنا شرعاً مامور نہیں ہے۔ البتہ سنت نبوی میں مختلف گروہوں پر لعنت کرنے کی اجازت ملتی ہے، مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے؛ وہ ایک انڈہ چراتا ہے اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔''

[البخاری ومسلم]

اور ایسے ہی فرمایا: ''جو انسان [دین میں] کوئی نئی چیز ایجاد کرے؛ یا کسی بدعتی کو پناہ دے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔''

[البخاری ۷/ ۱۶۹ ومسلم ۳/ ۱۲۱۹]

- نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سود کھانے والے پر؛ کھلانے والے پر؛ اس کی تحریر لکھنے والے پر اور اس کے لیے گواہ بننے والے پر لعنت کرے۔'' [سنن أبي داؤد ۲/ ۳۰۷، سنن الترمذي ۲/ ۲۹٤]۔
- نیز فرمایا: ''حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے ان پر اللہ کی لعنت ہو۔'' [سنن أبي داؤد ۳/ ٤٤٥]
- اور فرمایا: ''شراب پر؛ شراب بنانے والے پر؛ جس کے لیے بنائی جائے اس پر؛ جو اٹھا کر لے جائے؛ جس کیلئے اٹھا کر لے جائے؛ شراب پینے اور پلانے والے پر اور اسکی قیمت کھانے والے پر اللہ لعنت کی ہو۔'' [سنن أبي داؤد ۳/ ٤٤٥]

یزید اور اہل حرہ کا واقعہ:

یزید نے جو کچھ اہل حرّہ [1] کے ساتھ کیا اس کا اصل واقعہ یہ ہے کہ جب اہل مدینہ نے اس کی بیعت توڑ دی اور اس کے نائبین کو مدینہ سے نکال کر ان کے اہل خانہ کو گھیر لیا تو یزید نے اہل مدینہ کو پیہم پیغامات بھیج کر اطاعت کا مطالبہ کیا۔ مگر انھوں نے کچھ پروا نہ کی۔ [2] چنانچہ یزید نے مسلم بن عقبہ مری کو مدینہ بھیجا اور اسے اہل مدینہ کو ڈرانے دھمکانے کا حکم دیا یہ بھی کہا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ آزما ہو؛ اور تین دن تک مدینہ کو پامال کرے۔ یہی وہ بات ہے جس پر لوگوں نے یزید کے اس فعل کا انکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ: کیا یزید سے حدیث روایت کی جاسکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں' اس کی کوئی کرامت نہیں' یا یہ فرمایا: کیا یزید وہی نہیں ہے جس نے اہل مدینہ کے ساتھ کیا نہیں کیا؟''

---

[1] یزید بن معاویہ کے ایام خلافت ۶۳ ہجری میں حرہ واقم میں یہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا۔

[2] قاری اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے متعدد داعی مدینہ میں موجود تھے، ان کے سرخیل عبداللہ بن مطیع العدوی تھے۔ یہ داعی یزید پر طرح طرح کے بہتان لگا کر لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکاتے رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ابن مطیع کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی اور اسے سمجھایا کہ یزید کی بیعت توڑنا کوئی اچھا کام نہیں ہے بلکہ یہ عظیم غدر اور بے وفائی ہے۔ (البخاری کتاب الفتن۔ باب اذا قال عند قوم شیئاً ثمو خرج(ح:۷۱۱۱)، صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین (ح:۱۸۵۱)

شہادت حق اور بندوں کی خیر خواہی کے اعتبار سے امام ابن الحنفیہ کا موقف بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نقطۂ نظر سے کم نہیں ہے، جنھوں نے شیعی اکاذیب کی تردید کرتے ہوئے یہ سچی شہادت دی کہ آپ یزید کے ہاں اقامت گزیں رہ کر اچھی طرح اس کی سیرت و اخلاق کا بچشم خود ملاحظہ کر چکے ہیں۔ آپ اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ یزید پابند نماز، اعمال خیر کا حریص، متبع سنت اور فقیہ تھا۔ (البدایہ والنہایۃ: ۸/۲۳۳)

مگر عبداللہ بن عمر اور امام ابن الحنفیہ کی شہادت حق فتنہ پردازی کے شور و شغب میں دب کر رہ گئی۔ مدینہ کی فضا اشاعت و دعایت کے شور وغل سے مسموم ہوگئی اور وہاں کے حکماء و علماء اور صلحاء جاہل اور شرپسند عوام کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اہل ہوی کا مقصد وحید فتنہ پردازی اور شرپسندی تھا۔ اندریں حالات یزید نے سخت غلطی یہ کی کہ امراء مدینہ کو یکے بعد دیگرے معزول کرتا چلا گیا۔ چنانچہ عمر بن سعید بن العاص کو معزول کر کے اس کی جگہ ولید بن عتبہ کو مقرر کیا۔ پھر عبداللہ بن زبیر کی تدبیر سے متاثر ہو کر ولید کو معزول کر کے عثمان بن محمد بن ابی سفیان کو والی مدینہ مقرر کیا حالانکہ وہ اس منصب کے لیے موزوں نہ تھا۔ اسی دوران نعمان بن بشیر انصاری جو خود صحابی اور صحابی زادہ تھے ملک شام سے مدینہ پہنچے یہ اوّلین نومولود تھے جو اسلام کے بعد انصار کے ہاں پیدا ہوئے، یہ دمشق کے قاضی اور بہترین خطیب تھے۔ مدینہ پہنچ کر انھوں نے انصار کو اطاعت امیر اور لزوم جماعت کی تلقین کی اور فتنہ بازی سے یہ کہہ کر ڈرایا کہ تم اہل شام کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یزید نے ان کو فتنہ کے فرو کرنے کے لیے شام سے روانہ کیا تھا۔ عبداللہ بن مطیع نے نعمان بن بشیر کو مخاطب کر کے کہا: ''نعمان! تم کس لیے ہماری شیرازہ بندی کو منتشر کر کے ہم میں فساد پیدا کر رہے ہو؟''

یہ عجیب بات ہے کہ فتنہ پردازوں نے فتنہ کا نام اصلاح اور اس سے روکنے کا نام فساد مقرر کر رکھا تھا۔ یہ سن کر نعمان نے ابن مطیع کو جواباً کہا: ''جس بات کی طرف آپ دعوت دے رہے ہیں اگر وہ پوری ہوگئی تو آپ دیکھیں گے کہ مدینہ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہونگی اور لوگ شمشیر بکف بے دریغ ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہونگے؛ آپ خچر پر سوار ہو کر عازم مکہ ہوں گے اور یہ انصار غریب شہر کی گلیوں، مسجدوں اور اپنے گھروں کے دروازہ پر مقتول پڑے ہوں گے۔ (تاریخ طبری: ۷/۴، ۵، مطبع حسینیہ)۔ شیعہ کا مشہور راوی اور مؤرخ ابو مخنف لوط بن یحییٰ کہتا ہے: [...... حاشیہ جاری ہے......]

یہ بات غلط ہے کہ یزید نے تمام اشراف مدینہ کو قتل کروا دیا تھا۔ مقتولوں کی جو تعداد دس ہزار بتائی جاتی ہے یہ بھی درست نہیں ۔ اس بات میں بھی صداقت کا کوئی عنصر شامل نہیں کہ خون مسجد نبوی تک پہنچ گیا تھا۔ خون ریزی شہر سے باہر ہوئی تھی، مسجد میں نہیں مگر اس کا کیا علاج کہ شیعہ دروغ گوئی کے خوگر ہیں اور اگر کوئی بات سچی بھی ہو تو وہ اس میں جھوٹ کی آمیزش کر لیتے ہیں۔

کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے شرف وعظمت بخشی ہے۔ اور اسے حرم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام سے پہلے یا اسلام کے بعد کسی ایک کو بھی کعبہ کی بے حرمتی کرنے کی توفیق وقدرت نہیں دی۔ بلکہ جب ہاتھی والوں نے برائی کے ساتھ کعبہ کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ سزا دی جو کہ مشہور ومعروف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ❁اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ❁وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ❁تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ❁فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴾ [الفیل]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ ۔ کیا ان کے مکر کو بیکار نہیں کر دیا۔ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ پر جھنڈ بھیج دیئے۔ جو ان کو مٹی اور پتھر کی کنکریاں مار رہے تھے۔ پس انہیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ وَ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج ۲۵]

[سابقہ حاشیہ ......] ''لوگوں نے نعمان کی بات نہ مانی مگر جس طرح انھوں نے کہا تھا اسی طرح ہوا۔'' نعمان بن بشیر کے نصائح کو ٹھکرانے کے بعد اہل مدینہ نے والی مدینہ عثمان بن محمد بن ابوسفیان کو نکال دیا۔ اعلانیہ یزید کی بیعت توڑ ڈالی اور مدینہ میں جس قدر بنو امیہ اور ان کے ہم خیال قریش موجود تھے سب کا محاصرہ کر لیا۔ ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور یہ سب مروان کے گھر میں جمع ہو گئے تھے، بنو امیہ نے یزید کے نام ایک خط لکھا۔ عبد الملک بن مروان یہ خط لے کر نکلا۔ حبیب بن کرہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ حبیب کا بیان ہے کہ عبد الملک نے یہ خط دے کر اسے کہا: میں تجھے چوبیس دن کی مہلت دیتا ہوں، بارہ دن جانے کیلئے اور بارہ دن واپسی کے لیے چوبیس رات میں اسی جگہ بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔''

حبیب کا بیان ہے کہ وہ یزید کے یہاں آیا۔ یزید ایک بیماری کی وجہ سے اپنے پاؤں پانی سے لبریز ایک طشتری میں رکھے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ یزید نقرس کے مرض میں مبتلا تھا۔ میں نے خط پیش کیا یزید نے خط پڑھ کر استشہاد کے طور پر یہ شعر پڑھا:

لَقَدْ بَدَّلُوا الْحِلْمَ الَّذِیْ مِنْ سَجِيَّتِیْ ‏ ‏ ‏ ‏ فَبَدَّلْتُ قَوْمِیْ غِلْظَةً بِلَيَانِ

''علم وتحمل جو میری فطرت میں داخل تھا۔ لوگوں نے اسے بدل دیا اور میں نے اپنی قوم کے لیے اپنی نرمی کو سختی میں تبدیل کر دیا۔''

یزید نے اپنے ایک فوجی سپہ سالار مسلم بن عقبہ المری کو بلایا۔ مسلم بن عقبہ بڑا معمر، کمزور اور بیمار تھا، یزید نے اسے مدینہ جانے کا حکم دیا اور کہا تین شب و روز اہل مدینہ کو صلح کی دعوت دو، اگر وہ قبول کر لیں تو بہتر ورنہ ان سے جنگ کیجیے۔ جب اہل مدینہ پر غلبہ حاصل ہو جائے تو تین شب و روز تک مدینہ کو اپنے لیے مباح سمجھو۔ اس میں جو مال، اسلحہ یا خوراک ہو اس کا مالک لشکر ہوگا، تین شب و روز گزرنے کے بعد اس سے رک جاؤ، علی بن حسین زین العابدین کا ہر طرح خیال رکھو اور انھیں کوئی تکلیف نہ دو۔ انھوں نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ ان کا خط میرے پاس آ چکا ہے۔''

مسلم بن عقبہ بارہ ہزار جنگجو اشخاص کی معیت میں مدینہ پہنچا۔ یہ واقعہ حرہ واقم میں پیش آیا۔ مسلم نے ظلم وتعدی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسی لیے اہل مدینہ اسے مُسرِف بن عقبہ کہا کرتے تھے۔ یہ ہے واقعہ حرہ کا پس منظر! جس کی تفصیل ہم نے دانستہ ایک شیعہ مورخ کی زبانی بیان کی ہے، یہ راوی و مورخ ابومخنف ہے جو عبد الملک بن نوفل سے روایت کرتا ہے اور وہ بنو امیہ کے قاصد حبیب بن کرہ سے نقل کرتا ہے۔ (تاریخ طبری: ۷/۵۔۷)

''جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے اور اس حرمت والی مسجد سے بھی جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے مساوی کر دیا ہے وہیں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے ہوں جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں دین حق سے پھر جانے کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر عدن کے آخری کونے پر کوئی انسان حرم میں الحاد کا ارادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔'' [رواه احمد في مسنده مرفوعاً وموقوفاً]

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ لوگوں میں سب سے بڑے کافر قرامطی باطنی ہیں۔ جنہوں نے حجاج کرام کو قتل کیا۔ اور انہیں قتل کر کے بئر زمزم میں پھینک دیا۔ اور حجر اسود نکال کر لے گئے۔ جو ایک عرصہ تک ان کے پاس رہا۔ پھر واپس کر دیا گیا۔ [1]

اس طرح کے کچھ عبرت انگیز واقعات پیش آئے تھے جس کی وجہ سے انہوں نے حجرہ اسود کو واپس کیا؛ حالانکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بڑے کافر تھے۔ مگر اس کے باوجود ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ پر مسلط نہیں کیا؛ بلکہ کعبہ ہمیشہ ہی قابل عزت اور عظمت والا رہا ہے۔

جب کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے مسلمان بادشاہ اور ان کے نوابین میں سے کسی ایک نے بھی کبھی بھی کعبہ کی اہانت کا ارادہ نہیں کیا۔ اور نہ ہی یزید کے نائب نے ایسا کیا ہے۔ اور نہ ہی عبد الملک کے نائب حجاج بن یوسف نے ایسا کیا اور نہ ہی کسی اور نے۔ بلکہ تمام مسلمان کعبہ کا احترام و تعظیم بجالاتے تھے۔ ان لوگوں کا مقصود حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنا تھا۔ اور منجنیق سے پتھر ان پر برسائے گئے تھے بیت اللہ پر نہیں۔ یزید نے کعبہ منہدم نہیں کیا؛ اور اسے جلانے کا قصد بھی نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی یزید کا یہ کام تھا اور نہ ہی اس کے کسی نواب کا۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کعبہ کو منہدم کر کے اسے از سر نو پہلے سے بہتر تعمیر کیا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا۔ [2] اس سے پہلے بات یہ ہوئی کہ ایک عورت کے ہاتھ سے ایک چنگاڑی اڑ کر کعبہ کے پردوں پر جا گری جس سے کعبہ کا غلاف جل گیا اور کچھ پتھر بھی پھٹ گئے۔

پھر اس کے بعد عبد الملک نے حجاج بن یوسف کو حکم دیا کہ کعبہ کو دوبارہ اسی طرح تعمیر کیا جائے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا۔ سوائے اس کی بلندی کے؛ اس کی بلندی کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت سے لیکر آج تک کعبۃ اللہ ویسے ہی ہے۔

جب حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو یہ لوگ مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس سال حجاج

---

[1] یہ واقعہ تین سو سولہ ہجری میں پیش آیا۔ عین حج کے دنوں میں قرامطی شیعہ نے بیت اللہ پر اس وقت حملہ کر دیا جب لوگ حج کا طواف کر رہے تھے۔ تاریخ میں ہے کہ انہوں نے بیت اللہ میں دس ہزار حجاج کرام کو قتل کیا: اور حجر اسود نکال کر لے گئے۔ جو کہ بائیس سال تک ان کے پاس رہا۔ آخر کار تین سو اڑتیس ہجری میں ایک معاہدہ کے تحت حجرہ اسود واپس کیا' مگر اسے توڑ دیا گیا تھا۔ موجود حجر اسود میں اس کو جوڑنے کے نشانات کا بغور دیکھنے سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ شیعہ کی جانب سے قتل حجاج اور پامالی حرمت کعبہ وحرم کا یہ پہلا واقعہ نہیں؛ بلکہ اس قسم کے بیسیوں واقعات پیش آچکے ہیں۔ اس کی تفصیل کتاب " الحاد الخميني في بلاد الحرمين " کے ترجمہ میں آرہی ہے۔ [دردائی]۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الحج- باب فضل مكة و بنيانها(حديث:١٥٨٦)، صحيح مسلم، كتاب الحج- باب نقض الكعبة و بنيانها(حديث:٤٠٢/ ١٣٣٣)۔

بن یوسف نے لوگوں کے ساتھ [بطور امیر حج] حج کیا۔ اسے عبد الملک نے حکم دیا تھا کہ حج کے معاملات میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مخالفت نہ کرے۔

اگر ان لوگوں کا ارادہ کعبۃ اللہ کے ساتھ برائی کا ہوتا تو جب انہیں قدرت حاصل ہوگئی تھی تو پھر وہ ایسا کر گزرتے۔ جیسے ابن زبیر رضی اللہ عنہما پر قابو پا کر انہیں قتل کر دیا گیا۔

[شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور اہل سنت کا موقف]:

[اشکال]: شیعہ مصنف کی پیش کردہ حدیث کہ'' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل آگ کے ایک صندوق میں ہوگا اور اسے تمام اہل جہنم سے آدھا عذاب ہو رہا ہوگا۔ اور اس کے ہاتھ اور پاؤں آگ کی زنجیروں سے باندھ دیے گئے ہوں گے؛ یہاں تک کہ اسے جہنم کے ایسے انتہائی گہرے گڑھے میں ڈال دیا جائے گا اس کے عذاب اور بدبو سے جہنمی میں بھی اپنے رب سے پناہ مانگ رہے ہوں گے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اس دردناک عذاب میں مبتلا رہے گا......الخ۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ ایسے شخص کا بیان کردہ جھوٹ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ گوئی سے شرماتا نہ ہو۔ پھر اس پر یہ اضافہ کہ قاتل حسین رضی اللہ عنہ کو سب اہل جہنم سے آدھا عذاب دیا جائے گا۔ کیا جہنم کے عذاب کے آدھا ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ پھر آل فرعون؛ آل مائدہ؛ اور باقی سارے منافقین اور کفار کے لیے کیا باقی رہا؟ اور قاتلین انبیاء علیہم السلام سابقین اولین کے قاتلین کے لیے کیا باقی رہا؟ خصوصاً جب کہ حضرت عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم اجمعین کا قاتل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل سے بھی بڑا مجرم ہیں۔ ❶

روافض کا یہ غلو نواصب کے اس قول سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے جن کا عقیدہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ خوارج میں سے تھے اور انھوں نے ملت کے شیرازہ کو منتشر کر دیا۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کی بنا پر وہ مباح الدم تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:'' جو شخص آ کر تم میں تفریق پیدا کرنا چاہے؛ اور تمہارا معاملہ ایک انسان کے ہاتھ میں ہو تو اسے قتل کر دو خواہ وہ کوئی بھی ہو۔'' ❷

اہل سنت والجماعت ان دونوں گروہوں کے غلو کو رد کرتے ہیں۔

جبکہ اہل سنت کہتے ہیں کہ: حضرت حسین رضی اللہ عنہ بحالت مظلومی شہید ہوئے اور آپ کے قاتل ستم ران اور ظالم ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ قتل خوارج سے متعلق احادیث کا مصداق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ آپ نے امت میں انتشار پیدا نہیں کیا تھا۔ آپ کو اس وقت شہید کیا گیا تھا، جب آپ واپس مدینہ جانے کے خواہاں تھے یا محاذ جنگ پر جانا چاہتے تھے؛ یا پھر یزید کے ہاں تشریف لانا چاہتے تھے۔ آپ جماعت میں داخل تھے۔ اور کسی طرح بھی امت میں تفریق نہیں پیدا کرنا

❶ مشہور شیعہ علی بن مظاہر واسطی نے شیخ الشیعہ احمد بن اسحاق بن عبد اللہ بن سعد القمی الاحوص سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن عید اکبر کا دن ہے اور شیعہ اس دن کو یوم المفاخرہ و یوم البرکۃ و یوم الزکواۃ و یوم السلیۃ اور یوم مسرت کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ احمد بن اسحاق مذکور نے اس عید کا اختراع کیا تھا۔ شیعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاتل ابولولؤ مجوسی کو'' بابا شجاع الدین'' کے لقب سے ملقب کرتے ہیں اور آپ کے یوم شہادت کو'' عید بابا شجاع الدین'' سے موسوم کرتے ہیں۔ (تحفہ اثنا عشریہ شاہ عبد العزیز دہلوی، ص: ۲۰۸۔۲۰۹)

❷ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ۔ باب حکم من فرق امر المسلمین و ھو مجتمع (حدیث: ۱۸۵۲)۔

چاہتے تھے۔ ایسا مطالبہ اگر کسی ادنیٰ انسان کا بھی ہو تو اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے؛ تو پھر حسین رضی اللہ عنہ جیسے انسان کی بات کیوں نہ مانی جاتی ؟ اور اگر حکومت کا طلب گار کوئی ادنی انسان بھی ہو تو پھر بھی اسے محبوس کرنا یا قید کرنا جائز نہ تھا؛ چہ جائے کہ آپ کو گرفتار کیا جاتا اور پھر قتل کر دیا گیا۔

[اشکال] :ایسے ہی رافضی مصنف کا قول کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:'' میرا اور اللہ تعالیٰ کا شدید غضب اس شخص پر ہوگا جس نے میرے اہل کا خون بہایا اور میرے اہل بیت میں مجھے ستایا۔''

[جواب] رافضی قلمکار کی ذکر کردہ حدیث صحیح نہیں۔ اور ایک جاہل انسان ہی ایسی روایت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے خون کی ایمان و تقویٰ کی بنا پر حفاظت و عصمت؛ صرف قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بل بوتے سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ اگر بالفرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں سے کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے اسے قتل کرنا یا اس کا ہاتھ کاٹنا جائز ہو تو باتفاق مسلمین ایسا کرنا جائز ہوگا۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> '' اے لوگو! تم سے پہلے کئی قومیں ہلاک ہوئیں، جب کوئی شریف چوری کرتا تو وہ لوگ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تو وہ لوگ اس پر حد جاری کرتے اور قسم ہے اللہ کی! اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں ان کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔'' [1]

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے عزیز ترین فرد (سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے بارے میں بیان فرمایا اگر وہ بھی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے حد واجب ہو جائے تو اس پر حد نافذ کی جائے گی۔ [اسلام میں ادنیٰ و اعلیٰ کے مابین کوئی امتیاز سرے سے موجود ہی نہیں]۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ اگر ایک شادی شدہ ہاشمی زنا کا مرتکب ہوگا تو اسے سنگسار کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ اور اگر کسی کو ظلم اور سرکشی کرتے ہوئے قتل کرے گا تو قصاص میں اسے بھی قتل کیا جائے گا؛ بھلے مقتول کا تعلق حبشہ سے ہو یا روم سے یا ترک سے یا دیلم سے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> '' سب مسلمانوں کا خون مساوی حیثیت رکھتا ہے۔'' [2]

پس ہاشمی اور غیر ہاشمی کا خون اس وقت برابر ہے جب وہ دونوں آزاد ہوں اور دونوں مسلمان ہوں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ حق بجانب ہوتے ہوئے کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے خون کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے اپنے اہل خانہ کو خاص کر سکتے ہیں کہ جو ان کا خون بہائے گا اس پر اللہ تعالیٰ کا بہت سخت غضب ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کا ناحق خون بہانے سے منع کیا ہے۔ جب کسی کو حق کے ساتھ قتل کیا گیا ہو تو پھر اس کے قتل کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کا غضب کیونکر سخت ہو سکتا ہے؟ خواہ قتل ہونے والا ہاشمی ہو یا غیر ہاشمی۔

اگر کسی کو ناحق قتل کیا جائے؛ تو پھر جو کوئی بھی کسی مؤمن کو جان بوجھ قتل کر دے؛ تو بدلے میں اس کا ٹھکانہ جہنم میں ہوگا؛

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع (حدیث: ٦٧٨٧، ٦٧٨٨)، صحیح مسلم، کتاب الحدود۔ باب قطع السارق الشریف وغیرہ، (حدیث:١٦٨٨)۔

[2] سنن ابی داؤد۔ کتاب الجہاد، باب فی السریۃ ترد علی اہل العسکر (حدیث: ٢٧٥١)۔

وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا؛ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور لعنت ہوئی؛ اور اس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ خون کی حفاظت کرنے والا اسے مباح سمجھنے والا اس میں ہاشمی اور غیر ہاشمی برابر ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسا کلام منسوب کرنے والا یا تو منافق ہوسکتا ہے جو آپ کی ذات پر قدح کرنا چاہتا ہو یا پھر کوئی جاہل ہوسکتا ہے جو اس عدل کو نہ جانتا ہو جو عدل دیکر اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا تھا۔

ایسے ہی رافضی کا قول: ''جس نے مجھے میرے اہل بیت میں تکلیف دی۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے اہل بیت یا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم یا آپ کی سنت میں سے کسی کی توہین کر کے نبی کریم ﷺ کو ایذا دینا کبیرہ گناہ ہے۔

فصل:

[رافضی کا اہل سنت پر الزام]

[خوش فہمی اور دھوکا]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''صاحب عقل و خرد کو غور کرنا چاہیے کہ فریقین (شیعہ و اہل سنت) میں سے کون امن کا زیادہ حق دار ہے؟ وہ فریق جو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، انبیاء اور ائمہ کو منزّہ قرار دیتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شریعت کو مسائل ردیہ سے پاک سمجھتا ہے یا وہ فریق جو اس کے برعکس ہے؟ علاوہ ازیں اہل سنت ائمہ اثنا عشرہ پر درود و سلام نہ بھیج کر اپنی نمازوں کو برباد کرتے ہیں' حالانکہ وہ دوسرے ائمہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یا جو ان کے برخلاف ذکر کرتے اور عقیدہ رکھتے ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: شیعہ مصنف جس کو تنزیہ تصور کرتا ہے وہ ہمارے نزدیک اللہ و رسول کی توہین و تنقیص اور تعطیل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ جہمیہ کا قول ہے جو صفات کی نفی کرتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ صفات کمال سے عاری اور جمادات و معدومات کی مانند ہو۔ جب شیعہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ میں حیات و علم و قدرت نیز کلام و مشیت اور حب و بغض و رضا و ناراضگی میں سے کوئی صفت بھی پائی نہیں جاتی وہ نہ بذات خود کوئی فعل انجام نہیں دیتا اور نہ کسی تصرف پر قادر ہے؛ تو گویا وہ اسے جمادات اور ناقصات کے مشابہ قرار دیتے ہیں جو اس کی تنقیص و تعطیل ہے۔ باری تعالیٰ کی تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ اسے ان نقائص سے منزہ قرار دیا جائے جو کمال کے منافی ہیں۔ مثلاً اسے موت، نیند، غفلت عجز و جہل اور حاجت مندی سے پاک سمجھا جائے؛ جیسا کہ قرآن مجید میں اس نے اپنی ذات کو عیوب سے منزہ قرار دیا ہے۔ او۔ یہ بھی فرمایا کہ اس کا کوئی نظیر و مثیل نہیں۔ پس ان دونوں چیزوں کے مابین جمع کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے لیے صفاتِ کمال کو ثابت مانا جائے گا اور جو اوصاف صفات کمال کے منافی ہیں' ان کی نفی کی جائے گی۔ اور اس کے صفات میں سے کسی بھی چیز میں اسے کسی بھی مخلوق کے ساتھ مماثلت اور تشبیہ سے منزہ قرار دیا جائے گا۔ اور نقائص سے مطلق طور پر پاک مانا جائے گا۔ اور صفات کمال میں اسے کسی بھی مثال سے منزہ مانا جائے گا۔

انبیاء علیہم السلام کے متعلق شیعہ کا زاویہ نگاہ:

انبیائے کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو صفات کمال اور بلند درجات عطا کیے ہیں' شیعہ انہیں سلب کرتے ہیں۔ توبہ و

استغفار نیز ایک کمال سے بڑے کمال کی طرف منتقل ہو کر جو درجات عالیہ حاصل کرتے ہیں شیعہ اس کی نفی کرتے ہیں؛ اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو خبریں دی ہیں، انہیں جھٹلاتے ہیں، اور اس ضمن میں قرآن میں وارد شدہ آیات کی تحریف کرتے ہیں۔ شیعہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ کسی شخص کا جہالت سے علم اور ضلالت سے ہدایت؛ سرکشی اور بغاوت سے کامیابی اور رشد و ہدایت کی طرف منتقل ہونا نقص و عیب ہے۔ اور یہ بات نہیں جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے اور اس کی قدرت کی عظیم تر نشانیوں میں سے ہے کہ بندوں کو نقص سے کمال کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جو شخص خیر و شر دونوں کا ذوق آشنا ہوتا ہے اسے اس شخص کی نسبت خیر سے زیادہ محبت اور شر سے زیادہ نفرت ہوتی ہے جو صرف خیر ہی جانتا ہو اور شر سے نا آشنا ہو۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جب اسلام میں جاہلیت سے نا آشنا لوگ پیدا ہوں گے تو اسلام کا شیرازہ ایک ایک کڑی کر کے بکھر جائے گا۔''[1] باقی رہی یہ بات کہ شیعہ اپنے ائمہ کو عیوب و نقائص سے منزہ قرار دیتے ہیں تو یہ بڑی شرمناک بات ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے بھی انہیں حیاء آنا چاہیے تھی۔ خصوصاً اس امام کا پاک و صاف ہونا جو دین و دنیا میں کسی کام کا نہیں بلکہ وہ ایک معدوم چیز ہے جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں (شیعہ کا امام غائب جس کے وہ منتظر ہیں)۔

جہاں تک شریعت کو گھٹیا درجہ کے مسائل سے منزہ قرار دینے کا تعلق ہے، ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اہل سنت نے یک زبان ہو کر اس قسم کا ایک مسئلہ بھی بیان نہیں کیا۔ جبکہ روافض کے ہاں ایسے مسائل کی اتنی بھرمار ہے کہ اس قدر گھٹیا مسائل کسی بھی دوسرے فرقہ میں نہیں پائے جاتے۔ (روافض کے ان شرمناک مسائل کیلئے دیکھئے تحفہ اثنا عشریہ باب السابع ص: ۲۰۸ تا ۲۳۷ ط: سلفیہ)۔

❀ شیعہ مصنف کا قول کہ: ''اہل سنت ائمہ اثنا عشر پر درود و سلام نہ بھیج کر اپنی نمازوں کو برباد کرتے ہیں حالانکہ وہ دوسرے ائمہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔''

❀ جواب: اس سے شیعہ مصنف کی مراد یا تو یہ ہے کہ بارہ ائمہ پر درود بھیجنا واجب ہے۔ یا پھر نبی کریم ﷺ کے علاوہ ان میں سے کسی ایک پر یا کسی دوسرے امام پر درود بھیجنا واجب ہے۔ یا پھر اس سے مراد یہ ہوگی کہ آل نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے۔ اگر اس کی مراد پہلی بات ہے۔ تو یہ ان کی سب سے بڑی گمراہی اور شریعت محمدی سے خروج اور تجاوز ہے۔ اس لیے کہ ہم اور شیعہ سبھی جانتے ہیں اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے نماز میں یا خارج از نماز بارہ ائمہ میں سے کسی امام پر درود و سلام بھیجنے کا حکم نہیں دیا اور نہ ہی آپ کے مبارک دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کوئی ایسے کرتا تھا۔ [نہ تابعین نے کبھی اس پر عمل کیا] اور نہ ہی کسی ایک نے نبی کریم ﷺ سے کسی صحیح یا ضعیف سند سے کوئی ایسی روایت نقل کی ہے۔ اور نہ ہی نبی کریم ﷺ کے دور میں کوئی ایک ان بارہ ائمہ میں سے کسی ایک کو اپنا امام مانتا تھا۔ چہ جائے کہ نماز میں ان پر درود بھیجنا واجب ہوتا۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ [اور صحابہ کرام] کے عہد میں ادا کی جانے والی نمازیں بالکل درست تھیں، اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ تو پھر اس کے بعد کس نے نماز میں ان لوگوں پر درود بھیجنا واجب کر دیا۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کی نمازوں کو باطل

[1] حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اولین شخص تھے جو اس عظیم حقیقت سے آگاہ ہوئے، آپ نے فرمایا: ''جو شخص شر سے نا آشنا ہے اس بات کا قوی احتمال ہے کہ وہ اس کا شکار ہو جائے۔'' جو لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا رہنے کی وجہ سے زہد کی زندگی اختیار کرتے ہیں اس کا حضرت عمر بن عبد العزیز کے زہد سے کیا مقابلہ؟ غور فرمائیے کہ کرۂ ارض کی عظیم ترین حکومت کا مال آپ کے زیر تصرف تھا اور اللہ کے سوا آپ سے کوئی حساب لینے والا بھی نہ تھا اس کے باوصف آپ فقر و زہد کی زندگی بسر کرتے تھے۔

قرار دے دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص نماز میں بارہ ائمہ پر درود و سلام بھیجنے کو ضروری سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں بجز اس کے نماز باطل ہوتی ہے تو وہ تحریف فی الدین کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور وہ دین محمدی کو ایسے بدل رہا ہے جیسے یہود و نصاری نے انبیاء کرام علیہم السلام کا دین بدل دیا تھا۔

❀ اگر کہا جائے کہ: ''آل محمد میں ائمہ اثنا عشر بھی داخل ہیں۔''

❀ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آل محمد میں بنو ہاشم [1] اور امہات المومنین بھی شامل ہیں۔ [2] اور ایک قول کے مطابق بنو مطلب بھی اس میں داخل ہیں۔ جب کہ امامیہ ان میں سے اکثر کی مذمت کرتے اور بنو عباس کی مذمت کرتے ہیں؛ خصوصاً ان میں سے جو خلفاء ہو گزرے ہیں۔ حالانکہ ان کا شمار بھی آل محمد میں ہوتا ہے۔ نیز شیعہ امامیہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مذمت کرتے ہیں۔ جب کہ جمہور بنی ہاشم ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت کرتے اور ان سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور کوئی بھی صحیح النسب ہاشمی اس کا انکار نہیں کرتا؛ سوائے چند ایک محدود بنی ہاشم کے [جن پر جہالت کا غلبہ یا جو شیعہ سے متاثر ہو گئے ہیں]۔ ورنہ اکثر بنی ہاشم جو اہل علم اور دین دار طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے محبت رکھتے ہیں۔

یہ بات ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے کہ شیعہ تعظیم آل محمد کے مدعی ہیں حالانکہ انھوں نے خود بھر پور کوششیں کر کے تاتاریوں کو اسلامی دار الخلافہ بغداد پر حملہ کرنے کے لیے بلایا؛ حتی کہ ان کافروں نے اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کو قتل کیا جن کی صحیح گنتی تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ان میں ہاشمی اور غیر ہاشمی سبھی شامل تھے۔ انہوں نے بغداد اور اس کے گرد و نواح میں اٹھارہ لاکھ ستر ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کیا۔ اولاد علی و عباس میں سے ہزاروں کو قتل کیا۔ ہاشمیوں کے بیوی بچوں کو قیدی بنایا۔ [3]

حقیقت میں بلا شک و شبہ یہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض کی نشانی ہے۔ اس لیے کہ کافروں نے یہ کام رافضیوں کی مدد سے کیا تھا۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے ہاشمی عورتوں کو قیدی بنانے کے لیے اپنی کوششیں صرف کیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے ایسے شرمناک کارنامے ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ الغرض شیعہ جو بھی عیب دوسرے لوگوں پر لگائیں گے وہ خود ان کے اندر بڑھ چڑھ کر بدرجہ اتم موجود ہوگا۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ آپ نے فرمایا یوں کہو:

''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كما صليت على إبراهيم وعلى آلِ إبراهيم إنك حميد مجيد۔ اللهم بارِكْ على محمد وعلى آلِ محمد كما باركت على إبراهيم وعلى آلِ إبراهيم إنك حميد مجيد۔'' وفي رواية: وَعلى أَزْوَاجِهٖ و ذُرِّيَّتِهٖ۔'' [4]

---

[1] بلکہ بنو عباس و بنو لہب نیز حاکم بامر اللہ و آمر بن مستعلی اور نزار بن مستعلی بھی اس میں داخل ہیں۔

[2] اس لیے کہ امہات المومنین کو اس آیت میں مخاطب کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (الأحزاب)

[3] علاوہ ازیں لاتعداد نادر کتب کے مسودات جن میں سے بعض کے نام بھی ہم کو معلوم نہیں دریائے دجلہ میں بہا دیے۔

[4] (البخاری، کتاب احادیث الانبیاء باب (۱۰)، (ح:۳۳۶۹)، صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشہد (ح:۴۰۷)۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلاۃ۔ باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد التشہد (ح:۹۸۲)؛ یہاں پر ان الفاظ میں درود نقل کیا گیا ہے: ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ النَّبِيِّ وَ اَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ ذُرِّيَّتِهٖ وَ اَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔'' (و سنده ضعيف)۔ علماء زیدیہ میں سے قاضی شوکانی نیل الاوطار میں اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث سے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ ''آل'' سے ازواج و اولاد مراد ہے۔''

اور صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''صدقہ محمد اور آل محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے۔'' [مسلم ۲/ ۷۵۲؛ سنن ابی داؤد ۳/ ۲۰۳]

یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبدالمطلب بن ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ہمیں زکواۃ و صدقات وصول کرنے پر بھیجا جائے؛ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک صدقہ محمد اور آل محمد ﷺ کے لیے حلال نہیں ہے؛ یہ لوگوں کا میل کچیل ہے۔'' [مسلم ۲/ ۷۵٤]

اس سے ثابت ہوا کہ آل عباس اور بنو حارث بن عبدالمطلب آل محمد اور ذوی القربی میں شامل ہیں اور ان پر زکوٰۃ حرام ہے۔اور حدیث مبارک میں یہ بھی ثابت ہے کہ: نبی کریم ﷺ نے ذوالقربی کے حصہ میں سے بنو مطلب بن عبد مناف کو بھی ایک حصہ دیا تھا؛ اور فرمایا تھا:

''بیشک بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ نہ ہی ہم سے جاہلیت میں جدا ہوئے اور نہ ہی اسلام میں۔''[1]

یہ لوگ بنو عباس اور بنو حارث بن عبدالمطلب کی نسب دور کے رشتہ دار ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان تمام کا شمار ذو القربی [قریبی رشتہ دار] میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بات پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ آل عباس اور بنو حارث بن عبد المطلب آل محمد اور ذوی القربی میں شامل ہیں اور ان پر زکوٰۃ حرام ہے۔اور درود میں بھی یہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔اور یہ لوگ خمس کے مستحق ہیں۔ جب کہ بنو مطلب بن عبد مناف کے بارے میں اختلاف ہے۔کیا ان پر بھی صدقہ حرام ہے؟ اور کیا یہ بھی آل محمد ﷺ میں داخل ہیں؟ اس بارے میں دو قول ہیں۔امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایتیں منقول ہیں:

❀ پہلی روایت: ان پر صدقہ حرام ہے۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔

❀ دوسری روایت: ان پر صدقہ حرام نہیں ہے۔جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وہی لوگ آل محمد ﷺ ہیں جن کے بارے میں صریح حکم آیا ہے۔یہی مسلک شریف ابوجعفر بن ابوموسیٰ اور اس کے ساتھیوں کا ہے۔جن پر صدقہ حرام ہے وہ بنو ہاشم ہیں۔بنو مطلب کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔

ایسے ہی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں اختلاف ہے۔کیا ان کا شمار بھی آل محمد ﷺ میں ہوتا ہے جن پر صدقہ حرام ہے؟ امام احمد رحمہ اللہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں:

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے عتقاء [آزاد کردہ غلام اور لونڈیاں] جیسے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا [ان] پر صدقہ باجماع مسلمین جائز ہے۔اگرچہ بنی ہاشم کے موالین پر بھی صدقہ حرام ہے۔بعض مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک آل محمد سے آپ کی امت مراد ہے۔صوفیہ کا ایک گروہ اس سے اتقیاء امت مراد لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی بھی متعین شخص پر نماز میں درود بھیجنے کا حکم نہیں دیا۔اگر انسان نماز میں بعض اہل بیت پر درود بھیجے اور بعض پر نہ بھیجے؛ جیسا کہ آل عباس پر درود بھیجے اور آل علی پر نہ بھیجے؛ یا اس کے برعکس کرے؛ تو ایسا انسان شریعت کی مخالفت کرنے والا ہوگا۔تو پھر باقی تمام آل محمد کو چھوڑ کر چند متعین افراد پر کیسے درود بھیجا جاسکتا ہے؟

جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کی آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب نہیں ہے۔ جو لوگ درود بھیجنے

[1] [سنن أبي داؤد ۳/ ۲۰۰؛ النسائي ۷/ ۱۱۸ والمسند ٤/ ۸۱]

کو واجب کہتے ہیں وہ صرف آپ پر درود کو کافی سمجھتے ہیں' آل پر درود بھیجنا واجب نہیں۔ اور اگر آپ کی آل پر صلوٰۃ بھیجنا نماز میں واجب بھی ہوتا تو بعض آل پر یا باقی لوگوں کو چھوڑ کر چند متعین افراد پر اکتفا درست نہیں۔ بلکہ علماء کرام کا اختلاف یہ ہے کہ کیا کسی معین شخص کے حق میں درود بھیجنے یا دعا کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے [یا نہیں ہوتی]؟ اس میں دو قول ہیں:

اگر چہ اس کا یہی جواب صحیح ہے کہ اس سے نماز باطل نہیں ہوتی؛ لیکن اسے ائمہ کے ساتھ خاص طور پر واجب بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت نماز میں نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے پر درود بھیجنے کو واجب نہیں کہتے۔ نہ ہی اپنے ائمہ پر نہ ہی دوسروں کے ائمہ پر۔ اس لیے کہ اپنی طرف سے کسی ایسی چیز کو واجب کرنا گمراہ کرنے والی بدعت اور شریعت الٰہی کی مخالفت ہے۔ جیسا کہ شہادتین میں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا ذکر ہے۔ ایسے ہی آذان' نماز اور دوسرے مواقع پر بھی ہے۔ اگر کوئی انسان شہادتین کے اقرار میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ کسی امام کا ذکر کرے تو یہ سب سے بڑی گمراہی ہوگی۔

رافضی مصنف کا یہ قول کہ کسی معین خلیفہ پر صلوٰۃ بھیجنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے؛ باطل ہے۔ جمہور علماء کی رائے میں کسی معین شخص کے حق میں نماز میں دعا یا بددعاء کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ کیونکہ نبی ﷺ نماز میں یوں دعا کیا کرتے تھے:

((اللھم أنجِ الولِيد بن الولِيدِ وسلمة بن هِشام [وعياش بن أبِي ربِيع] والمستضعفِين مِن المؤمِنِين اللهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها عليهِم سِنِين كسِنِي يوسف))

''اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیع اور کمزور مسلمانوں کو (کفار مکہ کے پنجہ ظلم) سے نجات دے، اے اللہ اپنی پامالی (قبیلہ) مضر پر سخت کر دے، اور اس کو ان پر قحط سالیاں بنا دے، جیسے یوسف (کے زمانے) کی قحط سالیاں تھیں۔'' [صحیح بخاری:ح ٧٧٠]

اور آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: اے اللہ رعل وذکوان اور عصیہ پر لعنت کر۔'' [مسلم ٤/ ١٩٥٣]

دعائے قنوت میں ایک قوم کے حق میں دعائے خیر کرتے اور دوسری قوم کے افراد اور قبائل کا نام لے کر ان پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔ [1] جو کوئی اسے فاسد کہتا ہو' اس کا قول بھی اسی طرح فاسد ہے جس طرح نماز میں چند متعین اشخاص پر درود کو واجب کہنے والے کا قول فاسد ہے۔

اہل سنت والجماعت نہ ہی اس کو حرام کہتے ہیں اور نہ ہی واجب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ وہ اسی چیز کو واجب سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے واجب قرار دیا ہو' اور اسے حرام کہتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کہا ہو۔

اگر [رافضی مصنف کی] مراد یہ ہے کہ نماز میں آل محمد ﷺ پر درود بھیجنا واجب ہے کسی دوسرے پر نہیں۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ: اس مسئلہ میں علماء کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔

اکثر لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ؛ مالک اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ امام طحاوی نے دعویٰ کیا ہے کہ قدیم میں اس پر اجماع ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب (١٢٦)، (حدیث:٧٩٧، ٨٠٤، ٤٥٦٠)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات (حدیث: ٦٧٥، ٦٧٦)۔

دوسرا قول یہ ہے کہ: نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی اور دوسری روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ پھر اس روایت کی بنا پر مزید اختلاف ہے؛ کیا یہ درود رکن ہے یا واجب ہے جو کہ بھول جانے کی صورت میں سجدہ کرنے سے ساقط ہو جاتا ہے؟ امام احمد سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔

پھر جن لوگوں نے نماز میں نبی کریم ﷺ یا آپ کی آل پر درود پڑھنا واجب قرار دیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: یہ درود ان ہی الفاظ میں واجب ہے جو احادیث میں منقول ہیں۔ امام احمد کا ایک قول یہی ہے۔ اس صورت میں آل محمد پر درود واجب ہو جاتا ہے۔ اور بعض علماء کرام رحمہم اللہ الفاظ کی قید کو واجب قرار نہیں دیتے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی معروف ہے۔ اس صورت میں آل پر درود پڑھنا واجب نہ ہوگا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف بڑا مشہور ہے تو پھر کہا جائے گا کہ اگر نماز میں آل محمد ﷺ پر درود پڑھنا واجب بھی مان لیا جائے تو یہ درود تمام آل محمد کو شامل ہوگا؛ صرف ان کے صالحین یا ائمہ معصومین کے لیے خاص نہیں ہوگا [جیسا کہ رافضیوں کا خیال ہے]۔ بلکہ یہ تمام لوگوں کو شامل ہوگا۔ جیسا کہ اگر مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے اور اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کی جائے تو اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو ایمان یا اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ عام اہل ایمان کے لیے یا عام اہل بیت کے لیے دعا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں سے ہر ایک نیک اور متقی ہو۔ بلکہ دعا میں اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے فضل و احسان مانگا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہر ایک کے لیے طلب کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں آل محمد ﷺ کا حق زیادہ ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آل محمد ﷺ کے اس امت پر کچھ حقوق ہیں جن میں دوسرے لوگ ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ آل محمد ﷺ زیادہ محبت و موالات کے مستحق ہیں۔ جس محبت کے سارے قریشی قبائل مستحق نہیں۔ ایسے ہی قریش اس محبت کے مستحق ہیں جس کے باقی عرب قبائل مستحق نہیں' اور عرب اس محبت کے مستحق ہیں جس کی مستحق باقی اولاد آدم نہیں۔ یہ ان لوگوں کا مذہب جو عربوں کو باقی لوگوں پر فضیلت دیتے ہیں؛ اور قریش کو سارے عربوں پر اور بنی ہاشم کو سارے قریش پر فضیلت دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام احمد اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔

نصوص اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى كَنَانَةَ مِنْ وَلَدِ اسْمٰعِيلَ ، وَاصْطَفَى قُرَيْشاً مِّنْ كَنَانَةَ ، وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِيْ هَاشِمٍ))[1]

"بیشک اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو، اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو چن لیا تھا، اور قریش سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا ہے۔"

اور دوسری حدیث میں آتا ہے: "لوگ ایسے ہی کان کی طرح ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو جاہلیت میں اچھے لوگ تھے وہ اسلام میں بھی اچھے ہیں' اگر وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔"[2]

---

[1] مسلم کتاب الفضائل ، باب : فضل نسب النبي ﷺ ح: ٤٣١٨۔ صحیح ابن حبان ، کتاب التاریخ 'ذکر اصطفاء الله جل و علا صفيه ﷺ' ح: ٦٤٢٤۔ [2] البخاري ٤/ ١٥٢، مسلم ٤/ ١٩٥٨'

فصل سوم :

امامت علی رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

چھٹی بات: ''امامیہ نے جب دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ لاتعداد اوصاف و کمالات سے بہرہ ور ہیں جن کے روایت کرنے والے موافق و مخالف سبھی قسم کے لوگ ہیں۔ علاوہ ازیں جمہور علماء دیگر خلفاء پر مطاعن و اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی طرح کا بھی کوئی طعن ہرگز منقول نہیں۔ نظر بریں امامیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا امام مقرر کر دیا؛ اس لیے کہ موافق اور مخالف سبھی لوگ آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اور باقی لوگوں کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ ان لوگوں کے بارے میں ایسی روایات منقول ہیں جن سے ان کی امامت میں طعن واقعہ ہوتا ہے۔ اب ہم چند وہ دلائل ذکر کریں گے جو ان [اہل سنت] کے ہاں صحیح ہیں' اور انہوں نے ان دلائل کو اپنی معتمد کتابوں کے معتمد اقوال میں نقل کیا ہے۔ بروز قیامت اتمام حجت کے نقطہ خیال سے ہم چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

ان دلائل و براہین میں سے ایک وہ روایت بھی ہے جسے ابوالحسن اندلسی نے اپنی کتاب ''الجمع بین الصحاح الستۃ'' موطأ امام مالک' بخاری' مسلم' سنن ابی داؤد' صحیح ترمذی' اور سنن نسائی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ﴾ [بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے پلیدی کو دور کردے]۔ (احزاب)۔ ان کے گھر میں نازل ہوئی جب کہ میں دروازہ کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اہل بیت میں شامل نہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک تم خیر پر قائم ہو' بیشک تم ازواج النبی میں شمار ہوتی ہو۔'' سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''[اس وقت] گھر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین بھی تھے۔ آپ نے ان سب کو ایک چادر سے ڈھانپ لیا اور فرمایا:

''اے اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں، ان سے نجاست کو دور کر کے ان کو پاک کر دے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب میں وارد شدہ احادیث، فضائل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی احادیث سے بہت زیادہ ہیں۔ شیعہ مصنف نے اس ضمن میں بعض احادیث نقل کر کے کہا ہے کہ: جمہور ان پر اعتماد کرتے ہیں؛ اور انہوں نے یہ روایات معتمد اقوال اور معتمد کتابوں سے نقل کی ہیں؛ یہ صریح کذب ہے۔ اس لیے کہ اس نے جو احادیث نقل کی ہیں' ان میں سے اکثر من گھڑت ہیں یا پھر ان کے ضعیف ہونے پر اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔ ان میں سے جو احادیث صحیح ہیں ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت نہیں ہوتی اور یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے افضل تھے۔ اور نہ ہی ان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی دیگر خصوصیت ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ان فضائل و مناقب میں دیگر خلفاء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ برابر کے سہیم و شریک ہیں۔ البتہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل ان کے ساتھ مختص

ہیں اور دوسرا کوئی شخص اس ضمن میں ان کے ساتھ شریک نہیں، خصوصاً ابوبکر فضائل میں منفرد ہیں۔

جہاں تک خلفاء ثلاثہ کو ہدف طعن بنانے کا تعلق ہے تو شیعہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو اعتراضات وہ اصحاب ثلاثہ پر کرتے ہیں؛ ناصبی ان ہی اعتراضات کا نشانہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بناتے ہیں؛ بلکہ آپ پر اس سے بڑے بڑے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ اس چیز کو بیان کریں گے کہ جو کچھ اس بارے میں شیعہ مصنف نے بیان کیا ہے وہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

[شبہ]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''موافق و مخالف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عیب و خطاء سے منزہ سمجھتے ہیں۔ اور باقی لوگوں کو انہوں نے چھوڑ دیا کیونکہ ان لوگوں کے بارے میں ایسی روایات منقول ہیں جن سے ان کی امامت میں طعن واقع ہوتا ہے۔''

[جواب]: یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ مخالفین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پاک و صاف قرار نہیں دیتے، بلکہ متعدد فرقے آپ کو جرح و قدح کا نشانہ بناتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مورد طعن بنانے والے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے مخالفین سے افضل ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کی نسبت بھی اولیٰ و افضل ہیں جو حضرت کی شان میں غلو کرتے ہیں۔ مثلاً خوارج جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کفر پر یک زبان ہیں سب مسلمانوں کے نزدیک ان غالی شیعہ سے بہتر ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو الٰہ یا نبی تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ بالفاظ صحیح تر خوارج اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ آزما ہونے والے صحابہ ان اثنا عشری شیعہ سے افضل ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام معصوم قرار دیتے ہیں۔ [1]

روافض کے سوا مسلمانوں کا کوئی فرقہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ہدف طعن نہیں بناتا۔ [2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرنے والے خوارج حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دوستی رکھتے اور اظہار خوشنودی کرتے ہیں۔ فرقہ مروانیہ والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ظالم قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ آپ خلیفہ نہ تھے۔ دوسری جانب وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دوستی رکھتے ہیں حالانکہ وہ ان کے اقارب میں سے نہیں۔ پھر یہ بات کہاں تک قرین صدق و ثواب ہے کہ موافق و مخالف سب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ قرار دیتے ہیں اور اصحاب ثلاثہ کو نہیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو منزہ قرار دینے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مداحین کی نسبت اکثر و افضل اور اعظم ہیں۔ بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فسق اور عصیان سے متہم کرنے والے فرقے مسلمانوں میں بڑے معروف ہیں۔ وہ روافض کی نسبت زیادہ عالم اور دین دار بھی ہیں جب کہ

---

[1] خوارج کی شیعہ سے افضل ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غیر انبیاء کو معصوم قرار دینے کی ضلالت سے پاک ہیں۔ دوسری وجہ فضیلت یہ ہے کہ سیدنا علی کی رفاقت میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں خوارج کا جو عقیدہ تھا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے برگشتہ خاطر ہونے کے بعد بھی اس میں تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ پہلے بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں اور بعد ازاں بھی اسی نظریہ پر قائم رہے۔ خوارج کے گمراہ ہونے کے دو اسباب تھے۔ (۱) اس کی ایک وجہ خوارج کی وہ میراث تھی جو انھوں نے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے حاصل کی۔ (۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ انھوں نے تحکیم کی بنا پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی۔ بہر کیف جو شخص خوارج و روافض کی ضلالت میں بحیثیت مجموعی موازنہ کرنا چاہتا ہے، وہ مقابلتاً خوارج کو کم گمراہ پائے گا۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ سیدنا علی کو من جانب اللہ جو عظیم تر اجر و ثواب دیا جائے گا وہ اس بات پر ملے گا کہ مدینہ سے عازم عراق ہونے سے لے کر شہادت پانے تک آپ نے خوارج و شیعہ جیسے مسرف غالی فرقہ کے ہاتھوں عظیم مصائب جھیلے اور ان پر صبر و تحمل سے کام لیا۔

[2] وہ فرقے جو شیعہ کے شاگرد ہیں اور ان سے متفرع ہوئے ہیں مثلاً اسمٰعیلیہ، نصیریہ، شیخیہ، بابیہ اور بہائیہ یہ سب اس ضمن میں شیعہ کے ہم نوا ہیں۔

روافض ان کے مقابلہ میں کیا بلحاظ علم اور کیا باعتبار قوت وشوکت ضعیف و ناتواں ہیں۔ روافض اپنے حریفوں کے خلاف حجت قائم کر کے ان کا منہ بند کر سکتے ہیں نہ قوت بازو کو کام میں لا کر انھیں شکست دے سکتے ہیں۔ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح وارد کرتے ہیں اور ان کو کافر و ظالم تک قرار دینے سے احتراز نہیں کرتے، ان میں کوئی گروہ ایسا نہیں جو اسلام سے منحرف و برگشتہ ہو گیا ہو۔

اس کے عین برخلاف جو لوگ اصحاب ثلاثہ کو مورد طعن بناتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ مثلاً فرقہ نصیریہ والے الوہیت علی کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اسماعیلیہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اور غالی شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی قرار دیتے ہیں۔ [1] بیشک یہ سب کافر اور مرتد ہیں۔ اللہ و رسول کے ساتھ ان کا کفر کسی عالم دین سے مخفی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی انسان کی الوہیت کا قائل ہو یا نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کو نبی سمجھتا ہو اس کا کافر ہونا ہر اس شخص پر واضح ہے جو دینی علم سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہو۔ [2]

خوارج جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے اور آپ پر لعنت بھیجتے ہیں ان کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

[1] مشہور شیعہ عالم المامقانی کا قول ہے کہ جن عقائد و افکار کی بنا پر قدیم شیعہ کو غالی کہا جاتا تھا وہ اب ضروریات دین میں شمار ہوتے ہیں۔ دور حاضر میں تقیہ کیے بغیر جو شیعہ واشگاف الفاظ میں اپنے عقیدے کا اظہار کرے گا۔ تو اس میں اور متقدمین غالی شیعہ میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اسے ضروریات مذہب سے منحرف تصور کیا جائے گا۔

[2] کسی شخص کو نبی قرار دینے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اسے نبی کہہ کر پکارا جائے بلکہ اسے صفات انبیاء سے متصف کرنا بھی اسے نبی قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ علامہ کلینی نے جو شیعہ کا امام بخاری سمجھا جاتا ہے۔ شیعہ کی عظیم ترین کتاب ''الکافی'' میں جس طرح عنوانات قائم کیے ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ ائمہ امور الٰہی کے مالک اور اس کے علم کا خزانہ ہیں۔ ۲۔ باب: ائمہ زمین کا ستون ہیں۔
۳۔ اس باب میں یہ بیان کیا جائے گا کہ ائمہ کے یہاں سب کتابیں ہوتی ہیں اور اختلاف السنہ (زبانوں کے اختلاف) کے باوجود وہ ان کے مضامین سے آگاہ ہوتے ہیں۔
۴۔ اس بات کا باب کہ قرآن کو ائمہ نے جمع کیا ہے۔ ۵۔ اس باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ائمہ سب علوم سے واقف ہوتے ہیں۔
۶۔ اس بات کا باب کہ اماموں کو اپنی موت کا وقت معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے فوت ہوتے ہیں۔
۷۔ اس باب میں بیان کیا جائے گا کہ امام ''ما کان و ما یکون'' کا علم رکھتے ہیں اور کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں ہوتی۔
۸۔ اس بات کا باب کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ علم میں نبی کریم ﷺ کے شریک تھے۔
۹۔ اس بات کا باب کہ اگر ائمہ سے کوئی بات پوشیدہ رکھی جائے تو وہ اسے ظاہر کر دیتے ہیں۔
۱۰۔ ہر امام جانتا ہے کہ اس کے بعد کون شخص منصب امامت پر فائز ہوگا۔
۱۱۔ اس بات کا باب کہ ائمہ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ حق ہوتی ہے نیز جو بات ان کے ہاں سے نہیں آئی وہ باطل ہے۔
۱۲۔ اس بات کا باب کہ یہ کائنات ائمہ کی ملک ہے۔

یہ اس کتاب کے عنوانات ہیں جو شیعہ کی نہایت ہی قابل اعتماد کتاب ہے۔ یہ عقائد و افکار شیعہ میں اس وقت رائج تھے جب غلو کو ضروریات دین میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں تک ضروریات دین میں شمار کیے جانے والے غلو کا تعلق ہے تو اسے ان تراجم میں تلاش کرنا چاہیے جو اعداء دین روافض نے اپنے قلم سے تحریر کیے۔ مثلاً تحفہ اثنا عشریہ میں ص: ۱۰۰ پر دیکھیے شیعہ کا یہ عقیدہ کہ سیدنا علی اولوالعزم نبیوں کو چھوڑ کر سب انبیاء و رسل سے افضل تھے۔ آگے چل کر صفحہ: ۱۰۲، پر لکھا ہے کہ ائمہ انبیاء سے بڑے عالم ہوتے ہیں اس لیے ان کا مرتبہ بھی بلند تر ہوتا ہے۔ اسی کتاب کے صفحہ: ۱۰۳، پر شیعہ کا یہ عقیدہ تحریر کیا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اولین و آخرین سب سے افضل تھے۔ کتاب مذکور کے صفحہ: ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ شیعہ کے نزدیک سیدنا علی کی جانب وحی کی جاتی تھی اور آپ اس کی آواز سنتے تھے۔ (تحفہ اثنا عشریہ)۔

پر لعنت بھیجتے تھے اور آپ کے خلاف صف آراء بھی ہوئے؛ ان میں سے اصحاب معاویہ اور بنی مروان بھی تھے۔ یہ سب لوگ مقربہ الاسلام تھے اور دینی شرائع و احکام پر عمل پیرا تھے۔ یہ نماز کی پابندی کرتے، زکوٰۃ ادا کرتے، روزے رکھتے، زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوتے۔ اللہ اور اس کے رسول کے حلال کردہ کو حلال سمجھتے اور محرمات کو حرام سمجھتے تھے۔ ان میں ظاہری کفر کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا تھا۔ بخلاف ازیں ان میں اسلامی شعائر و شرائع برملا پائے جاتے تھے اور وہ ان کی تعظیم بجالاتے تھے ان باتوں سے ہر وہ شخص آگاہ ہے جو اسلامی حالات سے باخبر ہے۔ ان حالات کے باوصف یہ دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ سب مخالفین حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منزہ سمجھتے ہیں اور اصحاب ثلاثہ کو نہیں۔

بخلاف ازیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اعوان و انصار جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ناپسند کرتے تھے؛ شیعان علی رضی اللہ عنہ سے بوجوہ افضل ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منزہ سمجھنے والے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں قدح کرنے والے؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر قدح کرنے والوں سے بڑھ کر دین دار اور افضل ہیں۔ اگر اہل سنت کو معاونین و محبین علی رضی اللہ عنہ کی فہرست سے الگ کرلیا جائے تو ان کو چاہنے والوں میں ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو آپ کے مخالف فرقوں یعنی خوارج، امویہ اور مروانیہ کا مقابلہ کرسکے۔ اس لیے کہ اعداء علی رضی اللہ عنہ کے متعدد فرقے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اعداء علی رضی اللہ عنہ میں سب سے بڑے خوارج ہیں؛ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کافر و مرتد تھے؛ اور تقرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے ان کو قتل کرنا حلال ہے۔ ایک خارجی شاعر عمران بن حطان کہتا ہے:

۱ ......يَا ضَرْبَةً مِّنْ تَقِيٍّ مَّا اَرَادَ بِهَا ‏ اِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ رِضْوَانًا

۲ ......اِنِّيْ لَاذْكُرُهٗ يَوْمًا فَاَحْسِبُهٗ ‏ اَوْفَى الْبَرِيَّةِ عِنْدَاللّٰهِ مِيْزَانًا

(۱)۔ اے متقی (قاتل علی) کی وہ ضرب جو قابل تحسین تھی جس سے اس کا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول تھا۔

(۲)۔ میں کبھی کبھی اسے یاد کرتا ہوں تو یوں خیال کرتا ہوں کہ سب مخلوقات سے اللہ کے نزدیک اس کا اعمال نامہ زیادہ بھرپور تھا۔

ایک سنی شاعر نے اس کے مقابلہ میں یہ اشعار کہے:

۱ ......يَا ضَرْبَةً مِّنْ شَقِيٍّ مَا اَرَادَ بِهَا ‏ اِلَّا لِيَبْلُغَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ خُسْرَانًا

۲ ......اِنِّيْ لَاذْكُرُهٗ يَوْمًا فَاَلْعَنُهٗ ‏ لَعْنًا وَّاَلْعَنُ عِمْرَانَ ابْنَ حِطَّانًا

(۱) ہائے اس بدبخت کی وہ ضرب جس سے اس کا مقصد اللہ سے خسارہ پانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ (۲) میں بعض اوقات یاد کرکے اس پر لعنت بھیجتا ہوں اور عمران بن حطان پر بھی لعنت بھیجتا ہوں۔ (جس نے مذکورہ بالا اشعار کہے)۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کرنے والے شیعہ کے کفر پر تمام صحابہ کرام اور مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے انہیں کافر قرار دیکر آگ میں جلایا تھا؛ ان غالی شیعہ میں سے جس پر قدرت حاصل ہوا سے قتل کردیا جائے۔

جہاں تک خوارج کا تعلق ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے خلاف اس وقت جنگ آزما ہوئے جب انھوں نے لوگوں کو قتل کرنے اور ان کا مال لوٹنے کا بیڑا اٹھایا۔

خلاصہ کلام یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں غلو کرنے والوں کو صحابہ بلکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مرتد قرار دیا۔ اور ان سے مرتدین کا سا سلوک کیا۔ مگر خوارج سے کسی نے بھی مرتدین جیسا سلوک روا نہ رکھا۔ یہ حقائق اس بات کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ اصحاب ثلاثہ سے بغض رکھنے والے جو حب علی رضی اللہ عنہ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں ان میں بالاتفاق علی و جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق جو شر و کفر پایا جاتا ہے وہ ان لوگوں میں موجود نہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عداوت رکھتے اور آپ کی تکفیر کرتے تھے۔ نیز یہ بات بھی نکھر کر سامنے آئی کہ اصحاب ثلاثہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ و جمیع صحابہ کے نزدیک اعداء علی رضی اللہ عنہ سے بدتر تھے۔

فصل:

[چادر میں چھپانے کا قصہ]

جس حدیث میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو چادر تلے چھپانے کا ذکر کیا گیا ہے' امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [1]

امام مسلم نے یہ حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے: آپ فرماتی ہیں:

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ بالوں کی بنی ہوئی ایک منقوش چادر اوڑھے علی الصبح گھر سے نکلے۔ اتنے میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما آ گئے تو آپ نے دونوں کو چادر کے نیچے چھپا لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ و فاطمہ آئے تو ان کو بھی چادر میں چھپا لیا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ [2]

''بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اے اہل بیت؛ اور تمہیں بالکل پاک کر دے۔''

ظاہر ہے کہ حدیث میں بیان کردہ وصف صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں؛ بلکہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی اس میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔ ظاہر ہے کہ عورت امامت و خلافت کی اہل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حدیث میں بیان کردہ فضیلت خلفاء و ائمہ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی اس ضمن میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ حدیث میں صرف دعا کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی آلودگی دور کر کے ان کو پاک و صاف فرما دے۔ اس میں حد سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے پاکیزگی اور تقویٰ کی دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان سے گناہ کی آلودگی کو دور کر دے' اور نہیں پاک صاف کر دے۔ گناہ کی آلودگی سے محفوظ رہنا مومن پر واجب ہے' اور طہارت حاصل کرنے کا حکم ہر مؤمن کیلئے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ وَلَٰكِن يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ ﴾ [المائدہ]

''اللہ تم پر زندگی کو تنگ نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾ [التوبہ ۱۰۳]

''اے نبی! آپ ان کے اموال سے صدقہ وصول کیجئے اور اس صدقہ کے ذریعہ ان (کے اموال) کو پاک کیجئے اور

---

[1] سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب ما جاء فی فضل فاطمۃ رضی اللہ عنہا (حدیث: ۳۸۷۱)

[2] صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ ، باب فضائل اهل بيت النبی۔ (حدیث: ۲۴۲۴)

ان (کے نفوس) کا تزکیہ کیجئے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرة ۲۲۲]

''اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

بس زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ان لوگوں کے لیے امر بجالانے اور نواہی سے اجتناب کی توفیق کی دعا ہے۔اس سے آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''اَتْقٰی'' کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿اَلْاَتْقٰى ❁ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ❁وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ❁اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ❁وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ (الليل)

''وہ صاحب تقویٰ جو پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے۔حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کی رضا طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے۔اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا۔''❶

ایسے ہی مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین اور احسان کے ساتھ اتباع کرنے والے جن پر اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا؛ اوران کو یہ بشارت سنائی:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ [التوبة]

''وہ مہاجر اور انصار جنہوں نے سب سے پہلے ایمان لانے میں سبقت کی اور وہ لوگ جنہوں نے احسن طریق پر ان کی اتباع کی، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی۔وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔''

اس لیے ضروری ہے کہ وہ وہ واجب امور بجالاتے ہوں اور ممنوعات سے پرہیز کرتے ہوں تب یہ رضا مندی اور اس عمل پر یہ بدلہ ملے گا۔اس وقت ان سے گناہوں کی آلودگی کا دور کیا جانا اور انہیں پاک وصاف کرنا ان کی بعض صفات میں سے ایک صفت ہوگی۔تو کملی کے نیچے چھپائے ہوئے لوگوں کیلئے نبی کریم ﷺ کی دعا بھی اسی کی ایک قسم ہے' جو صفات اللہ تعالیٰ نے سابقین اولین کی صفات بیان کی ہیں۔نبی کریم ﷺ نے صرف ان چادر کے نیچے چھپائے ہوئے لوگوں کے لیے ہی دعا نہیں فرمائی' بلکہ ان کے علاوہ کئی ایک دوسرے لوگوں کے لیے بھی آپ ﷺ نے رحمت کی دعا فرمائی ہے؛ اور بہت سارے لوگوں کے لیے جنت اور مغفرت کی دعا فرمائی ہے؛ جو کہ صرف طہارت اور آلودگی دور ہونے کی دعا سے کئی درجہ بڑھ کر ہے۔اس سے یہ کہیں بھی لازم نہیں آتا کہ جن کے لیے آپ نے دعا فرمائی ہو وہ سابقین اولین سے افضل ہو جائے۔

مگر کملی کے نیچے چھپائے گئے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ جب طہارت حاصل کرنا اور گناہوں کی آلودگی سے دور رہنا ان پر واجب تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس فعل کے بجالانے پر ان کی مدد فرمائے' تاکہ وہ [اس

❶ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت ''اَتْقٰی'' کے اس زمرہ میں اس لیے شامل نہ تھے کہ آپ ان دنوں مال دار نہ تھے۔آپ اس وصف سے اس وقت متصف ہوئے جب غزوہ خیبر کے بعد آپ مال ودولت سے سرفراز ہوئے۔

فعل کے ترک کی وجہ سے] عقاب اور مذمت کے مستحق نہ ٹھہریں ؛ اوران اوامر کے بجالانے کی مدح وثواب کو پالیں ۔

[اداءِ صدقہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی انفرادیت]:

[شبہ]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آیت کریمہ: ﴿ اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰاكُمْ صَدَقَةً: ﴾(المجادله: ۱۲)''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم پیغمبر سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کروتو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دو۔'' کے بارے میں فرمایا کہ''اس آیت پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا۔اوراس آیت میں وارد حکم سے اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے اس امت پر تخفیف کردی۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب]:عرض ہے کہ صدقہ مسلمانوں پر واجب نہ تھا،جس کو ترک کرنے سے وہ گنہگار کہلاتے۔البتہ جو شخص نبی کریم ﷺ سے کوئی راز کی بات بیان کرنا چاہتا ہوا سے صدقہ دینے کا حکم دیا گیا تھا۔یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت صرف علی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے مشورہ کرنا چاہا اور حکم الٰہی کی تعمیل میں صدقہ ادا کیا۔[1] صدقہ کی یہ ادائیگی بعینہٖ یوں ہے جیسے حج تمتع کرنے والے پر یا جس شخص کو اداءِ حج سے روک دیا جائے اس پر قربانی واجب ہے۔اسی طرح جو شخص کسی تکلیف کی بنا پر حالت احرام میں سر منڈوانے پر مجبور ہو جائے اس پر فدیہ؛ یا روزہ ؛یا صدقہ کرنا واجب ہے۔یہ آیت حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ کا گزر آپ کے پاس سے ہوا' تو آپ اپنی ہانڈی کے نیچے آگ جلانے کے لیے پھونکیں مار رہے تھے؛ اور آپ کے سر میں جوؤں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی تھی[تو آپ کو حکم دیا گیا کہ سر کے بال منڈوا دیں اوراس کی جگہ صدقہ کردیں]۔اور جیسے مریض یا مسافر کو بعد کے ایام میں روزے رکھنے کا حکم ہے؛ اور جس طرح قسم توڑنے والے پر بھی کفارہ واجب ہے کہ وہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے' یا انہیں کپڑا پہنائے یا پھر ایک غلام کو آزاد کرے۔اور جس طرح یہ حکم ہے کہ جو کوئی نماز کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وہ وضو کرلے؛ اور جس طرح یہ حکم ہے کہ جو کوئی قرآن پڑھنا چاہتا ہوٗ اسے چاہیے کہ سب سے پہلے شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لے۔اس طرح کی مثال بہت زیادہ ہیں۔

ان آیات میں حکم شرط کے ساتھ معلق ہے ۔جب یہ شرط صرف ایک ہی آدمی میں پائی جائے تو اس کے علاوہ کسی اور انسان پر اس حکم کو بجالانا واجب نہیں ہوگا۔یہی عالم اس آیت کا بھی ہے۔اس لیے کہ اس کے منسوخ ہونے سے قبل کسی ایک نے بھی نبی کریم ﷺ سے کوئی راز دارانہ بات نہیں کی سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے؛اس لیے اس آیت پر عمل نہ کرنے پر کسی مؤمن پر کوئی حرج باقی نہ رہا۔پس اس طرح کی چیزیں ائمہ کی خصوصیات میں سے نہیں ہوسکتیں۔اور نہ ہی یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خاصیت ہے۔اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ باقی لوگوں نے بخل کی وجہ سے راز داری کی بات نہ کی؛اس لیے کہ ایسا کرنا صحابہ کرام کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا۔اس پر مزید یہ کہ مشورہ سے پہلے صدقہ دینے کا حکم تادیر باقی نہ رہا۔اوراس مدت میں کسی کو سرگوشی کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔[اور اتفاقاً حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی نے وہ درہم یا اس سے کم وبیش خرچ کرکے عمل کیا]۔اگر یہ بات مان لی جائے کہ یہ حکم بعض لوگوں کے لیے خاص تھا' تو اس سے لازم نہیں آتا کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ان لوگوں میں سے ہوں۔اور یہ ممکن بھی کیسے ہوسکتا ہے جب کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے جذبہ جود وسخا کا یہ عالم

[1] مستدرك حاكم(۲/ ٤٨٢)۔

تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے [غزوہ تبوک کے موقع پر] انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی تو آپ نے سارا مال اللہ کی راہ میں دیدیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا آدھا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا؛ انہیں کسی سرگوشی کی کوئی ضرورت ہی نہ پڑی تو پھر ان میں سے کسی ایک سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ کوئی سرگوشی کرنے سے پہلے دو یا تین درہم صدقہ کرنے سے بخل کرتا؟۔

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: میں نے سنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے:

''ہمیں رسول اللہ ﷺ نے صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ پس اتفاق سے اس وقت میرے پاس کافی مال تھا؛ میں نے کہا: اگر کوئی موقع جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ پر سبقت لے جانے کا ہے تو وہ آج کا دن ہے۔ تو میں اپنے گھر کا آدھا مال لے کر آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے عمر! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''اتنا ہی مال اپنے گھر والوں کے لیے بھی چھوڑ آیا ہوں۔'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا سارا مال لے کر آ گئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ سے دریافت کیا کہ اے ابوبکر! گھر میں کیا چھوڑا؟ تو حضرت صدیق نے جواباً فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول کو گھر والوں کے لیے باقی چھوڑ دیا ہے۔'' تو میں نے کہا: میں کبھی بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بازی نہیں لے سکتا۔'' ❶

[پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے اللہ کا رسول بس]

فصل:

[کعب قرظی کی روایت اور شیعہ کا شبہ]

[شبہ]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''محمد بن کعب القرظی روایت کرتے ہیں کہ طلحہ بن شیبہ اور حضرت عباس و علی رضی اللہ عنہم اجمعین باہم فخر کرنے لگے۔

طلحہ نے کہا: میں کعبہ کا کنجی بردار ہوں، اگر چاہوں تو کعبہ ہی میں رات بسر کرلوں۔

عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں اگر چاہوں تو مسجد ہی میں رات بسر کرلوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے پتہ نہیں تم لوگ کیا کہتے ہو؛ میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ رو ہو کر نماز ادا کی ہے اور میں صاحب جہاد بھی ہوں۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۹)

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر بنا دیا جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے؟ اللہ کے نزدیک یہ برابر نہیں ہو سکتے؛ بیشک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ روایت حدیث کی قابل اعتماد کتب میں موجود نہیں، بلکہ بوجوہ اس کا کاذب ہونا ظاہر ہوتا ہے:

❶ البخاری ۲/ ۱۲۔ سنن ابی داؤد۔ کتاب الزکاۃ، باب الرخصۃ فی ذلک (ح:۱۶۷۸)، سنن الترمذی۔ کتاب المناقب (ح:۳۶۷۵)۔

۱۔ اس کے جھوٹ ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ طلحہ بن شیبہ نامی کوئی شخص نہیں۔ خادم کعبہ کا نام شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ [1] ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحیح نہیں۔

۲۔ دوسری دلیل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ ''اگر میں چاہوں تو مسجد میں رات بسر کروں'' مسجد میں رات بسر کرنا کون سی بڑی بات ہے کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔

۳۔ تیسری دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ ''میں نے لوگوں سے چھ ماہ پیشتر کعبہ رو ہو کر نمازیں پڑھیں۔'' اس قول کا باطل ہونا ضرورت کے تحت معلوم ہے۔ وجہ بطلان یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشرف بہ اسلام ہونے اور حضرت ابوبکر و خدیجہ و زید رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسلام میں صرف ایک دن یا اس کے لگ بھگ کا فرق پایا جاتا ہے۔ پھر یہ بات کیوں کر درست ہوئی کہ آپ نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے نمازیں ادا کی تھیں۔

۴۔ مذکورہ بالا روایت کے جھوٹ ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو ''صاحب الجہاد'' کہا ہے، حالانکہ اس خصوصیت میں دوسرے صحابہ بھی آپ کے ساتھ برابر کے سہیم و شریک تھے۔

ان دلائل کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث موضوع [من گھڑت] ہے۔ جب کہ صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر سے جو حدیث مروی ہے وہ اس کی تردید کرتی ہے۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں منبر نبوی کے پاس بیٹھا تھا۔ اسی دوران ایک شخص نے کہا: ''میں اسلام لانے کے بعد کوئی کام نہ بھی کروں تب بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں سوائے حاجیوں کو پانی پلانے کے۔''

دوسرے نے کہا: میں مسجد حرام کو آباد کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔''

تیسرے نے کہا: اور جہاد کا ذکر کیا کہ وہ دونوں سے افضل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر انھیں ڈانٹا اور فرمایا کہ جمعہ کے دن منبر نبوی کے نزدیک یہ شور و غل موزوں نہیں۔ البتہ میں جمعہ سے فارغ ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہارے اختلافی مسائل کا حل دریافت کروں گا۔ تب مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَایَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (التوبة: ۱۹)

''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر بنا دیا جو اللہ پر اور آخرت

---

[1] یہ عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ کے چچازاد بھائی تھے جو مکہ سے سیدنا خالد بن ولید کی معیت میں عازم مدینہ ہوئے مقام ''الہدءة'' میں مکہ و عسفان کے درمیان سیدنا عمرو بن العاص سے ملاقات ہوئی۔ یہ تینوں حضرات بہ یک وقت دولتِ اسلام سے مالا مال ہوئے۔ (سیرة ابن هشام: ٤٨٤)، مستدرك حاکم: ۳/۲۹۷۔۲۹۸) شیبہ غزوۂ حنین تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ حنین میں دھوکہ دے کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک شیبہ کے سینے پر رکھا اور فرمایا: ''شیطان دفع ہو'' نتیجہ کے طور پر شیبہ مسلمان ہو گئے۔ (سیرة ابن هشام: ٥٦٥) اور آپ سے مل کر کفار سے لڑے اور حوادث و آلام میں صبر و تحمل کا ثبوت دیا، جب مکہ فتح ہوا تو آپ نے کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ اور ان کے چچازاد بھائی شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ کو دے کر فرمایا: ''ابوطلحہ کے بیٹو! ہمیشہ کے لیے یہ کنجی لے لو، کوئی ظالم شخص ہی تم سے یہ کنجی واپس لے گا۔'' سیرة ابن هشام (ص: ٥٤٩) اسد الغابه: (۳/٥۹۹۔٦۰۰) کعبہ کی کنجی آج تک قبیلہ بن عبدالدار کے اسی کنبہ کے قبضہ میں چلی آتی ہے۔ ان کو ''الشیبیین'' کہا جاتا ہے۔

کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے؟''[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں نہ ہی ائمہ کی کوئی خصوصیت ہے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس میں کوئی خصوصیت ہے۔ کیونکہ جو اصحاب اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مہاجرین اور انصار صحابہ کرام اس وصف میں آپ کے شریک ہیں۔ حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ان سب سے ایمان و جہاد میں بڑھ کر ہیں۔ جب کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ [التوبة ۲۰]

''جو لوگ ایمان لائے، ہجرت سے مشرف ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا، تو یہ لوگ بلاشبہ اللہ کے نزدیک عالی مرتبت ہیں۔''

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جہاد مال و جان، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں یقیناً بڑھ کر تھا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احسانات باقی سب لوگوں سے زیادہ ہیں۔''[2]

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''کسی شخص کے مال سے مجھے اتنا فائدہ نہیں پہنچا جتنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مال سے۔''[3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سیف و سنان و زورِ بیان دونوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرتے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اوّلین شخص تھے، جن کو اللہ کی راہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لاتعداد حوادث و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ پہلے شخص تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے سلسلہ میں اعداء دین کے سامنے سینہ سپر ہوئے۔ ہجرت و جہاد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق رہے، اس کی حد یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں سائبان کے نیچے آپ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔[4] ابوسفیان نے غزوۂ احد کے دن صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ابوسفیان نے جب پوچھا کہ کیا محمد موجود ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اسے جواب نہ دو۔ پھر اس نے پوچھا کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں؟ آپ نے جواب دینے سے منع کیا۔ ابوسفیان پھر بولا: کیا عمر رضی اللہ عنہ ہیں؟ آپ نے پھر بھی جواب دینے کی اجازت نہ دی۔ ابوسفیان کہنے لگا۔ ان سب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہ رہا گیا تو بولے اللہ کے دشمن! تو جھوٹ کہتا ہے یہ سب زندہ ہیں[5] اور اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے ایسے لوگ باقی رکھے ہیں جو تجھے رسوا کریں گے۔ جیسا کہ امام بخاری نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ۔ باب فضل الشھادۃ فی سبیل اللہ (حدیث:۱۸۷۹)

[2] صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "سدوا الابواب ......" (ح:۳۶۵٤) صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق، (حدیث:۲۳۸۲)

[3] سنن ترمذی۔ کتاب المناقب۔ باب (۱۵/ ۳٤)، (حدیث:۳۶۶۱)

[4] سیرۃ ابن ھشام (ص:۳۰۰)

[5] صحیح بخاری، کتاب المغازی۔ باب غزوۃ احد، (حدیث:٤۰٤۳۔۳۰۳۹)۔

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی کہنا ابن سبا کی اختراع]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''ان دلائل میں سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ذکر کردہ یہ روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سلمان سے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیجیے کہ آپ کا وصی کون ہے؟ جب سلمان نے یہ سوال کیا تو آپ نے جواباً فرمایا: ''اے سلمان! حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصی کون تھا؟'' کہا ''یوشع بن نون'' فرمایا: ''میرا وصی اور وارث علی [1] ہے؛ جو میرا قرض ادا کرے گا اور میرے وعدے پورے کرے گا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ روایت باتفاق محدثین کذب و دروغ اور موضوع ہے اور مسند احمد بن حنبل میں موجود نہیں۔ امام احمد نے فضائل صحابہ میں ایک کتاب تصنیف کی تھی اس میں خلفاء اربعہ اور دیگر صحابہ کے فضائل و مناقب بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں صحیح و ضعیف روایات سب جمع کر دی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کتاب میں جو حدیث بھی ہو وہ صحیح ہو۔ مزید برآں اس کتاب میں امام احمد رحمہ اللہ کے بیٹے عبد اللہ رحمہ اللہ نے اپنی روایات کا اضافہ بھی کیا ہے۔

❀ قَطِیْعی [2] نے اپنے شیوخ کی روایات سے بھی امام احمد کی کتاب فضائل صحابہ پر اضافہ کیا ہے۔ قطیعی کا اضافہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ جیسا کہ آگے اس کا بیان آئے گا۔ قطیعی کے شیوخ زیادہ تر امام احمد کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیعہ کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ اس کتاب میں جب بھی کوئی حدیث دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: ''یہ امام احمد کی روایت کردہ ہے'' حالانکہ اس کا قائل قطیعی ہوتا ہے جس کے اساتذہ امام موصوف کے ہم طبقہ لوگوں سے روایات اخذ کرتے ہیں۔

مسند امام احمد میں بھی آپ کے بیٹے عبد اللہ نے زیادات کی ہیں۔ مسند احمد میں جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرویات ذکر

---

[1] مشہور شیعہ المامقانی نے اپنی کتاب "تنقیح المقال" (۱۸۴/۲) پر جرح و تعدیل کے ماہر شیعہ عالم محمد بن عمر الکشی سے روایت کیا جس نے سب سے پہلے اس فن میں کتاب تصنیف کی۔ محمد بن عمر کی تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ بقول اہل علم عبد اللہ بن سبا یہودی تھا۔ اسلام ظاہر کر کے اس نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے دوستانہ مراسم قائم کیے۔ ابن سبا جب یہودی تھا تو کہا کرتا تھا کہ یوشع بن نون سیدنا موسیٰ کے وصی تھے۔ اسلام لانے کے بعد وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی بتایا کرتا تھا۔'' مشہور شیعہ عالم کا یہ بیان اس باب میں نص صریح کا حکم رکھتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے وصی کا لقب ابن سبا نے اختراع کیا۔ چونکہ سابقاً ذکر کردہ سیدنا انس کی روایت بے بنیاد ہے اس لیے اس باب میں یقینی بات یہی ہے جو المامقانی نے الکشی سے نقل کی کہ اس لقب کا واضع ابن سبا یہودی تھا۔ اس روایت کے راوی جب شیعہ خود ہوئے تو اب یا تو وہ اپنے علماء کو جھوٹا کہیں یا یہ کہیں کہ الکشی نے علماء سے یہ روایت نقل کرنے میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ ہمیں اس ضمن میں مزید کسی دلیل کی حاجت نہیں اور یہی بات کافی ہے کہ یہ روایت شیعہ علماء کی زبانی نقل ہوتے ہوتے ابن سبا سے الکشی تک پہنچی اور پھر المامقانی کے ذریعہ شیعہ جرح و تعدیل کی عظیم و جدید ترین کتاب میں مندرج ہوئی۔

یہ اسی روایت کا ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ انس و سلمان کا دامن اس تہمت سے پاک کر دیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغام کو ایسے عیب سے داغ دار ہونے سے بچا لیا جس کی وجہ سے امت بنی نوع آدم میں سے ہونے والے اوصیاء کے زیر اثر سب تصرفات سے محروم ہو جاتی، اس پر طرہ یہ کہ ان میں سے آخری وصی ہنوز ''لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ'' کا مصداق ہے، حالانکہ پیام اسلام دنیائے انسانیت کو حریت فکر و نظر کا عطیہ دینے کے لیے آیا تھا اور اس کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ عقل انسانی اسلام کے اس چشمۂ صافی سے بکمال آزادی اور بدوں جبر و اکراہ ہدایت عظمیٰ کا آب حیات پیئے جس پر اس عالمی شریعت کے سوا کسی کو نگران یا وصی مقرر نہیں کیا گیا۔

[2] بغداد کے گرد و نواح میں اراضی کے کچھ قطعات بے آباد پڑے تھے۔ عباسی امراء و حکام نے زمین کے وہ ٹکڑے بعض لوگوں کو جاگیر کے طور پر دے دیے تھے۔ زمین کے ہر ٹکڑے کو قطیعہ کہتے تھے اور اہل علم جن کو وہ جاگیریں ملی تھیں قطیعی کہلاتے تھے۔ امام احمد کی کتاب فضائل صحابہ پر جس نے اضافہ کیا ہے ممکن ہے وہ احمد بن جعفر بن حمدان القطیعی المتوفی (۲۷۳۔۳۶۸) ہو۔ احمد بن جعفر نواح بغداد کی آبادی قطیعۃ الرقیق میں بود و باش رکھتے تھے۔

کی گئی ہیں، وہاں عبداللہ نے خصوصی طور پر اضافہ کیا ہے۔ [1] خلاصہ یہ کہ یہ حدیث کسی دجال کا کذب و دروغ ہے اور اللہ کی قسم یہ امام احمد کی بیان کردہ نہیں، انھوں نے یہ حدیث اپنی مسند میں ذکر کی نہ فضائل صحابہ میں۔

[بیت اللہ سے بت توڑنے کی روایت]:

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''یزید بن ابی مریم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور نبی کریم ﷺ کعبہ میں آئے پھر نبی کریم ﷺ میرے کندھے پر سوار ہوئے۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکا۔ آپ میری کمزوری دیکھ کر اتر آئے پھر آپ بیٹھے اور میں آپ کے کندھے پر سوار ہو گیا۔ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور میں خانہ کعبہ پر چڑھ گیا۔ کعبہ پر تانبہ کی ایک مورتی تھی۔ میں نے اسے اکھاڑ کر پھینک دیا اور وہ ٹوٹ گئی۔ پھر ہم بھاگنے لگے، یہاں تک کہ ہم گھروں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے؛ ہمیں خوف تھا کہ کہیں لوگ ہمیں پکڑ نہ لیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ بشرط صحت [2] اس واقعہ میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی جو ائمہ وخلفاء کے خصائص میں شمار ہونے کے قابل ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ حالت نماز میں امامہ بنت ابی العاص کو اٹھائے ہوئے ہوتے تھے۔ [3] جب آپ سجدہ کرتے تو اسے نیچے چھوڑ دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے اٹھا لیتے۔ ایک دفعہ حالت سجدہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ آ کر آپ پر سوار ہو گئے [4] تو آپ نے سجدہ لمبا کر دیا۔ پھر بعد میں آپ نے فرمایا: ''میرے بیٹے کی وجہ سے مجھے سجدہ لمبا کرنا پڑا۔ [5] آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ جب آپ ایک لڑکے اور لڑکی کو اٹھا سکتے ہیں۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اٹھانے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آپ کی کوئی خصوصیت ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں دوسرے لوگ بھی آپ کے شریک ہیں۔ خصوصاً جبکہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لیے اٹھایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کو اٹھانے سے قاصر تھے۔ بنا بریں اس واقعہ کو مناقب رسول ﷺ میں شمار کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس پر مزید یہ کہ جو شخص نبی کو اٹھاتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو نبی پر سوار ہو۔ جیسے طلحہ بن عبید اللہ نے غزوہ احد میں نبی کریم ﷺ کو اٹھایا تھا۔ [6] ظاہر ہے کہ جس شخص نے نبی کریم ﷺ کو اٹھایا اس نے نبی کو فائدہ پہنچایا اور جو نبی پر سوار ہوا اس نے نبی سے فائدہ حاصل کیا۔ اس میں

---

[1] حافظ ابن کثیر مقدمہ ابن الصلاح کے خلاصہ میں جس کا نام "الباعث الحثیث فی اختصار علوم الحدیث" ہے لکھتے ہیں: ''حافظ ابو موسیٰ محمد بن ابی بکر مدینی کا مسند امام احمد کے بارے میں یہ ارشاد کہ ''اَنَّہٗ صَحِیْحٌ '' ضعیف قول ہے اس لیے کہ مسند احمد میں نہ صرف ضعاف بلکہ موضوعات بھی ہیں، مثلاً وہ احادیث جن میں مرو عسقلان نیز حمص کے نواحی شہر ''البرث الاحمر'' کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ محدثین نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔'' میں کہتا ہوں فضائل پر مشتمل احادیث اگرچہ بخاری و مسلم کی روایت کردہ احادیث کی طرح صحیح نہ بھی ہوں تاہم لوگ از راہ تساہل ان کو قبول کر لیتے ہیں جس طرح ترغیب وترہیب پر مشتمل ضعیف احادیث کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے۔''

[2] مسند احمد(۱/ ۸٤)۔ مستدرك حاكم(۲/ ۳٦٦۔۳٦۷، ۳/ ۵) من طريق ابی مریم عن علیؓ۔ و ابو مریم الثقفی هو مجهول۔ وقال الذهبی۔ اسناده نظیف والمتن منكر۔"

[3] صحيح بخاری ۔ كتاب الصلاة باب اذاحمل جارية صغيرة على عنقه" (حديث: ٥١٦)، صحيح مسلم ، كتاب المساجد۔ باب جواز حمل الصبيان فی الصلوة (حديث: ٥٤٣)۔ [4] سنن نسائی ، كتاب التطبيق ۔ باب هل يجوز ان تكون سجدة أطول من سجدة (حديث:١١٤٢) [5] رواه النسائي ٢/ ١٨٢؛ أحمد ٣/ ٤٩٣۔

[6] سنن ترمذی۔ كتاب المناقب ، باب مناقب ابی محمد طلحه بن عبيد الله ، (حديث:٣٧٣٨)

شبہ نہیں کہ نبی کو فائدہ پہنچانے والا نفع حاصل کرنے والے کی نسبت بہت زیادہ افضل ہے۔

فصل:

[ابن ابی لیلہ کی روایت: تین صدیق]

[شبہ]: شیعہ مضمون نگار رقم طراز ہے: ''ابن ابی لیلیٰ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: صدیق تین ہیں: (۱) حبیب نجار؛ آل یاسین کا مؤمن ۔(۲) حزقیل؛ مومن آل فرعون (۳) اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ؛ آپ ان تینوں میں سب سے افضل ہیں۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ روایت رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ گھڑا ہوا ہے۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کے لقب سے ملقب کیا۔ [1] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں:

'تم پر سچ بولنا لازم ہے؛ بیشک سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے' اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور کوئی آدمی سچ بولتا اور سچ کا قصد کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ درگاہ ایزدی میں صدیق لکھا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچ کر رہو۔ بیشک جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اور گناہ جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اور کوئی انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کا قصد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔'' [2]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ صدیق صرف کوئی ایک ہی نہیں بلکہ بہت سارے صدیق ہیں۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو صدیقہ کے لقب سے نوازا ہے' ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ﴾ (المائدۃ: ۵/ ۷۵) (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ صدیقہ تھیں) حالانکہ آپ عورت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مردوں میں بہت سارے لوگ کامل ہوئے ہیں' اور عورتوں میں سے صرف چار کامل ہوئی ہیں۔'' [3]

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ صدیق ہو سکتے ہیں۔

فصل:

[علی تم مجھ سے ہو...... حدیث]

[شبہ]: رافضی کہتا ہے: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ''۔

[جواب]: بخاری و مسلم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت علی و جعفر اور زید رضی اللہ عنہم اجمعین سید شہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی کفالت کے بارے میں جھگڑنے لگے تو آپ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ صادر کیا، کیونکہ وہ لڑکی کے خالو تھے۔ تاہم آپ نے فرداً فرداً تینوں کو مطمئن کرنے کیلئے ان کے حق میں تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا: ''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْكَ''۔ [4] تم میرے ہو اور میں آپ کا ہوں)

---

[1] مستدرک حاکم (۳/ ۶۲) [2] صحیح بخاری۔ کتاب الأدب، باب قول الله تعالیٰ ﴿ یایها الذین اٰمنوا اتقوا الله﴾ (ح:۶۰۹۴) صحیح مسلم۔ کتاب البر والصلة، باب قبح الکذب و حسن الصدق: (ح:۱۰۵/ ۲۶۰۷)

[3] البخاري مع الفتح ۶/ ۴۴۶۔ و مسلم ۴/ ۱۸۸۶۔

[4] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء، (حدیث: ۴۲۵۱)۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں فرمایا:''آپ کی صورت و سیرت مجھ سے ملتی جلتی ہے۔'' زید کو مخاطب کر کے فرمایا:
''آپ ہمارے بھائی اور مولیٰ ہیں۔''

مگر سوال یہ ہے کہ جو کلمات آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں فرمائے، وہ متعدد صحابہ کی شان میں فرما چکے تھے۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے ان کے قبیلہ کے حق میں فرمایا:

''اشعر قبیلہ کے لوگ جہاد میں محتاج ہو جاتے ہیں یا مدینہ میں ان کے بچوں کا کھانا کم ہو جاتا ہے، تو جو کچھ ان لوگوں کے پاس ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں، پھر آپس میں ایک برتن سے برابر تقسیم کر لیتے ہیں[اور فرمایا:
"هُمْ مِنِّیْ و اَنَا مِنْهُمْ"[1]
''وہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔''

ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:"هُوَ مِنِّیْ و اَنَا مِنْهُ۔"
''وہ میرے ہیں اور میں ان کا ہوں۔''

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

((نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک جہاد میں تھے کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مال عطا کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا:''کیا تمہیں کوئی ایک غائب معلوم ہوتا ہے۔'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں فلاں فلاں اور فلاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی گم نہیں ہے؟۔ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں فلاں فلاں اور فلاں غائب ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: کیا تم میں سے کوئی گم نہیں ہے؟۔ صحابہ نے عرض کیا: نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لیکن میں تو جلیبیب کو گم پاتا ہوں؛ اسے تلاش کرو۔'' پس انہیں شہداء میں سات آدمیوں کے پہلو میں پایا؛ جنہیں انہوں نے قتل کیا تھا۔ پھر کافروں نے انہیں شہید کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آ کر کھڑے ہوئے پھر فرمایا:''اس نے سات کو قتل کیا؛ پھر انہوں نے انہیں شہید کر دیا؛ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں؛ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا؛ اور اس طرح کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور نے انہیں نہیں اٹھایا ہوا تھا۔ پھر ان کے لئے قبر کھودی گئی اور انہیں قبر میں دفن کر دیا گیا اور غسل کا ذکر نہیں کیا''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل عشرہ:

[شبہات و اعتراضات]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

عمرو بن میمون روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ میں دس اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی اور میں موجود نہیں:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں فرمایا:''میں ایک ایسے شخص کو بھیجوں گا، جسے اللہ تعالیٰ ہرگز رسوا نہیں کریگا وہ اللہ و رسول کو چاہتا ہے اور اللہ و رسول اسے چاہتے ہیں۔ آپ نے ادھر ادھر دیکھا، پھر فرمایا، علی رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے' اور آرام کر رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے' آپ کی آنکھوں میں تکلیف کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ پھر آپ نے ان کی آنکھوں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشرکة، باب الشرکة فی الطعام والنهد، (حدیث: ٢٤٨٦)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة: باب من فضائل الاشعریین، (حدیث:٢٤٩٩) [2] مسلم ٤/ ١٩١٨۔

میں پھونک ماری؛ پھر تین بار جھنڈے کو ہلایا اور آپ کو عطا کر دیا؛ آپ صفیہ بنت حیی بن اخطب کو گرفتار کر کے لائے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ دے کر بھیجا، بعد ازاں ان کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا اور فرمایا: ''اس سورت کو لے کر وہ شخص جائے گا جو میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔''

۳۔ رسول کریم ﷺ نے اپنے چچا زاد بھائیوں سے پوچھا: ''کون شخص دنیا و آخرت میں مجھ سے دوستی لگانا چاہتا ہے؟'' سب نے انکار کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں آپ سے دنیا و آخرت میں دوستی لگاؤں گا۔''

فرمایا: ''آپ نے اسے چھوڑ دیا؛ پھر ان آدمیوں میں سے ایک آدمی کے پاس آئے؛ آپ نے پوچھا: ''کون شخص دنیا و آخرت میں مجھ سے دوستی لگانا چاہتا ہے؟'' سب نے انکار کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں آپ سے دنیا و آخرت میں دوستی لگاؤں گا۔'' تو آپ نے فرمایا: تو دنیا و آخرت میں میرا دوست ہے۔''

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اوّلین شخص تھے جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد اسلام لائے۔

۵۔ نبی کریم ﷺ نے اصحاب خمسہ [حضرت علی؛ حضرت حسن حضرت حسین اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو چادر تلے چھپایا اور آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ [الأحزاب ۳۳]

''اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر کے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔''

۶۔ چھٹی خصوصیت: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جان کی بازی لگائی اور نبی کریم ﷺ کی قمیص پہن کر مکہ میں نبی کریم ﷺ کے بستر پر سوئے رہے؛ اس وقت مشرکین آپ پر سنگ باری کر رہے تھے۔

۷۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ غزوہ تبوک کے لیے مدینہ سے نکلے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ جانے کی اجازت نہ دی تو آپ رو پڑے۔ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا: ''کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی؛ سوائے اس کے کہ آپ نبی نہیں ہیں۔ اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں چلا جاؤں مگر آپ کو اپنا خلیفہ بنا کر۔''

۸۔ آٹھویں خصوصیت کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا: ''میرے بعد آپ ہر مومن کے دوست ہیں۔''

۹۔ نویں خصوصیت کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا باقی سب لوگوں کے وہ دروازے بند کر دیے جائیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بحالت جنابت مسجد نبوی میں سے گزرا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ آپ کا دوسرا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

۱۰۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دسویں خصوصیت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں فرمایا:

''مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔''

''جس کا میں دوست ہوں؛ علی بھی اس کا دوست ہے۔''

نبی ﷺ سے مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ: آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ دے کر مکہ روانہ کیا۔ چنانچہ آپ تین شب و روز چلتے رہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو واپس بلوایا اور علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ سورۂ توبہ مکہ پہنچائیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی میں پہنچ کر رو پڑے۔ اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میرے

بارے میں کوئی نئی بات پیش آئی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں البتہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ یہ سورت خود مکہ پہنچاؤں یا میرا کوئی اپنا آدمی یہ فریضہ انجام دے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جوابات]: یہ کسی مستند حدیث میں ثابت نہیں ہے۔ عمرو بن میمون کی روایت کردہ یہ روایت مرسل ہے (اس لیے کہ عمرو بن میمون نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی اور نبی کریم ﷺ سے نہ مل سکے) مزید براں اس حدیث کے بعض الفاظ ایسے ہیں جو نبی کریم ﷺ پر اپنی طرف سے گھڑ کر منسوب کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ فقرہ:

"لَا یَنْبَغِیْ اَنْ اَذْهَبَ اِلَّا وَ اَنْتَ خَلِیْفَتِیْ۔"

''میں اس صورت میں مدینہ سے باہر جا سکتا ہوں جب آپ میرے خلیفہ ہوں۔''

حالانکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ متعدد مرتبہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنا نائب بنایا تھا۔ جب آپ نے حدیبیہ والا عمرہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے' اور مدینہ پر آپ کا خلیفہ کوئی اور تھا۔ اس کے بعد آپ نے غزوہ خیبر کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے؛ اور مدینہ میں خلیفہ کوئی اور تھا۔ غزوہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے اور مدینہ پر خلیفہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔ ایسے ہی غزوہ حنین اور غزوہ طائف کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے اور مدینہ میں خلیفہ رسول کوئی اور تھا۔ آپ نے حجۃ الوداع کیا' حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ حج پر تھے' اور مدینہ پر حاکم کوئی اور تھا اور ایسے ہی غزوہ بدر کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے' مدینہ میں کوئی دوسرا خلیفہ رسول تھا۔

یہ تمام باتیں صحیح اسناد کے ساتھ معلوم شدہ ہیں۔ اور ان پر اہل علم محدثین کا اتفاق ہے۔ اکثر غزوات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا کرتے تھے؛ خواہ ان غزوات میں قتال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ: آپ کے خلیفہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہی افضل ہیں۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ اتنے سارے غزوات [و واقعات] میں حضرت علی رضی اللہ عنہ مفضول ہوں۔ اور ایسے ہی حج و عمرہ کے موقع پر بھی۔ اور پھر باقی غزوات کے موقع پر خلیفہ مردوں پر بنایا جاتا تھا؛ جب کہ غزوہ تبوک کے موقع پر معذوروں؛ عورتوں اور بچوں پر خلیفہ بنایا گیا۔ اس وقت مدینہ میں [صحیح سالم اور تندرست] اہل ایمان میں سے صرف وہی تین مرد پیچھے رہ گئے تھے [جن کی معافی کا اعلان اللہ تعالیٰ نے کیا ہے] یا پھر وہ انسان باقی تھا جس پر منافق ہونے کی تہمت ہو۔ اس وقت مدینہ میں ہر لحاظ سے امن و امان تھا۔ اہل مدینہ کو کسی طرف سے کوئی خوف نہیں تھا۔ اور پیچھے رہ جانے والوں کو جہاد کی ضرورت نہیں تھی۔ جس طرح کہ باقی اکثر مواقع پر ہوا کرتا تھا۔

اسی طرح شیعہ کی پیش کردہ حدیث "سُدُّوا الْاَبْوَابَ اِلَّا بَابَ عَلِیٍّ" روافض کی طرف سے بطور مقابلہ اپنی گھڑی ہوئی ہے۔ جب کہ بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مرض الموت میں فرمایا:

''میں سب لوگوں سے زیادہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مال اور رفاقت کا ممنون ہوں۔'' اگر میں کسی کو گہرا دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بناتا۔ البتہ اسلامی اخوت و مودّت کسی شخص کے ساتھ مختص نہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی شخص کی کھڑکی مسجد کی جانب کھلی نہ رہے۔''[1]

شیعہ کی پیش کردہ حضرت ابن عباس کی روایت ''اَنْتَ وَلِیِّیْ فِیْ کُلِّ مُؤْمِنٍ بَعْدِیْ'' باتفاق محدثین موضوع ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ (ح: ۳۶۵٤) مسلم، (ح: ۲۳۸۲)۔

صحیح حدیث میں جن دیگر امور کا ذکر کیا گیا ہے اس میں نہ تو ائمہ کی کوئی خصوصیات ہیں اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیات؛ بلکہ ان میں دوسرے لوگ بھی آپ کے شریک ہیں؛ مثلاً:

۱۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ و رسول کو چاہتے ہیں؛ اور اللہ اور اس کا رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چاہتے تھے۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کرنا۔ [1]

۳۔ یہ بات کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے۔

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس انسان کا دوست ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کے دوست ہوں۔ اس لیے کہ ہر مؤمن اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی رکھتا ہے۔

۵۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سورۂ توبہ کو لے کر مکہ جانا؛ کیونکہ بنی ہاشم کے علاوہ کوئی یہ سورت مکہ نہیں پہنچا سکتا۔ اس میں سارے بنی ہاشم مشترک ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مختص نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۂ توبہ دے کر مکہ بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ نقض عہد کی اطلاع دینے کے لیے حاکم اعلیٰ کے قبیلہ کا کوئی شخص جایا کرتا تھا۔ اس سورۃ میں بھی نقض عہد کی اطلاع دی گئی ہے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مکہ جانا ضروری تھا۔ [2]

شیعہ کی وضع کردہ احادیث:

[شبہہ] : شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''خطیب اعظم خوارزمی [3] نے یہ روایت ذکر کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا:

''اے علی! اگر کوئی شخص اس قدر عرصہ دراز تک اللہ کی عبادت کرے جتنا عرصہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم میں ٹھہرے تھے اور احد پہاڑ جتنا سونا اللہ کی راہ میں صرف کرے؛ اور پا پیادہ ایک ہزار مرتبہ حج کرے؛ پھر بحالت مظلومی صفاء و

---

[1] ہم قبل ازیں تحریر کر چکے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو صرف ایک ہی مرتبہ حاکم مدینہ مقرر کیا گیا تھا۔ جب کہ دیگر صحابہ کو متعدد مرتبہ یہ خدمت تفویض ہوئی تھی جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اگر حاکم مدینہ کا سب لوگوں سے افضل ہونا ضروری ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی دوسرا حاکم مقرر کیا گیا سیدنا علی اس وقت مفضول تھے۔ مزید براں دوسرے صحابہ کی حاکمیت مدینہ کے زمانہ میں وہاں سب مومن موجود ہوا کرتے تھے، مگر جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا گیا تو عورتوں اور بچوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس سے افسردہ خاطر ہوئے اور اسے اپنی توہین پر محمول کیا۔ اس وقت مدینہ مامون تھا، اسے کوئی خطرہ لاحق تھا نہ وہاں جہاد کی ضرورت تھی۔

[2] یہ بات غلط ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سورۂ توبہ لے کر گئے اور پھر انھیں معزول کرکے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر کیا تھا اور آپ بہمہ وجوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا عدم موجودگی میں اس کے اہل تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ مدینہ سے رخصت ہو چکے تھے کہ سورۂ توبہ نازل ہوئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو یہ سورۃ دے کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جانب بھیجا، اس کے دو اسباب تھے، پہلی وجہ ذکر کی جا چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس سورۃ میں یہ آیت بھی ہے: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ﴾ اس آیت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جو مدح و ثنا بیان کی گئی ہے، وہ اس وقت تک باقی ہے، جب تک قرآن دنیا میں موجود ہے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا اس عظیم سورۃ کو لے کر جانا جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت پر مشتمل ہے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی دلیل اور ان لوگوں کے لیے ابدی ذلت کا موجب ہے جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے دل میں بغض و عداوت رکھتے ہیں۔''

[3] اخطب خوارزم (خطیب اعظم خوارزمی) ایک شیعہ ادیب ہے، یہ زمخشری کا شاگرد تھا۔ اس کا نام الموفق بن احمد بن اسحاق (۴۸۴۔۵۶۸) ہے۔ دیکھیے :بغیۃ الوعاۃ، ص: ۴۰۱، نیز روضات الجنۃ طبع ثانی، ص: ۲۲۷۔ اخطب خوارزم کی کتاب کا نام ''مناقب اہل البیت'' ہے۔ مقام افسوس ہے کہ غریب اہل بیت کی مدح میں شیعہ نے جھوٹی روایات وضع کرکے ان پر کتنا بڑا ظلم ڈھایا ہے۔''

مروہ کے مابین مارا جائے؛ اوراے علی! وہ تجھے دوست نہ رکھتا ہوتو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا اور نہ وہ اس میں داخل ہوگا۔'' [مزید من گھڑت روایات ملاحظہ فرمائیں]:

۱۔ ایک شخص نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنی شدید محبت رکھتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ'' جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی۔اور جس نے علی سے عداوت رکھی یقیناً اس نے مجھ سے عداوت رکھی۔''

۲۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرے کے نور سے ستر ہزار فرشتے پیدا کیے ہیں، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان سے محبت رکھنے والوں کے لیے تا قیامت مغفرت طلب کرتے رہیں گے۔''

۳۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی نماز و دعا اور صیام و قیام کو قبول فرماتے ہیں۔''

۴۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ہر رگ و ریشہ کے عوض جنت میں ایک شہر عطا کریں گے۔ جو شخص آل محمد سے محبت کرتا ہے وہ حساب و میزان اور پل صراط سے خائف نہ ہوگا۔ نیز جس کی موت حب آل محمد پر ہوگی میں اسے جنت میں انبیاء کرام کے ساتھ لے جانے کا ضامن ہوں۔ جو شخص آل محمد سے بغض رکھے گا بروز قیامت اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا'' خدا کی رحمت سے ناامید۔''

۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:'' جس کا یہ خیال ہو کہ وہ مجھ پر اور قرآن پر ایمان لایا ہے؛ مگر وہ علی سے بغض رکھتا ہو'وہ جھوٹا ہے' وہ ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتا۔''

۶۔ حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ایک دن ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کسی انسان کے قدم بروزِ قیامت اپنی جگہ سے سرکنے نہیں پائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال کرلیں:'' اس کی عمر کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اسے کہاں فنا کیا؟ اور اس کے جسم کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اسے کس چیز میں بوسیدہ کردیا؟ اور اس کے مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ اور ہم اہل بیت کی محبت کے بارے میں سوال کیا جائے گا؟۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپکے بعد آپ کی محبت کی نشانی کیا ہے؟ تو آپ نے اپنا دست مبارک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر پر رکھا؛ آپ اس وقت آپ کے پہلو میں کھڑے تھے؛ اور فرمایا: بیشک میرے بعد میری محبت اس سے محبت رکھنا ہے۔''

۷۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا کہ شب معراج اللہ تعالیٰ نے آپ کو کس زبان میں مخاطب کیا؟ آپ نے فرمایا'' علی کے لہجہ میں'' پھر میں نے بنا بر الہام پوچھا'' بار خدایا کیا تو نے مجھے مخاطب کیا یا علی نے''؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں دیگر اشیاء کی طرح نہیں۔ میں نے تجھے اپنے نور سے پیدا کیا اور علی کو تیرے نور سے خلق کیا۔ جب میں نے تیرے دل کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، لہٰذا اسی کے لہجہ میں آپ کو مخاطب کیا تاکہ آپ مطمئن رہیں۔

۸۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'' اگر سب باغات قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی

بن جائیں۔ جنات حساب دار اور سب بنی نوع انسان کاتب بن جائیں تو پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محاسن تحریر کرنے سے قاصر رہیں گے۔''

۹۔ اس نے اپنی سند سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل پر اتنا زیادہ اجر رکھا جس کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ جو کوئی آپ کے فضائل میں سے کسی فضیلت کا اقرار کرتے ہوئے اس کا تذکرہ کرے' تو اللہ تعالیٰ اس کے اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں۔ اور جو کوئی آپ کے فضائل میں سے کوئی ایک فضیلت لکھتا ہے' تو ملائکہ اس وقت تک اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں گے جب تک وہ کتاب اور وہ لکھا ہوا باقی رہے گا۔ اور جو کوئی آپ کے فضائل میں سے کوئی فضیلت سنتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ تمام گناہ معاف کردیتے ہیں جو اس نے سننے میں کئے ہوں۔ اور جو کوئی آپ کے فضائل پر مشتمل کتاب کو دیکھے؛ تو اللہ تعالیٰ نظر کی وجہ سے ہونے والے اس کے تمام گناہوں کو معاف کردیں گے۔ پھر فرمایا: ''امیر المؤمنین کے چہرہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے' آپ کا ذکر خیر کرنا عبادت ہے؛ اور اللہ تعالیٰ آپ سے دوستی اور آپ کے دشمن سے برأت کے بغیر کسی انسان کا ایمان قبول نہیں فرماتے۔

۱۰۔ حکیم بن حزام اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے؛ بیشک آپ ﷺ نے فرمایا: ''خندق کے دن عمرو بن عبد ود کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکلنا میری امت کے قیامت تک کے اعمال سے زیادہ افضل ہے۔

۱۱۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کا حکم دیا، مگر انھوں نے انکار کردیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی کہ تم علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو گالی کیوں نہیں دیتے؟ تو بتایا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے تین باتیں بتائی تھیں، اس وجہ سے میں ہرگز آپ کو گالی نہیں دوں گا اور اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو جائے تو وہ سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے۔ میں نے سنا کہ بعض غزوات میں جب نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں چھوڑ کر گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''اے علی! تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔ بس صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''[1] اور غزوہ خیبر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" لأعطین الرایة غداً رجلاً یحب الله و رسوله و یحبه الله و رسوله ۔"[رواہ البخاری ۵/ ۱۸]

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

ہم آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے۔ [جب صبح ہوئی تو] نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا۔ آپ کی آنکھیں

---

[1] علامہ موسیٰ جار اللہ اپنی کتاب ''الوشیۃ'' میں ''انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ'' کی تشریح میں فرماتے ہیں: دراصل رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ اگر چہ تیرا مقام نیکی میں بلند ہے لیکن سیدنا ہارون علیہ السلام کی طرح تم خلافت کا بوجھ نہیں اٹھا سکو گے، سیدنا ہارون چالیس دن بھی خلافت کا بار نہ اٹھا سکے اور مقصد یہ تھا کہ تم خلافت کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا بلکہ تعلیم و تعلم کے کام میں مشغول رہنا۔ حالانکہ ہارون نبی علیہ السلام تھے اور تم نبی بھی نہیں ہو۔

دکھ رہی تھیں۔آپ نے [ان کی آنکھوں میں لعاب ڈالا] اور پھر انہیں جھنڈا عطا کیا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَ اَبْنَآءَ كُمْ ﴾ [آل عمران ۶۱]

''پس آپ فرمادیجیے: آیئے! ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی؛ فاطمہ؛ حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلایا؛ اور فرمایا؛''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔''

شیعہ نے یہ حدیث تفصیلاً ذکر کی ہے اور قبل ازیں یہ بیان کی جا چکی ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: خطیب اعظم خوارزمی کی اس بارے میں ایک کتاب ہے؛ اس میں اتنی جھوٹی روایات ہیں جن کا من گھڑت ہونا کسی ادنی علم رکھنے والے پر بھی مخفی نہیں۔علماء حدیث کی تو بات ہی کچھ دیگر ہے۔نیز خطیب خوارزمی کا شمار محدثین میں نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا یہ مقام و مرتبہ ہے کہ دقیق علمی مسائل میں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔اس نے وہ روایات نقل کی ہیں جن کے بارے میں تمام محدثین جانتے ہیں کہ یہ من گھڑت اور جھوٹی روایات ہیں۔رافضی مصنف نے اپنی کتاب کے شروع میں دعوی کیا تھا کہ وہ اپنی کتاب میں وہی روایات نقل کرے گا جو اہل سنت والجماعت کے ہاں صحیح ہوں گی۔اور انہوں نے اسے اپنی معتمد کتابوں اور معتمد اہل علم کے اقوال سے نقل کیا ہوگا۔تو پھر وہ کیسے ایسی روایات ذکر کرتا ہے جن کے من گھڑت اور جھوٹ ہونے پر تمام اہل سنت کا اجماع ہے۔جب کہ معتمد کتب احادیث سے کوئی بھی روایت ہی نقل نہیں کی۔اور نہ ہی کوئی ایسی روایت ہے جسے ائمہ محدثین نے صحیح کہا ہو۔

یہ دس روایات جو اس نے ذکر کی ہیں؛ شروع سے لیکر آخر تک دس کی دس روایات محض جھوٹ ہیں۔سوائے عمرو بن عبد ود کے قتل کے واقعہ کے۔

۱۔سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کا حکم دیا، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔معاویہ رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی کہ تم علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو گالی کیوں نہیں دیتے؟ تو بتایا کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے تین باتیں بتائی تھیں،اس وجہ سے میں ہرگز آپ کو گالی نہیں دوں گا؛ اور اگر ان میں سے ایک بھی مجھے حاصل ہو جائے تو وہ سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے......الخ۔یہ حدیث صحیح ہے اور مسلم نے اسے روایت کیا ہے۔[1]

اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تین فضائل بیان ہوئے ہیں: مگر اس میں ائمہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت ہے۔یہ قول کہ: بعض غزوات میں جب نبی کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں چھوڑ کر گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا:''اے علی! تجھے مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔بس صرف اتنا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔'' ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حاکم مدینہ مقرر کرنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی خصوصیت نہیں، اور نہ ہی آپ کو نائب مقرر کرنا دوسروں کو نائب مقرر کرنے سے زیادہ کامل ہے۔یہی وجہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کی تھی: آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ اس لیے کہ ہر غزوہ میں مدینہ میں کچھ نہ کچھ مرد مہاجرین و انصار میں سے موجود رہتے تھے؛ سوائے غزوہ تبوک کے۔اس موقع پر آپ نے تمام لوگوں کو کوچ کرنے کا حکم دیا تھا۔

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، (ح:۳۲/ ۲٤۰٤)

اس موقع پر مدینہ میں وہی لوگ باقی رہ گئے تھے جو یا تو معذور تھے' یا بچے اور عورتیں یا پھر منافق؛ اور وہ لوگ جو غلطی یا سستی کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیچھے رہ جانے کو اچھا نہ سمجھا' اور عرض کیا:

''کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ یعنی آپ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے جا رہے' پیچھے کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کیا کہ: پیچھے رہنے میں کوئی نقص یا عیب نہیں ۔ بیشک موسی علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو پیچھے اس وجہ سے چھوڑا تھا کہ وہ آپ کے نزدیک امانت دار تھے۔ ایسے ہی میں بھی آپ کو پیچھے اس لیے چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ آپ میرے نزدیک امانت دار ہیں۔ مگر اتنا فرق ہے کہ موسی علیہ السلام نے اپنے بعد نبی کو پیچھے چھوڑا تھا' اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''[1]

یہ تشبیہ اصل استخلاف میں ہے۔ اس لیے کہ موسی علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو تمام بنی اسرائیل پر نائب بنایا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ تھوڑے سے مسلمانوں پر اپنا نائب بنایا تھا۔ جب کہ باقی سارے لوگوں کو آپ اپنے ساتھ جہاد پر لے گئے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اگر ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم و عیسیٰ علیہما السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح و موسیٰ علیہما السلام کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔[2] ظاہر ہے کہ یہ چاروں پیغمبر حضرت ہارون علیہ السلام سے افضل تھے۔ مزید براں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما ہر دو کو دو دو انبیاء کے مشابہ قرار دیا ہے، ایک کے نہیں۔ بنا بریں یہ تشبیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تشبیہ سے عظیم تر ہے۔ نیز یہ کہ استخلاف علی رضی اللہ عنہ میں دیگر صحابہ بھی ان کے سہیم و شریک تھے مگر اس تشبیہ میں کوئی صحابی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا شریک نہیں۔ لہٰذا یہ تشبیہ کسی طرح بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت قرار نہیں دی جا سکتی۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، (ح:۳۲/ ۲۴۰۴)

[2] یہ حدیث مندرجہ ذیل کتب میں ملاحظہ کی جائے۔ (۱) مسند احمد:۱/ ۳۸۳، ح:۳۶۳۲۔ (۲) مستدرك حاكم (۳/ ۲۱، ۲۲) (۳) ترمذی کتاب تفسیر القرآن۔ سورة الانفال(ح:۳۰۸۴) و سنده ضعیف لانقطاعه۔ ابوعبیدہ کا اپنے والد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔ (۴) تفسیر ابن کثیر(۴/ ۹۴۔۹۵)، (۵) مسند ابی یعلی(۲/ ۲۴۱)، (۶) دلائل النبوة(۳/ ۱۳۸)

ابن کثیر البدایۃ والنہایہ(۳/۲۹۷۔۲۹۸) پر لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ! یہ آپ کی قوم و قبیلہ کے لوگ ہیں انھیں زندہ رہنے دیجیے ممکن ہے کہ اللہ ان کو توبہ کی توفیق عطا کرے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ان لوگوں نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کو مکہ چھوڑنے پر مجبور کیا، لہٰذا ان کو تہ تیغ کر دیجیے۔''

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان کو نذر آتش کر دیجیے۔'' سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے قطع رحمی کا ثبوت دیا ہے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب باتیں سنیں اور کوئی جواب نہ دیا، لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے کسی نے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کریں گے، کسی نے کہا، عمر کی تجویز کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ کسی نے کہا، عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کریں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا:

اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دل کو انتہائی نرم بنا دیتے ہیں اور بعض کا دل اتنا سخت ہوتا ہے کہ اس کے سامنے پتھر کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا، آپ کی مثال سیدنا ابراہیم علیہ السلام جیسی ہے، جنھوں نے فرمایا تھا: ﴿مَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (سورۂ ابراہیم:۳۶) نیز آپ کی مثال سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے جن کا ارشاد ہے: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ (سورة المائدة:۱۱۸)

پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: آپ کی مثال سیدنا نوح علیہ السلام جیسی ہے، جنھوں نے فرمایا تھا: ﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا﴾ (سورۂ نوح:۲۶) نیز آپ کی مثال سیدنا موسیٰ علیہ السلام جیسی ہے، انھوں نے فرمایا تھا ﴿رَبِّ اشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ﴾ (سورۂ یونس:۸۸) پھر آپ نے فرمایا: چونکہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کمزور ہے، اس لیے کفار یا تو فدیہ ادا کریں یا انھیں قتل کر دیا جائے۔

ایسے ہی رسول اللہ ﷺ کا فرمان: ''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

ہم آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے ۔[جب صبح ہوئی تو] نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو طلب کیا۔ آپ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپ نے [ان کی آنکھوں میں لعاب ڈالا] اور پھر انہیں جھنڈا عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل میں روایت کردہ احادیث میں سب سے صحیح حدیث ہے۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے کئی اسناد سے نقل کیا ہے۔ مگر یہ وصف بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ یا ائمہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ہر متقی مؤمن سے محبت کرتے ہیں؛ اور ہر متقی مؤمن اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں نواصب کا بہترین ردّ ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بغض و عداوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛ آپ سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور آپ سے محبت و دوستی نہیں رکھتے۔ نیز خوارج کی تردید ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے اور آپ کو فاسق کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے گواہی دی ہے کہ آپ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث سے ان روافض کی تردید ہوتی ہے، جو کہتے ہیں کہ جو احادیث فضائل صحابہ میں وارد ہوئی ہیں وہ ان کے مرتد ہونے سے پہلے کی ہیں۔ خوارج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ حالانکہ خوارج و روافض دونوں کے اقوال سرے سے باطل ہیں۔[اہل سنت والجماعت ان کے اقوال سے بری ہیں]۔

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے خوشنودی کا اظہار نہیں کر سکتے جس کے متعلق اس کو معلوم ہو کہ اس کی موت کفر پر ہو گی۔ اسی طرح یہ حدیث ان اہل ہویٰ اور گمراہ فرقوں جیسے معتزلہ؛ مروانیہ وغیرہ؛ پر بھی حجت ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتے ہیں' اور آپ پر سب و شتم کرتے ہیں۔

اسی طرح مباہلہ بھی آپ کی خصوصیت نہیں، کیونکہ حضرت فاطمہ حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین بھی اس میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔ جیسا کہ یہی لوگ چادر کے نیچے چھپائے جانے میں بھی آپ کے شریک تھے۔ پس اس سے معلوم ہوا یہ حدیث نہ ہی مردوں کے ساتھ خاص ہے' اور نہ ہی ائمہ کے ساتھ خاص ہے۔ بلکہ اس میں عورت؛ بچے اور دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ کیونکہ مباہلہ کے وقت حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما چھوٹے بچے تھے۔ مباہلہ کا واقع سن نو یا دس ہجری میں فتح مکہ کے بعد اس وقت پیش آیا جب نجران کے عیسائیوں کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا تو اس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عمر سات سال بھی نہیں تھی۔ جب کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ سے ایک سال بڑے ہیں۔ ان کو بلانے کی وجہ یہ تھی کہ حکم یہی ملا تھا کہ ہر گروہ اپنے قرابت داروں بیٹوں اور عورتوں کو بلائے اور خود بھی حاضر ہو۔ تو ان دونوں فریقین میں سے ہر ایک نے اپنے قریب تر رشتہ داروں کو بلانا تھا۔ یہ لوگ نسب میں نبی کریم ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی تھے۔ اگرچہ بعض دوسرے لوگ نبی کریم ﷺ کے نزدیک ان سے افضل تھے۔ اس لیے کہ آپ کو یہ حکم نہیں ملا تھا کہ اپنے افضل ترین اتباع کاروں کو بلائیں۔ مقصود یہ تھا کہ لوگوں میں سب سے قریبی اور خاص افراد کو بلایا جائے۔ اس لیے کہ انسان کی فطرت میں ہے کہ [ایسے مواقع پر] اسے اپنی ذات اور اپنے قریبی خونی رشتہ داروں کا ایک خوف سے رہتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ چادر والی روایت میں اور دعا میں بھی انہیں ہی خاص کیا ہے۔

مباہلہ تو عدل کی بنا پر قائم تھا۔اس لیے عیسائیوں کو چاہیے تھا کہ وہ نسب کے لحاظ سے اپنے قریب تر رشتہ داروں کو بلا لائیں۔انہیں بھی اپنی اولاد کے بارے میں ایسے ہی خوف تھا جیسا خوف کسی اجنبی پر نہیں ہوسکتا۔یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ مباہلہ کرنے سے رک گئے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں علم ہو چکا تھا کہ آپ ﷺ حق پر ہیں۔اور اگر انہوں نے مباہلہ کیا تو آپ کی بددعا ان کے لیے اور ان کے اقارب کے لیے قبول ہو جائے گی۔اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی انسان کو اپنی اولاد کے بارے میں اتنا خوف محسوس ہوتا ہے کہ اتنا خوف اپنی جان کے بارے میں محسوس نہیں ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جو فضائل صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں؛ جیسے رسول اللہ ﷺ کا فرمان:

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

اور حدیث: کیا آپ اس بات پر راضی نہیں ہے کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔''

اور یہ حدیث:''یا اللہ! یہ بھی میرے اہل بیت ہیں۔ان سے پلیدی کو دور کردے' اور انہیں بالکل پاک کردے۔''

- اگر یہ کہا جائے کہ: یہ باتیں آپ کے خصائص میں سے نہیں ہیں؛ بلکہ ان میں دوسرے لوگ بھی آپ کے شریک اور حصہ دار ہیں تو پھر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے یہ تمنا کیوں کی تھی کہ ایک کاش! یہ مقام اسے مل جاتا۔جیسا کہ حضرت سعد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔
- اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ظاہراً و باطناً حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مومن ہونے کی شہادت دی تھی۔اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے موالات کا اثبات اور آپ کے لیے اہل ایمان کی محبت و موالات کا وجوب تھا۔اس میں ان نواصب کا رد ہے جو آپ کے کافر یا فاسق ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔اور اسلام سے خارج گروہ خوارج پر رد ہے؛ جو لوگوں میں سب سے بڑھ کر عبادت گزار تھے؛ جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

((تم ان کی نماز کے مقابلہ میں اپنی نماز اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزے؛ اور ان کی تلاوت قرآن کے مقابلہ میں اپنی تلاوت کو حقیر سمجھو گے۔وہ قرآن پڑھیں گے، جو ان کے گلوں سے نیچے نہ اترے گا۔دین سے وہ ایسے نکل جائے گی، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے؛ تم انہیں جہاں کہیں بھی پاؤ تو انہیں قتل کر ڈالو۔))[صحیح بخاری:ح ٥٢]

یہ خوارج حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر اور فاسق کہتے تھے؛ اور آپ کو قتل کرنا حلال اور مباح سمجھتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ ان خوارج میں سے ہی ایک شخص نے آپ کو قتل کر دیا تھا۔اس قاتل کا نام عبدالرحمن بن ملجم المرادی تھا۔یہ انسان لوگوں میں سب سے بڑا عبادت گزار تھا۔اہل سنت والجماعت کو خوارج و نواصب سے مناظرہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان اور دین داری کے اثبات کے لیے کہیں بہت زیادہ اور قوی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے؛ ایسے دلائل کی ضرورت شیعہ سے مناظرہ کرتے ہوئے پیش نہیں آتی۔اس لیے کہ خوارج بڑے سچے اور دیندار لوگ ہوتے ہیں۔اور ان کے ہاں جو شبہات پائے جاتے ہیں؛ وہ شیعہ کے شبہات کی نسبت زیادہ طاقتور ہیں۔یہ ایسے ہی ہے جیسے مسلمان جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جب یہود و نصاریٰ سے مناظرہ کریں؛ تو انہیں ان دلائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن سے یہودیوں کے اس دعویٰ پر رد کرسکیں کہ آپ ولد زنا یا جھوٹے ہیں-العیاذ باللہ-۔اور انہیں ان دلائل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن سے عیسائیوں پر رد کرسکیں جو حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کو رب اور معبود بنائے بیٹھے ہیں۔ یہودیوں سے مناظرہ کرنا عیسائیوں سے مناظرہ کرنے کی نسبت زیادہ مشکل کام ہے۔ ان کے ایسے شبہات ہیں جن کو رد کرنا نصاری کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ ان کا جواب مسلمان ہی دے سکتے ہیں۔ یہی حال نواصب کا ہے۔ ان کے ایسے شبہات ہیں جن کا جواب دینا شیعہ کا کام نہیں۔ بلکہ ان کا جواب اہل سنت ہی دے سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا احادیث صحیح ہیں' جو ظاہری و باطنی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایمان پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں نواصب پر رد ہے؛ اگر چہ ان دلائل کا شمار آپ کے خصائص میں نہیں ہوتا؛ یہ احادیث ویسے ہی ہیں جیسا کہ اہل بدر اور اہل بیعت رضوان کے ایمان پر دلالت کرنے والی نصوص ظاہر و باطن میں ان کے ایمان پر دلالت کرتی ہیں۔ اس میں اختلاف کرنے والے دونوں گروہوں خوارج اور روافض پر رد موجود ہے۔ اگر چہ ان میں سے کسی بھی روایت سے آپ کے خصائص پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ کسی معین شخص کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہادت دیں؛ یا اس کے لیے دعا کریں' تو بہت سارے لوگ چاہتے ہیں کہ اس کے لیے بھی ایسی ہی گواہی دی جاتی؛ یا پھر اس کے لیے بھی ایسی ہی دعا کی جاتی۔ اگر چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سارے لوگوں کے حق میں ایسی گواہی دی ہے' اور بہت سارے لوگوں کے لیے ایسی دعائیں بھی کی ہیں۔ مگر خاص طور پر کسی کے لیے ایسی دعا کرنا اس کے عظیم ترین فضائل و مناقب میں سے ہے۔ یہ ایسے ہی جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شماس بن قیس رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں کے لیے جنتی ہونے کی بشارت دی تھی۔ آپ نے ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی جنت کی بشارت دی ہے۔ اور جیسے کہ صحابی عبد اللہ الحمار رضی اللہ عنہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دی تھی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے؛ حالانکہ اسے شراب نوشی پر مار پڑ رہی تھی۔

اگر چہ آپ نے اس قسم کی گواہی ان لوگوں کے لیے بھی دی ہے جو اس صحابی سے افضل تھے۔ جیسا کہ آپ نے بنو عمرو بن تغلب کے بارے میں فرمایا کہ: انہیں نہ دینے کی وجہ ان کے دلوں میں بے نیازی اور خیر کی موجودگی ہے۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا:

((میں کسی کو دیتا ہوں اور کسی کو نہیں دیتا ہوں۔ اور جسے میں نہیں دیتا ہوں وہ میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، جسے میں دیتا ہوں۔ لیکن میں ان لوگوں کو دیتا ہوں، جن کے دلوں میں بے چینی اور گھبراہٹ دیکھتا ہوں۔ اور جنہیں میں نہیں دیتا ہوں ان لوگوں کو میں اس تونگری اور بھلائی کے حوالہ کر دیتا ہوں جو اللہ تعالی نے ان کے دلوں میں رکھی ہے۔ اور انہی میں عمرو بن تغلب بھی ہے۔))۔[صحیح بخاری:ح ۸۸۰]

حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے ایک شخص کا جنازہ پڑھتے ہوئے جب یہ دعا فرمائی:

((اللهم اغفر له وارحمه وعافِهِ واعف عنه وأكرِم نزله ووسع مدخله واغسِله بِالماءِ والثلجِ والبردِ؛ ونقِهِ مِن الخطايا كما ينقى الثوب البيض مِن الدنسِ وأبدِله دارا خيرا مِن دارِهِ وأهلا خيرا مِن أهلِهِ وقه من فتنة القبر عذابِ القبرِ و أفسح له في قبره ونوّر له فيه .))

'' یا اللہ اس کو بخش اور رحم کر اور اسے عافیت عطا فرما اور اسے معاف فرما اور اس کے اترنے کی جگہ کو کرم والی بنا دے اور اس کی قبر کو کشادہ فرما اور اسے پانی برف اور اولوں سے دھو دے اور اسکے گناہوں کو اس طرح صاف کر دے جیسا کہ سفید کپڑا میل کچیل سے صاف ہو جاتا ہے اور اسے اس کے گھر کے بدلے بہتر گھر عطا فرما؛ اور اسے قبر کے فتنہ سے

نجات دے؛ عذاب قبر سے بچا؛ اور اس کی قبر کو وسیع کر دے؛ اور اس کی قبر کو روشن کر دے۔''
تو عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہہ اٹھے: ''اے کاش! اس میت کی جگہ میں ہوتا۔[1] حالانکہ یہ دعا اس میت کے ساتھ مختص نہ تھی۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خصوصی اوصاف]

[**اشکال**]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''عامر بن واثلہ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر نے چھ صحابہ کو اپنے میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لیے مقرر کیا تو میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا؛ آپ نے ان کو مخاطب کر کے کہا: میں تمہارے سامنے ایسی دلیل پیش کروں گا، جس سے تمھارے کسی عربی یا عجمی کو مجال انکار نہ ہوگی۔ مندرجہ ذیل باتوں کا جواب دیجیے:

(۱) اے لوگو! میں تم سب کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، کیا تم میں سے کوئی شخص مجھ سے پہلے توحید کا قائل ہوا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔

(۲) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کا بھائی میرے بھائی جعفر طیار جیسا ہو' جو جنت میں ملائکہ کیساتھ رہ رہا ہے؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۳) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کا چچا میرے چچا حمزہ جیسا ہو' جو اللہ اور اس کے رسول کا شیر تھا؛ اور جو سید الشہداء ہوئے؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۴) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کی بیوی میری بیوی فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سیدۃ نساء اہل جنت کی طرح ہو؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۵) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے دو ایسے بیٹے ہوں جیسے میرے دو بیٹے جنت کے نوجوانوں کے سردار حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ہیں؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۶) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کرنے سے پہلے دس بار صدقہ کیا ہو؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۷) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو: ''من کنت مولاہ فعلي مولاہ؛ اللھم وال من والاہ و عاد من عاداہ۔'' جس کا میں مولی ہوں علی بھی اس کا مولی ہے۔ اے اللہ! جو اس سے دوستی رکھتے تو بھی اس سے دوستی رکھے اور جو کوئی اس سے دشمنی کرے تو تو بھی اس سے دشمنی رکھ۔'' اور حاضریں کو چاہیے کہ یہ بات غائبین تک پہنچا دیں۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۸) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہو: ''اے اللہ اپنی مخلوق میں اپنے اور میرے سب سے محبوب شخص کو لے آتا کہ وہ میرے ساتھ اس پرندے کا گوشت کھائے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہاں پہنچا دیا ہو؛ اور پھر اس نے آپ کے ساتھ وہ کھانا کھایا ہو؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الدعاء للمیت فی الصلاۃ (حدیث:۹۶۳)۔

(۹) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: ''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں ۔اور وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح نہ دیدے۔اور وہ شکست خوردہ واپس نہیں ہوگا؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۰) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے بنی وکیعہ سے کہا ہو: تم اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ؛ ورنہ میں تم پر ایسا آدمی بھیجوں گا جس کی ذات میری ذات کی طرح ہوگی۔اور اس کی اطاعت ایسے ہوگی جیسے میری اطاعت ۔اور جس کی نافرمانی ایسے ہوگی جیسے میری نافرمانی۔اور وہ تلوار کے ساتھ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۱) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: وہ انسان جھوٹ بولتا ہے جو خیال کرتا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے' مگر اس [یعنی خود حضرت علی رضی اللہ عنہ] سے بغض رکھتا ہو؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۲) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص موجود ہے جس پر بیک وقت تین ہزار فرشتوں، نیز جبرئیل و میکائیل اور اسرافیل نے سلام بھیجا ہو۔ یہ اس وقت ہوا جب میں کسی اور کے کنوئیں سے نبی کریم ﷺ کے پاس پانی لایا۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۳) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے لیے آسمان سے آواز لگائی گئی ہو: '' لا فتی إلا علی و لا سیف إلا ذو الفقار ''''نوجوان ہے تو صرف علی اور تلوار ہے تو صرف ذوالفقار؟ ۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۴) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے لیے جبریل نے یہ کلمات کہے ہوں؛ جب رسول اللہ ﷺ نے [میرے بارے میں]فرمایا: وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔'' تو جبریل امین نے کہا:'' میں تم دونوں میں سے ہوں''؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۵) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو:'' تم وعدہ توڑنے والوں؛ نافرمانوں اور دین سے نکل جانے والے لوگوں سے جنگ کرو گے؟ ۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۶) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: میں تنزیل قرآن پر جنگ کرتا ہوں' اور تم میری تفسیر کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر کرنے پر لوگوں سے جنگ کرو گے؟ ۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۷) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے لیے سورج کو واپس لوٹایا گیا ہو' حتی کہ اس نے وقت نکلنے کے باوجود عصر اس کے وقت پر پڑھی ہو؟ ۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۸) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے سورت برأت واپس

لی ہو؟ یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یارسول اللہ! میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''علی کے علاوہ میری طرف سے یہ سورت کوئی نہیں پہنچا سکتا؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۱۹) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: ''تم سے صرف مؤمن ہی محبت رکھے گا؛ اور تم سے صرف کافر اور منافق ہی بغض رکھے گا؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۰) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے تم سب کے دروازے بند کرنے اور میرا دروازہ کھلا رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اور تم لوگ پھر اس میں باتیں کرنے لگے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے نہ ہی تمہارے دروازے بند کیے ہیں اور نہ ہی اس کا دروازہ کھلا چھوڑا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دروازے بند کیے اور اس کا دروازہ کھلا چھوڑا ہے؟ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۱) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ طائف میں باقی لوگوں کو چھوڑ کر دیر تک مجھ سے سرگوشی کی۔ یہاں تک کہ تم لوگ کہنے لگے: ہمیں چھوڑ کر اس سے سرگوشیاں کررہا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صرف میں ہی اکیلا آپ سے سرگوشی نہیں کررہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی آپ سے سرگوشی کی ہے؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم! ہاں ہم جانتے ہیں۔

(۲۲) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم جانتے ہو کہ میرے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''حق علی کے ساتھ ہے؛ اور علی حق کے ساتھ ہے؛ اور علی کے زوال کے ساتھ حق کو بھی زوال ہوگا؟۔ کہنے لگے: ہاں اللہ کی قسم! ہم جانتے ہیں۔

(۲۳) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم جانتے ہو کہ نبی کریم ﷺ نے میرے بارے میں ارشاد فرمایا ہے: ''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں؛ وہ کتاب اللہ اور میرے اہل بیت کی عترت: یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر وارد ہو جائیں''؟۔ کہنے لگے: ہاں! ہم جانتے ہیں۔

(۲۴) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس نے اپنی جان نثار کرکے رسول اللہ ﷺ کو مشرکین سے بچایا ہو؟ اور آپ کی جگہ پر لیٹ گیا ہو؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۵) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جو عمر بن عبدود عامری کے مقابلہ کے لیے نکلا ہو جب اس نے مبارزت طلب کی تھی؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۶) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے متعلق آیت تطہیر نازل ہوئی ہو؟ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ ''اے اہل بیت نبی اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کرکے اچھی طرح پاک صاف بنا دے۔'' کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۷) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: ''تم مؤمنین کے سردار ہو؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

(۲۸) میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! کیا تم میں میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو: ''میں نے کبھی بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز نہیں مانگی' مگر وہی چیز تمہارے لیے بھی مانگی ہے؟۔ کہنے لگے: اللہ کی قسم نہیں۔

ابوعمر زاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا حضرت علی رضی اللہ عنہ میں چار اوصاف پائے جاتے ہیں جو کسی اور میں موجود نہیں:

۱۔ علی رضی اللہ عنہ اوّلین شخص ہیں جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی۔

۲۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم بردار تھے۔

۳۔ علی رضی اللہ عنہ وہ شخص ہے جس نے غزوۂ حنین میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبر کیا[اور ثابت قدم رہے]۔

۴۔ علی رضی اللہ عنہ وہ شخص ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دیا اور قبر میں اتارا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''شب معراج میرا گزر ایسی قوم پر ہوا جن کے جبڑے چھیلے جا رہے تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس نے کہا: ''یہ لوگوں کی غیبت کرنے والے افراد ہیں''۔ پھر میں ایسے لوگوں کے نزدیک سے گزرا جو چلا رہے تھے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا یہ کون ہیں؟ اس نے کہا '' یہ کافر ہیں'' پھر ہم دوسری راہ پر چل دیے۔ جب چوتھے آسمان پر پہنچے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے دیکھا۔ میں نے جبرئیل سے دریافت کیا یہ کون ہے؟ کیا علی رضی اللہ عنہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گئے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ علی رضی اللہ عنہ نہیں ہے۔ میں نے کہا: تو پھر یہ کون ہے؟ بات یہ تھی کہ ملائکہ مقربین اور دوسرے ملائکہ نے جب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل اور خصوصیات سنیں؛ نیز ان کے متعلق آپ کی یہ حدیث سنی: ''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسیٰ إلا أنه لا نبي بعدي ''اس وقت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھنے کے مشتاق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہم شکل فرشتہ پیدا کر دیا۔اب جب کبھی انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو وہ اس جگہ پر آجاتے ہیں' گویا کہ وہ علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیتے ہیں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا تھا:

'' میں خود نوجوان، نوجوان کا بیٹا اور نوجوان (حضرت علی) کا بھائی ہوں۔''میں نوجوان ہوں یعنی عرب کے نوجوان بہادروں میں سے ہوں۔اور نوجوان کا بیٹا ہوں' اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ﴾ [الأنبياء ٦٠]

''بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا تھا جسے ابراہیم علیہ السلام کہا جاتا ہے۔''

اور نوجوان کے بھائی سے مراد علی رضی اللہ عنہ ہیں۔یہی جبریل کے قول سے مراد ہے۔حضرت جبریل جنگ بدر کے دن خوش و خرم آسمان کی جانب چڑھے اور وہ کہہ رہے تھے:''لَا سَيْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَارِ وَ لَا فَتٰى اِلَّا عَلِيٌّ۔''

(تلوار ہے تو ذوالفقار اور نوجوان ہے تو علی)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:''میں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو کعبہ کے پردوں سے لٹکتے دیکھا وہ کہہ رہے تھے:'' جو مجھے پہچاننا چاہتا ہو، وہ پہچان لے، میں ابوذر ہوں۔ اگر تم نماز وروزہ کی پابندی کرتے کرتے سوکھ جاؤ اور کانٹے کی طرح ہو جاؤ تو تمھیں اس وقت تک اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا، جب تک علی رضی اللہ عنہ سے محبت نہ کرو۔''

(شیعہ مصنف کے دلائل ختم ہوئے)

[جواب]: شیعہ کے دلائل پر تنقید و تبصرہ:

شیعہ کے پیش کردہ دلائل کا جواب یہ ہے کہ:

(۱) شوریٰ کے دن عامر بن واثلہ کا جو ذکر مصنف نے کیا ہے؛ یہ روایت باتفاق محدثین کذب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے دن ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی؛ اور نہ ہی اس کے مشابہ کوئی بات کہی۔ بلکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''اگر میں آپ کو امیر مقرر کردوں تو کیا آپ انصاف کریں گے؟'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں'' عبدالرحمٰن نے پھر کہا: ''اگر میں عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کرلوں تو کیا آپ ان کی اطاعت کریں گے۔؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی یونہی کہا۔ پھر تین دن تک مسلمانوں سے مشورہ کرتے رہے۔ [1]

صحیحین میں ہے- یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں- حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے' وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان کے دفن کیے جانے کے بعد وہ لوگ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں خلافت کے مستحق تھے جمع ہوئے، حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس معاملہ کو صرف تین شخصوں پر چھوڑ دو۔ جس پر زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ:

میں نے اپنا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں نے اپنا حق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا۔ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے اپنا حق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دیدیا۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تم دونوں میں سے جو شخص اس سے برات کا اظہار کرے گا ہم خلافت اسی کے سپرد کریں گے اور اس پر اللہ اور اسلام کے حقوق کی نگہداشت لازم ہوگی ہر ایک کو غور کرنا چاہیے کہ اس کے خیال میں کون شخص افضل ہے اسی کو خلیفہ کردے۔ اس پر شیخین یعنی عثمان و علی رضی اللہ عنہما نے سکوت اختیار کیا۔

جب یہ حضرات چپ رہے تو عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا کیا تم دونوں خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ میرے حوالے کرتے ہو؟ بخدا مجھ پر لازم ہے کہ میں تم سے افضل کے ساتھ کوتاہی نہ کروں۔ دونوں نے کہا یہ مسئلہ آپ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے دونوں میں سے ایک یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت اور اسلام میں قدامت حاصل ہے، جو تم کو معلوم ہے خدا کے واسطے تم پر لازم ہے اگر میں تمہیں خلیفہ بنادوں تو تم عدل و انصاف کرنا۔ اور اگر میں عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنادوں تو اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا۔ اور ان سے بھی ایسا ہی کہا چنانچہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عہد لیا پھر کہا: اے عثمان رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ؛ پھر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اور ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے ان سے بیعت کی؛ پھر مدینہ والوں نے حاضر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔'' [صحیح بخاری:ح ۹۱٤]

مسور بن مخرمہ سے روایت ہے: وہ لوگ جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا اختیار دیا تھا جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ ان لوگوں سے عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تم سے اس معاملہ میں جھگڑنے والا نہیں ہوں لیکن اگر تم چاہو تو تم ہی میں سے کسی کو تمہارے لئے منتخب کردوں۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ معاملہ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ پر چھوڑ دیا۔

''لوگ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے پیچھے ہوئے؛ یہاں تک کہ ان بقیہ لوگوں میں سے کسی کے پاس ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ لوگوں سے ان راتوں میں مشورہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ رات آئی جس کی صبح میں ہم لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

مسور کا بیان ہے کہ تھوڑی رات گزر جانے کے بعد عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے میرا دروازہ اس زور سے کھٹکھٹایا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے کہا کہ: میں تمہیں سوتا ہوا دیکھتا ہوں حالانکہ اللہ کی قسم! ان راتوں میں میری آنکھ بھی نہیں لگی۔ تم چلو اور زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ کو میرے پاس بلاؤ۔ میں ان دونوں کو بلا لایا۔ ان سے آپ نے مشورہ کیا۔ پھر مجھے بھی بلا لیا۔ پھر مجھ سے کہا: جاؤ اور علی رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ۔ میں ان کو بلا لایا۔ ان سے بہت رات گئے تک سرگوشی کرتے رہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھے تو ان کے دل میں خلافت کی خواہش تھی۔ اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ان کی خلافت سے اختلاف امت کا اندیشہ تھا۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ۔ میں ان کو بھی بلا لایا۔ تو ان سے سرگوشی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح کی اذان نے ان کو جدا کیا۔ جب لوگوں نے صبح کی نماز پڑھی؛ تو یہ لوگ منبر کے پاس جمع ہوئے۔ مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ موجود تھے؛ ان کو بلا بھیجا۔ اور سرداران لشکر کو بلا بھیجا۔ یہ سب لوگ اس سال حج میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ شریک ہوئے تھے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا پھر کہا کہ:

اما بعد! اے علی رضی اللہ عنہ! میں نے لوگوں کی حالت پر نظر کی ہے تو دیکھا کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ہیں۔ اس لئے تم اپنے دل میں میری طرف سے کچھ خیال نہ کرنا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے) کہا: ''میں اللہ اور اس کے رسول اور آپ کے دونوں خلفاء کی سنت پر تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی اور تمام لوگوں نے مہاجرین و انصار، سرداران لشکر اور مسلمانوں نے بیعت کی۔'' [صحیح بخاری:2086۔]

اس رافضی نے جو روایت ذکر کی ہے' اس میں اتنے جھوٹ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پاک و مبرا رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے بھائی' اپنے چچا اور بیوی کو بطور حجت کے پیش کرنا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے افضل ہیں۔ اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہوگا جو سب سے زیادہ تقوی والا ہوگا۔

اس کے بجائے اگر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے: کیا تم میں میرے بھائی حمزہ جیسا کوئی ہے؛ اور کیا تم میں میرے بھتیجوں محمد علی اور جعفر جیسا کوئی ہے؟ تو یہ دلیل بھی بالکل ویسے ہی ہوتی۔ بلکہ کسی انسان کا اپنے بھتیجوں کو بطور حجت پیش کرنا اس کے چچاؤں کو بطور حجت پیش کرنے سے زیادہ بہتر اور اہم ہوتا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ کہتے کہ: کیا تم میں کوئی اور ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیوں سے شادی کی ہو؟ تو یہ حجت بھی اسی حجت کی طرح ہوتی کہ: تم میں سے کسی کی بیوی میری بیوی کی طرح ہے؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بھی شوری سے پہلے ہی ہو چکا تھا جیسے حضرت عثمان کی بیویوں رقیہ اور ام کلثوم کا انتقال شوری سے پہلے ہو گیا تھا۔ البتہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا تھا۔

یہی حال اس دعوی کا ہے: ''کیا تم میں کسی کے بیٹے میرے بیٹوں جیسے ہیں۔'' اس میں متعدد روایات ہیں۔ اور جیسا کہ یہ قول: میں نے اللہ تعالیٰ سے کبھی کوئی چیز نہیں مانگی مگر اس جیسی چیز تمہارے لیے بھی مانگی ہے۔ اور یہی حال اس روایت کا بھی

ہے کہ میرے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی یہ سورت پہنچا سکتے ہیں۔'' یہ ایک کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

علامہ خطابی نے اپنی کتاب ''شعار الدین'' میں لکھا ہے: ''آپ کی طرف منسوب یہ فرمان: میری طرف سے یہ سورت میرے اہل بیت میں سے ہی کوئی ایک پہنچا سکتا ہے۔'' یہ ایک ایسی چیز ہے جسے اہل کوفہ نے زید بن یثیع سے لیا ہے۔ اس راوی پر رافضی ہونے کی تہمت ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر جو قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں تک پہنچا ہے وہ اہل بیت کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ آپ انصار کو قرآن کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور انہیں دین کے مسائل سمجھاتے۔ آپ نے حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین میں بھیجا؛ آپ بھی وہاں یہی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا۔ عتاب بن اسید اموی رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ پر گورنر بنایا۔ تو پھر یہ قول کہاں گیا کہ: میری طرف سے یہ پیغام میرے اہل بیت میں سے ہی کوئی پہنچا سکتا ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی باطل ہے؛ اس میں کئی ایک جھوٹ ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ ہر جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہوا کرتا تھا۔'' اس لیے کہ غزوۂ احد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم بردار بالاتفاق مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے۔ [1] اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔ اور فتح مکہ کے دن علم رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زبیر [2] رضی اللہ عنہ کے پاس تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا کہ حجون میں جا کر جھنڈا گاڑ دیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا: کیا آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ پر جھنڈا گاڑنے کا حکم دیا تھا۔'' یہ روایت صحیح بخاری میں موجود ہے۔

ایسے ہی رافضی مصنف کا دعوی کہ: ''غزوہ حنین کے موقع پر آپ ہی ثابت قدم رہے۔''

یہ بات بھی جانتے ہیں کہ غزوہ حنین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کی خچر کی لگام تھامے ہوئے تھے؛ جبکہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سواری کی رکاب پکڑی ہوئی تھی۔ [3]

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: اصحاب سمرہ کو آواز دو۔ آپ فرماتے ہیں: میں نے اونچی آواز میں چیخ کر پکارا: اے اصحاب سمرہ تم کہاں ہو؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم جس وقت انہوں نے یہ آواز سنی تو وہ اس طرح پلٹے جس طرح کہ گائے اپنے بچوں کی طرف پلٹتی ہے۔ وہ لوگ یا لبیک یا لبیک کہتے ہوئے آئے اور انہوں نے کافروں سے جنگ شروع کر دی۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

" أنا نبی لا كذب أنا ابن عبد المطلب ۔" [4]

''میں اللہ کا سچا نبی ہوں' اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خچر سے اتر کر چند کنکریاں اٹھائیں اور انہیں کافروں کے چہروں کی طرف پھینکا پھر فرمایا: ''محمد کے رب کی قسم یہ شکست کھا گئے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ''میں دیکھ رہا تھا کہ جنگ بڑی تیزی کے

[1] البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٠٠)

[2] سيرة ابن هشام(ص:٣٧٩، ٣٨٣)، طبقات ابن سعد(٣/ ٨٦)

[3] صحيح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الراية يوم الفتح، (حديث:٤٢٨٠)مطولاً

[4] البخاری، کتاب الجهاد، باب من قاد دابة غيره فی الحرب (ح ٢٨٦٤)مسلم۔باب غزوة حنين، (ح:١٧٧٥)

ساتھ جاری تھی کہ اچانک آپ ﷺ نے کنکریاں پھینکیں۔ اللہ کی قسم میں نے دیکھا کہ ان کا زور ٹوٹ گیا اور وہ پشت پھیر کر بھاگنے لگے؛ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شکست دے دی۔''

صحیحین کی روایت میں ہے؛ اور یہ الفاظ بخاری شریف کے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''حنین کے موقع پر میں اور ابوسفیان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چپکے رہے' آپ سے علیحدہ نہیں ہوئے۔'' [۱۲۱/۵]

جب کہ آپ کو غسل دینے اور قبر شریف میں اتارنے میں اہل بیت نے شرکت کی تھی۔ جیسا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد۔ آپ کے غلام شقران اور بعض انصار نے بھی شرکت کی تھی۔ مگر غسل خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا۔ اس موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی عزت و احترام کی وجہ سے آپ کی اولاد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ براہ راست یہ خدمات انجام دے رہے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے زیادہ مستحق تھے۔

ایسے ہی رافضی کا دعوی کہ: آپ عرب و عجم میں پہلے انسان ہیں جنہوں نے نماز پڑھی۔ یہ روایت حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی معروف حدیث کے متناقض ہے۔

فصل:

[واقعہ معراج کی من گھڑت حکایت]

[اشکال]: معراج سے متعلق شیعہ کی ذکر کردہ روایت میں مذکور ہے کہ ملائکہ مقربین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب سنے؛ اور یہ حدیث سنی: " اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ ' تو ملائکہ نے اشتیاق ملاقات کا اظہار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہم شکل فرشتہ پیدا کر دیا۔

جواب: یہ ایسے جہال اور کذابین کا کلام ہے جو اچھی طرح جھوٹ بولنا بھی نہیں جانتے۔ بیشک معراج کا واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا؛ اس پر تمام لوگوں کا اجماع ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ [الإسراء ۱]

''پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصی تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ تعالی خوب سننے دیکھنے والا ہے۔''

[یہ اسراء کا واقعہ تھا] اسراء کا واقعہ مسجد الحرام میں سے پیش آیا تھا۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ٭مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ٭وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ٭ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴾ ....إلی قوله تعالیٰ....:﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ٭وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ٭عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی﴾ ....إلی قوله تعالیٰ....:﴿اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی﴾ [النجم آیات متفرقات]۔

(۱)......''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! کہ تمھارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے۔ اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔''

(۲)......''پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے۔ حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے

ہوئے بھی دیکھا ہے۔آخری حد کی بیری کے پاس۔''

(۳)......''پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔'' بالاتفاق یہ تمام آیات مبارکہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔

اور ایسے ہی یہ حدیث: ''کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔''

یہ کلمات آپ نے غزوہ تبوک کے موقع پر کہے تھے۔یہ سن نو ہجری کی بات ہے۔تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ: معراج کی رات فرشتوں نے یہ کلمات سن رکھے تھے کہ آپ نے فرمایا:''کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔''

پھر یہ بات بھی معلوم ہے کہ مدینہ طیبہ میں نائب بنایا جانا ایک مشترکہ قدر ہے۔جب کبھی بھی غزوہ تبوک سے پہلے مدینہ میں کسی کو نائب بنایا گیا تو اس وقت مدینہ میں اطاعت گزار اہل ایمان موجود ہوا کرتے تھے۔جن پر کسی کو نائب بنایا جاتا تھا۔ جب کہ غزوہ تبوک کے موقع پر کوئی بھی نیک وکار مؤمن پیچھے نہیں رہا۔سوائے ان لوگوں کے جن کا عذر اللہ تعالیٰ نے قبول کیا ہو'یا پھر جو جہاد کرنے سے عاجز ہوں۔پس غزوہ تبوک میں پیچھے رہنے والے باقی تمام اسفار غزوات اور حج وعمرہ میں پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت تعداد میں بہت کم اور کمزور تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر کے تقریباً تیس سفر کیے ہیں۔ان میں کسی نہ کسی کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا کرتے تھے۔

۱۔ غزوہ ابواء میں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۲۔ غزوہ بواط میں سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا۔

۳۔ جب کرز بن جابر الفہری کی تلاش میں نکلے تو مدینہ پر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔

۴۔ غزوہ عشیرہ میں ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بن عبد الاشہل کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

۵۔ قرقرۃ الکدر کے لیے مدینہ سے باہر نکلے تو عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔

۶۔ غزوۂ ذات الرقاع اور غزوہ غطفان کے لیے جاتے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاکمِ مدینہ قرار پائے۔

۷۔ غزوۂ بدر؛ غزوہ بنی قینقاع اور غزوہ سویق کے لیے تشریف لے گئے تو ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو حاکم مدینہ مقرر کیا۔

۸۔ غزوہ بدر الموعد میں آپ نے ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ پر عامل مقرر فرمایا۔

۹۔ غزوہ المریسیع میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

۱۰۔ دومۃ الجندل کے موقع پر سباع بن عرفطہ الغفاری کو عامل مقرر فرمایا۔

غزوہ تبوک سے پہلے جتنے بھی لوگوں کو نائب بنایا گیا؛ ان کی نیابت غزوہ تبوک پر نائب بنائے جانے سے زیادہ کامل و اکمل تھی۔اگر یہ تشبیہ اصل استخلاف میں ہے تو یہ تمام لوگ وہی نسبت رکھتے تھے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

اگر یہ کہا جائے کہ تبوک میں دور کا سفر تھا۔''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: لیکن اس موقع پر مدینہ طیبہ اور اس کے گردونواح میں امن و امان تھا۔کوئی ایسا دشمن باقی نہیں رہا تھا جس کا خوف ہو۔اس لیے کہ یہ تمام لوگ اسلام لا چکے تھے۔اور جو مسلمان نہیں تھے وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ جب کہ تبوک کے علاوہ دوسرے غزوات میں مدینہ کے گردونواح میں دشمنان موجود ہوا کرتے تھے جن کا خوف رہتا تھا۔اس

وقت نائب کو مزید محنتوں وکوششوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ جب کہ تبوک کے موقع پر ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔

فصل:

[روایت: لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی]

[**شبہ**]: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا تھا:

''میں خود نوجوان، نوجوان کا بیٹا اور نوجوان (حضرت علی) کا بھائی ہوں۔'' میں نوجوان ہوں یعنی عرب کے نوجوان بہادروں میں سے ہوں۔ اور نوجوان کا بیٹا ہوں' اس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰھِیْمُ﴾ [الأنبياء ٦٠]

''بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا تھا جسے ابراہیم علیہ السلام کہا جاتا ہے۔''

اور نوجوان کے بھائی سے مراد علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہی جبریل کے قول سے مراد ہے۔ حضرت جبریل جنگ بدر کے دن خوش و خرم آسمان کی جانب چڑھے اور وہ کہہ رہے تھے: ''لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفَقَارِ وَ لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ۔''

(تلوار ہے تو ذوالفقار اور نوجوان ہے تو علی)۔ [انتہی کلام الرافضی]

[**جواب**]: سابقہ روایات کی طرح یہ روایت بھی کذب اور من گھڑت ہے۔ اس روایت کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ اس کی سند کے علاوہ بھی کئی ایک وجوہات کی بنا پر اس کا جھوٹ ہونا معلوم ہوتا ہے:

(۱) ''اَلْفَتٰی'' کا لفظ کتاب و سنت اور لغت عرب میں اسماء مدح و ذم میں سے نہیں۔ بلکہ ''اَلشَّاب'' (جوان) اور ''اَلْکَھْل'' (ادھیڑ عمر کا) کی طرح مطلق اسم ہے۔ مشرکین کا قول ﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُھُمْ یُقَالُ لَہٗ اِبْرٰھِیْمُ﴾ یہ جملہ کہنے والے کافر تھے؛ اور ان کا مقصد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مدح کرنا نہیں تھا۔ فتی چڑھتے ہوئے نوجوان کو کہا جاتا ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بلند و بالا ہیں کہ اپنے دادا یا چچا زاد پر فخر کا اظہار کریں۔

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی نہیں بنایا تھا۔ یہ حدیث کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی بنایا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو، صریح کذب ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔ مہاجرین کا باہم ایسا کوئی رشتہ بھائی چارگی قائم نہیں ہوا۔

(۴) بدر کے موقع پر اس قسم کی کوئی آواز نہیں سنی گئی' اور نہ ہی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا۔

(۵) ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار نہیں تھی؛ بلکہ یہ ابوجہل کی تلوار کا نام ہے۔ غزوۂ بدر میں یہ تلوار مال غنیمت میں مسلمانوں کو ملی تھی۔ بدر کے موقع پر ذوالفقار مسلمانوں کی تلوار نہیں تھی۔ بلکہ اس وقت یہ تلوار کفار کے پاس تھی۔ امام احمد و ترمذی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالفقار نامی تلوار غزوۂ بدر میں انعام کے طور پر دے دی تھی۔[1]

(۶): نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''اَنَا فَتٰی'' کہنے کی روایت بھی جھوٹ ہے، کیوں کہ جب آپ نبوت پر سرفراز ہوئے تو اس وقت نوجوان نہ تھے، بلکہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے۔

---

[1] سنن ترمذی، کتاب السیر ۔باب فی النفل، (ح:١٥٦١)، سنن ابن ماجه(٢٨٠٨)، مسند احمد(١/ ٢٧١)۔

فصل:

[روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا قول جو کہ رافضی نے روایت کیا ہے' یہ بھی صحیح نہیں ۔ یہ روایت موقوف ہے' مرفوع نہیں ۔ اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے ساتھ ہی ابوذر رضی اللہ عنہ سے اس قول کے نقل کرنے والے بھی تحقیق کے محتاج ہیں ۔

مزید براں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کا واجب ہونا آپ کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ بلکہ ہم پر واجب ہوتا ہے کہ آپ سے ایسے ہی محبت کریں جیسے مہاجرین و انصار اور حضرت ابی بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت کرتے ہیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''حبّ انصار علامت ایمان ہے ۔ اور بغض انصار نفاق کی علامت ہے ۔'' ❶

صحیح مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُمّی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد کیا کہ:

''مجھ سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہوگا اور مجھ سے وہی شخص عداوت رکھے گا جو منافق ہوگا ۔'' ❷

فصل:

[محبت علی رضی اللہ عنہ اور گناہ کی چھوٹ]

- شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ان دلائل میں سے ایک دلیل صاحب الفردوس کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ذکر کردہ یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت ایک ایسی نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے برائی سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنا ایک ایسا جرم ہے جس کی موجودگی میں نیکی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔''
- ہم کہتے ہیں: ''مسند الفردوس'' نامی اس کتاب میں موضوعات کی بھرمار ہے ۔ اس کا مصنف شیرویہ بن شہریار دیلمی محدث ہے ۔ اگرچہ وہ بھی دین کے سچے طلبگاروں میں سے تھا ۔ لیکن اس نے جو احادیث جمع کیں' ان کی اسانید حذف کردیں؛ اور صحیح وضعیف اور موضوع روایت کو پرکھے بغیر جمع کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں بہت زیادہ موضوع روایات پائی جاتی ہیں ۔
- یہ حدیث بھی انہی میں سے ایک ہے جن کے بارے میں کوئی بھی مؤمن گواہی دے سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات ہرگز ارشاد نہیں فرما سکتے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کی نسبت بہت بڑی اور عظیم الشان چیز ہے ۔ مگر اس کے باوجود یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ مومن کو برائیوں سے نقصان پہنچتا ہے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن الحمار نامی ایک شخص پر شراب کی حد قائم کرنے کا حکم دیا تھا ۔ ایک شخص نے اسے گالی دی ۔ تو آپ نے فرمایا: ''اسے چھوڑیے کیونکہ یہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے ۔'' ❸

ہر مؤمن مرد اور عورت لازمی طور پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں' مگر اس کے باوجود برائیاں انہیں نقصان دیتی ہیں ۔ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے' اور شریعت محمدی میں یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہے کہ اگر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو یہ شرک اس کیلئے نقصان دہ ہوگا: اور اللہ تعالیٰ مشرک کی مغفرت نہیں کرے گا' بھلے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت ہی کیوں نہ کرتا ہو ۔

---

❶ البخاری ۱/ ۹۔ مسلم ۱/ ۸۵۔ ❷ مسلم ۱/ ۸۶۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر، (حدیث: ۶۷۸۰)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے والد ابوطالب اپنے بیٹے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے تھے، اس کے باوصف انھیں شرک سے نقصان پہنچا اور وہ جہنمی قرار پائے۔ اسی طرح غالی شیعہ بھی حب علی رضی اللہ عنہ کے دعوی دار ہیں، وہ بھی اصل میں جہنمی ہیں۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر فاطمہ بھی چوری کا ارتکاب کرتیں تو میں ان کا ہاتھ کاٹ ڈالتا۔''[1]

یہ بات دین میں یقینی طور پر سبھی جانتے ہیں کہ اگر کوئی مرد چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ اگر چہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت بھی کیوں نہ کرتا ہو۔ ایسے ہی اگر زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ اگر چہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت بھی کیوں نہ کرتا ہو۔ ایسے ہی اگر کوئی کسی کو قتل کردے تو اسے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اگر چہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت بھی کیوں نہ کرتا ہو۔ ایسے ہی اگر کوئی انسان نماز پڑھنا اور زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دے تو اسے اس کا نقصان ہوگا بھلے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی محبت دعویدار کیوں نہ ہوں۔ [حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت سے عظیم تر ہے، اس کے باوجود آپ کی محبت کا دعوی کرنے والے دوزخ میں جائیں گے اور آپ کی شفاعت کی بنا پر جہنم سے نکلیں گے]۔ تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کے ساتھ کوئی برائی نقصان کیسے نہیں دے سکتی؟

پھر یہ بات بھی معلوم ہے کہ اگر آپ کی محبت کا دعوی کرنے والے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا' اور آپ کے ساتھ مل کر دوسرے لوگوں سے جنگیں کی تھی۔ وہ دوسرے لوگوں کی نسبت اپنے دعوی میں بہت بڑھ چڑھ کر تھے؛ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر بھی ان کی مذمت کیا کرتے اور ان پر عیب جوئی کیا کرتے تھے؛ ان پر طعن کرتے اور جو کچھ ان لوگوں نے آپ کے ساتھ کیا تھا اس سے برأت کا اظہار فرماتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے کہ ان کے بدلے میں انہیں انتہائی برا حکمران دیدے اور ان برے ساتھیوں کے بدلے میں انہیں انتہائی اچھے ساتھی عطاء فرمادے۔ اور اگر ان شیعہ کا کوئی اور گناہ نہ بھی ہوتا تو صرف جنگوں میں جو ان لوگوں نے حضرت کو ذلیل کیا' اور آپ کے احکام کی نافرمانی کی [یہی رسوائی ان لوگوں کے لیے کافی تھی]۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے زمانے کے بہترین شیعہ تھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ واضح فرماتے ہیں کہ: ''ان لوگوں کے گناہ انہیں نقصان پہنچا رہے ہیں''؛ تو پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو شر و فساد میں اس دور کے شیعہ سے دو ہاتھ آگے ہیں۔

خلاصہ کلام! ایسی بات کہنا کفر ہے۔ یہ کہنے والے سے توبہ کروانی چاہیے۔ اور اللہ اور اس کے رسول پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایسی بے ڈھنگ بات کہے۔

ایسے ہی رافضی مصنف کا قول: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنا وہ برائی ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی کام نہیں آتی۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ: اگر آپ سے بغض رکھنے والا کافر ہے تو پھر یقیناً وہ اپنے کفر کی وجہ سے انتہائی بد بخت ہے۔ اور اگر مؤمن ہے تو اسے اس کے ایمان سے فائدہ ضرور پہنچے گا بھلے وہ آپ سے بغض رکھنے کی غلطی کر رہا ہو۔

❀❀❀❀

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب اقامة الحدود علی الشریف والوضیع (حدیث: ٦٧٨٧، ٦٧٨٨)، صحیح مسلم، کتاب الحدود۔ باب قطع السارق الشریف وغیرہ، (حدیث:١٦٨٨)۔

[محبت اہل بیت اور سال کی عبادت ......]:

رافضی مصنف کی ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کردہ روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''آل محمد سے ایک دن محبت کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور جس کا انتقال اس محبت پر ہو گیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

یہ روایت بھی موضوع ہے۔

اسی طرح یہ روایت: ''میں اور علی اللہ کی مخلوق پر حجت ہیں۔'' کھلا ہوا کذب ہے۔ اہل علم پر ان دونوں روایات کا جھوٹ ہونا صاف واضح ہے۔ ایک سال کی عبادت میں ایمان؛ روزانہ کی پانچ نمازیں' ماہ رمضان کے روزے ہیں۔ تمام مسلمانوں کا اجماع ہے کہ آل محمد ﷺ سے ایک ماہ کی محبت ان اعمال کے قائم مقام نہیں ہوسکتی تھی؛ تو پھر ایک دن کی محبت کیسے اس کے بدلے میں کافی ہوسکتی ہے؟

ایسے ہی بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت صرف اس کے رسولوں کے ذریعہ قائم ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء:۱۶۵)

شیعہ مصنف کا یہ قول کہ ''اگر سب لوگ حب علی پر جمع ہو جاتے تو جہنم کو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد ائمہ اور اصیاء وغیرہ بھی حجت ہوسکتے ہیں۔

[محبت علی رضی اللہ عنہ کا دعوی اور ایک اور جھوٹی روایت]:

[شبہ]: ایسے ہی شیعہ مصنف کا دعوی ہے کہ: ''اگر تمام لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت پر جمع ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ جہنم کو پیدا ہی نہ کرتے۔''

[جواب]: یہ کذب صریح ہے۔ اس کے جھوٹ ہونے پر تمام اہل علم و ایمان کا اتفاق ہے۔ اس لیے کہ اگر سارے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرنے پر جمع ہو جائیں تو انہیں اس کا کوئی فائدہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے فرشتوں پر؛ اس کی کتابوں پر؛ اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہ لائیں اور نیک اعمال نہ کریں۔ جب وہ ایسا کرلیں تو جنت میں داخل ہو جائیں گے بھلے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی معرفت ہی نہ ہو۔ اور ان کے دل میں حب علی یا بغض علی رضی اللہ عنہ کا خیال تک بھی نہ آئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾

''سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی۔'' (البقرۃ ۱۱۲)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓىِٕكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا﴾ [النساء ۶۹]

''اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے

انعام کیا، جیسے انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک لوگ، یہ بہترین ساتھی ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ☆الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ☆ وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ☆اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ﴾ [آل عمران ۱۳۳۔۱۳۶]۔

''اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو لوگ آسانی میں اور سختی کے موقع پر اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ غصہ پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے؛ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فورا اللہ کا ذکر کرتے اور اپنے گناہوں کے لئے استغفار کرتے ہیں فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟ اور وہ لوگ باوجود علم کے کسی برے کام پر اڑ نہیں جاتے۔ انہیں کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے ان نیک کاموں کے کرنے والوں کا ثواب کیا ہی اچھا ہے۔''

یہ جو لوگ جنت میں جائیں گے' ان کے لیے کہیں پر بھی حب علی رضی اللہ عنہ کی شرط کا ذکر نہیں کیا گیا۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ☆اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا☆وَاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ☆اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ☆الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ [المعارج ۱۹۔۲۲]

''بیشک انسان بڑے کچے دل والا بنایا گیا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو ہڑ بڑا اٹھتا ہے۔ اور جب راحت ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ نمازی۔ جو اپنی نمازوں پر ہمیشگی کرنے والے ہیں۔''

[یہاں سے آگے تک اللہ تعالیٰ نے کئی نیک اعمال ذکر کیے ان کے آخر میں جا کر فرمایا]:

﴿اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّکْرَمُوْنَ ﴾ [المعارج ۳۵]

''یہی لوگ جنتوں میں عزت والے ہوں گے۔''

نبی کریم ﷺ کے پاس کئی وفود آئے؛ وہ آپ پر ایمان لائے؛ اور آپ ﷺ پر ایسے لوگ بھی ایمان لائے جو آپ کو دیکھ نہیں سکے۔ اور نہ ہی انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام سنا؛ نہ ہی آپ کو جانتے تھے؛ اس کے باوجود وہ مؤمنین اور متقی ہیں۔ اور جنت کے مستحق ہیں۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ شیعہ رافضہ؛ نصیریہ اور اسماعیلیہ کا محبّ علی رضی اللہ عنہ ہونے کے دعوی پر اجماع ہے۔ مگر اس کے باوصف ان کی اکثریت جہنم کا ایندھن ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں۔[اور ہم علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھنے کے

باوجود دوزخ سے ڈرتے ہیں ۔ علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے والے بہت سے لوگ جنت میں جائیں گے، حالانکہ وہ علی رضی اللہ عنہ کے نام سے بھی آشنا نہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیعہ کا ذکر کردہ ضابطہ بے بنیاد ہے]۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اللہ تعالیٰ کا عہد]

[شبہ]: ایسے ہی شیعہ مصنف کی ذکر کردہ یہ حدیث '' کہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عہد کیا تھا، نیز یہ کہ علی عَلَمَ الھُدٰی و امام الاولیاء ہیں؛ نیز وہ کلمہ ہیں جو متقیوں کے لیے ضروری ہے۔''

[جواب]: یہ روایت صاف جھوٹ ہے ۔ اس کے موضوع ہونے پر تمام اہل علم اور محدثین کا اتفاق ہے ۔ صرف صاحب '' حلیۃ الاولیاء '' کے کسی روایت کو نقل کر لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ روایت صحیح بھی ہو' یا پھر اس سے استدلال کرنا جائز ہے ۔ س کتاب کے مصنف نے خلفاء اربعہ [حضرت ابو بکر و عمر و عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اجمعین] کی فضیلت میں بھی ضعیف ہی نہیں بلکہ موضوع روایات تک ذکر کی ہیں ۔ [1] اس پر تمام علماء کرام کا اتفاق ہے ۔ ابو نعیم اور ان کے امثال خود ثقہ علماء اور محدثین میں سے ہیں ۔ محدثین کرام جو کچھ اپنے مشائخ سے ذکر کرتے ہیں وہ اس روایت کے نقل کرنے میں ثقہ ہوتے ہیں ۔ مگر موضوع ہونے کی یہ آفت اوپر سے آتی ہے ۔ کیونکہ یہ محدثین تو اپنے مشائخ سے نقل کرنے میں جھوٹ نہیں بولتے ۔ مگر ان سے پہلے حدیث کی سند میں کوئی راوی ہوتا ہے جو کہ جھوٹا اور کذاب ہوتا ہے ۔ وہ یا تو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے یا پھر اس سے کبھی کبھار غلطی ہو جاتی ہے ۔ اس لیے وہ جن لوگوں سے روایت نقل کرتے ہیں' ان ہی کی بات آگے پہنچاتے ہیں ۔ اور عجیب و غریب قسم کی باتیں صرف اس لیے نقل کرتے ہیں تاکہ ان کی پہچان حاصل ہو جائے ۔ ایسی غریب قسم کی باتیں عام طور پر ضعیف ہوتی ہیں ۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' ان غرائب سے بچ کر رہو؛ ان میں عام طور پر ضعیف روایات ہوتی ہیں۔''

ایسے ہی رافضی مصنف کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہنا کہ:

'' آپ ہی کلمہ تقوی ہیں ۔''

یہ بھی جھوٹی روایت ہے ۔ اس کا جھوٹ یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ: '' کلمہ '' اسی جنس سے ہے جیسے حضرت عیسی علیہ السلام کے لیے '' کلمۃ اللہ '' (اللہ کا کلمہ) فرمایا گیا ہے ۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مٹی سے پیدا کیا؛ پھر فرمایا: ہو جا' تو آپ ہو گئے ۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک کلمہ کے ذریعہ سے پیدا کیا ۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح پیدا ہوئے ہیں جیسے باقی تمام مخلوق پیدا ہوئی ہے ۔

---

[1] ابن الجوزی نے ''صفۃ الصفوۃ'' کے مقدمہ میں کتاب حلیۃ الاولیاء کی اس کمزوری کی جانب اشارہ کیا ہے ۔ خلفائے اربعہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جملہ مخلوقات سے چیدہ و برگزیدہ ہیں اور اس لیے اس بات سے قطعی بے نیاز ہیں کہ ان کے فضائل میں ضعیف یا موضوع روایات بیان کی جائیں۔''

کلمہ تقوی سے مراد " لا الـه الا الله والله اکبر " ہے؛ جیسا کہ حدیث نبوی سے ثابت ہے۔اس کا شمار ان کلمات میں ہوتا ہے جن کے خبر ہونے کی صورت میں مؤمنین ان کی تصدیق کرتے ہیں؛ اور امر یا حکم ہونے کی صورت میں ان کی اطاعت کرتے ہیں۔[1] نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ☆ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ☆ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ ☆ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ [ابراهيم ۲۴۔۲۷]

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان فرمائی۔مثل ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت اپنے پھل لاتا ہے۔اور اللہ تعالی لوگوں کے سامنے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔اور ناپاک بات کی مثال ایسے درخت جیسی ہے جو زمین کے کچھ ہی اوپر سے اکھاڑ لیا گیا۔اسے کچھ ثبات تو ہے نہیں۔ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

ایسے ہی لفظ ''تقوی'' اسم جنس ہے؛ یہ ہر اس کلمہ کو شامل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا تقوی اختیار کیا جائے جیسے: صداقت عدل و انصاف وغیرہ۔پس ہر وہ انسان جو سچائی کی تلاش میں رہے؛ اور عدل و انصاف کو بجالائے۔یقیناً وہ کلمہ تقوی کا التزام کرنے والا ہے۔اور اس میں سب سے سچا اور عادلانہ کلام ''لا الہ الا اللہ'' ہے؛ اس لیے کہ تمام کلمات میں سے خاص کلمہ ہے۔

ایسے ہی حضرت عمار اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب روایات بھی جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

فصل:

[کلبی کے مطاعن اور ان کا جواب]

[اشکال]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:''جہاں تک صحابہ کے نقائص و معائب کا تعلق ہے۔جمہور امت نے اس بارے میں بہت کچھ نقل کیا ہے؛ اس کی حد یہ ہے کہ کلبی نے ''مثالب صحابہ'' کے موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ اس بارے میں جوابات تفصیلی ہیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں جو معائب منقول ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

معائب صحابہ کی قسم اوّل: جھوٹی روایات: جو کہ یا تو تمام کی تمام روایات ہی صاف اور کورا جھوٹ ہیں۔یا پھر ان میں کمی اور زیادتی کر کے انہیں تحریف کا نشانہ بنایا گیا ہے؛ جس کی وجہ سے ان میں مذمت اور عیب کا پہلو پیدا ہو گیا ہے۔

---

[1] سنن ترمذي ـ كتاب تفسير القرآن، باب و من سورة الفتح (حديث:٣٢٦٥)، عن ابى ابن كعب، ، مستدرك حاكم (٢/ ٤٦١)، تفسير ابن جرير (٢٦/ ١٠٤)، عن قول علي۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں نقل کیے جانے والے اکثر مطاعن کا تعلق اسی باب سے ہے۔ انہیں روایت کرنے والے راوی اپنے جھوٹ اور دروغ گوئی میں معروف ہیں ۔ مثلاً ابو مخنف لوط بن یحییٰ اور ہشام بن محمد بن سائب کلبی ۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مصنف ہشام کلبی کی تصنیفات سے استشہاد کرتا ہے، حالانکہ وہ اکذب الناس ہے۔ کلبی اور اس کا بیٹا ہشام دونوں شیعہ کذاب ہیں۔ ❶ یہ اپنے والد اور ابومخنف دونوں سے روایت کرتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں متروک الحدیث اور کذاب ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کلبی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص کلبی سے روایت کرتا ہو یہ تو صرف ایک داستان گو اور نساب تھا۔''

امام دارقطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کلبی متروک الحدیث ہے۔

محدث ابن عدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ہشام کلبی افسانہ گو تھا۔ مسند احمد میں اس سے کوئی حدیث مروی نہیں۔ اس کا باپ بھی کذاب ہے۔'' امام زائدہ ولیث وسلیمان رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ''کلبی کذاب ہے۔''

محدث یحییٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کلبی کذاب، ساقط الاحتجاج اور بے کار آدمی ہے۔''

محدث ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کلبی کا کاذب ہونا عیاں راچہ بیاں'' کے مصداق ہے۔

معائب صحابہ کی دوسری قسم: صحابہ پر دوسری قسم کے وہ اعتراضات ہیں جو بجائے خود صحیح ہیں، مگر صحابہ کے عذرات کی بنا پر ان کو گناہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ وہ اجتہادی غلطی کی قسم کی چیز ہیں جس کے درست ہونے کی صورت میں دو اجر ملتے ہیں اور غلط ہونے کی صورت میں ایک اجر۔ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ

---

❶ ہشام بن محمد بن سائب کا ذکر قبل ازیں گزر چکا ہے۔ ہشام کے والد کلبی کے متعلق محدث ابن حبان فرماتے ہیں: ''کلبی ابن سبا کے معتقدین میں سے تھا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ سیدنا علی ابھی فوت نہیں ہوئے وہ لوٹ کر آئیں گے اور کرہ ارضی کو عدل وانصاف سے ایسے ہی بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم و جور سے لبریز ہو چکی ہوگی۔ تبوذکی کہتے ہیں: ''میں نے ہمام سے سنا، اس نے کلبی کو یہ کہتے سنا کہ میں سبائی عقیدہ رکھتا ہوں۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوالنضر کلبی یحییٰ اور ابن مہدی کے نزدیک متروک الحدیث ہے۔ امام بخاری نے کلبی کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ ''میں جو روایت ابوصالح سے بیان کروں وہ جھوٹی ہوتی ہے۔'' محدث ابن حبان فرماتے ہیں کلبی کے مذہب اور اس کی دروغ گوئی کے پیش نظر اس کی تعریف بے سود ہے۔'' کلبی بطریق ابوصالح از ابن عباس تفسیری روایات بیان کرتا ہے۔ حالانکہ ابوصالح نے ابن عباس کو دیکھا بھی نہیں، کلبی نے بھی ابوصالح سے بہت تھوڑی روایات سنی ہیں، مگر بوقت ضرورت کلبی ابوصالح سے لاتعداد روایات بیان کرتا ہے۔ تصانیف میں کلبی کا نام لینا بھی حلال نہیں اس کی روایات سے احتجاج تو درکنار۔''

احمد بن زہیر کا قول ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا۔ ''کلبی کی تفسیر سے استفادہ کرنا حلال ہے یا نہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''نہیں۔''

محدث ابوعوانہ کہتے ہیں: ''میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا: جبرائیل نبی کریم ﷺ کو وحی لکھوایا کرتا تھا، جب آپ بیت الخلاء میں داخل ہو جاتے تو جبرائیل سیدنا علی کو وحی لکھواتے۔'' محدث ابن معین یحییٰ بن یعلی سے اور وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ میں کلبی سے قرآن پڑھا کرتا تھا۔ میں نے اسے یہ کہتے سنا: ''ایک مرتبہ میں ایسا بیمار پڑا کہ مجھے سب کچھ بھول گیا۔ میں آل محمد کے پاس گیا اور انھوں نے میرے منہ میں اپنا تھوک ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ بھولا تھا دوبارہ مجھے یاد ہو گیا۔'' میں نے یہ سن کر کہا میں آپ سے کوئی روایت بیان نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے اسے ترک کر دیا۔''

ابومعاویہ کہتے ہیں'' میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا: ''میں نے چھ یا سات دن میں قرآن حفظ کیا۔ دوسرا کوئی شخص اتنی جلد قرآن یاد نہیں کر سکتا اور میں ایسی چیز بھولا جس کو کوئی شخص فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنی داڑھی پکڑ کر چاہا کہ اس میں معمولی تخفیف کروں گا مگر میں نے مٹھی کے اوپر سے کتر ڈالی۔''

یہ ہیں کلبی سبائی کذاب کے بارے میں ائمہ حدیث کے ارشادات عالیہ۔ رافضی مصنف ایسے شخص کی کتاب سے ان صحابہ کے نقائص و معائب پر استدلال کرنا چاہتا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے بعد اس کائنات ارضی پر اللہ کی بہترین مخلوق تھے۔ ان کی عظمت وفضیلت کا یہ عالم ہے کہ اعدائے اسلام بھی ان کے مقام رفیع سے انکار نہیں کر سکتے جو انھیں تاریخ اسلام میں حاصل ہے۔

اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم اگر بفرض محال ان میں سے کسی چیز کے بارے میں ثابت بھی ہو جائے کہ وہ گناہ ہے تو اس سے ان کے فضائل ومناقب اور جنتی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ گناہ کی سزا متعدد اسباب کی بنا پر آخرت میں ٹل بھی جاتی ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں:

۱۔ توبہ گناہوں کو ختم دیتی ہے۔ شیعہ کے بارہ ائمہ کے بارے میں ثابت ہے کہ انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی تھی۔

۲۔ اعمال صالحہ گناہوں کو ملیامیٹ کردیتے ہیں۔ نیکیاں برائیوں کے اثرات کو ختم کردیتی ہیں؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ (النساء: ۳۱)

''اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیں گے۔''

۳۔ مصائب وآلام بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں اور ان سے گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ مومنوں کی دعا سے بھی گناہوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

۵۔ انبیاء کی شفاعت سے بھی گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

بہرکیف جن اسباب ووجوہ کی بنا پر افراد امت میں سے کسی کے گناہ کو معاف کیا جاسکتا اور اس کی سزا کا ازالہ ممکن ہے صحابہ ان سب سے زیادہ اس امر کے مستحق ہیں کہ ان سے ذم وعتاب کو دور کیا جائے اور ان کے گناہوں کو معاف کیا جائے۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین مدح وتعریف کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔

ہم اس ضمن میں صحابہ اور دیگر افراد امت کے لیے ایک جامع قاعدہ ذکر کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ انسان کو اس قاعدہ کلیہ کا علم ہو' تاکہ جزئیات کو اس کی طرف لوٹایا جائے' تاکہ انسان علم کی روشنی میں عدل کے ساتھ بات کر سکے۔ اور اسے جزئیات کے وقوع پذیر ہونے کی کیفیت کا بھی علم ہو' ورنہ وہ ان جزئیات کے بارے میں ایسے ہی کذب وجہالت کا شکار رہے گا۔ کلیات وجزئیات میں جہالت اور ظلم کی وجہ سے بہت بڑا فساد اور شر پیدا ہوتا ہے۔

قاعدہ جامعہ:

عدل وانصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے لیے بنی نوع انسان کے پاس کچھ قواعد کلیہ ہوتے ہیں جن پر رکھ کر جزئیات کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ پھر جزئیات کو پہچانا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان جزئیات سے بے بہرہ رہتا اور کلیات کے بارے میں جہل وظلم کا شکار ہو جاتا۔ جس سے عظیم فساد رونما ہوتا۔ علماء نے مجتہدین کے خطاء وصواب اور گنہگار یا عدم گنہگار ہونے کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں بیش قیمت قواعد نافعہ بیان کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ: لوگوں نے اصولی اور فروعی مسائل میں مجتہدین کو بجانب حق یا خطا پر کہنے میں بڑی لے دے کی ہے؛ بعض نے انہیں گنہگار ٹھہرایا ہے؛ اور بعض نے عدم گناہ کا کہا ہے۔ مگر ہم اس بارے میں انتہائی جامع اور فائدہ مند اصولوں کا ذکر کرتے ہیں:

اصل اوّل:

کیا مجتہد کے لیے یہ ممکن ہے کہ اپنے اجتہاد کے بل بوتے پر معلوم کرلے کہ فلاں متنازع مسئلہ حق ہے؟ اور اگر یہ ممکن نہیں اور مجتہد انتہائی سعی وجہد کے باوجود حق کو نہ پاسکے اور کہے کہ میرے علم کی حد تک یہ حق ہے، حالانکہ وہ حق نہ ہو تو کیا اسے

سزا دی جائے گی یا نہیں؟ یہ اس مسئلہ کی اساس و اصل ہے۔ علماء کے اس میں تین اقوال ہیں۔ ہر قول کو ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔

پہلا قول: اللہ تعالیٰ نے ہر مسئلہ میں حق کی ایک دلیل مقرر کر رکھی ہے۔ جو شخص کما حقہ جہد و کاوش سے کام لیتا ہے وہ حق کو پالیتا ہے۔ بخلاف ازیں جو شخص کسی اصولی یا فروعی مسئلہ میں حق کو معلوم کرنے سے قاصر رہتا ہے؛ اس کی وجہ اس کا تساہل و تغافل ہے۔ قدریہ و معتزلہ یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ متکلمین کا ایک گروہ بھی اسی کا قائل ہے۔

دوسرا قول: مجتہد بعض اوقات حق کی معرفت حاصل کر سکتا ہے اور بعض اوقات ایسا نہیں ہو سکتا۔ بصورت عجز اللہ تعالیٰ بعض اوقات اس کو سزا دیتے ہیں اور بعض اوقات نہیں۔ یہ جہمیہ و اشاعرہ کا مذہب ہے اور مذاہب اربعہ کے اکثر اتباع بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔

تیسرا قول: ہر مجتہد حق کو معلوم کرنے پر قادر نہیں اور نہ ہی وعید کا مستحق ہے۔ بخلاف ازیں وہی مجتہد وعید کا مستحق ہوگا جو کسی فعل مامور کو ترک کر دے یا فعل محظور کا مرتکب ہو۔ یہ فقہاء ائمہ کا قول ہے، سلف صالحین اور جمہور اہل اسلام اسی کے قائل ہیں پہلے دونوں اقوال میں جو صحیح بات پائی جاتی ہے۔ یہ قول ان کا جامع ہے۔

اصل ثانی:

اصل ثانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں اسی شخص کو سزا دے گا جو ترک مامور یا فعل محظور کی بنا پر اللہ کی نافرمانی کرے۔ سلف صالحین و جمہور کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ لہٰذا وجوب قدرت کے ساتھ مشروط ہے اور سزا صرف ترک مامور اور فعل محظور کی صورت میں ملے گی۔

ہم قبل ازیں وعد و عید اور ثواب و عقاب کے بارے میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ گناہ گار کی سزا دس اسباب کی بنا پر معاف کی جا سکتی ہے، جب سزا کی معافی امت کے سب گناہ گاروں کے لیے ہے خواہ وہ مجتہد ہوں یا کوئی اور گناہ گار۔ تو اصحاب رسول ﷺ کی سزا کیوں کر معاف نہیں کی جائے گی؟ اس پر طرہ یہ کہ جب بعد میں آنے والے مجتہدین سے ذم و عقاب کا ازالہ ممکن ہے تو سابقین اولین، مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین بالاولیٰ اس رعایت کا استحقاق رکھتے ہیں۔

ہم اس پر کھل کر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ جو روافض وغیرہ خلفائے راشدین و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں یہ ان کی ناموس و آبرو پر حملہ ہے۔ لہٰذا اس کا تعلق حقوق اللہ و حقوق العباد دونوں سے ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب ہم صحابہ کے سوا سلاطین و ملوک اور علماء و مشائخ کو موضوع سخن بناتے ہیں تو اس وقت جہل و ظلم کے باوجود علم و عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں، اس لیے کہ عدل ہر شخص کے لیے ہر حال میں ضروری ہے؛ اور ظلم مطلقاً حرام ہے، کسی بھی صورت میں مباح نہیں۔ جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (المائدۃ:۸)

''کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو عدل کیجیے کیونکہ وہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

جو بغض حکم الٰہی کے مطابق ضروری ہے، جب اس میں بھی مبغوض پر ظلم کرنے کی ممانعت ہے؛ تو تاویل یا شبہ کی آڑ لینے والا مسلمان اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے انصاف کیا جائے اور اسے تختہ مشق ستم نہ بنایا جائے۔

اصحاب رسول ﷺ سب لوگوں کی نسبت اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہیں کہ قول و عمل میں ان کے ساتھ انصاف برتا جائے۔ عدل اور اصحاب عدل بالاتفاق مدح و ستائش کے لائق ہیں اور ظلم و اہل ظلم بالاتفاق قابل مذمت ہیں۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ عدل و انصاف کے تقاضا کے مطابق فیصلہ صادر کرنا ہر زمان و مکان میں ہر شخص پر ہر ایک کے لیے واجب ہے۔ خصوصاً شریعت محمدی کی روشنی میں حکم صادر کرنا ایک خاص قسم کا عدل ہے جو عدل کے جملہ انواع سے اکمل و احسن ہے۔ یہ فیصلہ نبی کے لیے بھی ضروری ہے اور اتباع نبی کے لیے بھی۔ اس کی پابندی نہ کرنے والا یقیناً کافر ہے۔ ایسا فیصلہ امت کے جملہ متنازعہ امور میں ضروری ہے خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹)

''اگر کسی بات میں تمہارے یہاں تنازع بپا ہو جائے تو اسے اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ۔''

امت کے درمیان جملہ امور مشترکہ میں کتاب و سنت کا فیصلہ ناطق ہوگا نہ کہ کسی عالم و امیر یا شیخ و سلطان کا۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ''قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں، دو قاضی دوزخی اور ایک جنتی ہوگا۔''

۱۔ جو قاضی حق کو معلوم کرکے اس کے مطابق فیصلہ کرے وہ جنت میں جائے گا۔

۲۔ جو قاضی حق کو جاننے کے باوجود اس کے برخلاف فیصلہ کرے وہ جہنمی ہوگا

۳۔ جو جہالت کے باوجود لوگوں کا فیصلہ کرے وہ دوزخ میں جائے گا۔ [1]

جب کوئی شخص علم و عدل کی روشنی میں فیصلہ کرے اور اس کا اجتہاد مبنی بر صواب ہو تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر اس کا اجتہاد درست نہ ہو تو وہ ایک اجر کا مستحق ہے۔ [2]

جب دوسرے لوگوں کے باہمی معاملات میں عدل کو یہ اہمیت حاصل ہے تو صحابہ دوسروں کی نسبت عدل و انصاف کیے جانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ روافض نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں دو عملی اور تفرق کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ بعض صحابہ سے غلو کی حد تک محبت و مودت روا رکھتے ہیں۔ اور بعض کے ساتھ انتہائی بغض و عناد کا مظاہرہ کرتے ہیں یہ وہ تفرق و انقسام ہے جس سے اللہ و رسول نے منع فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ۱۵۹)

جن لوگوں نے دین میں تفریق پیدا کی اور فرقوں میں بٹ گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا﴾ (آل عمران: ۱۰۵)

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور جنھوں نے اختلاف پیدا کیا۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تین باتوں کو پسند کرتے ہیں:

(۱) اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الأقضية، باب فی القاضی یخطئ (حدیث: ۳۵۷۳)، سنن ابن ماجة، کتاب الاحکام۔ باب الحاکم یجتهد فیصیب الحق (حدیث: ۲۳۱۵)۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الاعتصام باب اجر الحاکم اذا اجتهد ...." (حدیث: ۷۳۵۲)، صحیح مسلم، کتاب الاقضية، باب بیان اجر الحاکم اذا اجتهد (حدیث: ۱۷۱۶)۔

(۲) قرآن کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقے نہ بنو۔ (۳) اپنے حکام وولاۃ کی خیرخواہی کرو۔''❶

اللہ تعالیٰ نے زندہ اور مردہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح ان کا خون، ان کا مال اور ان کی آبرو بھی حرام ہے۔ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''بیشک مسلمانوں کا خون، ان کا مال اور ان کی آبرو اسی طرح حرام ہے، جیسے اس دن کی حرمت تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں۔ گواہ رہو کہ میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں تک یہ احکام پہنچا دیں، جو موجود نہیں ہیں، اس لیے کہ جن لوگوں تک یہ احکام پہنچیں گے ان میں سے بعض ان لوگوں سے بھی ان احکام کو زیادہ یاد رکھیں گے جنھوں نے براہِ راست یہ مسائل مجھ سے سنے۔''❷

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا﴾

''جو لوگ مومن مرد اور عورتوں کو بلا وجہ ایذا دیتے ہیں انھوں نے ایک عظیم بہتان اور ظاہر گناہ کمایا۔'' (الاحزاب: ۵۸)

جو شخص کسی زندہ یا مردہ مومن کو دکھ پہنچائے گا وہ اس آیت کا مصداق ہوگا۔ البتہ مجتہد پر کوئی گناہ نہ ہوگا، جب کسی نے مومن کو اذیت پہنچائی تو یہ بلا وجہ اور بلا استحقاق ہی ہوگی۔ جو شخص گناہ گار ہو اور گناہ سے توبہ کر چکا ہو یا کسی اور وجہ سے اس کا گناہ بخشا گیا ہو اس کے باوجود کوئی شخص اسے تکلیف پہنچائے تو یہ ایذا بلا استحقاق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ (الحجرات: ۱۲)

''ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔''

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''غیبت کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے مسلمان بھائی کا ذکر ایسے انداز میں کرو کہ وہ اسے ناپسند کرے۔ آپ سے دریافت کیا گیا اگر اس میں وہ عیب موجود ہو تب بھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں؟ فرمایا: ''اگر اس میں وہ عیب موجود ہو پھر تو غیبت ہے اور اگر موجود نہ ہو تو یہ بہتان ہے۔''❸

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ کسی میں ایسا عیب ثابت کرنا جو فی الواقع اس میں نہ ہو بہتان کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ پر ایسا بہتان لگانا کس قدر مذموم ہوگا؟ جو شخص کسی مجتہد کے بارے میں کہے کہ اس نے دانستہ ظلم کیا یا دانستہ کتاب وسنت کی خلاف ورزی کی حالانکہ ایسا نہ ہو تو یہ بہتان ہے ورنہ غیبت۔ البتہ غیبت کی وہ قسم مباح ہے جسے اللہ و رسول ﷺ نے روا رکھا ہو۔ غیبت مباح وہ ہے جو قصاص وعدل کے طور پر ہو یا اس میں کوئی دینی یا دنیوی مصلحت مضمر ہو۔ مثلاً مظلوم کہے کہ فلاں شخص نے مجھے مارا یا میرا مال لے لیا یا میرا حق غصب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ﴾ (النساء: ۱۴۸)

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الاقضیة، باب النهی عن کثرة المسائل......" (ح:۱۷۱۵)، مسند احمد (۲/ ۳۲۷)

❷ البخاری، کتاب الحج، باب خطبة ایام منی (ح:۱۷٤۱) مسلم ۔ باب تغلیظ تحریم الدماء (ح:۱٦۷۹)

❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الغیبة (ح:۲۵۸۹)۔

''اللہ تعالیٰ اونچی آواز سے بری بات کہنے کو پسند نہیں کرتے البتہ مظلوم ایسا کرسکتا ہے۔''

مذکورہ صدر آیت کریمہ اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی جو کسی قوم کے پاس مہمان ٹھہرا اور انھوں نے حق مہمانی ادا نہ کیا۔ ❶ اس لیے کہ مہمانی حدیث نبوی کی رو سے واجب ہے ❷ جب انھوں نے اداء واجب میں تساہل کا ارتکاب کیا تو مہمان ان کی کوتاہی کا تذکرہ کرسکتا ہے۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ میرا خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ کنجوس آدمی ہے اور مجھے اتنا نان ونفقہ نہیں دیتا جس سے میری اور میرے بچوں کی بسر اوقات ہو سکے تو کیا مجھے اس کے مال سے کچھ لینے کی اجازت ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں اتنا مال لے سکتی ہو جو تیرے اور تیرے بچوں کے لیے کافی ہو۔'' ❸

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند کو شکایت کرنے سے نہ روکا تھا یہ فریاد مظلوم کی مثال ہے۔

خیر خواہی کے لیے غیبت کی مثال یہ حدیث ہے کہ چند آدمیوں نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام دیا تھا۔ انھوں نے جب اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ ''معاویہ رضی اللہ عنہ ایک مفلس آدمی ہے اور ابو جہم رضی اللہ عنہ عورتوں کو پیٹنے کا خوگر ہے، لہٰذا تم اسامہ رضی اللہ عنہ سے نکاح باندھ لو۔'' ❹

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے جب خاوند کے بارے میں مشورہ طلب کیا تو آپ نے اس کو مشورہ دے دیا۔ یہ خیر خواہی کے نقطہ خیال سے تھا اور خیر خواہی ایک ضروری امر ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث صحیح میں تین مرتبہ فرمایا: ''دین خیر خواہی کا دوسرا نام ہے۔'' لوگوں نے دریافت کیا، اے اللہ کے نبی! کس کی خیر خواہی؟ فرمایا: ''اللہ کی خیر خواہی، رسول کی خیر خواہی اور مسلم حکام اور عوام سے ہمدردی۔'' ❺

جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے میں غلطی کرتا ہو یا دانستہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی عالم پر جھوٹ باندھتا ہو یا دین کے عملی واقتصادی مسائل میں غلط رائے کا اظہار کرتا ہو تو ایسے شخص پر علم وعدل اور خیر خواہی کی نیت سے نقد وجرح کرنے والا اللہ کے نزدیک ماجور ہوگا۔ خصوصاً جب کہ وہ شخص بدعت کی طرف دعوت دیتا ہو تو لوگوں کو اس کی غلطی سے آگاہ کرنا اور اس کے شر کو روکنا ڈاکو اور راہ زنوں کے شر کو روکنے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

جو شخص علمی ودینی مسائل پر اپنے اجتہاد سے اظہار خیال کرتا ہے وہ مجتہد کا حکم رکھتا ہے وہ خطا کار بھی ہوسکتا ہے اور حق پر بھی۔ بعض اوقات زبان وقلم یا شمشیر وسنان کے ساتھ اختلاف کرنے والے دونوں اشخاص مجتہد ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں، بعض دفعہ وہ دونوں خطاء پر ہوتے ہیں مگر ان کو بخش دیا جاتا ہے، جیسا کہ ہم صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے باہمی تنازعات کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشاجرات صحابہ وتابعین پر اظہار خیال کرنا ممنوع ہے۔

---

❶ تفسیر ابن کثیر (ص:۳۷۲)

❷ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب اکرام الضیف (حدیث:٦١٣٧)، صحیح مسلم، کتاب اللقطة، باب الضیافة و نحوها (حدیث:۱۷۲۷)۔

❸ صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب نفقة المرأة اذا غاب عنها زوجها (حدیث: ٥٣٥٩)، صحیح مسلم، کتاب الأقضیة۔ باب قضیة هند (حدیث: ١٧١٤)

❹ مسلم، باب المطلقة البائن لا نفقة لها، (ح:١٤٨٠) ❺ مسلم، باب بیان ان الدین النصیحة (ح:٥٥)

جب دو مسلمان کسی بات میں جھگڑ پڑیں اور وہ معاملہ رفت گزشت ہو جائے اور لوگوں کا اس سے کچھ تعلق نہ ہو اور نہ وہ اس کی حقیقت سے آگاہ ہوں تو اس پر اظہار رائے کرنا بلا علم و عدل ہوگا جس سے انھیں بلا وجہ ایذا پہنچے گی۔ اور اگر لوگ جانتے ہوں کہ وہ دونوں گناہ گار یا خطا کار تھے تو بلا مصلحت اس کا ذکر کرنا بدترین قسم کی غیبت ہے۔ چونکہ صحابہ کی عزت و حرمت اور ناموس و آبرو دوسرے لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ہے اور ان کے فضائل و مناقب احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، اس لیے ان کے باہمی تنازعات کو موضوع گفتگو بنانا دوسرے لوگوں کی مذمت بیان کرنے کی نسبت بہت بڑا گناہ ہے۔

اگر سوال کیا جائے کہ: اہل سنت روافض کو برا بھلا کہتے اور ان کے عیوب و نقائص بیان کرتے ہیں تو ان کے لیے ایسا کرنا کیوں کر روا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی متعین آدمی کا نام لے کر اس کی مذمت بیان کرنا اور چیز ہے، اور کسی گروہ کی مذمت بحیثیت گروہ چیزے دیگر۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے بعض گروہوں پر لعنت فرمائی۔ [1] فرمان الٰہی ہے:

﴿لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الاعراف: ۴۴) ''ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔''

کتاب و سنت بدکردار لوگوں اور ان کے افعال کی قباحت و مذمت سے لبریز ہیں۔ جس کا مقصد اس فعل شنیع سے باز رکھنا اور یہ بتانا ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا وعید شدید کا مستوجب ہوگا۔

علاوہ ازیں جس گناہ کو آدمی گناہ تصور کرتا ہے، اس سے تائب ہو جاتا ہے، مگر مبتدعین مثلاً خوارج و نواصب جنھوں نے مسلمانوں میں بغض و عداوت کا دروازہ کھولا اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں اور جو لوگ ان کی ایجاد کردہ بدعت میں ان کے ہم نوا نہیں ہوتے ان کی تکفیر کرتے ہیں، بنا بریں ان سے مسلمانوں کو ان ظالموں کی نسبت زیادہ ضرر لاحق ہو سکتا ہے جو حرام سمجھتے ہوئے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

مجتہد خواہ حاکم ہو یا عالم' ناظر ہو یا مناظر یا مفتی وغیرہ کچھ بھی ہو؛ جب وہ اجتہاد کرے اور استدلال کرے' اور وہ حسب استطاعت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا بھی رہے؛ تو یہی چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے مکلّف ٹھہرایا ہے۔ اپنے اس فعل میں وہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار اور ثواب کا مستحق ہے۔ وہ اس معنی میں حق پر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہے۔ لیکن کبھی تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حق اسی میں ہے۔ لیکن کبھی یہ معلوم نہیں بھی ہو سکتا؛ بخلاف قدریہ اور معتزلہ کے۔

روافض خوارج سے بھی بڑے بدعتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی تکفیر کرتے ہیں جس کی جسارت خوارج بھی نہ کر سکے۔ مزید برآں یہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے بارے میں دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ خوارج جھوٹ نہیں بولتے تھے بلکہ وہ شیعہ کی نسبت زیادہ سچے، زیادہ بہادر اور عہد کے پابند ہوا کرتے تھے۔ خوارج مرد میدان اور بڑے جنگجو تھے۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں رافضی نہایت جھوٹے، حد درجہ بزدل، بدعہد اور نہایت ذلیل ہوا کرتے تھے۔ شیعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار تک سے مدد لینے سے گریز نہیں کرتے۔ ہم نے بھی دیکھا ہے اور مسلمانوں نے بھی مشاہدہ کیا ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر کڑا وقت آیا تو ان لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف ان کے دشمن کفار کا ساتھ دیا۔ جیسا کہ کافر تاتاری بادشاہ چنگیز خاں کے زمانہ میں ہوا۔ رافضیوں نے مسلمانوں کے خلاف اس کی بھرپوری مدد کی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری۔ کتاب الأذان، باب(۱۲۶)، (ح:۷۹۷، ۸۰٤، ٤٥٦٠)، صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات (ح: ٦٧٥، ٦٧٦).

ایسے ہی جب چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں خراسان اور عراق و شام کے علاقہ میں آیا تو شیعہ نے اعلانیہ اور خفیہ ہر طرح سے اس کی مدد کی۔ یہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور کسی کو اس سے مجال انکار نہیں؛ اور نہ ہی کسی پر کوئی بات پوشیدہ رہ گئی ہے۔عراق اور خراسان میں ظاہری و باطنی طور پر شیعہ نے کھل کر ان کا ساتھ دیا۔

اس وقت (1) خلیفہ بغداد کا وزیر ابن علقمی (2) بھی شیعہ تھا'' وہ ہمیشہ خلیفہ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتا رہتا۔'' اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو زک پہنچے۔اس نے اسلامی لشکر کے سپاہیوں کی تنخواہیں بند کردیں۔اور انہیں ہر طرح سے کمزور کیا۔اور انہیں تاتاریوں سے جنگ کرنے سے روکتا رہتا تھا۔ضرررسانی کے لیے وہ طرح طرح کے حیلے اختیار کیا کرتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کافر تاتاری بغداد میں داخل ہو گئے اور انھوں نے دس لاکھ یا اس سے کم و بیش مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اسلام میں تاتاری کفار کی جنگ سے بڑھ کر کوئی لڑائی نہیں لڑی گئی۔تاتاریوں نے ہاشمیوں کو تہ تیغ

---

(1) شہرہ آفاق شیعہ مورخ مرزا محمد باقر خوانساری نے اپنی کتاب روضات الجنات طبع ثانی کے صفحہ ۵۷۸، پر نصیر الدین طوسی کے حالات زندگی میں لکھا ہے: خواجہ نصیر الدین کی زندگی کا مشہور ترین واقعہ یہ ہے کہ وہ عظیم تاتاری سلطان اور اپنے دَور کے پرشوکت وحشمت فاتح ہلاکو خاں بن تولی خاں بن چنگیز خان کی ملاقات کے لیے ایران پہنچا اور پھر وہاں سے اس کے موید و مَنصور لشکر کی معیت میں ارشاد عباد، اصلاح بلاد اور قطع فساد کے لیے بغداد پہنچا۔اس کا مقصد بنی عباس کی حکومت کو ختم کرنا اور ان کے اتباع کو صفحہ ہستی سے مٹانا تھا۔ چنانچہ خواجہ طوسی اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور بغداد میں عباسیوں کے ناپاک خون کی ندیاں بہادیں۔'' مذکورہ بالا اقتباس میں شیعہ مورخ نے شیخ روافض خواجہ طوسی کے مشہور سفاک ہلاکو خاں کے یہاں آنے کو ارشاداً للعباد و اصلاحاً للبلاد قرار دیا ہے۔ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ اس آمد کا مقصد وحید یہ تھا کہ سب سے بڑے اسلامی دارالخلافہ میں خون کی ندیاں بہادی جائیں۔مرزا محمد باقر اس بات پر فخر و مباہات کا اظہار کرتا ہے کہ ہلاکو خاں نے سفاکی و خونریزی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو مسلمان اس کی سفاکی کا شکار ہوئے وہ سب جہنمی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بت پرست ہلاکو اور اس کا رافضی ہادی و مرشد خواجہ طوسی دونوں قطعی جنتی ہیں۔ اس سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بیان کی صداقت واضح ہوتی ہے۔ ہم قبل ازیں شیعہ مورخ کے قول کی جانب اشارہ کر چکے ہیں، اب ضرورت کے پیش نظر تفصیلاً اس کا اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

(2) اس کا نام محمد بن احمد بغدادی ہے۔ یہ ابن علقمی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ۶۵۶ھ میں فوت ہوا۔ نوجوانی میں یہ شیعہ ادباء میں شمار ہوتا تھا۔ اہل سنت نے اس کے بارے میں تساہل سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مناصب جلیلہ طے کرتے کرتے خلافت عباسیہ میں وزارت کے عہدہ تک پہنچا اور چودہ سال تک اس پر فائز رہا۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم نے ابن العلقمی پر اس قدر اعتماد کیا کہ جملہ امور سلطنت اسے تفویض کردیے۔ جب صنم پرست ہلاکو خاں کا لشکر بلاد ایران میں داخل ہوا تو ابن العلقمی نے اسے بغداد پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا، ابن العلقمی کو امید تھی کہ خلافت عباسیہ کے سقوط کے بعد ہلاکو خاں کسی شیعہ کو امام یا خلیفہ مقرر کرے گا۔ ہلاکو خاں قوم تاتار کرج کے دو لاکھ سپاہیوں کو لے کر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ ابن علقمی نے خلیفہ مستعصم کو دھوکہ دے کر ہلاکو خاں کے کام کو بڑی حد تک آسان کردیا۔ جب ہلاکو نے اپنی فوج کو بغداد کی شرقی و غربی جانب اتار دیا۔ ابن علقمی نے خلیفہ سے صلح کی سلسلہ جنبانی کے لیے خلیفہ سے ہلاکو خاں کو ملنے کی اجازت مانگی۔ جب ابن علقمی ہلاکو کو اپنی وفاشعاری اور خلافت عباسیہ سے خیانت کاری کا یقین دلا چکا تو خلیفہ کے پاس لوٹ کر واپس آیا اور کہنے لگا: ہلاکو اپنی بیٹی کا نکاح خلیفہ کے بیٹے ابوبکر سے کرنا چاہتا ہے۔ نیز ہلاکو کی خواہش ہے کہ وہ سلجوق سلاطین کی طرح خلیفہ کے زیر اثر رہے۔ خلیفہ علماء و رؤسا اور اعیان حکومت کی معیت میں بزعم خود اپنے بیٹے کو بیاہنے کے لیے ہلاکو کی جانب چل دیا۔

جب لوگ خلیفہ کی رفاقت میں ہلاکو کے یہاں پہنچے تو اس نے سب کو تہ تیغ کرنے کا حکم دیا پھر لشکر نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کا بازار گرم کیا۔ مسلسل چالیس دن تک قتل و غارت جاری رہا۔ کہا گیا ہے کہ ہلاکو نے جب مقتولوں کو شمار کرنے کا حکم دیا تو وہ دس لاکھ اسی ہزار نکلے۔ جو مقتول شمار نہ کیے جا سکے ان کی تعداد اس سے کئی گنا زائد تھی۔ اللہ کا دشمن ابن علقمی اپنے مقاصد میں ناکام رہا۔ اور شیعہ حکومت قائم کرنے سے متعلق اس کی آرزو بر نہ آئی۔ خیانت پیشہ لوگ ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا کرتے ہیں، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ہلاکو اسے حقیر سمجھنے لگا اور اس کی حیثیت تاتاریوں میں ایک غلام سے زیادہ نہ تھی بعد ازاں ابن العلقمی یہ مصرعہ گنگنایا کرتا تھا: و جَرَی الْقَضاءُ بِعَکْسِ مَا اَمَّلْتُهُ۔ (تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ)۔

پھر افسردگی کی حالت میں جہنم واصل ہوا۔ شیعہ مورخ بڑے فخریہ انداز میں اس عظیم حادثہ کا ذکر کرتا ہے، جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیعہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کا ساتھ دینے کے خوگر ہیں اور مسلمانوں کو بغض و عناد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔''

کر کے عباسی اور غیر عباسی سب خواتین کو قیدی بنالیا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ جو شخص کفار کو مسلمانوں پر مسلط کر کے انھیں قتل کرتا اور مسلم مستورات کو قیدی بنانے میں مدد دیتا ہے کیا ایسا شخص محبّ آل رسول ہوسکتا ہے؟

شیعہ حجاج ثقفی پر یہ بہتان لگاتے ہیں کہ اس نے سادات کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حالانکہ سفاک ہونے کے باوصف حجاج نے کسی ہاشمی کو قتل نہیں کیا تھا۔ البتہ بنی ہاشم کے علاوہ دیگر عرب شرفاء کو اس نے ضرور قتل کیا تھا۔ حجاج نے ایک ہاشمی خاتون بنت عبداللہ بن جعفر سے نکاح کیا تھا، مگر بنوامیہ نے مجبور کر کے بدیں وجہ تفریق کرادی کہ حجاج ایک شریف ہاشمی خاتون کا ہمسر و برابر نہیں ہوسکتا۔

ایسے ہی بلاد شام میں جو رافضی پائے جاتے ہیں' ان میں سے جنہیں قوت و طاقت حاصل تھی وہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین و نصاری اور اہل کتاب کفار کی مدد کیا کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو قتل کرتے' انہیں قیدی بناتے اور ان کے اموال پر قبضہ کر لیتے۔

جب کہ اس کے برعکس خوارج نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ بلکہ وہ لوگوں سے جنگیں لڑا کرتے تھے۔ لیکن نہ ہی وہ کفار کو مسلمانوں پر مسلط کرنے میں ان کی مدد کرتے اور نہ ہی اہل کتاب یہود و نصاری اور مشرکین کے ساتھ کوئی تعاون کرتے۔

رافضیوں میں زندیق ؛ ملحد اور منافقین شامل ہوگئے تھے جیسے اسماعیلیہ ؛ نصیریہ وغیرہ۔ اور ان کے علاوہ وہ لوگ بھی رافضیوں کی صفوں میں شامل ہوگئے تھے جو خوارج کے لشکر میں داخل نہ ہوسکے تھے۔ اس لیے کہ خوارج بہت عبادت گزار اور اہل ورع لوگ ہوا کرتے تھے۔ یہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں خبر دی تھی:

''تم میں سے کوئی ایک ان کی نماز کے مقابلہ میں اپنی نماز کو اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزہ کو حقیر سمجھے گا۔''

[یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔ تو پھر روافض کو خوارج سے کیا نسبت؟

اس میں شبہ نہیں کہ رافضیوں میں خال خال کچھ عابد و زاہد لوگ بھی پائے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا معاملہ دیگر مبتدعین اور اہل الاہواء سے یکسر مختلف ہے۔ معتزلہ شیعہ کے مقابلہ میں زیادہ دانش مند زیادہ دین دار اور ان سے بڑھ کر عالم ہوا کرتے ہیں۔ کذب و فجور بھی معتزلہ میں روافض کی نسبت کم ہے۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ نسبتاً بہتر اور علم و عدل سے قریب تر ہے۔ اہل بدعت میں خوارج سب سے زیادہ سچے اور عبادت گزار ہوا کرتے ہیں۔

[بایں ہمہ اہل سنت سب فرقوں کے ساتھ یکساں طور پر عدل و انصاف کا برتاؤ کرتے ہیں اور کسی پر بھی ظلم نہیں ڈھاتے۔ کیوں کہ ظلم مطلقاً حرام ہے۔ اہل سنت کے عدل و انصاف کی حد یہ ہے کہ وہ روافض سے بہ حیثیت مجموعی جو سلوک روا رکھتے ہیں، وہ اس سلوک سے بدرجہا بہتر ہے جو شیعہ کے بعض فرقے دوسرے فرقوں سے روا رکھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ روافض خود بھی اس کے معترف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روافض کے مختلف فرقوں کا یہ اشتراک ظلم و جہل پر مبنی ہے اور وہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں ایک دوسرے کے ہم نوا ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عدل و انصاف کا خوگر مسلمان شیعہ کے ساتھ جس عدل انصاف کے ساتھ کام لے سکتا ہے وہ آپس میں ہرگز ایسا نہیں کرسکیں گے۔ (کیوں کہ ظلم و جور ان کی فطرت بن چکا ہے)]

خوارج اہل سنت کی تکفیر کرتے ہیں، اسی طرح اکثر معتزلہ و روافض بھی اپنے مخالفین کو کافر قرار دیتے ہیں۔ یا کم از کم ان کی تفسیق کرتے ہیں۔ اکثر مبتدعین کا عام انداز یہ ہے کہ وہ ایک رائے کو تصنیف کرتے ہیں اور پھر اس کی مخالفت کرنے

والے پر کفر کا فتویٰ عائد کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں اہل سنت اس حق کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں؛ اور وہ اپنے مخالفین کو کافر نہیں ٹھہراتے، بلکہ وہ سب سے زیادہ حق کی واقفیت رکھتے ہیں اور مخلوقات پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے بھی وہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی بہبود کے لیے پیدا کیا گیا ہے''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''تم لوگوں کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہو۔''[1]

چونکہ اہل سنت سب لوگوں سے چیدہ برگزیدہ ہیں اس لیے وہ صحیح معنی میں اس آیت کے مصداق ہیں۔ وہی لوگوں کے لیے سب سے زیادہ بہتر [اور ان کے خیر خواہ] ہیں۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ ساحل شام پر ایک بڑا پہاڑ تھا۔ جس پر ہزاروں شیعہ بودو باش رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کا خون بہاتے اور ان کا مال چھین لیا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو قتل کیا اور ان کے اموال چھین لیے۔

جس سال مسلمانوں نے تاتاری بادشاہ غازان کے ہاتھوں شکست کھائی[2] تو اس پہاڑ پر رہنے والے شیعہ نے مسلمانوں کے گھوڑے، اسلحہ اور قیدیوں کو پکڑ کر کفار اور قبرص کے عیسائیوں کے پاس فروخت کر دیا۔ جو سپاہی وہاں سے گزرتا اس کو پکڑ لیتے۔ یہ مسلمانوں کے حق میں سب دشمنوں سے زیادہ ضرر رساں تھے۔''[3]

اس پہاڑ پر رہنے والے بعض شیعہ نصاریٰ کے علم بردار تھے۔ ان سے جب دریافت کیا جاتا کہ اہل اسلام اور نصاریٰ میں سے بہتر کون ہے؟ تو وہ کہتے: ''نصاریٰ'' پھر پوچھا جاتا تمہارا حشر کن کیساتھ ہوگا؟ تو وہ کہتے: ''نصاریٰ کے ساتھ۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ آل عمران۔ باب ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (ح:٤٥٥٧)۔

[2] اس پہاڑ کا نام الجرود کیردان تھا۔ جب غازان نامی بادشاہ دمشق پر حملہ آور ہوا تو اس پہاڑ کے باشندوں اور ان شیعہ نے جو یہاں سکونت رکھتے تھے اس موقع کو غنیمت خیال کیا۔ چنانچہ تاتاریوں سے شکست کھا کر جو سپاہی یا عام لوگ وہاں سے گزرتے یہ ان کو قتل کر دیتے اور ان کا ساز و سامان اور گھوڑے وغیرہ چھین لیتے۔ انھوں نے برملا اپنے عقائد فاسدہ اور کفر و ضلالت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے بلاد شام کو تاتار کے ظالمانہ چنگل سے رہائی بخشی تو نائب السلطنت جمال الدین اقوش الافرم دمشق سے لشکر لے کر اس پہاڑ کی جانب روانہ ہوا جیسا کہ البدایہ والنہایہ (۱۴/۱۲) پر لکھا ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لاتعداد اتباع و متعلقین کو لے کر اس پہاڑ کی جانب چل دیے۔ وہاں پہنچے تو بہت سے شیعہ سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اور اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ شیعہ نے لوٹا ہوا مال سب واپس کر دیا اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ امن و امان سے رہنے کا عہد باندھا۔ الافرم اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی روانگی کا مذکورہ واقعہ ۲۰ شوال کو پیش آیا اور ۱۳/ ذیقعد ۶۹۹ھ بروز اتوار واپس لوٹے۔

[3] غازان کا حملہ ۶۹۹ھ میں ہوا تھا۔ غازان التوفی (۶۷۰۔۷۰۳) شیعہ سلطان خدابندہ التوفی (۶۸۰۔۷۱۶) کا بھائی تھا۔ اسی خدابندہ نامی بادشاہ کے لیے ابن المطہر شیعہ نے وہ کتاب لکھی جس کی تردید شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنۃ میں کی ہے۔ شیخ الاسلام نے یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ دمشق ان دنوں حکومت مصر کے ماتحت تھا۔ مصر پر ان دنوں سلطان الناصر محمد بن قلاوون کی حکومت تھی۔ جس نے المنصور لاجین کو ۶۹۸ھ میں قتل کر کے مقام کرک کی جلاوطنی سے نجات پائی تھی۔ بلاد شام میں سلطان مصر کا نائب ان دنوں اقوش الافرم تھا۔ اقوش کا پیشرو سیف الدین قبجق المنصوری ایران میں جا کر تاتاری بادشاہ غازان سے مل گیا تھا۔ ۶۹۸ھ کو یہ خبر پہنچی کہ غازان ایران سے حلب کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ سلطان مصر محمد بن قلاوون جب اس سے آگاہ ہوا تو وہ ماہ محرم ۶۹۹ھ میں مصر سے غزہ پہنچ کر دو ماہ تک غازان کی نقل و حرکت کا منتظر رہا۔

ماہ ربیع الاول ۶۹۹ھ مطابق دسمبر ۱۲۱۹ء میں سلطان الناصر محمد بن قلاوون شدید سردی کے موسم میں دمشق پہنچا۔ سلطان نے رجال و اموال کی فراہمی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی یہاں تک کہ یتیموں کا مال بھی قرض لے لیا۔ آخر کار مورخہ ۲۷/ ربیع الاول ۶۹۹ھ وادی سلمیہ میں پہنچ کر [...... حاشیہ جاری ہے......]

سابقہ حاشیہ

[سابقہ حاشیہ]: تاتاریوں سے ملا، وہاں گھمسان کا رن پڑا۔ سلطان محمد بن قلاوون نے شکست کھائی اور غازان نے آگے بڑھ کر بعلبک پر قبضہ کرلیا۔ دمشق کے امراء وخواص سلطان الناصر کی پیروی میں مصر پہنچے اور دمشق حکام وولاۃ سے خالی رہ گیا۔ ادھر اہل شام نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کی کہ وہ غازان کے پاس جا کر قوم کے لیے امان طلب کریں۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے یہ درخواست قبول کرلی۔ آپ ڈرتے تھے مبادا تاتاری بدعہدی کریں اس لیے آپ نے امراء رجواش کو مل کر تاکید کی کہ قلعہ کے اندرونی انتظامات اچھی طرح مضبوط کیے جائیں اور تاتاریوں کو اسی وقت قلعہ میں داخل ہونے کی اجازت دیں جب وہ ایک ایک پتھر کرکے قلعہ کو مسمار کردیں۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ اہل شام کی رفاقت میں بروز سوموار ۳/ ربیع الاوّل ۶۹۹ھ کو غازان کی ملاقات کے لیے نکلے اور مقام النبک کے نزدیک اس سے ملے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے غازان کے ساتھ بڑے موثر اور پرزور طریقے سے بات چیت کی۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ (۱۴/ ۷) نیز (۸۹/۱۴) پر مشہور صالح وعابد شخص ابوعبداللہ محمد بن البالسی (۶۵۰ ـ ۷۱۸) کی زبانی یہ بات چیت تفصیلاً ذکر کی ہے۔ البالسی ان علماء وقضاۃ میں شامل تھے جو شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے ہمراہ غازان سے ملنے گئے تھے۔ البالسی کا بیان ہے کہ شیخ الاسلام نے غازان کو مخاطب کرکے کہا جب کہ ترجمان ساتھ ساتھ آپ کی گفتگو کا ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا:

''تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارے ساتھ موذن؛ قاضی اور امام بھی ہیں، پھر تم بلاد اسلامیہ پر کیوں حملہ آور ہوئے؟ تمہارے باپ دادا کافر تھے تاہم معاہدہ کرنے کے بعد انھوں نے اسلامی ممالک پر حملہ نہیں کیا تھا۔ مگر تم نے عہد باندھ کر بدعہدی کی اور اپنی بات کو پورا نہ کیا۔''

ابوعبداللہ البالسی بیان کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام نے غازان، قطلوشاہ اور بولائی کے ساتھ جو گفتگو کی اس میں کئی نشیب وفراز آئے۔ مگر شیخ نے حق وصداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور نہ اللہ کے سوا کسی سے ہراساں ہوئے۔ غازان نے ان علماء کو کھانا پیش کیا۔ ابن تیمیہ کے سوا سب نے کھانا کھایا جب آپ سے وجہ پوچھی گئی تو فرمایا۔ میں یہ کھانا کیوں کر کھا سکتا ہوں؟ یہ سب لوگوں سے چھینا ہوا مال ہے اور تم نے ناجائز طور پر لوگوں کے درخت کاٹ کر اسے پکایا ہے۔ غازان نے جب شیخ الاسلام رحمہ اللہ سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ! اگر غازان تیرے دین کی سربلندی اور نشر واشاعت کے لیے جنگ کررہا ہے تو اسے غلبہ عطا کر اور اسے عباد وبلاد کا مالک بنادے اور اگر حرص اقتدار اور شہرت کے لیے یہ جنگ آزما ہے اور اسلام اور اہل اسلام کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اسے ذلیل کرا سے برباد کردے اور اس کی جڑ کاٹ ڈال۔''

غازان ہاتھ اٹھا کر آپ کی دعا پر آمین کہتا جارہا تھا۔ عبداللہ البالسی کا بیان ہے کہ یہ دعا سن کر ہم اپنے کپڑے سمیٹ رہے تھے کہ جب ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو قتل کیا جائے تو ان کے خون سے ہمارے کپڑے آلودہ نہ ہو جائیں۔ جب غازان کے یہاں سے نکلے تو قاضی القضاۃ نجم الدین صصری نے کہا:

''آپ ہمیں بھی برباد کرنے لگے تھے اور آپ اپنے کو بھی، اللہ کی قسم! اب ہم آپ کے ساتھ نہیں چلیں گے۔'' شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں بھی آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتا۔'' چنانچہ یہ سب علماء ایک جماعت کی صورت میں چل دیے اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ چند اصحاب کے ساتھ تنہا رہ گئے، جب غازان کے خواص وامراء کو پتہ چلا تو وہ آپ کی دعا سے برکت حاصل کرنے کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ عازم دمشق تھے اور یہ امراء آ آ کر آپ کے ساتھ ملتے جارہے تھے۔ چنانچہ جب دمشق پہنچے تو تین صد سوار آپ کے ہم رکاب تھے۔ شیخ البالسی کا بیان ہے کہ میں بھی آپ کے ہمراہ تھا۔ جو علماء آپ کی رفاقت سے الگ ہوگئے تھے جب راستہ میں پہنچے تو تاتاریوں کی ایک جماعت نے ان سب کا مال ومتاع چھین لیا۔ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ (۱۴/ ۷) پر لکھتے ہیں:

''شیخ الاسلام کی گفتگو سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا اور دمشق میں امن وامان کا فرمان جاری ہوگیا۔ امن کا فرمان جاری کرنے کے دوسرے روز تاتاریوں نے مدرسہ قیمریہ میں ایک دربار منعقد کیا جس کا نام انھوں نے ''دیوان الاستخلاص'' رکھا۔ اس میں تاتاریوں نے یہ حکم جاری کیا کہ لوگوں نے جو گھوڑے اور ہتھیار اور مال ومتاع چھپا کر رکھا ہوا ہے وہ سب لا کر حاضر کردیں۔ سیف الدین قبجق المنصوری جو قبل ازیں تاتاریوں سے جا ملا تھا حاکم شام قرار پایا۔ المنصوری نے قلعہ دار کو قلعہ حوالہ کرنے کا حکم جاری کیا مگر اس نے انکار کردیا اور وہ مدافعت پر ڈٹا رہا۔ ربیع الثانی کے نصف میں تاتاریوں نے اپنے ہم نوا معاونین ارمن وکرج وغیرہ سے مل کر لوٹ مار کا آغاز کیا۔ انھوں نے ''جامع التوبہ'' کو نذر آتش کردیا اور ''الصالحیہ'' کو لوٹ کر اس کے مدارس پر دھاوا بولا اور جو علماء وہاں موجود تھے سب کو تہ تیغ کردیا۔ الصالحیہ کے رہنے والوں میں سے چار سو افراد کو قتل کیا اور چار ہزار کو قیدی بنالیا۔ جن میں الشیخ ابوعمر کے خاندان کے ستر افراد بھی تھے۔ شیخ ابوعمر امام الموفق مصنف المغنی والمقنع کے بھائی تھے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ۲۰/ ربیع الثانی کو بروز جمعرات تاتاری سلطان کو نصیحت کرنے اور ظلم وجور سے روکنے کے لیے نکلے مگر اس کے وزیر سعد الدین اور مشیر حکومت مسلمانی نے جو ایک یہودی زادہ تھا۔ شیخ کو اس سے باز رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوٹ مار کا بازار گرم رہا اور تاتاریوں نے دس ہزار سے زیادہ گھوڑے مسلمانوں سے چھین لیے۔ شہریوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جامع اموی میں قلعہ شکن آلات نصب [...... حاشیہ جاری ہے......]

انہوں نے مسلمانوں کے بعض شہر بھی ان نصاری کے زیر تسلط دے دیے تھے۔

بایں ہمہ جب بعض سلاطین نے ان کے خلاف جنگ آزما ہونے کے متعلق مجھ سے فتوی چاہا تو میں نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے اور میرے پاس ان کی ایک جماعت حاضر ہوئی۔ ہم نے انکے ساتھ کئی مرتبہ مناظرہ کیا جس کی تفصیلات طوالت کی موجب ہوں گی۔ جب مسلمانوں نے وہ علاقہ فتح کر لیا اور شیعہ ہر طرح سے ان کے قابو میں آ گئے تو میں نے شیعہ کو قتل کرنے اور قیدی بنانے سے روکا۔ ہم نے ان کو متفرق مقامات پر بھیج دیا تا کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو پائیں۔ میں نے اس کتاب میں شیعہ کی ضلالت و جہالت سے متعلق جو کچھ ذکر کیا ہے وہ ان معلومات کے مقابلہ میں مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہیں جو میں شیعہ کے متعلق رکھتا ہوں۔ علاوہ ازیں شیعہ میں اور بھی بہت سے نقائص ہیں جن کو میں بھی نہیں جانتا۔

شیعہ کے ساتھ ہمارا طرز عمل یہ ہے کہ ہم کتاب ہذا کے مصنف ابن المطہر اور اس کے نظائر و امثال کے سامنے ان کا وہ سلوک پیش کرتے ہیں جو انھوں نے امت کے سلف اور خلف کے ساتھ روا رکھا۔ شیعہ کا یہ کمال کیا کم ہے کہ انھوں نے انبیاء کے بعد کرہ ارضی پر بسنے والوں میں سے افضل الاوّلین والآخرین؛ جنہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی پیدا کیا تھا؛ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین پر افتراء پردازی کا بیڑا اٹھایا اور ان کے نیک اعمال کو افعال قبیحہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان پر بڑے بڑے بہتان گھڑے۔ دوسری طرف فرق ہائے ضالہ کے سرخیل یعنی شیعہ کو؛ جو کئی فرقوں میں منقسم ہیں، مثلاً امامیہ، زیدیہ اور غالی شیعہ وغیرہ؛ اس کائنات ارضی کی چیدہ و برگزیدہ مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اللہ جانتا ہے کہ جتنے فرقے بھی اسلام کی طرف منسوب ہیں ان میں کوئی فرقہ بھی بدعت و ضلالت کے باوجود شیعہ سے بڑھ کر جاہل، کاذب اور ظالم ہے نہ ہی کفر و فسق اور عصیان سے قریب تر اور ایمانی حقائق سے بعید تر ہے۔

شیعہ پوری امت محمد ﷺ کی تکفیر و تضلیل کرتے ہیں اور اپنے متعلق کہتے ہیں کہ صرف شیعہ ہی حق پر اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ

[سابقہ حاشیہ]: کر دیے تا کہ وہاں سے قلعہ پر پتھر پھینکے جائیں۔ تاتاریوں نے مسجد میں داخل ہو کر اس کے دروازے بند کر دیے اور آس پاس کے بازاروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ مورخہ ۱۹/ جمادی الاولیٰ کو غازان دمشق میں بولائی کے زیر قیادت ساٹھ ہزار جنگجو چھوڑ کر عراق کے راستہ واپس لوٹ گیا۔ تاتاری قلعہ کو فتح نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب غازان اور اس کا نائب قطلوشاہ وہاں سے چلے گئے تو قلعہ والوں نے مسجد پر حملہ کر کے قلعہ شکن آلات کو توڑ پھوڑ ڈالا اور تاتاریوں کے بعض معاونین کے ساتھ واپس قلعہ میں لوٹ آئے۔ تاتاریوں کے ان احباب و انصار کا سرخیل محمد بن محمد بن احمد بن المرتضیٰ تھا اس کو وہ شریف القمی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ قتل و غارت کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔

علم الدین البیرزالی نے ابن المنجا سے نقل کیا ہے کہ دمشق سے جو مال غازان کے خزانہ میں پہنچا، اس کی تعداد چھتیس لاکھ درہم تھی۔ ٹیکس اور رشوت اس میں شمار نہیں۔ شیخ المشائخ کو اس میں سے چھ لاکھ درہم ملے تھے؛ بدنصیب خواجہ طوسی کے حصہ میں ایک لاکھ درہم آئے۔ بدکاری و شراب نوشی کا دور چلنے لگا۔ سیف الدین قبجق کی یومیہ آمدنی ایک ہزار درہم تھی۔ مدارس کے اوقاف میں سے وہ جو کچھ چھینا کرتا تھا وہ اس پر مزید ہے۔ تاتاری سپہ سالار بولائی کے خیمہ میں بہت سے قیدی تھے۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ آغاز رجب میں بولائی کے یہاں گئے۔ اور قیدیوں کو رہا کرنے کے بارے میں اس کے ساتھ بات چیت کی۔ بولائی نے تعمیل ارشاد کر دی۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے تین دن وہاں قیام کیا اور پھر واپس لوٹ آئے۔ اسی اثنا میں یہ خبر پہنچی کہ مصری لشکر عازم دمشق ہے۔ چنانچہ بولائی غازان کی فوج کو لے کر دمشق سے چل دیا اور وہاں کوئی حاکم بھی موجود نہ رہا۔ بولائی کے کوچ کی خبر سن کر امیر ارجواش قلعہ سے نکلا اور شیخ الاسلام رحمہ اللہ ابن تیمیہ کی مدد سے فصیل شہر کی حفاظت کے لیے ایک فوج مرتب کی۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ ہر رات فصیل کے ارد گرد چکر لگاتے۔ اور آیات قرآنیہ تلاوت کر کے لوگوں کو جہاد و قتال اور صبر و شکر کی ترغیب دلایا کرتے تھے۔ سو دن تک خطبہ میں غازان کا نام لیا جاتا تھا۔ اب پھر سے خطبہ میں سلطان مصر کا نام لیا جانے لگا۔ شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے شہر میں جو شراب خانے اور قحبہ خانے تھے سب بند کرا دیے۔ نائب دمشق جمال الدین اقوش الافرم شامی لشکر سمیت مصر سے واپس لوٹا اس کے بعد باقی لشکر بھی مصر سے دمشق پہنچ گیا۔ یہ عظیم مصیبت وسط شعبان ۶۹۹ ھ کو ختم ہوئی۔

و چنیدہ مخلوق ہیں ۔اور یہ ضلالت پر کبھی جمع نہیں ہو سکتے ۔ گویا شیعہ سب بنی نوع انسان سے اعلیٰ و اولیٰ ہیں ۔

شیعہ کی مثال یوں ہے جیسے کوئی شخص ایسی جگہ جائے جہاں بہت سے بکریاں ہوں ۔اور بکریوں کے مالک سے کہے کہ مجھے قربانی کے لیے بہترین بکری دو ۔ بکریوں کا مالک یوں کرے کہ ایک بدترین لنگڑی لولی بیمار بکری کی جانب اشارہ کر کے کہے کہ یہ سب سے عمدہ بکری ہے ۔اس کے سوا کوئی بکری قربانی کے لائق ہی نہیں ۔ جب کہ باقی بکریاں ؛ بکریاں ہی نہیں بلکہ واجب القتل خنزیر ہیں ۔ پس صرف اسی لولی لنگڑی بکری کی قربانی ہو سکتی ہے ۔ احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے مومن کو منافق سے بچالیا ۔ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اس کے گوشت کو جہنم کی آگ سے بچائے گا ۔''[1]

یہ روافض یا تو جاہل ہوتے ہیں یا منافق ۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی رافضی یا جہمی منافق نہ ہو یا نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے جاہل نہ ہو ۔ شیعہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو نبی کریم ﷺ کے اقوال کو جانتا اور ان کو مانتا بھی ہو ۔ ارشادات نبویہ سے شیعہ کا فرار اور نبی کریم ﷺ پر افتراء پردازی صرف اسی شخص سے پوشیدہ رہتی ہے جو جہالت اور ہوئی پرستی میں حد سے تجاوز کر گیا ہو ۔ شیعہ مصنفین اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں کہ ان کے اکثر اقوال صریح کذب کے آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ مگر وہ اپنے اقتدار و اختیار کو باقی رکھنے کے لیے ایسی کتابیں لکھتے رہتے ہیں ۔

ابن المطہر کا دامن بھی اس تہمت سے ملوث ہے ۔ مگر اس نے یہ زحمت اپنے اتباع کو متاثر کرنے کے لیے گوارا کی ۔ اگر کوئی مصنف جانتا ہو کہ اس کی بات جھوٹ ہے اور اس کے باوجود اسے من جانب اللہ حق قرار دیتا ہو تو وہ علماء یہود کی جنس میں سے ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾ (البقرۃ:۷۹)

''ایسے لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو کتاب تو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں ۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ یہی اللہ کے ہاں سے ہے ۔ تاکہ اس سے تھوڑے سے دام لے سکیں ۔ ان کے ہاتھ کی تحریر بھی ان کے لیے بربادی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے ہلاکت کا سبب ہے ۔''

اور اگر وہ اسے حق سمجھتا ہے تو یہ اس کی جہالت و ضلالت کا کھلا ہوا ثبوت ہے ۔[بقول شاعر:]

''اگر تمہیں اس کا علم ہے تو یہ بہت بڑی مصیبت ہے ۔ اور اس کا علم نہیں تو پھر مصیبت اس سے بھی بڑی ہے ۔''

شیعہ کے دین میں عقلیات اور شرعیات ہیں ۔ عقلیات میں ان کے متاخرین معتزلہ کے پیروکار ہیں ۔ سوائے ان چند لوگوں کو کے جو اپنے تئیں فلسفی بننے کی کوششیں کرتے ہیں ۔ پس ان کا کلام یا تو فلسفہ پر مشتمل ہوتا ہے یا پھر اس میں فلسفہ اور اعتزال کی آمیزش ہوتی ہے ؛ اور اس کے ساتھ ان کی اپنی رافضیت بھی مل جاتی ہے ۔ جیسا کہ اس کتاب ''[منہاج الکرامہ]'' اور اس جیسی دوسری کتابوں کا حال ہے ۔ اس وجہ سے شیعہ اللہ اور اس کے رسول اور عوام مسلمین سے سب لوگوں سے دور تر ہوتے چلے جاتے ہیں ۔

جب کہ شرعیات میں ان کی بنیاد ان روایات پر ہے جو [ان کے تئیں] اہل بیت سے منقول ہیں ۔ جیسے ابوجعفر الباقر ؛ اور

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب ـ باب من رد عن مسلم غیبۃ (حدیث:٤٨٨٣)، مسند احمد(٣/ ٤٤١)، بمعناہ ـ

جعفر بن محمد الصادق اور دوسرے علماء [کی طرف منسوب روایات]۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے سرداروں اور سرکردہ لوگوں میں سے اور ائمہ دین ہیں ۔اور ان کے اقوال کی بھی وہی عزت و احترام ہے جو ان جیسے دوسرے علماء کے اقوال کا ہے ۔لیکن ان سے جو روایات نقل کی گئی ہیں ان میں سے اکثر جھوٹ پر مشتمل ہیں ۔ رافضیوں کو روایات کی اسانید کا کوئی علم وخبر نہیں ہوتے ۔ اور نہ ہی وہ ثقہ اور ضعیف کے درمیان فرق کر سکتے ہیں ۔ بلکہ اس معاملہ میں وہ اہل کتاب کے مشابہ ہیں ۔ یہ لوگ اپنی کتابوں میں اپنے اسلاف سے منقول جو بھی بات پاتے ہیں' اسے قبول کر لیتے ہیں ۔ بخلاف اہل سنت والجماعت کے ۔اہل سنت والجماعت کو اسانید کا علم ہے جس کی بنا پر وہ جھوٹ اور سچ میں تمیز کر سکتے ہیں ۔

جب حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ سے کوئی روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو ان کے امثال کا نمونہ ومقتدائی بھی موجود ہے جیسے قاسم بن محمد اور سالم بن عبداللہ وغیرہ رحمہم اللہ ۔ جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا معاملہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ تھا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء ۵۹]

''اگر کسی معاملہ میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا دو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ متنازعہ فیہ امور کو فیصلہ کے لیے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے ۔ رافضی قرآن مجید کو حفظ کرنے کا اہتمام نہیں کرتے ۔اور نہ ہی اس کے معانی اور تفسیر کو جانتے ہیں ۔ اور نہ ہی اس کے معانی و مفاہیم سے استدلال کرنے کا طریقہ جانتے ہیں ۔ایسے ہی یہ لوگ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی کوئی اہتمام نہیں کرتے ۔ اور نہ ہی انہیں صحیح اور ضعیف حدیث کی کوئی معرفت ہوتی ہے ۔ احادیث کے معانی و مفاہیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں ۔ آثار صحابہ و تابعین کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ ان کے مسلک اور ماخذ کا پتہ چل سکے؛ اور اختلاف کے وقت آیات قرآنیہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کے لیے پیش کیا جائے ۔ بلکہ ان کا سارا سرمایہ وہ روایات ہیں جنہیں اہل بیت کی طرف منسوب کر کے نقل کیا جاتا ہے ۔

اثبات شریعت میں شیعہ کے اصول:

اس بارے میں شیعہ کے تین بنیادی اصول ہیں :

۱۔ ان ائمہ میں سے ہر ایک امام معصوم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منزلت پر ہے ۔امام معصوم حق کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا ۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے' اس میں اس کی مخالفت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں ۔اور جس میں معاملہ میں کوئی دوسرا امام کے ساتھ اختلاف کرے تو اسے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی نہیں لوٹایا جائے گا ۔

۲۔ ان ائمہ میں سے کوئی ایک جو بھی بات کہتا ہے؛ اس کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ کہنا چاہتا ہے : جو میں کہتا ہوں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر رہا ہوں ۔افسوس کہ اگر یہ لوگ اس بارے میں تابعین جیسے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کی مراسیل پر ہی انحصار کر لیتے ۔ بلکہ وہ ان لوگوں کی روایات لیتے ہیں جو بہت متاخر ہیں جیسے حسن عسکری کے ماننے والے ۔ ان کا کہنا ہے کہ ان ائمہ میں سے جو کوئی بھی کوئی بات کہتا ہے؛ حقیقت میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ ہوتی ہے ۔

جس انسان کو ادنی سی بھی عقل ہو وہ جانتا ہے کہ عسکریین کی وہی اہمیت ہے جو اس دور کے باقی ہاشمیوں کی ہے۔ان کے پاس کوئی ایسا علم نہیں ہے جس کی وجہ سے باقی لوگوں سے امتیازی حیثیت رکھتے ہوں ۔اور باقی اہل علم اس کے محتاج ہوں ۔اور نہ ہی اہل علم ان سے کوئی روایت نقل کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ اپنے دور کے علماء سے نقل کرتے رہتے تھے۔یا پھر جیسے حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ اور ان کے بیٹے ابو جعفر اور پوتے محمد بن جعفر کے زمانے میں اہل علم تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل علم نے ان تینوں حضرات سے علم حاصل کیا ہے' اور ان سے اور ان جیسے دوسرے علماء سے روایات نقل کی ہیں ۔بخلاف عسکریین اور ان کی امثال کے۔اس لیے کہ معروف اہل علم نے ان سے علم حاصل نہیں کیا؛[اور نہ ہی ان سے کوئی معروف روایت نقل کی گئی ہے]۔مگر پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان متاخرین ائمہ میں سے کسی ایک نے جو کوئی بات کہی ہے اسے وہ قول رسول اللہ ﷺ کا درجہ دیدیں۔اور قرآن اور سنت متواترہ کی منزلت پر رکھیں ۔ ایسی باتوں پر اپنے دین کی بنیاد وہی قائم کرسکتا ہے جو لوگوں میں سے سب سے زیادہ اہل علم و ایمان کے طریقہ سے سب سے زیادہ دور ہو۔

۳۔ ان کا تیسرا اصول یہ ہے کہ: رافضیوں کا اجماع اہل بیت کا اجماع تصور کیا جاتا ہے۔اور اہل بیت کے اجماع کو معصوم مانتے ہیں ۔[اس سلسلہ میں دو مقدمات ہیں:] پہلا مقدمہ [یعنی رافضی اجماع اہل بیت کا اجماع ہے] یقیناً باطل اور جھوٹ ہے۔دوسرے مقدمہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔پس وہ اقوال جن میں سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی' رافضیوں کے ہاں وہ قرآن و سنت اور اجماع امت کی منزلت پر ہیں۔

❀ جو بھی عقل مند انسان دین اسلام کو جانتا ہے' اس پر اس تصور کی حقیقت کھل جاتی ہے۔یہ لوگ نمکین کھانے میں کڑوی اور درشت چیزوں کو ملاوٹ کرنا چاہتے ہیں۔خصوصاً وہ لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں جو اہل علم و تجربہ ہیں۔خاص طور پر وہ محدثین اس حقیقت سے آگاہ ہیں جن کے حقیقی امام ؛امام معصوم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث موجود ہیں ۔وہ رسول جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی کے بغیر اپنی مرضی سے بات تک نہیں کرتے۔

یہ بھی جانتے ہیں کہ رافضی اپنے ائمہ کو ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی جانب مبعوث کیا گیا رسول قرار دیتے ہیں؛ اور انہی سے اپنا دین اخذ کرتے ہیں ۔ جسے ان کا امام حلال کہہ دے اسے حلال' اور جسے حرام کہہ دے اسے حرام سمجھتے ہیں۔دین وہی ہے جو امام نے مشروع کیا ہو۔اور ہر وہ قول جو امام کے قول کے مخالف ہو وہ ان کے ہاں مردود ہے۔بھلے اس قول کا قائل مسلمانوں کے بہترین علماء میں سے ہو؛ اور ان سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔وہ اپنے اجتہاد پر ماجور بھی ہو۔

لیکن [اس کے برعکس اہل سنت والجماعت] قول اللہ اور قول رسول سے کبھی بھی اعراض نہیں کرتے ؛ اور نہ ہی [قول رسول کو چھوڑ کر] کسی غیر کے قول یا کسی کی رائے کی ان کے ہاں کوئی اہمیت ہے۔رسول اللہ ﷺ کے سوا جتنے بھی اہل علم ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ پیغام ہم تک پہنچانے میں واسطہ و وسیلہ ہیں۔یا تو وہ براہ راست وہی الفاظ نقل کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوں' یا پھر بالمعنی روایت کرتے ہیں۔[مگر ہر صورت میں وہ تبلیغ رسالت کا ہی کام کرتے ہیں]۔ایک جماعت نے قرآن و حدیث کو جیسے سنا ویسے ہی آنے والوں تک پہنچا دیا' اور ایک جماعت نے احادیث رسول اللہ ﷺ میں غور و فکر کیا ؛ اس کا تفقہ و تدبر حاصل کیا' معانی کی معرفت حاصل کی ۔اور جس چیز میں ان کا

اختلاف ہوا اسے فیصلہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر پیش کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کبھی بھی حدیث رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی قول پر جمع نہیں ہوئے۔ اور حق کبھی بھی ان سے خارج نہیں ہوا۔ ہر وہ چیز جس پر ان کا اجماع ہوا ہو' وہ وہی ہو سکتی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو۔

اور ہر وہ فرقہ جس نے اہل سنت والجماعت کی مخالفت کی ہو' خواہ وہ خارجی ہوں یا رافضی؛ معتزلی ہو یا جہمی یا کوئی دوسرا اہل بدعت؛ حقیقت میں وہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر رہا ہوتا ہے۔ اور اسلام کی طرف منسوب فرقوں میں سے کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں ہے جو رافضیوں سے بڑھ کر حدیث رسول اللہ ﷺ سے دور ہو۔

فصل:

رافضی یہودی مشابہت

اس لیے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جن اقوال میں ان لوگوں نے اہل سنت والجماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے' ان میں انتہائی فساد کا شکار ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مغرب کی نماز میں اتنی تاخیر کرتے ہیں یہاں تک کہ ستارہ طلوع ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ نماز مغرب جلدی پڑھنے کی تاکید منقول ہے۔

ایسے رافضی لوگوں سے دو روز پہلے روزہ رکھتے ہیں۔ اور دو دن پہلے افطار کرتے ہیں۔ اس میں ان اہل بدعت کی پیروی کرتے ہیں جو جوڑ کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ اور گنتی کے حساب سے روزے پورے کرتے ہیں۔ صحیحین میں نبی کریم ﷺ سے روایت ہے؛ آپ نے فرمایا: ''ہم لوگ ان پڑھ قوم ہیں لکھنا پڑھنا اور حساب کرنا نہیں جانتے؛ جب تم چاند کو دیکھو تو روزہ رکھ لو؛ اور جب چاند دیکھو تو افطار کر لو؛ اور اگر تم پر بادل چھا جائیں تو اس گنتی کا اندازہ لگا لو۔''

اور ایک روایت میں ہے: ''پس پھر تم اس کی تعداد مکمل کر لو۔'' [صحیح بخاری:ح۱۸۰۸]

- ان میں سے بعض روافض یہودیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مچھلی [کی ایک خاص قسم مرماہی] کو حرام کہتے ہیں۔ اور بعض دوسری پاکیزہ چیزوں کو بھی حرام کہتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کے خلاف جنگوں میں کافروں کی مدد کرتے ہیں۔ اور کفار کو مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اسلامی فرقوں میں سے کسی دیگر کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کوئی فرقہ ایسی حرکتیں کرتا ہو۔
- نیز جن مائع چیزوں کو اہل سنت والجماعت کے ہاتھ لگ جائیں انہیں نجس سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل سامریوں کے دین کی جنس سے ہے۔ سامری یہودیوں کے رافضی ہیں۔ یہودیوں میں ان کا وہی مقام ہے جو مسلمانوں میں رافضیوں کا ہے۔ رافضی کئی ایک امور میں سامریوں کے مشابہ ہیں۔ [مثال کے طور پر]:
- سامری حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت ہارون اور حضرت یوشع علیہما السلام کے علاوہ کسی نبی کو نہیں مانتے۔ ایسے ہی رافضی بھی خلفاء اور صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کی امامت یا فضیلت کے قائل نہیں۔
- سامری ان مائع چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں انکے علاوہ کسی اور کے ہاتھ لگے ہوں۔ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔
- سامری اپنے علاوہ کسی کے ہاتھ کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔ رافضی بھی ایسے ہی کرتے ہیں؛ یہ لوگ اہل کتاب کے ذبیحہ کو حرام کہتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر لوگ جمہور مسلمین کے ذبیحہ کو حرام کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جمہور مسلمین ان کے ہاں مرتد

ہیں ۔اور مرتد کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں ہے۔

❀ سامریوں میں بھی تکبر' رعونت ؛ حماقت اور جھوٹے دعوے پائے جاتے ہیں۔حالانکہ وہ خود قلت اور ذلت کا شکار ہیں ۔ رافضیوں کا بھی یہی حال ہے۔

❀ رافضی پانچ نمازوں کو تین بنا کر پڑھتے ہیں۔رافضی ہمیشہ ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نماز کو جمع کر کے پڑھتے ہیں۔یہ مسلک رافضیوں کے علاوہ امت کے کسی اور فرقے نے اختیار نہیں کیا۔ یہ یہودیوں کے دین سے مشابہت ہے جن کے ہاں صرف تین ہی نمازیں پائی جاتی ہیں۔

❀ ان کے غالی عبادت گزار اپنے اصحاب پر چاشت ؛ وتر اور قیام اللیل کو بھی واجب کرتے ہیں۔اس طرح ان کے ہاں روزانہ کی سات نمازیں ہوجاتی ہیں ۔ یہ عیسائیوں کا دین ہے۔

❀ رافضی نماز باجماعت اور جمعہ کا اہتمام نہیں کرتے ۔ نہ ہی اپنے شیعہ کے پیچھے اور نہ ہی کسی دوسرے کے پیچھے؛[کسی بھی طرح]نماز باجماعت نہیں پڑھتے ۔ یہ بات باقی کسی فرقہ میں اتنی زیادہ نہیں پائی جاتی جتنی شیعہ میں پائی جاتی ہے۔ باقی سارے فرقے صرف اپنے ہم مسلک لوگوں کے پیچھے نماز باجماعت اور جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔جیسا کہ معتزلہ اور خوارج ۔ جب کہ شیعہ رافضی تو کسی طرح بھی ان چیزوں کا اہتمام ہی نہیں کرتا۔ یہ بدنصیبی صرف رافضیوں کے حصہ میں آئی ہے۔

❀ رافضی نماز میں آمین نہیں کہتے ۔امت کے کسی دوسرے فرقہ میں یہ بات نہیں پائی جاتی ۔ یہ اصل میں یہودیوں کا دین ہے۔ یہودی آمین کہنے پر اہل ایمان سے حسد کرتے ہیں ۔

❀ بعض لوگوں نے بعض رافضیوں سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ اونٹ کے گوشت کو حرام کہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار ہوئی تھیں ۔ یہ بھی ایک کھلا ہوا کفر ہے؛ جو کہ اصل میں یہود کا دین ہے۔

❀ ان کے بہت سارے عوام کہتے ہیں کہ: عورت کی رضامندی کے بغیر طلاق نہیں ہوتی ۔جب کہ ان کے علماء اس کا انکار کرتے ہیں' ان کے علاوہ کسی ایک نے بھی یہ بات نہیں کہی۔

❀ رافضی کہتے ہیں: امام منتظر پر ایمان لانا واجب ہے ۔امام منتظر موجود ہے' مگر غائب ہے ۔ نہ ہی اس کی ذات کا کوئی پتہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی نشانی پائی جاتی ہے' اور نہ ہی حس اور خبر سے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکا۔مگر ان کے ہاں امام منتظر پر ایمان لائے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

❀ شیعہ کہتے ہیں: دین کے چار اصول ہیں: توحید؛ عدل؛ نبوت اور امامت ۔ اور ان کے ہاں امامت کی انتہاء امام معصوم پر ہوتی ہے جو کہ آنکھوں سے غائب ہے ۔لیکن شہروں میں موجود ہے۔ وہ دینار کو سمندر کی گہرائیوں سے نکال لائے گا۔ یہ امام سن دو سو ساٹھ ہجری میں سرداب سامرا میں چھپ گیا تھا۔اس وقت اس کی عمر دو سال' یا تین سال' یا پانچ سال تھی یا اس کے قریب قریب ۔ پھر اس وقت سے لے کر اب تک اس کی کوئی خبر معلوم نہیں ہوسکی۔لوگوں کا دین اس کو تفویض کیا گیا ہے۔ پس حلال وہی ہے جسے وہ امام حلال کہہ دے اور حرام وہی ہے جسے امام حرام کردے۔ اور دین وہی ہے جو اس امام کی مقرر کردہ شریعت ہو۔ اس امام سے اللہ کے بندوں میں سے کسی ایک کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔

❀ ایسے رافضی ان لوگوں کے نام پر نام رکھنا بھی ناپسند کرتے ہیں جن سے یہ بغض رکھتے ہوں؛ اور ان اسماء والوں سے محبت

رکھتے ہیں جن کے نام ان لوگوں کے نام پر ہوں جن سے محبت رکھتے ہیں۔اس کا خیال نہیں کرتے کہ یہ مسمیٰ کون ہے؟

- رافضی کوئی کام دس کی تعداد میں کرنے کو؛ اور دس کی تعداد بولنے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ عشرہ مبشرہ کی تعداد دس ہے۔
- جن لوگوں سے رافضی بغض رکھتے ہیں' جیسے عمر و عائشہ؛ ان سے تشفی اس طرح حاصل کرتے ہیں لال رنگ کی بھیڑ یا دُنبی کو پکڑ کر عذاب دیتے ہیں۔اور کہتے ہیں: یہ عائشہ ہے۔اور ایسے ہی سانڈھ کو پکڑ کر مار پیٹ کرتے ہیں اور اسے عمر سے تعبیر کرتے ہیں۔یہ حماقت رافضیوں کے علاوہ کسی دوسرے فرقہ کے نصیب میں نہیں آئی۔
- ایسے ماتم اور گریہ زاری کی مجالس قائم کرتے ہیں۔اپنے گال پیٹتے ہیں اور گریبان پھاڑتے ہیں۔اور خاک اڑاتے ہیں۔ ایسے ہی نمکین چیزیں کھاتے ہیں تا کہ پیاس لگے؛ جب پیاس لگ جائے تو پھر پانی نہیں پیتے؛ تا کہ مظلومیت کی حالت میں پیاسے قتل ہونے والوں کی مشابہت اختیار کریں۔کسی کے قتل ہونے کے پانچ سو[اب ساڑھے تیرہ سو] سال بعد بھی ماتم اور گریہ وزاری کرنا یہ صرف رافضی نصیب میں آئی ہے۔کسی اور کے بارے میں ایسی کوئی خبر نہیں مل سکی۔

رافضیوں کی اچھوتی باتیں جو کہ ان کی جہالت وگمراہی پر دلالت کرتی ہیں؛ بہت زیادہ ہیں۔ یہاں پر یہ امور ذکر کرنا ہمارا مقصد نہیں۔ہمارا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اہل سنت والجماعت جو کہ رسول اللہ ﷺ کے آثار کی پیروی کرنے والے ہیں؛ ان سے جتنے بھی فرقوں نے اختلاف کیا ہے' رافضی ان سب سے دو قدم آگے جا رہے ہیں۔

فصل:

[اصحاب محمد ﷺ کی منزلت]

جب سلف صالحین نے یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے لیے مغفرت طلب کرنے کا حکم دیا ہے تو شیعہ نے اس کے برعکس ان کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ نبی کریم ﷺ نے صحیح حدیث میں فرمایا ہے:

''لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ۔'' ''میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔'' [سبق تخریجه]

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ صحابہ کو گالی دینا حرام ہے۔استغفار کا حکم اور گالی دینے کی مخالفت یہ دونوں عام حکم ہیں، کسی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:''مسلم کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔'' [سبق تخریجه]

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (الحجرات: 11)

''اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں۔اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے کہ یہ ان سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ؛ اور نہ کسی کو برے لقب دو؛ ایمان کے بعد فسق برا نام ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ ﴾ (التوبة:۵۸)

''اور بعض لوگ صدقات کے بارے میں آپ کو طعن دیتے ہیں۔''

یعنی آپ پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور عیب لگاتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ﴾[التوبة ۷۹]

''جو لوگ ان مسلمانوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَلَا تَلْمِزُوا اَنْفُسَكُمْ ﴾[الحجرات ۱۱]

''آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ۔''

اور فرمان الٰہی ہے:﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ﴾[النور ۱۲]

''اسے سنتے ہی مومن مردوں عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾[البقرة ۵۴]

''اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴾[الهمزة ۱]

''بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے۔''

همز : کہتے ہیں: شدت کے ساتھ عیب جوئی اور طعنہ زنی کرنے۔

جب کہ عموماً مؤمنین کے لیے استغفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾ [محمد۱۹]

''اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگا کریں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے حق میں بھی۔''

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مرجانے والے اہل ایمان کے لیے نماز جنازہ پڑھنے[اور دعائے مغفرت ورحمت کرنے کا حکم دیا ہے]۔ اور نبی کریم ﷺ منافقین کے لیے بھی استغفار کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو اس سے روک دیا گیا۔ پر ہر وہ مسلمان جس کے بارے میں منافق ہونے کا علم نہ ہو؛ اس پر نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لیے استغفار کرنا جائز ہے۔

بھلے ان میں کوئی بدعات اور فسق و فجور کے کام بھی پائے جاتے ہوں۔ لیکن ہر ایک پر واجب نہیں ہے کہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں۔ اس لیے کہ بدعت کی طرف دعوت دینے والے یا کھلے عام گناہ کا کام کرنے والی کی نماز جنازہ نہ پڑھنے میں باقی لوگوں کے لیے تنبیہ اور ڈراوا ہے۔ پس نماز جنازہ پڑھنا ترک کرنا ان لوگوں کے لیے جائز ہے جن کا جنازہ چھوڑنا لوگوں کے لیے عبرت اور ڈر کا باعث ہو سکتا ہو۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خودکشی کر لینے والے کے بارے میں فرمایا:''اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔''

اور ایسے ہی ایک مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کے بارے میں فرمایا:''اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔''

ایسے ہی جب حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: آپ کا بیٹا ساری رات نہیں سویا؛ تو آپ نے پوچھا:''کیا بدہضمی سے؟ انہوں نے کہا: ہاں بدہضمی کی وجہ سے۔'' آپ نے فرمایا: اگر وہ مرجاتا تو میں اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتا؛ کیونکہ ایسا کرنا

خودکشی ہے۔'' [یعنی اتنا زیادہ کھالینا جس سے بدہضمی ہو]۔

بہر کیف اسلام کا اظہار کرنے والے مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں: یا تو وہ سچا مؤمن ہوگا یا پھر منافق ہوگا۔ جس کے منافق ہونے کا پتہ چل جائے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور نہ ہی اس کے لیے استغفار کیا جائے۔ اور جس کے نفاق کا علم نہ ہو اس کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے اور اس کے لیے استغفار بھی کیا جائے۔ جب کسی ایک آدمی کو کسی کے منافق ہونے کا علم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھے اس کی نماز جنازہ وہ پڑھے جسے اس کے نفاق کا علم نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس انسان کی نماز جنازہ نہیں پڑھا کرتے تھے جس کی نماز جنازہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نہ پڑھیں۔ اس لیے کہ غزوہ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے آپ کو ان منافقین کے بارے میں بتایا تھا جو آپ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ گناہ کی وجہ سے دنیا میں انسان کو ملنے والی عقوبت اور اس کی نماز جنازہ اور اس کے لیے استغفار کے مابین کوئی منافات نہیں ہے۔ اس لیے کہ چور؛ زانی؛ اور شرابی پر حد قائم کی جاتی ہے؛ مگر اس کے باوجود ان کے لیے دین و دنیا کی بھلائی کی دعا کی جاتی ہے؛ اور ان کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ سزائیں مجرمین کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ارادہ رحمت و احسان سے صادر ہوئی ہیں۔

اس لیے ایسے جرائم پر لوگوں کو سزا دینے والے کو چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ رحمت اور احسان کا قصد کرے۔ جس طرح کہ باپ اپنے بچے کو ادب کی نیت سے سزا دیتا ہے۔ اور طبیب کا قصد مریض کا علاج ہوتا ہے۔ بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہارے لیے والد کی منزلت پر ہوں۔'' [سنن ابو داؤد 'کتاب الطھارۃ]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾ [الأحزاب ٦]

''پیغمبر مومنوں پر خود ان سے بھی زیادہ حق رکھنے والے ہیں اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔''

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''تم لوگوں میں سے ان کے لیے بہترین لوگ ہو' تم انہیں زنجیروں میں جکڑ کر لاتے ہو تاکہ انہیں جنت میں داخل کرسکو۔''

اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ یہ امت بنی آدم میں سے بہترین امت ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگوں کو سزا دیتے ہیں انہیں قتل کرتے ہیں اور قیدی بناتے ہیں؛ اس سے مقصود ان کے ساتھ احسان کرنا ہوتا ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کی کرامت اور اس کی رضامندی کی طرف نکالنا ہے تاکہ جنت میں داخل ہوسکیں۔

یہی حال اہل بدعت روافض اور دوسرے لوگوں پر رد کا ہے۔ اگر اس سے مقصود ان کے لیے حق بیان کرنا' اور خلق کی ہدایت اور ان کے لیے رحمت اور ان کے ساتھ احسان نہ ہو تو پھر یہ عمل نیکی کا کام نہیں ہوسکتا۔ جب انسان بدعت یا گناہ کی

مذمت میں سختی کرتا ہے تو اس سے مقصود اس گناہ یا بدعت میں موجود برائی کا بیان کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگ اس سے بچ سکیں۔ جیسا کہ نصوص کی وعید میں پایا جاتا ہے۔ کبھی کسی گناہ کی وجہ سے کسی انسان سے لاتعلقی اختیار کی جاتی ہے' اس سے مقصود اس انسان کو خبردار کرنا اور گناہ و بدعت سے روکنا ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے رحمت اور احسان کا مظہر ہے تشفی اور انتقام کا مظہر نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین صحابہ سے قطع تعلقی کر لی تھی۔ جب غزوہ سے پیچھے رہ جانے والے اپنا اپنا عذر پیش کرنے کے لیے آئے؛ اور جھوٹی قسمیں اٹھا کر عذر پیش کرتے رہے۔ مگر یہ تین حضرات آئے اور انہوں نے سچ بولا؛ اور انہیں قطع تعلقی کی سزا سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر اللہ تعالیٰ۔ نے ان کی سچائی کی برکت سے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اس کی بنیاد دو مسئلوں پر ہے:

پہلا مسئلہ: گناہ کی وجہ سے گنہگار کا کفر لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ خوارج کہتے ہیں۔ بلکہ ایسا انسان ہمیشہ جہنم میں بھی نہیں رہے گا؛ اور نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے محروم بھی نہیں ہوگا۔ جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ: وہ متاول جس کی نیت رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہو؛ اسے کافر نہیں کہا جائے گا؛ بلکہ اگر وہ اجتہاد کرنے میں خطاء کا مرتکب ہوا ہو تو اسے فاسق بھی نہیں کہا جائے گا۔ لوگوں کے ہاں علمی مسائل میں یہ مشہور بات ہے۔ جب کہ اعتقادی مسائل میں بہت سارے لوگوں نے خطاء کرنے والوں کو کافر کہا ہے۔ اس قول کا قائل صحابہ کرام اور تابعین میں سے کوئی ایک بھی معلوم نہیں ہو سکا؛ اور نہ ہی مسلمان ائمہ میں سے کسی ایک نے ایسی بات کہی ہے۔ اصل میں یہ ان اہل بدعت کا قول ہے جو خود کوئی بدعت ایجاد کر لیتے ہیں' اور پھر جو کوئی اس بدعت میں ان کی مخالفت کرے اسے کافر کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ خوارج اور معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ۔ ائمہ کے متبعین میں بھی یہ بات کافی حد تک واقع ہوئی ہے۔ جیسا کہ امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے بعض ساتھیوں سے منقول ہے۔ یہ لوگ تکفیر میں اس مسلک پر عمل کرتے ہیں۔ بسا اوقات مطلق طور پر اہل بدعت کی تکفیر کرتے ہیں۔ پھر جو بھی ان کی راہ سے ہٹ جائے اسے اہل بدعت قرار دیتے ہیں۔ یہ بالکل خوارج؛ معتزلہ اور جہمیہ کے قول کی طرح ہے۔ یہ قول بھی اصحاب مذاہب اربعہ کے کچھ گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کا قول ہے اور نہ ہی مذاہب اربعہ میں سے کسی قابل اعتماد امام کا قول۔ اس لیے کہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہر بدعتی کو کافر کہتا ہو۔ بلکہ ان ائمہ سے منقول صریح روایات اس کے متناقض ہیں۔ لیکن کبھی کبھار بعض ائمہ نے بعض مخصوص عقائد و اقوال والوں کی تکفیر نقل کی جاتی ہے اس تکفیر سے مقصود ان کو ڈرانا ہوتا ہے۔ لیکن کفریہ قول صادر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس نے بھی یہ قول کہہ دیا وہ کافر ہو گیا؛ خصوصاً جب وہ انسان جہالت یا تاویل کا شکار بھی ہو۔ اس لیے کہ کسی متعین شخص کے حق میں کفر کا ثابت کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی کے حق میں آخرت میں عذاب اور وعید ثابت کرنا۔ اس کی کئی شروط اور موانع ہیں؛ جیسا کہ ہم اپنی جگہ پر اس موضوع کو تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

جب کوئی نفس امر میں کافر نہ ہو تو وہ منافق بھی نہ ہوگا۔ تو پھر ان کا شمار مؤمنین میں ہوگا؛ ان کے لیے استغفار کیا جائے گا اور رحم کی دعا بھی کی جائے گی۔ جیسا کہ ایک مسلم دعا کے دوران جب کہتا ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ (الحشر: ۱۰)

تو اس سے مراد وہ مومن ہوتا ہے جو گزشتہ زمانہ میں گزر چکا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ غلط تاویل کر کے وہ سنت کی خلاف

ورزی کر چکا ہو یا کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہو۔ بہر کیف گناہ کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ آیت کے عموم میں داخل رہے گا اور اس سے خارج نہ ہوگا؛ اوراس کا شمار ایمان میں سبقت لے جانے والے مؤمن بھائیوں میں ہوگا۔ اگر چہ اس کا شمار بہتر فرقوں میں ہی کیوں نہ ہوتا ہو، اس لیے کہ ہر فرقہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو کافر نہیں ہوتے، بلکہ وہ مومن ہوتے ہیں، اگر چہ گمراہی وگناہ گاری کے باعث عاصی مومنین کی طرح وعید کے مستحق ہوا کرتے ہیں۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے ایسے لوگوں کو اپنی امت سے خارج نہیں کیا؛ بلکہ اپنی امت میں شمار کیا ہے' اور نہ ہی انھیں دائمی جہنمی قرار دیا ہے۔

مذکورہ صدر قاعدہ ایک عظیم اصل ہے جسے ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لیے کہ سنت کی جانب منسوب بعض فرقوں میں خوارج اور روافض کی قسم کی بدعات پائی جاتی ہیں۔ یہ بات بھولنے نہ پائے کہ اصحاب رسول مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ ان خوارج کی تکفیر نہیں کرتے تھے جن کے خلاف وہ جنگ آزما تھے۔ خوارج نے جب پہلی مرتبہ حَروراء نامی مقام پر جمع ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف خروج کیا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت اور اہل سنت والجماعت سے خارج ہو گئے؛ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا: ''ہم پر تمہارا حق یہ ہے کہ ہم تمہیں اپنی مساجد میں آنے سے نہ روکیں؛ لیکن مال غنیمت کے حصہ سے تمہیں محروم کرتے ہیں۔''

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کی طرف بھیجا اور آپ نے ان سے مناظرہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوارج میں سے آدھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹ آئے، جو باقی بچے ان کے خلاف آپ نے جنگ لڑی اور ان کو زیر کیا۔ تاہم ان کی اولاد کو قیدی بنایا نہ ان کے مال کو مال غنیمت قرار دیا اور نہ ان کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جو صحابہ کرام مسیلمہ جیسے مرتدین سے کیا کرتے تھے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا خوارج کے ساتھ معاملہ مرتدین کے ساتھ معاملہ کے برعکس تھا۔ اس سلوک پر صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے نزدیک خوارج کافر اور مرتد نہ تھے؛ اس پر صحابہ کرام کا اتفاق تھا۔

قیس بن مسلم طارق بن شہاب سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نہروان (واسط و بغداد کے درمیان ایک بڑا قصبہ جہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج سے جنگ لڑی تھی) کی لڑائی سے فارغ ہوئے تو میں آپ کے ہمراہ تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا کیا خوارج مشرک ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''وہ شرک سے تو بھاگے تھے۔'' لوگوں نے پوچھا کیا وہ منافق ہیں؟ فرمایا: منافق تو اللہ کو بہت کم یاد کیا کرتے ہیں۔'' لوگوں نے دریافت کیا آخر خوارج ہیں کون؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی تھی اور ہم نے ان سے جنگ لڑی۔'' [سنن کبریٰ، بیهقی:(۸/ ۱۸۲)]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے واضح کر دیا کہ خوارج مومن ہیں کافر و منافق نہیں۔ اس سے ابو اسحاق اسفرائنی اور اس کے اتباع کی تردید ہوتی ہے جن کا قول ہے کہ جو فرقہ ہماری تکفیر کرتا ہے ہم اس کو کافر قرار دیں گے۔ اس لیے کہ کفر کسی انسان کا حق نہیں، بلکہ اللہ کا حق ہے۔ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ تکذیب کرنے والے کی تکذیب کرے اور جو اس کی بیوی سے بدکاری کا ارتکاب کرے وہ اس کی بیوی سے زنا کرے، کیوں کہ یہ حرام ہے۔ فرض کیجیے ایک عیسائی سرور کائنات ﷺ کو گالی بکتا ہے تو کیا ہم حضرت مسیح کو گالی دینے پر تل جائیں۔

روافض اگر شیخین کی تکفیر کرتے ہیں، تو ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں کر سکتے۔ سفیان جعفر بن محمد سے روایت کرتے

ہیں اور وہ اپنے والد امام باقر سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ جمل یا صفین کے دن ایک شخص کو سنا جو بہت مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سن کر یہ فرمایا:

''وہی بات کہو جو اچھی ہو، ہمارے مخالفین نے سمجھا تھا کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی، ادھر ہم نے یہ خیال کیا کہ وہ باغی ہیں۔ اس لیے ہم ان کے خلاف جنگ آزما ہوئے۔''

مکحول روایت کرتے ہیں کہ اصحاب علی رضی اللہ عنہ نے رفقاء معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا جو مقتول ہو چکے تھے کہ وہ کون ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''وہ مومن ہیں۔''

عبد الواحد بن ابی عون کہتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ اشتر نخعی کے ساتھ ٹیک لگائے جنگ صفین کے مقتولوں کے پاس سے گزرے۔ اچانک دیکھا کہ حابس یمانی مقتول پڑے ہیں۔ [1] اشتر نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا حابس یمانی مقتولوں میں پڑے ہیں۔ اور ان پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی علامت ہے۔ (یعنی یہ جنگ میں رفقائے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے) اللہ کی قسم! یہ بڑے پکے مومن تھے۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''وہ اب بھی مومن ہیں۔''

دوسری اصل: وہ مجتہد جو حق کی معرفت سے عاجز آ گیا ہو کیا اسے اللہ تعالیٰ سزا دے گا؛ یا اگر وہ اپنی استطاعت بھر کوششیں بروئے کار لائے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے؛ اور پھر بھی کسی قدر معرفت حق سے عاجز آ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے سزا نہیں دیں گے؟ جب ان دونوں اصلوں کی معرفت حاصل ہو جائے؛ تو پھر پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں کی جانے والی اکثر طعنہ زنی کی روایات جھوٹ پر مبنی ہیں۔ اور جو سچی روایات ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ حد یہ ہو سکتی ہے کہ وہ گناہ اور غلطی ہوں؛ یا خطاء ہوں؛ تو ان کی خطائیں مغفور لہم ہیں۔ گناہ کی مغفرت کے کئی ایک اسباب ہوتے ہیں۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قطعی طور پر ان میں سے کسی ایک کے بارے میں کہے: اس نے گناہ کا ایسا کام کیا جو لازمی طور پر جہنم میں جانے کا موجب تھا۔

خصوصی طور پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی ایک پر طعن کیا جاتا ہے تو وہ چیز ان کے محاسن اور فضل میں سے ہوتی ہے۔ یہ ہماری طرف سے مجمل جواب ہے۔

پھر اب ہم رافضی کے ذکر کردہ مطاعن کا تفصیلی جواب دیں گے؛ جیسا کہ اپنے زمانے کے بڑے رافضی نے اپنی اس کتاب [منہاج الکرامہ] میں ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس نے لکھا ہے کہ کلبی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عیوب اور برائیوں پر ''مثالب صحابہ'' نام کی ایک کتاب تحریر کی ہے۔

❀❀❀❀

---

[1] حابس بن ربیعۃ الیمانی رضی اللہ عنہ بڑے عابد و زاہد صحابی تھے۔ انھوں نے جنگ صفین میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور اسی جنگ میں مقتول ہوئے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے الاصابہ میں ان کے حالات زندگی نقل کیے ہیں۔

فصل:

[صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رافضی کی عیب جوئی اور اعتراضات]

[اشکال] :شیعہ مصنف لکھتا ہے: دوسرے لوگوں نے اور بھی بہت ساری چیزیں ذکر کی ہیں؛ ہم ان میں سے چند ایک چیزیں ذکر کریں گے۔ان میں سے ایک روایت ہے کہ: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے منبر پر کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی بنا پر غلطی سے محفوظ رہتے تھے اور میرے سامنے شیطان حائل ہو جاتا ہے۔لہٰذا اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کیجیے اور اگر سیدھی راہ سے بھٹک جاؤں تو مجھے جادۂ مستقیم پر ڈال دو۔'' ایسے شخص کی خلافت کیوں کر درست ہوگی جو رعیت سے سیدھا کرنے کی فرمائش کر رہا ہو؛ حالانکہ رعیت کو اس کی ضرورت ہے۔'' [انتہیٰ کلام الرافضی]

[جواب] :ہم کہتے ہیں: رافضی مصنف جس بات کو موجب طعن قرار دے رہا ہے حقیقت میں یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت پر بہت بڑی دلیل ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ اقتدار کے طالب اور ظالم نہ تھے۔اور نہ ہی آپ حکومت کے طلبگار تھے۔ بلکہ آپ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا: اگر میں اللہ و رسول کی اطاعت پر قائم رہوں تو میری مدد کیجیے اور اگر اس سے بھٹک جاؤں تو جبراً مجھے سیدھی راہ پر لائیے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا: ''کہ جب تک میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم میرے مطیع رہو؛ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری کوئی اطاعت نہیں۔'' [1]

جو شیطان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی راہ میں حائل ہوا کرتا تھا، وہ تمام بنی آدم کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔کوئی بھی ایسا انسان نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک جن ساتھی ہوتے ہیں ۔ جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے۔'' ہر شخص کے ساتھ دو ساتھی ہر وقت لگے رہتے ہیں، ایک جنوں میں سے اور ایک ملائکہ سے۔آپ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں میرے ساتھ بھی؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی؛ اور وہ مسلمان ہوگیا؛ اب وہ مجھے بھلائی کے علاوہ کسی بات کا حکم نہیں دیتا۔'' [2] اور پھر یہ کہ شیطان انسان کے رگ و پے میں خون کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے [3] حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم نہیں؛ اور یہ حق ہے۔

[خلیفہ کی شرعی حیثیت]:

[اعتراض]: معترض کا یہ کہنا کہ: اسکی امامت کیسے جائز ہوسکتی ہے جو سیدھی راہ پر چلنے کیلئے رعیت سے مدد طلب کرتا ہو۔''

[جواب]: یہ کسی جاہل کا ہی کلام ہوسکتا ہے۔اس لیے کہ حاکم رب نہیں ہوتا کہ وہ رعیت سے بے نیاز ہوجائے۔اور نہ ہی

---

[1] سیرۃ ابن ھشام (ص:٦٧١)۔

[2] مسلم، کتاب صفات المنافقین۔باب تحریش الشیطان (ح: ٢٨١٤)

[3] صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب ھل یدرأ المعتکف عن نفسه (حدیث: ٢٠٣٩)، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ(حدیث :٢١٧٤، ٢١٧٥)۔

وہ رعایا کی طرف رسول ہوتا ہے کہ وہ اللہ اور مخلوق کے مابین ایک واسطہ ہو۔ بلکہ رعایا نیکی و تقویٰ کے ان کاموں میں خلیفہ کے ساتھ تعاون کرتی ہے جن میں دین یا دنیا کی مصلحت ہو۔ پس ان کا آپس میں باہم مدد کرنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ امیر قافلہ جو لوگوں کو لے کر راستے پر چلتا ہے۔ اگر وہ انہیں لیکر سیدھے راستے پر چلتا رہے تو لوگ اس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ غلطی کر جائے تو لوگ اسے سمجھاتے اور خبردار کرتے ہیں؛ اور سیدھی راہ دیکھاتے ہیں۔ اور اگر راستہ میں انہیں کوئی چور یا ڈاکو پیش آ جائیں تو وہ قافلے کو بچانے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی امیر کارواں علم و قدرت اور رحم دلی میں کامل ہو تو لوگوں کے احوال کے اعتبار سے زیادہ مناسب اور بہتر ہوتا ہے۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ امام صلوٰۃ اگر نماز کے ارکان ٹھیک ادا کرتا ہے تو مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں اور اگر وہ بھول جاتا ہے تو تسبیح کہہ کر اس کی راہنمائی کر کے اسے راہ راست پر لایا جاتا ہے۔

اس کی تیسری مثال حاجیوں کے مرشد و رہنما کی ہے۔ جب تک وہ سیدھی راہ پر چلتا رہے تو لوگ اس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ غلطی کرے تو لوگ اس کی اصلاح کر دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگ امام یا حاکم سے دین نہیں لیتے تھے۔ بلکہ تمام ائمہ اور امت کے لوگ دین کتاب و سنت سے سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختلاف کے وقت معاملہ کو کتاب و سنت پر پیش کرنے کا حکم دیا ہے' فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء ۵۹]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔''

پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اختلاف کے وقت اپنا معاملہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر لوٹا دیں؛ ائمہ اور حکمرانوں کی طرف لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ اس لیے کہ ان کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک اطاعت نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہوگی۔'' [البخاری ۵/ ۱٦۱؛ مسلم ۳/ ۱٤٦۹]

اور ارشاد فرمایا: ''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں ہوگی۔'' [المسند ۵/ ٦٦]

مزید فرمایا: ''جو کوئی تمہیں اللہ کی نافرمانی کا حکم دے' تو اس کی بات نہ مانو۔'' [المسند ۳/ ٦۷]۔

معترض کا یہ کہنا کہ: اسکی امامت کیسے جائز ہو سکتی ہے جو سیدھی راہ پر چلنے کیلئے رعیت سے مدد طلب کرتا ہو؛ حالانکہ رعیت کو اس کی حاجت و ضرورت ہو؟''

یہ اعتراض تمام باہم تعاون کرنے والوں اور کسی کام میں بوقت ضرورت شرکت کرنے والوں پر ہے۔ یہاں تک کہ تجارت اور صناعت گری پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ نماز کے امام کی یہی منزلت ہوتی ہے۔ ماموین کو امام کی ضرورت ہوتی ہے۔ امام ہی ان کی طرف سے سہو وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایسے ہی جمہور کے نزدیک قرأت کی ذمہ داری بھی صرف امام پر عائد ہوتی ہے۔ امام جب بھول جاتا ہے تو اپنے مقتدیوں سے مدد طلب کرتا ہے؛ اور لوگ اسے تنبیہ کرتے اور اس کی

اصلاح کرتے؛ اور اسے سیدھی راہ پر لاتے ہیں ۔ اگر وہ نماز میں کوئی ایسی غلطی کرے' جس سے نماز کی شرعی کیفیت سے خارج ہو جائے تو لوگوں پر اس کی اتباع نہیں ۔ اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں ۔

پھر اس کے جواب میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی رعیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ مدد طلب کی اور انھیں مدد طلب کرنے کی ضرورت بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ تھی ۔ نیز یہ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی رعیت کی زیادہ رہنمائی کی اور ان کی رعیت بھی ہمیشہ ان کی مطیع فرمان رہی ۔ (اور رعیت کو یہ موقع کم ہی حاصل ہوا کہ انھوں نے کسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رہنمائی کی ہو) ۔ اس لیے کہ لوگ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی مسئلہ پر اختلاف کرتے تو آپ ان پر حجت قائم کرتے ؛ اور لوگ پھر آپ کی طرف رجوع کر لیتے ۔ جیسا کہ آپ نے مانعین زکوٰۃ کے مسئلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حجت قائم کی ۔ اس طرح کی دیگر بھی کئی مثالیں ہیں ۔ اور جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عوام کو کسی بات کا حکم دیتے تو وہ آپ کی اطاعت کرتے ۔ بخلاف ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حد تک اپنی رعایا کو جادۂ مستقیم پر نہ لا سکے اور ان کی رعیت چنداں اطاعت کیش بھی نہ تھی ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امہات الاولاد (وہ لونڈیاں جو صاحب اولاد ہو جائیں) کے بارے میں فرمایا کہ میں اس ضمن میں حضرت عمر کے قول سے متفق ہوں کہ ان کو فروخت نہ کیا جائے ۔

پھر آپ نے فروخت کرنے کا حکم دے دیا تو آپ کے قاضی عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے کہا:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ متفقہ رائے آپ کے انفرادی قول سے ہمیں زیادہ عزیز ہے ۔''[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''خلفاء سابقین کے زمانہ میں تم جس طرح فیصلے کیا کرتے تھے اب بھی کرتے رہو ۔ میں اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ یا تو ایک جماعت بن جائیں یا میں بھی اپنے اصحاب و رفقاء کی طرح موت سے ہم کنار ہو جاؤں ۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعایا اکثر آپ کی مخالفت اور نافرمانی کیا کرتی تھی ۔ لوگ آپ کو ایسے مشورے دیا کرتے جس میں آپ کی رائے ان کے خلاف ہوتی ؛ [آپ بھی ان کی مخالفت کرتے] پھر آپ کو پتہ چلتا کہ ان کی رائے درست ہے ۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کئی امور میں مشورہ دیا ۔ مثلاً آپ نے مشورہ دیا تھا کہ بیعت حاصل کیے بغیر مدینہ سے باہر نہ نکلیں ۔ اور کوفہ نہ جانے کا بھی مشورہ دیا تھا ۔ صفین کے موقع پر جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا ۔ اور یہ کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو معزول نہ کریں ۔ ان کے علاوہ کئی امور ایسے ہیں جن میں آپ نے مشورہ دیا تھا ۔

کوئی عقل مند آدمی اس سے اختلاف نہیں کر سکتا کہ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حالات جس طرح منظم تھے یہ انتظام و انصرام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مفقود تھا ۔ اگر یہ سب کچھ کمال حکمران اور کمال رعیت کی وجہ سے تھا تو پھر سابقہ خلفاء رضی اللہ عنہم اور ان کی رعیت افضل ٹھہرے ۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، (حدیث:۱۳۹۹، ۱۴۰۰)، صحیح مسلم ، کتاب الإیمان، باب الدعاء الی الشھادتین، (حدیث:۲۰)

[2] مصنف عبد الرزاق (۱۳۲۲۴)، کتاب الأم للشافعی (۷/ ۱۷۵)، سنن کبریٰ بیہقی (۱۰/ ۳۴۸)۔

اور اگر یہ صرف والی یا حکمران کا کمال تھا تو بھی ان سابقہ خلفاء کے حق میں یہ فضل وکمال زیادہ بلیغ ہے۔اور اگر ایسا رعیت میں نقص کی زیادتی کی وجہ سے تھا تو پھر مطلب یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی رعیت کی نسبت بہت زیادہ ناقص تھی۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت جو آپ کے ساتھ مل کر جنگیں لڑ رہی تھی؛ اور آپ کی امامت کا اقرار کرتی تھی؛ ان سے خلفاء ثلاثہ کی امامت کا اقرار کرنے والی رعیت زیادہ افضل تھی۔تو اس سے لازم آیا کہ سابقہ تین خلفاء میں سے ہر ایک خلیفہ افضل ہو۔

مزید برآں جیسا نظم و ضبط حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں حاصل ہوا؛ ایسا نظم و ضبط حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں نہیں تھا۔اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ کی رعیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت سے افضل ہو۔امیر معاویہ کی رعیت شیعان عثمان رضی اللہ عنہما کہلاتے تھے۔ان میں وہ نواصب بھی تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض ونفرت رکھتے تھے۔پس شیعان عثمان رضی اللہ عنہ شیعان علی رضی اللہ عنہ سے افضل ٹھہرے۔پس ہر لحاظ سے یہ لازم آتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہوں ۔

اور اس سے رافضیوں کے مذہب کا فساد بھی لازم آتا ہے۔اس لیے کہ رافضی دعوی کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ سے افضل ہیں۔اور وہ شیعہ جو آپ کے ساتھ مل کر برسر پیکار رہے؛ وہ ان لوگوں سے افضل تھے جنہوں نے سابقہ تین خلفاء رضی اللہ عنہم کی بیعت کی تھی۔اصحاب معاویہ رضی اللہ عنہ کی تو بات ہی بہت دور کی ہے۔سبھی لوگ بالاتفاق یہ جانتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے دور میں جو نظم و ضبط اور کنٹرول تھا؛ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں نہیں ہوسکا۔تو پھر یہ حکمران و امام کیسے کامل ہوسکتا ہے اور رعیت کیسے کامل ہوسکتی ہے۔بقول شیعہ۔جب کہ ان کے دور میں بدانتظامی اور بدنظمی کا دور دورہ ہو۔اور رعیت انتہائی ناقص ہی نہیں بلکہ شیعہ اعتقاد کے مطابق کافر و فاسق بھی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احباب واصحاب میں وہ شجاعت؛ جوانمردی؛ بہادری؛ سخاوت؛ کرم نوازی علم؛ اور دینداری نہیں تھی جو کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے احباب واصحاب اور رعیت میں تھی۔پس اس وجہ سے یہ لوگ نہ ہی دنیاوی امور میں اصلح تھے اور نہ ہی دینی امور میں۔اس کے ساتھ ہی شیعہ کے قول کے مطابق ان کا کوئی امام معصوم قدرت وشوکت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر نہ تھا۔تو پھر جب یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ سیدھے نہیں رہے؛ تو دوسرے ائمہ جو آپ سے قدرت وشوکت اور عصمت میں کم تھے؛ ان کے ساتھ بدرجہ اولی استقامت کے ساتھ نہیں رہے ہوں گے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ قوم ہی انتہائی فسادی شریر اور ناقص ہے۔

شیعہ حضرات کہتے ہیں: معصوم کی عصمت اس لیے واجب ہوتی ہے کہ اس میں مکلفین کے لیے لطف ومہربانی اور ان کی مصلحت ہوتی ہے۔جب یہ معلوم ہوگیا کہ غیر شیعہ کی مصلحت ہر زمانے میں شیعہ کی مصلحت سے بہتر رہی ہے۔اور ان پر مہربانی ہر دور میں شیعہ پر مہربانی کی نسبت بڑھ کر رہی ہے۔تو معلوم ہوا کہ شیعہ جس عصمت کے دعویدار ہیں وہ عصمت سرے سے باطل ہے۔پس یہ بھی واضح ہوگیا کہ پھر امت کو ایسے امام کی کوئی ضرورت نہیں [جس سے کوئی مصلحت حاصل نہ ہوتی ہو] اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ حق تھا؛ اور آپ کے دور میں مصلحتیں بدرجہ اتم پوری ہورہی تھیں۔اور ہر طرف عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔

فصل:

[قولِ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غلط استدلال]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا، میری بیعت واپس کردو، میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ تم میں موجود ہیں۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق تھی تو اس کا واپس کرنا گناہ تھا اور اگر مبنی برحق نہ تھی تو ان کی خلافت باطل ٹھہری۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ روایت صریح کذب اور بے سند ہے۔ کتب حدیث میں کوئی ایسی روایت موجود نہیں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ تم میں موجود ہیں۔ بلکہ صحیح سند کے ساتھ تاریخ میں ثابت ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ کے دن فرمایا تھا: ''ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کی بیعت کرلو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: '' بلکہ آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم میں سب سے بہتر ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سب سے زیادہ آپ کو چاہتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر میری گردن ماردی جائے' تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی؛ اور یہ میرے نزدیک اس بات سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ مجھے اس قوم پر امیر بنادیا جائے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔''[1]

ہم یہ بھی کہتے ہیں: اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہوتا کہ: تم میں علی رضی اللہ عنہ موجود ہیں'' تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جگہ انہیں امیر بنایا ہوتا؛ اس لیے کہ لوگ آپ کی اطاعت گزاری پر ہوتے۔ [خلیفہ وامام کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ امامت وخلافت کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوجائے۔ یہ ایک قسم کا انکسار بھی ہے جس سے آپ کی قدر ومنزلت میں کوئی فرق نہیں آتا]۔

[اعتراض]: شیعہ کا کہنا ہے کہ: ''اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق تھی تو اس کا واپس کرنا گناہ تھا۔''

[جواب]: اگر یہ ثابت ہوجائے کہ آپ نے ایسا کچھ فرمایا تھا؛ اگر حق کا معنی جائز ہے تو جائز کا ترک کرنا بھی جائز ہے۔ اور اگر حق کا معنی واجب ہے تو پھر یہ ظاہر ہے کہ لوگوں نے نہ ہی آپ کو اس منصب سے ہٹایا' اور نہ ہی آپ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنایا [تو واجب اپنی جگہ پر پورا ہورہا]۔ اگر آپ کی بیعت ترک کردیتے اور کسی دوسرے کو امیر بنادیتے تو پھر یہ منصب آپ پر واجب نہ ہوتا۔ انسان کبھی خرید وفروخت یا کرایہ داری کا عقد [معاہدہ] کرتا ہے۔ یہ معاہدہ حق ہوتا ہے۔ پھر وہ انسان اس معاہدہ کو ختم کرنا چاہتا ہے؛ اس کی وجہ اس کی تواضع ؛ اور اس بوجھ کے اٹھانے سے اپنی سبکدوشی مقصود ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کا زیادہ حق دار نہ بھی ہو۔ کسی انسان کی تواضع سے اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت ایک عاجلانہ اقدام تھا جس کے شر سے اللہ نے بچالیا، اگر کوئی اور شخص اس کا مرتکب ہو تو اسے قتل کردو۔ اگر آپ کی امامت صحیح تھی تو پھر اس پر قتل کا استحقاق نہ ہوتا۔ پس اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر طعن لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ امامت وخلافت باطل تھی تو ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما دونوں پر ایک ساتھ طعن لازم آتا ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: یہ قول افتراء پردازی اور کذب کا آئینہ دار ہے۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

[1] بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لو کنت متخذا خلیلا" (ح:۳۶۶۸)۔

یہ فرمایا تھا کہ:''کسی انسان کو یہ بات دھوکہ میں نہ ڈالے کہ وہ کہے: حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ایک عاجلانہ اقدام تھا؛ جسے فوری طور پر پورا کیا گیا۔ بلکہ یہ جلدی اس لیے عمل میں آئی تھی کہ آپ پہلے سے مقرر شدہ تھے۔''لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا۔اور تم میں کوئی انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مانند نہیں ہے جس کے لیے گردنیں ماری جائیں۔''

اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں بغیر کسی انتظار یا تاخیر کے جلدی اس لیے کی گئی کہ آپ پہلے سے خلافت کے لیے متعین تھے۔جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ:''اور تم میں کوئی انسان ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مانند نہیں ہے جس کے لیے گردنیں ماری جائیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت تمام صحابہ پر عیاں تھی۔اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی آپ کو تمام صحابہ پر مقدم کرنا سب کو معلوم تھا۔آپ کے متعین ہونے کی نصوص کی موجودگی نے مشورہ یا تاخیر سے بے نیاز کر دیا تھا۔بخلاف دوسرے لوگوں کے۔کسی دوسرے کی بیعت مشورہ؛انتظار اور مہلت کے بغیر جائز نہیں۔

اس کی تفسیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور خطبہ میں آئی ہے؛ یہ خطبہ صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔یہ خطبہ آپ نے عمر کے آخری ایام میں حج سے واپس آکر دیا تھا۔اہل علم کے ہاں یہ خطبہ مشہور ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ:

((میں مہاجرین کے کچھ لوگوں کو پڑھا رہا تھا جن میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ایک دن میں منیٰ میں ان کی رہائش پر بیٹھا ہوا تھا؛اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے پاس تھے اس حج میں (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے) آخری بار کیا تھا۔عبدالرحمن رضی اللہ عنہ میرے پاس لوٹ کر آئے اور کہا کہ: کاش!تم اس شخص کو دیکھتے جو آج امیر المومنین کے پاس آیا اور کہا کہ: اے امیر المومنین !آپ کو فلاں کے متعلق خبر ہے؟ جو کہتا ہے کہ اگر عمر رضی اللہ عنہ مرجائیں تو میں فلاں کی بیعت کرلوں ۔اللہ کی قسم!ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اتفاقیہ تھی جو پوری ہوگئی۔چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا؛اور کہا کہ انشاء اللہ میں شام کے وقت لوگوں میں کھڑا ہوں گا اور ان کو ڈراؤں گا جو مسلمانوں کے امور کو غصب کرنا چاہتے ہیں۔''

حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے کہا کہ اے امیر المومنین ایسا نہ کیجئے؛اس لئے کہ موسم حج میں عام اوباش اور پست قسم کے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔جس وقت آپ کھڑے ہوں گے تو اس قسم کے لوگوں کی اکثریت آپ کے پاس ہوگی۔اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کھڑے ہوکر جو بات کہیں گے اس کو اڑا کر دوسری طرف لے جائیں گے؛اور اس کی حفاظت نہیں کریں گے اور اس کو اس کے (مناسب) مقام پر نہیں رکھیں گے۔اس لئے آپ انتظار کریں یہاں تک کہ مدینہ پہنچیں۔اس لئے کہ مدینہ دار ہجرت و دار سنت ہے۔صرف سمجھدار اور سر برآوردہ لوگوں کے سامنے آپ جو کہنا چاہیں کہیں تاکہ اہل علم آپ کی گفتگو کو محفوظ رکھیں۔اور اس کو اس کے مناسب مقام پر رکھیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ:اللہ کی قسم!اگر اللہ نے چاہا تو مدینہ میں سب سے پہلے میں یہی بیان کروں گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ: ہم لوگ ذی الحجہ کے آخر میں مدینہ پہنچے۔جب جمعہ کا دن آیا تو آفتاب کے ڈھلتے ہی ہم مسجد کی طرف جلدی سے روانہ ہوئے یہاں تک کہ میں نے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ کو منبر کے ستون کے پاس بیٹھا ہوا پایا۔میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا میرا گھٹنا ان کے گھٹنے سے ملا ہوا تھا۔فوراً ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ

بن خطاب آئے ۔ جب میں نے ان کو آتے ہوئے دیکھا تو میں نے سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک ایسی بات کہیں گے جو انہوں نے کبھی نہیں کہی ہوگی، جب سے خلیفہ ہوئے ہیں۔

سعید رضی اللہ عنہ نے میری بات سے انکار کیا اور کہا کہ مجھے امید نہیں ہے کہ ایسی بات کہیں گے جو اس سے پہلے نہ کہی ہو۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ گئے، جب لوگ خاموش ہو گئے تو آپ کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد بیان کی جس کا وہ مستحق ہے پھر کہا: امابعد:

''میں تم سے ایسی بات کہنے والا ہوں جس کا کہنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ میں یہ نہیں جانتا کہ شاید یہ میری موت کے آگے ہو جس نے اسکو سمجھا اور یاد کیا تو وہ جہاں بھی پہنچے دوسروں سے بیان کرے۔ اور جس شخص کو خطرہ ہو کہ وہ اس کو نہیں سمجھے گا تو میں کسی کے لئے حلال نہیں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے متعلق جھوٹ بولے۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق دے کر بھیجا اور ان پر اللہ نے اپنی کتاب نازل کی۔ اللہ نے جو آیات نازل کیں ان میں رجم کی بھی آیت تھی؛ ہم نے اس کو پڑھا؛ سمجھا اور محفوظ کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگسار کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد سنگسار کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مدت دراز کے بعد ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ ایک کہنے والا کہے گا کہ: اللہ کی قسم! ہم آیت رجم کتاب اللہ میں نہیں پاتے وہ اس فرض کو چھوڑ کر گمراہ ہوگا جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اور رجم کتاب اللہ میں زنا کرنے والے مرد و عورت پر جبکہ شادی شدہ ہوں واجب ہے؛ بشرطیکہ گواہ قائم ہو جائیں یا حمل قرار پا جائے یا اقرار کر لیا جائے۔ پھر ہم کتاب اللہ میں جو پڑھتے تھے اس میں یہ بھی تھا کہ تم اپنے باپوں سے نفرت نہ کرو کیونکہ تمہارا اپنے باپوں سے نفرت کرنا تمہارے لئے کفر ہے یا یہ فرمایا کہ: ''بے شک تمہارے لئے یہ کفر ہے کہ تم اپنے باپوں سے نفرت کرو۔''

پھر سن لو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ''میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے اور تم صرف اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔''

پھر کہا کہ: مجھے خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی کہتا ہے کہ: اللہ کی قسم! اگر عمر مر جائیں تو میں فلاں کی بیعت کرلوں۔ تمہیں کوئی شخص یہ کہہ کر دھوکہ نہ دے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اتفاقیہ تھی اور پھر پوری ہوگئی۔ سن لو کہ وہ ایسی ہی تھی لیکن اللہ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا اور تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی فضیلت ہو۔ جس شخص نے کسی کے ہاتھ پر مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر بیعت کر لی تو اس کی بیعت نہ کی جائے اس خوف سے کہ وہ قتل کر دیے جائیں گے۔ جس وقت اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات دے دی تو اس وقت وہ ہم سب سے بہتر تھے۔ مگر انصار نے ہماری مخالفت کی اور سارے لوگ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ نے بھی ہماری مخالفت کی۔ اور مہاجرین ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوئے تو میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ:

اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! ہم لوگ اپنے انصار بھائیوں کے پاس چلیں۔ ہم لوگ انصار کے پاس جانے کے ارادے سے چلے جب ہم ان کے قریب پہنچے تو ان میں سے دو نیک بخت آدمی ہم سے ملے۔ ان دونوں نے وہ بیان کیا جس کی طرف وہ لوگ مائل تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا: اے جماعت مہاجرین کہاں کا قصد ہے؟ ہم نے کہا کہ: اپنے انصار بھائیوں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: تمہارے لئے مناسب نہیں کہ ان کے قریب جاؤ۔ تم اپنے امر کا فیصلہ کرو۔

میں نے کہا کہ اللہ کی قسم! ہم ان کے پاس جائیں گے۔ چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ہم ان کے پاس پہنچے؛ تو ایک آدمی کو ان کے درمیان دیکھا کہ کمبل میں لپٹا ہوا ہے۔ میں نے کہا: یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ سعد بن عبادہ۔ میں نے کہا کہ: ان کو کیا ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: ان کو بخار ہے ہم تھوڑی دیر بیٹھے تھے کہ ان کا خطیب کلمہ شہادت پڑھنے لگا اور اللہ کی حمد وثنا کرنے لگا جس کا وہ سزاوار ہے۔ پھر کہا امابعد:

''ہم اللہ کے انصار اور اسلام کے لشکر ہیں اور تم اے مہاجرین وہ گروہ ہو کہ تمہاری قوم کے کچھ آدمی فقر کی حالت میں اس ارادہ سے نکلے کہ ہمیں ہماری جماعت کو جڑ سے جدا کردیں اور ہماری حکومت ہم سے لے لیں۔ جب وہ خاموش ہوا تو میں نے بولنا چاہا۔ میں نے ایک بات سوچی رکھی کہ جس کو میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کرنا چاہتا تھا۔ اور میں ان کا ایک حد تک لحاظ کرتا تھا۔ جب میں نے بولنا چاہا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کی؛ وہ مجھ سے زیادہ بردبار اور باوقار تھے۔

اللہ کی قسم جو بات میری سمجھ میں اچھی معلوم ہوتی تھی اسی طرح یا اس سے بہتر پیرایہ میں فی البدیہہ بیان کی یہاں تک کہ وہ چپ ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ: ''تم لوگوں نے جو خوبیاں بیان کی ہیں تم ان کے اہل ہو لیکن یہ امر (خلافت) صرف قریش کیلئے مخصوص ہے۔ یہ لوگ عرب میں نسب اور گھر کے لحاظ سے اوسط ہیں۔ میں تمہارے لئے ان دو آدمیوں میں ایک سے راضی ہوں ان دونوں میں کسی سے بیعت کرلو۔ چنانچہ انہوں نے میرا اور ابوعبیدہ بن جراح کا ہاتھ پکڑا اور وہ ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ (عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) مجھے اس کے علاوہ انکی کوئی بات ناگوار نہ ہوئی۔

اللہ کی قسم! میں اس جماعت کی سرداری پر جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ ہوں اپنی گردن اڑائے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ یا اللہ! مگر میرا یہ نفس موت کے وقت مجھے اس چیز کو اچھا کر دکھائے جس کو میں اب نہیں پاتا ہوں۔

انصار میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ: ہم اس کی جڑ اور اس کے بڑے ستون ہیں۔ اے قریش ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے۔ شور وغل زیادہ ہوا اور آوازیں بلند ہوئیں؛ یہاں تک کہ مجھے اختلاف کا خوف ہوا میں نے کہا: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے ان سے بیعت کی اور مہاجرین نے بھی بیعت کی پھر انصار نے ان سے بیعت کی۔ اور ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پر غالب آ گئے۔

کسی کہنے والے نے کہا کہ: تم نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قتل کر ڈالا۔ میں نے کہا: اللہ نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا جو معاملہ ہوا تھا ہمیں اندیشہ ہوا کہ اگر ہم قوم سے جدا ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی تو یہ لوگ ہمارے پیچھے کسی کے ہاتھ پر بیعت کرلیں گے اس صورت میں یا تو ہم کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے جو ہماری مرضی کے خلاف ہوتا۔ یا ہم اسکی مخالفت کرتے اور فساد ہوتا۔ جس نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی سے بیعت کی اس کی پیروی نہ کی جائے نہ اور اس کی جس نے بیعت کی؛ اس خوف کہ وہ قتل کئے جائیں گے۔'' [صحیح بخاری:ح ١٧٤٤]

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم اس کی جڑ اور اس کے بڑے ستون ہیں؛ اے قریش! ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے'' یہ جملہ کہنے والے حضرت حباب ابن منذر رضی اللہ عنہ تھے۔ [صحیح بخاری ٥/ ٦]

ابوسلمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام سنح پر تھے۔ حضرت عمر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اللہ

کی قسم! رسول اللہ ﷺ کا انتقال نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے دل میں تو یہی بات آئی تھی کہ اللہ تعالیٰ ضرور آپ کو دوبارہ مبعوث کرے گا اور آپ لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹیں گے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے پر ہو کر سوار آئے یہاں تک کہ گھوڑے سے اترے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ کسی سے گفتگو نہ کی۔ یہاں تک کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قصد کیا۔ آپ کو یمنی چادر اڑھائی گئی تھی۔ آپ کے چہرے سے چادر اٹھائی پھر آپ پر جھکے اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا پھر روئے اور فرمایا اے اللہ کے نبی آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں! آپ نے پاکیزہ زندگی گزاری' اور پاکیزہ موت پائی۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ آپ پر دو موتوں کو جمع نہیں کرے گا۔ جو موت آپ کے لئے مقدر تھی تو وہ آپ پر آچکی۔

ابوسلمہ کا بیان ہے کہ مجھے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے اور عمر لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ بیٹھ جاؤ؛ انہوں نے انکار کردیا۔ پھر کہا کہ بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تشہد پڑھا لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے؛ اور عمر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ اور فرمایا: امابعد!

''تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر ۳۰]

''یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران ۱۴۴]

''(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف رسول ہی ہیں آپ سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑے گا عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔''

(یہ سن کر) سب لوگ بے اختیار رونے لگے۔

(راوی کا بیان ہے) سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں جمع ہوئے اور کہنے لگے کہ: ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم میں سے ہو۔ پھر حضرت ابوبکر و عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ بن جراح حضرت سعد رضی اللہ عنہم کے پاس تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گفتگو کرنی چاہی لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو روک دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اللہ کی قسم! میں نے یہ ارادہ اس لئے کیا تھا کہ میں نے ایک ایسا کلام سوچا تھا جو میرے نزدیک بہت اچھا تھا مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ وہاں تک ابوبکر رضی اللہ عنہ نہیں پہنچیں گے۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا کلام کیا جیسے بہت بڑا فصیح و بلیغ آدمی گفتگو کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ ہم لوگ امیر بنیں گے تم وزیر رہو۔ اس پر حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں؛ اللہ کی قسم! ہم یہ نہ کریں گے بلکہ ایک امیر ہم میں سے بنے گا ایک امیر تم میں سے مقرر کیا

جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ ہم امیر وصدر بنیں گے اور تم وزیر؛ اس لئے کہ قریش باعتبار مقام ومرتبہ کے تمام عرب میں عمدہ برتر اور فضائل کے لحاظ سے بڑے اور بزرگ تر ہیں۔ لہذا تم عمر یا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہما کی بیعت کرلو۔'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''جی نہیں ہم تو آپ کی بیعت کریں گے؛ آپ ہمارے سردار اور ہم سب میں بہتر اور ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور ان سے بیعت کرلی اور لوگوں نے بھی آپ سے بیعت کی۔ جس پر ایک کہنے والے نے کہا تم نے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو قتل کردیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ہی اسے قتل کردیا ہے۔''

اسی حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو تقریر ہوئی اس سے اللہ تعالیٰ نے بہت نفع پہنچایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے سے ڈرایا۔ ان میں جو نفاق تھا اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وجہ سے دور کیا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو ہدایت دکھائی۔ اور جو حق ان پر تھا وہ ان کو بتلایا۔'' [صحیح بخاری:ح ٨٨٤]

زہری حضرت انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا خطبہ سنا جب کہ وہ منبر پر بیٹھے؛ اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا دوسرا دن تھا۔ انہوں نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے، کچھ نہیں بول رہے تھے، انہوں نے کہا کہ:

''میں امید کرتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ رہیں گے، یہاں تک کہ ہمارے بعد انتقال فرمائیں گے۔ پھر اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتقال فرما گئے تو اللہ نے تمہارے سامنے نور پیدا کردیا ہے کہ جس کے ذریعے تم ہدایت پاتے ہو۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کی۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو غار میں آپ کے ساتھی تھے؛ مسلمانوں میں سے تمہارے امور کے مالک ہونے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لئے اٹھو اور ان کی بیعت کرو۔''

ان میں سے ایک جماعت اس سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ ہی میں بیعت کرچکی تھی اور عام بیعت منبر پر ہوئی۔

زہری نے حضرت انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ:

''میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس دن سنا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہتے ہوئے کہ منبر پر چڑھیے اور برابر کہتے رہے، یہاں تک کہ وہ منبر پر چڑھے اور لوگوں نے عام بیعت کی۔'' [صحیح بخاری:ح٢٠٩٨]

اس خطبہ میں ایک دوسری سند کیساتھ یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''جو کچھ تمہارے پاس ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لیے اس کو اختیار کرلیا ہے جو کچھ اس کے پاس ہے۔ یہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود ہے؛ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ہدایت عطا فرمائی۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو؛ تو تم اسی راستے کی طرف ہدایت پالو گے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت دی تھی۔''

❁❁❁❁

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت کہا: ''اے کاش! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ہوتا کہ کیا انصار کا بھی خلافت میں کوئی حصہ ہے؟ اس میں دلیل ہے کہ آپ کو اپنی خلافت کے بارے میں شک تھا؛ لہٰذا آپ کی امامت درست ثابت نہیں ہوتی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر صریح کذب و جھوٹ ہے۔ آپ نے ایسی کوئی بھی بات ارشاد نہیں فرمائی۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں جو انسان کسی بھی مسئلہ میں کسی منقول روایت سے استدلال کرتا اور حجت پیش کرتا ہے' تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ روایت کی سند بھی ذکر کرے تا کہ اس کی حجت پوری ہو سکے۔ تو پھر یہ کیسے مناسب ہے کہ سابقین اولین پر ایک ایسی روایت کی وجہ سے طعن کریں جس کی کوئی سند ہی نہیں ہے؟

مزید برآں یہ شیعہ کے اس دعوی کے خلاف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نص صریح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اس لیے کہ جب نص نصریح کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو چکے تھے تو پھر انصار کا کیا حق باقی رہا؟

فصل:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عند الموت کہا: ''اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی اور میں اینٹ میں ایک تنکا ہوتا۔'' جبکہ اہل سنت یہ روایت بیان کرتے ہیں: قریب الموت شخص اپنی آخری آرام گاہ جنت یا جہنم کو دیکھ لیتا ہے۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہرگز یہ منقول نہیں۔ روایت یقیناً جھوٹ پر مبنی ہے۔ بلکہ آپ سے ثابت ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھا تھا:

لَعَمْرُكَ مَا يُغْنِيْ الثَّرَاءُ عَنِ الْفَتٰى　　　اِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَ ضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

''تمہاری زندگی کی قسم! دولت اس وقت کسی کام نہیں جب آدمی آخری وقت میں غرغرانے لگے اور سانس سینے میں تنگ ہو جائے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنے چہرے سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا۔ اس طرح نہیں بلکہ یوں کہو:

﴿وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ (ق) ❶

''اور سکرات موت سچ مچ طاری ہو گئی، یہ وہی ہیں جس سے تو منہ موڑا کرتا تھا۔''

باقی رہا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ ''اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔'' تو آپ نے یہ حالت صحت میں فرمایا تھا نہ کہ مرض الموت میں۔ یہ قول ائمہ سلف کی ایک جماعت سے منقول ہے انھوں نے خوف الٰہی اور خوف قیامت کے باعث یہ کلمات ارشاد فرمائے تھے۔ حتی کہ بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے یہاں تک کہا ہے:

''اگر انہیں حساب و کتاب کے بعد جنت میں داخل ہونے یا پھر مٹی ہو جانے کا اختیار دیا جائے۔ تو میں مٹی ہو جانے کو

---

❶ الزهد للامام احمد(ص:۱۰۹)، طبقات ابن سعد(۳/ ۱۹۷)

اختیار کرتا۔‘‘

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

’’اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں کہ میں (انسان ہونے کے بجائے) ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا۔‘‘ [مسند احمد ٥/ ١٧٣]

ابونعیم رحمہ اللہ نے حلیۃ الأولیاء میں نقل کیا ہے: ’’حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’اگر مجھے جنت و دوزخ کے درمیان کھڑا کر کے کہا جاتا کہ تم ان دونوں میں سے کسی ایک میں جانا چاہتے ہو یا راکھ ہونے کو پسند کرتے ہو تو میں راکھ ہو جانے کو ترجیح دیتا۔‘‘

حضرت مسروق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی نے کہا: میں نہیں چاہتا کہ میں اصحاب یمین میں سے ہوجاؤں' بلکہ میں چاہتا ہوں کہ میں اصحاب مقربین میں سے ہوجاؤں۔ تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ’’لیکن یہاں ایک ایسا آدمی بھی ہے جو چاہتا ہے کہ اگر وہ مر جائے تو اسے دوبارہ اٹھایا ہی نہ جائے۔‘‘ اس سے مراد خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اپنی ذات تھی۔‘‘

اس موضوع میں بڑا طویل کلام ہے کہ کیا ایسے کہنا مشروع ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل کا کوئی دوسرا موقع دیکھیں گے۔ لیکن کسی انسان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے نکلنے والا کلام اس کے ایمان پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس خوف زدہ کی مغفرت کر دی تھی جس نے اپنے گھر والوں کو حکم دیا تھا کہ:

’’جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا۔ اور زیادہ یاد یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [اس نے کہا]: پھر میری راکھ بنانا۔ اور آدھی راکھ ہوا میں اڑا دینا۔ اور آدھی راکھ سمندر میں پھینک دینا۔ کیونکہ میں نے اللہ کے پاس کوئی نیکی نہیں بھیجی۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ مجھے بہت سخت عذاب دے۔ پھر ان سے وعدہ لیا۔ پس انہوں نے اللہ کی قسم اس کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ تو اللہ عزوجل نے فرمایا: تجھے ایسا کرنے پر کس چیز نے برانگیختہ کیا؟ اس نے عرض کیا: اے میرے رب! تیرے خوف نے۔ تو اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی۔‘‘ [مسلم ٤/ ٢١٠٩۔ بخاری ٩/ ١٤٥]

جب انسان کے قدرت اور معاد میں شک کے باوجود اس کے ساتھ جو کچھ کیا گیا' اس پر اللہ تعالیٰ اپنے خوف کی وجہ سے اسکی مغفرت کر دی۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا خوف گناہوں کی بخشش کے بڑے اور اہم ترین اسباب میں سے ہے۔

فصل:

[کلام ابو بکر رضی اللہ عنہ پر تنقید]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ’’حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے کاش! کہ سقیفہ بنی ساعدہ کے دن میں دو شخصوں میں سے کسی ایک کی بیعت کر کے اس کو امیر بنا دیتا اور خود وزیر بن جاتا۔ یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ آپ خلافت کے اہل نہیں تھے اور نہ ہی اپنی ذات کے لیے امامت و خلافت پر راضی تھے۔‘‘ [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اگر آپ نے یہ جملہ کہا ہو تو پھر یہ سب سے واضح دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امام نہ تھے۔ اس لیے کہ یہ جملہ کہنے والا انسان خوف الٰہی کی بنا پر ایسے کہہ رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو اس سے حق ولایت میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔

✿ ہم کہتے ہیں کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات ازراہ فروتنی و انکساری اور خوف الٰہی کے پیش نظر کہی تھی۔ یعنی اگر آپ

کے علاوہ کوئی اور خلیفہ بن جاتا اور آپ اس کے وزیر ہوتے تو اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتے۔ اگر اس حالت میں ان کے پاس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی کوئی نص صریح ہوتی تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ترجیح دیتے اور ان دو آدمیوں کا نام نہ لیتے۔ اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق نص صریح کے ہوتے ہوئے جیسا کہ تمہارا خیال ہے ان دو اشخاص کو خلیفہ بنانے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق امامت ضائع ہو جاتا؛ اور آپ ایک ظالم (جو بلا استحقاق خلیفہ بن گیا) کے وزیر ٹھہرتے؛ اور اس طرح دوسروں کی دنیا کے عوض اپنی آخرت فروخت کر دیتے۔ حالانکہ جو شخص اپنے اندر خوف الٰہی رکھتا ہو اور اپنے ذمہ داری ادا کرنا چاہتا ہو وہ ہرگز ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کو مرنے والا اپنا قرض ادا کرنے کی وصیت کر جائے۔ وارث یہ سوچے کہ اس کا مستحق فلاں شخص ہے۔ تو وہ قرض دیکر کسی کو اس قرض خواہ کے پاس بھیج دے۔ پھر کہے: ہائے افسوس میں نے یہ قرض اس آدمی کے ہاتھ بھیجا ہوتا جس کا قرض اس سے زیادہ ہے۔ اور اسے یہ خوف محسوس ہو رہا ہو کہ کہیں پہلا قاصد حق پورا ادا نہ کرے۔ یا اس میں کمی بیشی یا خیانت کرے۔ اور وہاں پر ایک شخص موجود ہو' جو قرض خواہ ہو؛ اور اس کا دعوی ہو کہ مستحق انسان کے بجائے وہ اس قرض کا حق دار ہے۔ اگر وارث کو علم ہوتا کہ واقعی یہی انسان قرض کا مستحق ہے۔ تو وہ اسے ادا کر دیتا اور اسے غائب انسان کی طرف قاصد بھیجنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

[جیش اسامہ رضی اللہ عنہ اور رافضی کا جھوٹا دعوی]:

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''نبی کریم ﷺ نے مرض الموت کی حالت میں متعدد بار فرمایا: اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیج دو۔ اللہ اس پر لعنت کرے جو اس لشکر میں شامل نہ ہو۔ تینوں اصحاب اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو اس میں شرکت کرنے سے روک دیا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب] : اس قصہ کے جھوٹ ہونے پر اتفاق ہے۔ سیرت رسول ﷺ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ یہ صاف جھوٹ ہے۔ اہل علم مؤرخین اور محدثین میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہما حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھے۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایات میں آتا ہے۔

❀ نیز نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جیش اسامہ رضی اللہ عنہ میں کیوں کر بھیج سکتے تھے جب کہ مرض وفات میں آپ نے انھیں نمازیں پڑھانے کے لیے امام مقرر کیا تھا۔ آپ کی مرض کی ابتداء جمعرات والے دن سے ہوئی۔ پھر آنے والی جمعرات اور اس کے بعد پیر تک نقل متواتر کے مطابق ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بارہ دن تک نماز پڑھائی۔ نبی کریم ﷺ کی بیماری میں جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو نمازیں نہیں پڑھائیں' اور نہ ہی صرف ایک یا دو دن امامت کی ہے؛ حتی کہ اس سے رافضی دعوی میں تلبیس کا موقع پیدا ہو جائے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کے بغیر آپ کو آگے کر دیا تھا۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی پوری مدت آپ ہی نمازیں پڑھاتے رہے۔ لوگوں کا اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی وفات والی مرض میں لوگوں کو نماز نہیں پڑھائی۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرا ان کا امام بھی نہیں بنا۔ آپ نے کئی دن تک لوگوں کو نمازیں پڑھائیں۔ ان میں سب سے کم جو تعداد بتائی جاتی ہے' وہ سترہ نمازوں کی ہے [کہ آپ نے لوگوں کو سترہ نمازیں پڑھائیں]۔ آپ نے جمعرات کو لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھائی۔ اور جمعہ کا

خطبہ بھی آپ نے دیا۔اس بارے میں صحیح احادیث تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔پھر آپ پیر کے دن فجر کی نماز تک لوگوں کو نمازیں پڑھاتے رہے۔

سوموار کے دن علی الصبح نبی کریم ﷺ نے پردہ ہٹا کر دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب لوگوں نے آپ کو دیکھا تو قریب تھا کہ اپنی نماز میں فتنہ میں پڑ جائیں' مگر رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ پردہ نیچے گرا دیا؛ یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری کام تھا۔ پھر پیر کے دن ہی زوال کے قریب آپ ﷺ کا انتقال ہوگیا۔[إنا لله و إنا إليه راجعون ۔ إنك ميت و إنهم ميتون]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: آپ نے اس سے کہیں زیادہ نمازیں پڑھائیں۔ پہلے جمعہ سے آپ نے نماز پڑھانی شروع کی۔ اس لحاظ سے بیماری کی پوری مدت آپ نے ہی نماز پڑھائی۔سوائے ایک وقت کی نماز کے۔اس وقت رسول اللہ ﷺ نے بیماری میں کچھ افاقہ محسوس کیا۔آپ آگے بڑھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی دائیں جانب کیا۔حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرتے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کررہے تھے۔

سوموار کے دن علی الصبح نبی کریم ﷺ نے پردہ ہٹا کر دیکھا کہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔اس وقت آپ کا چہرہ مبارک یوں چمک رہا تھا جیسے قرآن کا ورق۔جب آپ نے لوگوں کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھا تو اس سے بہت خوش ہوئے۔[1] اس کے بعد نبی کریم ﷺ کو مسجد میں نہیں دیکھا گیا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے آخری باجماعت نماز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے ادا کی۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی اور کے پیچھے آپ نے آخری نماز پڑھی۔[صحیح بات یہی ہے کہ کوئی اور نہیں تھا وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی تھے]۔

پھر ایسی حالت میں یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک صرف انہیں لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ روانہ کیا جائے اور دوسری طرف لوگوں کو نمازیں پڑھانے کے لیے امام مقرر کیا جائے۔؟

رسول اللہ ﷺ نے لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنی بیماری سے پہلے تیار کیا تھا۔اس لشکر کے امیر عام حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اس میں زیادہ تعداد مہاجرین کی تھی۔اس لشکر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔اس لشکر کی تعداد تین ہزار تھی۔اس لشکر کو حکم ملا تھا کہ فلسطین کے نواحی علاقہ موتہ پر جا کر حملہ کریں۔ جہاں پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہم اجمعین شہید ہوئے تھے۔حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جہاد کے لیے تیار ہوئے اور آپ اسی بوجھ کا شکار جرف تک نکلے۔تو رسول اللہ ﷺ کی بیماری کی وجہ سے کئی دن تک جرف میں پڑاؤ کیے رہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا؛ اور آپ سے فرمایا:

''اللہ کا نام لے کر اس کی برکت پر نصرت و عافیت کے ساتھ چلو۔پھر وہاں جہاں کر حملہ کرو جہاں پر حملہ کرنے کا حکم میں نے دیا ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اھل العلم والفضل احق بالامة (حدیث: ٦٨٠)، صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب استخلاف الامام، (حدیث:٤١٩)۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت سے نوازے گا' مجھے اجازت دیجیے کہ میں کچھ دن یہاں پر رک جاؤں؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دیدے۔ اگر میں اس حالت میں چل پڑا تو میرے دل میں آپ کے متعلق بے چینی اور ملال رہے گا۔ اور مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میں آپ کے متعلق لوگوں سے پوچھتا رہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ اس پر خاموش رہے۔ اس کے کچھ دن بعد رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد روانہ کیا تھا اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لشکر کے ساتھ نہ بھیجنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مدبر آدمی تھے، جن کی مدینہ میں اس وقت شدید ضرورت تھی۔ تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ [1]

پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس طرف چل پڑے جہاں کا رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا۔ اس لشکر کی وجہ سے دشمن پر بہت بڑی مصیبت آئی۔ اور آپ کو بہت بڑی غنیمت حاصل کی۔ اور آپ نے اپنے والد کے قاتل کو قتل کیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو امن و سلامتی اور عافیت کے ساتھ مدینہ واپس لوٹا دیا۔

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تو آپ نے کہا: 'میں اس جھنڈے کو کبھی بھی نہیں کھول سکتا جسے رسول اللہ ﷺ نے روانہ فرمایا تھا۔'' اس لیے کہ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لشکر بھیجنے سے روکا تھا۔ کیونکہ انہیں خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں لوگ نبی کریم ﷺ کی موت کی وجہ سے اس لشکر میں طمع کرنے لگیں۔'' مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کی موت کے فوراً بعد بھی یہ لوگ جہاد کر رہے ہیں؛ [تو لوگوں کے دلوں میں خوف بیٹھ گیا] اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کی وجہ سے اس دین کی مدد فرمائی اور مؤمنین کے دلوں کو قوت و استقامت عطا کی۔ کافروں اور منافقوں کو ذلیل کیا۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کمال ایمان؛ کمال معرفت' تدبر؛ اصابت رائے؛ اور ایمان و یقین کی علامت تھی۔

فصل:

[نبی کریم ﷺ اور منصب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: ''نبی کریم ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کبھی کوئی خدمت تفویض نہیں کی تھی۔ البتہ عمرو بن العاص اور اسامہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو بعض کاموں پر مامور فرمایا تھا۔ جب سورۂ توبہ دے کر آپ کو مکہ روانہ کیا تو تین دن بعد بحکم وحی آپ کو واپس بلا لیا۔ پھر کوئی عاقل آپ کی امامت پر کیسے راضی ہوسکتا ہے جب کہ نبی کریم ﷺ سورت توبہ کی دس آیات لوگوں تک پہنچانے کے لیے آپ پر راضی نہیں؟۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ جھوٹ کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ مفسرین' محدثین وفقہاء؛ سیرت نگاران اور مؤرخین سبھی جانتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے ۹ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر کیا تھا، جو آپ کی عظیم خصوصیت ہے۔

[1] تاریخ الاسلام، للذھبی (عھود الخلفاء الراشدین، ص:۱۹۔۲۰) طبقات ابن سعد (٤/ ٦٧)

اسلام میں یہ پہلا حج ہے جو مدینہ طیبہ سے ادا کیا گیا۔اس سے پہلے اسلام میں حج نہیں تھا سوائے اس حج کے جو حضرت عتاب بن اسید بن العاص بن امیہ رضی اللہ عنہ کی امارت میں مکہ مکرمہ سے ادا کیا گیا۔اس لیے کہ مکہ سن آٹھ ہجری میں فتح ہوا ۔ پھر اس سال کا حج عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کی امارت میں ادا ہوا۔انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ پر اپنا عامل بنایا تھا۔ پھر سن نو ہجری میں غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج مقرر فرمایا۔اس حج میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے موسم حج میں آوازیں لگانے کا حکم دیا کہ: اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہ کرے اور ننگے ہوکر بیت اللہ کا طواف نہ کیا جائے۔اس امارت جیسی امارت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائی۔ پس آپ کو یہ امارت و ولایت ملنا آپ کی خصوصیت شمار ہوتی ہے۔اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج پر کسی کو ایسے امیر مقرر نہیں کیا جیسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔

ایسے ہی نمازوں کا امام مقرر کرنا بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ہے جس میں آپ منفرد ہیں۔اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ماتحت تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جا کر ملے تو آپ نے دریافت فرمایا: کیا امیر ہوکر آئے ہیں یا مامور؟[1] تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: مامور۔ اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے۔اور آپ کے حکم کی ایسے ہی پیروی کیا کرتے تھے جیسے باقی مسلمان آپ کا حکم مانا کرتے تھے۔اس حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے باقی لوگوں کے ساتھ مل کر جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے منادی کی۔[البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت سورۂ توبہ کے احکام کو پہنچانا اور پھیلانا ہے۔][2]

جبکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ولایت کے علاوہ دوسرے لوگوں کی ولایت میں دوسرے لوگ بھی برابر کے شریک ہوا کرتے تھے۔ جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت ۔اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت میں دوسرے لوگ بھی شریک ہیں۔ بخلاف ابو بکر رضی اللہ عنہ کے؛ یہ ولایت آپ کی خصوصیت شمار ہوتی ہے۔حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو امیر مقرر نہیں فرمایا ؛ نہ ہی عمرو بن عاص کو اور نہ ہی اسامہ بن زید کو۔رضی اللہ عنہما ۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر بنانے کا قصہ محض جھوٹ ہے۔اس کے جھوٹ ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

جہاں تک حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے واقعہ کا تعلق ہے؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذات سلاسل میں ان کو بنی عذرہ کی جانب بھیجا تھا۔[3]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام(ص:٦١٢)، تفسیر طبری(١٤/ ١٠٧)

[2] اس کے دو سبب تھے جن کی جانب قبل ازیں اشارہ کیا جا چکا ہے۔(١) اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ میں مشرکین کے ساتھ باندھے ہوئے سابقہ عہد و پیمان کو توڑنے کا اعلان کیا گیا ہے۔عربوں کے یہاں دستور تھا کہ عہد شکنی کا اعلان حاکم خود کرتا تھا یا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار۔لہٰذا رشتہ دار ہونے کی بنا پر یہ خدمت سیدنا علی کو تفویض ہوئی۔(٢) اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کی مدح و ستائش فرمائی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبة: ٤٠) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ان فضائل و مناقب کا اظہار ان کے بھائی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہو۔ ہمیں روافض سے ایسے لوگوں کا علم ہے کہ اگر قرآن کریم میں یہ آیت نہ ہوتی تو وہ اسلام چھوڑ کر یہودی یا مجوسی ہو جاتے۔''

[3] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ ذات السلاسل، (حدیث: ٤٣٥٨)، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ۔ باب من فضائل ابی بکر الصدیق (حدیث: ٢٣٨٤)۔

یہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ننہال کا قبیلہ تھا اس لیے نبی کریم ﷺ متوقع تھے کہ یہ لوگ آپ کی اطاعت اختیار کر کے اسلام قبول کرلیں گے۔ پھر ان کے بعد حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے فرمایا: ''ایک دوسرے کی اطاعت کریں اور آپس میں اختلاف پیدا نہ کریں۔''

جب یہ لوگ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے جا ملے تو انہوں نے کہا: میں اپنے ساتھیوں کی جماعت کراؤں گا اور تم اپنے ساتھیوں کی جماعت کراؤ۔'' اس پر عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلکہ میں تم دونوں جماعتوں کی امامت کراؤں گا۔ اس لیے کہ آپ میرے لیے مدد بن کر آئے ہیں۔

تب ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کی اطاعت کروں، اور اگر تم میری بات نہیں بھی مانو گے تو میں تمہاری اطاعت کروں گا۔'' اس پر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہاری نافرمانی کروں گا۔''

اصل میں آپ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے اختلاف کرنا چاہتے تھے۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ایسے نہ کیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے میں مصلحت اسی میں تھی کہ اختلاف سے بچا جائے۔'' [سیرۃ ابن ھشام، ص(٦٥١)]

پس یہ سب حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حالانکہ سب لوگ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ یہ اکابر حضرات ابوبکر و عمر و ابوعبیدہ رضی اللہ عنہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ یہ بات ان کی فضیلت اور اصلاح پسندی کی علامت ہے۔ اس لیے کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس مصلحت کے پیش نظر امیر بنایا جا چکا تھا کہ ان کے قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے شاید وہ لوگ مسلمان ہوجائیں۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ کسی مصلحت کے پیش نظر افضل کی موجودگی میں مفضول کو امیر بنانا جائز ہے، جیسے نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ان کے والد کا انتقام لینے کے لیے امیر لشکر مقرر کیا تھا۔ اس لیے کہ غزوہ مؤتہ میں آپ کے والد شہید ہوچکے تھے۔

یہ بات تواتر کے ساتھ منقول اور ثابت شدہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی دوسرا صحابی نبی کریم ﷺ کے قریب، آپ کا خاص الخواص اور دن ورات میں آپ کے ساتھ رہنے والا، اعلانیہ و پوشیدہ کاموں میں شریک و سہیم نہیں تھا۔ اور نہ ہی آپ کے علاوہ کوئی دوسرا نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں آپ سے پہلے بولنے کی جرأت کرسکتا۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں حکم بھی دیتے، منع بھی کرتے ؛ خطبہ اور فتوی بھی دیتے۔ نبی کریم ﷺ آپ کے افعال پر راضی ہوتے ہوئے انہیں برقرار رکھتے۔ [1]

یہ نبی کریم ﷺ کی بات سے آگے بڑھنا نہیں تھا؛ بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے علم اور آپ کی اجازت سے تھا۔ اور اس میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تعاون اور آپ کی طرف سے تبلیغ کی ادائیگی ؛ اور آپ کے احکام کی تنفیذ تھی۔ اس لیے کہ آپ:

❀ رسول اللہ ﷺ کے متعلق سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

---

[1] یہ بات سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل میں شمار ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ جہاں بھی ہوتے سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کو شرف رفاقت حاصل ہوا کرتا تھا، اس لیے کہ زندگی میں سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے پہلے وزیر اور بعد از وفات خلیفہ اوّل تھے۔ ہجرت کرتے وقت سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ہمراہ تھے۔ جنگ بدر میں جو سائبان لگایا گیا تھا اس میں بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے رفیق تھے۔ ۹ھ میں امیر الحج مقرر ہوئے نبی کریم ﷺ کی جگہ شرف امامت سے مشرف ہوئے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صحابہ میں عظیم رتبہ پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں غزوہ فزارہ میں سرور کائنات ﷺ نے آپ کو امیر لشکر مقرر کیا، دیکھیے روایت سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ، المنتقی حدیث نمبر: ۲۸۴۳، بحوالہ مسلم و مسند احمد و ابوداؤد۔

❀ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تمام صحابہ سے بڑھ کر محبوب تھے۔

❀ رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے تابعدار و فرمانبردار تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے کہ: ''جب سورۂ توبہ دے کر آپ کو مکہ روانہ کیا تو تین دن واپس بلا لیا۔''

[جواب]: بیان کردہ قصہ کا جھوٹ ہونا صاف ظاہر ہے۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے آپ کو سن نو ہجری میں امیر حج بنایا تو آپ ایسے ہی امیر رہے یہاں تک کہ آپ نے حج ادا کیا؛ اور پھر حج پورا کرنے کے بعد مدینہ واپس لوٹ گئے۔اس حج میں آپ نے نبی کریم ﷺ کے احکام نافذ کیے۔اس لیے کہ اس وقت تک مشرکین بھی حج کیا کرتے تھے۔بیت اللہ کا ننگا طواف ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اور مشرکین کے مابین مطلق عہد و پیمان تھے۔آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔اور آپ کو حکم دیا کہ آپ اعلان کریں کہ:

❀ اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کا حج نہ کرے۔

❀ بیت اللہ کا طواف ننگے ہو کر نہ کیا جائے۔

اس سال ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ منادی کرائی۔اور حضرت علی بن ابوطالب رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اس سال ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے یہ اعلان کیا۔لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج کے لیے نکل چکے تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کے پیچھے بھیجا تاکہ مشرکین کے عہد و میثاق انہیں واپس لوٹا سکیں۔

کہتے ہیں: عربوں کی عادت تھی کہ عہد و پیمان وہی لوگ ختم کرتے تھے جو خود یہ عہد باندھتے یا پھر ان کے قریبی رشتہ داروں میں سے کوئی ایک ان معاہدوں کو ختم کرنے کا اعلان کرتا۔تو آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس لیے روانہ فرمایا تاکہ آپ مشرکین کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان ختم کرنے کا اعلان کردیں۔آپ کو بھیجنے کی کوئی دوسری وجہ نہیں تھی۔یہی وجہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔اور جملہ امور حج میں آپ کی اتباع کرتے رہے۔جس طرح کے باقی تمام رعیت آپ کی اطاعت کر رہی تھی۔

یہ واقعہ غزوہ تبوک کے بعد کا ہے' جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں نائب بنایا گیا تھا۔اور رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا: ''کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔''

پھر اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنایا۔اور پھر آپ کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ کا مامور بنا کر روانہ فرمایا۔اس میں دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے خلیفہ نہیں تھے؛ سوائے گنتی کے ان چند دنوں کے جب آپ مدینہ سے باہر تھے۔پھر سن نو ہجری میں حج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آپ پر امیر مقرر کر دیا۔پھر اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی؛ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہم اجمعین کو یمن روانہ فرمایا۔حضرت ابو موسیٰ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اس وقت واپس آئے جب آپ ﷺ حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے۔ان میں سے ہر ایک نے [غائبانہ طور پر] نبی کریم ﷺ کی نیت پر احرام باندھا اور تلبیہ کہا تھا۔جب کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں واپس تشریف لائے۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر ایک اور الزام]

[اعتراض] : شیعہ مصنف کا قول ہے:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چور کا بایاں ہاتھ کاٹ ڈالا۔ انھیں اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ چوری کی سزا میں دایاں ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ: اس سے زیادہ جھوٹی بات اور کیا ہوگی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے جائز تصور کرتے ہوں اس لیے کہ قرآن میں صراحتاً دائیں ہاتھ کی تصریح نہیں ہے۔ البتہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں یہ تصریح مذکور ہے؛ اسکے الفاظ یہ ہیں: ﴿ فَاقْطَعُوْا اَيْمَانَهُمَا ﴾ ''پس ان کے دائیں ہاتھ کاٹ ڈالو۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل بھی یہی رہا ہے۔ مگر اس کی کیا دلیل کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چور کا بایاں ہاتھ قطع کیا تھا۔ اور اس کی اسناد کہاں ہیں؟ ہمارے پاس علماء آثار کی تصانیف موجود ہیں مگر یہ بات کسی میں بھی مذکور نہیں۔ اختلافی مسائل کے بارے میں جو کتب تحریر کی گئی ہیں ان میں بھی اس روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ سب علماء حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت کے قائل ہیں۔

فصل:

[حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر آگ سے جلانے کا الزام]:

[اعتراض] : رافضی قلم کار لکھتا ہے:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فجاءہ سُلمی (1) کو زندہ جلا دیا تھا، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ سے جلانے سے منع کیا ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زنادقہ کو نذر آتش کر دینا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ روایات صحیحہ میں مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں غالی شیعہ اور زنادقہ کی ایک جماعت کو پیش کیا گیا تو آپ نے انھیں جلا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو فرمایا: ''اگر علی رضی اللہ عنہ کی جگہ میں ہوتا تو ہرگز یوں نہ کرتا، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو عذاب الٰہی میں مبتلا کرنے سے منع فرمایا ہے بلکہ میں انھیں قتل کر دیتا، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو اپنے دین کو بدل ڈالے اسے قتل کر دو۔'' (2)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو پوری ایک جماعت کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فعل برا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل اس سے بھی بڑھ کر برا ہے۔ اور اگر حاکم کے ایسے فیصلوں پر انکار نہیں کیا جا سکتا تو پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

---

(1) اس شخص کا اصلی نام ایاس بن عبداللہ بن عبد یالیل تھا، یہ فتنہ ارتداد کے زمانہ میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوا کہ میں مسلم ہوں اور مرتدین کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہوں مجھے سواری عنایت فرمایئے اور میری مدد کیجیے۔'' سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے سواری اور اسلحہ جنگ عطا کیا، اس نے قبیلہ بنی سلیم و عامر و ہوازن کے مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے طریفہ بن حاجز کو اسے سزا دینے کے لیے بھیجا، چنانچہ طریفہ نے اس کے ہمراہیوں سمیت اسے ٹھکانے لگا کر مسلمانوں کو اس کے شر سے بچا لیا۔

(2) صحیح بخاری، کتاب استتابة المرتدین، باب حکم المرتد والمرتدة (حدیث: ٦٩٢٢)۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر جہالت کا بہتان:

[اعتراض] : شیعہ مضمون نگار رقم طراز ہے:

''ابو بکر رضی اللہ عنہ اکثر شرعی احکام سے نابلد تھے، کلالہ کی میراث کا مسئلہ بھی آپ کو معلوم نہ تھا۔ اسی لیے اس کے متعلق فرمایا: ''میں اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں۔ اگر درست ہوا تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہوا تو شیطان کی طرف سے ہے۔'' ایسے ہی دادی کی میراث کے بارے میں ستر فیصلے دیے۔ اس سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی کوتاہی کا ثبوت ملتا ہے۔''

[جواب] : ہم کہتے ہیں: یہ عظیم بہتان ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی پر شریعت کے مسائل کیسے مخفی رہ سکتے ہیں حالانکہ عہد نبوت میں آپ کے سوا کوئی شخص فتویٰ نہ دیتا تھا اور نہ فیصلہ صادر کیا کرتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جملہ امور میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ آپ سے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خواص میں سے نہیں تھا۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ شرعی مسائل سے نابلد ہوں؟ بہت سارے علماء کرام جن میں سے ایک منصور بن عبدالجبار السمعانی بھی ہیں؛ نے اس بات پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اعلم الامت تھے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں جب بھی کسی بات میں کچھ اختلاف پیدا ہوا تو آپ نے کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا حل تجویز کیا۔

چنانچہ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور مقام تدفین پر روشنی ڈال کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھا۔[1] اور اس پر آیت قرآنی سے استشہاد کیا۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح کیا کہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف جنگ آزما ہونا شرعاً ضروری ہے۔[2] آپ نے بدلائل ثابت کیا کہ خلافت خاندان قریش میں محدود رہنی چاہیے۔[3]

مدینہ طیبہ سے کیے جانے والے پہلے حج پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو امیر بنایا۔ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نماز اور حج کے مسائل سے کما حقہ باخبر نہ ہوتے تو آپ انھیں امیر الحج نہ بناتے۔ ایسے ہی آپ کو نمازوں کی ادائیگی کے لیے امام بنایا گیا۔ اگر نماز کے مسائل میں آپ کی وسعت علم نہ ہوتی تو آپ کو امام صلوٰۃ مقرر نہ فرماتے۔ حالانکہ حج کے مسائل عبادات میں سب سے مشکل ہیں۔ پھر یہ کہ آپ نے حج اور نماز میں کسی صحابی کو بھی اپنا نائب مقرر نہیں کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے بارے میں جو کتاب مرتب کرائی تھی حضرت انس رضی اللہ عنہ نے وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے حاصل کی تھی۔[4] زکوٰۃ کے بارے میں جس قدر احادیث روایت کی گئی ہیں یہ ان سب میں صحیح تر ہے۔ فقہاء نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے عین برخلاف کسی شرعی مسئلہ میں بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔[5]

---

[1] سنن ابن ماجة، کتاب الجنائز، باب ذکر وفاته و دفنه ﷺ، (حدیث:١٦٢٨)

[2] صحیح بخاری، کتاب الزکاة، (حدیث:١٣٩٩، ١٤٠٠)، صحیح مسلم، کتاب الایمان، (حدیث:٢٠)

[3] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب رجم الحبلی فی الزنا(حدیث:٦٨٣٠)، مطولاً

[4] صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب زکاة الغنم(حدیث:١٤٥٤، ١٤٥١)

[5] بفرض محال اگر مسائل میں سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ سے غلطی سرزد ہوتی تو اس سے آپ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہ پڑتا، اس لیے کہ آپ غیر معصوم بشر تھے۔ یہی حال سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا تھا آپ سے غلطیاں سرزد ہوئیں اور ان سے آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا، آپ نے یہ فتویٰ دیا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اور وہ حاملہ ہو تو اس کی عدت أبعد الاجلین ہے۔(سنن کبریٰ بیهقی(٧/ ٤٣٠)، المغنی(١١/ ٢٨٩)، کتاب الام للشافعی(٧/ ١٧٣) یہ فتویٰ اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ بھی دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح غیر معصوم تھے۔

جبکہ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بہت سارے مسائل میں کئی ایک غلطیاں ہوئیں۔اس کی تفصیل اپنے مقام پر موجود ہے۔
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین کئی ایک مسائل میں اختلاف واقع ہوا ہے۔مثال کے طور پر:

میراث کے مسائل میں سے: دادا کے ساتھ بھائی کی میراث؛ عمریتین کا مسئلہ؛ عول کا مسئلہ۔

طلاق کے مسائل میں سے: ایک مجلس میں تین طلاقیں؛ حرام کہہ کر طلاق؛ بریہ اور خلیہ اور طلاق بتہ کا مسئلہ۔

جن مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف ہوا تھا یہ اختلاف آج تک اپنی جگہ پر امت میں موجود ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں اختلاف فقط اجتہادی مسئلہ تھا۔ان میں سے ہر ایک اپنے بھائی کے اجتہاد اور اس کی رائے کا احترام کرتا تھا۔جیسا کہ فقہاء کرام اہل علم و دین میں اختلاف ہوتا ہے۔

جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت اختلاف زیادہ ہوا؛ یہاں تک کہ درشت کلامی تک نوبت پہنچی؛ مگر نہ ہی کوئی ہاتھا پائی ہوئی اور نہ ہی سنگ و سناں کا استعمال ہوا؛ اور نہ ہی کوئی دیگر اس طرح کا معاملہ ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے وقت یہ اختلاف بہت بڑھ گیا؛ بات تیر و تفنگ تک جا پہنچی اور مسلمان اپنی تلواروں سے اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل کرنے لگے۔

جب کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد مسعود میں مسائل دین میں سے کسی ایک مسئلہ میں اختلاف کے پختہ ہونے کی خبر نہیں ملتی۔اس کی وجہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا کمال علم و عدل اور ان دلائل کی معرفت تھی جن سے اختلاف کی جڑیں ہی ختم ہو سکتی ہیں۔ آپ کے دور میں جب بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اختلاف پیدا ہوتا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایسے دلائل سے اس کا مقابلہ کرتے کہ آپ کی حجت فیصلہ کن ثابت ہوتی اور نزاع و اختلاف ختم ہو جاتا۔اکثر و بیشتر فیصلہ کن دلائل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس ہی ملتے تھے۔آپ کی موجودگی میں بہت کم ایسا ہوتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا کوئی دوسرا صحابی اپنی رائے کا اظہار کرتا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اسے برقرار رکھتے تھے۔

یہ دلیل ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ان کی رعیت؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی رعیت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی رعیت؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی رعیت سے افضل تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کے افضل ترین لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور پھر ان کی رعیت تھی۔

پھر وہ اقوال جن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی موت کے بعد آپ سے اختلاف کیا گیا ہے؛ ان میں اختلاف کرنے والے کے مقابلہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہی راجح ہے۔اس کی مثال دادا کے ساتھ بھائی کی میراث کے مسئلہ کو لیجیے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہ دادا کی موجودگی میں بھائی کو وراثت سے ساقط قرار دیتے ہیں۔علماء کے کئی طوائف کا یہی قول ہے۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی مسلک پر ہیں۔جب کہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل اور ان کے ساتھی جیسے شافعیہ میں سے: ابو العباس ابن سریج اور حنابلہ میں سے ابو حفص البرمکی کا یہی مسلک ہے' اور امام احمد سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ رحمۃ اللہ علیہم۔

اور جو لوگ دادا کے ساتھ بھائی کو وراثت دینے کا کہتے ہیں' جیسے حضرت علی اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما؛ ان کے مابین اختلاف بڑا مشہور ہے۔ان میں سے ہر ایک اپنے قول میں دوسرے کے خلاف کہہ رہا ہے۔ اور اس قول میں باقی

سارے صحابہ سے منفرد ہے۔ اس بارے میں ہم نے کئی جگہ پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔ اور اس بارے میں ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ اور ہم نے واضح کیا ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا موقف ہی حق اور ثواب ہے۔ اور یہی وہ راجح قول ہے جس پر شرعی دلائل کئی طرح سے دلالت کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

ایسے ہی جو مسائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں موجود تھے وہی حق تھے۔ مثال کے طور پر: حج کو فسخ کر کے عمرہ میں تبدیل کرتے ہوئے حج تمتع کرنا؛ اور ایک لفظ میں دی ہوئی تین طلاق کو ایک سمجھنا کہ اس سے صرف ایک ہی طلاق لازم آتی ہے؛ یہی راجح ہے نہ کہ فسخ کو حرام کہنا اور تین طلاق کو تین سمجھنا۔ اس لیے کہ کتاب و سنت اس پر دلالت کرتے ہیں جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام کمال پر فائز تھے؛ آپ صرف یہی نہیں کہ اس امت کے ہر ولی سے افضل ہیں؛ بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد جتنے بھی لوگ حاکم بنے ہیں؛ ان میں سب سے افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ اولین و آخرین میں انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ترین ہستی ہیں۔ صحیحین میں ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پا جاتا تو اس کا خلیفہ و نائب نبی ہوتا تھا۔ اور میرے بعد کوئی نبی نہیں؛ اور عنقریب میرے بعد خلفاء ہونگے اور بہت ہونگے۔ صحابہ نے عرض کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کرلو اسے پورا کرو۔'' [مسلم:ح ۲۷۶]

یہ بات سبھی جانتے ہیں جو کوئی فاضل کے بعد امور کی زمام کار سنبھالتا ہے؛ جب اس میں پہلے کی سیاست کی نسبت کچھ کمی یا نقص ہو تو وہ کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ جب کوئی بادشاہ اپنے سے پہلے بادشاہ کی جگہ ملکی نظم و نسق سنبھالتا ہے؛ یا کسی قاضی کے بعد کوئی قاضی بنتا ہے؛ یا کسی شیخ کے بعد کوئی شیخ مسند نشین ہوتا ہے تو اس کے احوال سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ بعد والے میں اگر کوئی نقص ہو تو وہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اور پہلے نے معاملات کو جس نظم و نسق کے ساتھ سنبھال رکھا ہوتا ہے؛ اس میں تبدیلی آجاتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم؛ جو کہ ساری کائنات میں کامل سیاسی رہنما بھی تھے؛ کے بعد حاکم بنے۔ تو اسلام میں کسی بھی لحاظ سے کوئی نقص یا کمی ظاہر نہیں ہوئی۔ بلکہ آپ نے مرتدین سے قتال کیا؛ اور معاملات کو اسی طرح بحال کیا جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھے۔ اور لوگ جس دروازہ سے اسلام سے نکل گئے تھے آپ نے وہیں سے دوبارہ انہیں اسلام میں داخل کیا۔ پھر اہل کتاب کفار سے جہاد شروع کیا۔ اور جو امور امت پر مخفی رہ گئے تھے ان کی تعلیم دی؛ اور جب ان میں کمزوری پیدا ہوگئی تھی تو انہیں طاقتور بنایا۔ اور جب بزدلی دکھانے لگے تو انہیں ہمت دلائی اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کے ساتھ ایسے چلتے رہے جس میں لوگوں کے دین اور دنیا کی اصلاح تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ سے تعلیم؛ دین اور قوت و طاقت کے ہر میدان میں اس امت کی اصلاح کی۔ اور آپ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس امت کے لیے ان کے دین کی حفاظت کا ذریعہ بن گئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کے صحیح حق دار تھے۔

[اعتراض]: شیعہ کا یہ کہنا: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کلالہ کی میراث سے آگاہ نہ تھے؛ اور اس مسئلہ میں اپنی رائے سے کہتے تھے۔''

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ یہی بات آپ کے عظیم عالم ہونے کی دلیل ہے۔ آپ نے کلالہ کے بارے میں جو موقف

اختیار کیا تھا؛ بعد میں جمہور علماء نے یہی مؤقف اختیار کیا ہے اور انہوں نے کلالہ کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ کلالہ وہ ہے جسکی اولاد ہو نہ والد؛ جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔ [1] رائے اور اجتہاد سے فیصلہ کرنا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے جیسے: حضرت ابوبکر؛ حضرت عمر؛ حضرت عثمان؛ حضرت علی؛ حضرت عبد اللہ بن مسعود؛ زید بن ثابت؛ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ۔ لیکن جو رائے حق کے موافق ہو' اس پر صاحب رائے کے لیے دو اجر ہوتے ہیں جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ رائے اس رائے سے بہتر ہے جس میں صرف ایک ہی اجر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قیس بن عبادہ رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

''یہ جو آپ سفر کرتے ہیں (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑائی کے لیے) تو اس کے بارے میں ہمیں بتلائیں کہ کیا اس کا کوئی عہد ہے جو آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا؟ یا آپ اپنی رائے سے ایسا کرتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کوئی عہد نہیں لیا لیکن یہ تو میری ذاتی رائے ہے۔'' [سنن أبو داؤد: ح ١٢٦٤]

اگر ایسی رائے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مابین اتنا خون خرابہ ہوا ہو؛ صاحب رائے کے امام اور خلیفہ ہونے میں مانع نہیں ہو سکتی تو پھر وہ رائے کیسے مانع ہو سکتی ہے جس کے صحیح ہونے پر جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہو۔''

رافضی نے شروع میں جو کہا ہے کہ آپ نے دادا کی میراث کے بارے میں ستر سے زیادہ فیصلے دیے؛ تو جان لینا چاہیے کہ یہ سب صاف جھوٹ ہے۔ نہ ہی یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے؛ اور نہ ہی آپ سے منقول ہے۔ بلکہ اس قول کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا رافضیوں کی جہالت اور جھوٹ کی انتہاء ہے۔ ہاں؛ بعض لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے دادا کی میراث کے بارے میں ستر سے زائد فیصلے کیے۔ مگر اس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنا بھی باطل ہے۔ اس لیے کہ آپ کی خلافت میں ستر ایسے دادا فوت ہی نہیں ہوئے جن کے پوتوں کے بھائی بھی ہوں۔ اس لیے کہ ان واقعات کی وجہ سے احتمال ہو سکتا تھا کہ آپ نے مختلف فیصلے دیے ہوں۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جھوٹ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دادا کو باپ کی مثل قرار دیتے ہیں، یہ متعدد صحابہ کا قول ہے۔ اور بہت سارے فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض شافعیہ اور بعض حنابلہ جیسے ابوحفص البرمکی بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ دلیل کے اعتبار سے یہی مسلک قوی تر ہے۔

اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فتوی دینے میں غلطی کی تھی۔ بخلاف دوسرے صحابہ کرام کے۔

[اور جو لوگ دادا کے ساتھ بھائی کو بھی وارث بناتے ہیں؛ ان میں حضرت علی' زید؛ ابن مسعود اور ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں۔ اس میں انہوں نے جمہور فقہاء سے اختلاف کیا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس ضمن میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کو اختیار کیا ہے۔ پس دادا کی میراث کے مسئلہ میں لوگ یا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فتوی پر عمل پیرا ہیں یا پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول پر؛ جس کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی فیصلہ دیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دادا کے بارے میں جو نظریہ اختیار کیا ہے ائمہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حق حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے باہر نہیں ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاضی تھے۔ حالانکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول حضرت زید رضی اللہ عنہ کے قول سے زیادہ راجح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دادا کی میراث میں توقف کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''میں چاہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے تین مسئلے کھل کر بیان کیے ہوتے: دادا کی میراث؛ کلالہ؛ اور سود کے ابواب۔

جب اس بات پر مسلمانوں کا اجماع قائم ہو چکا ہے کہ جد اعلیٰ چچا کی نسبت اولیٰ ہے، تو جد ادنیٰ بھائیوں سے اولیٰ ہوگا۔ جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ بھائی دادا کے شریک ہوتے ہیں ان کے اقوال میں شدید تناقض پایا جاتا ہے۔

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول سَلُوْنِی قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُوْنِیْ]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ کو علی رضی اللہ عنہ سے کیا نسبت جو کہا کرتے تھے: ''میرے مفقود (فوت) ہو جانے سے پہلے جو دریافت کرنا ہو کرلو۔ مجھ سے آسمان کے راستوں کے بارے میں پوچھئے کیوں کہ مجھے زمین کے راستوں سے ان کا زیادہ علم ہے۔

''ابوالبختری کا بیان ہے میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ کے منبر پر بیٹھے دیکھا۔ آپ نے نبی ﷺ کی زرہ، تلوار اور عمامہ زیب تن کر رکھا تھا۔ انگلی میں نبی کریم ﷺ کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ اسی دوران آپ نے شکم مبارک سے کپڑا اٹھا کر فرمایا: ''مجھے گم پانے سے پہلے جو پوچھنا چاہو پوچھ لو۔ بیشک میرے ان دونوں پہلوؤں کے درمیان علم غفیر ہے۔ بیشک یہ علم کا خزانہ ہے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی مجھے وحی الٰہی کے علاوہ کوئی جام نہیں پلایا۔ اللہ کی قسم! اگر میں تکیہ موڑ کر اس پر بیٹھ جاؤں تو اہل تورات کو تورات مطابق فتوی دوں اور اہل انجیل کو ان کی انجیل کے مطابق فتوی دوں؛ یہاں تک کہ اللہ کے حکم سے تورات اور انجیل بولنے لگ جائیں؛ اور وہ زبان حال سے کہیں: علی نے سچ کہا۔ میں تمہیں اس کے مطابق فتوی دیتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں نازل کی۔ اور تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہو؛ کیا تم عقل نہیں رکھتے''۔ [انتہی کلام الرافضی]

[جـــواب]: ہم کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا: ''مجھ سے پوچھو۔'' اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ آپ اہل کوفہ سے مخاطب تھے' اور کوفہ والے جاہل تھے اور آپ انھیں دین کے مسائل و احکام سکھانا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ ان میں جہلاء کی اکثریت تھی ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کو نہیں پایا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ آپ کے منبر کے گرد اکابر صحابہ موجود رہتے تھے؛ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا تھا اور تعلیم پائی تھی۔ اور آپ کی رعیت امت بھر میں زیادہ صاحب علم اور دین دار تر تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخاطب عوام تابعین میں سے تھے، بلکہ یوں کہیے کہ ان میں بہت سے بدترین تابعین میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی مذمت بیان کرتے اور ان پر بدعا کیا کرتے تھے۔ جب کہ مکہ و مدینہ اور شام و بصرہ کے تابعین کوفہ والوں سے بدرجہا بہتر تھے۔ خلفاء اربعہ سے منقول فتاویٰ جمع کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے حضرت ابوبکر و عمر کے فتاوی قرین صحت و صواب اور ان کے علم و فضل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ عمر رضی اللہ عنہ کے فتاوی سے بھی صحیح تر ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ میں سے مخالف نص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قضایا کی نسبت تعداد میں کم ہیں۔ آج تک کوئی ایسی نص معلوم نہیں ہوسکی جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ مسائل کے خلاف ہو۔ خلافت

صدیق میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی مشتبہ مسائل کی وضاحت فرمایا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں صحابہ کا اختلاف معروف نہیں ہے۔

[شیعہ مصنف کی ابوالبختری سے بیان کردہ روایت] صریح کذب ہے۔ایسے اقوال کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں۔ بیشک حضرت علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ اوراس کی کتاب کی خوب معرفت رکھتے تھے۔اس لیے آپ اہل کتاب کے معاملات کا فیصلہ تورات و انجیل کی روشنی میں کرنے کے مجاز نہ تھے۔[بلکہ صرف قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرنا آپ کے لیے ناگزیر تھا۔[1]] مسلمانوں کا اجماع ہے کہ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسری شریعت کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرے۔اگر یہودی اورعیسائی بھی مسلمانوں کے پاس اپنے جھگڑے لے کر آئیں تو انہیں چاہیے کہ ان لوگوں کے مابین بھی کتاب اللہ یعنی قرآن کریم میں نازل کردہ احکام الٰہیہ کے مطابق فیصلہ کریں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَ مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْكَ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا وَ مَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ☆ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾ [المائدة ۴۱۔۴۲]

’’اے رسول! آپ ان لوگوں کے پیچھے نہ کڑھیے جو کفر میں سبقت کررہے ہیں خواہ وہ ان (منافقوں) میں سے ہوں جو زبانی تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے دل میں ایمان نہیں۔اور یہودیوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو غلط باتیں سننے کے عادی ہیں اور ان لوگوں کے جاسوس ہیں جو اب تک آپ کے پاس نہیں آئے وہ کلمات کو اصلی موقف کو چھوڑ کر انہیں تبدیل کر دیا کرتے ہیں، کہتے کہ اگر تم یہ حکم دیئے جاؤ تو قبول کر لینا اگر یہ حکم نہ دیئے جاؤ تو الگ تھلگ رہنا۔اور جس کا خراب کرنا اللہ کو منظور ہو تو آپ اس کے لئے خدائی ہدایت میں سے کسی چیز کے مختار نہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کے دلوں کو پاک کرنے کا نہیں؛ ان کے لئے دنیا میں بھی بڑی ذلت اور رسوائی ہے اورآخرت میں بھی ان کے لئے بڑی سخت سزا ہے۔یہ کان لگا کر جھوٹ کے سننے والے؛ اور جی بھر بھر کر حرام کے کھانے والے ہیں اگر یہ تمہارے پاس آئیں تو تمہیں اختیار ہے خواہ ان کے مابین فیصلہ کرو خواہ ان کو ٹال دو۔اگر آپ ان سے منہ پھیر دو گے تو

[1] قرآنی احکام کو منسوخ کر کے یہود کے شرائع و احکام کو معمول بہا ٹھہرانا یہود کی دیرینہ خواہش ہے جو ماضی ہی میں ختم نہیں ہوئی، بلکہ مستقبل تک جاری وساری ہے۔ہم قبل ازیں شیعہ کی معتبر کتاب کافی کلینی...... جو شیعہ کے یہاں بخاری کے مرتبہ سے کم نہیں...... سے نقل کر چکے ہیں کہ اس کے ایک باب کا عنوان ہے ’’جب ائمہ کا بول بالا ہوگا تو وہ داؤد اور آل داؤد کے مطابق فیصلے کیا کریں گے، گواہ کی حاجت نہ ہوگی۔‘‘ ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری رسالت کا یہ حشر نہ ہونے دے اور اس سے اسے محفوظ و مصئون رکھے۔

بھی یہ آپ کو ہرگز کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں، یقیناً عدل والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ☆وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ﴾ [المائدۃ ۴۸۔۴۹]

''اور ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ یہ کتاب نازل فرمائی ہے جو اپنے سے اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ ہے اس لئے آپ ان کے آپس کے معاملات میں اسی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق حکم کیجئے اس حق سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ جایئے تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک دستور اور راہ مقرر کر دی اگر منظور مولا ہوتا تو سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس کی چاہت ہے کہ جو تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے تم نیکیوں کی طرف جلدی کرو تم سب کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے، پھر وہ تمہیں ہر وہ چیز بتا دے گا، جس میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔ آپ ان کے معاملات میں خدا کی نازل کردہ وحی کے مطابق ہی حکم کیا کیجئے، ان کی خواہشوں کی تابعداری نہ کیجیے اور ان سے ہوشیار رہیے کہ کہیں یہ آپ کو اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ادھر ادھر نہ کریں اگر یہ لوگ منہ پھیر لیں تو یقین کریں کہ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دے ہی ڈالے اور اکثر لوگ نافرمان ہی ہوتے ہیں۔''

جب کتاب و سنت کی روشنی میں یہ معلوم ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان فیصلہ کرنے والے مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کرے۔ خواہ یہ فیصلہ تورات و انجیل کے موافق ہو یا نہ ہو۔ تو پھر جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کے باہمی معاملات کا فیصلہ تورات و انجیل کے مطابق کیا کرتے تھے؛ یا اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے؛ اور اس پر ان کی مدح بھی کرتا ہے یا تو وہ بہت بڑا جاہل ہے اور یا زندیق و ملحد ہے کہ اس مدح کے پردے میں آپ پر جرح و قدح وارد کرنے کا خواہاں ہے۔ اس لیے کہ یہ بات مدح و ثواب کی موجب نہیں، بلکہ ذم و عقاب کا باعث ہے۔

❁❁❁❁

فصل:

[حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سابقہ انبیاء کی مثالیں]

شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''محدث بیہقی اپنی سند کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص حضرت آدم علیہ السلام کا علم، نوح علیہ السلام کا تقویٰ، ابراہیم علیہ السلام کا حلم، موسیٰ علیہ السلام کا رعب و دبدبہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طاعت و عبادت کو دیکھنا چاہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لے۔'' رسول اللہ ﷺ نے انبیاء سابقہ کے متفرق خصائل کو صرف ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت کر دیا ہے۔'' [رافضی کا دعویٰ ختم ہوا]۔

- **پہلا جواب:** ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے، اگر شیعہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو اس کی سند ذکر کریں۔ امام بیہقی فضائل میں ضعیف تو کیا موضوع احادیث تک بیان کر دیتے ہیں۔ جس طرح ان جیسے دوسرے اہل علم نے بھی کیا ہے۔
- **دوسرا جواب:** یہ حدیث محدثین کے نزدیک بلاشبہ کذب و موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضائل علی رضی اللہ عنہ کی احادیث کے حریص ہونے کے باوجود امام نسائی رحمہ اللہ جیسے محدثین نے بھی اسے ذکر نہیں کیا۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الخصائص میں فضائل علی رضی اللہ عنہ سے متعلق روایات کو جمع کر دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی متعدد احادیث آپ کے فضائل میں ذکر کی ہیں جن میں سے بعض ضعیف بلکہ موضوع بھی ہیں۔ مگر یہ حدیث کسی نے بھی ذکر نہیں کی۔

فصل:

[علمِ علی رضی اللہ عنہ اور من گھڑت روایت]

[کج فہمی]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''ابوعمر زاہد [1] کا قول ہے کہ: ابوالعباس نے کہا: ہمیں حضرت شیث علیہ السلام سے لے کر نبی ﷺ تک کوئی نبی ایسا معلوم نہیں جس نے یہ الفاظ کہے ہوں کہ ''جو پوچھنا چاہو مجھ سے پوچھ لو۔'' البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اکابر صحابہ مثلاً ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما آپ سے مسائل دریافت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سوالات کا سلسلہ رک گیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے کمیل بن زیاد! میری ذات میں علم کی فراوانی ہے، اے کاش! اس علم کا کوئی حامل ہوتا۔''

[جواب]: اگر اس روایت کی نقل ثعلب سے درست بھی ثابت ہو جائے؛ تو یہ بے سند ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج نہیں۔ ثعلب ان ائمہ حدیث میں سے نہیں ہے جنہیں صحیح و سقیم روایات کا علم ہوتا ہے؛ تاکہ یہ کہنا بجا ہوتا کہ یہ روایت ثعلب کے ہاں صحیح ہے۔'' جیسے امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور امام بخاری جیسے محدث؛ [جب یہ لوگ کہتے ہیں کہ: فلاں حدیث صحیح ہے تو اسے صحیح تسلیم کرلیا جاتا ہے]۔ بڑے بڑے فقہاء جو کہ [علم و فقہ و تقویٰ میں] ثعلب سے بہت آگے ہیں؛ بے اصل احادیث ذکر کرتے ہیں تو پھر ثعلب کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مزید یہ کہ ثعلب نے یہ روایت ایسے لوگوں سے سنی ہے جو اپنے اساتذہ کا نام ہی بیان نہیں کرتے۔

[1] ابوعمر زاہد المتوفی (۲۶۱۔۳۴۵) کا اصلی نام محمد بن عبد الواحد بن ابو ہاشم المطرز المعروف غلام ثعلب ہے۔ ابو العباس کا نام احمد بن یحییٰ ثعلب المتوفی (۲۰۰۔۲۹۱) ہے۔ یہ ابوعمر زاہد کا استاد ہے۔

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد مدینہ کا نہیں ؛ اور نہ ہی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے کا ہے ؛ بلکہ آپ نے یہ الفاظ کوفہ میں ارشاد فرمائے۔ آپ کوفہ کے لوگوں کو کہا کرتے تھے کہ آپ سے دینی مسائل پوچھیں۔ اس لیے کہ یہ لوگ دینی علم حاصل کرنے میں بہت زیادہ کوتاہی کرتے تھے۔ اس لیے آپ لوگوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ وہ علم دین حاصل کریں اور علمی مسائل پوچھا کریں۔ اس کی دلیل کمیل کی روایت ہے۔ اس میں شک وہ شبہ نہیں کہ کمیل تابعین میں سے ہیں اور آپ کو کوفہ میں ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صحبت کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے کہ ان لوگوں میں طالب علمی کے دعویٰ کے باوجود علم کے حصول میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے آپ نے یہ کلمات مہاجرین و انصار کے سامنے ارشاد نہیں فرمائے ؛ بلکہ آپ ان لوگوں کی مدح و تعریف کیا کرتے تھے۔

جس جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی دریافت نہیں کیا کرتے تھے۔ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ سنت محمودہ تھی کہ آپ صحابہ کرام ؛ حضرت عثمان ' حضرت علی ' حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؛ حضرت عبد اللہ بن مسعود ' حضرت زید بن ثابت اور دوسرے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آپ کی مجلس شوریٰ میں اسی طرح تھے جس طرح باقی لوگ۔ حضرت ابوبکر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما میں سے کوئی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی ایسا خاص مشورہ نہیں کیا کرتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے علم حاصل کیا تھا۔ جیسا کہ سنن میں مذکور ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

((جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو اس پر عمل کی توفیق بخشتا جس قدر چاہتا [اور مجھے اس سے فائدہ پہنچتا]۔ اور جب کوئی اور مجھ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کرتا تو میں اسکو قسم دیتا ؛ جب وہ قسم کھا لیتا تو مجھے یقین آ جاتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ : ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے حدیث بیان کی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سچ کہا انکا کہنا ہے کہ : '' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ : '' کوئی بندہ ایسا نہیں جو کوئی گناہ کر بیٹھے اور پھر اچھی طرح وضو کر کے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھے اور پھر اللہ سے معافی چاہے اور اللہ اس کو بخش نہ دے۔'' [سنن ابو داؤد: ج1: ح 1517]۔

فصل :

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے قصاص ؟

[اعتراض] : شیعہ مصنف لکھتا ہے :

'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شرعی حدود کو ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ کو قتل کر دیا ' جو کہ مسلمان تھا تو اس سے قصاص نہیں لیا تھا۔ خالد رضی اللہ عنہ نے جس دن مالک بن نویرہ کو قتل کیا اس رات اس کی بیوی سے شادی کر لی ؛ اور اس سے ہم بستر بھی ہوئے۔ جب عمر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبول نہ کیا۔''

[جواب] : اس کے جواب میں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں :

پہلی بات : اگر کسی بے گناہ کے قتل کا قاتل سے قصاص نہ لینا ایسا جرم ہے جس کی وجہ سے حکمران یا امام پر انکار کیا جا سکتا ہے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حامیان عثمان رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی دلیل یہی ہو گی کہ وہ آپ کا قصاص لینے سے قاصر

رہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مالک بن نویرہ جیسے زمین بھر کے لوگوں سے بدرجہا افضل تھے۔ آپ مسلمانوں کے خلیفہ تھے؛ آپ کو بحالت مظلومی بغیر کسی وجہ کے شہید کیا گیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قاتلوں سے قصاص نہ لیا۔ اسی وجہ سے شیعان عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شریک نہ ہوئے۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان کو قتل کرنے میں معذور تھے؛ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا عذر مالک بن نویرہ کے قاتل کو قتل نہ کرنے میں اس سے زیادہ قوی ہے۔ [شیعہ کو چاہیے کہ اہل سنت کی طرح ابوبکر و علی رضی اللہ عنہما دونوں کو معذور قرار دیں]۔

اور اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کوئی عذر نہیں تھا تو پھر قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو چھوٹ دینے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی کوئی عذر نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ رافضی کرتے ہیں کہ اس چھوٹے سے معاملہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر تو اعتراض کرتے ہیں' مگر اتنے بڑے معاملہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اعتراض نہیں کرتے؛ تو یہ ان کی جہالت کی انتہاء اور عقیدہ و اقوال میں تناقض کا نتیجہ ہے۔

ایسے ہی شیعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ جب عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ہرمزان کو قتل کر دیا تو انھوں نے عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لیا۔ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح معذور تھے۔ (ہرمزان کے قتل کے لیے دیکھیے "العواصم من القواصم، ص: ۱۰٦، ۱۰۸)

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لینے میں معذور تھے۔ اس لیے کہ قصاص لینے کی شرائط پوری طرح نہیں پائی جاتی تھیں۔ ایسا یا تو اس وجہ سے تھا کہ آپ متعین قاتلوں کو نہیں جانتے تھے۔ یا پھر اس کی یہ وجہ تھی کہ قاتلین بڑی قوت اور طاقت والے تھے۔ یا پھر اس طرح کا کوئی دیگر عذر بھی ہوسکتا ہے۔

تو کہا جائے گا کہ: یہی حال مالک بن نویرہ کے قتل کے متعلق بھی تھا؛ اس میں بھی پوری شروط نہیں پائی جاتی تھیں۔ اور ہرمزان کے قاتل کو بھی شبہ کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا؛ کیونکہ شبہات کی وجہ سے حد نافذ نہیں کی جاسکتی۔

اگر شیعہ کہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا' اور ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عبید اللہ بن عمر رحمہ اللہ کے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حالانکہ جن لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا تھا ان کے جواب میں ایسی دلیل پیش کی گئی جس کے سامنے انہوں نے سر تسلیم خم کرلیا؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ حق آپ کے ساتھ تھا؛ اور ایسے معاملات میں اجتہاد جائز تھا۔

اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کا بدلہ لینے کا مشورہ نہ مانا تو ان کے اور فریق مخالف [یعنی مشورہ دینے والوں] کے مابین جنگیں برپا ہوئیں۔ ان سے کوئی بھی انسان لاعلم نہیں ہے۔ جنگ صفین اور جنگ جمل کے مقابلہ میں قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا بہت آسان تھا۔ اگر یہاں پر آپ کے لیے اجتہاد جائز تھا؛ تو پھر ابوبکر و عثمان رضی اللہ عنہما کو بھی بدرجہ اولی اجتہاد کا حق حاصل تھا۔

اگر شیعہ کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مباح الدم تھے۔

تو ان کے جواب میں کہا جائے گا کہ: اس میں کوئی بھی شک نہیں کرسکتا کہ مالک بن نویرہ کا مباح الدم ہونا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مباح الدم ہونے کی نسبت زیادہ واضح تھا۔ بلکہ مالک بن نویرہ کے بارے میں معصوم الدم ہونا ہی معلوم نہیں۔

ہمارے ہاں ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوسکی ۔ جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں تواتر کے ساتھ کتاب وسنت سے ثابت ہے کہ آپ معصوم الدم تھے' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور مالک بن نویرہ کے مابین اتنا بڑا فرق ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی صحیح جانتا ہے ۔

اور جولوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مباح الدم کہتے ہیں ان کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو معصوم الدم ثابت کرسکیں ۔ اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا معصوم الدم ہونا حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے معصوم الدم ہونے کی بہ نسبت زیادہ ظاہر ہے ۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی نسبت سے موجبات قتل سے بہت زیادہ دور تھے ۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والوں کا شبہ حضرت علی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو قتل کرنے والوں کے شبہ کی نسبت انتہائی بودا اور کمزور تھا ۔اس لیے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا ۔اور نہ ہی انہوں نے اپنی خلافت کے لیے کسی سے جھگڑا کیا اور نہ ہی اپنے خلافت پر کسی سے جنگ وقتال کے لیے مدد طلب کی ۔

تو پھر اگر یہ کہنا جائز ہوسکتا ہے کہ جس نے اپنی خلافت کے لیے مسلمانوں کی بڑی تعداد کو قتل کیا؛ وہ اپنے اس فعل میں مجتہد تھا تو پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ معصوم الدم تھے ۔ اس لیے کہ آپ اموال اور ولایات کے امور میں بدرجہ اولی اپنے افعال وتصرفات میں مجتہد تھے ۔

مالک بن نویرہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ معصوم الدم تھا؛ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے تاویل کی بنیاد پر قتل کردیا ۔حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے لیے آپ کو قتل کرنا مباح نہ تھا ۔جیسا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے لا إلہ إلا اللّٰہ کہنے کے بعد ایک انسان کو قتل کردیا تھا ۔آپ فرماتے ہیں: جب ہم واپس ہوئے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر ملی تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ:

''اے اسامہ کیا تو نے اسے لا الہ الا اللّٰہ کہنے کے بعد بھی قتل کردیا، اے اسامہ کیا تو نے اسے لا الہ الا اللّٰہ کہنے کے بعد بھی قتل کردیا، اے اسامہ کیا تو نے اسے لا الہ الا اللّٰہ کہنے کے بعد بھی قتل کردیا ۔'' [صحیح بخاری ، ج۳ ح ۱۷۸۰]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس قتل کا انکار کررہے ہیں ؛ مگر اس کے باوجود آپ نے اسامہ سے نہ قصاص لیا ؛ نہ ہی دیت واجب کی اور نہ ہی کفارہ ادا کرنے کا کہا ۔

محمد بن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں]:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ [النساء ۹۴]

''جوتم سے سلام علیک کرے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں ۔''

آپ فرماتے ہیں : یہ آیت مرداس کے بارے میں نازل ہوئی ۔مرداس غطفان کا ایک آدمی تھا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا؛ اس پر امیر لشکر غالب لیثی تھے ۔[اس قوم کے] کچھ لوگ بھاگے مگر وہ نہیں بھاگا؛ انہوں نے کہا: میں ایمان لاچکا ہوں ۔صبح کے وقت لشکر کے گھوڑے سوار وہاں پہنچ گئے ؛ انہوں نے سلام کیا' مگر ان لوگوں نے اسے قتل کرکے اس کا مال لے لیا ۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کا مال واپس کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کے گھر والوں کو دیت بھی ادا کی جائے ۔اور مؤمنین کو منع کردیا گیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں ۔

ایسے ہی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب تأویل کی وجہ سے بنو جذیمہ کو قتل کردیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست

مبارک اٹھا کر اللہ کی بارگاہ میں دعا کی:

''اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا ہے' میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔'' [البخاري ٤/ ١٠٠]

مگر اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل نہیں کیا؛ اس لیے کہ آپ متاول تھے۔ جب نبی کریم ﷺ تاویل کی وجہ سے بنو جذیمہ کے کئی اہل ایمان کے قاتل کو قتل نہیں کر رہے؛ تو پھر یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے حجت کیسے نہیں ہوسکتی کہ آپ نے تاویل کی وجہ سے مالک بن نویرہ کو قتل کرنے والے کو قتل نہ کیا۔''

اس سے پہلے رافضی کا اعتراض گزر چکا ہے جو اس نے بنو جذیمہ کے معاملہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر کیا تھا۔ رافضی کو پتہ ہے کہ [بنو جذیمہ کے مسئلہ پر] نبی کریم ﷺ نے آپ کو قتل نہیں کیا۔تو پھر اس چیز کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں حجت کیسے تسلیم نہیں کرسکتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی ہوائے نفس کی پیروی میں لگتا ہوتا ہے اسے اس کی گمراہی اندھا کر دیتی ہے۔ [اور وہ کبھی راہ حق پر نہیں آسکتا]۔

- شیعہ مصنف کا کہنا کہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔''
- جواب: اس میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔ اس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کیا جائے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ آپ کو قتل کیا جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑے عالم نہیں تھے۔ اہل سنت اور شیعہ دونوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ پر واجب نہیں تھا کہ وہ اپنی رائے چھوڑ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی اتباع کریں۔ اور کسی شرعی دلیل کی روشنی میں یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے راجح ہے۔ تو اب کسی کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اس معاملہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں عیب شمار کرے؟ ایسا وہی کرسکتا ہے جو لوگوں میں سے سب سے کم علم و دین رکھتا ہو۔

ہمارے ہاں کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ معاملہ کی صورتحال ایسی تھی جس کی وجہ سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا واجب ہو رہا ہوتا۔

رافضی مصنف نے جو کہا ہے کہ: ''انہوں نے مالک بن نویرہ کے قتل کی رات ہی اس کی بیوی سے شادی کر لی۔''

- اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بالفرض اگر اسے ثابت مان بھی لیا جائے تو تاویل اس بنا پر رجم کرنے میں مانع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ: فقہاء کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ فوتگی [بیوگی] کی عدت کیا ہے؟ اور کیا یہ عدت کافر کے لیے بھی ہے؟ اس میں دو قول ہیں۔ ایسے ہی ذمی عورت کی عدت وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ اس میں بھی مسلمانوں کے ہاں دو قول مشہور ہیں۔ بخلاف طلاق کی عدت کے۔ اگر طلاق میں وطی کا سبب موجود ہو تو برأت رحم تک انتظار واجب ہے۔ جبکہ وفات کی عدت صرف عقد نکاح کر لینے سے واجب ہوجاتی ہے۔ لیکن پھر اگر دخول سے پہلے شوہر مر جائے تو کیا کافر کی عدت بھی ہوگی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اور ایسے ہی اگر کافر نے دخول بھی کیا اور دخول کے بعد ایک حیض آ گیا ہو [تو کیا اس پر عدت ہوگی یا نہیں؟]۔

یہ مسائل اس وقت ہیں جب کافر اصلی کافر ہو [یعنی مرتد نہ ہو]۔ جب کہ مرتد اگر قتل کر دیا جائے؛ یا اپنے ارتداد پر ہی مر جائے؛ تو اس صورت میں امام شافعی؛ امام احمد؛ ابو یوسف؛ اور محمد رحمہم اللہ کے ہاں اس پر کوئی عدت وفات نہیں۔ بلکہ وہ اسے

فُرقہ ءبائنہ شمار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح باطل ہوگیا تھا۔ یہ جدائی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے ہاں طلاق نہیں ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے ہاں طلاق ہے۔ اسی وجہ سے اس پر عدت وفات کو واجب نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس پر دائمی جدائی کی عدت شمار کرتے ہیں۔ اور اگر اس مرتد نے عورت کے ساتھ دخول نہیں کیا تھا تو پھر اس پر کوئی عدت نہیں ہے۔ جیسا کہ اگر وہ دخول سے پہلے طلاق دیدیتا تو اس پر کوئی عدت نہ ہوتی۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مالک بن نویرہ کو مرتد سمجھ کر قتل کیا تھا۔ اگر مالک بن نویرہ نے اپنی بیوی سے اس سے پہلے دخول نہیں کیا تھا تو پھر تمام علماء کے نزدیک اس پر کوئی عدت نہیں تھی۔ اور اگر اس کے ساتھ دخول کیا تھا تو پھر بھی بعض علماء کرام کے نزدیک اس پر ایک حیض کی عدت تھی؛ اس لیے کہ استبراء رحم واجب ہے۔ تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اسے اس سے پہلے حیض آچکا ہو۔ اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ کچھ دن کا حیض آجانا بھی کافی ہے۔ اس لحاظ سے اگر وہ حیض کے آخری ایام میں بھی تھی تو تب بھی برأت رحم ہو چکی تھی۔

خلاصہ ءکلام! ہم اس معاملہ کی گہرائیوں سے واقف نہیں۔ کیا یہ ایسا معاملہ تھا کہ اس میں اجتہاد جائز ہے یا نہیں؟۔ ایسی باتوں میں طعن کرنا بغیر علم کے بات کہنا ہے۔ اور بغیر علم کے بات کہنے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔

فصل:

[میراث فاطمہ رضی اللہ عنہا پر اعتراض]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فدک کی جاگیر نہ دے کر ارشاد رسول ﷺ کی خلاف ورزی کی۔ اور آپ کو خلیفہ رسول کہا جاتا ہے؛ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو خلیفہ نہیں بنایا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: بعض جاہل شیعہ کے سوا سب اہل اسلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے۔ اس بارے میں تفصیلی کلام گزر چکا ہے۔ ہم نے وہاں پر ثابت کیا ہے کہ عدم توریث والی حدیث نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اور اس بارے میں رافضیوں کا کلام قطعی طور پر باطل ہے۔

ایسے ہی فدک کے مسئلہ پر بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد کے خلفاء اسی قول پر گامزن رہے۔ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اموال فدک میں سے کچھ بھی اپنے لیے نہیں رکھا اور نہ ہی اس میں سے کچھ اپنے اہل خانہ کو دیا۔ اور نہ ہی کوئی زمین اپنے پاس روک کر رکھی۔ بلکہ بنی ہاشم کو اس سے کئی گنا بڑھ چڑھ کر زیادہ دیا۔

پھر اگر کوئی اعتراض کرنے والا کہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے بنی ہاشم سے مال روکا کرتے تھے۔ حتی کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بصرہ کا آدھا مال لے گئے۔ تو شیعہ کے پاس اس اعتراض کا اس کے سوا کوئی جواب نہ ہوگا سوائے اس کے کہ: آپ عادل اور نیک حکمران تھے' اور آپ کا ارادہ صرف حق کا تھا۔ اس لیے آپ کو متہم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ جواب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حق میں زیادہ اولی اور مناسب ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بڑھ کر محبت کرنے والے اور آپ کے حقوق کا خیال رکھنے والے تھے۔

کسی انسان کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بدگمانی اور ہویٰ سے بری قرار دینا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی برأت سے بڑھ کر نہیں

ہوسکتا۔اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسے عادل حکمران تھے جو کہ اپنی ذات کے لیے کچھ بھی تصرف نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ آپ کی تمام تر کوششیں مسلمانوں کی خیر و بھلائی کے لیے ہوا کرتی تھیں۔آپ نے اپنی ذات کے لیے کوئی مال نہیں لیا۔ بلکہ وہ مال مسلمانوں کا تھا۔ جب کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اسے اپنی ذات کے لیے طلب کررہی تھیں۔ یہ بات ہم ضرورت کے تحت جانتے ہیں کہ حکمران اپنے حریف سے بڑھ کر خواہشات نفس سے دور ہوتا ہے۔اس لیے کہ حریف جس چیز کا طلب گار ہوتا ہے وہ اپنی ذات کے لیے طلب کرتا ہے۔جب کہ اس بارے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا علم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے علم سے بڑھ کر ہے۔

اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ان چیزوں کی جانکاری اور عدل و انصاف کے قائم کرنے کے زیادہ حق دار تھے۔ جو کوئی اس معاملہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑا عالم اور عادل کہے؛ وہ لوگوں میں سب سے بڑا جاہل ہے۔خصوصاً جب کہ جمہور مسلمین کی اس مسئلہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے میں کوئی غرض ہی نہیں تھی۔تمام ائمہ اور فقہاء کا متفقہ مسئلہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنا مال وراثت میں نہیں چھوڑتے۔حالانکہ یہ تمام حضرات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عزت وقدر کرتے ہیں اور آپ کی عظمت کا خیال رکھتے ہیں۔لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ کسی فرمان کو لوگوں کے اقوال کے مقابلہ میں ترک بھی نہیں کرتے۔اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم بھی نہیں دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے اپنا دین اخذ کریں۔نہ ہی آپ کے اقارب سے؛ اور نہ ہی غیر اقارب سے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:''وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو عورت کو اپنا بڑا بنالیں۔''[رواہ البخاری ٦/ ٢٨]

تو پھر امت کے لیے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم شدہ سنت چھوڑ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے منقول حکایات کو مان لیں کہ آپ نے اپنی میراث طلب کی تھی؛ اس لیے کہ آپ کو یقین تھا کہ انہیں وراثت ملے گی۔

فصل:

[خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں نے خلیفہ رسول پکارنا شروع کیا۔اگر خلیفہ سے مراد وہ ہے جسے اپنے بعد نائب بنایا جائے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا؛ جیسا کہ اہل سنت والجماعت میں سے بعض علماء کرام کہتے ہیں۔ اور اگر خلیفہ سے مراد وہ ہے جو خود کسی کا قائم مقام بن جائے؛ اگرچہ اسے نائب نہ بھی بنایا گیا ہو؛ جیسا کہ جمہور علماء کا قول ہے۔تو پھر اس نام کے لیے استخلاف کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔کتاب وسنت کے دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ اسے کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام بن جائے خواہ اسے نائب بنایا جائے یا نہ بنایا جائے۔[اس کی مثالیں:]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ [یونس ١٤]

''پھر ان کے بعد ہم نے دنیا میں بجائے ان کے تم کو جانشین کیا تا کہ ہم دیکھ لیں کہ تم کس طرح کام کرتے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ﴾ [الأنعام ١٦٥]

''وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ﴾ [الزخرف ۲۰]

''اگر ہم چاہتے تو تمہارے عوض فرشتے کر دیتے جو زمین میں جانشینی کرتے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ﴾ [الأعراف ۶۹]

''اور تم وہ وقت یاد کرو کہ جب اللہ نے تم کو قوم نوح کے بعد جانشین بنایا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ﴾ [الأعراف ۷۴]

''جب قوم عاد کے بعد تمہیں اللہ نے جانشین بنایا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي﴾ [الأعراف ۱۴۲]

''اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ﴾ [الفرقان ۶۲]

''اور اسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا یہ اس شخص کے لئے ہے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ [یونس ۶]

''بلاشبہ رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں......''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ﴾ [الأعراف ۱۲۹]

''بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کرے گا اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا خلیفہ بنا دے گا پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ [النور ۵۵]

''تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ [البقرة ۳۰]

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ﴾ [ص ۲٦]

''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا۔''

ان آیات میں اکثر جگہ پر مراد یہ ہے کہ دوسرا پہلے کا خلیفہ ہو۔ اگر چہ پہلے والے نے اسے اپنا نائب نہ بھی بنایا ہو۔ خلیفہ کو خلیفہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے سے پہلے والے کے بعد میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے بنایا ہے کہ ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ جیسے دن اور رات آگے پیچھے آتے رہتے ہیں۔ دن رات کے بعد آتا ہے اور رات دن کے بعد آتی ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہونا نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں۔ ہم نے دوسری جگہ پر اس مسئلہ پر تفصیلی کلام کیا ہے۔

لوگ مسلمان حکمرانوں کو خلفاء کہتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم پر میری سنت واجب ہے' اور میرے بعد میرے ہدایت و رشد یافتہ خلفاء کی سنت واجب ہے۔'' [ابو داؤد ٤/ ۲۸۰]

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نہیں بنایا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کسی ایک متعین کو خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا: ''اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کروں تو مجھ سے قبل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اور اگر میں کسی کو خلیفہ نہ بناؤں تو مجھ سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔''

مگر اس کے باوجود آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا کرتے تھے: یا خلیفہ رسول اللہ!

ایسے ہی بنی امیہ اور بنی عباس کے خلفاء کا معاملہ ہے۔ ان میں سے بہت سارے ایسے ہو گزرے ہیں جنہیں ان سے پہلے کے خلفاء نے اپنا نائب نہیں بنایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ خلیفہ بعد میں آنے والوں کے لیے عام ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ میرے خلفاء پر رحمت نازل کرے۔'' پوچھا گیا: یا رسول اللہ! آپ کے خلفاء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو میری سنتوں کو زندہ کریں گے' اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیں گے۔'' [الجامع الکبیر ۱/ ٥۳٥]

اگر یہ روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو جائے تو اس مسئلہ میں حجت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگر صحیح سند کے ساتھ یہ قول ثابت نہ بھی ہو تب بھی جس نے یہ روایت وضع کی ہے وہ جانتا تھا کہ خلیفہ کا لفظ اس کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی کا جانشین بنے۔ اگر چہ اسے پہلے والے نے اپنی جگہ خلیفہ مقرر نہ بھی کیا ہو۔ پس جب وہ اس کا قائم مقام ہو جائے' اور بعض امور نبھانے میں اس کی جگہ لے لے؛ تو اسے اس معاملہ میں خلیفہ کہا جائے گا۔

❁❁❁❁

فصل :

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا آخری کلام اور شیعہ کا اعتراض

[اعتراض]: رافضی قلم کار کا قول ہے:

''ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں عمر سے روایت کیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت یہ الفاظ کہے: اے کاش! میں ایک مینڈھا ہوتا تو لوگ اپنی مرضی سے میری قیمت لگاتے؛ پھر ان کی قوم کا سب سے محبوب انسان اس کے پاس آتا؛ وہ مجھے ذبح کرتے؛ اور پھر مجھ آدھے کو بھون ڈالتے' اور آدھے کا سالن تیار کر لیتے۔ اور پھر مجھے کھا لیتے؛ میں کچرا ہو گیا ہوتا مگر بشر نہ ہوتا۔ یہ تو اسی طرح ہوا جیسے کافر بروز قیامت کہے گا: ﴿یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا﴾ ''اے کاش میں مٹی ہوتا۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عند الموت کہا: ''اگر میرے پاس اتنا سونا ہوتا جس سے ساری کائنات بھر جاتی تو میں عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے اسے فدیہ کے طور پر دے دیتا۔''

یہ بعینہ ایسے ہے جس طرح قرآن پاک میں فرمایا:

﴿وَ لَوْ اَنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ﴾ [الزمر ۴۷]

''اگر ظالموں کے پاس تمام روئے زمین کی چیزیں ہوں اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہوں، تو بھی اسے فدیہ میں ادا کر دیتے۔''

ایک طرف عند الموت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے قول کو پیش نظر رکھیے، دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ملاحظہ ہو کہ آپ اپنے آخری وقت میں فرماتے تھے کہ: ''میں محمد اور آپ کی جماعت سے کب ملوں گا؟ میں کب قیامت کو پہنچوں گا کہ جس دن بدبختوں کو اٹھایا جائے گا۔''

شہید ہوتے وقت فرمایا: ''فُزْتُ وَ رَبِّ الْکَعْبَةِ'' ''رب کعبہ کی قسم! میں نے اپنی مراد پالی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: اس کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا قول قائل کی جہالت کا آئینہ دار ہے۔ یہ اقوال جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کئے گئے ہیں ایسے اقوال تو ان لوگوں سے بھی منقول ہیں جو حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اجمعین کے مرتبہ سے فروتر تھے۔ بلکہ بعض ان خوارج نے بھی ایسے الفاظ کہے ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے تھے۔ ایسے ہی جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری وقت تھا اور آپ کی بیوی نے ''وَاحَرَبَاهُ'' (ہائے غم وافسوس) کہا؛ تو آپ نے فرمایا: ''وَاطَرَبَاهُ۔'' (واہ خوشی کی بات) میں کل اپنے احباب سے ملوں گا؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت سے مل جاؤں گا۔''

ابونعیم نے الحلیۃ میں قطیعی سے روایت کیا ہے۔ وہ اپنی سند سے حارث بن عمیر سے نقل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

'' حضرت معاذ ؛ ابوعبیدہ' شرحبیل بن حسنہ اور ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہم اجمعین ایک ہی دن میں زخمی ہوئے۔ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: بیشک یہ تمہارے رب کی رحمت اور تمہارے نبی کی دعا ہے؛ اور تم سے پہلے نیکوکاروں کا قبض کرنا ہے۔ اے اللہ! آل معاذ کو اس رحمت سے وافر نصیب عطا فرما۔''

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ آپ کا سب سے پیارا بیٹا عبدالرحمٰن ۔جس کے نام پر آپ اپنی کنیت رکھتے تھے۔ زخمی ہو گیا۔ یہ بیٹا آپ کو تمام مخلوق سے بڑھ کر محبوب تھا۔ جب آپ مسجد سے واپس آئے تو اسے انتہائی تکلیف کی حالت میں دیکھا۔ آپ نے پوچھا: اے عبدالرحمٰن! آپ کیسے ہیں؟ اس نے کہا: اے ابا جی! حق آپ کے رب کی طرف سے ہے' آپ شک کرنے والوں

میں سے نہ ہو جانا۔'' [مراد یہ ہے کہ موت رب کی طرف سے آئی ہے؛ آپ صبر سے کام لینا]۔

تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ آپ مجھے بھی صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔'' پھر رات کو اس کی روح قبض ہوگئی اور اگلے دن صبح دفن کر دیا گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ خود بھی زخمی تھے؛ آپ کو موت کے وقت اتنی سخت تکلیف ہوئی کہ اتنی تکلیف کسی کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اور جب کبھی آپ کو تھوڑا افاقہ ہوتا تو آپ اپنی آنکھیں کھولتے اور فرماتے: اے میرے رب! اب مجھے موت دیدے؛ اے اللہ تیری عزت کی قسم! تو جانتا ہے کہ میرا دل تجھ سے محبت کرتا ہے۔'' [الحلیة ۱/ ۲٤۰]۔

ایسے ہی یہ قول: ''فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ'' ''رب کعبہ کی قسم! میں نے اپنی مراد پالی۔'' یہ قول ایسے لوگوں نے بھی کہا ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بہت ہی فروتر تھے۔ یہ جملہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ نے بھی اس وقت کہا تھا جب آپ کو بئر معونہ کے موقع پر شہید کر دیا گیا۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ کے ساتھ نجد کی طرف بھیجا تھا۔

سیرت نگار علماء کرام رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ آپ کو جبار بن سلمی نے زخمی کیا تھا؛ یہ زخم آپ کے لیے کارگر ثابت ہوا۔ جب آپ کو ضرب لگی تو کہا: فزت واللہ! اللہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا؛ تو جبار نے کہا: یہ کیا کہہ رہا ہے: اللہ کی قسم میں نے مراد پالی؟ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: روایت کیا گیا ہے کہ ملائکہ نے آپ کو دفن کیا تھا۔'' [مختصر السیرة لابن ہشام ۳/ ۱۹٦]۔

ایسے ہی جب شبیب الخارجی پر وار کیا گیا تو وہ کہنے لگا: ''اے میرے رب! میں تیری طرف جلدی کر رہا ہوں تاکہ تو راضی ہو جائے۔'' میں اپنے ساتھیوں میں سے ایک آدمی کو جانتا ہوں جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو وہ کہنے لگا: اے میرے محبوب! میں تیری طرف آرہا ہوں۔ یہی کہتا رہا یہاں تک کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خوف؛ تو صحیح بخاری میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب نیزہ لگا تو درد سے کراہنے لگے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کو تسلی دے رہے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:

''امیر المومنین! کوئی فکر کی بات نہیں؛ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے اور آپ نے بہترین رفیق ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا۔ جب نبی کریم رضی اللہ عنہما کا آخری وقت آیا تو وہ آپ سے راضی تھے۔ پھر آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہے اور آخر وقت تک وہ بھی آپ سے خوش رہے۔ پھر آپ مسلمانوں کی صحبت میں رہے اور اگر آپ ان سے تشریف لے جائیں گے تو سب امت آپ سے راضی ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''آپ نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صحبت کا جو ذکر کیا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر عظیم احسان ہے۔ میری یہ بے قراری تم اور تمہارے اصحاب کی وجہ سے ہے۔ اللہ کی قسم! اگر میرے پاس روئے زمین کی دولت ہوتی تو میں عذاب الٰہی کو دیکھنے سے قبل اسے فدیہ کے طور پر دے ڈالتا۔''[1]

صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ میں ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ابن عباس رضی اللہ عنہ! دیکھو تو مجھ پر کون حملہ آور ہوا ہے؟ وہ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر انہوں نے کہا مغیرہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے آپ پر حملہ کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کیا اس کاریگر نے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا جی ہاں! تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کو غارت کرے میں نے تو اس کو ایک مناسب بات بتائی

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب عمر بن الخطاب، (حدیث: ۳٦۹۲)۔

تھی۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر نہیں کی جو اسلام کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلاشبہ تم اور تمہارے والد ماجد اس بات کو پسند کرتے تھے کہ مدینہ منورہ میں غلاموں کی بہتات ہو جائے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس سب سے زیادہ غلام تھے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر تم چاہو تو میں ایسا کروں؛ یعنی اگر چاہو تو میں ان کو قتل کر دوں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے:''تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ جب وہ تمہاری زبان میں گفتگو کرنے لگے اور تمہارے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے لگے اور تمہاری طرح حج کرنے لگے،تو پھر تم ان کو قتل نہیں کر سکتے۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کے گھر لے جایا گیا۔لوگوں کے رنج والم کا یہ حال تھا کہ گویا ان کو اس دن سے پہلے کوئی مصیبت ہی نہ پہنچی تھی۔کوئی کہتا فکر کی کچھ بات نہیں اچھے ہو جائیں گے۔اور کوئی کہتا مجھے ان کی زندگی کی کوئی آس نہیں ہے۔ پھر چھواروں کا بھیگا ہوا پانی لایا گیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسکو نوش فرمایا،تو وہ ان کے پیٹ سے نکل گیا۔اس کے بعد دودھ لایا گیا انہوں نے نوش فرمایا تو وہ بھی شکم مبارک سے نکل گیا۔لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ اب زندہ نہ رہیں گے۔ پھر ہم سب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہاں اور لوگ بھی آ رہے تھے۔اکثر لوگ آپ کی تعریف کرنے لگے۔ پھر ایک جوان شخص آیا اس نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشخبری ہو اس لئے کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اسلام قبول کرنے میں تقدم حاصل ہوا جس کو آپ خود بھی جانتے ہیں۔جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے انصاف کیا اور آخر کار شہادت پائی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ یہ سب باتیں مجھ پر برابر ہو جائیں نہ عذاب ہو نہ ثواب۔جب وہ شخص لوٹا تو اس کا تہ بند زمین پر لٹک رہا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس لڑکے کو میرے پاس لاؤ؛ چنانچہ وہ لایا گیا تو آپ نے فرمایا:''اے بھتیجے اپنا کپڑا اونچا کر کہ یہ بات کپڑے کو صاف رکھے گی اور اللہ تعالیٰ کو بھی پسند ہے۔''

پھر آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا: دیکھو مجھ پر لوگوں کا کتنا قرض ہے؟ لوگوں نے حساب لگایا۔تو تقریباً چھیاسی ہزار قرضہ تھا۔پھر فرمایا: اگر اس قرض کی ادائیگی کے لئے عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد کا مال کافی ہو تو انہی کے مال سے اسے ادا کرنا۔ وگرنہ پھر بنی عدی بن کعب سے مانگنا۔اگر ان کا مال بھی ناکافی ہو تو قریش سے طلب کر لینا۔اس کے سوا کسی اور سے قرض لے کر میرا قرض ادا نہ کرنا۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں جاؤ اور کہو کہ عمر رضی اللہ عنہ آپ کو سلام کہتا ہے۔امیر المومنین نہ کہنا کیونکہ اب میں امیر نہیں ہوں۔اور کہنا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ سے اس بات کی اجازت مانگتا ہے کہ اسے اپنے دوستوں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے پہنچ کر سلام کے بعد اندر آنے کی اجازت چاہی (اجازت ملنے پر) اندر گئے تو ام المومنین رضی اللہ عنہا کو روتے ہوئے دیکھا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سلام کہتے ہیں اور اس بات کی اجازت چاہتے ہیں کہ اپنے دوستوں کے پاس دفن کئے جائیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:''اس جگہ کو میں نے اپنے لیے روک رکھا تھا؛ مگر اب میں ان کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی ہوں۔'' جب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے اٹھاؤ؛ تو ایک شخص نے ان کو اپنے سہارے لگا کر بٹھا دیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ: کیا جواب لائے ہو؟

انہوں نے کہا کہ امیر المومنین وہی جو آپ چاہتے ہیں؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت دے دی ہے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کا شکر ہے میں کسی چیز کو اس سے زیادہ اہم خیال نہ کرتا تھا۔ پس جب میں مر جاؤں تو مجھے اٹھانا اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام کر کے کہنا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت چاہتا ہے؛ اگر وہ اجازت دیدیں تو مجھے اندر لے جانا اور اگر وہ واپس کر دیں تو مجھ کو واپس مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔'' [صحیح بخاری:ح ۹۱٤]

مذکورہ صدر حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، نبی کریم ﷺ اور تمام امت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے راضی ہے، اور آپ کے عدل و انصاف کا اقرار کر رہے ہیں۔ اور جب آپ کا انتقال ہوا تو گویا کہ تمام مسلمانوں کو ایسی مصیبت پہنچی جو کہ اس سے پہلے نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ مسلمان آپ کی بہت زیادہ تعظیم کیا کرتے تھے۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور جو تمہیں چاہتے ہوں تم ان کے حق میں دعا کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں، تمہارے بدترین حکام وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور جو تم سے بغض رکھتے ہوں، جن پر تم لعنت بھیجتے ہو اور جو تم پر لعنت بھیجتے ہوں۔'' [صحیح مسلم ،حدیث:۱۸۵۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں میں سے کسی نے قتل نہیں کیا؛ اس لیے کہ مسلمان تمام آپ پر راضی تھے۔ آپ کو قتل کرنے والا ایک کافر فارسی مجوسی تھا۔

باقی رہا عذاب الٰہی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خوف تو یہ ان کے کمال علم کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸)
''بندگان الٰہی میں سے اصحاب علم ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔''

حدیث میں آیا ہے جب نبی کریم ﷺ نماز پڑھتے تو رونے کی وجہ سے آپ کے سینہ میں ہنڈیا کی طرح جوش پایا جاتا تھا۔ (1)
حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سورت نساء تلاوت کی۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:
﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا ☆﴾ [النساء ٤١]
''پس کیا حال ہوگا جس وقت کہ ہر امت میں سے ایک گواہ ہم لائیں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ بنا کر لائیں گے۔''
تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بس کرو؛ [ٹھہر جاؤ]؛ اس وقت آپ کی آنکھیں اشکبار ہو رہی تھیں۔ [البخاري ٦/ ١٩٦]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ﴾ [الأحقاف ٩]
''آپ فرما دیجئے! میں کوئی انوکھا پیغمبر نہیں نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔''
صحیح مسلم میں مروی ہے کہ جب حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ قتل کیے گئے تو آپ نے فرمایا:
''اللہ کا رسول ہونے کے باوجود مجھے معلوم نہیں کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا۔'' (2)

---

(1) سنن ابی داؤد۔ کتاب الصلاۃ، باب البکاء فی الصلاۃ (حدیث:٩٠٤)، سنن نسائی (١٢١٥)۔
(2) صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب الدخول علی المیت بعد الموت، (حدیث: ١٢٤٣، ٧٠١٨)۔

جامع الترمذی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جوتم نہیں دیکھتے۔ اور میں وہ باتیں سنتا ہوں جوتم نہیں سنتے۔ آسمان چرچراتا ہے اور چرچرانا اس کا حق ہے۔ اس میں چار انگلی کے برابر بھی ایسی جگہ نہیں ہے کہ وہاں کوئی فرشتہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں پیشانی رکھ کر سجدہ ریز نہ ہو۔ اللہ کی قسم! اگر تم لوگ وہ کچھ جاننے لگو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنستے اور زیادہ روتے۔ اور بستروں پر عورتوں سے لذت نہ حاصل کرتے؛ جنگلوں کی طرف نکل جاتے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑاتے۔''

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ: ''میں نے تمنا کی کہ کاش! میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔'' [جامع ترمذی: ح1987]۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ☆ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ﴾ [المؤمنون ۵۷۔۵۹]

''یقیناً جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ یقیناً جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

''کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں اور خوف رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے صدیق کی بیٹی! نہیں؛ بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے نماز پڑھتے صدقہ دیتے اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اعمال رد نہ کر دیے جائیں۔'' [جامع ترمذی ۵/ ۳۲۷؛ ابن ماجہ ۲/ ۱٤۰٤]

رہا رافضی کا قول کہ: یہ کافر کے اس قول کی طرح کہ جب وہ کہے گا:

﴿يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا﴾ [النباء ۴۰]

''میرے لیے کاش! میں مٹی ہو جاتا۔''

ایسے کہنا رافضی کی جہالت کی نشانی ہے۔ بیشک کافر بروز قیامت یہ کلمات اس وقت کہے گا: جب اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی؛ اور نہ ہی اسے کوئی نیکی نفع دے گی۔ جب کہ دنیا میں اگر کوئی ایسی بات کہتا ہے تو دنیا دار العمل ہے؛ یہاں پر اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے ایسے کہہ سکتا ہے' اور اس خوف پر اسے ثواب ملے گا۔

حضرت مریم علیہا السلام نے بھی ایسے کلمات کہے تھے: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا﴾ [مریم ۲۳]

''بولی کاش! میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور لوگوں کی یاد سے بھی بھولی بسری ہو جاتی۔''

یہ ایسے نہیں ہے جیسے قیامت والے دن موت کی تمنا کی جائے گی۔ اور اسے جہنمیوں کے قول کی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ کہیں گے:

﴿وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ [الزخرف ۷۷]

''اور وہ آواز لگائیں گے اے مالک تمہارے رب کو معاملہ ختم کر دینا چاہیے۔''

ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ﴾ [الزمر ۴۷]

''اور اگر ظالموں کے پاس جو کچھ زمین میں ہے سب ہو اور اسی قدر اس کے ساتھ اور بھی ہو تو قیامت کے بڑے عذاب کے معاوضہ میں دے کر چھوٹنا چاہیں گے اور اللہ کی طرف سے انہیں وہ پیش آئے گا کہ جس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔''

[یہ معاملہ آخرت کا تھا]۔ جب کہ دنیا کی زندگی کا معاملہ مختلف ہے۔ ظاہر ہے کہ مومن کا دنیا میں اللہ سے ڈرنا ان اعمال میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ ثواب سے نوازے گا۔ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے قیامت والے دن امن میں رکھیں گے۔ جو کوئی مؤمن کے دنیا میں اللہ سے ڈرنے کو کافر کے بروز آخرت اللہ سے خائف ہونے کے برابر کرتا ہے وہ اسی انسان کی مانند ہے نور وظلمت اور دھوپ وسایہ؛ زندہ اور مردہ کو مساوی شمار کرتا ہے۔

جو شخص امارت وخلافت سے بہرہ ور ہو کر عدل وانصاف کی راہ پر گامزن رہے؛ اور لوگ اس کے عدل وانصاف کی گواہی بھی دیتے ہوں؛ مگر اس کے باوصف اللہ سے ڈرتا ہو کہ مبادا وہ کسی پر ظلم کر چکا ہو۔ وہ اس شخص کی نسبت افضل ہے جس کی رعیت اسے ظالم تصور کرتی ہو اور اس کے باوجود وہ اپنے اعمال پر ناز کرتا ہو؛ اور اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے امن میں سمجھتا ہو۔ حالانکہ یہ دونوں اہل جنت میں سے بھی ہو سکتے ہیں۔

خوارج جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کافر کہتے تھے' وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ آپ ظالم ہیں' اس لیے قتل کیے جانے کے مستحق ہیں۔ حالانکہ وہ اپنے اس نظریہ میں گمراہ اور غلطی پر تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تعظیم کرتے تھے' آپ کی حسن سیرت کے معترف اور عدل وانصاف کے مداح تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عدل میں ضرب المثل تھے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے: دونوں عمر کی سیرت۔ اس میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی مثال بیان کی جاتی ہے اور انہیں برابر سمجھا جاتا ہے۔ یہ اہل علم محدثین جیسے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ یا اس سے مراد ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما لیے جاتے ہیں؛ جیسا کہ اہل لغت کا ایک گروہ مراد لیتا ہے۔ جیسے ابو عبید وغیرہ۔ ہر دو اعتبار سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس مثال میں شمار ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ کسی انسان کے اپنے نفس پر گواہی دینے سے زیادہ اہمیت اس کی رعیت کی اس کے لیے گواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ [البقرۃ ۱۴۳]

''ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں۔''

صحیحین میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کا ذکر خیر کیا؛ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''واجب ہوگئی۔''

پھر ایک دوسرا جنازہ گزرا تو لوگوں نے اس کی برائی بیان کی: تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''واجب ہوگئی۔''

لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق بھی فرمایا: واجب ہوگئی اور دوسرے کے متعلق بھی فرمایا کہ: ''واجب ہوگئی'' اس سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جس جنازہ کی تم نے تعریف بیان کی؛ اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور جس جنازہ کی تم نے برائی بیان کی؛ اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی؛ ''تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو۔'' [صحیح بخاری: ۲/ ۹۷؛ مسلم ۲/ ٦٥٦]

مسند میں ایک حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قریب ہے کہ تم اہل جہنم میں سے اہل جنت کو پہچان لو۔'' لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کیسے ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''لوگوں کے اچھی تعریف کرنے اور برائی بیان کرنے سے۔'' [مسند أحمد ۳/ ٤١٦؛ وابن ماجة ۲/ ۱٤۱۱]

یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رعایا مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رعیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت سے بہت افضل تھی۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رعیت کا ایک جزء اور حصہ تھی۔ یہ تمام لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف؛ زہد و ورع؛ اور سیاست کی تعریف کرتے؛ اور آپ کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور پوری امت صدیاں گزرنے کے باوجود آپ کے زہد و تقوی اور عدل و انصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اور کسی ایک کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کوئی آپ کے عدل و انصاف پر طعن کرتا ہو۔

رافضی بھی اس پر طعن نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جب انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں غلو کیا؛ تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے کو گناہ شمار کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر ان چیزوں کی تلاش میں لگ گئے جن کو یہ اپنے تئیں ظلم سمجھتے تھے؛ مگر انہیں کوئی ظلم نہ مل سکا۔

جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اہل سنت والجماعت بھرپور محبت کرتے اور آپ سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور گواہی دیتے ہیں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین میں سے تھے۔ لیکن آپ کی آدھی رعایا آپ کے عادل ہونے پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ خوارج آپ کی تکفیر کرتے ہیں۔ خوارج کے علاوہ دوسرے لوگ اہل بیت اور غیر اہل بیت آپ سے انصاف نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔ شیعان عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ظلم کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔

خلاصہ کلام کہ! جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف کو ظہور و پذیرائی حاصل ہوئی؛ اس طرح آپ کے عدل و انصاف کے ساتھ نہ ہوسکا؛ بلکہ اس کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب میں سے کسی ایک کو بھی ولایت نہیں سونپی۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو ولایات سونپیں؛ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو ولایت سونپی تھی۔ مگر اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ خوف محسوس کررہے ہیں کہ کہیں ان سے کسی پر ظلم نہ ہوگیا ہو۔ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑے عادل اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے تھے۔ یہ بات دلیل ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے باوجود کہ آپ کی رعیت آپ سے راضی تھی؛ پھر بھی آپ کو خوف تھا کہیں کوئی ظلم نہ ہوگیا ہو۔ اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رعیت آپ سے شاکی تھی اور آپ اپنی رعیت سے شاکی تھے؛ اور ان کے ظلم بیان کرتے تھے اور ان پر بد دعا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ فرمایا کرتے تھے: میں ان سے نفرت کرتا ہوں' اور یہ مجھ سے بغض رکھتے

ہیں۔اور پھر آپ نے اپنے شیعہ پر بد دعا کی:

''اے اللہ! میں ان سے ملول ہوگیا ہوں' تو انہیں مجھ سے ملول کر دے۔اے اللہ! مجھے ان کے بدلے میں بہتر ساتھی عطا فرما؛ اور میرے بدلے ان کو برا حکمران عطا فرما۔''

تو اب جان جان لینا چاہیے کہ کون سا فریق امن کا زیادہ حق دار ہے؛ اگر تم کچھ جانتے ہو؟ ❶

فصل:

رافضی دعوی: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کم علمی

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: اصحاب کتب نے اپنی اسناد سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا: ''قلم دوات لاؤ کہ میں تمھیں کچھ لکھ دوں، جس کی موجودگی میں تم میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ کے حواس بجا نہیں ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔جب شور وغل بپا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہاں سے چلے جاؤ نبی کے پاس شور وغل زیب نہیں دیتا۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا مصیبت تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھوانے کا موقع نہ مل سکا۔'' جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ فوت نہیں ہوئے اور نہ ہی فوت ہوں گے یہاں تک کہ آپ لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیں۔جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کیا اور یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾ [الزمر ۳۰] ''بیشک آپ بھی مرنے والے ہیں اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔'' اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾ [آل عمران ۱۴۴] ''اگر آپ کا انتقال ہو جائے' یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے۔''

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سن کر کہا گویا میں نے قبل ازیں یہ آیت نہیں سنی تھی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

جواب: ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم و فضل صحابہ میں مسلم تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا دوسرا کوئی صحابی اس ضمن میں آپ کا ہم سر نہ تھا۔سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اُمم سابقہ میں کچھ لوگ مُلہم ہوا کرتے تھے۔میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔'' ❷

---

❶ امام جعفر صادق رحمہ اللہ کے والد فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نعش پر پردہ ڈالا گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور کہا: ''اللہ تجھ پر اپنی رحمت نازل کرے۔'' [مسند احمد (۵/ ۱۷۳)] یہ صحیح ترین روایت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی نعش کا احاطہ کر لیا اور آپ کے لیے دعائے خیر کرنے لگے۔اتنے میں ایک شخص نے اچانک آ کر میرا کندھا تھام لیا۔میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے رحم کی دعا فرمائی اور کہا: ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تو نے اپنے پیچھے کوئی آدمی نہیں چھوڑا جس کے اعمال کو لے کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا مجھے تجھ سے عزیز تر ہو۔'' یہ روایت بھی بہت صحیح ہے۔اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں:

صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (ح:۳۶۷۷۔۳۶۸۵) صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة۔ باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ (ح:۲۳۸۹)۔

❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر بن الخطاب (حدیث:۲۳۹۸)۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ماضی کی امتیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں کچھ لوگ مُلہم ہوا کرتے تھے۔ بیشک میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہے۔''

اور امام بخاری ہی نے ایک دوسری روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں: ''بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ شرف مکالمہ سے مشرف فرماتے تھے۔ میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہوا تو وہ عمر رضی اللہ عنہ ہے۔ ❶

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''حالت خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو دودھ بچ گیا وہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ پھر آپ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا: ''دودھ سے علم مراد ہے۔'' ❷

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے رو برو پیش کیا جا رہا ہے؛ یہ لوگ قمیص پہنے آئے تھے۔ بعض لوگوں کی قمیص چھاتی تک آتی تھی اور بعض کی کم و بیش۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ دامن کشاں گزرے۔ صحابہ نے پوچھا: پھر آپ نے اس سے کیا مراد لیا؟ تو فرمایا: ''دین۔'' ❸

بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے تین اقوال منشائے ایزدی کے موافق نکلے:

۱۔ مقام ابراہیم کے بارے میں۔ ۲۔ پردہ سے متعلق۔

۳۔ بدر کے قیدیوں کے بارے میں۔ ❹

صحیح بخاری میں ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''میں نے اپنے پروردگار سے تین باتوں میں موافقت کی (ایک مرتبہ) میں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلیٰ بناتے، پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ﴾ [البقرۃ ۱۲۵]

''مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔''

اور حجاب کی آیت بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی۔ کیونکہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرنے کا حکم دیں، اس لئے کہ ان سے ہر نیک و بد گفتگو کرتا ہے۔ پس حجاب کی آیت نازل ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں آپ پر نسوانی جوش میں آ کر جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بیویاں آپ کو بدلے میں دے گا،

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (حدیث:۳۶۸۹)

❷ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث:۳۶۸۱)، صحیح مسلم۔ حوالہ سابق، (حدیث:۳۶۹۱)۔

❸ صحیح بخاری حوالہ سابق (حدیث:۳۶۹۱)، صحیح مسلم، حوالہ سابق (حدیث: ۲۳۹۰)۔

❹ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صرف صحیح مسلم (حدیث:۲۳۹۹) میں ہے۔ صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی القبلۃ (حدیث:۴۰۲)، میں اساری بدر کی جگہ دوسری بات کا ذکر ہے۔

جو مسلمان ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ﴾ [التحریم ۵]

''اگر وہ (پیغمبر) تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد انہیں ان کا رب تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا۔''❶

واقعۂ قرطاس:

قرطاس کا واقعہ ❷ میں رسول اللہ ﷺ کیا لکھوانا چاہتے تھے؟؛ دوسرے مقام پر اس کی مکمل وضاحت ہے۔ بخاری و مسلم میں بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تفصیلاً مذکور ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ نے بیماری کی حالت میں فرمایا: پنے باپ اور بھائی کو بلاؤ کہ میں کچھ لکھ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد بعض لوگ یہ کہیں کہ میں امامت و خلافت کے لیے زیادہ موزوں ہوں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتے۔ ❸

صحیح بخاری میں قاسم بن محمد سے روایت ہے؛ آپ فرماتے ہیں: سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ''ہائے سر!'' نبی کریم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا، اگر یہ واقعہ میری زندگی میں پیش آیا تو میں آپ کے حق میں دعائے مغفرت کروں گا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ مقام افسوس ہے اللہ کی قسم! آپ چاہتے ہیں کہ میں مرجاؤں۔ اگر میں مرگئی تو آپ اسی روز اور شادی کرلیں گے۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

> ''میرے سر میں تکلیف ہے، میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے کو بلا کر ایک عہد نامہ تحریر کرنا چاہتا تھا۔ مبادا کوئی خلافت کا حریص اٹھ کھڑا ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان ایسا نہیں چاہتے۔''❹

صحیح مسلم میں ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ اگر آپ کسی کو خلیفہ مقرر کرنا چاہتے تو کسے مقرر کرتے ؟ آپ نے جواباً فرمایا: ابوبکر رضی اللہ عنہ کو، پھر پوچھا گیا، ان کے بعد کس کو؟'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو'' پھر پوچھا گیا ان کے بعد کس کو؟ کہا ''ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو۔''❺

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا پتہ نہ چل سکا کہ آپ یہ حکم شدت مرض کی وجہ سے دے رہے ہیں یا حسب معمول (بقائمی ہوش وحواس) صحیح حالت میں یہ بات فرمارہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام بیمار پڑ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ مرض اور نبوت و رسالت کے مابین کوئی منافات نہیں۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شک میں مبتلا تھے اور جزم و وثوق سے یہ بات نہیں فرمارہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شک میں مبتلا ہوسکتے ہیں کیوں کہ

---

❶ صحیح بخاری:جلد اول:حدیث نمبر 393۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ و وفاته (حدیث:٤٤٣٢)، صحیح مسلم، کتاب الوصیة، باب ترك الوصیة، لمن لیس له شی (حدیث:١٦٣٧)، من حدیث عبدا اللّٰه بن عباس رضی اللہ عنہما۔

❸۔صحیح مسلم۔ کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی بکر الصدیق(حدیث:٢٣٨٧)۔

❹ صحیح بخاری، کتاب المرضی، باب ما رخص للمریض ان یقول انی وجع، (حدیث:٥٦٦٦)۔

❺صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة باب من فضائل ابی بکر الصدیق، (حدیث:٢٣٨٥)۔

نبی کے سوا کوئی شخص معصوم نہیں۔ بنابریں وہ اس بات کو جائز سمجھتے تھے کہ آپ شدت بخار کی وجہ سے یہ گفتگو فرما رہے ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت رسول اکرم ﷺ بیمار تھے۔ آپ کو پتہ نہ چل سکا کہ کیا رسول اللہ ﷺ کا یہ کلام شدت مرض کی وجہ سے ہے جیسا کہ مریض کے ساتھ حالت مرض میں ہوتا ہے؛ یا آپ کا عام عرف کے مطابق کلام تھا جس کی اطاعت کرنا واجب تھی۔ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی شک پر مبنی تھا کہ نبی کریم ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ دلیل و برہان سے آپ کی وفات ثابت ہوگئی۔ نبی کریم ﷺ وہ عہد نامہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ اب لوگ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں تو آپ نے سوچا کہ اب یہ عہد نامہ لکھنے سے بھی شک کا ازالہ نہ ہو گا۔ لہٰذا اب اس کے لکھنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ حسب ارادہ ان کو کسی شخصیت پر جمع کر دیں گے جس کا اظہار آپ نے ان الفاظ میں کیا: "وَيَابَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلَّا اَبَا بَكْرٍ" [1]

"اللہ تعالیٰ اور مؤمنین انکار کرتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی خلیفہ ہو۔"

حدیث قرطاس کی مزید توضیح:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول کہ: "مصیبت اس انسان کے لیے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد لکھنے میں حائل ہوا" اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد نامہ کا نہ لکھنا ان لوگوں کے لیے باعث مصیبت ہے جن کے نزدیک حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں شک ہے؛ یا اس پر یہ امر مشتبہ ہے اگر آپ عہد نامہ لکھوا دیتے تو شک کا ازالہ ہو جاتا۔ جن کے نزدیک آپ کی خلافت برحق ہے ان کے نزدیک عدم کتابت سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وللہ الحمد۔

بخلاف ازیں جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عہد لکھنے والے تھے وہ علماء اہل سنت و شیعہ ہر دو کے نزدیک بالاتفاق گمراہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ افضل الامت تھے۔ لہٰذا آپ کی موجودگی میں دوسرا کوئی شخص خلیفہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شیعہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا حق دار خیال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ قبل ازیں ایک نص جلی کے ذریعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کر چکے تھے، لہٰذا عہد نامہ لکھنے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب (بقول شیعہ) امت نبی کریم ﷺ کی مشہور و معروف (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق) نص کو چھپانے کی مرتکب ہو چکی تھی۔ [اس کا جواب یہ ہے کہ اگر واقعی ایسا ہی تھا] تو پھر وہ اس عہد نامہ کو بھی بڑی آسانی سے چھپا سکتے تھے جس میں حاضرین کی تعداد بے حد قلیل تھی۔

نیز یہ کہ لوگوں کے شک کی بنا پر آپ عہد نامہ کو تا وفات کیونکر ملتوی کر سکتے تھے؟ نیز عہد نامہ میں جو کچھ آپ لکھنا چاہتے تھے اگر وہ کوئی واجب الاظہار بات ہوتی تو نبی کریم ﷺ بہر کیف اسے لکھوا کر رہتے اور کسی شک کرنے والے کے قول کو بھی لائق التفات قرار نہ دیتے۔ اس لیے کہ تمام خلق سے بڑھ کر آپ کی اطاعت کی جاتی تھی۔ جب آپ نے کتابت ترک کر دی تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین کی کوئی ضروری بات نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی ایسی بات تھی جس کا لکھنا واجب ہوتا۔ اس لیے کہ اگر

[1] صحیح مسلم ۔ کتاب فضائل الصحابة ، باب من فضائل ابی بکر الصدیق (حدیث:۲۳۸۷)۔

کوئی واجب چیز ہوتی تو آپ ﷺ اسے ضرور تحریر کروا دیتے۔

اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر کوئی معاملہ مشتبہ ہوگیا تھا اور پھر واضح ہوگیا؛ یا آپ کو بعض امور میں شک ہوا تھا؛ تو پھر بھی یہ اس سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا جو ایسے معاملات میں فتوی دے یا فیصلہ کرے جس میں نبی کریم ﷺ پہلے دوسرا فتوی دے چکے ہوں۔

[ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب نبی کریم ﷺ کے فتوی کے خلاف فیصلہ صادر کر سکتے ہیں تو کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے غلطی کا صدور نہیں ہو سکتا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فعل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل سے شنیع تر ہے، اس لیے کہ عمر رضی اللہ عنہ شک میں مبتلا ہوئے تھے اور علی رضی اللہ عنہ نے پورے جزم و یقین کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے خلاف حکم صادر کیا تھا]۔

یہ دونوں فعل ایسی اجتہادی خطاء سے تعلق رکھتے ہیں جو اللہ کے ہاں قابل عفو و درگزر ہے۔ مسئلہ کی توضیح یہ ہے کہ ایک حاملہ عورت کے بارے میں جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فتویٰ دیا تھا کہ اس کی عدت اَبْعَدُ الاجلین ہے۔ [1] حالانکہ اس ضمن میں صحیحین میں ثابت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ: ابو سنابل بن بعکک نے سبیعہ اسلمیہ کے بارے میں یہ فتوی دیا ہے؛ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابو سنابل نے جھوٹ بولا۔ تم اب جس سے چاہو نکاح کرلو۔'' سُبَیْعہ کی روایت بالکل صحیح ہے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے اس فتوی کو رد کیا ہے۔ اس لیے کہ ابو سنابل اہل اجتہاد میں سے نہ تھا' اور نہ ہی اس کے لیے یہ مناسب تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں کوئی فتوی دیتا۔

حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اگرچہ اس کا فتوی دیا ہے۔ مگر یہ آپ کا اجتہادی فیصلہ تھا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے۔ اور یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما تک نہ پہنچ سکی تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں اہل اجتہاد کے سارے اجتہادات کا معاملہ اسی طرح ہے۔ جب وہ اجتہاد کر کے کوئی فیصلہ کریں ' یا فتوی دیں' یا کسی چیز کا حکم دیں؛ اور سنت نبویہ اس کے خلاف ہو؛ اور انہیں سنت کا علم نہ ہوسکا ہو تو وہ اپنے اجتہاد پر ثواب کے مستحق ہیں۔ وہ حسب استطاعت اپنے اجتہاد میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے اطاعت گزار ہیں۔ اور اس پر بھی ان کے لیے اجر ہے۔ اور ان میں سے جنہوں نے اجتہاد کیا اور حق کو بھی پہنچ گئے تو ان کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔

لوگوں کا اس میں اختلاف ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر اجتہاد کرنے والا حق پر ہے؟ یا ان میں سے حق کو کوئی ایک ہی پا سکتا ہے؟۔ اس میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ: اگر حق پانے سے مراد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے تو پھر ہر متقی اور خوفِ الٰہی رکھنے والا مجتہد حق پانے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے بڑھ کر مکلف نہیں ٹھہراتے۔ اب یہ مجتہد اس معاملہ میں حق تک رسائی سے عاجز آ گیا ہے' لٰہذا اس سے امر ساقط ہے۔ اور اگر حق پانے والے سے مراد اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مراد تک رسائی اور اس کی معرفت ہے؛ تو پھر ان میں سے حق پانے والا کوئی ایک ہی ہو

---

[1] سنن کبری بیھقی (۷/ ٤۳۰)، کتاب الام للشافعی (۷/ ۱۷۳)۔

[2] البخاری (ح: ۵۳۱۸)، مسلم (ح: ۱٤۸۵)۔ اس واقعہ کا اختصار یہ ہے کہ: یہ سبیعہ عورت سعد بن خولہ کے نکاح میں تھی؛ ان کی وفات حج الوداع میں ہوگئی؛ وفات کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد وضع حمل ہوگیا؛ پس جب وہ نفاس سے فارغ ہوگئی تو اس نے پیغام نکاح دینے والوں کے لئے بناؤ سنگار کیا؛ تو ابو السنابل بن بعکک اس کے پاس آیا؛...... اور کہا: ''اللہ کی قسم تو اس وقت تک نکاح نہیں کر سکتی جب تک تجھ پر چار ماہ دس دن نہ گزر جائیں۔ ...... یہ عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فتوی دیا کہ وضع حمل ہوتے ہی آزاد ہو چکی ہوں اور مجھے نکاح کا حکم دیا۔'' [اختصرہ دراوی]

سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس معاملہ میں حق تو صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے قبلہ کا رخ متعین کرنے میں دو اجتہاد کرنے والوں کی۔ جب ان میں سے ہر ایک کسی ایک سمت کو قبلہ مان لے۔ تو ان میں سے ہر ایک کا مقصد اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ اور جس طرف کو بھی قبلہ سمجھ کر وہ نماز پڑھ لیں گے تو ان سے نماز کا فریضہ ساقط ہوجائے گا۔ لیکن ان میں سے جس نے قبلہ کا صحیح تعین کیا وہ ایک ہی ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے کہ وہ کسی کو معرفت حق اور اس پر عمل کرنے کی توفیق اور قدرت سے نواز دے۔ ایسے انسان کا اجر بھی بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فرمایا طاقتور مومن اللہ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر اور پسندیدہ ہے؛ اور ان میں سے ہر ایک میں خیر ہے۔'' [مسلم]

ایسے ہی جس عورت کے ساتھ مہر مقرر کیے بغیر نکاح کیا جائے اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا تھا کہ خاوند کی موت کی صورت میں عورت کا مہر ساقط ہو جاتا ہے۔ [1] حالانکہ بروَع بنت واشق نامی عورت کے بارے میں نبی ﷺ نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے وہ مہر دیا جائے گا جو ان کے خاندان میں عام طور سے رائج ہے۔ [2]

ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی بیٹی کو اپنے نکاح میں لانے کا ارادہ کیا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا تو یہ ارادہ ترک کردیا۔ [3]

اور ایسے ہی جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تہجد کی نماز پڑھنے کا کہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تقدیر سے احتجاج کیا۔ جب آپ نے فرمایا: کیا تم تہجد نہیں پڑھتے ؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بیشک ہماری جانیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا ہمیں جگانے کا ارادہ ہوتا ہے تو ہم جاگ جاتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ پیٹھ پھیر کر چلے گئے اور آپ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے فرما رہے تھے: ''انسان بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا ہے۔''

اس قسم کے اور بھی واقعات ہیں۔ ایسے واقعات جب مبنی بر اجتہاد ہوں تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا دیگر اہل علم کی شان میں کچھ قدح وارد نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ وہ حق کی طرف رجوع بھی کرلیں۔ تو ایسے ہی اس طرح کے واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں بھی موجبِ قدح نہیں ہوسکتے۔ جبکہ آپ نے حق واضح ہونے کے بعد اس کی طرف رجوع بھی کرلیا ہو۔

خلاصہ کلام ! جن امور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رجوع کرنا ضروری تھا وہ ان امور کی نسبت تعداد میں بہت زیادہ ہیں جن سے رجوع کرنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ناگزیر تھا۔ اس کے باوصف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اکثر امور سے رجوع کرلیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رجوع صرف بعض امور سے ثابت ہے۔

جن امور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رجوع کیا ان میں ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ نکاح کرنا بھی شامل ہے۔ جہاں تک دیگر مسائل کا تعلق ہے، مثلاً یہ مسئلہ کہ حاملہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت اَبْعَدَ الاَجَلَیْن ہے۔ نیز یہ مسئلہ جس عورت کا مہر مقرر نہ ہو اور اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اسے مہر نہیں دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

[1] مصنف عبد الرزاق، (١١٧٣٧)، ١١٧٣٨)، سنن کبری بیهقی (٧/ ٢٤٧)، سنن سعید بن منصور (٩٢٠)

[2] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فیمن تزوج و لم یسم لها صداقا" (حدیث: (٢١١٤، ٢١١٦)، سنن ترمذی، (١١٤٥)، سنن نسائی (٣٣٥٤)، سنن ابن ماجه (١٨٩١)۔

[3] صحیح بخاری، باب ذکر اصهار النبی ﷺ (ح:٣٧٢٩)، مسلم؛ باب من فضائل فاطمة، (ح:٢٤٤٩)۔

جب خاوند اپنی بیوی کو طلاق کا اختیار دے اور بیوی کہے کہ میں طلاق کی بجائے خاوند کے گھر میں آباد رہنا چاہتی ہوں تو اس کے باوجود عورت مطلقہ ہو جائے گی۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات کو اختیار دیا تھا اور ان پر طلاق واقعہ نہ ہوئی۔ [1] حضرت علی رضی اللہ عنہ تادم موت ان مسائل پر قائم رہے اور ان سے رجوع نہ کیا۔

جن مسائل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رجوع کرنا ثابت نہیں وہ کثیر التعداد ہیں، امام شافعی نے اس قسم کے مسائل اپنی کتاب ''اختلاف علی وعبداللہ'' میں اور محمد بن نصر المروزی نے کتاب ''رفع الیدین فی الصلوٰۃ'' میں ذکر کیے ہیں۔

اس قسم کے اکثر مسائل ان کتب میں مذکور ہیں جن میں باسند یا بے سند اقوال صحابہ بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً مصنف عبد الرزاق، سنن سعید بن منصور، مصنف وکیع، مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ، سنن الاثرم، مسائل حرب، عبداللہ بن احمد، صالح، کتاب ابن المنذر، ابن جریر الطبری، ابن نصر اور ابن حزم و دیگر مصنفین رحمہم اللہ۔

فصل:

[فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور شرعی حدود]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فدک کے متعلق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بات چیت کی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں ایک کاغذ لکھ کر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ جب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں سے لوٹیں تو راستہ میں عمر رضی اللہ عنہ ملے اور وہ کاغذ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے لے کر جلا ڈالا۔ اس پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں بددعا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابولؤلؤ نے عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ آپ نے حدود اللہ کو معطل کیا؛ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر حد نہیں لگائی۔ ازواج مطہرات کو اس سے زیادہ مال دیا کرتے تھے جس قدر عطا کرنا ضروری تھا، عائشہ و حفصہ کو سالانہ دس ہزار درہم دیا کرتے تھے۔ شراب پینے والے کو ملک بدر کر کے شرعی حکم کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔ آپ کو شرعی احکام کا علم بہت ہی کم تھا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اللہ کی قسم! یہ روافض کا بدترین خود ساختہ جھوٹ ہے؛ اس کے جھوٹ ہونے میں کوئی بھی عالم شک نہیں کر سکتا۔ یہ روایت کسی بھی عالم نے ذکر نہیں کی۔ نہ ہی اس روایت کی کوئی معروف سند ہے؛ نہ ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدک کسی کو لکھ کر دیا؛ نہ ہی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اور نہ ہی کسی دوسرے کو۔ اور نہ ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عمر رضی اللہ عنہ پر بددعا کی۔ نیز جو کچھ ابولؤلؤ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا؛ وہ آپ کے حق میں کرامت ہے۔ [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب من خیر ازواجه(حدیث:٥٢٦٢)، صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب بیان ان تخییره لامرته لا یکون طلاقاً، (حدیث: ١٤٧٧)۔

[2] اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر اپنی رحمت نازل فرمائے، وہ اس بات پر اظہار حیرت کر رہے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا ایک مجوسی کے ہاتھوں شہید ہونا بھی شیعہ کے نزدیک ایک جرم ہے، انھیں کیا معلوم تھا کہ شیعہ سیدنا عمر کے قاتل مجوسی کو بابا شجاع الدین کہہ کر پکاریں گے۔ شیعہ کے مشہور شیخ احمد بن اسحاق احوص نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اظہار مسرت کرنے کے لیے اس مجوسی کے اعزاز میں جشن کا ایک دن مقرر کیا اور اس کا نام ''عید بابا شجاع الدین'' رکھا۔ فاروق اعظم کے یوم شہادت کو ''عید اکبر'' و یوم التسلیة'' اور '' یوم المفاخرہ'' کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن یہ اس سے بڑھ کر ہے جو ابن ملجم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا اور جو کچھ قاتلان حسین رضی اللہ عنہ نے آپ کے ساتھ کیا۔اس لیے کہ ابولؤلؤ کافر تھا۔اس نے ایک مؤمن کو قتل کیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کفار اہل ایمان کو قتل کرتے ہیں۔ یہ شہادت ہے؛ جو اس شہادت سے کہیں بڑھ کر ہے جس میں کوئی مسلمان کسی مسلمان کو قتل کردے۔ نیز یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ابولؤلؤ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے تقریباً ساڑھے بارہ سال کے بعد قتل کیا گیا۔تو پھر یہ کیسے پتہ چلا کیا آپ کا قتل اس بددعا کا نتیجہ تھا جو اتنا لمبا عرصہ پہلے ہو چکی تھی۔ جب کوئی کسی مسلمان کے لیے بددعا کرے کہ اسے کوئی کافر قتل کردے' تو حقیقت میں یہ اس پر بددعا نہیں ہوتی؛ بلکہ اس کے حق میں نیک دعا ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب میں سے کسی ایک کے لیے بھی ایسی ہی دعا کیا کرتے تھے؛ آپ فرمایا کرتے تھے:''اے اللہ! فلاں کی مغفرت کردے۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کہتے کہ: اے کاش یہ سعادت ہمیں حاصل ہوئی ہوتی۔ اس لیے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان الفاظ میں دعا کیا کرتے تو وہ کچھ عرصہ میں ہی شہید ہو جاتا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل صفین اور خوارج پر ظلم کیا؛ انہوں نے حضرت پر بددعا کی؛ ان ملجم نے جو کچھ کیا وہ اسی بددعا کا نتیجہ تھا؛ تو معقول ہونے کے لحاظ سے یہ قول پہلے قول سے کچھ بعید نہ ہوگا۔اور ایسے ہی اگر یہ کہا جائے کہ آل سفیان بن حرب نے حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ پر بددعا کی تھی؛ اسی کے نتیجہ میں آپ کو شہید کردیا گیا۔

اس لیے کہ فدک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی غرض نہ تھی۔ نہ ہی آپ نے اس میں سے کچھ اپنی ذات کے لیے لیا اور نہ ہی اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے لیے کچھ لیا۔اور نہ ہی اہل بیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے محروم رکھنے میں انہیں کوئی فائدہ تھا۔ بلکہ آپ اہل بیت کو عطیات سے نوازنے میں باقی تمام لوگوں پر مقدم رکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب عطیات دینے کے لیے رجسٹر تیار کیا گیا؛ تو اس میں لوگوں کے نام لکھے گئے ۔ لوگوں نے کہا: ہم آپ کے نام سے شروع کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں؛ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب سے شروع کرو۔ اور عمر رضی اللہ عنہ کا نام اسی جگہ پر لکھا گیا جس مقام سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا تھا۔آپ نے بنو ہاشم سے نام لکھنے شروع کیے؛ پھر ان کے ساتھ بنو عبدالمطلب ملائے گئے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''بیشک بنو ہاشم اور بنو مطلب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہ نہ ہی ہم سے جاہلیت میں جدا ہوئے اور نہ ہی اسلام میں۔''

لہٰذا اس رجسٹر میں عباس؛ علی اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو پہلے درجہ میں رکھا گیا۔اور ان کے لیے ان کے ہم پلہ باقی تمام قبائل کے لوگوں سے بڑھ کر وظیفہ مقرر کیا۔آپ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اپنے بیٹے عبداللہ پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ اس پر آپ کے بیٹے کو غصہ بھی آیا اور انہوں نے کہا: آپ مجھ پر اسامہ بن زید کو ترجیح دے رہے ہیں؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تجھ سے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب تھا۔اور اس کا باپ تیرے باپ سے بڑھ کر محبوب تھا۔

تمام سیرت و سوانح نگار علماء کرام رحمہم اللہ کے ہاں مشہور ہے کہ آپ بنی ہاشم کو باقی تمام لوگوں پر ترجیح دیا کرتے تھے۔اس میں کوئی دو انسان اختلاف نہیں کرسکتے۔ جس انسان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داروں کے ساتھ یہ سلوک ہو؛ تو کیا اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرے۔اور پھر جنتی عورتوں کی سردار دختر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنے سے معمولی مال کے لیے ظلم کرتا؛ اور انہیں تکلیف دیتا جبکہ ان کے بیٹوں کو اس مال سے

کئی گنا بڑھ چڑھ کر دے رہا ہے ۔ اور ان لوگوں کو بھی دیتا ہے جن کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ کوئی دور کا تعلق ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی نوازتا ہے ۔

پھر یہ بھی ایک عادت چلتی آ رہی ہے کہ ملک و ریاست کے طلب گار عورتوں کے ساتھ تعرض نہیں کرتے ۔ بلکہ ان کا ہر لحاظ سے اکرام کرتے ہیں؛ اس لیے کہ خواتین اقتدار کی اہل نہیں ہیں ۔تو پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ مردوں کو تو عطیات سے نوازا جائے مگر عورت کو اس کے حق سے محروم رکھا جائے ۔ حالانکہ اس کو محروم رکھنے میں اصل میں کوئی دینی یا دنیاوی غرض نہ ہو۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور شرعی حدود میں سہل انگاری کا الزام:

[اعتراض]: شیعہ مصنف کا یہ قول کہ:'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شرعی حدود کو معطل کر دیا تھا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر حد قائم نہ کی ۔''

[جواب]:[ہم کہتے ہیں]: جمہور علماء نے اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ جب شہادت کا نصاب کامل نہ ہو تو مجرم کی بجائے گواہوں پر حد لگائی جائے گی۔جن حضرات نے اس کے علاوہ کوئی دوسری بات کہی ہے؛ ان کا بھی اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ ایک مسئلہ اجتہادی تھا۔اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسا ہوا تھا کہ آپ نے قاتلان عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص نہ لیکر شرعی حدود کو معطل کیا۔اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ قدح وارد نہیں ہوسکتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بدرجہ اولی کوئی قدح نہیں کی جاسکتی ۔

جو کچھ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا؛ وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں ایسا کیا گیا تھا اور صحابہ نے اس کی تائید کی تھی ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے اور انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تائید کی تھی ۔اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تین گواہوں پر حد قذف لگائی جا چکی تھی تو ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے از سر نو پھر کہنا شروع کیا کہ اللہ کی قسم !مغیرہ نے زنا کیا ہے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ پر حد قذف لگانے کا ارادہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی بجائے اب مغیرہ رضی اللہ عنہ کو رجم کرنا چاہیے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ایک گواہ ہیں ۔اور قبل ازیں شہادت دے چکے ہیں ۔اب ان کی تکرار شہادت چوتھے گواہ کے قائم مقام ہے، بایں طور چار گواہ پورے ہو گئے لہٰذا رجم واجب ہے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان پر حد نہ لگائی ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر رضا مند تھے کہ ان پر پہلی بار حد لگائی جائے ؛ دوسری بار نہیں؛ ورنہ آپ پہلی بار بھی اس سے ایسے ہی منع کر سکتے تھے جیسے دوسری بار منع کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لوگ آتے اور آپ سے مراجعہ وتکرار کرتے ؛ اور کتاب وسنت سے دلائل پیش کرتے ۔ پس عمر رضی اللہ عنہ [جب دیکھتے کہ حق ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہے تو] اپنے قول سے رجوع کرتے ۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی طرح بھی کتاب اللہ سے آگے بڑھنے والے نہیں تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

'' عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس بن حصن کے ہاں اترے ۔اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے قریب رکھتے تھے ۔اور قراء خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس کے مشیر ہوتے تھے۔عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا:اے بھتیجے !کیا امیر المومنین کے یہاں تیری رسائی ہے؟ تو میرے لئے اجازت لے

سکتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ عنقریب تمہارے لئے اجازت لوں گا۔''

ابن عباس کا بیان ہے: انہوں نے عیینہ کے لئے اجازت لی، جب وہ اندر آئے تو کہا کہ: اے ابن خطاب! اللہ کی قسم! تم ہمیں نہ تو زیادہ مال دیتے ہو اور نہ ہمارے ساتھ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان پر غصہ آ گیا یہاں تک کہ قریب تھا کہ الجھ پڑیں، تو حر نے کہا: ''امیر المومنین! اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ﴾ [الأعراف ۱۹۹]

''معافی کو قبول کریں اور نیکیوں کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے درگزر کیجئے۔'' یہ شخص جاہلوں میں سے ہے۔

اللہ کی قسم! جونہی یہ آیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پڑھی انہوں نے اس آیت کے خلاف نہیں کیا، اور کتاب اللہ کے پاس بہت زیادہ رکنے والے تھے (یعنی بہت زیادہ عمل کرنے والے تھے)۔'' [صحیح بخاری، ج۳، ح۲۱٦۱]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ آپ کو حدود شریعت میں کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہ ہوتی۔ اپنے بیٹے پر شراب کی حد لگائی۔ واقعہ یہ تھا کہ ان کا بیٹا مصر میں شراب نوشی کا مرتکب ہوا، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے چپکے سے گھر میں ہی اس پر حد لگادی۔ حالانکہ باقی لوگوں پر علانیہ حد لگائی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انھوں نے عمرو بن عاص کو ڈانٹا؛ اس لیے کہ انہوں نے آپ کے بیٹے سے بے جا محبت کا ثبوت دیا تھا اور اپنے بیٹے کو مدینہ بلا کر دوبارہ حد لگائی۔

جب حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا تو آپ نے انہیں بھی ڈانٹ دیا۔ اور بعض روایات میں جو کہا گیا ہے کہ آپ نے مرنے کے بعد اپنے بیٹے کو کوڑے لگائے یہ آپ پر جھوٹا الزام ہے۔ اور میت کو سزا دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق شرعی حدود قائم کرنے کی خبریں تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ آپ شرعی حدود میں کسی کی ملامت کی پروانہ کرتے تھے۔ یہ واقعات اتنی کثرت کے ساتھ ہیں کہ ان کا یہاں پر ذکر کرنا دشوار ہے۔

اور پھر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کونسی غرض ہو سکتی تھی کہ ان پر حد قائم نہ کرتے۔ جب کہ آپ کے عدل و انصاف کے بارے میں مشہور ہے؛ اور آپ راہ حق سے ادھر ادھر نہ ہوا کرتے تھے۔

❁❁❁❁

فصل:

ازواج مطہرات کے عطیات

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ ازواج مطہرات کو اس سے زیادہ مال دیا کرتے تھے جس قدر عطا کرنا ضروری تھا، عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما کو سالانہ دس ہزار درہم دیا کرتے تھے۔''

[جواب]: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو آپ نسبتاً کم دیا کرتے تھے۔اس لیے کہ آپ ان کی بیٹی تھیں۔ایسے ہی اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کم دیا کرتے تھے۔یہ عدل و انصاف میں آپ کے کمال احتیاط ؛خوف الٰہی اور اپنے نفس کو خواہشات سے روک کر رکھنے کی علامت ہے۔عطیہ جات دینے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فضیلت کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔آپ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو باقی خواتین کی نسبت بڑھ چڑھ کر دیا کرتے تھے۔اسی طرح آپ بنی ہاشم ؛ آل ابی طالب اور آل عباس کو بھی سب سے پہلے دیتے اور سب سے زیادہ دیتے۔ جب کسی انسان کی فضیلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ثابت ہوجاتا تو آپ اس کے استحقاق اور اسلام میں سبقت کی وجہ سے اسے زیادہ نوازا کرتے تھے۔آپ فرمایا کرتے تھے:''اس مال کے حق دار ہونے میں سب لوگ مساوی ہیں۔ البتہ ہر شخص کی اپنی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ پھر اسلام کی راہ میں صعوبات اٹھانے اور سبقت اسلام کا بھی لحاظ ہے۔اور لوگوں کو اسلام میں سبقت بھی حاصل ہے۔آپ کسی ایسے آدمی کو نہیں دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ پر تہمت آئے کہ آپ اپنے اہل قرابت یا دوست واحباب کو زیادہ نوازتے ہیں۔بلکہ آپ اپنے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے کم دیا کرتے تھے۔اللہ کی قسم! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی کی رو رعایت یا الفت و محبت کی اساس پر کسی کو زیادہ عطیہ جات دینے سے متہم نہ تھے۔آپ جن لوگوں کو ترجیح دیتے تو اس کا سبب بھی محض دینی ہوا کرتا تھا۔اہل بیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی تمام گھروں پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

یہ آپ کی سیرت کا ایسا روشن پہلو ہے جس پر آپ کے بعد نہ ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عمل ہوسکا ؛ اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ؛ اور نہ ہی ان دونوں سے ہٹ کر کسی اور سے۔اگر آپ پر اس لحاظ سے جرح وقدح کی جاسکتی ہے کہ آپ ازواج مطہرات کو زیادہ دیا کرتے تھے تو پھر یہ اعتراض بھی ہونا چاہیے تھا کہ آپ اہل بیت کے مردوں کو بھی فضیلت دیا کرتے تھے ؛ اور انہیں باقی لوگوں پر ترجیح دیتے اور مقدم رکھتے تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر شراب پینے والے کو ملک بدر کر کے شرعی حکم کی خلاف ورزی کیا کرتے تھے۔''

[جواب]: شرعی حکم کی خلاف ورزی وہاں ہوتی ہے جہاں اللہ کے حکم کا الٹ کیا جائے ؛ یا اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ امور کو ساقط قرار دیا جائے ؛ یا پھر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھا جاتا ہو۔ جب کہ شراب نوشی کی حد میں جلا وطنی کا حکم تعزیری ہے جو کہ حاکم کی صواب دید پر موقوف ہے [اس میں اجتہاد کی گنجائش موجود ہے]۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

شراب پینے والے کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی ؛ ان ہی اس کی مقدار مقرر ہے اور نہ ہی طریقہ کار۔ بلکہ اس میں لاٹھی اور جوتے سے مارنا بھی جائز ہے ۔ اور کپڑے کے کونے اور کھجور کی ٹہنی سے بھی مارا جاسکتا ہے ۔ جب کہ زنا اور بہتان تراشی کی سزا میں کوڑے سے مارا جائے گا۔

جب کہ تعداد کے لحاظ سے صحابہ سے شراب کی حد کے بارے میں چالیس اور اسی کوڑے مارنے کی روایات ملتی ہیں۔ صحیحین میں ثابت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ ان دونوں پر عمل کر سکتے ہیں اور یہ دونوں سنت ہیں۔

اس میں علماء کرام کے دوقول ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ چالیس سے زیادہ کوڑے مارنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ اور مالک رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: شراب نوشی کی سزا اصل میں تعزیر ہے ۔ حاکم وقت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ اس سے زیادہ سزا دے یا پھر اسے ترک کردے ۔ یہ مصلحت پر مبنی ہے ۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس پر اضافہ کرنا حاکم کی مرضی پر منحصر ہے۔ یہی مسلک زیادہ ظاہر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شراب پینے والے کا سرمنڈوا کر جلا وطن کر دیا کرتے تھے۔ ایسا کرنا بھی تعزیر کے باب میں سے ہی تھا۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جو شخص چوتھی مرتبہ شراب پیے اس کو قتل کردو۔ [1]

اس بات پر علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ آیا قتل کا حکم منسوخ ہو چکا ہے یا ہنوز باقی ہے؟ جب بھی حاکم وقت اس کی ضرورت محسوس کرے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس میں تین اقوال ہیں :

حضرت علی رضی اللہ عنہ چالیس سے زیادہ کوڑے لگایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: ''اگر کسی شخص پر حد لگائی جائے اور وہ مرجائے تو مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں البتہ اگر شراب پینے والا حد لگانے سے مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا؛ کیوں کہ یہ حد ہم نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے۔'' [2] یہ روایت امام شافعی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ اور اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ حاکم اپنے اجتہاد کی بنا پر تعزیر میں اضافہ کرنے کا مجاز ہے۔

پھر اس کی بنیاد ایک دوسرے مسئلہ پر ہے ؛ وہ مسئلہ یہ ہے کہ: جس پر حد یا تعزیر قائم کی جائے اور پھر وہ مرجائے تو کیا اس کی دیت ادا کی جائے گی یا نہیں؟ اس پر علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے کہ طے شدہ واجب حد اگر موت کا سبب بن جائے تو اس پر کوئی دیت نہیں ؛ اس لیے کہ اسے پورا کرنا واجب تھا؛ جیسا کہ قصاص ۔ اور غیر طے شدہ جیسے تعزیر اور میاں کا بیوی کو سزا دینا ؛ اور سوار کا چوپائے کو چابک لگانا ؛ اور بچے کو تأدیب دینے والے کی سزا؛ اس میں تین اقوال ہیں :

ایک قول یہ ہے کہ کسی بھی حال میں اس پر دیت نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ اس کے لیے سزا دینا مباح تھا۔ یہ امام احمد اور امام مالک کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ: اس پر غیر واجب مباح میں دیت واجب ہوگی۔ اس لیے کہ اسے سزا ترک کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ غیر مقدر میں دیت ادا کرے گا۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اس لیے کہ غیر مقدر سے ظاہر ہوتا ہے کہ تلف ہونے کی صورت میں دیت ادا کرے گا۔

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب اذا تتابع فی شرب الخمر(ح: ٤٤٨٢) الترمذی، کتاب الحدود، باب من شرب الخمر فاجلدوہ، (ح: ١٤٤٤)، ابن ماجۃ، کتاب الحدود۔ باب من شرب الخمر مراراً، (ح: ٢٥٧٢)

[2] سنن ابی داؤد، حوالہ سابق(ح:٤٤٨٦)، سنن ابن ماجۃ۔ کتاب الحدود، باب حد السکران(ح:٢٥٦٩)۔

فصل:

علم فاروقی پر اعتراضات

[اعتراض]: شیعہ لکھتا ہے: ''عمر رضی اللہ عنہ شرعی احکام سے نابلد تھے۔ ایک حاملہ عورت کو جب سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے روکا اور فرمایا: ''اگر تمہیں اس عورت کو سزا دینے کا حق و اختیار حاصل ہے لیکن اس کے جنین پر تمہارا کوئی اختیار نہیں۔ تو آپ سزا دینے سے رک گئے؛ اور فرمایا: ''اگر علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو جاتا۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ واقعہ درست ہے تو ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے حاملہ ہونے کا علم نہ ہو۔ کیوں کہ ایسے امور میں اصل عدم علم ہے۔ اور جب حاکم کو کسی قتل یا رجم کی مستحق عورت کے حامل ہونے کا علم نہ ہو؛ اور بعض لوگ اس کے حال کو جانتے ہوں؛ تو یہ بھی ان جملہ مخفی امور میں سے شمار ہوگا جس کا علم لوگوں کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے اور یہی اسی جنس سے ہے جیسے گواہ کسی غائبانہ بات کی گواہی دیتے ہیں۔ ایسا ہونا بھی ضروری ہے؛ ایسا انبیاء کرام یا ائمہ کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ اسی لیے اس کا شمار کلیہ شرعیہ میں نہیں ہوتا۔

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ آپ کو یہ حکم یاد نہ رہا ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یاد دلا دیا تو آپ کو یاد آگیا؛ تو آپ حد نافذ کرنے سے رک گئے۔ اس لیے کہ اگر آپ کی رائے یہ ہوتی کہ حاملہ کو رجم کیا جاسکتا ہے تو آپ اسے رجم کر دیتے۔ اور اس بارے میں کسی کی رائے کی کوئی پرواہ نہ کرتے۔ اس سے قبل غامدیہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی سنت موجود بھی تھی؛ غامدیہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ: وہ زنا سے حامل ہے [لہٰذا اس پر شرعی حد قائم کرکے اسے گناہ سے پاک کیا جائے] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے۔'' [اس کے بعد حد قائم ہوگی]۔ [مسلم ۳/ ۱۳۲۳]

اگر تسلیم کرلیا جائے کہ یہ مسئلہ آپ پر مخفی رہ گیا تھا؛ مگر بعد میں ظاہر ہوگیا؛ تو ایسے معاملات کی بنا پر ائمہ ہدایت کو ہدف طعن و ملامت بنانا کہاں تک قرین انصاف ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں اور اہل ذمہ کی سیاست کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے' اور شرعی حدود قائم کرتے اور تمام لوگوں کے مابین فیصلے کیا کرتے۔ آپ کے دور میں اسلام خوب پھیلا۔ اور اسلام کو وہ غلبہ اور شوکت نصیب ہوئی جو اس سے پہلے نہ ہوئی تھی۔ آپ ہمیشہ فیصلے کرتے اور فتوی دیتے۔ اگر آپ کے پاس وافر علم نہ ہوتا تو ہرگز ایسا نہ کرسکتے۔ پھر جب آپ پر لاکھوں مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ مخفی رہ جائے' اور وہ بھی جب واضح ہو جائے یا آپ کو یاد دلانے سے یاد آجائے تو اس میں عیب کی کون سی بات ہے؟ [1]

آپ کے علم و عدل اور بچوں کے ساتھ کمال رحمت کا واقعہ سنیے!

آپ بچوں کے لیے اس وقت تک وظیفہ مقرر نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ دودھ چھوڑ نہ دے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: اس کے لیے دودھ ہی کافی ہے۔'' پھر آپ نے ایک عورت کو سنا جو کہ اپنے بچے سے قبل از وقت دودھ چھڑانا چاہتی تھی تا کہ اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا جائے۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں میں منادی کرادی: ''بیشک امیر المؤمنین نے دودھ پیتے اور

[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس سے کئی گنا مسائل مخفی رہے۔ ان میں سے کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جن کا مرتے دم تک آپ کو علم نہ ہوسکا۔ آپ کے اجتہاد کا یہ حال ہے کہ جنگ جمل و صفین میں نوے ہزار انسان کو تہ تیغ کر دیا اس کے مقابلے میں حضرت عمر کا قصور صرف یہ تھا کہ آپ نے حاملہ کو سنگسار کرنے کا حکم دے کر ایک ولد الحرام کو قتل کرنا چاہا تھا اور وہ ابھی قتل نہیں کیا گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جرم آپ کے مقابلے میں عظیم تر تھا۔

دودھ چھٹے بچے کے لیے وظیفہ مقرر کرنے کا اعلان کیا ہے۔''

[اس واقعہ پر غور کیجیے اور اندازہ لگایئے]: بچے کو تکلیف دینا اس کی ماں کی طرف سے تھا؛ اس میں امیر المؤمنین کا کوئی دخل نہیں تھا۔لیکن آپ نے یہی مناسب سمجھا کہ دودھ پیتے بچوں کے لیے بھی وظیفہ مقرر کردیا جائے تا کہ لوگ اپنے بچوں کو ایذا نہ دیں۔ یہ مسلمانوں کی اولاد کے ساتھ آپ کا احسان تھا۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ جہاں تک ممکن ہو سکے کہ سزا صرف مجرم سے تجاوز نہ کرے تو ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگر مجرم کی سزا ترک کرنے میں بڑا فساد ہو'اور اس کو بھی سزا مل رہی ہے جس کا کوئی جرم نہیں ہے؛ تو اس صورت میں بڑے فساد کو ختم کرتے ہوئے چھوٹے فساد پر عمل کرلیا جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل طائف پر منجنیق سے سنگ باری کی۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ منجنیق سے سنگ باری کا نشانہ بچے اور عورتیں بھی بنتے تھے۔

صحیحین میں صعب بن جثامہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حربی مشرکوں کے بارے میں دریافت کیا کہ ان پر شبخون مارا جاتا ہے تو ان کی عورتیں بچے بھی قتل ہو جاتے ہیں تو آپ نے جواب دیا:

''وہ بھی انہیں میں سے ہیں۔'' [صحیح بخاری، ج ۲ ، ح ۲۷۰]

اور اگر کوئی حامل عورت لوگوں کی معصوم جانوں اور اموال پر حملہ آور ہو؛ اور انہیں نقصان پہنچائے اور اس کے قتل کیے بغیر اس سے لوگوں کی حفاظت ممکن نہ ہو؛ تو پھر اسے قتل کردیا جائے گا بھلے اس کا حمل بھی اس کے ساتھ ہی قتل ہو جائے۔

اگر یہ بات مان لی جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حد قائم کرنے کا حکم بھی اسی باب اور خیال سے تھا؛ یہاں تک کہ آپ کے لیے واضح ہو گیا کہ یہ عورت ایسی نہیں ہے؛ تو پھر بھی یہ جنگ جمل و صفین کے فساد سے بڑھ کر نہ تھا۔ ان جنگوں میں کئی اقسام کے بڑے بڑے فساد ظاہر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد اور غور وفکر کے باوجود یہ خیال نہ کر سکے تھے کہ معاملہ یہاں تک پہنچے گا۔ اگر آپ کو پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو آپ کبھی بھی ایسا نہ کرتے؛ جیسا کہ آخری زندگی میں آپ خود فرمایا کرتے تھے۔

پاگل لڑکی کو سنگسار کرنے کا حکم:

[اعتراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر نے ایک مجنون عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہوش میں آئے، یہ سن کر اس سے عمر باز آ گئے اور کہا:''اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔''

[جواب] :ہم کہتے ہیں کہ'' لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ'' کا اضافہ معروف نہیں ہے۔ پاگل لڑکی کو رجم کرنے کا حکم دو احتمال سے خالی نہیں:

۱۔ آپ کو اس لڑکی کے پاگل ہونے کا علم نہیں تھا۔تو اس سے آپ کے شرعی احکام کا عالم ہونے پر طعن نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ آپ کو یہ حکم بھول گیا تھا؛ پھر جب یاد دلایا گیا تو آپ کو یاد آ گیا۔

یا کسی کا یہ بھی خیال ہوسکتا ہے کہ شرعی سزائیں دنیا میں ضرر سے بچنے کے لیے تجویز کی گئی ہیں۔اور جب مجنون دوسرے مجانین یا عقلاء پر ظلم و تعدی کا ارتکاب کر رہا ہو؛ تو اس کے شر سے بچنے کے لیے اسے سزا دی جا سکتی ہے۔ زنا بھی ایک قسم کی سرکشی اور عداوت ہے۔ اس پر سزا دی جانی چاہیے؛ حتی کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں؛ جو کہ صرف مکلف

پر ہی قائم کی جاسکتی ہیں۔

شریعت میں بچوں کے نماز ترک کرنے پر ان کے لیے سزا موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب لڑکا سات سال کا ہو جائے تو اسکو نماز پڑھنے کی تاکید کرو اور جب دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اسکو مارو؛ اوران کے بستر علیحدہ کردو۔'' [سنن ابو داؤد: ح ٤٩١]

ایسے ہی مجنون اگر دوسرے لوگوں پر حملہ کرتا ہو؛ اوراس کے قتل کیے بغیر اس کے حملوں سے دفاع ممکن نہ ہو؛ تو اسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی اگر چوپایہ بھی لوگوں پر حملہ کرتا ہو؛ اوراس کو مارے بغیر جان محفوظ کرنا ممکن نہ ہو تو اسے مارا جاسکتا ہے۔ اور اگر چہ یہ حیوان کسی کی ملکیت ہی کیوں نہ ہو؛ اس کے مارنے والے پر مالک کے لیے کوئی تاوان نہیں۔ یہ جمہور علماء امام مالک؛ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مارنے والا مالک کو تاوان ادا کرے گا؛ اس لیے کہ اس نے مصلحت کے تحت قتل کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے [کوئی جانور] لڑائی میں مارا جائے [تو اس کا تاوان ادا کرنا ہوگا]۔ جب کہ جمہور کہتے ہیں: لڑائی میں انسان اسے اپنی وجہ سے مارتا ہے' جانور کی تعدی کی وجہ سے نہیں مارتا۔ جب کہ اس موقعہ پر جانور کی تعدی کی وجہ سے اسے مارا گیا ہے؛ [اس میں اپنی کسی غرض کا دخل نہیں]

خلاصہ کلام! غیر مکلف جیسے: بچے اور پاگل [کو سزا دینا] اور جانور کو اس کی ضرر سے بچنے کے لیے قتل کرنا بالاتفاق نصوص کی روشنی میں جائز ہے۔ ہاں بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے: جنگ؛ شب خون مارنا؛ منجنیق وغیرہ سے حملہ کرنا؛ اوران کے حملوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے انہیں قتل کرنا۔

وہ حدیث جس میں آتا ہے: ''تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔''

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس سے یہ کہیں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ان پر حد قائم نہیں کی جاسکتی۔ اِلا یہ کہ اس کے لیے ایک اور مقدمہ قائم کیا جائے؛ یہ کہا جائے کہ: ''جس کے اعمال لکھے نہیں جاتے؛ یعنی جو مرفوع القلم ہے؛ اس پر کوئی حد بھی نہیں ہے۔ اس مقدمہ میں ایک الجھاؤ ہے۔ وہ یہ کہ: کبھی کبھار مرفوع القلم کو بھی سزا دی جاتی ہے۔ اور کبھی سزا نہیں دی جاتی۔ ان دونوں صورتوں کے مابین فرق کرنے کے لیے انتہائی خفی علم کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی مجنون کسی عورت کے ساتھ زبردستی کرنا چاہے؛ اوراس کو قتل کیے بغیر اس سے نجات حاصل کرنا ممکن نہ ہو' تو اس کے لیے اس پاگل کو قتل کرنا جائز ہے۔ بلکہ اہل علم کے اجماع اور سنت کی روشنی میں اس عورت پر ایسا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

اگر بعض مجتہدین کا یہ اعتقاد ہو کہ زنا کرنا بھی زیادتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عدوان سے تعبیر کیا ہے' فرمایا:

﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ [المؤمنون ٧]

''جو اس کے سوا کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کر جانے والے ہیں۔''

پس اس حکم کی روشنی میں مجنون کو قتل کیا جائے گا؛ تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ حد ہے۔ اور یہ حد اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب مجرم کو اس فعل کے حرام ہونے کا علم ہو۔ مجنوں کو تو حلت و حرمت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ [یہ کہنے والے پر اس کا] یہ قول اتنا برا ہی سمجھے گا؛ جس سے خود کسی دوسرے پر اس سے بھی قبیح حرکت ہوئی ہو۔''

اگر کوئی کہنے والا کہے کہ: مسلمانوں کو قتال کرنا ان کے لیے سزا ہے۔ اور یہ سزا اس وقت تک نہیں دی جاسکتی جب تک

انہیں حرام یا واجب ہونے کا علم نہ ہو۔اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھی جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے برسر پیکار تھے ؛ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا بھی کوئی گناہ ہے۔تو پھر جس چیز کو وہ گناہ نہیں سمجھتے تھے اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان سے جنگ کرنا جائز نہ تھا۔اگر چہ وہ غلطی پر تھے ؛ تاہم زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے انہوں نے واجب اطاعت کو ترک کر دیا تھا۔لیکن ان میں سے اکثر لوگ یا بہت سارے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت و متابعت ان پر واجب ہے۔ وہ ایسے شبہات اور تاویلات کا شکار تھے جو کہ اس اطاعت کے واجب ہونے کے علم میں رکاوٹ تھے۔تو پھر ایسے انسان کو معصوم الدم ہونے کے باوجود قتل کرنا کیسے جائز ہوسکتا ہے جو یہ جانتا ہی نہ ہو کہ اس نے کوئی واجب ترک کیا ہے؟ یا اس نے کسی حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے ؟ ۔ اگر یہ تمام امور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت میں باعث طعن و قدح نہیں ہوسکتے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایسے معمولی امور ان کی خلافت و امامت میں سببِ قدح کیسے ہوسکتے ہیں؟

خاص کر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ترکِ واجب پر قتال اس وقت مشروع ہوتا ہے جب قتال کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابی اس ترکِ واجب کی خرابی سے کم تر ہو۔اور قتال کرنے کی مصلحت اس کے ترک کرنے کی مصلحت سے بڑھ کر ہو۔ جب کہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس قتال سے مطلوب اطاعت حاصل نہ ہوسکی۔ بلکہ اس وجہ سے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ نافرمانی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی جماعت سے خوارج کا پورا لشکر آپ کی نافرمانی کرتے ہوئے نکل گیا۔ اور بہت سارے آپ کے لشکر کے کمانڈر ہی آپ سے لڑنے لگے۔ان میں سے اکثر لوگ آپ کی مطلق اطاعت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس قتال سے پہلے وہ قتال کے بعد کی بہ نسبت زیادہ فرمانبردار و اطاعت گزار تھے۔

❁ اگر یہ کہا جائے کہ : حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مسئلہ میں مجتہد تھے ؛ اور آپ کا خیال تھا کہ شاید اس قتال سے لوگ آپ کی اطاعت میں داخل ہو جائیں گے۔

❁ تو اس کا جواب یہ ہے کہ : جب ایسا اجتہاد قابل مغفرت و بخشش ہوسکتا ہے ؛ حالانکہ اس اجتہاد کی وجہ سے ہزاروں مسلمان قتل ہوئے ؛ خرابی و فساد ہی پیدا ہوا ؛ کوئی اصلاح یا خیر کا کام نہ ہوسکا۔تو پھر کیا ایک آدمی کے قتل کے بارے میں اجتہاد قابل مغفرت نہیں ہوسکتا جب کہ اس ایک آدمی کو قتل کرنے کی وجہ سے مصلحت بھی حاصل ہوتی ہو ؛ اور لوگوں کو بے حیائی و برائی کے کاموں سے روکنے کے لیے زجر و تنبیہ کا سامان بھی ہو رہا ہو؟ حالانکہ آپ نے پھر اس آدمی کو قتل بھی نہیں کیا ؛ صرف قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا ؛ بعد میں اسے چھوڑ دیا گیا۔

حکمران یا ولی امر کو احکام حدود کی جزئیات کی معرفت کی بہ نسبت عام سیاست کے کلی احکام کی معرفت کی ضرورت کہیں بہت زیادہ ہوتی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر یہ بات مخفی نہ تھی کہ مجنون مکلّف نہیں ہوتا۔لیکن اشکال یہ تھا کہ کیا : غیر مکلّف کو فساد ختم کرنے کے لیے سزا دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یہی شک و شبہ کا مقام تھا۔

بیشک شریعت میں کئی ایک مواقع پر فساد کے ختم کرنے کے لیے غیر مکلّف کو سزا دینے کا جواز موجود ہے۔ اور لوگوں کی مصلحتوں کے پیش نظر عقل کا بھی تقاضا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ وہ لڑکا جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا ؛ اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جس وقت قتل کیا گیا ' اس وقت تک بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا تھا۔لیکن اسے قتل اس لیے کیا گیا کہ اس کی بد اعمالیوں سے اس کے والدین کو نجات دلائی جائے جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے :

[﴿وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا﴾ [الکھف ۸۰]

''اور اس لڑکے کے ماں باپ ایمان والے تھے، ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہ انہیں اپنی سرکشی اور کفر سے عاجز و پریشان نہ کر دے۔'']]

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''تین آدمیوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ سونے والے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے۔ مجنوں سے یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو جائے۔ بچہ پر سے یہاں تک کہ بڑا (بالغ) ہو جائے۔'' [سنن ابوداؤد: ج ۳: ح ۱۰۰۷]

اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان پر کوئی تاوان یا ضمان نہیں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اگر یہ تین اقسام کے لوگ کسی جان کو ضائع کر دیں؛ یا کسی کا مال ضائع کر دیں تو ان پر تاوان ہوگا۔ جہاں تک سزا ختم ہونے کا تعلق ہے؛ یعنی ان میں سے اگر کوئی ایک زنا کرے؛ یا چوری کرے یا رہزنی کرے۔ تو اس کے بارے میں علیحدہ دلیل سے علم حاصل ہوگا؛ اس حدیث سے نہیں۔

اسی وجہ سے علماء کرام رحمہم اللہ کا اتفاق ہے پاگل اور چھوٹا بچہ جنہیں کو تمیز نہ ہو؛ ان پر بدنی عبادات نہیں ہیں۔ جیسے نماز روزہ اور حج۔ اور ان کے اموال میں حقوق ہیں؛ جیسے: ان کے اخراجات؛ خرید و فروخت کے واجب ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ البتہ زکوٰۃ کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور علماء کی ایک جماعت رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ اس پر نماز کی طرح زکوٰۃ بھی واجب نہیں۔ جب کہ جمہور علماء کرام رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ اور مالی حقوق جیسے عشر؛ صدقۃ الفطر وغیرہ واجب ہیں۔ امام مالک؛ امام شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ اور یہ جمہور صحابہ کا قول بھی ہے۔

پس جب غیر مکلف کے بارے میں واجبات کا اشتباہ ہے کہ کیا اس کے مال میں بعض مالی حقوق واجب ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو یہی معاملہ بعض عقوبات کا بھی ہے۔ اس میں بھی اشتباہ ہے کہ کیا غیر مکلف پر بعض عقوبات لاگو ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ واجبات میں سے بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو بالاتفاق اس غیر مکلف کے ذمہ پر ہوتی ہیں۔ اور بعض کے بارے میں شبہ ہے کہ کیا یہ بھی واجب حقوق کی طرح ہیں یا نہیں؟

ایسے ہی عقوبات کا مسئلہ بھی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر کوئی عقوبت نہیں ہے؛ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ جیسے کہ اسلام کی وجہ سے قتل کرنا۔ پاگل کو اسلام قبول نہ کرنے پر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض چیزوں میں غیر مکلف کے لیے بھی عقوبت و سزا موجود ہے؛ جیسے کہ اس کا لوگوں پر حملہ آور ہونا؛ [جان و مال میں لوگوں کو نقصان پہنچانا وغیرہ]۔ اور بعض امور ایسے ہیں جن کے بارے میں شبہ ہے۔ اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ غیر مکلف بچہ جو کہ امتیاز کر سکتا ہو؛ اسے فحاشی کا کام کرنے پر انتہائی سخت سزا دی جائے گی۔ یہی حال مجنون کا ہے؛ اسے اس کے بعض افعال پر سزا دی جائے گی تاکہ وہ آئندہ کے لیے ڈر جائے۔ یہ امور شریعت میں معلوم شدہ ہیں۔ لیکن ان کا شمار ان ظاہری امور میں نہیں ہوتا جن کا علم مخفی رہ جانے پر کسی کو طعنہ زنی کا نشانہ بنایا جائے؛ حتی کہ وہ اس کا علم حاصل کر لے۔

مزید برآں اکثر مجانین یا بہت سارے مجانین کو بعض احوال میں افاقہ حاصل ہوتا ہے؛ اور اس وقت ان کی عقل کام کر رہی ہوتی ہے۔ تو شاید اس عورت کے متعلق بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی خیال ہو کہ اس نے افاقہ اور عقل کے وقت زنا کیا ہوگا۔ اس لیے کہ لفظ مجنون اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے؛ جس پر پاگل پن کا مکمل غلبہ ہو؛ اور اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو جسے ہلکا

پھلکا پاگل پن ہو؛[یا پھر جسے کبھی پاگل پن کا دورہ ہوتا ہو اور کبھی افاقہ ہو جاتا ہو]۔

خلاصہ کلام ! رافضی مصنف نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا دیگر اصحاب کے بارے میں جو مطاعن ذکر کیے ہیں ؛ ان کا مرجع دو چیزیں ہیں:

۱۔علم کا نقص ۲۔ دین کا نقص

ابھی ہم انہیں ہی چیزوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔شیعہ مصنف نے جتنے بھی امور ذکر کیے ہیں ؛ جیسا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے میراث کا روکنا؛ اپنے احباب و اقارب کو نوازنا؛ حدود شریعت کا خاتمہ؛ اور ان کے علاوہ جتنے بھی امور ہیں' ان کا مرجع یہ ہے کہ آپ [یعنی حضرت عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم] عادل نہیں تھے۔ بلکہ آپ ظالم تھے۔یہ بات تو عام و خاص سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف سے آفاق عالم کو بھر دیا تھا۔یہاں تک عدل و انصاف میں آپ کی ضرب المثل بیان کی جاتی تھی۔حتی کہ کہا جاتا ہے : دونوں عمر کی سیرت ۔ان دو میں سے ایک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں اور دوسرے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ ۔ یہ اہل علم محدثین جیسے امام احمد وغیرہ کا قول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما لیے جاتے ہیں ؛ جیسا کہ اہل لغت اور اہل نحو کا ایک گروہ مراد لیتا ہے ۔ جیسے ابو عبید وغیرہ۔

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے فضائل:

کسی انسان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ خوارج انتہائی سرکش ہونے کے باوجود حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت پر راضی ہیں ۔ایسے ہی پہلے دور کے شیعان علی رضی اللہ عنہ بھی آپ پر حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو افضلیت دیا کرتے تھے۔ ابن بطہ نے حسن بن عرفہ سے ذکر کیا ہے ؛ وہ کہتے ہیں: مجھ سے کثیر بن مروان فلسطینی نے بیان حدیث بیان کی؛ وہ انس بن سفیان سے ؛ وہ غالب بن عبداللہ العقیلی سے روایت کرتے ہیں ؛ آپ فرماتے ہیں:

''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخمی کر دیے گئے تو لوگ آپ کے پاس عیادت کے لیے حاضر ہوئے ۔ان میں سے ایک ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آخری گھڑیاں تھیں ؛ اور آپ رو رہے تھے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمانے لگے:

اے امیر المؤمنین ! آپ کو کس چیز نے رلا دیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم ! میں دنیا کے افسوس پر نہیں رو رہا؛ اور نہ ہی مجھے دنیا کا کوئی شوق ہے۔لیکن مجھے قیامت کی سختیوں کا خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اے امیر المؤمنین ! اللہ کی قسم ! آپ اسلام لائے تو آپ کا اسلام لانا فتح تھی ۔ پھر آپ کو امیر بنایا گیا ؛ تو آپ کی امارت بھی فتح سے عبارت تھی۔آپ نے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیا۔مسلمانوں کے کوئی دو آدمی بھی ایسے نہیں ہیں جن کے مابین کوئی رنجش ہو؛ تو ان کے سامنے آپ کا ذکر کیا جائے تو وہ آپ کی بات پر راضی ہو جاتے ہیں' اور اس پر قناعت کر لیتے ہیں۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے بیٹھا دو۔''

جب آپ کو بیٹھا دیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''اپنی بات دھراؤ۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: درست ہے ؛ میں دھراتا ہوں ۔ اور اپنی بات دھرا دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے ابن عباس ! کیا آپ میرے لیے قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس بات کی گواہی دیں گے؟

آپ نے فرمایا: ہاں اے امیر المؤمنین ! میں اللہ کے ہاں آپ کے لیے اس بات کی گواہی دوں گا۔اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ بھی آپ کے لیے اس بات کی گواہی دیں گے۔اس وقت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ وہاں پر تشریف فرما تھے۔تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: ہاں اے امیر المؤمنین ۔'' [رواه ابن جوزی في مناقب عمر ١٩٣]۔

یہ لوگ جو صبح و شام علم کی تلاش میں رہتے ہیں ؛ ان کی کسی ایک کے ساتھ کوئی غرض نہیں ہوتی ۔ بلکہ کبھی کسی کے قول کو ترجیح دیتے ہیں' اور کبھی کسی امام کے قول کو۔ جیسے بھی شریعت کے دلائل وارد ہوتے ہیں' ایسے فیصلہ کرتے ہیں۔ جیسے حضرت سعید بن المسیب ؛ اور فقہاء مدینہ۔ جیسے عروہ بن زبیر؛ قاسم بن محمد؛ علی ابن الحسین ؛ ابو بکر بن عبد الرحمٰن ؛ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ؛ سلیمان بن یسار؛ خارجہ بن زید؛ اور سالم بن عبد اللہ بن عمر رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ دوسرے علماء وفقہاء۔

ان کے بعد جیسے : ابن شہاب الزہری ؛ یحی بن سعید؛ ابو زناد؛ ربیعہ ؛ مالک بن انس؛ ابن ابی ذئب ؛ اور عبد العزیز الماجشون وغیر ہم رحمہم اللہ ۔

اور جیسے طاؤس الیمانی ؛ مجاہد؛ عطاء؛ سعید بن جبیر؛ عبید بن عمیر ؛ عکرمہ مولی ابن عباس وغیر ہم رحمہم اللہ ۔

اور ان کے بعد: عمرو بن دینار؛ ابن جریج؛ ابن عیینہ وغیر ہم رحمہم اللہ ۔اہل مکہ میں سے ۔

اور جیسے : حضرت حسن بصری ؛ محمد بن سیرین ؛ جابر بن زید ابو الشعثاء ؛ مطرف بن عبد اللہ بن الشخیر ؛ ایوب السختیانی ؛ عبد اللہ بن عون؛ سلیمان التیمی ؛ قتادہ؛ سعید بن ابی عروبہ؛ حماد بن سلمہ؛ حماد بن زید وغیر ہم رحمہم اللہ ۔اور ان کے امثال۔

پھر ان کے بعد جیسے: علقمہ؛ اسود؛ شریح القاضی ؛ وغیر ہم رحمہم اللہ ۔اور ان کے امثال ۔

پھر ان کے بعد جیسے : ابراہیم النخعی ؛ عامر الشعبی ؛ حکم بن عتیبہ ؛ منصور بن المعتمر ؛ سفیان الثوری؛ ابو حنیفہ؛ ابن ابی لیلی ؛ شریک ؛ وکیع بن الجراح ؛ ابو یوسف اور محمد بن الحسن وغیر ہم رحمہم اللہ ۔اور ان کے امثال ۔

پھر ان کے بعد : امام شافعی ؛ احمد بن حنبل ؛ اسحاق بن راہویہ ؛ ابو عبید القاسم بن سلام؛ اور حمیدی عبد اللہ بن الزبیر ؛ ابو ثور؛ محمد بن نصر المروزی ؛ محمد بن جریر الطبر ی ؛ ابو بکر ابن المنذ ر ؛ وغیر ہم رحمہم اللہ ۔اور ان کے امثال ۔

اور ان کے علاوہ علماء کرام رحمہم اللہ کی اتنی بڑی تعداد ہے جن کی صحیح گنتی کو اللہ ہی جانتا ہے۔جن تعلق مسلمانوں کی کئی اصناف سے ہے۔ یہ تمام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عدل و انصاف اور آپ کے علم کے معترف و مداح ہیں ۔

بعض علماء کرام نے مناقب عمر رضی اللہ عنہ پر منفرد کتابیں لکھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں میں آپ کی سیرت کی طرح کسی کی سیرت متعارف نہیں ہو سکی۔ ابو المعالی علی الجوینی رحمہ اللہ نے بھی یہی ارشاد فرمایا ہے۔آپ فرماتے ہیں:

'' آسمان نے آپ جیسا کوئی دوسرا عبقری نہیں دیکھا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: '' اپنی مجالس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ذکر سے زینت بخشو۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: '' لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب فراست تین افراد ہیں :

ا۔'' حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی ؛ جس نے اپنے والد سے کہا تھا:

﴿يَآأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ﴾ [القصص ۲٦].

''ابا جی! آپ انہیں مزدوری پر رکھ لیجئے، کیونکہ جنہیں آپ اجرت پر رکھیں ان میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو مضبوط اور امانتدار ہو۔''

۲۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا [جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا]۔

۳۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب انہوں نے اپنے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا۔''

یہ تمام علماء کرام رحمہم اللہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے؛ یہ سبھی جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل و انصاف آپ کے بعد آنے والے خلفاء کی نسبت زیادہ کامل و مکمل تھا۔ اور بعد میں آنے والوں کی نسبت آپ کا علم بھی کامل واتم تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد آنے والے خلفاء کی سیرت کے مابین جو فرق ہے اسے ہر خاص و عام جانتا ہے۔ بیشک آپ کے اعمال ظاہر ہیں' اور آپ کی سیرت بڑی صاف اور واضح ہے۔ جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حسن نیت؛ ارادہ وقصد عدل؛ عدم غرض؛ ہوائے نفس کی سرکوبی ایسے ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے کہ اس کی مثال بعد میں آنے والوں کی سیرت میں نہیں ملتی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

''جب تم سے شیطان کسی راستہ میں چلتے ہوئے ملتا ہے تو وہ تمہارے راستہ کو چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلنے لگتا ہے۔''[1]

اس لیے کہ شیطان انسان پر اس کی خواہشات نفس کی وجہ سے ہاتھ ڈالتا ہے؛ جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان خواہشات کا سر کچلنے والے تھے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''اگر میں تم میں مبعوث نہ کیا جاتا تو پھر عمر رضی اللہ عنہ کو مبعوث کیا جاتا۔''[2]

اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ عمر کی زبان پر حق کو جاری کر دیا ہے۔''[3]

کئی ایک مواقع پر آپ کے رائے رب کی رائے کے موافق ہوئی؛ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر قرآن نازل فرمایا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم کہا کرتے تھے: ''سکینہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جاری ہوتا ہے۔''[4]

یہ سب کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کمال علم و عدل کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ [الأنعام ۱۱۵]

''آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو علم اور عدل کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ جو بھی علم و عدل میں جتنا کامل ہوتا؛ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لائے ہوئے پیغام کے اتنا ہی زیادہ قریب ہوتا۔ اور یہ وصف دوسرے لوگوں سے بڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں نمایاں تھا۔ عمل اور عدل میں یہ وصف تقریباً ہر کسی میں پایا جاتا ہے۔ جب کہ علم میں یہ وصف آپ کی رائے اور مسلمانوں کی مصلحتوں سے علم؛ اور ان امور سے معلوم ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کی دنیا اور دین میں ان کے لیے نفع بخش یا نقصان دہ ہوں۔ اور ان اختلاف

---

[1] صحیح بخاری: ج2: ح897۔

[2] فضائل الصحابة للأمام أحمد ۱/ ٤٢٨ ۔ یہ روایت بہت ضعیف ہے؛ امام احمد نے مسند میں ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: '' لو كان بعدي نبي لكان عمر ۔ ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔'' ٤/ ١٥٤؛ والحاكم ٣/ ٨٥؛ والترمذي ح ٣٦٨٦۔

[3] سنن أبي داؤد ٣/ ١٩١؛ والترمذي ٥/ ٢٨٠۔ [4] رواه أحمد ٢/ ١٤٧۔

مسائل کی معرفت سے معلوم ہوسکتا ہے جن میں آپ کا بھی ایک قول ہو؛ اور کسی دوسرے کا بھی اس میں کوئی قول ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلافی مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اصابت رائے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی رائے سے کہیں بڑھ کر درست [اور زیادہ تعداد میں] ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل مدینہ آپ کے قول کی طرف زیادہ مائل ہوا کرتے تھے۔ اور اہل مدینہ کا مذہب باقی تمام بلاد و امصار کے مذہب پر راجح ہوتا ہے۔ اس لیے کہ پہلی تین صدیوں تک کسی بھی اسلامی شہر میں اہل مدینہ سے بڑھ کر علماء اور سنت رسول اللہ ﷺ کے جاننے والے نہیں ہوا کرتے تھے۔ اور اہل مدینہ کا بالا تفاق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ جب کہ اہل کوفہ کا پہلا طبقہ جن کا شمار حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں ہوتا ہے؛ یہ لوگ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ اہل کوفہ کے افضل ترین لوگ تھے۔ حتی کہ اہل کوفہ کے قضاۃ قاضی شریح؛ عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ اور ان کے امثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو صرف اکیلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول پر ترجیح دیا کرتے تھے۔

❀ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے کبھی بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا؛ مگر مجھے یوں لگتا تھا کہ آپ کی پیشانی پر ایک فرشتہ ہے؛ جو کہ آپ کو راہ راست پر چلاتا رہتا ہے۔''❶

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم یہ رائے رکھتے تھے: ''سکینہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان سے جاری ہوتا ہے۔''❷

❀ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام پیش قدمی کرنے والے انسان کی طرح ہوا کرتا تھا؛ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جتنا آگے بڑھتا اتنا قریب ہوتا جاتا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو اسلام پیٹھ پھیر کر بھاگنے والے کی طرح ہوگیا؛ اور اب وہ دور ہی ہوتا جا رہا ہے۔''❸

❀ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے ہم عزت میں ہی رہے۔''❹

❀ آپ ہی کا قول ہے؛ جب صالحین کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مبارک ہو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو؛ آپ کا اسلام لانا اسلام کی نصرت تھی؛ اور آپ کی حکومت اسلام کی فتح تھی۔''❺

❀ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہم سب میں سے کتاب اللہ کے زیادہ جاننے والے تھے؛ اللہ کے دین کی سب سے زیادہ سمجھ رکھنے والے تھے؛ اللہ کی قسم! یہ بات سب لوگوں کے لیے واضح ہے۔''❻

❀ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں اور کائنات کے سارے لوگوں کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پلڑا بھاری ہو جائے۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ نے فرمایا: میں خیال کرتا ہوں کہ نو حصے علم چلا گیا۔ اور میں کہتا ہوں کہ: آپ کے زخمی

❶ ذكره في مجمع الزوائد ٩/ ٧٢۔ وقال: رواه الطبراني؛ أنظر: فضائل الصحابة ١/ ٢٤٧۔

❷ فضائل الصحابة؛١/ ٢٤٩؛ الرياض النضرة ١/ ٢٧٠۔ [اس سے ملتا جلتا اثر ابن عمر کی روایت سے پچھلے صفحہ پر بھی گزر چکا ہے]۔

❸ دیکھیں: البخاری ٥/ ١١۔ ❹ فضائل الصحابة برقم ٣٤٠۔

❺ مجمع الزوائد ٩/ ٦٩۔ ❻ مجمع الزوائد ٩/ ٦٩۔ تاريخ عمر ابن خطاب ص ٢١٤۔

ہونے کے دن سے نو حصے علم چلا گیا تھا۔'' ❶

[مناقب عمر رضی اللہ عنہ صحابہ و تابعین کی نظر میں]:

❀ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب لوگوں کے مابین اختلاف واقع ہو جائے تو دیکھو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا کیا تھا؟ پس آپ کی رائے کو قبول کر لو۔'' ❷

❀ ابو عثمان النہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: بیشک حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک میزان تھے؛ آپ ادھر ادھر کی باتیں نہیں کیا کرتے تھے''۔ فضائل کی کتابوں میں ان سے کئی گنا زیادہ فضائل صحیح اور ثابت شدہ اسناد کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں۔ جن میں جھوٹوں کی من گھڑت اور خود ساختہ روایات نہیں ہیں۔ جو کتابیں اس وقت موجود ہیں' ان میں یہ فضائل کثرت کے ساتھ اور ثابت شدہ اسناد کے ساتھ موجود ہیں۔[وللہ الحمد]

❀ عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مجھ سے اباجی نے حدیث بیان کی؛ وہ کہتے ہیں ہم سے یحی بن سعید نے؛ ان سے اسماعیل بن ابی خالد نے؛ ان سے قیس بن حازم نے حدیث بیان کی؛ وہ کہتے ہیں: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے ہم عزت میں ہی رہے۔''

❀ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی:

''یا اللہ! اسلام کو ابوجہل یا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام سے تقویت پہنچا۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوسری صبح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام لائے۔'' ❸

❀ نضر نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے؛ وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو مشرکین کہنے لگے: آج یہ لوگ ہمارے برابر ہو گئے۔[آج ان لوگوں نے ہم سے انتقام لے لیا] ❹

❀ احمد بن منیع نے روایت کیا ہے ..... حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلامی قلعہ کی ایک مضبوط دیوار تھے۔ اس قلعہ میں لوگ داخل ہوا کرتے تھے؛ یہاں سے کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔ جب آپ قتل کر دیے گئے تو اس دیوار میں نقب لگ گئی۔ آج کل لوگ یہاں سے نکلنا شروع ہو گئے ہیں۔'' ❺

❀ ابن بطہ رحمۃ اللہ علیہ نے معروف اسناد کے ساتھ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے؛ آپ فرماتی ہیں: جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا ہے' اسلام کمزور ہو گیا ہے۔''

❀ حضرت سفیان الثوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے: حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام پیش قدمی کرنے والے انسان کی طرح ہوا کرتا تھا؛ وہ آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جتنا آگے بڑھتا اتنا قریب ہوتا جاتا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے تو اسلام پیٹھ پھیر بھاگنے والے کی طرح ہو گیا؛ اور اب وہ دور ہی ہوتا جا رہا ہے۔''

---

❶ فضائل الصحابۃ ۱/ ۳٦٤۔ ❷ فضائل الصحابۃ ۱/ ۲٥۹۔

❸ جامع ترمذی: جلد دوم: حدیث نمبر 1649؛ ابن ماجۃ ۱/ ۳۹۔

❹ رواه أحمد في الفضائل ۱/ ۲٤۸۔ والحاكم في المستدرك ۳/ ۸٥۔

❺ الطبقات الکبری لابن سعد ۳/ ۲۷۳۔ تاریخ دمشق لابن عساکر ٤٤/ ٤٦۰۔

- اور ابن ماجشون کی سند سے روایت کیا گیا ہے' انہیں عبد الواحد بن ابی عون نے خبر دی؛ وہ قاسم بن محمد سے روایت کرتے ہیں' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: ''جس کسی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسلام کی بے نیازی اور فائدہ کے لیے پیدا کیا تھا۔ اللہ کی قسم ! آپ اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے اپنے معاصرین کے لیے کسی مثالیں چھوڑی ہیں۔''
- محمد ابن اسحق رحمہ اللہ اپنی کتاب '' السیرۃ '' میں فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ انتہائی غیرت مند انسان تھے؛ اپنے پیچھے کا خیال نہیں کیا کرتے تھے؛ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا دفاع کیا یہاں تک کہ وہ عزت سے رہنے لگے۔''
- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: '' ہم کعبۃ اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؛ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے ۔ جب آپ اسلام لائے تو مشرکین سے لڑنا شروع کیا؛ یہاں تک کہ آپ نے کعبہ کے پاس نماز ادا کی ؛ اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔''
- محمد بن عبید الطنافیسی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے؛ ان سے اسماعیل نے ؛ ان سے قیس بن حازم نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے ہم عزت میں ہی رہے ۔ اللہ کی قسم ہم کھل کر بیت اللہ میں نماز نہ پڑھ سکتے تھے ؛ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو آپ نے مشرکین سے لڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم بیت اللہ کے پاس جا کر نماز پڑھنے لگے۔''
- کئی اسناد سے روایت کیا گیا ہے ؛ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر حق جاری کر دیا؛ اور آپ حق ہی کہتے ہیں۔'' اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل اور زبان پر حق جاری کر دیا ہے۔'' یا آپ کی زبان اور دل پر چلا دیا ہے۔''

  یہ جملہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا گیا ہے۔
- امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ماضی کی امتیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں کچھ لوگ مُلہم ہوا کرتے تھے۔ بیشک میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہے۔'' [اس کی تخریج گزر چکی ہے]۔

- طارق بن شہاب رحمہ اللہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: '' کوئی انسان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے حدیث بیان کرتا؛ اور وہ اس میں کوئی جھوٹ بولتا تو آپ اس سے کہتے رک جاؤ۔ پھر وہ آپ سے حدیث بیان کرتا تو آپ فرماتے: اس سے رک جاؤ۔ پھر وہ آدمی کہتا: '' میں نے جو بھی حدیث آپ سے بیان کی ہے' وہ تمام حق ہے؛ سوائے ان چیزوں کے جہاں پر آپ نے مجھے رک جانے کا حکم دیا۔''
- ابن وہب نے یحی بن ایوب سے روایت کیا ہے' وہ ابن عجلان سے نقل کرتے ہیں وہ نافع سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں؛ آپ فرماتے ہیں: بیشک حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر روانہ فرمایا؛ اور اس پر ساریہ نامی ایک آدمی کو امیر مقرر فرمایا۔ پس ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک آپ منبر پر چلانے لگے: اے ساریہ! پہاڑ کی طرف پلٹو۔ اے ساریہ! پہاڑ کی طرف دیکھو۔ جب اس لشکر کی طرف سے پیامبر آیا تو آپ نے

احوال دریافت فرمائے ۔ اس آدمی نے کہا: اے امیر المؤمنین! ہمارا دشمن سے آمنا سامنا ہوا؛ انہوں نے ہمیں شکست دیدی۔ پس اچانک ہم نے ایک چیخنے والے کی آواز سنی! اے ساریہ پہاڑ کی طرف پلٹو۔ اے ساریہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ پس ہم نے اپنی پشتیں پہاڑ کی طرف کردیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دیدی۔ تو پھر حضرت عمرابن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: حضرت آپ نے ہی منبر پر یہ آواز لگائی تھی۔''

❀ صحیح بخاری میں ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''میں نے اپنے پرودگار سے تین باتوں میں موافقت کی۔ (ایک مرتبہ) میں نے کہا کہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاش! ہم مقام ابراہیم کو مصلی بنا لیتے، پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة ۱۲۵]

''اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔''

اور حجاب کی آیت بھی میری خواہش کے مطابق نازل ہوئی۔ کیونکہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش آپ اپنی بیویوں کو پردہ کرنے کا حکم دیں، اس لئے کہ ان سے ہر نیک و بد گفتگو کرتا ہے۔ پس حجاب کی آیت نازل ہوئی۔ اور ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں آپ پر نسوانی جوش میں آکر جمع ہوئیں، تو میں نے ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آئیں تو آپ ﷺ تم کو طلاق دے دیں گے، تو عنقریب آپ کا پروردگار تم سے اچھی بیویاں آپ کو بدلے میں دے گا، جو مسلمان ہوں گی، تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ﴾ [التحریم ۵]

''اگر پیغمبر تمہیں طلاق دے دیں تو بہت جلد انہیں ان کا رب تمہارے بدلے تم سے بہتر بیویاں عنایت فرمائے گا۔'' [1]

❀ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے: جب عبداللہ بن ابی ابن سلول [منافق] مرگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی گئی۔ آپ نے چلنے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا دامن پکڑ کر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ منافق کی نماز پڑھا رہے ہیں اور دعائے مغفرت فرما رہے ہیں؛ تو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ﴾ [2] [التوبة ۸۴]

''ان منافقوں سے جو بھی مرے کبھی بھی اس کی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر جاؤ۔''

---

[1] صحیح بخاری: ج1: ح393۔

[2] صحیح بخاری: جلد دوم میں پوری روایت اس طرح ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب عبداللہ بن ابی مرگیا تو اس کا بیٹا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ: اپنا کرتہ اس کے کفن کے لئے دیدیجئے آپ نے دے دیا۔ پھر وہ کہنے لگا کہ آپ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا دیجئے آپ نے چلنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ منافق کی نماز پڑھا رہے ہیں اور دعائے مغفرت فرما رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو اس سے منع فرمایا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے مجھ کو اختیار دیا ہے کہ میں ان کیلئے دعائے مغفرت کروں یا نہ کروں؛ اور اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ اگر ان کیلئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کی جائے گی تو بھی میں ان کو نہیں بخشوں گا۔ لہٰذا میں اس کیلئے ستر بار سے زیادہ مغفرت چاہوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا وہ تو منافق ہے آخر آپ نے نماز پڑھادی۔ چنانچہ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: ان منافقوں سے جو بھی مرے اس کی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر جاؤ۔'' [صحیح بخاری: جلد دوم: حدیث نمبر ۱۸۱۳]

اور یہ آیت بھی اسی موقع پر نازل ہوئی:

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ [التوبة ۸۰]

''آپ ان کے لئے دعائے مغفرت کریں یا نہ کریں اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کریں مگر اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔''

❀ حضرت قیس نے طارق بن شہاب سے روایت کیا ہے' وہ فرماتے ہیں: ہم کہا کرتے تھے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر فرشتہ باتیں کرتا ہے۔''

❀ امام مجاہد سے روایت ہے فرماتے ہیں: ''جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی رائے کا اظہار کرتے تو اس کے مطابق قرآن نازل ہو جاتا۔''

❀ صحیحین میں ہے: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگوں کو میرے روبرو پیش کیا جارہا ہے؛ اور ان لوگوں نے قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ بعض لوگوں کی قمیص چھاتی تک آتی تھی اور بعض کی کم و بیش۔ اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجھ پر پیش کیا گیا؛ آپ اپنی قمیص کھینچتے ہوئے جارہے تھے۔ صحابہ نے پوچھا پھر آپ نے اس سے کیا مراد لیا؟ تو فرمایا: ''دین۔'' [البخاری ۹/ ۳۱؛ مسلم ٤/ ۱۸۵۹]

❀ صحیحین میں ہی روایت ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حالت خواب میں مجھے دودھ کا ایک پیالہ پیش کیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا یہاں تک کہ سیری کا اثر میرے ناخنوں میں ظاہر ہونے لگا جو دودھ بچ گیا وہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ پھر آپ نے اس خواب کی کیا تعبیر فرمائی؟ فرمایا: ''دودھ سے علم مراد ہے۔'' ❶

❀ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

''ایک بار میں سویا ہوا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنویں پر دیکھا جس پر ایک ڈول رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے پانی کھینچا جس قدر اللہ نے چاہا۔ پھر ابن ابی قحافہ رضی اللہ عنہ نے اس ڈول کو لے لیا اور اس نے ایک یا دو ڈول کھینچے؛ ان کے کھینچنے میں کمزوری تھی، اللہ ان کو معاف فرمائے۔ پھر وہ ڈول چرخ بن گیا؛ اور اس کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لے لیا۔ میں نے کسی طاقتور آدمی کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرح پانی کھینچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اونٹوں کے پینے کے حوض بھر لئے۔'' ❷

❀ عبداللہ بن احمد کہتے ہیں: ہم سے حسن بن حماد نے بیان کیا؛ ان سے وکیع نے اور ان سے اعمش نے ان سے شقیق نے بیان کیا آپ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں اور کائنات کے سارے لوگوں کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پلڑا بھاری ہو جائے''۔ اعمش کہتے ہیں: مجھے یہ بات بڑی اچھوت محسوس ہوئی۔ میں نے اس کا ذکر ابراہیم سے کیا؛ تو آپ نے فرمایا: پس کیا تم اس بات کا انکار کر رہے ہو؛ میں اس سے بھی افضل بات تمہیں بتاؤں؟ آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ''میں خیال کرتا

❶ صحیح بخاری، حوالہ سابق (حدیث: ۳٦۸۱)، صحیح مسلم ۔ حوالہ سابق، (حدیث: ۳٦۹۱)۔

❷ صحیح بخاری: ج ۳: ح ۱۹۲۱۔

ہوں کہ نو حصے علم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلا گیا۔''

❀ ابن بطہ رحمہ اللہ نے اپنی ثابت شدہ سند سے ابن عیینہ اور حماد بن سلمہ سے عبداللہ بن عمیر کے یہ الفاظ نقل کرتے ہیں: زید بن وہب سے روایت ہے کہ: ایک آدمی کو معقل بن مقرن ابوعمیرہ نے ایک آیت پڑھائی۔ اور عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی ایک آدمی کو ایک آیت پڑھائی۔ ان دونوں آدمیوں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا: ''تو آپ نے ایک سے دریافت کیا تمہیں کس نے یہ آیت پڑھائی ہے؟ اس نے کہا: معقل بن مقرن ابوعمیرہ نے۔ دوسرے سے پوچھا: تمہیں کس نے یہ آیت پڑھائی ہے؟ اس نے کہا: عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رونے لگ گئے یہاں تک آپ کے آنسو بہہ پڑے۔ اور پھر فرمانے لگے: ''ایسے ہی پڑھو جیسے عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے تمہیں پڑھایا ہے۔ بیشک عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ ہم سب سے بڑھ کر قرآن کی تلاوت کرنے والے اور اللہ کے دین کو جاننے والے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلامی قلعہ کی ایک مضبوط دیوار تھے۔ اس قلعہ میں لوگ داخل ہوا کرتے تھے؛ یہاں سے کوئی باہر نہیں نکلتا تھا۔ جب آپ قتل کردیے گئے تو اس دیوار میں ایسی نقب لگ گئی کہ کسی کے لیے اس کو پُر کرنا ممکن نہ رہا۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی راستے پر چلتے تو ہم آپ کی اتباع کرتے؛ اور اسے ایک آسان راستہ پاتے۔ اور جب کبھی اگر صالحین کا تذکرہ کیا جائے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مبارک ہے؛ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مبارک ہے؛ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مبارک ہے۔

❀ عبداللہ بن احمد اپنی سند سے روایت کرتے ہیں کہ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب لوگوں کے مابین کسی مسئلہ میں اختلاف ہوجائے تو پھر دیکھو کہ حضرت عمر نے کیا کیا ہے؛ اس کو لے لو۔''

❀ ابن مہدی نے حماد بن زید رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے' وہ کہتے ہیں: خالد الحذاء رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: ''ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کاربند ہیں' وہ اس سے پہلے کی سنت کی ناسخ ہے۔

❀ ابن بطہ رحمہ اللہ نے اپنی سند سے صالح المرادی سے نقل کیا ہے' وہ عبد خیر سے نقل کرتے ہیں؛ آپ فرماتے ہیں: ''میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ دیکھا؛ آپ نے عصر کی نماز پڑھی؛ اہل نجران نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنائیں۔ جب آپ نے نماز پڑھ لی تو ان میں سے ایک آدمی نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک تحریر نکال کر حضرت کے ہاتھ میں دیدی۔ جب آپ نے وہ تحریر پڑھی تو آپ کے آنسو چھلک پڑے۔ پھر آپ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ان سے مخاطب ہوکر کہنے لگے: ''اے اہل نجران! یا فرمایا: اے میرے دوستو! اللہ کی قسم! یہ میرے ہاتھ کی تحریر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے یہ تحریر لکھوائی تھی۔ وہ لوگ کہنے لگے: اے امیر المؤمنین! اس میں جو کچھ تحریر ہے' وہ ہمیں دیجیے۔ پس میں آپ کے قریب ہوا اور [میں نے اپنے دل میں] کہا: ''اگر آپ عمر رضی اللہ عنہ پر رد کرنے والے ہوں گے؛ تو آج کے دن رد کریں گے۔ آپ فرمانے لگے: ''جو کچھ عمر رضی اللہ عنہ نے تحریر کیا ہے' میں اس میں سے کسی چیز پر بھی رد کرنے والا نہیں ہوں۔ بیشک عمر رضی اللہ عنہ اپنے معاملات میں ہدایت و رشد کے پیکر تھے۔ بیشک عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ آپ کو دیا ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو آپ سے لیا ہے۔ اور جو کچھ آپ سے لیا ہے وہ اس سے بہتر ہے جو آپ کو دیا ہے۔ اور جو کچھ عمر رضی اللہ عنہ نے لیا ہے اس کا ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا؛ اس لیے کہ آپ نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہیں لیا؛ آپ نے جو کچھ لیا وہ

مسلمانوں کی جماعت کے لیے لیا تھا۔''

❀ امام احمد اور امام ترمذی اور دوسرے محدثین رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''لو كان بعدي نبي لكان عمربن الخطاب .''

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ ہوتا۔'' [الحاكم ٣/ ٨٥، والترمذي ح ٣٦٨٦]۔

❀ ایسی ہی روایت ابن بطہ نے بھی نقل کی ہے۔ عقبہ بن مالک الخطمي فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لو كان غيري نبي لكان عمربن الخطاب ۔''

''اگر میرے علاوہ کوئی دوسرا نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہوتا۔''

❀ اور ایک روایت کے الفاظ یہ بھی ہیں: ''اگر مجھے تم لوگوں میں مبعوث نہ کیا جاتا تو پھر عمر بن خطاب کو مبعوث کیا جاتا۔''

❀ عبد اللہ بن احمد رحمہ اللہ اپنی سند سے سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں آپ کہتے ہیں: حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو کافی دن تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تو آپ نے ایک عورت سے بات کی؛ اس عورت کے پیٹ میں شیطان تھا؛ اس نے کہا: اچھا جب میرا شیطان آئے گا تو میں اس سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ [جب شیطان آ گیا اور اس سے پوچھا؛ تو] اس نے کہا: ''میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو ایک چادر میں لپیٹے ہوئے صدقہ کے اونٹوں کو سہلاتے ہوئے دیکھا۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان جب بھی آپ کو دیکھتا تو اپنی گدی کے بل گر جاتا۔ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آگے ایک فرشتہ ہوا کرتا تھا۔ اور جبریل امین آپ کی زبان پر بولا کرتے تھے۔''

❀ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی اجازت طلب کی۔ اس وقت کچھ عورتیں قریش کی (یعنی ازواج مطہرات) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں؛ اور باتیں کرنے میں ان کی آوازیں آپ سے بلند ہو رہی تھیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (آپ سے) اجازت طلب کی اور ان عورتوں نے ان کی آواز سنی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور پردہ میں ہو گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجازت دی۔ چنانچہ وہ اندر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا:

''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کے دانتوں کو ہمیشہ ہنسائے؛ آپ اس وقت کیوں مسکرا رہے ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان عورتوں کی حالت پر مجھ کو تعجب ہے (میرے پاس بیٹھی ہوئی شور مچا رہی تھیں)۔ تمہاری آواز سنتے ہی پردہ میں چلی گئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ وہ آپ سے ڈریں۔

پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان عورتوں کو مخاطب کر کے کہا: ''اے اپنی جان کی دشمن عورتو! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں؟

انہوں نے کہا: ہاں؛ تم سے اس لئے ڈرتی ہیں کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ نسبت عادت کے سخت اور سخت گو ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: ''اے خطاب کے بیٹے! کوئی اور بات کرو ان کو

چھوڑ دو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے!'' جب تم سے شیطان کسی راستہ میں چلتے ہوئے ملتا ہے تو وہ تمہارے راستہ کو چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلنے لگتا ہے۔'' [صحیح بخاری:ح۸۹۷]

❀ ایک دوسری حدیث میں ہے: ''شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آہٹ پا کر بھاگ جاتا ہے۔''

❀ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی سند سے امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں:[وہ کہتے ہیں:] ہم کہا کرتے تھے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امارت کے دور میں شیاطین باندھ دیے گئے تھے جب آپ قتل کر دیے گئے تو شیاطین چھلانگیں لگاتے پھرتے ہیں۔''

یہ باب بہت طویل ہے۔ اس لیے علماء کرام نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کرنے کے لیے کئی کئی مجلد کتابیں لکھی ہیں۔ جیسے ابن جوزی اور عمر بن شبہ اور دوسرے علماء کرام۔ اور امام احمد بن حنبل اور دیگر ائمہ اہل علم رحمہم اللہ۔ اور جیسے کہ خیثمہ بن سلیمان کی تالیف: فضائل الصحابہ؛ امام دارقطنی اور بیہقی وغیرہ کی تصنیفات۔

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیاست و بصیرت اور حکمت]:

❀ قضاء کے معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف خط بڑا مشہور ہے۔ یہ خط علماء کرام رحمہم اللہ کے ہاں بڑا متداول ہے۔ اسے بنیاد بنا کر انہوں نے فقہ اور اصول فقہ کے علوم کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اس کی اسناد میں سے ایک ابن بطہ اور ابو عبید کی سند بھی ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس خط کی کئی اسناد ثابت ہیں جیسے کثیر بن ہشام کی سند؛ جعفر بن برقان سے؛ آپ فرماتے ہیں: حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا تھا:[اس میں ہے]:

اما بعد:......! قضاء [عدلیہ کا کام] ایک محکم فریضہ اور سنت متبع ہے۔ جب تمہارے سامنے کوئی معاملہ پیش کیا جائے تو پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ اس لیے کہ حق کی بات کرنا تمہیں اس وقت تک نفع نہیں پہنچائے گی جب تک حق کو نافذ نہ کر دیا جائے۔ اپنی مجلس میں اور اپنے سامنے اور اپنے فیصلہ کرنے میں لوگوں کے مابین مساوات قائم کرو۔ یہاں تک کہ کوئی بڑا آدمی تمہارے متعلق کوئی طمع نہ کرنے لگے؛ اور کمزور تیرے عدل سے مایوس نہ ہو۔ گواہی دعوی کرنے والے پر ہے اور قسم منکر پر ہے۔ مسلمانوں کے مابین صلح کرانا جائز ہے۔ سوائے اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال کیا جائے یا کسی حلال کو حرام کیا جائے۔ اور جو کوئی کسی غائب حق کا دعوی کرے؛ تو اسے اس حق تک پہنچنے کی مدت تک مہلت دو۔ اور اگر کوئی گواہی لیکر آئے تو اسے اس کا حق دیدو۔ اگر وہ اس سے عاجز آ جائے تو اس کے حق میں فیصلہ دیدو۔ بیشک ایسا کرنا عذر میں زیادہ بلیغ ہے؛ اور اندھے پن کو دور کرنے والا ہے۔''

کسی معاملہ میں اگر آج تم کوئی فیصلہ کرلو؛ اور پھر تمہیں پتہ چلے کہ حق کچھ اور ہے؛ تو تمہیں حق کی طرف رجوع کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔ بیشک حق قدیم ہے؛ اسے کوئی چیز ختم نہیں کرسکتی۔ حق کی طرف رجوع کر لینا باطل میں سرکشی کرنے سے بہتر ہے۔ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ عدل کرنے والے ہیں۔ سوائے اس انسان کے جس کے جھوٹ بولنے کا تمہیں تجربہ ہو چکا ہو۔ یا جسے کسی کو حد میں کوڑے لگے ہوں؛ یا جو اپنی ولاء یا نسب پر اترانے والا ہو۔

بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے اسراروں کا کارساز ہے۔ حدود کے معاملہ میں ان پر پردہ رکھا جائے سوائے اس کے کہ ان پر گواہی پیش کی جائے یا پھر وہ قسم اٹھالیں۔ پھر جو مسائل آپ کے ساتھ پیش آئیں' یا پھر آپ کے پاس معاملات لائے جائیں اور ان کا حل کتاب وسنت میں موجود نہ ہو تو انہیں اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے اور خوب سمجھنا چاہیے؛ اور پھر انہیں باقی امور سے قیاس کر لینا چاہیے۔ اور ان کے اشباہ وامثال کی معرفت بھی حاصل کرنی چاہیے۔ پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو حق کے زیادہ مشابہ ہو؛ اور ایسا کرنا جو اللہ کے ہاں زیادہ پسندیدہ ہو۔

خبردار اور خبردار! غصہ نہ کرنا' پریشان بھی نہ ہونا؛ کسی کو ڈانٹنا بھی نہیں' اور نہ ہی فریقین میں سے کسی کو کوئی تکلیف دینا۔ اس لیے کہ حق کے ساتھ فیصلہ کرنے سے انسان کے لیے اجر واجب ہو جاتا ہے۔ اور اسے اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔ جس انسان کی نیت حق کے لیے خالص ہوگی؛ بھلے اس کی ذات پر ہی بات کیوں نہ آتی ہو؛ اللہ تعالیٰ اس کے لیے لوگوں کی جانب سے کافی ہو جاتے ہیں۔ جو ایسی زینت اختیار کرے جو کہ اس میں نہیں ہے؛ اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کر دے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو صرف اس کی رضا کے لیے خالص ہو۔ پھر اللہ کے ہاں اس ثواب کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جو اس کے جلدی ملنے والے رزق میں بھی ہے اور اس کی رحمتوں کے خزانوں میں بھی۔"

❀ ابن بطہ رحمہ اللہ نے اپنی سند سے شعبی سے نقل کیا ہے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں: انہوں نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوم عرفہ میں خطبہ دیا۔ یہ وہ دن تھا جس دن آپ کی بیعت کی گئی۔ آپ نے فرمایا:

"تمام تر تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے مجھے آپ سے آزمایا؛ اور آپ سے مجھے آزمایا۔ اور مجھے میرے ساتھی کے بعد تم میں باقی چھوڑا۔ جو کوئی تم میں سے موجود ہو؛ اس سے ہم براہ راست بات کریں گے۔ اور جو کوئی ہم سے غائب ہو؛ اس کے لیے ہم طاقتور لوگوں کو عمال مقرر کریں گے۔ اگر وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو ہم اس کی نسبت زیادہ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اگر وہ ہم سے برائی کا سلوک کریگا تو ہم اس کے ساتھ مناظرہ کریں گے۔

اے لوگو! بیشک حکمرانوں کا تم پر حق ہے۔ اور حکمرانوں پر تمہارا حق ہے۔ جان لو کہ! حاکم کے حلم و بردباری اور عدل سے بڑھ کسی کا حلم و بردباری اللہ کے ہاں زیادہ محبوب اور نفع بخش نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حاکم کی جہالت اور بد اخلاقی سے بڑھ کر کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں ہے۔ اور بیشک جو انسان اپنی قدرت اور اختیار سے عافیت کو اپناتا ہے' اللہ تعالیٰ اسے اس کی طاقت و اسباب سے بالاتر عافیت عطا فرمائیں گے۔

❀ میں کہتا ہوں: احنف بن قیس کی روایت میں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب انسان اپنے ماتحت کے لیے عافیت کی تلاش میں رہتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے اوپر والوں سے عافیت ہی پہنچاتے ہیں۔

❀ وکیع نے ثوری سے روایت کیا ہے' وہ حبیب ابن ثابت سے نقل کرتے ہیں' وہ یحیٰ بن جعدہ سے؛ وہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تین باتیں نہ ہوتی تو مجھے یہ بات پسند تھی کہ میں اللہ کے پاس پہنچ گیا ہوتا:

۱۔ یہ کہ اگر میں اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نہ چلتا۔

۲۔ اور یہ کہ میں اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اپنی پیشانی کو مٹی میں نہ رکھ دیا کرتا۔

۳۔ اور ایسے لوگوں کی مجلس میں نہ بیٹھا کرتا جو عمدہ کلام کو ایسے چنتے ہیں جیسے عمدہ پھل کو چنا جاتا ہے۔

❀ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کلام جامع ترین اور کامل ترین کلام میں سے ہے۔اس لیے کہ آپ ملہم اور محدَّث ہیں۔آپ کے کلام کے ہر ایک جملے میں بہت سارے علم کے ذخیرہ کو بند کر دیا گیا ہے۔اس کی مثال مذکوہ بالا تین جملوں کو ہی لیجیے۔ان تین جملوں میں آپ نے نماز' جہاد اور علم کا ذکر کیا ہے۔امت کا اجماع ہے کہ یہ تینوں اعمال سب سے افضل ترین اعمال میں سے ہیں۔امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انسان کے نفلی اعمال میں سے افضل ترین عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نفلی اعمال میں سے افضل عمل نماز قائم کرنا ہے۔امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نفلی اعمال میں سے افضل: علم حاصل کرنا ہے۔

❀ حقیقت تو یہ ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک عمل کے لیے دوسرے دو اعمال کا ہونا بہت ضروری ہے۔اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ بعض احوال میں ایک عمل افضل ہو؛ اور بعض احوال میں دوسرا عمل افضل ہو۔جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین ان تینوں پر عمل کیا کرتے تھے۔ان میں سے ہر ایک عمل کے لیے اس کا خاص مقام ضرورت اور مصلحت ہے۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان تینوں چیزوں کو ایک پیرائے میں بند کر کے بیان کر دیا ہے۔

❀ امام زہری نے عبید اللہ بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں: آپ فرماتے ہیں: مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے ابن عباس! اللہ کی قسم! اس حکومت کے نظام کو چلانے کے لیے ایسے قوی انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو سختی نہ کرے؛ اور ایسے نرم دل کی ضرورت ہوتی ہے جو کمزوری نہ دیکھائے۔ایسا سخی ہو جو فضول خرچی نہ کرے' اور مال کو ایسے روک کر رکھنے والا ہو کہ اس میں بخل بھی نہ ہو۔''

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں کسی انسان کو نہیں جانتا جو عمر کے علاوہ ان صفات کا حامل ہو۔

❀ صالح بن کیسان نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے وہ سالم سے اور وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں: جب آپ کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا جاتا تو آپ فرماتے؛ اللہ کے لیے ہی عمر رضی اللہ عنہ کی بھلائی ہے۔آپ بہت کم ہی کسی چیز کا خوف سے ذکر کرتے مگر وہ حق ہوتی۔

فصل:

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر زیادہ مہر سے روکنے کا الزام]

[اعتراض]: شیعہ کا قول ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے کہا: جو شخص کسی عورت کا زیادہ مہر مقرر کرے گا تو میں مہر کی رقم بیت المال میں داخل کر دوں گا۔ایک عورت نے کھڑے ہو کر کہا: جو چیز اللہ نے ہمیں اپنی کتاب عزیز میں عطا کی ہے، آپ اس سے کیوں منع کر رہے ہیں؟ ارشاد باری ہے: ﴿وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا﴾ عمر نے یہ سن کر کہا ''ہر شخص عمر سے بڑا فقیہ ہے۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کمال فضل؛ دینداری اور تقویٰ کی دلیل ہے کہ جب حق آپ پر واضح ہو گیا تو آپ نے فی الفور کتاب عزیز کی طرف رجوع کیا اور ایک عورت کے قول سے بھی انحراف نہ کیا، اس کے لیے بھی

تواضع اختیار کی۔اور آپ کسی ایک مسئلہ میں بھی کسی ادنیٰ انسان کی فضیلت کے بھی قائل تھے۔ افضل کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مفضول اسے کسی بات پر بھی متنبہ نہ کر سکے۔ ہد ہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا۔

﴿ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ ﴾ (النمل: ۲۲)

''مجھے وہ باتیں معلوم ہیں جو آپ نہیں جانتے؛ اور میں آپ کے پاس ملک سباء ایک سچی خبر لے کر آیا ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام خضر کے پاس علم حاصل کرنے کی غرض سے گئے تھے؛ اور ان سے کہا تھا:

﴿ هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴾ [الکھف ۶۶]

''کیا میں آپ کی تابعداری کروں؟ کہ آپ مجھے وہ نیک علم کو سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔''

حالانکہ خضر کا مرتبہ آپ سے فروتر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور خضر کے مابین جو فرق ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے اشباہ و امثال صحابہ کے مابین فرق سے بہت زیادہ ہے۔ حضرت خضر کے وہ علوم جن کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے پاس جانا پڑا؛ وہ ان علوم کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام کے قریب بھی نہ تھے مبادا کہ آپ سے افضل ہوتے۔ بلکہ آپ کے متبعین انبیاء جیسے حضرت ہارون' حضرت یوشع اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام سے بھی افضل نہ تھے۔ جب کہ موسیٰ علیہ السلام خضر سے افضل تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی تھی وہ ایک فاضل مجتہد کہہ سکتا ہے۔ اس لیے کہ مہر میں اللہ کا بھی حق ہے اور یہ سودا بازی کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ مال کو مباح کرنے سے وہ مباح ہو جاتا ہے۔ اور اسے بلا عوض خرچ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ جبکہ شرمگاہ مباح سمجھنے سے مباح نہیں ہو جاتی۔ اور انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی لوگوں کا بغیر مہر کے نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ بغیر مہر کے نکاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ لیکن مہر کی مقدار مقرر کیے بغیر عقد نکاح ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مہر مثل لازم آتا ہے۔ [یعنی جتنا مہر اس عورت کی خاندانی خواتین کا ہوا اتنا مہر اسکا بھی ادا کیا جائے گا]۔

اگر شوہر بیوی کا مہر ادا کرنے سے پہلے مر جائے؛ تو اس صورت میں صحابہ اور فقہاء کے دو قول ہیں:

پہلا قول: اس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے متبعین کا مذہب ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک قول میں اسے ہی اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول: اس پر مہر مثل واجب ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے۔ یہی قول حضرت امام ابوحنیفہ' امام احمد اور دوسرے قول میں امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارے میں مہر مثل کا فیصلہ کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی خلاف نص نہیں ہے۔ آپ اس انسان سے بہت بہتر ہیں جس کا قول نصوص کے خلاف ہو۔ جب مہر میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی پایا جاتا ہے تو اس کے لیے ممکن ہے کہ کوئی شرعی حد مقرر کی جائے۔ جیسے زکاۃ اور فدیہ وغیرہ کی حد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مہر کی سب سے کم مقدار چوری کا نصاب ہے۔ اگر یہ جائز ہے کہ کم سے کم مہر کی مقدار مقرر کی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی مقدار مقرر کی جائے۔

خلاصہ کلام ! اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد کو نافذ بھی کر دیتے تو یہ اجتہاد ان دوسرے بہت سارے اجتہادات سے

کمزور نہ ہوتا جنہیں دوسرے لوگوں نے نافذ کیا ہے۔تو پھر آپ کے لیے یہ اجتہاد نافذ کرنا کیسے جائز نہ ہوتا؟

باقی رہ گیا معاملہ اس آیت کی تفسیر کا؛ ارشاد باری ہے: ﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾ اگر تم نے ان میں سے کسی ایک کو خزانہ بھی دیدیا ہو[تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو]۔

بہت سارے لوگ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو کہ خود اس آیت سے واضح ہوتی ہے کہ ایسا مبالغہ کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:'' جاؤ تلاش کرو اگر چہ تمہیں لوہے کی ایک انگوٹھی ہی مل جائے۔''

آپ ﷺ نے یہ جملہ مبالغہ کے طور پر ارشاد فرمایا تھا۔اگر مہر کی کم سے کم مقدار مقرر کرنے والے اس کی یہ تاویل کر سکتے ہیں تو پھر زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کرنے والوں کی تأویل بھی بجا ہے۔

پس اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باقی لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی تائید و نصرت اور ہدایت سے نوازا تھا۔ اور آپ کے ضعیف اقوال جن سے آپ نے رجوع بھی کرلیا تھا؛ اور ان پر مصر نہیں رہے تھے؛ وہ ان لوگوں کے ضعیف اقوال سے بہت بہتر ہیں جنہوں نے اپنے اقوال سے رجوع نہیں کیا۔مزید برآں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطاؤں کو معاف کر دیا ہے اگر چہ کوئی ان سے رجوع نہ بھی کرے۔

تو پھر ان کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جنہوں نے اپنی غلطی سے رجوع بھی کرلیا تھا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اس امت کے سب سے بڑے فقیہ؛ دین کے سب سے زیادہ جاننے والے اور دیندار تھے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:'' صحابہ کرام ہر علم ؛ فقہ؛ دین داری اور امر ہدایت میں ہم پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ہدایت اور علم کے حصول کا سبب موجود ہے۔ہمارے بارے میں ان کی رائے ہمارے اپنی ذات کے بارے میں رائے سے بہت بہتر ہوتی ہے۔''

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:'' ہمارے ہاں عقیدہ کی بنیاد یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے۔''

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول کتنا ہی خوبصورت ہے؛ آپ فرماتے ہیں:

'' اے لوگو! تم میں سے جو کوئی سنت اختیار کرنا چاہتا ہو اُسے چاہیے کہ ان لوگوں کی راہ پر چلے جو وفات پا چکے ہیں۔اس لیۓ کہ زندہ کو فتنہ سے محفوظ نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ محمد ﷺ کے صحابہ ہیں۔ جو تمام امت سے افضل لوگ ہیں۔ان کے دل سب سے نیک تھے۔ان کا علم سب سے پختہ اور گہرا تھا؛ اور تکلف بالکل نہیں کرتے تھے۔وہ ایسے لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اس کے دین کی اقامت کے لیے چن لیا تھا۔ان کی فضیلت کو پہچانو؛ اور ان کے آثار کی پیروی کرو۔اور اگر تم استطاعت رکھو تو ان کے اخلاق اور دین کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ بیشک وہ لوگ صراط مستقیم پر قائم تھے۔''

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

'' اے قراء کی جماعت! استقامت کے ساتھ رہو اور ان لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔اللہ کی قسم! اگر تم استقامت پر رہو گے تو بہت ہی آگے نکل جاؤ گے۔اور اگر تم دائیں بائیں چلنے لگو گے تو تم بہت دور کی گمراہیوں میں

جا گرو گے۔''

فصل:

[شراب کی حد اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت قدامہ رضی اللہ عنہ پر شراب کی حد نہیں لگائی تھی کیوں کہ اس نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا﴾ [المائدہ ۹۳]

''ایسے لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جب کہ وہ لوگ تقوی رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ سن کے کہا کہ'' آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے قدامہ رضی اللہ عنہ ان میں شمار نہیں ہوتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہ تھا کہ کیا حد لگائیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ:'' قدامہ رضی اللہ عنہ کو اسی چابک لگائیں۔ اس لیے کہ شراب پینے والا شراب پی لیتا ہے تو اس پر نشہ طاری ہوتا ہے' اور جب نشہ طاری ہوتا ہے تو وہ ہذیان بکتا ہے؛ اور جب ہذیان بکتا ہے تو جھوٹی تہمتیں لگاتا ہے۔'' [انتھیٰ کلام الرافضی]

[جواب]: یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک صاف کھلا ہوا صریح جھوٹ ہے۔ کیونکہ شراب نوشی کی حد کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ بارہا آپ کو اس کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی ایسے واقعات پیش آچکے تھے۔ کیونکہ اس سے پہلے کبھی چالیس چابک بھی مارا کرتے تھے اور کبھی اسی چابک۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی بطور تعزیر یہ سزا بھی دیا کرتے تھے کہ سر منڈوا کر اسے شہر سے نکال دیتے۔ اور کبھی صرف چھڑی سے مارا کرتے؛ کبھی جوتے سے؛ اور کبھی تھپڑ اور مکے پر کام چل جاتا اور کبھی کپڑے کے کونے سے مارا کرتے۔

ذکر کردہ حضرت قدامہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی تفصیل بروایت ابو اسحاق جوز جانی از ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ ہے کہ:'' قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ نے شراب پی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا'' تمہیں کس چیز نے شراب نوشی پر آمادہ کیا۔''

قدامہ رضی اللہ عنہ نے ذکر کردہ یہ آیت تلاوت کی:

﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّآمَنُوْا﴾

''ایسے لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جب کہ وہ لوگ تقوی رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں۔''

اور کہا کہ میں مہاجرین اولین میں سے ہوں؛ اہل بدر و احد میں سے ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:'' لوگو! اسے جواب دو۔'' سب صحابہ خاموش رہے۔ پھر آپ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو جواب دینے کا حکم دیا: تو آپ نے فرمایا:'' یہ آیت ان لوگوں کو معذور قرار دینے کے لیے نازل ہوئی جو شراب کی حرمت سے قبل شراب نوشی کے مرتکب ہو چکے تھے۔'' اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی ہے:

﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ ﴾ [المائدہ ۹۰]

''بیشک شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں ان سے بالکل الگ رہو۔''
اب یہ آیت لوگوں پر حجت ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی کی حد کے بارے میں پوچھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
''جب کوئی شخص شراب پیئے گا تو بے ہودہ بکے گا اور جب بے ہودہ بکے گا تو جھوٹ بولے گا، آپ قدامہ کو اسی درّے لگائیں۔'' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تعمیل کر دی۔

اس روایت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی درّے لگانے کا مشورہ دیا۔ مگر یہ بات محل نظر ہے۔

روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو چالیس درے لگائے تھے۔ اور آپ نے اسی درّے کی روایت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کیا تھا۔ [1] صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اسی درّے لگانے کا مشورہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ [2] اور یہ حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اخذ نہیں کیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اسی کوڑے لگائے تھے۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ کبھی چالیس درے لگائے جاتے تھے اور کبھی اسی درے۔ ہم قبل ازیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے: ''اگر کسی شخص پر حد لگائی جائے اور وہ مر جائے تو مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں البتہ اگر شراب پینے والا حد لگانے سے مر جائے تو میں اس کی دیت ادا کروں گا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے یہ حد مقرر نہیں فرمائی تھی۔ [یہ حد ہم نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے]۔''

یہ بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کی؛ اور نہ ہی فقہاء میں سے کسی ایک نے چالیس سے کم کا کہا ہے۔ اور یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام کو اجماع کی مخالفت پر محمول کیا جائے۔

فصل:

[فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر اجتہادی غلطیوں کا الزام]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حاملہ عورت کو بلا بھیجا تو خوف کے مارے اس کا حمل ساقط ہو گیا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: ''ہمارا خیال ہے کہ آپ صرف تأدیب کرنا چاہتے تھے لہٰذا آپ پر دیت وغیرہ نہیں آئے گی۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''اس کے ورثاء پر دیت کا ادا کرنا واجب ہے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ: ''یہ مسئلہ ان اختلافی و اجتہادی مسائل میں سے ہے جن میں علماء کرام کا اختلاف موجود ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کبار صحابہ مثلاً: حضرت عثمان، علی، ابن مسعود، زید بن ثابت؛ حتی کہ ابن عباس وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ یہ آپ کے کمال علم و فضل؛ عقل اور دینداری کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی رائے سب سے زیادہ درست ہوا کرتی تھی۔ کبھی آپ کسی ایک کی رائے کو راجح قرار دیتے تو کبھی کسی دوسرے کی رائے کو۔ ایک عورت کو بارگاہ فاروقی میں لایا گیا جس نے زنا کا اقرار کیا تھا۔ تمام لوگوں نے اس کو رجم کرنے پر اتفاق کر لیا؛ مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش بیٹھے رہے۔ آپ سے پوچھا گیا: آپ خاموش کیوں ہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود۔ باب حد الخمر (حدیث:۳۸/ ۱۷۰۷)۔
[2] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الخمر (حدیث:۱۷۰۶)۔

''میرا خیال ہے کہ یہ عورت اس کو جائز سمجھ رہی ہے اور زنا کی حرمت سے آگاہ نہیں ہے۔''
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر رجوع کرلیا اور اس عورت پر حد قائم نہ کی۔ معنی یہ ہے کہ وہ عورت اس کا کھل کر اظہار کرتی تھی؛ اور اسے مباح سمجھتی تھی؛ جیسے کوئی انسان کسی ایسی چیز کا اظہار کرتا ہے جسے وہ برا نہ سمجھتا ہو۔ جیسا کہ کھانا پینا شادی کرنا وغیرہ۔ جب وہ اس کا برا نہیں سمجھ رہی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ زنا کے حرام ہونے کے حکم سے جاہل ہے۔ اس لیے کہ حد صرف ان لوگوں پر قائم کرنا واجب ہوتی ہے جنہیں اس فعل کے حرام ہونے کا علم ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ (الاسراء ۱۵)

''اور ہم اس وقت تک عذاب دینے والے نہیں جب تک رسول کو مبعوث نہ کر دیں۔''
نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء ۱۶۵]۔
''تا کہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالی پر رہ نہ جائے۔''
یہاں پر یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور جو کوئی آپ کے سامنے حق بیان کرتا آپ اسے قبول کرتے تھے۔ اس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: آپ کے لیے اس معین واقعہ میں مناط الحکم واضح ہو جاتا؛ جسے وہ جانتے ہوتے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب فرمایا کہ: ''یہ زنا کے حرام ہونے کے حکم سے جاہل ہے۔'' یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عام حکم نہیں بیان کیا۔ بلکہ اس متعین قضیہ کے بارے میں انہیں بتایا کہ یہ عورت اس حکم کی اہل نہیں۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول کہ: یہ مجنون ہے۔ اس کا شمار بھی ایسے ہی قضایا میں ہوتا ہے۔ تو آپ نے اس کے مجنون ہونے کے بارے میں یا جاہل ہونے کے بارے میں خبر دی۔

دوسری وجہ: آپ کے لیے نص واضح ہو جاتی؛ یا نص کا عام حکم واضح ہو جاتا۔ جیسا کہ اس عورت نے آپ کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق آگاہ کیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ [النساء ۲۰]

''اور ان میں کسی کو تم نے خزانے کا خزانہ دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔''
یہ ایسے ہی ہے جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے شراب پینے والے کی حد کو بہتان لگانے والے کی حد پر قیاس کیا تھا۔

فصل:

[بچے کے بارے میں دو عورتوں کا جھگڑا]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''دو عورتیں ایک بچے کے بارے میں جھگڑتی ہوئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں، اور وہ ان کا فیصلہ نہ کر سکے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دونوں عورتوں کو بلا کر سمجھایا، مگر وہ باز نہ آئیں۔ آپ نے فرمایا: ''آری لاؤ۔'' ان میں سے ایک عورت نے پوچھا: ''آری سے کیا کرو گے''؟ فرمایا: تا کہ میں بچے کو چیر کر آدھا آدھا تقسیم کر دوں؛ اور ہر ایک آدھا آدھا بچہ لے لے۔ اس پر ایک عورت راضی ہوگئی۔ جب کہ دوسری عورت بولی: ابوالحسن! آپ کو اللہ کا واسطہ ہے ایسا نہ کیجیے۔ اگر ایسا کرنا ہی ضروری ہے تو یہ بچہ اسی عورت کو دے دیجیے۔ حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر! یہ تیرا ہی بیٹا ہے، اگر اس کا بیٹا ہوتا تو اس کو بچے پر رحم آتا۔ تو پہلی عورت نے اعتراف کرلیا کہ حق دوسری کے ساتھ ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حیران ہوگئے اور امیر المؤمنین کو دعائیں دینے لگے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں: اس قصہ کی نہ ہی اس نے کوئی سند ذکر کی ہے' اور نہ ہی اس کی صحت کا کوئی علم ہے۔ اور کسی بھی اہل علم نے ہمارے علم کے مطابق یہ قصہ ذکر نہیں کیا۔ اگر اس قصہ کی کوئی حقیقت ہوتی تو اسے ضرور ذکر کرتے۔ یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے متعلق نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ:

''دو عورتیں تھیں ان کے ساتھ دونوں کے بچے تھے کہ ایک بھیڑیا آیا اور ایک کے بچہ کو لے گیا۔ ایک عورت نے کہا بھیڑیا تیرے بیٹے کو لے گیا ہے دوسری نے کہا نہیں تیرے کو لے گیا ہے۔ ان دونوں نے داؤد علیہ السلام کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ انہوں نے بڑی عورت کے حق میں اس بچہ کا فیصلہ کر دیا۔ پھر دونوں وہاں سے نکل کر سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے پاس آئیں اور یہ واقعہ انہیں بتایا۔ تو سلیمان نے کہا کہ ایک چھری لاؤ میں اس بچہ کے دو ٹکرے کر کے دونوں میں تقسیم کر دوں گا۔ چھوٹی عورت نے کہا کہ: ایسا نہ کیجئے اللہ آپ کا بھلا کرے یہ اسی کا بیٹا سہی۔ پس سلیمان علیہ السلام نے بچہ چھوٹی کو دلوا دیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: اللہ کی قسم میں نے سکین کا لفظ اسی دن سنا ورنہ ہم تو (چھری) کو مدیہ کہتے تھے۔''[1]

یہ واقعہ بعض دوسرے صحابہ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی سن رکھا تھا جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سنا ہوا تھا۔ یا پھر انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی سن لیا تھا۔ اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جیسی سمجھ حضرت سلیمان علیہ السلام کو عطا کی، اور اس جیسی سمجھ حضرت داؤد علیہ السلام نہ سمجھ سکے۔

قرآن کریم میں [اس قسم کا ایک دوسرا قصہ نقل کرتے ہوئے] ارشاد ہوا ہے:

﴿اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ﴾ (الانبیاء: ۷۸)

''یاد کیجئے جبکہ وہ کھیت کے معاملہ میں فیصلہ کر رہے تھے کہ کچھ لوگوں کی بکریاں رات کو اس میں چر گئی تھیں۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی کہ انھیں ایسی حکومت عطا کی جائے جو اس کی حکومت سے ملتی جلتی ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام سے افضل ہوں، خصوصاً احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سب انسانوں سے بڑھ کر عابد تھے۔[2]

فصل:

[غیر شادی شدہ حامل کا حکم رجم]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، جس کے ہاں نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت کو مخاطب کر کے کہا اگر یہ عورت کتاب باری تعالیٰ کے مطابق آپ

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب اذا دعت المرأۃ ابنا، (ح:٦٧٦٩)، صحیح مسلم، کتاب الاقضیۃ، باب اختلاف المجتہدین، (ح:١٧٢٠)۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النہی عن صوم الدہر لمن تضرر بہ، حدیث: ١٨٢/ ١١٥٩) مطولاً۔

سے جھگڑے گی تو آپ پر غلبہ حاصل کر لے گی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ (الاحقاف:۱۵)

''اس کے حمل کا اور اس کے دودھ چھڑانے کا زمانہ تیس مہینے ہے۔''

نیز فرمایا: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (البقرۃ:۲۳۳)

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں جو رضاعت کی مدت کو پورا کرنا چاہتے ہوں۔''

[ایک آیت میں حمل و فصال کی مدت دو سال چھ ماہ بتائی، دوسری میں ذکر کیا کہ مدت رضاعت دو سال ہے، تو اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استدلال کیا کہ کم از کم مدت حمل چھ ماہ بھی ہو سکتی ہے]۔''

[جواب]: ہم کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ کبھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیا کرتے تھے تاکہ حق تک رسائی ہو جائے۔ کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ لیتے تو کبھی عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے؛ اور کبھی کسی دوسرے صحابی سے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی مدح کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾

''وہ اپنے کام باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں۔''

یہ مسئلہ متنازع فیہا ہے کہ جب ایک عورت حاملہ ہو اور اس کا خاوند ہو نہ آقا اور نہ ہی اس کا یہ دعویٰ ہو کہ کسی نے شبہ کی بنا پر غلطی سے اس کے ساتھ مجامعت کر لی ہے؛ تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ کیا اسے رجم کیا جائے گا......؟

امام مالک رحمہ اللہ اور اہل مدینہ اور سلف کا مذہب یہ ہے کہ: ''اسے رجم کیا جائے گا۔''

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول دو روایات میں سے ایک قول یہی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اسے رجم نہ کیا جائے۔''

امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دوسری روایت میں یہی منقول ہے۔ کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے ساتھ جبر کیا گیا ہو؛ یا کسی نے شبہ میں وطی کر دی ہو۔ یا اسے بلا مجامعت حمل ٹھہر گیا ہو۔ پہلا قول خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مسلک یہ ہے کہ اسے سنگسار کیا جائے۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی زندگی کے آخری دور میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''مردوں اور عورتوں میں سے جو بھی زنا کرے؛ زانی کو رجم کرنا حق ہے، بشرطیکہ گواہ موجود ہوں یا استقرار حمل ہو جائے، یا وہ شخص بذات خود زنا کا اعتراف کر لے۔''[1] ایسے ہی یہ معاملہ بھی تھا۔

ایک شرابی جب قے کر رہا ہو یا اس سے شراب کی بو محسوس ہو تو اس کے بارے میں بھی دو اقوال میں اختلاف ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام یعنی خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین سے معروف ہے کہ آپ قے کرنے اور بو محسوس کرنے کی وجہ سے حد لگایا کرتے تھے۔ اس بارے میں اگر کوئی گواہی دیتا کہ فلاں نے قے کی ہے؛ تو یہ بالکل اسی طرح ہوتا جیسے اس نے شراب پینے کی گواہی دی ہو۔ اس میں دور کے احتمالات بھی گواہ کی غلطی اور جھوٹ کے احتمالات کی طرح ہیں۔ یا پھر جیسے کسی کے خود اقرار کرنے میں غلطی یا جھوٹ کا احتمال ہوتا ہے۔ اور یہ دلائل ایسے ظاہر ہیں کہ ان سے اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الاعتراف بالزنا، (حدیث:۶۸۲۹)، صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الثیب فی الزنی (حدیث:۱۶۹۱)۔

جو کہ کئی گواہیوں اور اقرار سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ زنا پر گواہی کی وجہ سے بہت ہی کم حد قائم ہوتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ [کبھی اور کہیں] گواہی کی وجہ سے زنا کی حد قائم ہوئی ہو۔ بلکہ یہ حد یا تو اقرار کی وجہ سے نافذ کی جاتی ہے یا پھر حمل ظاہر ہونے کی وجہ سے۔لیکن ایسے مواقع پر حد سے کم درجہ کی سزا دی جائے گی۔مثال کے طور پر جب کسی جوڑے کو لحاف میں لپٹے ہوئے دیکھا جائے؛ یا اس طرح کی کسی دیگر قابل اعتراض حالت میں؛[تو انہیں تعزیر کے لیے کوئی سزا دی جائے]۔

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین یہ معروف تھا کہ حمل واضح ہونے پر حد قائم کی جاتی ہے؛ تو اگر عورت چھ ماہ سے پہلے بچہ جن لے تو اس پر بھی حد قائم ہوسکتی ہے۔نکاح کے چھ ماہ بعد بہت ہی شاذ و نادر حالت میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔اور نادر قسم کے امور کبھی انسان کے ذہن سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسے عورتوں کی عام عادت کے مطابق سمجھا ہوگا۔جس طرح عورتوں کی عام طبیعت ہوتی ہے کہ نو ماہ کے بعد بچہ جنم دے دیتی ہیں۔بعض اوقات بہت ہی کم یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی عورت کو دو سال تک حمل رہا؛ اور نادر طور پر چار سال تک بھی حمل رہا ہے۔اور ایسی عورت کے متعلق بھی اطلاع ملی ہے جسے سات سال تک حمل رہا۔[علماء کا اختلاف ہے کہ] جب عورت مرد سے جدا ہونے کے اتنے عرصہ بعد بچہ جنم دے تو کیا اس کا نسب اس آدمی سے ملایا جائے گا یا نہیں؟ یہ اختلاف بڑا معروف ہے۔اس کا شمار اجتہادی مسائل میں ہوتا ہے۔

بہت سارے ایسے علماء بھی ہیں جو حمل کی انتہائی آخری حد نادر ترین مدت کو مقرر کرتے ہیں۔اور کوئی دو سال حد مقرر کرتا ہے اور کوئی چار سال؛ اور کوئی سات سال۔اور بعض کہتے ہیں: یہ نادر معاملات ہیں؛ ان کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں کی جائے گی۔اور جب عورت مرد سے جدا ہونے کے بعد خلاف عادت بچے کو جنم دے؛ اور ایسے آثار بھی ہوں کہ یہ بچہ کسی دوسرے کا ہے تو پھر اس کا نسب اس کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا۔

فصل:

دادا کی میراث اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[اعتراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے، چنانچہ دادا کے بارے میں آپ نے سو مختلف و متضاد فیصلے کیے۔''

[جواب]:جدّ (دادا) کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ دیگر صحابہ کی نسبت اقرب الی الحق ہے۔ جب میت کا دادا بھی زندہ ہو اور بھائی بھی موجود ہوں تو اس کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے دو قول ہیں:

ا۔ پہلا قول یہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں بھائیوں کو ورثہ نہیں ملے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور بہت سارے دوسرے صحابہ کرام جیسے: ابی بن کعب؛ اور ابوموسیٰ و ابن عباس؛ ابن زبیر؛ اور ان کے علاوہ دیگر چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین اسی کے قائل ہیں۔علاوہ ازیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، شافعیہ میں سے ابن سریج رحمہ اللہ اور حنابلہ میں سے ابوحفص برمکی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے؛ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔اور یہ مسلک اقرب الی الحق ہے۔

اس لیے کہ حقیقی بھائیوں کے بیٹوں کو دادا سے وہی نسبت ہے جو دادا کے بیٹوں یعنی چچوں کو دادا کی طرف، اس بات پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ دادا یہاں باپ کا قائم مقام ہے اور باپ چچوں سے اولیٰ ہے، لہٰذا دادا بھائیوں سے اولیٰ ہوگا۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دادا بھائیوں کے ساتھ ورثہ میں شریک ہوگا۔ حضرت عثمان، علی و زید اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین اسی کے قائل ہیں، مگر اس کی تفصیل میں ان کے مابین بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، امام مالک و شافعی و احمد رحمہم اللہ اور جمہور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نظریہ کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

دادا کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جس نظریہ کا اظہار کیا ہے، ابن ابی لیلیٰ کے سوا فقہاء میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ اگر پہلا قول صحیح اور حق ہے تو پھر یہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اور اگر دوسرا قول صحیح ہے تو بھی یہ عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ [دوسرا قول حضرت زید بن ثابت کا ہے اور آپ] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدلیہ کے قاضی القضاۃ تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے فیصلوں کو نافذ کیا کرتے تھے۔ [حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دادا کے بارے میں اپنا فیصلہ ورع پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ دادا باپ کی طرح ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ مگر جب خود دادا بن گئے تو اس میں بھی ورع اختیار کرتے ہوئے یہ معاملات حضرت زید رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیے۔

باقی رہا آپ کے بارے میں راوی کا یہ قول کہ: "قَضٰی فِیْهَا بِمِائَةِ قَضِیَّةٍ"

اگر یہ درست بھی ہو تو راوی کا اس سے یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سو اقوال ہیں۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں، جد کے مسئلہ میں جو نزاع پایا جاتا ہے۔ وہ ماں، بہن اور دادا کے مسئلہ سے زیادہ نہیں جسے علم وراثت میں ''مسالۃ الخرقاء'' کہتے ہیں؛ حالانکہ اس میں صرف چھ اقوال ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ راوی کی مراد دادا کے سو حوادث و واقعات ہیں، دادا کے بارے میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اقوال دو یا تین سے ہرگز زیادہ نہیں۔

دادا کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مختلف اقوال منقول ہیں، علمائے فرائض سے یہ بات پوشیدہ نہیں۔ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ سو اقوال والی روایت کذب کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے کہ میت کے بھائی بھی زندہ ہوں اور دادا بھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف دس سال منصب خلافت پر فائز رہے تھے اس قدر مختصر زمانہ میں ایسے سو واقعات کیوں کر پیش آ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں آپ نے دادا کے بارے میں فتوی دینا بند کر دیا تھا۔ روایات صحیحہ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے کاش! کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزیں ہمارے لیے اچھی طرح بیان فرمائی ہوتیں:

(۱) جد کی میراث

(۲) کلالہ (۳) سود سے متعلق مسائل۔ ❶

اسی لیے آپ نے ان مسائل میں توقف اختیار کر لیا تھا؛ اور اس میں کچھ بھی نہیں فرمایا کرتے تھے۔ اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے میراث کے ایک ہی مسئلہ میں دو فیصلے نقل کیے گئے ہیں۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاشربة، باب ما جاء فی ان الخمر ما خامر العقل (حدیث: ۵۵۸۸)، صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب فی نزول تحریم الخمر (حدیث: ۳۰۳۲)۔

ان میں سے ایک فیصلہ مشرکہ عورت کے بارے میں ہے۔ اہل علم نے اپنی کتب میں معروف اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ایک بار آپ نے اس مشرکہ کے شریک میراث نہ ہونے کا فیصلہ دیا۔ یہی قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ یہی مسلک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے' اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی نقل کیا گیا ہے۔

اس جیسے ہی مسئلہ میں دوسری بار شریک میراث ہونے کا فیصلہ دیا۔ اور فرمایا: اب یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ یہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اور امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ یہ دونوں حضرات اور دوسرے علماء اس مسئلہ میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے مقلد ہیں۔ امام حرب نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت ایسی ہی نقل کی ہے۔

فصل:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر اقرباء پروری کا الزام

[اعتراض] :شیعہ مصنف لکھتا ہے:''حضرت عمر رضی اللہ عنہ مال تقسیم کرنے میں بعض لوگوں کو ترجیح دیتے تھے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مساوات کو واجب قرار دیا ہے۔'' [انتھی کلام الرافضی]

[جواب] :[پہلی بات] حضرت عمر رضی اللہ عنہ مال غنیمت خود تقسیم نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ یہ ان امراء لشکر کا کام تھا جو غنیمت حاصل کرتے تھے۔ امیر جیش خمس (مال غنیمت کا پانچواں حصہ) فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیج دیا کرتا تھا۔ جیسا کہ آپ کے علاوہ باقی خلفاء کو بھیجا جاتا تھا۔ پس آپ اس خمس کو اس کے اہل لوگوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔

[دوسری بات]: نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور نہ ہی کسی دوسرے نے یہ نہیں کہا کہ غنیمت میں تفضیل واجب ہے۔ لیکن علماء کرام رحمہم اللہ کے مابین اختلاف ہے کہ کیا امام کے لیے کسی مصلحت کے پیش نظر کسی مجاہد سے مال غنیمت کی تقسیم میں ترجیحی سلوک روا رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

اس میں علماء کرام رحمہم اللہ کے دو قول ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے دو روایتیں منقول ہیں۔

پہلا قول: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے جائز سمجھتے ہیں؛ اسکی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو جاتے وقت خمس نکال کر مال غنیمت کا ۴/۱ حصہ بعض مجاہدین کو انعام کے طور پر دے دیا تھا، واپسی کے وقت خمس نکال کر ۳/۱ انعام کے طور پر بانٹ دیا۔ [1] مجاہدین کو یہ ترجیح مال خمس کے چار حصوں میں دی جاسکتی ہے۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو غزوہ الغابہ میں دشمن کے قتل' اسے ڈرانے اور غنیمت کے حاصل کرنے میں غیر معمولی کارنامہ سرانجام دینے کے صلہ میں ایک پیدل اور ایک سوار کا حصہ دیا تھا حالانکہ سلمہ رضی اللہ عنہ پا پیادہ تھے۔ [2]

دوسرا قول: امام مالک و شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں: ایسا کرنا جائز نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انعام خمس میں سے دے سکتے ہیں۔ جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انعام خمس کے ۱/۵ [یعنی کل مال غنیمت کے ۱/۲۵] میں سے دے سکتے

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الجھاد۔ باب فیمن قال الخمس قبل النفل (حدیث:۲۷۴۹، ۲۷۵۰)، سنن ابن ماجۃ۔ کتاب الجھاد، باب النفل (حدیث:۲۷۴۸)

[2] صحیح مسلم، کتاب الجھاد، باب غزوۃ ذی قرد وغیرھا (حدیث:۱۸۰۷)، مطولاً۔

ہیں۔[اس سے زیادہ نہیں]۔صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں:

''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کی طرف ایک غزوہ میں شرکت کی۔ ہمارا حصہ بارہ بارہ اونٹ بنے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک ایک اونٹ انعام دیا۔''[البخاری ٥/ ١٦٠]

یہ انعام اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب خمس نکال دیا گیا ہو۔

یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔[عدل وانصاف میں بھلا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہم سراور کون ہوگا جن کے قلب ولسان پر حق ہمہ وقت جاری وساری رہتا تھا] مگر آپ کے لیے مصلحت کے پیش نظر ایسا کرنا جائز تھا۔

آپ تقسیم غنیمت میں فرق مراتب کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔آپ نے اس سلسلہ میں لوگوں کے مراتب مرتب کئے ہوئے تھے۔اور یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

''اگر مجھے آئندہ سال تک زندگی ملی تو میں تمام لوگوں کو ایک ہی طرح کردوں گا۔''[یعنی فرق ختم کردوں گا]۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مساوات کے اصول پر عمل پیرا تھے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مساوات کے قائل تھے۔جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تفضیل پر عمل کرتے تھے۔ بہرکیف یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔اور اختلاف یہ ہے کہ کیا امام کے لیے مصلحت کے پیش نظر فضیلت دینے کا اختیار ہے یا نہیں؟ اس میں دوقول ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی دو روایات منقول ہیں۔ برابری کرنا امام شافعی رحمہ اللہ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے جب کہ تفضیل کا جواز امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

شیعہ مصنف کی یہ بات بے اصل ہے کہ'' مساوات واجب ہے۔'' اس نے اس کی کوئی دلیل ذکر نہیں کی، اگر دلیل ذکر کرتا تو دیگر اجتہادی مسائل کی طرح ہم اسے بھی موضوع گفتگو ضرور بناتے۔

فصل:

قیاس کا اعتراض

[اعتراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ ظن وقیاس کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔''[انتہی کلام الرافضی]

[جواب] :ہم کہتے ہیں کہ:''رائے اور قیاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہی خاص نہیں۔حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ قیاس کرتے تھے۔ایسے ہی حضرت ابو بکر وعثمان ؛ زید؛ابن مسعود اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی قیاس کیا کرتے تھے' اور اپنی رائے کے مطابق فتوی دیا کرتے تھے۔سنن ابی داؤد اور دوسری کتب میں حضرت حسن رحمہ اللہ سے روایت ہے: قیس بن عبادہ رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

'' یہ جو آپ سفر کرتے ہیں (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے لڑائی کے لیے) تو اس کے بارے میں ہمیں بتلائیں کہ کیا یہ اس کا کوئی عہد ہے جو آپ سے رسول اللہ ﷺ نے لیا تھا؟ یا آپ اپنی رائے سے ایسا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ:''رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کوئی عہد نہیں لیا لیکن یہ تو میری ذاتی رائے ہے۔''[سنن ابو داؤد:ح ١٢٦٤]

یہ تو ثابت شدہ امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس جنگ جمل اور صفین کے حق میں کوئی ایک روایت بھی نہیں تھی؛ جیسا کہ خوارج کے قتال کے لیے آپ کے پاس روایات موجود تھیں۔ بلکہ ان جنگوں کے لیے جانا بھی ان کی رائے پر

مبنی تھا۔اس بارے میں صرف ان لوگوں کے پاس کچھ روایات تھیں جو جنگوں میں شریک ہی نہیں ہوئے۔اس لیے کہ ان کے پاس جو روایات تھیں ان میں فتنوں کے دور میں گھروں میں بیٹھ جانے [اور فتنہ سے دور رہنے] کا حکم تھا۔

وہ روایت جس میں عہد توڑنے والوں' اور نافرمانی کرنے والوں اور جماعت سے نکلنے والوں کو قتل کرنے کا حکم ہے' وہ نبی کریم ﷺ کی حدیث نہیں ہے' بلکہ جھوٹ گھڑ کر آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ قیاس ورائے اگر قابل مذمت نہیں ہیں تو اس کا قائل کسی حال میں بھی قابل ملامت نہیں۔اور اگر رائے واجتہاد ایک مذموم چیز ہے تو اس رائے سے اور مذموم تر رائے کیا ہوگی جس کی بنا پر ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون (جنگ جمل وصفین میں) بہایا گیا؛ اور اس سے مسلمانوں کو کوئی دینی ودنیوی فائدہ بھی نہ پہنچا۔ بلکہ شر میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور خیر بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ جب ایسی رائے معیوب و مذموم نہیں ہے تو فرائض وطلاق کے مسائل میں فاروق اعظم کی رائے بالاولیٰ معیوب نہ ہوگی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عملاً اس میں شریک تھے۔اور آپ کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اکثر سابقین اوّلین صحابہ رضی اللہ عنہم جنگ وقتال کو خلاف مصلحت تصور کرتے تھے اور یہ رائے یقیناً بدلائل کثیرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے سے اصلح واصوب تھی۔

یہ بھی معلوم ہے کہ دادا کے مسئلہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ قول بالرائے تھا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''میری اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں کی رائے اس بات پر متفق ہوگئی تھی کہ ام الولد لونڈیوں کو فروخت نہ کیا جائے۔مگر میں اب ان کے فروخت کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔''

اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاضی عبیدہ سلمانی نے کہا تھا:

''آپ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی متفقہ رائے آپ کی انفرادی رائے سے ہمیں عزیز تر ہے۔''[1]

صحیح بخاری میں بروایت عبیدہ از حضرت علی رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''جس قسم کے فیصلے تم کیا کرتے ہو کرتے رہو؛ میں اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یا تو جماعت کا نظم قائم رہے۔ یا اپنے اصحاب کی طرح میں بھی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔''[2]

یہ روایت ابن سیرین نے عبیدہ سے نقل کی ہے۔ابن سیرین کا خیال تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو روایات نقل کی جاتی ہیں وہ عموماً جھوٹی ہوا کرتی ہیں[3] (کیونکہ وہ اختلاف کی آئینہ داری کرتی ہیں، حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اختلاف کو ناپسند فرمایا کرتے تھے)۔

اگر اپنے رائے سے فتوی دینا گناہ ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ کا گناہ؛ جنہوں نے رائے کی بنا پر مسلمانوں کے خون کو حلال سمجھا؛ اس گناہ سے بڑا ہے جس میں ایک جزوی مسئلہ میں رائے سے فیصلہ کیا گیا۔اگر یہ رائے درست تھی تب اُن ہی تک تھی اور اگر غلط تھی تب بھی ان ہی تک محدود تھی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ قیاس اور رائے

---

[1] مصنف عبد الرزاق(١٣٢٢٤)، کتاب الام للشافعی(٧/ ١٥٧)، سنن کبریٰ بیهقی (١٠/ ٣٤٨)

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب علی بن ابی طالب، (حدیث:٣٧٠٧)

[3] صحیح بخاری (حوالہ سابق)۔

کے باب میں بھی دوسرے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ حق ہیں۔ اس لیے کہ دوسرے لوگوں کی نسبت آپ کی رائے زیادہ درست ہوا کرتی تھی۔ اور آپ کی نسبت دوسروں کی رائے میں غلطی زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی ہر رائے اور قیاس درست اور صواب پر ہوا کرتے تھے۔ پس جس رائے میں بڑی مصلحت پوشیدہ ہو وہ اس رائے سے بہتر اور افضل ہے جس میں کم یا ادنی درجہ کی مصلحت پوشیدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آراء میں مسلمانوں کے لیے بہت بڑی مصلحتیں ہوا کرتی تھیں۔ بہر حال جیسے بھی ہو؛ اگر رائے محمود اور قابل تعریف ہے تو پھر اس لحاظ سے آپ کی رائے باقی لوگوں کی نسبت اعلی وارفع ہوا کرتی تھی۔ اور اگر قیاس ورائے مذموم ہے تو پھر یہ مذمت دوسرے لوگوں کی بہ نسبت آپ کو بہت ہی کم لاحق ہوتی ہے۔ اور اس پر سب سے بڑی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے' آپ فرماتے ہیں:

''ماضی کی امتیں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں ان میں کچھ لوگ مُلہم ہوا کرتے تھے۔ بیشک میری امت میں اگر کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہے۔'' [یہ حدیث پہلے کئی بار گزر چکی ہے]۔

اور یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ جس انسان کو الہام ہوتا ہو؛ اس کی رائے دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ حق پر ہوتی ہے۔ اس سے اوپر صرف نص کا مرتبہ ہے جو صدیقین انبیاء کرام علیہم السلام سے حاصل کرتے تھے۔ اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نسبت بہت بلند و عالیشان ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ باقی تمام لوگوں سے افضل ہیں۔ مسند احمد کی روایت میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ عمر کی زبان پر حق کو جاری کر دیا ہے۔'' [یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]۔

❀ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''میں نے کبھی نہیں سنا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جس چیز کے بارے میں جس خیال کا اظہار فرماتے مگر وہ ہو بہو اسی طرح ہوا کرتی تھی۔''❶

نصوص کتاب وسنت اور اجماع وقیاس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے دیگر اکابر صحابہ مثلاً حضرت عثمان وعلی اور طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین کی نسبت بہت زیادہ صائب ہوا کرتی تھی اور اس کے نتائج وثمرات بھی دینی اور دنیاوی لحاظ سے قابل مدح وستائش ہوا کرتے تھے۔

آپ نے بلاد روم و فارس فتح کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ سے اسلام کو عزت دی۔ اور کفار و منافقین کو ذلت و رسوائی سے دو چار کیا۔ آپ نے سب سے پہلے دیوان مرتب کیے۔ لوگوں کے لیے وظائف مقرر فرمائے۔ اور اہل ذمہ پر ٹیکس عائد کیے۔ کفار وفجار کی سرکوبی کی۔ آپ کے دور میں اسلام عزت وشرف کی معراج پر تھا۔

جس شخص میں عدل و انصاف کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کمال سیرت و کردار و کثرت علم و فضل میں ذرہ بھر شک نہیں رکھتا۔ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو ہدف طعن و ملامت بنانے والا دو آدمیوں میں سے ہوئی ایک ہوسکتا ہے:

۱۔ یا تو ناتجربہ کار؛ جاہل؛ ملحد ومنافق ہوگا جوان پر طعن وتشنیع کرنے کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو نشان طعن بنانے کا ذریعہ بناتا ہے۔ رافضیوں کا پہلا معلم و مؤسس اسی راہ کا مسافر تھا۔ رافضیت کی بدعت اسی [بدبخت اور ملعون] کی ایجاد ہے۔ اور ائمہ باطنیہ کا بھی یہی حال ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب اسلام عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب (ح:۳۸۶۶)۔

۲۔ یا تو پھر وہ شخص ان حضرات پر تنقید کرسکتا ہے جو انتہائی سخت جہالت اور گمراہی کا شکار ہو؛ اور اس پر ہوائے نفس کا غلبہ ہو۔ عام طور پر غالب شیعہ اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر چہ وہ باطن میں مسلمان ہوں۔

- اگر رافضی کہے: چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معصوم تھے، اسی لیے آپ اپنی رائے سے کوئی بات نہیں فرمایا کرتے تھے۔ بلکہ آپ جو کچھ بھی فرماتے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نص اور حجت ہوا کرتی تھی۔ اس لیے کہ آپ امام منصوص ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امام متعین کیا تھا۔
- جواب میں ہم کہیں گے: آپ کے چیٹی بھائی دوسرے اہل بدعت خوارج ہیں' ذرا ان کو تو دیکھو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دائرہ اسلام ہی سے خارج کر رہے ہیں۔ حالانکہ خوارج روافض کی نسبت زیادہ دین دار؛ زیادہ عالم اور سچے ہوا کرتے ہیں۔

اس میں کوئی بھی ایسا انسان ذرا بھر بھی شک نہیں کرسکتا جو دونوں گروہوں کی حالت جانتا ہو۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی ایک ان کی نماز کے مقابلہ میں اپنی نماز کو اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزہ کو اور ان کی تلاوت قرآن کے مقابلہ میں اپنی تلاوت قرآن کو حقیر سمجھے گا۔'' [یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے]

ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں لڑائیاں لڑیں۔ اور پھر ان ہی میں سے ایک آدمی نے آپ کو شہید کردیا۔ ان کے لشکر تھے؛ ان کے پاس علماء تھے؛ ان کے اپنے شہر آباد تھے۔ اور اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ یہ لوگ گمراہ اور بدعتی تھے۔ اور صحیح احادیث کی روشنی میں ان کو قتل کرنا واجب تھا۔ اور امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے افضل کاموں میں سے ایک خوارج کے ساتھ قتال کرنا تھا۔

بعض شیعہ علماء سے پوچھا گیا: جب کفار ہمارے ملک پر حملہ کردیں' اور لوگوں کو قتل کریں' عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیں اور اموال چھین لیں تو کیا ہم ان سے جنگ کرسکتے ہیں؟ تو اس نے جواب میں کہا: ''نہیں؛ ہمارا مذہب یہ ہے کہ ہم امام معصوم کی قیادت کے بغیر جنگ نہیں کرسکتے۔ سوال پوچھنے والے نے کہا: کیا اہل سنت کے ساتھ مل کر لڑ سکتے ہیں؟

تو مفتی نے جواب میں کہا: اللہ کی قسم! نہیں؛ یہ پلید مذہب ہے' اور اس کی وجہ سے دین اور دنیا میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

یہ بات کہنے والے نے اپنے گمان کے مطابق ظلم سے بچنے کی کوشش کی تھی؛ مگر اپنے فاسد ورع و زہد کی وجہ اس سے کئی گنا بڑے ظلم کا شکار ہوگیا۔ بعض ولاۃ الامور کے کفار پر غلبہ پانے کے لیے ظلم کو اس سے کیا نسبت ہے جو ان سے بھی بڑھ کر ظالم ہو۔ چاہیے تو یہ تھا زیادہ ظلم کرنے والے کے خلاف کم ظلم کرنے والے کی مدد کی جاتی۔ اس لیے کہ شریعت کی بنیاد مصالح کے حصول و تکمیل؛ اور مفاسد کے خاتمہ یا ان کے کم کرنے پر رکھی گئی ہے۔ اور اس امر پر مبنی ہے کہ دو بھلائیوں میں سے بڑی بھلائی اور دو برائیوں میں سے بڑی برائی کی معرفت حاصل ہو۔ تاکہ بوقت ضرورت بھلائی کے حصول اور برائی سے دفاع کے لیے کوششیں بروئے کار لائی جائیں۔

یہ بات تو سبھی کو معلوم ہے کہ کفار' مرتدین اور خوارج کا شر اور ظلم کسی بھی ظالم کے ظلم سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہاں اگر ان کی طرف سے مسلمانوں پر کوئی ظلم نہ ہو رہا ہو؛ اور ان سے لڑنے والا ان پر ظلم کرنا چاہتا ہو تو پھر یہ اس کی طرف سے سرکشی اور بغاوت ہوگی؛ اور سرکشی کے کاموں میں کسی کی مدد نہیں کی جائے گی۔

فصل:

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شوریٰ اور رافضی اعتراض]

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد انتخاب خلیفہ کو شوریٰ کے حوالہ کرکے اپنے سے پہلے والوں کی مخالفت کی ۔اس لیے کہ لوگوں کو خود اپنا امیر منتخب کرنے کا موقع نہیں دیا۔اور نہ ہی اپنے بعد کسی ایک کو متعین کر کے حاکم مقرر کیا۔عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ اگر سالم مولیٰ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ زندہ ہوتے میں انھیں خلیفہ مقرر کر دیتا۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت موجود تھے۔ اور اس مجلس میں چناؤ کے لیے فاضل اور مفضول کو جمع کر دیا۔حالانکہ فاضل کا حق تھا کہ اسے مفضول پر مقدم رکھا جائے ۔ پھر جن لوگوں کو شوریٰ کے لیے منتخب کیا تھا ان میں سے ہر ایک پر طعن بھی کیا۔اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس چیز کو ناپسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی زمام کار مرتے ہوئے کسی کے سپرد کردیں جس طرح اپنی زندگی میں اس کو ناپسند کرتے تھے ۔پھر مرتے ہوئے یہ معاملہ چھ لوگوں کے سپرد کر گئے ۔ پھر ان میں کمی کرکے انہیں چار کردیا۔ پھر تین کردیا۔ پھر ایک تک بات پہنچ گئی۔اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دیدیا؛ حالانکہ آپ کو کمزوری اور کوتاہی سے موصوف کیا تھا۔پھر کہا: اگر امیر المؤمنین اور عثمان رضی اللہ عنہما ایک رائے پر جمع ہوجائے تو وہی بات مانی جائے گی جو یہ دونوں حضرات کہہ رہے ہوں۔ اور اگر تین ہوجائیں تو پھر ان کی بات معتبر ہوگی جن میں عبد الرحمن رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کبھی بھی ایک بات پر اکٹھے نہیں ہوسکتے۔اور یہ کہ عبدالرحمن کبھی بھی اپنے بھائی سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ آپ کے چچازاد بھائی تھے۔پھر حکم دیا کہ اگر بیعت کرنے میں تین دن سے زیادہ کی تاخیر کریں تو ان کی گردنیں اڑادی دی جائیں۔حالانکہ ان میں عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم اجمعین موجود تھے۔اور حکم دیا کہ جو ان چار کی مخالفت کرے اسے قتل کردیا جائے۔اور جن تین لوگوں کے گروہ میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ موجود ہوں ان کے مخالفین کو قتل کرنے کا حکم دیا۔یہ تمام باتیں دین کے خلاف ہیں۔

[حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے] حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:''اگر میں تمہیں امام بنادوں- حالانکہ وہ ایسا کرنے والے نہیں تھے-تو تم سنت کی راہ پر قائم رہوگے؟اس میں اشارہ تھا کہ آپ کو خلیفہ نہیں بنایا جائے گا۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: اگر میں تمہیں خلیفہ بناؤں تو آپ آل ابی معیط کی راہ پر قائم رہوگے؟اور اگر تم ایسا کروگے تو تم ضرور اسے قتل کرو گے۔اس میں امیر المؤمنین کے قتل کی طرف اشارہ تھا۔'' [شیعہ مصنف کا کلام ختم ہوا]۔

[جواب]:اس کا جواب یہ ہے کہ یہ گفتگو دو قسم سے خالی نہیں:

۱۔ جو نقل کے اعتبار صریح کذب ہے۔

۲۔ اس میں دانستہ حق کو ٹھکرایا گیا ہے۔

❁ پہلی قسم کا کلام اتنا کھلا ہوا صاف جھوٹ ہے کہ اس کا جھوٹ ہونا ہر ایک کو معلوم ہے ۔یا کم از کم اس کی صداقت کا علم کسی کو بھی نہیں۔

❀ دوسری قسم کا کلام سچا ہے، مگر اس میں کوئی چیز موجب طعن نہیں ہے۔ بلکہ وہ باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان فضائل و محاسن میں شامل ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے آپ کا خاتمہ فرمایا ہے۔

مگر اس بات کا کیا علاج کہ شیعہ فرط ضلالت و جہالت کی بنا پر نقلی و عقلی حقائق کو قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ان امور کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جو وقوع پذیر ہو چکے ہیں اور وہ اس بات کو جانتے بھی ہیں، مگر اس کے باوصف کہتے ہیں کہ وہ واقع نہیں ہوئے۔ پھر جو امور وقوع میں نہیں آئے اور ان کے عدم وقوع سے وہ آگاہ بھی ہیں بکمال دیدہ دلیری کہتے ہیں کہ وہ وقوع میں آچکے ہیں۔ خیر و صلاح کا نام اس کی اصطلاح میں فساد ہے اور فساد کا نام خیر و صلاح۔ [کسی شاعر نے کہا ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے]

شیعہ حضرات عقل و نقل دونوں سے عاری ہیں۔ وہ صحیح معنی میں آیت ہذا کے مصداق ہیں:

﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ (الملك: ۱۰)

''اگر ہم سنتے یا عقل رکھتے تو آج دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔''

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت؟]:

باقی رہا رافضی مصنف کا یہ قول کہ: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتخاب خلیفہ کے معاملہ کو شوریٰ کے حوالہ کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی۔'' اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اختلاف تضاد ۲۔ اختلاف تنوع۔

❀ اختلاف کی قسم اوّل کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص ایک امر کو واجب ٹھہراتا ہو اور دوسرا اسے حرام قرار دیتا ہو۔

❀ دوسری قسم کی مثال وہ اختلاف ہے جو قراءت میں پایا جاتا ہے۔ ہر قراءت بجائے خود جائز ہے۔ تاہم ایک قاری کے نزدیک ایک قراءت مختار ہوتی ہے اور دوسرا کسی اور کو مختار تصور کرتا ہے۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ سے بھی مشہور و معروف ہے۔ [نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''قرآن کریم سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ہر حرف شافی و کافی ہے۔''[1]]

روایات میں مذکور ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ اور ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہما کے مابین سورۂ فرقان کی تلاوت میں اختلاف پیدا ہوا۔ جب دونوں نے مختلف طریقہ سے پڑھ کر سنایا تو نبی کریم ﷺ نے دونوں سے کہا: ''یہ سورت اسی طرح اتاری گئی ہے۔''[2]

خلیفۂ مسلمین کا مسلمانوں کے لیے تصرف اسی قبیل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جنگ بدر میں نبی کریم ﷺ نے اسیران بدر کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فدیہ لینے کا مشورہ دیا؛ تو آپ نے انھیں حضرت ابراہیم و عیسیٰ کیساتھ تشبیہ دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے کا مشورہ دیا۔[3] تو آپ نے ان کو نوح و موسیٰ کے مشابہ قرار

---

[1] سنن نسائی، کتاب الافتتاح، باب جامع ما جاء فی القرآن(حدیث:۹۴۲)، مسند احمد (۵/ ۱۱٤، ۱۲۲)

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعة احرف(حدیث: ٤۹۹۲)، صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب بیان ان القرآن انزل علی سبعة احرف(حدیث:۸۱۸)

[3] مستدرك حاكم(۳/ ۲۱-۲۲)، مسند احمد(۱/ ۳۸۳)، و اسناده ضعیف لانقطاعه.

دیا۔ آپ نے دونوں میں سے کی مذمت نہ کی بلکہ انبیاء کے ساتھ تشبیہ دے کر ان کی مدح وستائش فرمائی۔ اگر نبی کریم ﷺ حتمی طور پر ایک بات پر عمل کرنے کے مامور ہوتے تو صحابہ سے مشورہ نہ لیتے۔

ایسے ہی خلیفہ کے اپنے عمال اور والیان مقرر کرنے کا معاملہ بھی ہے۔ امام یا خلیفہ پر واجب ہوتا ہے کہ اس انسان کو والی مقرر کرے جسے اپنی رائے میں بہتر سمجھتا ہو۔ علاوہ ازیں اجتہادی امور میں اختلاف کا امکان ہے اور ہر اجتہاد مبنی بر صواب ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غزوات میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو معزول کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس مشورہ پر عمل نہیں کیا کرتے تھے، بلکہ فرمایا کرتے تھے:

''خالد رضی اللہ عنہ مشرکین پر اللہ کی شمشیر برہنہ ہیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت پر فائز ہوئے، تو انھوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو معزول کرکے ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو سالار مقرر کیا۔ دونوں کا طرز عمل اپنے اپنے وقت پر درست تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نرم مزاج تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مقابلہ میں جابر و سخت گیر تھے۔ نبی کریم ﷺ دونوں سے مشورلیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

''جب عمر رضی اللہ عنہ وابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میں ان کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔''[1]

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بعض غزوات میں فرمایا:

''اگر لوگ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کریں گے تو سیدھی راہ پر چلیں گے۔''[2]

روایات صحیحہ میں یہ بھی آیا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے دریافت کیا:

''جب نبی موجود نہ ہوں اور نماز کا وقت آ جائے تو لوگ اس وقت کیا کریں گے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: اللہ و رسول ہی کو علم ہو گا۔ آپ نے فرمایا: ''کیا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما موجود نہیں؟ اگر ان دونوں کی اطاعت کرتے رہیں گے تو راہ راست پر آ جائیں گے اور اگر ان کی نافرمانی کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے اور پوری امت گمراہی سے ہم کنار ہو جائے گی۔'' نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''جنگ بدر کے دن نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا۔ ان کی تعداد ایک ہزار تھی۔ آپ کے رفقاء تین سو انیس تھے۔ نبی کریم ﷺ قبلہ رخ ہوئے، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے:

''اے اللہ! اپنے وعدہ کو پورا کر اور جو چیز دینے کا وعدہ کیا ہے وہ عطا کر اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔''

آپ ہاتھ اٹھائے قبلہ رو دعا کرنے میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ آپ کی چادر کندھوں پر سے گر پڑی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور چادر اٹھا کر آپ کے کندھوں پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے ہوکر نبی کریم ﷺ کے ساتھ چمٹ گئے اور کہا:

''اللہ کے نبی! بس کیجیے، اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

---

[1] مسند احمد(٤/ ٢٢٧)، تاریخ الاسلام للذهبي (عهد الخلفاء، ص:٢٥٦)۔

[2] مسلم، باب قضاء الصلاة الفائتة (ح: ٦٨١)مطولاً۔

﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ﴾ [1] (الانفال: ۹)

''اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے پھر اللہ نے تمہاری سن لی کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو لگا تار چلے آئیں گے۔''

ائمہ سلف کے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی عظمت و فضیلت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کی حد یہ ہے کہ شیعان علی تک اس سے متفق تھے۔ ابن بطہ رحمہ اللہ اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں جو ابوالعباس بن مسروق کے نام سے مشہور ہیں کہ ابواسحاق سبیعی جب کوفہ آئے تو شمر بن عطیہ نے ہمیں تعظیماً کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ ابواسحاق رحمہ اللہ بیٹھ کر ہم سے بات چیت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا: جب میں کوفہ سے نکلا تھا تو میں نے کوفہ میں ایک شخص بھی ایسا نہیں پایا جو حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی عظمت شان میں شک رکھتا ہو۔ اب میں واپس لوٹا ہوں تو لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ [2]

حضرت ضمرہ سعید بن حسن سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے لیث [3] بن ابی سُلیم کو یہ کہتے سنا:

''میں نے متقدمین شیعہ کو دیکھا کہ وہ کسی کو بھی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے افضل نہیں سمجھتے تھے۔

امام احمد بن حنبل صلی اللہ علیہ وسلم سفیان بن عُیینہ سے بطریق خالد بن سلمہ از مسروق روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

''ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کی محبت اور ان کی فضیلت کی معرفت حاصل کرنا اتباع سنت میں داخل ہے۔''

حضرت مسروق و طاؤس جلیل القدر تابعین کوفہ میں سے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے: متقدمین شیعہ کیوں نہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے قائل ہوتے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول تواتر کیساتھ آپ سے منقول ہے؛ آپ فرمایا کرتے تھے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت محمدی میں سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں پھر عمر رضی اللہ عنہ۔'' [4]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول قریباً اسی طرق سے روایت کیا گیا ہے۔

قبیلہ ہمدان والوں کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خصوصی مراسم تھے۔ آپ یہ شعر گنگنایا کرتے تھے:

وَ لَوْ كُنْتُ بَوَّابًا عَلٰى بَابِ جَنَّةٍ ۔۔۔ لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ ادْخُلِيْ بِسَلَامٍ

---

[1] مسلم، باب الامداد بالملائکة ......، (ح:۱۷۶۳)۔

[2] یہ اس باب میں ایک تاریخی شہادت ہے کہ شیعہ کے نظریات کس عجلت کے ساتھ تغیر پذیر رہے۔ ابواسحاق سُبیعی کوفہ کے مشہور شیخ اور عالم تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں کمسن تھے وہ خود کہتے ہیں: ''میرے والد مجھے اٹھا کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لے گئے......'' اگر یہ بات معلوم ہو جائے کہ آپ کب کوفہ سے گئے اور کب واپس لوٹے تو ہم جان سکیں گے کہ وہ زمانہ کونسا تھا جس میں شیعہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اتباع میں شیخین کی عظمت و فضیلت کے قائل تھے اور تاریخ کے کس دور میں شیعان علی نے آپ کی پیروی چھوڑ دی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے منبر پر فرمایا کرتے تھے کہ: سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما افضل الامت اور آپ کے وزیر و خلیفہ تھے۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ خوارج اور اباضیہ نے سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں اپنے اس نظریہ کو تبدیل نہ کیا؛ مگر سیدنا ابواسحاق سبیعی رحمہ اللہ کی زندگی کے آخری دور تک شیعہ نے اپنا یہ نظریہ تبدیل کر دیا اور اس ضمن میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نافرمانی کرنے لگے۔

[3] اس حدیث کے راوی لیث بن ابی سلیم قرشی کوفی بہت بڑے عالم و زاہد تھے۔ انھوں نے عکرمہ سے استفادہ کیا۔ یہ معمر و شعبہ اور ثوری کے استاد تھے۔ یہ مسائل حج کے مشہور کوفی عالم تھے اور کوفہ بھر میں ممتاز تھے۔ ان کی وفات ۱۴۳ھ میں ہوئی۔

[4] سنن ابن ماجة۔ المقدمة، باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ (حدیث: ۱۰۶)، مسند احمد(۱/ ۱۰۶)۔

''اگر میں جنت کے دروازے کا دربان ہوتا تو قبیلہ ہمدان والوں سے کہتا کہ آرام سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔''

قبیلہ ہمدان والوں سے بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت نقل کی ہے مثلاً سفیان ثوری رحمہ اللہ بطریق جامع بن شداد، منذر رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ہمدانی ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے محمد بن حنفیہ نے ان سے دریافت کیا: ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل کون ہیں؟''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بیٹا کیا تمھیں یہ بات معلوم نہیں؟''

محمد بن حنفیہ نے کہا: ''نہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سب سے افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔''

ابن حنفیہ نے پوچھا: ''ان کے بعد کون؟''

فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ''[2]

یہ محمد بن حنفیہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ باپ بیٹے کا مکالمہ ہے۔ اسے تقیہ پر محمول نہیں کر سکتے۔ ابن حنفیہ نے یہ روایت خاص طور سے اپنے والد سے نقل کی ہے اور یہ بات انھوں نے منبر پر کہی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''جو شخص مجھے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے افضل قرار دے گا میں اس پر حد قذف لگاؤں گا۔''

سنن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ دونوں جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما؛ ان کی اطاعت کیجیے۔''[3]

علماء سے ایک قول یہ بھی منقول ہے ؛اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا متفق علیہ قول لازم الاتباع ہے، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سنت کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ یہی قول راجح ہے۔ جیسا کہ اگر ان چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم کا کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو اس کے خلاف کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتباع کرنے کا حکم دیا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدل و اکمل امور دے کر مبعوث کیا گیا تھا، چنانچہ آپ ہنس مکھ بھی تھے اور مجاہد بھی۔ آپ نبی الرحمۃ بھی تھے اور صاحب قتال و جہاد بھی۔ یہ صرف آپ ہی کی خصوصیت نہیں، بلکہ آپ کی امت بھی دونوں اوصاف کی حامل تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹)

''کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحمدل ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (المائدۃ: ۵۴)

---

[1] سنن ابن ماجۃ۔ المقدمۃ، باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ (حدیث: ۱۰۶)، مسند احمد (۱/ ۱۰۶)

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم "لو کنت متخذاً خلیلاً" (ح: ۳۶۷۱)۔

[3] سنن ترمذی، کتاب المناقب باب (۱۶/ ۲۰)، (حدیث: ۳۶۶۲، ۳۶۶۳)، سنن ابن ماجۃ، المقدمۃ، باب فضائل ابی بکر الصدیق، (حدیث: ۹۷)، من حدیث حذیفۃ۔

''وہ نرم دل ہونگے مسلمانوں پر؛ اور سخت اور تیز ہونگے کفار پر۔''

چنانچہ نبی کریم ﷺ فاروقی شدت وحدت اور صدیقی لطف و کرم دونوں کے جامع تھے۔ اور اسی بات کا حکم دیتے تھے جو عدل و انصاف پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما دونوں آپ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں حضرات کے امور و افعال کمال استقامت کے آئینہ دار تھے۔

جب نبی کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور یہ دونوں اکابر یکے بعد دیگرے آپ کے خلیفہ و نائب قرار پائے ؛ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے کمال کا یوں اظہار فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لے کر اپنی روایتی نرمی کے ساتھ ان کی غلظت و شدت کو مخلوط کرتے رہے تاکہ اعتدال قائم رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خالص نرمی اور خالص درشتی و سختی دونوں بگاڑ کی موجب ہوا کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ طرز عمل اسوۂ نبوی کی پیروی میں اختیار کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فاروق سے بھی مشورہ لیا کرتے تھے اور بعض امور میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھی شرف نیابت سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر آپ اوّلین خلیفہ رسول ﷺ قرار پائے۔ مرتدین کے خلاف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جس شدت و غلظت کا ثبوت دیا تھا وہ فاروقی شدت و حدت سے بھی بڑھ کر تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے کہا تھا: ''اے نائب رسول! لوگوں پر رحم کیجیے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کس بات پر رحم کروں آیا کسی جھوٹی بات پر یا کسی خود ساختہ شعر پر۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم لومڑی کی طرح بزدل تھے آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں شیر بنا دیا۔''

جہاں تک حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات کا تعلق ہے آپ بذات خود سخت گیر تھے۔ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نرم طبع صحابہ سے مشورہ لے کر اعتدال کو قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح، سعد بن ابی وقاص، ابوعبید ثقفی، نعمان بن مقرن اور سعید بن عامر رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے اہل صلاح و زہد جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے صحابہ سے بھی بڑے عابد و زاہد تھے آپ کے مشیر تھے۔

شوریٰ کا معاملہ بھی اسی قبیل میں شامل ہے جن معاملات میں اللہ و رسول کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم نہیں ہوا کرتا تھا۔ آپ ان میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ شرعی نصوص جامع کلمات، قضایا کلیہ اور قواعد عامہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شارع کے لیے یہ ممکن نہیں کہ روز قیامت تک پیدا ہونے والے جملہ مسائل کے ایک ایک مسئلہ کو بوضاحت و صراحت بیان کردے۔ نظر بریں امور متعینہ میں غور و فکر کر کے اجتہاد کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا وہ شارع کے کلمات جامعہ میں داخل بھی ہیں یا نہیں؟ فقہی اصطلاح میں اس اجتہاد کو تحقیق المناط کہتے ہیں جس پر مثبتین و منکرین قیاس سب کا اتفاق ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''دو عادل اشخاص کو گواہ بنا لینا چاہیے۔'' اب کسی مخصوص شخص کے بارے میں ہمیں نص کے ذریعہ یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ وہ عادل ہے یا نہیں، بلکہ یہ بات اجتہاد ناس سے معلوم ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

ہے کہ امانت اس کے حق دار کو ادا کر دینی چاہیے اور فرائض و مناصب بھی اسی شخص کو تفویض کرنا چاہیے جو ان کا اہل ہو۔ مگر کسی متعین شخص کا کسی منصب کے لیے موزوں ہونا نص سے نہیں بلکہ اجتہاد خاص سے معلوم کیا جاتا ہے۔

اگر روافض کا خیال ہے کہ خلیفہ منصوص علیہ ہوتا ہے (اس کا تقرر شرعی نص کی بنا پر وجود میں آتا ہے) اور اس کے پہلو بہ پہلو وہ معصوم بھی ہوتا ہے تو یہ غلط ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب رسول ﷺ کے خلفاء و عمال غیر معصوم تھے تو امام و خلیفہ کیوں کر معصوم ہو سکتا ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے کہ شارع ہر مخصوص و متعین چیز کو صراحتاً بیان کر دے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ نبی و امام کو کسی مخصوص شخص کے باطنی احوال کا علم ہو۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ کو والی مقرر کیا؛ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ﴾

''اے مسلمانو! اگر تمہیں کوئی بے اعتبار آدمی خبر دے تو تم اس کی اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو۔'' [الحجرات ٦] ❶ [یہ ایک لمبا قصہ ہے۔]

کسی معاملہ میں آپ کا خیال یہ تھا کہ حق بنی ابیرق کے ساتھ ہے؛ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا﴾

''بیشک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے اور آپ خیانت کرنے والوں کی خاطر جھگڑنے والے نہ بنیں۔''

جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو جزئیات کے بارے میں آپ کا ظن [تخمینہ] اکثر مرتبہ غلط نکلا۔ اس سے معلوم ہوا کہ معصوم و غیر معصوم دونوں کے لیے جزئیات میں اجتہاد کرنا ضروری ہے۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

''آپ میرے پاس جھگڑے چکانے آتے ہیں، ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے دعویٰ کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کر سکتا ہو۔ میں تو اسی طرح فیصلہ کرتا ہوں جیسے سنتا ہوں۔ جس شخص کو میں نے اس کے بھائی کا حق دے دیا تو وہ اسے وصول نہ کرے، یہ تو اسی طرح ہے جیسے میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دے دوں۔'' ❷

کسی مخصوص معاملہ میں نبی کریم ﷺ کا فیصلہ اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دوسرے کا حصہ وصول کرنے سے منع فرمایا، جب کہ وہ در حقیقت اس کا حق دار نہ ہو۔

---

❶ بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی مصطلق جب مسلمان ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو ان سے زکوٰۃ لینے کے لئے بھیجا۔ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے قبیلہ اور بنی مصطلق میں پہلے سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ جب ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ ان کے ہاں گئے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور واپس آ کر آپ سے کہہ دیا کہ وہ زکوٰۃ دینے سے انکاری ہیں۔ بلکہ وہ تو مجھے بھی قتل کر دینا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں نے یہ رائے دی کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لئے ان پر چڑھائی کرنا چاہیے مگر آپ اس معاملہ میں متأمل تھے۔ اسی دوران بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ (ام المومنین سیدنا جویریہ رضی اللہ عنہا کا والد) اتفاق سے آپ کے ہاں آئے۔ تو انہوں نے بتایا کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ تو ہمارے ہاں گئے ہی نہیں تو ان کے قتل کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ ہم مسلمان ہیں اور زکوٰۃ دینے کو تیار ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ [دلدار جی]۔

❷ البخاری، باب من اقام البینة بعد الیمین (ح: ٢٦٨٠)، مسلم، باب بیان ان حکم الحاکم لا ...... (ح:١٧١٣)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے، اس اعتبار سے آپ پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ مسلمانوں میں جو سب سے زیادہ موزوں ہو، اس کو منصب خلافت پر فائز کریں۔ لہٰذا اجتہاد کی بنا پر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ چھ حضرات باقی لوگوں کی نسبت خلافت کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ آپ کا یہ اجتہاد اپنی جگہ درست تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی شخص نے یہ بات نہ کہی کہ دوسرا کوئی شخص ان سے موزوں تر ہے۔ خلیفہ مقرر کرنے کا کام چھ اشخاص کی اس کمیٹی کے سپرد کیا۔ مبادا آپ ان چھ میں سے کسی کو امام مقرر کردیں اور دوسرا شخص اس سے اصلح وانسب ہو۔ چھ حضرات کو یہ کام تفویض کرنا کسی ایک شخص کی تعیین کی نسبت آپ کو زیادہ موزوں نظر آیا۔ یہ ایک بے غرض خلیفہ، عادل ومخلص امام کا عمدہ ترین اجتہاد تھا۔ اسے اپنی خواہشات سے کوئی غرض اور مطلب نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ:۳۸)

''وہ اپنے معاملات شوریٰ سے طے کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''معاملات میں صحابہ کے ساتھ مشورہ کیجیے۔''

نظر بریں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شوریٰ کو اختیار کرنا مصلحت کے پیش نظر تھا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرنا بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ علم وفضل اور استحقاق خلافت کے اعتبار سے کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہم سر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے آپ نے شوریٰ کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس مبارک انتخاب کا اثر بھی مسلمانوں پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہا۔ ہر باانصاف دانش منداس حقیقت سے باخبر ہے کہ عثمان وعلی وطلحہ وزبیر اور سعد وعبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کوئی بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حریف نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے طرز عمل میں چنداں فرق وامتیاز نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

''دنیا میں عاقل ترین افراد تین تھے: ۱۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی جس نے کہا تھا:

﴿يٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ﴾ [القصص ۲۶]

''ابا جی! آپ انہیں مزدوری پر رکھ لیجئے، کیونکہ جنہیں آپ اجرت پر رکھیں ان میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو مضبوط اور امانتدار ہو۔''

۲۔ عزیز مصر جس نے اپنی بیوی سے کہا تھا:

﴿اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا﴾ (یوسف ۲۱)۔

''اس کی عزت کیجیے؛ ممکن ہے ہمیں فائدہ دے یا ہم اسے اپنا لڑکا بنالیں۔''

۳۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا۔''[1]

---

[1] مستدرك حاكم (۲/ ۳٤٥، ۳٤٦)، معجم كبير طبراني (۸۸۲۹، ۸۸۳۰)۔

[حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خطبہ]:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

میرے والد محترم کے کیا کہنے؟ وہ ایک بلند پہاڑ اور اونچی شاخ تھے۔ لوگوں کے سب خیالات جھوٹے ثابت ہوئے۔ وہ کامیاب ہوئے اور تم ناکام ٹھہرے، وہ آگے بڑھ گئے اور تم پیچھے رہے، جیسے گھوڑا منزل مقصود پر پہنچ کر تیز ہو جاتا ہے۔ عنفوان شباب میں وہ نوجوانِ قریش تھے۔ ادھیڑ عمر کو پہنچ کر قریش کی جائے پناہ تھے۔ قیدیوں کو چھڑاتے، تنگ دست کو کپڑے پہناتے۔ پراگندہ خاطر کو تسلی دلاتے۔ یہاں تک کہ ان کے دلوں کو آپ نے موہ لیا۔ پھر دینی کوششوں میں لگ گئے اور آپ کی غیرت وخودداری بڑھتی ہی چلی گئی۔ آپ نے اپنے گھر کے صحن میں مسجد بنا کر اسلامی عبادات کو زندگی بخشی۔ آپ حزین القلب اور کثرت سے رونے والے تھے۔ آپ کی آواز بڑی درد بھری تھی۔ مکہ کی عورتیں اور بچے آپ کی آواز سننے کے لیے جمع ہو جاتے اور آپ کا مذاق اڑاتے۔ [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:]

﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾ [البقرۃ ۱۵]

''اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے۔''

قریش کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے تیراندازی کے لیے اپنی کمانیں تان لیں اور آپ کو تیروں کا نشانہ بنا لیا۔ مگر آپ کا بال بیکا بھی نہ کر سکے اور آپ کی رفتار میں کچھ فرق نہ آیا جب دین کو استحکام نصیب ہوا۔ اس کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ لوگ فوج در فوج اس میں داخل ہونے لگے اور ہر قبیلہ جماعت در جماعت مشرف بہ اسلام ہونے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر شیطان نے اپنے خیمے گاڑ دیے۔ ان کی طنابیں کھینچ دیں اور اپنے تمام حربے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ لوگوں کے جی میں خیال آیا کہ اب ان کی امیدیں پوری ہوں گی۔ حالانکہ یہ بات غلط تھی، بھلا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ آپ ہمہ تن اس کے لیے تیار ہو گئے۔ اپنے احباب وانصار کو جمع کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی رونق رفتہ لوٹ آئی۔ اس کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے جمع ہو گیا اور اس کی کجی جاتی رہی۔ آپ نے نفاق کو لتاڑا اور اسلام کو حیاتِ نو بخشی۔ جب حق داروں نے حق کو پا لیا اور جان و مال ضائع ہونے سے بچ گئے تو آپ کا آخری وقت آ پہنچا۔ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ اس شخصیت سے پر کیا گیا جو رحم وکرم اور عدل وانصاف میں ان ہی جیسی تھی۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب تھے...... وہ ماں قابل تحسین ہے جس نے عمر رضی اللہ عنہ جیسے بیٹے کو شکم میں رکھا اور اسے دودھ پلایا۔ اس باب میں اس کا کوئی نظیر نہیں۔ آپ نے کفر کی مٹی پلید کر دی۔ شرک کو پارہ پارہ کر دیا اور دور افتادہ علاقوں کو فتح کر لیا۔ زمین نے اپنے خزانے اگل دیے اور جو کچھ چھپا رکھا تھا وہ نکال پھینکا۔ یہ مال وزر آپ کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور آپ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے، یہ تعاقب کرتا اور آپ بچ نکلتے۔ زندگی بھر ورع و زہد سے رہے اور اسی حالت میں دنیا چھوڑ کر راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

اب مجھے بتائیے کہ تمھیں کس بات میں شک ہے اور تم میرے والد پر کیا حرف گیری کرتے ہو؟ آیا ان کے عہد خلافت پر جب وہ عدل وانصاف کے تقاضوں پر عمل پیرا تھے۔ یا ان کے یوم وفات پر جب وہ تم پر مہربان تھے (کہ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ جیسے شخص کو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر کیا)۔

یہ خطبہ جعفر بن عون نے اپنے والد سے اور اس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔'' یہ سب بخاری و مسلم کے راوی ہیں۔

اب باقی رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو آپ نے ان چھ حضرات کو متقارب الصفات خیال کیا تھا اور کسی کو بھی ترجیح نہ دی۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی ایسی صفت تھی جو دوسرے میں نہیں تھی۔ اور آپ کا خیال تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو متعین کردیا تو اس سے ایک گونہ خلل واقع ہوگا۔ اور اس کی تہمت آپ پر آئے گی۔ پس آپ نے اللہ تعالیٰ کے خوف سے کسی ایک کو خاص طور پر متعین نہ کیا۔ اور آپ کو یہ بھی علم تھا کہ ان چھ افراد سے بڑھ کر کوئی دوسرا خلافت کا مستحق نہیں ہے۔ پس آپ نے دونوں مصلحتوں کو یک جا کردیا۔ ان چھ کی شوریٰ بنادی کہ ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا مستحق نہیں ہے۔ اور کسی ایک کو خاص طور پر متعین نہ کیا اس خوف سے کہ کہیں آپ سے کوتاہی نہ ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان پر واجب کیا ہے کہ حسب الامکان مصلحت پر عمل پیرا رہے۔ پس آپ کا فعل انتہائی مصلحت پر مبنی تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ کچھ معاملات ضرور ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا ختم کرنا یا بجا لانا ممکن نہیں ہوتا؛ تو ایسے افعال تکلیف شرعی کے حکم میں داخل نہیں ہوتے۔ اور معاملہ ایسے ہی تھا جیسے آپ نے سوچا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا مبنی بر مصلحت تھا، کیوں کہ آپ ہر اعتبار سے اس کے مستحق تھے اور جملہ کمالات سے بہرہ ور تھے۔[بعد میں ہر عاقل نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کی داد دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فعل بھی مصلحت سے عاری نہ تھا]۔ آپ کے نزدیک وہ چھ حضرات صفات و کمالات میں ایک دوسرے کے لگ بھگ تھے۔ اس لیے آپ کسی کو بھی ترجیح نہ دے سکے۔ ہر شخص میں ایک ایسی انفرادی فضیلت تھی جو دوسرے میں نہ تھی، بنا بریں زہد و ورع کے تقاضا سے آپ نے کسی کو متعین نہ کیا اور امکانی حد تک امت کی مصلحت کو پیش نظر رکھا۔ اور امکان تھا کہ کسی ایک کو متعین کرنے کی صورت میں کچھ اختلاف پیدا ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی طبیعت کو ایسا ہی بنایا بھلے وہ کتنے ہی بڑے اولیاء اللہ اور متقی ہی کیوں نہ ہوں۔

ان چھ حضرات نے بالاتفاق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کردیا۔ آپ کے انتخاب میں مصلحت زیادہ اور فساد کم تھا۔ واجب بھی یہی ہے کہ ایسے شخص کو منصب خلافت پر فائز کیا جائے جس کی مصلحت فساد پر غالب ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ خوف محسوس کرتے تھے کہ کہیں وہ لوگوں پر کوئی ایسی بات نہ مسلط کردیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اور آپ یہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے اپنے اختیار سے کسی ایک کی بیعت کرلی تو مصلحت پوری ہوجائے گی۔ یہی آپ کی زندگی اور موت کے مابین احوال کا فرق تھا۔ زندگی میں آپ خود خلیفہ تھے۔ آپ پر واجب ہوتا تھا کہ اس کو مسلمانوں پر والی بنائیں جو ان کے نظام و امور کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ تو آپ ایسے ہی کرتے رہے۔ اور مرنے کے بعد آپ پر کوئی چیز واجب نہیں تھی۔ اس لیے کہ یہ ممکن تھا کہ مسلمان اپنے میں سے کسی مثالی انسان کی اتباع پر جمع ہوجائیں [اور اسے اپنا خلیفہ منتخب کرلیں]۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آثار سے معلوم ہوگیا تھا کہ آپ کے بعد لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اطاعت پر جمع ہوجائیں گے؛ تو آپ نے ارادہ کرنے کے باوجود عہد نامہ تحریر نہ کیا۔[بروایت صحیحہ آپ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

''اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کردوں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو مجھ سے افضل تھے ایسا کیا تھا اور اگر کسی کو خلیفہ نہ بناؤں تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ میرے سامنے موجود ہے۔''](صحیح بخاری؛حدیث۷۲۱۸)

خلیفہ کے لیے شرعاً ضروری نہیں کہ وہ اپنی موت کے بعد کسی کو خلیفہ مقرر کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کسی واجب کو ترک نہیں کیا۔ جب آپ سے کسی متعین انسان کو خلیفہ مقرر کرنے کے بارمیں تکرار کیا گیا؛ اور آپ سے کہا گیا: ''اگر آپ ان میں سے کسی کو متعین کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اس خلافت کو ضائع نہیں کرے گا اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو ضائع کرے گا۔ بیشک میرا وقت آگیا ہے۔ پس اب خلافت ان چھ افراد کی شوریٰ میں سے ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے رضامندی کی حالت میں فوت ہوئے ہیں۔''

[تو آپ نے یہ معاملہ چھ صحابہ کی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ جن سے آخری وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی رہے تھے]۔

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا؛ اور کتابیں نازل فرمائیں؛ تاکہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کی جس قدر ممکن ہو اصلاح ہو سکے۔ ان سے مقصود یہ نہیں تھا کہ فساد بالکل ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ انسانی طبیعت کے لحاظ سے ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کسی قدر فساد کا ہوتے رہنا ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ﴾ [البقرة ۳۰]

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ: ایسوں کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کریں اور خون بہائیں؛ ہم تیری تسبیح اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔''

یہی وجہ ہے کہ کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں شر اور فساد نہ ہو۔ ہم سے پہلے بہترین امت بنی اسرائیل کے لوگ تھے۔ ان کے بارے میں جس شر اور فساد کا علم ہو سکا ہے وہ جملہ فساد کا کچھ حصہ ہے۔

ہماری امت اللہ کے ہاں سب سے بہترین اور عزت والی امت ہے۔ اور اس امت کے پہلے تین قرون بہترین قرون ہیں اور ان میں سب سے افضل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ ہماری امت میں بھی شر بہت زیادہ ہے۔ لیکن یہ شر اور فساد بنی اسرائیل کے شر و فساد کی نسبت بہت کم ہے۔ بنی اسرائیل کا شر ان لوگوں کے شر سے بہت کم ہے جو کہ کافر ہی رہے اور انہوں نے کسی بھی نبی کی بات نہیں مانی۔ جیسے فرعون اور اس کی قوم کے لوگ۔ ہر وہ خیر و بھلائی جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے امت اسلامیہ میں بھی ویسی ہی خیر و بھلائی بلکہ اس سے بہتر خیر موجود ہے۔ یہی حال اس امت کے پہلے لوگوں کا اور آخری لوگوں کا ہے۔ ہر وہ خیر و بھلائی جو بعد کے لوگوں میں پائی جاتی ہے؛ متقدمین میں اس سے بڑھ کر خیر و بھلائی موجود تھی۔ اور ہر وہ برائی جو کہ پہلے لوگوں میں تھی؛ بعد میں آنے والوں میں اس سے بڑھ کر برائی اور فساد موجود ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن ۱٦]

''تم سے جتنا ہو سکے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن سے آخری وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راضی رہے تھے؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلافت کا معاملہ ان چھ صحابہ کی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ اس وقت میں ان سے افضل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے

ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عنصر ایسا بھی تھا جس کو آپ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں کئی ایک مسائل ایسے تھے جن کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کوئی ایسا انسان خلیفہ نہیں بنا جو سیرت و کردار میں آپ سے بہتر ہو۔اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان سے کوئی بہتر خلیفہ بن سکا۔اور نہ ہی اس کے بعد کے مسلمان بادشاہوں میں سے کوئی بھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر اچھی سیرت و کردار کا مالک ایسا بادشاہ بنا جس کی سیرت و کردار اور فضائل کا تذکرہ لوگوں کی زبانوں پر ہو۔

جب ان میں سے کسی ایک کے گناہ ہوسکتے ہیں؛ تو پھر دوسرے لوگوں کے گناہ ان سے کئی گنا بڑھ کر ہوسکتے ہیں اور نیکیوں میں ان سے کم ہوسکتے ہیں۔یہ ایسے امور ہیں جن کی معرفت حاصل کرنا ضروری ہے۔اس لیے کہ جاہل انسان کی مثال مکھی کی ہے جو کہ صحیح اور پاکیزہ چیزوں کو چھوڑ کر گند اور گندگی پر بیٹھتی ہے۔عاقل انسان کی نشانی ہے کہ وہ تمام امور کو وزن کر کے پرکھتا ہے۔

شیعہ لوگوں کا جاہل ترین طبقہ ہے۔اس لیے کہ یہ جن لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے ان پر عیب لگاتے ہیں ان سے بڑھ کر عیب ان لوگوں میں موجود ہوتے ہیں جن لوگوں کی مدح سرائی کرتے ہیں۔اگر ان کو کسی میزان میں پرکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ جن لوگوں کی یہ لوگ مذمت کرتے ہیں حقیقت میں وہ ان لوگوں سے زیادہ فضیلت کے حق دار ہوتے ہیں جن کی یہ تعریف کرتے ہیں۔

شیعہ مصنف نے سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کا جو ذکر کیا ہے۔اس ضمن میں واضح ہو کہ صحابہ کے نزدیک احادیث نبویہ کے پیش نظر امامت و خلافت قریش کے قبیلہ میں محدود و محصور تھی۔اسی دلیل سے سقیفہ بنی ساعدہ کے دن انھوں نے انصار کے خلاف حجت پیش کی تھی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خلافت قریش میں ہی رہے گی جب تک لوگوں میں سے دو افراد بھی باقی رہیں گے۔''

اور ایک روایت میں ہے:''جب تک ان میں سے دو افراد بھی باقی رہیں گے۔''[مسلم ۳/ ۱٤٦٨؛ البخاری ٤/ ۱۷۹]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگ خلافت کے معاملہ میں قریش کے تابع ہیں۔ان کا مؤمن ان کے مؤمن کے تابع اور ان کا کافر ان کے کافر کے تابع ہے۔''[مسلم ۳/ ۱٤٥۱؛ البخاری ٤/ ۱۷۸]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''لوگ بھلائی اور برائی میں قریش کی پیروی کرنے والے ہیں''۔[صحیح مسلم: أیضاً؛214۔]

صحیح بخاری میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خلافت قریش میں رہے گی جب تک وہ دین کو درست رکھیں گے؛جو شخص بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اوندھے منہ گرا دے گا۔''[صحیح بخاری: ح۷۲۷]

ان دلائل کی بنا پر سقیفہ بنی ساعدہ کے دن قریش نے انصار کے خلاف حجت پیش کی تھی۔تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ [سالم رضی اللہ عنہ کو یا] کسی غیر قریشی کو خلیفہ کیوں کہ مقرر کر سکتے تھے؟ البتہ یہ ممکن ہے کہ انھیں جزئی امامت و ولایت تفویض کرنا

چاہتے ہوں یا اس ضمن میں ان سے مشورہ لینا چاہتے ہوں یا اس قسم کے دیگر امور جن کے لیے سالم موزوں تھے۔اس لیے کہ سالم رضی اللہ عنہ بہترین صحابہ میں سے تھے۔اور جب مہاجرین ہجرت کر کے تشریف لائے تو آپ لوگوں کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔

استخلافِ عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ:

[اعتراض]:شیعہ مصنف کا یہ قول ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاضل ومفضول کو جمع کر دیا تھا؛ حالانکہ حق یہ تھا کہ فاضل کو مفضول پر مقدم کیا جاتا۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: ہم کہتے ہیں کہ:[یہ روافض کے نزدیک ہے]۔اہل سنت ان چھ حضرات کو متقارب الصفات قرار دیتے ہیں۔ان میں سے کسی اور ایک کو بھی دوسرے پر ظاہری طور پر کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔جیسے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو باقی صحابہ پر تقدیم اور فضیلت حاصل تھی۔یہی وجہ ہے کہ شوریٰ میں کبھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے لی جاتی تھی اور کبھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اور کبھی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے۔ان میں سے ہر ایک کی کوئی نہ کوئی ایسی فضیلت تھی جس میں کوئی دوسرا ان کا سہیم وشریک نہ تھا۔صحابہ شوریٰ میں متردد تھے۔

اگر شیعہ کہیں کہ علی رضی اللہ عنہ افضل تھے اور عثمان رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگ مفضول تھے۔

تو یہ قول مہاجرین وانصار کے اجماع کے خلاف ہے۔جیسا کہ کئی ایک ائمہ نے ایسے ہی کہا ہے۔ان میں سے ایک ابو ایوب السختیانی بھی ہیں۔[تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ پھر انصار ومہاجرین نے بالاتفاق مفضول کو خلیفہ کیوں بنادیا؟] بعض علماء کا قول ہے:

''جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان سے رضی اللہ عنہ افضل قرار دیتا ہے۔وہ مہاجرین وانصار پر عیب لگاتا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہم عہد نبوی میں صحابہ کی درجہ بندی کرتے ہوئے کہا کرتے تھے:

''سب سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں پھر عمر رضی اللہ عنہ اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ۔'' [1]

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:''تینوں کے بعد ہم دیگر صحابہ میں تفاوت ومراتب قائم نہیں کرتے تھے۔'' [2]

یہ اس عقیدہ وایمان کے متعلق اطلاع ہے جس پر لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی تھے۔وہ پہلے ابوبکر کو شمار کرتے تھے پھر عمر کو اور پھر عثمان کو۔رضی اللہ عنہم اجمعین۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ خبریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا کرتی تھیں؛ مگر آپ اس پر نکیر نہیں فرمایا کرتے تھے۔اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مابین یہ تفضیل نصوص سے ثابت ہے۔

مہاجرین وانصار کے طرز عمل سے بھی ثابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قسم کے اقوال پر کوئی نکیر نہیں فرمائی اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوت ہوگئے تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے بالاتفاق کسی خوف ورغبت کے بغیر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور کسی بھی منکر نے اس کا انکار نہیں کیا۔اسی لیے حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جیسا اجماع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر ہوا؛ ایسا اجماع کسی کی بیعت پر نہیں ہوا۔''

پھر آپ سے خلافت نبوت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:''ہر وہ بیعت جو مدینہ میں منعقد ہوئی ؛ وہ خلافت نبوت ہے۔'' حقیقت بھی وہی ہے جیسے آپ نے ارشاد فرمایا۔اس لیے کہ مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آخری دور میں عزت وغلبہ

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حدیث:۳۶۵۵)

[2] صحیح بخاری، باب مناقب عثمان رضی اللہ عنہ، (حدیث:۳۶۹۸)۔

کے بامِ عروج پر تھے۔ ان تمام لوگوں نے بغیر کسی لالچ کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کچھ بھی نہیں دیا گیا۔ نہ ہی کسی کو کچھ مال دیا گیا اور نہ ہی کوئی ولایت دی گئی۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ جنہوں نے سب سے پہلے آپ کی بیعت کی؛ آپ کو نہ ہی کوئی عہدہ ملا اور نہ ہی کوئی مال۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ لالچ اور طمع سے کوسوں دور تھے۔ مگر اس کے باوجود آپ نے تمام لوگوں سے مشورہ لیا۔ اس وقت بنو امیہ کے لیے کوئی شوکت و غلبہ نہیں تھا؛ اور نہ ہی اس شوریٰ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی اموی تھا۔ اور تمام صحابہ کی شان وہی تھی جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ﴾ (المائدۃ: ۵۴)

''وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں وہ مومنوں پر بڑے رحم دل اور کافروں کے مقابلہ میں سخت تھے، اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرتے تھے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے نہ تھے۔''

[خلافتِ عثمانی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین]:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر رکھی تھی کہ جہاں کہیں بھی اور جیسے بھی ہوں حق بات ہی کہیں گے۔ اور حق بات میں اللہ کے سامنے کسی ملامت گر کی ملامت کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ آپ کی بیعت کرنے والوں میں حضرت عمار بن یاسر؛ حضرت صہیب؛ حضرت ابوذر؛ حضرت خباب؛ حضرت مقداد بن الاسود اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین شامل تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: ''ہم نے سب سے بہتر شخص کو خلیفہ بنایا اور اس میں کوتاہی نہیں کی۔''

صحابہ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی تھے؛ اور نقباء میں سے عبادہ بن صامت اور ان کے امثال، اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے لوگ تھے۔ اگر یہ حق و صداقت پر مشتمل بات کہتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ بعض صحابہ عمال کے نصب و عزل کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بات چیت کیا کرتے تھے اور آپ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاتے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تو طلحہ رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ نے اس پر اعتراض کیا۔[1]

عہد نبوت میں حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کے تقرر پر جرح کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب بعض حکام کو مقرر کرتے یا معزول کرتے تو صحابہ اس پر بھی معترض ہوا کرتے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کے بعد آپ کی ولایت و قوت؛ غلبہ و شوکت اور آپ کے اعوان و انصار کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ بنو امیہ کو بھی ظہور اور غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ تاہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزل و نصب پر لوگ نقد و جرح کیا کرتے تھے۔ خلافت عثمانی کے آخری دور میں جب لوگوں نے بعض عمال پر اعتراض کیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو معزول کر دیا۔

جب لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بعض عمال کی شکایت کی کہ وہ ناجائز طور سے مال وصول کرتے ہیں تو آپ نے ان کو معزول کر کے مال اخذ کرنے سے روک دیا۔ حالانکہ یہ اعتراض کرنے والے معمولی درجہ کے لوگ تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ محتشم ہونے کے باوصف ان کی شکایات سنتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ عزت و قوت کے باوجود جلیل القدر صحابہ کی

[1] طبقات ابن سعد(۳/ ۴۲)۔

بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں سنی نہ جاتی اور اس کے باوجود وہ خلیفہ قرار پاتے ۔[اس دور میں جو فتنے اٹھے وہ اس پر مزید ہیں صحابہ کرام تلخ گھونٹ پی کر چپ رہنے کے خوگر نہ تھے]❶ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا تو وہ اس پر بھی چپ نہ رہ سکے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے کہا:

آپ نے عمر رضی اللہ عنہ جیسے متشدد کو ہم پر خلیفہ مقرر کر دیا ہے ۔ آپ اللہ کو کیا جواب دیں گے؟

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تم مجھے اللہ کا خوف دلاتے ہو؟ میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر کہوں گا کہ ''میں نے سب سے بہتر شخص کو خلیفہ بنایا تھا۔''❷

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدت کی شکایت کی اور کسی چیز کی کوئی بھی پرواہ یا رعایت نہیں کی ۔

لوگوں کی عادت ہے کہ جس شخص کے خلیفہ مقرر کیے جانے کی امید ہو، اس کی رعایت کرتے ہیں، مبادا برسر اقتدار ہو کر وہ ان سے انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے ؛ اور پھر اس سے امیدیں اور لالچ بھی ہوتی ہے ۔ یہ سب چیز موجود تھیں ۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حق بات کہنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کوئی پرواہ اور رعایت نہیں کی ۔ تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رو رعایت کی اس وقت کیا ضرورت تھی؟ اس لیے کہ آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا؛ اور ابھی آپ خلیفہ بھی نہیں بنے تھے ۔ اگر لوگوں کو اس بات کا علم نہ ہوتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی اب خلیفہ بننے کے حقدار ہیں تو وہ کبھی بھی آپ کی بیعت نہ کرتے ؛ اور نہ ہی آپ کو خلیفہ بناتے ۔

مندرجہ بالا بیانات اس بات کی غمازی کرتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو استحقاق کی بنا پر خلیفہ مقرر کیا گیا تھا ۔ یہ ایسے دلائل و براہین ہیں کہ ان پر غور و فکر کرنے سے ایک دانا شخص کی بصیرت و فراست میں اضافہ ہوتا ہے، مگر جاہل اور صاحب غرض عقل کا اندھا ہوتا ہے ۔ جو شخص واقعات سے آگاہ اور دلائل سے باخبر ہو وہ ان دلائل کو دیکھ کر حق و انصاف کا ساتھ دے گا اور اس میں صرف وہی انسان شک و شبہ کا شکار ہو سکتا ہے جو حالات و واقعات سے بالکل جاہل ہو ۔ اور نظر و استدلال سے

---

❶ مؤرخ طبری اپنی تاریخ کی جلد پنجم ، صفحہ: ۱۹۵، پر لکھتے ہیں: '' سیدنا علی رضی اللہ عنہ جب جنگ جمل کے بعد بیعت لینے سے فارغ ہوئے اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو والی بصرہ مقرر کیا تو اشتر نخعی یہ بات سن کر سخت ناراض ہوا اور کہا، پھر ہمیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر کے کیا فائدہ پہنچا؟ یمن عبید اللہ کو مل گیا ۔ حجاز قثم کو، بصرہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو اور کوفہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا'' پھر سوار ہو کر واپس چل دیا ۔ [اس سے پتہ چلا کہ قاتلان عثمان کون تھے]۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء نوازی کا اعتراض لغو ہے ۔ یہ بات دراصل ان کے فضائل و مناقب میں شمار ہوتی ہے ۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی مدح میں فرمایا کرتے تھے: آپ صلہ رحمی کرنے میں سب صحابہ سے پیش پیش ہیں ۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے بذات خود اس اعتراض کا یہ جواب دیا تھا: ''مجھ پر طعن کیا جاتا ہے کہ میں اپنے کنبہ و قبیلہ سے محبت رکھتا ہوں، میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ان پر جملہ حقوق بھی عائد کرتا ہوں ۔ جہاں تک ان کو عطیہ جات دینے کا تعلق ہے میں اپنے مال سے ان کو تحائف دیتا ہوں اور مسلمانوں کے مال کو اپنے لیے یا کسی اور کے لیے حلال نہیں سمجھتا ۔ میں عہد رسالت اور سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بھی اپنے مال سے اقارب کو دیا کرتا تھا، جب کہ مجھے مال کی شدید ضرورت تھی اور میں اس کا حریص بھی تھا ۔ اب جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میں نے اپنا سب اثاثہ اپنے قبیلہ والوں کو دے دیا ہے مجھے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے ۔

نیز جلد پنجم ، صفحہ: ۱۰۳، پر لکھتے ہیں: ''سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا مال و دولت اور اراضی بنو امیہ میں بانٹ دی تھی اور اپنے بیٹوں کو بھی وہی حصہ دیا جو دیگر اموی افراد کو ملا تھا ۔ ابو العاص کے بیٹوں سے شروع کر کے آپ نے آل حکم کے مردوں میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار درہم دیے، چنانچہ انھوں نے ایک لاکھ درہم وصول کیے ۔ بنو عثمان کو بھی اتنا ہی دیا ۔ آپ نے بنو العاص، بنو العیص اور بنو حرب میں اپنا سب اثاثہ تقسیم کر دیا ۔''

❷ طبقات ابن سعد (۳/ ٤٢)۔

بھی تہی دامن ہو۔

دلائل سے جہالت اور غور فکر میں کمی کے نتیجہ میں جہالت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ہاں جب انسان کو واقعات کا علم ہو اور دلائل کو بھی جانتا ہو؛ اور غور وفکر اور استدلال کے طریقہ کار سے بھی واقف ہو۔تو وہ بغیر کسی شک وشبہ کے دوٹوک طور پر کہہ سکتا ہے کہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی خلافت کے مستحق تھے۔اور جو لوگ اس وقت تک باقی رہ گئے تھے ان میں سب سے افضل تھے۔لوگوں کا بغیر کسی انکار کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اتفاق کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک آپ سے زیادہ کوئی بھی خلافت کا اہل نہ تھا۔اگرچہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے دل میں آپ کے خلیفہ بنائے جانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔اس کی وجہ یا تو ان کا اپنا اجتہاد ہے؛ اور یا پھر خواہش نفس کا غلبہ۔مگر یہ بات آپ کی شان میں موجب قدح نہیں ہوسکتی۔جیسا کہ کسے دوسرے کی ولایت میں ایسی کوئی بات موجب قدح نہیں ہوسکتی۔جیسے رسول اللہ ﷺ کا حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو امیر کارواں بنانا [اس پر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اعتراض کیا تھا؛ مگر آپ کی امارت پر کوئی فرق نہیں پڑا]۔اور جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نائب اور خلیفہ بنانا [اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا تھا؛ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا]۔

خلافت عثمانی میں جو خیر وفتوحات اور مصلحتیں اور خیر و برکات پائی جاتی تھیں ان کو صحیح معنوں میں تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے [1]

[عثمانی دور کی کثیر فتوحات تاریخ اسلام کا زریں باب ہیں]۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اقارب کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا اور ان کو بھاری انعامات دیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور اقرب کو ولایت وامارت پر فائز کیا جاتا رہا۔بلکہ بعض کے دور میں وہ فساد اور شر بپا ہوا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں نہیں ہوا تھا۔ بعض قریبی لوگوں کو ولایت نوازی اور مال کی بخشش میں ترجیح دی جانے لگی۔اور امت آپس میں ایک دوسرے کا خون بہاتی رہی۔اپنی دینی اور دنیاوی مصلحتوں کو فراموش کر دیا۔یہاں تک کہ کفار بلاد اسلامیہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔مسلمانوں کا اتحاد اور یکجہتی ختم ہوگئے۔فتوحات کا سلسلہ رک گیا؛ خود ان کے مابین پھوٹ پڑ گئی۔اور دشمن کے سامنے اتنے عاجز آگئے کہ بعض اسلامی شہروں پر دوبارہ کافروں نے تسلط جمالیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر تناقض کا الزام:

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

[1] سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے منادی کو یہ آواز دیتے سنا اے لوگو! صبح حاضر ہو کر اپنی تنخواہ وصول کرو۔ چنانچہ لوگ حاضر ہو کر اپنا مشاہرہ وصول کر لیتے ،بعض اوقات منادی کہتا اے لوگو! مال غنیمت میں سے اپنا حصہ لے لو۔لوگ جاتے اور پورا حصہ وصول کر لیتے۔اللہ کی قسم! میں نے بگوش خود منادی کو یہ پکارتے سنا: ارے لوگو! حاضر ہو کپڑے لے لو۔لوگ جاتے اور کپڑے لے لیتے۔اسی طرح گھی اور شہد بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں خلافت عثمانی میں مال و دولت اور روپیہ پیسہ کی فراوانی تھی۔ کرۂ ارضی پر کوئی مومن دوسرے مومن سے ڈرتا نہ تھا بلکہ الفت ومحبت کا سلوک کرتا اور اس کی مدد کرتا تھا۔(یہ روایت محدث ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے)۔

سیدنا حسن بصری رحمہ اللہ کے مشہور معاصر اور رفیق کار ابن سیرین جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم عصر تھے۔فرماتے ہیں: ''سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مال و دولت کی افراط تھی۔اس کی حد یہ ہے کہ ایک لونڈی سونے میں تول کر فروخت کی گئی تھی۔ ایک گھوڑا لاکھ درہم اور کھجور کا ایک درخت ہزار درہم کے عوض فروخت کیا گیا تھا'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے سیدنا علی وعثمان رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''تیرا برا ہو تو ایسے دو حضرات کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہا ہے جو دونوں مجھ سے افضل ہیں، تم چاہتے ہو کہ میں ایک کی قدر بڑھاؤں اور دوسرے کی گھٹاؤں۔'' (البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ (ح:٣٧٠٤)، بمعناہ۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے لیے جن صحابہ کو چنا تھا، ان میں سے ہر ایک کو آپ نے مورد طعن بنایا اور یہ ظاہر کیا کہ آپ اپنی موت کے بعد کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کرنا چاہتے۔اس کے برعکس امام متعین کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بھی بنا دی۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: یہ ہے کہ آپ نے ان چھ حضرات پر اس طرح نقد و جرح نہیں کیا تھا۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ کوئی اور شخص ان کی نسبت خلافت کا زیادہ حق دار ہے۔ بلکہ آپ کے نزدیک ان چھ سے بڑھ کر کوئی بھی خلافت کا حق دار نہ تھا۔ جیسا کہ آپ کا واضح بیان موجود ہے۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ نے صرف خلیفہ متعین نہ کرنے کا عذر اور وجہ بتائی تھی کہ چونکہ ان حضرات میں کوئی نہ کوئی مانع موجود ہے؛ اس لیے آپ نے کسی متعین شخص کو خلیفہ بنانے سے احتراز کیا۔لیکن ان چھ اشخاص کو متعین کرنے سے احتراز اس لیے نہیں کیا کہ آپ کو علم تھا کہ ان چھ سے بڑھ کر کوئی بھی خلافت کا حق دار نہیں۔ جو بات آپ صحیح سمجھتے تھے؛ اور آپ جانتے تھے کہ اس پر اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دیگا ایسی بات میں ان پر کوئی ملامت نہیں۔ جیسے کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ مقرر کرنے کا معاملہ ہے۔اور جس چیز کا آپ کو خوف یا اندیشہ تھا کہ آپ پر موجب طعن ہو سکتی ہے تو آپ نے وہ نہیں کی؛ یعنی ان میں سے کسی ایک متعین شخص کو خلیفہ نہیں بنایا۔ بلکہ یہ معاملہ انہی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

یہ آپ کے کمال عقل اور دینداری [اور خوف الٰہی] کی نشانی ہے۔کسی ایک کو امیر اس لیے متعین نہیں کیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب دینے کا بھی خوف بھی تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا آتَوا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ﴾ [المؤمنون ۶۰]

''اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''

سنن ترمذی میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ:'' کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے صدیق کی بیٹی! نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے نماز پڑھتے صدقہ دیتے اور اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان سے قبول نہ کیا جائے۔'' [جامع ترمذی: ح ۱۱۲۲]

اطاعت گزاری میں کوتاہی ہو جانے کا خوف کمال اطاعت میں سے ہے۔اور اس سے زندگی میں اور مرنے کے بعد لوگوں کو مقلد بنانے اور ان پر حکم مسلط کرنے کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔اس لیے کہ آپ اپنی حیات مبارکہ میں اپنے نائبین پر خود رقیب اور نگہبان تھے۔ان کے اقوال و اعمال کا پتہ لگاتے رہتے تھے۔انہیں ہر سال حج کرنے کا حکم دیتے تاکہ ان کے اور عوام کے مابین فیصلے کیے جاسکیں۔پس اگر وہ کوئی ایسی بات کرتے جسے آپ ناپسند کرتے ہوں تو آپ کے لیے ممکن تھا کہ آپ اسے منع کرتے اور اسکے مافات کی تلافی کرتے۔بخلاف موت کے بعد کے۔اس لیے کہ مرنے کے بعد تو آپ کے لیے ممکن نہیں تھا کہ کسی مکروہ چیز سے منع کر سکیں۔اور نہ ہی اس کی تلافی ہو سکتی تھی۔پس اس لیے آپ نے ناپسند کیا کہ مر کر کسی کو عوام پر مسلط کر جائیں۔ جب کہ چھ کو متعین کرنے کا معاملہ صاف واضح ہے کہ اس وقت میں آپ کے نزدیک یہی لوگ اس امر کے اہل تھے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے افعال میں تناقض پایا جاتا ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ] آپ نے شوری کے ارکان میں کمی کر کے چار آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی کہ خلیفہ ان میں سے ایک آدمی ہوگا۔ پھر تین آدمی مقرر کیے اور پھر ایک شخص کو یہ اختیار دے دیا۔ اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دیدیا۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ کی کمزوری اور کوتاہی بیان کر چکے تھے۔'' [انتہی کلام الرافضی]

[جواب]: جو شخص نقلی دلائل سے احتجاج کر رہا ہو تو نقلی دلیل کی سند کو ثابت کرنا اس پر لازم ہوتا ہے۔ جب قائل یہ بات کہہ دے کہ اس روایت کی سند معلوم نہیں؛ تو وہ روایت اس پر حجت نہیں ہو سکتی۔ بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے [1] مگر اس میں ایسی کوئی بات مذکور نہیں۔ بلکہ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ ان چھ حضرات نے یہ معاملہ تین اشخاص کو تفویض کر دیا تھا، پھر تینوں نے مل کر عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ اختیار دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخمی کر دیے گئے تو آپ نے فرمایا:

''بیشک لوگ کہتے ہیں: کسی کو خلیفہ بنا دیں۔ آپ نے فرمایا: میرے نزدیک ان لوگوں سے زیادہ کوئی خلافت کا مستحق نہیں؛ جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال کے وقت راضی تھے۔ پھر آپ نے حضرت علی، عثمان، زبیر، طلحہ، سعد، عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم اجمعین کا نام لیا؛ اور فرمایا: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ تمہارے پاس حاضر رہا کریں گے مگر خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ آپ نے یہ جملہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی تسلی کے لیے کہا۔ اور فرمایا کہ: ''اگر خلافت سعد رضی اللہ عنہ کو مل جائے تو وہ حقیقتاً اس کے حقدار ہیں؛ ورنہ جو شخص بھی خلیفہ بنے وہ ان سے امور خلافت میں مدد لے۔ میں نے ان کو نا قابلیت اور خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا تھا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: میرے بعد جو خلیفہ مقرر ہو اس کو وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اولین کا حق سمجھے۔ ان کی عزت کی نگہداشت کرے۔ اس کو انصار کے ساتھ بھلائی کی بھی وصیت کرتا ہوں جو دار الہجرت دار الایمان میں مہاجرین سے پہلے سے مقیم ہیں۔ خلیفہ کو چاہیے کہ ان میں سے نیک لوگوں کی نیکوکاری کو بنظر استحسان دیکھے اور ان کے خطا کار لوگوں کی خطا سے درگزر کرے۔ نیز میں اس کو تمام شہروں کے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ لوگ اسلام کی پشت و پناہ ہیں۔ وہی مال غنیمت حاصل کرنے والے اور دشمن کو تباہ کرنے والے ہیں۔ اور وصیت کرتا ہوں کہ ان سے ان کی رضا مندی سے اس قدر مال لیا جائے جو ان کی ضروریات زندگی سے زائد ہو۔ میں اس کو اعراب کے ساتھ نیکی کرنے کی وصیت کرتا ہوں اس لیے کہ وہی اصل عرب اور مادہ اسلام ہیں اور ان کی (ضروریات سے) زائد مال لے جائیں اور ان کے فقراء پر تقسیم کر دیں۔ میں اس کو اللہ تعالیٰ اور رسول کے ذمہ [اہل ذمہ] کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ ان کا عہد پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں پر زور جنگ کی جائے، اور ان سے ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لیا جائے۔ [صحیح بخاری: ج ۲ ح ۹۱٤]

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قصۃ البیعۃ والاتفاق علی عثمان بن عفان، (ح: ۳۷۰۰).

آپ نے اپنے بعد والے خلیفہ کو تمام اقسام کے لوگوں کے حقوق کی نگہداشت کی وصیت کی؛ سابقین اولین اور مہاجرین وانصار کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا؛ اور تمام شہروں کے رہنے والوں کے متعلق اور اہل بادیہ اور اہل ذمہ کے متعلق وصیتیں فرمائیں۔ حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب ان کی وفات ہوگئی تو ہم لوگ ان کو لیے جارہے تھے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام کیا اور کہا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت مانگتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ان کو داخل کردو۔

چنانچہ وہ لائے گئے اور وہاں اپنے دوستوں کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ ان کے دفن کیے جانے کے بعد وہ لوگ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں خلافت کے مستحق تھے جمع ہوئے۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''اس معاملہ کو صرف تین شخصوں پر چھوڑ دو جس پر زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں نے اپنا حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں نے اپنا حق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: میں نے اپنا حق حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔

پھر حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: تم دونوں میں سے جو شخص اس سے برأت کا اظہار کرے گا ہم خلافت کی ذمہ داری اسی کے سپرد کریں گے۔ اور اس پر اللہ اور اسلام کے حقوق کی نگہداشت لازم ہوگی؛ اور اسے غور کرنا چاہیے کہ اس کے خیال میں کون شخص افضل ہے اسی کو خلیفہ بنا دے۔ اس پر شیخین یعنی عثمان وعلی رضی اللہ عنہما نے سکوت کیا۔ جب یہ حضرات چپ رہے تو حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تم دونوں خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ میرے حوالے کرتے ہو اللہ کی قسم! مجھ پر لازم ہے کہ میں تم سے افضل کے ساتھ کوتاہی نہ کروں؟

دونوں نے کہا: یہ مسئلہ آپ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے دونوں میں سے ایک یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ: ''تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت اور اسلام میں قدامت حاصل ہے۔ جو تم کو معلوم ہے اللہ کے واسطے تم پر لازم ہے اگر میں تمہیں خلیفہ بنا دوں تو تم عدل وانصاف کرنا اور اگر میں عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دوں تو اس کی بات سننا اور اطاعت کرنا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ان سے بھی ایسا ہی کہا۔ چنانچہ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے عہد لیا پھر کہا: اے عثمان اپنا ہاتھ اٹھاؤ؛ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے اور ان کے بعد علی رضی اللہ عنہ نے ان سے بیعت کی پھر تم مدینہ والوں نے حاضر ہو کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی۔'' [صحیح بخاری: ح ٩١٤]

امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ حضرت مسور بن مخرمہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں: وہ لوگ جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا اختیار دیا تھا جمع ہوئے اور مشورہ کیا۔ ان لوگوں سے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ''میں تم سے اس معاملہ میں جھگڑنے والا نہیں ہوں لیکن اگر تم چاہو تو تم ہی میں سے کسی کو تمہارے لئے منتخب کردوں۔ چنانچہ ان لوگوں نے یہ معاملہ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ پر چھوڑ دیا۔

''لوگ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے پیچھے ہوئے یہاں تک کہ ان بقیہ لوگوں میں سے کسی کے پاس ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے ان راتوں میں مشورہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب وہ رات آئی جس کی صبح میں ہم لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

مسور رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:''تھوڑی رات گزر جانے کے بعد عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے میرا دروازہ اس زور سے کھٹکھٹایا۔ میری آنکھ کھل گئی۔انہوں نے کہا کہ: میں تمہیں سوتا ہوا دیکھتا ہوں حالانکہ اللہ کی قسم! ان راتوں میں میری آنکھ بھی نہیں لگی۔تم چلو اور زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ کو میرے پاس بلاؤ۔ میں ان دونوں کو بلا لایا۔ان سے آپ نے مشورہ کیا۔ پھر مجھے بھی بلا لیا۔ پھر مجھ سے کہا: جاؤ اور علی رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ۔ میں ان کو بلا لایا۔ ان سے بہت رات گئے تک سرگوشی کرتے رہے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھے تو ان کے دل میں خلافت کی خواہش تھی۔اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو ان کی خلافت سے اختلاف امت کا اندیشہ تھا۔ پھر عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ۔ میں ان کو بھی بلا لایا۔ تو ان سے سرگوشی کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح کی اذان نے ان کو جدا کیا۔ جب لوگوں نے صبح کی نماز پڑھی اور یہ لوگ منبر کے پاس جمع ہوئے تو مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ موجود تھے ان کو بلا بھیجا۔اور سرداران لشکر کو بلا بھیجا۔ یہ سب لوگ اس سال حج میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کیساتھ شریک ہوئے تھے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے خطبہ پڑھا پھر کہا کہ:

اما بعد! اے علی رضی اللہ عنہ! میں نے لوگوں کی حالت پر نظر کی ہے تو دیکھا کہ وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ہیں۔اس لئے تم اپنے دل میں میری طرف سے کچھ خیال نہ کرنا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا):'' میں اللہ اور اس کے رسول اور آپ دونوں خلیفہ کی سنت پر تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے بھی بیعت کی اور تمام لوگوں نے مہاجرین و انصار، سرداران لشکر اور مسلمانوں نے بیعت کی۔''[صحیح بخاری:۷۲۰۷]

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر محبت عثمان رضی اللہ عنہ کا الزام]:

[اعتراض]: رافضی مصنف کہتا ہے:''عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:''امیر المؤمنین اور عثمان رضی اللہ عنہما ایک رائے پر جمع ہو جائیں تو وہی بات مانی جائے گی جو یہ دونوں حضرات کہہ رہے ہوں۔اور اگر تین ہو جائیں تو پھر ان کی بات معتبر ہوگی جن میں عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ موجود ہوں۔اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کبھی بھی ایک بات پر اکھٹے نہیں ہو سکتے۔اور یہ کہ عبدالرحمٰن کبھی بھی اپنے بھائی سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ آپ کے چچازاد بھائی تھے۔''

[جواب]: [ہم پوچھتے ہیں کہ رافضی مصنف کو] یہ کس نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے؟ اور [اگر بطور مناظرہ] بالفرض اس بات کو درست بھی مان لیں تو اس سے یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کی کوئی خاص غرض تھی یا پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی محبت میں انہیں خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دشمنی کی وجہ سے انہیں خلافت سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔اس لیے کہ اگر آپ کا یہی مقصود ہوتا تو آپ پہلے سے خود ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیتے۔ اور اس میں کوئی دو آدمی بھی اختلاف نہ کر سکتے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا تھا جب کہ جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد زندہ رہے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تقدیم دی۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کو متعین نہیں کیا تھا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے سے انھیں کون سی چیز مانع ہو سکتی تھی؛ اگر آپ ایسا کرتے تو سب لوگ آپ کا حکم مان لیتے۔خواہ ویسے ہوتا جس اہل ایمان کہتے ہیں کہ: آپ اہل خیر اہل دین اور عادل تھے۔ یا پھر اس طرح ہوتا جیسے منافقین اور طعنہ زنی کرنے والے کہتے ہیں کہ آپ ظالم اور شریر تھے۔حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کسی سے ڈرا نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک روافض (قاتلہم اللہ) ان کو امت محمدی کا فرعون کہہ کر پکارتے ہیں۔[1] جب زندگی بھر آپ کسی سے نہیں ڈرا کرتے تھے؛ آپ نے اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لیے آگے بڑھا یا جب یہ نظام اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ اور نبی کریم ﷺ کے بعد لوگوں کے دلوں میں کسی ایک متعین شخص کی اطاعت راسخ نہیں ہوئی تھی۔ اور اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی اختیار بھی حاصل نہیں تھا۔ تو پھر آپ کو موت کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے سے کس بات کا خوف ہوسکتا تھا جب کہ سارے لوگ آپ کی بات مان رہے تھے؛ اور لوگوں میں اطاعت کا جذبہ راسخ ہو چکا تھا۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیا فائدہ حاصل ہوتا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوسکتا تھا؟ آپ کے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے درمیان قبیلہ یا غیر قبیلہ کی وجہ سے اتنے تعلقات اور قرابت داری بھی نہیں تھی جو قرابت داری حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنے بیٹے کو بھی خلافت کے امیدواروں میں سے نکال دیا تھا۔ سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو قریبی رشتہ دار [چچا زاد بھائی] ہونے کے باوجود اہل شوریٰ میں داخل نہ کیا۔ حالانکہ آپ عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے ایک تھے۔ اور آپ کا تعلق بنی عدی کے قبیلہ سے تھا۔ اور نہ ہی آپ نے بنی عدی میں سے کسی کو والی مقرر کیا۔ بس صرف ایک آدمی کو والی مقرر کیا تھا پھر اسے معزول کر دیا۔

لوگوں کا اتفاق تھا کہ آپ کو اللہ کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کی چنداں پرواہ نہیں ہوتی۔ تو پھر کون سی حاجت ایسی ہوسکتی ہے کہ آپ زید کو چھوڑ کر عمرو سے محبت کریں حالانکہ اس سے کوئی دنیاوی فائدہ بھی حاصل نہ ہوسکتا ہو؟ پھر جہاں تک آپ کے خاندان کا تعلق ہے۔ آپ نے یہ حکم دیا تھا کہ ان پر موجود قرض صرف ان کے اقارب کے اموال سے ادا کیا جائے۔ اگر اس قرض کی ادائیگی کے لئے عمر رضی اللہ عنہ کی اولاد کا مال کافی نہ ہوتو پھر بنی عدی بن کعب سے مانگنا۔ اگر ان کا مال بھی ناکافی ہوتو قریش سے طلب کر لینا۔ لیکن بیت المال سے کچھ بھی نہ لیا جائے۔ اور اس کے سوا کسی اور سے کچھ بھی نہ لیا جائے۔ تو پھر آپ کو کون سی ایسی ضرورت پیش آسکتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یا حضرت علی رضی اللہ عنہما کو یا کسی دوسرے کو مقدم کریں؟ حالانکہ نہ ہی آپ کو اپنے بعد اپنے اہل خانہ کے لیے کسی کی ضرورت ہے اور نہ ہی اپنے قرض کی ادائیگی کے لیے؟

انسان اس سے محبت کرتا ہے جو اس کے بعد اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ یا اس طرح کا کوئی دیگر معاملہ ہو۔ پھر جس انسان کی کسی معاملہ میں کوئی حاجت ہی نہ ہوتو پھر وہ کس بنا پر کوئی ایسا کام کرسکتا ہے؟

پھر آپ نے اپنے آخری وقت میں جبکہ کافر بھی مومن ہو جاتا ہے اور فاسق و فاجر بھی اللہ سے ڈرنے لگتا ہے کسی کا لحاظ کیونکر کرسکتے تھے؟ اگر آپ جانتے ہوتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بنا برنص یا عظمت وفضیلت کی وجہ سے زیادہ حق دار ہیں تو آپ رضائے الٰہی حصول کے لیے ان کو منصب خلافت پر فائز کرتے۔ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے؛ اور اپنے گناہوں کو ہلکا کرتے۔ اس لیے کہ اب آپ کے لیے کوئی دنیاوی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہ گئی تھی؛ سوائے اس قرض کے۔ اگر اس سے قرض ادا کرنے

---

[1] شیعہ سیدنا صدیق اعظم رضی اللہ عنہ کو الجبت اور سیدنا فاروق رضی اللہ عنہ کو الطاغوت کے نام سے پکارتے ہیں۔ حوالہ کے لیے جرح وتعدیل کے فن میں شیعہ کی اہم کتاب "تنقیح المقال فی احوال الرجال للمامقانی" (۱/ ۲۰۷) حالانکہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ عظیم شخصیت ہیں جن کی مدح وثنا پر مشتمل سورۂ توبہ کو لے کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ خود نبی کریم ﷺ کے حکم کے مطابق مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔

کی امید کا معاملہ ہوتا تو تب کچھ کہا جا سکتا تھا۔[لیکن ایسا بھی نہیں تھا؛ اس لیے کہ آپ نے صرف اپنے مال سے قرض ادا کرنے کی وصیت کردی تھی]۔اور یہ بات عادۃً محال ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ سے ملتے وقت ایک ایسا کام کرتے جو دین و دنیا میں آپ کے لیے مفید نہ تھا اور جس پر عذاب الٰہی کی گرفت ہونا ناگزیر تھا۔ بلکہ ایسے وہ آدمی بھی نہیں کر سکتا جس کی کسی چیز سے کوئی غرض ہی نہ ہو اور وہ موت کے وقت مہلت مل کر صحت اور عقل کے ہوتے ہوئے اپنے دین کو چھوڑ دے جس کی اسے ضرورت ہے۔

بفرض محال اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ دشمن رسول بھی تھے (جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں) تاہم صحبت نبوی کی برکت سے آپ بہت کچھ حاصل کر چکے تھے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بے حد ذہین و فطین تھے۔ دلائل نبوت جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہرہ ور تھے؛ وہ آفتاب نصف النہار کی طرح واضح تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ اگر میں نے عداوت رسول کو ترک نہ کیا تو بروز آخرت عذاب الٰہی میں گرفتار ہونا پڑے گا۔ اس پر مزید یہ کہ موت کے وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں آپ کی کوئی غرض نہیں تھی[آخر اس سے آپ کا کون سا مقصد حل ہو جاتا ؟] اور آپ کس غرض کے پیش نظر مستحق کو اس کے حق سے محروم رکھتے ؟[آخر کیا وجہ تھی کہ (بقول شیعہ) آپ آخری دم تک آل رسول اور آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت پر تلے رہے؟ حالانکہ عمر رضی اللہ عنہ وہ شخص تھے جس نے اپنی خلافت کے زمانہ میں انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ موٹے جوتے پہنے۔ عدل وانصاف کے تقاضوں پر عمل کیا، مال جمع کرنے اور جاہ ومنصب سے گریزاں رہے]۔

اگر یہ کہا جائے کہ: آپ خوف محسوس کرتے تھے کہ کہیں لوگ کہنے لگیں گے: اس نے توبہ کرلی اور رجوع کرلیا؛ جیسا کہ ابو طالب کو موت کے وقت اسلام قبول کرنے میں عار دلانے کا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا: آپ کے لیے ممکن تھا کہ توبہ کا اظہار کیے بغیر ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیں۔ اس لیے کہ اگر آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی دوسرے کو خلیفہ بناتے تو لوگ آپ کی بات سنتے اور اطاعت کرتے۔ اور اس میں کوئی بھی اختلاف نہ کرتا۔ کبھی انسان کے ذمہ میں ایسے مظالم ہوتے ہیں جنہیں وہ اس طرح سے ادا کر دیتا ہے کہ کسی کو محسوس بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ ظالم ہے۔ مرتے وقت کسی کے لیے ایسی ایسی وصیت کر جاتا ہے اور اسے وصیت میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ وصیت یا تو اس پر واجب حق ہوتا ہے یا خوف کی وجہ سے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر انہیں مرنے کے بعد خوف محسوس ہوتا۔ اس لیے کہ آپ نے اپنے اقارب کو امر خلافت سے پہلے ہی سے دور رکھا تھا۔ اور آپ کو یہ بھی پتہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عادل اور متقی ہیں؛ ان کے اہل خانہ پر کبھی بھی ظلم نہیں کریں گے۔

اگر بالفرض مان لیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے انتقام لیتے جنہوں نے پہلے پہل آپ کی بیعت نہیں کی؛ تو پھر بھی بنو عدی اس معاملہ میں لوگوں سے سب سے زیادہ دور تھے۔ اس لیے کہ نہ ہی ان کی تعداد زیادہ تھی؛ اور نہ ہی ان کی کوئی شان و شوکت تھی اور کوئی غلبہ بھی حاصل نہیں تھا۔ اور یہ سارے لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے اور آپ کی تعظیم کیا کرتے تھے۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ بغض رکھتے ہوں؛ یا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض رکھتا ہو۔ ان میں سے کسی ایک انسان کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ ہی جاہلیت میں قتل کیا اور نہ ہی اسلام میں۔ ایسے ہی بنو تمیم سارے کے سارے آپ سے محبت رکھتے تھے اور آپ ان سے محبت رکھتے تھے۔ ان میں سے بھی کسی ایک انسان کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

نہ ہی جاہلیت میں قتل کیا اور نہ ہی اسلام میں ۔

دوسری بات : ان سے کہا جائے گا کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت رہی ہے کہ جب آپ سے کسی بات میں بحث کی جاتی تو آپ حق کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے۔اور ایسے کئی ایک واقعات ہیں کہ جب آپ کیلئے حق واضح ہو گیا تو آپ نے حق بات کی طرف رجوع کر لیا۔ یہ رجوع کرنا ہی توبہ ہے۔آپ فرماتے تھے: مرد سے غلطی ہوگئی اور عورت نے درستگی کو پالیا۔''

اور آپ توبہ کی تجدید کرتے رہتے تھے؛ اس لیے کہ آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ پوری زندگی آپ کا یہی وظیفہ رہا۔ حالانکہ زمین پر آپ کا سکہ چل رہا تھا۔تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ موت کے وقت توبہ نہ کرتے ؟

آپ کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ آپ کوئی حیلہ اختیار کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا دیتے ۔ اور کسی قابل مذمت چیز کو ظاہر بھی نہ ہونے دیتے۔ جیسا کہ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے حیلہ اختیار کیا تھا۔ اگر آپ یہ جانتے ہوتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کوئی دوسرا اس کا حق دار نہیں ہے تو آپ کے لیے بہت ساری راہیں ایسی تھیں کہ آپ حضرت کو خلیفہ مقرر کر دیتے اور لوگوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔

❀ ایسے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رافضی کا یہ قول بھی ہے :'' آپ جانتے تھے کہ علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کبھی بھی ایک بات پر اکھٹے نہیں ہو سکتے۔''

[جواب:] یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہے۔آپ کی ساری زندگی میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین کوئی اختلاف یا جھگڑا نہیں ہوا۔ بلکہ یہ دونوں حضرات باقی چاروں کی نسبت آپس میں بہت زیادہ قریب تھے ۔ دونوں کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا۔اور اس وقت تک بنو عبد مناف سارے ایک مٹھی کی طرح تھے۔حتی کہ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے ؛ اور خلیفہ بننے کے بارے میں کہنے لگے ۔اس لیے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی کے بیٹے تھے ۔ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ میں ابھی تک جاہلیت کی رمق باقی تھی۔انہیں یہ بات ناگوار تھی کہ ان کے قبیلہ پر کوئی دوسرا آدمی حاکم بنے۔اور یہ پسند کرتے تھے کہ خلافت و امارت بنو عبد مناف میں ہی باقی رہ جائے۔ ایسے خالد بن سعید رضی اللہ عنہ بھی اس وقت غائب تھے۔ جب آپ حاضر ہوئے تو آپ نے بھی حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما سے بات کی اور کہنے لگے: کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ خلافت بنو عبد مناف سے نکل جائے؟

[بنو ہاشم و بنو امیہ کے باہمی روابط]:

جو انسان کچھ تھوڑا بہت بھی جانتا ہے اسے ان لوگوں کی سیرت اور کردار کا علم ہے۔اسے علم ہے کہ عہد رسالت مآب میں اور خلافت صدیقی و فاروقی میں بنو ہاشم و بنو امیہ کے مابین حد درجہ یگانگت و اتحاد پایا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے سال جب ابو سفیان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے مکہ سے نکلا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا تو اسے اپنے پیچھے سواری پر بٹھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو کوئی منصب عطا کیجیے کیوں کہ یہ عزت و جاہ کا حریص ہے۔ [1]

---

[1] سنن ابی داؤد۔ کتاب الخراج باب فی خبر مکۃ (حدیث:۳۰۲۱، ۳۰۲۲)۔

یہ سب محبت کی کرشمہ سازی ہے اس لیے کہ بنو ہاشم و بنوامیہ دونوں بنی عبد مناف سے تعلق رکھتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حد بندی کے بارے میں کسی مسلمان کے ساتھ جھگڑا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چند آدمیوں کے ساتھ نکلے، ان میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حد کے ایک نشان کے بارے میں دریافت کیا کہ آیا یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی موجود تھا؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا؛ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر یہ ناروا ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے تبدیل کر دیتے۔'' اس جھگڑا میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا حالانکہ علی رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے۔ بلکہ آپ نے ابن جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''خصومات کا معاملہ بڑا دشوار ہوتا ہے اور شیطان ان میں آ دھمکتا ہے۔''

اس محاکمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابن جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر فقہاء نے اس سے احتجاج کیا ہے کہ فریق مخالف کی مرضی کے بغیر خصومات میں وکیل بنانا جائز ہے۔ امام شافعی اور اصحاب احمد بن حنبل رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء جب واپس آئے تو ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا: تمھیں معلوم ہے کہ معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہمارا ساتھ کیوں دیا؟ پھر خود ہی اس کی وجہ بتائی کہ ہم (بنو ہاشم) اور بنوامیہ دونوں بنی عبد مناف سے تعلق رکھتے ہیں۔''

ایک مرتبہ ایک عدالت میں مقدمہ پیش آیا جس میں ایک قاضی القضاۃ نے ہم سے مشورہ لینا چاہا۔ انھوں نے ایک کتاب پیش کی جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس مقدمہ کا ذکر تھا وہ ''المنافیہ'' کا مطلب نہ سمجھ سکے؛ تو میں نے انھیں اس کا مطلب سمجھایا کہ سب بنو عبد مناف عہد رسالت اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں متحد تھے۔ ان میں اختلاف بہت بعد میں واقع ہوا۔ ایسا اس وقت ہوا جب ان کے مابین امارت کا جھگڑا شروع ہوا۔ جیسا کہ بنو ہاشم عہد رسالت مآب میں؛ عہد خلفاء راشدین میں اور بنوامیہ کے دور میں ایک ہی چیز تھے۔ ان کے مابین اس وقت اختلاف واقع ہوا جب بنو عباس حکمران بن گئے اور ان کے اور بعض بنوابی طالب کے درمیان تفریق اور اختلاف پیدا ہو گیا۔

یہ سب لوگوں کی عادت ہے۔ جب تک لوگوں کے مابین مال؛ جاہ و مرتبہ یا دیگر کوئی ایسی جھگڑا پیدا کرنے والی چیز نہیں ہوتی تو سارے متفق ہوتے ہیں۔ اور اگر ان کا کوئی دشمن ہوتا ہے تو سارے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور جب خود انہیں اختیار مل جاتا ہے تو پھر آپس میں جھگڑنے لگتے ہیں۔

بنو ہاشم آل علی اور آل عباس بنوامیہ کے دور میں متفق تھے۔ ان کے مابین کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ جب ان میں ایسے لوگ سامنے آئے جو رضائے آل محمد کی طرف دعوت دینے لگے؛ تو بعض علویوں کے دل میں بھی اقتدار کی طمع انگڑائیاں لینے لگی۔ جعفر بن محمد اور دوسرے لوگ جانتے تھے کہ خلافت صرف آل عباس میں ہی چل سکتی ہے۔ جب انہوں نے اموی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ہاشمیوں کی حکومت قائم ہو گئی اور سفاح نے ایک شہر بھی بسایا جس کا نام ''الہاشمیہ'' رکھا۔ پھر جب منصور خلیفہ بنا تو ہاشمیوں کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس وقت محمد اور ابراہیم پسران عبداللہ بن حسن نے منصور کے خلاف خروج کیا۔ اور منصور ان کے مقابلہ کے لیے لشکر لے کر نکلا۔ ایک بہت بڑا فتنہ برپا ہوا۔ جس میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہوئی۔

پھر عباسیوں کا آپس میں اختلاف ہوا؛ جیسا کہ امین اور مامون کے اور دوسرے عباسیوں کے مابین اختلاف مشہور

ہے۔ایسے واقعات کا پیش آنا عام عادت کے مطابق ہے۔

[الغرض اس موقعہ پر]حضرت عثمان وعلی رضی اللہ عنہما نے اپنی مرضی سے بلا جبر و اکراہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو انتخاب امام کا اختیار تفویض کر دیا تھا۔[اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ان اصحاب کی مرضی اور اتفاق سے ہوا]۔

[اعتــــراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:''عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنے بھائی اور چچازاد(حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے سوا کسی اور کو خلیفہ مقرر نہیں کر سکتے۔''

[جـــواب]:یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر صاف جھوٹ اور شیعہ کی علم الانساب سے جہالت کا بین ثبوت ہے۔اس لیے کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برادر اور ابن العم ہرگز نہ تھے۔ بلکہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہم قبیلہ بھی نہ تھے۔ بخلاف ازیں وہ بنوزہرہ کے قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ بنوزہرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ننھال تھے،اس لیے اس کا میلان بنی ہاشم کی جانب تھا۔البتہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ قبیلہ بنوزہرہ میں سے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:''یہ میرے ماموں ہیں؛اور انسان کو چاہیے کہ اپنے ماموں کا خیال کرے۔''[1]

[یہ کہا جاسکتا تھا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے قبیلہ بنوزہرہ سے تعلق رکھتے تھے پھر ان کو خلیفہ کیوں نہ مقرر کر دیا؟]

مزید برآں حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مابین مواخات بھی نہیں تھی اور نہ ہی ان اتنے زیادہ گہرے تعلقات تھے۔اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین اور مہاجرین کے مابین مواخات قائم نہیں کی تھی۔ بلکہ مؤاخات کا رشتہ مہاجرین اور انصار کے مابین قائم ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اور سعد بن ربیع الانصاری رضی اللہ عنہ کے مابین مواخات قائم کی تھی۔ یہ حدیث بڑی مشہور اور ثابت ہے اور صحاح میں موجود ہے۔ حدیث کا علم رکھنے والے اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔عثمان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے مابین کوئی مواخات نہیں تھی۔

[اعتراض]:شیعہ مصنف لکھتا ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تھا کہ اگر تین دن تک بیعت نہ کریں تو ان سب کو قتل کر دیا جائے۔''

[جـــواب] :پہلی بات: ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ کس دلیل سے ثابت ہے؟ اور کس نے کہا کہ یہ روایت صحیح ہے؟ مشہور بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار کو حکم دیا تھا کہ ان سے جدا نہ ہوں اور جانے سے پہلے چھ اشخاص میں سے ایک کی بیعت کر لیں۔

دوسری بات: یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جھوٹ گھڑا گیا ہے۔ اہل علم میں سے کسی ایک نے بھی کسی بھی معروف سند سے اس واقعہ کو نقل نہیں کیا۔ اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی ایسا حکم دیا۔ یہ چھ اشخاص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک منتخب روزگار تھے۔ پھر آپ ان کے قتل کا حکم کیوں کر صادر کر سکتے تھے؟ اگر انہیں قتل کر دیا جاتا تو بہت بڑا فتنہ وفساد پیدا ہو جاتا۔ نیز یہ کہ انصار ان کو قتل کرنے کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اطاعت کیسے کر سکتے تھے؟[کیونکہ یہ لوگ ا۔ بے گناہ تھے۔۲۔اپنی اپنی قوم کے بڑے تھے؛ قوم انہیں کیسے قتل کر سکتی تھی؟]۔ اگر آپ قتل کا حکم صادر کرتے تو یہ بھی بتاتے کہ ان کے بعد کس شخص کو اس

[1] سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب ابی اسحاق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (حدیث:۳۷۵۲)۔

منصب پر فائز کیا جائے۔ آپ کیسے ان لوگوں کو قتل کرنے کا حکم دے سکتے ہیں جب کہ ان کے بعد کسی کو خلیفہ بھی مقرر نہیں کیا؟

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہ سب اپنے اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ ان کو قتل کرنے کی جرأت کون کرتا؟ جب کہ ساری امت ان کی اطاعت گزار تھی۔ ان کے ساتھ لشکر اور قبائل تھے۔ اگر سارے انصار مل کر بھی ان میں سے کسی ایک کو قتل کرنا چاہتے تو ایسا کرنے سے عاجز رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شر وفتنہ سے انصار کو محفوظ و مامون رکھا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ انصار کی ایک چھوٹی سی جماعت کو ان چھ حضرات کو اکٹھے قتل کرنے کا حکم بھی کیسے دے سکتے تھے؟ [کس جرم کی بنا پر یہ حکم دیتے؟] اور اگر مان لیا جائے کہ آپ نے ایسا کوئی حکم دیا بھی ہوتا تو کیا یہ حضرات خاموش رہتے؟ اور انصار انہیں قتل کرنے پر قادر ہو جاتے؟ جب کہ وہ ایسی جگہ پر جمع تھے جہاں ان کا کوئی اور مددگار بھی نہ تھا؟

اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ چھ حضرات خلیفہ بننا پسند نہیں کرتے تھے؛ اور ان میں سے کوئی خلیفہ نہ بنا کوئی ساتواں آدمی خلیفہ بن گیا تو پھر ان کو قتل کرنا کس بنا پر جائز ہوا؟ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہیں؛ آپ کو ہمیشہ خلافت کی پیش کش کی جاتی رہی؛ مگر آپ نے کبھی بھی اسے قبول نہیں کیا۔ لیکن انہیں تو کسی نے بھی قتل نہیں کیا۔ حکمین کے موقع پر آپ کو خلافت کے لیے متعین کیا گیا مگر آپ چھپ گئے؛ پھر بھی کسی نے آپ کو کوئی تکلیف نہیں دی۔ ہم نے ایسا کبھی نہیں سنا کہ کسی شخص نے خلیفہ بننے سے انکار کیا ہو اور اس جرم میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو۔

یہ روایات ایسے جھوٹے کذاب کی انشاء پردازیاں ہیں جسے کوئی پتہ نہیں کہ وہ کیا لکھتا ہے اور کیا کرتا ہے نہ ہی شرعاً اور نہ ہی عادتاً [اسے کسی چیز کا کوئی علم نہیں]۔

مرکب جواب: یہ معاملہ دو صورتوں سے خالی نہیں ہے:

پہلی صورت: یا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہوگا۔

دوسری صورت: آپ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

اگر آپ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر اس کا انکار کرنا باطل ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا تو پھر اگر شریعت کا تقاضا ہو کہ کسی کو قتل کیا جائے تو کسی انسان کا جنتی ہونا؛ یا اللہ کا ولی ہونا اس قتل میں مانع نہیں ہو سکتا۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غامدی عورت کو رجم کیا؛ اور فرمایا:

''بیشک اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اسے معاف کر دیا جاتا۔ اس سے بڑھ کر توبہ کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی جان ہی پیش کر دی۔'' [پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا اور اس کا جنازہ ادا کیا گیا اور دفن کیا گیا]۔ [صحیح مسلم: ج ۲، ح: ۱۹۴۰]

یہ اس عورت کے لیے گواہی دے رہے ہیں۔ لیکن جب حد اس پر ثابت ہو چکی تھی تو آپ نے اسے رجم کر دیا۔

اگر کسی انسان پر قصاص واجب ہو جائے؛ اور وہ انسان بڑے اولیاء اللہ میں سے ہو؛ اور اس نے قتل عمد سے توبۃ النصوح [پکی اور سچی توبہ] کر لی ہو؛ تو پھر بھی واجب ہو جاتا ہے کہ اسے مقتول کے ورثاء کے سپرد کیا جائے۔ اگر وہ چاہیں تو اسے قتل کر دیں۔ اس کا قتل کیا جانا اس کے حق میں کفارہ ہوگا۔

جب قتل کے بغیر مصلحت پوری نہ ہوسکتی ہو تو تعزیراً قتل کرنا ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ جیسا کہ مسلمان جاسوس کو قتل کرنا۔
اس میں مسئلہ میں علماء کرام کے دو قول ہیں؛ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں بھی یہی دو روایات ہیں۔

پہلا قول: اس کو قتل کرنا جائز ہے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے' اور ابن عقیل رحمہ اللہ نے بھی یہی اختیار کیا ہے۔

دوسرا قول: اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ امام شافعی رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔ اور قاضی ابو یعلی اور دوسرے علماء نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ رحمہم اللہ۔

صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو' اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کردو۔'' [صحیح مسلم ۳/ ۱۴۷۹، وسنن ابو داؤد ٤/ ۳۳٤]

اور شراب پینے والے کے بارے میں فرمایا:

''اگر یہ چوتھی بار شراب پیئے تو اسے قتل کردو۔'' [سنن أبي داؤد ٤/ ۲۲۸؛ الترمذي ۲/ ٤٤۹]

پھر اگر مان لیا جائے کہ آپ نے مہاجرین اور انصار میں سے کسی کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا؛ تو یہ آپ کا اجتہاد تھا؛ اور آپ کے لیے اجتہاد جائز تھا۔ اور یہ بات اس انسان کے اہل جنت ہونے میں مانع نہیں ہوسکتی۔ اور نہ ہی یہ بات آپ کے عدل و انصاف پر موجب قدح ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہی آپ کے جنتی ہونے میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ تو پھر جب کوئی واقع پیش ہی نہیں آیا تو کیسے اعتراض کیا جاسکتا ہے؟

بالفرض اگر اس واقعہ کو سچا بھی تسلیم کرلیں تو یہ امر موجب حیرت ہے کہ روافض کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان چھ حضرات کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا سب واجب القتل تھے۔ اور عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیدیا تھا تو پھر رافضی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ مکاریاں کیوں کرتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو خلیفہ بنا کر ان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ پھر ان کو تہ تیغ کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں یہ ''جمع بین الضدین'' نہیں تو اور کیا ہے؟

- اگر شیعہ کہیں کہ اس سے مقصود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل کرنا تھا۔
- تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ: ''اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ باقی لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لیتے تو پھر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قتل نہ کیا جاتا۔ اس لیے کہ قتل اسے کیا جاتا ہے جس سے کوئی خوف محسوس ہو رہا ہو۔ [حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا]۔ نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت میں شرکت نہ کی مگر کسی شخص نے انھیں نہ ہی پیٹا نہ ہی قید کیا جب کہ قتل کرنا تو درکنار بات ہے۔

ایسے ہی جو لوگ کہتے ہیں کہ: بنو ہاشم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی۔ تاہم آپ نے انھیں کچھ نہ کہا؛ نہ ہی ان میں سے کسی کو مارا پیٹا گیا اور نہ ہی اسے بیعت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہاں تک کہ بلا جبر و اکراہ خود حاضر ہو کر انھوں نے بیعت کرلی۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جن کی بیعت متعین ہوچکی تھی؛ [آپ کی بیعت سے پیچھے رہنے پر نہ ہی کسی کو قتل کیا گیا اور نہ ہی کسی کو مارا پیٹا گیا] تو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت سے پیچھے رہنے پر کیسے قتل کرنے کا حکم دیا

جا سکتا ہے؛ جب کہ ابھی تک آپ کی بیعت متعین بھی نہیں ہوئی۔

حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تمام بنی ہاشم کی تعظیم و تکریم بجالاتے رہے اور باقی لوگوں پر انہیں مقدم رکھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''لوگو! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے آپ کے اہل بیت کا خیال رکھو۔''❶

[اکرام اہل بیت اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما]:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، وہاں دیگر بنو ہاشم بھی تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کی مدح وستائش کی۔ اس کے جواب میں بنو ہاشم نے آپ کے مستحق خلافت ہونے کا اعتراف کیا اور بیعت کرنے میں تاخیر پر اپنا عذر پیش کرنے لگے؛ اور آپ کی بیعت اس حال میں کی کہ آپ ان کے پاس اکیلے تھے۔❷

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی آپس میں محبت والفت کے بارے میں آثار واحادیث اس کثرت سے ہیں جن سے ایسی جھوٹی روایات کی عمارت خود بخود دھڑام سے گر جاتی ہے۔

اگر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما اپنے اپنے عہد خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی طرح بھی الم ورنج پہنچانا چاہتے تو وہ بہمہ وجوہ اس کی قدرت رکھتے تھے۔ مگر ان کا مقام بلحاظ تقویٰ اس سے کہیں بلند تھا کہ وہ ایسی پست حرکات پر اتر آتے؛ اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد [جبکہ اس گھرانے کو ہمدردوں اور غمگساروں کی ضرورت تھی]۔

جاہل شیعہ اس زعم فاسد میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس وقت ظلم کا نشانہ بنایا جب وہ ظلم کی مدافعت کر سکتے تھے۔ اور یہ دونوں حضرات اگر چاہتے بھی تو آپ پر ظلم کرنے سے عاجز تھے۔ پھر جب انہیں قوت اور طاقت حاصل ہوگئی؛ اور لوگ ان کی اطاعت کرنے لگے تو اس وقت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم وستم کیوں نہ ڈھایا؟ جیسے سلاطین وملوک کی عادت ہے کہ جس کا خوف انھیں دامن گیر رہتا ہو وہ اپنے عروج کے زمانہ میں اس پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ یا اسے قید کر دیتے ہیں یا پھر اسے خفیہ طریقہ سے قتل کرا دیتے ہیں۔ یا اعلانیہ قتل کر دیتے ہیں۔ اگر ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما واقعی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مظالم توڑنا چاہتے تھے تو پھر انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ آپ کو کسی حیلہ سے قتل کیوں نہیں کیا یا پھر انہیں قید میں کیوں نہ ڈالا؟ اگر یہ لوگ ایسا کرنا چاہتے تو یہ بات ان کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وجود نص کے باوجود (جیسا کہ شیعہ کا خیال ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو محروم خلافت کرنے سے بھی آسان تر تھی۔

ایسے بھی ہوسکتا تھا کہ آپ کو کسی لشکر پر امیر بنا کر بھیج دیا جاتا؛ اور کسی فوجی کو کہہ دیا جاتا کہ وہ آپ کو قتل کر دے۔ یا زہر دیدے؛ یہ ساری باتیں ممکن تھیں۔

خلاصہ کلام! والی کا اپنے اس حریف سے دفاع کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے جو ولایت میں جھگڑا کر رہا ہو یا جو کہہ رہا ہو کہ وہ خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کے لیے قتل؛ قید؛ ایذا رسانی اور ملک بدری کا کوئی بھی حیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب مناقب قرابة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ح:٣٧١٣)۔

❷ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر، (حدیث:٤٢٤٠، ٤٢٤١)، صحیح مسلم، کتاب الجهاد۔ باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، "لا نورث ما ترکنا فهو صدقة" (حدیث:١٧٥٩)۔

اس کے عین برعکس یہ دونوں حضرات حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتہائی درجہ کا احترام کرتے: آپ کو ہر موقع پر مقدم رکھتے ۔ یہی نہیں بلکہ سارے بنی ہاشم کو دوسرے لوگوں پر عطیات میں ترجیح دیتے ۔ آپ کو مرتبہ؛ عزت و احترام؛ محبت؛ دوستی؛ تعریف و توصیف اور مدح وثنا میں باقی لوگوں پر مقدم رکھتے ۔ اور آپ کو ایسے ہی فضیلت دیتے جیسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان لوگوں پر فضیلت دی تھی جو کہ آپ جیسے نہیں تھے ۔ کبھی ان حضرات سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں یا پھر بنی ہاشم کی شان میں ایک سخت کلمہ تک نہیں سنا گیا ۔ [بلکہ ان سے بہترین سلوک روا رکھتے تھے ۔ انہوں نے نہ کبھی ان کے ظلم سے فریاد کی ۔ نہ بنی ہاشم کے کسی آدمی نے ظلم کی شکایت کی ۔]

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ: جب دل میں کسی کے خلاف دشمنی ہو تو اس سے انسان اپنے دشمن کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے ۔ اور جب انسان قدرت بھی رکھتا ہو اور قدرت کیساتھ پختہ ارادہ بھی ہو' تو اس سے واجب ہو جاتا ہے کہ انسان جس چیز کا پختہ ارادہ کر چکا ہو اسے کر گزرے ۔ اگر ان حضرات کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تکلیف دینے کا ارادہ ہوتا تو وہ سامنے نظر آجاتا؛ جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہے؛ یہ لوگ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اپنی محبت اور دوستی کا دم بھرتے ہیں ۔ [تو پھر اس کہانی کی کیا حیثیت؟] ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے الفت و محبت کا سلوک کرتے اور ظاہراً و باطناً ان کی تعظیم بجالاتے رہے ۔ اور انہیں باقی ساری امت، پر ترجیح دیتے تھے ۔ اس سے ان کے احوال و تعلقات کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی شان میں کبھی ایک لفظ تک برا نہیں کہا؛ اور نہ ہی کبھی یہ دعوی کیا کہ وہ ان دونوں سے بڑھ کر خلافت کے حق دار ہیں ۔

[رافضی مذہب کو کہاں پذیرائی ہو سکتی ہے؟]:

یہ ایک مشہور بات ہے اور ہر تاریخ دان اس سے آگاہ ہے اور اگر کوئی شخص روافض کے کذب و بہتان کا دل دادہ ہو جو اس امت میں منقولات سے نابلد محض علم الآثار سے یک سر بیگانہ اور محال و متناقض جھوٹ کے پجاری ہیں؛ جس کو ایک چوپایہ ہی باور کر سکتا ہے تو یہ ایک الگ بات ہے ۔ روافض دیہات کے ان افسانہ گو لوگوں کی مانند ہیں جو دیہاتی عوام کو جھوٹی کہانیاں سناتے ہیں اور پہاڑی و جنگلی باشندے اس پر سر دھنتے ہیں ۔ یہ پھر ان شہروں کے رہنے والے ان کی بات مان سکتے ہیں جہاں پر جھوٹوں کا دور دورہ اور اہل نام کی کوئی چیز وہاں پر نہ ہو [جو ان کے جھوٹوں کا بھانڈا پھوڑ سکے] ۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو ان کی گمراہیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔

رافضی مذہب کے بارے میں کبھی یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی ایسے بڑے شہر میں استقرار پکڑے جہاں پر اہل علم و دین [اہل حق] مسلمان موجود ہوں ۔ اس مذہب کو دور دراز کے پہاڑوں؛ دیہاتیوں اور جنگلیوں میں ہی پذیرائی ہو سکتی ہے ۔ یا پھر کسی ایسے پلید شہر میں جہاں کے لوگوں کے من خباثت سے بھرپور ہوں ۔ اور لوگ جھوٹ کے اس قدر دل دادہ ہوں کہ اپنے اندر چھپاتے کچھ ہوں اور اظہار کسی اور چیز کا کرتے ہوں ۔

قاہرہ کا شہر جب عبیدی حکمرانوں کے ساتھ تھا تو یہ لوگ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کرتے تھے ۔ لیکن شیعیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے ۔ انہوں نے وہاں اہل علم و دین پر پابندی لگا رکھی تھی کہ اپنا دین ظاہر نہ کریں ۔ مگر اس کے باوجود باقی شہروں کے مسلمانوں سے ڈرتے رہتے تھے ۔ جب کوئی اجنبی ان کے پاس آجاتا تو یہ اس کے سامنے اپنا عقیدہ ظاہر نہ ہونے دیتے ۔

اس کے ساتھ مداہنت سے پیش آتے اور اس مہمان سے ایسے ڈرتے رہتے جیسے کسی بادشاہ سے ڈرتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے اور افتراء پردازی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ﴾ [الأعراف ۱۵۲]

''بیشک جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی اور ہم جھوٹی تہمت لگانے والوں کو ایسی سزا دیا کرتے ہیں۔''

مفسر ابو قلابہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس امت میں سے بھی قیامت تک کیلئے ہر جھوٹ گھڑنے والے کی یہی سزا ہے۔

[اعتراض]: شیعہ مصنف [حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں] لکھتا ہے:

''اور حکم دیا کہ جو ان چار کی مخالفت کرے اسے قتل کر دیا جائے۔ اور جن تین لوگوں کے گروہ میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ موجود ہوں ان کے مخالفین کو قتل کرنے کا حکم دیا۔''

[جواب]: یہ محض جھوٹ ہے۔ پھر اگر بالفرض تسلیم بھی کرلیا جائے کہ آپ نے یہ فرمایا ہے تب بھی آپ نے دین کے خلاف کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ آپ نے فتنہ ختم کرنے کی نیت سے ایسے کہا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تمہارے پاس کوئی آئے اور تمہارا نظام ایک آدمی کے ہاتھ میں ہو اور وہ تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہو تو اسے قتل کر دو؛ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔'' [صحیح مسلم ۳/ ۱۴۷۹؛ وسنن ابو داؤد ٤/ ۳۳٤]۔

پھر اس سے مراد یہی ہوسکتی ہے کہ جو انسان بیعت اور مشورہ کے بغیر مسلمانوں سے علیحدہ ہوکر بیٹھ جائے؛ اس حدیث کی روشنی میں اس کے قتل کا حکم دیا ہوگا۔ جب کہ کسی انسان کے بیعت سے پیچھے رہنے کی وجہ سے جب فتنہ کا اندیشہ نہ ہو ایسے انسان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی ایسا حکم دیا ہے۔

ایسے ہی رافضی مصنف نے جو کہا ہے کہ: آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا اشارہ دیا تھا اور حضرت علی کو ولایت سے پیچھے رکھنے کا اشارہ دیا۔ یہ تمام باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جھوٹا الزام ہیں۔

ایسے ہی رافضی کا قول: ''[آپ کو پتہ تھا کہ] آپ کو خلیفہ نہیں بنایا جائے گا۔''

اس میں مستقبل کے متعلق ایک خبر ہے جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس میں کہیں بھی آپ کو ولایت سے روکنے کی بات نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ الفاظ اس سیاق کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ آپ پر جھوٹا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

❁❁❁❁